مُنتخب التواریخ

• تاریخ مبارک شاہی
اور نظام التواریخ کا صحیح انتخاب
• ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے تذکرے
• محمود غزنوی سے عہدِ اکبری تک کے صحیح حالات کا مفصّل جائزہ
• غیر معروف اور اہم مقامات کی مکمل تشریح • تاریخی حقائق
اور مستند ترین واقعات کا بیش بہا خزانہ

مُصنّف :- مُلّا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی ،

مُترجم :- محمود احمد فاروقی

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز، کشمیری بازار، لاہور

برانچیں :- ○ بندر روڈ، کراچی ○ نذر باغ، پشاور ○ ہسپتال روڈ، حیدر آباد

مُنتخبِ التّواریخ

تاریخ مُبارک شاہی اور نظام التّواریخ کا صحیح انتخاب،
محمُود غزنوی سے عہدِ اکبری تک صحیح حالات کے علاوہ
غیر معرُوف اور اہم مقامات کی مکمّل تشریح بھی کی گئی ہے۔

مُصنّف:۔ مُلّا عبدالقادر ملوک شاہ بدایُونی

مُترجّم:۔ محمُود احمد فارُوقی

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور پشاور حیدرآباد کراچی

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۰۶

سنہ ۱۹۶۲ء

شیخ نیاز احمد پرنٹر د پبلشر نے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور سے چھپوا کر شیخ غلام علی اینڈ سنز
کشمیری بازار لاہور سے شایع کیا

فہرست

۱۰۰۳	شیخ عبدالنبی صدر الصدور	۶۰۵	۱۰۳۰	مولانا عثمان سامانہ	۶۲۷
۱۰۰۴	شیخ احمدی فیاض امیٹھی دال	۶۰۸	۱۰۳۱	حاجی سلطان تھانیسری	″
۱۰۰۵	قاضی صدرالدین جلندری	″	۱۰۳۲	سید شاہ میر سامانہ	۶۲۸
۱۰۰۶	میاں الہداد لکھنوی	۶۰۹	۱۰۳۳	سید یاسین	″
۱۰۰۷	میر سید جلال الدین قادری آگرہ	″	۱۰۳۴	شیخ ضیاء اللہ	۶۲۹
۱۰۰۸	شیخ حسین اجمیری	۶۱۰	۱۰۳۵	میر ابوالغیث بخاری	۶۳۲
۱۰۰۹	شیخ عبدالقادر	۶۱۲	۱۰۳۶	میاں کمال الدین حسین شیرازی	″
۱۰۱۰	شیخ کبیر	۶۱۳	۱۰۳۷	شیخ ابوالفتح تھانیسری	۶۳۳
۱۰۱۱	میر سید علی لدھیانہ	۶۱۴	۱۰۳۸	مولانا عثمان بنگالی	۶۳۴
۱۰۱۲	شیخ معین	۶۱۵	۱۰۳۹	شیخ حسین بزہری	″
۱۰۱۳	میر عبداللطیف قزوینی	۶۱۶	۱۰۴۰	مولانا اسمٰعیل عرب	″
۱۰۱۴	مرزا غیاث الدین علی	۶۱۷	۱۰۴۱	قاضی مبارک گوپالوٹی	″
۱۰۱۵	خواجہ یحییٰ	″	۱۰۴۲	مولانا ولیس گوالیاری	۶۳۵
۱۰۱۶	شیخ حسین بدخشی	۶۱۸	۱۰۴۳	شیخ محمد شامی	۶۳۶
۱۰۱۷	شیخ عبدالقادر	″	۱۰۴۴	شیخ حسن علی موصلی	″
۱۰۱۸	شیخ ابوالمعالی	″	۱۰۴۵	قاضی نوراللہ شوستری	″
۱۰۱۹	مولانا جمال تلہ	۶۲۰	۱۰۴۶	حاجی ابراہیم محدث	۶۳۷
۱۰۲۰	مولانا عبدالشکور لاہور	″	۱۰۴۷	شیخ جلال واصل کالپی والے	۶۳۸
۱۰۲۱	شیخ کبیر ولد شیخ منور	۶۲۱	۱۰۴۸	ملک محمود پیارو	″
۱۰۲۲	شیخ سعداللہ نحوی	″	۱۰۴۹	صدر جہاں پہانی	″
۱۰۲۳	شیخ نصیرالدین	۶۲۲	۱۰۵۰	شیخ یعقوب کشمیری	۶۳۹
۱۰۲۴	شیخ مبارک الوری	″	۱۰۵۱	مولانا میرزا سمرقندی	۶۴۳
۱۰۲۵	شیخ چایئن لدہ ستہسی	۶۲۳	۱۰۵۲	قاضی ابوالمعالی	″
۱۰۲۶	شیخ عبدالغنی بدایونی	″	۱۰۵۳	مولانا میر کلال	″
۱۰۲۷	شیخ بہلول دہلوی	۶۲۴	۱۰۵۴	مولانا سعید ترکستانی	۶۴۴
۱۰۲۸	شیخ عبدالحق دہلوی	″	۱۰۵۵	حافظ کوکی	″
۱۰۲۹	مولانا الہداد سلطان پوری	۶۲۷	۱۰۵۶	قاضی نظام بدخشی	″

۱۱۱۱	جدائی	۶۸۰	۱۱۳۸	سقا	۶۹۹
۱۱۱۲	جذبی	″	۱۱۳۹	سپاہی	۷۰۰
۱۱۱۳	جمیلی کالپی والی	۶۸۱	۱۱۴۰	سہروری اصفہانی	″
۱۱۱۴	چشتی	۶۸۲	۱۱۴۱	ساقی جزائری	۷۰۱
۱۱۱۵	جعفر	۶۸۳	۱۱۴۲	سیدی	″
۱۱۱۶	جعفر بیگ	″	۱۱۴۳	شاہ ابوالمعالی	۷۰۲
۱۱۱۷	حیدری تبریزی	۶۸۴	۱۱۴۴	شیری	″
۱۱۱۸	حزنی	۶۸۵	۱۱۴۵	شکیبی اصفہانی	۷۰۵
۱۱۱۹	حیاتی گیلانی	″	۱۱۴۶	شجاعی	″
۱۱۲۰	حیائی	۶۸۶	۱۱۴۷	شعوری تربتی	۷۰۶
۱۱۲۱	حالتی	″	۱۱۴۸	ملّا صادق حلوانی سمرقندی	″
۱۱۲۲	خان اعظم	۶۸۷	۱۱۴۹	صبوحی	۷۰۷
۱۱۲۳	خنجر بیگ	۶۸۸	۱۱۵۰	صالحی	″
۱۱۲۴	خسروی	۶۹۰	۱۱۵۱	صادقی	۷۰۸
۱۱۲۵	میر دوری	″	۱۱۵۲	صرفی	″
۱۱۲۶	داہنی	۶۹۱	۱۱۵۳	صرفی ساوجی	۷۰۹
۱۱۲۷	دوائی	۶۹۲	۱۱۵۴	صبوری ہمدانی	″
۱۱۲۸	رفیعی	۶۹۳	۱۱۵۵	صالح دیوانہ	″
۱۱۲۹	رہائی	۶۹۴	۱۱۵۶	طارمی	۷۱۰
۱۱۳۰	روحتی	″	۱۱۵۸	طریقی ساوجی	″
۱۱۳۱	زین خاں کوکہ	۶۹۵	۱۱۵۹	طالب اصفہانی	۷۱۱
۱۱۳۲	سلطان ستپلکی	″	۱۱۶۰	طالعی یزدی	۷۱۲
۱۱۳۳	سلطان	۶۹۷	۱۱۶۱	طفلی	″
۱۱۳۴	سیری	۶۹۸	۱۱۶۲	ظہوری	۷۱۳
۱۱۳۵	سپہری	″	۱۱۶۳	عالم کابلی	۷۱۴
۱۱۳۶	سیانی	″	۱۱۶۴	میر عبدالحی مشہدی	۷۱۵
۱۱۳۷	مہی	۴۹۹	۱۱۶۵	عتابی	۷۱۶

۱۱۶۶	عبیدی	۷۱۸
۱۱۶۷	عشقی خاں	〃
۱۱۶۸	علمی	۷۱۹
۱۱۶۹	میر عزیز اللہ	〃
۱۱۷۰	میرزا عزیز کوکہ	۷۲۰
۱۱۷۱	عبدی شیرازی	〃
۱۱۷۲	عنایت اللہ کاتب	۷۲۱
۱۱۷۳	عرفی شیرازی	۷۲۲
۱۱۷۴	غزنوی	۷۲۳
۱۱۷۵	غباری	۷۲۴
۱۱۷۶	غربتی حصاری	۷۲۵
۱۱۷۷	غیرتی شیرازی	۷۲۶
۱۱۷۸	فارغی شیرازی	〃
۱۱۷۹	فہمی طہرانی	۷۲۷
۱۱۸۰	فہمی سمرقندی	〃
۱۱۸۱	فکری	〃
۱۱۸۲	فستائی	۷۲۸
۱۱۸۳	فسونی یزدی	〃
۱۱۸۴	فیروزہ کابلی	〃
۱۱۸۵	فہمی استرآبادی	۷۲۹
۱۱۸۶	ملک الشعرا شیخ فیضی	〃
۱۱۸۷	فارسی	۷۳۴
۱۱۸۸	قراری گیلانی	۷۳۵
۱۱۸۹	قومی	۷۳۶
۱۱۹۰	قیدی شیرازی	〃
۱۱۹۱	قدری	۷۳۷
۱۱۹۲	قندی	〃

۱۱۹۳	کامی	۷۳۷
۱۱۹۴	کلاہی	〃
۱۱۹۵	کلابی	〃
۱۱۹۶	کاہی قمی	۷۳۸
۱۱۹۷	لقائی استرآبادی	〃
۱۱۹۸	لوائی	〃
۱۱۹۹	لعلی	〃
۱۲۰۰	لطفی منجم	۷۳۹
۱۲۰۱	میر مرتضیٰ شیرازی	〃
۱۲۰۲	محوی	〃
۱۲۰۳	میر محسن رضوی مشہدی	۷۴۱
۱۲۰۴	موجی	〃
۱۲۰۵	میرزادہ علی خاں	۷۴۲
۱۲۰۶	معزی ہروی	۷۴۳
۱۲۰۷	مرادی استرآبادی	〃
۱۲۰۸	مشفقی بخاری	〃
۱۲۰۹	میلی ہروی	۷۴۴
۱۲۱۰	ملک قمی	۷۴۶
۱۲۱۱	ملاحی بدخشی	۷۴۷
۱۲۱۲	ملا مقصود قزوینی	〃
۱۲۱۳	محنتی حصاری	۷۴۸
۱۲۱۴	موسوی مشہدی	〃
۱۲۱۵	خواجہ معظم	۷۴۹
۱۲۱۶	موزوں	〃
۱۲۱۷	محمد یوسف	۷۵۰
۱۲۱۸	منظری سمرقندی	〃
۱۲۱۹	ملامی ہمدانی	۷۵۱

جلد اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

حمد و نعت اور سببِ تالیفِ کتاب

اے یافتہ نامہا زنامِ تو رواج   شاہاں بدرت چو ماہ پیشاں محتاج
حاشا کہ رسید عہدمت غیرت تو   نے پائے بکعش ماندہ نے فرق بتاج

حمد اے شہنشاہِ دو جہاں! اس دلِ بے حاصل کے ساتھ جو دیو و دوش کا مسکن ہے، تیری تعریف و توصیف کا خیال کیسے کروں اور اس بیہودہ گو فرسودہ زبان کے ساتھ جو گربہ و سگ لقمہ ہے، تیری مدح سرائی کیوں کر کروں ؎

چہ زہرہ خاکِ مسکیں را کہ توحیدِ خدا گوید
بدیں آلودگی خاکِ مقدس را ثناء گوید

مزید برآں اس راستہ میں کہ جس کے پیچ و خم سے میں ناواقف ہوں، یہ پائے جستجو لنگ ہے اور میری زبان سست بیان کے لیے اس بے پایاں بیابان میں گفتگو کی فضا تنگ ہے ؎

آنچہ دل داند حدوث است آنچہ لب گوید حروف
من بدل چوں دانمت یا با زباں چوں خوانمت

اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے قلم کو اس وادی کے طے کرنے سے روکوں اور حیران و پریشان دماغ کو دُنیا اور اس کے انسانوں کے بارے میں غور و فکر کرنے سے باز رکھ کر دیدۂ عبرت باری تعالیٰ کی پُر کمال صنعت اور اس کے لازوال ملک کی معرفت کے لیے وا کروں اور کائنات کے احوال اور اُن کے تغیرات سے اس کی بلند پایہ ذات تک پہنچ کر توحید اور تقریبِ کے عالم میں اپنا سر اٹھاؤں تاکہ یقین کی آنکھوں سے نہ صرف دیکھ سکوں بلکہ پہچان بھی سکوں کہ ؎

دُوئی را نیست رہ بحضرتِ تو
ہمہ عالم توئی و قدرتِ تو

نعت اور زبان کو اُس سرورِ کائنات، صاحبِ حوضِ کوثر حضرت محمدؐ کے نام کے ورد اور اُس کی حلاوت سے تر کروں، جن کے اولوالعزم وجودِ مقدس پر ازلی اور ابدی بادشاہت کی خلعتِ شریف چست آئی، اور جن کے نام عالی سے خداوند تعالیٰ کی لازوال مملکت کا سکہ رواں ہوا۔ رباعی

شاہِ عربی کہ شد جہاں مظہرِ او   سوگند بسرش گفت جہاں داورِ او
ہمسایۂ حق بود ازاں سایہ نداشت   تا پا ننہد کسے بجائے سرِ او

ہزاروں ہزار تحسین و آفرین ہو اُن کی آل برگزیدہ اور اصحابِ حق بیں، خصوصاً خلفائے راشدینؓ پر جنھوں نے پرچمِ اسلام بلند کرنے

اوراعلائے کلمۂ حق کے لیے اپنی جانیں نثار کیں، اپنے سر فدا کیے اور ہر طرح کے کفر و بدعت کے خار و خاشاک سے ملکِ شرع کی وادی کو پاک کیا۔

علم تاریخ حمد الٰہی اور نعت حضرت رسالت پناہیؐ کے بعد اس امر کی وضاحت لازمی ہے کہ علم تاریخ بذاتہٖ ایک علم شریف اور فن لطیف ہے۔ اس لیے کہ یہ اہلِ خبر کا سرمایۂ عبرت اور اہلِ عقل کا آئینۂ تجربات ہے۔ اصحابِ قصص و سیر نے حضرت آدمؑ سے لے کر زمانۂ حال تک اس فن میں بڑی معتبر اور ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور اس کی حقیقت کا ثبوت دلائل و براہین سے بہم پہنچایا ہے۔ اس لیے یہ خیال کبھی دل میں نہیں لانا چاہیے کہ ضعیف العقیدہ اور شکی طبیعت رکھنے والوں نے اس علم کے مطالعہ کے متعلق جو خیال آرائی کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس سے مسلمان شریعتِ محمدی کی راہ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں اور ہوا و بدعت کے مکدّر چشموں کے کنارے اُترتے ہیں، اس لیے کہ جس گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اسے فطری طور پر دینِ حق سے لگاؤ نہ ہو اور کلام ازلی جو سعادتِ ابدی کی کلید ہے اور دونوں جہاں کے لیے رحمت و شفا ہے اس کی تلاوت سے بھی اس کی شقاوتِ قلبی نہ گئی ہو اور وہ خسرانِ جاوید میں رہ گیا ہو۔ واذا لم یھتدوا بہ فسیقولون ھذا افک قدیم۔ جب قرآن مجید کے بارے میں اس کی یہ رائے ہو تو پھر علم تاریخ اُس کی زد سے کیسے بچ سکتا ہے ؎

چو حسّ سمع از مالیخولیا ضائع شود کس را
نیابد بہرہ از مزمارِ داؤدی و الحانش

مگر ہمارے مخاطب وہ اصحاب ہیں جو سلامتیٔ طبع، جودتِ ذہن اور شیوۂ انصاف کے حامل ہیں، نہ کہ وہ جماعتیں جو شرع شریف کی پابند نہیں اور اصل و فرع کی منکر ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے لوگ تخاطب کے قابل نہیں اور ان کا شمار اہلِ اعتبار اور اولی الابصار کے زمرہ میں نہیں ہوتا۔ بھلا ایسے علم کا کوئی شخص کیسے منکر ہو سکتا ہے جس کی فضیلت کا یہ حال ہو کہ اسے سبع مثانی[1] کی ساتویں آیت کا درجہ حاصل ہو اور سبع مثانی کی اہمیت ظاہر ہے کہ اسے ایمان اور یقین کی بنیاد قرار دیا گیا ہے وکلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت بہ فوادک۔ یہ آیۂ شریفہ اس کا بیّن ثبوت ہے اور علمائے حدیث و تفسیر کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں امام بخاریؒ[2] اور قاضی بیضاوی[3] سے لے کر ہمارے اپنے زمانہ تک کے علمائے کرام شامل ہیں۔ اُن سب نے اس دل پذیر علم کو اپنا مشغلۂ تحریر بنائے رکھا اور اقوامِ مشرق و مغرب جو اگرچہ مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی ہیں وہ بھی اُن کے قول و عمل کو مستند سمجھتی ہیں۔ اس کے برعکس اہلِ بدعت کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے اور اس کی یہ بدبختی ہے کہ اپنے نفس امّارہ کے تعصّب اور ظاہر و باطن کی کوتہ بینی سے اس نے اس حد تک جرأت کی کہ قابلِ یادگار اور صحیح تاریخ کے واقعات کو باہم خلط ملط کیا اور اس طرح اُن کے حقیقی مفہوم کو خبط کر دیا۔ اُس نے مسلّمہ ترکیبوں، تشریحوں اور وضاحتوں کے اسلوب کو ترک کر کے صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے معرکوں اور مناظروں کا قیاس اپنے زاویۂ نظر سے کیا اور اُن کی بنا حصولِ دولت اور خاندانی جاہ و حشم کے ذاتی تقاضوں پر رکھی۔ یقیناً یہ گروہ ایسے سادہ لوح لوگوں کی گمراہی کا

---

[1] سبع مثانی۔ بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں جن سے قرآن مجید کی ابتدا ہوتی ہے، اور وہ سورۂ فاتحہ ہے۔

[2] حافظ ابو عبداللہ محمد بن حسن اسمٰعیل بن ابراہیم بن المغیرات بن الاعفاف آپ صحیح بخاری کے مصنف ہیں ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۵۶ھ میں انتقال کیا۔

[3] قاضی نصیر الدین ابو الخیر عبداللہ بیضاوی ابی عمر ابن محمد۔ جائے پیدائش بیضا اس لیے بیضاوی کہلائے۔ بیضا شیراز کا ایک گاؤں ہے۔ قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے الغایۃ فی الفقہ، شرح المصباح والمنہاج اور تفسیر بیضاوی زیادہ مشہور ہیں ۶۸۵ھ میں انتقال ہوا اور شیراز میں دفن ہوئے۔

باعث ہوا جو پہلے ہی ضعیف الاعتقاد تھے اور اس نے اپنی غلطیوں کو اُن پر محمول کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے آپ کو بھی اور اپنے ساتھ اُن کو بھی دار البوار جہنم میں پہنچایا؂

اذا کانَ الغراب دلیل قوم[1] سیھد یھم لسبیل الھالکنا

اور جس شخص کی آنکھیں سرمۂ توفیق اور نورِ یقین سے منوّر ہوں ہر وہ سانحہ جو اس عالم کون و فساد میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اس کی سطح سے بالاتر ہو کر وہ اُس ذوالجلال صانع قدیم کی وحدت کو پا لیتا ہے، جو حدوث کے عیب سے مبّرا اور تغیّر و انتقال کے داغ سے پاک ہے، اور جب میں اپنے چاروں طرف بغور دیکھتا ہوں تو یہ دُنیا مجھے بذاتِ خود ایک کتاب قدیم نظر آتی ہے جس کا کوئی سر ہے نہ پیر اور اس کے تمام اوراق پراگندہ ہیں، مگر اس کے ہر ورق پر افرادِ انسانی کی کسی ایسی جماعت یا گروہ کے احوال و کوائف درج ہیں جس کے ہاتھ میں زمام اختیار دی گئی تھی؂

زاحوالِ شہاں گیتی بود شہنامہ کہنہ — تو دائم از پر عبرت در و می بین و میخوانش
فسونِ ایں فسانہ خواب خوش می آورد آنرا — کہ سر سلمے است واز سودا دماغ آمد پریشانش
ولے بیدار ہم می سازد آں کس را کہ از نخوت — بخوابِ غفلت اُفتاد است و بازی دادہ شیطانش

سبب تالیف کتاب

بنی نوع انسان کے اس دعا گو عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نے ۹۹۹ھ کے اوائل میں حضرت خلیفۂ زماں ظل الٰہی اکبر شاہ کے حکم کی تعمیل میں انتخاب تاریخ کشمیر[2] کا ہندی سے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے سے فراغت پائی مجھے چونکہ بچپن سے بڑھاپے تک اس علم تاریخ سے انسیت رہی ہے اس لیے اس عرصہ میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا کہ میں اس علم کے مطالعہ یا تحریر میں مشغول نہیں رہا، خواہ اپنی رغبت سے تھا یا کسی دوسرے کی حکم کی تعمیل میں، چنانچہ بارہا میرے دل میں آیا کہ دارالسلطنت دہلی کے بادشاہوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھا جائے۔ ع

جملہ عالم روستا نید آں سوادِ اعظم است

یعنی ابتدائے اسلام کے زمانہ سے لے کر اس زمانِ تحریر تک مختصراً لکھا جائے تاکہ ہر بادشاہ کے احوال کی وہ ایک ایسی اجمالی یادداشت ہو جو احباب کے لیے تذکرہ کا کام دے اور اربابِ بصیرت کی نظر میں اسے تبصرہ کی حیثیت حاصل ہو۔ اگرچہ میرے پاس اس موضوع پر کوئی کتاب یا تصنیف نہیں پھر بھی بقولِ شاعر؂

ایں کہن اوراقِ گردوں کش زانجم زیور است
کُہنہ تاریخ لبسے شاہانِ انجم لشکر است

ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے عالم ملکوت اور سرّ غیب کا کوئی فرستادہ ناظرین میں سے کسی مقبل کے دل پر اپنا نورانی پرتو ڈالے اور وہ ترکِ دُنیا کے جذبہ کے تحت اس سرائے فانی کی محبت اپنے دل سے نکال کر ان اوراق جامع کی جانب دستِ اعانت بڑھائے چنانچہ میری یہ اُمید موہوم نہیں تھی، جب کہ ہر دن نئے نئے غم و اندوہ کے ساتھ طلوع ہوتا اور بے اندازہ مصائب و آلام اپنے ساتھ لاتا۔ امداد کم ملتی

---

[1] یہ عربی محاورہ اصل میں اس طرح ہے من یکون الغراب لہٗ دلیلاً یمر بہ علیٰ جیف الکلاب
[2] تاریخ کشمیر کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ ملّا شاہ محمد شاہ آبادی نے کیا تھا۔

اور موانعات زیادہ پیش آتے اور زمانے کے رنج و محن کے باعث کسی ایک جگہ قیام دشوار ہوتا، ع

ہر روز بمنزلے و ہر شب جائے

اور ان پر مستزاد یہ کہ میرے ذریعۂ معاش کی کوئی مستقل اور یقینی صورت نہ تھی اور وہ زمین و آسمان کے مابین معلق تھا نیز یہ دل اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی جدائی میں پریشان تھا، اس لیے میرے مقصد کی تکمیل میں تاخیر لازمی تھی، مگر اسے حسنِ اتفاق کہئے کہ میرے مہربان اور مشفق دوستوں میں سے ایک نے تاریخ نظامی[1] کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ میرے اس دوست کو دین سے کافی لگاؤ تھا۔ اس فقیر کے ساتھ بھی اسے محبت تھی اور اس فقیر کو بھی اس کے ساتھ اُنس تھا مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہ رختِ حیات باندھ کر فردوسِ اعلیٰ کی جانب روانہ ہو گیا ؎

اُو رفت و رویم ما بدنبال   آخر ہمہ را بود ہمیں حال

اس مرحلہ پر جب کہ زمانے نے مجھے قدرے فرصت سے نوازا تو میں نے اپنی زندگی کے گوناں گوں اوقات کا ایک حصہ چُرا لیا جس سے میرے اس مقصد میں نئی جان آ گئی اور میرا ارادہ زیادہ مستحکم ہو گیا۔ چونکہ ماضی ہمیشہ مستقبل پر اثر انداز رہا ہے بقولِ شاعر ؎

اگر دہقاں نہ خرمن کند پاک

گذارد حصۂ کنجشک درِ خاک

مَیں نے بھی مناسب سمجھا کہ ہندوستان کے صاحبِ استقلال سلاطین کے حالات قلمبند کروں، چنانچہ تاریخ مبارک شاہی[2] اور نظام التواریخ[3] نظامی دونوں کو میں نے اپنے پیشِ نظر رکھا۔ کچھ مواد اُن سے اخذ کیا اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ میری اس تصنیف کو ان دونوں تاریخوں سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو بحرِ ذخار سے اور حباب کو تیز و تُند طوفان سے۔ میں نے اپنی اس تصنیف میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اور استعارات سے بھی احتراز کیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کا نام میں نے "منتخب التواریخ" رکھا جس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ بادشاہانِ اسلام کے فرخندہ فرجام ناموں کو باقی رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس مؤلف کی ایک یادگار بھی اس سرائے مستعار میں رہ جائے۔ اُمید ہے کہ یہ ناتمام تالیف آخرت میں بھی میری مغفرت کا موجب ہوگی نہ کہ باعثِ اضافۂ گناہ ؎

نوائے بلبل چو بخرامی دریں باغ

بہر لحنے نہ گیری نکتہ بر زاغ

---

[1] تاریخ نظامی کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد بن خواجہ مقیم ہروی ہیں۔ خواجہ مقیم ہروی بابر بادشاہ کے دیوان تھے اور خواجہ نظام الدین احمد اکبر بادشاہ کے دیوانی خاص تھے جنھیں بعد میں ترقی دے کر گجرات میں بخشی مقرر کر دیا گیا۔ تاریخ نظامی کا شمار بڑی مستند اور شہرۂ آفاق کتابوں میں ہوتا ہے۔ مصنف نے اس کا نام طبقات اکبر شاہی رکھا تھا اور یہ طبقاتِ اکبری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ فرشتہ کی رائے ہیں ان تمام تاریخوں میں سے یہ سب سے زیادہ معتبر ہے جو اُس کے مطالعہ میں آئیں۔ خواجہ نظام الدین احمد نے ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۵۹۴ء میں انتقال کیا۔

[2] تاریخ مبارک شاہی۔ یہ یحییٰ ابن احمد ابن عبداللہ سرہندی کی تصنیف ہے اور اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مبارک شاہ کے عہدِ حکومت کے حالات اور واقعات قلمبند کیے جائیں۔ اس تاریخ کی ابتدا محمد سام بانی سلطنت غوری سے ہوتی ہے اور اختتام سلطان سید محمد پر۔

[3] نظام التواریخ۔ اس نام کی کتاب سے مُلّا بدایونی کی مراد یہی تاریخ نظامی ہے جس کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد ہیں۔

چونکہ میری اس تحریر کی بنا دیانت داری ہے، اگر اتفاقاً کوئی سہو اور لغو زبانِ قلم پہ آجائے تو اُمید ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اسے اپنے کرم عمیم سے درگزر کرے گا اور بخش دے گا، ؎

یہ بد گفتن زبانِ من مگرداں
زبانِ من زیانِ من مگرداں

چونکہ محمد بن قاسم (عم زادہ اور داماد حجاج بن یوسف ثقفی) بلادِ سندھ، ملتان اور گجرات فتح کرنے کے بعد ولید بن عبدالملک مروانی کے حکم نامہ کی تعمیل میں شہر اودے پور سے روانہ ہوا تھا اور رستہ ہی میں اپنے آپ کو چرم خام[1] میں سلوا کر جان بحق تسلیم ہو گیا تھا، اس لیے ہندوستان کے مفتوحہ شہروں میں احکامِ اسلامی کی ترویج اور پابندی کا انتظام نہ ہو سکا۔ یہ سعادت ناصرالدین سبکتگین اور اُس کے فرزند سلطان محمود غزنوی ہی کو نصیب ہوئی کہ اُنھوں نے نہ صرف ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اسلام کا جھنڈا بھی اس سرزمین پر گاڑا اور احکام اسلامی کی ترویج اور پابندی کا انتظام کیا۔ سلطان محمود غزنوی جو ہر سال غزوہ اور جہاد کی نیت سے ہندوستان آتا تھا، اُس کی اولاد نے لاہور کو پایۂ تخت بنایا یہاں تک کہ ان علاقوں میں اسلام کے پَیر مضبوطی سے جم گئے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف کی ابتدا اُس سلطان عاقبت محمود سے کی جائے جس کی ابتدا بھی مسعود تھی اور انتہا بھی محمود۔ واللہ خیر الناصرین والمعین۔

---

[1] چرم خام۔ اس کا تعلق راجہ داہر کی دو کنواری لڑکیوں سے تھا جنھوں نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے دروغ بیانی سے کام لیا۔ واقعہ یوں ہے کہ جب ۹۳ھ میں راجہ داہر قلعہ راوڑ کے محاصرہ میں لڑتا ہوا مارا گیا تو محمد بن قاسم نے اس کی دونوں کنواری لڑکیوں کو حبشی غلاموں کی نگرانی میں بغداد بھیج دیا۔ جب اُنھیں خلیفہ ولید ابن عبدالملک مروانی کے حضور پیش کیا گیا تو دیکھتے ہی وہ اُن پر فریفتہ ہو گیا اور اُنھیں اپنے حرم میں رکھنے کا حکم دے دیا۔ ان لڑکیوں نے موقع غنیمت جان کر خلیفۂ وقت کو ہر ممکن طریقے سے اس امر کا یقین دلایا کہ یہاں بھیجنے سے پہلے محمد بن قاسم نے اُن کو تین روز اپنے پاس رکھا تھا، اس لیے وہ خلیفۂ وقت کے حرم میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہیں۔ یہ سُن کر خلیفۂ ولید کو بے حد غصہ آیا اور ایک حکم نامہ کے ذریعے محمد بن قاسم کو لکھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو اپنے آپ کو چرم خام میں سلوا کر دارالخلافہ پہنچے۔ محمد بن قاسم اُس وقت اودے پور میں تھا، چنانچہ حکم پاتے ہی اُس نے تعمیل کی اور اپنے آپ کو چرم خام میں بند کر کے سلوا لیا۔ جب چرم خام کا یہ سِلا ہوا تھیلا خلیفۂ ولید کے حضور لایا گیا تو محمد بن قاسم اس کے اندر جان بحق تسلیم ہو چکا تھا۔ خلیفۂ ولید نے سبز مہندی کی ٹہنیوں کا ایک دستہ ہاتھ میں لے کر لاش کی طرف اشارہ کیا اور ان دونوں لڑکیوں کو دکھایا جسے دیکھتے ہی لڑکیاں فوراً بول اُٹھیں کہ یہ دروغ بیانی تھی اور اُنھوں نے اس لیے اختیار کی تھی تاکہ محمد بن قاسم سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لیں، اس لیے کہ اُن کے نزدیک محمد بن قاسم اُن کے باپ کا قاتل تھا۔ اس دروغ بیانی کی پاداش میں خلیفۂ ولید نے یہ حکم دیا کہ دونوں لڑکیوں کو دو دیواروں کے درمیان چُن دیا جائے۔ (آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۳۴۵)

طبقۂ اوّل

غزنوی عہدِ حکومت

سلطان ناصر الدین سبکتگین سے خسرو ملک تک

سرزمینِ ہند پر اسلامی حکومت کا بانی جس نے دہلی فتح کرنے سے قبل ہی اسلام کا ڈنکا بجا دیا

دورانِ عہد حکومت ۳۶۷ھ سے ۵۸۲ھ تک ۲۱۵ سال

حکمرانوں کی تعداد ۱۵

سلطان ناصر الدین ترک نژاد تھا اور الپتگین کا غلام، اور الپتگین خود امیر منصور[1] بن نوح سامانی کا غلام تھا۔ الپتگین کے فرزند ابو اسحاق کی وفات کے بعد افواج اور رعایا کی متفقہ رائے سے سبکتگین تخت نشین ہوا۔ اس نے پرچم فتح و نصرت بلند کیا اور غزوہ و جہاد کے جذبۂ بے پناہ سے وہ کوہِ جود[2] کے راستہ عازم ہندوستان ہوا اور راجہ جے پال کے ساتھ جو اُس وقت ہندوستان کا ایک فرماں روا تھا، ایک عظیم جنگ لڑی مگر اس کا انجام باہمی مصالحت پر ہوا۔ بعد میں راجہ جے پال نے عہد شکنی کی اس لیے سبکتگین نے دوبارہ ایک لاکھ سوار اور بے شمار کوہ پیکر ہاتھیوں کے ساتھ اس پر چڑھائی کی اور لمغانات[3] کے نواح میں طرفین کی فوجوں کی آپس میں مڈبھیڑ ہوئی۔ اس بار بھی نسیم ظفر مندی ناصر الدین سبکتگین کے پرچم کی طرف چلی اور راجہ جے پال نے شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کی۔ لمغانات کا تمام علاقہ سبکتگین کے قبضہ میں آیا، اس کے نام کا خطبہ ہر طرف پڑھا گیا اور اسی کا سکّہ بھی جاری ہوا۔ پھر وہ یہاں سے لوٹا اور امیر نوح بن منصور سامانی کی مدد کو خراسان اور ماوراء النہر کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں کی عظیم فتوحات اسی کی مرہونِ منت تھیں۔ اس نے ماہِ شعبان ۳۸۷ھ میں انتقال کیا۔ مدّتِ حکومت بیس سال تھی۔

---

[1] امیر منصور بن نوح سامانی۔ خاندان سامانی کا آٹھواں حکمراں جس نے ۲۲ سال حکومت کی۔ اس حکومت کی بنا اسد بن سامان نے ڈالی تھی جو خراسان سے ماوراء النہر تک تھی۔ امیر منصور کا ۳۶۶ھ میں انتقال ہوا تھا، اس کے بعد اس کا فرزند ابو القاسم نوح تخت نشین ہوا تھا۔

[2] کوہ جود۔ غزنی اور لاہور کے درمیان ایک کوہستانی علاقہ کا نام۔

[3] لمغانات۔ غزنی کے پہاڑوں کا ایک حصّہ ہے۔ ابو الفدا اور لباب اس پر متفق ہیں۔

یمین الدولہ سلطان محمود بن ناصرالدین سبکتگین

غزنی کے راستہ ہی میں جب ماہ شعبان ۳۸۷ھ میں سبکتگین نے داعیٔ حق کو لبیک اجابت، کہا تو انتقال سے قبل ہی اس نے اپنے فرزندِ خورد اسمٰعیل کو ولی عہد سلطنت مقرر کردیا تھا۔ جب اس کی خبر محمود کو ملی تو اس نے اپنے برادرِ خورد اسمٰعیل کو تعزیتی خط لکھا جس میں بطورِ مصالحت یہ تجویز بھی پیش کی کہ وہ غزنی کا علاقہ محمود کے حوالے کردے اور اس کے عوض بلخ کی گورنری قبول کرلے۔ اسمٰعیل نے اس سے صاف انکار کردیا، چنانچہ دونوں بھائیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ محمود فتح مند ہوا اور اسمٰعیل چھ ماہ تک حصار بند ہو کر بیٹھا رہا۔ آخر اس خاندان کے چند خیر خواہوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں بھائیوں میں صلح کرادی۔ اسمٰعیل خود محمود کے پاس گیا اور اس کے بعد عنانِ حکومت یمین الدولہ سلطان محمود کے ہاتھ آئی۔ اس اثناء میں سلطان محمود اور امیر منصور بن نوح سامانی اور اس کے بھائی عبدالملک بن نوح سامانی کے درمیان کشیدگی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ جنگ کی نوبت آئی۔ عبدالملک کے ساتھی امراء فائق اور بکتوزون بھی میدانِ جنگ میں اترے، مگر ان میں سے کوئی بھی سلطان محمود کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، سب نے شکست کھائی اور غزنی سے لے کر خراسان اور حدودِ ہندوستان تک کی تمام سلطنت سلطان محمود کے قبضہ میں آئی۔ چونکہ اس کی ماں رئیس زابل (قندھار) کی دختر تھی اس لیے اسے بھی محمود زابلی کہا جاتا ہے، چنانچہ فردوسی بھی شاہنامہ میں لکھتا ہے ؎

خجستہ درگہِ محمود زابلی دریاست | چگونہ دریا کانرا کنارہ پیدا نیست
شُدم بدریا، غوطہ زدم، ندیدم دُر | گناہ بخت من است ایں گناہِ دریا نیست

حکومت کے ابتدائی ایام میں خلیفۂ بغداد القادر باللہ عباسی اور سلطان محمود کے درمیان کسی وجہ سے تلخ اور ناگوار خط و کتابت شروع ہوگئی۔ خلیفہ عباسی نے اسے بڑے تدبّر کے ساتھ ختم کیا۔ چنانچہ اُس نے ایک خلعتِ فاخرہ دیگر بیش بہا تحائف و جواہر کے ساتھ سلطان محمود کے لیے بھیجی اور "امین الملّت یمین الدولہ" کا خطاب عطا کیا۔ سلطان محمود ۳۸۷ھ میں غزنی سے بلخ اور ہرات پہنچا اور وہاں کے جھگڑے طے کرنے کے بعد واپس غزنی آیا۔ اس کے بعد متعدد بار ہندوستان پر چڑھائی کی اور چند قلعے فتح کیے۔ عسجدی نے انہی اطراف کے ایک سفر میں یہ قصیدہ لکھا تھا ؎

چوں شاہِ خسرواں سفر سومنات کرد
کردارِ خویش را عَلَمِ معجزات کرد

ماہِ شوال ۳۹۱ھ مطابق سنہ ۱۰۰۱ء میں سلطان محمود نے غزنی سے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس کے ہمراہ دس ہزار سوار تھے۔ سب سے پہلے اُس نے پشاور فتح کیا۔ پھر انہی حدود پر اس کا مقابلہ راجہ جے پال سے ہوا جو بے شمار سوار اور پیادہ لشکر اور تین سو ہاتھیوں کے ساتھ مقابلہ میں آیا۔ دونوں طرف سے خوب دادِ شجاعت دی گئی مگر آخر کار سلطان محمود فتح یاب ہوا۔ راجہ جے پال اپنے پندرہ رشتہ داروں سمیت گرفتار ہوا جن میں اس کے بھائی اور بیٹے بھی شامل تھے۔ اس معرکہ میں پانچ ہزار کافر تہ تیغ ہوئے اور مالِ غنیمت کی ایک کثیر مقدار غازیوں کے ہاتھ آئی۔ راجہ جے پال کے گلے کا ہار جس کی قیمت ایک لاکھ اسّی ہزار دینار کے قریب تھی، نیز اُس کے دوسرے رشتہ داروں کے گلے کے بیش قیمت ہار بھی اس میں شامل تھے۔ سلطان محمود کو یہ فتح بروز ہفتہ ۸ محرم الحرام ۳۹۲ھ مطابق ۱۰۰۱ء نصیب ہوئی۔ یہاں سے وہ

تبرہندہ[1] کی جانب بڑھا۔ یہ مقام راجہ جے پال کی قیام گاہ تھی محمود نے اسے فتح کرلیا۔

اس کے بعد پھر ماہ محرم ۳۹۳ھ میں وہ غزنی سے براہ سیستان عازم ہندوستان ہوا اور ملتان کے نواح میں بہاتیہ[2] پہنچا جہاں کے راجہ بیجی رائے نے اس کی آمد کی خبر پاتے ہی ڈر کے مارے اپنے آپ کو خنجر سے ہلاک کرلیا۔ اُس کا سر سلطان محمود کے حضور لایا گیا۔ علاوہ ازیں ہندوؤں کی ایک بے شمار تعداد تیغ بے دریغ سے عدم آباد کو روانہ ہوئی۔ سلطان محمود کے ہاتھ دو سو ستر ہاتھی مالِ غنیمت میں آئے۔ داؤد بن نصر[3] ملحد حاکم ملتان نے بھی خائف ہو کر اطاعت قبول کرلی اور سالانہ بیس مرتبہ بیس بیس ہزار درم تاوان دینے کا عہد کیا۔ سلطان محمود جس وقت ملتان کی جانب بڑھ رہا تھا تو راجہ جے پال کے بیٹے انند پال سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی مگر جنگ کے بعد وہ کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان محمود[4] اس کے بعد براستہ ہندوستان ملتان پہنچا[5] اور یہ واقعہ ۳۹۶ھ کا تھا

اس کے اگلے ہی سال ۳۹۷ھ میں سلطان محمود اور ماوراء النہر کے بادشاہ ایلک خاں کے مابین جنگ ہوئی جس میں سلطان محمود غالب آیا اور ۴۰۳ھ مطابق ۱۰۱۲ء میں ایلک خاں وفات پاگیا۔

۳۹۸ھ مطابق ۱۰۰۷ء میں سلطان محمود ترکستان میں داخل ہوا اور ترکوں کے جھگڑے سے فارغ ہو کر اس نے سندھ کے راجہ سُکھ پال نو رسہ شاہ کا تعاقب کیا۔ وہ گرفتار ہوا اور قید ہی میں مرگیا۔ اسی راجہ سُکھ پال نے ایک مرتبہ اسلام بھی قبول کیا تھا اور اسی بنا پر اسے ابو علی سنجری کی قید سے رہا بھی کیا گیا تھا مگر وہ دوبارہ اہلِ شرک وارتداد میں شامل ہوگیا تھا۔

۳۹۹ھ مطابق ۱۰۰۸ء میں سلطان محمود نے پھر ہندوستان کا رُخ کیا اور راجہ نندپال کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی جس میں راجہ نندپال ہار گیا اور بے حد وحساب مالِ غنیمت سلطان محمود کو ملا جسے وہ اپنے ساتھ لے کر قلعہ بھیم نگر[6] میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوا اور وہاں کے خزانوں اور دفینوں پر بھی قبضہ کیا جو بھیم کے زمانہ سے مدفون اور محفوظ تھے۔ ۴۰۰ھ میں اس نے حکم دیا کہ سونے چاندی کے وہ تمام تخت بے اندازہ دولت اور کثیر اموالِ غنیمت جسے وہ ہندوستان سے لایا تھا دربار میں پیش کئے جائیں۔ چنانچہ سونے چاندی کے تخت دربار میں بچھائے گئے اور تمام مال و دولت کو اوپر تلے رکھدیا گیا اس نمائش سے اس کا مقصد لوگوں کو مرعوب کرنا تھا

۴۰۱ھ مطابق ۱۰۱۰ء میں سلطان محمود نے پھر غزنی سے ملتان کا قصد کیا، اور اس علاقہ کے باقی ماندہ حصے پر بھی قابض ہوگیا۔ اس نے یہاں کے بہت سے قرامطہ[7] اور ملاحدہ کو بھی موت کے گھاٹ اُتارا اور جو بچ رہے اُنھیں قلعہ بند کردیا یہاں تک کہ وہ مرگئے۔ داؤد

---

[1] تبرہندہ۔ فرشتہ کے نزدیک بھٹنڈہ ہے اور "جموں کے راجگان" نامی تاریخ میں بھی یہی لکھا ہے۔

[2] بہاتیہ۔ بھیرہ

[3] داؤد بن نصر ملحد حاکم ملتان شیخ حمید لودھی کے پہلے حکمران کا پوتا۔

[4] امیر محمود غزنوی پہلا مشرقی حکمران تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ ("شاہانِ غزنوی کے سکے" مصنفہ ٹامس) (از سیاست نامہ نظام الملک طوسی)

[5] فرشتہ کے نزدیک براستہ ہندوستان کے بجائے براستہ بھٹنڈہ صحیح ہے۔

[6] یہ قلعہ قصبہ بھیم سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے اور قلعہ نگرکوٹ بھی کہلاتا ہے اور کوٹ کانگڑہ سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔

[7] قرامطہ۔ ملحد مسلمانوں کا ایک فرقہ، جس کا بانی ایک شخص قرامط تھا۔ اس نے ۲۷۸ھ میں اس کی بنا ڈالی تھی اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ جبر و تشدد سے ہر قسم کا مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے چنانچہ ۳۱۹ھ میں اس کے ایک معتقد ابو طاہر کی قیادت میں مکہ معظمہ میں خونریز جنگ ہوئی تھی جس میں بے شمار آدمی قتل ہوئے تھے اور بڑی لوٹ مار مچی تھی۔ قرامطہ خانہ کعبہ سے حجر اسود بھی اُٹھا کر لے گئے تھے جو بیس سال تک اُنہی کے پاس رہا۔ (کتاب الملل والنحل صفحہ ۱۴۷) (از سیاست نامہ نظام الملک طوسی)

بن نصر حاکم ملتان کو غزنی لے جا کر قلعہ غوری (غورک) میں مقید کر دیا اور وہ اسی کے اندر مر گیا۔

۴۰۲ھ مطابق ۱۰۱۱ء میں سلطان محمود نے تھانیسر کا عزم کیا اور راجہ جے پال ثانی پچاس ہاتھی اور دیگر اموال و تحائف بطور نذرانہ لے کر پیش ہوا مگر سلطان محمود نے اُسے قبول نہ کیا اس لیے کہ تھانیسر بُتوں اور مندروں کی وجہ سے مشہور تھا اور سلطان محمود کے پیش نظر بھی (صرف بت شکنی) تھی اور وہ اسی مقصد سے یہاں آیا بھی تھا، اس لیے وہ نذرانہ کیسے قبول کرتا۔ چنانچہ اُس نے تھانیسر کے بُتوں کو توڑا اور مندروں کو مسمار کیا۔ ان میں سے ایک بُت چکر سوم[1] نامی تھا جس کی حفاظت کی خاطر بے شمار ہندوؤں نے اپنی جانیں دیں۔ سلطان محمود اس بُت کو اُٹھوا کر غزنی لے گیا اور حکم دیا کہ اسے دربار (کے آستانہ پر) رکھ دیا جائے تاکہ لوگ اس کے اوپر سے چل کر گزریں اور اسے پامال کریں۔

۴۰۳ھ مطابق ۱۰۱۲ء میں سلطان محمود نے گرجستان فتح کیا۔ اسی سال ایک قاصد عزیز مصر کی طرف سے آیا اور جب سلطان کو معلوم ہوا کہ قاصد مذکور کا تعلق فرقہ باطنیہ سے ہے تو ذلت کے ساتھ اُسے واپس کر دیا۔

۴۰۴ھ مطابق ۱۰۱۳ء میں سلطان محمود نے شہر نندنہ[2] پر لشکر کشی کی۔ یہ شہر بال ناتھ کے پہاڑوں میں واقع تھا۔ راجہ جے پال ثانی نے کچھ فوج اس قلعہ کے دفاع کے لیے مقرر کی اور خود درۂ کشمیر کی جانب چلا گیا۔ چنانچہ سلطان محمود نے یہ قلعہ بڑی آسانی سے مسخر کر لیا اور اس کی نگرانی اور حفاظت کا کام سارتغ کوتوال کے سپرد کر کے خود راجہ جے پال ثانی کے تعاقب میں نکلا۔ اس کوہستانی علاقہ سے اس کے ہاتھ کثیر مال و دولت آیا، بے شمار کافر تہ تیغ ہوئے اور اُن کی ایک بہت بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی اور کچھ کو قیدی بنا کر غزنی روانہ کیا گیا۔

۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۵ء میں سلطان محمود پھر کشمیر کی تسخیر کے لیے نکلا اور موہر کوٹ[3] کے قلعہ کا محاصرہ کیا مگر جلد ہی اُسے اس محاصرہ سے دست کش ہونا پڑا اس لیے کہ برف باری اور بارش کی زیادتی نے اسے پریشان کر دیا تھا اور کشمیریوں کو پیچھے سے مسلسل کمک بھی پہنچ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی پوزیشن پر مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ غزنی واپس جا کر سلطان محمود نے اپنی ہمشیرہ کا عقد ابو العباس شاہ ابن مامون خوارزم شاہ کے ساتھ کر دیا اور اپنی ہمشیرہ کو اس کے پاس بھیج بھی دیا۔

۴۰۷ھ مطابق ۱۰۱۶ء میں کچھ بدمعاشوں اور اوباشوں نے سلطان محمود کے بہنوئی ابو العباس شاہ کو قتل کر دیا۔ جب اُسے اس کی خبر ملی تو وہ غزنی سے بلخ اور پھر وہاں سے خوارزم پہنچا اور وہاں کے سپہ سالار سے اس کی خونریز جنگ ہوئی جس میں سلطان محمود فتح یاب ہوا اور اس نے اس علاقہ کی حکومت پر التونتاش کو مقرر کیا اور اسے خوارزم شاہ کا خطاب عطا کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے بہنوئی کے قاتلوں کی خبر لی اور اُنھیں کیفر کردار کو پہنچا کر غزنی واپس آ گیا۔

۴۰۸ھ مطابق ۱۰۱۷ء میں قنوج پر قبضہ کرنے کی غرض سے سلطان محمود غزنی سے روانہ ہوا اور ہندوستان کے سات خوفناک دریاؤں کو عبور کر کے جب وہ قنوج پہنچا تو یہاں کے فرمانروا کورہ[4] نے بلاچون و چرا اطاعت قبول کر لی، تحفے نذر گزارنے اور جان کی

---

[1] چکر سوم بُت یا چکرا سومن اس کے معنی چکرا کا آقا یا دیوتا ہے۔ البیرونی جلد اوّل صفحہ ۱۱۷ پر اس کی پوری تفصیل درج ہے۔
[2] بنظنہیا نندنہ البیرونی نے لکھا ہے کہ یہ اینٹوں کا ایک قلعہ ہے جو کشمیر کے پہاڑوں میں واقع ہے۔ (البیرونی ترجمہ انگریزی از سچاؤ صفحہ ۳۱۷)
[3] فرشتہ کے نزدیک لوہ کوٹ ہے۔
[4] فرشتہ نے قنوج کے فرمانروا کا نام بجائے کورہ کے کنور رائے لکھا ہے۔

امان مانگی۔ اس کے بعد سلطان محمود نے قلعہ برنہ[1] کا رُخ کیا جہاں کے حکمران ہردت نے جب یہ سُنا تو قلعہ اپنے عزیزوں کے سپرد کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ اہلِ قلعہ نے بھی جب یہ دیکھا کہ وہ مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتے تو ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور تیس ہاتھی بطورِ نذرانہ پیش کیے اور پناہ چاہی۔ یہاں سے دریائے جمنا کے کنارے کنارے قلعہ مہاون[2] پہنچا، جہاں کے حاکم کل چندر کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے ہاتھی سواروں کو حکم دیا کہ وہ اُسے دریا کے پار لے کر چلیں، اسی اثنا میں سلطان محمود کے لشکری بھی آ نمودار ہوئے۔ کل چندر نے یہ دیکھ کر اپنی ہی تلوار سے خودکشی کر لی، ع

رفت بدوزخ ہم از آں راہِ آب

زیستن چوں بکامِ خصم بود　　　مُردن از زیستن بسے بہتر

قلعۂ قنوج سر کرتے وقت ۸۵ ہاتھی اور بے شمار مالِ غنیمت غازیوں کے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمود شہر متھرا کی جانب بڑھا۔ یہ شہر کافروں کا معبد تھا اور کرشن بن باس دیو کی جائے پیدائش اور ہندو کرشن کو خدا مان کر پوجتے تھے۔ یہاں اتنے بُت خانے تھے کہ اگر اسے کُفر کی کان کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ اس شہر کو سلطان محمود نے بغیر جنگ و جدل پامال کیا اور بے شمار مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ یہاں سونے کا ایک بُت بھی تھا جسے سلطان محمود کے حکم سے توڑ ڈالا گیا۔ اس بُت کا وزن ۹۸۳۰۰ مثقال اصلی سونا تھا اور یاقوت کا ایک ٹکڑا بھی اس میں ایک جگہ پیوست تھا جس کا وزن ۴۵۰ مثقال تھا۔ ایک کوہ پیکر ہاتھی جو ہندوستان کے راجوں میں سے ایک راجہ گوبند چند کی ملکیت تھا۔ سلطان محمود نے اس کی شہرت سُن رکھی تھی اور اُس کے دل میں اُس کو خریدنے کی تمنا تھی مگر وہ کسی طرح پوری نہیں ہوتی تھی۔ اسے حُسنِ اتفاق کہئے کہ ایک روز وہی ہاتھی بغیر فیل بان خیمۂ شاہی میں آ داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر سلطان محمود کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، چنانچہ اُس نے اس کا نام اسی مناسبت سے خدا داد رکھا۔ اس یلغار کے بعد جب سلطان محمود غزنی پہنچا تو اس کے ساتھ ۲ کروڑ ۵۳ ہزار درم اور ساڑھے تین سو سے زیادہ ہاتھی مالِ غنیمت کے طور پر تھے۔

سنہ ۴۱۰ھ مطابق ۱۰۱۹ء میں سلطان پھر ہندوستان آیا اور کالنجر کے راجہ نندا کے ساتھ دریائے جمنا کے کنارے اس کا سخت مقابلہ ہوا۔ راجہ نندا کے پاس ۴۵۰۰۰ پیادہ فوج اور ۶۴۰ ہاتھی تھے۔ اس نے راجہ قنوج کو بھی اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اُس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی اور راجہ جے پال جو متعدد بار سلطان محمود سے ہزیمت کھا کر بھاگا تھا اس کی بھی مدد کی تھی مگر اتنے لاؤ لشکر کے باوجود وہ سلطان محمود کی ظفریاب فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور ڈر کے مارے اپنا جملہ ساز و سامان چھوڑ کر چند خاص مصاحبوں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ جب سلطانی عساکر شہر میں داخل ہوئے تو اُسے خالی پایا۔ فوج اور دیگر حفاظتی دستوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا چنانچہ اُسے خُوب لُوٹا۔ پھر اس کے بعد راجہ نندا کا تعاقب کرتے ہوئے جب سلطانی عساکر ایک جنگل میں پہنچے تو وہاں ۵۸۰ ہاتھی اس کے ہاتھ آئے۔ سلطان محمود یہ تمام مال و دولت لے کر غزنی پہنچا۔ ان معرکوں میں کفار کے اکثر شہر اہلِ اسلام کے قبضہ میں آئے اور ان شہروں کے باشندوں نے طوعاً و کرہاً اسلام قبول کیا۔

سنہ ۴۱۲ھ مطابق ۱۰۲۱ء میں سلطان محمود پھر کشمیر پر حملہ آور ہوا اور ایک ماہ تک اس نے قلعہ موہرکوٹ کا محاصرہ کیا مگر

---

[1] برنہ۔ یہی وہ مقام ہے جسے برن اور بعد میں بلند شہر کہا گیا۔

[2] مہاون، دوسرے نسخوں میں مہابن ہے۔

وہ اتنا مستحکم تھا کہ فتح نہ ہو سکا۔ سلطان محمود اسے چھوڑ کر جانب لاہور روانہ ہوا اور موسم بہار کے شروع ہوتے ہی غزنی لوٹ گیا۔

۴۱۳ھ مطابق ۱۰۲۲ء میں سلطان محمود نے پھر راجہ نندا کے علاقہ کا رُخ کیا اور جب قلعہ گوالیار پہنچا تو بغیر کسی رکاوٹ کے وہ فتح ہو گیا اور وہاں کے حاکم سے نذرانہ قبول کرنے کے بعد سلطان محمود نے پھر اُسی کو حاکم مقرر کر دیا۔ اس نذرانہ میں ۳۵ ہاتھی بھی شامل تھے۔ یہاں سے کالنجر پہنچا جہاں کے حکمران راجہ نندا نے تین سو ہاتھی کی پیش کش کی اور جان کی امان مانگی۔ علاوہ ازیں راجہ نندا نے ہندی زبان میں ایک قصیدہ سلطان محمود کی مدح میں کہہ کر بھیجا، جسے سلطان نے فصحائے ہند اور اپنے ملک کے شاعروں کو بھی سُنوایا۔ سب نے اسے بے حد پسند کیا اور سلطان محمود کو خود بھی اس پر بہت فخر و ناز تھا چنانچہ اس کے صلہ میں اس نے راجہ نندا کو پندرہ قلعوں کا حکمراں مقرر کر دیا۔ راجہ نندا نے بھی سلطان محمود کے حضور بے حساب زر و مال اور جواہر ہدیۃً بھیجے۔ اس مہم سے سلطان محمود کامران اور دل شاد غزنی واپس پہنچا۔

۴۱۴ھ مطابق ۱۰۲۳ء میں سلطان محمود نے اپنے عساکر قاہرہ کا اور ان لشکروں کا جو اطراف میں متعین تھے محاسبہ کیا۔ یہ سب ۵۴ ہزار سوار اور تیرہ سو ہاتھی احاطۂ تحریر میں آئے۔

۴۱۵ھ مطابق ۱۰۲۴ء میں سلطان محمود بلخ پہنچا۔ جب اُس نے دریائے جیحوں پار کیا تو ماوراءالنہر کے سردار اس کے استقبال کو آئے اور یوسف قدر خاں جو پورے ترکستان کا بادشاہ تھا وہ بھی آیا اور سلطان محمود کی ملاقات سے فیض یاب ہوا۔ ایک محفلِ جشن آراستہ کی گئی اور دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو تحفے اور نذرانے پیش کیے۔ علی تگین کے ہاتھوں ماوراءالنہر کے عوام سخت پریشان تھے۔ جب اُسے سلطان محمود کے آنے کی خبر ملی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا مگر تعاقب کر کے اُسے گرفتار کر لیا گیا اور ہندوستان کے ایک قلعہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان محمود واپس غزنی پہنچا اور موسم سرما وہیں گزارا۔

سلطان محمود نے ایک بار پھر سومنات کی جانب لشکر کشی کی۔ سومنات بحرِ ہند کے کنارے ایک بڑا شہر ہے جو برہمنوں کا معبد ہے۔ اُن کا معبود ایک بہت بڑا بُت ہے۔ اِس کے علاوہ بہت سے سونے کے بُت ہیں۔ اگرچہ بعض مورخوں نے اس بڑے بُت کا نام منات لکھا ہے اور اس کے بارے میں یہ خیال آرائی بھی کی ہے کہ یہ ویسا ہی بُت ہے جیسا کہ مشرکین عرب حضرت محمدؐ کے عہدِ رسالت میں ہندوستان کے ساحل پر لائے تھے۔ مگر یہ بات ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے اِس لیے کہ ہندوستان کے برہمنوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ یہ بُت کرشن کے وقت سے اسی جگہ موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے چار ہزار سال کے قریب ہو چکے ہیں اور اس کا نام بھی ہندی زبان میں سومبھا ناتھ[۲] یعنی خالقِ حسن ہے۔ اس غلطی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان دونوں ناموں میں کافی مشابہت ہے۔

اس مُہم میں سلطان محمود نے پہلے پٹن[۳] فتح کیا جو نہروالہ کے نام سے مشہور ہے اور گجرات میں واقع ہے۔ جہاں سے خاصا سامانِ رسد لے کر وہ سومنات پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی اہلِ قلعہ نے دروازہ بند کر لیا جس کی پاداش میں قلعہ مفتوح ہونے پر ان کو سخت خمیازہ برداشت کرنا پڑا۔ اس بڑے بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غزنی بھیجے گئے جہاں اُنھیں جامع مسجد کے دروازہ پر رکھ دیا گیا اور لوگ آتے جاتے اُسے

ھ۱ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں بجائے ۴۱۳ھ کے ۴۱۶ھ لکھا ہے۔ (آئینِ اکبری حصہ اوّل صفحہ ۴۲۳)

ھ۲ البیرونی لکھتا ہے کہ سومناتھ کا بُت مہادیو کا لنگ تھا جسے چاند کا کوڑھ پن دور کرنے کے لیے نصب کیا گیا تھا۔ اس کے نزدیک لفظ سومناتھ کے معنی چاند کا دیوتا ہے۔ (البیرونی حصہ اوّل صفحہ ۱۷۹)

ھ۳ پٹن، رادھن پور سے بیس میل اور گجرات سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

پامال کرنے لگے۔ واپسی کے وقت بیرم دیو سلطان محمود کی راہ میں حائل ہوا۔ اس کا شمار ہندوستان کے بڑے راجوں میں ہوتا تھا مگر سلطان محمود نے مصلحتاً اس سے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا، اور راستہ کاٹ کر سندھ کی جانب نکل گیا اور ملتان پہنچا۔ یہاں خوراک اور پانی کی قلت کے باعث فوج کو بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ اس لیے قیام کیے بغیر وہ واپس غزنی چلا گیا۔

۴۱۷ھ میں خلیفہ القادر باللہ نے نامۂ نیابت کے ساتھ حکومتِ خراسان، ہندوستان، نیمروز اور خوارزم کا عَلَم بھی سلطان محمود کو بھیجا اور اس کے بھائیوں اور فرزندوں کو مختلف خطابات سے نوازا۔ سلطان محمود کو کہف الدولہ والاسلام، اُس کے فرزندِ اکبر امیر مسعود کو شہاب الدولہ وجمال الملتہ اور برادر خورد امیر محمد کو جلال الدولہ اور امیر یوسف کو عضد الدولہ وغیرہ کے خطابات دیے۔

اسی سال نواحِ ملتان کے جاٹوں نے سر اُٹھایا تو اُن کی سرکوبی کے لیے سلطان محمود نے ملتان پر چڑھائی کی۔ جاٹوں کے پاس چار ہزار کشتیاں تھیں اور بعضوں کے نزدیک ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ ان کشتیوں میں جاٹوں کے جملہ اہل و عیال بھی تھے۔ عین دریا میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جاٹوں کی بہت سی کشتیاں غرقاب ہوگئیں۔ جو بچ گئیں اُن کے اکثر لوگ تلوار کا لقمہ بنے۔ جاٹوں کے اہل و عیال گرفتار ہوئے۔ اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو سلطان محمود کی کشتیوں کی تعداد متقابلتہً زیادہ تھی دوسرے اس نے لڑائی بڑی حکمتِ عملی سے لڑی۔ اس لڑائی سے سلطان محمود مظفر و منصور غزنی لوٹا۔

۴۱۸ھ میں وہ بادرد کی جانب روانہ ہوا اور اس شہر کے ترکوں کا قلع قمع کرنے کے بعد رَے پہنچا اور اُس علاقہ کے اُن خزانوں اور دفینوں پر قبضہ کیا جو ایک مدت سے موجود تھے اور جھوٹے مذاہب کے معتقدین اور قرامطہ کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکا۔ اس کے بعد وہ اصفہان اپنے فرزندِ اکبر امیر مسعود کے سپرد کر کے غزنی واپس چلا گیا جہاں اُس نے ابھی زیادہ دن قیام نہیں کیا تھا کہ مرضِ دق میں مبتلا ہوگیا، روز بروز کمزور ہوتا گیا تاہم اپنے آپ کو تندرست اور طاقتور ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔ بحالتِ مرض وہ بلخ بھی گیا اور موسمِ بہار میں وہ وہاں سے واپس آیا مگر اس مرتبہ اُس کا پیمانۂ عمر لبریز ہوچکا تھا اور آخر کار بروز منگل ۲۳ ربیع الاوّل ۴۲۱ھ وفات پائی اور غزنی میں دفن ہوا۔ اس کی عمر ۶۰ سال تھی، ۳۱ سال حکومت کی۔ کہتے ہیں کہ جب سلطان محمود نزع کی حالت میں تھا تو اُس نے حکم دیا کہ تمام خزانے، مال و دولت اور تحائف و نوادر اس کے سامنے لائے جائیں چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور اُس نے جملہ املاک کی طرف بار بار حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور آہیں بھرتا رہا مگر ایک چھدام بھی کسی کو دینے کے لیے نہ کہا۔ سلطان محمود نے بارہ مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی اور ہر مرتبہ وہ بے پناہ جذبۂ جہاد کے ساتھ سرگرمِ عمل تھا انا عبابۂ عند ربہ اور فردوسی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا مشہور خاص و عام ہے، چنانچہ عارف جامی لکھتا ہے ؎

خوش است قدر شناسی کہ چوں خمیدہ سپہر | سہامِ حادثہ را کرد عاقبت قوسی
گذشت شوکتِ محمود و در زمانہ نہ ماند | جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدرِ فردوسی

اور تذکرۂ محمد عوفی میں بھی یہ قطعہ سلطان محمود سے منسوب ہے ؎

ز بیمِ تیغ جہاں گیر و گرزِ قلعہ کشائے | جہاں مسخّرِ من شد چو من مسخّرِ رائے
گہے بقدّر و بدولت ہمی نشستم شاد | گہے بحرص ہمی رفتمے ز جائے بجائے
گہے تفاخرے کردم کہ من کسے ہستم | کنوں برابرے بینم ہمی امیر و گدائے

-ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست ۔ بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نداشت ۔ بقا بقائے خدا است ملک ملکِ خدائے

سلطان محمد بن سلطان محمود غزنوی

لقب جلال الدولہ۔ مذکورہ سن ۴۲۱ھ میں اپنے باپ کی وصیت کے مطابق اور اسی کے ایک رشتہ دار ابن ارسلان کے استصواب رائے سے غزنی میں تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ ابھی ڈیڑھ ماہ گزرا تھا کہ امیر ایاز نے بعض دوسرے ملازمین کے ساتھ مل کر سازش کی اور وہ سب کے سب شاہی اصطبل کے گھوڑوں پر سوار ہو کر شہاب الدین مسعود کے پاس ملازمت کی غرض سے روانہ ہو گئے۔ شہاب الدین مسعود اصفہان میں تھا جہاں پہنچنے کے لیے اُنھوں نے نیرط کا راستہ اختیار کیا۔ امیر محمد نے سوندھی رائے ایک ہندو کو لشکرِ بسیار کے ساتھ اُن کے تعاقب میں بھیجا، مگر امیر ایاز جنگ میں اُس پر غالب آیا۔ اُس نے سوندھی رائے کو ہندوؤں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ قتل کر دیا۔ اُن کے سر کاٹ کر امیر محمد کے پاس بھیج دیے اور خود نیشاپور میں امیر مسعود کے ساتھ جا ملا۔ چار ماہ بعد امیر محمد نے اپنے خیموں کو بسط کی جانب منتقل کر دیا اور پوری جمعیت کے ساتھ اپنے بھائی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نکلا۔ جب تگین آباد پہنچا تو تمام اُمراء اس سے برگشتہ ہو گئے اور اسے اندھا کر کے ججرستان کے علاقہ کے قلعہ بج میں ڈال دیا۔ اس کے بعد تمام فوجوں اور خزانوں کے ساتھ وہ ہرات میں امیر مسعود کے ساتھ جا ملے۔ اندھے سلطان محمد نے صرف پانچ ماہ حکومت کی مگر بقول قاضی بیضاوی ۱۴ سال جس میں سے نو سال اس نے قید میں گزارے۔ واللہ اعلم

صاحبِ لُبّ التواریخ لکھتا ہے کہ محمد ابن محمود نے پہلے پہل اپنے باپ کی زندگی میں چار سال بادشاہی کی تھی اس کے بعد نو سال وہ قید میں رہا اور اپنے بھائی مسعود کے قتل کے بعد اس نے ایک سال اور حکومت کی۔ اس کے بعد انتقال کیا ؎

امیرے را کہ بر قدش ہزاراں پاسباں بینی ۔ کنوں بر قبۂ گورش کلاغاں پاسباں بینی
سر اسپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں ۔ بمرد آقا بخاک اندر تنِ اسپ ارسلاں بینی

شہاب الدولہ سلطان مسعود بن محمود غزنوی

سلطان محمود کے امیروں اور وزیروں کی متفقہ رائے سے وہ تخت نشین ہوا اور ہرات سے بلخ جا کر اس نے موسم سرما گزارا۔ احمد ابن حسن میمندی کو سلطان محمود نے قلعہ کالنجر میں قید کر رکھا تھا، اُسے بُلا کر اپنا وزیر بنایا۔ پھر بلخ سے غزنی واپس آیا اور وہاں سے اصفہان اور رَے کی جانب کوچ کا حکم دیا۔ جب ہرات پہنچا تو ترکمانوں سے مقابلہ ہو گیا، اُن سے شکست کھائی اور غزنی واپس چلا گیا۔ اس کی کمزوری کے باعث ترکمان روز بروز دلیر ہوتے گئے، اُن کے حوصلے حد سے زیادہ بڑھ گئے جس کا ثبوت آئندہ کے واقعات سے ملے گا۔

سنہ ۴۲۳ھ میں احمد بن حسن میمندی کا انتقال ہو گیا اور سنہ ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود ہندوستان کی تسخیر کے عزم سے براستہ قلعہ سرستی روانہ ہوا۔ یہ قلعہ کشمیر میں واقع ہے۔ سب سے پہلے اُس نے اِس کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا جسے لیکر

وہ غزنی لوٹ گیا۔ ۴۲۵ھ میں سلطان مسعود نے آمل[1] اور ساری[2] کو تسخیر کیا اور کالنجر اور طبرستان تک اپنے قاصد بھیجے تاکہ ہر جگہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور اسی کا سکہ رواں ہو۔ تغدی بیگ اور حسین ابن علی ابن میکال کو ایک لشکر عظیم کے ساتھ نیشاپور سے بھیجا تاکہ وہ ترکمانوں کی سرکوبی کریں۔ فریقین میں سخت جنگ ہوئی۔ حسین قید ہو گیا اور تغدی بیگ بھاگ کر سلطان مسعود کے پاس پہنچ گیا۔

امیر احمد نہال تگین[3] خازن سلطان محمود کو کسی قصور میں سزائے جرمانہ دی گئی تھی، اُسے بلا کر ہندوستان بھیجا مگر یہاں آکر اُس نے عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان مسعود نے ایک ہندو جرنیل ناہر[4] کو اُس کے مقابلہ کے لیے نامزد کیا۔ امیر احمد مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدانِ جنگ سے بھاگ کر منصورہ[5] سندھ پہنچا اور غرقاب ہو گیا۔ اُس کا سر کاٹ کر غزنی بھیج دیا گیا۔

۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۶ء میں ایک نیا محل تعمیر ہوا جس میں جواہرات سے مرصع تخت نصب کیا گیا تھا، اُس پر ایک مرصع تاج بھی آویزاں تھا۔ سلطان مسعود اس تخت پر جلوہ افروز ہوا، سر پر وہی تاج پہنا اور رعایا کو باریابی بخشی۔ اسی سال اُس نے اپنے فرزند امیر مودود کو طبل و عَلَم کے اعزاز کے ساتھ بلخ بھیجا اور خود ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ سب سے پہلے قلعہ ہانسی[6] فتح کیا پھر قلعہ سون پت[7] پہنچا جہاں کا حاکم دیپال بھاگ کر جنگل میں جا چھپا اور قلعہ بغیر کسی دقت کے فتح ہو گیا۔ یہاں سے کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور دیپال کی فوج کی ایک بڑی تعداد مسعودی عساکر کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ پھر سلطان مسعود آگے بڑھا تو وادیٔ رام میں داخل ہوا، جہاں کے حاکم رام نے بہت سا زر و مال نذرانہ کے طور پر بھیجا، ساتھ ہی ایک عرضداشت کے ذریعہ اپنی غیر حاضری کی معذرت بھی کی۔ امیر مسعود نے اس کی معذرت قبول کر لی۔ اس کے بعد اس نے اپنے فرزند امیر مجدود کو طبل و عَلَم کے اعزاز کے ساتھ لاہور بھیجا اور خود غزنی کی طرف مراجعت کی۔

۴۲۸ھ مطابق ۱۰۳۷ء میں سلطان مسعود اس ارادہ سے بلخ روانہ ہوا کہ ترکمانوں کو قرار واقعی سزا دے۔ جب ترکمانوں نے اس کی آمد کی خبر سنی تو وہ بلخ چھوڑ کر اس کے اطراف و نواح میں پناہ گزین ہو گئے اور سلطان مسعود دریائے جیحوں سے گزر کر تمام ماوراء النہر پر مسلط ہو گیا۔ داؤد ترکمان جس نے تغدی بیگ اور امیر حسین کو قبل ازیں شکست دی تھی پوری جمعیت کے ساتھ جانب بلخ روانہ ہوا۔ اس دوران میں سلطان مسعود بھی وہاں پہنچ گیا۔ داؤد ترکمان ابھی مرو میں تھا کہ یہ اطلاع آئی کہ تغدی بیگ نے گورگان کے نواح میں ظلم و ستم برپا کر رکھا ہے۔ سلطان مسعود نے جب یہ دیکھا تو حکم دیا کہ اُسے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے۔ سلطان مسعود نے اس قبیلہ کے

---

[1] آمل۔ طبرستان کا پایۂ تخت اور طبرستان علامہ طبری کا مولد ہے۔

[2] ساری یعنی سرایہ۔ یہ بھی طبرستان کا ایک قصبہ ہے مگر لُباب کی رائے میں یہ ماژندران میں واقع ہے۔

[3] امیر احمد نہال تگین۔ تاریخ سبکتگین میں اسے سلطان محمود کا خانہ زاد بیٹا لکھا ہے۔

[4] جرنیل ناہر کے بجائے بیہقی تلک لکھتا ہے اور فرشتہ امرائے ہند میں سے ناتھو کا نام بتاتا ہے۔

[5] المنصورہ سندھ میں واقع ہے جو پہلے بھمنوا کا شہر تھا۔ محمد بن قاسم نے اسے فتح کر کے اس کا یہ نام رکھا۔

(آئین اکبری از ابوالفضل)

[6] ہانسی۔ شہر حصار کے مشرق کی جانب ۱۱ میل کے فاصلہ پر ہے۔

[7] سون پت۔ جسے اب سونی پت کہتے ہیں۔ دہلی کے شمال کی جانب ہے۔

سردار بیغو ترکمان سے بھی اس امر کا عہد لیا کہ آئندہ وہ کسی قسم کی ناشائستہ حرکات کا مرتکب نہیں ہوگا اور اس کے لیے مناسب حدود مقرر کر کے سلطان مسعود ہرات چلا گیا۔ راستہ میں ترکمانوں کی ایک جماعت اُس پر حملہ آور ہوئی، اس نے سلطان مسعود کے ہمراہیوں میں سے چند ایک کو قتل کیا اور سامان لوٹ لیا۔ سلطان مسعود نے اس کا بدلہ لینے کے لیے جن لشکریوں کو نامزد کیا اُنھوں نے ترکمانوں کی اس جماعت کو تہ تیغ کر دیا اور اُن کے اہل و عیال کو مقتولین کے کٹے ہوئے سروں کے ساتھ سلطان مسعود کے حضور پیش کیا۔ سلطان نے اُن سروں کو گدھے پر لدوا کر بیغو ترکمان کے پاس بھیجا اور بیغو نے معذرت خواہی کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ وہی بیغو ہے جس کی مدح میں ایران کے ایک شاعر غیبائی[1] نے قصیدے لکھے تھے، جن میں سے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں ؎

کارِ اُو فتادہ بے تو مرا با گریستن — عیب است عیب در غم تو نا گریستن
شب تا بروزگارِ من و روز تا بشب — نالیدن است و از غم تو با گریستن
گفتی ز عشق من نگری و بر حقی — فرقے است از فشاندن خون نا گریستن
مارا بدولتِ غم عشقِ تو ہر زماں — صد گونہ محنت است نہ تنہا گریستن
نے حیلۂ ز مہر تو الّا گدا ختن — نے چارۂ ز دردِ تو الّا گریستن
از روزگار وعدہ مرا در فراقِ تو — امروز غصہ خوردن و فردا گریستن
از عہدِ تست فتنہ دگرنہ چہ لائق است — از من بعہدِ خسرو دنیا گریستن
بیغو ملک شد آنکہ پدید آورد ز تیغ — از پُر دلاں بموقفِ ہیجا گریستن
خسروِ نظام دیں کہ بوقت نبیرہ اُو — آمد ز خاک رستم و دارا گریستن

ترکمانوں کی سرکوبی کے بعد سلطان مسعود ہرات سے نیشاپور اور پھر طوس پہنچا۔ ترکمانوں کی ایک جماعت راستہ میں اس کے ساتھ جنگ آزما ہوئی مگر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بادرد کے باشندے اپنا شہر ترکمانوں کے حوالے کر چکے تھے، سلطان مسعود نے اس کے قلعہ پر قبضہ کر کے سب کو مروا ڈالا اور اس کے بعد موسم سرما نیشاپور میں گزارا۔

سنہ ۴۳۰ھ میں ترکمان طغرل کا سر کچلنے کے لیے سلطان مسعود روانہ ہوا۔ اس نے بادرد میں عَلَم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ جب طغرل بھاگ گیا تو سلطان مسعود وہاں سے لوٹ کر مہنہ[2] کے راستہ سرخس[3] پہنچا۔ اس نے مہنہ کے قلعہ کو زمین دوز کر دینے کا حکم دیا اور وہاں کی رعایا میں سے بعضوں کو مروا ڈالا اور اکثروں کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے۔ وہاں سے وہ زیرقان[4] کی طرف بڑھا یہاں ترکمانوں نے ایک لشکر عظیم کے ساتھ سلطان مسعود کا مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں غزنی کے اکثر سپہ سالار برگشتہ ہو کر دشمن سے جا ملے اور سلطان تن تنہا میدان میں رہ گیا اور آخر کار بہزار جد و جہد اس معرکہ سے صحیح و سلامت نکل آیا۔ یہ واقعہ ۴۳۱ھ میں پیش

---

[1] غیبائی۔ ضیاء الدین خجندی الفارسی شیراز کا باشندہ تھا۔ جوانی ہی میں اس نے خجند میں سکونت اختیار کر لی تھی وہ سلطان کا مداح تھا۔

[2] مہنہ فارسی میں میہنہ ہے جو ضلع خاوراں کا ایک قصبہ ہے

[3] سرخس۔ اس شہر کو کیکاؤس نے آباد کیا تھا۔

[4] زیرقان۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام غلطی سے لکھا گیا ہے اصل میں زندخاں ہے جو سرخس سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔

آیا تھا۔ اس کے بعد سلطان مسعود مرو پہنچا۔ اس کے اطراف کے کچھ لشکری اس کے اردگرد جمع ہوگئے اور وہ غور کے راستہ غزنی پہنچا۔ جو سردار بغیر جنگ کیے میدان سے بھاگ نکلے تھے اُن کو سزائیں دیں اور بعضوں کو مثلاً علی دایہ، حاجب بزرگ اور بیگ تغدی وغیرہ کو ہندوستان بھیج کر قلعوں میں بند کردیا اور وہ سب قید میں مرگئے۔

ترکمانوں کی سرکوبی کے لئے سلطان مسعود نے طے کیا کہ پہلے وہ ہندوستان جاکر اپنی طاقت میں اضافہ کرے۔ یہاں سے لشکرِ عظیم لے کر واپس آئے اور ترکمانوں پر چڑھائی کرکے اُنھیں قرار واقعی سزا دے، چنانچہ اس نے امارتِ بلخ امیر مودود کے سپرد کی اور خواجہ محمد بن عبداللہ کو اس کا وزیر مقرر کیا۔ اس کے بعد اپنے بیٹے امیر مجدود کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ ملتان روانہ کیا۔ اپنے دوسرے بیٹے امیر ایزدیار کو غزنی کے پہاڑوں کے دامن میں متعین کردیا تاکہ دوسرے ضلع کے افغانوں کی روک تھام کرے جنھوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اس انتظام کے بعد وہ اپنے باپ سلطان محمود کے اُن خزانوں کو اونٹوں پر لاد کر ہندوستان روانہ ہوگیا جو غزنی اور اس کے نواح کے قلعوں میں محفوظ تھے اور راستہ ہی میں اپنے اندھے بھائی امیر محمد کو لانے کے لیے کسی کو اُس کے پاس بھیجا۔ وہ قلعہ بزغند[1] میں مقید تھا۔ سلطان مسعود ابھی ماریکلہ[2] کے سرحدی قلعہ تک پہنچا تھا کہ اس کے اپنے ہی ملازموں اور غلاموں نے وہ تمام مال و دولت لوٹ لیا جو اس کے ہمراہ تھا۔ اس اثناء میں امیر محمد بھی پہنچ گیا چنانچہ سلطان مسعود کے مظالم کا خاتمہ کرنے کے لیے وہ امیر محمد کے پاس گئے اور اس کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد علم بغاوت بلند کرکے وہ سلطان مسعود پر حملہ آور ہوئے۔ بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر اس نے قلعہ میں پناہ لے رکھی تھی۔ دوسرے دن تمام فوج اُٹھ کھڑی ہوئی اور سلطان مسعود کو قلعہ سے باہر نکال کر لے آئی اور قیدی بناکر اسے قلعہ گیری میں بند کردیا یہاں تک کہ ماہ جمادی الاول ۴۳۲ھ میں ایک جھوٹا حکم امیر محمد کے نام سے اس قلعہ کے کوتوال کے پاس پہنچا کہ وہ سلطان مسعود کا سر کاٹ کر بھیج دے۔ کوتوال نے اس کی تعمیل کی اور سلطان مسعود کا سر کاٹ کر بھجوا دیا۔ قطعہ

ز حادثات زمانم ہمیں پسند آمد — کہ خوب و زشت و بد و نیک در گذر دارم
کسے کہ تاج مرصع بسر نہاد صباح — نمازِ شام درا خشت زیر سر دارم

یہ تفصیل کتاب نظامی کے بموجب ہے مگر قاضی بیضاوی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور اس کے نزدیک سلطان مسعود ۴۳۲ھ میں سلجوقیوں سے شکست کھا کر ابھی غزنی پہنچا تھا کہ امیر محمد نے اسے گرفتار کرلیا جو اس کی غیر حاضری میں اپنی پوزیشن کافی سے زیادہ مضبوط کرچکا تھا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اُسے قلعہ میں بند کردیا تھا جہاں امیر محمد کے بیٹے نے جاکر اُسے قتل کردیا۔

سلطان مسعود کی حکومت گیارہ سال رہی، مگر یہ امر قابلِ غور ہے کہ قاضی بیضاوی نے اس کی وفات کا سال ۴۳۳ھ لکھا ہے۔ اُن تمام شاعروں میں سے جنھوں نے سلطان مسعود کے عہدِ حکومت میں نشوونما پائی ایک شاعر منوچہری بھی تھا جس نے اس کے وزیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہمی نازد بعدلش شاہِ مسعود
چو پیغمبر بہ نوشیروانِ عادل

---

[1] بزغند۔ برغند

[2] ماریکلہ۔ فرشتہ اسے مرگلہ لکھتا ہے بعضوں کے نزدیک یہ قصبہ دریائے جہلم کے کنارے تھا ایک انگریز مصنف راورٹی اپنے ایک نوٹ میں اسے ایک دشوار گذار درہ بتایا ہے جو راولپنڈی اور اٹک کے درمیان تھا۔

سلطان مودود بن مسعود بن محمود غزنوی

بامیان میں اپنے باپ کے قتل کے بعد سلطان مودود وزیروں اور امیروں کی متفقہ رائے سے تخت نشین ہوا باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے اس نے ماریکلہ کی جانب کوچ کا ارادہ کیا مگر ابونصر احمد بن محمد بن عبدالصمد نے اُسے اس سے باز رکھا اور غزنی لے گیا۔ یہاں سے ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ سلطان مودود اپنے اندھے چچا امیر محمد پر چڑھائی کرنے کے لیے نکلا۔ وہ ابھی دنیپور کے قریب تھا کہ امیر محمد کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ ہو گئی، جس نے آخر خونریز جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی، رات ہونے پر فریقین اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔ دوسرے دن جب جنگ شروع ہوئی تو سلطان مودود نے امیر محمد کے ایک معتبر جرنیل کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ امیر محمد اور اس کا لڑکا احمد دونوں گرفتار ہو گئے اور اُنھیں قتل کر دیا گیا۔ سلطان مودود نے اس مقام پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام فتح آباد رکھا۔ یہ فتح اسے ماہ شعبان ۴۳۲ھ میں ہوئی تھی اور ایک دوسرے قول کے مطابق ۴۳۳ھ ہے۔

چونکہ سلطان مودود خواجہ احمد بن عبدالصمد سے ناراض تھا اس لیے اس نے اسے غزنی میں قید کر دیا جہاں آخر کار وہ مر گیا۔ اسی سال اس نے ابونصر محمد بن احمد کو ہندوستان بھیجا تاکہ نامی ابن محمد کے ساتھ جنگ کرے۔ نامی اس جنگ میں مارا گیا۔

۴۳۴ھ میں سلطان مودود کے حکم سے ارتگین کو ایک جمعیت کے ساتھ طبرستان کی جانب روانہ کیا گیا تاکہ وہ داؤد ترکمان کے ساتھ جنگ کرے۔ اس جنگ میں اس کے بہت سے آدمی کام آئے۔ ارتگین پھر بلخ کی طرف بڑھا اور وہاں اس نے سلطان مودود کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اسی کے نام کا سکہ بھی جاری کرایا۔ ارتگین کو وہاں زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ترکمانوں نے پوری طاقت کے ساتھ اس پر چڑھائی کر دی۔ وہ اُن کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکا اس لیے واپس غزنی چلا آیا۔ ۴۳۵ھ میں سلطان مودود نے غزنی کے کوتوال ابوعلی کو قید کر دیا مگر چند روز کے بعد پھر اس کی رہائی کا حکم بھی جاری ہو گیا اور کوتوال غزنی کے علاوہ اسے دیوان مملکت بھی بنا دیا گیا اور اس کے بجائے یسوری بن ایمنور دیوانی کو قید خانہ میں ڈال دیا جو وہیں مر گیا۔ سلطان مودود نے ارتگین کو بھی بغیر سزا دیے نہ چھوڑا۔

۴۳۶ھ میں جب خواجہ طاہر نے جسے خواجہ احمد کے بعد وزیر مقرر کیا گیا تھا انتقال کیا تو خواجہ امام ابوالفتح عبدالرزاق کو اس کی جگہ وزیر مقرر کیا گیا۔ اسی سال طغرل حاجب کو بسط کی جانب بھیجا جو زنگی ابومنصور برادر ابوالفضل کو گرفتار کر کے غزنی لایا۔ پھر سیستان چلا گیا۔ رباط امیر کے مقام پر ترکمانوں کے ساتھ اس کی خونریز جنگ ہوئی۔ طغرل حاجب اس جنگ میں فتح یاب ہوا۔ اس کے بعد وہ گرم سیر پہنچا اور اس علاقہ کے ترکمانوں کو جنھیں سرخ کلاہ[1] کہا جاتا تھا تیغ کے گھاٹ اتارا اور اُن کی کافی تعداد کو گرفتار کر کے غزنی لے آیا۔ سلطان مودود نے طغرل حاجب کو ۴۳۸ھ میں تکیناباد بھیجا جہاں پہنچ کر اس نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ جب سلطان مودود کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے علی بن ربیع کو اس کی سرکوبی کے لیے نامزد کیا۔ طغرل حاجب ڈر کے مارے اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ بھاگ گیا۔ علی بن ربیع نے اس کی فوج کو غارت کیا اور کچھ سپاہیوں کو گرفتار کر کے غزنی بھیج دیا۔

۴۳۹ھ میں امیر قصدار نے بغاوت کی، اور جب اس نے حاجب بزرگ بارتگین کے ہاتھ سے شکست کھائی تو اطاعت قبول کر لی۔

۴۴۰ھ میں سلطان مودود نے اپنے فرزندان ابوالقاسم محمود اور منصور کو بیک وقت خلعت اعزاز اور طبل و علم عطا کیا۔ ان میں سے

---

[1] سرخ کلاہ یعنی قزلباش۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ ترکی میں قزل کے معنی سرخ اور باش کے معنی سر ہے۔

ایک کو ہندوستان بھیجا اور دوسرے کو پُرشور[1]۔ علاوہ ازیں ابوعلی حسن کوتوال غزنی کو بھی ہندوستان روانہ کیا تاکہ وہ جاکر سرکشوں کو قرار واقعی سزادے اور جب وہ خدمات شائستہ بجالانے کے بعد غزنی واپس ہوا تو اسے میرک بن حسن کے سپرد کردیا گیا جس نے اسے قید کردیا اور قید خانہ ہی میں مروا ڈالا۔ چونکہ میرک بن وکیل نے ابوعلی حسن کو سلطان کے حکم کے بغیر مروا ڈالا تھا اور وہ اسے پردہ اخفا میں رکھنا چاہتا تھا اس لیے اُس نے سلطان مودود کو کابل جانے پر اُکسایا۔ مگر جب سلطان مودود قلعہ سیالکوٹ پہنچا اور دردِ قولنج میں مبتلا ہونے کے باعث اسے واپس جانا پڑا تو غزنی پہنچتے ہی اس نے میرک کو حکم دیا کہ ابوعلی کوتوال کو فوراً رہا کردیا جائے مگر میرک نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔ اسی اثناء میں ۲۴ رجب ۴۴۱ھ کو سلطان مودود نے اس دنیا سے رختِ سفر باندھ لیا۔ اس کی مدت حکومت ۹ سال تھی لب التواریخ میں لکھا ہے کہ سلطان مودود نے چغر بیگ کی دختر کے ساتھ شادی کی تھی اور اس سے ایک لڑکا بھی تولد ہوا تھا جس کا نام مسعود رکھا گیا۔ اس نے سات سال حکومت کی۔ ماہ رجب ۴۴۱ھ میں سلطان مودود چغر بیگ سے ملاقات کے لیے خراسان سے روانہ ہوا، مگر راستہ ہی میں دردِ قولنج سے انتقال کرگیا۔

سلطان مسعود بن مودود بن مسعود بن محمود غزنوی

مسعود بن مودود صرف تین سال کا بچہ تھا مگر علی بن ربیع نے اپنی حکمت عملی سے اسے تخت پر بٹھا دیا، مگر یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ اس کی حکومت کے قیام کو صرف پانچ ماہ ہوئے تھے کہ لوگوں نے اس کے چچا علی کو بادشاہ تسلیم کرلیا۔

سلطان علی ابن مسعود ابن محمود غزنوی

اُمراء کی متفقہ رائے سے وہ تخت نشین ہوا، مگر جب عبدالرزاق بن احمد میمندی سیستان سے بُسط اور اسفزار[2] کے درمیانی قلعہ تک پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ سلطان مودود کے حکم سے اس قلعہ میں عبدالرشید ابن محمود مقید ہے تو وہ اسے قید خانہ سے نکال لایا اور تختِ سلطنت پر بٹھا دیا۔ علی کی حکومت کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ یہ واقعہ ۴۴۳ھ مطابق ۱۰۵۲ء کا ہے۔

سلطان عبدالرشید ابن محمود غزنوی

سلطان عبدالرشید نے تخت پر رونق افروز ہوتے ہی عبدالرزاق کے مشورہ سے غزنی کا رُخ کیا۔ علی ابن مسعود بغیر جنگ کیے بھاگ گیا اور طغرل حاجب جو سلطان محمود کا خانہ زاد غلام تھا سیستان فتح کرنے کے بعد غزنی کی جانب بڑھا۔ سلطان عبدالرشید نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ۴۴۵ھ میں طغرل حاجب نے موقعہ پاکر اسے اور اس کے ساتھ سلطان محمود کے تمام وارثوں کو قتل کرڈالا۔ سلطان محمود کی دختر کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف شادی کرلی۔ ایک روز جب کہ وہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، دلیر پہلوانوں کی ایک ٹولی کی رگِ حمیت وغیرت بھڑک اُٹھی اور اُنھوں نے جوش میں آکر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔ سلطان عبدالرشید کا عہدِ حکومت صرف

---

[1] پُرشور۔ پشاور جس کا اصلی نام پرشوارہ تھا۔
[2] فرشتہ کے نزدیک اسفرائین ہے جو نیشاپور کے نواح میں ہے۔

چار سال رہا، مگر نظام التواریخ کے نزدیک سات سال اور لب التواریخ میں لکھا ہے کہ اس کا انتقال ۴۴۵ھ میں ہوا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سلطان فرخ زاد بن مسعود بن محمود غزنوی

سلطان فرخ قید خانے سے رہائی کے بعد امراء کی رائے سے تخت نشین ہوا۔ جب سلجوقیوں کی ایک جماعت نے غزنی پر چڑھائی کی تو اس نے اُن کی ایک کثیر تعداد کو قتل کرا دیا اور آخر اُن پر غلبہ پا لیا۔ جو سلجوقی گرفتار ہوئے اُنھیں غزنی بھجوا دیا۔ الپ ارسلان سلجوقی بادشاہ عراق اور خراسان سے فوج کشی کر کے غزنی پر چڑھ آیا۔ جب وہ جنگ میں فتح مند ہوا تو غزنی کے بہت سے سرداروں کو قید کر کے اس نے خراسان بھیج دیا، مگر جب دونوں میں مصالحت ہو گئی تو فریقین نے ایک دوسرے کے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا اور وہ اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے۔ چونکہ زابلستان ویران اور خراب ہو گیا تھا اس لیے سلطان فرخ زاد نے اس کا تاوان معاف کر دیا اور وہاں کے عوام کے ساتھ بطریق احسن پیش آیا۔ وہ تین ماہ تک مسلسل روزے رکھتا اور رات کا زیادہ وقت نماز اور عبادت میں گزارتا۔ آخر وہ بھی درد قولنج میں مبتلا ہوا، اور ۴۵۰ھ[1] میں انتقال کر گیا۔ اس کی مدت حکومت چھ سال تھی۔

سید السلاطین ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی

وہ ایک عادل، زاہد اور متقی بادشاہ تھا۔ ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا کرتا۔ اس نے اپنے لیے کوئی محل سرا تعمیر نہیں کرایا تھا، سوائے ایک مسجد اور مدرسہ کے اور وہ بھی خدا کے لیے تھا۔ جب اُمورِ سلطنت کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر پڑی تو اس نے سب سے پہلے سلجوقیوں کے ساتھ مصالحت کی اور پھر پوری دل جمعی اور اطمینان کے ساتھ ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں بہت سے قلعوں اور علاقوں کو فتح کیا۔ اُن میں سے ایک شہر ایسا بھی تھا جہاں اُن خراسانیوں کی نسل آباد تھی جنھیں افراسیاب نے شہر خراسان سے شہر بدر کیا تھا، اُنھوں نے ہندوستان آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔ سلطان ابراہیم نے اس شہر کے ہزاروں خراسانی النسل باشندوں کو گرفتار کر کے غزنی بھجوا دیا اور علیٰ ہٰذا القیاس بے شمار مال غنیمت بھی وہ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس نے اپنے دورانِ قیام میں چند قصبوں کی بنا بھی ڈالی۔ اُن میں سے خیر آباد اور امین آباد وغیرہ بھی ہیں۔ اُسے سید السلاطین بھی کہا جاتا ہے اور اسے ولی اللہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں غزنی کے لوگوں کو داروئے چشم، شربت اور دیگر دوائیں اور غذائیں غرض تمام اشیاء خزانۂ شاہی سے مفت ملا کرتی تھیں۔ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد اس نے ۴۹۲ھ میں وفات پائی۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا دورِ حکومت ۴۵۰ھ سے ۴۹۲ھ تک تھا۔ مسعود سعد سلمان سلطان ابراہیم کے زمانہ ہی کا شاعر تھا، ذیل کے اشعار اسی کے ایک قصیدہ کے ہیں جو اُس نے سلطان کی مدح میں لکھے تھے ؎

---

[1] فرشتہ لکھتا ہے کہ اس کی جان لینے کے لیے حمام میں اس پر حملہ کیا گیا تھا۔

ابوالقاسم ملک محمود ابراہیم بن مسعود — کہ ناز و چار چیز از وے کند ہر یک بدو مفتخر
یکے افروختہ چترے دوم افراختہ رایت — سوم دینار گوں کلکے چہارم آب گوں خنجر

ولہٗ

اے عزم سفر کردہ و بستہ کمر فتح — بکشاد چپ و راست فلک بر تو درِ فتح
مسعود جہانگیر کہ از دہر سعادت — ہر لحظہ بسوئے تو فرستاد نفر فتح
مانند سناں سر بسوئے رزم نہادی — چوں تیر میاں تو بہ بیند و کمر فتح
صد فتح کنی بے شک و صد سال ازیں پس — در ہند بہر خطہ بہ بیند اثرِ فتح

استاد ابوالفرج روشنی بھی سلطان ابراہیم کا مدّاح تھا اور اس کے قبل وہ سلطان مسعود کا مدّاح تھا۔ ان دونوں کی مدح میں اس نے بے شمار قصیدے لکھے تھے جو اس کے کلیات میں موجود ہیں۔ وہ روئیں نامی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں نواح لاہور میں واقع تھا مگر مرورِ ایام میں اس حد تک ویران اور برباد ہو گیا کہ آج اس کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ استاد ابوالفرج نے ذیل کا قصیدہ بھی سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھا تھا ؎

زہے ببازوے شمشیر کامگار ترا — شبیہ نفس عزیز و نظیر عقل عدیم
اسیر کردہٗ آں بے نفس چو حلق گلو — یتیم کردہٗ ایں بے عقب چو دُرِّ یتیم

اور مسعود سعد سلمان نے از روئے حسد جو شعرا کا لازمی خاصہ ہے استاد ابوالفرج کی مذمت کی تھی جس کی بنا پر اُسے دس سال قید میں رہنا پڑا اور یہ رباعی اس نے قید خانہ ہی میں کہی تھی ؎

زندان ترا ملک شہی می باید — تا بند پائے غدار می شاید
آں کس کہ ز پشتِ سعد سلمان زاید — گر مار بود ملک ترا بگزاید

اور یہ شعر بھی اسی کا ہے ؎

چو شانہ شد جگرم شاخ شاخ از حسرت — کہ موئے دیدم شاخ سفید در شانہ

اس کے کلیات عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں ہیں۔

علاؤالدین مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

باپ کے بعد تخت نشین ہوا، اور ۵۰۸ھ میں انتقال کر گیا۔ مدت حکومت ۱۷ سال تھی۔

سلطان شیرزاد بن مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

باپ کے فرمان کے مطابق بادشاہ ہوا۔ صرف ایک سال حکومت کی۔ اس کے بھائی ارسلان شاہ نے بغاوت کی اور ۵۰۹ھ میں اسے قتل کر ڈالا۔

سلطان ارسلان شاہ بن مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے تمام بھائیوں کو گرفتار کر لیا، مگر بہرام شاہ بھاگ کر سلطان سنجر کے پاس چلا گیا جو اس کا خالو زاد بھائی تھا۔ سلطان سنجر نے ہر چند سفارشی خطوط لکھے مگر ارسلان شاہ کے کان پر جُوں بھی نہ رینگی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان سنجر نے مجبور ہو کر اس پر چڑھائی کر دی۔ ارسلان شاہ تیس ہزار فوج لے کر اُس کے مقابلہ پہ آیا مگر شکست کھائی اور ہندوستان کا رُخ کیا۔ سلطان سنجر چالیس روز غزنی میں رہا۔ پھر تمام علاقہ بہرام شاہ کے حوالے کر کے لوٹ گیا۔ ارسلان شاہ ہندوستان سے ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ غزنی پہنچا۔ بہرام شاہ اُس کے مقابلہ میں کھڑا نہ ہو سکا اور قلعہ بامیاں میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ سلطان سنجر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ مدد کو آیا اور بہرام شاہ نے دوبارہ غزنی پر قبضہ کر لیا۔ ارسلان شاہ گرفتار ہوا اور ۵۱۲ھ میں اُسے مروا دیا گیا۔ ارسلان شاہ کی مدّتِ حکومت ۲ سال تھی۔

سلطان بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم

سلطان بہرام شاہ جب تخت پر بیٹھا تو حکیم سنائی اس کا مدّاح تھا۔ کلیلہ دمنہ اور بہت سی دوسری کتابیں اس کے عہدِ حکومت میں احاطۂ تحریر میں آئیں۔ اس کی تخت نشینی کے روز سید حسن غزنوی نے جو قصیدہ کہا تھا اس کا مطلع یہ ہے ؎

ندائے برآمد ز ہفت آسمان
کہ بہرام شاہ است شاہِ جہاں

اور ذیل کا قصیدہ مکّہ معظّمہ میں کہہ کر اس کی خدمت میں بھیجا ؎

ہرگز بود کہ باز ببینم لقائے شاہ	شکرانہ در دو دیدہ کشم خاکِ پائے شاہ
بہرام شاہ کہ جانِ سلاطیں فداش باد	باشد کہ جانِ ایشاں باشد سزائے شاہ
سیّارگانِ چرخ در افتد چوں شہاب	پا از بروں نہند زحدِ وفائے شاہ

حکیم سنائی نے اپنی مشہور تصنیف "حدیقۂ حقیقت" اپنے اسی ممدوح سلطان بہرام شاہ کے نام منسوب کی تھی۔ حکیم سنائی کو قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اُس کی وجہ غزنوی تعصب تھا۔ جب یہ تصنیف دار الخلافہ بغداد پہنچی اور اکابرین اور بزرگانِ دین کی نظر سے گزری تو اُن سب نے حکیم سنائی کے معتقدات کی تائید کی اور اس سلسلہ میں ایک یادداشت بھی لکھی جس کی وجہ سے حکیم سنائی کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور رحلت کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیخ مجدود نے اس تصنیف کی بنا پر حکیم سنائی پر رافضی ہونے کا اتہام لگایا تو اس نے بہرام شاہ کو یہ خط لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

"الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جو چیزیں عمر کی درازی، بارش کے برسنے اور درختوں کے اُگنے کا باعث ہوتی ہیں وہ یہ ہیں: ایک مظلوموں کی حمایت، دوسری ظالموں پر قہر

اس کی تائید میں حضرت محمدؐ کا یہ قول شاہد عادل ہے کہ آسمان عدل کی وجہ سے اپنی جگہ پر قائم ہے اور عدل کی مثال اس پرندے کی سی ہے کہ جہاں کہیں وہ سایہ فگن ہو دولت میں فراوانی ہوتی ہے اور جہاں کہیں وہ آشیانہ بنائے اس کا آشیانہ استقامت کا قبلہ ہوتا ہے اور بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ظلم اور عدوان ایک ایسے پرندے کی طرح ہے کہ جس طرف بھی وہ پرواز کرے قحط و وبا عام ہوتی ہے اور انسانوں کے دل سے زندگی اور حیا معدوم ہونے لگتی ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ سلطان اسلام و بادشاہِ عادل بہرام شاہ بن مسعود شاہ بن ابراہیم شاہ بن مسعود شاہ بن محمود غزنوی کو جور و ظلم سے محفوظ اور مصئون رکھے۔ اگر تمام دنیا بھی جمع ہو جائے تو اس فقیر کے دل میں علم و معرفت کا جو سرمایہ اور دولت ہے، اس کی حقیقت کے اظہار سے قاصر ہے۔ اور جو درخت کہ مالک الملک نے اسرار غیوب کا مشاہدہ کرنے کے لیے لگایا ہے اور جبرئیل اور میکائیل کو بھی اس کی کنہ تک رسائی نہیں، یہ امر یقینی ہے کہ عادل کے لیے وہ ہر حال میں موجب سعادت ہے اور جابر کے لیے باعثِ شقاوت، اور بدترین ظلم وہ ہے کہ کسی جماعت کسی کتاب یا مضمون کو پڑھے مگر اس کے مفہوم اور معنی سے بے بہرہ رہے مگر اس کے باوجود وہ مغرور اور خود پسند ہو اور علماء کے خلاف زبان طعن و تشنیع کھولے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہمارے پیغمبر صلعم نے فرمایا ارحموا ثلاثاً غنیاً افتقروا وعزیز قوم ذلّ وعالماً بین الجہال۔

(ترجمہ: تین آدمیوں پر رحم کھاؤ ایک وہ دولت مند جو غریب ہو جائے، دوسرے قبیلہ کا وہ بزرگ جو ذلیل ہو جائے، تیسرے وہ عالم جو جہلا میں پھنس گیا ہو)

جو کتاب کہ ارباب معرفت و کمال کی زبان میں لکھی گئی ہو، بایزیدؒ اور شبلیؒ ایسے بنیادی عارف ہی اس میں کوئی تصرّف کر سکتے ہیں مگر جن لوگوں کو مذہبی علوم اور دینیات سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں یہ بڑی نادانی اور حماقت ہوگی کہ وہ اس کتاب پر نکتہ چینی کریں۔ اُن کی کور چشمی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ آل مروان کو قابلِ نفرت و شقاوت ٹھہراتے ہیں اور آلِ مصطفیٰ کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہٗ کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے ہیں، مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اُن کا درجہ صدیقؓ، فاروقؓ اور ذی النورینؓ کے بعد رکھا گیا ہے اور آل مروان کے عیوب اور آل محمد صلعم کے مناقب کے بارے میں حضرت محمد صلعم کے ارشادات کافی ہیں اور ہمارے لیے وہی دلیلِ راہ ہیں۔

کلمۂ حق یہ ہے کہ اے خدا تو دنیا کو ایسے عالموں کے وجود سے آراستہ کر جو تجھ سے ڈریں اور عوام سے شرم و حیا ملحوظ رکھیں اور تو ہمیں ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ جو تیری محبّت کی راہ سے بھٹک گئے ہوں۔ بفضلک وجودک وکرمک یا ارحم الراحمین۔" یہ شعر حدیقہ ہی کا ذیل میں لکھتا ہوں ؎

عرش گر بارگاہ را زیبد ۔۔۔ شاہ بہرام شاہ را زیبد"

سلطان بہرام شاہ نے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور ان مقامات کو فتح کیا جنھیں اس کے اسلاف فتح نہیں کر سکے تھے۔ وہ اپنے امرا میں سے ایک کو ہندوستان چھوڑ کر واپس غزنی چلا گیا۔ اس امیر نے بغاوت کی۔ سلطان امیر کی سرکوبی کے لیے آیا۔ ملتان کے نواح میں زبردست جنگ ہوئی۔ امیر گرفتار ہو کر سلطان کے سامنے آیا، اُسے قتل کر دیا گیا اور دوسری بار پھر ہندوستان اس کے قبضے میں آ گیا۔ جب علاؤالدین حسن بن حسین سوری جو ملوکِ غور میں سے تھا اس نے اس کے خلاف بغاوت

کی اور غزنی تک آ پہنچا تو بہرام شاہ بھاگ گیا اور علاؤ الدین اپنے بھائی سیف الدین سوری کو غزنی چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ بہرام شاہ نے واپس آکر پھر غزنی پر قبضہ کر لیا اور سیف الدین کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں اس کی تذلیل کی اور بدترین طریقہ سے اسے قتل کرایا۔ جب علاؤ الدین کو اس کی اطلاع ملی تو اسے بے حد رنج ہوا اور ایک لشکر عظیم کے ساتھ غزنی کو چل پڑا، مگر اس کے غزنی پہنچنے سے پہلے بہرام شاہ ملکِ آخرت کا سفر اختیار کر چکا تھا۔ اس کے بجائے اس کا بیٹا تخت نشین تھا۔ علاؤ الدین نے اپنے بھائی کا سخت انتقام لیا اور غزنی کی خاک پر جو ہزاروں کشتوں کے خون کی حامل تھی خون کی ندیاں بہا دیں۔ بہرام شاہ ۵۴۶ھ مطابق ۱۱۵۶ء اس دنیا سے رخصت ہوا تھا اس کی مدتِ حکومت ۳۲ سال تھی۔ مسعود سعد سلمان نے اس کی مدح میں یہ مسدس کہا تھا ؎

بہرام شاہ خسرو گیتی کشائے گشت　　خورشید دہر و سایۂ فر خدائے گشت
چتر ش کہ شد ہمایوں فرِ ہمائے گشت　　اورا خدائے عزوجل رہنمائے گشت

خسرو شاہ بن بہرام شاہ

اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا، علاؤ الدین حسین بن حسن غوری اس کے مقابلہ پر بھی آیا خسرو شاہ نے بھاگ کر لاہور کا رخ کیا اور جب علاؤ الدین غزنی سے کامیاب واپس ہوا تو خسرو شاہ جو موقع کی تاک میں تھا فوج کشی کی اور غزنی پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور جب قبیلۂ غزاں نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا تو علاؤ الدین اُدھر جاتے ہوئے غزنی پہنچا۔ خسرو شاہ کو جب یہ خبر ملی تو وہ دوبارہ بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ یہاں ۵۵۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ۸ سال حکومت کی۔ اس کے عہدِ حکومت میں بہت بڑے بڑے شاعر تھے جنھوں نے خسرو شاہ کی مدح میں قصیدے لکھے تھے۔ یہ شعر ایک ترجیع بند سے لیا گیا ہے ؎

شاہنشہِ معظم خسرو شہ آنکہ آسماں
با تیغ و گرز گیرد از ہند تا خراساں

محقق تو یہ ہے کہ قاضی بیضاوی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ خسرو شاہ کا انتقال غزنی ہی میں ہوا تھا۔ علاؤ الدین نے جب غزنی کو تباہ و برباد کر کے قتل عام کیا تھا تو وہ اپنے بھتیجوں غیاث الدین ابو الفتح اور شہاب الدین ابو المظفر کو وہاں چھوڑ آیا تھا اُنھوں نے وہاں مستقل ... اختیار کر لی تھی۔ اس دوران میں اُنھوں نے مختلف حیلوں اور ترکیبوں سے خسرو شاہ کو اپنی امن پسندی اور وفاداری کا اطمینان دلا دیا تھا مگر ۵۵۵ھ میں اُنہی کے ہاتھ سے خسرو شاہ گرفتار ہوا اور اسی سال اس کا انتقال بھی ہو گیا۔ خسرو شاہ کے انتقال کے بعد غزنوی خاندان کا عہدِ حکومت ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی تمام سلطنت شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آگئی تھی۔ چونکہ نظام الدین احمدؒ نے تاریخ نظامی میں لکھا ہے اور اُنھوں نے اسے روضۃ الصفا سے اخذ کیا ہے کہ خسرو ملک ابن خسرو شاہ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا اس لیے میں نے بھی ان کی پیروی کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خسرو ملک ابن خسرو شاہ

خسرو شاہ کے انتقال کے بعد خسرو ملک لاہور میں تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ وہ پرلے درجے کا عیاش تھا اس لیے اس کے عہد حکومت میں ہر طرف بڑی ابتری پھیل گئی۔ غزنوی حکومت جو پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، خسرو ملک اس کی مُردہ لاش کو بس دُرّے مار مار کر گھسیٹتا رہا بس ۔ غوری خاندان کا ستارہ اوج پر تھا اور وہ دن رات ترقی کر رہا تھا اس لیے عنانِ حکومت عملاً غوریوں کے ہاتھ منتقل ہو گئی۔ سلطان معزّ الدین محمد سام المعروف سلطان شہاب الدین غوری نے غلبہ پا کر غزنی کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور غزنوی بادشاہوں کی طرح اُس نے بھی ہندوستان پر لشکر کشی کی اور لاہور کے نزدیک آ پہنچا۔ خسرو ملک کے پلّے تو کچھ بھی نہیں تھا، سلطان شہاب الدین کا مقابلہ کیسے کرتا، اس لیے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر امان چاہی۔ سلطان شہاب الدین غوری اسے اپنے ہمراہ غزنی لے گیا اور وہاں سے اُسے غیاث الدین کے پاس بھیج دیا جس نے اُسے فیروز کوہ میں قید کر دیا اور دس سال کے بعد خسرو ملک نے شربتِ فنا نوش کیا، ؎

دل مبند یدریں دہر کہ بے بنیاد است!
نو عروسے است کہ درعقب بسے داماد است

خسرو ملک نے ۵۸۳ھ میں وفات پائی تھی، وہ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اس نے ۲۸ سال تک حکومت کی، اس کے بعد غوری خاندان کی باری آئی اور اس نے زمامِ حکومت سنبھال لی۔ تؤتی الملک من یشاء ؎

بقا بقائے خدائے ست و ملک ملکِ خدائے

اور قاضی بیضاویؒ غزنوی مملکت کی مدت سلطان محمود سے خسرو شاہ تک ۱۶۱ سال بتاتے ہیں اور اس کے بارہ بادشاہوں نے حکومت کی مگر قاضی یحییٰ قزوینی کے نزدیک ۱۵۵ سال تھی اور ۱۴ بادشاہوں نے حکومت کی۔ تاریخ نظامی کے مصنف کی رائے میں جیسے کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، ۲۱۵ سال ہوتی ہے اور ۱۵ بادشاہوں نے حکومت کی، واللہ اعلم بالصواب۔

طبقۂ دوم

غوری عہدِ حکومت

جس نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت قائم کی

سلطان شہاب الدین غوری نے اس کی بنا رکھی

سلطان معزّ الدین محمدؒ سام المعروف بہ سلطان شہاب الدین غوری

معز الدین کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین غوری، عراق اور خراسان کا بادشاہ تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری اسی کا نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے غزنی میں تخت نشین ہوا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکّہ جاری کیا نیز اپنے برادر کلاں کے حکم سے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور نعرۂ غزوہ و جہاد بلند کیا۔ اسی کے عہدِ حکومت میں دِلّی فتح ہوئی تھی، اُس پر پرچم اسلام لہرایا تھا اور ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت کی بنا ڈالی گئی تھی سلطان غیاث الدین نے تگین آباد پر جو گرم سیر کے توابع میں سے تھا قبضہ کر کے سلطان شہاب الدین کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا اور خود غزنی پر لگاتار حملے کرتا رہا یہاں تک کہ اسی سال کے اندر وہ اس ملک کو اپنے دائرۂ فتوحات میں لے آیا۔ اس نے غزنی سے قبیلۂ غزّاں کو بھی نکال باہر کیا جو سلطان سنجر کی گرفتاری کے بعد اس پر قابض ہو گیا تھا اور معزّ الدین کو سلطان شہاب الدین کا لقب دیا۔ سلطان شہاب الدین نے اپنے برادر کلاں کی نیابت کے پہلے سال کے دوران ہی ۵۷۰ھ میں گردیز کو فتح کر لیا اور پھر اُچھ[1] اور ملتان پر قبضہ کر لیا اور قرامطیوں کے طائفوں کو وہاں سے نکال دیا۔ قبیلہ بھتیہ[2] نے اپنے آپ کو قلعہ بند کر رکھا تھا اُن کا بھی قلع قمع کیا اور اس کے بعد یہ پورا علاقہ علی کرانی کے سپرد کر کے غزنی لوٹ گیا۔

۵۷۴ھ میں سلطان شہاب الدین اپنی فوج کے ساتھ گجرات پہنچا۔ اُس علاقہ کے حکمراں بھیم دیو کے ہاتھ سے شکست کھائی اور بڑی مشکل سے غزنی پہنچا۔ ۵۷۵ھ میں اس نے پُرشور[3] فتح کیا اور ۵۸۰ھ میں لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ سلطان خسرو شاہ کو جو غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا اطلاع ملی تو وہ لاہور کے قلعہ میں بند ہو کر بیٹھ گیا کافی نامہ و پیام کے بعد

---

[1] اُچھ۔ پنج ند کے مشرقی کنارے واقع ہے اور ملتان سے ۷۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

[2] قبیلۂ بھتیہ کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے اس نام کا ایک قلعہ بھی ملتان اور الور کے درمیان واقع تھا۔ مرآت جہاں نما میں لکھا ہے کہ اس قبیلہ کا ایک راجہ بھی تھا۔

[3] پُرشور۔ پشاور۔

اس نے اپنے بیٹے کو ایک ہاتھی کے ساتھ بطورِ نذرانہ بھیجا تو سلطان شہاب الدین نے اس کی عرضداشت صلح قبول کر لی۔ اسی موقع پر اس نے قصبۂ سیالکوٹ کی بنا ڈالی اور وہاں اپنا ایک نائب مقرر کر کے غزنی چلا گیا۔ سنہ ۵۸۱ھ میں وہ دیول کی جانب بڑھا۔ (دیول[1] کا مطلب دوسرے لفظوں میں ٹھٹھہ ہے) اور بحرِ شور کے ساحلی شہروں کو تہس نہس کر کے اُن کا کافی سے زیادہ مال و اسباب لُوٹ کر لوٹ گیا۔

سنہ ۵۸۲ھ میں وہ پھر لاہور آیا، اس کے گرد و نواح کو تاخت و تاراج کیا اور حسین کو قلعہ سیالکوٹ کا نگران مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ تاریخ نظامی جو اس منتخب التواریخ کا ماخذ ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سیالکوٹ کی بنیاد[2] اسی سال ڈالی گئی تھی۔ یہ مبارک شاہی کے اس خیال سے مختلف ہے کہ اس کی بنیاد اس سے دو سال قبل ڈالی گئی تھی، واللہ اعلم۔ چونکہ تاریخ کا خانہ بھی خانۂ خواب اور دوسری چیزوں کی طرح خراب ہے اس لیے اختلاف کی عذر خواہی ظاہر ہے اور اسی سال خسرو ملک کھوکھروں کی مدد سے ایک مدت تک حصارِ سیالکوٹ کا محاصرہ کیے رہا مگر ناکام واپس ہوا۔ اسی سال سلطان شہاب الدین نے دوبارہ لاہور پر چڑھائی کی۔ خسرو ملک قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا مگر تا بہ کے، آخر مجبور ہو کر اسے سلطان شہاب الدین کے حضور میں آنا پڑا۔ سلطان اُسے اپنے ہمراہ لے گیا اور اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کے سپرد کر دیا جس نے اسے فیروز کوہ میں بند کر دیا اور وہ اسی حالت میں مر گیا۔ فیروز کوہ گرجستان کے قلعوں میں سے ایک ہے۔ اس تاریخ سے حکومت بلا خوف و خطر غوریوں کے پاس چلی گئی۔

اگر ابلقِ دہر بر زیں کشی	دگر خنگِ چرخت جنیبت کشد
مشو غرّہ کیں دَورِ دوں ناگہت	رقم بر سرِ حرفِ دولت کشد
دگر روضۂ عیشت از خرمی	خطِ فسخ بر ذکرِ جنّت کشد
زمانہ چو باد است و باد از نخست	نقاب از رُخِ گل بعوت کشد
پس از ہفتۂ درمیانِ چمن	تنش را بخاک مذلّت کشد

اسی سال سلطان شہاب الدین نے حاکمِ ملتان علی کرمانی کو لاہور میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور ۵۸۷ھ میں پھر غزنی سے

---

[1] دیول کا محل وقوع ٹائیفنتھلر کے نقشہ کے مطابق کراچی اور ٹھٹھہ کے درمیان ہے، کراچی سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر اور ٹھٹھہ سے ستر میل کے فاصلہ پر۔ کراچی سے مشرق کی جانب اور ٹھٹھہ سے شمال مغرب کی جانب۔ یہ سمندر سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے ان دو حصوں میں سے ایک میں واقع ہے جنھوں نے کسی زمانہ میں مہران (سندھ) کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اگر موجودہ نقشہ پر دیکھا جائے تو اس کے وجود کا کہیں پتہ نہیں چلتا، یا تو وہ بالکل غائب ہو گیا ہے یا اس حد تک کہ کہیں نظر نہیں آتا۔

[2] برہمنوں کے نزدیک شہر سیالکوٹ کی بنا پانچ ہزار سال قبل ایک راجہ سول یا سال نے رکھی تھی جو پانڈووں کا چچا یا ماموں تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے اس کا نام بھی سیالکوٹ رکھا تھا۔ اس خاندان نے ڈیڑھ ہزار سال تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد ایک سیلابِ عظیم نے اسے اس حد تک تباہ و برباد کر دیا کہ ایک ہزار سال تک وہ ویران اور اُجاڑ رہا۔ ایک دوسرے راجہ سالیاہن نے اسے دوبارہ آباد کیا اور اس میں قلعہ بھی تعمیر کیا۔ اس کا تعلق سیا نسل سے تھا اس وجہ سے بعضوں کا خیال ہے کہ سیالکوٹ کا نام سالیاہن ہی نے رکھا تھا اور لفظ سیا کی بنا پر اس کا نام سیالکوٹ رکھا۔ — بلا شبہ شہاب الدین غوری اس وقت لاہور پر حملہ آور ہوا تھا۔ جب وہاں غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ خسرو ملک حکمران تھا اور سیالکوٹ پر بھی اس نے چڑھائی کی تھی جو ایک ہندو راجہ کے زیرِ نگیں تھا اور وہ اس پر غالب آیا تھا۔ مگر جہاں تک سیالکوٹ کی بنیاد رکھنے کا تعلق ہے وہ غلط ہے۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد تو کئی ہزار سال قبل رکھی گئی تھی۔ البتہ اتنا صحیح ہے کہ راجہ سالیاہن نے جو قلعہ بنایا تھا اس کی حالت خراب و خستہ تھی اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس نے اس کی مرمت کی تھی۔ (پنجاب گزیٹیر سیالکوٹ)

روانہ ہو کر قلعہ تبر ہندہ کو سر کیا۔ یہ مقام ہندوستان کے بڑے بڑے راجوں کا پایۂ تخت رہ چکا تھا۔ ملک ضیاء الدین تولکی کو ایک ہزار بیس منتخب سواروں سمیت اس قلعہ میں چھوڑ کر اس نے واپسی کا ارادہ کیا مگر حاکم اجمیر رائے پتھورا اور اس کے بھائی کھنڈی رائے دونوں کے ساتھ اس کا مقابلۂ عظیم ہوا۔ کھنڈی رائے پہلے حاکم دہلی تھا وہ ایک کثیر لشکر کے ساتھ موضع ترائن[1] پہنچا جو دریائے سرسوتی کے کنارے واقع ہے اور دہلی سے سات کوس کے فاصلے پر ہے اور آج کل تراوری کے نام سے مشہور ہے لشکر اسلام اس معرکہ میں ہار گیا اس لڑائی میں سلطان نے بڑی پھرتی دکھائی اس نے کھنڈی رائے پر جو ہاتھی پر سوار لشکر کے آگے آگے تھا جھپٹ کر حملہ کر دیا جس سے اس کا چہرہ زخمی ہو گیا کھنڈی نے بھی جوابی حملہ کیا اور سلطان کے سر پر نیزہ سے وار کیا جس سے سلطان کا بازو زخمی ہو گیا مگر دونوں کی جان سلامت رہی۔ سلطان گھوڑے سے اتر آیا اور اپنے بیٹے خلجی کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ خلجی نے ایڑ لگائی اور گھوڑا سرپٹ دوڑا کر دونوں کو صحیح و سلامت میدانِ جنگ سے باہر لے کر نکل گیا۔

رائے پتھورا نے قلعہ تبر ہندہ کا ایک سال ایک ماہ تک محاصرہ کیا اور آخر صلح و صفائی کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔

۵۸۸ھ میں سلطان شہاب الدین غوری چالیس ہزار نامور سواروں کے ساتھ پھر ہندوستان آیا اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور موضع تبر ہندہ کے نواح میں جنگ کی اور اسے فتح کر لیا۔ رائے پتھورا گرفتار ہوا اور کھنڈی رائے میدانِ جنگ میں مارا گیا اور اس کے بعد سلطان نے ہانسی اور سرستی کے قلعوں پر چڑھائی کی اور ان پر بھی قبضہ کیا۔ اس کے بعد اجمیر کی جانب بڑھا یہ شہر رائے پتھورا کا پایۂ تخت تھا اس پر قبضہ کیا۔ اس کے نواح کو خوب تاخت و تاراج کیا اور ایک کافی تعداد کو گرفتار بھی کیا۔ ایک دوسرے ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری قدس اللہ سرہٗ العزیز جو دیارِ ہند کے مشائخ عظام کا سرچشمہ ہیں اور جن کا مزار متبرک اجمیر میں ہے۔ اس معرکہ میں سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ تھے اور یہ فتح اسی قطب ربانی کے فیوض و برکات کے طفیل تھی۔ اسی سال سلطان اپنے غلام اور متبنٰی اور جانشین ملک قطب الدین ایبک کو قصبہ کہرام میں (جو دہلی سے ۷۰ کوس کے فاصلہ پر ہے) چھوڑ کر خود کوہ سوالک (جو شمالی ہندوستان میں واقع ہے) کے راستہ غزنی پہنچا۔ بعد میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو مسخر کیا اور رائے پتھورا اور کھنڈی رائے کے خویش و اقربا کے ہاتھ سے اسے چھین لیا۔

۵۸۹ھ میں سلطان شہاب الدین نے چندوار اور اٹاوہ[2] کے حدود میں راجہ جے چند حاکم قنوج کے ساتھ جنگ کی اور اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد غزنی روانہ ہو گیا اور قلعہ کول[3] قطب الدین ایبک کے قبضہ میں آیا۔ اس نے دہلی کو پایۂ تخت بنایا اور اس کے اطراف و نواح میں شاہی نظم و نسق قائم کر دیا اس دن سے دہلی سلاطین اسلام کا دار السلطنت قرار پایا اور مینار اور دوسری عمارتیں اور مسجد وغیرہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔ چنانچہ ان سب کا ذکر اپنی اپنی جگہ کیا جائے گا۔

۵۹۱ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے قلعہ تھنگر اور بداؤں پر قبضہ کیا اور ۵۹۳ھ میں گجرات فتح کر کے نہروالہ یعنی پٹن کی جانب بڑھا۔ بھیم رائے دیو سے بہت سا مالِ غنیمت سلطان کے ہاتھ آیا جسے وہ اپنے ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اسی

---

[1] طبقاتِ ناصری میں اس کا نام نرائن لکھا ہے۔

[2] آگرہ کے شمالی جانب ۴۰ میل پر ہے۔

[3] یہ ایک کہنہ قلعہ ہے جو آنولہ ضلع بریلی میں واقع ہے اور آنولہ سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسے راجہ ہرچرن نے تعمیر کیا تھا۔

سال سلطان غیاث الدین کا انتقال ہو گیا ۔ سلطان شہاب الدین کو جب اس کی خبر ملی تو وہ طوس اور سرخس کی حدود میں مقاومہ فوراً بادغیس کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر مراسم عزاداری ادا کیے اور پھر اپنے بھائی کے ملک کو رشتہ داروں میں تقسیم کر کے غزنی روانہ ہو گیا۔ پھر خوارزم پر چڑھائی کی۔ سلطان محمد خوارزم شکست کھا کر پسپا ہوا۔ اور ہٹتے ہٹتے خلیج تک پہنچ گیا۔ یہ مقام دریائے جیحون کے مشرق کی جانب ہے۔ یہاں دوبارہ اہل خوارزم کے ساتھ جنگ ہوئی اور غوریوں کی کافی تعداد اس معرکہ میں کام آئی مگر اس کے باوجود سلطان خوارزم غوریوں پر فتح نہ پا سکا۔ اس اثناء میں ترکستان کے تمام بادشاہوں کی طرف سے محمد خوارزم کو کمک پہنچ گئی اور سلطان شہاب الدین کو اس لشکر عظیم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں سلطان نے شکست کھائی اور ایک ہزار سوار فوج کے ساتھ وہ قلعہ اندخود میں بند ہو گیا۔ امان پانے کے بعد وہاں سے غزنی واپس آیا۔

اس درمیان میں نواحی لاہور کے کھوکھروں کے ایک گروہ نے سر اٹھا رکھا تھا۔ سلطان شہاب الدین نے ان پر چڑھائی کر دی اور مدد کے لیے قطب الدین ایبک کو بھی دہلی سے بلوا بھیجا۔ دونوں نے مل کر کھوکھروں کی خوب گوشمالی کی۔ اس کے بعد سلطان غزنی لوٹ گیا۔ راستہ میں ابھی تو ابع غزنی کے ایک مقام دمیک پہنچا تھا کہ ایک فدائی کھوکھر نے موقع پا کر اسے شہید کر دیا۔ اس کی وفات سے متعلق یہ قطعہ تاریخ ہے: ؎

شہادتِ ملک بحر و بر شہاب الدین کز ابتدائے جہاں ہمچو او نیامد یک
سوم ز غرۂ شعبان سال شش صد بود فتادہ در رہ غزنیں بمنزل دمیک[1]

اس کی مدت حکومت ۳۲ سال اور کچھ مہینے تھی۔ اس کے پسماندگان میں سے اس کی وارث صرف ایک لڑکی تھی۔ اس نے سونے چاندی اور جواہرات کے بے بہا خزانے اپنے پیچھے چھوڑے تھے ان میں سے ایک خزانہ پانچ سو من الماس کا تھا۔ الماس کا شمار نفیس ترین جواہرات میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دوسرے خزانوں کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے نو مرتبہ ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ دو مرتبہ معرکوں میں شکست کھائی تھی اور سات مرتبہ فتح پائی تھی: ؎

معز الدین محمد سام را دیدی کہ در ہیجا قوی تر بود بازو و دل از سام و نریمانش
میسر گشت چوں محمود از فیلان ہندوستاں سیاست ہائے ساسان و ولایت ہائے سامانش
گذشت از عالم و گویند بر راوی بود عہدہ کہ پانصد من فزوں الماس ماند از گنج پنہانش

اس کے عہد حکومت میں علماء اور فضلاء کی ایک کثیر تعداد نے شہرت پائی تھی۔ ان میں سے ایک امام فخر الدین رازیؒ بھی تھے جنھوں نے لطائف غیاثی اور دیگر کتب لکھیں اور سلطان شہاب الدین کے بھائی سلطان غیاث الدین ابو الفتح کے نام سے منسوب کیں۔ امام موصوف کا قیام سلطان معز الدین المعروف سلطان شہاب الدین غوری کے لشکر میں تھا۔ وہ ہفتہ میں ایک بار وعظ فرمایا کرتے۔ وعظ کے خاتمہ پر سلطان پر رقت طاری ہو جاتی۔ چونکہ امام رازیؒ اس دوامی سلسلہ ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، ایک روز جب وہ منبر پر کھڑے ہوئے تو سلطان کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا کہ اے سلطان معز الدین کچھ عرصہ کے

---

[1] دریائے اٹک کے اس پار غزنی کی شاہراہ پر ہے۔ فرشتہ اسے رہتک لکھتا ہے جو غلط ہے۔

بعد نہ یہ تیری عظمت وشوکت باقی رہے گی اور نہ رازی کا یہ تملق اور نفاق۔ اور یہ قطعہ انہی کا ہے ؎

اگر دشمن نہ سازد با تو اے دوست ... ترا باید کہ با دشمن بسازی
دگرنہ چند روزے صبر فرما ... نہ او ماند نہ تو نہ فخر رازی

سلطان کے قتل کے بعد بعض فتنہ انگیزوں نے از روئے حسد امام رازیؒ پر یہ الزام لگایا کہ اُن کا تعلق فدائیوں[1] سے ہے اور وہ اُن کے منصوبوں سے بخوبی واقف ہیں۔ فتنہ پردازوں نے جب امام رازیؒ کی جان لینے کا قصد کیا تو اُنھوں نے مؤید الملک سنجری جو سلطان کے معتمد امراء میں سے تھے حفاظتِ جان کی التجا کی۔ کسی شاعر نے سلطان کی تعریف میں قصیدہ کہا جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

سلطان معزّ الدین شاہ غازی کہ در جہاں ... تیغش چو ذو الفقار علی مرتضیٰ شداست
سلطانِ حق محمد سام آں کہ خلق را ... مہرش چو مہر دوستیِ مصطفیٰ شداست

اور ایک دوسرے شاعر نے لکھا ہے ؎

شاہِ زمانہ خسرو غازی معزّ دیں ... کز روے فروز زینتِ تاج و کلاہ را
اصلِ ظفر محمد بن سام بن حسین ... آں حضرتش نشانہ شدہ فرّ شاہ را

ناؔزکی مراغہ بھی اُن کی مدح میں لکھتا ہے ؎

شہ معزّ الدین کہ دولتِ اوست ... ہمچو گلدستہ فلک بستہ میاں
وقت بر تخت چو گل در وقتے ... کہ فلک برد خود اندر میزاں
آں کہ در آتش قہرش بد خواہ ... جانِ شیریں بدہد شکر ساں
شکر دین و گُل دولت را ... باہم آمیخت سپہر گرداں
یارب ایں گل شکر دولت و دیں ... سببِ صحتِ عالم گرداں

اور قاضی حمید بلخی نے کہا ہے ؎

خسرو غازی معزّ الدین والدنیا کہ ہست ... روز ہیجا یا ہمایوں را تیمش ہمسر ظفر
بو المظفر شہریار شرق کاندر معرکہ ... گوئیا دارد ہمائے چترش اندر پُر ظفر

سلطان قطب الدین ایبک

ایبک سلطان معزّ الدین المعروف بہ شہاب الدین غوری کے خاص برگزیدہ غلاموں میں سے تھا، چونکہ چاند گرہن کے وقت اس کی چھوٹی اُنگلی ٹوٹ گئی تھی اس لیے اس کے نام کے ساتھ ایبک[2] لفظ کا اضافہ ہو گیا۔ اسے قطب الدین لکھ بخش بھی کہتے تھے۔

---

[1] ملاحدہ کی ایک جماعت۔ جن کا سرغنہ حسن بن صباح تھا جسے قلعۂ الموت کا ساحر بھی کہتے ہیں

[2] سلطان قطب الدین کے نام کے ساتھ لفظ ایبک کا اضافہ اور اس کی تشریح کے بارے میں اختلاف ہے ملّا بدایونی نے جو لکھا ہے دوسرے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہندوستان کے اُمراء کی متفقہ رائے سے دہلی کے استحکام و حفاظت کے لیے اس نے یہاں مستقل اقامت اختیار کر لی سلطان معزالدین کی شہادت کے بعد اس کے برادر زادہ غیاث الدین محمود نے فیروز کوہ سے چتر اور خلعت بادشاہی دونوں چیزیں ملک قطب الدین کو بھیجیں اور سلطان کے نام سے مخاطب کیا۔ سلطان غیاث الدین محمود کی مدح میں یہ شعر کہا گیا تھا ؎

سلطانِ مشرقین ، جہاندار مغربین
محمود بن محمد بن سام بن حسین

سلطان قطب الدین ایبک ۶۰۲ھ میں دہلی سے لاہور جا کر بروز منگل ۱۶ ماہ ذی قعدہ کو تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ جود و سخا میں اپنی مثال آپ تھا اور مستحقین کو حوصلہ سے بڑھ چڑھ کر انعام و اکرام سے نواز تا تھا۔ لکھ بخشی کے طریقہ کا بانی مبانی بھی وہی تھا۔ فضلائے عصر میں سے فاضل بہاؤالدین اوشی[1] نے یہ شعر اسی کی مدح میں لکھا تھا ؎

اے بخشش لک تو در جہاں آوردہ کاں را کف تو کار بجاں آوردہ
از رشکِ کفِ تو خوں گرفتہ دل کاں وز لعل بہانہ درمیاں آوردہ

زیادہ روز نہیں گزرے تھے کہ سلطان قطب الدین ایبک اور تاج الدین یلدوز کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ تاج الدین یلدوز سلطان فخرالدین کے بندگانِ خاص میں سے تھا۔ اس نے غزنی میں اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوا دیا اور لاہور پر بھی چڑھ آیا، چنانچہ پنجاب کی حدود میں جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی جس میں تاج الدین یلدوز نے شکست کھائی اور اپنے مستقل مستقر کرمان کی جانب بھاگ نکلا۔ سلطان قطب الدین اس کے بعد رفتہ رفتہ غزنی پر بھی قابض ہو گیا اور چالیس روز وہاں مقیم رہا۔ اس دوران میں اس نے اپنے اوقات خوب لہو و لعب اور عیش پرستی میں گزارے، یہاں تک کہ غزنی کے باشندے اس سے دل برداشتہ ہو گئے۔ اُنھوں نے خفیہ طور پر تاج الدین یلدوز سے ساز باز کی اور اُسے بُلوا بھیجا۔ وہ اس انتظار ہی میں بیٹھا تھا چنانچہ فوراً آپہنچا۔ سلطان قطب الدین اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سنگ سوراخ[2] کے راستہ لاہور چلا آیا ؎

چو سلطاں سرانداز باشد بجے
فتد بے خبر از سرش تاج کے

ابھی اس کی حکومت کو زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ ۶۱۷ھ میں جب کہ وہ لاہور میں مصروفِ چوگان بازی تھا گھوڑے سے گر کر جان بحق تسلیم ہوا اور اسی شہر میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر آج بھی زیارت گاہ مردم ہے۔ وہ پہلا مسلمان فاتح ہند[3] تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ): مورخین کی اکثریت بھی یہی رائے رکھتی ہے اور اس ترکی لفظ ایبک کے معنی بھی یہی لیے گئے ہیں حالانکہ ترکی زبان میں ایبک کے معنی مرغ کی کلغی ہے اور ٹنگی کے لیے لفظ برمق استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر اس لفظ کو مرکب سمجھا جائے تو اس کے معنی مختلف ہو جائیں گے۔ ترکی میں ای کے معنی چاند اور بک کے معنی آقا یعنی چاند آقا یا چاند دیوتا کے ہیں

[1] بہاؤالدین محمد اوشی فرغانی عالم و فاضل شخص تھا۔ عوفی کے نزدیک وہ بہت بڑا مقرر بھی تھا اور نظم و نثر دونوں اصنافِ تحریر میں خوب لکھتا تھا۔

[2] سنگ سوراخ غزنی اور پنجاب کے درمیان ایک شاہراہ کا نام ہے [3] مولف کی مراد "ہندوستان کا پہلا بادشاہ" ہے

جس کی کل مدت حکومت بیس سال تھی مگر اس میں سے صرف چار سال وہ بحیثیت سلطان رہا۔

گردنِ گرداں شکست ایں کہنہ چرخ چنبری
ناتوانی دل منہ بر مہر و ماہ و مشتری

سلطان معز الدین کے دوسرے امیروں اور غلاموں میں سے سات نے ہندوستان، غزنی اور بنگال وغیرہ میں حکومت کی تھی اور اُن کے حالات اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ اُن میں سے ایک تاج الدین یلدوز تھا جو ترائن عرف تراوڑی کی حدود میں سلطان شمس الدین التمش کے خلاف جنگ کرتا ہوا گرفتار ہوا۔ دوسرا سلطان ناصر الدین قباچہ جس نے تاج الدین یلدوز کی ایک بیٹی سے شادی کی تھی اور اس کی دوسری بیٹی سلطان قطب الدین ایبک سے بیاہی گئی تھی۔ سلطان معز الدین نے اپنی زندگی ہی میں سلطان ناصر الدین قباچہ کو اُچھ[۲] اور ملتان کی حکومت[۱] عطا کردی تھی۔ سلطان قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد اس نے اپنی حدودِ سلطنت میں توسیع کی، سرستی اور کہرام تک کے علاقہ کو بھی قبضہ میں لے آیا نیز لاہور پر بھی قابض ہوگیا۔ ملک تاج الدین یلدوز کا جو لشکر غزنی سے مؤید الملک سنجری کی قیادت میں آرہا تھا سلطان ناصر الدین قباچہ نے اس کے ساتھ بھی جنگ کی مگر ہار گیا اور سندھ کی جانب چلا گیا جہاں اس نے دوبارہ اپنی قوت بحال کی۔

٦١١ھ[۳] میں مغلوں کے لشکر نے چالیس روز تک ملتان کا محاصرہ کیا۔ سلطان ناصر الدین قباچہ نے خزانہ شاہی کے دروازے عوام پر کھول دیے اور اتنی بہادری دکھائی کہ مغلوں کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ آخرکار ۲۲ سال کی حکومت کے بعد وہ سلطان شمس الدین التمش کے ہاتھ گرفتار ہوا اور راہ آخرت[۴] اختیار کی۔

سلطان ناصر الدین قباچہ کے علاوہ سلطان معز الدین کے امیروں اور غلاموں میں ایک اور شخص کا بھی شمار ہوتا تھا اور وہ ملک بہاؤ الدین طغرل ہے۔ جب سلطان معز الدین نے قلعہ تھنگیر[۵] فتح کیا تو اسے اسی ملک طغرل کے حوالے کردیا جس نے بھیانہ کے علاقہ میں قلعہ تعمیر کیا اور وہیں مستقل رہائش اختیار کرلی۔

وہ ہمیشہ گوالیار کے نواح کو تاخت و تاراج کرتا تھا۔ سلطان معز الدین نے جب گوالیار سے مراجعت کی تھی تو اُس نے اُسی وقت وعدہ کیا تھا کہ یہ قلعہ بھی ملک بہاؤ الدین طغرل کو دے دیا جائے گا۔ وہ گوالیار سے تین چار میل کے فاصلہ پر بڑی مضبوطی سے

۱؎ مگر طبقات ناصری میں اس سے مختلف یہ لکھا ہے کہ قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد قباچہ اس نیت سے اوچھ اور ملتان کی جانب روانہ ہوا تھا کہ ان مقامات پر شیقہ مخالفانہ کرے نیز اس نے قطب الدین ایبک کی دو بیٹیوں کے ساتھ شادی کی تھی۔

۲؎ اوچھ، یہ ملتان سے ۷۰ میل جنوب مغربی جانب ہے۔ ٹائیفنتھلر لکھتا ہے کہ اس نام کے تحت سات گاؤں کی ایک بستی ہے اُن میں سے ایک گاؤں میں سید بخاری کا مقبرہ ہے اور یہی گاؤں اُن تمام گاؤں میں زیادہ ممتاز ہے اور اوچھ کہلاتا ہے۔

۳؎ تاج المآثر میں ٦١٢ھ لکھا ہے۔

۴؎ طبقات ناصری کے مطابق وہ ڈوب کر مرا تھا۔

۵؎ طبقات ناصری اور الفی میں تھنگر لکھا ہے۔

جم کر بیٹھا تھا۔ اس نے اہلِ قلعہ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا یہاں تک کہ اسی حالت میں ایک سال گزر گیا۔ آخر اہلِ قلعہ نے پیغامات اور تحائف بھیج کر سلطان قطب الدین ایبک کو بلوایا اور قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس بات پر سلطان قطب الدین ایبک اور ملک بہاؤ الدین طغرل کے درمیان چل گئی۔ جس نے آخر کار سخت عداوت کی صورت اختیار کر لی۔ مگر ملک بہاؤ الدین طغرل کی عمر نے وفا نہ کی اور تھوڑے عرصہ کے اندر ہی وہ انتقال کر گیا۔

سلطان معز الدین کے سلسلۂ امراء میں ایک اور شخص ملک محمد بختیار[1] غوری بھی تھا جو بلادِ غور اور گرم سیر کے اکابر میں سے تھا۔ وہ جمیلہ اوصافِ حمیدہ کا مالک تھا۔ سلطان معز الدین کے عہدِ حکومت میں وہ پہلے غزنی آیا پھر ہندوستان پہنچا مگر یہاں پہنچ کر اس نے اسے پسند نہ کیا کہ سلطان قطب الدین کے ساتھ لاہور میں مقیم رہے۔ اس لیے وہ حسام الدین اوغلبیگ کے پاس چلا گیا جو دوآبہ اور دریائے گنگا کے اُس پار کے علاقے کا حاکم تھا اور کنپیلا[2] اور پٹیالی اسے بطور انعام ملے تھے۔ ملک محمد بختیار غوری وہاں سے اودھ کو روانہ ہوا، اُسے فتح کیا۔ اس کے بعد بہار اور منیر[3] کی جانب بڑھا اور اسے مسخر کیا جہاں انواع و اقسام کا مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ سلطان قطب الدین ایبک کو جب اُس کی روز افزوں فتوحات کی اطلاع ملی تو ملک محمد بختیار غوری کے لیے اس نے ازراہِ قدردانی خلعتِ شاہی اور لوائے سلطنت بھیجا۔ ملک محمد بختیار غوری نے بھی اس کے عوض بے شمار تحائف سلطان کی خدمت میں بھیجے اور مزید انعام و اکرام سے مالا مال ہوا۔ بارگاہِ سلطانی کے امراء نے جب ملک محمد بختیار غوری کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھی اور اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں بالکل بے بس پایا تو حسد اور جلن سے اُنھوں نے اس کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کیے یہاں تک کہ سلطان اُن کی باتوں میں آ گیا اور اس نے ملک محمد بختیار غوری کو مست ہاتھی کے ساتھ لڑنے کا حکم دے دیا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو ملک غوری نے ہاتھی کے خرطوم پر ایک بھاری گرز سے اتنی کاری ضرب ماری کہ وہ چکرا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ سلطان اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ملک غوری کے لیے لکھنوتی[4] کے تمام علاقہ کی حکومت کا فرمان جاری کر دیا۔ اس کے دوسرے سال ملک غوری اپنے لشکر کے ساتھ لکھنوتی سے ندیا[5] پہنچا۔ یہ شہر آج ویران و خراب حال ہے اس کا حاکم رائے لکھیہ[6] (لکھمینہ)

---

[1] اسے محمد بختیار خلجی بھی کہتے ہیں۔ یہ پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے بنگال پر چڑھائی کی اور ندیا کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ ندیا شہر کو اس نے زمین کے ساتھ ملا دیا لکھنوتی کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اس کے بعد ہی سے بنگال کی سرزمین دہلی کے مسلمان بادشاہوں کے تحت رہی۔
(آئین اکبری)

[2] صحیح نام کنپلا ہے۔ (امپیریل گزیٹر)

[3] وہ مقام جہاں شیخ شرف الدین منیری کا روضہ مبارک ہے۔

[4] لکھنوتی۔ یہ بنگال کا قدیمی پایۂ تخت تھا جس کا اصلی نام لکشمن وتی تھا بعد میں لکھنوتی ہو گیا۔ اکبر بادشاہ نے اس کا نام جنت آباد رکھا۔ (آئین اکبری اور طبقات ناصری) (امپیریل گزیٹر)

[5] ندیا یا نوادیب یہ بھاگیرتی دریا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی بنا لکشمن یعنی میر بابل سین بنگال کے راجہ نے رکھی تھی۔ (طبقات ناصری اور امپیریل گزیٹر) [6] اس راجہ کی ولادت کا حال آئین اکبری اور طبقات ناصری دونوں میں یوں درج ہے کہ نجومیوں کی پیش گوئی کے مطابق جو وقت مقرر تھا۔ اس کی پیدائش اس سے تھوڑی دیر پہلے ہونے والی تھی۔ مگر معینہ وقت کو پورا کرنے کے لیے اس کی ماں کو اُلٹا لٹکا دیا گیا یعنی سر نیچے اور پاؤں اوپر اور اس کی ٹانگیں باندھ دی گئیں۔

تھا جس نے ملک محمد بختیار غوری، اور اس کی طاقت کے متعلق پہلے ہی نجومیوں سے سُن رکھا تھا، چنانچہ اس کی آمد کی خبر پاتے ہی وہ کامرو کی جانب فرار ہوگیا اور بے شمار مال و اسباب غنیمت اہلِ اسلام کو ملا۔ محمد بختیار نے کفّار کے معبدوں اور بُت خانوں کو مسمار اور ویران کیا، اُن کی جگہ مسجدیں اور مکتب تعمیر کیے۔ اس نے دار السلطنت کی بنا ڈالی اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام گور[1] (غور) رکھا۔

آنجا کہ بود نعرہ و غوغائے مشرکاں
اکنوں خروش و غلغلِ اللہ اکبر است

اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے اور سکّہ جاری کرانے کے بعد ملک بختیار غوری نے تبّت اور ترکستان کے ممالک فتح کرنے کا تہیّہ کیا اور ایک بہت بڑی جمعیت کے ساتھ اُدھر روانہ ہوا جو امیر علی[2] میچ کی کمان میں تھی۔ اس کے مقابلہ کے لیے بارہ ہزار سرتا پا مسلح سوار بردھن شہر پہنچ گئے۔ ملک غوری کے راستہ میں دریائے برہم ترا پڑتا تھا جس کا دوسرا نام برہمکدی تھا۔ یہ دریائے گنگا سے تین چار گنا ہے۔ شاہ گشتاسپ جب ادھر آیا تھا تو اُس نے اس دریا پر ایک پُل بنایا تھا اور کامرو کے پاس سے اسے عبور کرکے آگے بڑھا تھا۔ ملک بختیار نے بھی اسی پُل سے کام لیا اور اسی مقام پر دریا کو عبور کیا۔ پُل کی نگرانی اور راستہ کی حفاظت کے لیے اس نے اپنے پیچھے چند قابلِ اعتماد جرنیلوں کو چھوڑا۔ پھر وہ تبّت پہنچا، دس روز پہاڑوں کے دشوار گزار راستے طے کرنے میں گزارے، آخر اسے ایک صحرا دکھائی دیا جہاں ایک بے حد مستحکم قلعہ تھا۔ اہلِ قلعہ گشتاسپ کی نسل سے تھے اور اس قلعہ کی نبیاد بھی گشتاسپ نے ڈالی تھی، چنانچہ اہل قلعہ جنگ کرنے کے لیے میدان میں نکل آئے اور شام تک لڑتے رہے۔ محمد بختیار کے بہت سے آدمی ہلاک ہوئے، اس نے اسی جگہ خیمے گاڑ دیے تو اسے خبر ملی کہ اس شہر سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک اور شہر ہے جہاں پچاس ہزار جنگجو ترک ہیں اور وہ اہل قلعہ کی امداد کو آئیں گے اس لیے دوسرے دن محمد بختیار نے وہاں ٹھہرنا خلافِ مصلحت سمجھا۔ چونکہ اس میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اُسی پُل پر واپس آگیا مگر اس کے پہنچنے سے قبل ہی جن جرنیلوں کو اس نے پُل کا نگران اور راستہ کا محافظ مقرر کیا تھا کسی وجہ سے وہ آپس میں لڑ پڑے تھے جس کی وجہ سے کفار کو پُل کے دو طاق توڑنے کا موقعہ مل گیا تھا جب محمد بختیار پُل کی جانب واپس آرہا تھا تو کفار اس کے تعاقب میں تھے چنانچہ اس نے پلٹ کر حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس مقام کے قریب ہی ایک مضبوط بُت خانہ تھا، محمد بختیار نے رات وہیں گزاری، صبح دریا پار کرنے کا سوال درپیش ہوا تو قریب ہی ایک جگہ دریا پایاب نظر آیا اور اس کے چند آدمی وہاں سے گزر کر پار ہونے لگے مگر ریت ریگِ رواں بن گئی اور جہاں کہیں وہ پاؤں رکھتے ریت نیچے سے کھسک کر زمین میں دھنس جاتی اور اس کے بجائے پانی کا چشمہ اُبل پڑتا۔ چنانچہ محمد بختیار کے اکثر لشکری اس بحرِ فنا میں غرق ہوگئے اور جو بچ گئے وہ تیغ کفار کا لقمہ بنے اور شہادت کا مقام حاصل کیا۔ اتنے ہزار آدمیوں میں سے محمد بختیار صرف چار سو کے ساتھ

---

[1] اس امر کا کہیں تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ محمد بختیار غوری کے نام کی مناسبت سے اس کا نام گور (غور) رکھا گیا تھا۔ (امپیریل گزیٹر)

[2] کنچ اور میچ قبیلوں کا سردار۔ یہ قبیلے تبّت اور لکھنوتی کے درمیانی علاقوں میں رہتے تھے ۔ اور ترکوں سے مشابہت رکھتے تھے اور زبان بھی مختلف تھی نہ ہندوستان سے ملتی تھی نہ تبّت سے، محمد بختیار کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسی کو انھوں نے اپنا مرشد مان لیا تھا۔ (طبقاتِ ناصری)

دیوکوٹ پہنچا اور رنج و اندوہ کے باعث بیمار پڑ گیا یہاں تک کہ اس کی بیماری نے مرض دق کی صورت اختیار کر لی۔ اس حالت میں وہ اکثر کہتا کہ شاید سلطان معزالدین سام کو جو حادثہ پیش آیا تھا اس کی وجہ سے دولت اس سے برگشتہ ہو گئی ہے۔ روز بروز اس کی حالت گرتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے امراء میں سے ایک بڑے امیر علی مردان نے جو نارنول[1] کے علاقہ سے دیوکوٹ پہنچا تھا جب محمد بختیار کو صاحب فراش دیکھا تو اس کے چہرہ سے چادر ہٹا کر خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ ۶۰۳ھ کو رونما ہوا جب کہ سلطان معزالدین سام وفات پا چکا تھا۔ اسی علی مردان نے سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد بھی بڑی حکمت عملی سے عنانِ حکومت چھین لی تھی۔ لکھنوتی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا تھا، اپنا ہی سکہ جاری کیا تھا اور سلطان علاؤالدین کے نام کی آڑ لے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا، چونکہ وہ پرلے درجہ کا کمینہ، مغرور اور بیہودہ تھا اس لیے لکھنوتی میں بیٹھا اپنے آدمیوں میں ممالک ایران و توران کی تقسیم کرتا رہتا اور کسی کو اس سے یہ دریافت کرنے کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ ممالک تو ما بدولت کے احاطۂ تصرف سے باہر ہیں اس لیے اُن کی تقسیم یہاں کے آدمیوں میں کیسے کی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مصیبت زدہ تاجر نے سلطان علاؤالدین سے اپنے افلاس اور غربت کی شکایت کی۔ چنانچہ اس سے دریافت کیا گیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اُس نے اصفہان کا نام بتایا۔ یہ سنتے ہی اُس نے حکم دیا کہ ایک فرمان حاکم اصفہان کے نام جاری کر دیا جائے کہ وہاں کی زمین کا ایک قطعہ گزارہ کے لیے تاجر مذکور کو دے دیا جائے۔ تاجر نے اس قسم کا فرمان لے جانے سے انکار کر دیا، مگر ندیموں میں سے کسی کو اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سلطان کو اس امر کی اطلاع کرتا۔ ایک مرتبہ سلطان سے یہ کہا گیا کہ حاکم اصفہان کو خرچہ راہ داری اور اس علاقہ میں نظم و ضبط بحال کرنے کی غرض سے فوجوں کو اکٹھا کرنے کے لیے خرچ کی ضرورت ہے۔ اس پر اُس نے حکم دیا کہ اُسے ایک رقم خطیر بھیج دی جائے جو توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ جب اس کے مظالم حد سے تجاوز کر گئے تو امرائے خلج نے متحد و متفق ہو کر اسے قتل کر ڈالا اور اس کی جگہ ملک حسام الدین کو تخت پر بٹھا دیا جو خلج اور گرم سیر کے امرا اور محمد بختیار کے خدمت گاروں میں سے تھا۔ علی مردان کی مدت حکومت ۲۲ سال تھی۔ ملک حسام الدین تخت نشین ہوتے ہی ترہٹ، بنگال، جاج نگر اور کامرود کے تمام علاقوں پر متصرف ہو گیا۔ اس نے سلطان غیاث الدین کا خطاب پایا۔ ۶۲۲ھ میں اس نے سلطان شمس الدین التمش کو ۳۸ ہاتھی اور ستر ہزار تنکہ[2] زر نقد بطورِ نذرانہ بھیجا اُس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا چنانچہ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا انشاءاللہ۔

۶۲۴ھ میں ملک ناصرالدین محمد بن سلطان شمس الدین التمش اپنے بعض امیروں کے ورغلانے اور اُکسانے پر اودھ سے لکھنوتی روانہ ہوا۔ غیاث الدین اُس وقت فوج کے ساتھ کامرود گیا ہوا تھا۔ یہ سن کر واپس آ گیا اور ملک ناصرالدین محمد کے ساتھ اس کی خونریز جنگ ہوئی مگر وہ اپنے امرا کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ گرفتار ہو گیا اور بعد میں ان سب کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی مدت حکومت دو سال تھی۔

دیارِ ہند کے ان چند مسلمان بادشاہوں کا ذکر دہلی کے سلاطین عالی شان کے سلسلہ میں ضروری اور مناسب تھا اور باقی ملوک

---

[1] اسے نارکوئی بھی کہتے ہیں۔
[2] تنکہ آئین اکبری کے مطابق موجودہ ایک روپیہ کے برابر سکہ تھا۔

معزی کے حالات جو ملتان اور دوسرے مقامات پر قابض رہے دوسری جگہ درج ہیں۔

سلطان آرام شاہ بن قطب الدین ایبک

باپ کے بعد اُس کا جانشین ہوا ؎

جہاں را نماند بے کدخدائے — یکے گر رود دیگر آید بجائے
ہمیں است رسم سرائے فریب — پدر رفت و پائے پسر در رکیب

اُمراء کی متفقہ رائے سے آرام شاہ نے لاہور سے دہلی کی جانب کوچ کیا۔ اس اثناء میں سپہ سالار علی اسمٰعیل کی استدعا پر ملک شمس الدین التمش بردوار اور بدایوں سے آکر دہلی پر متصرف ہوگیا تھا۔ واضح رہے کہ ملک شمس الدین التمش سلطان قطب الدین کا غلام، مُنہ بولا بیٹا اور داماد تھا۔ ملک ناصر الدین قباچہ کے ساتھ بھی اس کے باج گزارانہ تعلقات تھے۔ جب آرام شاہ نواح دہلی میں پہنچا تو ملک شمس الدین التمش اس کے مقابلہ کے لیے ایک لشکر عظیم کے ساتھ دہلی سے باہر صف آرا ہوا۔ اس معرکہ میں آرام شاہ کو شکست ہوئی۔ اس کا عہدِ حکومت ایک سال[1] سے بھی کم رہا ؎

ہمہ مرگ رائیم پیر و جواں — بگیتی نماند کسے جاوداں
چنیں است کردارِ چرخِ بلند — بدستے کلاہ و بدستے کمند

سلطان شمس الدین[2] التمش[3] المخاطب بہ یمین امیر المومنین

٦٠٧ھ میں تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔ التمش کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی پیدائش چاند گرہن کی شب کو ہوئی تھی اور ترک ایسے بچہ کو التمش کہتے ہیں۔ اس کا باپ قبائل ترکستان کا سردار تھا۔ اس کے رشتہ دار ایک روز التمش کو سیر کے بہانے باغ میں لے گئے اور حضرت یوسف کی طرح ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا جہاں سے وہ بخارا پہنچا اور اس کے بعد سلطان محمد سام کے عہدِ حکومت میں غزنی آیا۔ عین اس وقت قطب الدین ایبک نہروالہ اور گجرات کی تسخیر کے بعد غزنی پہنچا تھا چونکہ بغیر حکم سلطان محمد سام کوئی شخص التمش کو خرید نہیں سکتا تھا اس لیے اس نے سلطان سے اجازت طلب کی۔ سلطان محمد سام نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ

۱؎ منہاج السراج میں لکھا ہے کہ آرام شاہ کے انتقال کے وقت ہندوستان کی حکومت چار بڑے بڑے صوبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سندھ ناصر الدین قباچہ کے قبضہ میں تھا۔ دوسرا لکھنوتی خلجی سرداروں میں سے علی مردان کے پاس۔ تیسرا لاہور، سندھ، دہلی اور غزنی کے حکمرانوں کا میدان جنگ اور چوتھا دہلی پر شمس الدین التمش کا تصرف تھا۔ (پٹھان بادشاہ صفحہ ۲۰)

۲؎ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے دہلی میں ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی۔ اسے خلیفۂ بغداد المستنصر باللہ سے سندِ خلافت بھی ملی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بغداد کے خلیفہ نے ہندوستان کے کسی مسلمان بادشاہ اور اُس کی حکومت کے وجود کو اس طرح تسلیم کیا تھا۔

۳؎ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی مقدمۃ الجیش یا دستہ ہراول ہے۔ اگر اس کی املا یوں لکھی جائے ایلتمش تو سورج گرہن کے معنی حاصل ہوتے ہیں۔

چونکہ وہ حکم دے چکے ہیں کہ غزنی میں اسے کوئی نہ خریدے اس لیے اسے دہلی لاکر فروخت کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قطب الدین ایبک دہلی واپس آیا اور یہاں آکر اس نے ایک لاکھ تنگہ میں دو غلام خریدے۔ ایک اس کا ہم نام ایبک تھا اور دوسرا یہ التمش۔ ایبک غلام کا نام امیر مغاج رکھا اور اسے تبر ہندہ کا امیر مقرر کرکے بھیج دیا۔ جب قطب الدین ایبک کی جنگ تاج الدین یلدوز سے ہوئی تو اس ایبک غلام نے شربتِ فنا چکھا۔ اس کے بعد اس نے التمش کو اپنا منظورِ نظر بنایا اور فتح گوالیار کے بعد وہاں کا قلمدان وزارت اس کے سپرد کیا۔ اس کے بعد برن اور اس کے نواح کی حکومت بھی اُسے دے دی۔ جب اس سے زیادہ آثار جلادت رونما ہوئے تو بدایوں کا علاقہ بھی اس کے تحت کر دیا۔ کھوکھروں کی جنگ میں التمش ایک بہت بڑا لشکر لے کر سلطان معزّ الدین کی مدد کو گیا تھا اور اپنے مسلّح گھوڑوں کو دریا میں ڈال کر اس نے اُن کے ساتھ مردانہ وار جنگ آزمائی کی تھی جس کے صلہ میں سلطان نے اسے القابات خسروانہ اور شایانِ شان خلعتوں سے نوازا تھا۔ ملک قطب الدین نے اس کی بہت سفارش کی تھی اور اس کی تربیّت کی تعریف کی تھی۔ اسی دن قطب الدین نے اسے خطِ آزادی مرحمت فرمایا، پھر رفتہ رفتہ اسے امیر الامراء کے منصب جلیلہ پر فائز کر دیا یہاں تک کہ وہ اس عالی مرتبہ تک پہنچ گیا جہاں تک کہ اسے پہنچنا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت کے ابتدائی ایام میں معزّی اور قطبی امراء میں سے بعض نے بغاوت کی، اُن کی سرکوبی کی گئی اور وہ تیغ بے دریغ کا لقمہ بنے۔ جب ملک تاج الدین یلدوز خوارزم کے لشکر سے شکست کھا کر لاہور پر قابض ہوا تو التمش دہلی سے اس کے استقبال کے لیے لاہور روانہ ہوا ۶۱۲ھ میں ترائن جو سرائے ترادری کے نام سے مشہور ہے اس کی حدود میں دونوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوئیں اور خونریز جنگ ہوئی جس میں ملک تاج الدین یلدوز نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا۔ اُسے بدایوں بھیج دیا گیا جہاں اس کا مرغِ روح زندانِ تن سے پرواز کرکے آشیانۂ آخرت کی جانب پرواز کر گیا۔ اسی شہر میں اُسے دفن کر دیا گیا۔

۶۱۲ھ میں سلطان ناصر الدین قباچہ سے سلطان التمش کی جنگ[1] ہوئی۔ قباچہ نے سلطان قطب الدین ایبک کی دو بیٹیوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے شادی کی تھی۔ اس معرکہ میں بھی سلطان التمش کو فتح ہوئی۔ تیسری مرتبہ پھر اس کا مقابلہ سلطان ناصر الدین قباچہ سے ہوا۔ وہ حصارِ اُچھ کو مستحکم کرکے خود قلعہ بھنکر کی جانب چلا گیا۔ نظام الملک وزیر جنیدی نے اس کا تعاقب کیا۔ اس اثناء میں سلطان التمش نے قلعہ اُچھ فتح کر لیا۔ جب اس کی خبر سلطان ناصر الدین قباچہ کو ملی تو اس نے اپنے بیٹے بہرام شاہ کو سلطان التمش کی خدمت میں بھیجا اور صلح کی درخواست کی۔ بعد میں قلعہ بھنکر بھی مسخر ہو گیا۔

۶۱۵ھ میں ناصر الدین قباچہ پنجاب میں غرقِ بحرِ فنا ہو گیا اور اس نے اپنا رختِ وجود سیلابِ اجل کے سپرد کر دیا۔ اس لیے سلطان التمش دہلی واپس آ گیا۔ ۶۱۸ھ میں اس نے سلطان جلال الدین منگبرنی[2] پسر خوارزم شاہ پر لشکرکشی کی جو چنگیز خاں سے

---

[1] تذکرۃ الملوک کے نزدیک۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ دونوں کے درمیان اس طرح مخالفت ہوئی۔ طبقات ناصری کی رائے اس کے برعکس ہے اس کے نزدیک ان دونوں کے درمیان اندر ہی اندر مخالفانہ جذبات پرورش پاتے رہتے تھے ان دونوں کے مقابلہ میں ملا بدایونی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

[2] ترکی زبان میں منکبرن کے معنی سیاہ تل ہے۔ چونکہ اس کی ناک پر ایک تل تھا اس لیے اسے منکبرنی کہا گیا۔
(طبقات ناصری)

شکست کھا کر تاج الدین ملیدوز کے بعد غزنی پہنچا تھا۔ پھر وہاں سے بھی خائف ہو کر اپنے متعلقین کے ساتھ لاہور آ گیا تھا۔ سلطان جلال الدین اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سندھ اور سیستان کی جانب چلا گیا، وہاں سے کچھ اور مکران کے راستہ کرمان اور عراق پہنچا۔

۶۲۲ھ میں سلطان التمش نے بہار اور لکھنوتی کا رُخ کیا اور سلطان غیاث الدین خلجی جس کا ذکر لطور ماسبق میں کیا جا چکا ہے اسے مطیع کیا اور جس تحفہ کا ذکر سطور ماسبق میں کیا گیا ہے اسے قبول کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنا سکہ جاری کیا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کو سلطان ناصر الدین محمد کا خطاب دے کر ولی عہد مقرر کیا اور وہ علاقہ اس کے سپرد کر کے خود مراجعت فرمائے دہلی ہوا۔ بعد میں سلطان ناصر الدین محمد اور سلطان غیاث الدین خلجی کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس میں سلطان غیاث الدین خلجی کو شکست ہوئی اور وہ سلطان ناصر الدین محمد کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس معرکہ میں لوٹ مار کا جو سامان سلطان ناصر الدین محمد کو ملا اُس نے اُسے کئی حصوں میں تقسیم کیا اور امرائے دہلی میں سے ہر ایک کو الگ الگ حصہ ہدیتہً بھیجا۔

کہتے ہیں کہ ناصری نامی ایک شاعر دہلی سے خواجہ قطب الدین[1] اوشی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کو بتایا کہ اس نے ایک قصیدہ سلطان التمش کی مدح میں کہا ہے۔ اس نے حضرت قدس سرہٗ سے درخواست کی کہ وہ فاتحہ خوانی کریں۔ تاکہ اُسے معتدبہ صلہ ملے۔ چنانچہ اُنھوں نے فاتحہ خوانی کی، اس کے بعد وہ سلطان التمش کی مجلس میں آیا اور یہ مطلع پڑھا ؂

اے فتنہ از نہیبِ تو زنہار خواستہ

تیغ تو مال و فیل زکفار خواستہ

ایک ہی بار پڑھنے سے یہ مصرعہ سلطان التمش کو ازبر ہو گیا۔ اس کے بعد جب شاعر نے تمام قصیدہ سُنایا تو سلطان نے دریافت کیا کہ کل شعر کتنے ہوئے؟ جب شاعر نے بتایا کہ ۵۳ شعر، تو سلطان نے حکم دیا ۵۳ ہزار تنگہ سفید ناصری شاعر کو انعام دیے جائیں۔

۶۲۳ھ میں سلطان التمش نے رنتھمبور کا قصد کیا اور اسے فتح کیا۔ اس کے بعد ایک لشکر کثیر کو ۶۲۴ھ میں قلعہ مندر کی تسخیر کے لیے بھیجا جو کوہ سوالک کے ساتھ اُسے بھی مسخر کر کے اس کے سلسلۂ فتوحات میں لایا اور دہلی واپس آ گیا۔ اسی سال امیر روحانی جس کا شمار افاضل روزگار میں ہوتا تھا، چنگیز خاں کے ہاتھوں تنگ آ کر بخارا سے عازم دہلی ہوا۔ اس نے ان فتوحات کی تقریب میں تہنیتی قصائد لکھے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؂

خبر اہل سما برد جبرئیل امین	زفتح نامۂ سلطانِ عہدِ شمس الدین
کہ اے ملائکہ قدس آسمانہا را	بدیں بشارتے بندید کلمۂ آمین
کہ نور بلادِ ملاحد شہنشہ اسلام	کشاد بارِ دگر قلعۂ سپہر آئین
شہ مجاہد غازی کہ دست تیغش را	روانِ حیدر کرارؓ می کند تحسین

---

[1] حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جن کا مزار مبارک دہلی میں زیارت گاہ خواص و عام ہے۔ کاکی یعنی کاک جس کے معنی کیک یا روٹی ہے۔ حضرت خضرؑ خواجہ کے خاندان کے لیے روٹیاں بھیجا کرتے تھے اس لیے وہ کاکی کہلائے۔ (آئین اکبری)

اس کے علاوہ بھی اس کی مدح میں اس نے دل پذیر اشعار کہے ان میں ایک قصیدہ یہ بھی ہے ؎

قصۂ خویش از زبانِ قلم — کردہ ام یاد در بیانِ قلم
رقم رنج گوئیا بود است — بر خطِ عمرِ من نشانِ قلم
با قلم تا قرین شدم بجہاں — روزِ من گشت چوں جہانِ قلم
ناگہاں بانگار دفترِ من — زاں درشتی کند سنانِ قلم
آخر احوالِ من نگوید کس — پیشِ صاحب مگر زبانِ قلم
خواجہ منصور بن سعید کز وست — تیز بازارِ امتحانِ قلم

۶۲۶ھ میں کچھ عرب سفیر اس کے لیے القاب، اور خلعت[1] مصر سے لے کر آئے اس خوشی میں شہر کو آراستہ کیا گیا، خوبصورت محرابیں بنائی گئیں اور محفلِ جشن و نشاط منعقد کی گئی۔ اسی سال اُسے اطلاع ملی کہ اس کا فرزند کلاں سلطان ناصر الدین محمد لکھنوتی میں انتقال کر گیا ہے۔ مراسم عزاداری سے فراغت پا کر سلطان نے اپنے پسر خورد کا نام بھی ناصر الدین رکھ دیا۔ کتاب طبقاتِ ناصری اسی کے نام سے موسوم ہے۔ ۶۲۷ھ میں وہ خود لکھنوتی پہنچا، وہاں کی شورش کو فرو کیا اور عنانِ حکومت عز الملک ملک علاؤ الدین خانی کے سپرد کر کے خود پایۂ تخت کو واپس چلا آیا۔ ۶۲۹ھ میں اس نے قلعہ گوالیار فتح کیا اور دبیرِ مملکت تاج الدین یلدوز نے اس قلعہ کی تسخیر کے موقعہ پر ذیل کی رباعی کہی جسے پتھر پر کندہ کر دیا گیا ؎

ہر قلعہ کہ سلطان سلاطیں بگرفت — از عون خدا و نصرتِ دیں بگرفت
آں قلعہ کالیور و آں حصنِ حصین — در ستمایہ سن ثلثین[2] بگرفت

ظاہراً یہ تاریخ محاصرہ ہے جو ایک سال پہلے کہی گئی تھی، قلعہ ایک سال کے بعد مسخر ہوا۔ ۶۳۱ھ[3] میں اس نے صوبہ مالوہ کی طرف یورش کی، بھیلسا[4] کو فتح کیا۔ اس کے بعد شہر اوجین کی طرف بڑھا اور اس پر بھی قبضہ کیا۔ اس میں ایک بُت خانہ تھا جس کا نام مہاکال تھا، اس کی تعمیر کو چھ سو سال ہو چکے تھے اُسے برباد کیا یہاں تک کہ اس کی بنیادوں کو بھی اُکھیڑ پھینکا۔ راجہ بکرماجیت کا ایک مجسمہ بھی وہاں نصب تھا اُسے بھی گرا دیا۔ واضح رہے کہ یہی وہ بکرماجیت ہے جس کے نام سے ایک سن بھی جاری ہے اور راقم الحروف نے خلیفہ الرحمانی شہنشاہی ظل اللٰہی کے حکم سے پہلے ۹۷۲ھ اور دوبارہ ۱۰۰۳ھ میں ہندو پنڈتوں کی مدد سے اسی راجہ کے متعلق ۳۲ نادر اور عجیب و غریب کہانیوں کا ہندی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس مجموعہ کا نام خرد افزا[5] رکھا۔ یہاں سے سلطان، پیتل کے کچھ مجسمے بھی اپنے ہمراہ لے گیا جنھیں اس نے دہلی کی جامع مسجد کے دروازہ

---

[1] مصر کے بجائے غالباً بغداد ہوگا اس لیے کہ خلیفہ المستنصر باللہ نے بغداد ہی سے اسے سندِ خلافت وغیرہ بھیجی تھی۔ [2] ۲۶ ماہ صفر ۶۳۰ھ (طبقات ناصری)
[3] ۶۳۲ھ (طبقاتِ ناصری)
[4] بھیلسا۔ ہندو یہاں یاترا کے لیے جاتے ہیں اور اس کے قریب ہی متعدد بدھ دہارے ہیں۔
[5] طبقاتِ شاہ جہانی کے مطابق ملا بدایونی کا انتقال ۱۰۲۴ھ میں ہوا تھا۔ نامۂ خرد افزا سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہے۔

کے پاس رکھ دیا اور حکم دیا کہ لوگ آتے جاتے انھیں پامال کریں۔ وہ ایک بار پھر لشکر لے کر ملتان پہنچا، مگر بد قسمتی سے اسی سفر میں اسے ایک جسمانی عارضہ لاحق ہوگیا اور دہلی واپس آگیا اور ۶۳۳ھ میں اس سرائے مستعار سے عالم جاودانی کو سدھارا۔ اس کی مدت حکومت ۲۶ سال تھی ؎

وزاں سرد آمد ایں کاخ دلآویز
کہ چوں جا گرم کردی گویدت خیز

اور خسرو شاعر نے کہا ہے ؎

همه هندوستان دیدی غبارِ حیشِ التمش
کنوں بی بادہ نوشِ دیگراں در سیر میدانش!
ہماں دہلی است ایں گو یا کجا شد چتر فیروزش
ہماں ملک است ایں آخر کجا رفت آں قدر خانش
زمیں ماتم کدہ است بہر خود ماتم ہمی دارد
بگاہِ زادن آں طفلے کہ می بنید گریانش

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ سلطان التمش سرد مزاج تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اس کے جی میں آیا کہ کسی خوبصورت اور حسین کنیز کی صحبت سے لطف اندوز ہو مگر قوتِ مردمی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور متعدد بار ایسا ہی ہوا۔ ایک روز جب کہ وہ کنیز سلطان کے سر میں تیل ڈال رہی تھی تو اس حسین کنیز کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے سلطان کے سر پر گر پڑے۔ سلطان نے سر اٹھا کر دیکھا اور اس سے رونے کا سبب دریافت کیا۔ بڑے پس و پیش کے بعد آخر کنیز نے بتایا کہ اس کا ایک بھائی تھا جس کا سر سلطان کی طرح گنجا تھا اس لیے سر میں تیل ڈالتے ہوئے کنیز کے دل میں اپنے گنجے بھائی کی یاد تازہ ہوگئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ کنیز نے یہ بھی بتایا کہ اس کا بھائی ایک مرتبہ مقید بھی ہوا تھا۔ چونکہ سلطان بھی مقید ہوا تھا اس لیے اسے یوں محسوس ہونے لگا گویا کنیز مذکور اسی کی بہن ہے اور حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اس کنیز کو شاید اسی وجہ سے حرامکاری سے بچائے رکھا۔ راقم الحروف نے خلیفۂ آفاق یعنی اکبر شاہ خلد اللہ ملکہٗ کی زبانی پہلے فتح پور اور اس کے بعد لاہور میں بھی ایک رات یہ بات سُنی تھی جب کہ انھوں نے پایۂ تخت کی خلوت گاہ میں بلا کر راقم الحروف کے ساتھ مختلف موضوعات پر باتیں کی تھیں۔ علاوہ ازیں سلطان غیاث الدین بلبن سے بھی یہی روایت منقول ہے بلکہ اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جب سلطان التمش نے ارادہ مباشرت کیا تھا تو کنیز کو حیض جاری ہوگیا تھا۔

سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن شمس الدین التمش

اپنے والد کے عہدِ حکومت میں سلطان رکن الدین فیروز شاہ چند مرتبہ بدایوں کے اضلاع کا مختار رہا تھا۔ اس کے بعد چتر شاہی اور علمائے اختیارات بھی حاصل ہوا تھا اور جب لاہور کے سیاہ و سفید کا مالک تھا تو اس کی حیثیت ولی عہد کی تھی۔ سلطان التمش کے انتقال کے بعد تمام اہلِ حل و عقد کی متفقہ رائے سے ۶۳۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دبیر ملک تاج الدین ریزہ نے اس تقریب سعید میں یہ تہنیتی قصیدہ کہا تھا ؎

مبارک باد ملکِ جاودانی
ملک را خاصہ در عہدِ جوانی

یمین الدولہ رکن الدین کہ آمد　　درش از یمین چوں رکنِ یمانی

جب تخت نشین ہوا تو شاہی خزانوں کے منہ کھول کر اس نے خوب دادِ عیش و عشرت دی اور اپنے اوقاتِ گرامی طوائفوں اور رذیلوں کی صحبت میں صرف کیے ؎

دل چو بمئے خانہ گراید ترا
جز مغ و مطرب کہ ستاید ترا

اُس کی والدہ ترکانِ خاتون[1] ایک ترکی کنیز تھی۔ از روئے غلبۂ قوت و رشک وہ حرم کی دوسری خواتین کو بہت تنگ کرتی۔ سلطان کا پسرِ بزرگ قطب الدین ایک دوسری حرم کے بطن سے تھا، اس نے اُسے بھی قتل کرا دیا تھا۔ سلطان رکن الدین کی عیش کوشی اور غفلت شعاری کے باعث خزانۂ عامرہ خالی ہوتا جا رہا تھا۔ جب اس کے برادرِ خورد ملک غیاث الدین محمد شاہ حاکمِ اودھ نے یہ حالت دیکھی تو اس نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ ساتھ ہی اس نے عز الدین وکبیر خاں سلطانی والیٔ ملتان اور ملک سیف الدین عنا بط ہانسی کو بھی خطوط لکھے اور انھیں آمادہ کیا کہ سلطان کی مخالفت کریں۔ سلطان رکن الدین کو جب اس کا علم ہوا تو فتنہ کو دبانے کی غرض سے منصور پور اور ترائن کے حوالی میں پہنچ گیا۔ اس واقعہ سے پہلے نظام الملک جنیدی وزیر و وکیل ممالک ہند سلطان کے ڈر سے کیلو کہاڑی[2] کو راہِ فرار اختیار کر کے کول میں ملک عز الدین محمد سالاری سے جا ملا تھا۔ لشکر کے دوسرے باقی ماندہ معتبر امراء منصور پور کے نواح ہی سے واپس دہلی چلے گئے اور وہاں رضیہ خاتون سے بیعت کر لی جو سلطان التمش کی دخترِ بزرگ تھی اور اپنے والد کی وصیت کے مطابق اسی کو حقِ ولی عہدی پہنچتا تھا۔ وہ شجاعت، سخاوت، فراست ایسی پسندیدہ خصلتوں کی حامل تھی۔ اُنھوں نے اُسے تختِ سلطنت پر بٹھا دیا اور ترکان خاتون[1] کو مقید کر دیا۔ جب سلطان واپس ہوا اور ابھی کیلو کہاڑی[2] پہنچا تھا، تو سلطان رضیہ اس کے استقبال کے لیے ایک لشکرِ کثیر کے ساتھ دہلی سے باہر نکلی اور بغیر جنگ کیے اسے گرفتار کر کے محبوس کر دیا، چنانچہ وہ قید کی حالت میں ہی انتقال[3] کر گیا۔ اس کی مدتِ حکومت چھ ماہ سے کچھ ہی زیادہ تھی ؎

منہ بر جہاں دل کہ بیگانہ ایست
چو مطرب کہ ہر روز در خانہ ایست

سلطان رکن الدین کے جملہ شعرائے عصر اور اساتذہ زماں میں سے ایک شہاب الدین مہمرہ[4] بدایونی تھا۔ امیر خسروؒ نے اپنے ایک قصیدہ میں اس کا ذکر کیا ہے ؎

در بدایوں مہمرہ سرمست بر خیزد ز خواب
گر برآید غلغلہ مرغانِ دہلی زیں نوا

---

[1] ترکان خاتون الملقب بہ خداوندۂ جہاں

[2] مضافاتِ دہلی کا ایک حصہ

[3] ۱۸، ربیع الاول ۶۳۴ھ

[4] شاعر کا پورا نام شہاب الدین ابن جمال الدین متمرہ ہے۔ غلطی سے مہمرہ لکھا گیا ہے وہ شہاب الدین متمرہ کے نام سے مشہور ہے۔

ملک الکلام فخر الملک تو کلی نے اسے استادی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ استاد الشعراء شہاب مہمرہ بدایونی کے چند قصائد کا انتخاب تیمناً و تبرکاً مندرج ذیل ہے تاکہ احباب کے دلوں میں اس کی یاد تازہ ہو اور راقم الحروف کا حقِ ہم شہری ادا ہو ے

الفم بلوح ہستی ہمہ ہیچ در نشانی　　　ببقائے غیر قائم ز وجودِ خویش فانی
عفِ آخر ایستادہ بامید بر نشینی　　　ز تحرک آرمیدہ بصفاتِ بے نشانی
صفتِ الف ندارم کہ الف کثری ندارد　　　ہمہ نقشِ من کثر آمد ز صحیفۂ امانی

یہ قصیدہ بھی اسی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، موئے اور مور کے التزام کے ساتھ توحید و نعت ختمی پناہ صلعم کی تشریح کا حق ادا کیا ہے ے

از زباں گرچہ شگافتم موئے ہنگامِ بیاں　　　در ثنائے حق ز حیرت ہمچو مورم بے زباں
در پئے زنجیر مویان پر پرواز ہوس　　　بستہ ام بسیار چوں موراں ز دل جاں بر میاں
وز برائے مور چشماں شکر لب در خیال　　　سفتہ ام موئے سخن عمدہ ز روئے آسماں
تا ذخیرہ باشدم چوں مور اندر مدحِ او　　　مو و دو نیمہ کردم دیک مو ندیدہ از کس نشاں
بعد ازیں چوں مور بندم بر درِ بیچوں کمر　　　وز بُن ہر موئے توفیقش کشائم صد زباں

اور یہ قصیدہ بھی اسی نے سلطان رکن الدین کی مدح میں کہا تھا۔ اس میں چار چیزوں کا التزام رکھا گیا ہے ے

ہر زماں ایں کرگ و گرگ و نیل و شیرِ طفل خوار　　　آں کند با من کہ پیل و کرگ وقتِ کارزار
آسمانِ نیلگوں مالد تنم را کرگ ساں　　　روزگارِ شیر وش عمرم رباید گرگ وار
زورِ کرگم نے و با من تند پیلِ آسماں　　　شیر مردی می کند چوں کہنہ کرگ روزگار
پیل با کرگ آں کند و گرگ با میش آنچہ کرد　　　شیر چرخ از جور با ایں شخص چوں موئے نزار

سلطان رضیہ بنت سلطان شمس الدین التمش

۶۳۴ھ میں تخت نشین ہوئی۔ اس نے اپنے پیش نظر عدالت و انصاف کا مسلک رکھا اور ان مہمات ملکی کو انجام دیا جو خلل پذیر تھیں۔ کرم دوزی کا وہ طریق کار جو عورتوں کے لیے اسی طرح معیوب تھا جس طرح مردوں کے لیے بخل۔ سلطان رضیہ نے اس پر عمل در آمد کیا۔ اس نے نظام الملک جنیدی کو اپنا وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔ اس کے امراء کے مابین بعض امور کے باعث آپس میں مخالفانہ جذبات پیدا ہو گئے اور وہ علانیہ لڑتے جھگڑتے لگے۔ سلطان رضیہ نے ناخن تدبیر سے کام لے کر نالائق امیروں کے گروہ میں انتشار پیدا کر دیا اور وہ تتر بتر ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ بعض کا تعاقب کر کے اُنھیں قتل کر دیا گیا۔ نظام الملک سرمو کہ چلا گیا اور اس نے نہاں خانہ عدم میں سکونت اختیار کر لی۔ خواجہ مہذب نائب اس کی جگہ وزیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ سلطان رضیہ کی حکومت بڑی طاقتور اور مستحکم ہو گئی۔ چنانچہ اس نے رنتھمبور فوج بھیجی، اور سلطان التمش کی وفات کے بعد جن

مسلمانوں کو ہندوؤں نے محصور کر رکھا تھا انھیں خلاصی دلوائی۔ جمال الدین یاقوت حبشی جو میر آخور (سردار اسپ ہا) تھا وہ اس کا اس حد تک معتمد علیہ ہو گیا کہ سلطان رضیہ ہاتھی اور گھوڑے کی سواری کے وقت اس کے بازو یا کندھے پر تکیہ لگا کر بیٹھتی۔ اس سے دوسرے امراء کے دل میں آتش حسد بھڑک اٹھی۔ سلطان رضیہ نے پردہ نشینی بھی ترک کر دی اور مردانہ لباس زیب تن کر لیا۔ وہ بڑی دلیری سے قبا پہنتی اور سر پر کلاہ رکھ کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتی اور فرائض حکومت سرانجام دیتی۔

۶۳۷ھ میں ملک عزالدین ایاز حاکم لاہور نے کھلے بندوں اس کی مخالفت شروع کر دی، چنانچہ سلطان رضیہ وہاں پہنچی اور اسے اپنے حلقۂ اطاعت میں لائی۔ مزید برآں اس کے علاقہ میں ملتان کا اور اضافہ کر دیا۔ اسی سال اس نے تبرہندہ کی جانب بھی لشکر کشی کی۔ راستہ ہی میں ترک امراء نے جب اس کی بعض ناشائستہ حرکات دیکھیں تو بغاوت کر دی اور سلطان رضیہ اور جمال الدین یاقوت حبشی جو امیر الامراء کے منصب جلیلہ پر فائز تھا ان دونوں کو گرفتار کر کے قلعہ تبرہندہ[1] میں بند کر دیا۔

مجو درستی عہد از جہانِ سست نہاد | کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است
نشانِ عہدِ وفا نیست در تبسم گل | بنال بلبل بیدل کہ جائے فریاد است

سلطان معزّ الدین بہرام بن شمس الدین التمش

سلطان رضیہ کے بعد سلطان معزّ الدین بہرام تخت نشین ہوا اور دہلی پہنچا۔ اس وقت ملک اختیار الدین التونیہ حاکم تبرہندہ نے سلطان رضیہ کے ساتھ عقد نکاح کر کے تمام زمینداروں، جاٹوں اور کھوکھروں کی جماعت اور ان کے امراء میں سے چند ایک کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا اور ان کی مدد اور اعانت سے دہلی کی جانب فوج کشی کی تھی۔ سلطان معزّ الدین بہرام نے ملک بلبن خورد کو جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوا۔ ملک اختیار الدین التونیہ کے مقابلہ میں بھیجا۔ رضیہ بھی ملک التونیہ کے ساتھ تھی۔ جب ملک بلبن خورد کی فوجیں میدان جنگ میں آئیں۔ رضیہ کے لشکر میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ تبرہندہ واپس چلی گئی مگر چند روز کے اندر ہی دوبارہ فوجوں کو اکٹھا کر کے تسخیر دہلی کے ارادہ سے چل پڑی اور قصبہ کیتھل[2] پہنچی، مگر اس بار بھی ملک بلبن خورد کے مقابلہ کی وہ تاب نہ لا سکی اور شکست کھا کر بھاگ نکلی۔ راستہ میں التونیہ اور رضیہ دونوں کو ہندوؤں[3] کے ہاتھ آ گئے اور سلطان معزّ الدین بہرام کے حکم سے انھیں قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۶۳۷ھ[4] کا تھا۔

۱؎ طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ جمال الدین کو قتل کر دیا گیا۔

۲؎ کیتھل سنسکرت میں اس کا نام کپستھالا تھا۔ کرنال سے ۳۸ میل کے فاصلہ پر ہے اور دہلی سے سو میل مغرب کی جانب۔

۳؎ یہ ہندو جاٹوں کی ذات ہے صحیح لفظ گنوارہ معلوم ہوتا ہے اس ذات کے لوگ گوہانہ کے دیہات اور دریائے جمنا کے اس پار دوآبہ میں پائے جاتے ہیں۔

۴؎ تاریخ وفات کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ فوجوں کی مڈبھیڑ ۴ ربیع الاول ۶۳۷ھ کو ہوئی تھی اور رضیہ اور التونیہ دونوں اسی ماہ کی ۲۵ تاریخ کو قتل کر دیے گئے تھے۔ چونکہ رضیہ ۶۳۴ھ کو تخت نشین ہوئی تھی اس لیے ۶۳۷ھ سن وفات زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سلطان رضیہ کی مدتِ حکومت ۳ سال ۶ ماہ اور ۶ روز تھی ؎

سرے را کہ گردون بر آرد بلند
ہمش باز در گردن آرد کمند

جب سلطنت کی زمامِ اختیار سلطان بہرام شاہ کے ہاتھ آئی تو ملک اختیار الدین اتیگین جو پہلے حاجب تھا اور سلطان کی ہمشیرہ اس کے نکاح میں تھی اور نظام الملک مہذب الدین کی تائید و حمایت سے مملکت کے جملہ امور پر وہ حاوی تھا اور ہمیشہ ایک بہت بڑا ہاتھی بادشاہوں کی طرح اپنے دروازے پر باندھے رکھتا تھا، ۶۳۷ھ میں اسے اور نظام الملک مہذب الدین وزیر دونوں کو چند فدائیوں[۱] نے سلطان کے اشارے پر قتل کر دیا۔ اسی سال سلطان نے امراء، اکابر، اعیان، صدور اور قاضیوں کی ایک جماعت کو جو درپردہ یہ سازشیں کرتی تھی کہ کسی طرح سلطان کو تبدیل کر کے اس کی جگہ کسی دوسرے کو بٹھایا جائے، تہس نہس کیا۔ ان میں سے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو جیسے بدرالدین سنقر امیر حاجب وغیرہ کو بدایوں بھیج دیا جہاں وہ قید خانے ہی میں مر گئے۔ اُن میں سے ایک قاضی جلال الدین کاشانی کو فوجی عہدہ سے معزول کر کے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا اور قاضی شمس الدین قاضی مارہرہ[۲] کو ہاتھی کے پاؤں میں روندوا دیا۔

۶۳۹ھ میں مغل چنگیز خاں کی فوجوں نے آ کر لاہور کا محاصرہ کیا اور ملک قراقش حاکم لاہور آدھی رات کے وقت بھاگ کر دہلی چلا گیا اور سلطان کو جملہ حالات سے آگاہ کیا۔ سلطان نے مناسب سمجھا کہ ایسے نازک وقت پر امراء سے از سرِ نو بیعت لی جائے، چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور ان سب کے مشورہ سے نظام الملک وزیر کو مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پنجاب بھیجا۔ نظام الملک کا دل پہلے ہی سلطان کی طرف سے صاف نہیں تھا چنانچہ اس نے مکر و نفاق سے سلطان کو ایک خط لکھا، جس میں اپنے ہمراہی امراء کی شکایت کی اور سلطان سے درخواست کی کہ وہ بنفسِ نفیس تشریف لائیں۔ خط کے مضمون سے سلطان نے فوراً بھانپ لیا کہ دال میں کالا ضرور ہے اس لیے اس نے بڑے سادہ لفظوں میں نظام الملک کو ایک فرمان کے ذریعہ اطلاع دی کہ منافق اُمراء اپنے وقت پر اس کی سزا پائیں گے، نظام الملک کو یہ لازم ہے کہ اس وقت اُن کے ساتھ خاطر مدارات سے پیش آئے۔ نظام الملک نے سلطان کا یہ فرمان بجنسہٖ امراء کے سامنے رکھ دیا اور اس طرح اُن کو اپنا طرفدار بنا لیا۔ سلطان معزالدین بہرام شاہ نے شیخ الاسلام خواجۂ خواجگان قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہٗ العزیز کو نظام الملک کے امیروں کے پاس بھیجا کہ وہ اُنھیں سمجھائیں بجھائیں اور اصلاح حال کریں مگر بے سود۔ شیخ الاسلام دہلی واپس تشریف لے آئے اور اُن کے پیچھے پیچھے نظام الملک اور دوسرے امراء بھی پہنچ گئے اور اُنھوں نے دہلی کا محاصرہ[۳] کر لیا۔ سلطان کو گرفتار کر کے قید کر لیا اور چند روز کے بعد اُسے دوسرے عالم میں پہنچا دیا اور اس کی جگہ دوسرے کو بادشاہ بنا دیا ؎

---

[۱] فرشتہ کے نزدیک دو ترک شراب میں مست تھے۔

[۲] طبقاتِ ناصری میں اس کی یہ تفصیل لکھی ہوئی ہے کہ ایک درویش کی چال بازیوں اور حیلہ سازیوں کا یہ نتیجہ تھا جو حسد کے مارے قاضی مارہرہ کی مقبولیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

[۳] ہفتہ ۱۹ شعبان ۶۳۹ھ کو محاصرہ کیا جو شعبان کے مہینہ تک رہا۔ (طبقاتِ ناصری)

زمانہ دیر شد کیں رسم دارد — کزیں بستاند و با آں سپارد

اس کی مدت حکومت ۲ سال ایک ماہ اور ۱۵ روز تھی۔

سلطان علاؤالدین مسعود شاہ بن رکن الدین فیروز شاہ

سنِ مذکورۂ ماسبق کے آخر میں اپنے چچا سلطان ناصرالدین محمد اور سلطان جلال الدین جو اولاد سلطان شمس الدین التمش سے تھے ان سب کی متفقہ رائے سے وہ تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ اس وقت قید خانہ میں تھا مگر عزالدین بلبن بزرگ نے اپنی یک روزہ تخت نشینی کے دوران ہی اس کی رہائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ملکوں اور امیروں میں سے کوئی بھی عزالدین بلبن بزرگ کی تخت نشینی پر خوش نہیں تھا اس لیے جب انھوں نے علاؤالدین کے بارے میں سُنا تو سب نے ادھر رجوع کیا۔ ملک قطب الدین حسن کو نائب اور ملک مہذب الدین نظام الملک کو وزیر ممالک مقرر کیا گیا مگر ۶۴۰ھ میں سلطان علاؤالدین مسعود شاہ کے امراء نے مہذب الدین نظام الملک کو قتل کرا دیا ؎

بناید تیز دولت بعد چوں گل
کہ آب تندرو زود افگند پل

اب وزارت صدرالملک نجم الدین ابوبکر کے سپرد ہوئی۔ ملک غیاث الدین خورد جو پہلے الغ خاں کے نام سے مشہور تھا اور بعد میں سلطانی کے منصب جلیلہ پر فائز ہوا اسے امیر حاجب مقرر کیا گیا۔ ناگور، سندھ اور اجمیر کی عنان حکومت ملک عزالدین بلبن کے ہاتھ دی گئی اور بدایوں ملک تاج الدین یلدوز کو عطا کیا گیا۔ اسی سال طغا خاں نے جو آگرہ[1] سے لکھنوتی کی جانب گیا تھا۔ شرف الملک اشعری کو ایک خط دے کر سلطان علاؤالدین کی خدمت میں بھیجا اور سلطان نے چتر لعل اور خلعت خاص حاکم اودھ[2] کے توسط سے سنجف خاں کے پاس لکھنوتی بھیجی اور اپنے مذکورہ صدر چچا کو قید سے رہا کرایا۔ اُن میں سے قنوج کا علاقہ ملک جلال الدین کے سپرد کیا اور بہرائچ ملک ناصرالدین محمد کے حوالے کیا۔ ان دونوں علاقوں میں اُنھوں نے پسندیدہ کارنامے دکھائے۔

۶۴۲ھ میں مغلوں کی فوجیں لکھنوتی پہنچ گئیں۔ قیاس یہ ہے کہ مغل تبت اور خطا کے راستہ آئے ہوں گے، چنانچہ سلطان علاؤالدین نے تیمور خاں قرابیگ کو طغا خاں کی مدد کے لیے بھیجا اگرچہ ان دونوں نے مل کر مغلوں کو شکست دی مگر ان کے درمیان آپس میں اَن بن ہو گئی۔ طغا خاں دہلی چلا آیا اور لکھنوتی میں تیمور خاں برقرار رہا۔ اسی سال مغلوں کے لشکر نے اچھ کے نواح میں لوٹ مار شروع کر دی۔ سلطان کو جب معلوم ہوا تو وہ پوری تیزی کے ساتھ کوچ پر کوچ کرتا دریائے بیاہ کے کنارے پہنچا۔ جب مغلوں کو اس کی خبر ملی تو وہ اچھ کے محاصرہ سے دستبردار ہو کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد سلطان دہلی واپس آگیا اور اس نے گرفتاریوں اور خوں ریزی کا بازار گرم کیا کہ اُمراء اور اکابر اُس سے برگشتہ ہو گئے اور اُنھوں نے متفقہ

---

[1] آگرہ غلط ہے، اس کے بجائے کڑہ ہونا چاہیے جو دریائے گنگا کے کنارے ہے۔ یہ مقام اکبر بادشاہ سے پہلے پایۂ تخت تھا۔ (امپیریل گزیٹر)

[2] قاضی جلال الدین کاشانی۔

رائے سے ملک ناصرالدین محمود کو بہرائچ سے بلا بھیجا۔ جب وہ دہلی پہنچا تو ۶۴۴ھ میں اُنھوں نے سلطان علاؤالدین مسعود کو گرفتار کر کے قید کر دیا جہاں سے وہ قید خانۂ جاوید کو چلا گیا ؎

چنیں است آئین گردندہ دہر
کہ بخشد بلطف و ستاند بقہر

اس کی مدت حکومت چار سال ایک ماہ تھی۔

سلطان ناصرالدین محمود بن شمس الدین التمش

۶۴۴ھ میں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے غیاث الدین بلبن خورد کو جو معتاً بزرگ تھا، اپنا وزیر بنایا۔ وہ اس کے والد کا غلام اور داماد تھا۔ جلوس کے وقت بے شمار تحفے سلطان ناصرالدین کی خدمت میں پیش کیے گئے اور شاعروں نے اس کی تہنیت میں اشعار کہے۔ اُن میں سے چند اشعار یہ ہیں ؎

آں خداوندے کہ حاتم بذل و رستم کوشش است
ناصر دنیا و دیں محمود بن التمش است

آں جہاں دارے کہ سقفِ چرخ در ایوان او
در علو مرتبت گوئی فرد دیں پوشش است

سکہ زالقاب ہمیونش چہ انداز دستِ تو
خطبہ را ز اسم ہمایونش چو مایہ نازش است

اس کے عدل و انصاف اور اخلاقِ حمیدہ کی یادگار کتاب طبقاتِ ناصری ہے جو اس کے نام سے منسوب ہے۔ سلطان نے جمیع امور سلطنت غیاث الدین بلبن کے سپرد کر کے اسے خطابِ الغ خانی دیا، ساتھ ہی تاکید کی کہ جملہ اختیارات کی عنان اس کے ہاتھ اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے کل حضرتِ بے نیاز کے حضور اسے اور سلطان دونوں کو ندامت اُٹھانی پڑے۔ سلطان کا اپنا یہ مشغلہ تھا کہ وہ حجرہ میں بیٹھ کر زیادہ تر وقت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے ذکر و تلاوت اور عبادت میں صرف کرتا۔ اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دربار عام میں سرو پائے شاہانہ سے اپنے جسم کو مزین کرتا اور خلوت میں پُرانی گدڑی پہنتا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنی بسر اوقات قرآن مجید کی کتابت کی آمدنی سے کیا کرتا۔ سلطان ناصرالدین محمود کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں زبان زدِ خاص و عام تھیں جن سے خلفائے راشدین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک کتاب میں راقم الحروف نے یہ پڑھا کہ ایک روز اس کی بیوی نے شکایت کی کہ اس کے پاس کوئی کنیز نہیں، جس کی وجہ سے روٹی پکاتے پکاتے اس کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اس کے جواب میں سلطان نے رو کر کہا کہ یہ جہانِ گزراں ہے چند روز اس تکلیف پر صبر کرو، خداوند تعالیٰ کل قیامت کو تمھارے صدقہ اس مصیبت کے عوض ایک حور خدمت کے لیے عطا کرے گا۔ اس وقت اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بیت المال کے خرچ سے کوئی کنیز خریدے۔ یہ سن کر اس کی بیوی مطمئن ہو گئی ؎

جہاں خوابے است نزد چشم بیدار
بخوابے دل نہ بندد مرد ہشیار

سلطان ماہ رجب میں لشکر کے ساتھ جانب ملتان روانہ ہوا اور ذیقعدہ میں اس نے دریائے راوی عبور کیا۔ الغ خاں کو

مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے کوہ جود اور اطراف نندنہ میں بھیجا اور خود دریائے سندھ کے کنارے توقف کیا۔ اس اثناء میں الغ خاں نے اس نواح کے سرکشوں کی سرکوبی کی اور اسے اپنے احاطۂ اختیار میں لایا۔ اس نے کھوکھروں اور دوسرے شورہ پشتوں کی بھی گوشمالی کی، اس کے بعد سلطان کے ساتھ آملا پھر دونوں ایک ساتھ دہلی واپس ہو گئے۔ ۶۴۵ھ میں سلطان نے میوات کا قصد کیا اور اسے مسخر کرنے کے بعد علاقہ دوآبہ کی جانب بڑھا، نیز اسی سال الغ خاں کو کٹرہ کی حدود سے سرکشوں کو نکالنے کے کام پر مامور کیا اور وہ کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ دہلی لوٹ آیا۔

۶۴۶ھ میں سلطان نے رنتھمبور کی جانب لشکر کشی کی، اس شہر کے مفسدوں اور فتنہ پردازوں کا سر کچلا اور واپس آیا۔

۶۴۷ھ میں اس نے الغ خاں کی دختر کے ساتھ نکاح کیا۔

۶۴۸ھ میں اس نے ملتان پر چڑھائی کی۔ چند روز بعد جب ملک عزّالدین بلبن بزرگ حاکم ناگور نے سرکشی کی تو سلطان ادھر متوجہ ہوا۔ اس نے امان چاہی اور پھر وفادار امرائے بارگاہ میں شامل ہو گیا۔

۶۴۹ھ میں سلطان نے گوالیار، چندیری اور مالوہ کی جانب مارچ کیا۔ راجہ جاہر دیو پانچ ہزار سوار اور دو لاکھ پیادہ فوج کے ساتھ مقابلہ کے لیے باہر نکلا مگر شکست کھائی اور قلعہ بزور مفتوح ہوا، اسی سال شیر خاں حاکم ملتان اور ملک عزالدین بلبن بزرگ جو اس کی کمک کے لیے ناگور سے روانہ ہوا تھا ان دونوں نے قلعہ اُچھ فتح کیا۔ شیر خاں اسی قلعہ میں رہا مگر عزّالدین بلبن بزرگ سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ سلطان نے اسے اضلاع بدایوں کی جاگیر عطا کی اور خطاب کشلو خاں سے نوازا۔

۶۵۰ھ میں سلطان نے دہلی سے لاہور کا قصد کیا، وہاں سے پھر ملتان اور اُچھ کی جانب روانہ ہوا اس سفر میں کشلو خاں دریائے بیاہ تک اس کے ہمراہ تھا۔

۶۵۱ھ میں سلطان دہلی سے کوچ کر کے تبرہندہ، اوچھ اور ملتان پہنچا۔ یہ علاقہ شیر خاں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور سندھی اس پر قابض تھے اس نے دوبارہ اس پر قبضہ کیا۔ پھر ارسلان خاں کے حوالے کر دیا اور خود دہلی لوٹ گیا۔

۶۵۲ھ میں سلطان نے بجنور کے پہاڑوں کے دامن میں اپنا لشکر جمع کیا اور جوالا پور کے پاس سے دریائے گنگا پار کیا پھر دامنِ کوہ کے ساتھ چلتے چلتے دریائے رہاپ تک پہنچا۔ راستہ میں جہاں کہیں پہنچا تاخت و تاراج کرتا گیا اور آدمیوں کی ایک کثیر تعداد کو اس نے گرفتار کیا پھر کٹھیر کی جانب بڑھا وہاں سے بدایوں اور اودھ پہنچا اور اس کے بعد پایۂ تخت کو روانہ ہو گیا۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے خبر ملی بعض امراء مثلاً الغ خاں اعظم، ارسلان خاں وغیرہ جن کو سلطان کے برادر ملک جلال الدین کی تائید و حمایت حاصل تھی، اُن سب نے مل کر مخالفت شروع کر دی۔ خبر ملتے ہی سلطان نے فوراً دہلی سے کوچ کیا مگر جب وہ تبرہندہ، کہرام اور کیتھل کے نواح میں پہنچا تو چند امراء کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مخالف امراء آمادۂ صلح و آشتی ہوئے۔ اور انھوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنے جان و مال کی پناہ چاہی اور وعدہ کیا کہ وہ حسب سابق سلطان کے مطیع و فرمانبردار رہیں گے سلطان نے لاہور کی حکومت ملک جلال الدین کے سپرد کی اور خود پایۂ تخت دہلی واپس چلا آیا۔

۶۵۳ھ میں سلطان کا مزاج اپنی والدہ ملکہ جہاں کی طرف سے کچھ بدل سا گیا چنانچہ اس نے قتلغ خاں کو جس کے حبالۂ عقد میں ملکہ جہاں تھی کچھ جاگیر عطا کی اور چند روز بعد اسے وہاں بہرائچ بھیج دیا۔ مگر بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر وہ اتنا خائف تھا کہ بہرائچ میں زیادہ دن قیام نہ کر سکا اور کوہ سرمور کی جانب چلا گیا۔

جہاں ملک عزّ الدین کشلو خاں اور بعض دوسرے اُمرا نے اس کی بہت افزائی کی، پھر سب نے مل کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان نے الغ خاں کو لشکرِ عظیم کے ساتھ اُدھر بھیجا۔ جب فریقین ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو شیخ الاسلام سید قطب الدین، قاضی شمس الدین بہرائچی اور کچھ دوسرے امرا نے قتلغ خاں کو ترغیب دی کہ وہ دہلی پر دھاوا بول دے اور اُس پر قبضہ کر لے۔ دہلی کے باشندوں نے بھی اس سلسلہ میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جب الغ خاں نے سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے حکم دیا کہ جن لوگوں نے قتلغ خاں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں اپنی جگہ چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔ قتلغ خاں اور ملک عزالدین کشلو خاں نے سو کروہ[1] کی مسافت دو روز میں طے کی اور سامانہ سے دہلی پہنچے، مگر دہلی کی جس جماعت نے اُن کو طلب کیا تھا اس کے آدمیوں کا کہیں نام ونشان بھی نہ ملا۔ یہ دیکھ کر دونوں کی بے حد حوصلہ شکنی ہوئی اور اُنھوں نے الگ الگ راہ فرار اختیار کی، جدھر مُنہ اُٹھا چل دیے،[2] مگر بعدہٗ الغ خاں سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

۶۵۵ھ[3] میں سلطان نے دہلی کے چند اکابر و اعیان کے اخراج کا حکم دیا۔ اسی سال کے آخر میں مغل اُوچھ اور ملتان کی حدود میں آوارد ہوئے جب کہ عزّ الدین کشلو خاں اُن کے ساتھ مصروفِ جنگ آزمائی تھا۔ سلطان بھی تیزی سے آ پہنچا۔ مغل اس کا مقابلہ نہ کر سکے اس لیے وہ خراسان کی جانب لوٹ گئے۔ اس کے بعد سلطان نے بھی لوائے مراجعت پایۂ تخت کی جانب اٹھایا اور ملک جلال الدین جانی کو خلعت عطا کر کے لکھنوتی بھیج دیا۔

۶۵۶ھ میں ترکستان کے کچھ ایلچی سلطان کے پاس آئے جنھیں سلطان نے بے شمار انعام و اکرام کے ساتھ واپس کیا۔ اسی سال حضرت گنج شکر[4] اصلح[5] اللہ اعلیٰ ذکرہٗ اس سرائے بُعد وحرماں سے دارِ قرب و رضوان کی جانب تشریف لے گئے۔

۶۵۷ھ میں لکھنوتی سے بے شمار ہاتھی اور خزانے اور بے حد وحساب جواہرات بطور تحفہ بھیجے گئے۔ اسی سال ماہِ رجب میں ملک عزالدین کشلو خاں لعین اس دنیائے فانی کی تگ و دو سے تنگ آ کر ملکِ آخرت کو سدھارا اور اسی سال غوث العالم حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ نے بھی خیمۂ وصالِ ذوالجلال عزّ شانہٗ کے جوارِ قدس میں جا نصب کیا۔ ایک عزیز نے یہ مصرعۂ تاریخ کہا ہے ؎

زتیرِ عشقِ ربّانی یکے زخمی دگر خون شد

---

[1] آئین اکبری میں ۱۸۰ میل لکھا ہے۔

[2] طبقات ناصری کے نزدیک یہ دونوں ملک شوالک کی جانب چلے گئے۔

[3] طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ یہ واقعات ۶۵۶ھ میں رونما ہوئے تھے۔

[4] حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر فرخ شاہ کابل کے پوتے تھے، والد کا نام کمال الدین سلیمان تھا۔ شہاب الدین غوری کے عہدِ حکومت میں آپ کابل سے ملتان آئے تھے۔ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کا انتقال اپنے پیرو مرشد کے انتقال کے دو سال بعد ہوا تھا۔ اُن کا مقبرہ پاک پٹن میں ہے۔ شیخ مخدوم گنج شکر کے سن وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ ملا بدایونی نے ۶۵۶ھ لکھا ہے۔ اسی طرح شیخ بہاؤالدین زکریا کا سنِ وفات بھی ۶۵۶ھ لکھا ہے، مگر فرشتہ کے نزدیک شیخ بہاؤالدین زکریا کا سنِ وفات ۶۶۶ھ تھا اور شیخ گنج شکر کا ۶۶۸ھ۔ آئینِ اکبری میں بھی شیخ گنج شکر کا سنِ وفات ۶۶۸ھ لکھا ہے اور شیخ زکریا کا ۶۶۵ھ۔

[5] اصلح کے بجائے اجلّ ہونا چاہیے۔

۶۵۸ھ میں سلطان ناصر الدین محمود نے میوات وغیرہ کے علاقوں کی تنبیہہ کی اور جب ملک پر اس کا پوری طرح قبضہ ہوگیا تو ۶۶۴ھ میں بیمار پڑ گیا اور عالم خواب وخیال سے آنکھیں بند کر کے مُلکِ باقی میں چلا گیا۔ اس کا کوئی وارثِ تخت وتاج نہیں تھا۔ مدتِ حکومت ۱۹ سال ۳ ماہ اور چند روز تھی۔ اس کی قبر دہلی میں ہے، ہر سال اس پر ایک اجتماع عظیم ہوتا ہے ؎

بیا ویک نظر اعتبار کن در خاک
کہ خاک تکیہ گہ خسروانِ معتبر است

اس جماعت میں سے جس نے کہ عہدِ ناصری میں شاعری کا ڈنکا بجایا اور ملک العلامی کے درجہ پر پہنچا، ایک شاعر شمس الدین دبیر تھا جس کے فضائل وکمالات حدِ بیان وتعریف سے مستغنی ہیں۔ امیر خسرو قدس اللہ سرہٗ نے اپنے اشعار کا معیار اس کے سلیقے کو قرار دیا اور اس پر بے حد فخر ومباہات کیا۔ دیباچۂ غرۃ الکمال اور اپنے کلام ہشت بہشت کے خاتمہ پر اس نے شمس الدین دبیر کی خوبیوں کے ذکر اور اس کے اوصاف کے اظہار سے اپنی کتابوں کو مزین کیا ہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن خورد نے جب کہ شمس الدین دبیر کی عمر کا آخری حصہ تھا، اُسے مملکتِ بنگالہ اور کامرود کا منشی مقرر کر کے اپنے پسرِ بزرگ نصیر الدین بغرا خاں کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ چند اشعار اس کے ایک قصیدہ کے ہیں ؎

این ہمہ کارِ دلم از تو بنادانی خام — دادۂ دوش مرا وعدہ مہمانیِ خام
پختہ کردم ہمہ شب چشم ندانستم کاں — طمع بود ازاں گونہ کہ میدانیِ خام
پختہ دارم دل از اندیشۂ رویت کہ چہ ساست — زنگ تو پختہ ہمیں نقرۂ پیشانیِ خام
سُست میدارم وہرچند قوی میکندم — ریسمانے است زمن تا بہ پریشانیِ خام
گفتیم ہیچ مسلماں نخورد خام بہ بیں — غم تو میخورم این ست مسلمانیِ خام
بسکہ در تو وفرِ ملکِ حیرانم — کار ناپختۂ من ماندہ زحیرانیِ خام
چوں ملک خسرو ثانی است نماند ہرگز — کارم از دولت خسرو ملکِ ثانیِ خام
ناصرِ دنیا ودیں آنکہ بہ پیش ملکش — شد زشاہاں ہوس ملکِ سلیمانیِ خام
شاہِ محمود شہ آں سلطان کز قدر پدر — یکساں در آرزویش نیست زسلطانیِ خام

ملک الملوک والکلام امیر فخر الدین عمید تولکی نے بھی ایک قصیدہ میں لکھا ہے ؎

چو بر دارد نگارم چنگ بندد زخم بر ناخن — زند ناہید را صد زخمِ غیرت بر جگر ناخن
ز رشکِ چنگ اُو ناہید را تپ گیرد آں ساعت — کبودش گردد از تاثیر آں تب سر بسر ناخن
حنا بر ناخنش خونیں شمر کز وقتِ رگ جستن — ز چنگِ خشکِ نے ناگہ بجست وکرد تر ناخن
بیا وردہ بطلعت اے مہِ دلداری کہ بارویت — عروسِ ماہ خونِ دل ز رشک آوردہ در ناخن

شہنشہ ناصرِ دنیا ودیں محمود کز عدلش
بمنقار افگند تیہو ز بازِ تیز پر ناخن

جبکہ عمید کا ذکر درمیان میں آگیا جو جملہ ممالک ہند کا کنٹرولر تھا، تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ اور نادر الوجود اشعار درج کیے جائیں، چنانچہ ذیل میں ملاحظہ ہوں ؎

بر خیز عمید ارنہ فسرد است دل تو — بگذر ز غزل حمد خداوندِ جہاں گو
مداحیٔ درگاہ خدا کن کہ برافراشت — بے زحمتِ آلات بسے گنبد مینو
دو شاہ رواں کرد بریں طارم ازرق — پس داد ز سیارۂ شاں فیل ز ہر سو

مراست دیدہ محیط و خیال جاں کشتی — بر آب دیدہ ز غم میکنند رواں کشتی
در آب دیدہ شب و روزم و چگونہ بود — فراز و شیب ز خوں موج و درمیاں کشتی
چہ سود دارم آں بادباں و آں لنگر — چو شد ز موجِ اجل غرق ناگہاں کشتی

زہے ز نرگسِ مستِ تو پُر خمار آہو — ز بند نافۂ خشکِ تو شرمسار آہو
بحیر تست در آں چشمِ دیدۂ نرگس — بغیر تست در آں زلفِ مشکبار آہو
چہ صنعت است در آں نرگسش کہ آں غمزہ — درو کش عمید دل ست و برو شکار آہو

قدِ چو نادش گرد خیزراں روزہ — زار غوانش بروں دادہ زعفراں روزہ
چہ زعفراں کہ نخندم ازاں واز گریہ — نذیر کرد رخ و اشکم ارغواں روزہ
چہ لالہ بود کہ خیریش مید ہد گو نہ — چہ سرد بود کہ میداردش نواں روزہ
گل شگفتۂ او تا بغنچہ باز نشد — یقیں نشد کہ گرفت است گلستاں روزہ

منکہ چوں سیمرغ دریک گوشہ مسکن کردہ ام — اوراے مرکز خاکی نشیمن کردہ ام
ننگِ بر مرغے دریں بوم از چہ معنی میکشم — رفتہ ام عنقا صفت در کوہ مسکن کردہ ام
مرغِ ہمت تا نگردد خرمن سفلی گرا — خرمنِ چرخش ز انجم پُر ز ارزن کردہ ام

سلطان غیاث الدین بلبن خورد

الغ خانی خطاب تھا۔ ۶۶۴ھ میں تمام اُمراء اور ملوک کی متفقہ رائے سے قصر سفید میں اس نے تختِ سلطنت کو زینت بخشی۔ یہ سلطان التمش کے اُن چالیس غلاموں میں سے تھا جن میں سے ہر ایک منصبِ امارت پر فائز ہوا۔ جب کہ وہ ابھی الغ خاں تھا اور زمامِ مملکت اس کے ہاتھ میں تھی اُس نے مملکت کے کاموں پر بخوبی قابو پالیا تھا۔ وہ رذیلوں کو کبھی اپنے امور

یں مداخلت کا موقعہ نہیں دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ فخر نام ایک رئیس بانار سالہا سال تک اس کی ملازمت میں رہا۔ ایک مرتبہ اس نے سلطان کے مقربین میں سے ایک تک کسی طرح رسائی پیدا کرلی اور اس سے یہ التجا کی کہ اگر اُسے ایک بار سلطان غیاث الدین کے ساتھ بات کرنے کا موقعہ مل جائے تو وہ اپنی تمام قیمتی جائداد اور مال و زر اس کے عوض دے دے گا۔ جب یہ التجا سلطان کے گوش گزار کی گئی تو اُس نے اُسے قابلِ قبول نہ سمجھا اور یہ کہہ کر رد کر دیا کہ سفیہوں اور رذیلوں کے ساتھ بات کرنا اس کے وقار کے خلاف اور نقصان دہ ہے۔ وہ ظلم و تشدد کے بالکل خلاف تھا چنانچہ اپنی حکومت کے ابتدائی ایام میں اس نے چند امراء کو محض اس بنا پر سزا دی تھی کہ اُنھوں نے رعایا پر ظلم و تشدد کیا تھا۔ اُن میں سے ایک دو کو تو مدعیوں کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ خود اُن سے قصاص لیں۔ جن امیروں نے زرِ قصاص ادا کر دیا وہ جب تک زندہ رہے شرم کے مارے اپنے گھر سے باہر نہ نکلے یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو گئے ؎

نامداری بعدل و داد بود
ظلم و شاہی چراغ و باد بود

اس کے تمام اوصاف حمیدہ کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی بے طہارت نہیں رہتا تھا اور مجالس وعظ میں بے حد گریہ و زاری کیا کرتا۔ مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ہی وہ سرکشوں اور باغیوں کا سر کچلنے میں بڑی سختی برتتا تھا ؎

فرکیخسروی ازیں جا خواست — کہ جہاں را بعلم و عدل آراست
روز خلوت گلیم پوشیدے — بنماز و نیاز کوشیدے
روئے بر ریگ و دل چو دیگ بجوش — دل سخن گستر و زباں خاموش
تابدیدے دلش بدیدۂ راز — دید پنہائے ایں نشیب و فراز

اسی سال تاتار خاں پسر ارسلان خاں نے لکھنوتی سے ۶۳ ہاتھی بطور تحفہ بھیجے اور اسی سال نیپالی[1] اور کنپلہ[2] جلاتے ہوئے بھوجپور[3]، کچھ، پٹیالی اور کنپلہ کے قلعے مسخر کیے۔ پانچ ہزار سوار کے ساتھ کوہ جود کی مہم کی تیاری کے بہانے اُس نے دریائے گنگا عبور کیا۔ روانگی دہلی سے دو روز کے اندر ہی وہ کاتیہر[4] کے علاقہ میں پہنچ گیا جہاں اس نے ہر مرد کو قتل کرا دیا یہاں تک کہ آٹھ سال کے بچے کو بھی نہ چھوڑا، اور عورتوں کو مقید کر دیا۔ اس علاقہ کے باشندوں کو اس نے ایسی سزائیں دیں کہ جلال الدین کے عہد تک بدایوں اور امروہہ کی مملکت کاتیہریوں کے شر سے محفوظ رہی۔ بہار، جون پور اور مشرقی ہندوستان جانے والے تمام راستے جو پہلے بند تھے، اس نے ان سب کو کھول دیا نیز میوات کی مملکت جو دوآبہ کے درمیان واقع ہے اسے طاقتور سرداروں کے سپرد کیا اور اُن کو حکم دیا کہ باغیوں کو قتل کر دیں۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور کچھ باغیوں کو قید بھی کیا گیا۔ اس کے بعد

۱؎ تحصیل علی گڑھ میں ہے۔ ایٹہ سے ۲۲ میل شمالی جانب۔ مسمار قلعہ کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ (امپیریل گزیٹر)
۲؎ فرخ آباد ضلع میں ہے۔ مہابھارت میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے۔ (امپیریل گزیٹر)
۳؎ بھوج پور۔ اوجین راجاؤں کی راجدھانی۔ آرہ کے مغربی جانب اور سہسرام سے شمالی جانب ہے۔
۴؎ کاتیہر۔ روہیل کھنڈ کا ایک ضلع۔ (تاریخ فیروز شاہی)

سلطان نے کوہِ سنتور[1] کے دامن میں آباد علاقہ پر چڑھائی کی اور وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا، اس کے گرد حصار[2] نو کھڑا کر کے پھر وہ کوہ جود کی جانب روانہ ہو گیا۔ لشکر کے ساتھ لاہور پہنچا۔ اس نے قلعہ لاہور از سرِ نو تعمیر کیا۔ سلطان معزّ الدین بہرام شاہ کے عہدِ حکومت میں یہ مغلوں کے ہاتھوں بُری طرح ویران ہوا تھا اور اُس وقت تک اسی حالت میں تھا۔ یہاں سلطان بیمار ہو گیا۔ اُس کی بیماری کی خبر لکھنوتی پہنچی تو طغرل نائب امین خاں نے جسے شیر خاں کے بعد وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، سرکشی کی اور اپنے آقا امین خاں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ امین خاں نے اسے مغلوب کیا اور قید کرنے کے بعد شان و شوکتِ شاہی کے جملہ ساز و سامان پر قبضہ کر لیا اور اپنے آپ کو سلطان معزّ الدین کا خطاب دیا۔ سلطان غیاث الدین بھی طغرل کے خلاف فوج لے کر پہنچا تھا مگر وہ جاج نگر اور تارکیلہ کی جانب نکل گیا اس لیے ملک اختیار الدین برلاس کو اس کے تعاقب کا حکم دیا گیا۔ سنار گام کے راجہ دھنوج نے سلطان کو یہ پیش کش کی کہ وہ طغرل اور ملک اختیار الدین کو پکڑ کر لائے گا۔ طغرل جنگل کی جانب بھاگ گیا تھا۔ ایک روز غفلت میں پا کر اس کا سر کاٹ دیا اور اسے سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلطان نے وہ مملکت اپنے پسرِ خورد بغرا خاں حاکم سامانہ کو چتر اور عصائے اختیار کے ساتھ دے دی۔ بغرا خاں بعد میں سلطان ناصر الدین کے خطاب سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد سلطان پایۂ تخت کو لوٹ آیا۔ چونکہ شیر خاں کی وفات کے بعد مغلوں کی آمد و رفت کا راستہ کھُل گیا تھا۔ واضح رہے کہ شیر خاں سلطان کا عم زاد بھائی اور سلطان شمس الدین التمش کے چالیس غلاموں میں سے تھا، اسے لاہور اور دیپال پور کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس نے غزنی میں سلطان ناصر الدین کے نام کا خطبہ بھی پڑھوایا تھا۔ اس کے ایام حکومت میں مغلوں کو اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ ہندوستان کا رخ کرتے مگر اس کی وفات کے بعد وہ بات قائم نہ رہ سکی اس لیے سلطان بلبن نے اس فتنہ کے تدارک کے لیے اپنے پسرِ بزرگ سلطان محمد کو جو خانِ شہید اور قاآن ملک کے لقب سے ملقب ہوا۔ چتر اور عصائے اختیار اور سلطنت کے دیگر امتیازی نشانات اور ساز و سامان دے کر ولی عہد بنایا اور سندھ مع توابع مضافات اس کے سپرد کر کے ملتان بھیجا۔ ٹھٹھہ تک کا تمام علاقہ اور ساحلِ بحر کا کنارہ اس کے قبضہ میں تھا۔ امیر خسرو دہلوی اور میر حسن دہلوی ملتان میں پانچ سال تک اس کی خدمت میں رہے اور اُن کا شمار قریبی دوستوں کے زمرہ میں ہوتا تھا۔ سلطان نے ملتان سے دو مرتبہ بے شمار زرِ نقد شیراز بھیجا اور شیخ سعدیؒ سے آنے کی درخواست کی۔ شیخ نے پیرانہ سالی کا عذر کیا اور خط میں اس نے سلطان کو یہ مشورہ دیا کہ امیر خسروؒ کی اچھی طرح خاطر و مدارات کی جائے علاوہ ازیں امیر خسروؒ کی حد سے زیادہ تعریف کی اور اپنے ہاتھ سے سفینہ اشعار[3] لکھ کر بھیجا۔

سلطان محمد کا معمول تھا کہ ہر سال سلطان بلبن کو دیکھنے کے لیے دہلی آتا اور خلعت اور انعام و اکرام سے ممتاز ہو کر واپس جاتا۔ آخری بار جب کہ اُن کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی سلطان نے خلوت میں سلطان محمد کو کچھ نصائح بلیغ اور مواعظ دلپذیر کیں اور اسے اجازتِ روانگی دے کر ملتان روانہ کیا۔ اسی سال اینتر[4] مغل نے تیس ہزار سواروں کے ساتھ دریائے

---

[1] ایک دوسرے نسخہ میں کوہ بار سنیور ہے اس سے مراد غالباً کمایوں کے پہاڑ ہیں۔

[2] ایک دوسرے نسخہ میں حصار نو نام نہادہ ہے یعنی اس کا نام حصار نو رکھا۔

[3] گلستاں اور بوستاں۔

[4] ضیاء الدین برنی اس کا نام تمر بتاتے ہیں، فرشتہ سے تیمور خاں لکھتا ہے۔ صحیح کونسا نام ہے واللہ اعلم بالصواب۔

راوی کو لاہور کے پل کے ذریعہ عبور کیا اور اس شہر میں ایک فتنۂ عظیم برپا کیا۔ حاکم لاہور نے اس امر کی اطلاع خان شہید کو لکھ کر بھیجی مگر اس نے اپنی مجلس میں جب خط پڑھ کر سنایا تو بجائے تیس ہزار فوج کے تین ہزار پڑھا پھر ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ تیزی سے کوچ پر کوچ کرتا ہوا باغ سرپر[1] پہنچا جو دریائے راوی کے کنارے ہے کفار کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے اس نے درجۂ شہادت پایا۔ یہ واقعہ ماہ ذی حجہ ۶۸۳ھ[2] میں رونما ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں امیر حسن[3] دہلوی نے ایک مرثیہ نثر میں لکھ کر دہلی بھیجا۔

امیر خسرو کی گرفتاری

اس لڑائی میں امیر خسرو بھی سلطان محمد کے ساتھ تھے۔ انھیں ایک مغل سردار کے غلام نے گرفتار کر لیا۔ وہ ظالم ان کے سر پر اپنے گھوڑے کی جھول اور توبڑہ اٹھوایا کرتا تھا۔ اس سارے واقعہ کو انھوں نے نہایت مؤثر پیرائے میں نظم کیا ہے اور سلطان محمد کی شہادت کے متعلق دو مرثیے[4] بھی لکھے ہیں۔ ان کی پہلی نظم کا مطلع ہے ؎

منکہ بر سر نمی نہادم گل
بار بر سر نہاد دگنتا جل

جب یہ مرثیے دہلی پہنچے تو ایک مہینہ تک لوگ انھیں مجلسوں میں پڑھتے اور اپنے ہلاک ہونے والے عزیزوں کو یاد کر کے روتے رہے۔

بلبن کی وفات

جب سلطان بلبن کو اس شکست اور سلطان محمد کی شہادت کی اطلاع ملی تو اسے بہت صدمہ ہوا اور دنوں تک اس کے ماتم میں مشغول رہا۔ ان مراسم سے فراغت ہوئی تو اس نے اپنے دوسرے لڑکے بغراخاں کو جسے ناصر الدین کا خطاب دے کر لکھنوتی کی حکومت عطا کی تھی خط لکھا کہ "تمھارا بھائی اس طرح مارا گیا اب تم ہی اس کے قائم مقام ہو اور میں اب تمھاری ہی صورت دیکھ دیکھ کر اس کے غم کو بھلانا چاہتا ہوں اس لیے تم فوراً ہی یہاں چلے آؤ۔"

---

[1] باغ سرپر، باغ سبز، باغ سرا، ان تینوں میں تمیز کرنا مشکل ہے کہ صحیح نام کیا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی مقام ہو جو آج کل لاہور کے قریب بادامی باغ کے نام سے مشہور ہے۔

[2] ضیاء الدین برنی کے نزدیک ۶۸۴ھ ہے۔ (صفحہ ۱۰۹ تاریخ فیروز شاہی برنی)

[3] ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ یہ نثری مرثیہ امیر خسرو نے لکھا تھا۔ فرشتہ نے بھی اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ امیر خسرو شہادت کے وقت خان شہید کے ہمراہ تھا مگر کسی وجہ سے اس کی جان بچ گئی اس کے بعد اس نے یہ نثری مرثیہ کہا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ "منتخب التواریخ" کے کاتب نے غلطی سے میر حسن کا نام لکھ دیا ہے ورنہ ملا بدایونی سے ایسی فاش غلطی سرزد نہیں ہو سکتی تھی۔ [4] یہ دونوں مرثیے ترکیب بند میں ہیں اور امیر خسرو کے دیوان "غرۃ الکمال" میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک کا مطلع ہے ؎

واقعہ است ایں یا بلا از آسمان آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
ماچہ ساعت بد کہ کافر بر سر لشکر رسید

دوسرے مرثیہ کا مطلع ہے ؎

اے دل بغم نشیں کہ از شادی نشاں نماند
وسعت غم جہاں ستاں کہ طرب در جہاں نماند

امیر خسرو نے اس واقعہ کا ذکر اپنے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔

بغرا خاں کو لکھنوتی میں مستقل حکومت ملی ہوئی تھی اور وہاں اس کا دل لگ گیا تھا اس لیے اس نے باپ کے بلانے پر پس و پیش کیا اور آنے میں کافی دیر کر دی۔ بادشاہ نے اُسے تاکیدی خطوط لکھے تو وہ دل برداشتہ دہلی پہنچا لیکن حوصلہ آزمائی کی اُمنگ اور حکومت کی چاٹ ایسی لگی تھی کہ جب تک دہلی میں رہا اس کا دل گھبراتا ہی رہا۔ آخر ایک مرتبہ شکار کا بہانہ کر کے چند سرداروں اور مصاحبوں کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور شکار گاہ سے سیدھا لکھنوتی چلا گیا۔

بیٹے کی موت نے بوڑھے بلبن کو بہت مضمحل کر دیا تھا۔ اُس کی عمر بھی اس وقت اَسّی سے کچھ اوپر ہی ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نے محمد خاں شہید کے بیٹے کیخسرو کو خسرو خاں کا خطاب اور تمام لوازمات سلطنت عطا کیے اور اپنا ولی عہد بنا لیا۔ ملتان کا علاقہ اسے بطور جاگیر کے دے دیا اور وصیت کی کہ بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو اس کے باپ کے پاس لکھنوتی بھیج دیا جائے۔ ان سارے انتظامات سے فراغت کے بعد وہ صرف تین دن اور زندہ رہا اور بائیس برس چند ماہ کی حکمرانی کے بعد ۶۸۶ھ میں عالم جاودانی کو کوچ کر گیا۔

سلطان معزّ الدین کیقباد

سلطان بلبن نے خسرو خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا لیکن ایک امیر ملک کچھن نے جسے ایتمر بھی کہتے تھے کچھ اور امراء کے ساتھ مل کر (جو خسرو خاں کے باپ خان شہید کے مخالف تھے) خسرو خاں کے بجائے بغرا خاں کے لڑکے معزّ الدین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت کیقباد کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی۔ تخت نشین ہونے کے بعد کیقباد نے سب سے پہلی کارروائی یہ کی کہ خسرو خاں اور اس کے متعلقین کو ملتان روانہ کر دیا اور وہاں کی عملداری اس کے نام بحال رکھی۔ خسرو خاں کے جتنے ہوا خواہ اور حامی تھے سب کو جلا وطن کر دیا۔ جب ملک کا نظم و نسق حسب مرضی ترتیب پا گیا تو کیقباد نے ملک نظام الدین کو "دادبیگی" اور ملک قیام الدین کو "وکیل" مقرر کیا اور باقی امراء کو ان کے پرانے عہدوں پر ہی بحال رکھا۔

تخت نشینی کا دربار چھ ماہ بعد سلطان کی سواری دہلی سے قصبہ کیلوکھری پہنچی۔ اس موقع پر کیلوکھری کو خوب ہی آراستہ کیا گیا تھا۔ سلطان نے یہاں اپنا پہلا دربار عام منعقد کیا۔ اسی دربار میں خواجہ خطیر الدین کو "خواجہ جہانی" اور ملک شاہک امیر حاجب کو "وزیر خانی" کے خطابات ملے۔ ملک نظام الدین[1] وزیر کے کہنے سے سلطان نے دربار میں نو مسلم مغلوں کو پکڑ بلوایا اور ان سب میں سے اکثر کو قتل کروا دیا۔

کیقباد نے ملک چھجو[2] کی لڑکی سے شادی کی۔ ملک چھجو کو صلہ میں سامانہ کی جاگیر ملی۔

اسی سال ماہ ذی الحجہ کے آخر میں سلطان کو خبر ملی کہ تاتاریوں نے ایتمر کی قیادت میں ملتان اور لاہور کے نواح میں

---

[1] یہ وہی ملک نظام الدین ہے جس کے نام سے "جامع الحکایات" اور محمد عوفی کا "تذکرۂ شعرا" منسوب ہے۔

[2] اس کی تعریف امیر خسرو نے "قران السعدین" میں کی ہے جس کا مطلع ہے:

خانکہ چھجو کشور کشائے — کز لب خانان گرہ بستہ بپائے

فتنہ و فساد مچا رکھا ہے۔ بادشاہ نے شاہک یاربک کو "خان جہانی" کا خطاب عطا کیا اور تیس ہزار سوار دے کر تاتاریوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ شاہک نے تاتاریوں پر دلیرانہ حملے کیے اور ان کو بھگا کر کوہ جود تک تعاقب کیا، بہت سے تاتاریوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور اُن کی ایک بڑی جماعت کو گرفتار کر کے دارالسلطنت میں لے آیا۔

کیقباد کی عیش پسندی

سلطان معزالدین کیقباد اپنے دادا کے زمانہ میں معلّموں اور اتالیقوں کی سخت نگرانی اور تربیت میں پرورش پاتا رہا تھا، اب غیر متوقع طور پر عین عالمِ شباب میں ایک بہت بڑی سلطنت اس کے ہاتھ آ گئی تھی، ملک میں چاروں طرف امن و امان تھا، فارغ البالی اور خوش حالی کی وجہ سے لوگ نہایت اطمینان اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان حالات میں نوجوان بادشاہ بہت ہی جلد عیش و عشرت کا شکار ہو گیا اور اس کے اوقات رنگ رلیوں میں بسر ہونے لگے۔ اس کے دادا کے عہد کے برخلاف بھانڈوں، قوالوں اور بازیگروں نے بادشاہ کے مزاج میں دخل پا لیا اور علم و زہد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر ملک نظام الدین کی بن آئی۔ وہ شاہی خاندان کو ختم کر کے اپنی سلطنت کے سُنہرے خواب دیکھنے لگا۔ اس غرض کے لیے اس نے بادشاہ کو بہکا کر کئی ایک فساد برپا کیے۔ پہلے تو اس نے بادشاہ کو خان شہید کے لڑکے کیخسرو کے قتل پر آمادہ کیا، چنانچہ سلطان نے خسرو کو ملتان سے بلوا کر قصبۂ رہتک میں شہید کرا دیا اس کے بعد خان جہاں پر جھوٹی تہمت لگوا کر اس کی تشہیر کرائی اور ان تمام امیروں کو جن کی نومسلم مغلوں سے قرابت داری تھی قید کر کے دور دراز قلعوں میں روانہ کر دیا۔ بادشاہ کی ان حرکتوں کی وجہ سے دربار کی وہ رونق و سطوت نہیں رہی جو بلبن کے زمانہ میں تھی۔

باپ اور بیٹے کی ملاقات

جب بغرا خاں ناصرالدین نے لکھنوتی میں اپنے بیٹے کا یہ حال سُنا تو اس نے ایک نصیحت آمیز خط لکھا اور اشارۃً نظام الملک کی شرارت کی طرف اسے توجہ دلائی لیکن وہ بادۂ جوانی کی سرمستیوں میں ایسا سرشار تھا کہ باپ کی ایک نہ سُنی، آخر کار طویل مراسلت کے بعد طے پایا کہ باپ بیٹا دونوں اودھ میں ملاقات کریں[1]۔ یہ ملاقات کافی دیر تک رہی اور دونوں نے تفصیلی طور پر آپس میں مشورے کیے۔ ناصرالدین بادشاہ سے مل کر اپنے ڈیرے میں آیا تو اس نے لکھنوتی کے نفیس تحفے بیٹے کے پاس بطور پیش کش روانہ کیے۔ معزالدین نے بھی باپ کی نذر کے لیے عراقی گھوڑے اور طرح طرح کا عمدہ اسباب روانہ کیا۔ اس وقت دونوں طرف کے لشکریوں نے بڑی

---

[1] امیر خسرو کی "قران السعدین" اور "تاریخ مبارک شاہی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات اس قدر مصالحانہ اور پُرامن ماحول میں نہیں ہوئی بلکہ بغرا خاں ناصرالدین بنگالہ سے دہلی پر فوج کشی کے لیے ایک بھاری لشکر لے کر آیا تھا۔ معزالدین اس کی مدافعت کے لیے اودھ پہنچا دونوں لشکر سرجو ندی کے متقابل کے کناروں پر ٹھہر گئے۔ اس موقع پر بلبن کے قدیم امیروں اور سرداروں نے بیچ میں پڑ کر باپ بیٹے میں صلح کرا دی اور طے پایا کہ سلطان ناصرالدین دریا پار کر کے بیٹے کی ملاقات کو آئے بیٹا تخت پر بیٹھے اور باپ تخت کے نیچے کھڑا ہو اس طرح ایک دوسرے کی تعظیم کریں۔ حسب قرارداد جب ناصرالدین دریا اُتر کر آیا تو معزالدین پر باپ کی ملاقات کا شوق ایسا غالب ہوا کہ وہ ننگے پاؤں اس کی طرف دوڑا اور چاہتا تھا کہ قدموں پر گر پڑے لیکن ناصرالدین نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا اور اپنے گلے سے لگا لیا۔ دونوں بغلگیر ہو کر دیر تک روتے رہے۔ باپ نے ہر چند چاہا کہ تخت کے نیچے کھڑا ہو لیکن بیٹے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا اور خود اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

خوشیاں منائیں اور اُن کے افسر بھی ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے آتے جاتے رہے۔ امیر خسرو نے "قران السعدین" میں ان صحبتوں کا پورا نقشہ کھینچا ہے ؎

زہے ملک خوش چوں دو سلطان یکے شد — زہے عہدش چو دو پیمان یکے شد

اسی نظم کا ایک شعر ہے ؎

سلطان معز دین و ابن کیقباد بادشاہ — یک دیدهٔ دو مردمک چار بادشاہ

آخری نصیحت

دوسرے دن سلطان ناصرالدین وداعی ملاقات کے لیے بادشاہ کے پاس آیا۔ نظام الملک اور قوام الملک دونوں سرداروں کے سامنے بادشاہ کو بڑی نصیحتیں کیں اور کثرت شراب نوشی، عیاشی، جماع، نظم و نسق سے بے پروائی، بعض پُرانے سرداروں اور کیخسرو کے قتل پر اسے سرزنش کی اور نماز روزہ، زہد و تقویٰ کی طرف رغبت دلائی اور جہاں بانی کے قاعدوں اور ضابطوں سے آگاہ کیا۔ بغل گیر ہوتے وقت چپکے سے کان میں کہا کہ "نظام الملک کا قصہ جلد ختم کردو، اگر اس نے قابو پالیا تو پھر تمھاری خیر نہیں۔" دونوں نے بڑے رنج و افسوس کے ساتھ ایک دوسرے کو رخصت[1] کیا۔ معزالدین چند دن تو باپ کی نصیحتوں پر کاربند رہا آخر کار حسین و جمیل لڑکیوں، خوب صورت مطربوں اور بازیگروں نے بادشاہ کو اپنی عشوہ گری کے جال میں پھانس لیا اور نوجوان بادشاہ کی توبہ شیشۂ نازک کی طرح چُور چُور ہو گئی۔ چنانچہ چند ہی منزل آگے بڑھا تھا کہ وہ اس طرح رنگ رلیوں میں مصروف[2] ہو گیا۔ دہلی تک یہ سارا سفر اسی عیش و عشرت میں کٹ گیا۔ دہلی میں سلطان کی واپسی ۶۸۹ ھ میں ہوئی۔

بادشاہ کا یہ حال دیکھ کر بعض سردار بد دل ہو کر پہاڑی علاقوں میں چلے گئے۔ ان میں سے شیر خاں پشیمان ہو کر بعد میں لوٹ آیا تھا لیکن بادشاہ نے اُسے قید کر دیا اور وہ اسی قید میں مر گیا۔ بادشاہ نے فیروز خاں یغرش خلجی کے بیٹے کو شائستہ[3] خاں کا لقب دے کر علاقۂ برن پر مامور کیا۔

---

[1] ناصرالدین بیٹے سے رخصت ہو کر جب قیام گاہ پر پہنچا تو کھانا نہ کھایا اور مصاحبوں سے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ نہ تو یہ لڑکا زندہ سلامت رہے گا اور نہ دہلی کا تخت۔" (فیروز شاہی)

[2] "فیروز شاہی" میں تفصیل سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ بادشاہ کی عیاشی کی لاگ میں اطراف و اکناف سے آکر بہت سی طوائفیں اور اہل طرب لشکر کے ساتھ ہو گئے تھے۔ جب بادشاہ چلا تو حسین و جمیل لڑکیاں ناز و ادا دکھا دکھا کر اس کو اپنی طرف مائل کرتی تھیں بادشاہ کا دل تو بہت کھینچتا تھا لیکن باپ کی نصیحتوں کے خیال سے جی مار کر رہ جاتا تھا۔ ایک دن جب کہ سواری جا رہی تھی، ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی گھوڑے پر سوار چتر شاہی کے قریب پہنچ گئی اور بڑے ناز سے یہ شعر پڑھا ؎

سرو سیمینا بصحرا میروی — نیک بد عہدی کہ بے ما میروی

پس سلطان کو یارائے ضبط نہ رہا اور اُسی وقت شراب منگائی اور اس ماہرو کو بغل میں بٹھا کر یہ شعر پڑھا ؎

شب زمی توبہ کنم از بیم ناز شاہداں — بامداداں روی ساقی باز در کار آورد

اُس آفتِ پرکالہ نے فوراً ہی جواب دیا ؎ — حمزۂ عابد فریبم زاہد صد سالہ را — موئے پیشانی گرفتہ پیش خمار آورد

[3] یہ وہی امیر ہے جو بعد میں جلال الدین خلجی کے نام سے تخت پر بیٹھا۔

شمس الدین کی تخت نشینی

ملک ایتمر کچھن نے بادشاہ کے قتل کی سازش کی تھی۔ سلطان نے اُسے بڑی حکمت عملی سے گرفتار کروا کے قتل کر ڈالا۔ باپ کی فہمائش کے مطابق اس نے نظام الملک کی بھی فکر کی اور اس کو ملتان جانے کا حکم دیا مگر نظام الملک سلطان کے ارادہ کو بھانپ گیا اور وہاں جانے میں پس و پیش کرنے لگا۔ اس دوران میں بادشاہ نے خفیہ طور پر زہر دلوا کر اس کا بھی قصہ ختم کر دیا۔ نظام الملک کی ہلاکت سے نظم و نسق میں کافی انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ ادھر بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اس کے شب و روز حالت مستی میں گزرتے تھے اور مے و معشوق کے سوا اسے کسی بات کی فکر تھی نہ خبر۔ چنانچہ کثرت عیاشی کی وجہ سے وہ لقوہ کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نہایت ضعیف اور کمزور ہو گیا اس کے قویٰ اور اعصاب بالکل ناکارہ ہو چکے تھے۔ سلطنت کا کاروبار بُری طرح درہم برہم ہو چلا تھا۔ یہ حال دیکھ کر چند خیر خواہ امیروں نے اس کے ایک کم عمر لڑکے کیکاؤس کو شمس الدین کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

شائستہ خاں کی بغاوت

۶۸۸ھ میں شائستہ خاں خلجی نے بہت سے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنی عملداری "برن" سے ایک فوج لے کر دہلی پر چڑھائی کر دی۔ بادشاہی امراء بھی فوجی تیاریاں کر کے مقابلہ پر روانہ ہوئے اور سلطان معزالدین کو جو بیماری اور کمزوری کی وجہ سے ایک بے جان تصویر بن کر رہ گیا تھا قصر کیلوکھری کی چھت پر چتر شاہی کے نیچے بٹھا دیا۔ ملک چھجو غیاث الدین کے بھتیجے نے آواز بلند اعلان کیا کہ "ہم چاہتے ہیں معزالدین کو کشتی میں سوار کر کے لکھنوتی میں اس کے باپ کے پاس بھجوا دیں اور سلطان شمس الدین کیکاؤس کی خدمت میں حاضر باش رہیں"۔ اس اعلان پر دہلی والے شمس الدین کیکاؤس کی حمایت کے لیے شائستہ خاں کے مقابلہ پر تیار ہو گئے اور بداؤنی دروازہ کے سامنے جمع ہو گئے۔

کیقباد کا انجام

لڑائی میں پانسہ شائستہ خاں کے ہاتھ رہا۔ ملک الامراء فخرالدین کوتوال کے لڑکے قید کر لیے گئے اور ملک ایتمر سرخہ جس نے شائستہ خاں کے قتل کا وعدہ کیا تھا۔ شائستہ خاں کے بیٹے اختیارالدین کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ملک الامراء نے جب اپنے آپ کو مقابلہ سے عاجز پایا تو اپنی جمعیت کو پیچھے ہٹا لیا اور فاتح غنیم کے سپاہیوں نے شمس الدین کیکاؤس کو تخت سے اُٹھا کر شائستہ خاں کے پاس بہادر پور روانہ کر دیا۔ شائستہ خاں نے ایک شخص کو جس کے باپ کو معزالدین نے قتل کر دیا تھا قیصر کیلوکھری پر قبضہ کے لیے بھیجا۔ وہ جب اس بدنصیب سلطان کے پاس پہنچا تو اس کا حال یہ تھا کہ وہ گم سم بیٹھا تھا اور بس اس کی سانس ہی باقی رہ گئی تھی۔ اس شخص نے دو تین لاتیں مار کر اسے جمنا میں دھکیل دیا۔ یہ واقعہ نصف ماہ محرم ۶۸۹ میں پیش آیا۔ سلطان معزالدین

ا؎ خلجیوں نے جب شاہزادہ شمس الدین کیکاؤس کو تخت سے اُتار کر گرفتار کر لیا تو اسی وقت معزالدین کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اسی حال میں بھوک پیاس کے صدمہ سے وہ جان بحق ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے یہ رباعی پڑھی تھی۔

اسپ ہنرم بر سر میدان ماندہ است — دست کرمم در تہ سنداں ماندہ است
چشمم کہ زروکاں دگہر کم دیدے — امروز برائے نان چہ حیران ماندہ است

نے تین برس چند ماہ تک حکومت کی اور اس پر غلاماں خاندان غوری یعنی غیاث الدین کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اس مہم میں شائستہ خاں خلجی کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے ایتمر سرخہ کی ہلاکت اور دہلی والوں کے فتنہ کو ختم کرنے کے بعد شاہزادہ کیکاؤس کو تخت پر بٹھا کر مملکت کا انتظام ہاتھ میں لے لیا۔

سلطان شمس الدین کیکاؤس

کیکاؤس برائے نام بادشاہ تھا۔ اسے کم سنی میں شائستہ خاں اور ملک چھجو کشلی خاں نے ۶۸۹ھ میں تخت پر بٹھایا تھا اُن دنوں شائستہ خاں کے چچا ملک حسین نے جو کیلو کھری میں معزالدین کا محافظ تھا کافی اثر ورسوخ پیدا کر لیا تھا۔ جب سارے انتظامات حسب مرضی طے پا گئے تو شائستہ خاں نے ملک چھجو کشلی خاں سے کہا کہ تم بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے دارالخلافہ میں رہو۔ تبرہندہ اور دیپال پور کو میں اپنی جاگیر قرار دے کر یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں، ملک چھجو نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے انکار کر دیا اور شائستہ خاں کا نائب رہنے کے لیے اصرار کرنے لگا اور اپنے لیے کڑہ کا علاقہ جاگیر میں دینے کی درخواست کی۔ ملک الامراء فخر الدین نے شائستہ خاں کو سمجھایا کہ "چھجو کو جانے دو، وہ نکل گیا تو پھر سب کچھ تمھارا ہی ہے۔" چنانچہ شائستہ خاں نے ملک چھجو کی تجویز فوراً ہی قبول کر لی۔

شائستہ خاں کیکاؤس کو تخت پر بٹھا کر قریباً دو ماہ تک ملک کا نظم ونسق چلاتا رہا اس کے بعد وہ نو عمر بادشاہ کو سوار کرا کے کیلو کھری لے کر آیا اور وہاں اسے قید کر دیا، پھر چند دن بعد ہی اُسے قتل کرا دیا۔ سلطان شمس الدین کیکاؤس کی کل مدت حکومت تین مہینے اور کچھ دن ہے۔

خاندان خلجی

سلطان جلال الدین بن یغرش خلجی

سلطان جلال الدین کا اصل نام ملک فیروز اور خطاب شائستہ خاں تھا۔ کیکاؤس کو قتل کرنے کے بعد وہ ملک چھجو خاں کے اتفاق و تائید سے تخت پر بیٹھا۔

"تاریخ طبقات محمود شاہی" کے مصنف شہاب الدین حکیم کرمانی جونپوری نے سلطان جلال الدین اور سلطان محمود مالوی کو چنگیز خاں کے داماد قالیج خاں کی اولاد بتایا ہے اور اس بارے میں ایک طویل قصہ بھی نقل کیا ہے لیکن یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ "قالیج" اور "خلج" میں کوئی مناسبت نہیں۔ "قالیج" ترکی زبان کا لفظ بھی نہیں ہے، اگر ہو بھی تو اس لفظ کے معنی تلوار کے ہوں گے۔ دوسری بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ یافث بن نوح علیہ السلام کے کسی لڑکے کا نام "خلج" تھا اور خلجی اس کی طرف منسوب ہیں۔

شہر نو کی تعمیر

سلطان جلال الدین نے تخت نشین ہونے کے بعد حکومت کے بڑے بڑے عہدے اپنے بھائیوں اور بیٹوں میں تقسیم کر دیے۔ بڑے بیٹے کو خان خاناں اور منجھلے کو ارکلی خاں اور چھوٹے بیٹے کو قدر خاں اور اپنے چچا ملک حسین کو "تاج الملک" کا خطاب دیا۔ سلطان جلال الدین نے جمنا کے کنارے معز الدین کے محل کے مقابل ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی، اس میں ایک مضبوط قلعہ اور باغ بنوایا، جب شہر بن گیا تو اس کا نام "شہر نو" رکھا۔

ملک چھجو کی شورش

سلطان جلال الدین کی تخت نشینی کے بعد حسب قرارداد ملک چھجو کشلی خاں کڑہ کی جاگیر پر چلا گیا تھا لیکن وہاں پہنچنے کے بعد اس نے تخت نشینی کے دوسرے ہی سال ماہ شعبان میں خودسری اختیار کی اور اس نواح کے اکثر جاگیردار جو غیاث الدین کے امراء تھے اس سے مل گئے اور لشکر تیار کر کے یہ سب امیر اپنے اپنے مقام سے بدایوں میں آ کر جمع ہو گئے۔ گنگا کو بھوجپور کے گھاٹ سے عبور کر کے وہاں ملک چھجو کے انتظار میں ٹھہرے رہے کہ وہ آ جائے تو پھر دہلی پر یورش کریں۔

سلطان جلال الدین کو جب اس شورش کی خبر ملی تو اس نے خان خاناں کو دہلی میں چھوڑا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے

روانہ ہوگیا۔ اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصّہ فوج کے ساتھ خود کول کے راستہ سے بدایوں روانہ ہوا اور دوسرے حصّہ کو ارکلی خاں کی قیادت میں ملک چھجو کے مقابلہ کے لیے امروہہ روانہ کر دیا۔

ارکلی خاں رہب کے کنارے ملک چھجو کی فوج سے چند دن تک برسرِ پیکار رہا۔ اسی اثنا میں راجہ برم دیو کولہ نے (اس کو کوئلہ بھی کہتے ہیں) ملک چھجو کو اطلاع دی کہ ارکلی خاں کی کمک کے لیے سلطانی لشکر بھی آرہا ہے یہ سنتے ہی وہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ راتوں رات بھاگ گیا لیکن راستہ میں گنواروں نے گھیر کر اسے پکڑ لیا۔

ارکلی خاں نے رہب ندی کو عبور کر کے غنیم کی بھاگتی ہوئی فوج پر حملہ کیا اور برم دیو کو قتل کر دیا۔ ملک چھجو اور دوسرے باغی امیروں کو حراست میں لے کر بہاری اور کستم کور (شمس آباد) کی طرف کوچ کیا۔

جب ملک چھجو اور بلبن کے وقت کے بہت سے اُمراء طوق وسلاسل میں گرفتار سلطان جلال الدین کی بارگاہ میں پیش کیے گئے تو انہیں دیکھ کر سلطان کو اپنا اور ان کا پچھلا زمانہ یاد آگیا اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ اُنھیں فوراً رہا کر کے حمام میں بھجوایا اور خلعتیں عطا کیں اور ان کے قصور معاف کر کے اپنا ہم نشین بنا لیا اور ملک چھجو کو بڑے احترام اور عزت کے ساتھ ملتان بھیج دیا اور کڑے پر اس کی جگہ اپنے بھتیجے اور داماد علاؤالدین کو جو اس وقت بدایوں پر متعین تھا روانہ کر دیا۔ اس کے بھائی الماس بیگ کو آخور بیگی[۱] کا عہدہ عطا کیا۔

اسی دوران میں بڑے شاہزادے خان خاناں کا انتقال ہوگیا، اس کی موت کا سلطان کو بہت رنج اور قلق ہوا۔ امیر خسرو نے اس کا مرثیہ کہا ہے ؎

چہ روز است ایں کہ می خورشید تاباں را نمی بینم
دگر شب چیرا ماہِ درخشاں را نمی بینم

دوسرے سال جب ارکلی خاں ملتان سے دہلی آیا تو بادشاہ نے اُسے دہلی میں چھوڑ کر منداور کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اُسے غدر کی اطلاعات ملیں، اس کے لشکر میں غیاثی امراء بھی شامل تھے۔ ان امیروں کی طرف سے اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں غدر کی خبریں سن کر یہ کوئی سازش نہ کریں۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ملک مغلتی کو بدایوں، ملک مبارک کو تبرہندہ کی طرف رخصت کر دیا اور جب منداور کا قلعہ فتح ہوگیا تو بلا تاخیر شب و روز کوچ کرتا ہوا دہلی واپس آگیا سلطان کو اطلاع ملی تھی کہ دہلی میں بغاوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور اس غدر کا بانی مبانی سیدی مولہ ہے چنانچہ دہلی آکر اس نے سیدی مولہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

سیدی مولہ درویش سیدی مولہ نہایت عابد و زاہد اور صاحب کرامات بزرگ تھے، وہ عجم سے ہند میں آئے اور پہلے اجودھن میں حضرت قطب الاولیاء مخدوم شیخ فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے پھر ان سے رخصت ہو کر ہندوستان کے شہروں کی سیر کرتے ہوئے دہلی آکر ٹھہر گئے۔ شیخ فرید نے رخصت ہوتے وقت ان کو وصیت کی تھی کہ "لوگوں کے ہجوم اور امراء و ملوک کی صحبت سے بچتے رہنا۔" دہلی میں سیدی مولا نے بہت

---

[۱] آخور بیگی۔ اصطبل شاہی اور رسالہ فوج کا سردار۔

ہی جلد شہرت عام حاصل کرلی اور بڑے بڑے امیر اُن کے معتقد ہوگئے، یہاں تک کہ سلطان کا بڑا شاہزادہ خان خاناں مرحوم بھی ان کا عقیدت مند تھا۔ بلبن کے عہد کے اکثر معزول امراء بھی اُن کے ہاں آتے رہتے تھے۔ دونوں وقت ان کے دسترخوان پر بہت سے امیر حاضر رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں روزانہ ہزار من میدہ اور پانچ سو من گوشت اور تین سو من شکر خرچ ہوتی تھی۔ امیر و غریب سب کے لیے ان کا دسترخوان عام تھا۔ محتاجوں کے لیے لنگر بٹا کرتا تھا۔ وہ کبھی کسی سے کوئی تحفہ یا معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے۔ اس خرچ پر لوگ گمان کرتے تھے کہ وہ کیمیا[1] بناتے ہیں۔ سیدی مولا نماز روزہ کے نہایت پابند تھے لیکن جمعہ[2] میں حاضر نہیں ہوتے تھے۔ جو بڑے بڑے لوگ ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اُن میں قاضی جلال الدین کاشانی اور قاضی اُردو بھی شامل تھے۔

سیدی مولہ کی شہادت

سلطان کو جب اس قسم کی اطلاعات ملیں کہ سیدی مولہ کی خانقاہ میں بغاوت کی سازشیں ہوتی ہیں تو ایک دن وہ خود بھیس بدل کر خانقاہ میں گیا اور جیسا سُنا تھا اس سے زیادہ لوگوں کو سید کا معتقد پایا اور اس کے شبہات قوی ہوگئے۔ چنانچہ اس نے دوسرے دن صبح ایک بڑی مجلس منعقد کی اور بے گناہ سید اُن کے معتقد امیروں اور قاضی کو پابہ زنجیر حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان کو بڑی اہانت کے ساتھ دربار میں لایا گیا اور ان پر سلطنت کے ادعا اور بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ سلطان نے ہر ایک سے اس الزام کے سلسلہ میں باز پرس کی۔ سیدی مولہ نے انکار کیا اور قسم بھی کھائی۔ قاضی جلال الدین پر بھی سلطان نے بہت عتاب کیا لیکن اس نے بھی اس الزام سے انکار کیا۔ سلطان نے اس کو دہلی کے عہدۂ قضاء سے معزول کرکے بدایوں تبادلہ کردیا۔ سیدی مولا کا امتحان لینے کے لیے نمرود کی طرح بہت سی آگ جلوائی، اُن کو مع ساتھیوں کے اس آگ میں جھونک دینے کا حکم دیا مگر حق گو علماء نے فتویٰ دیا کہ "یہ شرعاً جائز نہیں، آگ ہر ایک چیز کو جلادیتی ہے اس طرح کے امتحان کا کوئی اعتبار نہیں"۔ اس فتوے کی وجہ سے سلطان اس وحشیانہ حرکت سے باز رہا۔ اسی مجلس میں سید کے معتقد اکثر امیروں کو سزا دی اور بعض کو جلاوطن کردیا۔ سلطان نے خود بالمشافہ سیدی مولا سے مباحثہ کیا اور سخت جرح کی۔ سید نے ہر بات کا معقول جواب دیا اور سلطان، ان پر کسی شرعی الزام کو ثابت نہ کرسکا، زچ ہوکر اس نے ابوبکر طوسی کو جو آزاد منش قلندروں کا سرغنہ تھا مخاطب کرکے کہا "فقیر تم ہی اس ظالم سے میرا انصاف لو"۔ یہ سن کر ایک قلندر کود کر آگے آیا اور اس نے ان کو زخم لگائے داڑھی مونڈ ڈالی اور سوئیاں چبھوئیں۔ اتنے میں ارکلی خاں کے اشارہ پر ایک فیل بان نے مست ہاتھی اُن پر چھوڑ دیا۔ غرض وہ حق پسند مرد درویش بڑے عذابوں سے شہید ہوا۔ مشہور ہے کہ سیدی مولا اس حادثہ سے دو سال

---

[1] تاجر اور دُکاندار جب اپنے مال کی قیمت سیدی مولا سے طلب کرتے تو وہ اُن سے کہتے تھے کہ "فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے اس قدر تنکہ رکھے ہوئے ہیں لے لو"۔ چنانچہ بتائے ہوئے مقام پر اُسی قدر تنکے اُن کو مل جاتے اور یہ سکے ایسے نئے ہوتے تھے جیسے ابھی ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہوں۔ (فیروز شاہی صفحہ ۲۰۹)

[2] اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ سیدی مولا بادشاہت کی بنا پر ملک کو "دارالاسلام" نہیں سمجھتے ہوں گے اور جو جگہ دارالاسلام نہ ہو وہاں جمعہ فرض نہیں سمجھا گیا ہے۔

پہلے ہی سے اکثر یہ دو شعر پڑھ کر ہنسا کرتے تھے ؎

در مطبخ عشق جز نکو را نہ کشند — لاغر صفتاں زشت خو را نہ کشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز — مردار بود ہر آنکہ او را نہ کشند

جس دن سیدی مولا کو شہید کیا گیا اُس دن بڑی سخت سیاہ آندھی[1] آئی۔ اس سال بارش بھی نہیں ہوئی اور ایسا سخت قحط پڑا کہ دیہات اُجڑ گئے اور دیہاتوں سے ہندو جوق در جوق شہر میں آگئے، فاقہ کی تاب نہ لاکر بیس بیس تیس تیس آدمی ہاتھ میں ہاتھ دے کر جمنا میں کود کود کر خودکشی کرنے لگے۔ ہزاروں مسلمان بھی قحط سے بے حال ہو کر مر گئے۔ ان حادثوں سے لوگوں کو عام طور پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ اس بے گناہ شہید پر ظلم[2] کا وبال ہے لیکن یہ باتیں زیادہ قابلِ اعتبار نہیں، اتفاقی طور پر ایسے حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ سیدی مولا کے ساتھ بہت سے بے گناہ پکڑے گئے تھے، ان میں سے بعض کو ارکلی خاں کی سفارش پر رہائی مل گئی۔

اسی سال سلطان نے دوبارہ رنتھمبور کا قصد کیا اور اس کے گرد و نواح کو تباہ و برباد کر دیا اور وہاں کے بت خانوں کو بالکل ہی تاراج کر دیا لیکن وہ قلعہ کو فتح نہیں کر سکا اور ویسے ہی لوٹ آیا۔ اسی سال ارکلی خاں بادشاہ کی اطلاع و اجازت کے بغیر دہلی سے ملتان چلا گیا۔ شہزادہ کی اس حرکت سے سلطان کو بہت رنج پہنچا۔

نومسلم مغل

۶۹۱ھ میں چنگیزی مغلوں نے ہندوستان پر حملہ[3] کیا۔ سنام کے قریب ہندوستانی فوج سے ان کا مقابلہ ہوا ہندوستانی فوج کی قوت اور کثرت کو دیکھ کر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی گفتگو کی۔ ان کے سرداروں نے بادشاہ کو باپ کہہ کر فرزندی اختیار کرنے کی خواہش کی۔ بادشاہ نے بھی صلح کر لی اور اسے بیٹے سے مخاطب کیا۔ دونوں طرف سے بہت سے تحائف کا تبادلہ ہوا اور مغل ہندوستان کی سرحد سے لوٹ گئے۔ اسی دوران میں چنگیز خاں کا نواسہ الغو کئی ہزار مغلوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور سلطان کی حمایت میں آگیا، سلطان نے اسے غیاث پور[4] میں رہنے کے لیے جگہ دی اور اپنی بیٹی کا بھی اس سے نکاح کر دیا۔ ان مغلوں کو لوگ نومسلم کہنے لگے۔

اسی سال کے آخر میں بادشاہ نے منداور پر حملہ کیا اور اس کے مضافات کو تباہ کر کے لوٹ گیا۔ بادشاہ کے داماد اور بھتیجے علاؤ الدین نے جو کڑہ پر حاکم تھا بھیلسہ پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی اور اس کو فتح کر کے کافی مال غنیمت لے کر سلطان کی خدمت میں لوٹ آیا۔ علاؤ الدین بھیلسہ سے ایک بت بھی اُٹھوا لایا تھا جس کی ہندو بہت زیادہ پوجا کیا کرتے تھے، اس بت کو

---

[1] صاحب فیروز شاہی کا بیان ہے کہ اس نے خود اس آندھی کو دیکھا تھا۔

[2] سلطان جلال الدین نے ملک چھجو اور دوسرے اُمراء کو رہا کرتے وقت کہا تھا (بحوالہ فیروز شاہی) کہ میں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا اگر بادشاہت کے لیے قتل و خون ضروری ہے تو میں مغل کافروں کے خلاف جہاد کیوں نہ کروں اور یہی وہ سلطان ہے جس نے اس حق پسند درویش اور اس کے بے گناہ ساتھیوں کے خلاف اس طرح کی سفاکانہ کارروائی کی۔

[3] مغل حملہ آوروں کا سردار ہلاکو کا نواسہ عبداللہ تھا۔

[4] یہ وہی جگہ ہے جہاں اب حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار ہے، اسے مغل پورہ بھی کہتے ہیں۔

اس نے بدایوں کے دروازے کے سامنے راستہ میں ڈال دیا۔ علاؤالدین کے اس کارنامہ پر سلطان بہت خوش ہوا، اور اودھ کا علاقہ بھی اس کی جاگیر میں دے دیا۔

علاؤالدین کی مہم پسندی

علاؤالدین کو اپنی بیوی اور ساس سے بڑی رنجش تھی وہ دونوں بادشاہ کے سامنے اس کی بُرائی کرتی رہتی تھیں۔ اس کو اُن کی طرف سے خطرہ تھا کہ کہیں یہ دونوں بادشاہ کو اس کے خلاف کرکے اس کو کسی خطرہ میں نہ مبتلا کردیں۔ اس لیے وہ بادشاہ کی عملداری سے کسی اور طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے لشکر میں نئے نئے آدمیوں کو بھرتی کیا اور سلطان سے چندیری پر حملہ کی اجازت لے کر کڑہ آیا۔ وہاں اس نے اپنے ایک نائب علاء الملک کو متعین کرکے اسے ہدایت کی کہ کوئی کارروائی ایسی نہ ہو جو بادشاہ کی ناراضی کا باعث بنے۔ پھر وہ کڑہ سے چل کر ایلچ پور آیا لیکن یہاں سے بجائے چندیری کے دیوگڈھ کے راستہ پر روانہ ہوگیا۔

دکن کی فتح

چند دن تک بادشاہ کو علاؤالدین کی کوئی خبر نہیں ملی جس کی وجہ سے وہ بڑی تشویش اور فکر میں مبتلا رہا۔ ایک عرصہ بعد خبر آئی کہ علاؤالدین نے دیوگیر اور تقریباً سارے دکن کو فتح کرلیا ہے اور وہاں سے وہ بہت سا مالِ غنیمت، ہزاروں گھوڑے ہاتھی اور تحائف و اسباب لے کر کڑہ کو واپس آرہا ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ بہت خوش ہوا لیکن لوگوں کو گمان تھا کہ علاؤالدین نے اپنی ساس اور بیوی کے ہاتھوں بہت رنج اُٹھایا ہے اور وہ دیوگڈھ بھی بغیر اجازت کے ہی چلا گیا تھا۔ اب اس کے پاس کافی مال و اسباب بھی جمع ہوگیا ہے ممکن ہے وہ کوئی فتنہ برپا کرنے کی فکر میں ہو لیکن کسی کو جرأت نہیں تھی کہ بادشاہ کے سامنے ان اندیشوں کو ظاہر کرے، نہ بادشاہ کو ہی اس کی اطلاع تھی کہ اس کو ساس اور بیوی کے خلاف اتنا شدید رنج ہے۔ وہ اس کے خلاف جب بھی کچھ کہتی تھیں بادشاہ ان کو اہمیت نہیں دیتا تھا اور ٹال دیا کرتا تھا۔

علاؤالدین کی واپسی

جس وقت بادشاہ کو علاؤالدین کی واپسی کی خبر ملی تو وہ گوالیار میں تھا۔ اس نے امراء کی مجلس مشاورت طلب کی اور ان سے کہا کہ علاؤالدین اس شان و شوکت کے ساتھ آرہا ہے اب ہم چندیری کے راستہ پر آگے جاکر اس کا استقبال کریں یا اس سے اسی جگہ ملیں یا دہلی واپس چلے جائیں ——

ملک احمد حبیب جلال الدین کا نہایت خیرخواہ اور دانشمند وزیر تھا اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ میری رائے میں تو یہی مناسب ہے کہ سلطان مع لشکر کے چندیری کی طرف کوچ کرے اور علاؤالدین کو راستہ ہی میں روک لے اور جو کچھ ساز و سامان وہ لے کر آرہا ہے اس سے لے لے اور اتنی قوت رہنے نہ دے کہ وہ بغاوت کا خیال کرسکے، اس نے اپنی تائید میں ملک چھجو کی سرکشی کا بھی حوالہ دیا لیکن بادشاہ نے اس کی تجویز نہیں مانی اور یہی کہتا رہا کہ علاؤالدین میرے ہی نمک کا پروردہ ہے میں نے ہی اُسے اس بلند مرتبہ پر پہنچایا، میں نے اس کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی کہ جو وہ کسی فاسد خیال کو اپنے دل میں جگہ دے۔ بعض امیر بھی ہاں میں ہاں ملانے لگے حالانکہ احمد حبیب کی رائے نہایت معقول اور دُوراندیشی پر مبنی تھی۔ ملک احمد نے جب مجلس کا یہ رنگ دیکھا تو وہ غصہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ "اگر خدانخواستہ علاؤالدین کڑے میں آنے کے بعد سرونڈی عبور کرکے لکھنوتی کا ارادہ کرے تو میں کسی میں بھی یہ جرأت نہیں پاتا کہ اُس کو روک لے۔" بہرحال بادشاہ اس

خطرہ کا اندازہ نہیں کر سکا جس کو احمد چپ بھانپ چکا تھا اور وہ وہاں سے کوچ کر کے دہلی کو چلا گیا۔

علاؤالدین کی سازش

علاؤالدین نے کڑے میں پہنچ کر بادشاہ کو متعدد عرضیاں لکھیں اور بہت سے ہاتھی اور تحائف روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی لکھا کہ اگر میری طلبی کا فرمان صادر ہو تو حاضر ہو کر باریابی کا شرف حاصل کروں۔ لیکن ان سب باتوں سے اس کی غرض صرف یہ تھی کہ اُسے کچھ مہلت مل جائے۔ اس عرصہ میں اس نے لکھنوتی جانے کی تیاریاں کر لیں اور اپنے چھوٹے بھائی ظفر خاں کو اودھ رخصت کر دیا کہ وہ سروندی میں کشتیاں تیار کر رکھے۔

جلال الدین دام میں

سادہ لوح بادشاہ نے اُس کے حسب تحریر عماد الملک اور ضیاء الدین دو سرداروں کے ذریعے حاضری کا فرمان ارسال کیا۔ علاؤالدین نے اُن کو فوراً ہی حراست میں لے کر قید میں ڈال دیا۔ اپنے دوسرے بھائی الماس بیگ کو جو دہلی میں تھا ایک خط لکھا کہ "میں نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر دیوگیر پر حملہ کیا تھا اس کو بہانہ بنا کر لوگوں نے بادشاہ کو مجھ سے بدظن کر دیا ہے حالانکہ میں اُن کا ویسا ہی فرمانبردار فرزند اور غلام ہوں اگر وہ خود تنہا آکر مجھے لے جائیں تو میں اطاعت کے لیے موجود ہوں اور اگر بادشاہ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا ہے اور وہ اُس کو صحیح سمجھتے ہیں جو لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے تو میں مایوس ہو کر جس طرف سینگ سمائیں گے چلا جاؤں گا پھر میرا پتہ تک نہیں ملے گا" الماس بیگ نے یہ خط بادشاہ کو سنا دیا۔ بادشاہ نے اُسی وقت الماس بیگ کو علاؤالدین کے پاس روانہ کر دیا اور کہا کہ تم چلو میں بھی پیچھے آرہا ہوں۔ الماس بیگ کشتی کے ذریعے ساتویں دن علاؤالدین کے پاس پہنچ گیا اور اس کو لکھنوتی چلے جانے کا مشورہ دیا لیکن بعض ہوشیار خیر خواہوں نے کہا کہ لکھنوتی جانے کی کیا ضرورت ہے، دیوگڑھ کے ہاتھیوں گھوڑوں اور مال و اسباب کا لالچ بادشاہ کو اسی برسات میں یہاں کھینچ لائے گا، اُس وقت وہ تمھارے قابو میں ہوگا جو چاہو اس سے سلوک کرو۔ اُن کا یہ خیال ٹھیک تھا۔ سلطان جلال الدین کی قضا اسے کشاں کشاں اپنے بھتیجے کے پاس کھینچ لائی اور مال کی طمع میں اس نے آگے پیچھے کا کوئی خیال نہیں کیا اور اپنے سرداروں کے ساتھ ایک ہزار سوار لے کر کڑے کی طرف کوچ کر دیا۔ ملک احمد چپ کو خشکی کے راستہ لشکر لے کر آنے کا حکم دیا۔ چپ نے بادشاہ کو اس ارادہ سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اور وہ بڑی تیزی سے کوچ پر کوچ کرتے ہوئے رمضان کی سترہ تاریخ کو کڑہ پہنچ گیا۔

سلطان جلال الدین کا قتل

علاؤالدین کڑے اور مانک پور کے درمیان گنگا اُتر کر اپنی فوج کے ساتھ تیار کھڑا تھا۔ جب بادشاہ کے قریب آنے کی خبر سنی تو اس نے الماس بیگ کو بادشاہ کے لیے کئی ایک جواہر نذرانہ دے کر بھیجا کہ کسی تدبیر سے وہ اسے تنہا لشکر میں لے آئے۔ مکار الماس بیگ نے بادشاہ کے پاس جا کر بڑی چاپلوسی کی باتیں کیں اور کہا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو علاؤالدین تو ہاتھ سے نکل ہی گیا تھا کیونکہ دشمنوں نے آپ کی طرف سے اُسے بہت بدگمان کر دیا تھا، میں نے بہت کچھ اس کی دلجمعی کر دی ہے لیکن آپ کی ہیبت اس کے جی پر اُسی طرح چھائی ہوئی ہے، مصلحت یہی ہے کہ حضور شفقت و عنایت کا اظہار کریں اور تنہا جا کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر لے آئیں۔ بادشاہ کی تو مت پھر چکی تھی وہ ان چکمہ بازیوں میں آگیا اور ایک ہزار سواروں کو وہیں چھوڑ کر چند مسلح محافظوں کو لے کر الماس بیگ کے ساتھ

ہولیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد الماس بیگ نے پھر عرض کیا کہ میرا بھائی اس قدر خوفزدہ ہے کہ وہ جب حضور کے ساتھ ان ہتھیار بند آدمیوں کو دیکھے گا تو دہشت کے مارے بھاگ جائے گا۔ بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو ہتھیار کھول دینے کا حکم دیا۔ یہ اُن لوگوں پر بہت شاق گزرا لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ جب آگے بڑھے تو ایک بڑے لشکر کو وہاں صف آراستہ پایا۔ محافظ سرداروں نے الماس بیگ سے کہا آخر یہ کیا معاملہ ہے تم نے ہم سے ہتھیار تک رکھوا لیے اور یہاں یہ فوج لڑائی کے لیے مستعد دکھائی دے رہی ہے۔ اُس نے کہا اندیشہ نہ کرو اصل میں بھائی مع لشکر کے بادشاہ کو سلامی دینا چاہتے ہیں تاکہ ساری فوج حضور کے ملاحظے سے گزر جائے۔ ان باتوں پر بھی بادشاہ نہیں چونکا۔ اس کو نہ معلوم کیوں ایسا اعتماد تھا کہ وہ کسی وہم میں نہ پڑا اور چلتا رہا۔ اس طرح جب کافی مسافت طے ہوگئی تو بادشاہ نے الماس بیگ سے کہا "میں بوڑھا آدمی یہاں تک چلا آیا اور تیرے سنگ دل بھائی کو اب تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ کسی کشتی میں بیٹھ کر میرے پاس آ جاتا۔" اُس نے عرض کیا کہ "وہ آپ کے حضور خالی ہاتھ کیسے آئے، وہ تو اس وقت پیش کش اور نذرانوں کی ترتیب اور ہاتھی گھوڑوں کے انتخاب میں مشغول ہوگا۔" بادشاہ نے اس وقت قرآن کی تلاوت شروع کر دی اور عصر کے وقت کشتی دوسرے کنارے پہنچی۔ بادشاہ کشتی سے اُتر کر جب مقررہ مقام پر پہنچا تو علاؤالدین اپنی جمعیت کے ساتھ آگے بڑھ کر آیا اور حکمران چچا کے قدموں میں گر گیا۔ بادشاہ نے اُسے اُٹھایا اور مسکرا کر محبت سے اُس کے رخساروں پر ایک طمانچہ مارا اور اسے نصیحتیں کیں اور اپنے شوقِ ملاقات کا حال بیان کیا۔ وہ تسلی آمیز باتیں کرتے ہوئے اُس کا مُنہ چومتا جاتا تھا اور اپنے قریب کھینچتا جاتا تھا۔ اسی عالم میں بدبخت بھتیجے نے بادشاہ کا پنجہ زور سے پکڑ لیا اور اپنے آدمیوں کو جو پہلے سے تیار کھڑے تھے اشارہ کیا۔ اس کے اشارہ پر محمود سالم ایک کمینہ شخص نے جو سامانہ کا رہنے والا تھا بادشاہ پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ بادشاہ زخمی ہو کر کشتی کی طرف بھاگا اور کہا علاؤالدین نامراد یہ تُو نے کیا کیا! اتنے میں اختیارالدین نے جو بادشاہ کا پروردہ تھا پیچھے سے ایسا کاری ہاتھ مارا کہ اُس کا کام تمام ہوگیا اور سر کاٹ کر علاؤالدین کے پاس لے آیا۔ اس کے حکم سے بادشاہ کا سر ایک نیزہ پر چڑھا کر کڑے اور مانک پور میں پھرایا گیا۔ اس کے بعد بریدہ سر کو اودھ بھیج دیا گیا۔ بادشاہ کے تمام ساتھیوں کو بھی وہیں قتل کر دیا گیا، ان میں سے کچھ دریا میں کود کر ڈوب گئے۔ ملک فخرالدین کو بھی زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

قدر خاں کی تخت نشینی

جب احمد چپ کو اس حادثۂ جانکاہ کی خبر ملی تو وہ فوراً ہی دہلی لوٹ گیا۔ ارکلی خاں جو بادشاہ کا بڑا بیٹا اور تخت کا وارث تھا ان دنوں ملتان میں تھا۔ احمد نے اُس کا انتظار کرنا مناسب نہ جانا اور چھوٹے شاہزادے قدر خاں کو سلطان رکن الدین ابراہیم کا خطاب دے کر ملکۂ جہاں کے تعاون سے تخت نشین کر دیا۔ مرحوم سلطان کے تمام امراء نے بھی قدر خاں کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور مبارک باد دی لیکن قدر خاں کی بادشاہت بس برائے نام رہی۔

دہلی پر قبضہ

علاؤالدین نے اُسی دن جس دن کہ جلال الدین شہید ہوا تھا چترِ شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا اور باوجود برسات کے شب و روز کوچ کرتا ہوا دہلی روانہ ہوگیا۔ راستہ بھر اس نے کافی

روپے اور اشرفیاں خیرات اور انعام میں تقسیم کیں، جب وہ بدایوں پہنچا تو اس کے لشکر میں ساٹھ ہزار سوار تھے۔ ملک رکن الدین چونکہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ ارکلی خاں کے پاس ملتان چلا گیا۔[۱]

علاؤالدین نہایت اطمینان کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔ وہاں اس نے جمنا کے کنارے اپنے باغ میں قیام کیا۔ قدیم امراء اور سردار روپے کے لالچ میں اس سے آکر مل گئے۔

جلال الدین کے عہد کے شاعر

سلطان جلال الدین کی شہادت کا حادثہ ۱۷ رمضان ۶۹۶ھ میں ہوا۔ سات برس اس نے سلطنت کی۔ مرحوم سلطان کو شعر و سخن کا بھی خاصا ذوق تھا۔ سلطان معزالدین کے قتل کے بعد امیر خسرو کو اس نے اپنی مجلس میں شریک کر لیا تھا۔ بادشاہ کا مصحف ان کی تحویل میں رہتا تھا اور ہر سال ان کو ایک بھاری خلعت ملتی تھی۔ اس کے ندیموں میں امیر حسن، مؤید حاجی، امیر ارسلان کاتبی، سعد منطقی اور قاضی غطیب جیسے صاحب علم و ادب لوگ شامل تھے۔ اسی عہد کے سب سے بڑے عالم قاضی مغیث ہانسوی تھے جن کی ایک غزل بڑی مشہور ہے۔ یہ غزل فن کا ایک نادر نمونہ تھی، اسے اُنیس بحروں میں پڑھ سکتے تھے۔ اس غزل کا مطلع ہے ؎

دو دُر گوش و قد خوش دو خد خوب و خط تر
فر تو فری پری و پرے و با کرّ و فرّ

سلطان جلال الدین خود بھی شعر کہتا تھا۔ اُس کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

آں زلف پریشانت ژولیده نمیخواہم　　وآں روئے چو گلنارت تفسیده نمیخواہم
بے پیر منت خواہم یک شب بکنار آئی　　ہاں بانگ بلند ست ایں پوشیده نمیخواہم

سلطان نے جس زمانہ میں گوالیار کا محاصرہ کیا تھا تو وہاں اس نے ایک بڑا گنبد تعمیر کرایا تھا اس کے کتبے کے لیے خود ہی یہ رباعی کہی تھی۔ رباعی

مارا کہ قدم بر سر گردوں ساید　　از تودۂ سنگ و گل چہ قدر افزاید
ایں سنگ شکستہ زاں نہادیم درست　　باشد کہ دل شکستۂ آساید

سلطان نے اس رباعی کو ہم نشیں شاعروں خاص طور سے سعد منطقی کو سُنا کر اس پر تنقید و جرح کرنے کا حکم دیا۔ سب نے بے حد تعریف کی اور کوئی غلطی نہیں بتائی۔ سلطان نے کہا تم لوگ میرا پاس و لحاظ کر رہے ہو اس رباعی کے عیب میں خود ایک دوسری رباعی میں ظاہر کیے دیتا ہوں۔ رباعی

باشد کہ دریں جا گزرِ کس باشد　　کس خرقہ ردائے چرخ اطلس باشد
شاید کہ زمین قدم میمونش　　یک ذرہ بما رسد ہماں بس باشد

۱؎ جس وقت علاؤالدین کے لشکر کے آنے کی خبر ہوئی تو ملکۂ جہاں نو عمر بادشاہ رکن الدین اور چند وفادار امراء کو لے کر ملتان چلی گئی۔ علاؤالدین نے بغیر کسی مزاحمت کے دارالسلطنت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ (فیروز شاہی)

سلطان علاؤالدین خلجی

سلطان علاؤ الدین خلجی نے دہلی[1] میں ۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ کو جلوس کیا۔ تخت نشینی کی رسم سلطان کے بھائی الماس بیگ کی تائید و اتفاق سے انجام پائی۔ سلطان نے الماس بیگ کو الغ خاں، اپنے سالے سنجر کو جو میر مجلس تھا الپ خاں، ملک نصرت جلیسری کو نصرت خاں اور ملک بدرالدین کو ظفر خاں کا خطاب دیا۔

تخت نشینی کے بعد سلطان نے ایک میدان میں لشکر کا کیمپ لگوایا اور وہاں دربار عام منعقد کرکے عوام و خواص سب کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ اس مجلس میں سلطان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور امیر اور سرداروں کو مناصب اور جاگیریں عطا کی گئیں۔

ملتان پر فوج کشی

جب پائے تخت کا بندوبست بحسن و خوبی ہو گیا تو سلطان نے سب سے پہلے سلطان جلال الدین کے بیٹوں کی سرکوبی کی طرف توجہ کی اور ۶۹۶ھ میں الغ خاں اور الپ خاں کو بھاری لشکر دے کر ارکلی خاں اور سلطان رکن الدین کے مقابلہ پر ملتان کی طرف روانہ کیا۔ دونوں شہزادے قلعہ ملتان میں محصور ہو گئے۔

---

[1] کہتے ہیں یہ قدیم شہر قبل مسیح سے آباد ہے۔ سب سے قدیم علاقہ قطب صاحب کی لاٹھ کے ارد گرد کا ہے جو موجودہ پرانی دہلی یعنی شاہ جہاں آباد سے گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہندو راجاؤں کے آخری دور حکومت میں پرتھوی راج عرف رائے پتھورا کا دارالسلطنت اور لال کوٹ کے نام سے مشہور تھا۔ ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے رائے پتھورا کو شکست دے کر اس کو ہندوستانی مقبوضات کا مرکز بنایا۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک اور اس کے جانشینوں کا دارالسلطنت رہا۔

لال کوٹ سے پہلے یہاں کی آبادی اندرپت کہلاتی تھی اور اسے اندر دیوتا کا استھان سمجھا جاتا تھا۔ اننگ پال کا پرانا قلعہ بھی اندرپت میں شامل تھا۔ بعد میں اننگ پال تور دوم نے سمت ۱۱۰۹م ۱۰۵۲ء میں لال کوٹ بسایا تھا۔ لوہے کی لاٹھ پر یہی تاریخ درج ہے۔

دہلی کا دوسرا قدیم مستقر تغلق آباد یہ قلعہ اور شہر قطب صاحب سے چار میل مشرقی جانب متھرا کی سڑک کے قریب ہے یہاں غیاث الدین تغلق شاہ کا مقبرہ ہے اس مقبرہ میں سلطان محمد بن تغلق شاہ بھی دفن کیا گیا تھا۔ یہ شہر غیاث الدین تغلق شاہ کا آباد کیا ہوا تھا۔

دہلی کا تیسرا مرکزی مقام تغلق شاہ کے لڑکے سلطان محمد کا بسایا ہوا شہر "جہاں پناہ" تھا جو دہلی اور سیری کے درمیان تھا جہاں اس کے محل اور ہزار ستون کے کھنڈر ہیں۔

چوتھا شہر سلطان علاؤالدین کا بسایا ہوا تھا جسے شہر سیری کہا جاتا ہے، یہاں سلطان نے قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا اس کو قلعہ علائی کہتے تھے۔ اس کے کھنڈر قطب کو جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

دہلی کی پانچویں صورت وہ بڑا شہر تھا جسے محمد تغلق نے دہلی اور سیری کو ایک شہر پناہ سے ملا کر تعمیر کرایا تھا۔ یہ علاقہ شمال اور مشرق کی طرف سے پہاڑیوں کی وجہ سے قدرتی طور پر حصار بند تھا، ابن بطوطہ نے اسی شہر کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہ نہایت وسیع اور عظیم الشان شہر بن گیا تھا۔

دہلی کا چھٹا مستقر فیروز آباد تھا۔ یہ شہر ہمایوں کے مقبرہ سے موجودہ شہر کے شمال کی طرف پہاڑی تک پھیلا ہوا تھا جہاں فیروز شاہ کی لاٹھ کھڑی ہوئی ہے یہ قلعہ کا ایک حصہ تھا اسے فیروز شاہ نے بسایا تھا۔

ساتواں مرکز شاہ جہاں آباد ہے جسے شاہ جہاں نے ایک مرتبہ نقشہ پر تعمیر کرایا جس میں لال قلعہ اور جامع مسجد شامل ہیں۔

آٹھویں شکل نیو دہلی کی ہے جو انگریزوں کے عہد کا تعمیر کردہ شہر ہے۔ یہ سارے مقام اگرچہ الگ الگ ناموں سے آباد ہوئے لیکن سب کے سب دہلی ہی کہلائے۔ بلاشبہ یہ سارا علاقہ قدیم شان و شوکت کا بے مثل مرقع ہے۔

بادشاہی لشکر نے شہر پر حملہ کر دیا لیکن کوتوال شہر اور باشندوں نے امان طلب کر کے صلح کر لی۔ شہزادوں میں بھی مقابلہ کی تاب نہیں تھی اس لیے انھوں نے بھی شیخ رکن الدین قریشیؒ کو واسطہ بنا کر مصالحت کی درخواست کی اور الغ خاں کے پاس آ گئے۔ الغ خاں نے نہایت عزت و توقیر کے ساتھ ان سے ملاقات کی اور فتح کی خوش خبری دہلی کو روانہ کر دی اور خود بھی اسیر شہزادوں کو لے کر دہلی کی طرف چلا۔ جب وہ ضلع ہانسی میں بھوہر گاؤں پہنچا تو نصرت خاں اس کے نام ایک شاہی فرمان لے کر آیا جس کے بموجب الغ خاں نے دونوں شہزادوں اور مرحوم سلطان کے مغل داماد الغو بیگ اور دانش مند وزیر ملک احمد حبیب کو اندھا کر دیا۔ ارکلی خاں کے دو بیٹوں کو قتل کرا دیا اور دونوں شہزادوں کو ہانسی کے کوتوال کی حراست میں دے کر باقی اسیروں کو مع اہل و عیال کے دہلی روانہ کر دیا۔ سلطان نے الغو مغل اور احمد حبیب کو قلعہ گوالیار میں بھیج دیا اور دوسروں کو دہلی ہی میں قید رکھا۔ اس زمانہ میں اور دوسرے بہت سے قدیم اُمراء کو بھی اندھا کر دیا گیا اور کچھ کو جلا وطنی کا حکم دیا گیا۔ غرض سلطان جلال الدین کا سارا خاندان دیکھتے ہی دیکھتے تباہ و برباد ہو گیا اور اس طرح قدرت نے حق پسند درویش سیدی مولا کے خون کا بدلہ پوری طرح چکا دیا۔

اس دارِ مکافات میں سُن اے غافل
بیداد کرے گا آج کل پائے گا!

٦٩٦ھ میں نصرت خاں منصبِ وزارت پر فائز ہوا۔ اس نے لوگوں سے وہ سارے انعامات بڑی سختی کر کے واپس لے لیے جو علاؤالدین نے ابتداء میں تالیفِ قلب کے لیے عطا کیے تھے۔ اس طرح سرکاری خزانہ میں بے انتہا روپیہ داخل ہو گیا۔ علاء الملک[1] دہلی کا کوتوال تھا۔ سلطان نے اسے کڑے کی حکومت عطا کر کے روانہ کر دیا تھا لیکن دوبارہ اُسے کڑہ سے بُلا کر اس کے قدیم عہدہ پر فائز کر دیا۔ ملتان کا علاقہ الپ خاں کو بطور جاگیر ملا۔

مغلوں کا پہلا حملہ

٦٩٨ھ میں مغلوں نے چتلدی نامی مغل سردار کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ سندھ سے آگے تک بڑھ آیا۔ سلطان نے اس کے مقابلہ کے لیے الغ خاں اور تغلق خاں غازی الملک کو جو دیپال پور کا حاکم تھا روانہ کیا۔ شاہی لشکر کی مغلوں سے جارن منجھور کے علاقہ میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخر کار مغلوں کو شکست ہوئی اور کئی ایک مغل میدان میں مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے اور شاہی لشکر مال و غنائم لے کر فاتح و کامیاب واپس آیا۔

مغلوں کا دوسرا حملہ

مغلوں کا دوسرا حملہ قتلغ[2] خواجہ ولد سلطان داؤد کی قیادت میں ہوا۔ خواجہ ماوراء النہر سے یلغار کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوا اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ دہلی کی سرحدوں تک آ پہنچا۔ حملہ آوروں نے مضافات اور دیہات میں کسی قسم کی غارت گری نہیں کی البتہ دہلی کی

---

[1] علاء الملک ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کا چچا ہے۔
[2] ترکی میں "قتلغ" کے معنی "میانہ" یا "منجھلا" کے ہیں۔

پوری طرح ناکہ بندی کردی جس کی وجہ سے شہر میں غلہ کا قحط پڑ گیا اور گرانی کی وجہ سے لوگ تنگ آ گئے۔ سلطان نے حملہ آوروں کے مقابلہ کے لیے الغ خاں اور ظفر خاں کو ایک بڑا لشکر دے کر متعین کیا۔ کیلی کی سرحد پر لڑائی ہوئی۔ اس معرکہ میں ظفر خاں[1] مارا گیا۔ کہتے ہیں اس کی ہلاکت خود سلطان کی مرضی کے مطابق ہوئی۔ قتلغ خواجہ شکست کھا کر خراسان بھاگ گیا اور وہیں انتقال کیا۔

مغلوں کا تیسرا حملہ

تیسری بار مغلوں نے ترغی مغل کی قیادت میں جو بڑا ماہر تیر انداز تھا ہندوستان پر حملہ کیا۔ ترغی کی کمان میں ایک لاکھ پیادہ اور بیس ہزار سوار تھے، وہ کوہستانی علاقوں کو فتح کرتا ہوا قصبہ برن تک آ پہنچا۔ برن کا حاکم ملک فخرالدین امیردار قلعہ بند ہو گیا۔ سلطان نے اُس کی کمک کے لیے ملک تغلق غازی الملک کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ جس وقت شاہی لشکر وہاں پہنچا تو ملک فخرالدین بھی قلعہ سے نکل کر اس سے آ ملا۔ دونوں نے مل کر رات کو مغل فوج پر چھاپہ مارا۔ یہ شب خون اتنا زبردست تھا کہ مغل بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ترغی کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

مغلوں کا چوتھا حملہ

علاؤالدین کے عہد میں مغلوں نے چوتھی بار خراسان کے شہزادوں محمد تریاق اور علی بیگ کی قیادت میں ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ اس مرتبہ مغلوں نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان کا ایک لشکر ناگور کی طرف بڑھا اور دوسرا سرمور کے پہاڑوں کو فتح کرتے ہوئے بیاہ یعنی کالی ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ سلطان نے ملک مانک غلام اور حاکم دیپال پور ملک تغلق کو ان کے مقابلہ پر امروہہ کی جانب روانہ کیا۔ مغل غنیمت میں ملا ہوا کافی مال و اسباب لیے ہوئے رہب ندی کو عبور کر رہے تھے کہ ملک مانک نے اُن پر پشت سے حملہ کر دیا۔ اس موقعہ پر بڑی خوں ریز لڑائی ہوئی، دونوں مغل شاہزادے خوب جم کر لڑے اور انھوں نے بڑی بہادری دکھائی لیکن وہ گرفتار ہو کر قتل ہوئے اور اُن کا ایک بڑا لشکر گاجر مولی کی طرح کٹ گیا، جو بچے وہ جان بچا کر اپنے ملک کو بھاگ گئے۔ دونوں شہزادوں کے سر قلعہ بدایوں کے کنگرے پر لٹکا دیئے گئے۔[2] کسی شاعر نے اس موقع پر بدایوں کے جنوبی دروازہ پر یہ قطعہ لکھ دیا:

اے حصن کہ تائید خدا یار تو باد — فتح و ظفر شاہ علم دار تو باد

از تو ملک زمانہ معمار تو شد — ترغی چو علی بیگ گرفتار تو باد

مغلوں کا پانچواں حملہ

مغلوں نے پانچویں بار دکیک نامی مغل سردار کی قیادت میں حملہ کیا۔ دکیک دونوں شہزادوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ایک بڑا لشکر لے کر ملتان کی طرف آیا۔ سلطان نے اس بار

---

[1] ظفر خاں نہایت دلیر اور بہادر سپہ سالار تھا مغلوں پر اس نے بڑھ کر بھرپور حملہ کیا اور ایک ہی تاخت میں ان کو کافی دور تک پیچھے ہٹا دیا۔ جس وقت وہ ان کے تعاقب میں لگا ہوا تھا مغلوں کے ایک دستہ نے پیچھے سے اسے گھیر لیا اس موقع پر الغ خاں نے ظفر خاں سے دشمنی کی وجہ سے سخت غداری کی اور بجائے آگے بڑھ کر ان حملہ آوروں کو روکنے کے اپنی جگہ ٹھہرا رہا۔ ظفر خاں نے آخر دم تک بہادری سے لڑتے ہوئے جان دے دی، اس کے مرنے کے باوجود مغلوں پر اس کے حملے کا ایسا خوف طاری تھا کہ وہ خراسان لوٹ گئے۔ (فیروز شاہی)

[2] امیر خسرو نے ملک مانک کی اس دلیرانہ لڑائی کا پورا حال اپنے رزمیہ "خزائن الفتوح" میں تحریر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ رزمیہ خسرو کی فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی اور سے ایسے کلام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بھی ملک مانک اور ملک تغلق کو ہی ان کے مقابلہ پر بھیجا۔ شاہی لشکر میں اُس وقت جبکہ مغل ملتان کو لوٹ کر واپس ہو رہے تھے اُن کے سر پر جا پہنچا اور ایسا بھرپور حملہ کیا کہ مغل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلے۔ لشکر نے ان کا تعاقب کر کے کئی ایک مغل سرداروں اور کیبک کو گرفتار کر لیا۔ کافی غنیمت جس میں ملتان کی لوٹ بھی شامل تھی شاہی لشکر کے ہاتھ آیا۔ اس شکست کے بعد مغل ایسے پست ہمت ہوئے کہ پھر ہندوستان کا رخ کرنے کی جرأت نہ کی۔

شراب کی ممانعت

ان پے درپے فتوحات کی وجہ سے پورے ملک پر سلطان علاؤالدین کا رُعب چھا گیا اور ملک کی سرحدیں بھی محفوظ ہو گئیں۔ سلطان نے ان فتوحات کی خوشی میں جشن شاہانہ منعقد کیا اور ساری رات شراب و رنگ کا دَور چلتا رہا۔ اس رات جب کافی وقت گزر گیا تو اہل مجلس اُٹھنے کے لیے ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے، سلطان نے جو نہایت مدہوش ہو رہا تھا یہ گمان کیا کہ یہ لوگ میرے قتل کے لیے اشارے کر رہے ہیں وہ گھبرا کر "غدر غدر" چلّانے لگا اور اپنے محافظوں کو قاضی بہار کی گردن اُڑا دینے کا حکم دیا۔ قاضی بہار سلطان کا نہایت چہیتا اور ظریف مصاحب تھا۔ اُسی وقت سب لوگ مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ جب صبح ہوئی اور بادشاہ کے ہوش ٹھکانے آئے تو اُسے خیال آیا کہ رات اس نے خواہ مخواہ بدگمانی کی تھی چنانچہ اُس نے قاضی بہار کو بلوا بھیجا۔ خدام نے عرض کیا وہ تو اُسی وقت قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ سُن کر سلطان کو سخت صدمہ ہوا اور ایسی پشیمانی ہوئی کہ اس نے اُسی وقت شراب سے توبہ کی اور منادی کرا دی کہ پوری مملکت میں کسی جگہ بھی شراب فروخت نہ کی جائے۔ شاہی محل میں جتنے شراب کے ذخیرے تھے سب بہا دیے گئے۔ اس حکم کے بعد جو بھی حالت مستی میں پایا جاتا اُسے سزا دی جاتی تھی۔ میخانے بند ہو گئے اور محتسبوں کی بن آئی، زہد و تقویٰ کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔

۶۹۷ھ میں نومسلم مغلوں نے شورش کا ارادہ کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکاری عُمّال نے ان سے سرکاری روپیہ اور سلطان کے دیے ہوئے انعامات واپس لینے میں بڑی سختی کی۔ تنگ آ کر اُنھوں نے طے کیا کہ جس دن سلطان شکار میں مصروف ہو وہ غدر برپا کر دیں۔ سلطان کو اُن کے ارادوں کا علم ہو گیا۔ اس نے خفیہ احکام جاری کر دیے کہ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو جو بھی مغل نظر آئے قتل کر دیا جائے، چنانچہ مقررہ دن پورے ہندوستان میں بیچارے یہ پردیسی نومسلم اس قدر قتل ہوئے کہ شمار سے باہر ہے۔

علاؤالدین کی خام خیالیاں

دُنیاوی کامیابیاں انسان کو اپنے متعلق ایسی ایسی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ آسمانوں کی پرواز کرنے لگ جاتا ہے۔ علاؤالدین کو بھی جب متواتر کئی ایک کامیابیاں ہوئیں اور سارا ملک اس کے زیر نگیں ہو گیا تو وہ بھی طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ ایک تو یہ سوجھی کہ دین محمدی کی طرح ایک اور دین ایجاد کرے۔ اس نے خلفاء اربعہ کی طرح الغ خاں، الپ خاں، ظفر خاں اور نصرت خاں کو چار خلفاء بنانا بھی طے کر لیا۔ دوسرا یہ خبط سوار ہوا کہ سکندر کی طرح تمام دنیا کو فتح کر لے۔ چنانچہ اس نے خطبہ میں اپنے نام کے ساتھ سکندر ثانی پڑھنے کا حکم دے دیا۔ لیکن خدا نے اُسے اپنی مہربانی سے اس گمراہی سے بچا لیا۔ سلطان نے ان دونوں باتوں کے لیے علاءالملک کوتوال شہر سے مشورہ کیا۔ علاءالملک زیرک آدمی تھا اُس نے ان دونوں باتوں سے منع کیا کہ

دین کسی بندہ کے ایجاد کرنے سے نہیں بن جاتا یہ تو صرف اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتا ہے، پھر اس کے ساتھ معجزوں کا ہونا بھی ضروری ہے بغیر اس کے صرف دولت اور قوت کے زور سے دین کو بدل دینا ممکن نہیں، ایسے کسی اقدام سے طرح طرح کے فتنے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے جن کے نتیجہ میں بجز رسوائی اور پشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا البتہ ملک گیری کا ارادہ نہایت معقول اور مناسب ہے لیکن سکندر کا سا ساز و سامان میسر ہے نہ ارسطو جیسا وزیر۔ آپ اگر تمام ہندوستان کے قلعوں کو کافروں سے اور دہلی کے نواح کو سرکشوں سے پاک کر دیں تو یہ کارنامہ سکندر کی جہانگیری سے کم نہ ہوگا۔ غرض علاء الملک نے عقلی اور نقلی دلائل سے اس کے ان دونوں ارادوں کے متعلق بڑی معقول اور جچی تلی باتیں کہیں۔ سلطان کو بھی اس کی یہ تقریر نہایت پسند آئی اور اس نے حسب بخوبی غور کیا تو اسے علاء الملک کا مشورہ ہی مناسب معلوم ہوا اور وہ اپنی ان خام خیالیوں سے باز آگیا اور خوش ہو کر علاء الملک کو خلعت اور انعامات عطا کیے۔ دربار کے دوسرے امراء جو بادشاہ کی ہیبت اور بد مزاجی کی وجہ سے خلاف مرضی کوئی بات کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے، وہ بھی علاء الملک کی اس بے باکی اور حق گوئی پر بہت خوش ہوئے اور اس کی بہت تعریف و تحسین کی اور اس کے پاس تحفے بھیجے۔ اسی سال بادشاہ نے دیوگیر[1] کو دوبارہ فتح کیا اور اس فتح کے نتیجہ میں وہاں سے کافی مال غنیمت اور نفیس تحفے ہاتھ آئے۔

گجرات پر فوج کشی

۶۹۸ھ میں سلطان نے گجرات کے راجہ رائے کرن پر فوج کشی کے لیے الغ خاں[2] کو ایک بڑا لشکر دے کر روانہ کیا۔ رائے کرن تیس ہزار سوار، اسی ہزار پیادے اور تیس ہاتھی لے کر مقابلہ پر آیا لیکن شاہی لشکر کے مقابلہ میں اسے شکست ہوئی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ الغ خاں نے سروالہ کو لوٹ لیا اور رائے کرن کا تعاقب کیا۔ وہ دیوگیر (دکن) کے راجہ رام دیو کے پاس جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ اس کے اہل و عیال اور گجرات[3] کا خزانہ مسلمانوں کو غنیمت میں مل گیا۔

---

[1] دیوگیر کو اب دولت آباد کہتے ہیں۔ یہ شہر حیدرآباد دکن کے صوبہ اورنگ آباد سے دس میل کے فاصلہ پر بمبئی سے ۱۷۰ میل پر ہے، موجودہ آبادی دو ہزار ہوگی۔ دولت آباد کا قلعہ ایک پہاڑ کی چٹان پر ہے حصار پونے تین میل کا ہے، بالا حصار ۲۱۰ فٹ بلند ہے۔ اس پہاڑ کی بلندی زمین سے چھ سو فٹ ہے۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے وقت ۱۲۹۴ء میں یہاں خاندان یدو کا راجہ رام چند تھا۔ علاؤالدین جب نذرانہ لے کر لوٹ گیا اور دوبارہ راجہ نے بغاوت کی تو ملک کافور بادشاہ کے سپہ سالار نے اس قلعہ اور شہر کو فتح کیا اس کے بعد راجہ کے بیٹے شنکر نے بغاوت کی تو ملک کافور نے تیسری بار اس کو فتح کیا۔ کچھ عرصہ بعد راجہ کے داماد ہرپال نے بغاوت کی تو مبارک خلجی نے اسے شکست دے کر زندہ جلوا دیا۔ ۱۳۲۸ء میں محمد شاہ تغلق نے دہلی کو اجاڑ کر اس شہر کو دارالخلافہ بنایا۔ دیوگیر دہلی سے پورے ۸۰۰ میل پر ہے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں دکن کے خود مختار سرداروں نے دولت آباد پر قبضہ کر لیا تھا، پھر یہ صوبہ ۱۵۲۶ء تک بہمنی سلطنت کے زیر نگیں رہا۔ بہمنیوں کے زوال پر احمد نگر کے نظام شاہی سلاطین قابض رہے ان سے عالمگیر اورنگ زیب نے چھین لیا۔ ۱۷۲۸ء میں یہ سلطنت آصفیہ دکن کا حصہ بن گیا۔ ۷۴۳ھ میں ابن بطوطہ بھی اس جگہ گیا تھا۔

[2] ترکی میں "الغ" کے معنی بڑے کے ہیں اور "اکت" کے معنی چھوٹے کے۔ اس زمانہ میں "الغ خاں" "امیر الامراء" کے مساوی عہدہ تھا چنانچہ ناصر الدین محمود نے بلبن کو یہی خطاب دیا تھا۔ علاؤالدین نے اپنے بھائی الماس بیگ کو اس عہدہ پر فائز کیا۔ محمد تغلق کو بھی اس کے باپ نے الغ خاں کا خطاب دیا۔

[3] گجرات دریائے نربدا کے شمال میں سمندر کے کنارے کا علاقہ گجرات کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ نربدا سے صحرائے مارواڑ (جودھ پور) تک وسیع ہے اس کے مغربی حصے کا نام کاٹھیا واڑ ہے جو تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ اس سارے علاقہ میں گجراتی زبان بولی جاتی ہے۔ گجرات کا وسطی

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

رائے کرن کی ایک بیوی دیول رانی نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ سلطان کا بڑا لڑکا خضر خاں اس پر عاشق ہو گیا۔ خضر خاں نے امیر خسرو سے اس معاشقہ کو نظم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ اُنھوں نے ان دونوں کے قصہ کو بڑے عمدہ پیرایہ میں نظم کیا۔ اُن کی یہ نظم بہت مشہور ہے۔ الغ خاں نہروالہ سے ایک بڑا بُت جس کی ہندو بہت پرستش کرتے تھے دہلی لے کر آیا تھا اس نے یہ بُت دہلی کی سڑک پر ڈال دیا تاکہ راہ گیر اسے پامال کرتے ہوئے گزریں۔

جس وقت رائے کرن شکست کھا کر بھاگا تھا الغ خاں اس کے تعاقب میں سومنات[1] تک گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اس مشہور بُت خانہ کو دوبارہ تباہ کر دیا اور وہاں ایک مسجد بنوائی۔

اس زمانہ میں نصرت خاں نے کھمبایت[2] پر جو ساحل سمندر پر ایک مشہور بندرگاہ ہے حملہ کیا۔ کھمبایت سے نصرت خاں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میدان ندیاں نربدا اسابرمتی اور مہی سے سیراب ہوتا ہے۔ کاٹھیاواڑ اپنی بندرگاہوں اور گھوڑوں کی تجارت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس سرزمین کو ہندو مہادیو اور سری کرشن کا دیس بتاتے ہیں۔ ہندوؤں کے قدیم مندر دوارکا، سومنات اور پالی ٹانہ میں ہیں۔ سومنات کے مشہور مندر پر سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۶ھ / ۱۰۲۶ء میں حملہ کیا تھا۔ احمد آباد اور سورت گجرات کے بڑے شہر ہیں۔ زمانہ قدیم میں گجرات پر بدھ مت والوں کی حکومت تھی، پھر یہاں راجپوتوں کی عملداری رہی، ان کا صدر مقام موجودہ ریاست بڑودہ کے ضلع کڑی کی تحصیل "انہلواڑہ" میں تھا اس کو اب پٹن کہتے ہیں۔ محمود غزنوی اور قطب الدین ایبک کے حملوں کے بعد ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ء میں سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں گجرات دہلی کا ماتحت صوبہ بن گیا۔ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء میں دہلی کے گورنر ظفر خاں نے خود مختار ہو کر بادشاہی کی بنیاد رکھی۔ ۸۹۰ھ / ۱۵۷۲ء میں اکبر نے اس صوبہ کو دوبارہ دہلی کا باج گذار بنا لیا۔ مغل بادشاہوں کا قبضہ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء تک قائم رہا۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں گائکواڑ خاندان نے بغاوت کر کے خود مختاری اختیار کی، ان کے بعد انیسویں صدی کے آغاز میں یہ علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔

[1] سومنات۔ جزیرہ نمائے کاٹھیاواڑ کے موضع پٹن میں یہ بُت خانہ ہے جو ویراول ریلوے اسٹیشن سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ پہلے ریاست جوناگڑھ کے ماتحت تھا یہاں سے احمد آباد کا فاصلہ تقریباً تین سو میل ہوگا۔ ویراول سے پٹن تک سڑک کے دونوں طرف مسلمانوں کی بے شمار قبریں ہیں۔ بلاشبہ یہ اُنہی شہدا کی یادگاریں ہیں جنھوں نے اس خانۂ کفر کو ڈھانے میں جانیں قربان کر دی تھیں۔ پٹن کے پہلے دروازہ پر عربی اور سنسکرت میں دو کتبے ہیں، دوسرے پھاٹک پر علاؤالدین کا فتح نامہ ہے۔ مندر کی عمارت پختہ اور ویران ہے۔ ہندوؤں کے عقیدہ میں یہ مہادیو کا مندر ہے، سورج اور چاند گرہن کے وقت سارے ہندوستان کے یاتری یہاں جمع ہوتے تھے اور یہ بہت بڑا تیرتھ تھا۔ ہندو اعتقاد میں اس مندر سے آواگون (تناسخ) کے مطابق روحوں کو جسم عطا کیے جاتے ہیں۔ سومنات دیوتا کی مورت ۵ گز لمبی تھی ۲ گز زمین میں ۳ گز اوپر۔ اس میں چھپن ستون مرصع جواہرات کے تھے، چھت میں دو سو من سونے کی زنجیر تھی، چھ سو کوس سے گنگا جل دیوتا کے اشنان کے لیے روزانہ لایا جاتا تھا، ۵ سو لڑکیاں، تین سو گوّیے، تین سو نائی، دو ہزار پنڈت مندر کے ملازم تھے۔ سلطان محمود نے اس بُت کی ناک تیر سے اُڑا دی۔ مورت توڑنے پر اس کے پیٹ میں سے بے شمار ہیرے موتی جواہرات نکلے۔ اس بت کے دو ٹکڑے مکہ اور مدینہ کو روانہ کیے گئے اور ان میں سے ایک غزنی کی جامع مسجد اور دوسرا دیوان عام کے سامنے ڈلوا دیا۔ شیخ سعدی نے ساتویں صدی ہجری میں اس مندر کی سیر کی ہے اُس وقت یہ آباد تھا۔ سعدی نے بوستان میں اس کا ذکر کیا ہے ؎ "بتے دیدم از عاج در سومنات + مرصع چو در جاہلیت منات"۔ سومنات سے مراد مندر ہے نہ کہ بُت۔ شیخ فریدالدین عطار کا شعر بھی اس کی تائید کرتا ہے ؎ "لشکر محمود اندر سومنات + یافتند آں بُت کہ نامش بود نات"۔ فرشتہ کہتا ہے سوم بادشاہ کا نام تھا اور نات بُت کا۔ اس بادشاہ کی نسبت سے شہر کا نام سومنات پڑ گیا۔ جس طرح بعلبک بُت اور شہر دونوں کا نام ہے۔ نویں صدی میں سلاطین گجرات نے مندر پر حملہ کر کے بُت توڑ ڈالا، اس کے بعد یہ آباد نہیں ہوا۔ موجودہ بھارتی حکومت نے اس میں دوبارہ مورتی رکھوائی ہے۔ مندر کا طول و عرض دس پندرہ گز ہے، باہر کی دیواروں پر کئی طرح کے نقش و نگار ہیں۔

[2] کھمبایت کے متعلق تزک جہانگیری میں سب سے زیادہ عمدہ اور معتبر بیان ہے۔ جہانگیر کہتا ہے "یہ قدیم بندرگاہ ہے، برہمن اس کی بناء ہزارہا سال قبل

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بے شمار مال و دولت لعل و جواہرات حاصل ہوئے مشہور (فاتح) کافور ہزار دیناری بھی اسی لڑائی میں گرفتار ہو کر آیا تھا جس نے ترقی کر کے سلطان کے نائب کی حیثیت اختیار کر لی۔

الغ خاں جب گجرات فتح کر کے الور میں آیا تو اس نے لشکریوں پر بڑی سختی کر کے مالِ غنیمت وصول کیا۔ اس کارروائی سے مغل لشکری بگڑ گئے اور مقابلے پر تیار ہو گئے، لیکن الغ خاں نے ان کو زیر کر کے سخت سزا دی[۱] اور انھیں منتشر کر دیا۔ ان میں سے کچھ مغل تو رنتھبور کے قریب جھائن میں راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے اور الغ خاں مسلسل کوچ کرتے ہوئے دہلی لوٹ آیا۔

رنتھبور کا معرکہ

الغ خاں نے ۶۹۹ھ میں رنتھبور اور جھائن پر جو نوشہرہ کے نام سے موسوم ہے حملہ کیا۔ یہاں کا راجہ رائے پتھورا کا پوتا ہمیر دیو تھا۔ وہ دس ہزار سوار، بکثرت پیدل فوج اور بے شمار ہاتھی لے کر مقابلہ پر آیا لیکن اسے بُری طرح شکست ہوئی وہ اپنا مال و اسباب سمیٹ کر رنتھبور کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ الغ خاں نے اس مہم کے متعلق تفصیلی رپورٹ دہلی روانہ کی اور سلطان کو رنتھبور پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔

چتوڑ کی فتح

سلطان علاؤالدین نے الغ خاں کے مشورہ پر بڑی بھاری فوج کے ساتھ کوچ کیا اور تھوڑی ہی مدت میں اس قلعہ کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ فتح کر لیا اور ہمیر دیو کو قتل کروا دیا۔ مفتوحہ قلعہ سے کافی دفینے اور ذخیرے حاصل ہوئے۔ سلطان نے اس کی حفاظت کے لیے ایک قلعدار مقرر کیا اور جھائن کا علاقہ الغ خاں کے حوالے کر کے چتوڑ[۲] کی طرف روانہ ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ کھمبایت صفحہ گزشتہ) بتاتے ہیں، اس کا پہلا نام ترنباوتی تھا اور یہاں کا راجہ ترنبک کمار تھا۔ راجہ امبھے کمار کے عہد میں اس شہر پر آسمانی عذاب نازل ہوا اور سارا شہر مٹی میں دھنس گیا۔ مہادیو کی مورتی نے جو لکڑی میں نقش تھی امبھے کمار کو خواب میں اس عذاب سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اس بُت کو جہاز میں رکھ کر مع اہل و عیال و خزانہ سوار ہو گیا، جہاز بھی سمندر کے طوفان میں ٹوٹ گیا۔ راجہ اس لکڑی کے بُت کے سہارے بچ گیا اور دوبارہ اُس نے اس شہر کو تعمیر کرایا اور اس بُت والے ستون کو یادگار و برکت کے لیے نصب کروا دیا۔ ہندی میں ستون کو کھنبا اور تھنب کہتے ہیں اس لیے اس کا نام تھنب نگری اور کھنباوتی پڑ گیا جو کثرت استعمال سے کھمبایت بن گیا جہاز کھمبایت کی کھاڑی میں نہیں آتے اور قریب کے بندر گوگہ پر لنگر کرتے ہیں۔" مشہور سیاح مسعودی نے بھی اس بندر کا ذکر کیا ہے۔ ساتویں صدی کے آخر میں ایران سے پارسی ہندوستان آئے تو وہ سورت سے ۷۰ میل پر مقام سنجیم میں ٹھہرے۔ وہاں سے رفتہ رفتہ گجرات کے سارے ساحل پر پھیل گئے۔ کچھ عرصہ تک کھمبایت پر انہی پارسیوں کا قبضہ رہا۔ بعد میں مغل صوبہ دار گجرات مومن خاں نے اس کو خود مختار جاگیر کی حیثیت دے دی۔ کھمبایت کے نوابوں نے مرہٹوں کی اطاعت قبول نہیں کی، حالانکہ وہ اپنے دور عروج میں پورے گجرات پر قابض تھے۔ یہ شہر مئو سے ۲۰۲ میل، احمد آباد سے ۵۲ میل پر ہے، آبادی چالیس ہزار ہے۔ شہر کی جامع مسجد سلطان محمد تغلق کی بنائی ہوئی ہے۔ مارکوپولو اور ابن بطوطہ نے بھی اس بندرگاہ کا ذکر کیا ہے۔

[۱] اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کا قتل عام الغ خاں کے دہلی لوٹ کر آنے کے بعد ہوا ہے۔ مؤرخین نے تقدیم و تاخیر کا خیال کیے بغیر اس واقعہ کا پہلے ہی ذکر کر دیا ہے۔ اگر پہلے ہی قتل عام ہوا ہوتا تو پھر لشکر کے ساتھ مغلوں کے ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[۲] چتوڑ۔ سابقہ ریاست اودے پور کا صدر مقام ہے۔ یہاں سے اجمیر ۱۱۶ میل اور اندور ۱۹۱ میل ہے۔ ریل کا اسٹیشن شہر سے دو میل پر اسی پہاڑی کے دامن میں ہے جس پر مشہور تاریخی قلعہ ہے۔ آبادی تقریباً آٹھ ہزار ہے۔ قلعہ چتوڑ کی عمارت پانچ فٹ سطح ارض سے بلند پہاڑی پر ہے۔ اس کا طول سوا تین میل اور عرض نصف میل ہے۔ ایک چکردار سڑک سے اوپر جاتے ہیں۔ سڑک کے گرد اگرد مستحکم (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سلطانی لشکر نے مختصر عرصہ میں چتوڑ کو فتح کر لیا۔ سلطان نے اس کا نام خضر آباد رکھا اور خضر خاں لعل کو ایک چتر عطا کر کے چتوڑ کی سربراہی پر مامور کر دیا۔

شاہزادہ کی وفات

اس مہم میں جو واقعات پیش آئے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بادشاہ کی روانگی سے پہلے شاہزادہ نصرت خاں نے الغ خاں کی کمک کے لیے رنتھبور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ایک دن قلعہ والے مورچوں پر سنگ باری کر رہے تھے کہ ایک پتھر نصرت خاں کو لگا، جس کے صدمہ سے وہ مر گیا۔ اس سے پہلے ظفر خاں کے مر جانے سے بادشاہ کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا، اب نصرت خاں کے شہید ہونے کے بعد اس کا دوسرا بازو بھی ٹوٹ گیا۔

علاؤالدین خطرہ میں

دوسرا واقعہ خود بادشاہ کے ساتھ پیش آیا۔ جب بادشاہ ہنٹ کے قصبہ میں پہنچا تو وہ ایک مرتبہ ساری رات "قمرغہ"[1] میں مصروف رہا، دوسرے دن صبح فوجوں کو تقسیم کر کے مختلف سمتوں پر روانہ کیا۔ اُس وقت وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر فوجوں کی روانگی کا معائنہ کر رہا تھا۔ عین اُس موقع پر اکت خاں اُن نومسلم مغلوں کو جو بہرہ پر متعین تھے ساتھ لے کر بادشاہ پر حملہ کے ارادہ سے بڑھا۔ باغیوں نے تیر برسانے شروع کر دیے۔ بادشاہ کے بازو میں بھی ایک تیر لگا اور وہ زخمی ہو گیا لیکن خوش قسمتی سے موسم سرما کی وجہ سے رُوئی کا موٹا کوٹ پہنے ہوئے تھا اس لیے تیر زیادہ کارگر نہیں ہوئے تاہم سلطان نیم جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اکت خاں نے گھوڑے سے اُتر کر چاہا کہ سلطان کا سر کاٹ لے تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے لیکن سرداروں نے اکت خاں کا استقبال کرتے ہوئے دوستانہ باتیں کیں اور عرض کیا بادشاہ کا کام تمام ہوا اب سر کاٹنے کی کیا حاجت ہے۔ اکت خاں پس و پیش میں پڑ گیا اور سیدھا شاہی خیمہ میں جا کر سلطان کے تخت پر بیٹھ گیا، کسی امیر نے مزاحمت نہیں کی اور سب نے نذرانے پیش کیے۔ اکت خاں کم حوصلہ آدمی تھا اس سے صبر نہ ہو سکا اور وہ اُسی وقت شاہی حرم سرا میں گھسنے لگا۔ ملک دینار (کافور) اپنی جمعیت کے ساتھ بہرہ پر تھا اُس نے اُسے

(بقیہ صفحہ گذشتہ بسلسلہ چتوڑ) فصیل ہے جس میں سات دروازے ہیں، بلندی پر چشمے تالاب اور باؤلیاں بنے ہوئے ہیں اکبر کے حملہ کے وقت اس قلعہ میں آٹھ ہزار فوجی اور چالیس ہزار باشندے تھے۔ مشہور ہے اس قلعہ کو ساتویں صدی مسیح میں چترانگ نام، ایک راجا نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے نام پر یہ چتراکوٹ پھر بگڑ کر چتوڑ ہو گیا۔ سولھویں صدی عیسوی تک چتوڑ اودے پور کے راجاؤں کا پایۂ تخت رہا۔ تاریخ میں یہاں کے راجپوتوں کی بہادری اور حریت پسندی کے قصے مشہور ہیں۔ علاؤالدین نے سب سے پہلے ۷۰۳ھ/۱۳۰۳ء میں اس کو فتح کیا۔ علاؤالدین کے دوسرے حملہ میں ہی پدمنی کا وہ مشہور سانحہ ہوا جو زبان زد عام ہے۔ پدمنی نے پاک دامنی کے لیے چتا میں جل کر جان دے دی تھی۔ بعد میں سلطان محمد تغلق کو بھی چتوڑ پر قبضہ کے لیے سخت معرکے لڑنے پڑے۔ اس کے بعد بہادر شاہ والیٔ گجرات نے سخت لڑائی کے بعد قبضہ کیا۔ پھر اکبر نے خونریز معرکوں کے بعد اسے فتح کیا۔ قلعہ میں بہت سے قدیم محل اور مندر ہیں، ان عمارتوں میں "جے ستمب" کا مینار قابل دید ہے، جس کو رانا کمبھا نے ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء اور ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء میں شاہان مالوہ اور گجرات کی متحدہ فوجوں پر کامیابی کے بعد فتح کی یادگار میں بنوایا تھا۔ اس کی بلندی ۱۲۰ فٹ ہے اس کے نو درجے ہیں (قطب مینار ۲۳۸ فٹ بلند ہے)۔

[1] "قمرغہ" شکار کا نام ہے۔ ایک بڑے احاطہ میں ہرن، بکری، بارہ سنگھا وغیرہ چوپایوں کو گھیر کر ہانکا کیا جاتا ہے اور شکاری گھوڑوں پر ان کا شکار کرتے ہیں۔

روک دیا اور کہا جب تک تم بادشاہ کا سر نہ لاؤ گے میں اندر جانے نہ دوں گا۔ اُدھر علاؤالدین جب ہوش میں آیا تو اُس کی مرہم پٹی ہوئی، اُس نے دل میں سوچا کہ یقیناً اُمراء اکت خاں سے مل گئے ہیں اُن کی موافقت کے بغیر اکت خاں کی یہ جرأت نہیں ہوسکتی، اس لیے اس وقت لشکر گاہ میں جانا خطرہ سے خالی نہ ہوگا۔ اب جو پچاس ساٹھ ہمراہی رہ گئے ہیں اُن کے ساتھ الغ خاں کے پاس جھاین میں چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ لیکن بعض سرداروں نے اس کی تائید نہ کی اور اُسے مجبور کرکے لشکر گاہ کی طرف لے چلے۔ ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ پچاس سوار اور آکر بادشاہ کے ہمراہ ہوگئے۔ جیسے ہی اکت خاں کو یہ خبر ملی کہ بادشاہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے، وہ حواس باختہ ہوکر افغان پور کی طرف بھاگ نکلا۔ لشکر والوں نے تعاقب کرکے اُسے گرفتار کرلیا اور بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ نے اُس کے سارے کنبہ کو قتل کرا دیا، اس حادثہ میں اس کا بھائی قتلغ خاں بھی مارا گیا۔

اسی زمانہ میں بادشاہ کے دو بھتیجوں عمر خاں اور منگو خاں نے بداؤں[1] میں بغاوت کی۔ دو تین شاہی سردار وہاں جاکر اُن دونوں کو پکڑ لائے، اُن کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔

حاجی مولا کی بغاوت

محاصرۂ رنتھبور کے موقع پر بھی ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا تھا۔ ملک الامراء کوتوال کے ایک غلام حاجی مولا نامی نے چند فتنہ پردازوں کو ساتھ لے کر ایک سازش کی۔ وہ بادشاہ کا ایک جعلی فرمان لے کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بداؤں دروازہ سے دہلی میں آیا اور وہ فرمان بتا کر کوتوال شہر ترمذی نامی کو قتل کردیا اور شہر کے دروازے بند کرا دیے۔ پھر اپنے آقا علاء الملک کو جو قلعہ کے کوتوال تھے کہلایا کہ بادشاہ کے پاس سے فرمان آیا ہے اسے آکر پڑھو۔ علاء الملک ہوشیار آدمی تھا وہ اُس کے پاس نہیں گیا۔ حاجی مولا نے کوشک لعل میں جتنے قیدی تھے سب کو رہا کرکے اُنھیں مسلح کردیا اور اُنھیں شہر کے خزانہ سے رقم دے کر اپنا موافق بنا لیا اور ایک علوی سید منسہ نامی کو جس کی ماں شمس الدین التمش کی اولاد میں سے تھی کوشک لعل میں تختِ سلطنت پر بٹھا کر تمام امیروں سے جبراً نذر دلوائی۔ حاجی مولا کی ان سب حرکتوں کی خبر بادشاہ کو پہنچتی رہی لیکن اُس نے ان سب خبروں کو راز ہی میں رکھا اور نہ پایۂ تخت کی اس شورش پر کچھ زیادہ پریشان ہوا اور پوری دل جمعی کے ساتھ فوج کشی میں لگا رہا۔ حاجی مولا کی سرکشی پر ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ملک حمید الدین نے جو میر کوٹی کے عہدہ پر فائز تھا اپنے بیٹوں اور ظفر خاں کے کچھ سواروں کو جو امروہہ[2] سے آئے تھے ساتھ لیا

---

[1] بداؤں بریلی سے ۲۷ میل پر روہیل کھنڈ ریلوے لائن پر ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے اسلامی تاریخ میں اس کا تذکرہ ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء سے ملتا ہے جبکہ قطب الدین ایبک نے بداؤں کے قلعہ کو فتح کیا تھا۔ وسط شہر میں سلطان شمس الدین التمش کی یادگار ایک عالی شان مسجد ہے، بڑی نہیں لیکن نہایت خوش منظر اور نفیس ہے، پورے روہیل کھنڈ میں ایسی کوئی مسجد نہیں۔ بداؤں قدیم دور میں علم وفضل کا مرکز تھا۔ یہاں سے بڑے بڑے لوگ اُٹھے ہیں۔ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء، مشہور شاعر ضیاء الدین نخشبی اور مؤلف کتاب ہذا ملا عبدالقادر بدایونی اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ شہر کے باہر مشاہیر علماء و صوفیا کی قبریں ہیں۔

[2] امروہہ۔ ضلع مرادآباد میں تحصیل کا صدر مقام ہے آبادی چالیس ہزار مرادآباد سے ۲۳ میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ دہلی سے بذریعہ ریل ۸۲ میل پر ہے۔ امروہہ کا ذکر اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ملتا ہے جبکہ وہ ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء میں کٹھیر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے اس جگہ آیا تھا۔ امروہہ کسی اور وجہ سے مشہور ہو یا نہ ہو شیخ سدو کی وجہ سے ضرور مشہور ہے اُن کا خیالی مزار جامع مسجد کے اندر ہے عورتیں عموماً شیخ سدو کی منت مانتی ہیں تاکہ بھوت پریت کا اثر نہ ہو۔ امروہہ کے قریب ایک دلدل ہے جس میں سے ایک ندی نکلتی ہے اُس کا نام سوت کی ندی ہے عام طور پر اسے یار وفادار بھی کہا جاتا ہے۔

اور حاجی اور سیّد مذکور کو گھیر کر قتل کر دیا اور اُن کے سر رنتھبور میں سلطان کے پاس بھیج دیے۔ سلطان نے اُن تمام امیروں کو جو اس غدر میں شریک تھے قتل کرا دیا اور اس خیال سے کہ یہ شورش ملک الامراء کے اشارہ سے ہوئی ہوگی اُس کے سارے خاندان کو تہ تیغ کرا دیا۔

رنتھبور کا قلعہ فتح ہو گیا تو سلطان نے یہ قلعہ الغ خاں کی جاگیر میں دے دیا اور وہاں سے دارالسلطنت مراجعت کا ارادہ کیا، لیکن شومیٔ تقدیر سے انہی دنوں الغ خاں نے وفات پائی۔ رنتھبور کا قلعہ اُس کے لیے گویا شدّاد کی جنت بن گیا۔

چار نکاتی لائحہ عمل

قلعہ فتح ہونے پر یہاں جالور کے مغرور باغی بھی پکڑے گئے جو قلعہ میں بند تھے۔ اُن کا سردار محمد شاہ زخمی تھا، اُسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اُس سے پوچھا "اگر میں تجھے رہا کر دوں اور تیرے زخموں کا علاج کراؤں تو صحت پانے کے بعد تو میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟" اُس نے بے باکی سے جواب دیا: "اگر مجھے قابو ملے تو تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا اور ہمیر دیو کے بیٹے کو بادشاہ بنا دوں گا۔" اس کے اس جواب پر سلطان کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ سرکشی اور بغاوت کے اسباب اور باغیوں کی نفسیّات پر غور کرنے لگا۔ اپنے تمام وزیروں کو جمع کر کے اس نے پوچھا "بغاوت کے محرکات کیا ہیں اور اس کا انسداد کس طرح ممکن ہے؟" وزیروں اور مشیروں نے جو کچھ کہا اُس کا خلاصہ ان چار باتوں میں آ جاتا ہے:

اوّل یہ کہ بادشاہ ملک کے اچھے بُرے تمام حالات پر نگران اور اُن سے باخبر رہے۔

دوم یہ کہ شراب تمام بُرائیوں کی جڑ ہے اس کو یک لخت موقوف کر دیا جائے۔

سوم یہ کہ امیروں کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا جائے، وہ ایک دوسرے کے گھر جائیں اور نہ باہم مشورہ کریں۔

چہارم یہ کہ خواہ فوجی ہوں یا رعیّت کسی کو دولت کی فراوانی کا موقع نہ دے، سارے فتنے مال و دولت ہی سے اُٹھتے ہیں۔

بادشاہ نے یہ چاروں باتیں قبول کر لیں، شراب کی ممانعت تو پہلے ہی کرا چکا تھا جس کا ذکر آ چکا ہے، بقیہ تین امور کے لیے بھی احکام جاری کر دیے۔

نرخوں کا تعیّن

سلطان علاؤالدین نے کچھ نئے قاعدے اور ضابطے بھی مدون کرائے کہ ایسے قوانین نہ اس سے پہلے کسی بادشاہ نے رواج دیے تھے اور نہ اس کے بعد۔ ان قوانین میں شریعت کی موافقت و مخالفت کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ منجملہ ان قوانین کے اشیاء کے نرخ کا تعیّن بھی تھا۔ سلطان نے غلّہ، کپڑا، گھوڑے اور دوسری اشیاء ضرورت کے لیے ایک ارزاں نرخ مقرّر کر دیا تاکہ خاص و عام بآسانی فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس کی تفصیل ضیاء برنی کی تاریخ (فیروز شاہی) میں درج ہے۔ اس ارزانی سے رعایا کو بڑی سہولت ہو گئی اور مغلوں کے حملوں کا بھی اس طرح سدباب[1] ہو گیا۔

---

[1] جب مغلوں کے مسلسل حملے ہونے لگے تھے تو علاؤالدین خلجی کو اُن کی روک تھام کے لیے ایک بہت بڑا لشکر ہمیشہ تیار رکھنا پڑتا تھا جب حساب کیا گیا تو معلوم ہوا اتنے بڑے لشکر پر کافی سے زیادہ خرچ اُٹھے گا۔ فوجی خرچ کو کم کرنے کے لیے اس نے اشیاء کی ارزانی کی یہ تدبیر کی، چنانچہ اس نے سوار کی تنخواہ کم مقرر کی اور نرخ الیسا رکھوایا کہ اس تنخواہ میں اُس کی گزر ہو جائے۔ اس طرح اُس نے پونے پانچ لاکھ سوار

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

یہاں تک ہم نے جو واقعات تحریر کیے ہیں تاریخ کی کتابوں میں ان کی سن وار ترتیب قابلِ اطمینان نہیں ہے جس طرح لکھا ہوا تھا ہم نے اُسی طرح بیان کر دیا۔

مالوہ پر حملہ

سنہ ۷۰۵ھ میں سلطان نے عین الملک شہاب ملتانی کو بڑی بھاری فوج دے کر مالوے کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ مالوے کی رانی کوکا نے چالیس ہزار سواروں اور ایک لاکھ پیادوں کی کثیر فوج لے کر عین الملک کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر وہاں سے فرار ہو گئی۔ عین الملک نے اُس کے ملک کو خوب لوٹا اور کافی مالِ غنیمت لے کر وہاں سے دارالسلطنت کو واپس آ گیا۔ اس قصے کو عین الملک نے بھی نظم کیا ہے ؎

بعین الملک اشارت کرد ز ابرو — کہ تا آرد بسوئے مالوہ[۱] رُو

قلعہ سورت پر حملہ

اسی سال بادشاہ شکار کے ارادہ سے سورت[۲] کی طرف گیا۔ قلعہ سورت میں ایک فتنہ پرداز ستلایو نامی نے ایک کثیر جمعیت فراہم کر کے شورش مچا رکھی تھی اور شاہی لشکر کے قابو میں نہیں آتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رکھنے کا بآسانی انتظام کر لیا۔ تنخواہ کی شرح دو سو چونتیس ٹنکہ (روپیہ) ایک گھوڑے کے لیے اور تین سو بارہ ٹنکہ دو اسپہ سوار کے لیے تھی اور اشیا کا نرخ گندم فی من (۱۴ سیر پختہ) ساڑھے سات جیتل (دو آنے کے مساوی) جَو فی من چار جیتل، چاول فی من ۵ جیتل۔ ماش فی من ۵ جیتل۔ نخود فی من ۵ جیتل۔ موٹھ فی من ۳ جیتل۔ اس کے علاوہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا نرخ بھی مقرر کر دیا چنانچہ سوئی سے لیکر گھوڑے تک کا نرخ خود بادشاہ نے متعین کیا۔ نرخ کی نگرانی کے لیے مخبر متعین تھے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں یہاں تک کہ اصطبل کے ملازم بچوں کو جیتل دے کر بھیجتا تھا۔ اس کے زمانہ میں خشک سالی اور قحط کے وقت بھی یہی نرخ رہے۔ خالصہ کے دیہات سے وہ بجائے نقدی کے محصول میں غلہ لیا کرتا تھا اور خشک سالی میں یہ غلہ شاہی گودام سے مقررہ نرخ پر فروخت کیا جاتا تھا۔ سلطان علاؤالدین کے بعد یہ سارا انتظام ختم ہو گیا اور اب ایک عرصۂ دراز بعد موجودہ حکومتیں تعین نرخ کے لیے حیران و سرگرداں نظر آتی ہیں۔

۱؎ مالوہ۔ یہ خطہ دریائے سیپرا کے کنارے واقع ہے اس کا دارالسلطنت اجین تھا جو اب گوالیار کی ریاست میں شامل ہے موجودہ آبادی ۳۵ ہزار ہے۔ علاؤالدین خلجی کے بعد سنہ ۱۳۸۷ء سے سنہ ۱۵۳۱ء تک مالوہ کے بادشاہ خودسر رہے۔ شاہ گجرات بہادر شاہ نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سنہ ۱۵۷۱ء میں اکبر نے اسے دوبارہ دہلی کے ماتحت کر دیا۔ سنہ ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی آخری فیصلہ کن لڑائی اسی نواح میں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۷۹۲ء میں ہولکر مرہٹہ سردار نے اس علاقہ کو غارت کر کے اجین کو جلا دیا۔ سنہ ۱۸۱۰ء تک یہاں مرہٹوں کی عملداری رہی اور یہ سندھیا مرہٹہ کا دارالخلافہ رہا، اس کے بعد مالوہ کا پایۂ تخت گوالیار ہو گیا۔ اجین کو ہندو ہیئت داں مرکز مان کر طول ارض کا حساب لگایا کرتے تھے۔ یہاں محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ نے ایک رصدگاہ بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس وقت شہر کا رقبہ ۶ کوس ہے۔ قدیم شہر کے کھنڈرات ایک میل کے فاصلہ پر عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ سلاطین مالوہ کا تفصیلی حال آگے بیان ہوگا۔

۲؎ سورت۔ بمبئی سے ۱۶۷ میل شمال میں دریائے تاپتی کے کنارے پر آباد ہے۔ صوبہ گجرات میں تجارتی و تاریخی حیثیت سے مشہور ہے۔ اسے شاہان گجرات نے سنہ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء میں آباد کیا تھا۔ سمندر کا راستہ یہاں سے ۱۴ میل پر ہے۔ یہ شہر تجارتی اغراض کے لیے تعمیر ہوا تھا اسی لیے کسی شاعر نے یہ مادۂ تاریخ کہا ہے۔ "باد آباد بندر سورت"۔ اس شہر نے ایسی ترقی کی کہ یہاں ایران، عرب، شام اور روم کے باشندے آ کر مقیم ہو گئے۔ اب تک سورت کے محلوں کے نام ان نو وارد قوموں کی یادگار ہیں۔ سترھویں صدی میں سورت پرتگیز، ڈچ اور دوسرے مغربی تاجروں کی آماجگاہ رہا۔ سنہ ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۵ء میں انگریزوں کے سفیر نے شہنشاہ ہند سے تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت لی۔ یہ ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے پہلی کوٹھی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سورت مغربی ہند کا تجارتی مرکز بن گیا اور اس کی آبادی آٹھ لاکھ ہو گئی۔ مرہٹوں نے بھی سورت کو بہت تباہ و برباد کیا۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں آتش زدگی کی وجہ سے سورت جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ جس وقت بحری تجارت سورت سے بمبئی منتقل ہو گئی تو پھر اس کی رونق بھی جاتی

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

سلطان نے پہلا شکار اسی کو کیا اور اسے گرفتار کر کے جہنم رسید کر دیا۔

دکن پر ملک کافور کا حملہ

۷۰۶ھ میں جالدیو کے قلعہ کو شاہی سردار کمال الدین کرک نے فتح کیا اور وہاں کے باغی کنھیر دیو کو قتل کرا دیا۔ ۷۰۷ھ میں سلطان نے ملک کافور نائب کو کافی ساز و سامان اور بڑے لشکر کے ساتھ مرہٹوں اور تلنگوں کے ملک پر حملہ کے لیے روانہ کیا۔ ملک کافور نے وہاں سے کافی بڑا خزانہ، ہاتھی، گھوڑے، جواہرات، قیمتی کپڑے غنیمت میں حاصل کیے۔

ورنگل کی تسخیر

۷۰۹ھ میں ملک کافور نے دوبارہ ارنگل[۵۱] پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ ندر دیو کو شکست دے کر بہت بڑا خزانہ، بہتر ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے اُس سے ہرجانہ میں لیے اور سالانہ خراج مقرر کر کے آگے بڑھا پھر پورے ملک دکن کو سمندر کے کنارے تک فتح[۵۲] کر لیا۔

۷۱۱ھ میں ملک کافور دکن کی فتوحات سے فارغ ہو کر دہلی واپس پہنچا اور تین سو بارہ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے، ۹۶ ہزار من سونا، جواہرات اور مروارید کے بے شمار صندوق اور ہر طرح کے مال و اسباب کے ذخیرے بادشاہ کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیے۔ ان فتوحات کا تذکرہ امیر خسرو نے اپنی کتاب "خزائن الفتوح" میں کیا ہے۔

سلطان علاؤالدین کی ان پے در پے عظیم الشان فتوحات کو لوگ علاؤالدین کی کرامت پر محمول کرنے لگے۔ بعض لوگ اسے جادو اور سحر سمجھتے تھے اور بعض کو یہ یقین تھا کہ یہ ساری فتوحات شیخ نظام الدین اولیاء[۵۳] کی برکت و دعا کا نتیجہ ہیں۔

(بقیہ سورت صفحہ گزشتہ) رہی۔ سورت کا قلعہ ۹۵۱ھ / ۱۵۴۴ء میں سلطان مظفر والی گجرات نے پرتگیزوں کی روک تھام کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ کسی شاعر کا مادۂ تاریخ ہے: "سد بود بر سینۂ جان فرنگی ایں بنا"

۵۱ (ارنگل، ورنکال، ورنگل) یہ سلطنت آصفیہ کا ضلع تھا، اس جگہ پہلے قلعہ کی تعمیر ہوئی بعد میں شہر آباد ہوا۔ یہ قلعہ بارھویں صدی میں راجہ گنپتی رودرا دیو نے بنانا شروع کیا تھا۔ اس راجہ نے ۱۱۹۰ء تا ۱۲۵۸ء تک حکومت کی اس کے بعد اس کی رانی رودرامہ دیوی نے ۳۸ سال حکومت کی۔ اس قلعہ کو اسی رانی نے مکمل کرایا۔ پتھر کی فصیلوں کی وجہ سے اس کا نام "ایکا سلا نگرم" پڑ گیا جس کا ترجمہ اردو زبان میں "دادر کا دل" ہے۔ یہی لفظ بگڑ کر "ورنکال" بن گیا۔ ۱۲۹۶ء تک یہاں ہندوؤں کی حکمرانی رہی، ملک کافور نے ۱۳۰۳ء سے ۱۳۰۹ء تک دوبارہ اس کو فتح کیا تھا۔ ۱۳۲۱ء میں غیاث الدین تغلق کے بیٹے جونا خاں نے اس قلعہ پر حملہ کیا تھا۔ ۱۳۲۳ء میں جونا خاں کے سردار شہاب خاں یا الف خاں نامی نے فتح کر کے ہندو سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ آخری راجہ جو گرفتار ہو کر دہلی بھیجا گیا "پرتاپ رودرا" تھا، مسلمان مورخ اس کو "لدار دیو" لکھتے ہیں۔ یہ راجہ ۱۳۴۱ء میں فوت ہوا۔ اس کے لڑکے شنکر نے ۱۳۴۴ء میں دوار سمدرا اور بیجا نگر کے راجاؤں سے سازش کر کے ورنگل پر قبضہ کر لیا۔ ۱۳۵۸ء میں محمد شاہ بہمنی نے ورنگل پر حملہ کر کے راجہ کو ماتحت بنا لیا۔ آخر ۱۴۲۵ء میں احمد شاہ ولی بہمنی نے یہ علاقہ فتح کر کے گجپتی (صاحب فیل) راجاؤں کا اقتدار ختم کر دیا۔ اب یہاں کی آبادی (۷۴۴۸۴۰) سے زائد ہی ہے۔ زبان تلنگی ہے۔ ہزار کھم کی دیول تاریخی یادگار ہے، ایک کوئلہ کی کان بھی ہے۔

۵۲ علاؤالدین پہلا حکمران ہے جس کے عہد میں ہمالہ سے راس کماری تک پورا ہندوستان پایۂ تخت دہلی کے زیر نگیں ہو گیا تھا۔ دوسرا مسلمان بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہے جو کابل سے راس کماری تک پورے ہندوستان کا حکمران تھا۔

۵۳ اصل نام شیخ نظام الدین تھا، لوگوں میں سلطان نظام الدین اولیاء مشہور تھے۔ بڑے فقیہ اور صوفی گزرے ہیں۔ آپ کے والد احمد بن دانیال غزنی سے آ کر بدایوں میں متوطن ہوئے، آپ کی ولادت ۶۳۴ھ میں ہوئی، پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے، ۲۵ سال کی عمر میں اپنی والدہ کو لے کر

(باقی آئندہ صفحہ پر)

جب ساری قلمرو ہند سلطنت دہلی کے تحت آگئی اور سلطان ان تمام مہمات سے فارغ ہوگیا تو اس نے اپنے بیٹوں کی شادیاں کرائیں اور ان کو علیحدہ علیحدہ علاقے جاگیر میں دے دیئے۔ خضر خاں کا نکاح اس کی محبوبہ دیول رانی کے ساتھ ہوا۔ امیر خسرو کی لکھی ہوئی مثنوی جو اس واقعہ کے متعلق ہے ہم آگے تحریر کریں گے۔ خضر خاں کو سلطان نے "چتر" اور "دورباش" عطا کر کے اپنا ولی عہد بنایا اور اسے ہستناپور کے کوہستانی علاقہ کی طرف بھیج دیا۔

علاؤ الدین کی علالت

کچھ عرصہ کے بعد ہی سلطان علاؤ الدین بیمار ہوا۔ بڑھاپے نے اُسے کمزور کر ہی دیا تھا بہت جلد کئی ایک بیماریاں لاحق ہوگئیں یہاں تک کہ تپ دق کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ آخر زمانہ میں اس کے حواس خلل پذیر ہو چکے تھے، مزاج پر چڑچڑا پن اور بدگمانی غالب آگئی تھی۔

علاؤ الدین کا انتقال

خضر خاں کو جب باپ کی علالت کی خبر ملی تو اُس نے باپ کی صحت کے لیے مَنّت مانی تھی۔ جب درمیان میں سلطان کو بیماریوں سے کچھ افاقہ ہوا تو وہ ہستناپور سے دہلی بزرگوں کی زیارت کے ارادہ سے ننگے پیر آیا اور اتفاق یہ کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، حالانکہ وہ اُن کا بہت زیادہ معتقد تھا۔ ملک کافور کو خضر خاں سے دلی عداوت تھی اُس نے اس کی آمد کو بادشاہ کے سامنے رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا اور کہا کہ اُس کا ماموں الپ خاں بھی گجرات سے اسی لیے آیا ہوا ہے کہ خضر خاں کو بادشاہ بنا کر خود اُس کا نائب بن جائے سلطان اُس کے جھانسے میں آگیا اور اُسی وقت الپ خاں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ملک نائب کافور اور ملک کمال الدین گرگ نے اس بے گناہ کو شاہی قلعہ میں لا کر بھیڑ کی طرح ذبح کر ڈالا۔ ملک کافور نے اب بادشاہ کو سمجھایا کہ ماموں کے قتل کی وجہ سے خضر خاں ہراساں اور ناراض ہوگا اس لیے اب اُس کو واپس جانے دینا مناسب نہیں، چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ خضر خاں امروہہ چلا جائے اور جب تک نہ بلائیں وہ وہاں شکار میں مصروف رہے۔ خضر خاں نے مجبوراً حکم کی تعمیل کی۔ کچھ دن بعد اُس نے باپ کے پاس عرضی لکھ کر معلوم کیا کہ "آخر مجھ سے کون سا ایسا قصور ہوا کہ مجھے اس عتاب کا سزاوار سمجھا گیا؟" عرضی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دہلی آگئے۔ وہاں خواجہ شمس الدین خوارزمی کی جو غیاث الدین کے وزیر بھی تھے شاگردی اختیار کر لی لیکن اکثر وہ شیخ نجیب الدین متوکل کی صحبت میں رہے۔ یہ بزرگ بابا فرید الدین شکر گنج کے بھائی تھے، اُن سے بھائی کی تعریف سن کر اجودھن بابا کی خدمت میں چلے گئے۔ بابا نے ہی اُن کو خرقہ درویشی عطا کیا اور دہلی ہی رہنے کا حکم دیا۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن مشہور شاعر آپ کے مرید تھے سلطان علاؤ الدین نے خضر خاں اور شادی خاں اپنے دونوں بیٹوں کو بھی سلطان الاولیاء کا مرید کرایا تھا۔ اسی وجہ سے قطب الدین مبارک شاہ آپ کا مخالف ہوگیا تھا اور حکم دیا کہ ہر ماہ آخری تاریخ دربار میں حاضری دیا کریں، لیکن وہ اس تاریخ سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح جب غیاث الدین تغلق بنگال میں تھا تو اُس نے سلطان نظام الدین کو پیغام دیا "یا شیخ آنجا باشد یا من" سلطان جی نے فرمایا "ہنوز دلی دور است" چنانچہ ۷۲۵ھ میں بادشاہ کے دہلی پہنچنے سے پہلے سلطان جی کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ بھی افغان پور کے محل میں دب کر مر گیا۔ خضر خاں نے آپ کی زندگی میں ایک عالی شان مقبرہ بنوا دیا تھا لیکن سلطان جی کی وصیت کے مطابق آپ کو اس کے سامنے دفن کیا گیا اور مقبرہ کو مسجد بنا دیا گیا۔ مسجد پر آپ کی تاریخ وفات درج ہے۔

نظام دو گیتی شہ ما طین — سراج دو عالم شدہ بالیقین
چو تاریخ فوتم بجستم ز غیب — ندا داد ہاتف "شہنشاہ دین" ۷۲۵ھ

مزار پر اس وقت جو مقبرہ ہے اسے اکبری عہد میں ۹۷۰ھ میں سید فریدون خاں نے تعمیر کرایا تھا۔

بھیج کر وہ صاف دل بیٹا باپ سے ملنے بے اختیار چلا آیا۔ اُسے دیکھ کر محبتِ پدری نے جوش مارا اور سلطان نے اُسے اپنے سینہ سے لپٹا لیا اور اُس کے رخساروں کا بوسہ لے کر ماں کے سلام کے لیے رخصت کیا۔ ملک کافور نے پھر بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے اور اسے باور کرا دیا کہ خضر خاں پھر بن بُلائے بُرے ارادے ہی سے آیا ہے۔ بادشاہ کی عقل سٹھیا گئی تھی وہ خضر خاں سے دوبارہ بدگمان ہو گیا۔ آخر اُسے اُس کے بھائی شادی خاں کے ساتھ قلعہ گوالیار میں قید کرا دیا۔ ان دونوں کو سر سے ٹالنے کے بعد ملک کافور نے چوتھے شاہزادے شہاب الدین کو جو خضر خاں کا سوتیلا بھائی تھا ولی عہد بنا دیا اور اس سے اپنی نیابت کے لیے پختہ عہد کرا لیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن بعد ہی سلطان نے اِس دنیائے فانی سے منہ پھیر لیا۔ اُس نے اکیس سال حکومت کرنے کے بعد ۷۱۶ھ میں رحلت کی ؎

علاؤالدین کہ از مہر علائی سکّہ بر زر زد | جہاں بگرفت زیر زر کف دست زر افشانش
زدور چرخ گشت آں سکہ دگرگوں ولی آں زر | ہماں ساں ماند در عالم کہ بینی دست گردانش

امیر خسرو اور امیر حسن

علاؤالدین کے زمانہ کے شاعروں میں امیر خسرو ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے علاؤالدین کے نام پر پانچ کتابیں دو سال کے عرصہ میں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کے مجموعہ کا نام "خمسہ" رکھا۔ خمسہ کی تکمیل ۶۹۸ھ میں ہوئی۔ اس میں "مطلع الانوار" کا حصّہ دو ہفتہ میں لکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

سال کزیں چرخ کہن گشتہ بود | از پس شش صد نود و ہشت بود
از اثر اختر گردوں خرام | شد بدو ہفتہ مہ کامل تمام

اپنی دوسری کتاب "نغمات" میں اُنھوں نے اپنے متعلق شیخ نظام الدین اولیاء کا قول نقل کیا ہے۔

"روز قیامت ہر کسے بہ چیزی نازد و ناز من بسوزِ سینۂ ایں ترک اللہ است"

خسرو کا یہ شعر بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

خسروِ من کوش براہِ صواب | تات شود ترک ندائی خطاب

امیر خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا۔ اُن کی قبر سلطان الاولیاء کے پائیں ہے۔ مولانا شہاب معمائی نے قطعۂ تاریخ کہہ کر لوح قبر پر کندہ کرا دیا ہے ؎

میر خسرو[۱] خسروِ ملکِ سخن | آں محیط فضل و دریائے کمال

---

[۱] امیر خسرو۔ خسرو کا تعلق ماوراالنہر کے شہر کش میں متوطن ترک قبیلہ "لاچین" سے ہے، اُن کے والد سیف الدین قبیلہ کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ سلطان شہاب الدین التمش کے عہد میں چنگیزی حملوں سے بچ کر ہند میں آ گیا تھا۔ خسرو کی والدہ بلبن کے وزیر عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ خسرو کی پیدائش ۶۵۲ھ مطابق ۱۲۵۴ء میں شہر پٹیالی میں ہوئی۔ خسرو کا پہلا مربی علاء الدین محمد کشلی خاں عرف ملک چھجو تھا۔ ان کی یہ ملازمت ۱۲۷۰ء کی ہے بعد میں وہ بلبن کے بیٹے بغرا خاں کے مصاحب بنے جو سامانہ کا گورنر تھا اس کے ساتھ وہ لکھنوتی میں بھی رہے، بعد میں وہ دہلی آئے اور بلبن کے بڑے بیٹے سلطان محمد کے ساتھی بن گئے۔ ایک لڑائی میں وہ مغلوں کی قید میں بھی کچھ عرصہ تک رہے۔ شہزادہ کی شہادت کے بعد وہ اپنی ماں کے پاس پٹیالی میں رہے۔ سلطان جلال الدین کے زمانہ میں وہ "امیر مصحف" کے عہدہ پر فائز ہوئے اس کے بعد وہ سلطان علاؤالدین کے درباری شاعر رہے۔ امیر خسرو نظام الدین اولیاء کے مرید اور عاشق تھے، علاؤالدین کے بعد وہ مبارک شاہ کے مصاحب رہے۔ نظام الدین اولیاء کے چھ ماہ بعد ۷۲۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

نثرِ او دلکش تر از ماءِ معین | نظمِ او عمانی تر از آبِ زلال
بلبلِ دستاں سرائے بے قریں | طوطیِ شکر مقالِ بے مثال
از پئے تاریخِ سالِ فوتِ او | چوں نہادم سر بزانوئے خیال
شد عدیم المثل یک تاریخِ او | دیگری شد طوطیٔ شکر مقال

علاؤالدین کے دربار کا دوسرا شاعر امیر حسن تھا، اُس کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ جس سال سلطان محمد نے دہلی کو ویران کرکے دکن میں دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا تھا، امیر حسن کو بھی دولت آباد جانا پڑا اور اُسی جگہ اُس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر دولت آباد میں مرجع خاص و عام ہے۔

عارف جامی نے ان دونوں شاعروں کے متعلق کہا ہے ؎

آں دو طوطی کہ بنو خیزیٔ شاں | بود در ہند شکر ریزیٔ شاں
عاقبت سخرۂ افلاک شدند | خامشاں قفسِ خاک شدند

سلطان شہاب الدین خلجی

علاؤالدین کی وفات کے بعد ملک کافور نے شوال [1] ۷۱۵ھ میں شہاب الدین کو نوعمری میں تخت نشین کیا اور ملک اختیار الدین سنبل کو گوالیار کے قلعہ میں بھیج کر خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کرادیا۔ اُن کی والدہ ملکۂ جہاں کی حرم سرا بھی لوٹ لی گئی اور اس کو شاہزادہ مبارک خاں کے ساتھ قید کردیا گیا۔ کافور اُن کی بھی آنکھیں نکلوا دینا چاہتا تھا لیکن تقدیر نے ایک اور ہی پانسہ پھینکا۔ مبشر اور بشیر ملکۂ جہاں کے ملازم اور قصر ہزار ستون کے محافظ سردار تھے۔ ان دونوں نے ایک رات ملک کافور کو گھیر کر قتل کردیا اور مبارک خاں کو قید سے نکال کر ملک کافور کی جگہ بادشاہ کا نائب مقرر کردیا۔ مبارک خاں نے ایک دو مہینے میں تمام اُمراء کو اپنے موافق بنا کر شہاب الدین کو تخت سے اُتار دیا اور گوالیار کے قلعہ میں قید کرادیا۔ وہ اسی قلعہ میں [2] ۷۱۰ھ میں مارا گیا۔ اس کی مدتِ حکومت صرف تین ماہ رہی۔ مبارک شاہ نے تخت پر بیٹھنے کے بعد مبشر اور بشیر دونوں سرداروں کو بھی جنھوں نے اسے قید سے رہائی دلائی تھی قتل کرادیا ؎

نکو را نیک و بد را بد شمار است | بہ پاداشِ عمل گیتی بکار است

سلطان قطب الدین خلجی

مبارک شاہ نے اپنے بھائی شہاب الدین کو ٹھکانے لگانے کے بعد تمام اُمراء کے اتفاق و تعاون سے [3] ۷۱۶ھ میں

---

[1] فرشتہ نے شوال ۷۱۶ھ لکھا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ علاؤالدین کی وفات ۷۱۶ھ میں ہوئی تھی اور دوسرے ہی دن ملک کافور نے شہاب الدین کو تخت پر بٹھایا تھا۔ [2] یہ سن بھی غلط معلوم ہوتا ہے ۷۱۶ھ میں تو وہ بادشاہ بنا تھا ۷۱۰ھ میں کیسے مارا گیا؟
[3] امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں تخت نشینی کا سن نظم کیا ہے ؎

سنہ شانزدہ بعد ہفصد شدہ | کہ سلطان بہ تخت زبرجد شدہ

تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔ اپنے ہوا خواہوں اور مقربوں کو جاگیریں اور منصب عطا کیے۔ سلطان علاؤالدین کے نائب خاص اور حاجب ملک شادی کے پاس قوم برادار سچہ[1] کا ایک نہایت حسین و جمیل غلام حسن نامی تھا جو مالوہ سے اسیر ہو کر دہلی پہنچا تھا۔ مرحوم سلطان نے بڑی محبت و شفقت سے اس کی پرورش کی تھی۔ مبارک شاہ اس غلام پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ چنانچہ بادشاہ بنتے ہی اس نے جوشِ محبت میں اس خوب صورت غلام زادہ کو خسرو خاں کا خطاب دے کر عہدۂ وزارت پر فائز کر دیا حالانکہ وہ اس ذمہ داری کی اہلیت قطعاً نہ رکھتا تھا۔

گرت مملکت باید آراستہ || مدہ کار اعظم بنو خاستہ
نخواہی کہ ضائع شود روزگار || بنا کار دیدہ مفرمائی کار

چونکہ سلطان قطب الدین نے قید و اسارت کی بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں اس لیے اس نے بادشاہ ہوتے ہی تمام قیدیوں کو عام رہائی دے دی۔ ملک فخرالدین کو جس کا لقب محمد عادل تھا اور جو غازی الملک کا بیٹا تھا بادشاہ نے اپنا "میر آخور" مقرر کیا سلطان نے پہلے ہی سال دیوگیر عرف دولت آباد پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن امیروں نے اُسے اس ارادہ سے باز رکھا۔

خضر خاں کا قتل ۷۱۸ھ میں سلطان نے اپنے کوتوال قطب الدین کو گوالیار بھیج کر خضر خاں اور شادی خاں کو شہید کرا دیا اور خضر خاں کی محبوبہ دیول رانی کو اپنے حرم[2] میں داخل کر لیا۔

جب علاؤالدین کے خانوادہ کا یہ حشر ہوا تو کسی نے ایک مجذوب سے پوچھا "آخر یہ کیا ہو رہا ہے"؟ اُس نے جواب دیا "علاؤالدین نے جو آگ اپنے ولی نعمت اور محسن چچا کے خاندان میں لگائی تھی اُسی آگ میں اس کا خاندان جل رہا ہے"۔

دریں بر صدا گنبد مانوی
سخن ہر چہ گوئی ہماں بشنوی

سلطان قطب الدین عیش پسند آدمی تھا اس لیے اس کے عہد میں وہ سارے قاعدے اور ضابطے جو علاؤالدین نے بڑے تدبر اور مصلحت سے مقرر کیے تھے درہم برہم ہو گئے۔ ملک میں ہر طرف فسق و فجور کا زور ہو گیا۔

سلطان نے گجرات سے الپ خاں کو واپس بلا کر قتل کرا دیا اور اس کی جگہ کمال الدین گرگ کو وہاں متعین کیا لیکن گرگ وہاں

---

[1] یہ گجرات کی ایک ادنیٰ قوم ہے جو خدمت گزاری اور معمولی کاموں پر گزر اوقات کرتی تھی۔ یہ نام "بروار" "براؤ" "بردار" تینوں طرح لکھا گیا ہے

[2] امیر خسرو نے اس واقعہ پر جو مثنوی لکھی ہے اُس کے چند شعر یہ ہیں۔

کہ چوں مبارک شاہ بے مہر || زتلخی گشت بر خویشاں ترش چہر
نہاں سوئے خضر خاں کس فرستاد || نمودار لعبتہ از دل بروں داد
دول رانی کہ در پیشت کنیز است || کنیز ار مہ بود ہم سہل چیز است
دول رانی کہ با فرخندگی بود || خضر خاں را زلال زندگی بود
بر آمد جان عاشق خوں فشاناں || دلی می گشت گرد اگرد جاناں
گلی کز وی چکیدی قطرہ خوئی || فشاندی خوں صد روئی بروئی
بجائے آب ازاں گل خوں کشیدند || نگہ کن تا گلابش چوں کشیدند

جاکر شہید ہوگیا۔ اُس کی جگہ سلطان نے عین الملک ملتانی کو متعین کیا۔ عین الملک نے گجرات کی بغاوت کو ختم کرکے نہر والہ اور گجرات کے دوسرے تمام شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

سلطان قطب الدین نے ملک دینار کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور دینار کو ظفر خاں کا خطاب دے کر گجرات روانہ کیا۔ اس نے اس علاقہ کے نظم ونسق کو عین الملک کی نسبت کہیں بہتر طریقہ پر سرانجام دیا۔

دیوگیر پر حملہ

۷۱۸ھ میں قطب الدین نے ایک بھاری لشکر کے ساتھ دیوگیر کا رُخ کیا، جب لشکر شاہی وہاں پہنچا تو سرکش راجہ ہرپال دیو جو راجہ رام دیو کا جانشین تھا اور اس نے دہلی کی سلطنت کو کمزور دیکھ کر بغاوت اختیار کر لی تھی سلطان کا مقابلہ نہ کر سکا اور اسیر ہوگیا۔ سلطان نے اُس کی کھال کھنچوا دی۔ دیوگیر سے فارغ ہوکر سلطان نے مرہٹوں پر حملہ کیا اور اُن کے ملک پر بھی قبضہ کر لیا۔ خسرو خاں کو "چتر اور دور باش" کا اعزاز دے کر ملیبار پر فوج کشی کے لیے روانہ کیا اور تلنگی قوم کے ایک غلام کو اپنا نائب بنا کر دیوگیر میں متعین کر دیا اور دہلی کی طرف مراجعت کی۔

واپسی میں کسی مخبر نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ لبغرش خاں کے بیٹے ملک اسدالدین نے (یہ سلطان علاؤالدین کا چچیرا بھائی اور ملک خموش کے نام سے مشہور تھا) ساکون کی گھاٹی کے قریب بغاوت کی تیاریاں کر رکھی ہیں اور بادشاہی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس خبر کے ملنے پر سلطان نے اسدالدین پر یلغار کرکے اُسے پکڑ لیا اور اُسے اُسی وقت قتل کرا دیا۔ اس کے کنبہ کے بیس آدمی بھی جو اس واقعہ سے قطعاً بے خبر تھے بادشاہ کے حکم سے مارے گئے۔ ان مقتولین میں تو عمر معصوم بچے بھی تھے۔ جھاین میں پہنچنے کے بعد سلطان نے شادی خاں کتھ سلاح دار کو دوبارہ گوالیار روانہ کیا اور اس نے وہاں جا کر حکم شاہی کے بموجب شہاب الدین کو قتل کر دیا اور خضر خاں[۱] اور مقتول شادی خاں کے اہل وعیال کو جو وہاں رہ گئے تھے قلعہ گوالیار[۲] سے دہلی لے آیا۔

---

[۱] جیسا کہ بیان ہو چکا ہے خضر خاں کا قتل پہلے ہی ظہور میں آچکا تھا۔ امیر خسرو نے مثنوی "خضر خاں اور دیول رانی" میں اس قتل کا سبب اس طرح بیان کیا ہے کہ مبارک شاہ نے خضر خاں کو پیغام بھیجا کہ میں تجھے کسی علاقے کا حاکم بنا دوں گا اگر تو دیول رانی کو میرے پاس بھیج دے لیکن خضر خاں نے انکار کیا ؎

چو با من ہمراست ایں یار جانی | ہر من دور کن زاں پس بدانی

بادشاہ اس جواب پر ناراض ہوگیا ؎

بہ تندی سر سلاحی را طلب کرد | کہ باید عہد کردہ امروز شب کرد
او اندر گالیور ایں دم نہ بس دیر | سر شیراں ملک افگن بہ شمشیر

فرشتہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"چوں بجھاین رسید شادی کتھ سردار سلاح داراں را بگوالیار فرستاد تا خضر خاں و شادی و ملک شہاب الدین را کہ قبل ازیں میل درچشم کشیدہ بودند بہ قتل رسانند واہل وعیال ایشاں را بدہلی آورد و سلطان قطب الدین دیول دیوی منکوحہ خضر خاں را داخل حرم ساخت۔"

ضیاء الدین برنی نے بھی تاریخ فیروز شاہی میں اس شخص کا نام شادی خاں کتھ سر سلاح داراں لکھا ہے۔

[۲] قلعہ گوالیار۔ گوالیار کا قلعہ ۳۴۲ فٹ بلند ایک پہاڑی پر ہے، ڈیڑھ میل لمبا اور تین سو گز چوڑا ہے، دروازہ پہ ہاتھی کی مورت کھڑی ہے۔ اس دروازہ کو ہاتھی پول کہتے ہیں۔ قدیم گوالیار قلعہ کے مشرقی جانب پہاڑی کے نیچے ہے یہاں شیخ محمد غوث گوالیاری کی خانقاہ کی قابل دید عمارت ہے۔ راج محل راجہ مان سنگھ نے (۱۴۸۶ء تا ۱۵۱۶ء) بنایا تھا۔ اس کے قریب راجہ بکرماجیت، جہانگیر، شاہ جہاں کے محل ہیں۔ محلات کا

(باقی آئندہ صفحہ پر)

سلطان قطب الدین کی بداعمالی

سلطان قطب الدین حضرت نظام الدین اولیاء سے بھی برگشتہ تھا، وجہ حضرت
یہ تھی کہ خضر خاں شیخ کا مرید تھا، چنانچہ سلطان نے حضرت کی غند میں

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ گوالیار صفحہ گزشتہ) یہ مجموعہ بڑا دلکش منظر رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا بیان ہنٹر سے ماخوذ ہے۔ ولفورڈ صاحب کی تحقیق کے مطابق گوالیار کا قلعہ راجہ سورسین نے ۳۷۳ء میں بنایا تھا۔ ۱۰۲۳ء میں محمود غزنوی نے اس پر حملہ کیا اور لوٹ گیا۔ ۱۱۹۶ء میں محمد غوری نے اسے فتح کیا ۱۲۱۱ء میں شاہان دہلی کے قبضہ سے نکل گیا۔ ۱۲۳۱ء میں شمس الدین التمش نے اسے فتح کیا۔ اکبر کے زمانہ سے یہ امراء اور شاہزادوں کے لیے قید خانہ بنا دیا گیا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق اس کے زمانہ میں بھی یہ قلعہ اسی غرض کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن لارڈ ڈفرن کے عہد میں شہر جھانسی کے عوض اسے سندھیا مرہٹہ کو واپس کر دیا گیا۔ گوالیار آگرہ سے ۶۵ میل پر ہے۔ بابر نے بھی ہتیا پول کا ذکر اپنی تزک میں کیا ہے۔ "در برج ضلع شرقی دو ہتیہ پول است پیل را ہاتی گویند دروازہ را پول۔ بر ایں دروازہ صورت یک فیلبے را مجسم کردہ اند و بالائے دو فیل بان ہم ساختہ بعینہ فیل را مشابہ کردہ اند۔" جب اکبر نے قلعہ آگرہ تیار کرایا تو اس کے مغربی دروازہ پر اس کی نقل میں دو ہاتھی مع فیل بانوں کے تیار کرائے جن کو شاہجہاں لال قلعہ دہلی لے آیا تھا۔ عالمگیر نے ان کو بت پرستی کے شائبہ کی وجہ سے علیحدہ کروا دیا اور ٹکڑے ٹکڑے کرا کے دفن کرا دیا۔ ان سب میں سے ایک ہاتھی کو جو بچ گیا تھا اور ایک دوسرا تیار کر کے لارڈ کرزن نے قلعہ دہلی کے دروازہ پر کھڑا کروا دیا۔ برنیئر نے بھی اپنے سفرنامہ میں ان ہاتھیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہاتھیوں کے بتوں کو اکبر کے دشمنوں جیمل اور فتا کے بت بتلاتا ہے لیکن یہ غلط قیاس ہے کیونکہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں جیمل اور فتا کا کوئی ذکر نہیں کیا صرف اتنا لکھا ہے: "گیتی خداوند قلعۂ از سنگ سرخ بر ساخت کہ جہاں دیدگاں ہمتائے او نگذارند بدروازۂ باختر دو فیل سنگین با پیل بانان بس نیکو تراشیدہ اند۔" برنیئر کے وقت جیمل اور فتا کا واقعہ تازہ تھا اسی لیے لوگ ان فیل بانوں کو ان کے بت سمجھتے ہوں گے۔ ابوریحان بیرونی نے بھی قلعہ گوالیار کے استحکام کا ذکر کیا ہے۔ قلعہ کے اندر ایک تالاب سورج کنڈ نامی ہے، کہتے ہیں ۳ء میں راجہ بسواپتی نے سورج کے ایک مندر کے ساتھ بنوایا تھا، مغربی جانب ڈھونڈہ دروازہ کے متقابل قلعہ کی حد سے باہر نکلا ہوا وہ تاریخی قید خانہ ہے جس میں امراء اور شاہزادے قید رہتے تھے، اس کو "نوچوکی" کہتے ہیں۔ تان سین کا مقبرہ بھی اسی قلعہ میں ہے۔ فضل علی نے "تاریخ گوالیار" میں جسے اس نے ایک برہمن گھنشام کی تاریخ سے مرتب کیا ہے بیان کیا ہے کہ یہ قلعہ سمت ۳۳۲ بکرماجیتی میں بنایا گیا۔ اس کی ایک مشہور روایت یہ ہے کہ اس پہاڑی پر ایک رشی گوالپا نامی رہتا تھا، راجہ سورسین کچھواہہ کو جذام ہو گیا تھا۔ ایک روز شکار میں اسے پیاس لگی تو وہ اس رشی کے مڑھ میں پانی پینے آیا، وہاں پانی پیتے ہی اچھا ہو گیا۔ راجہ نے کہا "میں شکرانہ میں کیا کروں؟" رشی نے کہا "اس پہاڑی پر قلعہ بناؤ اور جس تالاب کا یہ پانی ہے اسے پختہ اور وسیع کر دو۔" رشی نے یہ بھی کہا "آج سے تیرا نام سوہن پال ہے، تیری اولاد میں چوراسی راجہ راج کریں گے، جب تک ان کے نام میں پال ہوگا زوال نہ ہوگا۔" کھرگ رائے کہتا ہے چوراسی ویں راجہ نے اپنا نام تیج کرن رکھ لیا۔ یہ راجہ ۱۱۳۳ء میں راجہ انمل کی بیٹی سے شادی کرنے دیولہ گیا، تیج کرن کو وہاں ایک سال لگ گیا، اس کے بھانجے پرمل دیو ن پوار نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور راجہ بن بیٹھا۔ قطب الدین ایبک نے اسے فتح کیا تھا لیکن اس کے قبضہ میں نہیں رہا۔ ۱۲۳۳ء میں التمش نے فتح کیا۔ ۱۲۳۲ء سے ۱۳۹۸ء تک مسلمان سلاطین کے قبضہ میں رہا۔ تیمور کی آمد سے پہلے اس پر تور خاندان کے ایک راجہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ ابراہیم لودی کے زمانہ میں بکرماجیت نے ایک سال مقابلہ کے بعد قلعہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ہمایوں کے زمانہ میں پھر بکرماجیت کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ ہمایوں کے حملہ سے ڈر کر اس کے گھر والے بھاگ نکلے لیکن ہمایوں نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا، اس احسان کے صلہ میں انھوں نے ہمایوں کو وہ مشہور ہیرا دیا جس کا وزن تین سو تیس رتی ہے اور کہتے ہیں یہی کوہ نور تھا۔ یہ ہیرا پہلے علاؤالدین خلجی کے پاس تھا، رانا کھمبا راجہ چتوڑ اور سلطان کی لڑائی میں گوالیار کا راجہ رانا کھمبا کا معاون تھا، معلوم ہوتا ہے اس وقت یہ ہیرا اس کے ہاتھ لگ گیا۔ بابر کے وقت رحیم داد خاں اور شیخ محمد غوث نے قلعہ کو لودی قلعہ دار تاتار خاں سے چھین لیا۔ قلعہ میں خوب صورت مسجد جو عالمگیری دروازہ کے پاس ہے معتمد خاں کی بنوائی ہوئی ہے۔ کرنل سلیمن کہتا ہے "یہ مسجد ایسی خوبصورت ہے گویا اس پر سے آج ہی معمار اترے ہیں۔" سلاطین مغلیہ کے زوال پر گوہد کے ایک جاٹ رئیس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۸۴ء میں مادھو کا سندھیا نے اس سے قلعہ چھین لیا۔ انگریزوں کا

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ملتان سے شیخ رکن الدین کو بلا کر دہلی میں ٹھہرایا اور حضرت کے منکر شیخ زادۂ جام کو بھی اپنا مقرب بنایا۔

سلطان قطب الدین نے بھی اپنے باپ کی طرح خوں ریزی شروع کردی۔ ظفر خاں حاکم گجرات کو اُس نے بے سبب قتل کرادیا۔ اک لکھی دیوگیر کا سرکش اور باغی سردار تھا خسرو خاں نے اسے گرفتار کرکے دہلی بھیج دیا۔ بادشاہ نے اُسے فوراً قتل کرادیا۔ ملک شاہین کو جس کا خطاب وفا ملک تھا لوگوں کے کہنے سے قتل کرادیا۔ اس خوں ریزی کے علاوہ قطب الدین کے مزاج میں بڑا اوچھاپن پیدا ہوگیا، یہاں تک کہ وہ مجلسوں میں عورتوں کا سا لباس اور زیور پہن کر آتا تھا اور علانیہ شراب پی پی کر فسق و فجور کے مظاہرے کرتا رہتا تھا۔ شہدے اور مسخرے اس کے اشارہ پر محل ہزار ستون کی چھت پر بیٹھ کر معتبر اور نامور اُمراء جیسے عین الملک ملتانی اور قرا بیگ وغیرہ کی ہنسی اڑایا کرتے تھے اور چھیڑا کرتے تھے، نقلیں اتار کر ان کی اہانت کرتے اور مادر زاد ننگے ہوکر بے حیائی کی حرکتیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اُمراء کے کپڑوں پر اپنا پیشاب چھڑکتے تھے۔ قطب الدین کی ان بیہودہ حرکتوں سے اس کی تباہی کا سامان خود بخود تیار ہوگیا۔

شاہ از مے گراں چہ برخواہد خاست ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ از مستیٔ بیکراں چہ برخواہد خاست

سرمست و جہاں خراب و دشمن پس و پیش ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ پیداست کزیں میاں چہ برخواہد خاست

حسام الدین کی سرکشی

ظفر خاں کے قتل کے بعد بادشاہ نے حسام الدین کو جو خسرو خاں کا رشتہ میں بھائی ہوتا تھا ظفر خاں کی جگہ گجرات کی حکومت پر روانہ کیا، اُس نے اپنی قوم بردار بچہ کے آدمیوں کو جمع کرکے وہاں بغاوت کی تیاریاں شروع کردیں اور ظفر خاں کے زمانہ کے تمام امیروں کو قید کرکے دہلی روانہ کردیا۔ سلطان اُس کی اس حرکت پر کھٹکا ضرور اور ان امیروں کو اُسی وقت رہا کردیا لیکن محض اپنے محبوب خسرو خاں کی خاطرداری کے خیال سے حسام الدین کی باز پرس نہ کی بلکہ اُسے کچھ زیادہ مراعات دیں اور قدردانی کا سلوک کیا لیکن یہ ضرور کیا کہ اس کو گجرات سے بلالیا اور اس کی جگہ ملک وحید الدین قریشی کو جس کی کوششوں سے اک لکھی گرفتار ہوا تھا گجرات کی عملداری پر بھیج دیا۔

دکن پر خسرو خاں کا حملہ

اسی زمانہ میں خسرو خاں نے دکن میں تلنگانہ پر فوج کشی کی اور وہاں کے قلعہ کا محاصرہ کرکے راجہ سے کافی مال و دولت اور ایک سو سے زائد ہاتھی کی نذر لے کر بیتھلی کی طرف کوچ کیا۔ وہاں سے ۱۲۰ ہاتھی اور چھ درم وزن کا ایک الماس لے کر ملیبار[۵] میں آیا۔ اس وقت اس کے پاس کافی مال و متاع اور

(بقیہ حاشیہ سلسلہ گوالیار صفحہ گزشتہ) پہلا قبضہ ۱۸۴۴ء میں ہوگیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وہاں کی فوج بھی باغی ہوگئی تھی، دوسرے سال پھر یہ انگریزوں کے قبضہ میں آیا پھر آخر تک یہ ریاست پٹیالہ کے مہاراجہ کے پاس رہا۔

[۵] ملیبار۔ ملی پہاڑ کو کہتے ہیں، بار معنی ملک کے ہیں، قدیم زمانہ میں اسے "کرالہ" کہتے تھے (اب عرصہ دراز بعد یہی نام رکھا گیا ہے) اس علاقہ کی قدیم حدود راس کماری سے لے کر سنداپور یعنی گوا تک تھیں انگریزی عہد میں ٹراونکور، کوچین کی ریاستیں مالابار جنوبی کانڑا کے ضلع قدیم مالابار کی حد میں ہیں۔ ساحل مالابار ۲۵ میل سے ۷۰ میل تک پھیلا ہوا ہے، ساحل کے متوازی کوہ مغربی گھاٹ کا سلسلہ جس کی بلندی میں ہزار سے سات ہزار فٹ تک ہے برابر چلا گیا ہے۔ ۸۲۷ء میں اس علاقہ کے راجہ چیرامن پیرومل نے اسلام قبول کیا، یہ راجہ ہجرت کرکے عرب کے ساحل ظفار چلا گیا تھا وہاں ۸۳۱ء میں مرگیا۔ اس کی قبر ظفار میں ہے۔ اس نے ہجرت سے پہلے اپنے ملک کو اپنے سرداروں پر تقسیم کردیا تھا ان میں کالی کٹ کا ساموری اور ہیلی کا کولاتری بڑے سردار تھے۔ فرشتہ نے لکھا ہے: عراق عرب کے کچھ درویش باوا آدم کے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لاؤ لشکر جمع ہوگیا تھا۔ اس کے سر میں بھی بادشاہی کی دُھن سوار ہوئی اور کئی ایک امیروں کو اُس نے قتل کرا دیا۔ اُس کی ان حرکتوں کی وجہ سے ملک تلبیغہ لبغدہ، ملک تلبیغہ ناگوری اور ملک حاجی نائب نے اس کی سرکشی کا اندازہ کر لیا اور موقع پاکر اُسے اغوا کرایا اور ایک ڈولی میں بٹھا کر سات دن کے اندر دیوگیر سے دہلی میں لے آئے اور بادشاہ سے اس کے فاسد ارادوں کا حال بیان کیا لیکن خسرو خاں نے خلوت میں اپنے عاشق و فریفتہ سلطان کو ناز نخروں، حیلوں بہانوں سے راضی کر لیا اور اُلٹا امیروں کے خلاف اُسے بھڑکا دیا۔ بادشاہ اس کی اداؤں پر مٹا ہوا تو تھا ہی اُس کے کہنے پر یقین کر کے وہ الی ہوا خواہ امیروں سے مکدر ہوگیا اور ان پر عتاب کر کے انھیں خوب ذلیل و رسوا کیا۔ باوجود اس کے کہ ان امیروں نے سچے گواہ اور شہادتیں پیش کیں لیکن بادشاہ نے باور نہیں کیا اور ان گواہوں کو بھی سزا دلوائی۔ فرزدق عربی شاعر کا یہ شعر یہاں پوری طرح صادق آتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ فرزدق کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوگیا، دونوں میاں بیوی خلیفہ ہارون رشید کے ہاں فریادی ہوئے۔ جعفر برمکی نے فرزدق کی سفارش اور حمایت کی اور ملکہ زبیدہ نے اس کی بیوی کی پشت پناہی کی۔ خلیفہ نے زبیدہ کے پاس خاطر سے اس کی بیوی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس پر فرزدق نے یہ شعر[۱] پڑھا ؎

لیس الشفیع الذی یاتیک متزرا
مثل الشفیع الذی یاتیک عریانا

یعنی وہ سفارشی جو تیرے پاس ازار پہن کر آئے اُس سفارشی کے برابر نہیں ہو سکتا جو تیرے پاس برہنہ آتا ہو۔ یہ شعر اُس دن سے بطور مثل کے عرب میں مشہور ہوگیا۔

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ ملیبار صفحہ گزشتہ) قدم کی زیارت کے لیے سراندیپ گئے، راستہ میں سامری کے دار الخلافہ کرنگنور میں قیام کیا۔ راجہ نے پیغمبر اسلام کے معجزے اُن سے سُنے اور شق القمر سے متعلق اپنے پستک نویسوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ایک دفعہ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ ان کی پستک میں درج ہے۔ اس تصدیق سے وہ ایمان لے آیا، بعد میں وہ اُنہی زائرین کے ساتھ پوشیدہ طریقہ پر جہاز میں بیٹھ کر حضر موت کے بندر شحر میں چلا گیا اور وہیں مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے مالک بن دینار کے ذریعہ اپنے مقرر کردہ راجاؤں کے پاس وصیت بھیجی کہ عرب تاجروں کو مسجد، سرائے، مکان بنانے کی اجازت دی جائے۔ مالک بن دینار نے راجاؤں کی اجازت سے کرنگانور، کولم، ہیلی ماراوی، جرفتن، درفتن، فندرینہ، چالیات، ونکور، اور منگلور میں نو مسجدیں بنائیں۔ سرزمین ہند میں خدا کے یہ پہلے گھر تھے جن کے ذریعے اس ساحلی ملک میں اسلام پھیلا۔ پرتگیزوں کی آمد سے پہلے ساحل ملیبار کی ساری تجارت مسلمان تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔ ابن بطوطہ بھی اس علاقہ میں پہنچا ہے اس کے بیان کے مطابق اس وقت تک ملیبار کے راجہ پیرول کی وصیت پر عمل پیرا تھے اور مل جل کر اپنا اپنا راج سنبھالے ہوئے تھے۔ ۱۷۳۲ء میں ان کے درمیان نزاع ہوگئی، ان میں سے کسی نے میسور کے راجہ سے کمک چاہی اور اسی بہانے حیدر علی نے جو اس وقت میسور کا نائب تھا ۱۷۶۰ء سے ۱۷۷۴ء تک کئی دفعہ ملیبار پر حملے کیے اور اس کو فتح کر لیا۔ ۱۷۹۲ء میں ٹیپو سلطان نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے صلح کر کے یہ علاقہ انگریزوں کو دے دیا۔ ملیبار میں مسلمان کافی تعداد میں ہیں۔ مقامی باشندے نائر ہندو ہیں جو زیادہ تر زمیندار ہیں۔

[۱] تاریخ ابن خلکان میں یہ واقعہ دوسری طرح ہے کہ فرزدق کی بیوی نے عبداللہ ابن زبیر کی بیوی خولہ بنت منظور بن زبان کو اپنا سفارشی بنایا تھا اور فرزدق کے سفارشی حمزہ بن عبداللہ ابن زبیر (جو خولہ مذکور کے بطن سے ہیں) تھے۔ یہ مرافعہ عبداللہ ابن زبیر کے سامنے پیش ہوا تھا نہ کہ ہارون رشید کے، کیونکہ فرزدق ہارون سے پہلے گزرا ہے۔ اس قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے

اما بنوہ فلم تنجح شفاعتہم　　وشفعت بنت منظور بن زبانا

ابن خلکان کا بیان صحیح ہے۔

خسرو خاں کا اقتدار

اس قضیہ کے رفع ہونے کے بعد خسرو خاں نے دوبارہ اپنی قوم کو دارالسلطنت میں بلانے کی بادشاہ سے اجازت لے لی اور کوشش کر کے اُن کو بادشاہ کا مصاحب بنا دیا۔ عیش پسند بادشاہ نے بھی اپنے محبوب پر اور اُس کے لوگوں پر بھروسہ کیا، سارا نظم و نسق اُن کے حوالے کر دیا اور خود عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔

مصحف و شمشیر بر انداختہ
جام و صراحی عوضش ساختہ

صبح بادہ و جام سے گزرتی ہے — شب دلآرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گزرتی ہے

اُمراء نے جب یہ رنگ دیکھا اور کوئی چارہ نہ پایا تو مجبوراً وہ خسرو خاں کی خوشامد میں لگ گئے، دربار سرکار میں براؤ بچہ قوم کے لوگ چھا گئے۔ یہ لوگ خسرو خاں کے گھر پر بادشاہ کے خلاف بغاوت کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ قاضی ضیاءالدین نے جن کا خطاب قاضی خاں تھا ایک دن ان سازشوں کی خبر بادشاہ کو دے دی لیکن بادشاہ نشۂ ہوس سے ایسا مخمور تھا کہ اسے اچھے بُرے کی تمیز ہی نہیں رہی تھی چنانچہ اس مدہوش نے اُسی وقت خسرو خاں کو بلا کر یہ قصہ بیان کر دیا۔ اُس نے جواب دیا کہ چونکہ میرے حال پر بادشاہ کی غیر معمولی عنایات ہیں یہ لوگ حسد کے مارے ایسے بہتان لگانے کے درپے رہتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کی بات کی دل و جان سے تصدیق کی اور اسے توشک خانہ خاص وغیرہ کی چابیاں بھی حوالے کر دیں۔ چابیوں کی حوالگی کو اس نے اپنے حق میں نیک فال سمجھا۔

آخری عبرت انگیز رات

ایک رات بادشاہ خسرو خاں کے ساتھ بیٹھا شراب کے جام پر جام لنڈھا رہا تھا، کافی رات گزر گئی، چوکی پہرہ والے امیر اپنی اپنی نوبت سے اُٹھ کر جا چکے تھے اور قاضی خاں ہزارستون کی چھت سے اتر کر دروازوں کی حفاظت اور پہرہ داروں کی نگرانی میں مصروف تھا کہ خسرو خاں کا چچا مدہوک نامی اپنے آدمیوں کو لے کر اچانک آ پہنچا اور قاضی خاں کو باتوں میں لگا کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ غریب اُسی جگہ جاں بحق ہو گیا۔ اس واردات کی وجہ سے شور و غل ہوا تو بادشاہ نے خسرو خاں سے پوچھا کیا بات ہے؟ وہ دریافت حال کے بہانہ اُٹھ کر اپنے آدمیوں کے پاس گیا اور بادشاہ کے قتل پر ان کو آمادہ کر کے چلا آیا اور بادشاہ سے کہنے لگا طویلہ کے گھوڑے کھل گئے تھے اور لڑنے لگے تھے بس اسی کا شور ہو رہا ہے۔ اتنے میں خسرو کا ماموں جاہر نامی اپنی جماعت کو لے کر ہزارستون کی چھت پر چڑھ آیا اور وہاں کے محافظوں کو قتل کر کے بادشاہ کی طرف لپکا، اب بادشاہ کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے اور وہ اس نیم مستی کے عالم میں زنانہ محل کی طرف بھاگنے لگا لیکن خسرو خاں نے پیچھے سے سر کے بال پکڑ لیے۔ بادشاہ اُس سے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ جاہر شمشیر بکف آ پہنچا اور اس کے پہلو پر وار کیا اور سر کاٹ کر چھت کے نیچے پھینک دیا۔ امیروں نے جب یہ حال دیکھا تو چپکے سے اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ کئی ایک محل کے دروازے پر قتل کر دیے گئے۔ خسرو خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر شاہی محل سرا میں گھس گیا اور فرید خاں، منگو خاں شیر خوار شہزادوں کو ان کی ماؤں کی گود سے کھینچ کر ان کے سامنے ذبح کر ڈالا۔ جمانہ آویں

نے عورتوں پر ظلم کر کے ان کے ساتھ جیسا جی میں آیا سلوک کیا اور سلطان علاؤالدین و قطب الدین کا ننگ و ناموس دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گیا۔

دگرگوں حال ہو جاتا ہے دم بھر میں زمانہ کا

ان ہنگاموں سے فارغ ہو کر خسرو خاں نے عین الملک ملتانی ملک فخرالدین جونا (جو بعد میں سلطان تغلق بنا) ملک وحیدالدین قریشی اور قرابیگ کے بیٹوں کو اسی رات بلا کر صبح تک ہزار ستون کے بالاخانہ میں نظر بند کر دیا اور جب دن نکلا تو شہر کے تمام اعیان و اکابر کو بلایا گیا اور دربار سجا کر خسرو خاں کے نام پر بیعت لی گئی۔ جس کے متعلق بھی مخالفت کا اندیشہ ہوا، اُسے دھوکہ سے پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ قاضی ضیاءالدین کی بیوی کسی طرف بھاگ گئی لیکن اس کا سارا خانوادہ مہول کے سپرد کر دیا گیا۔ حسام الدین خاں نے جو خسرو خاں کا سگا ماموں تھا خان خاناں کا خطاب پایا اور مہول رائے رایاں بن گیا۔ سلطان قطب الدین کے حرم، دوسرے شہزادوں اور مقربین کی عورتوں کو اُن لوگوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ سلطان کی ملکہ سے خسرو خاں نے خود نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ ۷۲۰ھ میں پیش آیا۔ سلطان قطب الدین[1] کی مدت حکمرانی چار سال چند ماہ تھی۔

تا جہاں بود چنیں بود و چنیں خواہد بود

ہمہ را عاقبت کار چنیں خواہد بود

ناصرالدین خسرو خاں

پہلے اس کا نام "حسن بردار بچہ" تھا۔ ۷۲۰ھ میں مبارک شاہ مارا گیا تو اپنے قبیلہ والوں کی حمایت سے اس نے ناصرالدین کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ علائی اور قطبی امیروں نے بھی چار و ناچار اطاعت اختیار کر لی اور اُسے بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس انقلاب سے ہندوستان میں اسلامی شعار کا تنزل ہونے لگا۔ ہندوؤں کے رسم و رواج ترقی کرنے لگے، علانیہ بت پرستی ہونے لگی، مسجدیں ویران ہونا شروع ہو گئیں۔ خسرو خاں نے عوام و خواص کی تالیف قلب کے لیے اُن خزانوں کا منہ کھول دیا جو علاؤالدین اور قطب الدین کے وقت سے جمع تھے لیکن اس کی نمک حرامی اور بے دینی کی وجہ سے لوگ اس سے برگشتہ خاطر ہی رہے۔

ہندوؤں کا غلبہ

۷۲۱ھ میں خسرو خاں نے علاؤالدین کی اولاد میں سے ابوبکر خاں، علی خاں اور بہادر خاں کو اندھا کرا دیا۔ عین الملک اور دوسرے بڑے اُمرا اور وزراء کو بھی دور دراز علاقوں میں بھیج کر منتشر کر دیا۔

---

[1] ضیاءالدین برنی مصنف فیروز شاہی نے اس واقعہ کی تفصیل اس طرح لکھی ہے: "سلطان قطب الدین جوتے پہن کر حرم کی جانب دوڑا "خسرو خاں مفعول" (بقول مصنف) نے سوچا کہ اگر سلطان حرم میں چلا گیا تو معاملہ بگڑ جائے گا چنانچہ اس نے دوڑ کر پیچھے سے سلطان کے گیسو پکڑ لیے، سلطان نے اُسے زمین پر پچھاڑ دیا اور اُس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا لیکن اس حرامزادہ نے کسی طرح بھی گیسو نہ چھوڑے۔ اس حال میں جاہریا برواروہاں پہنچ گیا اور اُس نے سلطان کے سینہ پر تیر چلایا۔ خسرو خاں کے سینہ پر سے اسے گھسیٹ لیا اور زمین پر گرا کر ذبح کر دیا۔"

امور سلطنت پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمان تباہ و برباد ہونے لگے۔ یہ تباہی ویسی ہی تھی جیسی سلطان سنجر کے زمانہ میں غزوں کی یورش میں رونما ہوئی تھی۔

خسرو خاں نے ہر طرف فرامین روانہ کرکے لوگوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی۔ یوسف صوفی برادر بچہ کو صوفی خاں اور اختیار الدین سنبل کو حاتم خاں کے خطاب عطا کیے۔ کمال الدین صوفی کو وکیل دربار اور ملک فخرالدین جونا غازی الملک کے بیٹے کو آخور بیگی کا منصب دیا۔ قرہ قمار کے بیٹے کو عارض الممالک کا عہدہ ملا۔ غازی الملک کے بیٹے کی وہ بڑی خاطر داری کیا کرتا تھا۔ غرض یہ تھی کہ اس کا باپ علاؤالدین کے زمانے کا بڑا نامی گرامی امیر تھا اور اس نے مغلوں کے خلاف بڑے معرکے سر کیے تھے۔ چاہتا تھا کہ وہ دیپالپور سے آکر اس کے پھندے میں پھنس جائے تاکہ کوئی کھٹکا باقی نہ رہے۔ عین الملک ملتانی کو بھی اس نے عالم خاں کا خطاب دے کر اپنے ساتھ ملا لینا چاہا، لیکن وہ اس لالچ میں نہ آیا بلکہ اس نے غازی الملک کو لکھ بھیجا کہ اگر تم مقابلہ کے لیے تیار ہو تو میں معرکہ کارزار میں خسرو خاں کا ساتھ نہیں دوں گا بلکہ اپنے ملک مالوے کو چلا جاؤں گا اور جب سب امیر تمہارے ساتھ ہو جائیں گے تو میں بھی تمہارے پاس آجاؤں گا۔ غرض کچھ امیر تو ایسے تھے جو منصب اور جاگیر کے لالچ میں خسرو خاں کے حامی ہو گئے اور کچھ اس سے برگشتہ خاطر ہی رہے۔

غازی الملک میدان میں

جب غازی الملک کو یہ تمام پریشان کن خبریں ملیں تو اسلامی غیرت اور اپنے آقا کے خون اور عزت و ناموس کی حمیت نے جوش مارا، اس نے خسرو خاں سے بدلہ لینے کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور دوسرے امراء سے بھی اس مہم کے لیے مدد مانگی۔ فخرالدین جونا نے بھی اب خفیہ خط باپ کے پاس بھیجا کہ اگر آپ گھوڑوں کی ڈاک بٹھا دیں تو میں یہاں سے بھاگ آؤں، چنانچہ اس انتظام کے ہوتے ہی اس نے ایک رات[1] اچھ[2] اور ملتان کے حاکم بیرام اللہ کے بیٹے کو ساتھ لیا اور دہلی سے نکل کر اپنے باپ کے پاس دیبالپور بھاگ گیا۔ باپ کو بیٹے کے صحیح سلامت چلے آنے پر بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ قلعہ سرستی میں دو سو سواروں کو متعین کر چکا تھا۔

جب خسرو خاں کو فخرالدین جونا کے بھاگ جانے کی خبر ملی تو وہ نہایت پریشان ہوا اور قرہ قمار کے لڑکے کو اس کے

---

[1] فرشتہ نے فرار کا وقت رات کے بجائے دوپہر لکھا ہے۔ ابن بطوطہ بھی دن کا وقت ہی بتلاتا ہے۔

[2] اچھ۔ اوچھ۔ اوچہ:۔ یہ شہر دریائے پنج ند کے کنارے ہے اور اب ریاست بہاولپور میں شامل ہے۔ یہاں سے ملتان کا فاصلہ ۷۰ میل ہے۔ پہلے سندھ اور پنجاب کے پانچوں دریا اسی مقام پر آکر ملتے تھے۔ اب یہ سنگم چالیس میل نیچے مٹھن کوٹ کے قریب ہٹ گیا ہے۔ کننگھم صاحب کا خیال ہے کہ یہ شہر سکندر اعظم نے بسایا تھا۔ ناصرالدین قباچہ کے وقت یہ شہر سندھ کا دارالخلافہ تھا۔ بخاری اور گیلانی سادات کی سکونت اسی جگہ رہی۔ سید جلال الدین بخاری اور مخدوم جہانیاں کے مزار اسی شہر میں ہیں۔ اُن کے مقبرہ کے دروازہ پر یہ شعر درج ہے ؎

تاریک گشت جملہ جہاں بے جلال شاہ
تاریخ بود ہفت صد و ہشتاد و پنج سال
۷۸۵ھ

سفر الواصلین نے ان کا سال ولادت لکھا ہے ؎

ہفت صد ہفت سال ہجری بود
کاں مہ برج دیں طلوع بنمود

ابن بطوطہ بھی اوچہ کا ذکر کرتا ہے اس وقت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی عمر غالباً ۲۷ سال تھی۔ ان کو وہ سید جلال الدین حیدری علوی لکھتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں برنی کا حوالہ ہے کہ سید جلال نے ۷۶۱ھ میں فیروز شاہ اور حاکم سندھ جام بانبیہ کے درمیان صلح کرائی تھی۔

تعاقب میں روانہ کیا لیکن وہ قصبہ سرستی[1] تک جاکر لوٹ آیا اور خسرو خاں کو غازی الملک کی تیاریوں کی اطلاع دی۔

غازی الملک کا حملہ

جب سارا ساز و سامان مہیا ہوگیا تو غازی الملک نے نہایت دلیری اور مردانگی کے ساتھ دیپال پور[2] سے دہلی کی طرف یلغار کردی۔ خسرو خاں نے اس کے مقابلہ پر اپنے بھائی خانخاناں کو چتر اور دور باش کا اعزاز دے کر روانہ کیا اور صوفی خاں جیسے نالائق اور کمینے امیروں کو بھی ساتھ کردیا۔ غازی الملک زمانے کے سرد و گرم دیکھا ہوا پرانا امیر تھا۔ مغلوں کے مقابلہ میں اس نے فتح و شکست کے بڑے بڑے تجربے حاصل کیے تھے اور نمایاں فتوحات حاصل کی تھیں۔ اوچھ اور ملتان کا حاکم بہرام اللہ[3] بھی اس کی مدد کے لیے آگیا تھا، ایسے بھگتے بھگتائے امیروں کے مقابلہ میں خسرو خاں کے بھیجے ہوئے امیر نہایت کم حوصلہ اور ناتجربہ کار تھے۔ چنانچہ جب تھانیسر[4] میں دونوں فوجیں مقابل ہوئیں تو پہلے ہی حملہ میں غازی خاں نے دشمن کو مار بھگایا اور نمایاں فتح حاصل کی۔ غنیم ہاتھی گھوڑے اور سارا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ گیا، غازی الملک بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا دہلی کے سامنے پہنچ گیا۔

خسرو خاں مقابلہ پر

خسرو خاں نے شکست خوردہ لشکر کو جمع کرکے خزانے کا دروازہ کھول دیا۔ سپاہیوں کو تین تین چار چار ماہ کی تنخواہیں پیشگی دیں، بڑے بڑے عہدے اور جاگیروں کے وعدے

---

[1] سرستی۔ قدیم تاریخوں میں سرسہ کا نام سرستی لکھا ہے۔ آئین اکبری میں سرسہ ہے۔ یہ شہر دریائے سرسوتی کے کنارے ہے ا۔ اسی دریا سے منسوب ہے۔ جو لوگ اسے راجا سارس کے نام سے منسوب کرتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ پرانا شہر ۱۷۲۶ء کے قحط میں برباد ہوگیا تھا۔ موجودہ شہر ۱۸۳۷ء میں میجر تھارسبی نے آباد کیا اس کی آبادی سترہ ہزار ہے۔ پرانے شہر کے کھنڈر موجودہ آبادی کے جنوب مغرب میں نظر آتے ہیں پہلے یہاں سے دریائے گھگھر کی ایک شاخ بہتی تھی جو خشک ہوگئی۔ ابن بطوطہ نے یہاں کے چاولوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس وقت شاید چاول اچھا اور بکثرت ہوتا تھا، اب یہ حال نہیں ہے۔

[2] دیپال پور۔ ضلع منٹگمری میں دریائے بیاس کے قریب پاک پٹن سے ۲۸ میل مشرق کو واقع ہے۔ اوکاڑہ کے اسٹیشن سے ۱۷ میل جنوب میں ہے۔ جنرل کننگھم کی تحقیق ہے کہ اسے راجہ دیو پال نے آباد کیا تھا۔ بطلیموس نے جس "ڈیدالہ شہر" کا ذکر کیا ہے وہ یہی دیپال پور ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے یہاں تک ایک نہر بنوائی تھی اور جامع مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ غلاموں اور خلجیوں کے وقت میں یہ شہر پنجاب کا دارالخلافہ تھا۔ چونکہ لاہور اور ملتان کے درمیان تھا اس لیے چنگیز خانی حملوں کی روک تھام کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی، یہاں سے دونوں سمتوں کا باسانی انتظام ہوسکتا تھا۔ پرانے شہر کے کھنڈر جنوب مغرب میں ملتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ خاص شہر میل کے رقبہ میں آباد تھا۔ موجودہ شہر کی آبادی چار ہزار ہے۔ تیمور کے حملہ کے وقت یہ ملتان کے برابر کا شہر تھا۔ اس میں ۸۴ مسجدیں تھیں۔ بابر کے وقت میں لاہور کے برابر کا شہر تھا۔

[3] ابن بطوطہ اس کا نام کشلو خاں لکھتا ہے لیکن یہ اس کا خطاب تھا نام نہیں تھا۔

[4] تھانیسر۔ لاہور سے ۲۲۸ اور دہلی سے ۸۷ میل پر دریائے سرستی کے کنارے آباد ہے۔ تھانیسر قدیم آریاؤں کا پہلا پڑاؤ ہے۔ اسی شہر سے ہندو مذہب اور تہذیب نے جنم لیا۔ ہندوؤں کی پرانی زیارت گاہ ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں (۴۰۲ھ / ۱۰۱۲ء) سلطان محمود غزنوی نے اس شہر پر حملہ کیا۔ یہاں کی دلچسپ عمارت شیخ چلی کا مقبرہ ہے جو اکبر کے عہد کا بنا ہوا ہے۔ شیخ چلی کا اصل نام عبدالرزاق تھا، بکثرت چلہ کشی کی وجہ سے ان کو شیخ چلی کہنے لگے۔ ان کے لطیفے بہت مشہور ہیں لیکن یہ سب یاران مجلس کے تراشے ہوئے ہیں، وہ ایک عابد درویش تھے اور بس۔ شیخ جلال الدین تھانیسری (۹۷۹ھ / ۹۵۷) کا روضہ اور مسجد بھی ہے۔ شیخ چلی کے مقبرہ میں ایک دینی مدرسہ بھی لگا ہوا ہے۔ تھانیسر ہندوؤں کے مقدس تالاب کلچھیتر کی وجہ سے بھی مشہور ہے، اس کا طول ایک میل عرض چوتھائی میل ہے۔ یہاں دور دور سے یاتری غسل کرنے آتے ہیں۔ مہابھارت کی مشہور تاریخی جنگ بھی اسی شہر کے نواح میں ہوئی تھی۔ یہ میدان ستر میل لمبا بیس میل چوڑا ہے اور ہندوؤں کے نزدیک بڑی متبرک جگہ ہے۔

کیے۔ خاندان علائی کے جن شہزادوں کو اندھا کر رکھا تھا اُن کو مروا ڈالا اور کافی ساز و سامان لے کر دہلی سے باہر نکلا اس کی لشکرگاہ حوض خاص سے اندر پت تک پھیلی ہوئی تھی۔ غازی الملک سلطانہ رضیہ کے روضہ میں کیمپ لگائے ہوئے تھا۔ اس وقت عین الملک عہد و قرار کے مطابق اپنی جمعیت کو لے کر دہار[1] اور اجین کی طرف نکل گیا۔ اس کے اس طرح کٹ جانے سے خسرو کا دل ٹوٹ گیا۔

خسرو خاں کی شکست

دوسرے دن لڑائی ہوئی۔ پہلی بار غازی الملک کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ منتشر ہو گیا لیکن غازی الملک نے تین سو سواروں کے ساتھ جو گھاٹ میں چھپے ہوئے تھے یکبارگی خسرو خاں کے فاتح لشکر پر حملہ کر دیا اور اسے پراگندہ کر دیا۔[2] ملک تلبغہ اور تمار قرہ کے بیٹے اور خسرو کے دوسرے طرف دار کئی ایک امیر مارے گئے لیکن خسرو بڑی بہادری سے شام تک لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر تلپتہ کی طرف بھاگ گیا۔ چتر شاہی اور دوسرا اسباب شاہانہ جو چند روز کے لیے خسرو کو برائے نام مل گیا تھا غازی الملک کے قبضہ میں آ گیا۔

جب خسرو نے راہِ فرار نہ پائی تو تلپتہ سے لوٹ کر اپنے پُرانے رفیق ملک شادی کے باغ میں تن تنہا چھپ گیا۔ دوسرے دن اُس کو بڑے بُرے حال میں پکڑ کر غازی الملک کے روبرو پیش کیا گیا اور اُس نے اپنے کیے کی سزا پائی۔[3]

دوسرے دن غازی الملک تلپتہ سے سوار ہو کر سبز کوشک میں آیا اور اسی جگہ قیام کیا۔ دہلی کے خاص و عام آ آ کر اس کو مبارک باد دینے لگے۔ دوسرے دن وہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ حرامی خانخاناں بھی کسی باغ میں چھپا بیٹھا ہے، ملک فخرالدین جونا اُسے پکڑ لایا۔ غازی الملک کے حکم سے اس کے ناک کان ہاتھ پاؤں کاٹ کر سارے شہر میں پھرایا گیا۔ یہ واقعہ ۷۲۰ھ میں پیش آیا۔ خسرو خاں چار ماہ کچھ دن تخت شاہی پر قابض رہا۔

---

[1] دہار۔ بحوالہ آئین اکبری، دہار راجہ بھوج کا پایۂ تخت تھا۔ پوار راجاؤں کا پہلا دارالخلافہ اجین تھا، بھوج نے دہار کو اپنا مستقر بنایا۔ موجودہ راجا بھی اپنے آپ کو بکرماجیت کی اولاد بتاتا ہے۔ ۱۳۰۵ء میں پوار خاندان کمزور ہو گیا اور دکن میں پونا کی طرف چلا گیا۔ مسلمانوں کے وقت میں مالوہ کا دارالخلافہ اوّل دہار ہی تھا بعد میں منڈو مقرر ہوا۔ انگریزوں کے زمانہ میں دہار چھوٹی ریاست تھا۔ آبادی سولہ سترہ ہزار ہے۔ مئو اور بڑودہ کی سڑک پر مئو سے ۳۳ میل مغرب میں ہے بڑودہ سے ۱۸۳ میل مشرق میں۔ دو سنگ سُرخ کی مسجدیں مسلمانوں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ یہاں کے انگور کافی مشہور تھے اور سال میں دو مرتبہ پھل دیتے تھے۔

[2] ابن بطوطہ کی صراحت ہے کہ اس وقت خسرو خاں کا لشکر مال غنیمت لوٹنے میں مصروف تھا۔

[3] خسرو خاں پیش ہوا تو اس نے کھانا مانگا اسے کھانا کھلایا گیا۔ پھر اس نے کہا مجھے رسوا نہ کرو اور میرے ساتھ شاہانہ سلوک کرو۔ غازی الملک نے اُسی جگہ جہاں قطب الدین قتل ہوا تھا لے جا کر اُسے قتل کرا دیا اور اُس کی لاش چھت پر سے نیچے پھنکوا دی۔ (ابن بطوطہ)

خاندان تغلق

سلطان غیاث الدین تغلق شاہ

دہلی میں داخل ہونے کے بعد غازی الملک نے تمام امیروں کے اتفاق رائے سے ۷۲۰ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور غیاث الدین تغلق[1] لقب رکھا۔

تغلق بڑا منتظم اور مدبر شخص تھا۔ اُس نے ایک ہفتہ کے اندر ہی سلطنت کے اس درہم برہم کارخانہ کو بخوبی سنوار کر رکھ دیا۔ جس تیزی اور ہوشیاری سے اس نے نظم و نسق کی اصلاح کی وہ شاید دوسروں سے سالہا سال میں بھی نہ ہوتے۔ اپنے عزیزوں اور قریبوں کو اس نے عہدے اور منصب عطا کیے، علاؤ الدین اور قطب الدین کے زمانہ کے اکثر امراء کے

---

[1] ابن بطوطہ کہتا ہے "تغلق" قوم سے ترک قرونہ تھا۔ یہ لوگ ترکستان اور سندھ کے درمیانی پہاڑوں میں رہتے تھے"۔ مارکو پولو نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے: "قرونہ اُن کو کہتے ہیں جن کے باپ تاتاری اور ماں ہندی ہو، اُن کا پیشہ لوٹ مار اور قزاقی ہے، جہاں جاتے ہیں اُس علاقہ کو بے چراغ کر دیتے ہیں، اُن کا سردار نکودار ہے جو چغتائی کا بھتیجا ہے۔ یہ شخص اپنے چچا کے پاس سے بھاگ کر قرونہ کے لشکر کو لے کر براہِ بدخشاں کشمیر چلا گیا۔ لاہور کو فتح کیا اور مغلوں سے لڑتا رہا"۔

دوسری تاریخ سے معلوم ہوتا ہے پہلے قرونہ کا طومان (دس ہزار کا دستہ) مغلوں کے لشکر کے ساتھ رہا کرتا تھا بعد میں انھوں نے قزاقی کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اس قوم کا اصل مسکن شمالی چین میں قردل جیدل یا خیدن نامی پہاڑ ہے"۔ کرنیل یول مارکو پولو کی بتائی ہوئی وجہ تسمیہ کو غلط کہتا ہے لیکن خلاصۃ التواریخ کا مصنف لکھتا ہے: "پدر سلطان ترک زاد باسم تغلق از غلامان سلطان غیاث الدین بلبن و مادر او از قوم جاٹ پنجاب بود"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونہ کے لفظ سے ابن بطوطہ کے راوی نے یہی مراد لی ہے کہ سلطان تغلق دوغلا تھا اور جو کچھ مارکو پولو نے وجہ تسمیہ لکھی ہے صحیح ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "تغلق" اس کی قوم کا نام نہیں بلکہ اس کے باپ کا نام تھا تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف نے لکھا ہے "میں تغلق شاہ کے نسب کا حال اپنی کتاب "مناقب سلطان تغلق" میں لکھ آیا ہوں اس لیے یہاں نہیں لکھتا"۔ اس کتاب کا کوئی پتہ نہیں چلتا وہ اگر سُستی نہ کرتا تو تغلق کا کل حال معلوم ہو جاتا۔ تغلق کے سکوں پر "السلطان الغازی غیاث الدنیا والدین ابو المظفر تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المومنین" درج ہے۔ اس کے بیٹے کے سکہ پر "المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ" یا "الراجی رحمۃ اللہ محمد بن تغلق شاہ" ثبت ہے اس سے ظاہر ہے کہ تغلق قوم کا نام نہیں یا تو خود غیاث الدین کا نام تھا یا اس کے باپ کا۔ "تغلق" کے ترکی زبان میں لغوی معنی "پہاڑی" کے ہیں اور یہ پشتو کے لفظ "روہیلہ" کے مترادف ہے۔ فرشتہ کا کہنا ہے "میں نے بادشاہ تغلق کے نسب کی بابت لاہور اور دوسرے شہروں میں ہر چند تحقیقات کی مگر کچھ پتہ نہ چلا"۔ "نوادر المعانی" میں "تغلق" اور "قتلغ" کے معنی "اوسط" اور "میانہ" لکھے ہیں۔ "قتلغ" ہم سکے تو یہ معنی درست ہوں گے کیونکہ "الغ خاں" اور "الکت خاں" کے علاوہ بعض امیر "قتلغ خاں" خطاب کے بھی ملتے ہیں لیکن "تغلق" کوئی علیحدہ مستقل لفظ ہے، اب بھی ملتان کے مضافات میں تونے خاں (یعنی تغلق خاں) کا کنڑہ موجود ہے۔

ساتھ مہربانی کا سلوک رکھا اور ان کو بھی جاگیریں عطا کیں۔ ان سارے انتظامات کے بعد قلعۂ تغلق آباد[1] تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ تین سال میں تیار ہوا۔ جب قلعہ تیار ہوگیا تو وہاں ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔ اس موقع پر بدر شاشی شاعر نے قلعہ کی تعمیر کی تاریخ "فادخلو" نکالی جو بلاشبہ یہ ایک نادر تاریخ ہے۔ سلطان نے اُن تمام لوگوں کو جن کے مشورے سے خسرو خاں نے قطب الدین کی ملکہ سے عقد کیا تھا اور جو اس کی سرکش قوم کے مددگار بنے تھے، سب کو سزائیں دیں۔ اپنے بیٹے ملک فخر الدین جونا کو جس کے قیافہ سے ہی شاہانہ علامتیں جھلکتی تھیں الغ خاں کا خطاب چتر وغیرہ شاہی اعزازات دے کر اپنا ولی عہد بنایا اور بیرام اللہ کو جسے سلطان تغلق نے اپنا بھائی بنایا تھا کشلو خاں کا خطاب دے کر پورے سندھ اور ملتان کا حاکم بنا دیا۔ اپنے دوسرے چار بیٹوں کو بہرام خاں، ظفر خاں، محمود خاں اور نصرت خاں کا خطاب عطا کیا۔

الغ خاں کی فوج کشی

۷۲۱ھ میں تغلق نے الغ خاں کو چندیری[2]، بدایوں اور پورب کے دوسرے شہروں کی فوجیں دے کر دیوگیر اور تلنگانہ کی مہم پر روانہ کیا۔ الغ خاں نے دیوگیر پہنچ کر وہاں کی متعینہ فوج کو بھی اپنے ساتھ لیا اور اس سارے لاؤ لشکر کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے قلعۂ ارنگل کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ گزشتہ سات سو برس سے رائے سدر مہادیو اور اس کے آباؤ اجداد کے تصرف میں تھا۔ الغ خاں نے قلعہ کے باہر کا کچا حصار بہت جلد فتح کر لیا۔ اور قریب تھا کہ وہ اندر کے سنگین حصار کو بھی فتح کر لے کہ اس عرصہ میں دہلی کی ڈاک آنے میں خاصی تاخیر ہوگئی۔ مفسدوں کو اچھا خاصا مشغلہ ہاتھ لگ گیا۔ چنانچہ شیخ زادہ دمشقی اور عبید[3] شاعر نے یہ خبر اُڑائی کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس

---

[1] تغلق آباد۔ یہ قلعہ اور شہر قطب صاحب سے چار میل مشرقی جانب متھرا کی سڑک سے متصل واقع ہے۔ نیم دائرہ کی شکل میں بنا ہوا ہے۔ کل محیط چار میل سے ایک فرلانگ کم ہے۔ نیم دائرہ کا قاعدہ جنوب کی طرف ہے۔ اس کا طول ایک میل ہے، نیچے بند باندھ کر ایک جھیل بنائی گئی ہے، پہاڑ کی چٹان کو تراش کر اس کے اوپر قلعہ کی فصیل بنائی گئی ہے، میدان سے کل اونچائی ۹۰ فٹ ہے۔ جنوب مغربی گوشہ میں قلعہ اور شاہی محلات تھے، اس کے قریب ہی غیاث الدین تغلق شاہ کا مقبرہ ہے جو جھیل کے وسط میں ہے۔ یہ مقبرہ سنگِ سرخ اور سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ نیچے سے گنبد کی چوٹی تک ۸۰ فٹ بلند ہے، گنبد کا قطر باہر سے ۴۴ فٹ ہے۔ کہتے ہیں دونوں باپ بیٹے ایک ہی مقبرہ میں آسودہ ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق شاہ ٹھٹھہ واقع سندھ میں مرا تھا وہاں سے اس کی لاش غالباً دہلی لائی گئی تھی۔ قلعہ میں اب گوجروں کی آبادی ہے۔ مقبرہ کے احاطہ میں مسلمان زمینداروں کے گھر ہیں، یہ لوگ خود کو تغلق کی اولاد بتاتے ہیں۔ لکڑیاں لا کر دہلی میں فروخت کرتے ہیں۔ بہادر شاہ کے وقت میں یہ لوگ شاہ جہاں آباد کے قلعہ میں لکڑیاں فروخت کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے خواہ کتنی ہی قیمت دی جائے وہاں ہرگز نہیں جاتے تھے۔

[2] چندیری۔ یہ شہر بیتوا ندی کے کنارے تھا اب ایک گاؤں رہ گیا ہے۔ گوالیار سے ۱۰۵ میل آگرہ سے ۱۷۰ میل اور دہلی سے ۲۸۰ میل پر ہے۔ پہاڑی پر ایک سنگین قلعہ اب بھی موجود ہے۔ بابر نے اس قلعہ کا مفصل بیان اپنی تزک میں اور ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے اس شہر میں چودہ ہزار سنگین مکان تین سو چوراسی بازار تین سو ساٹھ سرائیں اور بارہ ہزار مسجدیں تھیں۔ اس تعداد میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ سیر المتاخرین میں ہے کہ اس شہر میں ایک مندر اس قدر بڑا تھا کہ نقارہ بجنے کی آواز اس سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ بابر کہتا ہے "میں نے اس قلعہ کو تین گھڑی میں فتح کر لیا تھا۔ انگریزوں نے جھانسی کے عوض یہ شہر لے لیا تھا۔"

[3] عبید شاعر۔ پیشِ نظر نسخہ (کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی) میں تو نہیں البتہ بدائونی کے بعض دوسرے نسخوں میں "عبید شاعر زاکانی" لکھا ہوا ہے۔ زاکانی اور یہ عبید ایک شخصیت نہیں ہیں۔ عبید زاکانی ایران کا مشہور مسخرہ ہجو گو شاعر ہے جو ابو اسحاق شاہ شیراز کے دربار سے متعلق تھا۔ اس کا زمانہ بھی اسی کے قریب ہے۔ فرشتہ نے وضاحت کر دی ہے کہ "ایں عبید نہ عبید شاعر مشہور است" یہ عبید امیر خسرو کا

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

خبر سے لشکر میں بڑا اضطراب پھیل گیا۔ عبید نے امراء لشکر کو بھی خوب بہکایا کہ الغ خاں تم لوگوں کی فکر میں ہے۔ لشکر کی اس پریشانی سے غنیم نے پُرقوت فائدہ اُٹھایا اور قلعہ سے نکل کر حملہ کیا اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کردیا۔ ملک تگین اور دوسرے امیروں نے الغ خاں سے غداری پر کمر باندھ لی۔ ملک تگین تو پچاس سواروں کو ساتھ لے کر فوراً ہی دہلی بھاگ گیا اور دوسرے امیر بھی اسے چھوڑ کر اپنے اپنے علاقہ کی طرف نکل گئے۔ ان میں سے ملک تگین ملتان اور جیسلمیر کے درمیان پکڑا گیا۔ تاج الدین طالقانی اور اُس کا داماد جو قید خانہ سے نکل بھاگا تھا، سرو ندی کے کنارے گرفتار ہوا۔ عبید شاعر کو بھی بڑی مشکل سے گرفتار کر کے لایا گیا۔ ان سب کو ان کے ساتھیوں سمیت ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا گیا۔ جو بچ گئے وہ جہاں تھے مارے گئے۔

۷۲۳ھ میں الغ خاں نے دوبارہ تلنگانہ کا رخ کیا۔ ارنگل کا راجہ رائے سدر مہادیو پھر قلعہ بند ہو گیا۔ اس مرتبہ الغ خاں نے بیرونی حصار کو فتح کر کے راجہ کو مع اس کے ساتھیوں کے گرفتار کر لیا اور وہاں عامل مقرر کر کے مال غنیمت جو ہاتھیوں، جواہرات اور دوسرے قیمتی سامان پر مشتمل تھا، راجہ سمیت دہلی روانہ کر دیا۔ ارنگل کا نام سلطان پور رکھ کر خود بھی دہلی لوٹ آیا۔

بنگالہ کی مہم ۷۲۴ھ میں بنگالہ کے حاکم کی شورشوں کی خبر ملی تو خود سلطان تغلق نے اس طرف توجہ کی اور الغ خاں کو تغلق آباد میں ملکی اور مالی امور کی نگرانی کے لیے اپنا نائب مقرر کر دیا۔

جب سلطان لکھنوتی پہنچا تو وہاں کا حاکم سلطان ناصر الدین اور اس نواح کے تمام راجہ اور امراء استقبال کے لیے آئے۔ تغلق نے ناصر الدین کو چتر دور باش اور سلطنت کے اعزاز دے کر دوبارہ اسے لکھنوتی[1] کی حکومت کا پروانہ عطا کیا۔

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ عبید صفحہ گزشتہ) مخالف تھا۔ جب امیر خسرو نے نظامی کے "خمسہ" کے جواب میں اپنا "خمسہ" لکھا تو اس نے یہ شعر ہجو میں کہا ؎

غلط افتاد خسرو را ز خامی ‌‌ ‌ که سگ پا پخت در دیگ نظامی

امیر خسرو نے بھی اپنی تصنیفات میں اس عبید اور سعد فلسفی کی کئی جگہ شکایت کی ہے۔ عبید زاکانی کا حال "تذکرہ دولت شاہ سمرقندی" میں درج ہے۔ اس کے حق میں مشہور شاعر سلمان ساوجی نے یہ کہا، کیونکہ زاکان قزوین کے پاس ایک گاؤں ہے ؎

جهنمی و هجاگو عبید زاکانی ‌ ‌ مقرر است بہ بے دولتی و بے دینی

اگرچہ نیست ز قزوین و روستا زادہ است ‌ ‌ ولیک می شود اندر حدیث قزوینی

دولت شاہ کا بیان ہے۔ ایک دن خواجہ سلمان ساوجی کے پاس زاکانی گیا، سلمان نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ کہا قزوین سے۔ سلمان نے کہا: تم کو سلمان کا کوئی کلام یاد ہے؟ عبید نے اس کا یہ قطعہ پڑھا ؎

من خراباتیم و بادہ پرست ‌ ‌ در خرابات مغاں عاشق و مست

مے کشندم چو سبو دوش بدوش ‌ ‌ مے برندم چو قدح دست بدست

قطعہ پڑھ کر کہا یہ شعر خواجہ سلمان کے نہیں معلوم ہوتے غالباً خواجہ کی بیگم نے یہ قطعہ کہا ہو۔ سلمان یہ سن کر شرمندہ ہو گئے اور سمجھ گئے یہ شخص عبید زاکانی ہے۔

[1] لکھنوتی۔ قدیم نام گور تھا۔ بنگال کے ہندو راجاؤں کا دار السلطنت تھا۔ بعض کا خیال ہے شہر کا نام لکھنوتی یعنی لکھنوتی تھا اور علاقہ کا نام گوڑ بنگالہ تھا۔ ۱۲۰۴ء میں جب مسلمانوں نے بنگال کو فتح کیا تو اپنا دار الحکومت اسی کو بنایا۔ تین سو سال تک مسلمان بادشاہ اسی جگہ رہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اور فتح نامہ دہلی بھیجا۔ لکھنوتی سے تغلق نے ظفر آباد کے حاکم تاتار خاں کو جسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا فوج کشی کے

(بقیہ حاشیہ سلسلہ لکھنوتی صفحہ گزشتہ) درمیان میں بعض بادشاہوں نے پنڈوہ کو جسے حضرت پنڈوہ بھی کہتے ہیں اور وہ گور کے قریب ضلع مالوہ میں واقع ہے، اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ فیروز آباد بھی اسی شہر کے قریب تھا۔ فیروز شاہ نے ۷۵۵ھ میں لکھنوتی پر حملہ کیا تو اس کا نام فیروز آباد رکھا تھا (شمس سراج عفیف) لیکن یہ غلط ہے کیونکہ اس سے پہلے کے سکّوں پر بھی "فیروز آباد" درج ہے۔ قیاس ہے کہ سلطان شمس الدین فیروز بن ناصر الدین بغرا بن بلبن کا رکھا ہوا ہے۔ جب گنگا کی وہ شاخ خشک ہو گئی جس پر یہ شہر آباد تھا تو دلدل کی وجہ سے شہر کی آب و ہوا بگڑ گئی۔ اس وقت سے بنگال کے بادشاہوں کا پایۂ تخت تبدیل ہو گیا۔ ۱۵۳۷ء میں شیر شاہ نے اسے لوٹ لیا تھا۔ ۱۵۷۵ء میں منعم خاں خان خاناں اکبر کے سپہ سالار نے یہاں حملہ کیا تھا۔ آب و ہوا کی خرابی سے اس کے لشکر میں وبا پھیل گئی اور خان خاناں بھی مر گیا۔ کہتے ہیں اس کے بعد سے گور بالکل ہی اجڑ گیا لیکن ابو الفضل کی آئین اکبری سے اس کی تردید ہوتی ہے اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے جب شاہ شجاع نے راج محل کو بنگالہ کا دار الخلافہ بنایا تو گور ویران ہو گیا اور پھر آباد نہ ہو سکا۔ قدیم کھنڈرات ۲۵—۲۳ مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں جن سے بازاروں مسجدوں اور محلات کا نشان ملتا ہے۔ اجڑنے کے بعد یہاں گھنا جنگل ہو گیا تھا، انگریزوں نے جنگل کاٹ کر اس جگہ کی اینٹوں سے انگریز آباد مرشد آباد، مالدہ اور پرنیہ کی عمارتیں بنائیں۔ کھنڈر بتاتے ہیں کہ کبھی یہ شہر قدیم کلکتہ سے کم نہیں تھا، کم از کم چھ سات لاکھ کی آبادی ہو گی۔ فصیل کی بنیاد شمال کی طرف سو فٹ چوڑی تھی، خندق سوا سو فٹ سے کم نہیں معلوم ہوتی۔ فصیل کے شمال مشرقی کنارہ پر جس محل کے کھنڈر ہیں وہ چار سو گز لمبا اور چار سو گز چوڑا تھا۔ اس کو راجہ بلال سین کا محل کہتے ہیں۔ فصیل کے باہر کی آبادی کے کھنڈروں میں ایک تالاب اب بھی موجود ہے، یہ سولہ سو گز لمبا، آٹھ سو گز چوڑا تھا۔ اس کو ساگر ڈگی کہتے ہیں۔ دیواریں پختہ اینٹوں کی اور پانی نہایت صاف شفاف ہے۔ قلعہ کے پاس جو تالاب پیاس باڑی نام کا ہے اس کا پانی کھاری ہے۔ کہتے ہیں یہ تالاب قیدیوں کے استعمال کے لیے بنایا گیا تھا۔ ابو الفضل نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ قلعہ اور پیاس باڑی کے درمیان سنہری مسجد ہے جو ۶۰ گز لمبی، ۲۰ گز چوڑی اور ۲۰ گز اونچی ہے۔ کہتے ہیں اس کی چھت میں ۳۳ گنبد تھے۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے۔ "جنت آباد پرانا شہر ہے، پہلے پایۂ تخت تھا، اس کو لکھنوتی کہتے تھے۔ ہمایوں بادشاہ نے اس کا نام جنت آباد رکھا۔ یہاں ایک نہایت عمدہ قلعہ ہے۔ مشرق میں ایک تالاب چھتیا پھتا ہے۔ اس میں بہت سے ٹاپو ہیں۔ اگر اس کا بند ٹوٹ جائے تو سارا شہر ڈوب جائے۔ شہر کے شمال میں ایک کوس کے فاصلہ پر ایک عمارت اور ایک حوض ہے جس کا پانی زہر کی خاصیت رکھتا ہے۔ اس حوض کو پیاز (پیاس) باڑی کہتے ہیں۔ جن قیدیوں کو قتل کرنا ہوتا تھا ان کو وہاں رکھا جاتا تھا وہ یہ پانی پی پی کر تھوڑے ہی دنوں میں مر جاتے تھے۔ ہمارے بادشاہ نے اس کی ممانعت کر دی ہے۔" شیخ اخی سراج کی خانقاہ بھی گور میں تھی آپ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے۔ یہ خانقاہ ساگر ڈگی تالاب کے شمال مشرقی گوشے پر سعد اللہ پور کے موضع میں ہے۔ آپ کا انتقال ۷۵۸ھ میں ہوا۔ باہر کے دروازہ پر جو کتبہ ہے اس پر سنہ ۹۱۶ھ درج ہے یہ دروازہ حسین شاہ سلطان بنگال کا بنایا ہوا ہے خانقاہ غالباً سکندر شاہ کی بنائی ہوئی ہے۔ کتبہ کی جگہ خالی ہے۔ کلکتہ کے عجائب گھر میں گور کی جو اینٹیں ہیں ان پر غیاث الدین بن سکندر شاہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ تاریخ سات سو پر کچھ معلوم ہوتی ہے۔ کننگھم صاحب کا خیال ہے یہ اینٹیں اس کتبہ کی جگہ کی ہیں۔ ممکن ہے درست ہو۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔ یہ غیاث الدین سکندر شاہ کا بیٹا تھا اور وہ بادشاہ ہے جس نے شیراز سے خواجہ حافظ کو آنے کی دعوت دی تھی۔ آپ نے ایک غزل بھیج کر معذرت کی۔ اس غزل کا شعر ہے

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

لیے روانہ کیا۔ تاتار خاں نے سنارگاؤں[1] کے حاکم بہادر شاہ عرف تورہ کو جو کچھ عرصہ سے خود مختار بن بیٹھا تھا گرفتار کر کے پابجولاں اس کے تمام ہاتھیوں سمیت بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔

تغلق کی وفات

مندرجہ بالا فتوحات کے بعد تغلق بہادر شاہ مذکور کو ساتھ لے کر دہلی واپس ہوا۔ یہ سفر اس نے نہایت سرعت کے ساتھ طے کیا، چنانچہ دو دو منزل پر پڑاؤ کرتے ہوئے کوچ کیا جاتا تھا۔

الغ خاں نے سلطان کی آمد کی خبر سُن کر تغلق آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر افغان پور میں ایک بہت بڑا اور بلند قلعہ نما محل تین دن کے اندر تیار کرایا تاکہ بادشاہ اسی جگہ رات میں قیام کرے اور صبح کو نیک ساعت دیکھ کر تغلق آباد میں داخل ہو۔ چنانچہ بادشاہ نے حسب انتظام اسی محل میں جا کر قیام کیا، وہاں استقبال کے لیے الغ خاں تمام امیروں کو لے کر آیا اور ضیافت کا بڑا شاہانہ انتظام کرایا۔ اس جگہ وہ ہاتھی جو بنگالے سے آئے تھے بادشاہ کے حکم سے دوڑائے گئے۔ محل چونکہ نیا بنا تھا ہاتھیوں کے دوڑنے سے دہل گیا۔ بادشاہ نے محل کے اندر کھانا کھایا۔ لوگوں کو چونکہ یہ اطلاع تھی کہ کھانا کھاتے ہی فوراً سوار ہو جائیں گے اس لیے محل میں جتنے لوگ دسترخوان پر حاضر تھے کھانا کھاتے ہی ہاتھ دھوئے بغیر ہی سواری کے انتظام کے لیے جلد ہی باہر چلے آئے، البتہ بادشاہ ہاتھ دھونے کے انتظار میں بیٹھا رہا، لیکن اچانک چھت گر پڑی۔ اور اُس کو جان سے ہی ہاتھ دھونا پڑے۔

اس واقعہ کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ الغ خاں نے قصداً اس کی دیواریں اندر سے کھوکھلی رکھی تھیں۔ اتنی جلدی نیا محل تعمیر کرنے سے شبہ ہوتا ہے کہ عوام کا یہ خیال ممکن ہے سچ ہو[2]۔ تاریخ فیروز شاہی میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔

---

[1] سنارگاؤں۔ غالباً یہ شہر ہندوؤں کے زمانہ سے مشرقی بنگال کا دار الخلافہ چلا آتا تھا۔ تاریخ میں اس کا ذکر پہلی بار مغیث الدین طغرل کے ذکر میں ملتا ہے کہ جب اس نے بلبن سے بغاوت کی تو بھاگ کر سنارگاؤں چلا گیا۔ اس وقت وہاں کا راجہ دنج رائے تھا، بلبن سے اس کی صلح ہو گئی تھی۔ یہ علاقہ لکھنوتی سے کافی دور تھا۔ برسات میں دریاؤں کی طغیانی سے وہاں جانا دشوار ہو جاتا تھا اس لیے یہاں کے حاکم شاہان دہلی یا شاہانِ بنگالہ سے باغی ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ بھی سنارگاؤں گیا تھا۔ اُس نے وہاں کے باغی فخرالدین عرف فخرو کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ شہر بسایا گیا تھا تو دریائے برہم پترا اور میگنا کے اتصال پر دونوں کے درمیان تھا اور بنگال کی دونوں سمتوں کے لیے دریائی سفر کا مرکز بن گیا تھا۔ بڑا تجارتی مقام تھا۔ اب اس جگہ ایک گاؤں "پے نام" رہ گیا ہے۔ پُرانے شہر کے کھنڈر بید کے جنگل میں پوشیدہ ہیں۔ بید کا جنگل اس قدر گھنا ہے کہ پیدل آدمی بھی بمشکل وہاں جا سکتا ہے۔ یہ مقام ڈھاکہ سے پندرہ میل پر برہم پترا کے کنارے دو میل اندر کی طرف ہے۔ ۱۵۸۶ء میں وہاں بنگال کا بادشاہ عیسیٰ خاں اکبر کے حملوں سے بچنے کے لیے جا کر رہ گیا تھا۔ اس زمانہ میں ایک انگریز سوداگر رالف فیچ ہندوستان آیا تھا وہ لکھتا ہے: "سنارگاؤں میں سارے ہندوستان سے اچھا روئی کا کپڑا تیار ہوتا ہے۔" ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں وہاں کے کپڑے کی تعریف کی ہے۔ یہاں سے قریب ایک قصبہ "گیارہ سندر" ہے وہاں ایک حوض ہے جس کے پانی کی تاثیر یہ ہے کہ کپڑا اس میں دھویا جائے تو اس میں بڑی صفائی اور سفیدی پیدا ہو جاتی ہے۔" ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس جگہ ایک کوٹھی بنائی تھی۔ یہ جگہ اب آم اور پان کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کا شاہ پسند سندوریہ آم اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے اور کافوری پان تمام ہندوستان میں جاتا ہے۔ یہاں کا دہی بھی بہت مشہور ہے۔ شیر شاہ کی مشہور سڑک جو اٹک سے شروع ہوتی ہے اسی جگہ آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس جگہ سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کا مقبرہ ہے جس نے خواجہ حافظ کو بلایا تھا۔

[2] قصر افغان پور۔ اس محل کے متعلق مختلف خیالات ملتے ہیں۔ بدایونی کے الفاظ ہیں: "از ساختن ایں چنیں قصرے کہ ہیچ ضرورتی نبود بوئے آں می آمد کہ الغ خاں قصر را مجوف ساختہ باشد چنانچہ مشہور در عوام است۔" یہی رائے ابوالفضل اور مصنف طبقات ناصری کی ہے لیکن ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہ محل الغ خاں نے اپنی خواہش سے نہیں بلکہ بادشاہ کے حکم سے بنوایا تھا۔ اس لیے اس کو غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ابن بطوطہ محل کی ساخت

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

واضح رہے کہ اس کا مصنف فیروز شاہ کا طرفدار ہے۔

ہنوز دلی دور است یہ واقعہ ۷۲۵ھ میں پیش آیا۔ غیاث الدین نے کل چار برس کچھ ماہ تک حکومت کی۔ ہندوستان کے عوام میں یہ بھی مشہور ہے کہ غیاث الدین کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء سے رنجش تھی۔ اُس نے لکھنوتی سے دہلی آتے ہوئے شیخ کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ "اب کی بار دہلی میں یا میں رہوں گا یا نظام الدین"۔ اس کے جواب میں شیخ کی زبان سے نکلا: "ہنوز دلی دور است"۔ اُسی دن سے یہ قول ضرب المثل بن گیا۔ امیر خسرو کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ اُن کی سب سے آخری تصنیف "تغلق نامہ" ہے جو اسی بادشاہ کے نام پر لکھی گئی۔

سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات کے بعد الغ خاں نے تمام امیروں کے اتفاق اور تائید سے سلطان محمد عادل کے لقب سے ۷۲۵ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور چالیس دن تک باپ کا ماتم کرتا رہا۔ اس کے بعد قدیم شاہی محل

(بقیہ حاشیہ قصر افغان پور صفحہ گزشتہ) کے متعلق لکھتا ہے: "اس کی بنیاد لکڑی کے ستونوں پر اس طرح رکھی گئی تھی کہ اگر اس کے ایک خاص موقع پر ہاتھی کھڑا کیا جائے تو تمام مکان گر پڑے۔ جونا خاں نے بادشاہ سے کہا "اے اخوند عالم نماز عصر کا وقت قریب ہے آیئے نماز پڑھ لیں۔" سب لوگ باہر نکل آئے، محل میں صرف بادشاہ اور اس کا لاڈلا شہزادہ محمود رہ گیا۔ اُس وقت ہاتھی کو اُس خاص مقام پر لایا گیا۔ ہاتھی کا وہاں پہنچنا تھا کہ سارا مکان ایک دھماکا سے بادشاہ اور شہزادہ کے سر پر گر پڑا۔ جونا خاں نے ملبہ ہٹانے میں بھی تاخیر سے کام لیا۔ جب ملبہ کھودا گیا تو بادشاہ اپنے بیٹے پر جھکا ہوا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا اُس کو بچانے کے لیے اُس کو اُٹھانا چاہتا ہے۔ بعض کہتے ہیں بادشاہ اُس وقت زندہ تھا لیکن اس کا کام تمام کر دیا گیا اور اسے راتوں رات تغلق آباد کے مقبرہ میں لے جا کر دفن کر دیا گیا (سفر نامہ ابن بطوطہ) ابن بطوطہ نے اس پُر اسرار محل کے معمار کا نام احمد بن ایاز لکھا ہے جو بادشاہ کا میر عمارت تھا اور محمد تغلق شاہ (الغ خاں) نے اپنے عہد میں اسے خواجہ جہاں کا لقب عطا کیا تھا۔ غالباً اسی (حسن خدمت) کے صلہ میں۔ فرشتہ اس روایت کو کہ مکان "ارادتاً" اس قسم کا بنایا گیا تھا تسلیم نہیں کرتا اور وہ "تاریخ حاجی محمد قندھاری" کی اس روایت کو کہ "بجلی گری اور مکان گر پڑا" کو ترجیح دیتا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے بھی "فیروز شاہی" میں یہی لکھا ہے لیکن ابن بطوطہ کے راوی شیخ رکن الدین ملتانی ہیں وہ اس واقعہ کے وقت تغلق کے پاس موجود تھے۔ اُنھوں نے خود ابن بطوطہ سے بیان کیا کہ "وہ عصر کے لیے محل سے نکل آئے اور جب شور سُنا تو نماز پڑھے بغیر چلے آئے۔" ان شیخ کا بھی یہی خیال ہے کہ "مکان ایسی صنعت سے بنایا گیا تھا کہ جس وقت ہاتھی اس مکان پر چڑھے تو وہ فوراً گر پڑے۔" عبدر جہاں گجراتی نے اس صنعت کو طلسم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ پچھلے سب مورخ ضیاء الدین برنی کو الزام دیتے ہیں کہ اس نے ارادتاً فیروز شاہ کی خاطر سے جو اپنے چچیرے بھائی سلطان محمد تغلق کا ممنون احسان اور مداح تھا اصل کیفیت بیان نہیں کی۔ اس مکان کے انجنیئر خواجہ ایاز کو وزیر اعظم بنا دینا اور تمام زندگی میں اس کی قدر افزائی کرنے کو بھی ابن بطوطہ اور اس کے راوی نے ایک حجت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان حالات میں بجلی کے گرنے کا قصہ محض بہانہ ہے۔ اگر یہی سبب تھا تو شیخ رکن الدین ملتانی اس کا ابن بطوطہ سے ذکر کرتے اور لوگوں سے بھی یہ بات پوشیدہ نہ رہتی۔ "سیر المتاخرین" میں درج ہے: "شیخ رکن الدین ملتانی برائے ملاقات سلطان دراں قصر رفتہ بود و بر مزد ایماء در برخاستن سلطان استعجال می نمود اما سلطان فہم نہ کرد چوں شیخ برخاست قصر بر سلطان فرود آمد۔" سلطان محمد تغلق شیخ رکن عالم پر بڑا مہربان رہا کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے اپنے باپ کا مقبرہ جو قلعہ ملتان میں ہے جس میں شیخ رکن عالم کا مزار ہے شیخ کو عنایت کر دیا تھا۔ ایک موقع پر گاؤں بھی جاگیر میں دیے۔ یہ مہربانیاں بھی غالباً شیخ کا مُنہ بند رکھنے کے لیے ہوں۔ اس مہربانی کے باوجود شیخ نے ابن بطوطہ سے صحیح واقعہ بیان کر دیا تھا اور تمام مورخوں سے ان کی رائے ہی زیادہ وزنی ہے۔

میں جشن منعقد کرکے کافی روپیہ خیرات کیا۔ اُس نے اپنے چچازاد بھائی ملک فیروز کو جو بعد میں سلطان فیروز کے نام سے تخت نشین ہوا اپنا نائب مقرر کیا۔ دوسرے امیروں کو بھی اونچے مناصب پر ترقی دی۔ چنانچہ حمید لوبکی بادشاہ کا مقرب بن گیا۔ ملک سرتیز کو عمادالملک، ملک خرم کو ظہیرالجیوش، ملک بنا ار خلجی کو قدر خاں اور ملک اعزالدین یحییٰ کو اعظم الملک کا خطاب ملا۔ اعظم الملک کو ست گاؤں کا علاقہ جاگیر میں ملا۔

دکن پر فوج کشی

۷۲۷ھ میں بادشاہ نے دیوگیر کی طرف کوچ کیا۔ دہلی سے دیوگیر تک ہر کوس پر ڈاک چوکی مقرر کی گئی۔ ہر منزل پر ایک خانقاہ اور مسافر خانہ بنوایا گیا۔ ہر مسافر خانہ میں ایک مُلّا متعین رہتا تھا۔ مسافروں کے لیے طعام و قیام کے سارے اسباب مہیّا رہتے تھے اور چوکی داروں کو تاکید کردی گئی تھی کہ مسافروں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ان خانقاہوں کے آثار برسوں تک باقی رہے۔

دارالخلافہ کی منتقلی

سلطان نے دیوگیر پہنچ کر اس کا نام دولت آباد رکھا اور یہ سوچ کر کہ دیوگیر مملکت کے وسط میں ہے اُسے اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ دہلی سے اپنی والدہ مخدومہ جہاں کو مع اہل و عیال کے اور دوسرے سب امیروں، لشکر کے سرداروں اور غلاموں کو دولت آباد بلالیا اور سارے خزانے بھی منگوالیے۔ مخدومہ جہاں کی وجہ سے بہت سے سیّد مشائخ اور عالم بھی دولت آباد چلے گئے۔ بادشاہ نے سب کے انعام اور وظائف دُگنے تگنے کردیے۔ خانہ ویرانی کی مصیبت بُری ہوتی ہے، دہلی کے بسے بسائے گھرانے اُجڑ کر دولت آباد گئے تو لوگوں کو بڑی پریشانیوں اور آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بیمار اور ضعیف آدمی تو راستہ ہی میں سفر کی صعوبتوں سے جاں بحق ہوگئے۔ جو پہنچے وہاں اُن کا رہنا مشکل ہوگیا۔ ان مصیبت زدوں سے اگر کوئی نام پوچھتا تو اُن کا یہ حال تھا کہ وہ زبانِ حال سے میر تقی میر کا یہ قطعہ ادا کرتے تھے ؎

دہلی جو ایک شہر تھا رشکِ چمن کبھی — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے مار کے ویران کردیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

۷۲۷ھ کے آخر میں فوج کے بخشی ملک بہادر گرشاسپ[1] نے دہلی میں بغاوت کی لیکن ملک احمد ایاز خواجہ جہاں نے اسے

---

[1] گرشاسپ۔ ابن بطوطہ اس کا پورا نام بہاؤالدین گشتاسپ لکھتا ہے۔ یہ سلطان تغلق کا بھانجا تھا۔ اس نے تغلق کے مرنے کے بعد محمد عادل کی بیعت قبول نہیں کی۔ جب خواجہ جہاں نے شکست دی تو یہ رائے کمپیلہ (بیجانگر کے پاس احاطہ مدراس کا مقام) کے پاس بھاگ گیا۔ شاہی لشکر نے کمپیلہ کا محاصرہ کرلیا۔ رائے کمپیلہ نے مقابلہ کیا اور جب بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تو اس نے گرشاسپ کو تو ایک اور راجہ کے پاس بھیج دیا۔ اس کی عورتیں الاؤ میں جل کر مرگئیں اور راجہ نے چند بہادروں کے ساتھ شاہی لشکر سے مقابلہ کرتے ہوئے جان دیدی یہاں سے فارغ ہوکر شاہی لشکر نے گرشاسپ کو پناہ دینے والے راجہ پر حملہ کیا۔ اس راجہ نے اسے پابہ زنجیر بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ بادشاہ نے اس کی کھال کھنچوا کے بھوسہ بھروادیا۔ مندرجہ بالا سارا بیان ابن بطوطہ سے ماخوذ ہے جس راجہ نے گرشاسپ کو گرفتار کرادیا اس کا نام ابن بطوطہ نے نہیں لکھا ہے۔ "رابرٹ سوول" اس کا نام بلال دیو بتاتا ہے۔ یہ میسور کے قریب تانور کا راجہ تھا اور ہوسیا خاندان کا تھا۔ گرشاسپ اس کے پاس ۱۳۲۷ء میں گیا تھا۔ بداؤنی نے جیسا کہ متن میں ذکر ہے ۷۲۷ھ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور اس کی گرفتاری دہلی ہی میں بتاتا ہے۔ اس کے برخلاف فرشتہ کے بیان سے ابن بطوطہ کی تصدیق

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

شکست دے کر گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں اسے بغاوت کی سزا دی گئی۔

بیرام اللہ کی بغاوت

دوسری بغاوت ملک بیرام اللہ نے جسے سلطان تغلق اپنا بھائی کہا کرتا تھا ملتان میں برپا کی۔ جب بادشاہ نے اسے لانے کے لیے علی خطیطی کو اس کے پاس بھیجا تو اس نے علی کو قتل کر دیا۔ بادشاہ اس فتنہ کو دبانے کے لیے دولت آباد سے کوچ پہ کوچ کرتا ہوا دہلی آیا اور شب و روز ملیغار کرتے ہوئے دہلی سے ملتان پہنچا۔ بیرام نے جم کر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور قتل ہو گیا۔ اس کا سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ بیرام کی سرکشی کے بدلے ملتان میں قتل عام کرانا چاہتا تھا لیکن حضرت شیخ رکن الدین نے اپنی دستار اتار کر بادشاہ سے سفارش کی اور بیچارے ملتان والوں کی جان بچی ؎

از ابتدائی دور آدم تا زمان بادشاہ

از بزرگاں عفو بودہ داز فرودستاں گناہ

سلطان نے ملتان قوام الملک کے حوالہ کیا اور دہلی مراجعت کی۔ چند دن بعد اس کی جگہ ملتان کی حکومت پر بہزاد کو روانہ کر دیا۔ بہزاد کو شاہو لودی پٹھان نے بغاوت کر کے قتل کر دیا۔ جب بادشاہ شاہو کو سزا دینے کے لیے دیپال پور پہنچا تو وہ بھاگ کر پہاڑوں پر چلا گیا۔ سلطان دہلی واپس آ گیا۔

مغلوں کا حملہ

۷۲۹ھ میں ترمہ شیریں مغل نے جو قتلغ خواجہ کا بھائی تھا دہلی پر یورش کی۔ یہ قتلغ خواجہ وہی ہے جس نے اس سے قبل ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ ترمہ شیریں نے لاہور[۲]، سامانہ اور

(بقیہ گرشاسپ صفحہ گزشتہ) ہوتی ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے "بہاؤالدین گرشاسپ بادشاہ کا عم زاد بھائی تھا اور ساگر کا صوبہ دار تھا اس نے بغاوت کی تو دہلی سے خواجہ جہاں اس کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ دولت آباد میں لڑائی ہوئی، دو دفعہ خواجہ جہاں نے شکست کھائی۔ اس لیے خود بادشاہ دولت آباد گیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی خواجہ جہاں نے رائے کمپیلہ اور گرشاسپ کو شکست دے کر اسے بلال دیو کے ہاں میں بھگا دیا تھا۔ بلال دیو نے اسے شاہی لشکر کے حوالے کر دیا۔ خواجہ جہاں نے اسے قید کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا "تا پوستش کندہ پرکاہ ساختند و در شہر گردانیدند"۔ اس واقعہ کے بعد بادشاہ نے دولت آباد کو دارالخلافہ بنانے کا حکم دیا۔ بہرحال سودل کا ۷۳۲ھ صحیح نہیں ہو سکتا۔ ضیاء برنی نے اس بغاوت کا ذکر تک نہیں کیا البتہ وہ بہاؤالدین کو تغلق شاہ کی بہن کا لڑکا بتاتا ہے یہی ابن بطوطہ نے بھی کہا ہے۔

[۱] ابن بطوطہ نے اس کو شاہ افغان لکھا ہے۔ بداؤنی اور فرشتہ شاہو افغان لکھتے ہیں۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے "جب وہ دشوار گزار پہاڑوں پر بھاگ گیا تو بادشاہ نے غصہ میں اپنے اہلکاروں کو لکھا کہ جہاں کہیں کوئی پٹھان ہو پکڑ لیا جائے۔ یہی قاضی جلال الدین کی بغاوت کا سبب ہوا"۔ فرشتہ نے اس بغاوت کا زمانہ وہ لکھا ہے جب بادشاہ ۷۴۲ھ میں دکن سے واپس آتا ہوا گجرات میں بیمار ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "بادشاہ یہ خبر سن کر پٹن سے پالکی میں سوار ہو کر بیماری کی حالت میں چلا آیا"۔ ابن بطوطہ اس کو سب بغاوتوں کے آخر میں بیان کرتا ہے۔ غرض شاہو افغان کی یہی وہ بغاوت ہے جس کی وجہ سے گجرات اور دکن کے امیران صدی جو عموماً افغان تھے باغی اور منحرف ہو گئے اور اس کا سلسلہ دکن میں حسن کانگوئی کی بہمنی سلطنت کے قیام پر جا کر ختم ہوا۔ بداؤنی ۷۲۹ھ سے پہلے اس بغاوت کا ذکر کر رہا ہے لیکن دوسری تاریخوں سے یہی قیاس ہوتا ہے کہ یہ بغاوت ۷۴۲ھ کی ہے جبکہ جمادی الثانی ۷۴۲ھ میں بادشاہ سندھ گیا تھا۔

[۲] لاہور۔ قدیم زمانہ میں یہ راجپوت فرمانرواؤں کی راجدھانی تھا۔ مسلمان چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یہاں آئے جبکہ سلطان محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں اس کی اولاد میں سے خسرو شاہ نے پنجاب پر قبضہ کر کے لاہور کو اپنا دارالسلطنت

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اندری سے بدایوں تک بہت سے قلعے فتح کر لیے اور اس علاقہ میں بڑی لوٹ مار مچائی لیکن جب ان کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر بڑھا تو سب چھوڑ چھاڑ اُلٹے پاؤں بھاگ گئے۔ بادشاہ نے کلانور تک ان مغلوں کا پیچھا کیا اور وہاں کا قلعہ ڈھانے کے لیے مجید الدین بورجا کو متعین کر کے دہلی واپس آ گیا۔

سلطان کی سخت گیری

سلطان کو دوآبہ کے درمیانی علاقہ کی رعایا سے بھی سرکشی اور بغاوت کی سخت شکایات تھیں۔ اس لیے اُس نے اُن پر بھاری خراج لگا دیا۔ اس علاقہ کی غریب رعایا پر عمال نے بھی طرح طرح کے ظلم توڑنے شروع کر دیے۔ اُن کے مظالم سے تنگ آ کر لوگ وہاں سے بھاگ گئے جس سے سارا علاقہ اُجڑ گیا۔ جو لوگ باقی رہ گئے اُنھوں نے قزاقی اور لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنا لیا۔

دہلی کی خانہ ویرانی

بادشاہ نے دوسرا سخت حکم دہلی والوں کو یہ دیا کہ جو بھی لوگ شہر میں دولت آباد جانے سے رہ گئے ہیں وہ سب کے سب اور دہلی کے گرد و نواح کی ساری رعیت بھی دولت آباد منتقل ہو جائے۔ بادشاہ نے سارے مکانات خرید لیے شاہی خزانہ سے اُن کی قیمت لوگوں کو ادا کی اس طرح دولت آباد تو خوب آباد ہو گیا لیکن دہلی۵ ایسی اُجڑی کہ وہاں کتّوں اور بلّیوں کے سوا کوئی نہ رہا۔

تانبہ کا سکّہ

سلطان کی ان انوکھی تدبیروں سے خزانہ بالکل ہی خالی ہو گیا۔ تلافی کے لیے اس نے تانبے کے سکّے کو رواج دیا اور اس کی قیمت چاندی کے سکّے کے برابر رکھی۔ جو اس شرح پر لینے میں تامّل کرتا تھا اُسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ اس کارروائی سے بھی ملک میں بڑی خرابی اور انتشار پھیلا۔ مفلس اور شرپسند لوگوں نے اپنے اپنے

(بقیہ حاشیہ سلسلہ لاہور صفحہ گزشتہ) بنایا۔ اس کے بیٹے خسرو ملک تک غزنوی خاندان کی حکومت رہی۔ سندھ کے بعد یہ پہلا شہر ہے جہاں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ غوریوں کے عہد میں دہلی کے دار الخلافہ ہو جانے سے لاہور کی رونق ماند پڑ گئی۔ لاہور کی موجودہ آبادی کا آغاز اکبر سے ہوتا ہے جس نے دسویں صدی ہجری میں پختہ فصیل اور ایک خوب صورت قلعہ بنا کر اسے صوبہ پنجاب کا مرکز بنایا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانہ میں بھی یہاں عالیشان عمارتیں بنائی گئیں۔ مغلوں کے ضعف کے بعد یہاں سکھوں نے قبضہ کر لیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ مشہور عمارتوں میں مسجد وزیر خاں (۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۴ء بہ عہد شاہ جہاں) سنہری مسجد (۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء بہ عہد محمد شاہ) حضوری باغ بادشاہی مسجد (۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۳ء بہ عہد عالمگیر) قلعہ (بہ عہد اکبر شاہ) شالامار باغ (۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء بہ عہد شاہ جہاں) مقبرہ جہانگیر (۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء بہ عہد شاہ جہاں) تاریخی اور قابل دید مقامات ہیں۔

۵؎ دہلی کی بربادی۔ یہ حکم ۷۲۹ھ میں دیا گیا اس سے پہلے ۷۲۷ھ میں جو منتقلی عمل میں آئی تھی اس میں زبردستی نہیں کی گئی لیکن اس مرتبہ جبراً اور حکماً لوگوں کو دہلی سے نکالا گیا۔ فرشتہ نے بھی یہی واقعات لکھے ہیں۔ ضیاء برنی نے دہلی چھوڑنے کا یہی سبب لکھا ہے کہ بادشاہ نے دولت آباد کو اپنی سلطنت کا وسط سمجھ کر اسے دار الخلافہ بنانا چاہا تھا لیکن ابن بطوطہ نے جو اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد دہلی پہنچا تھا اس نے کچھ اور سبب بتایا ہے "لوگ (جو بادشاہ کی خوں ریزی اور قتل سے نالاں تھے) رقعے لکھ لکھ کر اُن پر مہر لگاتے تھے اور لفافہ پر لکھتے تھے کہ بادشاہ کے سر کی قسم ہے کہ سوائے بادشاہ کے کوئی اور نہ کھولے اور یہ رقعے رات کو دیوان خانہ میں ڈال جایا کرتے تھے۔ جب بادشاہ ان کو کھولتا تھا تو اس کے نام گالیاں درج ہوتی تھیں، اس لیے بادشاہ نے دہلی کے اُجاڑنے کا ارادہ کیا۔" آگے کہتا ہے: "ایک معتبر راوی نے مجھ سے ذکر کیا کہ بادشاہ ایک رات اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور شہر کی طرف دیکھا تو اس کو آگ، دھواں یا چراغ کچھ نظر نہ آیا۔ بادشاہ نے کہا اب میرا دل ٹھنڈا ہوا۔" یہ سبب کسی اور مورخ نے نہیں لکھا ہے ممکن ہے کچھ یہ بھی وجہ ہو لیکن اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوب اور شمال دونوں کے وسط میں مرکزی مقام کو مستقر بنانا چاہتا تھا تاکہ شمال کے حملہ آوروں سے دار السلطنت محفوظ رہے مگر یہ اس کی فاش غلطی تھی۔

گھروں میں ٹکسالیں بنالیں۔ وہ تانبے پر سکہ لگا کر بازار سے سونا چاندی گھوڑے ہتھیار اور ہر طرح کا عمدہ سامان خرید لیتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان لوگوں نے کافی دولت پیدا کرلی۔ غیر ملک کے پردیسی چونکہ تانبے کے سکے کو کسی صورت میں بھی قبول نہیں کرتے تھے اس لیے بہت سے کاروبار مندے ہوگئے۔ جب یہ تشویشناک صورت حال پیدا ہوئی تو سلطان نے حکم دیا: "جس کے پاس تانبے کا سکہ ہو خزانہ میں داخل کردے اور اس کے عوض چاندی کے سکے لے جائے"۔ اس حکم کے ہوتے ہی لوگوں نے منوں تانبہ خزانہ میں داخل کردیا اور ڈھیروں چاندی معاوضہ میں حاصل کرلی۔ اس بہانہ سے لوگوں کے ہاتھ کافی دولت آگئی اور بادشاہی خزانہ تانبے سے اٹ گیا۔[1]

کوہ ہمالیہ کی مہم

۷۳۸ھ میں سلطان نے کوہ ہماچل[2] کی تسخیر کے لیے اسّی ہزار سواروں کی ایک فوج کو روانہ کیا۔ کوہ ہماچل چین اور ہندوستان کے درمیان حائل ہے۔ اسے کوہ قراچل بھی کہتے ہیں۔ اس فوج کو حکم تھا کہ فاصلہ فاصلہ سے رسد کے بندوبست کے لیے کچھ آدمیوں کو چھوڑتے جائیں۔ اس پہاڑ کی ایک عجیب خصوصیت ہے کہ وہاں آدمیوں

---

[1] مبارک شاہی کا مصنف کہتا ہے مبارک شاہ کے وقت تک تغلق آباد میں تانبے کے وہ ڈھیر اینٹ پتھر کی طرح بیکار پڑے تھے۔

[2] ہماچل۔ قراچل۔ بقول فرشتہ قراچیل، یہ سب کوہ ہمالیہ کے نام ہیں۔ ابن بطوطہ نے کوہ قراچیل کی لمبائی "تین ماہ کا راستہ" لکھی ہے۔ بیس میل فی روز کے حساب سے یہ طول ۱۸ سو میل کا ہوتا ہے جو غلط نہیں۔ فرشتہ، بداؤنی، برنی اور دوسرے مورخوں نے اس مہم کا ذکر کیا لیکن کسی نے وہ مقام نہیں بتایا جہاں سے لشکر ہمالیہ میں داخل ہوا۔ ہمالیہ سے ہو کر چین جانے کی یہ مسلمانوں کی دوسری کوشش تھی۔ اس سے پہلے ۶۰۳ھ میں محمد بختیار خلجی نے آسام کے راستہ سے چین جانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت ۷۳۷ھ میں چونکہ سلطان فخرالدین بنگالہ میں خودسر ہوگیا تھا اس لیے آسام کے راستہ اس مہم کو جانا ممکن نہ تھا۔ ابن بطوطہ نے لشکر کے داخلہ کے دو مقاموں کا ذکر کیا ہے "جدید" اور "وارنگل"۔ وارنگل کا اس علاقہ میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ دکن کے ورنگل سے جس کا قلعہ بھی پہاڑ پر تھا۔ ابن بطوطہ کو غلط مبحث ہوگیا ہوگا۔ البتہ آئین اکبری میں جدید یا جڑیہ نام کا ایک محال سرکار کماؤں میں درج ہے۔ ابن بطوطہ نے دہلی سے اس پہاڑ کا فاصلہ دس منزل بتایا ہے۔ اس لیے قیاس یہ ہے کہ شاہی لشکر ترائی کماؤں اور گڑھوال کے راستہ داخل ہوا تھا۔ گڑھوال اور کماؤں سے درۂ نیتی اور درہ مانا دو دروں سے چین کا راستہ ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: "اس راجہ کا علاقہ پہاڑ کے نیچے بھی تھا" یہ بیان بھی کماؤں پر صادق آتا ہے۔ ہنٹر کماؤں کے متعلق لکھتا ہے: "یہ علاقہ شاہان دہلی کے ماتحت کبھی پوری طرح نہیں آیا لیکن راجہ کا علاقہ چونکہ میدان میں بھی تھا اس لیے اس کو دہلی کی اطاعت کرنی پڑتی تھی"۔ ایک اور شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ سے محمد تغلق کا لشکر گھسا ہوگا۔ علی محمد خاں روہیلوں کے سردار نے ۱۷۴۴ء میں کماؤں پر حملہ کیا۔ راجہ مقابلہ نہ کرسکا۔ روہیلوں نے المورہ لے لیا اور وہ سات ماہ تک پہاڑ میں رہے لیکن موسم کی تاب نہ لاکر تین لاکھ روپیہ نقد لے کر واپس چلے آئے۔ نواب علی محمد خاں نے ۱۷۴۵ء میں دوبارہ لشکر کشی کی، اس مرتبہ بارا کھیتری میں پہاڑ کے اندر جاتے ہی ان کو شکست ہوگئی۔ یہی حال محمد تغلق کے لشکر کا بھی ہوا۔ بداؤنی نے میر لشکر کا کوئی نام نہیں لیا۔ فرشتہ اس امیر کا نام خسرو ملک لکھتا ہے۔ ابن بطوطہ نے ملک نکبہ اور دوسری جگہ ملک بغرا لکھا ہے۔ لشکر کی تعداد بداؤنی نے اسّی ہزار، فرشتہ نے ایک لاکھ لکھی ہے۔ ۷۳۸ھ میں یہ لشکر تباہ ہوا۔ اس کے بعد ہی سارے علاقے خودسر ہوگئے اور معبر دکن گجرات کے فساد شروع ہوگئے جو تیرہ سال تک جاری رہے اور دہلی کی مرکزیت میں ضعف آگیا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: "فقط تین آدمی بچ کر آئے۔ ایک امیر نکبہ، دوسرا بدرالدین دولت شاہ تیسرے کا نام مجھے یاد نہیں رہا"۔

اور گھوڑوں کے شوروغل سے بادل گھر آتے ہیں اور شدت کی بارش ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ جب یہ فوج پہاڑ پر چڑھنے لگی تو برف باری اور بارش بکثرت ہونے لگی اور رسد کا سلسلہ بالکل ہی موقوف ہو گیا۔ کھانے کو نہ ملا تو جو راہ دار راستہ میں متعین کیے گئے تھے وہ کھسک گئے اور ساری فوج نہایت پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ پہاڑی قوموں نے موقع پاکر حملہ کر دیا۔ اور شکست دے کر اس فوج کو بھگا دیا۔ فوج بھاگ کر بھی پناہ حاصل نہ کر سکی۔ پہاڑیوں کے تیر یوں معلوم ہوتے تھے جیسے زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ پھر چٹانوں پر سے جو پتھروں کی مار پڑتی تھی، بس پناہ بخدا۔ ان مصیبتوں سے شاہی لشکر کے ہزاروں آدمی مارے گئے اور ہزاروں پہاڑیوں کی قید میں چلے گئے۔ جو بچے، مدتوں ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہے۔ کچھ لوگ جو مصیبتیں اٹھاتے آفتیں جھیلتے وطن پہنچے تو بادشاہ نے بھاگ آنے کے جرم میں ان کو قتل کرا دیا۔ ایسی منظم اور آراستہ فوج پھر بادشاہ کو نصیب نہ ہوئی اور وہ سارا روپیہ جو اس مہم میں لگا تھا خاک میں مل گیا۔

بنگال کی شورش

۷۳۹ھ میں بہرام خاں حاکم سنار گاؤں کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال ملک فخر الدین سلاحدار نے بغاوت اختیار کی اور اپنے آپ کو بادشاہ کہنے لگا۔ لکھنوتی کے حاکم قدر خاں نے ملک حسام الدین ابورجا اور عز الدین یحییٰ اعظم الملک کو اپنا حامی بنا کر فخر الدین کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے کر اس کا جمع کیا ہوا سارا خزانہ اور مال و اسباب چھین لیا۔ قدر خاں نے بہت سا خزانہ اور طرح طرح کے نفیس تحفے بادشاہ کی پیشکش کے لیے اپنے گھر میں ذخیرہ کیے۔ حسام الدین نے اس طرح علانیہ مال اور روپیہ جمع کرنے سے منع کیا اور اسے سمجھایا کہ مال کے لالچ میں لوگ دشمن بن جاتے ہیں اور طرح طرح کے فتنے پیدا کر دیتے ہیں، لیکن قدر خاں نے اس عاقلانہ مشورہ کو قبول نہ کیا۔ آخر حسام الدین کا کہنا ہی آگے آیا۔ ملک فخر الدین دوبارہ تیاری کر کے مقابلہ پر آ گیا اور اس نے قدر خاں کے آدمیوں کو اندر ہی اندر اپنے ساتھ ملا لیا، چنانچہ قدر خاں کو اسی کے آدمیوں نے مار ڈالا اور وہ سارا مال اور روپیہ فخر الدین کو مل گیا۔

سنار گاؤں کی حکومت بھی مفت ہاتھ آ گئی۔ اس نے اپنے غلام مخلص نامی کو لکھنوتی کی طرف روانہ کیا لیکن قدر خاں[1] کی فوج کے سردار علی مبارک نے مخلص کو قتل کر دیا اور خود مستقل حاکم بن کر بیٹھ گیا۔ پھر بادشاہ کے پاس بھی مصلحت آمیز عرضیاں دہلی روانہ کیں۔

سلطان نے فخر الدین پر حملہ کرنے کے لیے ملک یوسف کو متعین کیا لیکن وہ راستہ ہی میں مر گیا۔ پھر بادشاہ کچھ دوسرے معاملات میں ایسا الجھ گیا کہ اس طرف کوئی توجہ نہ کر سکا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھایا فخر الدین کے علی الرغم علی مبارک نے علانیہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا خطاب سلطان علاؤ الدین رکھ لیا۔[2]

---

[1] غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں اس کا بڑا بیٹا ناصر الدین محمود بغرا بنگال پر مستقل حکمران تھا۔ محمد تغلق کے وقت اس کا پوتا غیاث الدین بھنورا قید میں تھا۔ بادشاہ نے اسے رہائی دی اور بنگال پر اپنے بھتیجے ابراہیم خاں کی شرکت میں بادشاہت کرنے کے لیے رخصت کیا۔ پھر اس سے ناراض ہو کر دلجلی تاتاری (تاتار خاں) کو اس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اسے شکست ہوئی اور اس کی کھال کھنچوا کر بھوسہ بھروا دیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے تاتار خاں کو سنار گاؤں میں اور ملک بیدار خلجی یعنی قدر خاں کو لکھنوتی کا حاکم مقرر کیا (بحوالہ ابن بطوطہ) ابو الفضل لکھتا ہے کہ سلطان تغلق کی طرف سے قدر خاں بنگالہ میں متعین تھا۔ ملک فخر الدین نے اسے شکست دی اور ملک فخر الدین کو

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

بنگالہ کا پہلا سلطان کچھ دن بعد ہی ملک الیاس حاجی نے جس کی جمعیت کافی بڑی تھی، لکھنوتی کے بعض امیروں سے ساز باز کر کے علاؤ الدین کو قتل کر دیا اور اپنا خطاب شمس الدین رکھ کر

(بقیہ حاشیہ بنگال کی بغاوت صفحہ گزشتہ) قدر خاں کے سردار علی مبارک نے اُرکہ سلطان علاؤ الدین کے نام سے اپنی بادشاہت قائم کی۔ اسے حاجی الیاس امیر بنگالہ نے قتل کر کے شمس الدین کے نام سے اپنی شاہی قائم کی۔" نظام الدین احمد بخشی نے فخر الدین کی مدت حکومت دو سال چند ماہ اور سن وفات ۷۴۱ھ لکھا ہے۔ فرشتہ نے اسے قدر خاں کا سلاح دار بتایا ہے اور فخر الدین کے اعلان شاہی کا ۷۳۹ھ لکھا ہے۔ بداؤنی لکھتا ہے: سلطان محمد تغلق نے فوج کشی کر کے فخر الدین کو گرفتار و قتل کیا لیکن فرشتہ کا بیان ہے کہ "سلطان شمس الدین در ۷۴۱ھ لشکر بہ سنار گاؤں کشید و فخر الدین را زندہ گرفتہ بہ لکھنوتی آورد و بہ حلق کشیدہ خطبہ و سکہ را بنام خود گردانید۔ تا سیزدہ سال و چند ماہ احدے از بادشاہان دہلی معترض او نہ شدہ در کمال استقلال بادشاہی می کرد تا آنکہ شوال ۷۵۴ھ فیروز شاہ بالشکر گراں از دہلی متوجہ لکھنوتی گردید و جنگ کردہ بہ سبب برشگال واپس شد در ۷۵۵ھ شمس الدین پیشکش لائق فرستادہ صلح نمود سلطان شمس الدین در ۷۵۹ھ فوت شدہ" فرشتہ، بداؤنی احمد نظام اور ابوالفضل کا یقین کیا جائے تو عجیب اُلجھن ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے فخر الدین کو ۷۴۱ھ میں، کوئی کہتا ہے سلطان شمس الدین نے، کوئی کہتا ہے علی شاہ نے، کوئی کہتا ہے سلطان محمد تغلق نے مار ڈالا۔ ان سب کے برخلاف ابن بطوطہ جو ۷۴۶ھ کے شروع میں بنگال پہنچا تھا کہتا ہے: "بنگالہ کا بادشاہ فخر الدین ہے۔" اسے وہ ناصر الدین بن بلبن کا ملازم بتاتا ہے۔ شاہان بنگال کی ترتیب ابن بطوطہ کے قول کے مطابق یہ ہے:

(۱) سلطان ناصر الدین بلبن (۲) اس کا بیٹا شمس الدین (۳) اس کا بیٹا شہاب الدین (۴) غیاث الدین بہادر بھنورا (۵) اس کے بعد اس کا داماد بادشاہ ہوا اسے لشکر نے قتل کر دیا (۶) اس کے بعد علی شاہ لکھنوتی میں بادشاہ بن گیا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے "جب فخر الدین نے دیکھا کہ اس کے آقا ناصر الدین کے خاندان سے بادشاہت نکلی جا رہی ہے تو اس نے سدکاؤں میں بغاوت کی۔"

مسٹر طامس نے شاہان بنگال کے جن سکوں کا ذکر کیا ہے ان میں سلطان فخر الدین کے سکے ۷۵۰ھ تک ملتے ہیں، جن کی ترتیب اس طرح ہے:

"سلطان فخر الدین۔ دار الضرب سنار گاؤں۔ وزن ۱۶۶ گرین"

۷۳۷ھ، ۷۴۱ھ، ۷۴۳ھ، ۷۴۴ھ، ۷۴۵ھ، ۷۴۶ھ، ۷۴۷ھ، ۷۴۸ھ، ۷۴۹ھ، ۷۵۰ھ

نمونہ رُخ اول: "السلطان الاعظم فخر الدنیا والدین ابو المظفر مبارک شاہ سلطان"

رخ دوم: "یمین خلیفۃ اللہ ناصر امیر المومنین"

سکّہ کے حاشیہ پر سن ضرب درج ہے۔

ان سکّوں کی وجہ سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ابن بطوطہ کا بیان صحیح ہے اور ہمارے مورخوں نے شاہان بنگال کے تذکرہ میں غلطی کی ہے۔ ان مورخوں میں سے کسی کے بیان کے مطابق فخر الدین نے قدر خاں کو، کوئی کہتا ہے تاتار خاں کو، مار ڈالا۔ حالانکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ وہ غالباً تاتار خاں کا شمشیر بردار تھا۔ جب تاتار خاں مر گیا تو اس نے موقع پا کر ۷۳۹ھ میں نہیں (جیسا کہ ہمارے مورخوں کا بیان ہے) بلکہ ۷۳۶ھ میں مشرقی بنگال کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ کیونکہ مذکورہ بالا سکوں کی جدول میں اس کا پہلا سکہ ۷۳۷ھ میں ملتا ہے۔ اس کے آگے فرشتہ کا یہ کہنا البتہ درست ہے کہ "فخر الدین کی بغاوت کی خبر سن کر بادشاہ نے قدر خاں حاکم لکھنوتی کو لکھا اور اس کی مدد کے لیے حسام الدین اور ابوالرجاء وغیرہ کو نامزد کیا۔ انھوں نے فخر الدین کو شکست دی اور جنگل میں بھگا دیا۔" معلوم ہوتا ہے یہ لڑائی کئی سال تک جاری رہی کیونکہ ۷۳۷ھ کے بعد تین سال تک اس کے نام کا کوئی سکہ نہیں ملتا۔ بعد میں جیسا کہ بداؤنی نے لکھا ہے: اس نے قدر خاں کے آدمیوں سے سازش کی اور اُس کو اسی کے آدمیوں نے قتل کر دیا اور خزانہ وغیرہ لے کر فخر الدین کے پاس چلے گئے۔ وہ سنار گاؤں میں مستقل بادشاہ بن گیا۔ بداؤنی نے اس کے خود مختار ہونے کا ذکر ۷۳۹ھ میں کیا ہے لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر وہ

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تخت پر بیٹھ گیا۔

۷۴۱ھ میں سلطان نے سنار گاؤں کی تسخیر کا ارادہ کیا اور فوج کشی کر کے فخر الدین کو گرفتار کر لیا۔ اسے لکھنوتی لا کر قتل کر دیا۔ شمس الدین اس طرح لکھنوتی کا مستقل حاکم بنا رہا۔ اس کی اولاد میں مدت تک سلطنت قائم رہی۔

(بقیہ حاشیہ بنگال کی بغاوت صفحہ گزشتہ) ۷۳۹ھ میں خود مختار بادشاہ بن گیا تھا تو پھر اس سن کا یا ۷۴۰ھ کا سکہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ واقعہ لازماً ۷۴۱ھ میں پیش آیا ہوگا کیونکہ اس کے بعد سے ۷۵۰ھ تک برابر اس کے سکے ملتے ہیں۔ بداؤنی سے فخر الدین کی گرفتاری اور قتل کے بارے میں غلطی ہوئی ہے، وہ کہتا ہے ۷۴۱ھ میں بادشاہ نے فخر الدین پر فوج کشی کی اور اسے گرفتار کر کے لکھنوتی لا کر قتل کر دیا۔ حالانکہ اس کے سکے برابر ۷۵۰ھ تک دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ بطوطہ ۷۴۶ھ میں بنگال گیا ہے، اس وقت مغربی بنگال یعنی لکھنوتی میں سلطان شمس الدین (ملک الیاس) حکمران تھا اور مشرقی بنگال یعنی سنار گاؤں میں فخر الدین بادشاہ بنا ہوا تھا۔ ۷۴۶ھ کے بعد ابن بطوطہ یہاں سے چلا گیا اور "سکے" شہادت دیتے ہیں کہ ۷۵۰ھ تک فخر الدین زندہ اور برسر اقتدار تھا۔ اصل میں ہمارے اکثر مورخوں نے مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے دو خود مختار حکمرانوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا اور ان دونوں کے بیان کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اصل میں لکھنوتی یعنی مغربی بنگال میں علی شاہ اور سنار گاؤں یعنی مشرقی بنگال میں فخر الدین نے علیحدہ علیحدہ بادشاہت قائم کر رکھی تھی۔ علی شاہ کا پہلا "سکہ" ۷۴۲ھ کا ہے۔ بداؤنی کا یہ کہنا درست ہے کہ "فخر الدین کے علی الرغم علی مبارک نے سلطان علاؤ الدین خطاب رکھ کر بادشاہت کا اعلان کر دیا" بداؤنی نے آگے لکھا ہے۔ "ملک الیاس حاجی نے لکھنوتی کے بعض امیروں سے ساز باز کر کے علی شاہ (علاؤ الدین) کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا" لیکن وہ یہ ساری باتیں ۷۴۱ھ سے پہلے کی بیان کرتا ہے حالانکہ علی شاہ کے سکہ "مضروبہ ۷۴۲ھ" سے معلوم ہوتا ہے وہ ۷۴۲ھ میں بھی زندہ تھا۔ حاجی الیاس کے نام کا بھی ایک "سکہ" ۷۴۰ھ کا ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے علی شاہ اور حاجی الیاس میں عرصہ تک کشمکش رہی ہے اور ۷۴۰ھ میں حاجی الیاس بھی مستقل بادشاہ بن چکا ہے اور اپنا "سکہ" ضرب کرا چکا ہے، پھر اسے علی شاہ نے تخت سے ہٹا دیا اور علاؤ الدین کے نام سے بادشاہ بن گیا۔ پھر حاجی الیاس نے بداؤنی کے بیان کے مطابق علی شاہ کو سازش سے قتل کر کے دوبارہ تخت حاصل کر لیا اور شمس الدین کے نام سے خود بادشاہ بن گیا لیکن یہ واقعہ یقیناً ۷۴۲ھ کے بعد میں پیش آیا اس سے پہلے نہیں۔ ۷۵۰ھ کے بعد فخر الدین کے "سکے" نہیں ملتے، اس کے بعد کوئی شخص اختیار الدین غازی دو سال تک بادشاہ رہا، اس کے سکہ پر "سلطان ابن سلطان" ثبت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے غالباً وہ فخر الدین کا ہی بیٹا تھا لیکن ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔ "اس کا ایک ہی لڑکا تھا جسے شیدا نے مار ڈالا تھا"۔ معلوم ہوتا ہے بطوطہ کے جانے کے بعد فخر الدین کو کوئی لڑکا ہوا اور امراء نے فخر الدین کے بعد اسے کم عمری میں تخت پر بٹھا دیا۔ شمس الدین (لکھنوتی) فخر الدین (سنار گاؤں) کے درمیان لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اس کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن کوئی کسی پر غالب نہیں آسکا۔ بعد میں ۷۵۴ھ میں کہیں جا کر سلطان شمس الدین کے "سکے" سنار گاؤں کی ضرب کے ملتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان شمس الدین نے فخر الدین کے کم عمر جانشین پر فوج کشی کر کے ۷۵۴ھ کے لگ بھگ سنار گاؤں یعنی مشرقی بنگالہ کو فتح کر لیا تھا اور تمام بنگال کا مستقل بادشاہ بن گیا تھا۔ فیروز شاہ نے بھی اس کے قدم مضبوط دیکھ کر اس سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ۷۵۵ھ میں نذرانہ لے کر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ سلطان شمس الدین بنگال کا پہلا مستقل بادشاہ ہے اس کی وفات ۷۵۹ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کی اولاد بنگال میں کئی پشت تک حکمران رہی۔ اس سارے بیان میں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ سلطان ناصر الدین بلبن کے عہد سے لے کر بنگال کے پہلے سلطان شمس الدین بھنگرہ تک بنگال کی تاریخ ہمارے مورخوں کے پاس نہایت خلط ملط اور الجھی ہوئی ہے۔ اس کی صحت ابن بطوطہ کے سفر نامے اور مسٹر طامس کے دریافت کردہ سکوں سے ہو سکتی ہے۔

دکن کی بغاوت

سلطان کی آئے دن کی سختیوں اور خوں ریزیوں سے تنگ آکر معبر[۵۱] میں ملک ابراہیم خریطہ دار شاہی کے باپ سید حسن کیتھلی نے جو حسن کانگو[۵۲] کے نام سے مشہور تھا سرکشی اور بغاوت کی۔

---

۵۱ معبر۔ عربی میں گھاٹ کو کہتے ہیں۔ عرب دکن کے مشرقی ساحل کو معبر اور مغربی ساحل کو ملی بار کہتے تھے۔ بعض مورخوں نے معبر اور ملیبار میں تمیز نہیں کی اور ان کو خلط ملط کر دیا۔ تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں عرب اور ایرانی ہندوستان کے صرف اسی ساحل کو جسے ہم کارو منڈل اور کرناٹک کہتے ہیں معبر کہا کرتے تھے۔ ادریسی کے جغرافیہ میں معبر کا نام نہیں ہے۔ بارھویں صدی سے پہلے اس لفظ کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس کے بعد ابوالفداء نے لکھا ہے: "راس کماری پر مالابار ختم ہو جاتا ہے اور معبر شروع ہو جاتا ہے اور نیلور تک اس کی حد ہے۔" وصاف نے بھی یہی لکھا ہے کہ "معبر کا ملک کولم سے نیلور تک ہے اس کا طول تین سو فرسنگ ہے۔" وصاف نے معبر کو "ہندوستان کی کنجی" کہا ہے اور اس کے راجہ کا نام سندر پانڈے اور وزیر کا تقی الدین عبدالرحمٰن لکھا ہے۔ اس راجہ کی وفات ۱۲۹۳ء میں ہوئی اس کا دارالخلافہ مدُرا تھا جسے شہر پانڈی بھی کہتے ہیں جو بگڑ کر فارسی تاریخوں میں مانڈی اور منڈی ہو گیا۔ مانڈی راجاؤں کا خاندان اس ملک پر کئی ہزار سال حکمران رہا ہے۔ یونانی مورخ مے غاس تھی نیس (۲۵۰ ق۔م) نے بھی اس خاندان کا ذکر کیا ہے۔ ۱۳۱۱ء سے ۱۳۵۸ء تک مسٹر نلسن نے آٹھ صوبہ داروں کا نام لیا ہے۔ جو بادشاہ دہلی کی طرف سے اس علاقہ پر حاکم رہے ان میں پہلا تو ملک نائب کافور اور آخری فندق ملک کا نام ہے لیکن یہ فہرست معتبر نہیں اس میں اکثر نام فرضی اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں، صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ ۱۳۱۱ء سے ۱۳۳۸ء تک جب کہ محمد تغلق کے عہد میں جلال الدین احسن شاہ نے بغاوت کی جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے کیا ہے۔ شاہان دہلی کی طرف سے کون کون صوبہ دار رہا۔ ابن بطوطہ نے معبر کے حاکموں کے جو نام دیے ہیں ان میں سے صرف دو نام علاؤالدین اور قطب الدین نلسن کی فہرست سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ابن بطوطہ کہتا ہے: "قطب الدین، علاؤالدین کا داماد تھا اور وہ جلال الدین احسن شاہ کے بعد تیسرا بادشاہ تھا۔" ۱۳۳۸ء سے پہلے سید جلال الدین احسن شاہ صوبہ دار تھا پھر خود مختار ہو کر وہ ۱۳۴۵ء تک بادشاہ رہا۔ اس کے بعد ۱۳۴۵ء میں اس کا داماد قطب الدین بادشاہ ہوا لیکن صرف چالیس دن اس کے بعد اسی سن میں غیاث الدین دامغانی اس کے بعد ناصرالدین بادشاہ بنا۔ ان بادشاہوں کا شاہان دہلی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ان کے اور بہمنی بادشاہوں کے درمیان بیجانگر کی ہندو مملکت حائل تھی۔ اس لیے ان کو شمال سے کوئی مدد مل نہ سکی اور بیجانگر کے ہندو راجاؤں نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان مسلمان بادشاہوں کی حکومت ختم کر دی۔ ہمارے کسی مورخ نے معبر کے ان سلاطین کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر ابن بطوطہ نہ لکھتا تو ان کا ہماری تاریخ میں نشان تک نہ ملتا۔ واضح رہے معبر کو سب سے پہلے فتح کرنے والا علاؤالدین خلجی کا سپہ سالار ملک کافور تھا جس نے اس وقت کے راجہ ویرا پانڈی کو شکست دے کر اسے فتح کر لیا تھا۔ بداؤنی نے یہاں جو معبر کا نام لیا ہے اس سے اس کی مراد دکن سے ہے خاص اس علاقہ سے نہیں جس کا ہم نے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ کیونکہ حسن کانگو نے معبر میں نہیں بلکہ بالائی دکن دولت آباد، گلبرگہ اور بیدر کے علاقہ میں بغاوت کی تھی۔

۵۲ حسن کانگو۔ بداؤنی کو معبر اور دکن کی طرح حسن کانگو کی شخصیت کے بارے میں بھی سخت مغالطہ ہوا ہے اس کی پیروی دوسرے مورخوں نے بھی کی ہے۔ بداؤنی سید جلال الدین احسن شاہ کو حسن کانگو لکھ رہا ہے اگرچہ وہ سید جلال الدین کا نام "سید حسن کیتھلی" لکھتا ہے۔ بلا شبہ سید جلال الدین احسن جس نے معبر میں بغاوت کی تھی اور جس کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے کیتھل کا رہنے والا تھا لیکن حسن کانگو دہلی کا تھا اور قوم کا سید نہیں تھا۔ بداؤنی دونوں بغاوتوں، دونوں ملکوں اور دونوں شخصوں میں فرق نہیں کر سکا۔ دکن کو معبر لکھ دیا۔ "سید" اور "کیتھلی" کے درمیان حسن کے بجائے "حسین" لگا کر دونوں کے نام کو الجھا دیا۔ غنیمت ہے کہ اس نے یہ لکھ دیا "وہ حسن کانگو کے نام سے مشہور تھا۔" بداؤنی نے لکھا ہے: "آخر کار سلطنت دکن بروقرار یافتہ مخاطب بعلاؤالدین بہمنی شاہ گشت۔" یہ جملہ حسن کانگو کے لیے بالکل صحیح ہے لیکن سید حسن کیتھلی یعنی سید جلال الدین احسن شاہ کے متعلق صحیح نہیں کیونکہ حسن کانگو نے تلنگانہ میں بہمنی سلطنت قائم کی تھی اور سید جلال نے معبر یعنی کرناٹک میں علیحدہ بادشاہت۔ اس کے علاوہ سید جلال الدین کی بغاوت فرشتہ کی تحریر کے مطابق ۷۴۲ھ میں اور حسن کانگو کی بغاوت ۷۴۸ھ میں ہوئی۔ بداؤنی نے سید جلال الدین کی بغاوت کا سن (۷۴۲ھ) بھی حسن کانگو سے جوڑ دیا ہے حالانکہ آگے جا کر وہ خود ۷۴۸ھ کے واقعات میں حسن کانگو کی بغاوت اور اس کے بادشاہ بننے کا ذکر کرتا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ۷۴۷ھ۔۷۴۸ھ کے درمیان امیران صدہ کی بغاوت کے بعد ہی دولت آباد اور تلنگانہ میں بغاوت ہوئی جن کا سرغنہ حسن کانگو تھا۔ فرشتہ اور بداؤنی نے جلال الدین احسن شاہ کی بغاوت کا جو یہ سن ۷۴۲ھ دیا ہے وہ خود بھی اپنی جگہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ابن بطوطہ کے بیان اور معبر کے بادشاہوں کے سن دیکھ کر تو یہی یقین کرنا پڑتا ہے کہ جلال الدین کی معبر میں بغاوت اس سے بہت پہلے ہوئی ہوگی، زیادہ صحت کے ساتھ معبر کی اس بغاوت کا سن ۷۳۷ھ یا ۷۳۸ھ ہی ہو سکتا ہے، اس کے بعد ہرگز نہیں۔ حسن کانگو کے حالات آگے ایک اور حاشیہ کے تحت ہم بیان کریں گے۔

اور اپنا خطاب علاؤ الدین بہمن شاہ رکھ کر مستقل بادشاہت قائم کر لی۔ وہاں جو شاہی لشکر تھا وہ بھی اس کا حامی ہو گیا تھا اس لیے جس نے اس کی مخالفت کی اُس کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلطان لکھنوتی سے دیوگیر پہنچا اور وہاں سے تلنگانہ تک گیا مگر وہاں اچانک بیمار پڑ گیا، مجبوراً اس نے مراجعت کی اور رات دن کوچ کر کے دہلی واپس آ گیا۔ بادشاہ نے قتلغ خاں کو دولت آباد کے بندوبست کے لیے وہاں چھوڑ دیا تھا لیکن معبر کا فتنہ دب نہ سکا۔

کھوکھروں کی بغاوت

۷۴۳ھ میں ملک ہلاجون، گل چند کھوکر[1] اور ملک تتار خرد نے غدر کر کے لاہور کے حاکم کو قتل کر دیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہاں کو اُن کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ باغیوں نے مقابلہ کیا لیکن شاہی لشکر سے بُری طرح شکست کھا کر بھاگ گئے۔

۷۴۴ھ میں بادشاہ نے سنام اور سامانہ سے آگے بڑھ کر کیتھل کے سیّدوں پر حملہ کیا اور سید حسن کیتھلی کے بغض اور جلن میں یہاں کے تمام سیدوں کا قتل عام کرا دیا۔ ان کے علاقہ میں پٹھانوں کو بسا کر اُن کو جاگیریں، خلعتیں اور زری پٹکے عطا کیے۔

دہلی کو واپسی

اسی سال (۷۴۴ھ) میں چونکہ سخت قحط[2] پڑا ہوا تھا، بادشاہ نے حکم دیا کہ جس کا جی چاہے پورب کے

---

[1] کھوکر۔ بدایونی نے "کھوکر" لکھا ہے اور فرشتہ کی تحریر ہے "در ۷۴۳ھ ملک چندر کہ سردار گکھراں بود علم مخالفت بلند ساختہ"۔ بدایونی نے اس قوم کا نام "کھوکر" غلط لکھا ہے کیونکہ "کھوکروں" کی قوم پنجاب میں کبھی اس قدر طاقتور نہیں رہی، لیکن "گکھروں" کا زور سلطان شہاب الدین کے وقت سے اکبر بادشاہ کے عہد تک چار سو سال کے قریب شمالی پنجاب میں برابر رہا کئی صدیوں تک ان کی لوٹ مار کی وجہ سے خراسان کا راستہ ملتان اور دیپال پور کی جانب سے رہا اور لاہور کی جانب سے بند ہو گیا۔ کننگھم صاحب کی تحقیقات کے مطابق یہ قوم ترکی الاصل ہے۔ سکندر کے مورخوں نے لکھا ہے: "سوہاں کا دریا ابھی سار کے ملک سے نکلتا ہے۔" "راج ترنگنی" میں درج ہے "مری اور مارگلہ کے درمیان کا ملک ابھی سار کا ملک تھا۔" چونکہ گکھر اس علاقہ میں سکندر کے زمانہ سے پہلے رہتے تھے اور یونانی مورخوں نے بھی لکھا ہے "ابھی سار کے بھائی کے پاس دو بڑے بڑے سانپ تھے جن کی وہ پرستش کرتا تھا" اس لیے قیاس کیا گیا ہے کہ وہ "دہ اک" قوم سے تھا۔ اب دیکھیے گکھروں میں بھی ایک روایت چلی آتی ہے کہ "ان کو افراسیاب نے کید کی ماتحتی میں ہندوستان کی طرف نکال دیا۔" اس روایت کی تصدیق فرشتہ بھی کرتا ہے۔ وہ سلطان ابراہیم غزنوی کے حال میں لکھتا ہے کہ "اس نے دارا نامی قلعہ پر حملہ کیا۔" "و متوطنان آں جا از نسل خراسانیاں بودند افراسیاب از سرکشی ایشاں تنگ آمدہ با زن و فرزند از ولایت خراسان اخراج کردہ بود بہ ہندوستان فرستادہ مردم آں شہر بالا تمام آں جماعت بودند و با بیگانہ پیوند و وصلت نمی کردند و بعبادت اصنام و فسق بر دوام مشغول بودند و ملوک ہند بہ سبب آنکہ استیلا بر آں جماعت از محالات می دانستند معترض ایشاں نمی شدند۔" دارا سے مراد دارا پور ہے جو دریائے جہلم پر جلال پور کے متصل واقع ہے۔ اب وہاں گکھر نہیں رہتے بلکہ اب یہ جنجوہوں کا مرکز ہے۔ ان حوالوں سے بہر حال یہ معلوم ہوتا ہے گکھر ہندی الاصل نہیں ہیں بلکہ کسی زمانہ میں خراسان یا خوارزم کی طرف سے آئے ہیں۔ یہ رسم اب بھی گکھروں میں ہے کہ وہ اپنی قوم کے باہر رشتہ داری نہیں کرتے۔ حالانکہ راجپوتوں کی مختلف قومیں اس طرح کرتی ہیں۔ بابر نے تزک میں جو تاتار خاں اور گکھلوں کے سردار ہاتھی نامی کا ذکر کیا ہے اس میں پہلا نام مسلمانوں جیسا ہے اور دوسرا اشترک۔ بدایونی نے جو یہ سن ۷۴۳ھ لکھا ہے وہ بھی زیادہ صحیح نہیں کیونکہ گکھروں نے اس وقت بغاوت کی تھی جب کہ سید جلال الدین احسن شاہ کی بغاوت دفع کرنے بادشاہ معبر کی طرف گیا تھا اس لیے ان کی بغاوت بھی ۷۴۲ھ سے پہلے ہی ہوئی ہوگی بعد میں نہیں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں معبر کی بغاوت ۷۳۷ھ یا ۷۳۶ھ میں ہوئی تھی۔

[2] قحط۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے "جب بادشاہ معبر کی طرف گیا تو ہندوستان میں بڑا سخت قحط پڑا اور نرخ یہاں تک مہنگا ہوا کہ ایک من کی قیمت ساٹھ درہم ہو گئی۔ پھر اس سے بھی زیادہ گرانی ہوئی۔" فرشتہ لکھتا ہے "در عہد آں بادشاہ دو مرتبہ امساک باراں شد و در ہر کرت مردم قریب سہ سال اوقات بہ عسرت گزرانیدند۔" فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب بادشاہ سید احسن شاہ حاکم معبر کی بغاوت دفع

(باقی بر صفحہ آئندہ)

ملکوں میں چلا جائے اور جس کا جی چاہے دولت آباد چھوڑ کر دہلی میں جا بسے۔

(بقیہ حاشیہ بسلسلۂ قحط صفحہ گزشتہ) کرنے کے لیے دکن گیا تو وہ چند منزل چلا تھا کہ قحط شروع ہو گیا جب واپس آیا تو تمام ملک کو قحط میں مبتلا پایا۔ فرشتہ نے معبر کی بغاوت کا ذکر ۷۴۲ھ میں کیا ہے۔ اس طرح قحط کا سن ۷۴۲ھ ہوتا ہے۔ بداؤنی قحط کا ذکر ۷۴۴ھ میں کرتا ہے لیکن اس کے لفظ میں "قحط پڑا ہوا تھا" کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں۔ دوسری تاریخوں میں ۷۴۸ھ میں بھی قحط کی حالت کا ذکر ہے جبکہ بادشاہ دولت آباد سے طغی کی بغاوت دبانے کے لیے گجرات گیا ہے۔ ان تمام مورخوں کے حساب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قحط دو مرتبہ پڑا۔ جیسا کہ فرشتہ نے لکھا ہے "دو مرتبہ امساک باراں شد" اول دفعہ ۷۴۲ھ، ۷۴۳ھ اور ۷۴۴ھ میں۔ دوسری دفعہ ۷۴۸ھ میں۔ تاریخ مبارک شاہی میں تحریر ہے: "قحط عام و گرانی غلہ ہفت سالی چناں شد کہ قطرہ از آسمان نبارید" گویا ۷۴۲ھ سے ۷۴۹ھ تک قحط رہا درمیان میں صرف ایک سال ارزانی رہی۔ لیکن برنی مؤلف فیروز شاہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ جب گجرات گیا ہے تو اہلکاروں کو تقاوی کی تقسیم کے لیے کافی رقم دے گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اس وقت قحط ختم ہو چکا تھا۔ تقاوی قحط کے بعد بارش ہونے پر ہی دی گئی ہوگی۔ برنی لکھتا ہے "اگر بادشاہ گجرات کی مہم سے واپس آتا اور ۷۵۲ھ کے ماہ محرم میں ٹھٹھہ میں مر نہ جاتا تو ان لوگوں سے جو تقاوی کی رقم غبن کر گئے تھے خوب اچھی طرح روپیہ وصول کرتا"۔ برنی کے قول کے مطابق قحط بادشاہ کی معبر سے واپسی پر شروع ہوا تھا۔ فرشتہ کی نسبت یہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ہم لکھ آئے ہیں معبر کی بغاوت کا صحیح سن ۷۳۶ھ ہے۔ اس لیے پہلا قحط ۷۴۲ھ سے ۷۴۴ھ نہیں بلکہ ۷۳۶ھ سے ۷۴۲ھ کے درمیان ہونا چاہیے اور دوسرا قحط ۷۴۸ھ میں نہیں بلکہ ۷۴۵ھ، ۷۴۶ھ، ۷۴۷ھ میں ہونا چاہیے۔ برنی بھی لکھتا ہے کہ بادشاہ ۷۴۸ھ میں تقاوی کی رقم دے کر گجرات گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۷۴۸ھ تک قحط ختم ہو چکا تھا۔ پہلے قحط کا ۷۴۲ھ کے بجائے ۷۳۶ھ اور ۷۴۲ھ کے درمیان ہونا یوں بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ سارے لشکر کو لے کر سرگدواری کی چراگاہوں میں چلا گیا تھا۔ ابن بطوطہ کے بیان سے سرگدواری کے قیام کا یہی زمانہ معلوم ہوتا ہے وہ خود بھی اُس وقت وہاں موجود تھا اور وہاں عین الملک کے خلاف جو لڑائی لڑنی پڑی اس میں وہ خود کو شریک بتاتا ہے۔ بداؤنی کے بیان سے سرگدواری میں بادشاہ کے قیام کا زمانہ ۷۴۶ھ اور ۷۴۷ھ معلوم ہوتا ہے جو صحیح نہیں۔ بداؤنی نے شاہی لشکر کے سرگدواری میں جانے کا سبب بھی نہیں لکھا ہے۔ ابن بطوطہ کے بیان سے اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ قحط کی وجہ سے مویشیوں کو چارہ نہیں مل رہا تھا اس لیے بادشاہ سارے لشکر کو سرگدواری میں لے آیا۔ یہاں یہ بات بھی نکل آئی کہ عین الملک کی بغاوت بھی ۷۴۰ھ میں ہوئی نہ کہ ۷۴۷ھ میں، جیسا کہ بداؤنی کا بیان ہے۔ غرض تمام واقعات کی صحیح ترتیب سے قحط کے زمانہ کا جو تعین ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ:

پہلا قحط ۷۳۹ھ میں شروع ہوا اور ۷۴۱ھ تک جب تک کہ بادشاہ سرگدواری کی چراگاہ میں رہا قحط کی حالت رہی۔

دوسرا قحط برنی کے قول کے مطابق ۷۴۵ھ سے شروع ہوا اور ۷۴۷ھ تک رہا، لیکن واقعات کی صحیح ترتیب سے جس کو ہم آگے اور بھی حاشیوں کے ذیل میں واضح کریں گے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کی بغاوت دور کرنے بادشاہ ۷۴۸ھ میں نہیں بلکہ ۷۴۵ھ میں گیا ہے، اس لیے زیادہ صحت کے ساتھ دوسرا قحط گجرات جانے سے پہلے ۷۴۲ھ یا ۷۴۳ھ میں شروع ہوا اور ۷۴۵ھ میں ختم ہو گیا۔

اس قحط کے نرخ کی بابت فرشتہ لکھتا ہے: "ایک سیر غلہ بہ ہفدہ درم یافت نمی شد و در دہلی قحط بمرتبہ بود کہ آدم آدم را می خورد" ابن بطوطہ نے "فی من چھ دینار" نرخ لکھا ہے۔ دوسری جگہ "ایک من غلہ کی قیمت ساٹھ درہم اور اس سے بھی زائد لکھی ہے۔ ابن بطوطہ جب درہم کہتا ہے تو اس کی مراد اُس وقت کے مروجہ "ہشتگانی" سے ہوتی ہے اس طرح وہ ٹنکہ یا تنگہ کے آٹھویں حصہ کو درہم سمجھتا ہے یہی مسالک الابصار کا مصنف بھی لکھتا ہے۔ فرشتہ نے ایک سیر کی قیمت سترہ درہم غلط لکھی ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں ضیاء الدین برنی نے ایک سیر کی قیمت ۱۷ جیتل یا ۱۶ جیتل لکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے برنی سے نقل کرتے ہوئے فرشتہ نے جیتل کے بجائے درہم لکھ دیا۔ اس جیتل کے حساب سے ایک سیر کی قیمت دو درہم ہوتی ہے۔ اس وقت کا سیر ابن بطوطہ کی تحریر کے مطابق "دہلی کا رطل (وہ رطل من کو کہتا ہے) مصر کے ۲۵ رطل کے برابر ہوتا ہے"۔ ابن بطوطہ کے فرانسیسی مترجموں نے اس رطل کے حساب سے من کا وزن ۲۹ ¾ پونڈ نکالا ہے یعنی چودہ سیر پختہ۔ مسالک الابصار کا مصنف لکھتا ہے "دہلی کا سیر ۷۰ مثقال کا ہوتا ہے"۔ اگر مثقال کو ساڑھے چار ماشے کا سمجھیں تو سیر کا وزن ۲۹ تولہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی سال خراسان، عراق اور سمرقند کے لوگ بادشاہ کی بخششوں کا حال سن کر کافی تعداد میں ہندوستان آئے چنانچہ جدھر دیکھو انہی کے قافلے نظر آتے تھے۔

فرمانِ خلافت

اس سال حاجی سعید مصری خلیفہ عباسی کی طرف سے جو مصر میں برائے نام خلیفہ تھا، بادشاہ کے لیے فرمانِ خلافت، نشان، خلعت اور ناصر المومنین کا خطاب لے کر آیا۔ بادشاہ نے اُس دن سارے شہر میں آئینہ بندی کرائی اور شہر کے تمام اکابر و اعیان مشائخ و سادات کو لے کر حاجی سعید کے استقبال کے لیے گیا، پیادہ پا ہو کر حاجی سعید کے پاؤں چُومے اور اُن کے جلو میں پیچھے پیچھے چلا۔ خلیفہ کی اجازت اور فرمان کے آنے تک بادشاہ نے جمعہ اور عیدین کی جماعت موقوف کر رکھی تھی۔ اس دن نہایت خوشی سے جماعت قائم کرنے کی اجازت دی۔ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس خطبہ میں سے پچھلے بادشاہوں کے نام خارج کر دیے، صرف سلطان محمود غزنوی کا نام رہنے دیا۔ حاجی سعید کو بادشاہ نے اتنا زر نقد اور تحائف دیے کہ خزانہ خالی ہو گیا۔ خلیفہ مصر[١] کے لیے ایک نہایت ہی عمدہ موتی کہ اُس جیسا خزانہ

(بقیہ تحت صفحہ گزشتہ) دو ماشے ہوا، اور من کا ١٣ سیر ٨ چھٹانک، اور اگر مثقال ٥ ماشہ کا لیں جیسا کہ بابر نے اپنی تزک میں لکھا ہے تو من کا وزن ١٤ سیر ٩ چھٹانک دو تولہ کا ہوا۔ اب بھی پاکستان و ہند میں کچا من ½١٢ سیر پختہ سے لے کر ١٥ سیر پختہ تک کا ہوتا ہے۔ اکبری سیر ٢٥ تولہ ٢ ماشہ ٢ رتی کا تھا۔ عالمگیری سیر ٧٠ تولہ کا تھا یعنی موجودہ پختہ سیر سے تین تولہ کم۔ غرض محمد شاہ تغلق کے وقت کا من موجودہ پختہ من کے حساب ½١٤ سیر کا سمجھنا چاہیئے۔ اس حساب سے ایک دینار کے عوض غلہ کا نرخ ١ سیر ٧ چھٹانک کے قریب ہوا اور دوسری روایت کے مطابق پونے آٹھ روپیہ کا چودہ سیر آٹھ چھٹانک یعنی کچھ کم دو سیر کا نرخ ہوا۔ برنی اور فرشتہ کی تحریر کے مطابق ایک سیر رائج الوقت کی قیمت ١٦ جیتل یعنی دو درہم یعنی چار آنہ ہوئی۔ اس لیے ایک من کی قیمت دس روپیہ کے قریب ہوئی یعنی ایک روپیہ کے تقریباً ڈیڑھ سیر پختہ۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے اس سے بھی زیادہ نرخ ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کا اور برنی کا بیان مطابق ہے۔ اس قحط کا حال ابن بطوطہ لکھتا ہے "میں نے دیکھا تین عورتیں مرے ہوئے گھوڑے کی کھال کاٹ کاٹ کر کھاتی تھیں۔ لوگ چمڑوں کو پکا پکا کر بازار میں بیچتے تھے"۔ فرشتہ نے آدمی کو آدمی کے کھانے کا جو ذکر کیا ہے، ابن بطوطہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "بعض خراسانی طالب علم اگرو ہ پہنچے تو سارا شہر خالی پڑا تھا ایک خالی مکان میں ایک شخص آگ جلا کر کسی آدمی کی ٹانگ بھون بھون کر کھا رہا تھا۔ بادشاہ کے حکم سے تمام دہلی کے باشندوں کو چھ ماہ کا گزارا یومیہ ڈیڑھ رطل کے حساب سے دیا گیا۔

[١] خلیفۂ مصر۔ خلیفہ بغداد مستعصم باللہ کے قتل کے تین برس بعد ۶۵۹ھ میں اس کا چچا امیر ناصر الدین منہا کے ساتھ مصر پہنچا۔ وہاں اس کی بیعت کی گئی اور مستنصر باللہ نام رکھا گیا، پھر ملک طاہر بیبرس نے اسے لشکر دے کر بغداد فتح کرنے بھیجا۔ ۶۶۰ھ میں حدیثیہ کی لڑائی میں وہ یا تو مارا گیا یا گرفتار ہوا، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بھاگنے والوں میں سے ایک شخص جو خلیفہ مسترشد باللہ کی پانچویں پشت سے تھا مصر کو چلا گیا۔ وہاں ۶۶۱ھ میں ملک طاہر نے مصلحتاً مغلوں کے حملوں سے بچنے اور مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس کو خلیفہ بنا کر اور حاکم بامر اللہ ابو العباس احمد اس کا نام رکھ کر اس سے بیعت کی۔ ۷۰۱ھ تک وہ خلیفہ رہا، اس کے بعد اس کا بیٹا المستکفی باللہ خلیفہ ہوا، وہ ۷۴۰ھ تک رہا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا الواثق باللہ ابراہیم ایک سال رہا۔ ۷۴۲ھ میں مستکفی باللہ کا بیٹا الحاکم بامر اللہ احمد ابو العباس خلیفہ ہوا جو ۷۵۳ھ تک رہا۔ اگرچہ ۷۴۴ھ (?) تک ہندوستان کے سکوں پر خلیفہ مستکفی باللہ کا نام چلا آتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس وقت تک اس کے فوت ہونے کی خبر نہیں پہنچی ہو گی۔ فرشتہ لکھتا ہے "بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ خلفائے عباسیہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص سلطنت کا مستحق نہیں ہو سکتا اس لیے غائبانہ خلیفہ کے نام پر بیعت کر کے سکّہ خلیفہ کے نام کا شروع کر دیا" اگرچہ خلیفہ کا منشور ۷۴۴ھ (?) میں حاجی سعید صرصری کے ہاتھ پہنچا لیکن عملدرآمد پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ان دو تین سال کے اندر وہاں تیسرا خلیفہ خلافت پر آ چکا تھا۔ تمام مسلمان بادشاہ آلِ عباس کے خلفاء کو برحق سمجھتے تھے اور ان کی اجازت کے بغیر سلطنت کرنا ناواجب سمجھا جاتا تھا۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

میں دوسرا نہ تھا اور دوسرے قیمتی اور نادر تحفے روانہ کیے۔ فرمانِ خلافت کیا ملا، سلطان بزعمِ خود خلیفہ ہی بن بیٹھا۔ خلیفہ کا فرمان لے کر اس کے احکام سب کو سُنایا کرتا تھا اور خلیفہ کے نام پر لوگوں سے بیعت لیتا تھا۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس لیے ایران و ترکستان کے اکثر بادشاہ خلفائے بغداد سے حکمرانی کی سند حاصل کر لیا کرتے تھے چنانچہ محمود غزنوی نے کافی روپیہ خرچ کر کے یہ سند اور یمین الدولہ امیر المومنین کا خطاب حاصل کیا تھا۔ ان دنوں خلفائے عباسیہ کی حکومت برائے نام تھی اور وہ اس سرپرستی کو غنیمت سمجھتے تھے۔ غزنی اور غوری سلاطین اکثر ایسا کرتے تھے کہ سکہ پر ایک طرف خلیفہ وقت کا نام ضرب کراتے تھے۔ امیر المومنین سے ہمیشہ عباسی خلیفہ وقت مراد ہوتا تھا۔ چنانچہ قطب صاحب کی لاٹ پر "مظہر کلمۃ اللہ العلیا ابو المظفر محمد بن سام قسیم امیر المومنین خلد اللہ ملکہ" اور جامع مسجد دہلی کے دروازے پر "معز الدنیا والدین محمد بن سام ناصر امیر المومنین"۔ سلطان معز الدین غوری کے دینار کے ایک طرف "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ الناصر...... امیر المومنین" اور التمش کے ٹنکہ کے ایک رخ پر "فی عہد الامام المستنصر امیر المومنین" اور ناصر الدین محمود بن التمش کے ایک سکہ پر یہی عبارت اور رضیہ سلطان کے ایک سکّے پر بھی ایک رخ پر یہی عبارت درج ہے، یہاں تک کہ بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ ۶۵۶ھ میں قتل بھی ہو گیا اور خلافت کا خاتمہ ہو گیا تو بھی ۶۸۰ھ کے سکوں میں جو غیاث الدین کے وقت میں مضروب ہوئے "الامام المستعصم امیر المومنین" ضرب ہوتا رہا۔ گڈھ مکتیسر کی مسجد کے کتبہ میں جو سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی "غیاث الدنیا والدین ابو المظفر بلبن السلطان ناصر امیر المومنین ۶۸۲ھ" درج ہے، بلکہ فیروز شاہ خلجی کے وقت میں جو سکّے مضروب ہوئے یعنی ۶۹۱ھ تک ایک رخ پر "الامام المستعصم امیر المومنین" لکھتے رہے، یہی حال ۶۹۵ھ تک رہا۔ علاؤ الدین خلجی کے سکوں پر "سکندر ثانی یمین الخلافت ناصر امیر المومنین ۷۰۹ھ" لکھا جاتا تھا لیکن اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ خود ہی امام اور امیر المومنین بن بیٹھا چنانچہ اس کے سکّہ کے ایک طرف "الامام الاعظم خلیفہ رب العالمین قطب الدنیا والدین ابو المظفر مبارک شاہ" اور دوسری طرف "السلطان ابن السلطان الواثق باللہ امیر المومنین ۷۱۸ھ" درج ہے۔ خسرو نو مسلم اپنے سکوں پر "ولی امیر المومنین" اور سلطان غیاث الدین تغلق "ناصر امیر المومنین" لکھتے رہے۔ بنگالہ کے بادشاہ ۷۱۱ھ تک "الامام المستعصم امیر المومنین" لکھتے رہے۔ سلطان محمد بن تغلق نے ۷۴۱ھ تک اپنے سکوں پر نہ تو کسی خلیفہ کا نام لکھا اور نہ خود کو امیر المومنین لکھا۔ سرگرداری کے قیام میں شاید خراسان، عراق، شام اور مصر کے لوگوں کی صحبت کا اثر ہے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر بادشاہی کرنا تغلب میں داخل ہے۔ اس نے ۷۴۱ھ میں غائبانہ خلیفہ کے نام پر بیعت کر کے سکوں میں اس کا نام اپنے نام کے بجائے شروع کیا اور خلیفہ کے پاس ایک عرضداشت بھیجی۔ ۷۴۱ھ میں خلیفہ مستکفی باللہ مر چکا تھا لیکن ہندوستان میں اس کی وفات کی خبر نہیں پہنچی جب تک کہ خلیفہ کا قاصد سعید صرصری ۷۴۴ھ میں سند لے کر نہ آیا۔ اس لیے ۷۴۲ھ، ۷۴۳ھ اور ۷۴۴ھ کے سکوں پر محمد تغلق المستکفی باللہ کا نام لکھتا رہا۔ جس وقت یہ قاصد پہنچا تو مستکفی کے بعد ابراہیم واثق باللہ ایک سال خلیفہ رہ کر اس کے بجائے ابو العباس احمد الحاکم بامر اللہ ۷۴۲ھ میں خلیفہ مقرر ہو چکا تھا لیکن ہندوستان میں اس کے تقرر کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ حاجی سعید کے آنے کے بعد بادشاہ نے حاجی رجب کو پھر خلیفہ کے پاس بھیجا۔ ضیاء الدین برنی نے فیروز شاہی میں حاجی سعید کے آنے کی تاریخ ۷۴۴ھ لکھی ہے اور یہ لکھا ہے "دو سال کے بعد حاجی رجب اور شیخ رکن الدین آئے"۔ بدر چاچ کے شعر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ؎

ہم بتاریخے کہ ماہ از سال ہفصد شد فزدل　　　زیں سفر ماہ محرم سابق شعبان رسید

"سابق شعبان" سے حاجی رجب مراد ہے۔ فرشتہ نے حاجی سعید صرصری اور حاجی رجب کے آنے کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن بطوطہ نے حاجی سعید کا کچھ ذکر نہیں کیا اور شیخ رکن الدین کا بھی مختصر ذکر کیا ہے وہ حاجی سعید کی آمد کے وقت جزائر مالدیپ میں تھا۔ شیخ رکن الدین کا حال بھی اس نے بعد میں سُنا ہو گا یہ دونوں اس کے سامنے نہیں آئے تھے۔ فیروز شاہ نے بھی یہ اجازت حاصل کی تھی۔ فتوحات فیروز شاہی میں ہے "خلیفہ نے اجازت نامہ سید السلاطین کا خطاب، ایک خلعت، علم و شمشیر، انگشتری اور حضور اکرمؐ کے قدم کا نشان بھیجا تھا"۔ یہ قدم اب شاہزادہ فتح خاں کی قبر پر لگا ہوا ہے، یہ ۷۵۷ھ میں آیا تھا، بارہ وفات پر یہاں بڑا میلہ لگتا ہے۔ بداؤنی نے مخدوم زادہ بغدادی غالباً شیخ رکن الدین کو ہی لکھا ہے کیونکہ یہ حاجی سعید کے دو سال بعد آیا تھا۔

سلطان کے نام خلیفہ کے اور بھی فرمان دو تین مرتبہ آئے۔ دوسری بار خلیفہ کی طرف سے مخدوم زادہ بغدادی آیا تھا۔ بادشاہ نے اس کا پیادہ پا پالم تک جاکر استقبال کیا۔ جب دُور سے اس کی سواری نظر آئی تو بادشاہ نے آگے بڑھ کر ملاقات کی۔ اُسے اپنے تخت پر برابر میں بٹھالیا۔ مخدوم زادہ کو سلطان نے کیلی کا شہر اور وہاں کی ساری اراضیات اور باغ جاگیر میں دے دیے تھے۔

۷۴۵ھ میں کڑہ[۱] کے حاکم ملک نظام الدین نے بغاوت کی تھی۔ عین الملک کے بھائی شہر اللہ نے اودھ کی طرف سے حملہ کرکے اسے گرفتار کرلیا اور یہ بغاوت جلد ہی ختم ہوگئی۔

دکن کے باغی

اسی سال بیدر[۲] میں شہاب الدین نے علم بغاوت[۳] بلند کیا۔ بادشاہ نے قتلغ خاں کو اُس کی طرف روانہ کیا۔ شہاب الدین تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کے بعد اپنے بیٹے سمیت قلعہ بند ہوگیا۔ قتلغ خاں نے اُسے امن کا قول نامہ دے کر قلعہ پر قبضہ کرلیا، اور اُسے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔

۷۴۶ھ میں ظفر خاں علائی کے بھانجے علی شیر نے ایک بڑا جتھا بنا کر گلبرگہ[۴] پر قبضہ کرلیا، پھر اس نے بیدر کے شاہی ناظم کو قتل کرکے کافی مال و اسباب جمع کرلیا۔ قتلغ خاں نے علی شیر[۵] کو بھی شکست دی اور وہ بھاگ کر قلعہ بیدر میں محصور ہوگیا۔ قتلغ خاں نے اُسے گرفتار کرکے سرگدواری میں جو ضلع شمشاد میں واقع ہے اور جہاں شاہی لشکر ان دنوں مقیم تھا، بھیج دیا۔

---

[۱] کڑہ۔ ضلع الٰہ آباد میں گنگا کے کنارے شہر الٰہ آباد سے ۴۲ میل پر شمال مغرب میں واقع ہے۔ اکبر نے جب قلعہ اکبر آباد بنایا تو یہاں سے صوبہ کا مستقر قلعہ میں منتقل ہوگیا۔ اس قصبہ کی موجودہ آبادی چھ سات ہزار ہے۔ پہلے کبھی یہاں کا کاغذ بھی مشہور تھا۔

[۲] بیدر۔ یہ ریاست نظام حیدر آباد کا ضلع تھا۔ شہر حیدر آباد سے ۷۵ میل شمال مغرب میں ہے۔ بیدر بریدشاہی بادشاہوں کا دارالخلافہ رہا ہے۔ بیدر میں تانبہ، جست اور رانگ ملا کر ایک سیاہ دھات تیار کرتے ہیں، اس سے برتن، مٹی اور دوسرے نفیس تحفے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ یہاں کی خاص صنعت ہے۔ محمود گاواں کا مدرسہ اور بیدر کا قلعہ مشہور مقام ہیں۔ بیدر تلنگانہ اور مرہٹواڑی کی سرحدوں پر واقع ہے اور نہایت پرفضا مقام ہے۔

[۳] ابن بطوطہ اس باغی کو "تاج الملک نائب سلطان نصرت خاں" لکھتا ہے۔ فرشتہ نے وضاحت کی ہے "جب بادشاہ تلنگانہ سے واپس ہوا تو وارنگل میں پہنچا تو اس نے شہاب الدین سلطانی کو نصرت خاں کا خطاب دے کر تلنگانہ بھیجا اور ایک کروڑ تنکہ کے عوض وہ علاقہ اُسے دے دیا۔" وہ چونکہ یہ رقم وہاں سے وصول نہ کرسکا اس لیے باغی بن گیا لیکن ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔ "جب بادشاہ وبا کی وجہ سے دکن سے لوٹا تو دولت آباد اور بیدر کے راستہ میں بیمار ہوگیا اور اس کی وفات کی خبر پھیل گئی۔ یہ خبر سُن کر نصرت خاں باغی ہوگیا۔" ضیاءالدین برنی کی تحریر سے فرشتہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ فرشتہ نے بھی یہ واقعہ ۷۴۵ھ میں بتایا ہے، اس جگہ ابن بطوطہ کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔

[۴] گلبرگہ۔ یہ شہر دکن کے ہندو راجاؤں کی قدیم یادگار ہے۔ تقریباً چھ سو سال مسلمان بادشاہوں کے زیر حکم رہا۔ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں بہمنی سلاطین کا دارالسلطنت بنا۔ اس وقت یہ دکن کا سب سے زیادہ بارونق اور مرکزی شہر تھا۔ شہر کے گرد پختہ فصیل اور وسط میں فوارہ تھا جہاں سے چاروں طرف سڑکیں تھیں۔ مغربی جانب گلبرگہ کا قدیم قلعہ ہے کسی زمانہ میں یہاں شاہی محل تھے، اب ویرانہ ہے۔ قلعہ کے وسط میں قرطبہ کے نمونہ پر ایک بڑی مسجد ہے جس کا صحن نہیں ہے، یہ مسجد بہمنی خاندان کے دوسرے بادشاہ محمود شاہ بہمنی کی یادگار ہے سن تعمیر ۷۶۷ھ ۱۳۶۵ء ہے۔ مشرقی جانب نصف میل پر سلاطین بہمنیہ کے مقبرے ہیں۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر دکن کے مشہور بزرگ میر سید گیسو دراز کا روضہ ہے جو نصیر الدین روشن چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔

[۵] بداؤنی نے اس باغی سردار کا نام "علی شیر خواہر زادہ ظفر خاں علائی" لکھا ہے۔ ابن بطوطہ اسے قتلو خاں (جسے بداؤنی نے قتلغ خاں لکھا ہے) کا ہمراہی بتاتا ہے اور اس کا نام علی شاہ بتاتا ہے۔ اسے اس نے خوبصورت، نیک خصلت، بہادر اور ساتھ ہی بہرا لکھا ہے اور یہ [illegible] حسن گنگو کا بھتیجا تھا جو بعد کو سلطنت بہمنی کا بانی [illegible] تھا۔

بادشاہ نے ان قیدیوں کو پہلے تو غزنی کی طرف روانہ کرنے کا حکم دیا، پھر واپس بلوا کر اُن کو قتل کرا دیا۔[1]

عین الملک کی بغاوت ۷۴۱ھ میں اودھ اور ظفرآباد[2] سے عین الملک کا مال و اسباب اور نفیس تحفے بادشاہ کی نذر کے لیے لےکر آیا۔ بادشاہ نے اس نذرانہ سے خوش ہو کر طے کیا کہ قتلغ خاں[3] کو دکن سے بلا کر عین الملک کو اُس جگہ بھیج دے۔ اس تجویز سے عین الملک بجائے خوش ہونے کے دور دراز کے اندیشوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا وہم اس قدر بڑھ گیا کہ ایک رات موقع پا کر سرگدواری[4] سے بھاگ کر گنگا عبور کی اور اودھ چلا گیا۔ اس کا بھائی شہراللہ شاہی لشکر کے تمام ہاتھی اور گھوڑے جو چرائی کے لیے جنگل میں چھوڑے گئے تھے

بادشاہ نے عین الملک کی سرکوبی کے ارادہ سے کوچ کیا اور قنوج پہنچا۔ عین الملک کو اس کے بھائیوں اور ملک فیروز نائب باربک کے آدمیوں نے جو شاہی لشکر کے ہاتھی گھوڑوں کی رکھوالی اور چرائی پر متعین تھے، بادشاہ کے خلاف بھڑکایا اور مقابلہ پر آمادہ کیا۔ عین الملک نے گنگا اُتر کر صف آرائی کر لی لیکن بڑی غلطی کی کہ ڈاکوؤں اور گنواروں کے طریقہ پر پیادہ ہو کر حملہ کیا۔ بادشاہ کے فیل سواروں اور تیر اندازوں نے گھیر کر اُسے اپنی زد پر لے لیا۔ چنانچہ وہ جلد ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُس کے دو بھائی جس میں سے ایک کا نام شہراللہ تھا اور اُس کے دوسرے بہت سے حامی سردار گنگا[5] میں ڈوب کر مر گئے اور جو تیر کر بمشکل پار پہنچے اُن کو جاٹوں اور گنواروں نے لوٹ لیا اور ہلاک کر دیا۔ اس دار و گیر میں عین الملک بھی پکڑا گیا اور اُسے اس حال میں چارپائی پر برہنہ جسم باندھ دیا گیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ کچھ دن بعد بادشاہ نے اُس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کر کے رہا کر دیا اور پھر مزید مہربانی اور عنایت کا اظہار کر کے دوبارہ اُس کا علاقہ بھی اُسے عطا کر دیا۔

---

[1] بدایونی کے اس بیان کے خلاف ابن بطوطہ کی تحریر ہے "علی شاہ خود خلاف حکم غزنی سے سندھ آ گیا تھا۔ اُسے بادشاہ کے پاس گرفتار کر کے لے گئے تو اُس نے کہا "تو میرے ملک میں پھر فساد کرنے کے لیے آیا ہے۔" پھر اس نے اُس کے قتل کا حکم دے دیا۔

[2] ابوالفضل کے وقت ظفرآباد سرکار جون پور کا ایک محال تھا اسے علاؤالدین خلجی کے وقت غالباً ظفر خاں نے آباد کیا تھا۔

[3] فرشتہ اور ابن بطوطہ اس کو بادشاہ کا استاد بتاتے ہیں یہ دولت آباد دکن کا صوبہ دار تھا ابن بطوطہ اس کو قتلو خاں لکھتا ہے۔

[4] سرگدواری۔ ضلع فرخ آباد کے قریب شمس آباد کے نواح میں ایک چراگاہ تھی، یہاں شاہی لشکر قحط کے زمانہ میں آکر ٹھہرا تھا اور عارضی جھونپڑے بنا لیے تھے۔ اسی موضع کو سرگدواری کہتے ہیں۔

[5] گنگا دریائے گنگ ریاست گڑھوال میں کوہ ہمالیہ سے نکلتا ہے اور ۱۵۵۷ میل بہہ کر خلیج بنگال میں گر جاتا ہے۔ گنگوتری کی چوٹی جہاں سے ایک چشمہ بھاگیرتی نام کا نکلتا ہے۔ سمندر سے ۱۳۸۰۰ فٹ بلند ہے۔ جب بھاگیرتی کے ساتھ جاہنوں اور الک نندا شامل ہو جاتے ہیں تو یہ سب مل کر گنگا کہلاتے ہیں۔ الک نندا بھاگیرتی سے دیو پریاگ میں ملتی ہے اور ہردوار میں پہاڑ سے نکلتی ہے۔ پریاگ یعنی الہ آباد میں جمنا بھی گنگا سے آکر مل جاتی ہے۔ گنگا منبع سے لے کر دہانہ تک ہندوؤں کے ہاں متبرک ہے۔ ویدوں کے زمانہ میں گنگا کے تقدس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ یہ رتبہ اس نے غالباً پچھلے دو ڈھائی ہزار سال کے اندر اندر حاصل کیا ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے دریاؤں میں سے سندھ اور برہم پترا گنگا سے بھی لمبے دریا ہیں لیکن جس قدر بڑا حصہ اس دریا کا میدان سے گزرتا ہے اور اراضی کو فائدہ پہنچاتا ہے اس قدر کوئی دوسرا دریا نہیں پہنچاتا۔ سمندر میں گرنے سے ۲۴۰ میل پہلے اس کی بے شمار شاخیں ہو جاتی ہیں، سب سے بڑی شاخ کو میگنا کہتے ہیں اور مغربی شاخ کو ہوگلی، ان دونوں کے درمیان بھی بے شمار شاخیں ہیں۔ ہمالیہ اور وندھیاچل پہاڑوں کے درمیان کا تمام پانی اس دریا میں آتا ہے۔ ماہ مئی سے طغیانی شروع ہوتی ہے، ستمبر میں طغیانی شباب پر ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام دریاؤں میں اس کے شکم سے سب سے زیادہ پانی آکر سمندر میں گرتا ہے۔

اس بغاوت[1] کے رفع ہونے کے بعد بادشاہ سرگدواری سے دہلی واپس آگیا۔

بادشاہ نے دولت آباد سے قتلغ خاں کو واپس بلا لیا۔ قتلغ خاں نے سارے ملک دکن کو بخوبی سنبھالی رکھا تھا۔ اس کے وہاں سے ہٹتے ہی دکن میں طرح طرح کے فتنے ازسرنو اُٹھ کھڑے ہوئے۔

امرائے صدہ کی سرکشی

سلطان نے عزیز خمار کو جو ایک کمینہ اور پست فطرت آدمی تھا مالوے کی حکومت پر متعین کر دیا۔ اُس نے بادشاہ کے اشارے سے وہاں کے اکثر امرائے صدہ یعنی یوز باشی[2] کے امیروں کو قتل کر ڈالا، جس کی وجہ سے مالوے میں بھی بڑے فتنے پیدا ہوگئے۔ اس قتل کا حال سُن کر ۷۴۵ھ میں گجرات کے امرائے صدہ بھی بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ ان امیروں نے خواجہ جہاں کے غلام مقبل نامی پر جو گجرات میں وزیر کا نائب مقرر ہوا تھا اور کافی خزانہ لے کر سلطان کے پاس جا رہا تھا، شب خوں مارا اور تمام شاہی خزانہ، مال اسباب، گھوڑے وغیرہ لوٹ لیے۔ اس بغاوت کو دبانے کے لیے خود بادشاہ کو گجرات جانا پڑا۔ بادشاہ نے ملک علی سرجان دار اور احمد لاچین کو بعض دوسرے امیروں کے ساتھ دولت آباد روانہ کیا تاکہ وہاں جا کر یہ لوگ دکن کے باغی امرائے صدہ کو گرفتار کرلیں۔ جب احمد لاچین مانک گنج کی گھاٹی میں پہنچا تو اسے امیرانِ صدہ نے قتل کر ڈالا۔ عزیز خمار ان باغی امیروں کی سرکوبی کے لیے گجرات سے دبوہری اور بڑودہ[3] کی طرف گیا تھا لیکن وہ بھی مقابلہ کرتے ہوئے گرفتار ہوگیا۔ ان ناکامیوں اور امیرانِ صدہ

---

[1] فرشتہ لکھتا ہے جس عرصہ میں بادشاہ سرگدواری میں رہا تو چار امیروں نے بغاوت کی (۱) نصرت خاں (۲) علی شاہ (۳) نظام امین (کڑہ) (۴) عین الملک (اودھ) بداؤنی نے ان چاروں بغاوتوں کے جو سن دیے ہیں وہ یہ ہیں (۱) نظام امین ۷۳۵ھ (۲) نصرت خاں ۷۳۵ھ۔ (۳) علی شاہ ۷۴۶ھ (۴) عین الملک ۷۴۷ھ۔ ابن بطوطہ اس کے برخلاف ان تمام واقعات کو صرف سن ۷۴۳ھ تک بتاتا ہے۔ برنی لکھتا ہے "سرگدواری سے آکر بادشاہ تین چار سال دہلی میں رہا" اور یہ ظاہر ہے کہ بادشاہ کو پورے چار سال گجرات، دولت آباد اور طغی کی بغاوتوں میں لگے۔ اگر ہم فرشتہ اور بداؤنی کے قول کے مطابق عین الملک کی بغاوت کو ۷۴۷ھ میں سمجھیں تو بادشاہ کی وفات (محرم ۷۵۲ھ) میں صرف چار سال رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مدت سات آٹھ سال کی ہوتی ہے۔ اس لیے ابن بطوطہ کے علاوہ برنی کی روایت کے مطابق یعنی فرشتہ اور بداؤنی کا دیا ہوا سن غلط معلوم ہوتا ہے۔ ایڈورڈ طامس نے جو سکے جمع کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا وہ سکہ جس میں بادشاہ نے خلیفہ کا نام ضرب کرایا ۷۴۱ھ کا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ۷۴۱ھ میں بادشاہ سرگدواری سے دہلی واپس آچکا تھا۔ کیونکہ خلیفہ مصر کا ایلچی سرگدواری سے بادشاہ کے دہلی واپس آنے کے بعد ہی فرمان خلافت لے کر حاضر ہوا تھا۔ اس حساب سے بھی عین الملک کی بغاوت کا سن ۷۴۰ھ یا ۷۴۱ھ ہونا چاہیئے، کیونکہ عین الملک کی بغاوت سرگدواری کے قیام کے دوران میں ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے کہ محمد تغلق کے سن ہمارے اکثر مورخوں نے غلط لکھے ہیں جیسا کہ حسن گانگو، کی بغاوت اور کے سلسلہ میں بھی ہم اس غلطی کی صراحت کر آئے ہیں۔ سال کی تصحیح ابن بطوطہ کے سفرنامے اور طامس کے سکوں سے ہو جاتی ہے۔

[2] "یوزباشی" ترکی میں سو ساتھیوں کے سردار کو کہتے ہیں۔

[3] بڑودہ۔ سورت سے ۸۱ میل پر یہ مہاراجہ گائیکواڑ کا دارالسلطنت ہے اور سورت سے پہلے کا بسا ہوا ہے۔ اس وقت اس کی آبادی دو لاکھ ہوگی۔ یہاں کی جامع مسجد ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء کی تعمیر اور شاہی زمانہ کی یادگار ہے۔ موجودہ مہاراجہ کی مملکت میں سونے اور چاندی کی دو تاریخی توپیں بھی ہیں ریاست بڑودہ کا بانی پیلاجی گائیکواڑ ہے جس نے محمد شاہ رنگیلے کے وقت میں خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ ۱۷۳۱ء میں اس شخص کا انتقال ہوگیا۔ اُس نے چالیس برس تک گجرات اور کاٹھیاواڑ کے سب راجاؤں سے لڑائی کی اور اُن کو اپنا باج گزار بنا لیا۔ احمد آباد اور پٹن بھی اس کے قبضے میں آگیا تھا۔ پہلے اس کی ریاست کا مرکز جوناگڑھ تھا۔ آخر میں بڑودہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بڑودہ کی موجودہ ریاستی حیثیت

(باقی صفحہ آئندہ پر)

کی خودسری کی خبریں سُن کر بادشاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

جب ملک مقبل[۱] اور عزیز خمار کے یہ واقعات مشہور ہوئے تو سارے ملک میں ہر مقام کے امیرانِ صدہ باغی بن بیٹھے۔ سب نے اپنے اپنے گروہ بنا کر بادشاہ سے کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی۔

دولت آباد پر حملہ

ان باغی امیروں نے ملک عالم کے کمانڈروں سے دولت آباد کا قلعہ بھی چھین لیا اور اسماعیل فتح خاں نامی ایک امیر کو سلطان ناصر الدین[۲] کا خطاب دے کر بادشاہ بنا لیا۔

دیوگیری اور بڑودہ کے امیرانِ صدہ پر بادشاہ نے خود فوج کشی کی۔ وہ بھی شکست کھا کر دولت آباد آ گئے۔ اس طرح دولت آباد باغیوں اور سرکشوں کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ سلطان نے پوری تیاری کے ساتھ دولت آباد پر حملہ کیا۔ اسمٰعیل مذکور نے شاہی لشکر کا تھوڑا بہت مقابلہ کیا، آخر شکست کھا کر اس نے دھارا نگر یعنی دولت آباد کے قلعہ میں پناہ لی۔

اس فتنے میں بھی ہزاروں مسلمان دولت آباد میں قتل و قید ہوئے۔ کچھ امرائے صدہ بیدر کی طرف بھاگ نکلے۔ بادشاہ نے عماد الملک سرتیز کو ان کے تعاقب پر متعین کر دیا۔

ابھی بادشاہ ان باغیوں کی سرکوبی ہی میں مصروف تھا کہ گجرات میں غدر ہو جانے کی خبریں ملیں۔ معلوم ہوا کہ ملک تغی نے گجرات کے حاکم ملک مظفر کو قتل کر دیا ہے اور تمام گھوڑوں اور مال و اسباب پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان تشویشناک خبروں کے ملتے ہی بادشاہ نے ملک جوہر اور خداوندزادہ قوام الدین اور شیخ برہان بلگرامی کو دھارا نگر چھوڑا اور خود تلنگانہ[۳] سے گجرات

(بقیہ حاشیہ سلسلہ بڑودہ صفحہ گزشتہ) ۱۸۰۲ء میں انگریزوں سے معاہدے کے تحت متعین ہوئی۔ اس ریاست کا کل رقبہ ۸۵۷۰ مربع میل ہے۔ ریاست کے مشہور فرماں روا گنپت راؤ گائیک واڑ ۱۸۲۷ء کو ناڈے راؤ گائیک واڑ ۱۸۵۶ء گزرے ہیں۔ اب یہ ریاست بھارت یونین میں شامل کر لی گئی ہے۔

[۱] ملک مقبل۔ ابن بطوطہ کہتا ہے یہ وزیر خواجہ جہاں کی طرف سے گجرات اور بیروالہ کا حاکم تھا۔ اس کا صحیح نام ملک مقبول تھا۔ تلنگانے کا رہنے والا اور وہاں کے ایک راجہ کے پاس بڑے عہدے پر فائز تھا۔ جب یہ راجہ بادشاہ سے ملنے دہلی آیا تو یہ بھی اُس کے ساتھ دہلی آ کر مسلمان ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کا نام مقبول رکھا تھا۔ اُس وقت کی سرکاری زبان فارسی سے واقف نہیں تھا۔ لیکن نہایت ہوشیار اور عقلمند آدمی تھا کچھ دن بعد ہی بادشاہ نے اُسے قوام الملک کا خطاب دے کر ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ اسی کا لڑکا جوناشاہ نامی گزرا ہے۔ فیروز شاہ نے احمد ایاز خواجہ جہاں کے مرنے کے بعد ملک مقبل کو اپنا وزیر بنا کر خواجہ جہاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا جوناشاہ وزیر اعلیٰ اور خواجہ جہاں بنا اور بیس سال تک اس عہدے پر معمور رہا۔ شاہ جہاں آباد کے ترکمان دروازے کے اندر کالی (کلاں) مسجد اسی خواجہ جہاں جوناشاہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس مسجد کا سن تعمیر ۷۸۹ھ ہے۔

[۲] ناصر الدین۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ دولت آباد کے باغیوں نے پہلے جس شخص کو بادشاہ بنایا وہ اسمٰعیل ہی تھا۔ بدایونی اس کا نام اسمٰعیل فتح لکھتا ہے۔ کچھ دوسرے اسمٰعیل مخ افغان بتاتے ہیں۔ لیکن ابن بطوطہ اس کو دولت آباد کے ملک مل کا لڑکا اور اس کا نام ناصر الدین لکھتا ہے۔ ملک مل دولت آباد کے راجہ کا نومسلم لڑکا تھا۔ ابن بطوطہ نے یہاں غلطی کی ہے کسی ہم عصر کا شعر بھی اس کی تردید کرتا ہے ؎

سماعیل مخ را در آں دار و گیر   بشاہی بخواندند شاہ نصیر

[۳] تلنگانہ۔ نظام حیدر آباد کی ریاست دو علاقوں پر مشتمل تھی، ایک تلنگانہ جو جنوب مشرقی سمت تھا، دوسرا مرہٹواڑہ شمالی مغربی جانب تھا۔ تلنگانہ وہ علاقہ جہاں تلنگی یا تلگو زبان بولی جاتی ہے اور مرہٹواڑہ جہاں کی زبان مرہٹی ہے دکن میں ان دو بڑی زبانوں کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چلا گیا۔

حسن کانگو بہمنی

بادشاہ کے جاتے ہی تمام امیران صدہ جو دولت آباد سے بھاگ گئے تھے پھر اکٹھے ہو گئے، عماد الملک سرتیز سے مقابلہ کر کے اسے قتل کر دیا اور دولت آباد پر حملہ کر دیا۔ ملک جوہر اور قوام الدین وغیرہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور شہر خالی کر کے بھاگ گئے۔ حسن[1] کانگو نے جو تمام امیران صدہ کا سردار اور اس بغاوت کا سرغنہ تھا شہر پر قبضہ کر لیا اور اسماعیل فتح کو علیحدہ کر کے خود سلطان علاؤالدین کے خطاب سے بادشاہ بن گیا۔ اس وقت سے دولت آباد کی سلطنت اس کے خاندان سے مخصوص ہو گئی۔ واضح رہے "تاریخ فتوح السلاطین" بھی اسی کے نام پر نظم میں لکھی گئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ تلنگانہ صفحہ گزشتہ) علاوہ کنڑی، تامل، ملیالم بھی بولی جاتی ہیں۔ تلنگانہ دریائے نربدا کے جنوب اور کرشنا کے شمال میں واقع ہے۔ قدیم کتابوں میں اس ملک کا نام تلنگا اور آندھرا درج ہے۔ موجودہ بھارتی حکومت نے بھی جنوب کے تلگو بولنے والے اور ریاست نظام کے تلنگانہ کے علاقہ کو ملا کر آندھرا کا صوبہ بنایا ہے۔ بطلیموس نے اس کا نام کالنگا لکھا ہے اور پلینیاس نے دونوں نام لیے ہیں۔ اس علاقہ کا قدیم دارالحکومت وارنگول تھا جسے اب ورنگل کہتے ہیں۔ بلدہ حیدرآباد نظام کا دارالسلطنت اور موجودہ صوبہ آندھرا کا مرکز بھی تلنگانہ میں ہے۔

[1] حسن کانگو یہ دہلی کا رہنے والا تھا۔ ایک برہمن نے اس کی خدمت گزاری سے خوش ہو کر یہ بشارت دی تھی کہ تجھے بادشاہی ملے گی اور یہ اقرار لیا تھا کہ جب تو بادشاہ ہو جائے تو اپنے نام کے آخر میں میرا نام بھی شامل کرنا۔ چنانچہ کانگو بہمنی اسی شرط کی تکمیل میں اس کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں شیخ نظام الدین اولیاؒ نے بھی اسے بادشاہت کی بشارت دی تھی۔ مصیبت کے دنوں میں حسن دولت آباد چلا گیا اور وہاں قتلغ خاں کے پاس ملازم ہو گیا۔ جب اسماعیل ناصر الدین کو امرائے صدہ نے دولت آباد میں بادشاہ بنا لیا تو حسن کو ظفر خاں کا خطاب اور گلبرگہ جاگیر میں ملا تھا، اُس وقت حسن نو ہزار سپاہیوں کا سردار تھا۔ حسن کانگو نے اطراف و اکناف کے حاکموں کو شکست دے کر کافی طاقت پیدا کر لی اور اس کی جمعیت میں ہزار ہو گئی۔ پھر وہ ایک مہینہ تک دہلی کے امیر سے جو دکن کی مہم پر آیا تھا لڑتا رہا۔ اس لڑائی میں غازی الملک مارا گیا اور حسن کانگو کے پاس اس فتح سے کافی مالِ غنیمت اور دولت جمع ہو گئی۔ اس وقت تک وہ اسماعیل مخ ناصر الدین کا برابر حامی بنا رہا۔ آخر کار اس کے پاس پچاس ہزار فوج ہو گئی۔ انہی دنوں اسماعیل مخ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور امرائے صدہ نے مشورہ کر کے ۷۴۸ھ میں ۲۴ ربیع الآخر بروز جمعہ اسے تخت شاہی پر بٹھا دیا اس کا لقب سلطان علاؤالدین حسن کانگو بہمنی تھا۔ دارالسلطنت گلبرگہ تھا جس کا نام اس نے حسن آباد رکھ دیا تھا۔ اپنے قدیم آقا کانگو برہمن کو دہلی سے بلا کر وزارت اُس کے سپرد کی۔ اسماعیل مخ کو امیر الامراء کا عہدہ ملا۔ اس نے کولاس، ورنگل، کرناٹک، دکن کا کافی بڑا علاقہ فتح کیا۔ گجرات کو فتح کے خیال سے روانہ ہوا تھا کہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ گلبرگہ میں چھ ماہ تک بیمار رہ کر غرہ ربیع الاول ۷۵۹ھ میں ۶۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مدت حکومت گیارہ برس دو ماہ سات دن "سراج التواریخ" اور "بہمن نامۂ دکنی" میں اسے ایران کے بہمن اور اسفندیار بادشاہوں کی اولاد لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ بہمن نامہ علامہ شیخ آذری کی تصنیف ہے۔ کتب خانۂ نظام شاہیہ کی ایک کتاب میں اسے بہرام گور کی اولاد بتایا گیا ہے اور باقاعدہ اس کا سلسلہ کیقباد سام اور بہرام گور تک ملایا گیا ہے۔ حسن کانگو نے جس بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی اُس نے اس قدر ترقی کی کہ سارا دکن بہمنی بادشاہوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس خاندان کے بیس بادشاہوں نے حکومت کی۔ اس عہد میں دکن صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اور شمال کی ساری رونق جنوب میں کھنچ آئی تھی۔ حسن کانگو کے زمانہ کے مشہور اہل علم شیخ عین الدین بیجاپوری اور شیخ محمد سراج گزرے ہیں۔

محمد تغلق کی پریشانیاں

ادھر گجرات میں ملک طغی نے دو مرتبہ شاہی فوج کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہ قزاقوں کی طرح جگہ جگہ مارا مارا پھرتا تھا۔ بادشاہ بھی برابر اس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے بادشاہ نے دہلی سے ملک فیروز کو بھی بلا لیا تھا۔

اسی سال ملک گیر نے جو ملک قبول کا بیٹا تھا انتقال کیا۔ بادشاہ کے سارے معاملات کی سربراہی اسی کے ذمہ تھی۔

اسی کی طرف سے بادشاہ نے ایک خط مصر کے خلیفۂ عباسی کے پاس حاجی برقعی کے ہاتھ روانہ کیا تھا۔

سلطان محمد عادل تغلق شاہ کے اس آخری عہد میں سارے ملک کا انتظام احمد ایاز خواجہ جہاں، ملک قبول، قوام الملک دہلی میں بیٹھ کر سرانجام دیتے تھے۔ بادشاہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرگرداں پھر رہا تھا۔ اس وقت بغاوتوں اور فتنوں کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف کے بندوبست سے بادشاہ فارغ نہیں ہوتا تھا کہ دوسری طرف غدر برپا ہو جاتا۔

محمد تغلق کی غلطیاں

سلطان محمد تغلق کے اس آخری عہد میں ملک کی جو تباہی اور بربادی ہوئی اس کی بہت سی وجوہ "تاریخ فیروز شاہی" اور "مبارک شاہی" کے مصنفوں نے تحریر کی ہیں۔ ان تمام اسباب و وجوہ کا خلاصہ یہ سات باتیں ہیں:-

اول:- ترمہ شیریں مغل کی تباہ کن غارت گری۔

دوم:- دوآبہ کے وسیع علاقہ میں دس گنا اور بیس گنا محصول مقرر کیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ گاؤشماری اور خانہ شماری کے اخراجات علیحدہ وصول کیے گئے اور غریب رعایا تنگ آ کر مفسد امیروں کے جتھہ میں شامل ہو گئی۔ اور بغاوت و غارت گری کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، اس طرح محصول زیادہ وصول ہونے کے بجائے اور کم ہو گیا اور سارے دوآبہ کا علاقہ اجڑ گیا۔

سوم:- ایک طویل اور تباہ کن قحط پڑا جو سات سال تک جاری رہا۔

چہارم:- بادشاہ نے دہلی کو برباد کر کے دولت آباد بسانا چاہا اور جب ساری دہلی اجڑ گئی تو اس میں گرد و نواح کے گنواروں کو لا کر بسایا گیا۔ پھر انھیں بھی جبراً دولت آباد ہانک دیا۔ اس جلاوطنی سے دہلی والوں کا سارا مال و متاع تلف ہو گیا اور وہ ساز و سامان پھر نصیب نہ ہو سکا۔

پنجم:- کوہ ہمالیہ کی مہم میں اسّی ہزار کا آراستہ و پیراستہ لشکر تمام کا تمام تباہ ہو گیا اور ان کے گھربار تباہ و برباد ہو گئے۔

ششم:- لوگوں کو (بادشاہ کی خوں ریزی کے شوق کی وجہ سے) اپنی اپنی جانوں کا بڑا ڈر ہو گیا تھا۔ مجبور ہو کر انھوں نے سرکشی اور بغاوت کی راہ اختیار کی۔ ان فتنوں میں بہت سی مخلوقِ خدا ماری گئی اور شاہی کارندوں نے اکثر پر جھوٹی تہمتیں لگا کر انھیں اور ان کے خاندانوں کو قتل کرا دیا۔ غرض ہر طرح مخلوق تباہ اور شہر ویران ہونے لگ گئے۔

ہفتم:- بادشاہ کو قتل و خوں ریزی کا کچھ ایسا جنون اور شوق تھا کہ اس نے سیّدوں، عالموں، مشائخوں، شریفوں، کمینوں، پیشہ وروں، تاجروں، کسانوں اور سپاہیوں غرض ہر طبقہ اور ہر گروہ کے بے شمار آدمیوں کو بے تامل قتل کرا دیا چنانچہ اس کے دروازہ پر عموماً لاشوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ جلاد مارتے مارتے اور بھنگی اٹھاتے اٹھاتے عاجز آ گئے تھے۔ مگر

نہ رعایا فساد سے باز آتی تھی اور نہ بادشاہ خوں ریزی سے۔

آخر اس کثرت سے فتنے برپا ہوئے کہ بادشاہ عاجز آ گیا۔ اسے ان بغاوتوں کی وجہ سے اتنے سفر کرنے پڑے کہ دم بھر کے لیے چین لینا حرام ہو گیا لیکن اس بندۂ خدا نے تلوار نیام میں نہ کی، حالانکہ اس خوں ریزی سے بجائے کسی فائدے کے روز بروز خرابیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

خونی شاہ

سلطان محمد تغلق کو غالباً سزائیں دینے میں خاصا لطف ملتا تھا[1]، اس نے اسے اپنا مشغلہ بنا رکھا تھا۔ وہ بڑے اہتمام کے ساتھ سزائیں دیا کرتا تھا۔ اس کی عدالت میں چار مفتی علیحدہ علیحدہ مقرر تھے جب کوئی شامت کا مارا کسی جرم میں پکڑا ہوا آتا تو بادشاہ اس کو سزا دینے کا تہیہ کر کے ان مفتیوں سے باقاعدہ بحث کرتا۔ مفتیوں کو یہ تاکید بھی کر رکھی تھی کہ تم سچ کہنے میں ہرگز ہرگز کوتاہی نہ کرنا، اگر کوئی ناحق مارا گیا تو اس کا مواخذہ تمھاری گردن پر ہو گا۔ ان مفتیوں سے جی بھر کر جرح اور بحث کرنے کے بعد انھیں قائل کرتا اور خواہ آدھی رات ہی کا وقت کیوں نہ ہو مجرم کی گردن مار کر ہی دم لیتا، صبح تک انتظار کرنا اس کے لیے دوبھر ہو جاتا تھا۔ اگر مفتیوں کی کسی پُرزور دلیل سے خود اُسے قائل ہو جانا پڑتا تو مقدمہ کو دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیتا، پھر فرصت میں مفتیوں کے دلائل کے جوابات سوچ کر ان سے دوبارہ بحث کرتا۔ اس بحث میں مفتی اور قاضی لاجواب ہو جاتے تو اُسی وقت مجرم کو قتل کروا دیتا تھا اور اگر اس بار بھی خود اُسے بحث میں ناکامی ہوتی تو چار و ناچار مجرم کی جان بخشی پر راضی ہو جاتا۔

شیخ زادہ جام کی حق گوئی

ایک بار قاضی کمال الدین صدر جہاں کی عدالت میں پیادہ پا چلا گیا اور استغاثہ کیا کہ شیخ زادہ جامی[2] نے مجھ کو ظالم کہا ہے اس کو طلب کرو تاکہ وہ میرا ظلم ثابت کرے، اگر

---

[1] بادشاہ کی خوں ریزی۔ ابن بطوطہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔" وہ خوں ریزی پر نہایت دلیر تھا، ایسا کبھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ اُس کے دروازے پر کوئی شخص قتل نہ کیا جاتا ہو۔ اکثر دروازے پر نعشیں پڑی رہتی تھیں۔" ابن بطوطہ نے اس کے مقتولین میں اس کے بھائی مسعود خاں، شیخ شہاب الدین بن احمد جام خراسانی۔ فقیہہ عفیف الدین کاشانی، شیخ رکن الدین ملتانی کے پوتے، شیخ زادہ ہود، شیخ شمس الدین ابن تاج العارفین باشندہ کوئل اور کھمبایت کے شیخ حیدری کا نام خاص طور سے لیا ہے۔

[2] شیخ زادہ جامی۔ ابن بطوطہ کہتا ہے:۔" شیخ شہاب الدین شیخ احمد جام خراسانی شہر کے بڑے شیخ تھے، چودہ دن تک برابر روزہ رکھتے تھے سلطان قطب الدین اور سلطان تغلق ان کے معتقد تھے۔" سلطان محمد تغلق کے ساتھ ابتداء میں ان کے تعلقات بہت اچھے تھے، بادشاہ بھی بہت لحاظ کرتا تھا، لیکن بعد میں یہ تعلقات کشیدہ ہو گئے، چنانچہ بقول ابن بطوطہ:۔" بادشاہ نے ان کو بلایا، وہ نہیں گئے اور صاف صاف کہہ دیا " میں اس ظالم بادشاہ کی خدمت ہرگز نہ کروں گا۔" بادشاہ نے اُنھیں پکڑ بلایا اور ظالم کہنے کی وجہ پوچھی۔ شیخ نے ۔۔۔ " شہر دہلی اجاڑنے (بقول ابن بطوطہ) کا ذکر کیا۔" چودہ دن تک قید میں رہے اور قتل کر دیے گئے۔" (بحوالہ ابن بطوطہ)

شیخ شہاب الدین جامی شیخ الاسلام احمد جام زندہ پیل کی اولاد میں سے تھے اور یہ بزرگ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کی اولاد میں سے تھے۔ احمد جام زندہ پیل کے متعلق مشہور ہے کہ ۲۲ سال تک بالکل اُمی تھے بعد میں ان پر سارے علوم کا کشف ہوا۔ ان کی تصنیفات تین سو ہیں۔ ان کے ہاتھ پر ایک لاکھ اسی ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ ان کی پیدائش ۴۴۰ھ میں اور وفات ۵۳۶ھ میں ہوئی۔ مشہور فارسی شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامی نے انہی کی نسبت سے اپنا تخلص جامی رکھا تھا۔ ہمایوں کی بیوی اور اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم انہی بزرگ احمد جام کی اولاد میں سے تھی۔ (بحوالہ سفینۂ دارا شکوہ)

نہ کرسکے تو اس پر تم حد شرعی جاری کرو۔ عدالت کے حکم سے شیخ زادہ موصوف حاضر ہوئے اور علانیہ اقرار کیا کہ "میں بلے ریب و شک تم کو ظالم کہتا ہوں"۔ بادشاہ نے سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "جس کسی کو تم حق یا ناحق سزا دیتے ہو اس کے اہل و عیال کا کیا قصور ہوتا ہے کہ تم ان کو بھی جلّاد کے حوالے کر دیتے ہو، یہ کون سے مذہب ملت میں جائز ہے؟"

یہ سن کر بادشاہ کو چپ لگ گئی، کوئی جواب نہیں بن پڑا، اپنا سا منہ لے کر عدالت سے اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن ظالم نے اس حق گو بیباک شیخ زادہ کو آہنی پنجرہ میں قید کر دیا۔ جب دولت آباد گیا ہے تو اس مظلوم مردِ خدا کا پنجرہ بھی ہاتھی پر رکھا ہوا ہمراہ تھا۔ دولت آباد سے لوٹ کر دہلی آیا تو اس خونی سلطان نے دار القضا کے آگے پنجرہ کھلوایا اور شیخ زادہ کو باہر نکال کر اپنے سامنے اس کے دو ٹکڑے کرا دیے۔

سلطان محمد عادل شاہ تغلق کی شخصیت بھی عجیب مجموعۂ اضداد تھی۔ نام عادل تھا (بزعم خود عدل و فیاضی کا پورا اہتمام کرتا تھا) لیکن طبعی رجحان ظلم و خوں ریزی کی طرف تھا۔ اس کی خوں ریزیوں کی وجہ سے اس کا لقب بھی "خونی شاہ" پڑ گیا تھا۔

ٹھٹہ پر چڑھائی جب سلطان محمد تغلق کا ظلم و جور حد سے سوا ہو گیا تو ملک کے نظم و نسق اور امور مملکت میں بڑا خلل اور انتشار پیدا ہو گیا اور وہ اپنی پوری سعی و جہد کے باوجود ان فتنوں کا کسی صورت بھی تدارک نہ کر سکا۔ اپنی اس بے بسی اور لاچاری پر اسے اس قدر رنج و غم ہوا کہ آخر کار اس غم نے تپِ دق کی صورت اختیار کر لی۔ اسی حالتِ مرض میں بادشاہ نے آخری کوشش کی اور ٹھٹہ پر جہاں ملک طغی نے پناہ لے رکھی تھی یورش کی۔ خوش قسمتی سے اسی موقع پر شاہ خراسان[1] کے نائب قرغن نے التون بہادر کی سرکردگی میں پانچ ہزار سوار اس کی کمک کے لیے روانہ کیے۔ اس بر وقت امداد سے بادشاہ کو بڑی خوشی اور ایک گونہ اطمینان ہو گیا جس سے اس کے مرض میں بھی قدرتی طور پر کچھ کمی ہو گئی۔

محمد تغلق کی وفات غرض جب وہ یہ لاؤ لشکر لے کر ٹھٹہ میں داخل ہوا تو عاشورہ کے دن اس نے روزہ رکھا۔ ان دنوں گرمی کافی شدت سے پڑ رہی تھی، اس پر یہ حرکت کی کہ افطار میں مچھلی کھالی، مرض نے یکبارگی شدت پکڑ لی اور اس کی جان لے کر ہی ٹلا۔ سلطان محمد عادل شاہ تغلق نے ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو ٹھٹہ میں انتقال کیا اور ہندوستان کی رعایا کو اس کے خونی پنجے سے رہائی ملی۔

---

[1] خراسان۔ ایران کا ایک بڑا صوبہ ہے، دار الخلافہ مشہد ہے جہاں آٹھویں امام علی بن موسیٰ رضا کا مقبرہ ہے۔ تقریباً پونے دو لاکھ کی آبادی ہے۔ ایک جانب کے علاقہ کو سر ولایت اور دوسرے کو پائین کہتے ہیں۔ طوس۔ نیشاپور۔ سبزوار۔ خراسان کے بڑے شہر ہیں۔ یہاں کے قبائل میں اعوان لو، شاد لو بڑے قبیلے گزرے ہیں۔ یہ صحرا نشین اور گلہ بان ہیں۔ بندوق کے نشانہ میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہاں کے ایک قبیلہ افشار سے مشہور فاتح نادر شاہ کا تعلق تھا۔

اس کے زمانہ کے مشہور شاعروں میں بدر شاشی گزرا ہے جس نے اس کے نام پر تیس ہزار اشعار پر مشتمل ایک شاہنامہ نظم کیا ہے۔

سلطان فیروز شاہ

فیروز شاہ سلطان محمد عادل کا چچازاد بھائی تھا۔ سلطان محمد نے مرتے وقت اسے جانشین اور ولی عہد بنایا تھا۔ چنانچہ اس کے انتقال پر فیروز شاہ نے اسی سن ٧٥٢ھ میں ٹھٹہ کے نواح میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ اس کی تخت نشینی میں حضرت شیخ نصیرالدین[1] چراغ دہلوی اور مخدوم زادہ عباسی بغدادی کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ عوام میں اس کا عام چرچا تھا کہ شیخ نصیرالدین چراغ دہلی نے بادشاہ کی زندگی ہی میں فیروز شاہ کو برسر اقتدار لانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

حضرت چراغ دہلویؒ

بادشاہ کو بھی ان حضرات کی کوششوں کا علم ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ان پیر و مرید (یعنی فیروز شاہ) دونوں کو دہلی سے قید کر کے ہمارے لشکر میں لے آؤ۔ شاہی کارندے حسب الحکم اُن دونوں کو قید کر کے لے چلے لیکن جب ہانسی[2] کے قریب پہنچے تو ملک فیروز نے محافظوں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے حضرت شیخ بدرالدین[3] نبیرۂ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی خدمت میں حاضری کی مہلت لے لی۔ جب وہ

---

[1] سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے خلیفۂ بزرگ تھے۔ ان کے وصال پر دہلی کی ولایت شیخ چراغ دہلوی سے متعلق ہو گئی۔ ان کے دادا عبداللطیف یزدی تھے، والد کا نام یحییٰ تھا اور یہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے، لیکن چراغ دہلوی کی ولادت اودھ میں ہوئی۔ ابتدا میں مولانا عبدالکریم شیروانی اور مولانا افتخارالدین گیلانی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ چالیس سال کی عمر میں اودھ سے دہلی آ کر سلطان المشائخ کی ارادت و عقیدت سے وابستہ ہو گئے، حضرت نے ان کو محمود گنج کا خطاب اور چراغ دہلوی کا لقب عطا کیا۔ کہتے ہیں سلطان محمد تغلق نے جو عام طور سے مشائخین کا مخالف تھا، ایک دن چراغ دہلوی کو اپنے پاس دعوت دی اور کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پیش کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر وہ کھا لیں تو اُن پر حجت شرعی قائم ہو جائے کہ سونے چاندی میں کھا کر حرام کے مرتکب ہوئے اور نہ کھائیں تو بادشاہ کی حکم عدولی میں سزا دی جائے۔ حضرت اس کی نیت بھانپ گئے۔ آپ نے تھوڑا سا کھانا ان برتنوں میں سے اُٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور کراہت سے کھا لیا۔ حاسد ایک دوسرے کا مُنہ تکتے رہ گئے۔ آپ کے خلفاء میں میر سید محمد گیسو دراز گزرے ہیں جن کا مزار گلبرگہ دکن میں ہے۔ مخدوم جہانیاں جلال الدین جہاں گشت جیسے بڑے بزرگ آپ کے مرید تھے۔ ٦٥ سال کی عمر میں شب جمعہ ١٨ ماہ رمضان المبارک ٧٥٧ھ میں وصال فرمایا۔

[2] ہانسی۔ یہ شہر ضلع حصار میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ موجودہ آبادی سولہ ہزار کے قریب ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے: "یہ خوبصورت اور مستحکم شہر ہے اس کی فصیل بھی اونچی ہے، اسے ایک ہندو راجہ تورا نے بنایا تھا۔" ابن بطوطہ "تورا" راجہ اننگ پال تور کو کہہ رہا ہے جس نے یہ شہر بسایا تھا۔ ١٧٨٣ء میں قحط سے یہ ویران ہو گیا تھا۔ ١٧٩٥ء میں جارج طامس نے دوبارہ آباد کیا۔ ١٨٠٢ء میں سرکار انگریزی کے مکمل قبضہ میں آگیا اور یہاں فوجی چھاؤنی قائم ہوئی۔ شہاب الدین غوری اور محمود غزنوی نے بھی اس شہر پر حملہ کیا تھا۔ آئین اکبری میں صرف اتنا لکھا ہے "قلعہ دارد از خشت پختہ"۔

[3] شیخ بدرالدین۔ ایک شیخ بدرالدین اسحاق سمرقندی کا ذکر "خزینۃ الاصفیاء" میں ملتا ہے جو شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے۔ ہندوستان آ کر نظام الدین اولیاء کی خدمت میں رہے۔ ٧١٦ھ میں موضع شنگولہ میں وفات پائی۔ یہ بدرالدین کوئی دوسرے بزرگ ہیں کیونکہ یہ ٧٥٢ھ میں بقید حیات ہیں۔

ان بزرگ کی خدمت میں پہنچا تو اُسے دیکھتے ہی اُن کی مبارک زبان سے یہ کلمہ نکلا" ایک کو قید کرکے بادشاہت کے لیے لیے جاتے ہیں اور خود اس کو اس کی خبر نہیں"۔ غرض جب بادشاہ کے لشکر میں یہ قیدی پہنچے تو بادشاہ نے اُسی وقت ان دونوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس حکم کے بعد ہی وہ حالت نزع میں مبتلا ہوگیا۔ محافظوں نے بادشاہ کا یہ حال دیکھ کر دونوں کو چھوڑ دیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ اسی دن بادشاہ کا بیٹا کہیں شکار پر گیا ہوا تھا اور باپ کے آخر وقت موقع پر موجود نہ تھا جب بادشاہ کا انتقال ہوگیا تو فیروز شاہ ارکین سلطنت کی تائید و اتفاق سے تخت پر بیٹھ گیا اور بادشاہ کے بیٹے کو علیحدہ کردیا۔

جب فیروز شاہ ٹھٹھ سے دہلی آیا تو اس نے حضرت شیخ بدرالدین کی خانقاہ اور لنگر کے لیے ہانسی کے ماتحت ضلع چوراسی کو وقف کردیا۔

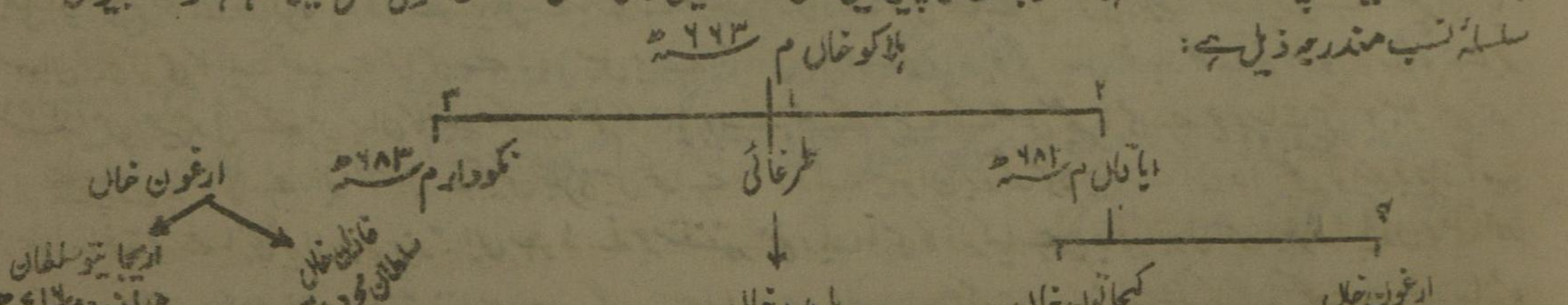
عام طور سے یہ دلچسپ واقعہ بھی مشہور ہے کہ سلطان محمد تغلق نے شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کو اپنی جامہ داری کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ ایک دن آپ نے اس کے کپڑے میں گرہ لگا کر فرمایا " نصیرالدین بندد و خدا کشاید" کہتے ہیں اُسی دن سلطان محمد کا انتقال ہوگیا۔

مغلوں کی شورش

سلطان محمد تغلق شاہ کے انتقال کی خبر سُن کر مغل[1] سر اُٹھانے لگے۔ اُنھوں نے شاہی لشکر پر چھاپے مارنے شروع کردیے۔ چنانچہ فیروز شاہ نے سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ لشکر کے ساتھ جو مغل ہیں ان کا گروہ شاہی لشکر سے علیحدہ فاصلے پر منزل کیا کرے۔ اس احتیاط کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو بادشاہ نے بذاتِ خود نگہبانی اور نگرانی کا فرض انجام دیا اور ان مغلوں کی اچھی طرح گوش مالی کرکے فوج کو ان کی

---

[1] مغل۔ وسط ایشیا کے مشہور خونی فاتح چنگیز خاں کے زمانہ یعنی چھٹی صدی ہجری میں مغلوں کے مختلف قبیلے چین سے لے کر بحر روم کے کناروں تک پھیل گئے۔ چنگیز خاں کے چار بیٹے تھے: سب سے بڑا تولے خاں، دوسرا اوکتائی قاآن، تیسرا چغتائی، چوتھا جوجی۔ چنگیز کے بعد اس کا جانشین اوکتائی قاآن ہوا، اس کے بعد اس کا بیٹا کیک قاآن۔ اس کے بعد تولے خاں کا بیٹا منگو قاآن قائم مقام ہوا۔ اس کے بعد قوبلا آن چین میں بڑا قاآن ہوا۔ اس نے اپنے بھائی ہلاکو خاں کو ایران کا " ایل خان" (ماتحت بادشاہ) بنا دیا۔ یہاں سے ہلاکو کی اولاد ایران پر حکومت کرتی رہی اور قوبلا آن کی چین میں۔ ان کے درمیان رسمی ماتحتی کے سوا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہلاکو کے بیٹوں کا سلسلۂ نسب مندرجہ ذیل ہے:



خدابندہ نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ مسلمان مغل بادشاہوں میں سلطان ابو سعید کا دور نہایت شاندار گزرا ہے۔ جو مغل سمرقند، بخارا، بلخ، بدخشاں کی طرف آباد تھے وہ اکثر ہندوستان پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض قبیلے مسلمان تھے اور بعض کا اسلام برائے نام تھا اور بعض اسی طرح غیر مسلم تھے۔ یہ قبیلے سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان پر حملے کرتے رہتے تھے۔

دست درازی سے نجات دلائی۔

خواجہ جہاں کی اطاعت

فیروز شاہ سیوستان[۱] کی راہ سے متواتر کوچ کرتے ہوئے دہلی پہنچا۔ یہاں احمد ایاز خواجہ جہاں ایک مجہول النسب لڑکے کو غیاث الدین محمود شاہ کا خطاب دے کر بادشاہ بنا بیٹھا تھا اور خود اس کا وکیل بن گیا تھا، لیکن اس کے کیے کچھ نہ بنا اور فیروز شاہ کی بادشاہت قائم ہوگئی۔ آخر بڑی ردو قدح اور گفت وشنید کے بعد خواجہ جہاں اشرف الملک اور دوسرے امرا کی وساطت سے ہانسی آیا اور پگڑی گلے میں ڈال کر ننگے سر بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے معاف کر کے ہانسی کے کوتوال کے حوالہ کر دیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس کارروائی میں خواجہ جہاں کے شریک تھے مختلف سمتوں میں منتشر کر دیا۔

جس دن فیروز شاہ نے دہلی جاتے ہوئے سرستی میں منزل کی تھی اُسی دن شاہزادہ فتح خاں کے پیدا ہونے کی خوش خبری ملی تھی اور اسی جگہ گجرات سے ملک طغی کے فتنہ و فساد کی بھی اطلاع آئی۔

فیروز شاہ کی تخت نشینی

فیروز شاہ نے ۲ رجب ۷۵۲ھ میں دہلی کے تخت پر جلوس کیا اور امرا کو از سر نو منصب اور عہدے تقسیم کیے۔ دوسرے سال ۷۵۳ھ میں وہ سرمور کی طرف شکار کے لیے گیا اور پائے تخت واپس آگیا۔ اسی سال ماہ رجب میں شاہزادہ محمد خاں کی ولادت ہوئی جس کا بعد میں ناصر الدین محمد خطاب ہوا۔

۷۵۴ھ میں سلطان کلانور کی طرف شکار کے لیے گیا اور دریائے سرستی کے کنارے ایک عمدہ اور وسیع عمارت بنوا کر شیخ صدر الدین ملتانی کے حوالہ کی۔ ملک قبول نائب وزیر کو خان جہاں کا خطاب عطا کیا۔

لکھنوتی پر حملہ

۷۵۴ھ کے آخر میں فیروز شاہ نے بنگال کے باغی حاکم حاجی الیاس کی سرکوبی کے لیے لکھنوتی پر حملہ کیا۔ یہاں حاجی الیاس نے شمس الدین خطاب رکھ کر مستقل بادشاہی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ شاہی لشکر سے ڈر کر حاجی نے بنگال کے سب سے زیادہ مضبوط قلعہ اکدالہ میں پناہ لے لی لیکن چند ہی حملوں میں اسے ہتھیار رکھ دینے پڑے اور اس کا بہت سا ساز و سامان فیروز شاہ کے ہاتھ آگیا۔ سوء اتفاق سے بارش کا موسم سر پر آگیا جس سے مجبور

---

[۱] سیوستان۔ فرشتہ نے محمد بن قاسم ثقفی کے ذکر میں لکھا ہے "جمعے از معتبران شہر ہمراہ گرفتہ متوجہ بلدہ سیوستان کہ دریں عصر بسیوان شہرت دارد گردید۔" ابن بطوطہ کہتا ہے۔ "یہ ایک بڑا شہر ہے اور ایسے ریگستان میں ہے جس میں سوائے کیکر کے کوئی اور درخت نہیں مچھلی اور بھینس کا دودھ افراط سے ملتا ہے۔ یہاں کے باشندے سقنقور یعنی ریگ ماہی کھاتے ہیں۔ گرمی نہایت سخت پڑتی ہے۔" سیوانی یا سہوان ضلع کراچی کا ایک قصبہ ہے کراچی سے ۱۹۰ میل پر ہے، آبادی ۵ ہزار سے زائد ہوگی۔ یہاں شہباز قلندر کی مشہور خانقاہ ہے جو ۱۳۵۶ء میں تعمیر ہوئی کہتے ہیں یہاں کا قلعہ سکندر اعظم کا بنایا ہوا ہے۔ شہر کے قریب ایک جھیل منچھر نامی ہے جو برسات میں ۲۰ میل لمبی اور دس میل چوڑی ہو جاتی ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے: "نزدیک سیہوان بزرگ کولابیست آں را منچور گویند بر فراز آب زمینہا ساختہ برخے ماہی گیراں بسر برند"۔ ابن بطوطہ نے جو سقنقور یعنی ریگ ماہی کا ذکر کیا ہے یہ جانور بقول ابن بطوطہ "پاؤں پر چلتا اور گوہ کی طرح ہوتا ہے"۔ عربی میں سقنقور فارسی میں ریگ ماہی ہندی میں "ریگ ماہی" "بن رو ہو" کہتے ہیں۔ اسے خشکی کی گوہ سمجھنا چاہیے۔ سانڈہ سے بڑا ہوتا ہے۔ مصر میں نیل کے کنارے بھی پایا جاتا ہے۔ صاحب مخزن نے لکھا ہے "اس نے بن رو ہو مرشد آباد میں دیکھا ہے جو ۱۱۵۱ھ میں پٹنہ کے ملک سے لائے تھے۔ یہ دو ہاتھ لمبا نصف ہاتھ چوڑا تھا، چھوٹے چھوٹے پاؤں تھے"۔

ہوکر بادشاہ نے حاجی الیاس سے صلح کرلی اور وہاں سے لوٹ گیا۔

۷۵۵ھ میں بادشاہ مانک پور کے راستے دہلی پہنچا اور جمنا کے کنارے فیروز آباد کا قلعہ تعمیر کرایا۔

نہروں کی کھدائی

۷۵۶ھ میں دیپال پور گیا اور ستلج سے ایک نہر نکال کر ۴۸ کوس کے فاصلہ پر مقام جھجر تک پہنچائی۔ ۷۵۷ھ میں مندول اور سرور کے قریب جمنا سے بھی ایک نہر نکالی اور اس میں دوسری سات نہریں ملاکر ہانسی تک اور وہاں سے اُسے راس تک پہنچایا۔ اس جگہ ایک قلعہ حصار فیروزہ کے نام سے بنوایا۔ اس قلعہ کے نیچے ایک بڑا حوض بھی بنوایا تھا جس میں نہر سے پانی آکر جمع ہوتا تھا۔ ایک اور نہر کھگر سے نکال کر قلعہ سرستی کے نیچے تک اور وہاں سے ہرنی کھرہ تک پہنچائی اور ان دونوں کے درمیان ایک اور قلعہ فیروز آباد کے نام سے بنایا

فرمانِ خلافت

۷۵۷ھ ہی میں مصر سے خلیفہ الحاکم بامراللہ ابوالفتح ابوبکر بن ابوالربیع سلیمان کے پاس سے ہندوستان کی بادشاہی کا فرمان اور خلعت آئی۔

اسی سال لکھنوتی سے حاجی الیاس کے قاصد نہایت نفیس تحائف اور نذرلے کر آئے۔ بادشاہ نے ان قاصدوں پر بڑی مہربانی کی اور حکم دیا کہ حاجی الیاس ان تحفوں کے عوض ہمیشہ عمدہ ہاتھی بھیجا کرے۔

فیروزشاہ کی سلطنت یوں تو سارے ہندوستان کو احاطہ کیے ہوئے تھی، لیکن لکھنوتی پر صلح کے بموجب حاجی الیاس ہی کی حکمرانی تھی اور دکن میں سلطان محمد مرحوم کے زمانہ ہی سے حسن کانکو بہمنی بادشاہ ہوگیا تھا۔

۷۵۹ھ میں بادشاہ نے سامانہ کا ارادہ کیا۔ مغلوں نے دیپال پور پر حملہ کردیا تھا۔ ان کی گوشمالی کے لیے اُس نے ملک قبول کو روانہ کیا۔ جب شاہی لشکر پہنچا تو مغل حسب عادت ڈر کر ولایت بھاگ گئے اور بادشاہ دہلی واپس آگیا۔

بنگالہ کے معاملات

اسی سال بادشاہ نے بہت سے تازی گھوڑے، نفیس ولایتی سامان اور دوسرے عمدہ تحفے حاجی الیاس کے قاصدوں کے ہمراہ کرکے انھیں رخصت کیا لیکن ابھی یہ قاصد راستہ ہی میں تھے کہ لکھنوتی سے حاجی الیاس کے مرنے کی خبر پہنچی اور معلوم ہوا اُس کی جگہ اُس کا لڑکا سلطان سکندر تخت نشین ہوا ہے۔ اس خبر کے ملنے پر بادشاہ نے وہ گھوڑے اور تحائف بہار میں واپس منگا لیے اور قاصدوں کو کڑے میں ملوا لیا۔

۷۶۰ھ میں بادشاہ نے خاصا بڑا لشکر لے کر دوبارہ لکھنوتی کا ارادہ کیا۔ اس نے خان جہاں کو تو دہلی کے انتظام کے لیے چھوڑا اور غزنی کی سرحد سے ملتان تک کی عملداری تاتارخاں یعنی ملک تتار کے سپرد کردی، خود ظفرآباد میں آکر بارش کے موسم کی وجہ سے ٹھہر گیا۔

اسی مقام پر اعظم ملک شیخ زادہ بسطامی مع ملک احمد ایاز کے جسے بادشاہ نے ملک بدر کردیا تھا خلیفۂ مصر کی طرف سے ایک خلعت لے کر آیا۔ بادشاہ نے اُسے اعظم خاں کا خطاب دیا۔

ظفرآباد سے ہی بادشاہ نے سید رسول دار کو لکھنوتی سے آئے ہوئے قاصدوں کے ساتھ سلطان سکندر کے پاس روانہ کیا۔ سکندر نے بھی وہاں سے پانچ ہاتھی اور کچھ تحفے بارگاہ میں روانہ کیے۔ اس سفارت اور تحائف کے

باوجود فریقین میں صلح کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور بارش ختم ہونے کے بعد فیروز شاہ نے ظفر آباد سے لکھنوتی کی طرف کوچ کر دیا۔ راستہ میں شاہزادہ فتح خاں کو سامان سلطنت، ہاتھی اور فراش خانہ لعل جو بڑی عزت کا نشان تھا عطا کیا اور اس کے نام کا سکہ بھی ضرب کرایا۔

جب بادشاہ کا لشکر پنڈورہ پہنچا تو سکندر بھی اسی قلعہ اگرالہ میں جہاں اس کے باپ نے پناہ لی تھی محصور ہو گیا بادشاہ نے کچھ عرصہ تک قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا، آخر سکندر نے ۳۷ ہاتھی اور بے شمار عمدہ تحائف دے کر صلح کر لی۔

سنہ ۷۶۱ھ میں فیروز شاہ پنڈورہ کے راستہ سے جونپور[1] لوٹ آیا اور برسات کی فصل اسی جگہ گزاری۔ اس سال کے آخر میں بہار کے راستہ سے جاج نگر روانہ ہوا اور لکھنوتی سے جو ہاتھی اور خیمہ خرگاہ ملا تھا کٹڑے بھجوا دیا۔

ہاتھیوں کا شکار

جب شاہی لشکر ست کھرہ پہنچا تو وہاں کا راجہ کسی طرف روپوش ہو گیا۔ وہاں سے لشکر بارانسی پہنچا۔ وہاں کا راجہ بڑا نامی گرامی راجہ تھا وہ ڈر کر تلنگانہ کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ کچھ دور تک اس کا تعاقب کر کے واپس آ گیا اور شکار کھیلتے ہوئے رائے پربھان دیو کے علاقہ میں پہنچا۔ رائے نے ۳۲ ہاتھی اور کچھ تحائف پیش کیے۔ یہاں سے بادشاہ پدماوتی اور پرم تلا کے جنگل میں جہاں ہاتھی بکثرت تھے شکار کے لیے گیا۔ اس نے خود دو ہاتھی مار گرائے اور ۳۳ ہاتھی زندہ پکڑوائے۔ ضیاء الدین برنی نے اس کارنامہ پر یہ رباعی کہی ہے:

شاہی کہ ز حق دولت پایندہ گرفت   اطراف جہاں چو مہر تابندہ گرفت

از بہر شکار فیل در جاج نگر   آمد دو بکشت و سی و سہ زندہ گرفت

سیر و شکار کے بعد سلطان نے بہت جلد وہاں سے مراجعت کی اور کٹرہ پہنچ گیا۔

نہر سیلمہ

سنہ ۷۶۲ھ میں سلطان کٹرہ سے دہلی آیا اور کچھ دن قیام کے بعد نہر سیلمہ کی طرف گیا۔ یہ نہر ایک ریتیلے ٹیلے سے نکل کر ستلج میں جا گرتی تھی۔ اس کو سرستی بھی کہتے ہیں۔ یہاں اس کے برابر ہی ایک دوسری نہر بھی جاری تھی۔ وہ ریتیلا پشتہ دونوں نہروں کے درمیان حائل تھا۔ اس پشتہ کے کھد جانے سے سرستی کا پانی دوسری نہر سے مل کر سہرند، منصور پور اور سامانہ کی طرف جاری ہو سکتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ پچاس ہزار بیلدار جمع ہو کر اس پشتہ کو کھود دیں۔ جب اس پشتہ کو کھودا گیا تو اس میں سے ہاتھیوں اور آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ آدمیوں کے ڈھانچوں میں ہاتھیوں کی ہڈیاں تین تین گز لمبی تھیں، کچھ گلی ہوئی تھیں اور کچھ اسی طرح باقی تھیں۔ بہرحال وہ نہر کھد نہ سکی۔

انہی دنوں بادشاہ نے اس ضلع سے سہرند کی جمع بندی سے دس کوس مسافت کی اراضی علیحدہ کر کے ضیاء الملک شمس الدین ابو رجا کے حوالہ کی۔ اس نے اس مقام پر فیروز پور کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔

نگرکوٹ کا کوہستان

یہاں سے سلطان نگرکوٹ[2] گیا اور لڑائی کے بعد قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ آخر وہاں کا راجہ

---

[1] جونپور اس وقت معمولی مقام تھا۔ فیروز شاہ نے یہاں ایک شہر کا سنگِ بنیاد رکھا اور مرحوم سلطان فخر الدین جونا کے نام پر جونپور نام رکھا۔ بعد میں اس شہر نے بڑی ترقی کی۔ یہاں ایک مستقل خاندان بھی حکمران رہا۔

[2] نگرکوٹ۔ بحوالہ آئین اکبری "پہاڑ پر آباد ہے اکبر کے صوبہ لاہور سے متعلق تھا۔ اس کے قلعہ کا نام کانگڑہ ہے، ایک ہندو دیوی مہامائی کی زیارت گاہ ہے۔"

امن کا طالب ہوا اور حاضر بارگاہ ہوگیا۔ بادشاہ نے مرحوم سلطان کے نام پر نگرکوٹ کا نام محمد آباد رکھ دیا۔

اس مقام پر پہاڑی لوگ بادشاہ کے لیے برف لے کر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے فرمایا اسی مقام پر سلطان محمد مرحوم کے لیے بھی لوگ برف لے کر آئے تھے، چونکہ میں اس وقت حاضر نہیں تھا اسی لیے سلطان نے بھی اس برف کا شربت نہیں پیا تھا۔ اس واقعہ کو یاد کر کے بادشاہ نے اس برف میں مصری ڈلوائی جو کہ ہاتھیوں اور اونٹوں پر لدی ہوئی ہمراہ تھی اور شربت تیار کرایا اور سلطان محمد کی فاتحہ کے لیے قرآن ختم کرا کے سارے لشکر میں تقسیم کرایا۔

اس موقع پر لوگوں نے بادشاہ کو بتایا کہ جب سکندر ذوالقرنین ہندوستان آیا تھا اُس وقت سے اس علاقہ کے لوگ نوشابہ کی تصویر اپنے گھروں میں رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں کے بُت خانہ میں جسے لوگ "جوالا مکھی" کہتے ہیں اگلے زمانہ کے برہمنوں کی ایک ہزار تین سو کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس جگہ سے آگ کے شعلے کافی اونچے نکلتے رہتے ہیں۔ کہ ہزاروں مشک پانی بھی ڈالا جائے تو یہ آگ نہیں بجھ سکتی۔

قدیم کتابیں

بادشاہ نے وہاں کے برہمنوں کو بلا کر وہ کتابیں منگوائیں اور اُن کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ ان کتابوں[1] میں سے ایک کتاب کو عزالدین خالد خانی نے جو اس کے عہد کے بڑے شاعروں میں سے تھا علم نجوم کے بیان میں نظم کیا اور اس کا نام "دلائل فیروزی" رکھا۔ میں نے بھی (مصنف کتاب بداؤنی) اس کتاب کو لاہور میں ۱۰۰۱ھ میں اوّل سے آخر تک دیکھا ہے۔ کچھ ایسی عمدہ اور لائق تعریف نہیں ہے۔

ٹھٹہ پر فوج کشی

محمد آباد سے بادشاہ ٹھٹھہ گیا۔ وہاں کا حاکم جسے جام[2] کہتے ہیں، قلعہ بند ہوگیا۔ اس ضلع میں بارش کی کثرت سے ندی نالوں اور دریاؤں کا جال سا بچھا ہوا تھا غلہ بھی گراں تھا اس لیئے بادشاہ زیادہ عرصہ تک محاصرہ جاری نہیں رکھ سکا اور وہاں سے گجرات چلا گیا۔ وہاں کے حاکم نظام الملک کو نائب وزیر بنا کر دہلی روانہ کر دیا اور اس کی جگہ ظفر خاں کو گجرات کی حکومت پر متقرر کر دیا۔ وہاں سے پھر ٹھٹھہ لوٹ کر آیا۔ اس مرتبہ جام نے امن کی درخواست کی اور بارگاہ شاہی میں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ کے رکاب ہی میں دہلی آیا، وہاں نوازش خسروانہ سے حسب سابق ٹھٹھہ کی حکومت پر دوبارہ قائم ہوگیا۔

---

[1] ان کتابوں میں جو سلطان فیروز کے نام پر ترجمہ ہوئی تھیں، کچھ تو فن موسیقی سے متعلق تھیں اور بعض میں کشتی کے داؤ پیچ کا ذکر تھا۔ دوسری ایسے ہی مختلف اور عام موضوعات پر تھیں۔

[2] ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے "یہ قدیم زمانہ سے خود مختار جداگانہ ریاست تھی۔ پہلے اس کا پائے تخت برہمن آباد تھا۔ یہاں ایک مستحکم قلعہ ہے اور اس کے ساتھ ایک بڑا شہر ہے۔ اس قلعہ میں ۱۴۰۰ برج ہیں، اب بھی اس کے نشان ملتے ہیں۔ زیادہ تر آبادی بلوچیوں کی رہی ہے۔ یہاں زمانۂ قدیم میں ایک راجہ سہرس نامی حکمران تھا، ایرانیوں سے جنگ میں یہ مارا گیا اور اس کا لڑکا رائے ساہی تخت نشین ہوا۔ اس کے وزیر رام کے پاس ایک برہمن جو چچ (ججّ) ملازم تھا بتدریج اس کا اقتدار بڑھتا گیا اور یہ وزیر کا جانشین ہوگیا۔ رانی سے اس کے ناجائز تعلقات تھے راجہ کے مرنے پر رانی کی مدد سے یہ تخت نشین ہوگیا۔ چچ کے خاندان سے ہی راجہ داہر تھا جسے محمد بن قاسم نے شکست دی تھی۔ محمد بن قاسم کے زمانہ سے بنی اُمیّہ کے عہد میں فرزندان تمیم انصاری سندھ پر قابض رہے۔ اس کے بعد سومرگاں (سمرہ) خاندان نے ۵۰۰ سال حکومت کی۔ اس کے بعد تقریباً پون صدی سمیہ خاندانوں کے بادشاہ جو "جام" کہلاتے تھے حکمران رہے۔ پھر اٹھائیس برس تک تغلق خاندان کی بالادستی قائم رہی جس وقت فیروز شاہ نے حملہ کیا ہے، جام بانہتیہ حکمران تھا۔ ابوالفضل کہتا ہے مذکورہ جام سے فیروز شاہ کی تین مرتبہ لڑائی ہوئی اور تیسری بار اس نے اطاعت

وزیر اور شہزادہ کی رحلت

۷۷۲ھ میں خان جہاں وزیر نے انتقال کیا تو اس کی جگہ اس کا لڑکا جونا شہ وزیر بنا اسے بھی خان جہاں[1] کا خطاب عطا ہوا۔

۷۷۳ھ میں ظفر خاں کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ گجرات کی حکومت پر اس کا بیٹا مامور کیا گیا۔

۷۷۶ھ میں شاہزادہ فتح خاں کے انتقال کا سانحہ پیش آیا جس سے بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا۔

شمس الدین کی بغاوت

اسی سال شمس الدین[2] دامغانی کو زریں کمر پٹے اور نقرئی چنڈول کا اعزاز عطا ہوا۔ اس نے گجرات کی حکومت اس شرط پر قبول کی تھی کہ ہر سال سو ہاتھی اور دو سو تازی گھوڑے اور چار سو غلام اور دوسرا مال و اسباب اور نقدی بارگاہ شاہی میں روانہ کرے گا، لیکن وہ اس قدر مال وہاں سے حاصل نہ کر سکا اور بغاوت اختیار کر لی

۷۷۸ھ میں گجرات کے امیرانِ صدہ نے اسے قتل کر دیا اور اس کا سر بادشاہ کے پاس دہلی بھیج دیا۔ اس کے بعد گجرات کی عملداری فرحتہ الملک عرف ملک مفرح سلطانی کو عطا کی گئی۔

اٹاوہ پر فوج کشی

۷۷۹ھ میں بادشاہ نے اٹاوہ[3] اور اکھٹ کے علاقہ پر حملہ کیا، وہاں کے راجاؤں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور ان کو مع اہل و عیال دہلی روانہ کر دیا۔ اس علاقہ کے فتح ہونے کے بعد یہاں حکم شاہی سے کئی ایک قلعے بنائے گئے۔ فیروز پور[4] اور بیٹلاہی ملک تاج الدین ترک کے لڑکے کو اور اکھٹ کا علاقہ ملک افغان کو سپرد کر کے بادشاہ دہلی واپس آ گیا۔

اسی سال حاکم اودھ[5] ملک نظام الدین کا جو اس مہم میں بادشاہ کے ہمرکاب تھا انتقال ہو گیا اور اس کا علاقہ اس کے بیٹے سیف الدین کے سپرد کر دیا گیا۔

---

[1] مولانا داؤد نے لورک اور چاندا کے عشق کی داستان مثنوی چنداین کے نام سے اسی خان جہاں سے منسوب کی ہے۔ یہ مثنوی بڑی اثر انگیز اور صاحبانِ ذوق کے لیے وجد آور ہے۔ ہندوستان کے گویّے اسے بڑے مزے سے گایا کرتے تھے۔ مخدوم شیخ تقی الدین واعظ بھی اس کے بعض شعر دہلی میں منبر پر پڑھا کرتے تھے اور اسے سن کر لوگوں پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ ایک عالم نے شیخ ممدوح سے پوچھا منبر پر اس ہندی مثنوی کو آپ کیوں پڑھا کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا اس کے سارے مطالب اہل تصوف کے اقوال اور آیاتِ قرآنی کے مطابق ہیں۔

[2] یہ شخص مانک پور کا رہنے والا تھا۔

[3] اٹاوہ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے "قلعہ ہے دریائے جمن کے کنارے پر" یہاں چوہان راجاؤں کی حکومت تھی کانپور اور آگرہ کے درمیان اب یہ ایک اوسط درجہ کا شہر ہے۔

[4] ایک فیروز پور تو بنگال میں ہے، اس فیروز پور کا ذکر "آئین اکبری" میں سرکار تجارہ صوبہ آگرہ کے جدول میں کیا گیا ہے۔ "قلعہ دامنِ کوہ میں واقع ہے اور اس پہاڑ میں ایک چشمہ ہے اور اس جگہ مہادیو کی مورت بنائی گئی ہے۔ یہ ہندوؤں کا معبد ہے۔ چشمہ ہمیشہ جاری رہتا ہے یہاں کے زمیندار میئو ہیں۔

[5] اودھ۔ بادشاہی زمانہ میں اس صوبہ کی حدود کم و بیش گورکھپور سے قنوج اور شمالی کوہستان سے صوبہ الہ آباد کی سرحد سدہ پور تک تھیں مشرق میں بہار، شمال میں کوہستان، جنوب میں مانک پور اور مغرب میں شہر قنوج واقع تھا۔ یہاں کے دو دریا سرو اور گھاگھرا ہیں۔ اودھ شہر کا نام بھی تھا۔ یہاں زمانہ قدیم میں اجودھیا آباد تھا، جو راجہ رام چندر جی کا مولد اور مسکن ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کا مقدس تیرتھ رہا ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سامانہ اور سنتور کی مہم

۷۸۱ھ میں سلطان فیروز شاہ نے سامانہ کا رخ کیا اور انبالہ[1] سے آگے بڑھ کر سنتور کے کوہستان پر لشکر کشی کی۔ وہاں کے راجاؤں سے قیمتی نذرانے لے کر دارالسلطنت واپس آگیا۔

بادشاہ نے نصیر خاں کو کڑے اور مہوبہ[2] کے ضلع سے واپس بلاکر مغلوں کی سرکوبی کے لیے ملتان کی طرف متعین کیا اور مہوبے کا ضلع اس کے بیٹے سلیمان کے سپرد کر دیا۔ یہ نصیر خاں وہی شخص ہے جس نے سلطان علی الدین بدایونی کے دادا سید خضر خاں کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔

کیتھل کی مہم

۷۸۲ھ میں سلطان نے کیتھل[3] کی مہم ہاتھ میں لی۔ کیتھل کا مقدم رائے کھوکر تھا، اس نے بدایوں کے حاکم سید محمد اور سید علی الدین کو جو حقیقی بھائی تھے دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ ان بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ہی سلطان نے فوج کشی کی تھی۔ بادشاہ کے پہنچنے کی خبر پاکر کھوکر کمایوں کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے کیتھل کو تاخت و تاراج کرکے تباہ کر دیا اور کھوکر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ملک افغان کو سنبھل[4] میں متعین کر دیا۔ ملک قبول کو بدایوں کی عملداری پر روانہ کیا۔ بدایوں میں محلہ قبول پوری اسی کی یادگار ہے۔ ہر سال وہ شکار کے لیے کیتھل آکر اسے لوٹ لیتا تھا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ دہلی واپس آگیا۔

قلعہ فیروز پور کی تعمیر

۷۸۷ھ میں سلطان فیروز شاہ نے بدایوں سے سات کوس کے فاصلہ پر موضع بیولی میں جسے بوآسا بھی کہتے ہیں ایک قلعہ تیار کرا کے اس کا نام فیروز پور رکھا۔ یہ فیروز شاہ کی سب سے آخری تعمیر[5] ہے اس لیے اسے آخرین پور بھی کہا جاتا ہے۔ اب اس قلعہ کی عمارت باقی نہیں ہے، اس کی جگہ ایک ٹیلہ بطور نشانی رہ گیا ہے۔

خان جہاں کی فتنہ پردازی

اس وقت بادشاہ کی عمر نوے سال کی ہو چکی تھی۔ عمر کے تقاضا سے عقل و دانے

(بقیہ اودھ صفحہ گذشتہ) شہر سے ایک کوس پر (ستی ندی) دریائے گھاگھرا، دریائے سرو (ستی) سے مل گئی ہے اور قلعہ کے نیچے سے گزرتی ہے۔ شہر سے قریب دو قبریں ہیں جو چھ سات گز لمبی ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یہ حضرت شیث ؑ اور ایوب ؑ پیغمبروں کے مزار ہیں۔ قریب ہی رتن پور میں کبیر داس موحد کی قبر بتائی جاتی ہے۔ کبیر داس سکندر لودی کے زمانہ میں گزرا ہے۔ اس کے دوہے مشہور زبان زد عام ہیں، اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی، اس کے اشعار سے حق شناسی اور فقر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس صوبہ میں بہرائچ، لکھنو، سورج کنڈ بنگرام شامل تھے اور ان پانچ سرکاروں کے تحت ۱۳۸ پرگنے تھے۔ موجودہ شہر فیض آباد سے چند کوس پر اجودھیا کا گھاٹ ہے۔ گھاٹ کے کنارے عمارتوں کی قطار بڑا اچھا منظر پیش کرتی ہے۔

[1] بادشاہی زمانہ میں چھوٹا سا شہر تھا اور صوبۂ دہلی کے ماتحت سرکار سرہند سے متعلق تھا۔ یہاں بارہہ قبیلہ اور جاٹ زیادہ آباد تھے۔

[2] آئین اکبری میں اس کا نام مہویا درج ہے، یہاں ایک سنگین قلعہ ہے اس کی عمارت دو رنگ کے پتھروں سے بنائی گئی۔ ایک بڑا پہاڑ بھی ہے۔

[3] کیتھل۔ آئین اکبری میں یہ سرکار سرہند صوبہ دہلی کے تحت درج ہے۔ یہاں راجپوتوں کی قوم آباد تھی۔ ابوالفضل نے صرف اتنا لکھا ہے "یہاں ایک خشتی قلعہ ہے اور ہندوؤں کی مقدس زیارت گاہ ہے۔"

[4] بحوالہ آئین اکبری۔ سنبھل۔ "صوبۂ دہلی کی سرکار تھا یہاں ایک خشتی قلعہ بھی ہے۔"

[5] یہ قلعہ جس موضع میں تعمیر ہوا اسے بسولی لکھا گیا ہے۔ فیروز شاہ نے ندیوں دریاؤں کے بند بندھوائے۔ کئی ایک محلے اور بے شمار باغ اس کی یادگار ہیں۔ شہروں میں فیروزہ حصار، فیروز آباد، جونپور اس کے بسائے ہوئے ہیں۔

میں ضعف پیدا ہو چلا تھا۔ وزیر خان جہاں حاسد مزاج تھا، وہ کسی دوسرے امیر کی ترقی اور وقعت دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے بادشاہ کو بہکا کر کچھ بے قصور امیروں کو دربار سے نکلوا دیا اور بعض کو قتل کروا دیا، بعض امیروں کے خلاف یہ بہتان باندھا کہ وہ شاہزادہ محمد خاں سے مل گئے ہیں اور اسے تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کی باتوں کا یقین کر کے اُن کے قتل کا تہیہ کر لیا اور شاہزادہ بھی ڈر کے مارے مُنہ چھپاتا رہا۔ آخر ایک دن شہزادہ نے خلوت میں باپ سے گفتگو کی اور خان جہاں کے سارے فریب کھول کر رکھ دیے۔

خان جہاں کی شکست

جب سلطان کو اس کی فتنہ پردازیوں کی حقیقت معلوم ہوئی تو اُس نے شاہزادہ محمد خاں کو اُس کی گوشمالی کے لیے گوٹہ کی طرف روانہ کیا۔ شاہزادہ نے حسب الحکم بہت سے امیروں اور لشکر کو اپنے ساتھ لیا اور ماہ رجب ۷۸۹ھ میں خان جہاں کی سرکوبی کے لیئے روانہ ہوا۔ خان جہاں نے شاہی لشکر سے مقابلہ کیا لیکن زخمی ہو کر میوات کی طرف بھاگ گیا اور وہاں کے ایک زمیندار کوکا نامی کے گھر میں پناہ لی۔ شاہزادہ نے اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور جو امیر خان جہاں کے شریک و مشیر تھے اُنھیں مناسب سزا دی۔

فیروز شاہ کی گوشہ نشینی

اس واقعہ کے بعد شاہزادہ کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے اور وہ عملاً مطلق العنان ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی شاہی لوازمات ہاتھی، گھوڑے اور سلطنت کے اعزازات اسے عطا کر کے ماہ شعبان ۷۸۹ھ میں اُسے تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور خود عبادت الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو گیا۔ اس دن سے جمعہ کے خطبہ میں دونوں بادشاہوں کا نام لیا جاتا تھا۔

خان جہاں کا قتل

محمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد از سر نو امیروں کو عہدے اور جاگیریں تقسیم کیں۔ ملک یعقوب کو سکندر خاں کا خطاب دے کر خان جہاں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ میوات کے زمیندار کوکا چوہان نے خان جہاں کو پکڑ کر سکندر خاں کے حوالہ کر دیا۔ سکندر نے اُسے قتل کر کے اس کا سر بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ اور خود گجرات چلا گیا۔

امیران صدہ کا فساد

۷۹۰ھ میں محمد شاہ شکار کے لیے کوہ سرمور کی طرف گیا ہوا تھا، ادھر گجرات میں ملک مفرح نے امیران صدہ کی مدد سے سکندر خاں کو مار ڈالا اور اس کا لُٹا پٹا لشکر سپہ سالار کی سرکردگی میں بُرے حالوں لوٹ کر دہلی آیا۔ جب بادشاہ سرمور سے لوٹ کر پائے تخت پہنچا تو اُس نے جوانی کی ترنگ میں بڑی لاپرواہی برتی، سکندر خاں کے انتقام کی فکر نہیں کی اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔

لشکریوں کی بغاوت

محمد شاہ کی اس غفلت اور کمزوری کی وجہ سے شرپسندوں کی جرأتیں بڑھ گئیں اور ملک میں نت نئے فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے ——— محمد شاہ کے حضور میں سماء الدین[1] اور کمال الدین نام دو امیر نہایت مقرب اور نظم مملکت میں دخیل ہو گئے تھے، اُن کے عمل دخل کو دیکھ کر فیروز شاہ کے قدیم لشکری اور امیر سخت برہم تھے چنانچہ یہ سب بغاوت کے ارادہ سے ایک میدان میں اکٹھا ہو گئے۔ محمد شاہ نے اُن کو سمجھانے

---

[1] دوسری تاریخوں میں یہ نام بہاؤالدین اور کمال الدین ہیں۔ یہ دونوں ناصرالدین محمد شاہ کے عم زاد بھائی تھے۔

کے لیے ملک ظہیر الدین لاہوری کو روانہ کیا۔ باغیوں نے اس کی ایک نہیں سنی اور اسے پتھر مار مار کر زخمی کر دیا۔ ظہیر الدین اسی حالت میں لہولہان محمد شاہ کے پاس آیا اور اس سے فریاد کی۔ شاہزادہ نے اپنی خاص جمعیت کو اکٹھا کر کے سرکش لشکریوں پر حملہ کر کے انھیں منتشر کر دیا، یہ بھاگ کر سلطان فیروز کی پناہ میں چلے گئے اور دوبارہ تیاری کر کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ دو دن تک فریقین میں سخت لڑائی ہوتی رہی۔

فیروز شاہ میدان جنگ میں

جب باغیوں نے دیکھا کہ مقابلہ میں ان کا پہلو دبتا جا رہا ہے تو انھوں نے بوڑھے فیروز شاہ کو بہکا کر بیٹے کے مقابلہ کے لیے آمادہ کر لیا اور لاغر و کمزور بادشاہ کو اپنے ساتھ میدان میں لے آئے۔ باغیوں کی یہ چال بڑی کارگر ہوئی۔ جیسے ہی محمد شاہ کے لشکریوں اور فیل بانوں نے میدان میں مقابلہ پر بوڑھے بادشاہ کو دیکھا، فوراً لڑائی بند کر دی اور باغی لشکر سے مل گئے۔ محمد شاہ کے ساتھ گنتی کے چند آدمی رہ گئے۔ وہ بیچارا انھیں ساتھ لے کر سرمور کے پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا۔ فیروز شاہ کی رکاب میں اس وقت ایک لاکھ کا لشکر تھا۔ سوار اور پیادے اس کامیابی کے بعد محمد شاہ کے محلات میں گھس گئے اور اس کے تمام مقربوں اور حواریوں کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ فیروز شاہ نے بھی اہل غرض کے بہکانے سے محمد شاہ کی ولی عہدی کی منسوخی کا اعلان کر دیا اور اس کے بجائے فتح خاں کے بیٹے تغلق خاں کو تغلق شاہ کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنا لیا۔ تغلق شاہ نے اختیارات پاتے ہی بادشاہ کے داماد میر حسن کو جو محمد شاہ کا دوست اور حامی تھا قتل کرا دیا اور غالب خاں حاکم سامانہ کو جلا وطن کر کے سامانہ بھیج دیا۔

فیروز شاہ کی وفات

۱۸ر رمضان ۷۹۰ھ[1] میں فیروز شاہ کا انتقال ہوا۔ اسے حوض خاص کے کنارے دفن کیا گیا اور اس کے مرقد پر ایک بڑا گنبد تعمیر کرا دیا گیا۔ اس کی وفات کی تاریخیں ہیں "وفات فیروز"، "نقل فیروز شاہ"۔ اس دوسری تاریخ میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

عہد فیروز شاہی کے شاعر

فیروز شاہ نے ۳۸ سال چند ماہ حکومت[2] کی۔ اس کے عہد کے بڑے شاعروں میں سے امیر خسروؒ کا بیٹا ملک احمد تھا، یہ بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ اس کا کوئی دیوان مشہور نہیں لیکن یہ بڑا قادر الکلام نقاد تھا۔ اس نے متقدمین کے کلام پر جو جرح اور گرفت کی ہے اسے اکثر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

ملک احمد کی اصلاحیں

مشہور شاعر ظہیر کے شعر میں اس نے جو تصرف کیا وہ کچھ اس طرح ہے۔ ظہیر کا شعر تھا؎

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ
ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

ملک احمد نے کہا پہلا مصرعہ اس طرح ہونا چاہیے: ع

زہے طپانچۂ قہر تو از طریق نفاذ

---

[1] عیسوی سن ۲۳ر اکتوبر ۱۳۸۸ء ہوتا ہے۔

[2] واضح رہے فیروز شاہ نے جس وقت ۲۳ر محرم ۷۵۲ھ م ۲۳ر مارچ ۱۳۵۱ء میں تخت پر جلوس کیا تو اس کی عمر پچاس سے اوپر ہو چکی تھی۔

اور مصرعہ ثانی میں "ربودہ" کی جگہ "فگندہ" ہونا چاہیئے۔

(واقعی اس اصلاح کے بعد شعر کی شان دوبالا ہو جاتی ہے (م))

حسب ذیل شعر میں بھی اس کی اصلاح قابل تعریف ہے۔ اصل شعر ہے ؎

ایں سہل بود کہ گوگرد سرخ خواست
گہ زان خواجہ خواستی آں را چہ کردی

ملک احمد نے اسے اس طرح تبدیل کر دیا۔ ع

ایں سہل بود کہ آب حیات خواست

ایک شعر اور اس کی تصحیح کا نمونہ ہے۔ اصل شعر تھا ؎

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج
نرخ گہر بطعن خریدار نشکند

ملک احمد نے اس کے پہلے مصرع کو تبدیل کر دیا۔ ع

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج
(نرخ گہر بہ طعن خریدار نشکند

(مشتری اور خریدار کی لفظی مناسبت کتنی عمدہ ہے (م))

میری (بداؤنی مصنف ہذا) کی نظر سے اس کی اصلاح کے اور بھی شعر گزرے تھے لیکن یاد نہیں رہے۔ ملک احمد امیر خسرو کے فرزند تھے اس لیے متقدمین کے کلام میں ان کے تصرّف و تبدیل کو بادشاہ اور اس زمانہ کے امیر اور اہل علم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔[۱]

اس عہد کے دوسرے شاعر مولانا مظہر کڑہ تھے۔ اُن کی اولاد میرے اس عہد تک لکھنوتی میں موجود ہے اور اپنے بزرگوں کے وقت سے برابر عزت و مراتب پر فائز ہے۔ مولانا مظہر کا ایک دیوان بھی ہے جس میں پندرہ سولہ ہزار شعر ہیں۔ ان کے کلام پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا اور مقصدیت کے تناسب سے شعریت دب کر رہ گئی تھی اس لیے ان کی فضیلت کا جتنا چرچا تھا اتنا ان کے شعر رواج نہ پا سکے۔ بہر حال بنظر غور دیکھنے پر ان کے کلام کی ندرت واضح ہوتی ہے۔

فیروز شاہ عادل[۲] کے زمانہ میں تیسرے شاعر قاضی عابد گزرے ہیں جن کا یہ قطعہ مشہور ہے:

---

[۱] امیر خسرو کے فرزند بھی ہوتے تو ان کی اصلاحیں اس پایہ کی تھیں کہ انھیں بہر حال پسند کیا جاتا۔ اس زمانہ میں نہیں تو بعد میں۔

[۲] فیروز شاہ کی اصلاحات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ یہ اختصار خود فیروز شاہ کی تصنیف "فتوحاتِ فیروز شاہی" سے ماخوذ ہے:

۱۔ میں نے وحشیانہ سزائیں جیسے مثلہ کرنا، اندھا کرنا، آگ میں جلانا، کھال کھچوانا، ناخنوں میں کیلیں ٹھکوانا، بدن کے دو ٹکڑے کرنا، سب موقوف کرا دیں۔

۲۔ محمد تغلق کے زمانہ میں خطبہ سے جن نامور شاہانِ اسلام کے نام خارج ہو گئے تھے انھیں شامل کرایا۔

۳۔ فیروز شاہ سے پہلے ظالمانہ اور ناجائز محصول عائد تھے جیسے چرائی، گلفروشی، دندانی، نیلگری، ماہی فروشی، ریسمان فروشی، بھڑبھونجی، بھنوائی، دوکانوں کے کرائے، تہ بازاری، دادبیگی، کوتوالی، احتساب وغیرہ، یہ سب محصول میں نے بند کرا دیے اور حکم دیا ایسا ناجائز اور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پہ)

دوستاں گویند عابد باچنیں طبع لطیف — چیست اشعار و غزل از تو فراواں برنخاست
با کراشعر و غزل گوئیم چوں در عہد ما — شاہدی موزوں و ممدوح زرافشاں برنخاست

یہ قطعہ دراصل "مقامات حریری" کے ان عربی اشعار کا ترجمہ ہے:

قالو ترکت الشعر قلت ضرورۃً — باب الدواعی والبواعث مغلق
خلت الدیار فلا کریم یرتجیٰ — عزہ النوائی ولا ملیح یعشق
ومن العجائب انہ لا یشتریٰ — ومع الکساد یخان فیہ ویسرق

سلطان تغلق شاہ

تغلق شاہ فتح خاں مرحوم شاہزادے کا لڑکا تھا۔ دادا کی وصیت کے مطابق ۷۹۰ھ میں وہ تخت نشین ہوا اور غیاث الدین تغلق اپنا خطاب رکھا۔ محمد شاہ کے مقابلہ کے لیے اس نے فوج روانہ کی۔ محمد شاہ نے تھوڑا بہت مقابلہ کیا۔

(بقیہ حاشیہ فیروز شاہ کی اصلاحات صفحہ گزشتہ) خلاف شرع روپیہ خزانہ میں داخل نہ ہو۔

۴۔ پہلے مال غنیمت میں سے خمس لشکر کو اور چار حصے بادشاہ کے حصے میں آتے تھے۔ فیروز شاہ خود لکھتا ہے "میں نے اس کے بالعکس کیا اور خود خمس لینا اور چار حصہ فوج کو دینا اختیار کیا۔

۵۔ مذہب اثنا عشریہ کی کتابوں، رسالوں اور اُن کے مذہب کی اشاعت ہونے لگی تھی، میں نے اُسے قطعاً مسدود کرادیا۔

۶۔ میں نے ملحد لامشرب اور بدمشرب لوگوں کو ملک بدر کردیا کہ وہ اوروں کو گمراہ نہ کریں۔

۷۔ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے تھے جو پارچہ ہائے ریشمی، زیور طلائی و نقری پہنتے تھے اور ظروف نقرہ میں کھانا کھاتے تھے، اسے خلاف شرع سمجھ کر اس کی مطلقاً ممانعت کردی۔

۸۔ ایک شخص رکن الدین نامی نے دعویٰ مہدیت و عالم الغیب ہونے کا کیا تھا اُس کو میں نے قتل کر کے اس کے گروہ کو منتشر کردیا۔

۹۔ حسین امیروہی نے "انی انا اللہ" کہنا شروع کیا اُس کو بھی قتل کردیا۔

۱۰۔ مسلمانوں کی عورتوں نے خلاف شرع یہ شعار بنالیا تھا کہ بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کے بہانے میلوں میں جاتیں اور وہاں ناجائز فعل کرتی تھیں، اس کی ممانعت میں میں نے قطعی حکم صادر کیے۔

۱۱۔ ہندوؤں کو نئے مندر تعمیر کرنے کی ممانعت کردی۔ کسی نے بنایا تو منہدم کرادیا۔

۱۲۔ صالح آباد میں ایک مندر تعمیر کیا گیا تھا اُسے گرادیا۔

۱۳۔ ایک اور گاؤں میں نیا مندر تعمیر ہوا تھا اُسے بھی گرادیا۔

۱۴۔ پہلے کے بادشاہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے لگے تھے اور تلواروں کے قبضے مرصع کراتے تھے ان سب کا استعمال میں نے موقوف کرادیا۔

۱۵۔ مکانوں میں ذی روح کی تصاویر لوگ نقش کراتے تھے اُس کو بند کرا کے میں نے یہ حکم دیا کہ ان کے بجائے غیر ذی روح کی تصویریں گل بوٹے وغیرہ بنائیں۔

۱۶۔ میں نے قدیم عمارتوں کو جو پہلے بادشاہوں کے عہد میں منہدم ہوگئی تھیں از سر نو مرمت کرا کے آباد کیا اور ایسی جائدادیں ان کے لیے وقف کیں کہ وہ ہمیشہ آباد رہیں۔

۱۷۔ جو محصول رعایا پر گراں اور ناگوار تھا، موقوف کرادیا۔

۱۸۔ میں نے زنان بازاری کا جو علانیہ فحش کرتی تھیں نکاح کرانے کا حکم دیا تھا لیکن ارکین سلطنت نے عرض کیا کہ اگر ان کا نکاح کرادیا گیا تو اکثر لشکری شادی شدہ عورتوں کے زنا (زنائے محصنہ) میں مبتلا ہو جائیں گے، لہذا میں نے سکوت اختیار کرلیا۔

پھر نگرکوٹ کی طرف بھاگ گیا۔ نگرکوٹ دشوار گزار راستہ پر ہے اس لیے شاہی فوج اس کا تعاقب نہ کر سکی۔

اسی اثناء میں بادشاہ کے بھتیجے ابوبکر خاں نے ملک رکن الدین اور دوسرے امراء کی سازش سے بغاوت کی اور تغلق شاہ کی جائے سکونت فیروز آباد میں داخل ہو گیا اور اُس کے محل خاص کے دروازہ پر ملک مبارک کبیر کو قتل کر دیا۔ تغلق شاہ اور خان جہاں وزیر دوسرے دروازہ سے فرار ہو گئے۔ ابوبکر نے اُن کا تعاقب کر کے قتل کر دیا اور اُن کے سر شہر کے دروازہ پر لٹکا دیے۔ یہ سانحہ ۷۹۱ھ میں پیش آیا۔ اس طرح تغلق شاہ کی حکومت صرف پانچ ماہ ۱۸ دن رہی۔

سلطان ابوبکر شاہ بن ظفر خاں

تغلق شاہ کے قتل کے بعد احمق امیروں کے اتفاق سے ابوبکر شاہ تخت نشین ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے امیروں اور سرداروں کو مناصب اور عہدے تقسیم کر دیے اور رکن الدین جندہ کو اپنا وزیر بنایا لیکن کچھ ہی دن بعد معلوم ہوا کہ رکن الدین کی نیت بھلی نہیں۔ وہ بعض امیروں سے اپنی بادشاہی جمانے کی سازش کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی ابوبکر شاہ نے رکن الدین اور اُس کے مشیروں کو قتل کرا دیا اور اُن کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اس پہلی ہی سخت کارروائی کی وجہ سے اس کی حکومت مستحکم ہو گئی۔

سامانہ کے امیران صدہ

اسی دوران میں سامانہ کے امیران صدہ نے امیر سامانہ ملک سلطان شہ خوش حال کو جو محمد شاہ کے مقابلہ پر مامور کیا گیا تھا۔ سامانہ کے تالاب کے کنارے قتل کر دیا اور اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، اُس کا گھر بار لوٹ لیا، اس کا سر نگرکوٹ میں شاہزادہ محمد شاہ کے پاس بھجوا دیا اور اُسے نگرکوٹ سے سامانہ آنے کی دعوت دی۔

دہلی پر محمد شاہ کی چڑھائی

امیرانِ صدہ کے پیغام اور مطالبہ پر محمد شاہ نگرکوٹ سے کوچ پر کوچ کرتے ہوئے جالندھر کے راستہ سے سامانہ پہنچ گیا اور شاہانہ اسباب مہیا کر کے دوبارہ ماہ ربیع الاول ۷۹۱ھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

ماہ ربیع الآخر ۷۹۱ھ میں محمد شاہ نے پچاس ہزار کا لشکر لے کر دہلی کی طرف اقدام کیا اور قصر جہاں نما میں آ کر ٹھہر گیا۔ امراء کو منصب اور اعزاز عطا کیے۔ ملک سرور کو خواجہ جہاں اور ملک الشرق نصیر الدین حاکم ملتان کو خضر خاں کا خطاب دیا۔

محمد شاہ اور ابوبکر شاہ کا مقابلہ

محمد شاہ کے مقابلہ پر ابوبکر شاہ نے بھی بہادر ناہر میواتی کی مدد سے صف آرائی کی۔ ماہ جمادی الاوّل سن مذکور میں فیروز آباد کے میدان میں فریقین نے ایک گھمسان کی جنگ کی۔ محمد شاہ کی بدنصیبی اس کے ساتھ تھی اسے شکست ہوئی اور وہ دو ہزار سواروں کی حفاظت میں جمنا پار کر کے دوآبہ کے علاقہ میں چلا گیا، پھر وہاں سے اُس نے اپنے منجھلے بیٹے ہمایوں خاں کو سامانہ کمک لانے کے لیے

بھیجا، وہ وہاں سے تیاری کے ساتھ پچاس ہزار سواروں کا لشکر لے کر آیا۔ اس لشکر کو لے کر محمد شاہ نے دوبارہ دہلی پر حملہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی اسے ابوبکر شاہ کے مقابلہ میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ابوبکر شاہ نے کچھ دور تک اس کا تعاقب کیا۔ محمد شاہ کا سارا ساز و سامان اور لشکر تباہ ہوگیا اور وہ بُرے حالوں گنگا کے کنارے ایک قصبہ جیتور میں پناہ گزین ہوگیا۔

ہمایوں خاں کا حملہ اور شکست

۷۹۲ھ میں شہزادہ ہمایوں خاں نے سامانہ کے بہت سے امراء کی مدد سے دہلی پر ایک بار پھر حملہ کیا اور شہر کے مضافات کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ اس کے سدباب کے لیے ابوبکر شاہ نے عماد الملک کو چار ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔ پانی پت کے میدان میں دونوں فوجیں مقابل ہوئیں۔ ہمایوں خاں شکست کھا کر سامانہ بھاگ گیا۔

ایک شہر، دو بادشاہ

ماہ جمادی الاول ۷۹۲ھ میں ابوبکر شاہ ایک بھاری لشکر لے کر محمد شاہ کے فتنہ کو یکسر ختم کر دینے کے خیال سے جیتر کی طرف روانہ ہوا اور دہلی سے بیس کوس فاصلہ طے کر کے پڑاؤ ڈالا۔

اس موقع پر محمد شاہ نے ایک گہری چال چلی۔ وہ ابوبکر شاہ کے لشکر کو دھوکا دے کر ایک دوسرے راستہ سے دہلی میں داخل ہوگیا اور قصر ہمایوں میں جا کر قیام کیا شہر کے سب خواص و عوام اس سے مل گئے۔

ابوبکر شاہ کو جب غنیم کی اس کارروائی کا علم ہوا تو اُلٹے پاؤں دہلی لوٹا اور ملک بہاء الدین جنگی کو جو محمد شاہ کی طرف سے دروازہ کا محافظ تھا قتل کر کے شہر میں داخل ہوگیا اور سیدھا قصر ہمایوں کا رخ کیا۔

محمد شاہ اس حملہ سے غافل تھا۔ مقابلہ کی تاب نہ پا کر گھبرا گیا۔ جو امیر اس سے مل گئے تھے وہ اس حملہ میں مارے گئے۔ اب محمد شاہ میں ابوبکر شاہ کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ مسلسل ناکامیوں نے اس کا دل توڑ دیا تھا لیکن رعایا اور لشکر والوں کی ہمدردیاں اسی کے ساتھ تھیں اور یہ سب ابوبکر شاہ سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔

دہلی پر محمد شاہ کا قبضہ

اس سال کے ماہ رمضان میں مبشر چپ اور فیروز شاہ کے عہد کے بعض امراء نے جو مختلف وجوہ سے ابوبکر شاہ سے ناراض تھے محمد شاہ کے پاس خفیہ خطوط روانہ کیے اور اس سے حملہ کرنے کی استدعا کی۔ جب ابوبکر شاہ کو امراء کی اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ نہایت پریشان ہوا اور بہادر ناہر سے مدد لینے کے لیے کوٹلہ میوات کی طرف روانہ ہوگیا۔ دہلی میں ملک شاہین، عماد الملک، ملک بحری اور صفدر خاں کو چھوڑ گیا۔

اس موقع پر محمد شاہ امراء کے بلانے پر تیسری مرتبہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور قصر فیروز آباد میں تخت شاہی پر باقاعدہ جلوس کیا۔ مبشر چپ کو اسلام خاں کا خطاب دے کر وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ کچھ دنوں بعد قصر فیروز آباد سے قصر جہاں نما میں منتقل ہوگیا اور ان فیروز شاہی غلاموں کو جو پہلے فتنہ و فساد کے بانی تھے قتل کر دینے کا حکم دیا۔ غلاموں کے اس قتل عام میں پورب کے اکثر آزاد لوگ بھی جن کی زبانیں کچی تھیں غلاموں کے دھوکے میں قتل ہوگئے۔

اس انقلاب سے ابوبکر شاہ بے دست و پا ہوگیا۔ محمد شاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے کوٹلہ میوات کی طرف فوج کشی کی۔ ناچار ابوبکر شاہ اور بہادر ناہر امان طلب کرتے ہوئے خدمت میں حاضر ہوگئے۔ بہادر ناہر کو تو خلعت و انعام ملا اور ابوبکر شاہ کو قلعہ میرٹھ کی قید[1]۔ زندگی بھر وہ اسی قید میں رہا۔ اس کی وفات ۷۹۳ھ میں ہوئی۔ عرف ڈیڑھ سال حکومت کی۔

سلطان محمد بن فیروز شاہ

اس فتح اور اپنے بھتیجے ابوبکر کی وفات کے بعد ۷۹۳ھ میں سلطان محمد نے تخت دہلی پر قدم رکھا۔ اب کوئی دوسرا سلطنت کا دعوے دار نہیں رہا تھا۔ محمد شاہ مستقل اور کامل الاختیار بادشاہ ہوگیا۔

بغاوتیں

اسی سال حاکم گجرات ملک مفرح سلطانی کی سرکشی کی خبریں ملیں، بادشاہ نے ظفر خاں ولد وجیہہ الملک کو اس کی سرکوبی کے لیے مقرر کر دیا۔

۷۹۴ھ میں مواس کے زمینداروں نے دوابہ کے علاقہ میں فتنہ انگیزی کی اور قصبہ بلارام کو لوٹ لیا۔ اسلام خاں نے وہاں کے باغی سرغنہ ہرسنگھ رائے پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ بادشاہ نے قنوج اور اٹاوے کی طرف توجہ کی اور وہاں کے سرکشوں کی اچھی طرح گوشمالی کر کے اور اٹاوے کو تاخت و تاراج کر کے قصبۂ جیتر جو اس کا قدیم پسندیدہ مقام تھا لوٹ آیا۔ شہر محمد آباد کی تعمیر شروع کرائی۔ اسی سال بغاوت کے الزام میں اسلام خاں کا قتل ہوا۔

۷۹۵ھ میں بادشاہ نے اٹاوے کے باغیوں کی طرف ملک مقرب الملک کو روانہ کیا۔ اس نے قول و قرار کر کے سب باغیوں کو لشکر میں بلایا، پھر انھیں قنوج لے جا کر قتل کر ڈالا اور محمد آباد واپس آ گیا۔

محمد شاہ کی علالت

ماہ شوال ۷۹۵ھ میں بادشاہ بیمار ہوگیا۔ اس درمیان میں بہادر ناہر[2] نے کئی ایک مواضعات لوٹ لیے۔ بادشاہ نے اسی بیماری کی حالت میں کوٹلہ کی طرف کوچ کیا۔ بہادر ناہر تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کے بعد بھاگ گیا اور بادشاہ محمد آباد واپس آگیا۔

محمد آباد واپس ہونے کے بعد بادشاہ نے کسی عمارت کی تعمیر شروع کرائی۔ اس مصروفیت میں اس کا مرض شدید ہو گیا۔

حالتِ مرض میں لاہور سے خبر ملی کہ وہاں سرشیخا کھوکھر نے بغاوت کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔

بادشاہ نے لاہور کی مہم پر شہزادہ ہمایوں کو متعین کیا۔ ابھی شہزادہ اس مہم پر روانہ نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ عالم آخرت کو سدھار گیا اور اپنے باپ کے روضہ میں حوض خاص کے کنارے سپردِ خاک کیا گیا۔

سلطان محمد شاہ کی حکومت چھ سال سات ماہ رہی۔

ف۱ اس کی اسارت کی تاریخ ۲۰ ذی الحجہ ۷۹۲ھ مطابق ۱۱ ماہ نومبر ۱۳۸۹ء

ف۲ اس شخص کا پورا نام "آزروی بن ناہر سنگھ" تھا۔ راٹھور قوم کا سردار تھا۔

سلطان علاؤالدین بن سکندر شاہ

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں خاں سلطان علاؤالدین سکندر شاہ کے لقب سے ۱۹ ربیع الاول ۷۹۵ھ میں تخت نشین ہوا لیکن اس کی مدت حکومت صرف ایک ماہ سولہ دن رہی۔ عین عالم شباب میں وفات پائی۔

تا جہاں بود چنیں بود و چنیں خواہد بود
ہمہ را عاقبتِ کار ہمیں خواہد بود

اس بادشاہ کے عہد شاہزادگی میں ایک صاحب علم نے مقامات حریری کے مقابلہ میں ایک کتاب اس کے نام پر تصنیف کی تھی۔ اس کا ایک مضمون میری (مصنف کتاب کی) نظر سے بھی گزرا ہے۔

سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ

علاؤالدین کی رحلت کے بعد محمد شاہ مرحوم کا چھوٹا لڑکا محمود شاہ تمام امیروں کے اتفاق و تائید سے ۲۰ جمادی الاول ۷۹۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ سلطان ناصرالدین محمود شاہ اس کا خطاب مقرر ہوا۔

اس نے مقرب الملک کو مقرب خاں کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنایا اور دوسرے تمام اُمراء کو منصب، جاگیر اور خطاب عطا کیے۔ گزشتہ چند سال کے پراگندہ حالات نے سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھ کھول دیے تھے اور سارے ملک میں فتنہ و فساد پھیل گیا تھا۔ سلطان نے ان باغیوں کی سرکوبی کے لیے خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر قنوج سے بہار[۵۱] تک کا سارا علاقہ حوالہ کر دیا اور اسے فوج کشی کے لیے رخصت کیا۔

خواجہ جہاں کی مساعی

خواجہ جہاں نے جاج نگر تک فوجی کارروائیاں کر کے قبضہ کر لیا اور اس علاقہ سے کافی مال غنیمت اور بہت سے ہاتھی حاصل کر کے بادشاہ کے پاس بھجوائے۔ لکھنوتی کے بادشاہ نے بھی ہر سال دہلی کو ہاتھی بطور پیشکش روانہ کرنے شروع کر دیے ——— اسی دوران میں کٹرہ، اودھ، بلوتالیہ، بھرائچ[۵۲] اور نرہٹ کے قلعے جنھیں کافروں نے تباہ کر دیا تھا از سر نو تعمیر کیے گئے۔ سندیلہ[۵۳] کے قلعہ کی بھی تعمیر ہوئی۔

---

۵۱ بہار۔ یہ شہر پٹنہ سے ۴۶ میل ہے۔ صوبہ بہار اسی شہر سے منسوب تھا۔ اس وقت یہ ضلع پٹنہ کا ایک معمولی قصبہ ہے جس کی آبادی پچاس ہزار ہوگی۔ یہاں مخدوم شرف الدین احمد کا مزار ہے جو شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ساتویں صدی کے بزرگ ہیں۔ ایک پرانے قلعہ کے کھنڈر ہیں جن میں بدھوں اور برہمنوں کی عالی شان عمارتوں کے آثار ہیں۔ یہاں بدھوں کی قدیم مشہور درس گاہ کے طویل دالان بھی نظر آتے ہیں۔ اس درس گاہ کو "دھار" کہا جاتا تھا اور یہ بگڑ کر "بہار" بن گیا۔ "دھار" کے معنی دارالعلوم کے ہیں۔

۵۲ بھرائچ۔ گونڈہ سے ۳۸ میل پر دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک قدیم قصبہ ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے "بھرائچ اودھ کا بہت بڑا شہر ہے اور دریائے سرو کے کنارے آباد ہے"۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے "یہ ایک خوبصورت شہر دریائے سرجو کے کنارے ہے۔ سرجو ایک بڑا دریا ہے جو اکثر اپنے کنارے گراتا رہتا ہے۔ جب بادشاہ (محمد تغلق) شیخ سالار مسعود غازی کی قبر کی زیارت کے لیے گیا تو ایک بڑی کشتی اس دریا میں ڈوب گئی جس میں تین سو آدمی سوار تھے۔ شیخ سالار کا مزار ایک برج میں ہے اسی نواح میں ہم نے بانس کے جنگل میں گینڈا دیکھا"۔

سارنگ خاں کا حملہ مشرقی علاقہ کے باغیوں کا تو کچھ انتظام ہو گیا لیکن لاہور اور دیپال پور کی طرف شیخا کھوکھر کی بغاوت اسی طرح موجود تھی۔ بادشاہ نے اس فتنہ کو رفع کرنے کے لیے سارنگ خاں کو

(بقیہ حاشیہ بھڑائچ صفحہ گزشتہ)

سرجو یا سرو قدیم تاریخوں میں دریائے گھاگھرا کو ہی کہا گیا ہے لیکن آج کل یہ گھاگھرا کے ایک معاون دریا کا نام ہے جو نیپال کے پہاڑوں سے نکل کر ۷۰ میل بہہ کر کٹائی گھاٹ کے قریب دریائے گھاگھرا میں گرتا ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے یہ دریا گونڈہ ضلع میں بہتا ہوا کہیں آگے جا کر گھاگھرا میں گرتا تھا۔ ایک انگریز سوداگر نے جو پہاڑ سے لکڑی کاٹ کر لایا کرتا تھا جلدی پہنچانے کے لیے اس دریا کا رخ بدل کر اس رستہ پر ڈال دیا۔

مغلوں کے دور میں یہ حاکم نشین جگہ تھی۔ اب اس کی آبادی ۳۰ ہزار ہو گی۔ یہاں سے عمارتی لکڑی اور تمباکو برآمد ہوتا ہے۔
اس مقام کو فیروز شاہ کے باپ رجب سالار نے آراستہ اور بارونق بنا دیا۔ (آئین اکبری) بھڑائچ کے قریب موضع دوکونی ہے (جو اکبر کے عہد تک) "تانبوں کے سکوں کی ٹکسال ہے" (ابوالفضل) اس نواح میں چیرا متی ایک مقام ہے جہاں ہولی کے موقع پر شعلے خود بخود اٹھتے ہیں (ابوالفضل) نیمکھسار ایک قلعہ ہے جو دریائے گودی (گومتی) کے کنارے ہے۔ یہاں ایک حوض برہما درت کند ہے۔ اس کا پانی اس قدر جوش کھاتا ہے کہ اس میں جو چیز بھی پھینکی جاتی ہے پانی کے زور سے اوپر آ جاتی ہے انسان اس میں ڈوب نہیں سکتا (آئین اکبری) ایک مقام انار کلی مزار سے قریب ہے جو سالار شہید کی سیر گاہ تھی، نہایت پر فضا مقام ہے، سالار شہید کی جہاں نشست گاہ تھی وہاں ایک چوبی چھتری بنی ہوئی ہے۔ انار کلی کے نیچے ایک جھیل ہے جس کا رقبہ چھ کوس ہے یہ نہایت گہری جھیل ہے اس میں سے ایک ندی بھڑائچ کے نیچے سے ہو کر نکل جاتی ہے (آئین اکبری)

سالار شہید۔ ابن بطوطہ نے جو شیخ سالار مسعود لکھا ہے اس سے سلطان مسعود سالار غازی ہی مراد ہیں۔ مرأت مسعودی (واضح رہے کہ یہ کتاب جہانگیر کے عہد میں عبدالرحیم چشتی نامی نے لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ غالباً شیخ عبدالرحمٰن امیٹھوی کے نام سے بعد میں بھی شائع ہوا ہے) میں سالار غازی کے باپ کا نام ساہو، ماں کا ستر معلی، سال ولادت ۴۰۵ھ جائے پیدائش اجمیر، سال وفات ۴۲۴ھ درج ہے۔ جو عیسوی ۱۰۳۲ء کے مطابق ہے۔ یہ کتاب تاریخی معیار پر پوری نہیں اترتی، قصہ کہانیوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے اس لیے قابل اعتبار نہیں۔ ابوالفضل نے ان بزرگ کے متعلق لکھا ہے "خویشاوند سلطان محمود غزنوی است" مرأت مسعودی میں ان کو سلطان محمود غزنوی کا بھانجہ بتایا گیا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے "از اقارب سلطان محمود غزنوی بودہ کہ در عہد سلطان محمود غزنوی در ۵۵۷ھ بدست کفار مقتول گردید" دارا شکوہ نے اپنی کتاب سفینۃ الاولیاء میں شیخ عبدالحق کے حوالہ سے سالار مسعود کا اس طرح ذکر کیا ہے:
"از سرداران و غازیان لشکر سلطان محمود غزنوی اند در اوائل اسلام در ہندوستان فتوحات بسیار نمودہ اند و بدرجہ شہادت رسیدہ شہادت ایشاں در چہار عدد و نوزدہ ہجری (۴۱۹ھ) بودہ"۔ خود شیخ عبدالحق کی کتاب "اخبار الاخیار" میں جو دارا شکوہ کی ماخذ ہے، سالار مسعودی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ فرشتہ کا یہ کہنا کہ "وہ سلطان محمود کی اولاد میں سے کسی عہد میں ہندوستان آئے تھے" درست معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا دیا ہوا سن غلط ہے کیونکہ ۵۵۶ھ میں سلاطین غزنوی اتنے طاقتور نہیں رہے تھے کہ اتنی دور ہندوستان میں لشکر بھیجے۔ سالار شہید کی درگاہ پر ہر سال ہندو مسلمانوں کا ایک لاکھ کے قریب مجمع ہوتا ہے۔ اس میلہ سے درگاہ کو ۲۰ ہزار سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ جب فیروز شاہ زیارت کے لیے آیا تھا تو اس نے سید ابو جعفر امیر ماہ بھڑائچی سے جو بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے مسعود سالار غازی کے مراتب دریافت کیے۔ انھوں نے فرمایا "ان کا بلند درجہ یہ ہے کہ تم جیسا سلطان اور مجھ جیسا فقیر ان کی خدمت میں حاضر ہیں"۔ انہی بزرگ ابو جعفر امیر ماہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھڑائچ میں انگلیوں کے بل چلتے تھے، بادشاہ نے وجہ پوچھی تو کہا یہاں اس قدر شہید دفن ہیں کہ مجھے چلنے کو جگہ نہیں ملتی"۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں سالار صاحب کے جھنڈے اٹھائے جاتے تھے، ان جھنڈوں اور چھتریوں کا ذکر اکبر نے بھی کیا ہے۔ طبقات اکبری کے مصنف نے لکھا ہے "شہنشاہ اکبر ذکر کرتے

روانہ کیا۔ جب سارنگ خاں وہاں پہنچا تو اُسی سال ماہ ذی قعدہ کے آخر میں لاہور سے بیس کوس کے فاصلہ پر موضع سامود تھلہ میں شیخا کھوکھر نے سارنگ خاں سے ایک سخت لڑائی لڑی لیکن شکست کھا کر جموں کے پہاڑ پر بھاگ گیا۔ سارنگ خاں نے لاہور اپنے چھوٹے بھائی عادل خاں کے سپرد کر دیا اور خود دیپال پور لوٹ گیا۔

مقرب خاں اور سعادت خاں

ماہ شعبان ۷۹۵ھ میں سلطان محمود نے مقرب خاں کو شہر میں اپنا نائب بنا کر سعادت خاں کو جو عبدالرشید سلطانی کے نام سے مشہور تھا، اپنے ہمراہ لیا اور بیانہ[۵۱]

تھے کہ ایک دن میں اکبرآباد میں شاہ سالار غازی کی چھتریاں دیکھنے گیا، ایک شخص نے مجھے پہچان کر دوسرے سے کہا بادشاہ جاتا ہے میں نے فوراً اپنی آنکھوں کے کوئے باہر نکال لیے اور کچھ بُرا سا منہ بنا لیا، جب دوسرا شخص مجھے دیکھ کر گیا تو کہنے لگا کہ بادشاہ کی ایسی آنکھیں نہیں ہیں"۔ مصباح التاریخ میں مراۃ مسعودی کے حوالہ سے سالار غازی کو محمد بن حنیفہ بن علی کی اولاد بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ "محمد بن حنیفہ کے دو بیٹے تھے عبدالفتاح اور عبدالمنان۔ خواجہ احمد یسوی پیر ترکستان تو عبدالفتاح کی اولاد ہیں اور سالار مسعود غازی عبدالمنان کی" لیکن ابن عقیبہ نے محمد بن حنفیہ کے بیٹوں کے نام لکھے ہیں "حسن، عبداللہ، ابو ہاشم، جعفر، حمزہ، اصغر، عون"۔ مصنف عمدۃ المطالب نے لکھا ہے سوائے جعفر بن محمد اور علی بن محمد کے محمد بن حنیفہ کے کسی بیٹے کی اولاد موجود نہیں ہے، ممکن ہے سالار شہید علوی نسب ہوں لیکن محمد بن حنیفہ کے دو بیٹوں کے مذکورہ نام مرأت مسعودی کے مصنف کی محض اختراع ہیں۔ مزار کے قریب ایک اور قبر رجب ہٹیلے کی ہے۔ "ملک رجب سالار شہید کے لشکر کے ہراول تھے لیکن یہ قبر فرضی معلوم ہوتی ہے۔ مرأت مسعودی میں لکھا ہے۔" "ملک رجب اور سالار شہید کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا تھا۔ موضع نگوا برگنہ مہادیو ضلع گونڈہ میں فیض آباد کی سڑک پر بھی ایک روضہ ملک رجب ہٹیلے کا ہے کہتے ہیں اس جگہ اُن کی اُنگلی کٹ کر گری تھی، یہ سب غلط ہے۔ کسی فقیر نے اپنے نفع کے لیے یہ افسانہ گھڑ کر روضہ بنا لیا۔

۵۳ سندیلہ۔ یہ شہر ضلع ہردوئی ملک اودھ میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ لکھنو سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں واقع ہے۔ آبادی ۲۰ ہزار ہوگی۔ پان اور گھی برآمد ہوتا ہے۔ سندیلہ کے لڈو بھی مشہور ہیں۔

۵۱ بیانہ۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: "بیانہ بہت بڑا خوش نما شہر ہے۔ بازار بہت خوبصورت جامع مسجد نادر بنی ہوئی ہے"۔ بیانہ دہلی سے سو میل جنوب مغرب میں ہے، اکبر کے زمانہ میں بیانہ کی سرکار صوبہ آگرہ کے تحت تھی (آئین اکبری) ابوالفضل لکھتا ہے: "بیانہ قدیم زمانہ میں ستھرا شہر تھا۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے، پرانے محلات اور بُت خانے بہت ہیں، ان کھنڈرات سے اب تک ہتھیار اور تانبے کے برتن نکلتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا مینار بھی ہے، آم اچھا ہوتا ہے بعض آم وزن میں ایک سیر (موجودہ ڈھائی پاؤ) سے زیادہ ہوتا ہے، شکر بھی بہت سفید ہوتی ہے۔ ایک کنواں اس شہر میں ایسا ہے کہ اس کے پانی کی تاثیر سے شکر کے لڈو وزن میں سیر سیر بھر سے زیادہ باندھ لیتے ہیں، ان لڈوؤں کو گنڈورہ کہتے ہیں۔ تیل اور چیا بہت ہوتا ہے تیل دس روپیہ اور بارہ روپیہ من کے حساب سے ملتا ہے۔ مہندی بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اس شہر میں قبرستان بھی بہت ہیں"۔ ابوالفضل نے جس کنویں کا ذکر کیا ہے اس کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے یہ کنواں ۸۲۳ھ میں محمد خاں اوحدی صدیقی حاکم بیانہ نے تعمیر کرایا تھا۔ کتبہ کے اشعار یہ ہیں۔

به عهد دولت خان کبیر اوحد خان — پناه جمله جهان سرور زمین و زمان
ملک معظم تیمور خان از سر صدق — بنا بکرد چنین جای طاعت رحمان
بنزد او چه زمزم صفت ز خالص مال — قبول باد بدرگاه خالق منان
ز هجری نبوی سال بود هشصد و بست — دگر سه سال به ماه معظم رمضان

جنرل کننگھم نے اس کتبہ کے پڑھنے میں غلطی کی ہے۔ اس کنویں پر ایک اور کتبہ فارسی اور ناگری میں ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور گوالیار[۵۱] کی طرف سفر کیا۔ قصبہ بساور میں ایک بڑی سنگین جامع مسجد تعمیر کرائی جو آج تک موجود ہے۔ جب شاہی لشکر گوالیار کے قریب پہنچا تو ملک علاؤالدین دھاروال، ملو خاں برادر سارنگ خاں اور ملک راجو نے سعادت خاں کے قتل کا

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ بیانہ صفحہ گزشتہ) جس سے معلوم ہوتا ہے ۸۵۳ھ میں ٹھاکر امر سنگھ نے کنویں کی مرمت محمد خاں اوحدی کے زمانہ میں کرائی تھی۔ کننگھم صاحب لکھتے ہیں "یہ کنواں اب بھی موجود ہے۔ شکل میں مربع ہے اور چاروں ضلعے چار چار گز کے ہیں، لیکن اب وہاں شکر نہیں ملتی"۔ قبروں میں ابو بکر قندھاری کی خانقاہ بہت مشہور ہے۔ ان کے متعلق عوام میں دوہا مشہور ہے ؎

اگارہ سو ہتر پھاگ تیج دی دار   بجے مندر گڑھ توڑ ابو بکر قندھار

یعنی پھاگن کے مہینہ میں تیسری تاریخ کو سمت ۱۱۷۳ میں ابو بکر قندھاری نے بیانہ کا قلعہ فتح کیا۔ یہ غالباً ۵۱۲ھ کا زمانہ ہے جو بہرام بن مسعود غزنوی کے جلوس کا سال ہے۔ اس بادشاہ کے آغاز جلوس میں بھی غزنوی لشکر ہندوستان آیا تھا۔ چنانچہ "روضۃ الصفا" میں بہرام کے متعلق تحریر ہے" و بعد از آنکہ بر تخت مملکت متمکن گشت لشکر بدیار ہند کشید و بسیارے از آں بلاد کہ اسلاف او بداں موضع نرسیده بودند بکشاد" سالار مسعود غازی غالباً اسی لشکر کے سپہ سالار تھے کیونکہ بیانہ کا قلعہ ان کے ہاتھ پر بھی فتح ہوا تھا۔ اس دوہے سے سالار مسعود غازی کے ہندوستان آنے کا صحیح سال معلوم ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے جس منارہ کا ذکر کیا ہے وہ بھی موجود ہے۔ یہ اصل میں مسجد کا ماذنہ ہے اور قلعہ میں واقع ہے۔ دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اب دو منزلیں باقی ہیں پہلی منزل ۴۶½ فٹ اور دوسری ۳۲ فٹ۔ تیسری منزل کہتے ہیں میگزین کی بارود میں آگ لگنے سے گر گئی تھی۔ منارہ پر کتبہ ہے۔ "اشار ببناء ہذہ المنارہ المبارک المسند عالی ذی المعالی اعظم ہمایوں داؤد خاں بن مسند عالی محمد خاں بن مسند عالی معین خاں صدیقی المعروف باوحدی خلد اللہ ملکہ فی سن احدی وستین وثمانمائۃ (۸۶۱ھ)" سنگ سرخ کی بنی ہوئی ایک باؤلی بھی ہے جو سلطان قطب الدین خلجی کے عہد میں ۷۱۸ھ میں ملک کافور نے تیار کرائی تھی یہ اب تک موجود ہے اس کی تاریخ بناء یہ ہے:

در زمان ملک سلطان زمانہ قطب الدین   ملک دار الخلافہ شہر یار بحر و بر
بندۂ درگاہ او کافور سلطانی بگفت   تا شد ایں بائیں بنا بایں لطافت در گزر
چار در با چار گنبد بنگر و تاریخ آں   سال و ماہ از سال ہجرت ہفتصد و ہژدہ شمر

بیانہ کا موجودہ شہر آگرہ اور بمبئی کی سڑک پر بھرت پور ریاست میں واقع ہے، اس کی آبادی صرف چھ سات ہزار ہوگی۔

۵۱ گوالیار۔ گوالیار کے مشہور قلعہ کا ذکر اس سے پہلے ایک حاشیہ میں آچکا ہے۔ شہر اور ریاست کی تفصیل درج کی جاتی ہے گوالیار دریائے چمبل کے دوسرے کنارے دھولپور سے چالیس میل پر ہے۔ ریاست گوالیار صوبہ مالوہ کی بڑی ریاست تھی اس کی بنیاد رانوجی سندھیا نے جو پونا کا ایک مرہٹہ سردار تھا رکھی تھی۔ یہ پہلے باجی راؤ پیشوا کے باڈی گارڈ کا جرنیل تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں محمد شاہ کے عہد میں مالوہ آیا اور اجین پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا مہاداجی سندھیا جانشین ہوا ۱۱۵۷ھ/۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی پانی پت میں لڑائی ہوئی تو مہاداجی اس میں شریک تھا بعد میں اس نے مالوہ اور راجپوتانہ کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے شاہ عالم کا مشیر بن کر ملک کا نظم و نسق ہاتھ میں لے لیا اور نربدا سے اٹک تک اس کا عملی دخل ہو گیا ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں سندھیا نے دوبارہ شاہ عالم سے ساز باز کر کے اس اندھے بادشاہ کو تخت نشین کیا اور خود وزیر مطلق بن گیا۔ مہاداجی لنگڑا تھا کسی ظریف نے کیا خوب کہا ہے ؎

عجب قدرت قادر قدیر   اندھا بادشاہ لنگڑا وزیر

پانی پت میں جب ابدالی فوج سے مرہٹے شکست کھا کر بھاگے تو مہاداجی سندھیا طلائی اور نقرئی ساز سے آراستہ گھوڑے پر سوار تھا ایک ابدالی سپاہی نے اس کا تعاقب کیا اور متھرا کے قریب اس کے پاؤں پر تیر مار کر اسے گھوڑے سے گرا دیا۔ اس کے لشکر کا ایک سقہ رانی خاں بیل پر سوار آرہا تھا اس نے مہاداجی کو اٹھا کر بیل پر سوار کر لیا اور اجین لے آیا۔ مہاداجی نے اس رانی خاں کو اپنا بھائی بنا لیا تھا، اجین میں اسی سقہ کی یادگار میں اب تک "رانی خاں کا باغ" موجود ہے۔ مہاداجی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ارادہ کیا لیکن سعادت خاں ان کی سازش سے واقف ہو گیا اور اس نے ملک علاؤ الدین اور مبارک خاں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا البتہ ملو خاں جان بچا کر نکل گیا اس نے دہلی جا کر مقرب خاں کی پناہ لے لی، بادشاہ بھی اُسی وقت پایۂ تخت کو لوٹ آیا اور شہر کے مضافات میں سلطانی کیمپ لگا دیا گیا۔ مقرب خاں نے چونکہ سرکش ملو خاں کو پناہ دی تھی اس لیے خوفزدہ ہو کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ تین ماہ تک مقرب خاں اور سعادت خاں کے لشکر میں لڑائی ہوتی رہی۔

ماہ محرم ۷۹۷ھ میں سلطان محمود مقرب خاں کے طرف داروں کے بہکانے سے سعادت خاں کو چھوڑ کر قلعہ میں چلا گیا اور مقرب خاں کی سرپرستی قبول کر لی۔ بادشاہ کے آجانے سے مقرب خاں کی قوت بڑھ گئی اور اس نے دوسرے دن میدان میں آکر سعادت خاں پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر دوبارہ قلعہ میں پسپا ہونا پڑا۔

نصرت شاہ

سعادت خاں یہاں سے فیروز آباد چلا گیا اور بعض امیروں کو اپنے ساتھ ملا کر فتح خاں کے بیٹے نصرت خاں کو میوات سے بلایا۔ ماہ ربیع الاول ۷۹۷ھ میں اس کو ناصر الدین نصرت شاہ کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔ نصرت شاہ بس نام کا بادشاہ تھا سارے دروبست پر سعادت خاں کا تسلط تھا۔ نصرت شاہ اس بے بسی پر سخت نالاں رہتا تھا چنانچہ فیروز شاہ کے چند غلاموں اور فیل بانوں کے ساتھ اس نے ایک سازش کی اور کسی بہانہ سے ہاتھی پر سوار ہو کر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ سعادت خاں پر حملہ کر دیا۔ سعادت خاں اس سازش سے بے خبر تھا وہ کچھ نہیں کر سکا اور وہاں سے بھاگ نکلا اور اپنے پرانے دشمن مقرب خاں کے پاس ہی فریاد لے کر دہلی پہنچا۔ اس نے سعادت خاں کو ملاقات کے لئے بلا کر دھوکہ سے قتل کرا دیا۔

شطرنج کے بادشاہ

اب ایک ہی تخت کے دو دعویدار تھے۔ دہلی میں سلطان محمود اور فیروز آباد میں نصرت شاہ۔ فیروز شاہ کے غلاموں محمد مظفر وزیر، شہاب ناہر، ملک فضل اللہ بلخی اور دوسرے چند امیروں نے نصرت شاہ سے ازسرِنو بیعت کی۔ اس نے ان میں مناصب اور اعزاز تقسیم کیے۔

مقرب خاں نے دہلی کا پرانا قلعہ بہادر ناہر میواتی کے تفویض کیا اور ملو خاں کو اقبال خاں کا خطاب ملا۔ اب عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں بادشاہوں میں ہر روز شطرنج کے بادشاہوں کی طرح لڑائی ہوتی رہتی تھی لیکن کوئی دوسرے کو مات نہیں دے سکتا تھا۔

دوآبہ کا درمیانی علاقہ، سنبھل، پانی پت، رہتک اور جھجر نصرت شاہ کے قبضہ میں آگیا تھا اور چند پرانے قلعے جیسے دہلی سیری وغیرہ سلطان محمود کے تصرف میں تھے۔ مشہور مثل: "حکم خداوند عالم از دہلی تا پالم[1]"۔ اسی زمانہ سے

(بقیہ حاشیہ گوالیار صفحہ گزشتہ) مر گیا، دولت راؤ سندھیا اس کا جانشین ہوا ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں یہ ریاست انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی اس کا حالیہ اقتدار مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا کی بدولت تھا۔ اس شخص نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں کی بڑی مدد کی تھی۔ اس کے صلہ میں اضافہ جاگیر اور خطاب ملا، اس کے بعد اس کا لڑکا مادھو راؤ جانشین ہوا۔ ریاست کا رقبہ ۲۵ ہزار مربع میل آبادی ۳۰ لاکھ اور آمدنی ۷۵ لاکھ تھی۔

[1] پالم۔ دہلی سے دس کوس پر مسعود آباد کے آگے یہ قصبہ ہے۔ ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ اسے سید شریف ناصر الدین جو محمد تغلق کے مصاحب تھے کی جاگیر بتاتا ہے۔ دہلی سے ریواڑی ریلوے لائن پر واقع ہے۔

چلی ہے، کیونکہ دہلی اور مضافات کو چھوڑ کر سارے ہندوستان میں یہاں جس کا بس چلا علاقہ دبا کر خود مختار ہو گیا تھا۔ اور پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔

خضر خاں اور سارنگ خاں

کافی عرصہ تک فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ کبھی فیروز آباد والے دہلی والوں پر غالب آ گئے تو کبھی دہلی والوں نے فیروز آباد والوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تو یہ صورت حال تھی ہی کہ شمال کی طرف خضر خاں امیر ملتان اور سارنگ خاں حاکم دیپال پور میں بھی ٹھن گئی اور ان دونوں کے درمیان ۷۹۸ھ تک سخت لڑائی ہوئی۔ آخر کار ملک مردان کے غلاموں نے خضر خاں سے بے وفائی کی اور سارنگ خاں سے جا کر مل گئے۔ یہ ملک مردان خضر خاں کے باپ ملک سلیمان کا محسن اور مربی تھا۔ ان غلاموں کی غداری کی وجہ سے ملتان خضر خاں کے قبضہ سے جاتا رہا اور سارنگ خاں کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس کے لشکر میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

سارنگ خاں کی شکست

۷۹۹ھ میں سارنگ خاں نے حاکم سامانہ غالب خاں اور والیٔ پانی پت تاتار خاں کو بے دخل کر کے دہلی تک قبضہ کر لیا۔ نصرت خاں نے فیروز شاہ کے غلام ملک الماس کو ایک بڑا لشکر اور بہت سے ہاتھی دے کر تاتار خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا تاکہ سامانہ سارنگ خاں سے چھین کر غالب کے سپرد کر دیا جائے۔

محرم ۸۰۰ھ میں موضع کوٹلہ کے نواح میں ان دونوں فوجوں میں بڑا سخت معرکہ گرم ہوا۔ سارنگ خاں شکست کھا کر ملتان بھاگ گیا۔ تاتار خاں نے تلونڈی تک اس کا پیچھا کیا اور وہاں سے کمال الدین مبین کو اس کے تعاقب پر مامور کر کے لوٹ آیا۔

مغلوں کا حملہ

اسی سال ماہ ربیع الاول میں میرزا پیر محمد نے جو امیر تیمور گورگان سلطان خراسان و ماوراء النہر کا پوتا تھا، ہندوستان پر حملہ کیا اور دریائے سندھ[1] عبور کر کے قلعہ اوچھ کا محاصرہ کر لیا۔ سارنگ خاں کا

---

[1] دریائے سندھ۔ سنسکرت میں دریا کو سندھو کہتے ہیں۔ آریا مغرب سے آئے تھے اس لیے اُنھوں نے پہلا جو سب سے بڑا دریا دیکھا، اس کا نام سندھو رکھ دیا۔ دریا کے نام سے ملک کا نام بھی سندھ ہو گیا۔ فارسی اور سنسکرت کی لغت میں "[illegible]" اور "س" کی تبدیلی ہو جاتی ہے، اس لیے اہل فارس اس ملک کو "ہند" کہنے لگے بعد میں ملک کا نام "ہند" اور دریا کا "سندھ" پڑ گیا۔ عرف دریا کے کنارے کا ملک سندھ لکھ دیا۔ مورخوں نے افسانہ طرازی اور قافیہ بندی سے کام لے کر ہند اور سندھ کو حضرت نوح کے دو بیٹے لکھا ہے۔ دریائے سندھ میں پنجاب کے پانچوں دریا مل جاتے ہیں اس کو "پنج ند" یا "پنجاب" کہتے ہیں سلاطین مغلیہ کے وقت سے پہلے صرف دریائے سندھ کا نام پنجاب تھا اور ملک کو پنجاب نہیں کہتے تھے۔ ناصر الدین قباچہ جب دریائے سندھ میں غرق ہو کر مر گیا تو بداؤنی لکھتا ہے "ناصر الدین در پنجاب غریق بحر فنا گشت"۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے "بعض مورخ اس دریا کا سرچشمہ ایک ایسے مقام کو بتاتے ہیں جو کشمیر اور کاشغر کے درمیان ہے اور بعض اسے ملک خطا میں بتاتے ہیں"۔ ولیم ولکنس نے اپنی کتاب "علم جغرافیہ" میں لکھا ہے "یہ دریا اٹک اور جوآبہ سے گزرتا ہوا بلوچستان میں بہتا ہے"۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے "ہم پہلی محرم ۷۳۴ھ (بہ عہد محمد تغلق شاہ) کو دریائے سندھ پر پہنچے اس دریا کو پنجاب بھی کہتے ہیں، یہ دنیا کے بڑے دریاؤں میں سے ہے۔ گرمی کے موسم میں طغیانی آتی ہے نیل کی طرح اس ملک کے باشندوں کا مدار بھی سندھ کی طغیانی پر ہے"۔

قلعہ دار علی ملک ایک مہینے تک قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتا رہا۔ اس کی کمک کے لیے سارنگ خاں نے تاج الدین بختیار کو ایک ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔ جب وہ اوچھ کے قلعہ پر پہنچا تو میرزا پیر محمد محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا لیکن یہ محض اس کا فریب تھا، کیونکہ اس نے دشمن کو دھوکے میں رکھ کر بیاس[1] کو عبور کیا اور ملک تاج الدین کی فوج پر جب کہ وہ غافل سو رہی تھی حملہ کر دیا اور بہت سے سپاہی قتل کر دیے بعض دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ کمک کی فوج کو تباہ کر کے میرزا پیر محمد نے دوبارہ ملتان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ سارنگ خاں برابر چھ ماہ تک پیر محمد سے لڑتا رہا۔ آخر امن طلب کر کے اس کی پناہ میں آ گیا۔ پیر محمد نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور تیمور کے آنے تک ملتان ہی میں ٹھہرا رہا۔

اقبال خاں کی حوصلہ آزمائی

ماہ شوال سنہ ۸۰۰ھ میں اقبال خاں جو ملو یا سلطان کے نام سے مشہور تھا بڑے عہد و پیمان کے ساتھ نصرت شاہ کا حامی اور شریک بن گیا اور اسے پورے لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ قصر جہاں نما میں لے کر گیا۔ مقرب خاں اور بہادر ناہر پرانی دہلی کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔

تیسرے دن اقبال خاں نے دھوکا دے کر نصرت شاہ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ وہ بے خبر تھا۔ بدحواس ہو کر فیروز آباد بھاگا، وہاں سے جمنا[2] پار کر کے اپنے وزیر تاتار خاں کے پاس پانی پت چلا گیا۔ نصرت شاہ کا سارا ساز و سامان ہاتھی گھوڑے مکار اقبال خاں کے ہاتھ آ گئے۔ اقبال خاں اور مقرب خاں کے مابین دو ماہ تک برابر لڑائی ہوتی رہی۔ چند دن بعد بعض امراء نے درمیان میں پڑ کر دونوں کی صلح کرا دی لیکن ایک دن موقع پا کر اقبال خاں نے دغا کی اور اچانک مقرب خاں کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اور جب وہ امن کا قول و قرار کر کے باہر نکلا تو اسے قتل کر ڈالا اور سلطان محمود کو تخت پر بٹھا کر برائے نام بادشاہ بنا لیا اور ملک کا سارا بندوبست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ماہ ذی قعدہ سنہ ۸۰۰ھ میں اقبال خاں نے تاتار خاں سے پانی پت[3] بھی چھین لیا اور وہاں کا سارا ساز و سامان اس کے

---

[1] بیاس۔ بیاہ یا بیاس اس کا پرانا نام بیاشا ہے، اس کے سرچشمہ کو بیاہ کند کہتے ہیں۔ کوہ کلو سے نکلتا ہے۔ سلطان پور اسی کے کنارے آباد ہے۔ اکبر نے ستلج اور بیاس کے درمیانی حصہ کو "بیت جالندھر" اور بیاس اور راوی کے درمیانی علاقہ کو "باری" کا نام دیا تھا۔ ستلج سے بیاس تک ۵۰ کوس اور بیاس سے راوی تک سترہ کوس کا علاقہ ہے۔ (ابوالفضل۔ آئین اکبری)

[2] دریائے جمنا۔ کوہ ہندوکش سے نکل کر جنوب کی طرف بہتی ہے۔ پانی پت، دہلی، آگرہ، الہ آباد اس کے کنارے آباد ہیں۔ گنگا کی نصف مسافت پر الہ آباد کے قریب گنگا سے آ کر مل جاتی ہے۔ گنگا جمنا کے سنگم کو تربینی کہتے ہیں، ہندوؤں کی مقدس زیارت گاہ ہے۔ جمنا کا طول ۸۰۰ میل ہے گنگا کا ۱۶۵۰، سندھ کا ۱۷۰۰ دنیا کا سب سے بڑا طولانی دریا مسیسپی ہے، نیل ۳۶۰۰ میل لمبا ہے، والگا ۲۴۰۰ میل، فرات ۱۸۰۰، برہم پتر ۱۶۸۰، آمو یعنی جیحوں ۱۲۰۰ میل" دجلہ ۱۱۴۰، ستلج ۱۰۰۰، سیحوں ۱۰۰۰ گوداوری دکن ۸۰۰ میل ہے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے "ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں ہے کہ جمنا کا منبع کلند نامی پہاڑ میں ہے کہ وہاں سردی کی شدت سے کوئی نہیں جا سکتا۔"

[3] پانی پت۔ لاہور سے ۲۵۲ میل اور دہلی سے ۵۴ میل پر ہے، راستہ میں کرنال اور تراوڑی جیسے تاریخی مقامات پڑتے ہیں۔ پانی پت دریائے جمنا کے پرانے ساحل پر ایک قدیم شہر ہے۔ اس کا ذکر کورو پانڈو کی لڑائی مہابھارت سے پہلے بھی ملتا ہے۔ اس میدان میں تین بڑی تاریخی لڑائیاں ہوئیں جن کی وجہ سے ہندوستان کی قسمت ادلتی بدلتی رہی۔ پہلی لڑائی سنہ ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء میں ہوئی تھی جس میں بابر نے مختصر سی جمعیت سے ابراہیم لودی کے بڑے لشکر کو شکست دی تھی اور ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ دوسری لڑائی سنہ ۹۶۴ھ ۱۵۵۶ء میں اکبر اور عادل شاہ سودی کے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

قبضہ میں آگیا۔ اس حملہ سے پہلے تاتار خاں نے دہلی پر یورش کی تھی لیکن وہ کچھ نہ کرسکا بلکہ اُلٹا ایک بڑا علاقہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لاچار ہوکر وہ دہلی سے اپنے باپ کے پاس گجرات چلا گیا۔ اقبال خاں نے دہلی آنے کے بعد تاتار خاں کے داماد نصیر الملک کو بادل خاں کا خطاب دے کر دوآبہ کا درمیانی علاقہ اس کے تفویض کردیا۔

ہندوستان پر امیر تیمور کا حملہ

سنہ ۸۰۱ھ میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ[۵۱] کیا اور تلمبہ کو غارت کرکے ملتان پہنچ گیا۔ میرزا پیر محمد نے سارنگ خاں کے بے شمار لشکریوں کو یہاں قید کر رکھا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ پانی پت) سپہ سالار ہیموں بقال کے درمیان ہوئی، اکبر نے ہیموں کو شکست دے کر مغل سلطنت کو مستحکم کردیا۔ تیسری لڑائی ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں ابدالی اور مرہٹہ فوجوں کے درمیان ہوئی۔ ایک طرف افغانستان کا احمد شاہ درانی اور دوسری طرف شمبو داس بھاؤ، سندھیا اور ہلکر تین بڑے مرہٹہ سردار تھے۔ مرہٹوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی اور ابدالی فوج تقریباً ایک لاکھ تھی۔ احمد شاہ نے مرہٹوں کو اس بُری طرح شکست دی کہ شمال سے دکن تک اُن کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور ہندوستان کی فرمانروائی کا خواب بس خواب ہو کر رہ گیا۔

پانی پت کے شہر سے باہر بابر بادشاہ کی ایک عالی شان مسجد ہے جو پہلی لڑائی کی یادگار ہے۔ شہر کی آبادی مختصر ہے مگر عمارتیں سب پختہ ہیں، وسط شہر میں شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ یہ بزرگ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور مجذوب ہیں، اوائل عمر میں علوم مروجہ حاصل کیے اور جب حالت جذب و سکر کا غلبہ ہوا تو کتابیں دریا میں پھینک کر صوفیائے چشت کا دامن تھام لیا۔ معارج الولایت کا مصنف لکھتا ہے وہ خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی کے خلیفہ ہیں بعض ان کو شیخ نظام الدین بداؤنی سلطان الاولیاء سے منسوب کرتے ہیں۔ عشق و محبت، عوارف و حقائق، توحید، ترک اور جذب کے بیان میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں، ایک مکتوبات کا مجموعہ بھی ہے جو اپنے مرید اختیار الدین کو لکھے تھے ان کی ایک کتاب "جامع علوم توحید" ہے۔ دوسرا رسالہ "حکم نامہ شیخ شرف الدین" کے نام سے مشہور ہے ایک مثنوی "مخزن نور" ہے۔ اشعار اور غزلیات بھی بہت مشہور ہیں۔ پانی پت کے یہ قدیم باشندے ہیں ان کے والد کا نام سالار فخر الدین تھا، والدہ کا نام بی بی حافظہ جمال۔ یہ علاؤ الدین اور جلال الدین خلجی کے عہد کے بزرگ ہیں۔ یہ دونوں بادشاہ ان کے حلقہ بگوش تھے۔ صاحب "سیر الاقطاب" نے ان کا سلسلہ نسب امام اعظم ابو حنیفہ سے ملایا ہے اور سلسلۂ ارادت خواجہ بختیار کاکی سے۔ بوعلی شاہ قلندر حضرت شمس الدین کلیر کے ہم عصر تھے آپ نے کچھ عرصہ پانی پت کے مشرق میں بمقام باگھوتی مقام کیا۔ ہندی میں باگھ شیر کو کہتے ہیں چونکہ آپ شیر کی شکل میں شہر سے اس جنگل میں جا بسے تھے اس لیے اس کا نام باگھوتی پڑ گیا۔ یہ مقام بھی عوام کی زیارت گاہ ہے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ کرنال کے ایک موضع بڈھا کھیڑہ میں جا کر رہے، صاحب سیر الاقطاب" اور مصنف "تذکرۃ العاشقین" کے بیان کے مطابق ان کی وفات ۱۳ رمضان ۷۲۴ھ میں ہوئی مزار پانی پت اور کرنال کے نواح میں ہے، آپ کے روضہ کی عمارت بڑی نفیس ہے اس کی چھت سنگ کسوٹی کے آٹھ ستونوں پر قائم ہے۔

پانی پت علوم و فنون کا مرکز رہا ہے، فن تجوید (قرأت) میں تو کبھی اس کا بڑا شہرہ تھا، جس طرح ٹونک کے حافظ مشہور ہیں اسی طرح پانی پت کے قاری مشہور تھے، شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی مصنف مسدس حالی یہاں کے متوطن تھے۔ قاضی ثناء اللہ بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے ان کا نام قادیانیوں کے مباحثوں میں بڑا مشہور ہے۔ سید غوث علی شاہ فقیر بھی اسی جگہ کے باشندے ہیں۔

پانی پت میں ایک مزار امام عبد الدین کا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ امام زین العابدین کے پوتے تھے اور یہاں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ "شہیدوں کا ٹیکرا" ان کے مزار کی بلندی ہی کا نام ہے۔

[۵۱] تیمور کا حملہ۔ مغلوں کی مختلف تاریخوں سے جو تفصیل ملتی ہے وہ یہ ہے۔ امیر تیمور نے اپنے وزیروں اور امیروں سے مشورہ کیا کہ "میں چین پر چڑھائی کروں یا ہندوستان پر"؟ لوگوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے روکا اور اس کے چار سبب بیان کیے، اول پنجاب کے دشوار گزار ندیاں، دوم جنگلوں کی کثرت، سوم صحرائی باشندوں کی لوٹ مار، چہارم جنگلی ہاتھیوں سے مقابلہ لیکن شاہزادہ شاہ رخ مرزا اس کے برخلاف ہندوستان پر حملہ کرنے کا حامی تھا۔ تیمور نے اپنے لشکریوں کو بہت آمادہ کیا لیکن وہ ہندوستان پر فوج کشی کے لیے دل سے راضی نہیں ہوتے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تیمور نے ان کو قتل کرا دیا۔ تیمور ملتان سے آگے بڑھا اور مسلسل کوچ کرتے ہوئے بھٹنیر کے قلعہ کو فتح کر لیا۔ راجہ جلیجین بھٹی کو اور قلعہ میں محصور اشخاص کو قتل کر ڈالا۔ تیموری لشکر نے اب پیش قدمی کر کے سامانہ بھی فتح کر لیا۔ اس وقت دیپال پور،

(بقیہ حاشیہ امیر تیمور کا حملہ صفحہ گزشتہ) تھے۔ اسی اثناء میں ہندوستان سے پیر محمد کا عریضہ آیا کہ اس نے ملتان فتح کر لیا ہے اور تیمور کو اب ہندوستان پر حملہ کر دینا چاہیئے۔ اس نے تفصیل سے ہندوستان کی اس وقت کی طوائف الملوکی کا بھی ذکر کیا۔ اس رپورٹ کے آنے پر تیمور نے ہندوستان پر چڑھائی کا عزم کر لیا اور ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء کے آغاز بہار میں کوہ ہندوکش سے اُتر کر پہلے کابل آیا، وہاں سے سرکنڈوں کا پُل باندھ کر اٹک اور جہلم کو عبور کیا اور تلمبیان کو روندتا ہوا بیاس کے کنارے پہنچا۔ یہ مقام ملتان سے آٹھ میل پر تھا، یہاں سے پاکپٹن اجودھن سے گزر کر قلعہ بھٹنیر اور جالنس کو فتح کرتا ہوا سمانہ کے راستہ دہلی کا رخ کیا اور سلطان محمود کے فرار کے بعد ۸ ماہ ربیع الاول ۸۰۰ھ مطابق ۱۷ دسمبر ۱۳۹۸ء دہلی میں داخل ہوا، انہی دنوں دہلی کا قتل عام ہوا۔ بعض مورخوں نے اس کی ذمہ داری ہندوؤں پر ڈالی ہے کہ ان لوگوں نے تیمور کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنے کے لیے اس کے بعض سپاہیوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس قتل عام میں لاکھوں آدمی لقمۂ اجل ہو گئے۔ آخر میں تیمور سوار ہو کر جامع مسجد میں آیا اور علماء و مشائخ کو جمع کر کے معذرت کی کہ میں قتل کرنا نہیں چاہتا تھا مجبور ہو گیا بس خدا کی یہی مرضی تھی، وہ کیا کہتے چپ ہو رہے۔ قتل عام کے بعد تیمور دہلی سے میرٹھ گیا۔ وہاں بھی قتل عام ہوا، پھر ہردوار اور جمبو سے ہوتا ہوا کابل کے راستہ واپس ہو گیا۔ تیمور کی تاریخ ولادت ۷۳۶ھ اور وفات ۸۰۷ھ ہے۔ تیمور کے ابتدائی حالات میں مورخین کو بڑا اختلاف ہے۔ اس کی جائے پیدائش شہر کس یا کس یا کش نامی ایک مقام ہے جو ماوراء النہر کا ایک سرسبز و شاداب شہر ہے، سمرقند سے خچر پر ایک دو دن کا راستہ ہے۔ عربی کی تاریخ تیموری کا مصنف اسے چور اور ڈاکو بتاتا ہے، بعض اسے قصاب بعض چرواہا بعض سپاہی زادہ بعض موچی بعض اسے چنگیز کی اولاد بتاتے ہیں، صرف آخری بات صحیح ہے پہلی ساری باتیں "تاریخ تیموری" کے مصنف کی اختراع ہیں، تیمور نے اس مصنف کے لیے پھانسی کا حکم دیا تھا اس لیے وہ اس کا مخالف اور دشمن ہے چنداں قابل اعتبار نہیں، ان دنوں بلخ اور بلاد خراسان پر سلطان حسین بادشاہ تھا۔ تاریخ "بدعی المنتخب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ تیمور کا باپ سلطان حسین کی فوج میں تھا بعد میں تیمور خود اُس بادشاہ کے مقربوں اور وزیروں میں شامل ہو گیا۔ اس تاریخ منتخب سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خاں سے تیمور کا رشتہ ماں کی طرف سے تھا۔ تیمور ترکی لفظ ہے جس کے معنی "فولاد" کے ہیں، اس کا سلسلۂ نسب تاریخوں میں صرف تیمور بن ترغائی بن البغاء درج ہے یہ "البغاء" بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا دراصل شہر کس کا ایک گاؤں "ایلغاء" تھا جو تیمور کا مولد و مسکن تھا۔ عربی مورخوں نے اسی "ایلغاء" کو اس کے دادا کا نام سمجھ لیا۔ تیمور نے بتدریج سلطان حسین کے ہاں اتنا اثر بڑھا لیا کہ سلطان نے اپنی لڑکی اُس کے نکاح میں دے دی، اس کے نام کے ساتھ "کورگان" (گورگان صحیح نہیں) لکھا جاتا ہے اس ترکی لفظ کے معنی "داماد" کے ہیں۔ شاہی داماد ہونے کی وجہ سے اس کا یہ لقب پڑ گیا۔ اس کے ابتدائی زمانہ کے ساتھی عباس شاہ جہاں، قماری، جاکو، سیف الدین ایسے شاطر اور بہادر کل چالیس آدمی تھے۔ ان لوگوں نے جیحوں پار کر کے تخشب، بدخشاں پر قبضہ کر لیا اور جیحوں کے کنارے سلطان حسین کے لشکر کو شکست دی، پھر بلخ پر حملہ کر کے سلطان حسین کو قتل کر دیا اور سمرقند کو دارالسلطنت بنا کر تیمور کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ماوراء النہر کے تمام شہر خوارزم، ہرات، بلاد خراسان، عراق، عجم کے سارے علاقے شام تک بہت ہی جلد تیموری پرچم کے تحت آ گئے۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کی طرف آیا۔ دوسری طرف ٹرسٹیو، زنبا، تاتار، جارجیا، میسو تھیما، روس اور سائبیریا کے سارے علاقے فتح کر لیے آخر عمر میں چین کا عزم تھا لیکن موت نے مہلت نہیں دی۔ خطا پر فوج کشی کے ارادہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ مقام انزار میں اس کے لشکر کو سخت سردیوں نے گھیر لیا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے شراب نوشی شروع کر دی اور اس کثرت سے پی کہ معدہ اور جگر ماؤف ہو گیا اور اسی مقام انزار میں بدھ کی شب کو ۱۷ شعبان ۸۰۷ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ سب سے بڑا جانشین امیر خلیل سلطان تھا۔ عمیدہ بانو بیگم تیمور کی چہیتی بیگم تھی۔ تیمور کو لنگ کہتے ہیں کیونکہ اس کی صحرانشینی کے زمانہ میں کسی چرواہے نے تیر مار کر اس کی ٹانگ زخمی کر دی تھی۔ تیمور شب سہ شنبہ ۲۵ شعبان ۷۳۶ھ میں پیدا ہوا تھا +

اجودھن اور سرستی کے سارے لوگ جان کے خوف سے اِدھر اُدھر بھاگ نکلے اور اس بلائے آسمانی سے بچنے کے لیے جہاں سینگ سمائے چلے گئے۔ تیمور نے ان منفرورین میں سے جس کو بھی جہاں پایا قتل کر دیا اور بعض کو قید کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔

تیموری لشکر دوآبہ میں

سامانہ سے تیمور نے آگے بڑھ کر جمنا کو عبور کیا اور دوآبہ کے علاقہ میں تباہی مچادی۔ سارا ملک اس کی لوٹ کھسوٹ سے ویرانہ بن گیا۔ جمنا کے کنارے قصبہ لونی میں جو دہلی کے قریب ہے اس نے منزل کی اور یہاں تقریباً پچاس ہزار قیدی جو گنگا کے کنارے تک پکڑے گئے تھے تہ تیغ کرا دیے۔ تیمور کے لشکر میں کچھ لوگ بڑے بڑے عمامے باندھے مولویوں کی صورت بنائے ساتھ تھے۔ اُنھوں نے مسلمان قیدیوں کو بھی ہندوؤں کے ذیل میں شمار کیا اور جہاد کی نیت سے اپنے ہاتھ سے ان بے کسوں کو قتل کر دیا۔

سنہ ۸۰۱ھ ماہ جمادی الاوّل میں تیمور نے جمنا کو عبور کیا اور فیروز آباد آ کر ٹھہر گیا۔ دوسرے دن حوض خاص پر اس کے لیے شامیانے لگائے گئے۔

سلطان محمود کا فرار

اقبال خاں تیموری لشکر کے مقابلہ پر بہت سے ہاتھی اور بھاری لشکر لے کر آیا لیکن تیموری فوج نے ایک ہی زوردار حملہ میں اسے بُری طرح شکست دی اور سارے ہاتھی تیمور کے ہاتھ آ گئے۔ جب رات ہوئی تو اقبال خاں اور سلطان محمود عزت و آبرو، شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنے اہل و عیال کو اس مصیبت میں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سلطان محمود تو گجرات کی طرف بھاگا اور اقبال خاں جمنا پار کر کے قصبہ برن میں جا چھپا۔

تیمور دہلی میں

دوسرے دن امیر تیمور دہلی میں داخل ہو گیا اور شہر والوں کو کافی مال و دولت کا اقرار لے کر امان عطا کی۔ حسب اقرار شہریوں سے مقررہ رقم اور مال وصول کر لیا۔ اس کے علاوہ اسے بڑے بڑے نذرانے اور قیمتی پیش کش بھی حاصل ہو گئی۔ اس درمیان میں تیموری لشکر کے کئی ایک سپاہیوں کو شہر والوں نے قتل کر دیا۔ جب تیمور کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے تمام شہر والوں کی عام گرفتاری کے احکام دے دیے اور دہلی کے رہنے والے بے شمار لوگوں کو ماوراء النہر پہنچا دیا۔

شیخ احمد کھٹو

ان قید ہونے والوں میں شیخ احمد کھٹو[1] بھی تھے جن کا مزار گجرات میں احمد آباد کے قریب ہے وہ بھی تیمور کے لشکر کے ساتھ گئے تھے۔ تیمور سے اُن کی ملاقات بھی ہوئی اور تیمور اُن کے فضل و کمال کا بڑا

---

[1] شیخ احمد۔ تھانیسر کے رہنے والے تھے اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ تھے۔ جب وہ امیر تیمور سے ملاقات کرنے دربار میں گئے تو ان کے اور شیخ الاسلام نبیرۂ مولانا برہان الدین مرغینانی مصنف ہدایہ کے درمیان نشست کی تقدیم و تاخیر پر جھڑپ ہو گئی۔ تیمور نے کہا "شیخ الاسلام کے دادا ہدایہ کے مصنف ہیں، اس لیے ان کو نشست میں اولیت اور تقدیم حاصل ہے۔" مولانا احمد نے فرمایا۔ "صاحب ہدایہ نے خود ہدایہ میں غلطیاں کی ہیں اصل عزت علم کی ہے نہ کہ شخص کی۔" شیخ الاسلام نے غلطیاں دریافت کیں۔ مولانا نے خود جواب دینے کی بجائے اپنے شاگردوں کو اشارہ کیا کہ وہ صاحب ہدایہ کی غلطیاں بیان کریں لیکن تیمور نے اس بحث کو روک دیا اور مجلس برخاست کر دی۔ جب مولانا احمد تیمور کی قید سے رہا ہوئے تو دہلی سے کالپی جا کر رہ گئے۔ اسی جگہ سنہ ۸۲۰ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار کالپی میں ہے۔

معتقد ہوگیا۔ اُنھوں نے ماوراالنہر کے تمام علماء کو مباحثہ میں لاجواب کر دیا اور تیمور سے ان قیدیوں کی رہائی کی سفارش کی۔ تیمور نے ان کی خاطر سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ بلاشبہ شیخ کا اہلِ ہند پر بڑا احسان ہے۔ شیخ کے حالات میں یہ سارا قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس فتح کے کچھ دن بعد خضر خاں اور بہادر ناہر میواتی جو میوات کے پہاڑوں میں ڈر کر چھپ گئے تھے، امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تیمور نے خضر خاں کے سوا باقی سب کو قید کر لیا۔ خضر خاں کی غالباً امیر تیمور سے پہلے کی تھوڑی بہت شناسائی تھی اسی لیے وہ بچ گیا۔

لاہور پر تیمور کا حملہ

تیموری لشکر نے دوبارہ ہندوستان کے سارے ملکوں کو لوٹ لیا اور کوہ سوالک کے ملکوں کو فتح کر کے وہاں ایک قیامت برپا کر دی اس کے بعد تیمور لاہور آیا۔ اس فتح کی تاریخ لفظ "رُخا" اور "خار" سے نکلتی ہے۔

شیخا کھوکھر پہلے تیمور کی خدمت میں چلا گیا تھا پھر وہ لوٹ کر آیا اور فریب سے لاہور کو سارنگ خاں سے چھین لیا تھا اور خود قابض بن کر بیٹھ گیا تھا۔ تیمور نے اس کو اہل و عیال سمیت گرفتار کر لیا اور لاہور کے تمام شہریوں کو لوٹ لینے اور گرفتار کر لینے کا حکم دیا۔

تیمور کی واپسی

خضر خاں کو دیپال پور اور ملتان کا ملک تفویض کر کے اس سے کہا: "دہلی بھی ہم نے تجھے عطا کر دی"۔ امیر تیمور لاہور سے کابل[1] ہوتا ہوا

---

[1] کابل۔ اکبر کے زمانہ میں یہ صوبہ تھا اور کشمیر اس کے ماتحت تھا۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے اس کا طول اٹک بنارس سے جو دریائے سندھ پر واقع ہے ہندوکوہ تک سو کوس ہے اس کا عرض قراباغ قندھار سے چغان سرا تک سو کوس ہے۔ اس کے شمال میں ہندوستان شمال مغرب میں کوہستان اور ملک غور اندراب بدخشاں، جنوب میں فرمل اور نغز ہیں یہ نہایت سرد علاقہ ہے شدید برف باری ہوتی ہے، میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں لیکن خربوزہ اچھا نہیں ہوتا، چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اس لیے زراعت اچھی نہیں ہوتی۔ کوہ ہندوکش کابل کو بدخشاں اور بلخ سے جدا کرتا ہے۔ ہندوستان سے کابل جانے کے پانچ راستے ہیں: (۱) کوہپہ۔ یہ راستہ درہ گوتل سے جلال آباد چلا گیا ہے، بابر نے اس راستہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اس وقت یہ درہ کھلا نہیں تھا۔ (۲) خیبر۔ یہ پہلے دشوار گزار راستہ تھا اکبر نے اس کو درست کرایا۔ (۳) بنگش۔ اس راستہ میں دریائے سندھ پڑتا ہے۔ (۴) نغز۔ (۵) فرمل۔ صوبہ کابل (موجودہ افغانستان) میں گیارہ زبانیں مروج رہی ہیں۔ ترکی، مغولی، فارسی، ہندی، افغانی، پشتو، پراچی، گبری، برکی، لمغانی اور عربی۔ اس علاقہ کے دو بڑے قبیلے ہزارہ اور افغان ہیں۔ ہزارہ کے لوگ ان چغتائی لشکریوں کی اولاد میں سے ہیں جن کو منکو قاآن نے ہلاکو کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ ہلاکو نے اس فوج کو اپنے فرزند نکودار اوغلان کی ماتحتی میں کابل بھیج دیا۔ یہ قبیلہ غزنی سے قندھار میدان سے سرحد بلخ تک آباد ہے۔ اس کی تقریباً ایک لاکھ خاندان کی آبادی ہے، یہ لوگ باہم بڑے منافق اور ریاکار ہوتے ہیں۔ دوسرا بڑا قبیلہ افغانوں کا ہے جو اپنے آپ کو بنی اسرائیل کی اولاد بتاتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ کا نام افغان تھا، اس کے تین لڑکے ہوئے: سربن، غرغشت، بٹن، ان تینوں کی اولاد کئی خاندانوں میں پھیل گئی۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں کوئی چالیس خاندانوں کے نام لکھے ہیں۔ افغان متی نامی ایک خود قبیلہ کے آدمی نے بٹن قبیلہ کی ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات کے بعد نکاح کر لیا۔ اس سے تین بیٹے

(باقی حاشیہ دیکھو صفحہ آئندہ پر)

براہ قندھار[1] سمرقند چلا گیا۔

اس سال دہلی میں ایسی وبا پھیلی اور اتنا سخت قحط پڑا کہ اس کی بربادی اور ویرانی میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ شہر اور مضافات ایسے اُجڑے کہ انسان تو انسان کسی چرند پرند کا سایہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ کابل صفحہ گزشتہ) جو غلزئی، لودی اور سردانی پیدا ہوئے ان کی اولاد افغان کہلائی۔ بعض مورخ افغانوں کو قبطی الاصل بتاتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل بیت المقدس سے مصر آئے تو یہ قبطی مصر سے بھاگ کر ہند آگئے اور افغان کہلائے۔

شہر کابل دنیا کے قدیم اور مشہور شہروں میں سے ہے۔ کہتے ہیں اس کی آبادی پشتاسپ کے عہد میں یہاں بسی تھی۔ اکبر کے زمانہ میں یہاں مٹی کے دو مضبوط قلعے تھے۔ قلعہ کابل کے غربی شمالی جانب ایک پہاڑی "شاہ کابل" نامی ہے اس پر کسی بادشاہ کی بنائی ہوئی عالی شان عمارت تھی۔ دوسری سرسبز پہاڑی "عقابین" ہے، دو چشمے بھی ہیں ایک کا نام "خطبیاں" ہے جو شہر میں سے گزرتا ہے۔ دوسرا چشمہ "جوئے پل متال" کہلاتا ہے۔ ایک نہر "ماہم آنگہ" بھی ہے، ایک تفریح گاہ گلگشتہ بھی ہے، یہی گلگشتہ اب گلگت کے نام سے اچھا خاصا شہر ہے۔ کابل اور قندھار ہندوستان کے دروازے کہلاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں کابل کا ذکر سب سے پہلے ؁۷۸ھ میں ملتا ہے جبکہ عبدالملک بن مروان اموی خلیفہ نے اسد بن عبداللہ کو معزول کر کے حجاج بن یوسف ثقفی کو خراسان کا اور اس کے تحت عبداللہ بن ابی بکر کو سیستان کا حاکم بنایا۔ عبداللہ بن ابی بکر نے سیستان میں لشکر جمع کر کے کابل کے راجہ ان تھیل پر حملہ کیا، وہ پہاڑوں میں جا چھپا۔ اس کے تعاقب میں عبداللہ بھی پہاڑوں میں جا کر راستہ بھول گیا۔ مقامی باشندوں نے واپسی کے دروں کو پتھروں سے چن دیا، جب اس کا لشکر عاجز آگیا تو اس نے سات لاکھ درہم جو تین لاکھ روپے کے مساوی ہوتے ہیں ادا کر کے حریف کے ملک سے نجات پائی۔ حجاج نے ؁۸۰ھ میں عبدالرحمٰن بن محمد اشعث کو کابل پر حملہ کے لیے روانہ کیا۔ اس نے بڑی کامیابی حاصل کی اور کافی مال غنیمت وصول کیا لیکن مقامی دشواریوں کے وجہ سے ملک پر قبضہ نہیں رکھ سکا اور واپس چلا گیا۔ حجاج نے اسے دوبارہ کابل پر حملہ کرنے کے لیے مجبور کیا وہ حجاج کی سخت گیری سے تنگ آچکا تھا اس نے حاکم کابل سے مصالحت کر لی اور حجاج سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا اور نواح تستر میں حجاج کو شکست دے دی۔ حجاج وہاں سے بصرہ چلا گیا۔ جب حجاج نے دوبارہ عبدالرحمٰن پر حملہ کیا تو وہ سبت کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ سبت کے قلعدار نے عبدالرحمٰن کو گرفتار کر کے حجاج کے پاس روانہ کر دینا چاہا لیکن حاکم کابل کو اس کی خبر ہو گئی، اُس نے حملہ کر کے عبدالرحمٰن کو چھڑا لیا اور کابل لے کر چلا گیا لیکن ؁۸۴ھ میں ان تھیل حاکم کابل نے حجاج کی باتوں میں آکر عبدالرحمٰن کو بصرہ بھیج دیا۔ اُس نے حجاج کے سامنے جانے سے پہلے ہی ایک پہاڑی پر سے گر کر جان دے دی۔ ؁۱۰۸ھ میں ہشام بن عبدالملک کے عہد میں اسد بن عبداللہ قشیری حاکم خراسان نے کابل کو فتح کر کے اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس کے بعد سے کابل بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں خراسان کے حاکم کا ماتحت رہا۔ سامانیوں کے عہد میں ایک غلام الپتگین نے غزنی اور کابل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سبکتگین بادشاہ ہوا، اس کے بعد محمود غزنوی نے غزنوی سلطنت قائم کی۔ غزنویوں کے بعد سلاطین غور کابل پر قابض رہے، ان کے بعد ان کے غلاموں کی حکمرانی رہی۔ عہد غلاماں کے بعد سلاطین خوارزم کا قبضہ رہا۔ ان کے بعد قاآن چنگیز خاں کے ہاتھ آگیا۔ اسی چنگیز خانی سلسلہ میں امیر تیمور نے کابل پر قبضہ کر لیا۔

[1] قندھار۔ کابل اس کے مشرق اور غزنی شمال میں ہے۔ گرمی سخت پڑتی ہے، سردی بہت کم ہوتی ہے لیکن برف باری ضرور ہوتی ہے۔ یہاں کا سفید گیہوں بہت مشہور ہے۔ قندھار سے پانچ کوس پر اژدر کوہ ایک پہاڑ ہے اس میں ایک غار ہے جس کا نام غار جمشید ہے اس درہ میں ہوا گھٹنے کی وجہ سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ قندھار کے انار مشہور ہیں بڑے بڑے سرخ دانے ترشی مائل ہوتے ہیں۔ اسی طرح سیب بھی مشہور ہیں، زردی مائل بڑے اور نہایت خوشبودار ہوتے ہیں۔ سب سے اچھا سیب سمرقند کا ہوتا ہے۔

ہندوستان کی طوائف الملوکی

نصرت شاہ جو اقبال خاں کے مقابلہ سے بھاگ کر دوآبہ میں چلا گیا تھا اس موقع کو غنیمت جان کر میرٹھ[1] آیا، وہاں سے سیدھا دہلی پہنچ گیا۔ جو لوگ مغلوں کی دست برد سے جان بچا کر اِدھر اُدھر چھپے بیٹھے تھے وہ سب اور عادل خاں اس کے گرد جمع ہو گئے اور اچھا خاصا لشکر بن گیا۔

اب نصرت شاہ نے شہاب خاں کو اقبال خاں کے مقابلہ کے لیے برن[2] کی طرف روانہ کیا لیکن راستہ ہی میں اسے ہندوؤں نے شب خون مار کر قتل کر ڈالا۔ اقبال خاں نے پیش قدمی کر کے اس کے مال و اسباب اور ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کامیابی سے اقبال خاں کا اقبال چمک اٹھا اور روز بروز اس کی جمعیت میں ترقی ہوتی گئی اور نصرت شاہ کی رونق اُٹھتی چلی گئی۔

اقبال خاں نے پوری تیاریوں کے بعد برن سے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ اس کی لشکر کشی کی خبر سنتے ہی نصرت شاہ فیروز آباد سے میوات کی طرف بھاگ گیا۔ اسی جگہ اس کا انتقال ہوا۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی طوائف الملوکی حد انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ جہاں جس نے قدم جما لیے وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔

اقبال خاں کی کارروائیاں

۸۰۲ھ میں اقبال خاں نے حاکم بیانہ شمس خاں اوحدی پر حملہ کیا، نوہ اور پٹیل کے جنگل میں ان کا مقابلہ ہوا جس میں اقبال خاں کو فتح نصیب ہوئی اور شمس خاں شکست کھا کر بیانہ کی طرف پیچھے ہٹ گیا۔

بیانہ کے بعد اقبال خاں نے کینتھر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ رائے ہرسنگھ سے کافی مال بطور پیش کش لے کر واپس ہوا۔

۱۔ میرٹھ۔ کہتے ہیں یہ شہر قبل مسیح سے آباد ہے۔ میرٹھ کی جامع مسجد کے پاس بدھ مذہب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سید سالار مسعودی غازی نے اسے فتح کیا تھا۔ مغلوں کے عہد میں یہاں عمدہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ دارالخلافہ دہلی سے قریب تھا اس لیے اس کی بڑی اہمیت اور رونق تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں سکھوں، مرہٹوں، روہیلوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے تباہ ہو گیا۔ انگریزوں کے زمانہ میں اس کی آبادی سوا لاکھ تھی۔ شاہی زمانہ کی جامع مسجد اونچے ٹیکرے پر ہے۔ شہر سے باہر شاہ پیر کی درگاہ سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے اس میں پچی کاری کا نفیس کام ہے مگر روضہ کا گنبد اوپر سے نامکمل ہے، یہ شاہ صاحب جہانگیر بادشاہ کے پیر تھے عمارت نور جہاں بیگم کی یادگار ہے۔ شہر سے باہر ایک میل پر نوچندی دیوی کا مندر ہے یہاں نئے چاند کی خوشی میں "نوچندی کا میلہ" لگتا ہے۔ میرٹھ کی چھاؤنی قدیم انگریزی کمپ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اسی چھاؤنی سے شروع ہوئی تھی۔ میرٹھ کے کباب بھی خاص شہرت رکھتے ہیں۔

۲۔ برن۔ ابن بطوطہ نے اسے بَرَن لکھا ہے وہ کہتا ہے "یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے" ہندوؤں کے درمیان یہ مسلمانوں کا شہر ہے اس کا حاکم محمد بن بیرم ترکی ہے" یہاں بکثرت درندے ہیں اس نے ایک مردم خور شیر کا قصہ بھی بیان کیا ہے۔ اس نام کا آج کل کوئی شہر نہیں۔ آئین اکبری میں ایک محال اور قلعہ بروئی نام کا سرکار نرور صوبہ آگرہ میں ملتا ہے غالباً یہی شہر ہوگا۔ گوالیار سے جو سڑک مئو کو جاتی ہے وہ بھی نرور کے علاقہ سے گذرتی ہے، ابن بطوطہ کا راستہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ نرور گوالیار میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔

اسی سال جون پور میں خواجہ جہاں کا انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ ملک مبارک قرنفل مبارک شاہ کے خطاب سے قائم مقام بنا۔

۸۰۳ھ میں بیانہ کے شمس خاں اور بہادر ناہر خاں کے لڑکے مبارک خاں نے اقبال خاں سے مصالحت کر لی اور اس نے ان دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر پٹیالہ[۵] کی حدود پر حملہ کیا۔ آب سیاہ کے کنارے جو کالے پانی کے نام سے مشہور ہے وہاں کے مقدم رائے سیر کو شکست دے کر بھگا دیا اور ان کا فرول کا اٹاوہ تک تعاقب کیا۔

اقبال خاں جب یلغار کرتے ہوئے قنوج پہنچا تو وہاں گنگا کے دوسرے کنارے پر مبارک شاہ جونپور سے کوچ کر کے پہنچ گیا تھا اور اس کی فوج مقابلہ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اقبال خاں نے اس کنارے پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ فریقین میں سے کسی کو بھی گنگا عبور کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور دونوں اپنے اپنے علاقہ کو لوٹ گئے۔

دریا سے واپسی پر اقبال خاں نے شمس خاں اور مبارک خاں کو بدعہدی کر کے قتل کر ڈالا۔

اسی سال ایک بادشاہی غلام نے جو حاکم سامانہ کا داماد تھا کافی بڑی جمعیت اکٹھی کر لی اور ۹ رجب ۸۰۳ھ میں اجودھن[۶] کے نواح میں اس نے خضر خاں سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر قصبہ بھوبر میں جا چھپا۔ غالب خاں اور

---

۵ پٹیالہ۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں میں پٹیالہ سب سے بڑی ریاست تھی۔ سدھو جاٹ قوم کے ایک سرگروہ سردار آلا سنگھ نے جو چودھری پھول کے بیٹے رام کا لڑکا تھا ۱۱۶۶ھ / ۱۷۸۲ء میں اس ریاست کو قائم کیا تھا۔ ریاست کا قیام مین اس زمانہ میں ہوا جبکہ ہندوستان میں احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے تحت ہوگئی اور ریاست کے راجاؤں نے ۱۸۱۴ء میں نیپال کی مہم میں ۱۸۴۷ء میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی میں ۱۸۵۷ء میں غدر کے ہنگامہ میں ۱۸۷۲ء میں کوکوں کی گرفتاری میں اپنی فوج سے انگریزوں کی مدد کی۔

پٹیالہ کا کچھ حصہ میدانی اور کچھ پہاڑی ہے۔ بڑا حصہ جو میدانی ہے ستلج کے جنوب میں واقع ہے، کوہستانی علاقہ شملہ تک چلا گیا ہے، شملہ پہلے پٹیالہ کے تحت تھا انگریزوں نے ۱۸۳۰ء میں بڑولی کے تین مواضعات دے کر شملہ لے لیا۔ شاہی زمانہ کے مشہور شہر سنام، پنجور کا شالی مار باغ، سرہند، بھٹنڈہ اور نارنول پٹیالہ کے تحت تھے۔

ریاست کا رقبہ ۵ ہزار چار سو بارہ مربع میل، آبادی ۱۵ لاکھ ۸۶ ہزار تھی، آمدنی ۶۶ لاکھ روپیہ سالانہ۔

اکبری دور میں اس کو پٹالا کہتے تھے اور یہ صوبہ لاہور میں سرکار سندھیا ساگر کا ایک محال تھا جس کی آمدنی ۶۲۴۰۰۰ تھی۔ جانو ہبر ذات کے لوگ رہتے تھے۔

۶ اجودھن۔ پاک پٹن کا قدیم نام اجودھن تھا۔ بابا فرید کی خانقاہ کی وجہ سے اکبر بادشاہ کے حکم سے اسے پاک پٹن کہنے لگے۔ پہلے پٹن فرید کہتے تھے۔ یہ شہر ستلج سے دس میل پر شمال میں ہے۔ پہلے دریا اس کے نیچے بہتا تھا۔ ملتان سے ہندوستان جانے والے ستلج کو اسی جگہ سے عبور کرتے تھے۔ اب ضلع منٹگمری میں تحصیل کا صدر مقام ہے ہر سال محرم کے مہینے میں بابا فریدالدین شکر گنج کے مزار پر بڑا بھاری میلہ ہوتا ہے، ساٹھ ستر ہزار آدمی جمع ہوتے ہیں ان میں سے ہر شخص ایک دریچہ "بہشتی کھڑکی" میں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ قصبہ کی آبادی آٹھ ہزار ہوگی۔ آئین اکبری میں اس کو صرف پٹن لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں پٹن بابا فرید۔

بابا فریدالدین شکر گنج یہ خواجہ جمال الدین سلیمان کے فرزند تھے۔ خواجہ صاحب کابل سے آ کر کوٹ کرور میں ٹھہرے۔ وہاں مولانا وجیہ الدین خجندی عباسی کی دختر سے آپ کا نکاح ہوا، آپ نے قصبہ کھوتوال میں جو اب تحصیل میلسی ضلع ملتان میں چاولی مشائخ کے نام سے مشہور ہے سکونت اختیار کی۔ خواجہ صاحب سلیمان فرخ شاہ کابلی کی اولاد میں سے تھے اور نسب میں فاروقی تھے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

دوسرے امیروں نے متفق ہو کر اسے قتل کر ڈالا

سلطان محمود دہلی میں

۸۰۲ھ میں محمد شاہ کا بیٹا سلطان محمود دھار[1] سے دہلی آیا۔ اقبال خاں دکھاوے کے لیے اس کے استقبال کو آیا اور اُسے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ لے جا کر کوشک جہاں نما میں ٹھہرایا، لیکن سلطنت کے سارے اختیارات اسی طرح اپنے ہاتھ میں رکھے۔ یہ بات سلطان محمود کو بڑی گراں گزری تھی لیکن وہ بالکل ہی مجبور و بے بس تھا۔

اسی سال مبارک شاہ مر گیا، سلطان ابراہیم اس کا چھوٹا بھائی جانشین بنا۔ ابراہیم لشکر تیار کر کے اقبال خاں اور سلطان محمود کے مقابلہ کے لیے آیا۔ سلطان محمود اقبال خاں سے کبیدہ خاطر تھا ہی وہ لڑائی ہونے سے پہلے شکار کے بہانے اقبال خاں کے لشکر سے بھاگ نکلا اور سلطان ابراہیم کے پاس پہنچ گیا لیکن سلطان ابراہیم نے اس سے بڑی بے رُخی اور لاپروائی برتی۔

اس اثنا میں سلطان محمود نے قنوج سے شاہزادہ فتح خاں ہروی کو جو مبارک شاہ کی طرف سے وہاں حاکم تھا، نکال کر قلعہ قنوج پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کی تمام رعایا اس کی حامی بن گئی۔

سلطان ابراہیم جونپور[2] کو اور اقبال خاں دہلی کی طرف بغیر لڑے لوٹ گئے اور سلطان محمود نے صرف قنوج پر ہی

(بقیہ اجودھن صفحہ گزشتہ) جواہر فریدی کی تحریر کے مطابق فرخ شاہ کابل حضرت ابراہیم بن ادہم بادشاہ بلخ کی اولاد میں سے تھے۔ ابراہیم بن ادہمؒ (م ۱۶۱ھ) قبیلہ بکر بن وائل سے تھے اور قریشی نہیں تھے۔ شیخ مجدد سرہندی اور دوسرے فاروقی خاندان کے لوگ جن کا تعلق فرخ شاہ کابلی سے ہے اپنے نسب میں ابراہیم تو لکھتے ہیں ادہم نہیں لکھتے۔ بابا فریدالدین کو ابن بطوطہ نے غلطی سے بداؤنی لکھا ہے آپ کی پیدائش ۵۸۲ھ وفات ۶۷۰ھ میں ہوئی۔ مقام ولادت قصبہ کھوتوال مضافات ملتان ہے۔ خرقۂ طریقت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملا تھا بابا صاحب نے ملتان سے قندھار جا کر تحصیل علم کیا، وہاں سے بغداد جا کر علماء کی صحبت میں رہے وہاں سے دہلی اور دہلی سے ہانسی پھر وہاں سے اجودھن آکر مقیم ہوئے۔ سفینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے تاریخ وفات ۵ محرم بروز سہ شنبہ ۶۶۴ھ لکھی ہے۔ فرشتہ ۶۶۰ھ لکھتا ہے، شاہ عبدالحق نے ۶۶۴ھ لکھی ہے، حیدرآباد کا مشہور شمس الامرائی خاندان بابا صاحب کی اولاد میں سے ہے +

[1] دھار۔ ابن بطوطہ نے اسے ظہار لکھا ہے وہ لکھتا ہے "یہ مالوہ کا سب سے بڑا شہر ہے زراعت بہت ہوتی ہے، خصوصاً گیہوں بہت ہوتا ہے۔ یہاں سے پالن دہلی تک جاتے ہیں جو چوبیس منزل ہے، سڑک پر ہر جگہ پتھر کے ستون (سنگ میل) لگے ہوئے ہیں جن پر فاصلہ درج ہے مسافر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کتنا چلا ہے منزل کتنی دور ہے جس شہر کا فاصلہ چاہے ان ستونوں سے معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ شہر ابراہیم مالدیپی کی جاگیر ہے۔" آئین اکبری میں تحریر ہے۔ "دھار راجہ بھوج کا پایہ تخت تھا، انگور دو دفعہ پھل دیتا ہے، پہلا پھل بہت شیریں ہوتا ہے۔" پہلے پوار راجاؤں کا دارالخلافہ اجین تھا راجہ بھوج نے دھار کو پایہ تخت بنایا۔ موجودہ راجہ خود کو بکرماجیت کی اولاد بتاتا ہے۔ ۱۳۰۵ء میں پواروں کا خاندان کمزور ہو گیا اور دکن میں پونا چلا گیا تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں مالوہ کا دارالخلافہ یہی دھار تھا بعد میں منڈو مقرر ہوا۔ دھار انگریزی عہد میں چھوٹی سی ریاست تھی۔ آبادی سترہ ہزار ہوگی۔ مئو اور بڑودہ کی سڑک پر ۳۳ میل مغرب میں بڑودہ سے ۱۸۳ میل مشرق میں ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں کافی بڑا شہر تھا، اس وقت کی یادگار دو سنگ سرخ کی مسجدیں مرمت طلب حالت میں ہیں +

[2] جونپور۔ اس کو سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے برادر زادہ فخرالدین جونا کے نام پر بسایا تھا۔ سلطان محمود بن سلطان محمد بن فیروز شاہ نے اپنے وقت ملک سرور نامی ایک خواجہ سرا کو جو اس کے اسلاف کے وقت خان جہاں کے عہدہ پر تھا، سلطان الشرقی کا خطاب

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

قناعت کر لی۔

۸۰۵ھ میں اقبال خاں نے گوالیار پر حملہ کیا۔ مغلوں کی یورش میں یہ قلعہ ہر سنگھ نے مسلمانوں سے چھین لیا تھا اقبال خاں نے قلعہ کو ہر سنگھ کے بیٹے بیرم دیو کو شکست دے کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔

تاتار خاں کی ہلاکت

۸۰۷ھ میں تاتار خاں ناخلف نے اپنے باپ ظفر خاں کو دھوکے سے قید کر کے اساول بھیج دیا۔ سلطان ناصر الدین محمد شاہ خطاب رکھ کر ایک بڑا لشکر جمع کیا اور دہلی کی طرف پیش قدمی کی، لیکن راستہ میں اس کے چچا شمس خاں نے اس کو زہر دے کر مار ڈالا اور ظفر خاں کو قید سے رہائی دی۔ سارا لشکر اس کے ساتھ ہو گیا۔

۸۰۸ھ میں اقبال خاں نے گوالیار اور اٹاوے کا رُخ کیا۔ اس نواح کے جتنے بھی راجہ تھے وہ سب اٹاوے کے

(بقیہ حاشیہ جون پور صفحہ گذشتہ) دے کر اس علاقہ پر متعین کیا تھا۔ اس کے بعد مبارک قرنفل نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے مقابلہ میں ملو سلطان آیا لیکن لڑائی کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ مبارک شاہ ۸۰۴ھ (م ۱۴۰۱ء) میں فوت ہوا اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سلطان ابراہیم جانشین بنا، یہ علم دوست بادشاہ تھا، ہندوستان کے مشہور فاضل قاضی شہاب الدین اسی عہد کے بزرگ ہیں۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ تیمور کے حملہ کے بعد جون پور آئے۔ یہ ابوالفضل کا بیان ہے لیکن آئینہ اودھ کے مصنف نے لکھا ہے ان کے بزرگ غزنی کے تھے اور ان کی نشوونما دولت آباد دکن میں ہوئی تھی، ان کی تصانیف ہیں جیسے بدیع البیان، فتاوی ابراہیم شاہی، تفسیر بحر المواج، مناقب السادات، مصباح (نحو)۔ ابراہیم شاہ کے بعد اس کا بڑا لڑکا بھکن خاں محمود شاہ کے لقب سے ۸۴۴ھ م ۱۴۴۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانہ میں سلطان محمود خلجی شاہ مالوہ نے کالپی پر لشکر کشی کی ۸۵۶ھ م ۱۴۵۲ء میں سلطان بہلول اور سلطان محمود میں لڑائی ہوئی جو چھ سال تک جاری رہی، آخر میں محمود کو کامیابی ہوئی اور وہ دہلی کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن بیماری نے مہلت نہ دی اور ۱۸ سال حکومت کر کے مر گیا۔ لیکن ابوالفضل نے لکھا ہے "محمود شاہ کے افعال پسندیدہ نہیں تھے اس لیے وہ معزول کیا گیا اور اس کا بھائی حسین شاہ فرمانروا ہوا۔" ابوالفضل نے سلطان محمود اور محمد شاہ میں فرق نہیں کیا ہے، ابوالفضل کی بات محمد شاہ پر صادق آتی ہے جو محمود شاہ کا لڑکا تھا اور اس کے بعد تخت نشین ہوا اور اسے حسین شاہ نے تخت سے علیحدہ کر کے بادشاہت لے لی۔ سلطان بہلول نے اسے شکست دی۔ سلطان حسین نے سکندر شاہ کے زمانہ میں فوج جمع کر کے دہلی پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر بنگال بھاگ گیا اور اس پر سلاطین شرقی کی حکومت ختم ہو گئی۔ ان چھ بادشاہوں نے ننانوے سال چھ ماہ حکومت کی۔

جونپور فیض آباد سے ۴۸ میل پر ہے، دریائے گومتی شہر کے درمیان سے گزرتا ہے دریا کے کنارے ہندوؤں اور بدھوؤں کے مندروں کے آثار ہیں اس کی آبادی ۵۰ ہزار ہوگی۔ گومتی پر جو پل ہے اسے ۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء میں نواب منعم خاں خانخاناں نے ۳۰ لاکھ کے صرفہ سے بنوایا تھا مادہ تاریخ "الصراط المستقیم" ہے۔ بڑی مسجد "مسجد جامع الشرق" ہے، یہی نام مادہ تاریخ بھی ہے جس سے ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء نکلتا ہے۔ مسجد کے دائیں جانب سلاطین شرقی کا قبرستان عبرت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ ایک اور عظیم الشان مسجد "مسجد اٹالہ" ہے۔ یہ وسیع اور بڑی پُر عظمت مسجد ہے۔ اس میں علوم دینی کا ایک بہت بڑا مدرسہ ہے۔ ایک اور شاندار مسجد لعل دروازہ ہے جس کا اصل نام "نماز گاہ" تھا۔ جونپور کا خوشبودار تیل اور تمباکو مشہور ہے۔

جونپور سے تین میل پر ایک موضع ظفر آباد ہے یہ بھی کسی وقت بڑا شہر تھا اور کاغذ سازی کے لیے مشہور تھا۔

قلعہ میں اکٹھے ہو گئے۔ چار ماہ تک لڑائی ہوتی رہی آخر کار ان راجاؤں نے چار ہاتھی اور کچھ پیش کش دے کر صلح کر لی۔ اقبال خاں نے اٹاوہ سے لوٹ کر قنوج کے قلعہ پر سلطان محمود سے مقابلہ کے لیے حملہ کیا لیکن قلعہ کی مضبوطی سے لاچار ہو کر دہلی واپس ہو گیا۔

اقبال خاں کا انجام محرم ۸۰۸ھ میں اقبال خاں سامانہ اور پھر وہاں سے رو پڑ کی طرف گیا اور بہرام خاں ترک بچہ کو جو سارنگ خاں کا مخالف ہو گیا تھا دھوکے سے گرفتار کر کے اس کی کھال کھنچوا دی اور وہاں سے خضر خاں کے مقابلہ کے لیے ملتان کا رُخ کیا۔ تلونڈی سے وہاں کے زمینداروں رائے کمال الدین وغیرہ کو اپنے ہمراہ لے کر آگے بڑھا۔ اسی سال ۱۹ جمادی الاول کو ضلع اجودھن میں خضر خاں سے مقابلہ ہوا۔ اقبال خاں کا اقبال رو بہ زوال ہو گیا تھا اس لیے پہلے ہی حملہ میں اُسے شکست ہوئی، اُس کا گھوڑا زخمی ہو گیا تھا اس لیے وہ معرکہ گاہ سے جان بچا کر نکل نہ سکا خضر خاں کے لشکریوں نے اس کا تعاقب کر کے پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر فتح پور ضلع ملتان میں بھیج دیا۔

سلطان محمود کی دوبارہ تخت نشینی ۸۰۸ھ ماہ جمادی الآخر میں امرائے دہلی کے بلانے پر سلطان محمود قنوج سے دہلی آکر دوبارہ تخت نشین ہوا۔ سب امیروں کو مناصب تقسیم کیے مبارک خاں کے خاندان کو کول کی طرف روانہ کر دیا۔

۸۰۹ھ میں سلطان محمود قنوج کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن سلطان ابراہیم نے گنگا عبور کر کے راستہ روک دیا اور مقابلہ کے لیے صف آرائی کر لی لیکن دونوں فریق بغیر لڑے اپنے اپنے علاقہ کو لوٹ گئے۔ ابراہیم نے دوبارہ فوج کشی کر کے قنوج کا محاصرہ کر لیا۔ قنوج میں سلطان محمود کی طرف سے ملک محمود ترمتی ناظم تھا، اس نے چار مہینے تک حملہ آوروں کی مدافعت کی لیکن جب کسی طرف سے بھی مدد نہ ملی تو مجبوراً امان لے کر قنوج ابراہیم کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم نے برسات قنوج میں گزاری، پھر اختیار خاں کو قنوج میں چھوڑ کر دہلی کی تسخیر کے ارادہ سے کوچ کیا۔

دہلی پر سلطان ابراہیم کا حملہ ۸۱۰ھ میں سلطان محمود کے کچھ آدمی باغی ہو کر ابراہیم سے آکر مل گئے۔ ان باغیوں میں نصرت خاں گرگ انداز تاتار خاں ولد سارنگ خاں، اقبال خاں کا غلام ملک مرحبا وغیرہ شامل تھے۔ البتہ اسد خاں لودی سنبھل میں قلعہ بند ہو گیا، لیکن دوسرے ہی دن سلطان ابراہیم نے قلعۂ سنبھل کو فتح کر لیا اور اُسے تاتار خاں کے سپرد کر دیا اور گنگا عبور کر کے دہلی کی طرف یلغار کی۔ جب جمنا کے کنارے پہنچا تو اسے خبر ملی کہ ظفر خاں نے دھار کو تسخیر کر کے جونپور کی طرف فوج کشی کر دی ہے۔ یہ سن کر سلطان ابراہیم نے دہلی کا خیال چھوڑ دیا اور برن میں ملک مرحبا کو متعین کر کے بڑی تیزی سے جونپور پہنچا۔ سلطان محمود نے اس کا پیچھا کر کے ملک مرحبا کو قتل کر دیا۔ سنبھل کا قلعہ بھی بغیر لڑے اس کے ہاتھ آگیا اسے سلطان نے اسد خاں لودی کے حوالے کر دیا۔ تاتار خاں قنوج بھاگ کر چلا گیا۔ اس اقدام کے بعد سلطان محمود دہلی لوٹ آیا۔

دہلی پر خضر خاں کا حملہ اسی سال خضر خاں نے بڑی تیاریوں کے ساتھ پیش قدمی کی اور دولت خاں کو سامانہ سے

بے دخل کر دیا۔ وہاں کے سارے امیر خضر خاں کے ساتھ ہو گئے۔ بتدریج دہلی کے قریب تک کا سارا علاقہ خضر خاں کے ہاتھ آگیا، صرف رہتک اور دوآبہ کا درمیانی ملک سلطان محمود کے پاس رہ گیا۔

۸۱۱ھ میں سلطان محمود نے حصار فیروزہ کا رخ کیا۔ وہاں خضر خاں کی طرف سے قوام خاں ناظم تھا اُسے بھگا کر سلطان محمود نے حصار[1] فیروزہ پر قبضہ کر لیا اور علاقہ رہتک تک فوج کشی کر کے دہلی لوٹ آیا۔

خضر خاں نے بھی فتح آباد سے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ رہتک کے راستے پیش قدمی کی، دہلی پر حملہ کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت دہلی میں بڑا سخت قحط تھا اس لیے وہاں ٹھہر نہ سکا اور دوآبہ کے علاقہ پر قبضہ کر کے فتح پور کو لوٹ گیا۔

۸۱۲ھ میں بیرم خاں ترک بچہ نے خضر خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ واضح رہے، بیرم خاں نے بہرام خاں ترک بچہ کے بعد سامانہ پر قبضہ کر لیا تھا اور دولت خاں سے شکست کھا کر خضر خاں کے پاس آگیا تھا، پھر خضر خاں سے بغاوت کر کے دوبارہ دولت خاں سے جا کر مل گیا تھا۔ خضر خاں نے اسے سابقہ جاگیر عطا کر دی۔

۸۱۳ھ میں خضر خاں نے رہتک کا محاصرہ کر لیا اور چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد اسے فتح کر کے فتح پور واپس چلا گیا۔ اسی سال سلطان محمود بھی کیتھر کی طرف گیا اور وہاں سے لوٹ کر دہلی آ گیا۔

خضر خاں کا دہلی پر دوسرا حملہ

۸۱۴ھ میں خضر خاں نے نارنول اور میوات پر حملہ کر کے بڑی لوٹ مار کی اور دہلی پر حملہ کر دیا۔ سلطان محمود سیری کے قلعہ میں اور اختیار خاں فیروز آباد میں محصور ہو گئے، کئی دن تک لڑائی جاری رہی، آخر غلّہ کی گرانی کی وجہ سے خضر خاں پانی پت کے راستہ فتح پور چلا گیا۔

سلطان محمود کی وفات

۸۱۵ھ میں سلطان محمود کا انتقال ہو گیا اور فیروز شاہ کے خاندان کی سلطنت ختم ہو گئی۔ سلطان محمود نے اس سارے انتشار اور طوائف الملوکی کے باوجود بیس سال دو ماہ حکومت کی۔

عہد محمودی کے شاعر

سلطان محمود کے عہد کا سب سے بڑا شاعر قاضی ظہیر دہلوی گزرا ہے۔ اس کا ایک دیوان مدحیہ قصائد پر مشتمل ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

وارث سلطنت قاہرہ سلطان محمود
کہ جہاں خدمت جد و پدرش بگزیدہ!

---

[1] حصار فیروزہ۔ سلطان فیروز شاہ نے آباد کیا تھا اور دریائے جمنا سے ایک نہر نکال کر شہر میں پانی پہنچایا تھا۔ کہتے ہیں ایک عارف نے فیروز شاہ کو فرمانروائی کا مژدہ سُنایا اور اُن کی ہدایت پر ہی یہ نہر تیار کی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ نہر قصبہ سرسہ کے قریب ایک تالاب میں گر کر ناپید ہو جاتی ہے۔ اس تالاب کو بیدر کہتے ہیں۔ اس کے متعلق بڑی داستانیں مشہور ہیں۔ اس ضلع میں دریا کم ہیں اور کنوؤں میں بھی پانی بہت گہرائی پر ملتا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں حصار فیروزہ صوبہ دہلی کی سرکار تھی جس میں ۲۷ محالات تھے۔

ایک دوسرا قصیدہ ہے ؎

قہرمانے کہ بود سجدہ بسوئش افلاک
بادشاہے کہ کند فخر بدورش ایام

ایک اور قصیدے کا شعر ہے ؎

یار بیروں رفت بیروں رو تو اے جان نیز ازاں کہ
گہ بروں با یار ثانی باشد از یاری بروں

ایک اور شعر ہے ؎

خسروا گر ز رکاب تو بماندم محروم
نیستم فارغ یک ساعتے از مدح و ثنا

ایک اور قصیدہ ہے ؎

بوئے گل جنبید سوئے گلستاں خیز اے ندیم
بادۂ کہنہ طلب یاد آر ازاں یار قدیم

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں قاضی ظہیر کے بعد ایسا بڑا شاعر کوئی اور نہیں گزرا۔

دولت خاں اور خضر خاں کے مقابلے

سلطان محمود کے انتقال کے بعد مبارز خاں، والیٔ رہتک، ملک ادریس اور دوسرے امراء نے خضر خاں کے مقابلہ میں دولت خاں سے موافقت کر لی۔ خضر خاں اس سال فتح پور ہی میں بیٹھا رہا۔

۸۱۶ھ میں دولت خاں شکار کے لیے کیتھر گیا اور وہاں کے تمام راجاؤں کو گرفتار کر کے پٹیالی کا رخ کیا۔ اس جگہ بدایوں کا حاکم مہابت خاں اس سے آکر مل گیا۔

اسی سال سلطان ابراہیم نے کالپی[1] میں قادر خاں ولد محمود خاں کو گھیر لیا۔ دولت خاں کے پاس لشکر زیادہ نہ تھا اس لیے اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور دونوں میں سے کسی کو مدد نہ دی۔

اسی سال ماہ ذی قعدہ میں خضر خاں فیروز آباد آیا۔ وہاں کے تمام امیر اس سے آکر مل گئے۔ ملک ادریس رہتک میں قلعہ بند ہو گیا، خضر خاں وہاں سے میوات چلا گیا اور بہادر ناہر کے بھتیجے جلال خاں میواتی کو ہمراہ لے کر سنبھل پر حملہ کیا اور اسے خوب لوٹا۔

---

[1] کالپی۔ یہ قصبہ جمنا کے کنارے بہت سے بزرگانِ دین کی خوابگاہ ہے، یہاں کی مصری مشہور ہے۔ سلطان شرقیہ کے زمانہ میں یہ شہر دہلی کا باج گزار تھا۔ قادر خاں والیٔ کالپی نے بغاوت کی اور خود مختار بن گیا۔ سلطان ہوشنگ حاکم مالوہ نے فوج کشی کر کے اس کو شکست دی لیکن فتح کے بعد شہر اسی کے سپرد کر دیا۔ سلطان محمود شرقی نے نصیر خاں ولد قادر خاں کو شکست دے کر کالپی پر قبضہ کر لیا۔ اکبر کے زمانہ میں یہ صوبہ آگرہ کی سرکار تھی جس میں ۱۵ محال تھے۔

دہلی پر خضر خاں کا تیسرا حملہ

۸۱۶ھ ذی الحجہ کے مہینے میں خضر خاں نے دہلی پر یورش کی اور شہر سے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔ دولت خاں قلعہ بند ہو گیا لیکن خضر خاں کی طرف دار ملک لونا وغیرہ کی بے رخی کی وجہ سے مقابلہ سے عاجز آگیا اور بڑی عاجزی سے امن طلب کر کے خضر خاں کے پاس حاضر ہو گیا۔ خضر خاں نے اسے قید کر کے قوام خاں کے سپرد کر دیا۔ قوام خاں نے اُسے حصار فیروز آباد لے جا کر قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۷ ربیع الاول ۸۱۶ھ کو پیش آیا۔

سلطان خضر خاں بن ملک اشرف

خضر خاں نے پایۂ تخت ہند دہلی کو فتح کرنے کے بعد ۸۱۶ھ میں تخت شاہی پر جلوس کیا۔

خضر خاں کا خاندان

فیروز شاہ کے زمانہ میں خضر خاں کے دادا ملک سلیمان کو ملک نصیر الملک مروان نے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم جہانیاں[1] شیخ جلال الدین بخاری کسی کام سے ملک مروان کے گھر آئے۔ کھانے کے وقت ملک سلیمان حضرت کا ہاتھ دھلانے کے لیے آفتابہ اور طشت لے کر سامنے آیا۔ حضرت مخدوم نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ "اس سید زادے سے ایسی خدمتیں لینا مناسب نہیں"۔ اُس دن سب کو علم ہوا کہ ملک سلیمان نجیب سید ہے۔ ویسے بھی اس کے طور طریقے سیدوں جیسے ہی تھے۔

ملک مروان جس کا ذکر کیا گیا، فیروز شاہ کے زمانہ میں ملتان کا حاکم تھا۔ اس کے مرنے پر ملتان اس کے بیٹے ملک شیخ کو مل گیا۔ کچھ دن بعد جب اس نے بھی وفات پائی تو ملتان کا علاقہ ملک سلیمان کے سپرد ہو گیا۔ کچھ دن بعد جب ملک سلیمان نے انتقال کیا تو ملتان کا صوبہ اور اس کے ماتحت تمام علاقے فیروز شاہ نے اس کے پوتے خضر خاں کو تفویض کر دیے۔

"رایات اعلیٰ"

ملتان کی عملداری سے بتدریج ترقی کر کے خضر خاں بادشاہی کے بلند درجہ تک پہنچ گیا لیکن اس نے بادشاہی خطاب اختیار نہ کیا صرف "رایات اعلیٰ" اپنا لقب مقرر کر کے انتظام سلطنت سنبھال لیا۔

---

[1] مخدوم جہانیاں۔ اوچہ کے سید جلال الدین سرخ بخاری کے پوتے تھے، سید صدر الدین راجو قتال ان کے حقیقی بھائی تھے۔ دو سال تک مدینہ منورہ میں رہ کر شیخ عفیف الدین سے خرقۂ طریقت حاصل کیا۔ مکہ میں شیخ امام عبداللہ یافعی سے بھی ارادت تھی۔ وہاں سے دہلی آکر نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی خدمت میں رہے اور سلسلۂ چشتیہ کا خرقہ حاصل کیا۔ مشہور ہے جہاں چاہتے تھے، پلک جھپکنے میں پہنچ جاتے تھے، اس لیے جہانیاں جہاں گشت کے لقب سے مشہور ہوئے۔ صاحب اخبار الاخیار نے سال وفات ۷۸۵ھ عمر ۷۸ سال لکھی ہے۔ آپ کی ولادت ۱۴ شعبان شب برات میں ہوئی تھی۔ اوچ مضافات ملتان میں مزار ہے وفات ۱۰ ماہ ذی الحجہ عید الاضحیٰ کے دن ہوئی تھی۔ ایک مبارک رات میں پیدا ہوئے اور ایک مبارک دن میں وصال فرمایا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔ "میں نے اوچہ میں سید جلال الدین حیدری علوی کی زیارت کی، انھوں نے مجھے اپنا خرقہ عنایت کیا"۔ اس نام سے ابن بطوطہ کی مراد جہانیاں جہاں گشت سے ہی ہو گی۔ ضیاء الدین برنی کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے فیروز شاہ اور جام بانبیہ حاکم سندھ کی صلح بھی سید جلال نے ۷۶۱ھ میں کرائی تھی۔ ان کے مزار پر یہ تاریخی شعر درج ہے: "تاریک گشت جملہ جہاں بے جلال شاہ + تاریخ بود ہفت صد و ہشتاد و پنج سال"۔ مخزن الواصلین میں تاریخ ولادت ہے: "ہفت صد ہفت سال ہجری بود + کاں مہ برج دیں طلوع بنمود"۔ ابن بطوطہ ۷۳۴ھ میں اوچ پہنچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے اس وقت ان کی عمر ۲۷ سال تھی +

تاج الملک کی فوج کشی

۸۱۶ھ میں خضر خاں نے سلطان محمود کے قصر میں قیام کیا اور خاص و عام ہر ایک کو انعامات دیے، اپنے مقربوں کو مناصب و خطابات تقسیم کیے۔ جلوس کے پہلے سال ملک تحفو کو تاج الملک کا خطاب دے کر پورب کی طرف روانہ کیا۔ تاج الملک جب دریائے گنگا عبور کر کے کیتھر پہنچا تو وہاں کے سرکش رائے ہرسنگھ وغیرہ آنولہ کے جنگل میں روپوش ہو گئے۔ تاج الملک نے کیتھر کو لوٹ کر پامال کر دیا۔ مہابت خاں حاکم بدایوں بھی ملاقات کے لیے اس کے پاس حاضر ہو گیا۔ رائے ہرسنگھ بھی آخر کار حاضر خدمت ہوا اور سالانہ خراج میں ایک بھاری رقم دینی منظور کی۔

کیتھر سے تاج الملک اور مہابت خاں نے ایک ندی کے کنارے کنارے کوچ کیا اور دونوں سرگدواری پہنچے۔ وہاں گنگا عبور کر کے کھور کہ (یہ مقام اب شمس آباد کہلاتا ہے) سے کنپلہ[1] اور پٹیالی پر فوج کشی کی اور وہاں کے باغیوں کی اچھی طرح سرکوبی کر کے قصبہ سکینہ اور یادہم سے گذر کر راپری پہنچے۔ راپری پر حسن خاں اور اس کے بھائی ملک حمزہ کی حکومت تھی۔ یہ دونوں بھائی اور رائے سرحاکم چندوار گوالیار کے سرداروں کے ساتھ حاضر ہو گئے اور سالانہ خراج دینے کا اقرار کیا۔

تاج الملک نے وہاں سے قصبہ جلیسر کا رخ کیا اور اسے چندوار کے ہندوؤں کے قبضہ سے نکال کر اس جگہ ایک مسلمان گماشتہ کو مقرر کیا۔ یہاں سے فوج کشی کر کے آب سیاہ کے علاقہ کو فتح کر لیا اور اٹاوہ کے کافروں کا قلع قمع کر کے دہلی لوٹ آیا۔

شہزادہ مبارک

۸۱۸ھ میں خضر خاں نے اپنے چھوٹے لڑکے مبارک کو جس کے بشرہ سے ہی بادشاہی آثار ظاہر تھے، فیروز پور، سہرند اور بیرم خاں ترک بچہ کا مقبوضہ سارا علاقہ تفویض کر دیا اور ان اضلاع کے نظم و نسق پر اسے کامل اختیارات دے دیے۔ اس شاہزادہ کا نائب ملک سدھو نادرہ کو مقرر کیا گیا۔ شاہزادہ نے اسی سال سدھو نادرہ، زیرک خاں امیر سامانہ اور دوسرے امراء کے ساتھ مفوضہ ضلع کا دورہ کیا اور وہاں کا قرار واقعی بندوبست کر کے دہلی لوٹ آیا۔

---

[1] کنپلہ۔ سرکار قنوج میں ایک محال تھا (آئین اکبری) ابن بطوطہ نے سرگدوارہ کو اسی کے نواح میں بتایا ہے۔ کہتے ہیں پانڈوں کی رانی دروپدی یہاں کے راجہ کی بیٹی تھی۔ وہاں ایک ٹیلہ کو اب تک راجہ دروپد کا قلعہ بتایا جاتا ہے۔ غیاث الدین بلبن کے وقت یہاں ڈاکوؤں کی پناہ گاہ تھی۔ اس نے ان کا قلع قمع کر کے ایک قلعہ تیار کرایا، جہاں شاہی فوج رہتی تھی۔ مغلوں کے زمانہ میں اس شہر کا نام بہت کم ملتا ہے۔ (ہنٹر)

ایک اور مقام کمپیلہ یا کمپلی ریاست بیجانگر کے پاس بلاری احاطہ مدراس کے ضلع میں بھی ہے۔ مؤرخ اس کمپیلہ اور قنوج والے کنپلہ میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ابن بطوطہ نے دکن کے اس مقام کو کمپیلہ لکھا ہے وہ لکھتا ہے:—

—— "رائے کمپیلہ کا ملک دشوار گذار پہاڑوں میں ہے"۔ اس نے یہ ذکر سلطان تغلق کے بھانجے بہاؤ الدین گشتاسپ کی بغاوت کے بیان میں کیا ہے۔ یہ بغاوت دکن میں محمد شاہ تغلق کے عہد میں ہوئی تھی۔

گوالیار اور بیانہ پر حملہ ۸۱۹ھ میں خضر خاں نے ملک تاج الملک کو ایک بڑا لشکر دے کر گوالیار اور بیانہ کی طرف رخصت کیا۔ شمس خاں اوحدی کا بھائی ملک کریم الملک بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ تاج الملک اس پورے علاقہ کو کافروں سے پاک کر کے دہلی لوٹ آیا۔

ترکوں کی سرکشی اسی سال بیرم خاں کے ترکوں نے ملک سادھو نادرہ کو جو شہزادہ کی طرف سے سرہند میں ناظم تھا دھوکے سے پکڑ کر قتل کر دیا اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ خضر خاں کے حکم سے زیرک خاں اس طرف گیا اور وہاں کا انتظام کر کے واپس ہوا۔

اسی سال حاکم گجرات سلطان احمد نے ناگور کا محاصرہ کر لیا لیکن جب خضر خاں کے آنے کی خبر سنی تو محاصرہ اُٹھا کر لوٹ گیا۔

گوالیار پر خضر خاں کا حملہ خضر خاں نے جھاین پہنچ کر وہاں کے حاکم الیاس خاں کو مطیع کیا، پھر وہاں سے گوالیار گیا۔ گوالیار کا قلعہ فتح نہ ہو سکا لیکن خراج اور پیش کش میں کافی مال و دولت وصول ہو گئی۔ گوالیار سے بادشاہ نے بیانہ کا رُخ کیا۔ شمس خاں اوحدی حاکم بیانہ نے اطاعت قبول کر لی۔

۸۲۰ھ میں طوغان روحی ترک سردار نے جس کے آدمیوں نے ملک سدھو کو قتل کیا تھا دوبارہ سرکشی کی۔ زیرک خاں نے دوبارہ جاکران کو منتشر کر دیا۔

شاہی لشکر کے اقدامات ۸۲۱ھ میں خضر خاں کیتھر میں آیا۔ ہر سنگھ دیو اسی آنولہ کے جنگل میں جو چوبیس کوس کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا روپوش ہو گیا۔ وہاں سے کچھ دن تک مقابلہ کرتا رہا آخر شکست کھا کر کماؤں کی طرف بھاگ گیا۔ تاج الملک نے رہب ندی اُتر کر پہاڑوں تک اس کا تعاقب کیا اور وہاں سے بدایوں آیا۔ حاکم بدایوں مہابت خاں کو ساتھ لے کر گنگا کو بجلانہ کے گھاٹ سے عبور کیا، وہاں سے مہابت خاں کو رخصت کر کے اٹاوہ تک فوج کشی کی اور کافی مال غنیمت لے کر دہلی واپس آیا۔

بادشاہ کے خلاف بغاوت اسی سال خضر خاں نے دوبارہ کیتھر پر حملہ کیا اور کول کے راستے سے بیتالی پہنچ گیا۔ وہاں سے گنگا پار کر کے بدایوں کا عزم کیا۔ اس بار مہابت خاں خوفزدہ ہو کر قلعہ بند ہو گیا اور برابر چھ ماہ تک بادشاہ کا مقابلہ کرتا رہا۔ خضر خاں قلعہ کو فتح کر لیتا لیکن اسی دوران میں اُسے اطلاع ملی کہ محمود شاہ کے قدیم امیر قوام خاں اور اختیار خاں جو دولت خاں کو چھوڑ کر خضر خاں سے آکر مل گئے تھے بغاوت کی سازش کر رہے ہیں۔ اس اطلاع کے ملتے ہی وہ بدایوں کو چھوڑ کر دہلی واپس چلا گیا اور ۸۲۲ھ میں گنگا کے کنارے ان باغی امیروں کو پکڑ کر سب کو قتل کر دیا۔

نقلی سارنگ خاں ۸۲۲ھ میں ایک غیر معروف شخص نے سارنگ خاں ہونے کا دعویٰ کیا، حالانکہ سارنگ خاں ایک مدت پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ اس شخص نے بہت سے لوگوں کو جمع کر لیا۔ جب اس کا فتنہ بہت بڑھا تو خضر خاں نے سلطان شہ لودی کو اس کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ سرہند کے علاقہ میں بہت سخت لڑائی ہوئی، آخر

نقلی سارنگ خاں شکست کھا کر پہاڑوں میں بھاگ گیا۔

تاج الملک کا انتقال اسی سال خضر خاں نے تاج الملک کو دوبارہ اٹاوہ کی طرف روانہ کیا۔ وہاں کا زمیندار رائے سیر قلعہ بند ہوگیا۔ اس نے امان طلب کی اور اپنے ذمے کا روپیہ ادا کرنے کا عہد کیا۔

تاج الملک وہاں سے چندوار گیا اور خوب لوٹ مار کرکے کیتھر آیا اور وہاں سے دہلی لوٹ گیا۔ اسی سال تاج الملک کا انتقال ہوا اور اس کا بڑا بیٹا ملک سکندر وزیر مقرر ہوا۔

طوغان ترک نے سرہند میں پھر خروج کیا، اس بار خیر الدین نے حملہ کرکے اس فتنہ کو ختم کیا۔

میوات اور گوالیار پر حملہ ۸۲۴ھ میں خضر خاں نے میوات کی طرف توجہ کی اور کوٹلہ کے قلعہ کو فتح کرکے وہاں سے گوالیار پر فوج کشی کی اور گوالیار کے راجہ سے بہت سامال اور قیمتی پیش کش لے کر اٹاوہ چلا گیا۔ اور وہاں رائے سیر کو قتل کردیا۔ اس کے بیٹے نے اطاعت قبول کرلی۔

خضر خاں کی وفات خضر خاں اٹاوہ ہی سے بیمار ہوکر دہلی آیا، دہلی پہنچنے کے بعد ۱۷ جمادی الثانی ۸۲۴ھ میں انتقال کیا۔ اس کی مدت سلطنت سات سال چند ماہ رہی ؎

جہاں اے برادر نماند بہ کس
دل اندر جہاں آفریں بند و بس

سلطان مبارک شاہ بن خضر خاں

سلطان خضر خاں کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ تمام امراء کے اتفاق سے ۸۲۴ھ میں تخت نشین ہوا۔

جسرت کھوکھر کی بغاوت اسی سال شیخا کھوکھر کے بیٹے جسرت کھوکھر نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا محرک یہ تھا کہ سلطان علی کشمیر[۱] کے بادشاہ نے ٹھٹہ کی تسخیر کے ارادہ سے فوج کشی کی تھی۔ جسرت

---

[۱] کشمیر۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے: "ایک بے حد دلفریب خطۂ ملک ہے، خوشگوار چشمے، خوش آئند آبشاریں، پورا خطہ سدا بہار باغ ہے۔ برف باری میں ایران و توران، بارش میں ہندوستان کے مماثل ہے، یہاں کی بہار اور خزاں دونوں موسم دلفریب ہیں۔ تمام مکانات لکڑی کے ہیں، مکان کی چھتوں پر گل لالہ بوتے ہیں۔ یہاں کے پشمینے اور شال دور دور تک جاتے ہیں۔ کشمیر کی بدترین شے یہاں کے انسان ہیں۔ باوجود اس کے کہ ملک بے حد آباد ہے، سرمایۂ زندگی قلیل ہے۔ خربزہ، سیب، شفتالو، زرد آلو بے حد عمدہ ہیں، انگور ہوتے ہیں لیکن ان کی قسم اعلیٰ نہیں۔ توت کے پتوں پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔ خوراک چاول، شراب، مچھلی اور ترکاریاں ہے۔ لباس پوستین کا ہوتا ہے۔ مرغابی بارہ سنگا، کبک، چیتوں کا شکار ہوتا ہے۔ برہمن بکثرت ہیں، تالابوں میں کشتی رانی ہوتی ہے۔ کشمیری توز جو ایک درخت کی چھال ہے لکھنے کے کاغذ کا کام دیتی ہے۔ اس کے ورقوں پر گہری سیاہی سے لکھا جاتا ہے۔ ہندو پورے کشمیر کو عبادت گاہ خیال کرتے ہیں۔ سری نگر کشمیر کا پایۂ تخت ہے جو چار کوس لمبا ہے۔ یہاں کے دریا بہت، مار اور بچھو ہیں۔ مہادیو کی مورتیں جگہ جگہ بطور نما پتھر کی ملتی ہیں۔ بہت سی عبادت گاہوں کے کھنڈرات بھی پائے جاتے ہیں۔ دو تین مقامات پر ریت سے سونا بھی نکلتا ہے۔

ابوالفضل نے کشمیر کے قدیم ۱۵۹ راجاؤں کے نام لکھے ہیں جو نو خاندانوں پر مشتمل ہیں، ان کی حکومت ۳۰۲۸ سال چھ ماہ آٹھ دن رہی۔

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر دیکھیں)

نے پہاڑ کی گھاٹی میں دھوکے سے اسے شکست دے کر سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔ اس کامیابی کا اسے ایسا گھمنڈ ہوا کہ سلطنت دہلی کے خواب دیکھنے لگا اور ایک بڑی جمعیت اکٹھی کر کے بیاس اور ستلج عبور کر کے تلونڈی کے کنارے آیا۔ وہاں رائے فیروز اس کا مقابلہ کرنہ سکا بھاگ گیا۔ اب جسرت کے لیے میدان کھلا ہوا تھا وہ کداہنہ تک بڑھ آیا اور ستلج[51] کے ساحلی علاقوں کو روپڑ تک لوٹ کر تباہ کر دیا۔ پھر آگے بڑھ کر جالندھر[52] پہنچا۔ زیرک خاں جالندھر میں قلعہ بند ہو گیا۔ جسرت

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ کشمیر صفحہ گزشتہ) ان خاندانوں کا سلسلہ اوگنند خاندان سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد لوہ اس کے بعد راجہ گنند اس کے بعد برتاپادت پھر میگھ داہن اس کے بعد رنبھ دردن اس کے بعد اونت درما پھر جسر دیو بعد ازاں سنگرام دلدادیراج۔ ہندو عہد کے بعد اکبر کے عہد تک ۳۲ مسلمان بادشاہوں نے دو سو بیاسی سال پانچ ماہ اور ایک دن حکومت کی۔ جن کا سلسلہ سلطان شمس الدین (یہ شخص راجہ کشمیر سنیدھیو کا ملازم تھا) سے شروع ہو کر یعقوب خاں پر ختم ہوتا ہے۔ کشمیر کے کل ہندو و مسلمان فرمانروا، ۱۹۱ گزرے جن کی مدت حکومت چار ہزار ایک سو نو برس گیارہ مہینے نو دن رہی۔ کشمیر کے بادشاہوں کی قدیم تاریخ کا نام "راج ترنگی" ہے یہ ہندی زبان میں ہے۔ اکبر نے کشمیر فتح کیا تو یہ کتاب اس کے ملاحظہ میں پیش ہوئی تھی۔ بادشاہ نے سنسکرت کے علماء کو اس کے ترجمہ پر مقرر کیا تھا اور بہت جلد فارسی میں ترجمہ ہو گئی اس کتاب میں لکھا ہے کہ راجہ اشوک جو راجہ جنک کا چچازاد بھائی تھا حکمران ہوا، اور اس نے برہمن مذہب کو منسوخ کر کے جین مت کو رواج دیا۔ راجہ سینہہ دیو کے عہد میں ایک شخص شاہ میر نامی نے ترقی کی اور راجہ کا وزیر بن گیا اور اس نے راجہ ادن دیو کے مرنے پر راجہ کی زوجہ سے نکاح کر لیا اور ۷۴۲ھ میں سلطان شمس الدین کے نام سے کشمیر کا بادشاہ بن گیا۔ اس کے بیٹے سکندر کے وقت صاحبقراں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ بداؤنی نے جس سلطان علی کا ذکر کیا ہے جسے جسرت کھوکھر نے شکست دی اسی سلطان سکندر کا فرزند معلوم ہوتا ہے اس نے چھ سال نو ماہ حکومت کی۔ "راج ترنگی" سے پتہ چلتا ہے کہ علی شاہ نے زین العابدین کو جانشین بنا کر سفر حجاز پر جانا چاہا تھا لیکن یہ ارادہ ترک کر کے اس نے دوبارہ تخت پر قبضہ کر لیا۔ زین العابدین نے بغاوت کی، جسرت کھوکھر سے مدد لی، علی شاہ کو شکست ہوئی اور زین العابدین بادشاہ ہو گیا۔ زین العابدین نے تبت اور سندھ کو فتح کیا۔ یہ بڑا علم دوست خدا ترس بادشاہ تھا۔ اس نے بے شمار عربی فارسی کشمیری اور ہندی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ سلطان بہلول لودی سلطان محمود گجراتی کا ہم عصر اور ان کا دوست تھا۔ سلطان حسین بعد کے ایک فرمانروا نے پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ محمد شاہ سلطان کشمیر جب تیسری مرتبہ تخت نشین ہوا تو بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ محمد شاہ نے جب چوتھی مرتبہ تخت کشمیر پر جلوس کیا تو ہمایوں ہندوستان میں بادشاہ تھا۔ مرزا کامران نے بھی کشمیر پر حملہ کیا تھا لیکن ناکام رہا۔ ۹۳۰ھ میں سلطان سعید خان کاشغری نے کشمیر پر حملہ کیا اور صلح کر کے واپس ہوئے۔ ۹۴۸ھ میں مرزا حیدر نے ہمایوں کے حکم سے کشمیر پر حملہ کیا اور تبت کلاں کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اکبر کے عہد میں کشمیر سلطنت مغلیہ کا ایک حصہ بن گیا۔

کشمیر کی آبادی پندرہ لاکھ کے لگ بھگ رہی ہے۔ انگریزی دور میں ریاست کشمیر کے سربراہ ڈوگرہ خاندان کے راجا تھے مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن کشمیر کے ایک حصہ پر بھارت کی موجودہ ہندو حکومت نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے ایک حصہ پاکستان میں شامل ہے۔

مقبوضہ کشمیر کا دارالخلافہ سری نگر راجہ پرورسین کا بسایا ہوا ہے۔ یہ راجہ چھٹے حکمران خاندان کا پانچواں راجہ تھا۔ بکرماجیت کے مرنے کے بعد کشمیر کا راجہ ماترگپت بنارس جا کر گوشہ نشین ہو گیا تو پرورسین کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانہ میں سری نگر میں چھ لاکھ گھرانے بستے +

۵۱ ستلج۔ اسے قدیم زمانہ میں ستدرو کہتے تھے۔ اس کا منبع کاہلور نامی پہاڑیں ہے۔ روپڑ، ماچھیواڑہ اور لدھیانہ کے شہر اس کے کنارے آباد ہیں۔ یہ دریا بوبور سے بہتا ہوا دریائے بیاس سے جا کر مل گیا ہے +

۵۲ جالندھر۔ لدھیانہ سے ۳۶ میل پر ہے۔ شہر کی عمارتیں پختہ ہیں۔ چند پرانی مسجدیں اور مقبرے بھی ہیں۔ امام ناصر کی ایک مشہور خانقاہ وسط شہر میں ہے۔ یہ آٹھویں صدی کے صاحب کمالی بزرگ تھے۔ راجپوت اور پٹھان آباد ہیں۔ لکڑی کا کام بہت اچھا ہوتا ہے۔ گڑ سارے پنجاب میں یہاں عمدہ ہوتا ہے +

نے سرستی کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ پہلے تو صلح کر لی پھر دھوکے سے زیرک خاں کو قید کر لیا۔

جب جسرت کی ان جسارتوں کی مسلسل خبریں مبارک شاہ کو ملیں تو وہ خود جسرت کے مقابلہ کے لیے آیا۔ جسرت کو بادشاہ کے آنے کی خبر ملی تو اس نے زیرک خاں کو رہا کر دیا۔ چنانچہ وہ سامانہ میں مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مبارک شاہ جب لدھیانہ[1] پہنچا تو جسرت نے لدھیانہ کی ندی عبور کر کے مقابلہ پر صف آرائی کر لی۔ اس نواح کی ساری کشتیاں جسرت نے اپنے اختیار میں کر لی تھیں اس لیے مبارک شاہ اس سے پہلے دریا کو عبور نہ کر سکا جب کچھ دن بعد دریا پایاب ہوا تو شاہی لشکر نے دریا عبور کیا۔

شاہی لشکر کی پیش قدمی سے جسرت ڈر کر بھاگ گیا اور چناب پار کر کے پہاڑی مقام بلبھر کو چلا گیا۔ مبارک شاہ نے تعاقب کر کے اس کے بہت سے سوار اور پیادے قتل کر دیے اور کافی مال و اسباب لوٹا۔

لاہور کی آبادکاری

اس مقام پر جموں کا زمیندار رائے بھیلم مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لشکر کے ساتھ شامل ہو گیا۔ مبارک شاہ نے لاہور پہنچ کر ایک ماہ تک راوی[2] کے کنارے قیام کیا اور شہر لاہور کو جو پچھلے تباہ کن ہنگاموں میں ویران ہو چکا تھا از سر نو آباد کرایا۔ قلعہ لاہور کی مرمت کرائی اور ملک محمود کو جس کا خطاب ملک الشرق تھا وہاں چھوڑ کر دہلی کو مراجعت کی۔ مبارک شاہ کے لاہور پہنچنے کا سن ۸۲۵ھ ہے۔

لاہور پر جسرت کی یورش

پانچ ماہ بعد جسرت نے دوبارہ ایک بڑا لشکر جمع کر کے لاہور پر چڑھائی کی اور حضرت شیخ حسن زنجانی[3] کے مزار کے قریب اپنا کیمپ لگایا۔ جسرت کی فوج ہر روز شہر پر حملہ کرتی تھی لیکن اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑتا تھا۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نہ نکلی تو مجبوراً کلانور کی طرف پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں اس کی خبر لینے کے لیے رائے بھیلم کی جمعیت تیار تھی۔ فریقین میں لڑائی ہوئی لیکن جلد ہی صلح ہو گئی۔

مبارک شاہ نے ملک محمود حسن کی کمک کے لیے دہلی سے ملک سکندر تحفہ کو بھیجا۔ اس نے بیاس کو لوہی کے

---

[1] لدھیانہ۔ سرہند سے ۳۸ میل پر ستلج کے کنارے واقع ہے اور لودی خاندان کی یادگار۔ اس کی بنیاد پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں رکھی گئی تھی۔ ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کے تحت یہ انگریزوں کی نگرانی میں آگیا۔ باشندے زیادہ تر کشمیری ہیں۔ اناج کی بھاری منڈی ہے چادر خانہ کپڑا، مشجر لنگی فرش کلاہ اچھی تیار ہوتی ہیں۔ یہاں کے ایک سکھ رہنما نے ایک نیا پنتھ "کوکا پنتھ" قائم کیا تھا۔ ایک صاحب مولوی محمد حسن زمانۂ حال میں گزرے ہیں انھوں نے نیوٹن کے "ضابطۂ صعود" کے برعکس ایک نیا نظریہ "ضابطۂ نزول" پیش کیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے ۱۹۱۹ء کی شورش کے رہنما بھی اسی جگہ کے رہنے والے تھے۔ لدھیانہ فیروزپور لائن پر ریلوے کا جنکشن ہے +

[2] راوی۔ اس دریا کو قدیم زمانہ میں ایراوتی کہتے تھے۔ اس دریا کا سرچشمہ کوہ بیدراں ہے۔ لاہور اسی کے کنارے آباد ہے۔ بیاس اور راوی کا دوآبہ اکبر کے عہد میں باری کہلاتا تھا۔ (آئین اکبری) +

[3] شیخ زنجانی۔ شیخ سید حسین زنجانی اصلی نام ہے، بداؤنی نے "حسن" لکھا ہے۔ "خزینۃ الاصفیاء" میں سید حسین ہے "گفت عارف حسینؒ زنجانی" یہ مادہ تاریخ ہے جس سے ان کی وفات کا سن ۶۰۰ھ نکلتا ہے۔ یہ معز الدولہ بہرام شاہ غزنوی کا آخری دور ہے۔ شیخ زنجانی جنیدی سلسلہ کے بزرگ اور سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کے خلیفہ ہیں انہی کے ساتھ زنجان سے لاہور تشریف لائے تھے +

گھاٹ سے عبور کیا۔ جب جسرت کو خبر ملی کہ تحفہ لاہور پہنچ چکا ہے تو وہ چناب[۱] پار کر کے تلوارہ پہاڑ کی طرف بھاگ گیا شاہی لشکر اس فتنہ کا سدباب کر کے دہلی لوٹ آیا۔

شمس آباد پر یلغار

۸۲۶ھ میں مبارک شاہ کیتھر گیا۔ یہاں مہابت خاں بدایونی نے جو خضر خاں کے عہد میں باغی ہو گیا تھا حاضر ہو کر باریابی حاصل کی۔ مبارک شاہ نے اس پر بڑے الطاف و اکرام کیے۔ کیتھر سے کوچ کر کے بادشاہ نے گنگا کو عبور کیا اور کھور عرف شمس آباد کے نواح میں بنواروں کے علاقہ کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ یہاں کے سرکشوں کے بندوبست کے لیے ملک مبارز خاں، زیرک خاں اور کمال خاں کو بھاری لشکر دے کر کنپلہ کے قلعہ میں متعین کر دیا اور خود دہلی واپس چلا گیا۔

الپ خاں کی سرکشی

۸۲۶ھ میں دھار کے حاکم الپ خاں نے گوالیار پر حملہ کیا۔ جب مبارک شاہ کو یہ خبر ملی تو وہ گوالیار کی جانب روانہ ہوا۔ بیانہ کے قریب پہنچا تو اوحد خاں اوحدی کا بیٹا حاکم بیانہ قلعہ بند ہو گیا۔ اس نے اپنے چچا مبارک خاں سے بغاوت کر کے اسے قتل کر دیا تھا۔ اسی قتل کے مواخذہ سے ڈر کر اس نے سرکشی اختیار کی تھی لیکن وہ زیادہ دن محصور نہیں رہ سکا اور بہت جلد اطاعت اختیار کر لی۔

بیانہ سے فارغ ہو کر مبارک شاہ نے گوالیار کی طرف کوچ کیا۔ الپ خاں نے شاہی لشکر کا راستہ روکنے کے لیے چنبل[۲] کے کنارے پر مورچہ بندی کر لی تھی لیکن مبارک شاہ نے اسے غفلت میں رکھ کر ایک دوسرے گھاٹ سے چنبل کو عبور کیا اور حملہ کر کے الپ خاں کے لشکر کو تہس نہس کر دیا۔ آخر الپ خاں نے بھاری پیش کش دے کر صلح کر لی اور اپنے علاقہ کو لوٹ گیا، بادشاہ بھی دہلی واپس آ گیا۔

ہندوستان کا قحط

۸۲۷ھ میں مبارک شاہ نے دوبارہ کیتھر اور کمایوں کا رُخ کیا۔ وہاں سے واپسی پر میوات کو بُری طرح پامال کر دیا۔ اسی سال ہندوستان میں بہت بڑا قحط پڑا تھا۔

۸۲۹ھ میں بادشاہ نے پھر میوات پر فوج کشی کی اور اندور[۳] و الور[۴] کے قلعے فتح کر لیے۔

---

[۱] چناب۔ اس دریا کا پرانا نام چندر بھاگا ہے۔ کوہ کنٹھوار کے دامن سے دو چشمے نکلتے ہیں ایک کا نام چندر ہے اور دوسرے کا بھاگا۔ یہ دونوں چشمے کھنٹواڑ کے قریب مل جاتے ہیں اور دریا کی شکل میں بہتے ہیں۔ یہی چندر بھاگا ہے جسے اب چناب کہتے ہیں۔ یہ دریا بہلول پور، سودھرہ اور ہزارہ کو سیراب کرتا ہے۔

[۲] چنبل۔ جمنا کے بعد یہ اودھ کا دوسرا بڑا دریا ہے۔

[۳] اندور۔ احمد آباد سے ۲۷۹ میل پر مالوہ کی ایک ریاست ہے۔ سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ ایک برساتی نالہ "کا پانی ندی" جس کا نام ہے شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، اس پر نو محرابوں کا ایک پل ہے۔ پونے دو سو برس پہلے یہ ایک گمنام گاؤں تھا، اسے اہلیا بائی بیوہ مہاراج کھانڈے راؤ نے آباد کیا یہ ان ریاستوں میں سے ہے جنھیں مرہٹوں نے مغل سلطنت کے عہد زوال میں قائم کیا تھا۔ اس ریاست کا مورث اعلیٰ ملہار راؤ ہلکر مرہٹہ سردار تھا جو پہلے ایک چرواہا تھا۔ اس نے ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں صوبہ مالوہ کے مغل صوبہ دار کو شکست دے کر خود مختار ریاست قائم کی۔ چالیس سال کی حکمرانی کے بعد ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں فوت ہوا اس خاندان کی دو مشہور رانیوں اہلیا بائی زوجہ کھنڈے راؤ نے ۳۰ سال حکومت کی، وفات ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں ہوئی۔ دوسری مہارانی تلسی بائی تھی جو ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں قتل کی گئی۔ آخری راجہ ٹوکوجی راؤ تھا۔ ریاست کا رقبہ ۹۵۰۰ مربع میل آبادی ۰۰ ۵۰ +

[۴] الور۔ بمبئی سے ۷۵۰ میل دہلی سے ۹۹ میل، مغل دور میں صوبہ آگرہ کے تحت تھا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

گوالیار کے راجاؤں کی اطاعت

۸۲۳ھ میں اس نے بیانہ سے محمد خاں اوحدی کے عمل دخل کو ختم کر دیا اور اپنے ایک غلام ملک مقبل کو بیانہ کی حکومت دے دی۔ سیکری کو ملک خیرالدین تحفہ کو تفویض کیا۔ اوحدی کے سارے خاندان کو بیانہ سے ہٹا کر کوتنک جہاں نما میں ٹھہرا دیا۔ ان انتظامات کے بعد گوالیار پر فوج کشی کی۔ اس مرتبہ وہاں کے سارے راجاؤں نے اطاعت قبول کر لی۔

ملک شرقی سے مقابلے

۸۳۱ھ میں حاکم کالپی قادر خاں کے قاصدوں نے آ کر اطلاع دی کہ ملک شرقی نے کالپی کا محاصرہ کر لیا ہے۔ مبارک شاہ قادر خاں کی کمک کے لیے دہلی روانہ ہوا۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ ملک شرقی بھون گاؤں میں پہنچ چکا ہے اور وہاں سے بدایوں کا ارادہ کر رہا ہے۔ بادشاہ نے تیزی سے کوچ کیا اور توہ ٹپل کے گھاٹ سے جمنا عبور کر کے موضع جبر تولی اور پھر وہاں سے اترولی پہنچ گیا۔ یہاں مخبروں نے اطلاع دی کہ ملک شرقی کا بھائی مختص خاں ایک بڑا لشکر اور ہاتھی لے کر اٹاوہ کی سرحدوں پر پہنچ گیا ہے۔ مبارک شاہ نے ملک الشرق محمود حسن کو دس ہزار سوار دے کر مختص خاں کی طرف روانہ کیا۔ جب اسے شاہی لشکر کی آمد کی خبر ملی تو اپنے بھائی ملک شرقی سے جا ملا۔ اس وقت ملک شرقی نے آب سیاہ[1] عرف کالے پانی کو گھیر لیا تھا اور قصبہ برہان آباد کے قریب جو اٹاوہ کے تحت ہے مقیم تھا۔

ملک شرقی کا فرار

مبارک شاہ نے اترولی سے کوچ کیا اور کوٹہ میں آ کر ٹھہر گیا لیکن ملک شرقی مقابلہ کئے بغیر واپس چلا گیا، وہاں سے جمنا پار کر کے بیانہ پہنچا اور کیتھر کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔

مبارک شاہ اس کے تعاقب میں چندوار پہنچ گیا۔ اب دونوں لشکر چار کوس کے فاصلہ پر بالمقابل تھے، روزانہ فریقین میں صف آرائی اور جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ بیس دن تک لڑائی کا یہی رنگ رہا آخر ملک شرقی نے ایک دن پوری تیاری سے حملہ کیا، دوپہر سے شام تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی دوسرے دن ملک شرقی میدان چھوڑ کر

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ الور صفحہ گزشتہ) اسٹیشن سے باہر خوش نما مقبرہ فتح جنگ کی یادگار ہے اور ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء کی تعمیر ہے۔ وسط شہر میں ایک گنبد ہے جو ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء کی تعمیر اور فیروز شاہ کے بھائی سارنگ خاں کی قبر ہے۔ ایک بڑا مندر جگدیش جی کا ہے۔ دربار ہال کے کتب خانہ میں تزوک بابری کا ایک قدیم نسخہ ہے جس پر اکبر کے وقت سے کتب خانہ میں داخلہ تک مغل سلاطین کی مہریں لگی ہوئی ہیں، ایک گلستاں کا باغ و بہار نسخہ ہے جسے ایک لاکھ روپیہ کے صرف سے مہاراجہ بنے سنگھ نے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ الور کے حکمراں کا راجگان جے پور سے تعلق ہے اور پونے دو سو برس سے یہ ریاست قائم تھی۔ اس کا رقبہ ۳ ہزار ایک سو ۴۱ مربع میل، آبادی ۸ لاکھ ۴۰ ہزار ۵۰۰ تھی، سالانہ آمدنی ۳۰ لاکھ روپیہ تھی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں الور کے متعلق لکھا ہے "یہاں شیشہ کا کام اچھا ہوتا ہے، اونی قالین بھی تیار کیے جاتے ہیں، بیراٹھ میں لوہے کی کان ہے۔ ایک من خاک سے ۳۵ سیر لوہا نکل آتا ہے۔ یہاں چاندی کی بھی ایک کان ہے۔"

[1] آب سیاہ۔ غالباً کالی ندی مراد ہے۔ دوآبہ میں اس نام سے دو ندیاں مشہور ہیں مغربی کالی ندی جو کوہ سوالک سے نکل کر مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع میں بہتی ہوئی دریائے ہینڈن میں شامل ہو جاتی ہے۔ مشرقی کالی ندی ضلع مظفر نگر سے نکلتی ہے کچھ دور تک "ناگن" کہلاتی ہے۔ خواجہ کے قریب رخ بدل لیتی ہے ۳۱۰ میل کے بعد میرٹھ، بلند شہر، علی گڑھ، ایٹہ اور فرخ آباد کے اضلاع سے گزرتی ہوئی قنوج سے چار میل آگے گنگا میں مل جاتی ہے۔ ابن بطوطہ بھی اس کا ذکر کرتا ہے "برج پور سے چل کر ہم ایک دریا پر جس کو آب سیاہ (کالی ندی) کہتے تھے پہنچے پھر قنوج پہنچے۔"

اپنے علاقہ کی طرف پسپا ہوگیا اور مبارک شاہ نے اس خیال سے کہ دونوں طرف مسلمان ہیں ناحق خون بہے گا، اُس کا تعاقب نہ کیا۔

حاکم بیانہ کی اطاعت

ملک شرقی کو بھگا کر بادشاہ نے رستگالی پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے چنبل کے ساحل پر قبضہ کرتے ہوئے بیانہ پہنچا۔ محمد خاں اوحدی ملک شرقی کے ساتھ ہوگیا تھا۔ اب جو شاہی لشکر آیا تو وہ خوفزدہ ہو کر قلعہ بند ہوگیا پھر امن طلب کرتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس کے بعد مبارک شاہ دہلی چلا گیا۔

۸۳۲ھ میں ملک الشرق حسن محمود جو بیانہ میں رہ گیا تھا اس ضلع کا نظم و نسق درست کر کے اور ان لوگوں کو سزائیں دے کر جو محمد خاں اوحدی کے گرد جمع ہوگئے تھے، دہلی لوٹ آیا۔ مبارک شاہ نے اس کی حسن کارکردگی پر خوش ہو کر حصار فیروزہ بطور جاگیر اسے عطا کیا۔

اسی سال ملک رجب نادرہ حاکم ملتان فوت ہوگیا اور اس کی جگہ ملک محمود حسن کا تقرر ہوا۔ بادشاہ نے اُسے عمادالملک کا خطاب عطا کیا۔

فولاد کی فتنہ انگیزی

۸۳۳ھ میں ملک شاہ نے بیانہ کے راستہ کو رخ کیا اور گوالیار پہنچا۔ راپڑی سے حسن خاں کو ہٹا کر ملک حمزہ کو متعین کیا اور دہلی لوٹ گیا۔ راستہ میں سید سالم جو خضر خاں کی خدمت میں تیس سال رہا تھا اور تبرہندہ اس کی جاگیر میں تھا فوت ہوگیا۔ مبارک شاہ نے اس کے ایک بیٹے کو سید خاں دوسرے کو شجاع الملک کا خطاب عطا کیا لیکن تبرہندہ میں سید سالم کے ایک ترک غلام فولاد نے بغاوت کر کے اس کے سارے مال و اسباب اور تبرہندہ کی عملداری پر قبضہ کر لیا۔ مبارک شاہ نے سید سالم کے مذکورہ بیٹوں کو قید کر لیا۔ (غالباً یہ بغاوت ان کے اشارہ پر ہوئی تھی) اور ملک یوسف سرور اور رائے ہنسو بھیٹی کو فولاد سے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ فولاد نے شب خون مار کر ان کے لشکر کو تباہ کر دیا، کافی مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا۔ اس قضیہ کو چکانے کے لیے مبارک شاہ نے خود فولاد پر لشکر کشی کی۔ فولاد قلعہ میں محصور ہوگیا۔ مبارک شاہ نے ملتان سے عمادالملک کو بلا کر اس کے پاس بھیجا۔ عمادالملک کی کوششوں سے وہ امان طلب کر کے قلعہ سے نکل کر عمادالملک کی پناہ میں آگیا لیکن اس کا دل مطمئن نہیں تھا اسی لیے دوبارہ بھاگ کر قلعہ میں چلا گیا اور لڑائی جاری رکھی۔ مبارک شاہ نے عمادالملک کو تو ملتان واپس کر دیا اور فولاد کے مقابلہ میں لشکر چھوڑ کر خود دہلی واپس ہوگیا۔

شیخ علی حاکم کابل کا حملہ

فولاد چھ ماہ تک برابر بادشاہی لشکر سے برسرپیکار رہا پھر اس نے کابل کے حاکم شیخ علی[1] مغل کے پاس کافی زر نقد بھیج کر اُس سے اپنی کمک پر آنے کی درخواست

---

[1] شیخ علی سلطان خراسان و ماوراء النہر شاہ رخ مرزا کی طرف سے کابل کا حاکم تھا۔ خضر خاں شاہ رخ مرزا کے پاس تحائف اور نذرانہ روانہ کیا کرتا تھا۔ مبارک شاہ نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ مرزا نے شیخ علی کو ہندوستان پر حملہ کا حکم دیا۔ بداؤنی نے یہ وجہ نہیں لکھی ہے بلکہ صرف فولاد کے اس کو بلانے کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے یہ بھی سبب رہا ہو۔

کی۔ شیخ علی ایک بڑا لشکر لے کر فولاد کی مدد کے لیے آیا۔ پنجاب کے ہزاروں آدمی اس کے ساتھ ہو گئے۔ شیخ علی نے تبرہندہ سے فولاد اور اس کے قبیلہ کو اپنے ہمراہ لیا اور لاہور پر چڑھائی کر دی۔ ملک الشرق ملک اسکندر حاکم لاہور ہر سال شیخ علی کے پاس نذرانے روانہ کرتا رہتا تھا۔ اس بار بھی اس نے نذر نذرانے دے دلا کر شیخ علی سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ لاہور سے شیخ علی قصور[1] پہنچا اور وہاں سے اس نے دیپال پور کا قصد کیا۔

ملتان سے عماد الملک اس کا راستہ روکنے کے لیے پہنچ گیا۔ شیخ علی راوی کے کنارے کنارے طلبنہ تک چلا گیا اور وہاں سے خوط پور کو لوٹ کر عماد الملک کے لشکر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی۔ عماد الملک کا سردار ملک سلیمان شاہ لودی اس لڑائی میں مارا گیا۔ پھر شیخ علی خسرو آباد میں آ کر ٹھہر گیا اور ایک طویل عرصہ تک ہر روز اس کی اور عماد الملک کی فوج میں لڑائی ہوتی رہی۔

شیخ علی کی شکست اور فرار

۸۳۴ھ میں مبارک شاہ نے فتح خاں بن سلطان مظفر خاں گجراتی کی سرکردگی میں ایک بھاری لشکر عماد الملک کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ شیخ علی اس فوج کا مقابلہ نہ کر سکا اور پیچھے ہٹ کر اس حصار میں جو اس نے اپنے لشکر کے اطراف میں بنا لیا تھا محصور ہو گیا۔ جب عماد الملک نے اس حصار کو بھی گھیر لیا تو مجبور ہو کر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ دریائے جہلم میں اس کے بہت سے لشکری ڈوب گئے۔ عماد الملک کا لشکر برابر تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ اس نے شیخ علی کی بہت بڑی جمعیت کو اس جگہ تہ تیغ کر دیا اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا۔ شیخ علی اور امیر مظفر تھوڑے آدمیوں کے ساتھ قصبہ شیور[2] میں پہنچے۔ عماد الملک نے اسی قصبہ تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں امیر مظفر تو ایک قلعہ میں محصور ہو گیا اور شیخ علی جان بچا کر کابل بھاگ گیا۔ شاہی لشکر فتح کے جھنڈے اڑاتے ہوئے دہلی لوٹ آیا۔

جسرت کی سرکشی

مبارک شاہ نے کچھ عرصہ بعد ملتان سے عماد الملک کو ہٹا کر خیر الدین خانی کو متعین کر دیا۔ اس کارروائی سے ملتان میں بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے اور ادھر جسرت نے بھی پہاڑی علاقہ میں شورش برپا کر دی۔

۸۳۵ھ میں لاہور کا حاکم ملک سکندر جسرت کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ جسرت نے سکندر کو غفلت میں رکھ کر اچانک اس کی فوج پر حملہ کر دیا اور جالندھر کے نواح میں سکندر کو گرفتار کر لیا۔ پھر اسے اپنے ساتھ ملا کر لاہور پر فوج کشی کر دی۔ سکندر کا نائب نجم الدین اور اس کا غلام ملک خوش خبر جسرت سے مقابلہ کرتے رہے۔

شیخ علی کا دوسرا حملہ

اسی اثناء میں شیخ علی دوبارہ تیاریاں کر کے ملتان کی حدود تک پہنچ گیا اور خوط پر یورش کر کے جہلم کے رہنے والے بہت سے باشندوں کو قید کر لیا۔ طلبنہ کو بری طرح لوٹا۔ وہاں کئی

---

[1] قصور۔ آئین اکبری میں سرکار باری دوآبہ کے تحت ایک محال کا نام ہے۔ اب یہ مغربی پاکستان کا درمیانہ شہر ہے۔

[2] شیور۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں سرکار دوابہ رچنا و صوبہ لاہور کے تحت ایک محال شور کا ذکر کیا ہے جہاں جٹ لنگاہ قوم آباد تھی۔ غالباً شیور سے یہی قصبہ مراد ہے۔

آدمیوں کو قتل اور قید کرکے کابل چلا گیا۔

اسی دوران میں تبرہندہ سے فولاد ترک نے رائے فیروز کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ رائے فیروز اس مقابلہ میں مارا گیا، فولاد نے اُس کا سر کاٹ کر تبرہندہ کو بھیج دیا۔

جسرت اور شیخ علی کا فرار

اسی سال مبارک شاہ نے ان فتنوں کو رفع کرنے کے لیے دوبارہ لاہور اور ملتان کی طرف کوچ کیا۔ جب شاہی لشکر سامانہ کے قریب پہنچا تو جسرت لاہور کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف اور شیخ علی کابل کو واپس چلا گیا۔ مبارک شاہ نے لاہور اور جالندھر سے شمس الملک کو معزول کرکے یہ علاقہ نصرت خاں گرگ انداز کے سپرد کر دیا اور شمس الملک کے سارے خاندان کو لاہور سے دہلی روانہ کر دیا اور خود بھی دہلی لوٹ آیا۔

مخدومہ جہاں کی وفات

۸۳۶ھ میں مبارک شاہ نے جسرت کی سرکوبی کے لیے دوبارہ سامانہ کی طرف کوچ کیا تھا لیکن وہ پانی پت پہنچا تھا کہ اسے اپنی والدہ مخدومہ جہاں کے انتقال کی خبر ملی۔ اس نے لشکر کو وہیں چھوڑا اور تنہا دہلی لوٹ آیا۔ دس دن تک ماتم کی رسوم ادا ہوتی رہیں، اس کے بعد وہ لوٹ کر لشکر میں چلا گیا اور ملک یوسف سرور الملک کو تو فولاد کی گوشمالی کے لیے تبرہندہ کی طرف روانہ کیا اور نصرت خاں کو لاہور اور جالندھر سے ہٹا کر یہ شہر ملک الہ داد لودی کے سپرد کر دیے۔

جسرت کی دوبارہ پسپائی

الہداد نے لاہور سے جسرت پر فوج کشی کی اور جالندھر جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ جسرت نے بیاس کو عبور کرکے بجواڑہ میں الہداد سے مقابلہ کیا اور اُسے شکست دے کر پہاڑوں کی طرف بھگا دیا۔

اسی سال مبارک شاہ نے میوات میں جلال خاں پر حملہ کیا۔ وہاں سے گوالیار اور اٹاوہ کی طرف فوجیں روانہ کرکے دہلی لوٹ آیا۔

شیخ علی کا تیسرا حملہ

اس سال شیخ علی نے پھر پنجاب میں داخل ہو کر لڑائی چھیڑ دی۔ مبارک شاہ نے اس علاقہ کے امراء کی مدد کے لیے عماد الملک کو روانہ کیا۔ شیخ علی نے تلونڈی سے بیاس تک سارے علاقہ کو بُری طرح پامال کر دیا اور سینکڑوں آدمیوں کو قید کرکے لاہور پہنچا، جہاں زیرک خاں اور دوسرے امراء قلعہ بند ہو گئے اور کافی عرصہ تک حملہ آور غنیم کی مدافعت کرتے رہے۔ ایک رات غنیم کو غافل پا کر ملک یوسف، سرور الملک اور زیرک خاں شب خون مارنے کے لیے قلعہ سے نکل کر آئے لیکن شکست کھا کر لوٹ گئے۔ شیخ علی نے ان کا تعاقب کرکے اکثر کو قتل اور قید کر لیا۔

شیخ علی کا لاہور پر قبضہ

دوسرے دن شیخ علی لاہور شہر میں داخل ہو گیا اور لاہور کے بہت سے باشندوں کو قتل کر دیا، اکثر کو اسیر بنا لیا۔ کچھ دن وہاں قیام کرنے کے بعد دیپالپور پہنچا۔ ملک یوسف سرور الملک دیپالپور پر مورچہ بندی کیے ہوئے تھا اس نے دشمن کے دباؤ کو محسوس کرکے وہاں سے بھی نکل جانے کا

ارادہ کیا تھا لیکن عماد الملک نے بروقت دیپال پور کے قلعہ کی حفاظت کے لیے تبرہندہ سے اپنے بھائی ملک احمد کو بھیج دیا جب شیخ علی کو اس کمک کی اطلاع ملی تو وہ وہیں سے لوٹ گیا۔

اس فتنہ کے سدّباب کے لیے سلطان مبارک شاہ نے پھر لشکر کشی کی اور سامانہ سے تلونڈی پہنچا وہاں سے کوچ کرکے بیاس کو بوہی کے گھاٹ سے عبور کیا اور دیپال پور پہنچ کر راوی کے کنارے خیمے لگا دیے۔

شیخ علی کی کابل کو واپسی

شیخ علی بادشاہ کی آمد سے گھبرا کر جہلم پار کرکے بھاگا۔ مبارک شاہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے قلعہ شیور تک چلا گیا اور راوی کو طلبنہ کے قریب عبور کیا۔ یہاں ایک قلعہ میں شیخ علی کا بھتیجا مظفر محصور ہو گیا تھا۔ وہ ایک ماہ تک بادشاہی لشکر سے لڑتا رہا آخر کار امان لے کر صلح کر لی اور اپنی لڑکی کو بھاری جہیز کے ساتھ شاہزادہ کے عقد میں دیا۔ شیخ علی کے جو لشکر لاہور کے قلعہ میں محصور تھے شمس الملک سے امان لے کر باہر نکل آئے۔

مبارک شاہ جب شیور اور لاہور کی اس مہم سے فارغ ہوا تو لشکر چھوڑ کر اولیاء اللہ کی زیارتوں کے لیے ملتان چلا گیا اور جلد ہی وہاں سے لوٹ کر دیپال پور آ گیا۔ کچھ دن وہاں ٹھہرا رہا اور شیخ علی کے سدّباب کی خاطر لاہور اور دیپال پور کی حکومت عماد الملک کے تفویض کر دی۔ بیانہ پر عماد الملک کی بجائے شمس الملک کو متعین کر دیا۔ پھر وہاں سے نہایت تیزی سے کوچ کرتا ہوا عید الاضحیٰ کے دن دہلی واپس آ گیا۔

سرور الملک کی سازش

دہلی پہنچنے کے بعد مبارک شاہ نے وزارت پر ملک سرور الملک کو فائز کیا اور نائب لشکر ملک کمال الملک کو اس کا مددگار بنایا لیکن ان دونوں میں نبھ نہ سکی۔ سرور الملک کو دیپال پور کی حکومت کے نہ ملنے کا پہلے ہی رنج تھا، عماد الملک کی تقرری کے بعد تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا اس لیے مبارک شاہ سے ناراض ہو کر غدر برپا کرنے کی فکر میں لگ گیا اور مبارک شاہ کے قتل کی سازش میں کانگوی اور کنگوی کھتریوں، میران صدر نائب عرض کو جو باپ دادا کے وقت سے مبارک شاہ کے خاندان میں پرورش پاتا رہا تھا اور بڑے بڑے عہدے اور منصب حاصل کیے تھے ساتھ لیا اور کچھ دوسرے نمک حرام مسلمانوں کو بھی شریک کر لیا۔

شہر مبارک آباد

۸۳۷ھ میں مبارک شاہ نے جمنا کے کنارے ایک نیا شہر مبارک آباد بسایا لیکن حقیقت میں یہ شہر اس کے لیے مبارک ثابت نہ ہوا۔ وہ اس کی عمارتوں کے بندوبست میں مصروف تھا کہ قلعہ تبرہندہ سے فتح کی خوش خبری اور فولاد کا بریدہ سر حضور میں پیش ہوا، بادشاہ نے شاداں و فرحاں تبرہندہ کا قصد کیا اور جلد ہی وہاں سے لوٹ کر مبارک آباد آ گیا۔

اسی سال خبر پہنچی کہ سلطان ابراہیم شرقی اور کالپی کے حاکم الپ خاں المخاطب بہ سلطان ہوشنگ کے مابین لڑائی ہو رہی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی بادشاہ نے ہر طرف فرامین بھیجے اور ہر جگہ سے لشکر کو اکٹھا کرکے کالپی پر یورش کی تیاریاں کرنے لگا۔

مبارک شاہ کی ہلاکت

ایک دن مبارک شاہ حسب معمول نئی عمارتوں کے معائنہ کے لیے دہلی سے مبارک آباد

گیا، وہاں جمعہ کی تیاری کر رہا تھا کہ نمک حرام میران صدر جو سرور الملک کے بہکانے سے گھات میں لگا ہوا تھا کسی بہانہ سے محل میں گھس آیا اور بادشاہ پر حملہ کر دیا۔

اور سدھ پال کھتری کے پوتے نے مبارک شاہ کو شہید کر دیا۔

مبارک شاہ کی شہادت ۸۳۷ھ میں ہوئی۔ اس نے تیرہ سال تین ماہ سولہ دن تک حکومت کی۔

سلطان محمد شاہ بن فرید خاں

مبارک شاہ کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا محمد شاہ جسے مبارک شاہ نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا ۸۳۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ سرور الملک نے مصلحتاً اس سے بیعت کر لی۔ محمد شاہ نے اس کی فتنہ پردازیوں سے صرف نظر کر کے اُسے خان جہان کا خطاب اور خلعت عطا کی۔ میران صدر کو معین الملک کا خطاب ملا۔ سرور الملک کے شریک وزارت کمال الملک نے بھی سلطان محمد شاہ سے بیعت کر لی لیکن اس نے اپنی سکونت شہر سے باہر رکھی۔

سرور الملک کا اقتدار

نمک حرام سرور الملک برابر فتنہ پردازی میں لگا رہا، چنانچہ جلوس کے دوسرے ہی دن مبارک شاہ مرحوم کے بعض غلاموں کو کسی حیلہ سے پکڑ کر قتل کرا دیا اور لوگوں کو اپنے آپ جاگیریں تقسیم کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے مبارک شاہ کے قاتلوں سدھ پال اور سدھارن کو بیانہ، امروہہ، نارنول، کہرام اور دوآبہ کے کئی ایک پرگنے عطا کر دیے۔

سدھ پال کا غلام رانوں سیہ بیانہ پہنچ کر قلعہ میں داخل ہونا چاہتا تھا لیکن بروقت نہڑدن سے یوسف خاں اوحدی اپنی جمعیت لے کر پہنچ گیا اور رانوں پر حملہ کر کے اس کے بہت سے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے اہل و عیال مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے اور رانوں کا سر کاٹ کر قلعہ کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا۔

امیروں کی بغاوت

سرور الملک کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر خضر خاں اور مبارک شاہ کے وقت کے سارے امیر جہاں جہاں تھے، باغی بن بیٹھے اور تمام ملک میں فتنے و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ از سر نو طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ سنبھل کا حاکم ملک الہداد کالا لودی، حاکم بدایوں ملک چمن اور امیر علی گجراتی وغیرہ مبارک شاہ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے دہلی پر چڑھ آئے۔

کمال الملک کی بغاوت

بادشاہ نے ان کے مقابلہ کے لیے سید خاں ولد سید سالم جس کا خطاب اعظم خاں تھا اور کمال الملک کو روانہ کیا۔ کمال الملک کے ساتھ ملک یوسف ولد سرور الملک، سدھارن اور کانکو بھی گئے۔ جب دہلی کا یہ لشکر کیتھے کے گھاٹ کو عبور کر کے بَرن پہنچا تو الہداد اور دوسرے امیروں نے جو قصبہ اہار تک پہنچ چکے تھے محمد شاہ سے لڑائی کا خیال چھوڑ کر واپسی کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس اثناء میں ان کو خفیہ اطلاعات ملیں کہ خود کمال الملک سرور الملک سے مرحوم بادشاہ کے خون کا بدلہ لینے کی فکر میں ہے تو انھوں نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ سرور الملک کو بھی کسی طرح کمال الملک کے ارادوں کی ہوا لگ گئی۔ اس نے کمال الملک کی مدد کے بہانے اپنے نائب

ملک ہشیار کو اپنے بیٹے کی حفاظت کے خیال سے بھیج دیا۔ یوسف خاں وغیرہ بھی کمال الملک کے رویہ سے کھٹک گئے تھے، چنانچہ ایک دن موقع پاکر یوسف خاں ملک ہشیار اور سدھارن لشکر سے نکل کر دہلی بھاگ گئے۔

باغی امیروں کا دہلی پر حملہ

سنبھل اور بدایوں وغیرہ کے امیروں کا لشکر کمال الملک کے لشکر سے جا ملا اور یہ سب مل کر کیچھ پہنچ گئے۔ دوسرے دن جمنا پار کرکے ایک باغ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ سرور الملک نے قلعہ بند ہوکر لڑنے کی تیاریاں کرلیں۔ سرور الملک کے لشکریوں نے شہر سے نکل کر باغی امیروں کی فوج پر حملہ کیا لیکن جوابی حملہ کی تاب نہ لاکر پسپا ہوگئے اور لوٹتے ہوئے ان کے بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے قید ہوگئے۔

دوسرے دن مبارک شاہی امیروں نے سیری کے قلعہ کے سامنے کمپ لگا دیا۔ شہر کے حصار سے بھی اکثر امیر نکل کر ان کے ساتھ ہوگئے۔ یہ لڑائی برابر تین ماہ تک رہی۔

اس سال کے آخر میں زیرک خاں حاکم سامانہ کا انتقال ہوگیا اور اس کا علاقہ اس کے بیٹے محمد خاں کو مل گیا۔

سرور الملک کا قتل

خود سلطان محمد شاہ کا یہ حال تھا کہ وہ مصلحتاً اور مجبوراً سرور الملک کے ساتھ تھا اور دل سے مبارک شاہی امیروں کا حامی تھا۔ بادشاہ کی اس دلی کیفیت سے سرور الملک غافل نہیں تھا اور وہ اُسے بھی ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ سرور الملک نے مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور ۸ محرم ۸۳۸ھ سرور الملک میران صدر کے لڑکوں کو لے کر سراپردۂ شاہی میں محمد شاہ کے قتل کے ارادہ سے گھس گیا۔ محمد شاہ نے اُسی وقت کمال الملک کو بلانے کے لیے آدمی بھیجے لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی شاہی خادموں نے سرور الملک اور میران صدر کے لڑکوں کو گھیر کر قتل کردیا۔ ان کے دوسرے ساتھی اپنے اپنے گھر بند کرکے بیٹھ رہے۔

مفسد کھتریوں کا انجام

سرور الملک کا قضیہ پاک ہونے کے بعد کمال الملک دوسرے امراء کے ساتھ بغدادی دروازہ سے شہر میں داخل ہوا۔ بدبخت سدھ پال ہندوانہ رسم کے مطابق اپنی عورتوں کو چتا میں جلاکر مارنے مرنے پر تیار ہوگیا اور مارا گیا۔ سدھارن کانگو اور اس کے کھتری رفیق بھی مبارک شاہ کے روضہ کے پاس قتل کردیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ملک ہوشیار اور مبارک کوتوال کی گردن اڑا دی گئی۔

محمد شاہ کی مستقل حکمرانی

دوسرے دن کمال الملک اور دوسرے تمام امیروں نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وزارت کا منصب کمال الملک کے تفویض ہوا۔ ملک چمن بدایونی کو غازی الملک کا خطاب عنایت ہوا اور اسے بدایوں کی قدیم عملداری کے علاوہ امروہہ بھی جاگیر میں دیا گیا۔ ملک الہداد نے خود تو کوئی خطاب قبول نہ کیا لیکن اپنے بھائی کو دریا خاں کا خطاب دلوا دیا۔ اب کہیں جاکر محمد شاہ کامل الاختیار بادشاہ بن سکا اور اس کی حکمرانی کے لیے کوئی خطرہ اور خدشہ نہ رہا۔

ملتان کا سفر

۸۴۰ھ میں محمد شاہ نے ملتان[1] کا عزم کیا اور کچھ دن مبارک پور میں ٹھہرا رہا۔ جب ہر طرف کے امیر اور سردار مبارک پور میں جمع ہوگئے تو انھیں لے کر ملتان گیا اور وہاں بزرگوں کے مزاروں کی

---

[1] ملتان۔ نہایت قدیم شہر ہے۔ سکندر بن فیلقوس کے وقت میں یہ شہر قوم ملی کا دار الخلافہ تھا۔ جنرل کننگھم کی رائے میں اس کی وجہ تسمیہ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

زیارت کرکے دہلی لوٹ گیا۔

اسی سال اس نے سامانہ پر فوج کشی کی اور اس علاقے کو غارت کرکے ایک فوج شیخا کھوکھر کے مقابلہ پر متعین کردی اور دہلی لوٹ گیا۔

فتنوں کا آغاز

۸۴۱ھ میں ملتان میں لنگاہ پٹھانوں کی شورش انگیزی کی خبر ملی اور اسی دوران میں سلطان ابراہیم شرقی نے دہلی کے بعض پرگنوں پر یلغار کرکے قبضہ کرلیا۔ گوالیار کے زمینداروں نے بھی مالگزاری بند کردی۔ ضرورت تھی کہ مختلف سمت سے اٹھنے والے فتنوں کی طرف بادشاہ فوری متوجہ ہوتا لیکن محمد شاہ نے ان کے سدّباب میں سستی برتی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور سارے ملک میں پھر سے فتنہ و فساد کا دور دورہ ہوگیا۔

محمود خلجی کا دہلی پر حملہ

میوات کے خان زادوں نے جو حسن خاں میواتی کے بزرگ تھے مالوہ[1] کے محمود خلجی کو دہلی پر حملہ کی دعوت دی اور ۸۴۴ھ میں محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کردیا۔ محمد شاہ نے بھی

(بقیہ حاشیہ ملتان صفحہ گزشتہ) سورج دیوتا کا مندر ہے۔ ۶۴۱ء میں ہیون تھسانگ ایک چینی سیاح ہندوستان آیا تھا اس نے بھی ملتان کے اس مندر اور سورج کے بت کا ذکر کیا ہے اس وقت ملتان کا رقبہ ۵ میل تھا۔ "چاچ نامہ" سے معلوم ہوتا ہے ۷۱۲ء میں جب محمد قاسم ثقفی نے ملتان کو فتح کیا۔ اس وقت دریائے بیاس اس کے جنوب مشرق میں بہتا تھا اور راوی قلعہ اور شہر کے درمیان سے گزرتا تھا۔ بلاذری نے (۸۷۵ء) بھی اس بت کا ذکر کیا ہے۔ اصطخری (۹۵۰ء) نے لکھا ہے "اس مندر کی تعظیم کی وجہ سے ہندو حملہ آور اس شہر پر حملہ نہیں کرتے تھے"۔ اس نے اس مندر کو مین بازار کے چوک میں بتایا ہے۔ ابن حوقل ۹۷۶ء کہتا ہے "یہ بت آدمی کی شکل کا ہے جو چبوترے پر بیٹھا ہوا ہے، آنکھوں میں دو جواہر ہیں باقی جسم پر سرخ کھال منڈھی ہوئی ہے معلوم نہیں جسم کس چیز سے تراشا گیا ہے۔ ابن حوقل کے تھوڑے دن بعد ہی قرامطیہ نے ملتان کو فتح کرلیا اور اس مندر کو ڈھا دیا اور اس کی جگہ مسجد بنوادی۔ چنانچہ جب ابوریحان بیرونی ملتان آیا تو یہ بت نہیں تھا لیکن ادریسی نے (۱۱۳۰ء) اس کا ذکر کیا ہے۔ ادریسی کے وقت بھی راوی شہر کے نیچے سے بہتا تھا۔ موسیو تھے وی نو فرانسیسی سیاح ۱۶۶۶ء میں اورنگ زیب کے عہد میں آیا تھا وہ بھی اس سورج کی مورتی کا ذکر کرتا ہے، اس کا بیان ابن حوقل کے بیان کے مطابق ہے۔ کہتے ہیں اورنگ زیب نے اس مندر کو توڑ کر قلعہ میں وہ مسجد بنوادی جو مول راج کے زمانہ میں محاصرہ ملتان کے وقت بطور میگزین استعمال کی گئی تھی اور آگ لگنے سے اڑ گئی تھی۔ جنرل کننگھم کہتے ہیں "میں نے ۱۸۵۳ء میں اس کے کھنڈر دیکھے ہیں وہ قلعہ کے عین وسط میں تھی"۔ اس سے عربی مورخوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ مندر مین بازار کے چوک میں تھا۔ تیمور کے وقت تک دریائے راوی شہر اور قلعہ دونوں طرف بہتا تھا اور اس کی ایک شاخ دونوں کے درمیان سے نکلتی تھی۔ قلعہ میں اب جو پہلاد پوری کا مندر ہے اس کا سورج دیوتا مندر سے کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے سورج کنڈ کا جو مندر شہر سے پانچ میل پر ہے اس کا بقیہ ہو۔ ملتان میں شاہ رکن عالم کا مقبرہ عجیب چیز ہے، اس کی بلندی سو فٹ ہے، پچاس فٹ کی بلندی سے اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں یہ مقبرہ غیاث الدین تغلق نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا لیکن محمد شاہ تغلق نے یہ شاہ رکن عالم کو دے دیا۔ یہ کہانی بے سروپا ہے کہ شاہ رکن عالم کی قبر غوث صاحب کے قریب تھی انھوں نے کسی کو خواب میں کہا کہ ہم اس بے ادبی کے متحمل نہیں ہوسکتے اس لیے شاہ رکن عالم غیاث الدین کے مقبرہ میں چلے گئے۔ موجودہ شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ ابن بطوطہ نے ملتان سے دس میل کے فاصلہ پر راوی کو عبور کیا تھا۔ وہ اسے سندھ کا دارالخلافہ لکھتا ہے۔

[1] سلاطین مالوہ۔ ہندو تاریخوں اور قدیم داستانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے ایک رشی مہاپاہ نے آتش کدہ

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس کے مقابلہ کی تیاریاں کیں اور اپنے بیٹے سید علاؤالدین کو حملہ کرنے کے لیے شہر سے باہر بھیجا۔ محمود خلجی نے اپنے بیٹوں غیاث الدین اور مدن خاں کو اس کے مقابلہ پر متعین کیا۔

(بقیہ حاشیہ سلاطین مالوہ صفحہ گزشتہ) قائم کر کے پرستش کا آغاز کیا۔ بدھ مذہب کے پیرو راجہ نے اس عبادت کو جبراً بند کرا دیا کیونکہ یہ لوگ آگ میں انسانوں کو جلایا کرتے تھے۔ مہاباہ کی دعا سے اس آتش کدہ میں سے ایک انسانی جسم نمودار ہوا۔ اس نے تخت حکومت پر بیٹھ کر دوبارہ برہمن مذہب کو رواج دیا، اس نے دکن سے آکر مالوہ کو پایۂ تخت بنایا اور دھنجی نام سے حکومت کی۔ اس کی پانچویں پشت میں راجہ بیت راج لاولد مر گیا۔ اس کا جانشین آدت پنوار ہوا۔ اس شخص سے پنوار خاندان کی حکمرانی کا آغاز ہوتا ہے۔ پنوار کے بعد گندھرب راجہ بنا اس کو ہندو اوتار اور دیوتا بھی سمجھتے ہیں۔ گندھرب کا فرزند بکرماجیت ہے جو مشہور فاتح گزرا ہے، اسی راجہ سے ہندوؤں کا سن بکرمی شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد مشہور راجہ چندر پال گور ا۔ ۵۴۱ بکرمی میں راجہ بھوج تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں علم و فضل کی بڑی ترقی ہوئی، پانچ سو اہل علم اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان میں ایک عالم برورچ دوسرا دھن پال گزرا ہے جس نے بے شمار دلچسپ کتابیں لکھی ہیں۔ بھوج کے بعد اس کا لڑکا جے چند حکمران ہوا۔ اس کے بعد پنوار خاندان سے حکومت تو نور خاندان کے مورث چتپال نے حاصل کر لی۔ اس خاندان کے آخری راجہ کنور پال کے بعد حکومت کی باگ چوہان خاندان کے ہاتھ آگئی۔ مالدیو کے عہد میں شیخ شاہ نے غزنی سے آکر مالوہ فتح کیا۔ اس کا لڑکا علاؤالدین اس کا جانشین بنا۔ پھر مانک دیو چوہان کی اولاد میں سے ایک شخص جیت پال نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ راجہ پتر سین کے عہد میں جلال الدین افغان نے حکومت ہندوؤں سے چھین لی۔ پھر پتر سین کا لڑکا کھڑک سین مالوہ پر قابض ہوگیا۔ سنت سنگھ کے عہد میں دکن سے شاہزادہ بہادر شاہ نے حملہ کر کے راجہ کو قتل کر دیا اور مالوہ فتح کر کے دہلی پر حملہ کیا، لیکن سلطان شہاب الدین نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن سے فیروز شاہ تک مالوہ دہلی کے ماتحت رہا، اس کے بعد سلطان محمود کا مالوہ کا صوبیدار دلاور خاں غوری اس کے مرتے ہی خود مختار ہوگیا۔ اس وقت گجرات کا صوبہ دار ظفر خاں، ملتان کا خضر خاں، جون پور کا خواجہ سرور بھی باغی بن بیٹھے تھے۔

دلاور خاں کے بعد مالوہ پر اس کا لڑکا الپ خاں سلطان ہوشنگ کے لقب سے حکمران ہوا، اس نے اپنے باپ کو زہر دلوا دیا تھا۔ سلطان مظفر گجراتی نے ہوشنگ پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور مالوہ پر اپنے بھائی ناصر خاں کو مقرر کر دیا۔ یہ شخص ظالم تھا اس لیے رعایا نے بغاوت کر کے ہوشنگ کے چچازاد بھائی موسیٰ کو بادشاہ بنا لیا۔ سلطان مظفر نے ہوشنگ کو رہا کر کے اسے موسیٰ کے مقابلہ پر بھیجا، ہوشنگ نے موسیٰ کو شکست دی اور دوبارہ حکمران بنا۔ مظفر شاہ کے مرنے پر اس نے گجرات پر حملہ کر دیا لیکن سلطان احمد گجراتی کے مقابلہ میں ہر مرتبہ شکست کھائی۔ ہوشنگ نے مبارک شاہ بن خضر خاں حاکم دہلی، ابراہیم شرقی جون پور، سلطان احمد دکن سے بھی لڑائیاں لڑیں۔ ہوشنگ کے بعد اس کا لڑکا نصیر خاں محمد شاہ کے خطاب سے تخت پر بیٹھا۔ ہوشنگ کے چھوٹے بھائی محمود خاں نے محمد شاہ کو زہر دلوا دیا اور محمود شاہ کے لقب سے حکومت سنبھال لی۔ بدایونی نے اس کو محمود خلجی لکھا ہے۔ اس نے بھی سلطان احمد گجراتی سلطان محمد بن مبارک شاہ دہلی سلطان حسین شرقی جون پور اور رانا کونبا سے لڑائیاں لڑیں۔ اس کے پاس خواجہ جمال الدین اله آباد سلطان ابوسعید مرزا حاکم خراسان کے سفیر بن کر آئے تھے۔ محمود شاہ ایک مرتبہ رانا سانگا کے ہاتھوں بھی گرفتار ہوگیا تھا لیکن رانا نے اُسے عزت کے ساتھ رہا کر دیا۔ جب محمود نے بہادر شاہ گجراتی پر حملہ کیا تو شکست کھا کر قید ہوگیا، چاپانیر کے راستہ میں قتل کر دیا گیا اور مالوہ گجرات کے تحت آگیا۔ ہمایوں کے عہد تک یہ گجرات کے تحت تھا۔ ہمایوں جب آگرہ واپس ہوا تو مالوہ میں ایک شخص ملو نے قادر خاں کے لقب سے سلطان مالوہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ شیر شاہ کے عہد میں مالوہ کا صوبہ دار شجاعت خاں تھا جو سلیم شاہ کے عہد میں خود مختار ہوگیا اور میاں دولت خاں کے نام سے حکمران ہوا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بایزید خاں باز بہادر کے نام سے حکمران ہوا اس کے زمانہ میں اکبر نے مالوہ فتح کر لیا۔ نربدا، سپرا، کالی سندھ، بیتیا، گودی یہاں کے خاص دریا ہیں۔ نہایت سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ جھیل اور چراگاہیں بکثرت ہیں زراعت کے لحاظ سے بھی زرخیز ہے۔ گیہوں، خشخاش، گنا، آم، خربوزہ، انگور کی پیداوار ہوتی ہے۔ پان بھی مشہور تھے۔ اجین گڈھ بیجا گڑھ دہار اجمیر اس صوبہ میں شامل رہے ہیں ــــ مالوہ کے متعلق ایک مختصر نوٹ ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں +

دونوں فوجوں میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخر محمود خلجی نے صلح کر لی اور لوگوں سے یہ بہانہ کر کے کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مالوہ پر بڑی تباہی آ گئی ہے"۔ راتوں رات دہلی کا میدان چھوڑ کر مالوہ کی طرف کوچ کر گیا۔ بہلول لودی نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے لشکر کا کافی مال و اسباب لوٹ لیا۔ یہ کامیابی چونکہ بہلول لودی کی کارگزاری سے حاصل ہوئی تھی اس لیے محمد شاہ نے فتح کے انعام میں اسے لاہور اور دیپال پور جاگیر میں عطا کیے۔

بہلول لودی کا دہلی پر حملہ

۸۴۵ھ میں محمد شاہ نے دوبارہ سامانہ کا رخ کیا اور بہلول لودی کو جسرت کے مقابلہ پر رخصت کر کے دہلی لوٹ آیا۔

جسرت نے بہلول کے ساتھ ساز باز کر لی اور اسے سلطنتِ دہلی کے سبز باغ دکھا کر قسمت آزمائی پر آمادہ کر لیا۔ بہلول کے دل میں بھی بادشاہت کی امنگ لہر لینے لگی اور اس نے اپنی برادری کے تمام پٹھانوں کو ہر طرف سے اپنے پاس بلا لیا، کئی ایک پرگنوں پر قبضہ جما لیا اور محمد شاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے دہلی پر لشکر لے کر آ گیا۔ بہلول کافی عرصہ تک دہلی کا محاصرہ کیے وہاں پڑا رہا لیکن اس کی تگ و دو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور دہلی میں داخل ہونے کی کوئی راہ پیدا نہ ہوئی اور اسے مجبوراً محاصرہ اٹھا کر لوٹ جانا پڑا۔

سلطان محمد شاہ کی وفات

اسی دوران میں محمد شاہ بُری طرح بیمار ہو گیا۔ اس کی علالت کی وجہ سے موقع پا کر ہر طرف لوگ باغی ہو گئے۔ یہاں تک کہ دہلی سے بیس کوس تک کے امیروں نے بھی اس کے حلقہ اطاعت کو نکال پھینکا اور خود مختار بن بیٹھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر محمد شاہ نے اپنے بیٹے علاؤالدین کو جس کی بدایوں میں جاگیر تھی اور جو اس وقت شکار کے لیے پہاڑوں پر گیا ہوا تھا دہلی بلا کر اپنا ولی عہد بنا لیا۔

سلطان محمد شاہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکا۔ ۸۴۷ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔ اس کی سلطنت چودہ سال چار ماہ رہی۔

علاؤالدین بن محمد شاہ

محمد شاہ کی وصیت کے مطابق اسی سال علاؤالدین نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔ ملک بہلول اور دوسرے امیروں نے اس سے بیعت کر لی۔

بہلول لودی کے منصوبے

علاؤالدین اپنے باپ سے کہیں زیادہ غافل اور لاپروا تھا۔ اس کی سستی اور غفلت کو دیکھ کر ملک بہلول کی نیت پھر بدلنے لگی اور وہ جی ہی جی میں اپنی بادشاہت کے منصوبے بنانے لگا۔

۸۵۰ھ میں سلطان علاؤالدین بیانہ کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن کسی نے راستہ ہی میں یہ افواہ پھیلا دی کہ جونپور کا بادشاہ دہلی پر حملہ کے لیے آ رہا ہے۔ علاؤالدین نے کوتاہ اندیشی کے باعث اس خبر کی تحقیق نہ کرائی اور اُلٹے پاؤں دہلی لوٹ آیا۔

بدایوں کا سفر

۸۵۱ھ میں بادشاہ نے بدایوں کا سفر کیا۔ اسے بدایوں کچھ ایسا پسند آیا کہ اسی جگہ مستقل قیام کا ارادہ کر لیا اور ایک عمارت کی بنیاد رکھ کر دہلی لوٹ آیا۔

۸۵۲ھ میں اپنے ایک سالے کو کوتوالِ شہر اور دوسرے کو میر گو مقرر کر کے دوبارہ بدایوں گیا۔ اس کے پیچھے ان دونوں بھائیوں نے ایسے فتنے برپا کیے کہ شہر والے ان سے تنگ آ گئے اور ہجوم کر کے ان کو قتل کر دیا۔

بہلول لودی کا دہلی پر قبضہ

بادشاہی امراء نے بھی سرکشی اختیار کر لی۔ عمدۃ الملک حسام خاں نے جو بادشاہ کے سامنے بے جھجک کھری کھری کہنے کا عادی تھا اور اسی وجہ سے بادشاہ کی خفگی سے دوچار رہتا تھا اور اسے اپنے عہدہ سے بھی معزول ہونا پڑا تھا۔ حمید خاں نے جو بادشاہ کی سزا سے ڈر کر دہلی بھاگ آیا تھا متفق ہو کر بہلول لودی کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور لودی نے سرہند[1] میں شاہی خطاب تجویز کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور ایک بھاری لشکر کے ساتھ آ کر دہلی پر بے روک ٹوک قبضہ کر لیا۔

علاؤالدین شاہ کی بے نیازی

بہلول لودی نے دہلی میں اپنے ایک نائب کو متعین کر کے مزید لشکر فراہم کرنے کے لیے دیپال پور کا عزم کیا لیکن ساتھ ہی ایک منافقانہ عریضہ علاؤالدین کے پاس روانہ کر دیا کہ "میں آپ کا فرمانبردار غلام ہوں اور یہ ساری کارروائی مجھے آپ کی خیرخواہی میں کرنی پڑی ہے۔"

علاؤالدین شاہ بھی کچھ نرالے مزاج کا بادشاہ تھا۔ اس نے جواب دیا کہ "میں کون سا سلطان ابن سلطان[2] ہوں محمد شاہ مرحوم نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اس لیے بادشاہ بن گیا، اب میرے پاس بادشاہی کا ساز و سامان نہیں اس لیے میں بدایوں پر ہی صبر و قناعت کرتا ہوں باقی سلطنت سے تیرے حق میں سبکدوش ہوتا ہوں۔"

اس خط کے ملنے پر مزید تگ و دو کی ضرورت نہ رہی تھی اس لیے بہلول لودی دیپال پور سے لوٹ کر دہلی آیا اور بلا کسی مزاحمت اور جھگڑے کے تختِ دہلی پر جلوس کر کے مفت میں ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

سلطان علاؤالدین بہلول لودی کی اجازت سے بدایوں میں گنگا کے کنارے تک اور دامنِ کوہ سے خیرآباد تک کے پرگنوں پر قابض رہا۔ اس علاقہ میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

---

[1] سرہند۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں صوبہ دہلی کے تحت اس کو ایک "سرکار" بتایا ہے اور صرف یہ لکھا ہے: "ایک بڑا شہر ہے حافظ رخنہ کے باغات سے بڑا اچھا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔" اس وقت اس سرکار کے تحت ۳۱ محال اور پرگنے تھے۔ یہ شہر ریاست پٹیالہ میں لدھیانہ و انبالہ کے درمیان راجپورہ سے ۱۶ میل پر ہے۔ آبادی قدیم اور تاریخی واقعات کی دردانگیز یادگار ہے۔ آخری مغل عہد میں سکھوں نے اسے لوٹ کر تباہ کر دیا تھا۔ قدیم عمارتوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ "باغ عام خاص" گذشتہ عظمت کی روتی ہوئی یادگار ہے۔ قریب ہی شاہی زمانہ کا چھوٹا سا قلعہ بھی ہے۔ ایک چھوٹے موضع ڈیرہ میں دسویں گورو گوبند سنگھ کے دو بیٹوں کی "سمادھ" سکھوں کی زیارت گاہ ہے۔

سرہند کی اہمیت مسلمانوں کے نزدیک حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی وجہ سے ہے۔ یہ مشہور نقشبندی بزرگ گزرے ہیں۔

[2] مورخوں کے ایک قول کے مطابق اس کا باپ محمد شاہ مبارک شاہ کا لڑکا نہیں تھا بلکہ فرید خاں بن خضر خاں کا لڑکا تھا۔

سلطان علاؤالدین کی وفات

سلطان علاؤالدین اپنی اس مختصر سی سلطنت میں مگن، کافی عرصہ زندہ رہا، یہاں تک کہ سات سال چند ماہ کی حکمرانی کے بعد ۸۵۵ھ میں وہ عالم لبقا کی طرف سدھار گیا۔

اس کے بعد ہندوستان کی سلطنت ایک نئے خاندان میں منتقل ہو گئی ۔

خاندان لودی

سلطان بہلول بن کالا لودی

محمد شاہ کے عہد میں سلطان بہلول[1] کو خان خاناں کا خطاب ملا ہوا تھا۔ سلطان علاؤالدین کی دستبرداری کے بعد وہ حمید خاں کے تعاون سے ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ عمدۃ الملک حسام الدین اور حمید خاں نے بادشاہ کے خلاف دہلی میں سازش کی تھی۔ سلطان علاؤالدین نے حسام الدین کو تو قتل کرا دیا تھا لیکن حمید خاں بہلول لودی کو بادشاہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ حمید خاں نے حسام الدین کے قتل کے بعد دہلی میں علاؤالدین کے گھرانہ پر قبضہ کر لیا تھا اور جب بہلول دہلی آیا تو قلعہ کی کنجی اس کے حوالہ کر دی۔ اس کی نمک حرامی بہت جلد اس کے سامنے آگئی اور بہلول نے اس کے احسان کا یہ بدلہ دیا کہ اُسے قید میں ڈال دیا اور بے کھٹکے اپنی بادشاہی کا نقشہ جما لیا اور اسی سال ملتان کے بندوبست کے لیے روانہ ہو گیا (بہلول لودی کی تخت نشینی سے) ملک پر افغانوں[2] کا تسلط ہو گیا۔

---

[1] بہلول لودی۔ یہ شخص سلطان شہ لودی کا بھتیجا اور شاہو خیل قبیلہ کا رکن تھا۔ سلطان شہ کا باپ قلوت سے ملتان آکر تجارت کرنے لگا یہ سلطان محمود کا زمانہ تھا۔ سلطان شاہ نے خضر خاں کی ملازمت اختیار کی۔ سرہند جاگیر اور اسلام خاں خطاب ملا سلطان شہ لودی کے بھتیجے کا فرزند بہلول تھا جو نہایت غربت کی حالت میں سرہند پہنچا سلطان شہ نے اسے اپنا فرزند بنا لیا۔ بہلول ملتان میں پیدا ہوا تھا اس کی ماں حاملہ تھی کہ مکان کا شہتیر گرنے سے مر گئی۔ مردہ ماں کا پیٹ چاک کر کے اسے نکالا گیا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں سے ایک درویش نے کہا کون شخص دہلی کا تخت اتنی رقم کے عوض خریدنے کو تیار ہے؟ سب ہنسنے لگے لیکن بہلول نے خوشی سے اُتنی رقم درویش کو دے دی۔ کہتے ہیں اسی فقیر کی دعا سے وہ اس مرتبہ پر پہنچا۔

[2] افغان۔ یہ قوم ہمیشہ سے وحشی اور اُجڈ رہی ہے۔ سلاطین غور اور غزنی کے زمانہ میں یہ خوار و زبوں حالت میں رہی۔ لودی قوم کے لوگ افغان ہونے سے منکر ہیں اور اپنا سلسلۂ نسب شاہ عجم ضحاک تازی سے جوڑتے ہیں، لیکن لودی اور خلجی دونوں قبیلے مسماۃ متو بی بی دختر بیٹ افغانی کی نسل سے ہیں۔ اس سے قبل کابل کے حاشیہ میں ہم نے تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ افغانوں میں اسلام کس طرح داخل ہوا۔ وہ حاشیہ زیادہ تر ابوالفضل (آئین اکبری) کے حوالوں پر مشتمل ہے۔ محمد قاسم مصنف تاریخ فرشتہ نے جو تفصیل لکھی ہے اس کا اختصار یہاں بیان کیا جاتا ہے تاکہ لودیوں کے اصل نسب کی وضاحت ہو جائے۔

واضح رہے ۲۲ھ میں حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فارس کے مرتدوں کی سرکوبی کے لیے عبداللہ بن عامر نے فوج کشی کی۔ ۳۰ھ میں سعید بن العاص نے طبرستان، جرجان، استرآباد کو فتح کیا۔ ۳۱ھ میں عبداللہ بن عامر کے ہراول حنیف بن قیس نے سیستان، قہستان، نیشاپور فتح کیا اور طوس سے لے کر بلخ تک کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ ۳۲ھ میں بلخ کی مہم پر عبدالرحمٰن بن ربیعہ مامور ہوئے لیکن انھیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ۴۴ھ میں امیر معاویہ کے زمانہ میں زیاد بن امیہ والی بصرہ کی نگرانی میں عبدالرحمٰن بن شمر نے کابل فتح کیا۔ اسی زمانہ میں ملہب بن ابی صفرہ ایک عرب سردار نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ ۶۲ھ یزید کے زمانہ میں یزید بن زیاد نے کابل کے باغیوں پر حملہ کیا اور

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

محمود شرقی کا دہلی پر حملہ

۸۵۶ھ میں علاؤالدین کے امیروں کی سازش سے سلطان محمود شرقی نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس مرتبہ بھی بڑی سخت جنگ ہوئی۔ مقابلہ میں محمود کا دستِ راست فتح خاں ہروی مارا گیا۔ اس کی ہلاکت سے محمود کے حوصلے پست ہو گئے اور مقابلہ کی تاب نہ لاکر وہ جون پور لوٹ گیا۔ دوسرے سال وہ تیاری کر کے پھر جون پور سے نکلا اور دہلی کے ارادہ سے اٹاوہ تک پہنچ گیا۔ اس مرتبہ فریقین میں اس شرط پر صلح ہو گئی کہ دہلی کے وہ پرگنے جو مبارک شاہ کے قبضہ میں تھے سلطان بہلول کے ہوں گے اور جن پرگنوں پر سلطان ابراہیم شرقی قابض تھا وہ محمود کے قبضہ میں رہیں گے۔ ایک اور شرط یہ تھی کہ شمس آباد بھی جہاں محمود کا نائب جونا خاں رہتا تھا موسم برسات کے بعد بہلول کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اس قرارداد پر دونوں فریق اپنے اپنے علاقہ کو لوٹ گئے۔

شمس آباد پر قبضہ

شرائطِ صلح کے بموجب برسات کے بعد بہلول نے شمس آباد پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی حکومت بھوگاؤں کے حاکم رائے کرن کے سپرد کر دی۔ محمود کو بہلول کی یہ کارروائی شاق گزری۔ اس نے شمس آباد کے نواح میں بہلول کے لشکر سے لڑائی چھیڑ دی لیکن اسی دوران میں وہ فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا محمد شاہ جونپور کا سلطان بن گیا اور وہ صلح کی سابقہ شرائط پر راضی ہو کر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

بہلول کا جون پور پر حملہ

جون پور کی اس لشکر کشی کے موقع پر بہلول کے چچا قطب خاں کو محمد شاہ کے لشکر نے قید کر لیا تھا۔ اپنے چچا کو قید سے چھڑانے کے لیے بہلول نے عہد شکنی کی اور محمد شاہ کی سرحدں

(بقیہ حاشیہ افغان صفحہ گزشتہ) شکست کھائی، اس کے بعد طلحہ بن عبداللہ بن حنیف خزاعی نے کابل پر کامیاب حملہ کیا، اس کے بعد کابل کے حاکم خالد بن عبداللہ مقرر ہوئے ان کو حجاج بن یوسف نے معزول کر دیا اور یہ ملتان اور پشاور کے درمیان کوہ سلیمان پر جا کر بس گئے اور وہاں کے ایک پٹھان سردار کے نکاح میں اپنی لڑکی دے دی۔ اس سے دو لڑکے ہوئے ایک لودی اور دوسرا سور۔ لودی اور سوری قوم انہی دو کی اولاد میں۔ مطلع الانوار کے مصنف نے ان کی نسل کا ایک اور سلسلہ بتایا ہے جسے فرشتہ نے بھی نقل کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جب نیل میں فرعون غرق ہوا تو قبطیوں کی ایک جماعت جلاوطن ہو کر کوہ سلیمان میں آ کر بس گئی اور یہاں ان کا قبیلہ افغان کہلایا۔ افغان کوہ سلیمان سے محمد بن قاسم ثقفی کے لشکر کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے اور کرماچ پشاور شنوران میں مقیم ہوئے۔ لاہور کے راجہ نے ان پر دو تین بار حملہ کیا اور خلج غور اور کابل کے مسلمانوں نے اس کے مقابلہ میں ان پٹھانوں کی مدد کی۔ ان لڑائیوں کے زمانہ میں جب کوئی ان پٹھانوں سے پوچھتا "کوہستان کے مسلمانوں کا کیا حال ہے"؟ تو یہ کہتے کوہستان نہ کہو "فغانستان" کہو، کیونکہ بجز فغان و فریاد کے وہاں کچھ اور نہیں۔ اس وقت سے ان کے مقام کو افغانستان اور ان کو افغان کہا جانے لگا۔ ہندوستان والے ان کو پٹھان کہتے رہے اس کی وجہ فرشتہ نے بیان کی ہے کہ جب یہ قوم ہندوستان میں پہنچنے کے بعد پٹنہ میں جا کر مقیم ہوئی تو ان کا نام پٹھان پڑ گیا۔ راجہ جے پال نے غزنویوں کے حملہ کو روکنے کے لیے پٹھانوں کی مدد لی اور شیخ حمید نامی سردار کو لمغان اور ملتان کا بندوبست سپرد کیا۔ اس وقت سے پٹھان اقتدار و حکمرانی کی طرف مائل ہوئے۔ فرشتہ کا ہمعصر مورخ خواجہ نعمت اللہ بن خواجہ حبیب اللہ ہروی مصنف "تاریخ مخزن افغانی" جس نے ۱۰۱۸ھ جہانگیر کے عہد میں خاں جہاں خاں لودی کی سفارش پر فرزندی کا خطاب پایا تھا وہ ان کو قبطی کے بجائے بنی اسرائیلی ثابت کرتا ہے کہ جس وقت بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر دیا تو بنی اسرائیل کی ایک شاخ جلاوطن ہو کر کوہ سلیمان میں آ کر بس گئی۔ ان کی زبان سریانی تھی کوہ و صحرا کے قیام کے اثر سے بدلتے بدلتے پشتو بن گئی۔ یہی مصنف ان کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ فتح مکہ کے دن قیس عبدالرشید کی بہادری پر خوش ہو کر حضور اکرمؐ نے اسے "جہاز کی بنیادی لکڑی" کہا تھا اس لکڑی کو جہازیوں کی اصطلاح میں پٹھان کہتے ہیں۔ انہی قیس عبدالرشید کے بیٹوں سربنی، بتنی، غرغشتی اور کرانی کے خاندان سے پٹھانوں کے مختلف قبیلوں کا تعلق ہے۔

پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ بھی جون پور سے نکل کر شمس آباد پہنچا اور اُسے ہندو حاکم سے چھین لیا۔ راپری کی سرحد پر بہلول کی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر قنوج کی طرف بھاگ گیا۔ بہلول بھی اس کے تعاقب میں لگا رہا۔

سلطان حسین اور بہلول کی صلح

ادھر محمد شاہ، بہلول سے اپنا پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا کہ جون پور میں اس کا بھائی حسین شاہ امراء سے سازش کر کے بادشاہ بن گیا اور ایک بھاری لشکر بھیج کر اس نے گنگا کے کنارے راج گڑھ میں محمد شاہ کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد سلطان حسین نے جون پور سے بہلول کے چچا قطب خاں کو بلایا اور اُسے گھوڑا اور خلعت عطا کر کے سلطان بہلول کے پاس بھیج دیا اور از سرِ نو بہلول سے صلح کر لی۔ پھر جون پور سے قنوج کی طرف کوچ کیا۔

بہلول نے بھی سلطان حسین کے بھائی جلال خاں کو، جسے اس نے قطب خاں کے عوض گرفتار کر رکھا تھا، نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ سلطان حسین کے پاس بھیج دیا۔

تین سالہ التوائے جنگ

صلح کی یہ حالت کئی سال قائم رہی۔ پھر سلطان حسین اور بہلول کے مابین چندوار کی سرحدوں پر لڑائی ٹھن گئی۔ یہ لڑائی زیادہ طول نہیں پکڑی اور تین سال تک کے لیے دونوں کے درمیان التوائے جنگ کا معاہدہ ہو گیا کہ تین سال بعد دونوں مقابلہ کریں گے۔ اس لڑائی کے موقع پر حاکم بیانہ احمد خاں جلوانی سلطان حسین کا حامی بن گیا اور اس نے اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔

سلطان حسین کا دہلی پر حملہ

جب التوائے جنگ کی یہ تین سالہ مدت گزر گئی تو سلطان حسین ایک لاکھ سوار، ایک ہزار ہاتھی اور بڑا ساز و سامان لے کر دہلی پر حملہ کرنے نکلا۔ بھتوارہ کے مقام پر بہلول کے لشکر سے مقابلہ ہوا لیکن اس بار بھی مصالحت ہو گئی اور سلطان بہلول دہلی کو سلطان حسین اٹاوے کو لوٹ گئے۔

دونوں بادشاہوں کے یہ دم خم تھے اور مضحکہ انگیز بات یہ تھی کہ ان دونوں کی حدودِ سلطنت بس سات منزل کی مسافت تک ہی تھیں۔

سلطان حسین کا بدایوں پر قبضہ

اسی سال بدایوں میں سلطان علاؤالدین انتقال کر گیا اس کی بیٹی ملکہ جہاں سلطان حسین کے نکاح میں تھی۔ علاؤالدین کے انتقال پر سلطان حسین بدایوں آیا اور اسے علاؤالدین کے بیٹوں کے قبضہ سے نکال کر اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ پھر سنبھل پہنچ کر وہاں کے حاکم تاتار خاں کو قید کر کے سارن بھیج دیا۔

دہلی پر دوسرا حملہ

ذی الحجہ ۸۸۰ھ میں سلطان حسین نے ایک بھاری لشکر کے ساتھ دہلی کا قصد کیا اور جمنا کے کنارے کچھ کے گھاٹ پر منزل کی۔

سلطان بہلول سرہند سے کوچ کر کے دہلی پہنچا اور خان جہاں کے بیٹے حسین خاں کو میرٹھ سے بلا کر سلطان حسین کے مقابلہ پر متعین کیا، لیکن جنگ نہیں ہوئی۔ اس مرتبہ بھی قطب خاں نے بیچ بچاؤ کر کے اس شرط پر صلح کرا دی کہ گنگا

دونوں کے درمیان حد رہے اور اِس کنارے تک سلطان حسین اور اُس کنارے تک سلطان بہلول قابض رہے۔

بہلول کی عہد شکنی

سلطان حسین صلح کر کے اپنے ملک کو لوٹ گیا اور مصالحت کے بھروسہ پر اس منزل پر اپنا بہت سا مال و اسباب چھوڑ گیا۔ سلطان بہلول نے اس کے پیٹھ پھیرتے ہی دغا پر کمر باندھ لی اور اُس کا چھوڑا ہوا سارا سامان لوٹ لیا۔ ہاتھیوں گھوڑوں پر لدا ہوا اس کا کچھ خزانہ بھی مال غنیمت میں بہلول کو مل گیا۔

نوید خرابی

سلطان حسین کے چالیس امیر جن میں اس وقت کے مشہور عالم قاضی سماء الدین جن کا خطاب قتلغ خاں تھا شامل تھے، بہلول کے لشکر میں قید ہو گئے۔ بہلول نے قتلغ خاں کو طوق و زنجیر پہنا کر قطب خاں کے سپرد کر دیا اور خود لشکر لے کر سلطان حسین کے تعاقب میں دوآبہ میں شمس آباد تک گیا۔ اس وقت شمس آباد سلطان حسین کے قبضہ میں تھا۔ بہلول نے وہاں قبضہ کر کے اپنا عامل مقرر کر دیا۔

یہ واقعہ ۸۸۳ھ میں پیش آیا، اس کا مادۂ تاریخ ہے "نوید خرابی"۔

سلطان حسین نے بہلول کے تعاقب سے تنگ آ کر راپری کی سرحد پر مقابلہ کا ارادہ کیا لیکن فریقین میں از سرِ نو مصالحت ہو گئی اور طے پایا کہ دونوں اپنے اپنے قدیم علاقوں پر قابض رہیں۔

سلطان حسین کی پسپائی

اس صلح کے بعد حسین نے نقض عہد کیا اور شمس آباد میں لشکر جمع کر کے سلطان بہلول کی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ موضع سونہار کے قریب بڑے معرکہ کی لڑائی ہوئی۔ سلطان حسین کو بُری طرح شکست ہوئی اور اس کا خاصا مال و اسباب لودیوں کے ہاتھ لگا۔ اس کامیابی سے لودیوں کی قوت بہت بڑھ گئی۔

دریں اثنا دہلی میں خان جہاں کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے سلطان بہلول دھوپا مؤ سے دہلی میں آیا اور اس کے بیٹے کو خان جہاں کا عہدہ دے کر واپس چلا گیا۔

راپری کا معرکہ

راپری میں سلطان حسین سے اس کی ایک اور لڑائی ہوئی، اس بار بھی سلطان حسین شکست کھا کر بھاگا۔ اس بھاگم بھاگ میں سلطان حسین کے گھرانہ کے کچھ لوگ جمنا میں ڈوب گئے۔ قوم بھدوریہ کے شر پسندوں نے بھی اس کی بھاگتی ہوئی فوج کو خوب لوٹا۔

سلطان حسین بھاگ کر گوالیار گیا۔ حاکم گوالیار رائے کیرت سنگھ نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور بطور پیش کش بہت سا نقد روپیہ، مال و جنس، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے دیے اور بہت سی فوج اس کے ہمراہ کر دی۔ خود بھی کالپی تک اس کے ساتھ گیا۔

کالپی کا معرکہ

سلطان بہلول بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا کالپی پہنچ گیا۔ کالپی کی حدود پر فریقین میں پھر لڑائی ہوئی اور یہ مقابلہ کافی عرصہ تک ہوتا رہا۔ اسی اثنا میں بکسر کے حاکم رائے تلوک چند نے سلطان حسین کی خدمت میں آ کر اس کے لشکر کو ایک پایاب مقام سے گنگا عبور کرا دیا۔ سلطان حسین مزید مقابلہ کی

ہمت نہ پاکر پٹنہ[1] چلا گیا۔ وہاں کے راجہ نے بھی بڑھ کر استقبال کیا اور بہت سا نقد مال و جنس اور ہاتھی نذر دیے۔ اور اسے جون پور پہنچا دیا۔

بہلول لودی کا جون پور پر حملہ

سلطان بہلول نے ان لڑائیوں کا قصہ یکسر ختم کرنے کے لیے جون پور کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ سلطان حسین بھی جون پور سے نکل کر بھرائچ کی راہ قنوج پہنچا اور وہاں رہیب کے کنارے سلطان بہلول سے مقابلہ کیا۔ حسب سابق اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی اور لودیوں نے اس کی بادشاہی کا سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔

سلطان حسین کی بیوی ملکۂ جہاں بی بی خونترا جو علاؤالدین کی بیٹی تھی لودیوں کے ہاتھ گرفتار ہوگئی۔ بہلول نے اُسے بڑی عزت و عفت کے ساتھ رکھا اور جب اس نے دوبارہ جون پور پر حملہ کیا تو وہ کسی تدبیر سے نکل کر اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔

---

[1] پٹنہ (عظیم آباد) دریائے گنگا کے کنارے بدھوں کی مشہور زیارت گاہ گیا سے ۷۵ میل پر ہے۔ قدیم ہندو دور کا مشہور شہر پاٹلی پترا جو مگدھ دیس کا پایۂ تخت رہ چکا ہے اسی مقام پر آباد تھا۔ مغل دور میں یہ حاکم نشین جگہ تھی۔ اورنگ زیب کے پوتے عظیم الشان نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں اس کا نام عظیم آباد رکھا۔ شہر تین آبادیوں پر مشتمل ہے پٹنہ، بانکی پور، اور داناپور۔ پٹنہ قدیم شہر ہے یہ تینوں مقام دو دو میل کے فاصلہ پر ہیں۔ اس وقت اس کی آبادی ڈیڑھ پونے دو لاکھ ہوگی۔ پٹنہ کا بازار وسیع ڈیڑھ دو میل لمبا ہے۔ یہاں "مدرسہ مسجد" کے نام سے ایک مسجد ہے۔ دریا کے کنارے بڑی عمدہ عمارت ہے۔ نواب سیف خاں اور نواب ہیبت جنگ کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کا مادۂ تاریخ ہے "مجموعۂ خیر دنیا"۔ سکھوں کے آخری گورو گوبند سنگھ صاحب متوفی ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء کی جائے پیدائش ہے۔ ان کی مولدگاہ اب "ہرمندر" کہلاتی ہے اور سکھوں کی زیارت گاہ ہے۔ شہر سے باہر شیر شاہ کی مسجد پٹنہ کی تمام عمارتوں میں قدیم عمارت ہے۔ ایک بزرگ شاہ ارزاں کی درگاہ بھی زیارت گاہ ہے۔ یہ بزرگ پشاور کے رہنے والے تھے فرخ سیر کے زمانہ میں یہاں آکر بس گئے، ان کے علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ فرخ سیر نے اُن کی درگاہ کے مصارف کے لیے پچاس ہزار سالانہ کے اوقاف مقرر کیے تھے جو انگریزوں کے عہد تک بھی جاری رہے، اب نہیں معلوم کیا صورت ہے۔ ایک عجیب و غریب عمارت گودام غلہ ہے گنبد نما عمارت ہے جس کی بلندی نوے فٹ اور اندرونی قطر ایک سو دس فٹ ہے۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں قحط کے زمانہ کے لیے غلہ جمع کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اس میں ۳۵ لاکھ من غلہ ذخیرہ ہو سکتا ہے لیکن زمانہ تعمیر سے اب تک اس میں غلہ جمع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے باہر کی طرف چکر دار زینہ ہے اس چھت پر سے سارے پٹنہ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور دلچسپ جگہ گلزار باغ ہے جس میں انگریزی حکومت نے افیون کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ بانکی پور کا اصل نام باقی پور ہے، مشہور "پٹنہ لائبریری" اسی جگہ ہے۔ یہ کتب خانہ خان بہادر مولوی خدا بخش صاحب کا قائم کردہ ہے جو ۱۹۱۰ء میں فوت ہوئے۔ اس لائبریری میں عربی فارسی کی قدیم خوش خط اور مطلا کتابیں بکثرت ہیں۔ کئی ایک کتابیں نایاب اور نوادرات میں سے ہیں، بعض کتابوں پر بادشاہوں کی دستخطی یادداشتیں بھی درج ہیں۔ خان بہادر حیدر آباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ان کے کتب خانہ کی فہرست اس زمانہ میں پانچ چھ سو صفحات پر طبع ہوئی تھی۔ ہندوستان کے مشہور مدبر سید علی امام بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے، مولوی قادری شاہ سلیمان صاحب پھلواری کے سجادہ نشین کے وعظ و تقریر کی بھی بڑی شہرت رہی ہے۔ پھلواری پٹنہ سے ۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ شاہ صاحب کا ایک لکچر جو انھوں نے ندوۃ العلماء میں دیا تھا رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۳۴۳ھ کے پرچہ میں نظر سے گزرا ہے۔

سلطان بہلول نے جون پور پہنچ کر قبضہ کر لیا اور وہاں مبارک خاں نوخانی کو متعین کر کے بدایوں آیا۔ لیکن جیسے ہی بہلول جون پور سے رخصت ہوا سلطان حسین موقع پا کر جون پور میں داخل ہو گیا اور بہلول کے امیر وہاں سے بھاگ کر قطب خاں کے پاس مہجولی چلے گئے اور سلطان حسین سے معالحت کی گفت و شنید کرتے رہے۔ اس اثنا میں ان کی کمک کے لیے سلطان بہلول نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو روانہ کیا اور خود بھی اس کے پیچھے جون پور کی طرف کوچ کر دیا۔

جون پور پر قبضہ بہلول کی آمد سے سلطان حسین گھبرا کر بہار چلا گیا۔ جب بہلول قصبہ ہلدی میں پہنچا تو اسے قطب خاں کے انتقال کر جانے کی اطلاع ملی۔ بہلول نے اپنے چچا کے مراسم تعزیت ادا کیے اور اس کے بعد جون پور میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا۔

بہلول نے جون پور کے تخت پر اپنے بیٹے باربک کو بٹھایا اور خود کالپی چلا گیا۔ یہ علاقہ اپنے بھتیجے اعظم ہمایوں کو جس کا اصل نام خواجہ بایزید تھا تفویض کیا۔ وہاں سے دہل پور پہنچا وہاں کے راجہ سے کئی من سونا نذرانہ لے کر باری سے ہوتا ہوا رنتھنبور کے علاقہ پالھی پور گیا اور اُسے پامال و غارت کر کے دہلی لوٹ آیا۔

کچھ دن بعد بہلول نے حصار فیروزہ کا سفر کیا اور وہاں مختصر سے قیام کے بعد دہلی واپس آ گیا۔

دہلی سے سلطان نے گوالیار کی طرف بھی کوچ کیا۔ وہاں کے راجہ مان سے اس وقت کے مروجہ اسّی لاکھ ٹکے پیش کش وصول کر کے اور گوالیار کی حکومت اسی کے نام بحال کر کے واپس ہوا۔

سلطان بہلول لودی کی وفات سلطان بہلول گوالیار سے اٹاوہ کی راہ دہلی واپس جانا چاہتا تھا لیکن اُسے صحیح سلامت دہلی واپس جانا نصیب نہیں ہوا جب وہ قصبہ سکیٹ میں پہنچا تو بیماری اس کے لیے سوہانِ روح بن گئی۔

سلطان بہلول[۱] نے ۸۹۴ھ میں اڑتیس سال آٹھ مہینے آٹھ دن حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔

---

[۱] سلطان بہلول کا نسب نامہ مختصراً ہم لکھ آئے ہیں، مزید تفصیل درج ذیل ہے:

بہلول بن کالا بن ملک موجی برادر ملک بہرام بن لیسین بن ملک شاہو بن اسحاق بن عمر بن بزنگی بن سپانی بن لودی بن مسماۃ منو بی بی دختر شیخ پنٹ و زوجہ شاہ حسین بن شاہ معز الدین محمود بن جمال الدین حسین بن سلطان بیرام غور بن سلطان جلال الدین بن فریدن بن بیمتن بن سلطان اقبال بن طغرل بن سلطان بزرگ بن جمشید تگین بن بہمن بن افراسیاب بن طہماسپ بن فریدوں رشید بن اسفندیار بن طغرل تگین بن داراب بن نعال بن نور بن اسکندر بن تماسب بن خسرو بن منذر بن اتیام بن کاؤس بن زہراب بن کامیاب بن گودرز بن قرامان بن سلامان بن جمشید بن ہرمز بن قباد بن بیرام بن مناسب بن تورح بن زمرزد بن آذردشت بن ارسلان بن ضحاک بن ماران بن اش بن ارم بن سام بن مہتر نوح علیہ السلام۔

یہ نسب نامہ پٹھانوں کے حاشیہ نشین مورخوں کی تاریخوں سے مرتب کیا گیا ہے چنداں قابل اعتبار نہیں۔ بہلول کا چوتھا مورث ملک شاہو تاجر تھا۔ افغانستان سے ہندوستان اسباب تجارت لایا کرتا تھا۔ وہ مرا تو اس کا لڑکا لیسین یہی کام کرتا رہا۔ اس کے تین لڑکے ملک بہرام، ملک محمود، ملک موجی یہی کام کرتے رہے۔ ملک بہرام ان کا پیشوا کار تھا۔ ہندوستان کے امراء سے اس کی جان پہچان ہو گئی ایک بار اپنے بھائیوں سے ناراض ہو کر حاکم ملتان کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ اس کا بھائی بھی فیروز شاہ کے زمانہ میں جمعدار کے عہدہ پر مامور

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

قطعۂ تاریخ:-

به هشتصد و نود و چهار رفت از عالم | خدیو ملک ستان و جہاں کشا بہلول
به تیغ ملک ستاں بود نیک دفع اجل | بود محال به شمشیر و خنجر معقول

سلطان سکندر بن بہلول لودی

سلطان بہلول لودی کے انتقال کی خبر جب اس کے بیٹے نظام خاں کو ملی تو وہ اُسی وقت دہلی سے کوچ کر کے قصبہ جلالی میں لشکر سے آملا اور باپ کی نعش دہلی کو روانہ کی۔

سکندر کی تخت نشینی نظام خاں نے جمعہ کے دن سلطان فیروز کے قصر میں جو کالی ندی کے کنارے ہے اپنا خطاب سلطان سکندر رکھ کر تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔ مشہور ہے کہ جب وہ دہلی سے چلنے لگا تو حضرت شیخ سماء الدین[1] کنبو کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ حضرت شیخ جمالی کے پیر تھے اور اس عہد کے بڑے عالم و بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ شاہزادہ نے ان سے "اسعدک اللہ" کے معنی پوچھے۔ اُنھوں نے فرمایا "تجھ کو اللہ تعالیٰ نیک بخت کرے"۔ شاہزادہ نے عرض کیا "زبان مبارک سے تین مرتبہ یہی ارشاد فرمائیے"۔ شیخ نے تین بار اس کی تکرار کی تو شاہزادہ نے اُٹھ کر کہا "میری مراد بر آئی" اور شیخ سے اپنے لیے دعا کرا کے لشکر کی طرف گیا۔

باربک شاہ سے مقابلہ جب سلطان سکندر کی بادشاہت اچھی طرح جم گئی تو اس نے دہلی سے راپڑی اور اٹاوہ کی طرف کوچ کیا۔ اس علاقہ میں وہ سات ماہ تک ٹھہرا رہا اور اس دوران میں اپنے بھائی باربک شاہ سلطان جون پور کے پاس اسمٰعیل خاں نوحانی کو مصالحت کا پیغام دے کر بھیجا۔ خود بتیالی کے حاکم عیسیٰ خاں پر حملہ کر دیا۔ مقابلہ میں عیسیٰ خاں نے زخمی ہو کر اطاعت کر لی لیکن وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور مر گیا۔ بتیالی کا راجہ رائے گنیش جو باربک شاہ کا حامی تھا سکندر سے مل گیا اور سکندر نے اسے بتیالی کی حکومت پر بحال رکھا۔

(بقیہ حاشیہ بہلول کا نسب نامہ صفحہ گذشتہ) ہوا جب خضر خاں اور ملو اقبال کی لڑائی ہوئی تو ملو اقبال خاں بہرام کے بھتیجے ملک شہ کے ہاتھ سے مارا گیا اور خضر خاں نے ملک شہ کو سرہند کی حکومت عطا کر دی۔ اس کے پاس افغان جوق در جوق آکر ملازم ہو گئے اور اس وقت سے ہندوستان کے امور سلطنت میں ان کا اثر و نفوذ شروع ہوا۔

سلطان بہلول پابند شریعت اور سادگی پسند تھا۔ علماء و مشائخ کا احترام کرتا تھا۔ سخت کوش اور منصف مزاج تھا لیکن پٹھانوں کی دغا اور عہد شکنی کی صفت اس میں بھی تھی۔

[1] شیخ سماء الدین سہروردی سے مراد ہے، یہ مخدوم جہانیاں کے پوتے سید کبیر الدین اسماعیل کے خلیفہ تھے، علوم ظاہری و باطنی دونوں پر عبور حاصل تھا۔ رائپور اور بیانہ میں عرصہ تک مقیم رہے پھر دہلی آکر متوطن ہوئے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے اور بغیر علاج ہی بصارت لوٹ آئی۔ "مفتاح الاسرار" ان کی تصنیف ہے۔ شیخ فخر الدین عراقی کی لمعات پر بڑے عمدہ حواشی لکھے ہیں سلطان بہلول اور سلطان سکندر شیخ کے معتقد تھے۔ سکندر کے زمانہ میں ۷، جمادی الاول سنہ ۹۰۱ھ میں وصال فرمایا۔ ان کی کرامات بڑی مشہور ہیں۔

باربک شاہ مصالحت پر راضی نہیں ہوا اور لشکر لے کر جون پور سے قنوج آیا۔ اسی جگہ دونوں بھائیوں میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باربک کا طرف دار امیر مبارک خاں نوخانی گرفتار ہو گیا اور باربک بدایوں بھاگ گیا۔ سکندر نے پیش قدمی کر کے بدایوں کا محاصرہ کر لیا۔ باربک مجبور ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سکندر نے باربک کا اچھی طرح سے خیر مقدم کیا اور اسے تسلی دلاسا دے کر اپنے ساتھ جون پور لے گیا۔ حسب سابق اسے مملکت شرقی کا حکمران بنا دیا لیکن جون پور کے سارے پرگنے اپنے امیروں میں تقسیم کر دیئے اور ہر جگہ اپنی فوج متعین کر دی۔ کالپی سے اعظم خاں ہمایوں کو معزول کر دیا۔

اس انتظام کے بعد سکندر چھترہ گیا اور وہاں سے گوالیار پہنچا۔ خواجہ محمد علی فرملی کو خلعت خاص دے کر اپنا وکیل بنایا اور اسے راجہ مان کے پاس بھیجا۔ راجہ نے بھی اظہار اطاعت کے لیے اپنے بھتیجے کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور وہ بیانہ تک بادشاہ کے ساتھ رہا۔

بیانہ کی تسخیر

جب سکندر شاہ بیانہ پہنچا تو سلطان شرق حاکم بیانہ جو سلطان احمد جلوانی کا بیٹا تھا حاضر خدمت ہوا اس نے قلعہ و بیانہ کی کنجی سکندر کے گماشتوں کے حوالہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی اور بیانہ واپس جا کر قلعہ بند ہو گیا۔

یہاں سے سلطان سکندر آگرہ گیا۔ جہاں سلطان الشرق کا عزیز ہیبت خاں جلوانی موجود تھا۔ وہ سکندر کی سرحد پر قلعہ آگرہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ سکندر نے چند امیروں کو آگرہ پر متعین کیا اور خود بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔

۸۹۷ھ میں جب سلطان الشرق بالکل ہی مجبور ہو گیا تو ہتھیار ڈال دیے اور پناہ طلب کر کے قلعہ بیانہ سلطان کے حوالے کر دیا۔ سکندر نے بیانہ کی حکومت خان جہاں فرملی کے حوالے کر دی۔

بچگوتی قوم کی بغاوت

اسی سال جون پور میں بچگوتی قوم نے بغاوت کی اور تقریباً ایک لاکھ سوار اور پیادے جمع کر کے فساد برپا کر دیا۔ ان کی سرکوبی کے لیے سکندر نے جون پور کا رخ کیا۔ باربک نے آگے بڑھ کر سلطان کا استقبال کیا۔ یہاں سے سکندر کچھ دن کے لیے سیر و شکار کی غرض سے اودھ چلا گیا۔ پھر لوٹ کر جون پور کا قصد کیا۔

جب سکندر جنبھار کے قلعہ پر پہنچا تو سلطان حسین شرقی کے امیروں نے اس سے مقابلہ کیا۔ سکندر نے اُن کو شکست دے کر بھگا دیا، وہ قلعہ بند ہو گئے۔ سکندر نے ان کے محاصرہ کی فکر نہ کی بلکہ سیدھا الہ آباد کے قریب باریل چلا گیا اور اس علاقہ کو بُری طرح پامال کر کے کڑہ اور مانک پور کے راستہ دلمئو کا رُخ کیا۔ وہاں سے شمس آباد آیا وہاں وہ چھ ماہ تک ٹھہرا رہا پھر سنبھل جا کر شمس آباد کو لوٹ آیا۔

پٹنہ اور بہار پر فوج کشی

۹۰۰ھ میں برسات کے بعد سکندر شاہ نے پٹنہ پر لشکر کشی کی اور وہاں کے سرکشوں کی گوشمالی کر کے جون پور واپس ہوا۔ اس سفر میں اتنے گھوڑے مرے کہ دس میں سے بس ایک زندہ رہا۔ اس کے لشکر کو اس مشکل میں گرفتار دیکھ کر پٹنہ کے زمینداروں نے سلطان حسین شرقی کو عریضہ بھیج کر

بلایا۔ سلطان حسین ایک بڑی جمعیت فراہم کرکے سکندر پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔
جب سکندر کو اس کی خبر ملی تو وہ گنگا عبور کرکے جنبھار پہنچا اور وہاں سے بنارس[1] آیا۔ سلطان حسین نے

---

[1] بنارس۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں صوبہ الہ آباد کے تحت اس کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے "بارانسی جسے عام طور پر بنارس کہتے ہیں، دو دریاؤں یعنی برنہ اور آسی کے درمیان واقع ہے اس لیے اسے بارانسی کہتے ہیں۔ قدیم کتابوں میں اس کا نام کاشی لکھا ہے یہ شہر کمان کی شکل میں آباد ہے، جس میں سے دریائے گنگا چلہ کے طور پر گزرتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک بت خانہ تھا جس کا طواف کیا جاتا تھا۔ عرصۂ دراز سے یہ شہر ہندوستان کا علمی مرکز ہے۔ طالب علموں کے گروہ کے گروہ دور دراز مقامات سے یہاں تحصیل علم کے لیے آتے ہیں اور بے حد خلوص و محنت کے ساتھ علم حاصل کرتے ہیں۔ ۴۱۰ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اس شہر پر حملہ کیا۔ ۴۱۶ھ میں دوسرا حملہ کیا۔"

بنارس جونپور سے ۳۵ میل پر ہے۔ ہندوؤں کے سات تیرتھ مشہور ہیں (۱) اجودھیا، جہاں رام چندرجی پیدا ہوئے (۲) متھرا، جہاں سری کرشن جی نے جنم لیا (۳) مایا یعنی ہردوار (۴) کاشی (۵) کانچی جو دکن میں ہے (۶) اونتکا پوری یعنی اجین (۷) دوارا یعنی دوارکا (بحوالہ سفرنامہ رائے بہادر لالہ امین چند) ان سات تیرتھوں میں بنارس تیسرا اہم تیرتھ سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں غالباً اس سے زیادہ قدیم شہر نہیں ہوگا۔ ہندو اسے سورگ کا دروازہ کہتے ہیں اور مرنے سے پہلے وہاں اشنان کرنا ضروری سمجھتے ہیں، بدھ بھی بنارس کو مقدس جانتے ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے گوتم بدھ نے اپنا سب سے پہلا وعظ اسی جگہ کہا تھا اور اس کو مرکز بنا کر یہاں سے لنکا، جاپان، چین، برہما، تبت اور نیپال میں مبلغ بھیجے تھے۔ ابوالفضل نے بنارس پر محمود غزنوی کے حملہ کا ذکر کیا ہے۔ بداؤنی مصنف ہذا نے بنارس پر حملہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ دوسری تاریخوں میں سلطان محمد غوری کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے ۵۹۰ھ ۱۲۹۲ء میں بنارس پر حملہ کیا تھا اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ محمود کالنجر سے ہی واپس چلا گیا تھا۔

بنارس کی آبادی تین لاکھ سے زیادہ ہی ہوگی۔ مکانات عالی شان، عمارتیں خوش وضع ہیں، بازاروں میں بڑی گھما گھمی اور رونق رہتی ہے لیکن راستے بہت تنگ ہیں۔ بنارس کی چار چیزیں خطرناک ہیں: ایک حسین عورتیں، دوسرے مست سانڈ، تیسرے تنگ زینے، چوتھے مکار سنیاسی۔ چنانچہ مشہور ہے ؎

رانڈ، سانڈ، سیڑھی، سنیاسی ان سے بچے سو سیوے کاسی

بنارس مندروں کا شہر ہے، ہر جگہ مہادیو کے شوالے نظر آتے ہیں، وسط شہر میں وشیشر جی کا مشہور مندر ہے جو کاشی وشوناتھ یعنی کُل دنیا کے مالک کہلاتے ہیں اس کا گنبد سونے کا ہے۔ اس کے آگے پرانے مندر سے ملی ہوئی اورنگ زیب کی بلند و عالی شان مسجد ہے۔ اس مندر کو اورنگ زیب نے یہاں کے پجاریوں کی داراشکوہ کے ساتھ سازش کی وجہ سے منہدم کرا دیا تھا اور مسجد تعمیر کروائی تھی۔ مندروں کے اس شہر میں جو کل کا کل بت خانہ معلوم ہوتا ہے، اس مسجد کا بلند مینار انگشت شہادت کی طرح توحید کا اعلان کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مان مندر میں راجہ جے سنگھ کا رصد خانہ جنتر منتر ہے۔ اب تک اس کے آلات درست حالت میں رکھے ہوئے ہیں۔ دریا کے کنارے سنگین سیڑھیوں کے بیسیوں گھاٹ ہیں جن پر اشنان اور پوجا پاٹ ہوتا ہے۔ صبح صبح اشنان کا نظارہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی لیے "صبح بنارس" مشہور ہے۔ ساحل پر نیپالی مندر اور دہریرا کی مسجد قابل دید ہیں۔ مندر لکڑی کا ہے جس پر مرد عورت کی فحش تصویروں کی منبت کاری ہے مسجد کے مینار ڈیڑھ سو فٹ اونچے ہیں سنسکرت اور شاستروں کی تعلیم کا یہ مرکز رہا ہے۔ بنارس کے پنڈت ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ شیخ محمد علی ایرانی نے جن کا تخلص حزیں تھا بنارس اور وہاں کے برہمن زادوں کے متعلق کہا تھا ؎

از بنارس نروم معبد عام ست ایں جا ہر برہمن پسرے لچھمن و رام ست ایں جا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی یلغار کرتے ہوئے بنارس کا رخ کیا۔ لیکن ابھی بنارس سے ۱۸ کوس پر ہی تھا کہ سکندر برق بے اماں کی طرح اس کے سر پر جا گرا۔ راستہ میں پٹنہ کا راجہ سالباہن بھی سلطان حسین سے کٹ کر سکندر کے پاس آ گیا۔ یہ لڑائی بھی سلطان حسین ہار گیا اور پٹنہ کی طرف پا بردانستہ بھاگ نکلا۔ سکندر نے ایک لاکھ سواروں کے ساتھ اُس کا تعاقب کیا۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ سلطان حسین بہار کی طرف نکل گیا ہے۔ غرض سکندر نویں دن اس کے تعاقب سے لوٹ کر لشکرگاہ میں آ گیا اور بہار پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔

سلطان حسین کو جب بہار پر اس کی فوج کشی کی اطلاع ملی تو وہ بہار میں اپنے ایک نائب کو چھوڑ کر کھل گاؤں ضلع لکھنوتی چلا گیا۔ سکندر نے حملہ کر کے بہار پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ کر ترہٹ[۵۱] کو فتح کیا۔

سنہ ۹۰۱ھ میں خواجہ جہاں نے انتقال کیا اور اس کے بڑے بیٹے احمد خاں کو اعظم خاں ہمایوں کا خطاب ملا۔

ترہٹ میں سلطان سکندر حضرت شیخ شرف الدین[۵۲] یحییٰ منیریؒ کی زیارت کے لیے گیا۔ اُن کی زیارت سے فارغ ہو کر درویش پور میں آیا۔ وہاں سے شاہ بنگالہ علاؤالدین پر فوج کشی کی۔ بہار کے نواح میں علاؤالدین کا بیٹا دانیال اس کے مقابلہ پر آیا۔ آخر دونوں میں صلح ہو گئی اور اپنے اپنے ملک کی طرف واپس ہو گئے۔

قحط اور تنگدستی اس سال شاہی لشکر قحط و تنگدستی میں بڑی طرح مبتلا ہو گیا اور بادشاہ نے ہر طرف فرمان بھیج دیے کہ غلہ کی زکواۃ بند کی جائے۔ سکندر حدود بنگالہ سے لوٹ کر سارن[۵۳] پہنچا اور اس علاقہ کو

(بقیہ حاشیہ بنارس صفحہ گزشتہ) یہاں کے مشہور کالج کوئینز کالج اور ہندو کالج ہیں۔

شہر سے تین چار میل کے فاصلہ پر سارناتھ بدھ مذہب کی ایک عمارت ہے جو کسی بدھ بھکشو کا مرقد یا معبد تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ سارناتھ ہی وہ جگہ ہے جہاں مہاتما بدھ نے پہلا وعظ کہا تھا۔

۵۱ ترہٹ۔ ابو الفضل آئین اکبری میں صوبہ بہار کے تحت اسے ایک "سرکار" لکھتا ہے لیکن اس نے اس کا تلفظ "ترہٹ" کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "یہ مقام بے حد قدیم زمانہ سے ہندی علوم کا مرکز ہے، آب و ہوا عمدہ ہے، یہاں دہی ایک سال تک خراب نہیں ہوتا۔ اہیر اگر دودھ میں پانی ملاتا ہے تو غیب سے اُسے سزا ملتی ہے۔ یہاں کے بھینسے بڑے طاقتور ہوتے ہیں اور شیر پر حملہ کر دیتے ہیں۔ تالاب بکثرت ہیں ایک تالاب کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ اس کی گہرائی بے اندازہ ہے۔ بیس کوس تک نارنگی کے کھیت ہیں۔ بارش میں ہرن بارہ سنگھا اور شیر آبادی میں آ جاتے ہیں شہر والے ان کا شکار کر کے ہاتھ پیر توڑ کر ایک چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ بعد میں حسب ضرورت ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔"

۵۲ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ساتویں صدی کے بزرگ ہیں۔ شہر بہار سے جو اس وقت ضلع پٹنہ میں معمولی قصبہ ہے ساٹھ میل مغرب کی طرف منیر ایک قدیم بستی ہے۔ اس کا صحیح تلفظ پر پیش نہیں بلکہ زبر سے ہے۔ آپ اسی بستی کے رہنے والے تھے۔ قصبہ بہار میں آپ کا مزار ہے آپ کا اصل نام مخدوم شرف الدین احمد تھا۔ آپ کے مزار پر ہر سال عرس میں ہزاروں معتقدین جمع ہوتے ہیں۔ ان کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ صاحب قلم بزرگ تھے۔ مکتوبات و ملفوظات کے مجموعہ کا نام "معدن المعانی" ہے۔ اس کے علاوہ "ارشاد السالکین" "شرح آداب المریدین" ان کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔ وہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی ملاقات کے لیے گئے تھے لیکن اُن کا وصال ہو چکا تھا۔ جب وطن واپس ہوئے تو بہار میں کوہ راج گیر پر عرصہ تک ریاضت کی۔ صاحب معارج الولایت کی ایک روایت کے مطابق ان کی وفات سنہ ۷۸۲ھ میں فیروز شاہ کے عہد میں ہوئی۔

۵۳ سارن۔ اکبر کے زمانہ میں یہ صوبہ بہار کی سرکار تھا جس کے تحت ۱۷ پرگنے تھے۔ (ابو الفضل آئین اکبری)

تقسیم کرکے اپنے امیروں کے حوالے کردیا۔ شاہی لشکر سارن سے براہ بہلی گڑھ جون پور پہنچ گیا جہاں چھ ماہ تک ٹھہرا رہا۔

جون پور سے سکندر نے دوبارہ پٹنہ پر لشکر کشی کی اور ۹۰۴ھ میں پٹنہ سے باندھوگڑھ کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کرڈالا۔ البتہ وہاں کے مستحکم قلعوں کو ناقابل تسخیر سمجھ کر فتح کیے بغیر ہی جون پور واپس چلا گیا۔

امیروں کی سازش

جون پور کے امیروں میں کسی کھیل کے دوران اختلاف ہوگیا اور قتل و خون تک نوبت پہنچ گئی۔ سکندر اپنے ان جھگڑالو امیروں سے بدگمان ہوگیا اور اپنی حفاظت کے لیے خاص خاص بھروسہ کے لوگوں کو متعین کردیا۔ یہ محافظ دستہ ہتھیار باندھے رات بھر بادشاہ کی حفاظت کرتا تھا۔

سکندر نے ناراض ہوکر جن امیروں کو معزول کردیا تھا انھوں نے ایکا کرکے سلطان بہلول کے بیٹے فتح خاں کو سلطنت کے لیے اکسایا۔ فتح خاں سادہ لوح آدمی تھا، اس نے اپنی ماں، شیخ طاہر اور بادشاہ کے معتمد امراء سے اس سازش کا ذکر کردیا اور ترغیب دینے والے امیروں کے نام بھی ظاہر کردیے۔ ان سب نے فتح خاں کو اس خام خیالی سے منع کیا اور اسے اچھی طرح سمجھا بجھا کر ایسے کسی اقدام سے روک دیا اور خود کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے سلطان سکندر سے بھی اس کا تذکرہ کردیا۔ سکندر نے بڑی حکمتِ عملی سے کام لے کر ان مفسد امیروں کو منتشر کردیا۔

حاکم دہلی کی سرکشی

۹۰۵ھ میں سکندر سنبھل آکر ٹھہرا۔ پورے چار سال یہاں سیر و شکار، تفریح اور عیش و عشرت میں گزار دیے۔

سکندر کو عیش و عشرت میں مشغول دیکھ کر ۹۰۵ھ میں دہلی کے حاکم اصغر نے بغاوت کردی۔ سکندر نے سنبھل سے ماچھی وارہ کے حاکم خواص خاں کے نام فرمان بھیجا کہ "اصغر کو گرفتار کرکے ہمارے حضور میں بھیج دو۔" خواص خاں فرمانِ شاہی کی تعمیل میں روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اصغر نے خود ہی سنبھل پہنچ کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔ اس کی جگہ سلطان نے خواص خاں کو دہلی کا حاکم مقرر کردیا۔

اسی سال حاکم بیانہ خان خاناں فرملی فوت ہوگیا۔ کچھ دنوں تک بیانہ پر اس کے بیٹے عماد اور سلطان متعین رہے پھر ان دونوں کو خدمتِ شاہی میں طلب کرلیا گیا اور بیانہ کا قلعہ خواص خاں کے سپرد ہوگیا۔ آگرہ صفدر خاں کو تفویض کیا گیا۔

دھول پور کی مہم

خواص خاں نے حاکم میوات عالم خاں نوخانی اور خان خاناں نوخانی کو اپنی کمک پر ساتھ لے کر دھول پور[1] پر فوج کشی کی۔ دھول پور کے راجہ نے جم کر مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی ایک بڑی

---

[1] دھول پور۔ آگرہ سے ۳۴ میل پر یہ ایک ریاست کا صدر مقام ہے۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں سرکار آگرہ کے تحت اسے ایک محال لکھا ہے اور صرف اتنا لکھا ہے کہ "یہ ایک قلعہ دریائے چنبل کے کنارے ہے۔" دریائے چنبل کے کنارے اس کی آبادی دراصل راجہ دھولن کی یادگار ہے۔ چنبل حاصل پور مالوہ سے نکل کر کالپی کے قریب جمنا میں مل جاتی ہے۔ دھولن نے اس شہر کو گیارھویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا۔ ۱۵۰۱ء میں سلطان سکندر لودی نے اس پر قبضہ کرلیا۔ سولھویں صدی عیسوی میں ہمایوں نے چنبل کے سیلاب سے حفاظت کی خاطر آبادی کو شمال کی طرف منتقل کردیا۔ اس کی موجودہ حیثیت ایک قصبہ کی ہے۔ آبادی تقریباً بیس ہزار ہوگی۔ ہندی اور

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تعداد شہید ہوئی۔ جب سکندر کو خبر ملی تو وہ لشکر لے کر اُن کی کمک پر دھول پور آیا۔ شاہی لشکر کی آمد پر دھول پور کا راجہ مانک دیو قلعہ چھوڑ کر گوالیار بھاگ گیا اور اس علاقہ میں لوٹ مار غارت گری شروع کر دی۔

سکندر ایک ماہ تک دھول پور میں رہا پھر وہاں سے کوچ کر کے گوالیار پہنچا اور وہاں آدم لودی کو متعین کر کے چنبل ندی کو عبور کیا اور مینڈکی کے کنارے لشکرگاہ قائم کی۔ وہاں آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے لشکر میں وبا پھیل گئی۔ اس اثنا میں گوالیار کے راجہ نے صلح کر لی اور بادشاہ کے لشکر سے بھاگے ہوئے امیروں سعید خاں، بابو خاں اور رائے گنیش وغیرہ کو جو گوالیار میں پناہ لیے بیٹھے تھے اپنے قلعہ سے باہر کر دیا اور اپنے بڑے بیٹے کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلطان نے اُسے گھوڑا اور خلعت عطا کر کے واپس کر دیا۔ وہ وہاں سے آگرہ چلا گیا اور دھول پور کی حکومت مانک دیو کے نام دوبارہ بحال کر دی۔ سکندر نے پورا موسم برسات آگرہ ہی میں بسر کیا۔

۹۱۰ھ میں آگرہ سے کوچ کر کے قلعہ مندرائل پر لشکر کشی کی۔ وہاں کے رائے نے امان لے کر قلعہ چھوڑ دیا۔ سکندر نے قلعہ میں داخل ہو کر وہاں کے سارے بُت خانے توڑ دیے۔ وہاں سے لوٹ کر دھولپور کے قلعہ کو از سرِ نو تعمیر کرایا اور وہاں سے آگرہ چلا گیا۔

آگرہ پہنچ کر سلطان سکندر نے اپنے تمام امیروں کو لشکر سے چھٹی دے کر اُن کو متعلقہ جاگیروں پر رخصت کر دیا۔

سید محمد مہدی

اسی سال (۹۱۰ھ) میں سید محمد جون پوریؒ[1] نے انتقال فرمایا۔ یہ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی کامل تھے، اُنھوں نے امام مہدی ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ جب وہ حج سے لوٹ رہے تھے تو شہر فرہ

(بقیہ حاشیہ دھول پور صفحہ گزشتہ) اُردو عام طور پر بولی جاتی ہے۔ ریاست کے دفتر اور راجہ کے محل نئی آبادی میں ہیں۔ شہر سے باہر مسجدوں سراؤں اور مقبروں کے آثار ہیں۔ صادق محمد خاں کا مقبرہ قدیم صناعی کا نمونہ ہے یہ اکبر کا جرنیل تھا اور ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ء میں فوت ہوا۔ دو میل کے فاصلہ پر جھیل مچ کنڈ ہے جس کے گرد چند عمدہ مندر ہیں۔ مویشیوں اور گھوڑوں کی تجارت کا مرکز ہے۔ دھولپور کا حکمران خاندان بروليا گوت کے جاٹ ہیں جو پہلے گوہد کے رانا کہلاتے تھے گوالیر بھی ان کے ماتحت تھا۔ مرہٹوں نے اس ریاست کو ختم کر دیا تھا۔ انگریزوں کے عہد میں رانا کیرت سنگھ نے دوبارہ یہ ریاست قائم کی۔ اس کے بیٹے بھگوت سنگھ نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ اس کا پوتا رانا نہال سنگھ ۱۸۷۳ء میں انگریزی رسالہ کا میجر تھا۔ آخری فرمانروا رانا رام سنگھ ایک علم دوست آدمی گزرا ہے۔

ریاست کا رقبہ ۱۱۹۷ میل ہے، آبادی تین لاکھ کے قریب ہے جس میں مسلمان صرف ۵ فیصد ہیں۔ آمدنی نو لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ یہاں کا سنگ سرخ مشہور ہے۔

[1] سید محمد جون پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام یوسف تھا۔ ایک مجذوب شیخ دانیال کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ سید محمد کے متعلق مشہور ہے کہ حالت سکر میں "انا مہدی" کا نعرہ لگایا تھا لیکن ہوش میں آنے کے بعد دعویٰ مہدیت سے توبہ کر لی اور مہدی موعود کے آنے کا اقرار کیا لیکن جہلا نے ان کو مہدی موعود بنا لیا اور ایک نیا فرقہ مہدوی کے نام سے پیدا ہو گیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے جو اپنے آپ کو مہدی کہا تھا اس سے مہدی موعود مراد نہیں تھا بلکہ صرف ہادی اور رہنما کہنا چاہتے تھے۔ حضرت نے اپنے پیرؤں کو بہت سمجھایا اور مہدی کہنے سے منع کیا لیکن وہ اس عقیدہ پر اسی طرح قائم رہے۔ سید محمد نے اصلاحی تحریک بھی شروع کی تھی اور اس سلسلہ میں ارباب اقتدار سے ان کی ٹکر بھی ہوئی۔ ایک قول کے مطابق ان کی وفات ۱۰۴۲ھ میں ہوئی۔ بداؤنی کا ۹۱۰ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی تاریخ وفات قاضی حسین زرگر قندھاری نے لکھی ہے:

گفتا کہ بروز شیخ کن استفسار

شیخ مبارک نے مادۂ تاریخ نکالا — "مقتداء مہدی"

تباہ کن زلزلہ

۹۱۱ھ ۳ صفر کو سارے ہندوستان میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ پہاڑ تک دہل گئے اور بڑی بڑی عمارتیں زمین دوز ہو گئیں، جا بجا زمین شق ہو گئی اور درخت اُکھڑ کر دور دور تک جا گرے۔ لوگ یہ دیکھ کر سمجھے کہ بس قیامت آ گئی۔ بابر کی تاریخ اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دن یہ زلزلہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی آیا تھا۔ اس زلزلہ کی تاریخ لفظ "قاضی" سے نکلتی ہے۔

قطعہ: در عہد واحدی عشر از زلزلہ ہا

گردید سواد آگرہ چوں مرحلہا

با آنکہ بناہاش بسے عالی بود

از زلزلہ شد عالیہا سافلہا

کہتے ہیں از آدم تا ایں دم ایسا زلزلہ کبھی نہیں آیا۔

اونت گڑھ اور نرور کی فتح

۹۱۲ھ میں سلطان سکندر نے اونت گڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ میں سلطانی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے لیکن فتح سلطان کو حاصل ہوئی۔ وہاں کے محصور ہندوؤں کو قتل کر دیا گیا، جو بچے وہ اپنے اہل و عیال سمیت خود جل کر مر گئے۔ سلطان نے وہاں کے بُت خانے توڑ کر مسجدیں تعمیر کرائیں۔

۹۱۳ھ میں نرور کے قلعہ پر چڑھائی کی۔ راستہ میں جلال خاں لودی نے اپنے سواروں اور پیادوں کی ایک بڑی جمعیت بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کی۔ سکندر کو اس کی یہ کارگزاری کہ اتنی بڑی جمعیت اس نے اپنے گرد اکٹھی کر لی تھی کچھ پسند نہ آئی اور اس نے اس جمعیت کو منتشر کر کے اسے گرفتار کر لیا اور قلعہ اوسکہ میں بھیج دیا۔ نرور کے محصورین نے امان مانگ کر مصالحت کر لی۔

نعمت خاتون

۹۱۴ھ میں نرور کے اطراف ایک اور حصار تعمیر کرایا تاکہ قلعہ اور زیادہ مستحکم ہو جائے۔ اسی دوران میں قطب خاں کی بیوی نعمت خاتون سکندر سے ملنے کے لیے آئی۔ سلطان نے شہزادہ جلال خاں کو دو سو گھوڑے اور پندرہ ہاتھی دیے۔ نعمت خاتون کے ساتھ اسے کالپی کو روانہ کیا اور وہ علاقہ شہزادہ کی جاگیر میں دے دیا۔

آگرہ کو واپسی

۹۱۵ھ میں سلطان، لہار سے کوچ کر کے ہتکانت اور وہاں سے آگرہ روانہ ہوا۔ راستہ میں جگہ جگہ تھانے مقرر کیے۔ اس کے آگرہ پہنچنے کا مادۂ تاریخ ہے

"وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ"

اسی سال مالوہ کے سلطان ناصر الدین کا نواسہ اپنے نانا کے خوف سے بھاگ کر سکندر کے پاس پناہ لینے آیا۔ بادشاہ

نے چندیری اس کی جاگیر میں عطا کیا اور شہزادہ جلال خاں کو اس کی مدد اور تعاون کی تاکید کی۔
۹۱۵ھ ہی میں سکندر نے آگرہ سے دھولپور تک جگہ جگہ عمارتیں بنوائیں اور باغات لگوائے تاکہ اس نواح میں سیر و شکار اور آرام کرنے کی سہولتیں موجود رہیں۔

محمد خاں ناگوری کی اطاعت

اسی سال محمد خاں ناگوری نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اس کی ساری قوم پہلے ہی سے سکندر سے مل گئی تھی اور اب اس کے لیے اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک میں سلطان سکندر کے نام کا خطبہ بھی شروع کرا دیا اور بغیر کسی جنگ کے یہ علاقہ سکندر کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

جس وقت سکندر اونت گڑھ کی مہم پر گیا تھا اس نے خان خاناں فرملی کے بیٹے سلیمان کو نوپہ کی طرف روانہ کیا تھا لیکن یہ تعیناتی اس نے قبول نہیں کی تھی اور ٹال مٹول کرتا رہا تھا۔ اس سال سکندر نے اس حکم عدولی کے جرم میں اسے معزول کر دیا البتہ اندری کرنال کا پرگنہ اس کی معاش کے لیے دے دیا۔ وہ اسی جگہ جا کر مقیم ہو گیا۔

چندیری کا الحاق

مالوہ کے سلطان محمود کی سلطنت رُو بہ زوال ہو چکی تھی۔ اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر بہجت خاں مالوی نے چندیری کو سلطان سکندر کے حوالہ کر دیا اور وہاں سکندر کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا۔ اس خوش خبری کے فرمان اور فتح نامے ہر طرف بھیجے گئے۔ سلطان سکندر نے سلطان ناصرالدین کے پوتے محمود خاں کو پہلے شہر چندیری میں نظر بند کر دیا تھا بعد میں چندیری اس کو تفویض کر کے اسے بحال کر دیا، البتہ احتیاط کے لیے اس پر اپنے گماشتوں کو متعین کر دیا۔

سید نعمت اللہ حسینی

چندیری کے انتظام کے بعد بادشاہ نے بیانہ کا سفر کیا اور وہاں کے علماء و فضلاء کی خدمت میں حاضری دی۔ بیانہ میں سید نعمت اللہ[1] حسینی سے جو بڑے مانے ہوئے بزرگ اور صاحبِ کشف و کرامات تھے سلطان سکندر کو بڑی عقیدت تھی، اکثر وہ ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

دولت خاں کی اطاعت

قلعہ رنتھنبور کے حاکم شاہزادہ دولت خاں نے بھی جو سلطان محمود مالوی کے ماتحت تھا علی خاں ناگوری کے ذریعہ سلطان کی ملازمت اختیار کر لی اور قلعہ کی کنجی حوالے کر دینے کا عہد کیا لیکن علی خاں ناگوری کی نیت کچھ بدل گئی اور اس نے اسے کنجی دینے سے روک دیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع مل چکی تھی لیکن اس نے علی خاں کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیا اور دولت خاں سے بیٹوں کی طرح شفقت و مہربانی کا سلوک کیا، خاص خلعت کئی گھوڑے اور ہاتھی اسے عطا کیے۔

---

[1] فرشتہ نے شاہ نعمت اللہ ولی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی دعا و برکت سے دکن کے فیروز شاہ بہمنی کے خان خاناں احمد کو فیروز شاہ کی سلطنت نصیب ہوئی اس نے اُن کی تاریخ وفات ۸۳۴ھ بمقام کوہ بیگی وو متور لکھی ہے لیکن بدایونی نے جن بزرگ کا نام لکھا ہے وہ سید نعمت اللہ حسینی ہے اور ۹۱۵ھ میں سلطان سکندر کی ان سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ یا تو ناموں اور تاریخوں میں اشتباہ ہے یا یہ دونوں مختلف بزرگ ہیں نعمت اللہ ولی قادریہ سلسلہ کے بزرگ تھے اور حضرت غوث اعظمؒ کے خاندان سے تھے۔

سلطان سکندر لودی کی وفات

سلطان نے قلعہ تھنکر پہنچ کر کچھ دن قیام کیا۔ وہاں سے سیر کرتے ہوئے قصبہ باری میں آیا۔ پھر آگرہ واپس ہو گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد سکندر بیمار ہو گیا اور اسی بیماری میں اتوار کے دن ۱۷ ذی قعدہ ۹۲۳ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کی تاریخ وفات کا مادہ ہے:

"وَجَنَّاتُ الفِردَوسِ نُزُلاً"

سلطان سکندر شاہ نے ۲۸ سال پانچ ماہ بڑی شان و شوکت سے سلطنت کی۔

سکندر لودی کی شعر گوئی

سلطان سکندر بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ شعر و سخن کا بھی اسے ذوق تھا۔ شاعروں سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا، اکثر شعراء اس کی مجلس میں حاضر رہتے تھے۔

سکندر خود بھی قدیم ہندی طرز میں شعر کہا کرتا تھا اور اپنا تخلص گلرخ رکھا تھا۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سروی کہ سمن پیرہن و گل بدنستش — روحی ست مجسم کہ دراں پیرہنستش
مشک ختن چیست کہ عد مماثت چین — در حلقۂ آں زلف شکن در شکنستش
گلرخ چہ کند جوہر دندان ترا وصف — ہم چوں در سیراب سخن در دہنستش
در سوزن مژگاں بکشم رشتہ جاں را — تا چاک بدوزم کہ دراں پیرہنستش

سلطان سکندر کے عہد میں ایک نامور شاعر برہمن بھی تھا جو باوجود کفر کے مروجہ علوم کی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا، حسب ذیل مطلع اسی کا کہا ہوا ہے، جسے اس نے مسعود بیگ کی زمین میں کہا ہے

دل خوں نشدی چشم تو خنجر نشدی گر
رہ گم نشدی زلف تو ابتر نشدی گر

عہد سکندری کے علماء

سلطان سکندر کے زمانہ کے علماء میں دہلی میں شیخ عبداللہ طلبنی اور شیخ عزیز اللہ طلبنی سنبھل میں تھے۔ یہ دونوں بزرگ ملتان کی بربادی کے وقت ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان میں علوم معقولات کی ترویج میں ان بزرگوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس سے پہلے علم منطق اور کلام میں شرح شمسیہ اور شرح صحائف بس یہ دو رسالے ہندوستان میں رائج تھے۔

شیخ طلبنی

استادوں سے سننے میں آیا ہے کہ شیخ عبداللہ کے حلقۂ درس سے چالیس سے زیادہ بڑے بڑے متبحر عالم جیسے میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری، میراں سید جلال بداؤنی وغیرہ فارغ ہو کر نکلے۔

کہتے ہیں سلطان سکندر بھی شیخ عبداللہ کے درس میں حاضر ہوا کرتا تھا اور دبے پاؤں آکر ادب سے ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا تھا تاکہ طلباء کے سبق میں خلل نہ پڑے۔ درس کے بعد سلام علیک کہہ کر دیر تک ان کی صحبت میں بیٹھا رہتا تھا۔

شیخ عزیز اللہ طلبنی دوسرے عالم شیخ عزیز اللہ طلبنی بھی بڑے رشد و ہدایت والے عالم تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا تیز اور ذہن خوب رسا تھا۔ مشکل سے مشکل منتہی کتابوں کو بغیر مطالعہ کے بآسانی پڑھا دیتے تھے۔

اکثر لوگوں نے امتحان کے طور پر ان کے سامنے اُلجھے ہوئے پیچیدہ سوالات رکھے لیکن اُنھوں نے ان سوالوں کو چٹکیوں میں حل کر کے دکھا دیا۔

ان کے تلامذہ میں میاں حاتم سنبھلی تھے۔ کہتے ہیں اُنھوں نے اپنی عمر میں شرح مفتاح کا تیس سے زیادہ اور مطول کا چالیس سے زیادہ مرتبہ بسم اللہ سے آخر تک درس دیا۔

شیخ الہدایہ ایک دوسرے صاحب تصانیف عالم جونپور کے شیخ الہدایہ تھے۔ اُنھوں نے فقہ کی ہدایہ پر چند جلدوں پر مشتمل شرح لکھی ہے۔ انھوں نے کافیہ کی جو شرح لکھی ہے اس کی تعریف تو زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے تفسیر مدارک وغیرہ پر حاشیئے لکھے ہیں جو اس زمانہ تک پڑھائے جاتے ہیں۔

سکندر نے ایک مرتبہ اپنے ملک کے تمام علماء کو جمع کیا۔ ایک جانب سے شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ اور دوسری جانب سے شیخ الہدایہ اور ان کے لڑکے بھکاری نے علمی مباحثہ کیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے دو بزرگ تقریر میں اور دوسرے دو تحریر میں سب سے فائق و ممتاز ہیں۔

شیخ عبداللہ کا انتقال ۹۲۲ھ میں ہوا۔ ان کا مادۂ تاریخ ہے:

"أُولٰئِكَ لَهُمْ دَرَجَاتُ الْعُلیٰ"

عہد سکندری کے شعراء اس زمانہ کے شاعروں میں ایک شیخ جمالی کنبوہ دہلوی تھے۔ سلطان سکندر ان کو اکثر اپنے شعر سنایا کرتا تھا۔ شیخ جمالی بڑے رنگا رنگ شاعر تھے، سیر و سیاحت بھی بہت کی تھی۔ مولانا جامی[1] کی خدمت میں بھی عرصہ تک رہے تھے اور شعر و سخن میں ان سے اصلاح لی تھی۔ ان کا نمونۂ کلام ہے:

ما را ز خاک کویت پیراہنی ست برتن
وآں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

ے

عشق را طی لسانی ست کہ صد سالہ سخن
دوست با دوست بیک چشم زدن میگوید

ان کی یہ غزل جو ہندی طرز میں کہی ہے بڑی وجد آور اور بہت مشہور ہے ے

---

[1] مولانا جامی۔ ان کے لقب عماد الدین اور نور الدین ہیں، نام عبدالرحمٰن۔ احمد جام زندہ پیل کی نسبت سے جامی تخلص کیا والد کا نام نظام الدین اور دادا کا شمس الدین تھا۔ سلسلۂ نسب امام اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد شیبانی سے ملتا ہے۔ آپ کی ۹۹ تصانیف ہیں۔

طال شوقی الی منازلکم ایها الغائبون عن نظری
روز و شب مونسم خیال شماست فاسئلوا عن خیالکم خبری

تذکرہ سیر العارفین شیخ جمالی نے سیر العارفین کے نام سے ہندوستان کے بزرگوں کے حالات پر ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔ یہ تذکرہ ہے تو خوب لیکن اسقام و اغلاط سے پاک نہیں۔ تذکرہ کی ابتدا حضرت خواجہ بزرگوار معین الحق والدین الاجمیری سے اور اس کا اختتام ان کے اپنے پیر شیخ سماء الدین کنبوی دہلوی پر ہوتا ہے۔
اس کے علاوہ نظم و نثر میں ان کی اور بھی چیزیں ہیں۔ ان کا دیوان آٹھ نو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

سلطان ابراہیم بن سکندر لودی

سلطان سکندر کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم امراء کے اتفاق سے تخت نشین ہوا۔ سلطان سکندر نے شہزادہ جلال خاں کو جون پور کی حکومت عطا کی تھی۔ امراء نے اسے بھی شریک سلطنت قرار دے دیا۔
اسی دوران میں خان جہاں خاں نوحانی راپری کا حاکم آگرہ آیا اور جلال خاں کو شریک سلطنت بنانے پر امیروں کو لعنت ملامت کی۔ پورب کے تمام امراء کے نام فرامین جاری کرائے کہ جلال خاں کو گرفتار کر کے دار الخلافہ کو روانہ کر دیں۔

جلال خاں کا دعویٰ بادشاہت جلال خاں جون پور سے کالپی پہنچا۔ وہاں ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کر کے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرایا اور اپنا خطاب سلطان جلال الدین رکھا اعظم ہمایوں سروانی کچھ عرصہ تک تو جلال خاں کا معاون بنا رہا لیکن بعد میں سلطان ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔
سلطان ابراہیم نے اسمٰعیل خاں، حسین خاں اور دوسرے شاہزادوں کو جو پہلے سے قید میں تھے، ہانسی کے قلعہ میں بھجوا دیا۔ ان کے لباس اور کھانے کا انتظام کرا کے دو دو خدمت گار ہر ایک کے لیے مقرر کر دیے۔

ابراہیم لودی کی لشکر کشی سلطان ابراہیم نے پورب کی طرف لشکر کشی کی اور بھون گاؤں پہنچا اور اس علاقہ کو پامال کرتا ہوا قنوج آیا۔ وہاں سے کئی ایک امیروں کی سرکردگی میں جلال خاں کے مقابلہ پر لشکر روانہ کیا۔

جلال خاں نے بھی تیس ہزار سواروں اور کثیر ہاتھیوں کے ساتھ آگرہ کا رخ کیا۔ سلطان ابراہیم کی طرف سے آگرہ کی حفاظت پر ملک آدم کاکر متعین تھا۔ اس کی مدد کے لیے اور بھی کئی ایک امیر پہنچ گئے۔

جلال خاں کا اظہار اطاعت امیروں نے جلال خاں سے تفصیلی گفت و شنید کر کے اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سلطان ابراہیم کے حق میں بادشاہت سے دستبردار ہو جائے اور کالپی اس کی جاگیر میں رہے۔ اس شرط پر امراء نے اس کے قصور معاف کرا دینے کی حامی بھری۔ جلال خاں اس بات پر راضی ہو گیا اور شاہی امتیاز چتر، آفتاب گیر اور نقارہ وغیرہ ملک آدم کو دے دیا۔ ملک آدم نے اٹاوہ کے قریب یہ چیزیں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں

اور جلال خاں کی سفارش کی۔

جلال خاں کا فرار

سلطان ابراہیم نے اس بات کو قبول نہیں کیا اور جلال خاں کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کردی۔ جلال خاں پریشان ہوکر گوالیار بھاگ گیا اور سلطان سکندر کے تمام امیروں نے جنھوں نے یہ رخنے پیدا کیے تھے سلطان ابراہیم کی اطاعت قبول کرلی۔ صرف ایک امیر میاں بھوہ ایسا تھا جسے بادشاہ نے معاف نہ کیا یہ سکندر کا نامی وزیر اور مشیر رہ چکا تھا۔ ابراہیم نے دلی عداوت کی وجہ سے اسے پابہ زنجیر ملک آدم کے حوالہ کردیا وہ اسی قید میں انتقال کرگیا۔ بادشاہ نے اس کے بیٹے کو باپ کا منصب اور عہدہ تفویض کردیا تھا۔

سلطان نے حاکم کڑہ اعظم ہمایوں سروانی کی کمان میں تیس ہزار سوار اور ایک سو ہاتھی گوالیار کی تسخیر کے لئے روانہ کیے۔ جب جلال خاں کو شاہی لشکر کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ گوالیار سے سلطان محمود مالوی کے پاس مالوہ چلا گیا۔

گوالیار کی تسخیر

شاہی فوج نے گوالیار کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت وہاں کا حاکم رائے مان سنگھ تھا جس نے اپنے باپ رائے بکرماجیت کو قتل کرکے حکومت حاصل کی تھی۔ وہ مسلمانوں کے حملہ کی مدافعت نہیں کرسکا اور قلعہ گوالیار کا زیریں حصار بادل گڑھ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ وہاں ایک کانسی کا بت تھا جس کی ہندو پوجا کرتے تھے ہمایوں نے وہ بُت سلطان کے پاس آگرہ روانہ کردیا۔ بادشاہ کے حکم سے اس بُت کو شہر دہلی کے دروازہ پر ڈال دیا گیا تھا۔ یہ بُت اس کتاب (منتخب التواریخ) کی تصنیف سے دس سال پہلے فتح پور لایا گیا تھا۔ میں نے (مُلا عبدالقادر بدایونی مصنف) اس بت کو دیکھا ہے۔ اس کے سامنے ناقوس اور گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔

اسی زمانہ میں سلطان ابراہیم اپنے اکثر امیروں سے بدظن ہوگیا مختلف مقامات پر تبادلے کرکے اُن کو منتشر کردیا۔

جلال خاں کا قتل

مالوہ میں جلال خاں اور محمود مالوی کے درمیان زیادہ دن نبھ نہ سکی اور جلال خاں مالوہ سے بھاگ کر کڑہ کتکہ کی طرف نکل گیا۔ اس جگہ گوند قبیلہ کے لوگوں نے اسے پکڑکر سلطان ابراہیم کے پاس روانہ کردیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو بھی دوسرے شاہزادوں کے ساتھ قلعہ ہانسی میں قید رکھا جائے، لیکن کسی دشمن نے اسے راستہ ہی میں قتل کردیا۔

اعظم ہمایوں کی گرفتاری

گوالیار پر اعظم ہمایوں برابر محاصرہ کیے ہوئے پڑا تھا۔ قریب تھا کہ اس کی کوششوں سے یہ مستحکم قلعہ فتح ہوجائے کہ عین وقت پر بادشاہ کی طلبی کا فرمان آگیا اور وہ محاصرہ اُٹھاکر آگرہ لوٹ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی بادشاہ نے اسے اور اس کے بیٹے فتح خاں کو قید کرلیا۔

اسلام خاں کی بغاوت

اعظم ہمایوں کا دوسرا بیٹا اسلام خاں کڑہ میں تھا۔ اسے باپ کی ساری دولت اور سازوسامان مل گیا۔ اس نے اس مال سے کڑہ میں ایک بڑی جمعیت منظم کرلی اور اس نواح کے امراء کو اپنا معاون بنالیا اور حاکم کڑہ احمد خاں پر حملہ کرکے اسے شکست دی۔

اعظم ہمایوں لودی کا بھائی احمد خاں ایک بڑے جتھے کا سربراہ تھا، سلطان نے اسے اور خان خاناں فرملی جیسے بڑے بڑے امراء کو اسلام خاں اور اس کے شریک باغی امیروں کے مقابلہ پر بھیجا۔ جب یہ شاہی لشکر قنوج کے قریب بانگرمؤ

کے قصبہ میں پہنچا تو اعظم خاں ہمایوں کے دستِ راست اقبال خاں نے گھات سے نکل کر اچانک ایسا بھرپور حملہ کیا کہ شاہی لشکر پراگندہ ہو گیا۔

بادشاہ نے احمد خاں کی کمک پر مزید فوج روانہ کی۔ باغی امیر بھی چالیس ہزار سوار اور پانچ سو ہاتھی لے کر مقابلہ پر آئے۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ عین لڑائی کے وقت بہار کی جانب سے نصیر خاں لودی نے آکر باغیوں پر حملہ کر دیا۔ باغی امیر دو سمتوں سے گھر گئے۔ دونوں طرف سے ان پر حملے ہو رہے تھے لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ آخر بڑی جانفشانی اور جدوجہد کے بعد شاہی لشکر ان کو شکست دے سکا۔ اس مقابلہ میں اسلام خاں مارا گیا اور سعید خاں قید ہو گیا۔

امیروں سے بدگمانی

امرائے شاہی نے اس بغاوت کو رفع کرنے کے لیے بڑی دیانت داری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا تھا لیکن ابراہیم کا دل اپنے امیروں کی طرف سے پھر بھی صاف نہ ہوا اور وہ ان سے اسی طرح بدظن رہنے لگا۔ سلطان کے اس رویہ سے امیر بھی برداشتہ خاطر ہو گئے اور ہر طرف سے بادشاہ کی مخالفت شروع ہو گئی۔

اعظم ہمایوں سروانی اور سکندر کا وزیر میاں بھوہ بڑے کارکرد اور پایہ کے امیر تھے۔ سلطان ابراہیم نے ان دونوں کو قید کر لیا اور وہ اسی قید میں مر گئے۔ میاں حسن فرملی ایک اور امیر تھا جسے سلطان ابراہیم کے اشارہ پر چندیری میں اوباش شیخ زادوں نے قتل کر دیا۔ دریا خاں لوحانی بہار کا حاکم اور خان جہاں لودی بھی بادشاہ کی دست درازیوں سے ڈر کر باغی بن بیٹھے۔ دریا خاں چند دن بعد مر گیا۔ اس کا بیٹا بہادر خاں جانشین ہوا اور وہاں کے تمام پرگنوں کے امیر اس کے ساتھ ہو گئے۔

بہادر خاں کی خود مختاری

بہادر خاں نے بہار میں ایک لاکھ سوار جمع کر کے سارے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور اپنا خطاب سلطان محمد رکھ کر بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سکہ اور خطبہ اپنے نام کا جاری کرا دیا۔ اس نے سنبھل تک فوج کشی کی اور مدت تک بہار اور اس کے نواح میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔

سلطنت مغلیہ کا محرک

اسی دوران میں لاہور سے دولت خاں لودی کا بیٹا خان خاناں آگرہ آکر خدمت شاہی میں باریاب ہوا لیکن وہ بھی بادشاہ کے رویہ سے خوفزدہ ہو کر اپنے باپ کے پاس بھاگ گیا۔ دولت خاں نے جب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بادشاہ کے چنگل سے کسی طرح محفوظ نہیں رکھ سکتا تو اس نے اُسے کابل بھیج دیا۔ یہی خان خاناں وہ شخص ہے جو ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کا محرک بنا۔ اس نے کابل جانے کے بعد ظہیر الدین بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا اور اسے لے کر ہندوستان آیا تھا۔ بعد میں اسی خان خاناں نے بابر سے اپنے باپ کی شکایتیں کر کے اس کا دل دولت خاں سے پھیر دیا تھا۔ اس قصہ کی تفصیل انشاء اللہ آگے بیان ہوگی۔ واضح رہے خان خاناں شیر شاہ کے عہد تک زندہ تھا اور اسی کی قید میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

بابر سے امیروں کی مراسلت

بہار میں سلطان محمد خاں کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک تمام امیر سلطان ابراہیم لودی سے بڑی طرح بگڑ گئے تھے اور اس کے خلاف سازشوں میں لگے

ہوئے تھے، چنانچہ ان امیروں نے جن میں دولت خاں اور اس کے بیٹے غازی خاں اور دوسرے بڑے بڑے امیر شامل تھے، عالم خاں لودی کے ذریعہ ظہیرالدین بابر کے پاس کابل میں عرضیاں لکھ لکھ کر بھیجیں اور اُسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

بابری لشکر کی یلغار

بابر نے پہلے اپنے چند امیروں کو عالم خاں کے ساتھ ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ان امیروں نے بہت ہی جلد لاہور اور سیالکوٹ وغیرہ فتح کر لیا اور تفصیلی حالات بابر کے پاس لکھ کر روانہ کیے۔ اس کی فتح کی تاریخ ہے ؎

ظہیرالدین محمد شاہ بابر — سکندر دولت و بہرام صولت
بہ دولت کرد فتح کشور ہند — کہ تاریخ آمدش فتح بدولت

بابر کا ہندوستان پر حملہ

جب بابر کو ان فتوحات کی امید افزا روداد وصول ہوئی تو وہ بھی متواتر کوچ کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے آکر اُتر گیا۔ اس پڑاؤ پر اس کا لشکر دس ہزار تھا۔

بابر کے حملہ کی خبر پاتے ہی دولت خاں اور غازی خاں اپنے عہد و پیمان سے منحرف ہو گئے اور تیس ہزار پٹھان سواروں کو لے کر قصبۂ کلانور پر قبضہ کر لیا اور بابر کے امیروں پر حملہ کرنے کے لیے لاہور کی طرف کوچ کر دیا۔ جب غازی خاں سیالکوٹ پہنچا تو بابر کا امیر خسرو قلعہ کو چھوڑ کر بابر کے لشکر سے جا کر مل گیا۔

سیالکوٹ کی تباہی

کچھ دن بعد بابر سیالکوٹ آیا اور اسے بری طرح تاخت و تاراج کر دیا۔ پوری طرح ویران کر کے اس کے بجائے دھول پور کو آباد کرایا۔ یہاں سے بابر نے عالم خاں کو دہلی پر حملہ کے لیے آگے بڑھایا۔ اس نے سلطان ابراہیم کے لشکر پر شب خوں مارا۔ اس رات ابراہیم کے چند امیر جلال خاں وغیرہ عالم خاں سے جا کر مل گئے۔

عالم خاں کی شکست

سلطان ابراہیم نے اس شب خوں کے جواب میں صبح تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ عالم خاں کا لشکر غنیم کی خاموشی پر اپنی فتح کے گمان میں اِدھر اُدھر منتشر ہو گیا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی اور عالم خاں کے ساتھ تھوڑے سے آدمی رہ گئے تھے۔ سلطان ابراہیم نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ایک ہاتھی کو آگے بڑھا کر حملہ آور غنیم پر حملہ کر دیا۔ اس کا یہ حملہ ایسا سخت اور غیر متوقع تھا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ عالم خاں میدان سے جان بچا کر بھاگا اور دوآبہ سے گزر کر سہرند پہنچا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر قلعہ گنگوتہ میں جو ملوت کے توابعات میں پہاڑ پر واقع ہے پناہ لی۔

دلاور خاں لوحانی یہاں سے عالم خاں کے لشکر سے جدا ہو کر بابر کے لشکر میں چلا گیا۔ جب وہ بابر کے پاس گیا تو وہ اس کی تعظیم کو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بڑی عزت و توقیر کی اور اسے خلعت عطا کی۔

بابر کی پیش قدمی

اب بابر نے خود پیش قدمی کی اور ضلع کلانور جا کر پڑاؤ کیا۔ یہاں لاہور سے اس کے امیر محمد سلطان مرزا وغیرہ بھی آ کر مل گئے۔ قلعہ ملوت کے نواح میں جہلم سے غازی خاں بھاگ گیا تھا بابری لشکر

پہنچا تو دولت خاں جو بابر سے منحرف ہو چکا تھا لشکر میں حاضر ہو گیا۔ لوگوں نے اس کو باندھ کر اس کی گردن میں دو تلواریں ڈال دیں۔ اس ہیئت میں اسے بابر کے دربار عام میں پیش کیا گیا۔ بابر نے جب یہ دیکھا تو لوگوں کو اس سلوک سے منع کیا اور دولت خاں کو نہایت تعظیم سے بلایا اور اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ دی لیکن اس کا سارا مال و اسباب لشکر والوں میں تقسیم کرا دیا۔ ملوت پر بابری لشکر نے قبضہ کر لیا اور دولت خاں چند دن بعد بابر کی قید میں ہی انتقال کر گیا۔

دولت خاں کا قصہ پاک ہونے کے بعد بابر نے غازی خاں کے تعاقب میں کوہ سوالک کا رخ کیا اور مقام تادول میں خیمہ گاہ لگائی۔ جب وہاں غازی خاں لشکر والوں کے ہاتھ نہ آیا تو بابر وہاں سے لوٹ کر منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے ضلع سہرند میں پہنچا اور کھگر کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ پھر وہاں سے سامانہ اور سنام کا رخ کیا۔

سلطان ابراہیم نے عالم خاں کو شکست دینے کے بعد سرحدوں کی فکر نہیں کی اور دہلی میں پڑا رہا۔ بابر نے ابراہیم کے لشکر اور جنگی تیاریوں کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے بعد امیر کتہ بیگ کو نامزد کر کے رخصت کیا۔ اسی مقام پر بابر کا امیر بین افغان باغی ہو گیا تھا لیکن جلد ہی شاہی لشکر سے آکر مل گیا۔

شہزادہ ہمایوں کا حملہ

بابر کو اطلاع ملی کہ سلطان ابراہیم کا خاص رسالدار حمید خاں حصار فیروزہ سے لشکر فراہم کر کے لڑنے کے لیے آ رہا ہے۔ بابر نے اس کے مقابلہ پر شاہزادہ محمد ہمایوں کے ساتھ میرزا خواجہ کلاں اور دوسرے امراء کو متعین کیا۔ ہمایوں اور حمید خاں کی فوجوں میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ سخت جدوجہد کے بعد حمید خاں کو ہمایوں نے شکست دی۔ اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے اور کچھ گرفتار ہو گئے۔ اس فتح کی خوشی میں بابر نے حصار فیروزہ ہمایوں کو جاگیر میں دے دیا۔

پٹھانوں کی سرکوبی

یہاں سے آگے بڑھ کر بابری لشکر نے جمنا کے کنارے شاہ آباد سے دو منزل پر منزل کی۔ سلطان ابراہیم کے امیر داؤد خاں وغیرہ پانچ چھ ہزار سوار لے کر جمنا عبور کر گئے تھے۔ داؤد خاں کے مقابلہ پر بابر نے سید محمد مہدی، خواجہ محمد سلطان میرزا اور سلطان جنید برلاس کو آگے بڑھایا۔ ان لوگوں نے پٹھانوں کی اچھی طرح سرکوبی کی اور بہتوں کو قتل و قید کر لیا۔ جو جان بچا کر نکل گئے، وہ ابراہیم کے لشکر سے جا ملے۔

بابر کا توپ خانہ

بابر نے شاہ آباد سے کوچ کر کے لڑائی کا ساز و سامان درست کیا۔ اسی ایک دن میں آٹھ سو گاڑیاں تیار ہو گئیں۔ بابر کے ماہر آتش باز استاد علی قلی نے حسب الحکم توپ خانہ کو روم کے توپ خانہ کی طرح مستحکم کر دیا۔ اس نے تمام گاڑیوں کو زنجیروں اور تسموں سے باہم جکڑ دیا اور جا بجا دو دو گاڑیوں کے درمیان چھ سات مٹی سے بھرے ہوئے بورے کھڑے کر دیے تاکہ ان مورچوں کی حفاظت میں رہ کر سپاہی بندوقیں چلائیں۔

طے یہ پایا کہ یہاں سے کوچ کر کے پانی پت کو لشکر کے عقب میں رکھ کر منزل کی جائے اور میدان میں ان گاڑیوں کی قطار لگا دی جائے۔ سارے سوار اور پیادے ان کے پیچھے رہیں، حملہ کے وقت ادھر ادھر سے نکل کر دشمن پر یلغار کریں اور حسب ضرورت اس مورچہ بندی کی حفاظت میں آ جائیں۔

بابر پانی پت میں

۹۳۲ھ میں ۳۰ جمادی الآخر بروز جمعرات بابر نے پانی پت کے قریب کیمپ لگایا۔ وہاں سے

سلطان ابراہیم کا لشکر چھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ اس وقت بابر کے پاس صرف پندرہ ہزار سوار اور پیادے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ابراہیم لودی کے پاس ایک لاکھ سوار، ہزار ہاتھی تھے۔

بابر کے لشکری روزانہ پٹھانوں پر چھاپے مار کر سپاہیوں کے سر کاٹ لے جاتے تھے۔ لشکر لڑنے کے لیے بے چین تھا لیکن ابراہیم اپنی جگہ چپ چاپ ٹھہرا رہا اور کوئی حرکت نہ کی۔

ایک رات بابر کے امیر مہدی خواجہ اور محمد سلطان مرزا وغیرہ نے پانچ ہزار کی جمعیت لے کر ابراہیم کے لشکر پر شب خوں مارا اور بہت سے سپاہیوں کو قتل کر کے صحیح سلامت لوٹ گئے۔

پانی پت کی پہلی خونریز لڑائی

سن مذکور ۸- رجب کو بروز جمعہ خدا خدا کر کے سلطان ابراہیم کی سواری حرکت میں آئی اور اس نے فوج کی تنظیم و ترتیب کر کے میدان میں صف بندی کر لی۔

بابر نے بھی بڑی آن بان کے ساتھ اپنی فوج کو منظم کیا۔ نقشۂ جنگ اس طرح تجویز کیا کہ داہنی جانب سے امیر قراقورچی اور امیر شیخ علی وغیرہ اور بائیں جانب سے ولی قزل اور بابا قشقہ تمام مغل جمیعت کو ساتھ لے کر دو جانب سے غنیم کے عقب پر حملہ کریں اور بقیہ میمنہ اور میسرہ والی فوج اور امیر محمدی کوکلتاش، امیر یونس علی اور امیر شاہ منصور برلاس کا لشکر سامنے سے دشمن پر یورش کرے۔

جب لڑائی چھڑی تو داہنی طرف پٹھانوں کا زیادہ دباؤ تھا اسی لیے بابر نے امیر عبدالعزیز کو بھی اس سمت پر روانہ کر دیا۔ اُس نے جاتے ہی یکبارگی دشمن پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ فریقین نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔ دونوں طرف کے بہادروں نے جی کھول کر دادِ شجاعت دی اور ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ میدان میں کشتوں کے پشتے لگ گئے اور خون کی ندیاں بہنے لگیں۔

اس لڑائی کو دو قرن کی مدت (پونی صدی) گذر چکی ہے لیکن آج تک راتوں میں اس میدان سے "مار مار" کی آواز آتی رہتی ہے۔ ایک مرتبہ ۹۹۷ھ میں میں (بدایونی مصنف ہٰذا) لاہور سے فتح پور جا رہا تھا۔ اسی میدان سے میرا گذر ہوا؛ چاروں طرف سے "بکش، بزن" کی آوازیں آنے لگیں، جو لوگ ہمراہ تھے اُن کو شبہ ہوا شاید کوئی دشمن حملہ کرنے پہنچ گیا ہے۔

ابراہیم لودی کا قتل

مختصر یہ کہ اس خوں ریز جنگ کے نتیجہ میں بابری فوج کو فتح ہوئی، پٹھان شکست کھا کر بھاگے۔ سلطان ابراہیم کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے پیش کیا گیا۔

جس جگہ سلطان ابراہیم قتل ہوا تھا وہاں پانچ چھ ہزار مقتولین کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

بابر دہلی میں

اس فتح کے بعد بابر بادشاہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بابر نے شاہزادہ محمد مرزا کو بہت سے اُمراء کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ کیا اور سلطان ابراہیم کا سارا خزانہ جو حد و شمار سے باہر تھا، مغل لشکریوں میں تقسیم کرا دیا۔

یہ واقعہ ۹۳۲ھ میں پیش آیا۔ اس کا مادہ تاریخ ہے :

"شہید شدائے ابراہیم"

سلطان ابراہیم نے نو سال حکومت کی۔ وہ لودی سلطنت کا آخری پٹھان فرمانروا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کی بادشاہت تیموری خاندان کے ہاتھ آگئی ۔

ترک اور افغان سلاطین
کا
تین سو سالہ دورِ حکمرانی

یہاں تک مُلّا عبدالقادر بدایونی مصنّف منتخب التواریخ نے ترک اور افغان سلاطین کے تقریباً ساڑھے تین سو سالہ دورِ حکومت کے حالات قلمبند کیے ہیں، اس کے بعد مصنّف مغل خاندان کا تذکرہ ظہیرالدین بابر سے شروع کرتا ہے۔ خاندان مغلیہ کی تاریخ کا ترجمہ پیش کرنے سے پہلے ہم پچھلے صفحات پہ ایک نظر بازگشت ڈال لینا چاہتے ہیں تاکہ آگے پڑھنے سے پہلے مذکورہ تین صدیوں کا خلاصہ سامنے آجائے۔ (مترجم)

چوتھی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی تک ہندوستان کی سرزمین ترک اور افغان قبائل کی ترکتازیوں کا تختۂ مشق بنی رہی۔ یہ فتوحات سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پہ حملہ سے شروع ہوتی ہیں۔ محمود نے ۳۹۲ھ میں ہندوستان کا رخ کیا اور بہت جلد پنجاب کو وادیٔ ستلج تک فتح کر لیا۔ ملتان اور سندھ کے صوبے بھی غزنی اقتدار کے تحت ہو گئے۔ ہندو ریاستیں وسطی مشرقی اور جنوبی ہند میں بکھری پڑی تھیں۔ یہ چھوٹی بڑی متعدد ریاستیں تھیں۔ جن پر راجپوت اور دوسرے ہندو خاندان حکمران تھے۔ اس ہندو دنیا کا بیشتر حصّہ برہمن مت کا پیرو تھا۔ ہندوستان کے ان راجاؤں میں باہمی رقابت کا جذبہ بہت شدید تھا۔ اشوک اور چندر گپت کے بعد کوئی مرکزیت باقی نہیں رہی تھی اور نہ ایسی طاقتور اور بااثر شخصیت کا ہندوؤں میں ظہور ہوا جو ان منتشر طاقتوں کو یکجا کر سکتی۔ برہمن، پانڈے، راجے، سپاہی، ساہوکار، کسان، تاجر، صناع غرض سب کے سب کسی سیاسی مرکزیت اور نظریاتی وحدت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک انتشار کے عالم میں مبتلا تھے۔ عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ محنت و جفاکشی باقی نہیں رہی تھی اور معاشرتی حالت نہایت تباہ ہو چکی تھی۔ اُتم جاتی اور نیچ جاتی کے امتیازات نے پورے سماج کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

ان حالات میں ہندوستان پر ترک مسلمانوں نے حملے کیے۔ ۱۱۰۰ء سے پنجاب اور سندھ غزنی کے ترک سلاطین کے زیرِ اقتدار تھے ہی ۱۱۹۳ء میں سلطان محمد غوری نے اجمیر کے راجا پرتھوی راج کو شکست دے کر اس کی مملکت پر قبضہ کر لیا اور بنگالہ تک اس کی فتوحات کا سلسلہ پہنچ گیا۔ اس کے بعد ۱۱۹۵ء سے ۱۲۰۶ء تک شمالی ہند غزنی اور غور کی ترکی اور اسلامی سلطنت کا ایک حصّہ بنا رہا۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو مرکز بنا کر ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ قطب الدین کے عہد تک حکمرانوں کی مدت حسب ذیل ہے:۔

الف ۔ سلاطین غزنی ۔ محمود غزنوی سے خسرو ملک بن خسرو شاہ تک ۱۴ بادشاہوں نے جن میں غزنوی خاندان کے ۵ اور سادات غزنی کے ۶ بادشاہ شامل ہیں۔ ۳۹۳ھ سے ۵۸۳ھ تک تقریباً دو سو سال حکومت کی۔

ب ۔ غزنویوں کے بعد معز الدین بن سام شہاب الدین غوری کی حکمرانی ۵۶۹ھ سے ۵۹۳ھ تک تقریباً ۲۵ سال رہی ۔

قطب الدین ایبک نے خاندان غلاماں کی بادشاہت کا آغاز کیا اور ۶۰۲ھ تک حکمران رہا۔ اس کے بعد دس بادشاہوں نے جن میں شمس الدین التمش جیسا عظیم المرتبت بادشاہ سلطانہ رضیہ جیسی جنگجو ملکہ، ناصر الدین محمود جیسا خدا ترس دیانت دار فرمانروا اور غیاث الدین بلبن جیسا منتظم اور اولوالعزم سلطان شامل ہیں ۶۷۹ھ تک تقریباً پون صدی حکمرانی کی اور خاندان غلاماں کا کیقباد ناصر الدین اور شمس الدین کیکاؤس پر خاتمہ ہو گیا۔

خاندان غلاماں کے سلاطین سب کے سب زر خرید غلام اور غلام زادے تھے ترقی کر کے سرداری اور بادشاہی کے رتبے تک پہنچے رہے۔ ان کے عہد میں مملکت کی وسعت کا دائرہ مشرق میں بنگال تک اور جنوب مشرق میں گجرات کاٹھیاواڑ تک پہنچ گیا تھا۔ اور وسطی ہند کے اکثر راجا دہلی کے باج گزار بن گئے تھے ۔ اس خاندان کے سب سے بڑے دو کارنامے ہیں:

اوّل : ہندوستان میں مستقل اسلامی مملکت کا قیام ۔

دوم : وسط ایشیا سے آنے والے چنگیز خانی سیلاب کی روک تھام ۔

واضح رہے ۱۲۱۰ء سے ۱۲۳۶ء تک چنگیز خاں کے وحشی لشکروں نے وسطی ایشیا، ترکستان، ایران، افغانستان کے ملکوں کو تاخت و تاراج کر کے بے چراغ کر دیا تھا۔ اسلامی دنیا میں ہندوستان کی مسلمان مملکت ہی واحد مملکت تھی جس نے چنگیز خاں کے لشکر کو شکست دی۔ سلطان التمش نے دریائے اٹک کے پار چنگیز خاں کے مغل سردار کو اس بری طرح شکست دے کر بھگایا تھا کہ عرصہ تک ان کا فر مغلوں کو ہندوستان کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

غلاموں کے بعد زمام اقتدار خلجیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ خاندان خلجی کا آغاز جلال الدین بن یغرش خلجی سے ہوتا ہے جس نے ۶۸۹ھ میں خلجی حکومت کی بنیاد رکھی ۔ اس خاندان میں چار بادشاہ گزرے۔ قطب الدین مبارک شاہ آخری خلجی بادشاہ ہے جس پر ۷۲۰ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ خلجیوں نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔

خلجیوں کا سب سے بڑا کارنامہ جنوبی ہند کی ہندو ریاستوں کی فتح ہے۔ سلطان علاؤ الدین نے راس کماری اور رامیشورم تک سارا ملک فتح کر لیا۔ علاؤ الدین ہندوستان کا وہ پہلا مہم پسند بادشاہ ہے جس کے زیر نگین تقریباً سارا ہندوستان ایک ہی مرکزی اقتدار کے تحت آ گیا تھا۔ ایسی مرکزیت اور وسعت علاؤ الدین کے عرصہ دراز بعد اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ملتی ہے جو کابل سے راس کماری اور برما کی سرحدوں سے سورت تک کا واحد مطلق العنان بادشاہ تھا۔

مغلوں نے سلطان علاؤ الدین کے عہد میں بھی ۱۲۹۵ء سے ۱۳۱۶ء تک ہندوستان میں گھسنے کی کوشش کی لیکن سلطان کے لشکر نے ان کو ہمیشہ شکست دے کر بھگا دیا۔

خلجیوں کے بعد تغلق خاندان کے ترک سلاطین حکمراں رہے۔ ان کا آغاز غیاث الدین تغلق شاہ سے شروع ہوتا ہے۔

جس نے ناصر الدین خسرو خاں ایک منافق اور غاصب بادشاہ کو شکست دے کر ۷۲۰ھ میں تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔ ان کے بعد سات اور تغلق ہندوستان کے تخت پر متمکن ہوئے، جن میں سے محمد شاہ تغلق جیسا ذہین لیکن خونی بادشاہ اور فیروز شاہ تغلق جیسا علم دوست، درویش منش، عادل اور باہمت سلطان گزرا ہے۔ محمد شاہ تغلق نے کوہستان ہمالیہ کے راستہ چین پر حملہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ دہلی کے بجائے دولت آباد دکن کو پایہ تخت بنایا جس سے دہلی کا شہر ویران ہو گیا تھا۔ تانبے کا سکہ جاری کیا۔ اس کے وسیع اور دور رس منصوبے ناکام رہے اور وہ تاریخ میں سر پھرا سلطان کہلایا۔ فیروز شاہ تغلق نے نہریں بنوائیں، زراعت اور تجارت کو ترقی دی۔ اس کے زمانہ میں رعایا خوش حال ہو گئی اور ملک آباد، اس نے سڑکیں بنوائیں اور راستوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔

۸۱۵ھ (۱۳۹۸ء) میں تیمور کی یلغار نے آخری تغلق بادشاہ محمود شاہ بن محمد شاہ کو تخت سے بے دخل کر دیا اور تغلقوں کی جگہ خضر خاں سادات نے لے لی۔

تغلق خاندان تک ہم ترک فاتحین کو فتوحات کرتے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کرتے، ان علاقوں سے بھاری خراج وصول کرتے یا آپس میں تختِ شاہی کے لیے لڑتے جھگڑتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تغلق خاندان کے صد سالہ دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کی بنیادیں مستحکم ہو چکی ہیں اور پہلی فتوحات کی بار آور فصلیں کاٹی جا رہی ہیں اور جس کھیت سے یہ فصل مل رہی ہے اس کو روندنا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی زمین کو کھاد دے کر سیراب کرنا بھی پیشِ نظر ہے۔

سید بادشاہوں کا آغاز تیمور کی واپسی کے بعد خضر خاں سے شروع ہوتا ہے جس نے ۸۱۷ھ میں ہندوستان کا اقتدار سنبھال لیا۔ اس کے سلسلہ میں مزید تین بادشاہ گزرے اور آخری بادشاہ علاؤالدین بن محمد شاہ پر اس خاندان کا ۸۵۵ھ میں خاتمہ ہو گیا۔

ان چار بادشاہوں کا سلسلہ مسلسل انتشار اور افراتفری میں گزرا۔ تیموری مغلوں نے سارے ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کر دیا تھا۔ شمال شرق میں جونپور کے شرقی بادشاہ، مغرب میں شاہانِ گجرات، دکن میں بہمنی حکمران، مشرق میں شاہانِ بنگال اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے خود مختار ہندو اور مسلمان سرداروں یا راجاؤں کی حکمرانی تھی اور سارا ملک ایک عظیم خلفشار اور طوائف الملوکی میں مبتلا تھا۔ ابتدا میں مذکورہ بادشاہوں کی حیثیت تیمور کے نائبوں کی تھی۔ تیمور کے بعد جب کوئی پرسانِ حال نہ رہا تو یہ خود مختار بن بیٹھے۔ ان کی مدت حکومت صرف ۴۰ سال ہے۔

سادات خاندان سے لودی خیل کے پٹھانوں نے حکومت چھین لی۔ لودی خاندان میں صرف تین بادشاہ گزرے، ایک سلطان بہلول جس نے اس سلسلہ کی بادشاہت ۸۵۵ھ میں قائم کی۔ دوسرا سلطان سکندر جس نے بڑی بیدار مغزی اور دلیری سے فرمانروائی کی اور ملک کو اس بڑے انتشار سے جس میں وہ مبتلا تھا بچا لیا۔ آخری ابراہیم لودی جو ایک باہمت باپ کا بزدل بیٹا تھا۔ ابراہیم لودی پر ۹۳۲ھ میں لودی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس خاندان نے بھی پون صدی سے زیادہ حکومت کی۔

سلاطین تغلق کے بعد سے ہندوستان میں مسلمان مملکت اندر سے مسلسل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ باہمی عداوتوں اور رقابتوں

کی وجہ سے اس میں اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ کسی بیرونی حملہ یا اندرونی انقلاب کو سہار سکے۔ چنانچہ تیموری یلغار نے ہندوستان کی بادشاہت کو دیکھتے ہی دیکھتے سرنگوں کر دیا۔ اب یہ خوش قسمتی تھی کہ تیمور مسلمان تھا اور ہندوستان کو کسی کافر حملہ آور سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ بظاہر دیکھا جائے تو تیمور کا حملہ ایک وحشیانہ یلغار معلوم ہوتی ہے لیکن اس حملہ کا سب سے بڑا فائدہ مسلمانوں کو ملا۔ اس پر بہت کم لوگوں کی نظر جاتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک سوال کا واقعاتی جواب حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور وہ سوال ہے:

"اگر تیمور نہ آتا تو ہندوستان میں کیا صورتِ حال پیدا ہوتی؟"

تفصیل اور شواہد کا موقع نہیں، مختصراً صرف اتنا اشارہ کافی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دکن کو چھوڑ کر وسطی اور شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی بعینہ وہی حالت تھی جو ان ترک فاتحین کی آمد کے وقت یہاں کے ہندوؤں کی تھی جس کا ذکر ہم اس تبصرہ کے آغاز میں کر آئے ہیں۔

اب آپ اس واقعاتی پس منظر میں سوچیے کہ باہر سے اگر تیمور یا کوئی اور مسلمان فاتح نہ آتا تو ہندوستان کے وسطی اور شمالی علاقوں میں کیا ہوتا۔ اس وقت کے حالات ہم کو بجز اس کے دوسرا کوئی جواب نہیں دیتے کہ پنجاب، ملتان اور دہلی تک تو پنجاب کے کھوکھروں کا اقتدار قائم ہو جاتا جو بت پرست جاٹ تھے اور جن کے ایک سرغنہ جسرت نے دہلی کے بادشاہوں کو تیمور کی واپسی کے بعد بھی مسلسل تنگ کیا اور دوابہ سے دکن تک گوالیار، قنوج، بیجانگر اور راجپوتانہ کے ہندو راجاؤں کا اقتدار قائم ہو جاتا، جو اندر ہی اندر مسلمان حکومت کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ دکن میں البتہ مسلمانوں کا اقتدار سلاطین بہمنی اور ان کے جانشین خاندانوں کی وجہ سے ضرور قائم رہتا جو اس وقت شمال کی نسبت زیادہ طاقتور اور مستحکم سلطنت کے مالک تھے۔

اس ہندوگردی سے روکنے والی کوئی مسلمان طاقت نہیں تھی اور ڈھائی سو سال بعد ہی یہاں کے فاتح مسلمانوں کی غلامی کے اسباب پیدا ہو چلے تھے۔ اس رسوا کن انجام سے ان کو صرف تیمور کے حملہ نے بچا لیا۔

تیموری یلغار سے گھات میں لگی ہوئی ہندو طاقت ایک مرتبہ اور مسلمانوں کی ترکتازیوں سے مرعوب ہو گئی۔ اب اس کے سامنے صرف دہلی کے کمزور جھگڑالو بادشاہ نہ رہے بلکہ بحر احمر کے کناروں سے جمنا کے کنارہ تک وسیع علاقوں کو فتح کرنے والی ایک عظیم الشان شخصیت ابھر کر سامنے آگئی جس نے اس کی اٹھتی ہوئی گردن کو اٹھنے سے پہلے ہی نیچے جھکا دیا۔

اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ تیمور کا حملہ دراصل مسلمانوں کے خلاف نہیں، بلکہ ہندو اقتدار کے دوسرے جنم کے خلاف تھا۔

تیمور کی واپسی کے بعد جو افراتفری مچی اگر وہ اسی طرح برقرار رہتی اور لودی خاندان برسر اقتدار نہ آتا تو ہندوگردی کا خطرہ جسے تیموری یلغار نے سر سے ٹال دیا تھا دوبارہ رونما ہو جاتا، چنانچہ بہلول کے منظر پر آنے سے پہلے ہم کو شمال میں جسرت کھوکھر کی بڑھتی ہوئی جسارتوں، قنوج اور گوالیار کے قلعوں میں ہندوستان کے راجاؤں کی پراسرار آمد و رفت اور خفیہ ملاقاتوں کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ لودی خاندان بلکہ صحیح معنوں میں صرف سکندر بن بہلول لودی نے اسلامی عظمت و اقتدار کی اس گرتی ہوئی عمارت کو اپنے عصائے شاہی پر روک لیا۔

بلاشبہ یہ لودی خاندان کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مسلمانوں کی ڈھلتی ہوئی عظمت کو سلاطین مغلیہ کی آمد تک حفاظت سے سنبھال کر رکھا اور یہ امانت کسی اندرونی ہندوانہ انقلاب میں لٹنے سے بچ گئی۔

مجموعی طور پر ان ترک اور پٹھان سلاطین کے تین سو سالہ دورِ حکومت میں ہندوستان کے رہنے والے پہلے کی نسبت زیادہ امن و آرام اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ان سلاطین میں سے اکثر صحیح العقیدہ خدا ترس اور نیک بادشاہ تھے۔ اُنھوں نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ بھی بڑی رواداری اور انصاف کا سلوک کیا اور ہندوؤں کے مذہب، تمدن، معاشرت اور رواج سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کے دور میں ہندوستان کے مذہب و تمدن میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی اور جامد برہمنیت اور اُلجھے ہوئے ویدانتی فلسفوں کی جگہ وحدانی تصورات اور نئے تحریکی نظریوں نے علوم و فنون کی ترقی کے بند دروازوں کو کھول دیا +

(محمود فاروقی مترجم کتاب ہذا)

خاندان مغلیہ

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی

پانی پت کی فتح کے بعد مقابل میں کوئی طاقت نہیں رہی تھی۔ بابرؒ[۵] نے دہلی پہنچ کر تخت سلطنت کو اپنے جلوس سے زینت بخشی اور جی کھول کر فیاضی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ اس فتح کے شکرانہ میں سمرقند، کاشغر، عراق اور خراسان کے

---

۵ بابر۔ تاتاری مغلوں نے اپنے وطن سے نکل کر (۱۲۱۰ء) ماوراء النہر، ایران اور خراسان اور ایشیا کے تقریباً پون حصہ پر قبضہ کر لیا۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کی تلوار نے عرب و عجم کے بیشتر ملکوں کو فتح کر لیا (۱۲۳۶ء) اس کے بعد امیر تیمور نے والگا سے گنگا کے کنارے تک مغل فتوحات کی دھاک بٹھا دی (۱۳۹۸ء) تیمور کے مرنے کے بعد اس عظیم الشان سلطنت کے تمام اجزاء پریشان ہو گئے اور جگہ جگہ خود مختار مغل حکمرانوں نے اپنی اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ ان میں ہمیشہ جنگ و جدال رہنے لگی۔ بابر کی پیدائش کے وقت سمرقند پر بابر کا ایک چچا سلطان احمد مرزا حاکم تھا۔ بدخشاں، قندز، ترمذ اور حصار پر سلطان محمود مرزا کی حکومت تھی۔ کابل اور غزنی پر الغ بیگ مرزا قابض تھا۔ تاشقند اور شاہرخیہ پر بابر کا ماموں سلطان محمود خاں حکمران تھا اور خراسان پر سلطان حسین مرزا کی فرمانروائی تھی۔ ولایت فرغانہ پر بابر کا باپ عمر شیخ مرزا حاکم تھا۔ عمر شیخ مرزا سلطان ابوسعید مرزا کا بیٹا تھا۔ ابوسعید امیر تیمور کے بیٹے میراں شاہ کا پوتا تھا۔ عمر شیخ مرزا کی اپنے بھائیوں اور سسرال والوں سے ہمیشہ لڑائی رہی۔ اس کی وفات ۴ رمضان ۸۹۹ھ کو قلعہ اخسی میں ہوئی۔ بابر کی ماں قتلق نگار خانم یونس خاں مغل کی بیٹی تھی۔ یونس خاں چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھا۔ اس طرح بابر کی رگوں میں تیمور اور چنگیز دو اولوالعزم فاتحوں کا خون جوش زن تھا۔ بابر نے اپنی ماں کے متعلق لکھا ہے: "اکثر معرکوں اور لڑائیوں میں میری ماں ساتھ دیتی تھی (تزک بابری) اس کا انتقال ۹۱۱ھ میں کابل میں ہوا۔ بابر کا وطن فرغانہ تھا جو ترکستان کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ یہ ریاست دریائے سیحوں کے دہانہ پر دونوں کناروں پر واقع تھی۔ اس کے مشرق میں کاشغر، مغرب میں سمرقند، جنوب میں کوہستان بدخشاں، شمال میں غیر آباد علاقہ تھا۔ اس کے قصبوں میں اوش جہاں کے قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے، مرغینان جو صاحب ہدایہ کا وطن تھا اور خجند جہاں کے بزرگ خواجہ کمال خجندی گزرے ہیں، بڑے قصبے تھے۔ اخسی دار الخلافہ تھا۔ اس کا قلعہ سیحوں کے کنارے اونچے پہاڑوں پر بنا ہوا تھا۔ بابر ۶ محرم ۸۸۸ھ میں پیدا ہوا۔ شاعر جامی کا شعر ہے ؎

اندر شش محرم زاد آں شہ مکرم   تاریخ مولدش ہم آمد شش محرم ۸۸۸

بابر ۵ برس کی عمر میں اپنے چچا سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا اور اس کی نسبت چچا کی لڑکی عائشہ سلطان بیگم سے ہو گئی۔ سمرقند اندجان سے ۱۵۵ میل پر ہے۔ بابر کی تعلیم و تربیت قاضی عبداللہ خواجہ مولانا کے سپرد ہوئی۔ یہ بزرگ شیخ الاسلام برہان الدین کی اولاد میں سے تھے اور خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے مرید تھے، فرغانہ کے مذہبی مقتدا تھے۔ بارہ سال کی عمر میں بابر شیخ فرید بیگ کی اتالیقی میں اندجان گیا۔ اسی سال سلطان احمد مرزا اور بابر کے ماموں سلطان محمود خاں نے مل کر فرغانہ پر حملہ کیا اور عمر شیخ مرزا کا بھی اسی اثناء میں انتقال ہو گیا۔ بابر ۵ رمضان ۸۹۹ھ میں بارہ سال کی عمر میں قلعۂ فرغانہ میں تخت نشین ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے شوال ۹۰۱ھ میں سمرقند پر حملہ کیا لیکن برف باری کی وجہ سے لوٹ آیا۔ ۹۰۲ھ کی فصل بہار میں دوبارہ سمرقند پر حملہ کیا۔ بایسنغر مرزا اور شیبانی خاں کو شکست دے کر سمرقند پر قبضہ کر لیا پھر سمرقند پر سلطان علی مرزا نے قبضہ کر لیا اور بابر صحرا نوردی میں یہاں سے وہاں دوڑتا رہا پھر وہ ترمذ پہنچا اور

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لوگوں کو انعامات روانہ کیے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور اکثر بزرگوں کے مزاروں پر نذریں بھیجیں اور ہندوستان کے خزانوں سے بدخشاں اور کابل کے باشندوں کے لیے بھی کافی زرنقد روانہ کیا۔ اس کے لطف و کرم سے سارے ہندوستانیوں میں خوشی اور اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔ بابر نے ہندوستان کے امرا کی بھی بڑی دلدہی کی لیکن وہ دل وجان سے اس کے مطیع نہیں ہوئے اور قلعوں میں پناہ گزین رہے۔ چنانچہ سنبھل میں قاسم سنبھلی، بیانہ میں نظام خاں، الور میں حسن خاں میواتی اور گوالیار میں تاتار خاں، سارنگ خاں قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے۔ اٹاوہ قطب خاں اور کالپی عالم خاں کے قبضہ میں تھے۔ قنوج اور شمال مشرق کے سارے علاقے پٹھانوں کے قبضے میں تھے انھوں نے بہار خاں کے بیٹے کو سلطان محمد کا لقب دے کر بادشاہ بنا لیا تھا اور بہار تک کے علاقہ پر اسی کا قبضہ تھا۔ نصیر خاں لوحانی اور معروف فرملی جیسے امرا نے بھی اس کی اطاعت اختیار کر لی تھی۔ جھاین کے قصبہ پر سلطان ابراہیم کے ایک غلام مرغوب نامی نے قبضہ کر رکھا تھا۔

سنبھل پر حملہ جب یہ امیر سیدھی راہ پر نہیں آئے تو بابر نے ان پر لشکر روانہ کیے اس فوج کشی سے کچھ پٹھان مطیع ہو گئے۔ فیروز خاں، سارنگ خاں اور مصطفےٰ فرملی کے بھائی شیخ بایزید نے حاضر ہو کر جاگیر پائی۔ شیخ گھورن بھی دوآبہ کی جمیعت کو لے کر بادشاہ کے حضور میں آ گیا۔ یہ شخص ہندوستان کا معزز امیر تھا، ظرافت اور موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا۔ بابر نے سنبھل شاہزادہ ہمایوں کی جاگیر میں عطا کیا۔ ہمایوں نے سنبھل پر حملہ کر کے قاسم سنبھلی کو گرفتار کر لیا اور بابر کے حضور میں بھیج دیا۔ ایک دوسرے لشکر نے بیانہ پر حملہ کر کے نظام خاں کا محاصرہ کر لیا۔

اسی سال رانا سانگا نے رنتھنبور کے ایک نواحی قلعہ کھندار پر حملہ کر کے اسے حسن ولد مکھن سے چھین لیا۔ ادھر لوحانی پٹھان پچاس ہزار کی تعداد میں قنوج سے آگے بڑھ کر پیش قدمی کرنے لگے۔ بابر نے ہمایوں کو ان امراء کے ساتھ جو دھولپور پر متعین کیے گئے تھے پٹھانوں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ ہمایوں چلا تو سید مہدی خواجہ اور محمد سلطان مرزا بھی جو اٹاوہ کی مہم پر لگے ہوئے تھے اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہمایوں نے اس یلغار میں تمام شمالی علاقہ کو جونپور تک فتح کر لیا۔

رانا سانگا کی جدوجہد اسی اثناء میں رانا سانگا اور حسن خاں میواتی نے باہمی اتفاق سے سلطان محمود کو جو

(بقیہ حاشیہ بابر صفحہ گزشتہ) دو تین سو آدمی ساتھ لے کر کابل پر حملہ کر دیا اس وقت کابل پر سلطان حسین مرزا کے حاکم ارغون خاں کی حکومت تھی۔ بابر نے اس کے بھائی مقیم خاں کو شکست دے کر کابل پر قبضہ کر لیا اور شیبانی خاں کے قتل کے بعد بابر نے تیسری مرتبہ سمرقند و بخارا کو فتح کیا لیکن آٹھ ماہ بعد ہی اوزبکوں نے اسے شکست دے کر وہاں سے نکال دیا۔ بابر نے افغانستان پر قناعت کر لی اور بادشاہ کا لقب اختیار کر کے مستقل سلطان بن گیا۔ واضح رہے تیموری خاندان میں بادشاہ کا لقب پہلی مرتبہ بابر نے ہی رکھا۔ اب تک تیمور کی اولاد مرزا کہلاتی تھی۔ بابر نے ۹۳۲ھ والے حملہ سے پہلے بھی چار حملے پنجاب پر کیے۔ جس وقت بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت لودی خاندان کی حکومت پنجاب سے بہار تک تھی۔ دکن میں بہمنی سلطنت مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔ گجرات کی بادشاہت ۱۴۰۵ء کے اقتدار کے بعد نزع کے عالم میں تھی۔ مالوہ کی خود مختار حکومت جس کا دار الخلافہ منڈو (امندور) تھا۔ رانا سانگا کے حملوں سے دم توڑ رہی تھی۔ بنگال میں ایک خاندان الگ خود مختار بادشاہی کر رہا تھا۔ ہندوؤں میں چتوڑ کا راجہ رانا سانگا اور بیجے نگر کا راجہ مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ ان حالات میں اگر بابر نہ آتا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو انہی نتائج سے دوچار ہونا پڑتا جن کا تیمور کے حملہ کے وقت امکان تھا۔ جن کی تفصیل ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔

سکندر لودی کی اولاد میں سے تھا، بادشاہ بنا لیا اور ایک بڑا لشکر جمع کر کے لیسا ور کی طرف سے پیش قدمی کی اور فتح پور سیکری پہنچ گئے۔[1]

بیانہ کے حاکم نظام خاں نے مصالحت و اطاعت کے لیے بابر کے حضور میں بہت سے عریضے روانہ کیے اور سیّد رفیع الدین صفوی[2] کے توسط سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سیّد صفوی بلخ کے سادات عظام میں سے تھے اور علم حدیث کے بڑے ماہر عالم تھے۔ سکندر لودی کے عہد میں یہ ہندوستان آئے تھے۔ ان کو "حضرت مقدس" کا خطاب ملا ہوا تھا۔

جب رانا سانگا نے کھندار پر قبضہ کیا تھا تو اُس طرف کے علاقوں میں ہندوؤں کو بڑی طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کی شورہ پشتی دیکھ کر تاتار خاں سارنگ خاں نے بھی متعدد عریضے بادشاہ کے پاس بھیجے تھے اور قلعہ گوالیار سپرد کر دینے پر رضامند ہو گیا تھا لیکن جب خواجہ رحیم داد اور شیخ گھورن قلعہ کو تحویل میں لینے وہاں پہنچے تو اس کی نیت بدل گئی۔ شاہی امیر شیخ محمد غوث گوالیاری عامل کے ذریعہ قلعہ میں داخل ہو گئے اور تاتار خاں سے جبراً قلعہ چھین لیا۔ تاتار خاں کو بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا گیا۔

دھول پور کے قلعہ پر محمد زیتون افغان قابض تھا۔ اس نے بھی قلعہ امرائے بابر کے حوالے کر دیا اور خدمت میں حاضر ہو گیا۔

رانا سانگا نے بیانہ پر یورش کی اور وہاں کچھ دن ٹھہر کر فتح پور میں آیا۔ رانا کے مقابلہ کے لیے بابر نے بھی تیاری کی اور آگرہ میں جتنی بھی فوج تھی ہمراہ لے کر باہر نکلا۔ ہمایوں کو لکھ بھیجا کہ جونپور پر کسی امیر کو متعین کر کے جلد رانا سے مقابلہ کے لیے آگرہ آجائے۔ اس اثناء میں ہمایوں حرتمد اور بہار بھی نصیر خاں لوحانی سے چھین چکا تھا۔ اس نے جونپور کی حکومت امیر شاہ حسن اور امیر جنید برلاس کو تفویض کی اور وہاں سے کالپی پہنچ کر عالم خاں کو صلح سے یا لڑائی کے ذریعہ مطیع بنا لیا اور وہاں سے تیزی کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے باپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

اس زمانہ میں خواجہ خاوند نقشبندی[3] جو ایک باکمال بزرگ تھے۔ کابل سے ہندوستان آئے۔

---

[1] بابر نے اس امیر کو فی البدیہہ یہ شعر لکھ کر بھیجے تھے۔

با ترک ستیز مکن اے میر بیانہ — چالاکی و مردانگی ترک عیاں ست

در زود نیائی و نصیحت نکنی گوش — ہر جا کہ عیاں ست چہ حاجت بہ بیاں ست

[2] یہ بزرگ میر معین الدین مصنف "تفسیر معنی" کی اولاد میں سے تھے۔ سالہا سال مدینہ منورہ میں مجاوری کی اور مولٰنا جلال الدین دوانیؒ سے علم حدیث و تفسیر حاصل کیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سلیم شاہ کے عہد میں شیخ علائی مہدوی سے ۹۵۴ھ میں مناظرہ کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں ۹۵۴ھ میں انتقال ہوا اور بعض ۹۵۷ھ بتاتے ہیں۔ یہ سلیم شاہ پسر شیر شاہ کا عہد تھا۔ ان کا مزار اکبر آباد میں آصف جاہ کی حویلی میں ہے۔ (بحوالہ مخزن الواعظین)

[3] خواجہ خاوند نقشبندی۔ سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے مشہور بزرگ ہیں والد کی طرف سے خواجہ علاؤ الدین عطار سے ان کا نسب ملتا ہے بیس سال کی عمر میں سلسلہ طریقت اختیار کیا اور بخارا سے سیاحت کے لیے نکلے اور کابل پہنچے وہاں سے کشمیر گئے۔ ایک عرصہ تک وہاں مقیم رہے کشمیر سے ہندوستان آکر لاہور، دہلی اور اکبر آباد میں قیام کیا۔ آپ شاہ جہان کے عہد تک زندہ رہے۔ آپ کی وفات بروز منگل ۱۲ ماہ شعبان ۱۰۵۲ھ میں لاہور میں ہوئی مزار تاشمار باغ کے قریب ہے مقبرہ شاہ جہانی امیر نواب سعید خاں نے تعمیر کرایا ہو [illegible] معلوم ہوتی ہیں اگرچہ نام بالکل ملتا جلتا ہے کہ [illegible] سو سال سے زیادہ عمر پائی [illegible] قابل قیاس نہیں۔

راناسانگا کی شکست

رانا سانگا[1] ایک ٹڈی دل لشکر کو لے کر میدان میں آیا تھا۔ بابر کے پاس اس کے مقابلہ میں بہت مختصر فوج تھی۔ اس کے امیروں نے رائے دی کہ آگرہ کے قلعہ میں کچھ فوج چھوڑ کر بادشاہ پنجاب چلا جائے اور دیکھیے غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بابر نے اس بُزدلانہ مشورہ کو قبول نہ کیا اور جان لڑا دینے کا عزم کر لیا۔ اس کے حوصلہ کو دیکھ کر امراء نے بھی قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جنگ میں لڑ کر جان دے دینے یا دشمن پر فتح حاصل کرنے کا حلف اُٹھایا۔ جب رانا کی فوج سے مقابلہ ہوا تو اُمراء نے بہادری کے خوب ہی جوہر دکھائے۔ آخر ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد اللہ نے بابر کو فتح دی۔ حسن خاں میواتی پیشانی پر تیر لگنے سے گر کر مر گیا، اس کی لاش لوگوں نے ایک کنوئیں میں ڈال دی۔ اس کے گرتے ہی باقی ساری فوج بھاگ نکلی۔

نقلی حسن خاں

سلیم شاہ کی وفات کے بعد ۹۶۰ھ میں ایک میواتی نے جو بڑا قدآور اور جسیم تھا، حسن خاں ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور میواتیوں کو خاص علامتیں بتائی تھیں اور بہتوں کو اس پر یقین آ گیا تھا۔ ۹۶۵ھ میں مَیں نے بھی (مصنف ہذا) اس کو آگرہ میں دیکھا ہے۔ اس کے چہرہ سے تو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی سردار ہے بلکہ وہ بدشکل گنوار معلوم ہوتا تھا۔ خان خاناں بیرم خاں کہا کرتے تھے کہ حسن خاں بڑے رعب داب کا آدمی تھا اور شاعر بھی تھا، اس کے شعر بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ یہ شخص بہرحال کسی صورت بھی حسن خاں نہیں تھا۔ اس کو چند دن بعد میواتی خان زادوں نے غیرت کے مارے قتل کر دیا۔

بابر کی وفات

رانا سانگا پر فتح پانے کے بعد بابر بیمار[2] ہو گیا اور بیماری کچھ اس طرح اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی کہ جان لے کر ہی ٹلی۔

ـلـہ راناسانگا میواڑ کے راجاؤں میں اکیاون واں راجہ تھا جو ۱۵۰۹ء میں چتوڑ کے تخت پر بیٹھا۔ چتوڑ کے راجا خود کو سورج بنسی خاندان سے بتاتے ہیں۔ آخر سورج بنسی راجہ چھٹی صدی عیسوی میں کاٹھیاواڑ میں اپنے دارالخلافہ ولبھی میں سارے خاندان سمیت قتل کر دیا گیا تھا، صرف ایک حاملہ رانی بچ گئی جس سے کیشوروت پیدا ہوا، اس کی چوتھی پشت میں باپارادل نے چتوڑ فتح کر کے آٹھویں صدی میں اس ریاست کی بنیاد رکھی۔ تیسویں راجہ رتن سی اول کے عہد میں ۱۳۰۱ء میں سلطان علاؤالدین خلجی نے چتوڑ پر حملہ کر کے رانی پدمنی کو اسیر کر لیا تھا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ راجہ کی نسل میں صرف کرن سنگھ بچا جو پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ تینتالیسویں راجہ ارسی دوم کے وقت غیاث الدین تغلق نے حملہ کر کے چتوڑ فتح کیا تھا۔ پینتالیسویں راجہ ہمبر سے رانا سانگا کے عہد تک دو سو سال چتوڑ پر مالوہ اور گجرات کے مسلمان بادشاہ حملہ کرتے رہے۔ جب رانا سانگا برسر اقتدار آیا تو ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، سکندر شاہ لودی کے بعد کوئی مرکزیت باقی نہیں تھی۔ سانگا نے راجپوت ریاستوں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کر لیا اور مارواڑ، اجمیر، گوالیار اور رائسین کے تمام راجاؤں نے اس کو اپنا لیڈر مان لیا اور ان سب کی مشترکہ فوج دو لاکھ پر مشتمل تھی اس کی خود فوج ایک لاکھ تھی۔ رائے سین کے راجہ سیمدی کی ۳۰ ہزار، ڈونگر پور کے راول اودے سنگھ اول کی ۱۲ ہزار، میدنی رائے کی ۱۲ ہزار، میوات کے حسن خاں کی ۱۲ ہزار، محمود خاں لودی کی ۱۰ ہزار، بوندی کے راؤ نربت ہاڑا کی ۷ ہزار، سروی کھنچی کی ۶ ہزار، ایڈر کے راؤ بہارامل کی ۴ ہزار، بیرم دیو میرتھہ کی ۴ ہزار۔ یہ دو لاکھ فوج لے کر سانگا نے بیانہ کے نواح بمقام خوانہ میں بابر سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ اگر بابر ہار جاتا تو ہندوستان پر سے مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا اور راجپوتوں کا راج قائم ہو جاتا۔ رانا سانگا کا اصل نام سنگرام تھا وہ اس شکست کے سال یعنی ۹۳۴ھ / ۱۵۲۸ء میں میواڑ کے پہاڑوں میں فوت ہوا۔ اس نے ۱۹ سال حکومت کی +

ـلـہ بابر کس مرض میں گرفتار ہوا، نہ تو فرشتہ نے لکھا ہے نہ کسی اور مورخ کے ہاں نظر سے گزرا۔ بابر آگرہ میں ۹۳۶ھ میں بیمار ہوا +

بابر نے ۹۳۷ھ میں اس عالم فانی سے کوچ کیا۔ اس کی عمر ۵۰ سال تھی۔ بارہ سال کی عمر میں وہ تخت نشین ہوا تھا اور ماوراالنہر، بدخشاں، کابل، کاشغر اور ہندوستان میں اس کی سلطنت کی کل مدت ۳۸ سال ہے۔
بابر کی تاریخ وفات ہے ؎

تاریخ وفات شاہ بابر

در نہ صد و سی و ہفت بودہ

لفظ "شش شوال" بھی اس کی وفات[1] کا مادۂ تاریخ ہے۔

تاریخ ولادت ؎

چوں در شش محرم زاد آں شہ مکرم

تاریخ مولدش ہم آمد شش محرم

خواجہ کلال بیگ نے بابر کے مرثیہ میں یہ شعر کہا ہے ؎

بے تو زمانہ و فلک بے مدار حیف

باشد زمانہ و تو نباشی ہزار حیف

عہد بابری کے عالم

بابر کے وقت کے ممتاز عالم شیخ زین خاں[2] تھے، جنھوں نے "تاریخ واقعات بابری" کا جو خود بابر بادشاہ نے لکھی ہے بڑی عمدہ عبارت میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ شعر اُن کے ہی طبع زاد ہیں ؎

آرمیدی بہ رقیباں و رمیدی از ما	ما چہ کردیم و چہ دیدی و چہ بشنیدی از ما
بہر دل بردن ما حاجت بیداد نبود	می سپردیم اگر می طلبیدی از ما

؎

بس کہ گشتم تنگ دل در آرزوئے آں دہن	تنگ شد بر جان من راہ برون رفتن ز تن
ہست شعر من ز عقل و نقل خواہم بشنود	جامع المعقول والمنقول مولانا حسن

ایک دوسرے فاضل مولانا بقائی تھے۔ اُنھوں نے مخزن کی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی۔
ایک اور عالم مولانا شہاب الدین معمائی تھے۔ معمہ کے فن میں ان کو ایسی مہارت تھی کہ ان کے سامنے ان کے

---

[1] بابر کی وفات بروز پیر ۵ جمادی الاول ۹۳۷ھ میں ہوئی۔ اس نے وصیّت کی تھی کہ اس کی لاش کابل میں دفن کی جائے۔ اس لیے چندے میت "نور افشاں باغ" جسے اب آگرہ میں آرام باغ کہتے ہیں میں امانت رہی، پھر کابل لے جاکر "قدم گاہ رسول" میں دفن کیا گیا۔ شاہ جہان نے قبر پر سنگ مرمر کا مقبرہ تیار کرایا۔

[2] ان کا پورا نام شیخ زین الدین خاں خوافی تھا اور تخلص وفائی۔ آگرہ میں جمنا کے دوسری طرف ان کی یادگار ایک مدرسہ اور مسجد ہے فن معما، تاریخ گوئی، بدیہہ گوئی اور نظم و نثر کی تمام اصناف میں بے مثل عالم تھے۔ ان کا انتقال چنار گڑھ کے حدود میں ۹۴۰ھ میں ہوا۔ آگرہ میں اپنے ہی مدرسہ میں دفن ہوئے۔

دوسرے اوصاف وکمال لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

جس زمانہ میں اسمٰعیل[1] صفوی کی طرف سے خراسان پر درمیش خاں حاکم ہو کر آیا تھا ایک محدث میر جمال الدین نے ایک دن اپنے وعظ میں آیت

"اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ"

اور یہ صحیح حدیث کہ "دنیا کی پیدائش سات دن میں ہوئی" پڑھی اور ان دونوں کے مضمون میں جو اختلاف معلوم ہوتا ہے (آیت میں آسمان و زمین کے چھ دن میں پیدا ہونے اور حدیث میں دنیا کے سات دن میں پیدا ہونے کا ذکر ہے) اس کو رفع کیا تھا۔ مولانا شہاب الدین نے ان کی تقریر کو رد کر کے حدیث اور آیت کی مطابقت میں کئی ایک عمدہ وجہیں لکھی تھیں۔ اس رسالہ پر اکثر علماء نے تقریظیں لکھی تھیں۔ میں نے (مصنف بداؤنی) بھی نظم و نثر میں تھوڑا بہت لکھا تھا۔ ایک رباعی یہ ہے ؎

این نسخہ کہ آمدہ است چوں سحر حلال
نظم و نثرش پاک تر از آب زلال
نورے ست ز انوار شہاب ثاقب
کز منقبتش زبان فکرت شدہ لال

مولانا شہاب الدین نے "اسم کاشف" کا معمہ[2] ان اشعار میں پیش کیا ہے ؎

از بہر فریب دل ما خستہ دلال
ہر لحظہ ز ناز آں صنم غنچہ دہاں
بر صفحۂ گل کرد رقم آں سر زلف
وانگہ رخ سہ کرد زیک گوشہ عیاں

ہمایوں بادشاہ نے ۹۴۲ھ میں جب سفر گجرات سے مراجعت کی تھی اس وقت مولانا شہاب الدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی وفات کا مادۂ تاریخ میر اخوند مورخ نے کہا تھا:

"شہاب ثاقب"

بابر کی علم دوستی | خود بابر بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کی خاص ایجاد "خط بابری" ہے۔ اس خط میں قرآن لکھ کر

---

[1] اردبیل کے صفوی شیخ زادوں میں سلطان حیدر کا لڑکا تھا۔ ۸۹۲ھ میں اردبیل میں پیدا ہوا۔ تیرہ سال کی عمر میں چار ہزار کی جمعیت فراہم کر کے شیروان شاہ کو شکست دی اور تبریز، آذربائیجان اور اردبیل کے علاقہ پر خود مختار بادشاہ بن گیا۔ تبریز کو پایہ تخت بنایا اور شیعہ صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اصفہان و شیراز پر سلطان مراد ترکمان کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ بغداد بھی اس کے تسلط میں آ گیا تھا۔

صفوی خاندان کے اس پہلے بادشاہ نے ایران کے بڑے حصہ پر ۲۴ سال حکومت کی اور ۳۷ سال کی عمر میں شہر سراب میں بیمار ہو کر انتقال کیا۔ مشہور صفوی بادشاہ طہماسپ، اسی کا بیٹا اور جانشین تھا جس سے مدد لے کر ہمایوں دوبارہ ہندوستان آیا تھا۔

[2] معماگوئی کے فن میں ان کا ایک رسالہ "تبیین و توضیح علم معما" مشہور رہا ہے۔

اس نے مکہ معظمہ روانہ کیا تھا۔ اس کی ترکی اور فارسی اشعار کا ایک دیوان بھی مشہور ہے۔

بابر نے ایک کتاب "فتح مبَین" (ب اور ی پر زبر) فقۂ حنفی میں لکھی تھی، اس کی شرح شیخ زین نے "شرح مُبِین" (ب زیر کے ساتھ) کے نام سے لکھی ہے۔

فنِ عروض میں بھی بابر کے رسالے مشہور ہیں۔

نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ

باپ کے مرنے کی خبر ملتے ہی ہمایوں سنبھل سے کوچ کر کے دار الخلافہ آگرہ پہنچا اور وکیل سلطنت و وزیر مطلق امیر خلیفہ کے مشورہ و حمایت سے ۹۳۷ھ میں تخت نشین ہوا۔

شاعروں نے اس کے جلوس کی تاریخ لکھی ہے ؎

محمد ہمایوں شاہ نیک بخت — کہ خیر الملوک است اندر سلوک
چو بر مسندِ بادشاہی نشست — شدش سالِ تاریخ "خیر الملوک"

اس نے جلوس کے موقع پر سونے سے بھری ہوئی کشتیاں تقسیم کرائی تھیں۔ اس لیے کسی نے اس کی تاریخ جلوس "کشتی زر" بھی نکالی۔

۱؎ فتح مبین، فرشتہ نے بابر کی اس کتاب کا نام "مثنوی مبین" لکھا ہے۔ ممکن ہے پورا نام "مثنوی فتح مبین" ہو کیونکہ یہ کتاب ترکی نظم میں تھی اور فقہ کے موضوع پر۔ بابر کی فقہ حنفیہ میں مہارت کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے ، "وہ مجتہدانہ قوت رکھتا تھا"۔ اس مثنوی کے چند شعر "واقعات بابری" میں بھی درج ہیں۔ اس نے اپنے حالات پر جو تزک لکھی ہے وہ بھی ترکی میں ہے۔ اکبر کی فرمائش پر عبد الرحیم خانِ خاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی کا نام "واقعات بابری" ہے۔ محمد قاسم فرشتہ نے بابر کی تزک کے متعلق لکھا ہے: "بنوعی نوشتہ کہ فصحا قبول دارند"۔ بابر علم موسیقی، شعر، انشاء اور املاء میں بھی ماہر تھا" (فرشتہ) فرشتہ نے بابر کے نام سے ایک شعر نقل کیا ہے ؎

باز آئے اے ہمائے کہ بے طوطی خطت — نزدیک شد کہ زاغ برد استخواں من

لیکن یہ فرشتہ کی غلطی ہے۔ کیونکہ بابر نے اپنی تزک میں یہ شعر خود حسن یعقوب کا بتایا ہے۔ بابر بڑا اچھا ادبی نقاد بھی تھا۔ خواجہ آصفی کے کلام کی نسبت اس نے بڑی موزون رائے دی ہے "شعرِ او از رنگ و معنی خالی نیست اگرچہ از عشق و حال بے بہرہ است"۔ فنِ عروض میں بھی بابر کو بڑی مہارت تھی۔ اس نے خود ترکی میں ایک شعر کہا ہے جو ۵۰۴ اوزان میں تقطیع ہو سکتا ہے۔ عروض پر بھی اس کا ایک رسالہ ہے۔ موسیقی میں بھی بڑی اچھی دسترس تھی معاصر موسیقاروں کے حسن و قبح پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ مشہور مصوّر بہزاد بابر کا ہمعصر تھا اس نے بہزاد کی ایک تصویر کے نقائص بھی ظاہر کیے ہیں۔ بابر حقیقت پسند انسان تھا۔ چنانچہ اس کے راستباز قلم نے نہ خود اپنے باپ کے عیوب چھپائے اور نہ اپنے جانی دشمنوں کے ہنروں پر پردہ ڈالا۔ تاتاری مغل چنگیز خاں کے لائحہ عمل "تورہ چنگیز خانی" کو بڑا متقدس سمجھتے تھے۔ بابر نے لکھا "تورہ چنگیز خانی کوئی آیت نہیں کہ خواہ مخواہ اس پر عمل کیا جائے، جس کسی نے اچھی بات نکالی ہو اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر باپ نے کوئی بد روش جاری کی ہو تو اس کو نیکی سے بدل دینا چاہیئے"۔ غرض بابر دربار میں بادشاہ، جنگ میں سپہ سالار، بزم میں یار باش رند، اہلِ علم کی صحبت میں محقق اور نقاد تھا۔

ہمایوں کی لشکر کشی

سلطنت کے نظم و نسق سے فراغت پاکر ہمایوں نے کالنجر پر فوج کشی کرکے اُسے فتح کر لیا۔ جون پور میں سکندر لودی کے بیٹے سلطان عالم نے بغاوت کر دی تھی، اس پر بھی حملہ کرکے اس فتنہ کو ختم کیا۔

ان فتوحات کے بعد آگرہ واپس آکر بادشاہ نے ایک بھاری جشن منعقد کیا۔ اس جشن میں بارہ ہزار آدمیوں کو خلعتیں عطا کی گئی تھیں۔

اسی زمانہ میں محمد زمان میرزا جو کچھ عرصہ سے باغی ہوگیا تھا گرفتار ہوکر آیا۔ ہمایوں نے اسے بیانہ کے قلعہ میں بھیج کر اندھا کر دینے کا حکم دیا تھا لیکن حسن اتفاق سے اس کی بینائی سلامت رہی اور کچھ دن بعد وہ قید سے بھاگ کر گجرات کے بادشاہ سلطان بہادر[1] گجراتی کے پاس پناہ گزین ہوگیا۔

سلطان بہادر گجراتی

جس وقت محمد زمان مرزا سلطان بہادر گجراتی کے ہاں گیا، وہ چتوڑ کا محاصرہ کیے پڑا تھا موسم نہایت گرم تھا، گرمی سے محمد زمان کو اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ طبیبوں نے صرف گلقند علاج میں تجویز کیا۔ مرزا نے سلطان بہادر کے پاس سے تھوڑا سا گلقند منگوایا۔ سلطان نے اپنے شراب دار کو بلا کر پوچھا "لشکر کے ساتھ کتنا گلقند ہے؟" اُس نے عرض کیا "بیس سے زیادہ چھکڑے گلقند سے بھرے ہوئے موجود ہیں"۔ سلطان نے وہ سارے چھکڑے محمد زمان کے پاس بھجوا دیے اور معذرت بھی کی کہ "ازراہ کرم معاف فرمائیں حالت سفر میں لشکر کے ساتھ فقط اتنا ہی گلقند موجود تھا"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سلطان بہادر کے لیے گلقند کا عرق

---

[1] شاہان گجرات۔ ابوالفضل کی فہرست کے مطابق گجرات پر سراج چاورہ سے سامنت تک سات راجاؤں نے ۱۹۶ سال اور مولراج سولنکی سے لکھمول تک دس راجاؤں نے ۲۴۴ سال پھر ہردمول باگھیلہ سے کرن تک چھ راجاؤں نے ۱۲۶ سال حکومت کی۔ اس کے بعد سے مسلمان بادشاہوں کا سلسلہ ہے جو سلطان مظفر تانک سے شروع ہوکر سلطان مظفر نام کے ہی آخری بادشاہ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ۱۴ بادشاہ ہیں جنہوں نے اکبر کے عہد تک ۱۶۰ سال حکومت کی ۔۔۔۔۔ ہندی مورخوں کا کہنا ہے کہ ۸۰۳ بکرمی مطابق ۱۵۴ھ میں ایک راجہ جس کا نام سراج، پتراج، مزاج، بنراج لکھا جاتا ہے یہاں خود مختار حکومت قائم کی تھی۔ یہ زمانہ غالباً راجہ سری بھوردیو والیٔ قنوج کا تھا۔ ۱۰۶۲ بکرمی مطابق ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی نے گجرات کو فتح کیا تھا لیکن یہاں ایک ہندو راجہ کو ہی حکومت سپرد کر دی تھی۔ پھر سلطان معزالدین سام اور قطب الدین ایبک نے بھی گجرات کو فتح کیا، لیکن اس کی خود مختاری باقی رہی۔ آخری باگھیلہ راجہ کرن یا کارن کو سلطان علاؤالدین خلجی نے شکست دے کر دکن کی طرف بھگا دیا اور گجرات دہلی کے تحت صوبہ بن گیا۔ محمد بن فیروز شاہ تغلق کے عہد میں گجرات کے امرائے عمدہ نے بغاوت کی اور سلطان محمود تغلق کے زمانہ تک طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ سلطان محمود کے عہد میں ظفر خاں نامی سردار نے خود مختاری اختیار کرکے اپنا خطاب سلطان مظفر رکھا۔ یہ ظفر خاں وجیہہ الملک کا بیٹا تھا جو نو مسلم برہمن تھا اس کا قبیلہ ٹانک کہلاتا ہے۔ مظفر خاں کے بعد اس کا پوتا احمد سلطان ہوا۔ احمد آباد اسی بادشاہ نے بسایا تھا۔ اس کے بعد محمد شاہ پھر قطب الدین احمد شاہ اس کے بعد داؤد شاہ حکمران ہوئے، اس کے بعد محمود شاہ نے گجرات کو بڑی رونق بخشی، اس کے بعد سلطان مظفر حکمران ہوا۔ اس کے پاس شاہ اسمٰعیل صفوی شاہ ایران نے سفارت اور تحفے روانہ کیے تھے۔ اس کے بعد سلطان سکندر تخت پر بیٹھا، اس کے بعد نصیر خاں تخت نشین ہوا، اسی نے اپنے امراء کی سازش کے خلاف بابر سے مدد طلب کی تھی، اس کے بعد سلطان سکندر کا بیٹا سلطان بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کو ہمایوں نے شکست دی تھی، پھر خاندیس کے شہزادہ میران محمد کو گجرات کے امیروں نے بادشاہ بنایا، اس کے بعد سلطان مظفر کا پوتا سلطان محمود تخت پر بیٹھا، اس کے بعد ایک مقتدر امیر اعتماد خاں نے سلطان احمد ثانی اور سلطان مظفر دو لڑکوں کو یکے بعد دیگرے برائے نام بادشاہ بنا کر حکومت سنبھال لی۔ پھر اکبر نے اس ملک کو فتح کرکے دہلی کے ماتحت کر دیا۔

کشید کیا جاتا تھا، اسی وجہ سے اس قدر گلقند ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

اس دوران میں محمد زمان میرزا نے اپنے دونوں بیٹوں الغ مرزا اور شاہ مرزا کے ساتھ حملہ کر کے قنوج میں فساد برپا کر دیا۔ ہمایوں نے کئی بار محمد زمان میرزا کو روانہ کرنے کے لیے سلطان بہادر کو خط لکھے لیکن اس نے ہمیشہ دو ٹوک جواب بھیج دیا۔ اس کی اس گستاخی پر ہمایوں نے گجرات کی تسخیر کا ارادہ کر لیا۔

اس زمانہ میں سلطان بہادر نے رانا سانگا[1] کے خلاف لشکر کشی کر کے چتوڑ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس کی طرف سے تاتار خاں لودی نے حملہ کر کے بیانہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور آگرہ تک چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ تاتار خاں نے تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ میرزا ہندال پر بھی یورش کی اسی لڑائی میں تاتار خاں مارا گیا۔

جس زمانہ میں سلطان بہادر نے چتوڑ کا دوسری مرتبہ محاصرہ کیا تھا اُسی وقت ہمایوں نے آگرہ سے گجرات کا عزم کیا۔ اسی زمانہ میں لاہور سے میرزا کامران نے قندھار پر حملہ کر کے شاہ طہماسپ کے بھائی سام مرزا کو جس نے ان دنوں خواجہ کلاں بیگ کا محاصرہ کر رکھا تھا شکست دی۔ اس فتح کی تاریخ ہے:

"زدہ بادشہ کامران سام را"

مولانا بیکس نے تاریخ کہی ؎

آں دم کہ تاج و کاسۂ زر در نظر نمود — در بزم و رزم شکل صراحی و نقش جام
پرسیدم از خرد کہ چرا تاج زرفشاں — افگندہ ہمچو لالۂ حمرا دریں مقام
گفتا سپہر از پئے تاریخ ایں مصاف — افگندہ تاج زر ز شکست سپاہ سام

سلطان بہادر سے مقابلہ

ہمایوں نے گجرات پر حملہ کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر سارنگ پور میں ٹھہر گیا کہ "ایسے وقت میں جبکہ غنیم چتوڑ کے محاصرہ میں لگا ہوا ہے اس پر فوج کشی کر کے اس محاصرہ سے ہٹا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لینا شیوۂ مردانگی نہیں بلکہ باعثِ رسوائی ہے۔"

سلطان بہادر نے بھی جلد از جلد قلعہ چتوڑ کو فتح کر لیا اور اس مہم سے فارغ ہو کر ہمایوں کے مقابلہ کی تیاری کی۔ مندسور کے نواح میں فریقین کے درمیان دو ماہ تک حالت جنگ رہی۔ اس دوران میں سلطان بہادر کے لشکر میں غلہ کی رسد بند ہو گئی۔ اس کے سپاہی اور مویشی بھوکوں مرنے لگے، مجبور ہو کر سلطان بہادر اپنے پانچ معتمد ساتھیوں کے ساتھ خیمہ گاہ کے عقب سے نکل کر مندسور بھاگ گیا۔ اس فتح کی تاریخ کا قطعہ ہے ؎

---

[1] بداؤنی نے یہاں غلطی کی ہے۔ رانا سانگا نے بابر سے ۹۳۴ھ / ۱۵۲۸ء میں شکست کھائی تھی اور میواڑ کے پہاڑوں میں بھاگ گیا تھا جہاں اسی سال وہ اس شکست کے صدمہ سے مر گیا۔ اس صورت میں وہ ۹۳۷ھ میں کس طرح سلطان بہادر سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ عہد ہمایوں میں بہر حال سانگا زندہ نہیں تھا۔ رانا سانگا کے بعد ۱۵۲۸ء میں رتن سی جی جانشین ہوا۔ اس کے بعد ۱۵۳۲ء میں بکرماجیت چتوڑ کا راجہ بنا۔ اور اسی راجہ پر ۱۵۳۵ء میں سلطان بہادر نے حملہ کیا تھا دوبارہ ۱۵۳۶ء میں حملہ کر کے چتوڑ فتح کر لیا اور بکرماجیت بھاگ گیا۔ اس نے بعد میں پھر چتوڑ پر قبضہ کر لیا تھا۔

همایوں شاہ غازی آنکہ اوراست — ہزاراں بندہ چوں جمشید در خور
بفیروزی چو آمد سوئے گجرات — مظفر گشت فخر آلِ تیمور
بہادر چوں ذلیل و خوار گردید
شدہ تاریخ آں "ذلِّ بہادر"

ہمایوں نے بہادر کا تعاقب کیا۔ ایک دن تو مغل لشکریوں نے اسے سوتے ہوئے گھیر لیا لیکن وہ جاگ کر نہایت پھرتی کے ساتھ اُن کے نرغہ سے نکل آیا اور چھ سات سواروں کے ساتھ گجرات بھاگ گیا۔ البتہ سلطان عالم لودی پکڑا گیا اور اس کے پاؤں کے جوڑ کاٹ دیے گئے۔

ہمایوں سلطان بہادر کے تعاقب میں احمد آباد پہنچ گیا اور اس شہر کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ سلطان بہادر احمد آباد سے بھاگ کر کھنبایت اور وہاں سے بندر دیپ کی طرف نکل گیا۔ اس یلغار میں قلعہ جاپانیر[1] پر بھی ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس قلعہ سے بادشاہ کو بڑا خزانہ غنیمت میں ملا۔ اس مہم کی تاریخ ہے ؎

تاریخ ظفر ! فتح شاہ ہمایوں
می جُست خرد یافت نہ شہرِ صفر بود
۹۴۲

مرزا عسکری کی سرکشی

سلطان بہادر گجراتی نے دوبارہ سورت کے زمینداروں کو اپنے ساتھ لے کر احمد آباد پر قبضہ کا ارادہ کیا تھا۔ ہمایوں احمد آباد مرزا عسکری کے حوالہ کر کے برہان پور چلا گیا تھا۔ ہمایوں کے جاتے ہی میرزا عسکری نے امیر ہندو بیگ قوچین کی تائید و حمایت سے چاہا تھا، کہ اپنے نام کا خطبہ پڑھوا کر بادشاہت کا اعلان کرے لیکن بہادر خاں کی سرکشی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوا اور وہ بہادر خاں سے کچھ مقابلہ کر کے جاپانیر کی طرف چلا گیا۔

جاپانیر کے حاکم تردی بیگ کو جب میرزا عسکری کے ارادوں کا پتہ چلا تو اس نے قلعہ بند کر لیا اور عسکری کو داخل نہ ہونے دیا۔ اور ایک عریضہ بھیج کر ہمایوں کو عسکری کے باغیانہ خیالات کی اطلاع دی۔ جس وقت ہمایوں منڈو سے آگرہ کی طرف جا رہا تھا، میرزا عسکری ہر طرف سے مایوس ہو کر خدمتِ شاہی میں حاضر ہو گیا اور سلطان بہادر نے تردی بیگ سے صلح کر کے جاپانیر پر قبضہ کر لیا۔

اسی سال جمالی کنبو[2] کی وفات ہوئی، ان کا مادۂ تاریخ ہے: "خسروِ ہند بودہ"۔
۹۴۲ھ

---

[1] قلعہ جاپانیر۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اس کا نام "جانپانیر" لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے "نہایت عمدہ اور خوش منظر قلعہ ہے جو بے حد بلند پہاڑ پر ہے۔ قلعہ پر جانے میں ڈھائی کوس کا بعید طویل اور دشوار گزار راستہ طے کرنا پڑتا ہے، اس راہ میں جگہ جگہ دروازے نصب ہیں۔ ایک جگہ ساٹھ گز کی چٹانوں پر تختہ بندی کی گئی ہے جو لڑائی میں مورچہ کا کام دیتی ہے۔ یہاں میوے عمدہ ہوتے ہیں۔ پہاڑ پر بالائی قلعہ کو "پاوا" کہتے ہیں۔ دوسرا قلعہ پہاڑ کے نیچے ہے۔" اکبر کے وقت یہ صوبہ گجرات کی سرکار تھا جس میں نو محال تھے۔

[2] جمالی کنبو۔ آزاد حسین واسطی نے "خزانۂ عامرہ" میں لکھا ہے یہ ایک باکمال سخنور شاعر تھے، نام فضل اللہ تھا قوم کنبو تھی، قوم کنبو کے دہلی میں قاضی اور مفتی تھے۔ حرمین کی زیارت کے لیے گئے اور سلطان حسین مرزا کے عہد میں خراسان کا سفر کیا اور مولانا جامی اور جلال الدین دوانی سے فیض حاصل کیا۔ وفات ماہ ذی قعدہ ۹۴۳ھ میں ہوئی۔ حضور اکرمؐ کی نعت میں ان کا یہ شعر مشہور ہے ؎
موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک پرتوِ صفات — تو عین ذات می نگری در تبسمی

طہماسپ کا حملہ | اسی سال سام میرزا کا بدلہ لینے کے لیے عراق سے شاہ طہماسپ[1] قندھار پہنچا۔ خواجہ کلاں بیگ نے شہر خالی کر دیا اور اس حال میں وہاں سے نکلا کہ دیوان خانہ جو عمدہ فرش اور مجلسی ساز و سامان سے آراستہ تھا اسی طرح مقفل پڑا

---

[1] شاہ طہماسپ ایران کے صفوی سلسلہ کا دوسرا بادشاہ ہے۔ اپنے باپ شاہ اسمٰعیل صفوی کا ۹۳۰ھ میں جانشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بابر نے کابل سے پنجاب پر حملے شروع کر دیے تھے۔ اس نے عثمانیوں اور ازبکوں کو شکست دی، ۵۴ سال حکومت کے بعد ۹۸۴ھ میں وفات پائی۔ اس نے خود اپنا ایک "تذکرہ" لکھا ہے اس میں اپنی تخت نشینی کی تاریخ لکھی ہے "بتاریخ نہصد و سی (۹۳۰ھ) از ہجرت در محل (وقت) چاشت روز دوشنبہ نوزدہم شہر رجب موافق پیچی ئیل ترکی جلوس بر سریر جہانبانی واقع شدہ در سن دہ سالگی" اور تاریخ پیدائش "و مولود در بیست و ششم شہر ذی حجہ سنہ عشرین تسعمائہ (۹۲۰ھ) بودہ موافق ایت ئیل ترکی" "و تاریخ جلوس "ظل" است"

یہاں ہم صفوی سلسلہ کی وضاحت کے لیے شاہان ایران کا ایک مجمل خاکہ تحریر کر دیتے ہیں۔

۱۔ ایران کی قدیم تاریخ پیشدادیوں سے شروع ہوتی ہے جس میں پہلا بادشاہ کیومرث ہے۔ اس کے بعد ہوشنگ، طہمورث دیوبند، جمشید (جس کا جام مشہور ہے) ضحاک، فریدوں، منوچہر، نوذر ذاب، گرشاسپ۔

۲۔ شاہانِ قدیم کا دوسرا سلسلہ کیانی سلاطین کا ہے جس کا بانی کیقباد ہے۔ اس کے بعد کیکاؤس، کیخسرو "لہراسپ" گشتاسپ، بہمن، دارائے اول، دارائے ثانی۔

۳۔ یہ دو سلسلے مشرق کے مورخین بیان کرتے ہیں، مغربی مورخین ایران کی قدیم تاریخ کو ہخامنش بادشاہوں سے شروع کرتے ہیں یہ دور ۵۵۹ قبل مسیح سے ۲۲ عیسوی تک کا ہے۔ اس دور میں پہلے ایرانی حکمران ہیں پھر مدیی اس کے بعد کو اس کی سلطنت شروع ہوتی ہے، اس کے بعد اس کا بیٹا کامبتر پھر کوماتائی، داریوش، خشایارشا، اردشیر، داریوش ثانی، اردشیر دوم، اردشیر سوم، داریوش سوم (جسے سکندر اعظم نے شکست دی) اسکندریوں کے بعد ۲۵۴ قبل مسیح سے اشکانی سلاطین کا سلسلہ ہے جس کا بانی اشک اول اس کے بعد اشک دوم، اردوان اول، فرہاد دوم، مہرداد اول، ارد، فرہاد چہارم (اس کے آخری عہد میں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے) بلاش اول، اردوان چہارم۔ ان بادشاہوں کے بعد ۲۲ عیسوی سے ساسانیوں کا ظہور ہوتا ہے جن کا بانی اردشیر بابکان ہے۔ اس کے بعد شاپور اول، بہرام دوم، نرسی، شاپور ثانی، یزدگرد اول، بہرام پنجم، فیروز، قباد، انوشیروان عادل (۵۷۹ء) (اس کے زمانہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی) ہرمز چہارم، خسرو پرویز، آخر ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم جو ۱۰ھ کو تخت پر بیٹھا اور جنگ نہاوند میں ۶۴۱ء کو مارا گیا اور ساسانی حکومت ختم ہو گئی۔

۴۔ مسلمانوں کی ایران پر حکمرانی حضرت عمرؓ کے زمانہ ۳۳ھ سے شروع ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک اور بنو عباس ۱۳۲ھ سے ۲۵۳ھ تک حکمران رہے۔ ان کے بعد صفاریوں نے ۲۵۳ھ سے ۲۹۳ھ تک حکومت کی۔

۵۔ صفاریوں کا بانی یعقوب بن لیث تھا، اس کے بعد عمرو بن لیث پھر ایک شخص خلف بن احمد حکمران ہوا۔

۶۔ صفاریوں کے علاوہ ایران کے سلاطین کا دوسرا سلسلہ سامانی بادشاہوں کا ہے جس کے بانی نصر اور اسماعیل ہیں، جنہوں نے معتمد خلیفہ عباسی کے عہد میں ۲۷۹ھ میں خود مختاری اختیار کی۔ ان کے بعد اس سلسلہ کے بادشاہ اسماعیل، احمد، نوح، عبد الملک گزرے ہیں۔

۷۔ عبد الملک سامانی کے عہد سے غزنوی سلاطین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کے افراد الپتگین، سبکتگین، سلطان محمود، سلطان مسعود۔ صفاریوں نے چالیس سال حکومت کی، ان کا پایۂ تخت سیستان تھا، سامانیوں نے سو سال حکومت کی ان کا پایۂ تخت بخارا تھا۔ غزنویوں نے ۳۲۲ھ سے ۴۲۱ھ تک تقریباً سو سال حکومت کی۔ پایۂ تخت غزنی تھا۔

۸۔ ایران کے مسلمان بادشاہوں کا ایک اور سلسلہ آل بویہ کا ہے جنہوں نے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہوا تھا۔ شاہ طہماسپ نے اسی دیوان خانہ میں اپنی نشست رکھی اور خواجہ بیگ کی بڑی تعریف کی کہ "کامران میرزا نے نوکر تو بہت اچھا رکھا ہے۔" پھر وہ اپنے ایک امیر بدرغ خاں کو قندھار پر متعین کر کے عراق واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی کے بعد کامران میرزا نے قندھار پر حملہ کر کے دوبارہ اسے فتح کر لیا۔

سلطان بہادر چھینی ہوئی حکومت واپس لینے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس نے محمد زماں میرزا کو فتنہ و فساد برپا کرنے کے لیے ہندوستان بھیج دیا تھا۔ جس وقت میرزا کامران لاہور سے رخصت ہوا تو اس نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جب بادشاہ کے لوٹنے کی خبر ملی تو محاصرہ اُٹھا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔

شیر خاں کا فتنہ

باوجود اس کے کہ اطراف و اکناف سے کئی ایک فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے ہمایوں نے آگرہ سے حرکت نہ کی۔ ہمایوں کی اس لاپروائی سے شیر خاں افغان سوری نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور گور، بہار، جون پور اور قلعہ چنار پر قبضہ کر لیا اور اس کی طاقت کافی بڑھ گئی۔

شیر خاں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے گھبرا کر آخر کار ہمایوں نے آگرہ سے کوچ کیا اور ۱۴ صفر ۹۴۳ھ کو قلعہ چنار سے باہر کیمپ لگا دیا۔ یہاں شاہی لشکر سے شیر شاہ کے بیٹے جلال خاں نے جو اسلام شاہ کے خطاب سے شیر شاہ کا جانشین بنا تھا مقابلہ کیا لیکن مغل لشکر کے ماہر فن آتش باز رومی خاں کی تدبیروں سے چنار کا قلعہ جلد ہی فتح ہو گیا۔

یہ رومی خاں وہی شخص ہے جس کے نام کو سلطان بہادر نے ایک معمہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

حیف باشد نام آں سگ بر زباں میخ در جانش نہ و نامش بخواں

(بقیہ حاشیہ شاہ طہماسپ صفحہ گزشتہ) ۳۲۲ھ سے ۴۴۷ھ تک ۱۰۰سو سال حکومت کی۔ ان کا بانی علی بویہ تھا۔ اس کے بعد عماد الدولہ، عضد الدولہ، موید الدولہ اور فخر الدولہ ان کا پایۂ تخت مازندران تھا۔

۹۔ آل بویہ کے بعد سلاطین سلجوق کا دور شروع ہوتا ہے جو ۵۹۰ھ تک حکمران رہے ان کا بانی طغرل بیگ اول تھا۔ اس کے بعد الپ ارسلان، جلال الدین ملک شاہ، سلطان سنجر، طغرل سوم، سلجوقی تقریباً ڈیڑھ سو سال حکمران رہے۔ اسماعیلی فرقہ کا ظہور اسی دور میں ہوا پہلی صلیبی جنگ سلطان ملک شاہ کے لڑکے برکیارق کے عہد میں ہوئی۔ خواجہ نظام الملک الپ ارسلان اور ملک شاہ دونوں کا وزیر تھا۔

۱۰۔ خوارزم شاہی بادشاہوں نے ۵۲۱ھ سے خود مختاری اختیار کی ان کا بانی قطب الدین محمد خوارزم شاہ ہے اس کے بعد علاؤالدین تکش، سلطان محمد (اسی کے زمانہ میں چنگیزی حملے شروع ہوئے) سلطان جلال الدین یہ سلسلہ ۶۲۸ھ تک رہا۔

۱۱۔ خوارزم شاہیوں کے بعد چنگیزی مغلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے بعد ہلاکو خاں اس کے بعد غازان خاں حکمراں رہے (یہ پہلا چنگیزی مغل بادشاہ ہے جس نے اسلام قبول کیا) سلطان محمد خدا بندہ۔

۱۲۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد تیموری سلاطین برسر اقتدار ہوئے جن کا بانی تیمور خاں تھا اس کے بعد مرزا شاہرخ، الغ بیگ نے حکومت کی تیموری خاندان ۹۲۰ھ کے لگ بھگ تک حکمراں رہا۔

۱۳۔ تیموریوں کے بعد صفویوں نے حکومت سنبھالی، ان کا بانی سلطان اسمٰعیل صفوی تھا۔ اس کے بعد شاہ طہماسپ، شاہ عباس بزرگ، شاہ صفی، شاہ عباس ثانی، شاہ سلیمان، شاہ سلطان حسین، شاہ طہماسپ دوم صفوی ۱۱۳۵ھ تک حکمران رہے

۱۴۔ صفویوں سے نادر شاہ افشار نے ۱۱۴۸ھ میں حکومت چھین لی۔ اس کے بعد ایک شخص کریم خاں زند نے ۱۱۷۲ھ میں حکومت کی۔

۱۵۔ قاچاری سلطنت ۱۲۵۵ھ سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا بانی آقا محمد خاں قاچار تھا جس نے طہران کو پایۂ تخت بنایا۔ آقا محمد کے بعد فتح علی شاہ پھر عباس مرزا محمد شاہ، ناصر الدین شاہ آخری بادشاہ ہوا۔ مظفر الدین شاہ اور محمد علی شاہ کے بعد رضا شاہ پہلوی نے پارلیمانی بادشاہت قائم کر دی + اور اب محمد رضا شاہ پہلوی حکمران ہے۔

چنار سے شکست کھا کر جلال خاں دریا کے راستہ بھاگ گیا اور شیر خاں کے لشکر سے جو اُن دنوں حاکم بنگالہ نصیب شاہ سے لڑ رہا تھا جا کر مل گیا۔ نصیب خاں کو شیر خاں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور وہ زخمی ہو کر ہمایوں کے پاس چلا آیا۔

بنگال پر فوج کشی

اسی زمانہ میں ہمایوں نے ہندو بیگ توچین کو امیر الامراء کا عہدہ دے کر جون پور کی حکومت پر مامور کیا اور اسے ایک زریں کرسی بھی عطا کی۔ خود لشکر لے کر بنگال کی طرف کوچ کیا۔ یہاں ہمایوں نے بہار اور بنگال کے درمیان گڑھی کی تنگ وادی کو عبور کیا۔ اس گھاٹی پر شیر خاں کے لشکر نے بڑی مستحکم ناکہ بندی کر رکھی تھی۔

ہمایوں کی پیش قدمی کی خبر ملتے ہی شیر خاں نے جھار کھنڈ کے راستہ سے یلغار کی اور قلعہ رہتاس[1] پر پہنچ کر وہاں کے راجہ کو پیغام بھیجا "میں اپنی عورتوں وغیرہ کو آپ کے اس مضبوط اور محفوظ قلعہ میں چھوڑ جانا چاہتا ہوں"۔ رہتاس کے راجہ نے اس لالچ میں کہ شیر خاں کی عورتیں اور بہت سامال و اسباب مفت میں ہاتھ آ رہا ہے رضامندی ظاہر کر دی۔ اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ شیر شاہ نے پردہ دار ڈولوں میں دو ہزار سپاہیوں کو بٹھا کر قلعہ میں بھیج دیا۔ جب ڈولے رکھے گئے تو بجائے عورتوں کے سفاک سپاہی تلواریں سونت کر نکل آئے اور تمام قلعہ والوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ اس تدبیر سے شیر شاہ نے رہتاس کے قلعہ پر بآسانی قبضہ کر لیا۔

جنت آباد میں قیام

ہمایوں کو بنگال[2] کی آب و ہوا بہت پسند آئی۔ اس نے گور کا نام جنت آباد رکھ دیا اور دو تین ماہ اسی جگہ ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد وہاں سے واپسی کے ارادہ سے کوچ کیا۔ اس مہلت

---

[1] قلعہ رہتاس۔ یہ قلعہ بہار کے آثار قدیمہ میں سے ہے۔ یہ راجہ ہریش چندر کے بیٹے شہزادہ رہتاسوا سے منسوب ہے۔ ۱۵۳۹ء میں شیر شاہ نے جس راجہ سے یہ قلعہ چھینا تھا اس کا نام ہرکشن تھا۔ ۱۵۹۶ء میں راجہ مان سنگھ نے اپنی صوبیداری کا صدر مقام بنایا تھا۔ ۱۶۲۴ء میں شاہزادہ خرم شاہجہاں نے بغاوت کر کے اسی کو پناہ گاہ بنایا تھا۔ شجاع الدولہ کے زمانہ میں قاسم علی نے یہ قلعہ بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ یہ قلعہ مشرق سے مغرب تک چار میل، شمال سے جنوب ۵ میل کل ۲۸ میل کے دائرہ میں ہے اور جزیرہ نما پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ قلعہ میں ایک محل ہے جس کے دروازہ پر یہ کتبہ ہے:

دروازہ مقیم بنائے چو شد تمام	دروازہ سپہر زرنگش مقیم شد
سال عمارتش چو نمودم بلیغ گفت	از راجہ مان سنگھ بنائے مقیم شد

[2] بنگالہ۔ ابو الفضل کے بیان کے مطابق "اس صوبہ کے مشرق میں سمندر شمال اور جنوب میں پہاڑ مغرب میں صوبہ بہار مشرق میں بھاٹی شمال میں ایک علاقہ کوچ اور کامروپ ہیں۔ یہاں کا حسن اور جادو مشہور ہے۔ بنگال میں ایک درخت ایسا ہے جس کی شاخوں کو کاٹنے سے میٹھا رس ٹپکتا ہے (یہ غالباً تاڑی کا ذکر ہے) یہاں ایک خاص قسم کا آم ہوتا ہے جو پیڑ پر نہیں بلکہ انگور کی بیل کی طرح کے پودے پر لگتا ہے۔ ایک پھول ایسا ہے جو دو ماہ تک نہ خشک ہوتا ہے نہ اس کی رنگ و بو میں فرق آتا ہے اس سے ملا ہوا آسام کے راجہ کا ملک ہے۔ تبت بھی اس سے ملحق ہے جس کے جنوب میں ختا یا ماچین واقع ہے۔ جنوب مشرق میں ایک اور علاقہ ارخنگ ہے۔ چاٹگانو کی بندرگاہ اسی علاقہ میں ہے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

میں شیر خاں نے کافی جمعیت اکٹھی کر لی تھی۔ جب ہمایوں لوٹنے لگا تو شیر شاہ نے اُسے عرضی لکھی کہ تمام پٹھان آپ کے فرماں بردار اور غلام رہنا چاہتے ہیں اور جاگیروں کے طلبگار ہیں، اگر حضور سے ان کو جاگیریں مل جائیں تو امن و چین سے

(بقیہ حاشیہ بنگالہ صفحہ گزشتہ) اونٹ گھوڑے گائے بھینس کمیاب ہیں، ایک ایسا جانور ہوتا ہے جس میں گائے اور بھینس دونوں کے خواص ہیں۔ لوگ اس کا دودھ پیتے ہیں، مقامی لوگ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، بہن سے نکاح کرنے میں عار نہیں۔ درویشوں اور عالموں کو داوتی کہتے ہیں۔ باشندے سیاہ فام ہوتے ہیں قریب ہی پیگو کا علاقہ ہے جسے چین کہتے ہیں۔ یہاں سفید ہاتھی بھی ملتا ہے۔ اسا کاں میں لعل، ہیرے سونا چاندی تانبا گندھک تیل کی کانیں ہیں۔ بنگالہ کا اصلی نام بنگ ہے۔ قدیم حکمرانوں نے بیس گز چوڑے دس گز اونچے ٹیلے تعمیر کرائے تھے۔ ٹیلے کو ملکی زبان میں "آل" کہتے ہیں۔ "بنگ" اور "آل" مل کر بنگالہ بن گیا۔" آل کے متعلق ڈاکٹر زبیر نے اپنے "وقائع" میں لکھا ہے کہ بارش میں جب ہر طرف دلدل اور پانی سے راستے بند ہو جاتے تھے تو بنگال والے اونچی اور چوڑی دیواریں بناتے تھے اس کو آل کہتے تھے اور ان کے ذریعے ہی آمد و رفت ہوتی تھی۔ ان دیواری راستوں میں جگہ جگہ چبوترے بھی ہوں گے جن کا ابو الفضل نے ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ "آل" چبوتروں سمیت انہی دیواری راستوں کا نام تھا۔ بنگال میں گرمی معتدل سردی کم بارش بکثرت ہوتی ہے۔ بحوالہ آئین اکبری "بنگال میں بے شمار دریا ہیں سب سے بڑا پہلا دریا گنگا جس کے منبع کا کسی کو پتہ نہیں۔ ہندو کہتے ہیں یہ مہادیو کے سر کی چوٹی سے نکلا ہے۔ یہ دریا بہر حال شمالی کوہستان سے پھوٹتا ہے۔ دہلی، آگرہ، الٰہ آباد، بہار سے ہوتے ہوئے بنگال میں داخل ہوتا ہے۔ بارنک آباد کے پرگنے قاضی ہٹہ پر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ مشرق کی سمت چاٹگاؤں سے سمندر میں گرتی ہے دوسری جنوب کی طرف تین شہروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہلی نہر سرستی دوسری جمنی تیسری گنگ کہلاتی ہے، ان تینوں کے مجموعہ کو تربینی کہتے ہیں۔ تیسری شاخ سات گاؤں جاتی ہے اور ہزاروں شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بنگال کا دوسرا دریا برہم پتر ہے۔ یہ دریا ختا سے کوچ وہاں سے باذوہا کو سیراب کر کے سمندر میں گر پڑتا ہے اور اس صوبہ کا سمندر بحر محیط کی خلیج ہے۔ خاص پیداوار چاول ہے، اتنی قسمیں چاول کی ہوتی ہیں کہ ہر ایک کا ایک ایک دانہ جمع کیا جائے تو مٹکا بھر جائے۔ چاول کی کاشت سال میں تین مرتبہ ہوتی ہے۔ چاول کا پودا ایک رات میں سات ہاتھ تک بڑھ جاتا ہے۔ بنگالیوں کی مرغوب غذا چاول اور مچھلی ہے۔ مرد عورت برہنہ نیم برہنہ رہتے ہیں۔ مکانات عموماً بانس کے ہوتے ہیں، عورتیں کاروبار کرتی ہیں، سفر کشتیوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ خشکی پر سفر سکھاسن کے ذریعے ہوتا ہے جو ایک چھت دار آرام دہ سواری ہوتی ہے۔ حصیریں بہت عمدہ ہوتی ہیں، یہاں نمک کی بے حد مانگ ہے۔ پھل پھول بکثرت ہیں۔"

بنگال کے حکمران۔ راجہ بھگیرت کھتری سے ست سنگھ تک ۲۴ کھتری راجاؤں نے دو ہزار چار سو اٹھارہ سال حکومت کی۔ پھر راجہ بھوج گوریلے سے راجہ منو بھوج تک نو کائستھ راجاؤں نے پانسو بیس سال حکومت کی۔ راجہ دوسور سے راجہ جیدھر تک گیارہ راجاؤں کے ایک دوسرے کائستھ خاندان نے سات سو چودہ سال حکومت کی، پھر راجہ بھوپال سے راجہ جگ پال لہراد تک دس دوسرے کائستھ راجاؤں نے حکومت کی، پھر سوکہ سین سے راجہ نوجہ تک، سات اشخاص حکمران رہے۔ ان اکسٹھ ہندو راجاؤں کی حکومت چار ہزار پانچ سو چوالیس سال رہی۔

مسلمان بادشاہ۔ ہم پہلے کسی حاشیہ میں شاہانِ بنگال کا حال لکھ چکے ہیں۔ بنگال پر اکبر کے عہد تک کل پچاس مسلمان بادشاہ تقریباً تین سو سال حکمران رہے جن کا سلسلہ سلطان شمس الدین بنگرہ سے شروع ہوتا ہے۔ نصیب خاں کے بعد شیر شاہ بنگال پر حکمران رہا، اس کے بعد یہ ملک ہمایوں کے بھی زیر اقتدار رہا۔ شیر شاہ کے بیٹے سلیم شاہ نے محمد خاں کو بنگال کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد اس کا

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

رہیں گے ورنہ بھوک کے مارے ان کے سرکش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اب تک میں حسن و تدبیر سے ان کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں، آئندہ حضور کی مرضی پر ہی سارا انحصار ہے۔"

ہمایوں اس عرضیہ کو دیکھ کر اس کے اصل منشا سے واقف ہو گیا لیکن اس وقت اس کی توجہ اور ہی معاملات پر لگی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو لشکر کا ساز و سامان درست کرانا تھا کیونکہ ان مسلسل طویل سفروں میں سارا سامان خراب ہو چکا تھا، اکثر گھوڑے اور اونٹ مر چکے تھے، دوسری طرف دہلی سے بابر، محمد سلطان میرزا، الغ مرزا اور شاہ مرزا کی فتنہ انگیزیوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ ان سرکشوں کی گوشمالی کے لیے بادشاہ نے مرزا ہندال کو جو مونگیر تک ہم رکاب تھا متعین کر کے رخصت کیا تھا لیکن وہ اس مہم کے بہانے آگرہ جا کر بیٹھ گیا تھا۔

سلطان بہادر کو فرنگیوں نے دھوکے سے سمندر میں غرق کر دیا اور محمد زمان میرزا بے یار و مددگار رہ گیا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو وہ ہمایوں کی پناہ میں آ گیا۔

۹۴۵ھ میں میرزا ہندال نے شیخ محمد غوث[۱۵] گوالیاری کے بڑے بھائی شیخ بہلول کو قتل کر دیا۔ شیخ بہلول صاحب فضل اور مشہور عامل تھے، بادشاہ بھی ان سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ ان کی تاریخ شہادت ہے:

"نقدمات شہیدا"

مرزا ہندال کی بغاوت

اسی سال مرزا ہندال نے آگرہ میں خود مختاری اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ ہمایوں نے جہانگیر بیگ مغل کو پانچ ہزار سپاہی دے کر بنگال کی حکومت عطا کی اور اسے حسب ضرورت اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کی بھی اجازت دے دی۔ اس انتظام کے بعد ہمایوں نے آگرہ کا رخ کیا۔

(بقیہ حاشیہ بنگال صفحہ گزشتہ) فرزند خضر خاں بہادر شاہ کے لقب سے حکمراں ہوا، پھر سلیم شاہ کا ایک امیر تاج خاں بادشاہ ہوا۔ پھر اس کے بھائی سلیمان نے حکومت کی۔ اس کے دو بیٹوں بایزید اور داؤد آخری حکمران ہیں، جن کے زمانہ میں اکبر نے بنگال کو دہلی کا ماتحت صوبہ بنا لیا۔

[۱۵] شیخ محمد غوث گوالیاری۔ غوث اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی کے سلسلۂ طریقت میں شیخ حاجی حمید کے خلیفہ اور بڑے صاحب کمال بزرگ گزرے ہیں، ان کے دادا مینا پور کے شیخ تھے ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ شیخ غوث لاغر اندام شخص تھے لیکن سیاحت بہت کی تھی۔ ابتدا میں قلعہ کلیجیتر میں وعظ و بیان کا مشغلہ تھا بعد میں راہ سلوک اختیار کی، ہمایوں ان کا معتقد تھا۔ آپ نے ایک کتاب "معراج نامہ" لکھی تھی جس میں اپنی "معراج" کا تذکرہ تھا۔ شیر شاہ کے زمانہ میں اس کتاب پر بڑے اعتراض ہوئے۔ شیر شاہ ان کی فکر میں تھا کہ وہ گوالیار سے گجرات چلے گئے۔ گجرات کے علماء نے بھی ان کو گھیر لیا۔ آخر میں علماء کی مجلس میں جب انھوں نے یہ کہا کہ "مجھے یہ معراج عالم بیہوشی میں ہوئی" تب کہیں جا کر جان بچی۔ آپ کی تصانیف میں جواہر خمسہ، اوراد غوثیہ اور بحر الحیات مشہور ہیں۔ وفات ۱۵ رمضان ۹۷۰ھ میں ہوئی۔ مزار گوالیار میں ہے۔ ہمایوں سے تعلقات کی وجہ سے ان کا بھائی شیخ بہلول عمدہ مناصب پر پہنچ گیا تھا جس کی شہادت کا واقعہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

مخبر الواصلین میں ان کی وفات کی تاریخ ہے:

چوں محمد غوث عالی مرتبت — جانب جنت عنان عزم تافت
گفت تاریخ وصالش ہاتفم — اوج فردوس از محمد زیب یافت

اس وقت شاہی لشکر کی حالت بہت خستہ و خراب تھی۔ ہمایوں کوچ پر کوچ کرتے ہوئے اسی بے سروسامانی کی حالت میں گنگا کے کنارے ایک قصبہ جوسہ نامی پر پہنچ گیا۔ اسی جگہ جون پور اور چنار کے امیر، بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شیر خاں کا حملہ

شیر خاں کو شاہی لشکر کی بے سروسامانی کی پوری اطلاع تھی اور وہ برابر تاک میں لگا ہوا تھا۔ جوسہ میں جب ہمایوں ٹھہر گیا تو اس نے آگے بڑھ کر شاہی فوج کا راستہ روک لیا۔ گنگا کی شاخ رماہی ندی برسات کے پانی سے لبریز چل رہی تھی، اسی ندی کے دونوں کناروں پر فریقین مورچے جمائے ہوئے تھے۔ تین ماہ تک برابر دونوں لشکروں میں لڑائی ہوتی رہی۔

صلح کا پیغام

کہتے ہیں ایک دن ہمایوں نے مُلّا محمد عزیز کو جس کی شیر خاں سے پہلے کی جان پہچان تھی، اپنا قاصد بنا کر اس کے پاس روانہ کیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سخت گرمی میں شیر خاں آستینیں چڑھائے پھاوڑہ ہاتھ میں لیے ہوئے خندق کھود رہا ہے۔ مُلّا محمد کو دیکھ کر اس نے ہاتھ دھوئے ان کے لیے شامیانہ لگوایا اور خود بے تکلّف وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ جب بادشاہ کا پیغام سن چکا تو اس نے کہا۔ "میری طرف سے صرف اتنا جا کر کہہ دیجیے کہ تم تو خود لڑنا چاہتے ہو لیکن تمہارا لشکر لڑنا نہیں چاہتا اور میں لڑنا نہیں چاہتا لیکن میرا لشکر لڑنے پر مُصر ہے۔"

اس کے بعد خود شیر خاں نے شیخ خلیل کو جو حضرت شیخ فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے اور شیر خاں کے پیر تھے صلح کا پیام دے کر بادشاہ کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ "بنگالہ کے سوا میں کسی اور علاقہ سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا اور یہاں بھی میں خطبہ اور سکّہ بادشاہ کے نام کا ہی برقرار رکھوں گا۔ اس عہد کے لیے کلام اللہ کی قسم بھی کھائی۔ ہمایوں نے اعتماد و یقین کر کے صلح پر رضامندی کا اظہار کیا اور پوری طرح مطمئن ہو کر ندی پر پُل باندھنے کا حکم دیا۔

ہمایوں کی شکست

شیر خاں کی طرف سے صلح کا یہ پیام محض ایک دھوکا تھا۔ اس نے دوسرے دن صبح ہی اچانک شاہی لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں کی فوج بالکل ہی بے خبر تھی، پریشانی میں صف آرائی تک نہ ہو سکی اور شیر خاں نے ایک ہی حملہ میں ہمایوں کو شکست دے دی۔ جو پُل اس نے تیار کرایا تھا اُسے پٹھانوں نے توڑ دیا۔ ان کے توپچیوں اور تیر اندازوں نے کشتیوں میں بیٹھ کر ہمایوں پر گولوں اور تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔

اس معرکہ میں محمد زمان میرزا مارا گیا۔ ہمایوں نے اس عالم میں کہ کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا گھبرا کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب ڈوبنے لگا تو ایک سقّہ نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی اور دریا سے پار کرا دیا۔ اُس وقت شیر خاں نے یہ شعر کہا ؎

فرید حسن را تو شاہی دہی
سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

اس کے اُستاد نے اس کو اس طرح اصلاح دی ہے ؎

یکے را بہ آری و شاہی دہی — سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

یہ واقعہ ۹۴۶ھ میں پیش آیا۔ اس کی تاریخ ہے ؎

"سلامت بود بادشاہ کسے"

اس فتح کے بعد شیر خاں نے بنگالہ کے علاقوں پر لشکر کشی کی اور متعدد لڑائیوں کے بعد جہانگیر قلی بیگ کو اس کے لشکر سمیت تباہ و تاراج کر دیا۔ اب سارا بنگال شیر خاں کے قبضہ میں تھا۔ وہ وہاں اپنے نام کا خطبہ پڑھ کر شیر شاہ کے خطاب سے تخت نشین ہو گیا۔ دوسرے سال ہی شیر شاہ نے بڑی تیاریوں کے ساتھ آگرہ کا قصد کیا۔

ہمایوں کے بھائی کامران میرزا کو جب جوسہ کی شکست، شیر خاں کے غلبہ اور میرزا ہندال کی سرکشی کی خبریں ملیں تو وہ قندھار سے لاہور پہنچ گیا اور وہاں سے کوچ کر کے ۹۴۶ھ میں آگرہ میں داخل ہوا۔ مرزا ہندال اس کے آنے سے پہلے ہی دہلی جا چکا تھا، وہاں اس نے میر فخر علی اور میرزا یادگار ناصر کا جو دہلی میں قلعہ بند ہو گئے تھے محاصرہ کر لیا لیکن جب کسی طرح کامیابی حاصل نہ ہوئی تو محاصرہ اٹھا کر آگرہ میں مرزا کامران سے آ کر مل گیا۔ چند دن بعد میر فخر علی بھی کامران کے پاس آ گیا، البتہ مرزا یادگار ناصر برابر دہلی کے قلعہ پر جما رہا، پھر مرزا ہندال کامران سے ٹوٹ کر الور کی طرف چلا گیا۔

ہمایوں کی پریشانی جوسہ کی شکست کا داغ تو تھا ہی، آگرہ میں بھائیوں کی ان حرکتوں کا حال سن سن کر ہمایوں سخت پریشان اور مضطرب تھا۔ ایک دن کامران سراپردہ میں غافل بیٹھا تھا کہ اچانک ہمایوں اندر داخل ہو گیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے مقابل ہو گئے لیکن جیسے ہی ان کی نظریں ملیں خون نے جوش مارا محبت امنڈ آئی اور دونوں گلے مل کر رونے لگے۔ اس کے بعد ہندال مرزا، محمد سلطان مرزا، اس کے دونوں بیٹے جو عرصہ سے مخالفت و سرکش بنے ہوئے تھے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ہمایوں نے سب کے قصور معاف کر دیے اور شیر خاں کی سرکوبی کے لیے ان سب نے مشورہ کیا۔

بظاہر مرزا کامران نے یہ کہا کہ "میرے ساتھ پنجاب کا جو لشکر ہے وہ آراستہ اور تازہ دم ہے اس لیے آپ دار الخلافہ میں رہیں اور میں شیر خاں کے مقابلہ پر فوج کشی کرتا ہوں۔"

ہمایوں نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ چند دن بعد کامران نے پنجاب واپس ہو جانے کی اجازت مانگی اور بادشاہ سے بھاری بھاری مطالبے کرنے لگا۔ ہمایوں نے بجز پنجاب کی اجازت کے اس کے سارے مطالبے قبول کر لیے۔ خواجہ کلاں بیگ بھی کامران کو پنجاب رخصت کر دینے کے لیے سعی کر رہا تھا۔ چھ ماہ بس اسی گفت و شنید میں نکل گئے اور کچھ طے نہ پا سکا۔

اسی دوران میں میرزا کامران کو مختلف بیماریوں نے گھیر لیا۔ طبیبوں نے تشخیص کیا کہ ان تمام بیماریوں کا اصل مادہ زہر ہے جو کسی نے کھلا دیا ہے۔ لگائی بجھائی کرنے والوں نے اس کو ہمایوں کی طرف سے بدگمان کرا دیا اور وہ یہ سمجھ کر کہ ہمایوں نے ہی زہر دلوایا ہے۔ اسی بیماری کی حالت میں پنجاب کی طرف کوچ کر گیا۔ پہلے تو اس نے یہاں تک حامی بھری تھی کہ میں اپنی ساری فوج آگرہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا لیکن اب اس قول کو پس پشت ڈال کر سکندر نامی سردار کے صرف دو ہزار سپاہی آگرہ میں چھوڑ دیے اور باقی سارا لشکر اپنے ساتھ ہی لے کر چلا گیا۔ میرزا حیدر مغل کشمیری بھی آگرہ میں رہ گیا۔ اس پر بادشاہ

بھیجے بڑے لطف و کرم کا اظہار کیا۔

بھائیوں کی نا اتفاقی شیر خاں کو بھائیوں کی اس نا اتفاقی کی بھی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں، ان حالات میں اس کی جرأتیں اور بڑھ گئیں اور وہ اسی سال کے آخر میں گنگا کے کنارے پہنچ گیا، وہاں سے اپنے بیٹے قطب خاں کو ایک لشکر دے کر کالپی اور اٹاوہ کی طرف روانہ کیا۔ قاسم حسین سلطان ازبک نے یادگار ناصر مرزا اور اسکندر سلطان کو ہمراہ لے کر کالپی کے نواح میں قطب خاں کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دے دی۔ اس کا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے سر کاٹ کر ہمایوں کے پاس آگرہ کو روانہ کر دیے۔

خرابی ملک دلی ہمایوں ایک لاکھ سواروں کا لشکر لے کر شیر خاں کے مقابلے کے لیے آگرہ سے نکلا اور قنوج کا دریا عبور کر کے صف آرائی کی۔ شیر خاں کی فوج پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مہینہ بھر تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر جمی رہیں، ممکن تھا کہ شاہی لشکر کامیاب ہو جاتا لیکن اس نازک موقع پر محمد سلطان مرزا اور اس کے بیٹے لشکر سے فرار ہو گئے، اور کامران کی فوج کے جتنے لشکری تھے وہ بھی ہمایوں کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ سخت بارش شروع ہو گئی، شاہی فوج نشیب میں تھی ہمایوں نے کسی اونچے مقام پر پڑاؤ ڈالنے کے لیے وہاں سے کوچ کرنا چاہا، اس حال میں شیر خاں نے بھرپور حملہ کر دیا۔ اکثر مغل بغیر لڑے ہی بھاگ گئے، بادشاہ نے تو اسی ارادہ سے باگ پھیری تھی کہ کسی اونچے ٹیلہ پر جا کر قیام کرے لیکن لشکر والوں نے اسے فرار پر محمول کر کے میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر لی اور جس کا جدھر منہ اٹھا نکل گیا۔ مجبوراً بادشاہ نے اپنا گھوڑا گنگا میں ڈال دیا اور پانی کے بہاؤ میں پشت سے دریا میں گر پڑا۔ اس وقت شمس الدین محمد غزنوی نے مدد کی اور بادشاہ کو دریا سے عبور کرایا۔ وہاں سے ہمایوں آگرہ گیا مگر شیر خاں برابر تعاقب میں چلا آ رہا تھا اس لیے وہ وہاں بھی ٹھہر نہ سکا اور فوراً پنجاب چلا گیا۔

یہ لڑائی ۹۴۷ھ میں ہوئی تھی، اس کی تاریخ ہے:

"خرابی ملک دلی"

لاہور میں مشورے ہمایوں نے لاہور پہنچ کر یکم ربیع الاول ۹۴۷ھ میں تمام امراء و سلاطین کو جمع کر کے مشورہ کیا لیکن ہمایوں کے بھائیوں اور دوسرے امراء کے درمیان بڑی پھوٹ پڑ چکی تھی اس لیے کسی تجویز پر اتفاق نہ ہو سکا۔ محمد سلطان اور اس کے بیٹے لاہور سے ملتان بھاگ گئے۔ مرزا ہندال اور مرزا یادگار ناصر ٹھٹھہ کی طرف چلے جانے کی رائے دے رہے تھے۔ مرزا کامران چاہتا تھا کہ سب لاہور سے ٹل جائیں تو وہ کابل چلا جائے۔

آخر بڑے صلاح و مشورہ کے بعد طے پایا کہ مرزا حیدر کو ایک لشکر دے کر کشمیر پر حملہ کیا جائے اور کشمیر فتح ہو جائے تو بادشاہ وہاں چلا جائے۔ ہمایوں نے مرزا حیدر کو اس مہم پر روانہ کر دیا۔ اس نے وہاں پہنچ کر اور بہت سے کشمیریوں کو اپنا موافق بنا کر کشمیر کو فتح کر لیا اور ۲۲ رجب ۹۴۷ھ میں اس علاقہ پر قابض ہو گیا۔

ہمایوں کا فرار

خواجہ کلاں بیگ سیالکوٹ تک پہنچا تھا کہ بادشاہ کو خبر ملی، شیر خاں سلطان پور کی ندی عبور کر کے لاہور سے ۳۲ کوس کے فاصلہ پر آگیا ہے۔ یہ سن کر ہمایوں لاہور کی ندی عبور کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ مرزا کامران مصلحتاً کچھ دور تک تو ساتھ رہا۔ خواجہ کلاں بیگ بھی سیالکوٹ سے ہٹ کر لشکر سے آملا لیکن جب یہ سب بھیرہ کے نواح میں پہنچے تو میرزا کامران اور مرزا عسکری عہد و پیمان سے منحرف ہو کر خواجہ کلاں بیگ کے ساتھ کابل کی طرف نکل گئے، ہمایوں نے سندھ کا رُخ کیا۔ چند منزل بعد میرزا ہندال اور میرزا یادگار ناصر بھی ساتھ چھوڑ گئے لیکن امیر ابوالبقاء کے سمجھانے سے دوبارہ لوٹ آئے۔

دریائے سندھ کے کنارے شاہی لشکر ایسے قحط میں مبتلا ہوا کہ ایک سیر غلّہ ایک اشرفی میں بھی ملنا محال ہو گیا۔ پانی بھی دُور دُور تک نہیں تھا۔ بھوک اور پیاس سے اکثر لشکری مر گئے۔

ہمایوں سخت مصیبتوں اور صعوبتوں کے بعد ایک مختصر سی جمیعت کے ساتھ جیسلمیر[۱] اور مارواڑ پہنچ سکا۔ وہاں بھی اسے کئی ایک حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان کی سرحد سے نکل کر عراق پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے شاہ طہماسپ سے مدد لے کر قندھار اور کابل پر آکر حملہ کیا اور ان شہروں کو فتح کر کے وہاں لشکر منظم کر کے دوبارہ اس نے ہندوستان کو فتح کیا جس کی تفصیل ہم انشاءاللہ آگے بیان کریں گے۔

---

[۱] جیسلمیر۔ سندھ سے متصل یہ ایک ریگستانی ریاست ہے۔ تقریباً تین ہزار سال پہلے چندر بنسی راجاؤں کی اولاد میں سے شالباہن کے پوتے راؤ بہاٹی کی اولاد "بھاٹی راجپوت" کہلانے لگی۔ یہ لوگ سندھ اور پنجاب سے ۷۳۱ء میں راجپوتانہ کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوئے۔ ۸۵۳ء میں دیوراج نامی ایک بھاٹی نے اس علاقہ میں حکومت کی بنیاد رکھی اور راول کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سلسلہ میں پانچویں راول جیسل نامی نے مسلمانوں کی مدد سے تخت پر قبضہ کیا اور ۱۱۵۶ء میں شہر جیسلمیر آباد کیا۔ جیسل کے بعد شالباہن، بیجل، کیلن، چاچک دیو، تیج راؤ، کرن، لاکھن، پونپال، جیت سی۔ اس کے زمانہ میں ۱۲۷۶ء میں مسلمانوں نے جیسلمیر کا محاصرہ کر لیا اور ۱۲۹۴ء میں مولراج اول کے زمانہ میں اس پر قبضہ کر کے دو سال تک قابض رہے اور جیسلمیر برباد ہو گیا۔ کئی سال بعد راٹھوروں نے اسے دوبارہ آباد کیا، پھر ان کو چوبیسویں راول دودو نے شکست دے کر دوبارہ بھاٹیوں کی حکومت قائم کر دی۔ ۱۳۰۶ء میں مسلمانوں نے راول دودو کو شکست دے دی، پھر ایک عرصہ بعد گرسی نامی بھاٹی نے دوبارہ جیسلمیر کو آباد کیا اور ریاست تین چار سرداروں میں تقسیم کر دی۔ پھر ۱۴۷۳ء میں تیسویں راول برسی نے مستقل ریاست کی بنیاد رکھی۔ بتیسویں لون کرن کے وقت ۱۵۴۳ء میں ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ کو جاتے ہوئے جیسلمیر سے گزرا۔ اس نے ہمایوں کی فوج پر راستہ میں پانی بند کرا دیا تھا۔ مغل لشکر نے بھاٹی راجپوتوں سے لڑ کر پانی حاصل کیا اور اس علاقہ سے نکل گئے۔ بدایونی جن حادثوں کا ذکر کرتا ہے اس میں ہمایوں کو سب سے زیادہ مشکل اس پانی کے نہ ملنے سے پیش آئی تھی۔ راجہ نے راستہ کے تمام کنوؤں اور چشموں کو ریت بھروا کر پاٹ دیا تھا تاکہ مسلمان گائے بکری وغیرہ کا ذبیحہ کرنے نہ پائیں۔ ۱۵۷۰ء میں جب اکبر اجمیر ہوتا ہوا ناگور پہنچا تو راول ہرراج کی بیٹی شاہی حرم میں داخل ہوئی اور جیسلمیر کے راول مغل سلطنت کے مددگار اور باج گزار بن گئے۔ پینتیسویں راول کلیان سنگھ کی بیٹی جہانگیر کے عقد میں تھی۔ ۱۶۳۹ء میں شاہجہان نے سبل سنگھ کو راول بنایا تھا۔ ۱۶۵۹ء میں راول امر سنگھ مسند نشین ہوا۔ ۱۷۲۲ء میں داؤد خاں کا پوتا اور مبارک خاں کا بیٹا بہاول خاں نے حملہ کر کے دیوراول اور گھسال کا علاقہ اپنی خود مختار ریاست بہاول پور میں شامل کر لیا۔ ۱۸۱۸ء میں انگریزوں سے سرکاری عہد نامہ کے تحت مہاراول گج سنگھ تخت نشین ہوا جو انگریزوں کی ماتحت ریاست کا بانی تھا۔

سوری خاندان

شیر شاہ بن حسن سور

"خرابیٔ ملک دلی" نہ صرف ہمایوں کی شکست کی بلکہ شیر شاہ کی تخت نشینی کی بھی تاریخ ہے، کیونکہ اس سال یعنی ۹۴۷ھ میں شیر شاہ نے آگرہ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

شیر شاہ کے ابتدائی حالات

شیر شاہ کا اصل نام فرید خاں تھا۔ اس کا دادا ابراہیم سور[1] افغانستان کے علاقہ رن سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں وہ سلطان بہلول کے لشکر میں ملازم ہو گیا اور کافی عرصہ تک حصار فیروزہ اور نارنول میں کارپرداز رہا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹے حسن نے سلطان سکندر کے ایک امیر جمال خاں نامی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسے جمال خاں کی طرف سے سہسرام[2] اور خواص پور قلعہ رہتاس کے ماتحت پرگنے جاگیر میں ملے۔ اس کے زیر حکم پانچ سو سوار تھے۔ فرید خاں (شیر شاہ) کے سات بھائی اور تھے۔ اس نے باپ اور بھائیوں سے لڑ کر ملازمت

---

[1] سور۔ افغانستان کے کوہستانی علاقہ روہ یا رن کے افغان قبیلوں میں سور قبیلہ آباد ہے۔ یہ لوگ خود کو سلاطین غور سے منسوب کرتے ہیں۔ اس قبیلہ کا مورث محمد سور تھا۔ ابراہیم سور کا اسی قبیلہ سے تعلق تھا۔ اس کے بیٹے حسن خاں سور نے نارنول میں انتقال کیا۔ اس کا مقبرہ اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس کا بیٹا فرید خاں (شیر شاہ) رجب ۸۷۸ھ مطابق ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا۔ بداونی نے شیر شاہ کا سن ولادت نہیں دیا ہے۔

[2] سہسرام۔ بنارس سے ریل کے راستے ۸۳ میل پر ہے۔ یہ شیر شاہ کا مولد اور وطن تھا۔ یہاں شیر شاہ کا مقبرہ قابل دید عمارت ہے۔ اس مقبرہ کی عمارت تالاب کے وسط میں ہے جس کا طول گیارہ سو فٹ اور عرض ایک ہزار فٹ ہے۔ مقبرہ کی کرسی مربع اوپر کی منزلیں ہشت پہلو، عمارت سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے۔ اس کا ہر پہلو ساٹھ فٹ لمبا ہے اور ہر پہلو میں ایک دروازہ ہے، اندر شیر شاہ کا مزار اور ایک مسجد ہے۔ در و دیوار پر قرآنی آیات کندہ ہیں، درود شریف اور تاریخ بنا لکھی ہے ۹۵۲ھ م ۱۵۴۵ء یہ عمارت شیر شاہ کے بیٹے سلیم شاہ کی یادگار ہے۔ نہایت مستحکم عمارت ہے۔ کہتے ہیں ہمایوں نے دوبارہ بادشاہ بن کر سہسرام کی ساری عمارتوں کو گرا دینے کا حکم دیا تھا، اس کی تعمیل کی گئی لیکن جب مقبرہ گرانے کی نوبت آئی تو حاکم نے بادشاہ کو لکھا کہ اس کے ساتھ مسجد بھی ہے، مقبرہ گرایا گیا تو وہ بھی شہید ہو جائے گی۔ ہمایوں نے مسجد کی وجہ سے مقبرہ کو منہدم نہ کرایا۔ سہسرام پہلے بڑا آباد شہر ہوگا اب تو بہار کے ضلع شاہ آباد میں ایک معمولی قصبہ ہے کوئی ۲۵ ہزار کی آبادی ہوگی۔ سہسرام کو بسانے والے کا نام سہارام تھا۔ یہ بستی پہلے بوڑھن پہاڑ کے نیچے تھی، حسن خاں سور نے وہاں سے ہٹ کر نئی آبادی بسائی۔ ۵۸۷ھ میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کے جنرل بختیار خلجی فاتح بنگال کے ایک مجاہد بزرگ سید میر حسین نے مذکورہ سہارام پر حملہ کیا۔ یہ بزرگ مدینہ کے متوطن تھے۔ پہلے انھوں نے اجمیر میں جہاد کیا تھا۔ سہارام سے آپ کی دست بدست لڑائی ہوئی۔ آپ نے اسے زخمی کر دیا، مرنے سے پہلے اس نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ سید میر حسین بنارس کے جہاد میں شہید ہوئے اور سہسرام میں ان کا لاشہ دفن ہوا۔ کہتے ہیں ان کا سر بنارس میں دفن ہے۔ آپ کا مزار سہسرام کی مشرقی پہاڑی پر ہے آپ کے سرہانے عبداللہ یعنی سہارام کی بھی تربت ہے اور بھی آپ کے ساتھیوں کے یہاں مزار ہیں اور یہ جگہ "چندن شہید پیر" کے نام سے مشہور ہے۔

ترک کر دی اور جون پور میں جا کر طالب علمی اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں اس نے کافیہ مع حواشی اور چند مختصر دوسرے رسالے اور فارسی میں گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا۔ اس کے اکثر اوقات جون پور کے مدرسوں اور خانقاہوں میں گزرتے تھے جہاں وہ علمائے اور صلحائے کی صحبت سے استفادہ کرتا اور اپنے اخلاق کی تربیت و تہذیب میں مصروف رہتا تھا۔ چند دن بعد اس کی باپ سے صلح ہو گئی اور اس کے باپ حسن خاں نے جاگیروں کے انتظام کے لیے اسے مامور کر دیا۔ اپنی عملداری میں شیر خاں نے بڑے عدل و انصاف اور حسن انتظام سے کام لیا اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس نے تمام فتنہ پردازوں کا قلع قمع کر دیا۔

شیر خاں کا یہ دور بھی مختصر ہی رہا۔ چند معاملات میں اس کی باپ سے پھر مخالفت ہو گئی اور وہ اپنے ایک بھائی کے ساتھ آگرہ کو چلا گیا۔ وہاں سلطان ابراہیم کے ایک سردار دولت خاں کے ہاں ملازمت کر لی اور سلطان ابراہیم کے پاس اپنے باپ اور بھائیوں کی شکایت پہنچائی۔ سلطان اُلٹا اس سے ناراض ہو گیا اور کہا کہ "یہ تو بہت بُرا آدمی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باپ اس سے ناراض ہے اور یہ بھی باپ کی شکایت کرتا ہے"۔

حسن خاں کے مرنے کے بعد دولت خاں نے اس کی جاگیر کے پرگنے شیر خاں کو دلوا دیے اور وہ ایک عرصہ تک اپنی جاگیروں ہی میں رہا۔ بھائیوں سے اس کی مخالفت پہلے کی طرح باقی تھی۔

شیر خاں بہار میں

جس زمانہ میں سلطان ابراہیم پانی پت میں مارا گیا تھا اور بابر نے فتح پائی تھی، دریا خاں کے بیٹے بہار خاں نے بہار میں سلطان محمد کے لقب سے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ فرید خاں بھی ان دنوں جاگیروں کو چھوڑ کر بہار چلا گیا اور سلطان محمد کے ہاں ملازم ہو گیا اور ایک دن سلطان محمد کی رکاب میں اس نے ایک شیر کا شکار کیا۔ اس وقت سلطان محمد نے اسے "شیر خاں" کا خطاب عطا کیا اور اپنے بیٹے جلال خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔

ولایت "چوند" کے حاکم محمد خاں سور نے شیر خاں کے بھائیوں کی طرفداری میں سلطان محمد کو شیر خاں سے بدول کر دیا اور جاگیر میں اس کے بھائیوں کو بھی شریک کرا دیا۔ اور اس کے بھائی سلیمان کو اپنے ایک غلام شادی خاں کے ساتھ کر کے خواص پور کا قبضہ دلانے کے لیے بھیجا۔ وہاں اُن کا مقابلہ شیر خاں کے ایک غلام بھگہ نامی سے ہوا۔ اس شخص کے متعلق مشہور تھا کہ یہ خواص خاں کا باپ ہے۔ مقابلہ میں بھگہ مارا گیا اور اس کے آدمی بھاگ کر شیر خاں کے پاس سہسرام میں آ گئے۔

شیر خاں مغل لشکر میں

شیر خاں نے جب دیکھا کہ وہ محمد خاں سے مقابلہ نہیں کر سکتا تو جاگیروں سے دست بردار ہو کر سلطان جنید برلاس کے پاس چلا گیا جو بابر کی طرف سے کڑہ اور مانک پور کا حاکم تھا اور اس کو بہت سے تحائف نذر دے کر اپنا حامی بنا لیا، پھر اس سے مدد لے کر محمد خاں پر حملہ کر دیا اور اس سے پرگنہ چوند بھی چھین لیا۔ محمد خاں نے قلعہ رہتاس میں بھاگ کر پناہ لے لی۔ شیر خاں نے اپنی جاگیروں پر قبضہ کر کے بھائیوں کی گوشمالی کی اور محمد خاں سے اس گستاخی کی معذرت کر کے اس کے پرگنے اسے لوٹا دیے اور جاگیر کے انتظام پر اپنے بھائی نظام کو مقرر کر کے سلطان جنید برلاس کے پاس واپس چلا گیا۔

شیر خاں بابر کے حضور میں

سلطان جنید عموماً بابر کے دربار میں جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شیر خاں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور بادشاہ سے سفارش کر کے اسے شاہی ملازموں میں شامل کرا دیا چنانچہ چندیری کے سفر میں وہ بابر کے ہم رکاب تھا۔ اسی سفر میں اس کو اندازہ ہوا کہ مغل حکمران امورِ مملکت سے نہایت بے پرواہ ہے اور عملہ کے لوگ رشوتیں لے کر لوگوں کے معاملات کو بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر شیر خاں کو یقین سا آ گیا کہ ان مغلوں سے بادشاہت چھین لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس وقت سے شیر خاں حصول اقتدار کی تدبیروں میں لگ گیا۔

ایک دن بابر نے کھانا کھاتے وقت دسترخوان پر شیر خاں کی کوئی گستاخانہ حرکت دیکھی۔ اس وقت اہل مجلس نے موقع پا کر شیر خاں کی خودسری اور اس کے باغیانہ خیالات بابر کے گوش گزار کیے۔ شیر خاں ان باتوں سے نہایت خائف ہوا اور شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور اپنے پرگنوں میں جا کر ٹھہر گیا۔ جنید برلاس کو یہ عذر لکھ کر بھیج دیا کہ "مغلوں کی ملازمت اختیار کر لینے کی وجہ سے محمد خاں نے جس کو مجھ سے دلی عداوت ہے سلطان محمد کو میری جاگیر پر لشکر کشی کے لیے آمادہ کر دیا تھا اس لیے جلدی اور اضطراب میں بادشاہ سے اجازت لینے کی مہلت نہ مل سکی اور میں بغیر پوچھے ہی اپنے پرگنوں میں چلا آیا۔ میں اُسی طرح بادشاہ کا خیر خواہ اور مخلص ہوں۔"

اس کے بعد شیر خاں نے دوبارہ سلطان محمد کے ہاں اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور اس کا مقرب بن کر ممتاز خدمات پر مامور رہا۔ پھر اس کے بیٹے جلال خاں کا وکیل مقرر ہوا اور اس کے سارے معاملات شیر خاں کے زیر انتظام ہو گئے۔ اور جب سلطان محمد کا انتقال ہوا تو سرکار بہار کا سارا نظم و نسق اسی سے متعلق ہو گیا۔

بنگال میں حوصلہ آزمائی

اسی زمانہ میں والیٔ بنگالہ کے ایک امیر مخدوم عالم سے جو حاجی پور کا حاکم تھا شیر خاں کی بڑی دوستی ہو گئی۔ پھر بنگال میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ وہاں کے سلطان نے مخدوم عالم پر حملہ کرنے کے لیے اپنے ایک امیر قطب خاں کو روانہ کیا۔ شیر خاں نے حق دوستی ادا کر کے مخدوم عالم کی طرف سے قطب خاں کا مقابلہ کیا اور اسے قتل کر کے اس کا سارا خزانہ مال و اسباب اور ہاتھی لوٹ لیے۔

بعد میں اس کے معاون جلال خاں اور دوسرے لوحانیوں نے بہار کا علاقہ سلطان بنگال کے سپرد کر دیا اور شیر خاں کو مصیبت میں تنہا چھوڑ کر سلطان کی اطاعت اختیار کر لی۔ بنگال والوں نے مقتول قطب خاں کے لڑکے ابراہیم خاں کو اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے شیر خاں کے خلاف روانہ کیا۔ شیر خاں نے قلعہ بند ہو کر کافی عرصہ تک ان کا مقابلہ کیا۔ اس اثناء میں بنگالی فوج کی کمک پر مزید دستے وہاں پہنچ گئے اور شیر خاں کے بچ نکلنے کا راستہ بھی مسدود ہو گیا۔ اب شیر خاں چاروں طرف سے بُری طرح گھر گیا تھا۔ کوئی راہ نہ پا کر آخر اس نے ایک دلیرانہ حملہ کرنے کا عزم کر لیا اور قلعہ سے باہر نکل کر جان توڑ کر غنیم سے مقابلہ کیا۔ بڑی سخت جد و جہد کے بعد ان پر فتح پائی۔ اس لڑائی میں ابراہیم مارا گیا اور اس کا سارا مال و اسباب فیل خانہ، توپ خانہ شیر خاں کے ہاتھ آ گیا۔ اس فتح سے اس کی شان و شوکت بہت بڑھ گئی اور سارا بہار اس کے قبضۂ اقتدار میں آ گیا۔

سلطان محمود لودی

اس دوران میں سلطان محمود لودی جسے حسن خاں میواتی اور رانا سانگا نے بادشاہ بناکر بابر سے مقابلہ کیا تھا، مغل لشکر سے شکست کھاکر چتوڑ کے قلعہ میں محصور ہوگیا تھا۔ لودی امراء نے اسے چتوڑ سے بلاکر پٹنہ کے تخت پر بٹھادیا۔ اس نے لشکر کشی کرکے شیر خاں سے بہار کا علاقہ چھین لیا اور شیر خاں نے اس کی اطاعت اختیار کرلی۔

کچھ عرصہ بعد شیر خاں سلطان محمود سے اجازت لے کر اپنے پرگنہ سہسرام میں آگیا۔ بعد میں جس وقت محمود کا سہسرام سے گزر ہوا تو اس نے شیر خاں کو بہار کا عہد نامہ لکھ کر دے دیا اور وہاں سے جون پور کی تسخیر کے ارادہ سے کوچ کیا۔ جون پور پر ہمایوں کے سرداروں کو شکست ہوئی اور یہ علاقہ لکھنؤ کی سرحدوں تک لودیوں کے قبضہ میں آگیا۔ ہمایوں کے امیر شکست کھاکر نواح کالنجر میں بادشاہ کے لشکر میں حاضر ہوگئے۔

اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے خود ہمایوں نے سلطان محمود اور اس کے معاون بایزید کے مقابلہ کے لیے کوچ کیا۔ اس اثناء میں شیر خاں سلطان محمود کے لشکر سے کچھ دن تو علیحدہ ہی رہا بعد میں آکر اس کے ساتھ شامل ہوگیا۔ جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو شیر خاں نے مغلوں کے امیر الامراء ہندو بیگ قوچین کو خفیہ پیغام بھیجا کہ "میں لڑائی کے وقت طرح دے کر علیحدہ ہوجاؤں گا کیونکہ مجھے سلطان محمود اور بایزید کا اقتدار ایک آنکھ نہیں بھاتا"۔ چنانچہ جب لڑائی ہوئی تو شیر خاں اپنی جمعیت کو لے کر میدان سے ہٹ گیا اور سلطان محمود شکست کھاکر پٹنہ کو چلا گیا۔ اس کا انتقال ۹۴۹ھ میں اڑیسہ[1] کی سرحد پر ہوا۔

---

[1] اوڑیسہ - آئین اکبری کے حوالہ سے۔ "اوڑیسہ پہلے بنگال سے الگ ایک ملک تھا۔ یہاں ۱۲۹ پختہ قلعے ہیں یہاں کے حکمران کو گجپتی کہتے ہیں۔ آٹھ ماہ بارش تین مہینے گرمی پڑتی ہے اور ایک مہینہ سردی کا ہوتا ہے۔ چاول بکثرت ہوتا ہے۔ لوگ چاول مچھلی ترکاریاں اور بربحل کھاتے ہیں، مرد صندل ملتے اور زیور پہنتے ہیں، عورتیں صرف نچلا حصہ ڈھانکتی ہیں، مکان سرکنڈوں کے ہوتے ہیں، بت خانے سنگین اور بلند ہوتے ہیں۔ ہاتھی بکثرت ملتے ہیں۔ ان کی زبان بنگال کی زبان سے مختلف ہے، ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں۔ یہاں لوہے کے قلم سے کھجور کے پتوں پر کتابت ہوتی ہے، پھولوں میں گل نسرین خاص پھول ہے۔ کیوڑے کے جنگل ہوتے ہیں، پان متعدد اقسام کے ہوتے ہیں، کوڑیوں سے لین دین ہوتا ہے۔ چار کوڑیوں کا گنڈہ، چار گنڈوں کا بودی، چار بودیوں کا پن، سولہ یا بیس پن کا ایک کھاون، دس کھاون کا ایک روپیہ۔ یہاں کا مستقر کٹک ہے۔ راجہ مکند دیو کا نو منزلہ محل مشہور ہے۔ پہلی منزل میں فیل خانہ اور اصطبل تھا، دوسری منزل میں توپ خانہ، تیسری میں دیدبان، چوتھی میں دفاتر، پانچویں میں باورچی خانہ، چھٹی میں ملاقات کا دیوان، ساتویں میں خلوت خانہ، آٹھویں میں شاہی محلات، نویں میں راجہ کی خوابگاہ تھی۔ شہر پرشوتم میں بحر شور کے کنارے جگناتھ کا مندر ہے جس کے قریب کشن اور اس کے بھائی بہنوں کی مورتیں ہیں۔" جگناتھ کے متعلق ہندوؤں میں مشہور ہے کہ جب نیلگری کے راجہ اندر دمن نے چار یا پانچ ہزار سال پہلے یہاں یہ شہر بسایا تو ایک خواب کی بشارت کے مطابق سمندر میں ایک لکڑی کا باون انگل چوڑا ڈیڑھ ہاتھ لمبا ٹکڑا اسے ملا۔ یہ لکڑی دیوتا کی مورت تھی۔ اس نے اس پر جواہرات جڑوا کر اس کا نام جگناتھ رکھا۔ جگناتھ کے میلے میں اس مورت کا سولہ پہیوں کے رتھ پر جلوس نکلتا ہے جس کے نیچے دب کر مرنے کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور مندر آفتاب کا مندر ہے جو نہایت بلند وسیع عظیم الشان عمارت ہے۔ اس میں سورج سیاروں کی اور پجاریوں کی مورتیں ہیں۔ اس مندر کی مورتیں سنگ تراشی کا معجزہ معلوم ہوتی ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے راجہ نرسنگ دیو نے اس مندر کی تعمیر مکمل کی تھی جس کے خرچ میں ملک کے بارہ برس کا خراج لگ چکا تھا اس کے قریب ۲۸ دوسرے بت خانے ہیں۔ کہتے ہیں کبیر داس اسی جگہ دفن ہوا تھا۔

ہمایوں اور شیر خاں کا اختلاف

اس فتح کے بعد ہمایوں نے ہندو بیگ کو اپنا نمائندہ بنا کر شیر خاں کے پاس بھیجا اور اس سے قلعہ چنار سپرد کر دینے کا مطالبہ کیا۔ شیر خاں نے حیلے بہانے کر کے بادشاہ کے مطالبہ کو ٹال دیا۔ ہمایوں نے اپنے چند امیروں کو قلعہ کے محاصرہ کے لیے رخصت کیا۔ وہ خود بھی اس مہم پر جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ شیر خاں کی ایک عرضی اس کے نام آئی جس میں اس نے اپنے خلوص اور اطاعت کا ذکر کیا تھا اور بابر بادشاہ کے وقت کی خدمات اور سابقہ حقوق کے حوالے تھے، خاص طور سے سلطان محمود سے میدان جنگ میں علیحدگی کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ شیر خاں نے یہ عریضہ اپنے بیٹے قطب خاں کے ذریعہ ایک بڑی جمعیت اس کے ہمراہ کر کے روانہ کیا تھا اور اپنے وکیل اور وزیر عبر خاں حجاب کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا (اس عرضی پر ہمایوں نے شیر خاں کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ قطب خاں شاہی لشکر کے ساتھ ہی رہا) گجرات میں قطب خاں ہمایوں کے لشکر سے فرار ہو کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا اور شیر خاں نے ہمایوں کی گجرات سے واپسی تک کے عرصہ میں اپنی قوت میں کافی اضافہ کر لیا، پھر ہمایوں سے مقابلہ کر کے اسے شکست دی، جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

شیر گڑھ

شیر شاہ نے تخت نشینی کے بعد قنوج کے قدیم شہر کو ویران کر دیا اور اسے گنگا کے کنارے آباد کرایا۔ یہ شہر اب شیر گڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ شمس آباد کے قلعہ کو بھی اجاڑ کر اسے دوسری جگہ اس نے تعمیر کرایا اور اس کا نام رسول پور رکھا لیکن اب یہ قلعہ پھر اپنی اصلی جگہ پر آباد ہو گیا ہے۔ شیر خاں نے علاؤالدین کی بسائی ہوئی پرانی دلی کو بھی ویران کر کے ایک شہر فیروز آباد تین کوس کی لمبائی میں بسایا۔ اس کے قلعہ کا دروازہ سنگ و گچ سے نہایت بلند بنوایا تھا۔

ضروری انتظامات کے بعد شیر شاہ کوچ پر کوچ کرتے ہوئے سلطان پور پہنچ گیا۔ یہاں ہمایوں کے بھائی آپس کے جھگڑوں میں اُلجھے ہوئے تھے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، شیر شاہ کے آتے ہی یہ جھگڑالو بھائی وہاں سے بھی نکل بھاگے، پھر شیر شاہ نے ان کو ہندوستان کی حدود میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔

شیر شاہی سڑک

اس سال شیر شاہ نے حکم دیا کہ بنگالہ سے رہتاس (پنجاب) تک جو چار ماہ کا راستہ ہے سڑک بنائی جائے۔ اس سڑک پر آگرہ سے مانڈو تک ہر کوس پر ایک سرائے، مسجد اور پختہ کنواں تعمیر کرایا گیا اور ہر مسجد میں ایک مؤذن ایک امام مقرر کیا گیا ایک ہندو سقہ کو بھی مقرر کیا گیا۔ اس سڑک پر بادشاہ کے حکم سے دو رویہ درخت لگوائے گئے تاکہ مسافر ٹھنڈی چھاؤں میں سفر کریں۔ ان تعمیروں کے آثار میرے اپنے زمانہ تک کہ شیر شاہ کے عہد کو باون سال گزر چکے ہیں باقی ہیں۔

عدل و انصاف

شیر شاہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھے۔ اس کے عدل و انصاف کی ایسی دھاک تھی کہ بڑھیا بھی اگر جنگل میں سونے کا تھال اُچھالتی ہوئی چلی جائے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔

خدا کا میں بڑا شکر گزار ہوں کہ میری پیدائش اس عادل بادشاہ کے زمانہ میں ماہ ربیع الثانی ۹۴۷ھ میں ہوئی۔

شیر شاہ نے مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لیے کوہ بالنات پر رہتاس کا قلعہ تعمیر کرایا اور خواص خاں کو ہمایوں کے تعاقب پر متعین کر کے دارالخلافہ کو لوٹا۔

قاضی فضیحت

راستہ میں اطلاع ملی کہ بنگالہ میں خضر خاں سرگ نام ایک سردار نے سرکشی اختیار کی ہے اور اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ شیر شاہ نے فوراً بنگال کا رخ کیا اور خضر خاں کو شکست دے کر گرفتار کر دیا اور اس علاقہ کو اپنے امیروں میں تقسیم کر دیا۔ اپنے لشکر کے قاضی کو جس کا نام قاضی فضیلت تھا رہتاس شرقی کے قلعہ پر ناظم مقرر کیا۔ عوام اس قاضی فضیلت کو اس کے رویہ کی وجہ سے قاضی فضیحت کہتے تھے۔

شیر شاہ ان مہموں سے فارغ ہو کر ۹۴۸ھ میں آگرہ واپس آ گیا۔

ملو گیدی

۹۴۹ھ میں شیر شاہ مالوہ کی فتح کے ارادہ سے گوالیار گیا۔ قلعہ گوالیار میں ہمایوں کا ایک امیر ابوالقاسم بیگ متعین تھا۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں قلعہ کی کنجی لے کر حاضر ہو گیا۔ اسی جگہ حاکم مالوہ ملو خاں بھی جو سلطان خلجی کا غلام اور اس علاقہ کا با اقتدار شخص تھا۔ بادشاہ کی قدم بوسی کے لیے باریاب ہوا۔ شیر شاہ نے اس پر بڑی عنایتیں کیں اور بھاری انعام و اکرام سے نوازا، اور اپنے خیمہ کے نزدیک ہی اس کا خیمہ لگوایا۔ شیر شاہ اسے ایک سو ایک گھوڑے اور دوسرے اعزاز بھی عطا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا لیکن ملو خاں نہ معلوم کس وجہ سے خائف ہو کر غلاموں کی طرح خیمہ چاک کر کے راتوں رات لشکر سے بھاگ گیا۔ یہ شعر شیر شاہ نے اسی کے متعلق کہا تھا ؎

با ما چہ کرد دیدی ملو غلام گیدی
قولیست مصطفےٰ را "لا خیر فی عبیدی"

ملو خاں کی سرکوبی کے لیے شیر شاہ نے حاجی خاں سلطان کو تو مالوہ کی طرف اور سزاول خاں کو سرکار ستواس کی طرف روانہ کیا۔ ان دونوں کے مقابلہ میں ملو خاں کو شکست ہوئی اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔

انہی دنوں خان خاناں شیروال نے رنتھمبور کا قلعہ شاہی لشکر کے حوالہ کر دیا اور خود اپنے خاندان کو لے کر پشاور کے قصبہ میں چلا گیا۔ کہتے ہیں وہاں اس کو کسی نے زہر دے کر مار ڈالا۔ اس کی قبر پشاور سے باہر ایک نہایت ہی پر فضا مقام پر ہے۔

پورن مل کا قتل

اسی سال رائے سین کے مقدم پورن مل نے چندیری کو لوٹ لیا اور وہاں کے اکثر آدمیوں کو قتل کر دیا۔ اپنے حرم میں وہاں کی دو ہزار ہندو اور مسلمان عورتوں کو داخل کر لیا۔ جب شیر شاہ کو اس فساد کی اطلاع ملی تو وہ برق و باد کی طرح رائے سین کے قلعہ پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ کا مادۂ تاریخ ہے ؎

"قیام بارگہ باشد مبارک"

شیر شاہ قلعہ کو فتح نہ کر سکا اس لیے اس نے شاہزادہ عادل خاں اور قطب خاں کے وسیلہ سے عہد و پیمان کر کے پورن مل کو بلوایا اور بڑی عزت کے ساتھ اسے لشکر میں ٹھہرایا۔ سو گھوڑے کافی زر نقد اور خلعت انعام میں دیا، بعد میں شیر شاہ نے عہد شکنی کی اور میر سید رفیع الدین صفوی سے فتویٰ لے کر پورن مل کو اس کے اہل و عیال اور بچوں سمیت ہاتھیوں کے پیروں میں

کچلوا دیا۔ اس سانحہ میں پورن مل کے دس ہزار ہندوؤں میں سے ایک کی بھی جان نہ بچی اور وہ سب بیوی بچوں سمیت قتل ہوئے بعض خود آگ میں جل کر مر گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۹۵۰ھ میں پیش آیا تھا۔

راجہ مالدیو پر حملہ

کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے آگرہ سے راجہ مالدیو[51] کے خلاف فوج کشی کی۔ مالدیو، ناگور اور جودھپور کا بڑا نامی گرامی راجہ تھا اور مسلمانوں پر اس کے غلبہ اور زیادتی کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔

شیر شاہ کا قاعدہ تھا کہ خواہ دشمن زیادہ ہو یا کم، اپنے لشکر کے اطراف وہ خندق ضرور بنا لیتا تھا۔ اجمیر کے نواح میں راجہ مالدیو پچاس ہزار سوار لے کر بڑی تیاریوں کے ساتھ مقابلہ پر آیا۔ وہاں میدانِ جنگ پورا ریتیلا تھا، حصار اور خندق بنانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ شیر شاہ نے اس بارے میں اپنے تجربہ کار امراء سے مشورہ کیا، کسی کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی اور سب عاجز و حیران ہو گئے۔ اس وقت شیر شاہ کا ایک خورد سال پوتا جس کا نام شاہ عالم تھا بے ساختہ بول اُٹھا: "بنجاروں کو حکم دیجیے کہ وہ اپنے تھیلے ریت سے بھر کر لشکر کے گرد مورچہ بندی کر دیں۔" بادشاہ اس کی بات سن کر پھڑک اُٹھا۔ اُسی وقت اپنی پگڑی اُس کے سر پر رکھ دی اور اپنا ولی عہد بنا لیا، لیکن سلطنت شاہ عالم کی قسمت میں نہیں تھی۔ جب سلیم شاہ بادشاہ بنا اس نے سب سے پہلے اسی کو قتل کرایا تھا۔

جنگی تدبیر

شیر شاہ اپنے پٹھان لشکریوں کی جانوں کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا اسی لیے عموماً لڑائیوں کو مقابلہ کے بجائے حکمت عملی سے جیتنا چاہتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ راجہ مالدیو کے مقابلہ میں بھی اس نے ایک چال چلی۔ راجہ مالدیو کے سرداروں کی طرف سے اس نے اپنے نام بہت سے جعلی خط لکھوائے، ان کا مضمون یہی تھا کہ لڑائی کے دن آپ کو مقابلہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، ہم خود راجہ مالدیو کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے بشرطیکہ فلاں فلاں علاقے آپ ہم کو جاگیر میں عطا کریں۔ پھر شیر شاہ نے کسی تدبیر سے وہ خطوط راجہ کے ہاتھوں تک پہنچا دیے۔ شیر شاہ کی چال کامیاب ہوئی اور وہ اپنے تمام سرداروں سے بدگمان ہو گیا۔ راتوں رات میدان جنگ سے نکل کر بھاگ گیا۔ امیروں نے اس سے مل کر بہت کچھ یقین دلایا کہ ہم ہرگز دغا نہیں کریں گے یہ سارا فریب شیر شاہ کا ہے، لیکن راجہ کو ان کے کہے کا کسی صورت میں بھی یقین نہ آیا۔ مالدیو کا ایک سردار گویا نامی تھا۔ اس کو بڑا غصہ اور غیرت آئی اور اس نے بگڑ کر مالدیو کو بری بری گالیاں دیں، اپنے چار ہزار آدمیوں کے ساتھ شیر شاہ پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا یہ لوگ شب خوں کے ارادہ سے نکلے لیکن یہ بدقسمتی سے راستہ بھول کر رات بھر بھٹکتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ

---

۵۱ راجا مالدیو۔ ایک مالدیو تو وہ ہے جسے سلطان محمد تغلق جونا نے چیتوڑ کا راجہ بنایا تھا۔ یہ چوہان تھا اور مالوہ کا حاکم تھا۔ شیر شاہ نے جس مالدیو پر حملہ کیا تھا وہ مارواڑ کا راٹھور راجہ تھا جس کا پایہ تخت اجمیر تھا۔ سلطان معز الدین سام (شہاب الدین غوری) نے دہلی کے رائے پتھورا کو شکست دینے کے بعد قنوج کے راجہ جے چند کو بھی شکست دی اور وہ گنگا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس کا بھتیجا سیتھا نامی شمس آباد پر حاکم تھا۔ اس کے تین بیٹے سوناک، اشوتھی، اج باپ کے قتل کے بعد گجرات بھاگ کر آئے۔ راستہ میں پالی میں ٹھہر گئے یہاں برہمنوں نے ان کو سردار بنا لیا، پھر سوناک نے گوہیلی اور میہر قبیلوں کو شکست دے کر ایڈر پر اور اس کے بھائی اج نے بگلانہ پر قبضہ کر لیا۔ مارواڑ اشوتھی کے قبضہ میں رہا۔ اسی کی اولاد سے راجگان اجمیر و مارواڑ ہیں۔ مالدیو اس سلسلہ کا سولھواں راجہ تھا۔ مارواڑ کا علاقہ اکبری عہد میں اجمیر، جودھپور، سروہی، ناگور اور بیکانیر پر مشتمل تھا۔

وہ کسی اور طرف کافی دور نکل آئے ہیں۔ ان لوگوں نے جان دے دینے کا قول و قرار کیا تھا اس لیے واپس نہ ہوئے۔ جب انھیں شیر شاہ کا لشکر نظر آیا تو گھوڑوں سے اُتر کر سب نے از سر نو قسم کھائی اور ایک نے دوسرے کے کمرپٹہ سے اپنے کمرپٹہ کو باندھ لیا۔ برچھے تلوارلے کر شیر شاہ کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ شیر شاہ نے ان حملہ آوروں پر ہاتھی دوڑا دیے۔ ان میں سے اکثر ہاتھیوں کے پیروں میں پامال ہوگئے، جو بچے وہ توپوں اور تیروں کی بوچھاڑ کی نذر ہوگئے۔ ان میں سے ایک بھی سلامت نہ رہا۔ اس لڑائی میں ایک مسلمان کو بھی چشم زخم نہ پہنچا۔ ایک پشاوری شاعر نے جس کا تخلص فیضی تھا اس واقعہ پر یہ شعر کہا تھا ؎

ناگہاں کشت شہی بر سر ملدیو رسید
مات بودار نشدی مہرۂ گویا نفری

اس فتح کے بعد شیر شاہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "بڑی خیر ہوگئی میں نے تو تمام ہندوستان کی سلطنت مٹھی بھر جوار کے عوض بیچ دی تھی۔"

اس کے بعد شیر شاہ نے رنتھنبور کا قلعہ اپنے بیٹے عادل خاں کو دیا اور اسے وہاں چند دن کے لیے رخصت کر دیا تاکہ اس کا انتظام کر کے لوٹ آئے۔

رفیع الدین محدث

میں نے معتبر آدمیوں سے سُنا ہے کہ سیّد رفیع الدین محدّث نے جن کا پہلے ہی ذکر آچکا ہے اس سفر میں شیر شاہ سے کہا۔ "میرے باپ دادا سب اہل علم، صاحبِ تصانیف تھے اور حرمین شریفین میں وعظ کہا کرتے تھے۔ سارے خاندان میں مَیں ہی ایک ایسا نالائق ہوں جو روپیہ کے لالچ میں ہندوستان میں آوارہ گردی کر رہا ہوں اور بالکل ہی جاہل رہ گیا ہوں۔ اب حضور مجھے معاف فرمائیں تاکہ وطن جا کر اپنے خاندان کا چراغ روشن کروں۔"

شیر شاہ کے نیک ارادے

شیر شاہ نے ان سے کہا۔ "مجھے آپ کو رخصت کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن میں نے آپ کو ایک مصلحت کی خاطر ٹھہرا رکھا ہے۔ میری دلی آرزو یہ ہے کہ ہندوستان کے وہ قلعے جو ہندوؤں کے قبضہ میں رہ گئے ہیں فتح کر لوں، اس کے بعد ان قزلباشوں کی خبر لوں جو حاجیوں کو راستوں میں لوٹ لیتے ہیں۔ ان قزلباشوں کا یہ حال ہے کہ جب ان کو سلطان روم دباتا ہے تو وہ اس طرف چلے آتے ہیں اور جب وہ لوٹ جاتا ہے تو یہ پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے جو تدبیر سوچی ہے اس کے مطابق اُدھر سے شاہ روم اور اِدھر سے مَیں دونوں مل کر ان قزلباشوں کا ایسا قلع قمع کر دیں گے کہ پھر انھیں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ اس مہم کے لیے اور حرمین شریفین میں کسی ایک مقام کی خدمت کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے میں آپ کو اپنا وکیل بنا کر شاہ روم کے پاس سفارت روانہ کروں گا۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس سفارت کے لیے آپ کے سوا دوسرا کوئی موزوں نظر نہیں آتا۔" کیا عجب کہ شیر شاہ کی یہ حسن نیت ہی اس کی مغفرت کا سبب بن جائے۔ عمرو بن لیث[1] جو شاہانِ عراق میں ممتاز بادشاہ گزرا ہے اسی طرح حسرت ظاہر کیا کرتا تھا کہ میں اگر امام حسین کے ساتھ

---

[1] عمرو بن لیث ایران کے پہلے صفاری بادشاہ یعقوب لیث کا بھائی اور جانشین تھا۔ پایۂ تخت خراسان تھا۔ بغداد کے خلیفہ معتمد نے اسے لشکر کشی کر کے شکست دی۔ جب وہ شیراز سے خراسان بھاگ کر آیا تو اسماعیل سامانی نے اسے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا، یہاں وہ قید خانہ میں رہا اور اسی قید میں مر گیا۔ ایک آنکھ سے نابینا تھا، تیرہ سال حکومت کی۔

ہوا تو یزیدیوں کے دماغ ٹھکانے لگا دیتا۔ لوگوں نے اُسے خواب میں دیکھا کہ وہ روضۂ جنت میں سیر کر رہا ہے۔ بہرحال آدمی کوئی بھلا کام کر سکے یا نہ کر سکے اس کی نیت اور آرزو تو کر سکتا ہے، اس کا بھی اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔

قلعہ کالنجر کا محاصرہ

۹۵۲ھ میں شیر شاہ نے قلعہ کالنجر[1] کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ہندوستان کے مضبوط قلعوں میں سے ایک ہے۔ بادشاہ کے حکم سے فصیل کے گرد سرنگیں کھودی گئیں اور جب یہ سرنگیں قلعہ کے اندر پہنچیں تو مسلمان بہادران سرنگوں کے ذریعے قلعہ میں داخل ہو گئے اور وہاں اپنی تلواروں سے ایک قیامت برپا کر دی۔ شیر شاہ اپنی نگرانی میں ایک مقام سے بارودی گولے قلعے میں پھنکوا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک گولہ قلعہ کی دیوار سے ٹکرا کر شاہی لشکر ہی میں لوٹ آیا اور پھٹ گیا۔ اس کے اثر سے وہاں جتنے گولے تھے سب پھٹ پڑے اور ہر طرف آگ پھیل گئی شعلوں میں شیر شاہ بھی گھر گیا اور اس کا سارا بدن جل کر سیاہ کوئلہ ہو گیا۔ شیخ خلیل پیرزادہ اور مولٰنا نظام الدین دانش مند کو بھی اس آگ سے صدمہ پہنچا۔

بارودی مورچہ کے قریب ہی بادشاہ کے لیے ایک چھوٹا ڈیرا لگایا گیا تھا۔ شیر شاہ اسی نازک حالت میں دوڑتا ہوا اس خیمہ میں چلا گیا۔ فوج قلعہ پر یورش کر رہی تھی اور بادشاہ خیمہ میں بے ہوش پڑا تھا۔ جب بھی اسے کچھ ہوش آتا وہ چلا چلا کر لوگوں کو قلعہ فتح کرنے پر اکساتا رہتا اور جو کوئی اسے دیکھنے اندر آتا تو بادشاہ اسے محاذ پر جانے کا اشارہ کرتا۔ جاں بلب بادشاہ کے اس عزم کو دیکھ کر امرائے لشکر نے بھی بجائے ہراساں ہونے کے پورے جوش و خروش کے ساتھ قلعہ پر یورش کی اور خنجروں اور تلواروں سے دشمنوں کے حلق پھاڑ کر رکھ دیے۔

غیبی امداد

میں نے ایک معتبر آدمی سے سنا ہے ـ" اسی روز ایک شخص سیاہ لباس پہنے اور سر پر عمامہ باندھے فوج کو لڑائی کے لیے بڑھاتے لیے جا رہا تھا سب اُسے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے اُسے نہ پہچانا کہ کون ہے۔ سب کے ساتھ وہ بھی قلعہ میں داخل ہوا تھا۔ فتح کے بعد لوگوں نے جب اُسے ڈھونڈا تو کہیں اُس کا پتہ نہ چل سکا۔ اسی طرح دونوں طرف کے مورچہ والوں نے بھی یہی بیان کیا کہ اسی لباس کے سوار لشکر کے آگے آگے جاتے ہوئے نظر آئے۔ جب سب قلعہ میں داخل ہو گئے تو وہ غائب ہو گئے۔ بہرحال یہ بات کافی مشہور ہے کہ اُس دن مسلمانوں کی مدد کے لیے غیب سے کمک آئی تھی۔

---

[1] کالنجر۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے۔ " یہ سنگی قلعہ ہے جو سر بہ فلک۔ پہاڑی پر واقع ہے۔ اس میں بہت سے بُت خانے ہیں۔ ایک بُت کا نام "کالی بھیرون" ہے۔ یہ بت اٹھارہ ہاتھ لمبا ہے۔ قلعہ میں متعدد چشمے اور بے شمار تالاب ہیں۔ قلعہ کے اطراف گھنا جنگل ہے جس میں آبنوس کے درخت ہیں۔ ہاتھی مار شکاری جانور رہتے ہیں۔ یہاں لوہے کی ایک کان بھی ہے۔ آٹھ کوس کے فاصلے پر ہیروں کے ذرّے بھی پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں حاکم قلعہ راجہ کیرت سنگھ کے پاس چھ نادر تحفے تھے۔ ایک دانشمند اور پارسا برہمن ایک خوبصورت، خوش کردار نوجوان، ایک طوطی جو ہر سوال کا جواب دیتی تھی اور جو کچھ سنتی یاد رکھتی ایک گویا بجشتو نامی دو حسین اور خوبرو گانے والی کنیزیں سلطان بہادر گجراتی نے راجہ سے ان میں سے کوئی ایک تحفہ طلب کیا۔ راجہ نے بجشتو گویے کو اس کے حوالے کر دیا۔ بعد میں شیر خاں نے ان دونوں پری جمال لونڈیوں کو مانگا۔ راجہ نے اس کا مطالبہ قبول نہ کیا اور شیر خاں نے کالنجر کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ اپنی عورتوں سمیت چتا میں جل کر مر گیا اور شیر خاں بھی بارود خانہ میں آگ لگنے سے جل کر فوت ہوا۔"

شیر شاہ کا انتقال شیر شاہ اسی بے قراری اور تڑپ کی حالت میں بار بار قلعہ کی فتح کے متعلق پوچھتا رہا۔ اُس دن گرمی بھی بہت تھی، لوگوں نے اس کے جسم پر صندل اور گلاب کا لیپ لگایا لیکن اس کی تکلیف برابر بڑھتی گئی۔

جیسے ہی شیر شاہ نے فتح کی خبر سنی، اُس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ کہا گیا:

شیر شاہ آنکہ از مہابت او　　شیر و بز آب را بہم می خورد
از جہاں رفت و گفت پیر خرد　　سال تاریخ او ز آتش مرد ۹۵۲ھ

شیر شاہ کا آبائی قبرستان سہسرام میں تھا اس لیے اس کی لاش وہیں لے جا کر دفنائی گئی۔ شیر شاہ نے پندرہ برس تک تو سرداری اور حکومت کی اور پانچ سال خود مختار بادشاہت۔ آئینہ دیکھ کر وہ کہا کرتا تھا:

"افسوس مجھے شام کے وقت بادشاہی ملی"

شیر شاہ کی زندگی ایک نظر میں شیر شاہ کا نام فرید خاں تھا
باپ کا نام حسن خاں سور

سال ولادت:	رجب ۸۹۶ھ
سال جلوس:	۹۴۷ھ
مقام جلوس:	آگرہ
دار الخلافہ:	دہلی
مدت سلطنت:	۴ سال ۴ ماہ ۱۵ یوم
سال وفات:	۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ
مدفن:	سہسرام (مرتبہ مترجم)

سلیم شاہ بن شیر شاہ سوری

شیر شاہ کے انتقال کے بعد اُمراء نے اس کے بیٹے سلیم خاں (اصل نسخہ میں "اسلیم شاہ" الف سے نام لکھا ہوا ہے) کو تخت نشینی کے لیے بلایا۔ وہ اس وقت پٹنہ کے نواح میں تھا۔ سلیم خاں کوچ پر کوچ کرتے ہوئے نہایت تیزی سے لشکر میں پہنچ گیا۔ عیسیٰ خاں حجاب اور دوسرے اُمراء کی تائید سے اس کی تخت نشینی ہوئی۔ اس نے اپنا خطاب سلیم شاہ رکھا۔

سلیم شاہ کا سن جلوس مُلا احمد جنید نے اس آیت سے نکالا:

"ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصالحون"

سلیم شاہ کا خط تخت نشینی کے بعد سلیم شاہ نے اپنے بڑے بھائی عادل خاں کو جو رنتھنبور[1] میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس مضمون کا

---

[1] رنتھنبور۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے "یہ ہندوؤں کا بڑا قلعہ ہے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے مدتوں محاصرہ کر کے یہاں کے راجہ

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

خط لکھا۔ "اگرچہ آپ ہی ولی عہد اور جانشین تھے لیکن آپ لشکر سے بہت دور تھے اور یہاں فتنوں کے پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا اس لیے میں کچھ دن کے لیے آپ کے نائب کی حیثیت میں لشکر کی حفاظت کر رہا ہوں۔ جب آپ تشریف لے آئیں گے تو مجھے ہر طرح اطاعت گزار اور فرماں بردار پائیں گے۔

سلیم شاہ نے کالنجر سے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔ کورہ گھاٹم کے قصبہ میں خواص خاں نے اپنی جاگیر سہرند سے حاضر ہو کر سلیم شاہ کی اطاعت قبول کی لیکن درحقیقت وہ عادل خاں کا ہی دل سے طرف دار تھا۔

تخت نشینی کا جشن

سلیم شاہ نے آگرہ میں ایک بڑا جشن منعقد کیا اور باقاعدہ جلوس کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں طویل مراسلت ہوتی رہی۔ آخر کار عادل خاں نے اپنی آمد کے معاملہ کو سلطنت کے چار بڑے امیر قطب خاں نائب، عیسیٰ خاں نیازی، خواص خاں اور جلال خاں جلوانی کی رائے پر چھوڑ دیا۔ سلیم شاہ نے ان چاروں امیروں سے عہد کیا کہ وہ اسے پہلی ملاقات کے فوراً ہی بعد اس کی جاگیر پر رخصت ہو جانے دے گا اور اسے اختیار ہوگا کہ ہندوستان میں جہاں چاہے اپنے لیے جاگیر حاصل کر لے۔ چاروں امیر اس عہد و پیمان کے بعد عادل خاں کو لانے کے لیے گئے اور وہ ان کے ساتھ آگرہ اور وہاں سے سیکری آیا۔ سلیم شاہ نے شکارپور[۱] تک آکر اس کا استقبال کیا۔ یہاں دونوں بھائیوں میں ملاقات ہوئی اور انھوں نے باپ کی تعزیت کی رسم ادا کی، پھر دونوں مل کر آگرہ کی طرف روانہ ہوئے۔

سلیم شاہ کی مکاری

سلیم شاہ بظاہر بڑی محبت و خلوص کا برتاؤ کر رہا تھا لیکن اس کے دل میں کھوٹ تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ عادل خاں کے ساتھ قلعہ میں دو تین آدمیوں سے زیادہ داخل نہ ہونے پائیں، لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور عادل خاں کافی جمعیت کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اب سلیم شاہ بھی مجبور ہو گیا اور کسی قسم کی بدگمانی پیدا نہ کرنے کے خیال سے عادل خاں کی خوشامد درآمد میں لگا رہا، اس سے کہا۔ "میں نے ان سرکش پٹھانوں کو آج تک

(بقیہ حاشیہ رنتھمبور صفحہ گزشتہ) تیمور لنگ کو شکست دی تھی۔ عرش آشیانی (اکبر) نے ایک ماہ بارہ دن میں یہاں کے راجہ بلائے سرجن ہاڈا کو شکست دے کر قبضہ کیا۔ رائے سرجن کے بعد اس کا بیٹا رائے بھوج باج گزار حاکم رہا، اب اس کا پوتا سربلند رائے ہماری خدمت میں ہے۔ یہاں دو برابر برابر پہاڑ ہیں ایک کو "رن" دوسرے کو "تھنبور" کہتے ہیں۔ تھنبور کے اوپر قلعہ ہے، ان دونوں کو ملا کر "رنتھمبور" نام رکھا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط ہے، پانی بھی وافر ہے ان پر مضبوط حصار ہے۔ قلعہ ہندوؤں کی عمارت کی طرح بے ہوا اور کم فضا ہے۔"

[۱] شکارپور، سیہوان سے ۱۳۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس جگہ حکام اور امراء شکار کھیلا کرتے تھے اس لیے اس کا نام شکارپور پڑ گیا۔ خراسان کو جانے والے مسافر جو درہ بولان سے ہو کر جاتے تھے ان کی یہ گزرگاہ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں اس کی آبادی پچاس ہزار تھی۔ اندرون شہر کی عمارتیں خام اور بازار تنگ تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں ترقی اور تبدیلی شروع ہوئی۔ پہلے ایک چھت والا بازار تھا۔

آثار قدیمہ میں صرف حاجی فقیر اللہ صاحب کا روضہ ہے جو قندھار سے آئے تھے۔ ان کی وفات ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۰ء میں ہوئی تھی۔ انگریزی دور میں ہندوؤں کا شہر پر تسلط تھا اور انھوں نے یہاں کی تجارت کو بڑی ترقی دی تھی۔ اب بھی تجارت و زراعت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بڑی مشکل سے قابو میں رکھا ہے، اب یہ آپ کے سپرد ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے عادل خاں کو تخت پر بٹھایا اور خود فرمانبردار کی طرح سامنے کھڑا رہا۔ دکھاوے کے لیے بڑی لچھے دار باتیں کرنے لگا۔

عادل خاں کی دُور اندیشی

عادل خاں باہوش، تنومند، زورآور نوجوان تھا۔ اس کی طاقت اور زور آزمائی کے قصے لوگوں میں مشہور تھے، لیکن وہ سلیم شاہ کی چال بازیوں کو بھی خوب بھانپ چکا تھا۔ اس لیے اس نمائشی رویہ پر اس نے دھوکا نہ کھایا اور تخت سے اُتر کر سلیم شاہ کو ہی تخت پر بٹھا دیا اور نیچے کھڑے ہو کر بادشاہت کی مبارک باد دی۔ اس دن بہت سا سونا چاندی لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ سلیم شاہ نے حسب وعدہ عادل خاں کو بیانہ کی جاگیر عطا کی اور اسے عیسیٰ خاں اور خواص خاں کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

سونے کی زنجیر

دو ماہ بعد ہی سلیم شاہ نے اپنے محرم خاص غازی محلی کو عادل خاں کو گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کیا۔ جب یہ خبر عادل خاں کو ملی تو وہ بیانہ سے خواص خاں کے پاس میوات میں چلا گیا۔ خواص خاں نے غازی محلی کو بلا کر اس کو اسی سونے کی زنجیر میں بندھوا دیا جو وہ عادل خاں کو قید کرنے کے لیے لے کر آیا تھا۔

عادل خاں کی یلغار

ان دونوں نے ایک بھاری لشکر آراستہ کر کے آگرہ پر یلغار کر دی۔ قطب خاں اور عیسیٰ خاں بھی جو تخت کے بلند پایہ امیر تھے اور انہی کے اعتماد پر عادل خاں اس قول و قرار پر راضی ہوا تھا۔ سلیم شاہ کی اس بدعہدی پر ناراض ہو گئے اور اُنھوں نے عادل خاں کے پاس خفیہ پیام بھیجا کہ "آپ شب برات کی صبح کو اول وقت آگرہ میں داخل ہوں، ہم سب یہاں آپ سے بیعت کر لیں گے۔"

عادل خاں اور خواص خاں شب برات کو سیکری پہنچ گئے۔ وہاں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی خدمت میں رات بھر عبادت کرتے اور نوافل پڑھتے رہے۔ اس شب گزاری کی وجہ سے آگرہ پہنچنے میں دیر ہو گئی اور وہ مقررہ وقت پر شہر میں داخل نہ ہو سکے۔

ان کی آمد سے سلیم شاہ گھبرا گیا۔ وہ قطب خاں اور دوسرے اُمرا کو سمجھا بجھا کر عادل خاں کے پاس بھیجنا چاہتا تھا تاکہ مخالف اُمرا سے قلعہ خالی ہو جائے تو وہ چنار کے قلعہ میں جا کر ٹھہر جائے اور وہاں کے خزانے اور دفینے قبضہ میں کر کے سامان جنگ تیار کر کے عادل خاں کے مقابلہ پر آئے۔ اس کی اس تجویز سے عیسیٰ خاں حجاب نے اختلاف کیا اور اس کے نقصان اور خطرے سمجھا کر اسے چنار جانے سے روک دیا۔

بھائیوں میں مقابلہ

سلیم شاہ اپنے قابل اعتماد دو تین ہزار قدیم ملازمین کو لے کر شہر سے باہر مقابلہ کے لیے نکلا۔ ان امیروں کو جنھیں اس نے عادل خاں کے پاس قاصد بنا کر بھیجا تھا یہ کہلوا کر بلا لیا کہ "مجھے عادل خاں کا کوئی اعتبار نہیں، خدا جانے وہ تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ تم لوگ لوٹ آؤ۔ اب میرے اور اس کے درمیان زبانِ تیغ ہی سے بات چیت ہو گی۔"

آگرہ کے نواح میں دونوں فوجوں میں بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی اور عادل خاں شکست کھا کر تنہا پھنّہ کی طرف نکل گیا۔ خواص خاں اور عیسیٰ خاں نیازی نے میوات کا راستہ لیا، کیونکہ یہ دونوں دل و جان سے ایک دوسرے کے شریک تھے۔

سلیم شاہ کے ایک لشکر نے ان دونوں کا تعاقب کیا۔ قصبہ فیروز پور میں اس لشکر کو اُنھوں نے شکست دے کر بھگا دیا لیکن سلیم شاہ کا خوف ایسا تھا کہ وہ کوہستان کماؤں کے راجہ کے پاس جا کر پناہ گزین ہو گئے۔ سلیم شاہ نے ان کی سرکوبی کے لیے قطب خاں کو نامزد کیا اور وہ عرصہ تک ان پہاڑوں میں لوٹ مار کرتا رہا۔

جلال خاں کا قتل

اس فتح کے بعد سلیم شاہ چنار گیا اور وہاں کے سارے خزانے اُٹھوا کر گوالیار منتقل کر دیے۔ چنار سے لوٹ کر جب وہ گھاٹم پور کے قصبہ میں آیا تو اس نے جلال خاں جلوانی کو چوگان کھیلنے کے بہانے اپنے خیمہ میں بلایا۔ جلال خاں بڑی جمعیت والا پٹھان سردار تھا اور دل سے عادل خاں کا طرف دار تھا اس لیے سلیم شاہ اُس کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگا ہوا تھا، چنانچہ جیسے ہی وہ اندر آیا، سلیم شاہ نے اسے اور اس کے بھائی خداداد کو گرفتار کرا کے ایک پٹھان کے حوالہ کر دیا۔ یہ پٹھان پہلے ہی جلال خاں سے کسی خون کا انتقام لینے کی فکر میں تھا اس طرح سلیم شاہ نے قصاص کا بہانہ کر کے جلال خاں کو قتل کرا دیا اور وہاں سے آگرہ لوٹ آیا۔

کچھ عرصہ بعد سلیم شاہ نے آگرہ کے بجائے گوالیار کو پایۂ تخت بنا لیا اور عادل خاں کے طرف داروں کو ختم کرنے کی تدبیروں میں لگا رہا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے بساطِ سلطنت پر سے ایک ایک کر کے مخالف مہروں کو اُٹھا دیا۔ اس کی اس کارروائی سے قطب خاں بھی خوف زدہ ہو گیا اور کماؤں کی مہم چھوڑ کر لاہور میں ہیبت خاں نیازی کے پاس چلا گیا۔ یہ نیازی وہی امیر ہے جسے شیر شاہ نے اعظم ہمایوں کا خطاب عطا کیا تھا۔

ہیبت خاں نے قطب خاں کو پناہ نہ دی بلکہ سلیم شاہ کے مطالبہ پر اسے مقید کر کے بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ سلیم شاہ نے قطب خاں، شہباز خاں اور دوسرے تیرہ چودہ نامی امیروں اور امیر زادوں کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ ان میں سے اکثر کو بارود کے ذریعہ اُڑا دیا گیا۔

محمود خاں کا قتل

ان مقتولین میں عادل خاں کا بیٹا محمود خاں بھی تھا جس نے سات سال کی عمر میں شیر شاہ کو لشکر کے اطراف ریت کے بوروں کا حصار بنانے کی تدبیر بتلائی تھی اور شیر شاہ نے اس کو اپنا ولی عہد کہہ دیا تھا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

اسی سال سلیم شاہ نے لاہور سے اعظم ہمایوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ عذر کر کے خود نہ آیا بلکہ اپنے بھائی سعید خاں کو جو بڑا بہادر اور عقل مند آدمی تھا بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلیم شاہ بظاہر اس سے بھی بڑی مہربانی اور عنایت سے پیش آتا رہا لیکن دل ہی دل میں اسے بھی ٹھکانے لگانے کی فکر کرتا رہا۔

دیوارِ مرگ

ایک دن وہ اُسے تنہا اپنے محل میں لے گیا اور وہاں بعض امیروں کے سر دکھائے جنھیں اس کے حکم سے زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا "کیا تم انھیں پہچانتے ہو یہ کون کون ہیں"؟ سعید خاں نے اُن کے نام بتلا دیے جنھیں وہ جانتا تھا۔ باہر آنے کے بعد سعید خاں نے جان بچا کر بھاگنے کی فکر کی اور لاہور کے راستہ میں ڈاک چوکی کا انتظام کرا کے تین راتوں میں آگرہ سے لاہور چلا گیا۔

کمال خاں کا قصہ

سلیم شاہ نے جن امیروں کو گوالیار کے قید خانہ میں بارود میں آگ لگا کر جلوا دیا تھا ان میں سے صرف

کمال خاں ککھڑ زندہ بچ گیا تھا۔ اس کے بچ جانے کے متعلق یہ قصّہ مشہور ہے کہ اس کی بہن سلیم شاہ کے نکاح میں تھی جب اسے معلوم ہوا کہ رات میں قیدیوں کو بارود لگاکر جلا دیا جائے گا تو اس نے اس کی اطلاع اپنے بھائی کمال خاں کے پاس بھجوا دی اور ساتھ ہی روئی سے بھرے ہوئے چار لحاف اور کئی مشک پانی بھی اس کے پاس بھیج دیا۔ کمال خاں نے غسل کے بہانہ سے ان لحافوں کو پانی میں اچھی طرح بھگو دیا اور ان کو اوڑھ کر سب سے الگ ایک کونے میں جاکر پڑ رہا۔ جب آگ لگائی گئی تو سارے قیدی جل کر راکھ بن گئے مگر کمال خاں ان لحافوں میں زندہ بچ گیا۔ صبح جب سلیم شاہ آتش زدگی کا تماشہ دیکھنے قید خانہ میں آیا تو اسے سلامت دیکھ کر کہا تو چونکہ میرے ساتھ سچا خلوص رکھتا تھا اس لیے تجھے آگ نے کوئی گزند نہیں پہنچایا۔ سلیم شاہ نے قسم کھاکر اسے اطمینان دلایا کہ "میں اب کبھی بھی تجھے گزند نہیں پہنچاؤں گا۔" چنانچہ اسے رہا کرکے حاکم پنجاب کے ہمراہ ککھڑوں کے ملک پر متعین کر دیا۔ وہاں اس نے بڑا اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔

اعظم ہمایوں کی بغاوت

اعظم ہمایوں نے اپنے بھائی سعید خاں کے واپس آجانے کے بعد خود مختاری اختیار کر لی۔ اور کافی قوت فراہم کرکے لاہور میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ سلیم شاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے ہر جگہ کے لشکر بلا لیے اور ایک بڑی فوج لے کر آگرہ سے لاہور کی طرف یلغار کی۔ راستہ میں مالوہ کے حاکم یزادل خاں نے حاضر ہوکر باریابی حاصل کی۔ بادشاہ نے اس پر بڑی عنایتوں کا اظہار کیا۔ بعد میں یزادل خاں اپنی بعض مصروفیتوں کا عذر کرکے اجازت لے کر لشکر سے رخصت ہو گیا۔

سلیم شاہ نے دہلی پہنچ کر چند روز توقف کیا اور وہاں لشکر کو منظم کرکے لاہور کی طرف کوچ کر دیا۔ خواص خاں اور عیسیٰ خاں نیازی بھی کوہ کمایوں سے اعظم ہمایوں کے پاس آگئے تھے۔ یہ سب باغی امیر اپنے لشکر لے کر بادشاہ سے مقابلہ کے لیے شہر سے روانہ ہوئے۔ سردیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا انبالہ کے قریب دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا۔

جس دن صبح لڑائی ہونے والی تھی اس رات کو ان امیروں کی مجلس مشاورت میں اعظم ہمایوں نے خواص خاں سے پوچھا "فتح حاصل ہو جائے تو تخت پر کون بیٹھے گا؟" خواص خاں نے جواب دیا "شیر شاہ کا بڑا بیٹا عادل خاں ہی سلطنت کا حق دار ہے!" نیازیوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور کہنے لگے "یہ بھی خوب، جانیں تو ہم لڑائیں اور سلطنت دوسرے کے سپرد کر دیں، سلطنت کوئی میراث تو نہیں بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتی ہے۔"

خواص خاں کو نیازیوں کا یہ ادعا پسند نہ آیا کیونکہ وہ دل و جان سے شیر شاہ اور اس کی اولاد کا خیر خواہ تھا۔ جب صبح مقابلہ ہوا تو بڑی لڑائی کے بعد خواص خاں عیسیٰ خاں کو ساتھ لے کر میدانِ جنگ سے کنارہ کش ہو گیا اور کسی طرف کو نکل گیا۔

نیازیوں کی شکست

نیازیوں نے سلیم شاہ کے مقابلہ میں بڑی جرأت دکھائی لیکن تقدیر میں ناکامی لکھی تھی اس لیے بُری طرح شکست کھائی۔ اعظم ہمایوں کے بھائی سعید خاں نے اس وقت اپنا حلیہ تبدیل کر لیا اور چند سواروں کے ساتھ سلیم شاہ کے لشکر میں پہنچ گیا۔ وہاں پوچھتا پھر رہا تھا "بادشاہ کہاں ہے میں اسے مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔" وہ اس بہانہ سے سلیم شاہ تک پہنچ کر اس کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ اس وقت سلیم شاہ نے ہاتھیوں کے حلقہ میں اپنی نشست

رکھی تھی۔ اتفاقاً کسی فیل بان نے سعید خاں کی آواز پہچان لی اور اس پر نیزہ سے وار کیا اور وہاں ایک ہجوم سا لگ گیا۔ سعید خاں اس ہنگامہ سے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلا۔

نیازیوں کی فوج منتشر ہو کر رُوہ کے قریب قصبہ دھنکوٹ میں بھاگ گئی۔ جو بھاگ نہ سکے اُن کو جاٹوں اور گنواروں نے لوٹ مار کے تباہ کر دیا۔ ان میں کچھ انبالہ کی ندی میں ڈوب کر مر گئے۔ سلیم شاہ نے نیازیوں کا رہتاس تک خود تعاقب کیا اور وہاں سے خواجہ ویس شیروانی کو ایک بھاری لشکر دے کر روانہ کیا اور خود آگرہ کو لوٹ آیا، وہاں سے گوالیار چلا گیا۔

خواص خاں کا حملہ

عیسیٰ خاں اور خواص خاں جو نیازیوں کا ساتھ چھوڑ کر میدان جنگ سے نکل گئے تھے، ان میں سے عیسیٰ خاں تو پہاڑوں کی طرف چلا گیا لیکن خواص خاں پانچ چھ سو سواروں کو لے کر لاہور لوٹ کر آیا۔

اس وقت سلیم شاہ کی طرف سے لاہور کا حاکم شمس خاں لوحانی تھا۔ وہ کسی ضرورت کی وجہ سے لاہور سے باہر تیس کوس پر گیا ہوا تھا۔ خواص خاں نے اپنے سواروں کے ساتھ لاہور پر حملہ کرنے کے لیے مرزا کامران کے باغ میں پڑاؤ لگایا۔ شہر والے قلعہ بند ہو گئے اور شمس خاں کے آنے تک حملہ آوروں سے لاہور کی حفاظت کرتے رہے۔ اس اثناء میں خواص خاں نے باغ کے اونچے اونچے پیڑ کاٹ کر زینہ بنانے کا ارادہ کیا تھا لیکن اسی وقت اطلاع ملی کہ رائے حسین جلوانی اور دوسرے سلیم شاہی امیر تیس ہزار سواروں کے ساتھ بہت ہی قریب آ پہنچے ہیں۔ (ایک دوسرے نسخہ میں ہے کہ خواص خاں لاہور میں داخل ہو گیا اور شہر میں لوگوں کو قتل کرا دیا۔ بعد میں جب بادشاہ کی تعاقب کرنے والی فوج پہنچی تو اُسی دن راوی عبور کر کے موضع میانی کے نواح میں پہنچ گیا۔ یحییٰ جلوانی جو خواص خاں کے تعاقب پر مامور تھا اس کے پیچھے ہی میانی پہنچ گیا۔ خواص خاں زخمی ہو چکا تھا لیکن چارپائی سے اُٹھ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور یحییٰ سے مردانہ وار جنگ کر کے نگر کوٹ کی طرف نکل گیا۔)

خواص خاں کی بہادری

جس وقت رائے حسین وہاں پہنچا تو خواص خاں نے عیسیٰ خاں سے مشورہ کیے لاہور کی فکر چھوڑ دی اور اپنے سواروں کو لے کر بلائے ناگہانی کی طرح کمک کے لیے آنے والی فوج پر جا پڑا۔ ان کے اس ہلاکت خیز حملے کو دیکھ کر رائے حسین نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ "اس مصیبت کو یہاں سے ٹل جانے دو اور ان کے جانے کے لیے راستہ چھوڑ دو۔" خواص خاں کے سوار اس فوج کو چیر کر دوسری طرف نکل گئے، پھر پیچھے سے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اُس وقت خواص خاں کا زانو زخمی ہو گیا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا لیکن غنیم کے آدمیوں کو آگے بڑھ کر اسے گرفتار کر لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس کے آدمی اسے چارپائی پر ڈال کر سب کے سامنے لے کر نکل گئے۔ رائے حسین نے اپنے لشکر کو ان کے تعاقب سے روک دیا اور خواص خاں صحیح سلامت نگر کوٹ پہنچ گیا اور وہاں سے کمایوں کے پہاڑوں میں چلا گیا۔

اعظم ہمایوں کے نیازیوں نے بادشاہ سے شکست کھا کر کشمیر کا رخ کیا۔ وہاں پہاڑ کی گھاٹیوں میں کشمیریوں نے دھوکے سے ان سب کو نیست و نابود کر دیا۔

سزاول خاں کی سرکشی

سزاول خاں بھی بادشاہ سے سرکش ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے کسی وجہ سے عثمان نامی ایک پٹھان کا ہاتھ کٹوا دیا تھا، وہ پٹھان انتقام کی فکر میں تھا، چنانچہ اس نے

۹۹۴ھ میں موقع پاکر سزاول خاں پر تلوار سے حملہ کردیا اور وہ زخمی ہوگیا۔ اسے گمان ہوا کہ پٹھان نے یقیناً سلیم شاہ کے اشارہ ہی سے حملہ کیا تھا، اس وجہ سے وہ سلیم شاہ سے کٹ کر مالوہ کی طرف چلا گیا۔ بادشاہ نے بانس والہ تک اس کا تعاقب کیا لیکن وہ سرود کے زمینداروں کے علاقہ میں ایسا گم ہوگیا کہ اس کا پتہ نہ چلا۔ سلیم شاہ نے عیسیٰ خاں سور کو بیس ہزار سوار دے کر اجین میں چھوڑ دیا اور خود گوالیار واپس ہوگیا۔

سلیم شاہ کے انتظامات

سلیم شاہ نے اپنی حکمرانی کے آغاز میں ہندوستان کی تمام بڑی بڑی سرکاروں میں پانچ پانچ ہزار سوار متعین کردیے تھے۔ ان سواروں میں نظام سوار کا بیٹا مبارز خاں بھی شامل تھا۔ یہ سلیم شاہ کا چچازاد بھائی اور سالا بھی تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا بعد میں سلطان محمد عدلی خطاب ہوا ہے۔ سلیم شاہ نے مبارز خاں کو سنبھل کی سرکار میں اجاون کے علاقہ پر بیس ہزاری منصب دے کر روانہ کیا تاکہ خواص خاں یا کوئی اور باغی اس جانب سے فتنہ انگیزی نہ کرے۔ پائندہ خبرک کو بادشاہ نے مبارز خاں کا نائب مقرر کیا تھا۔

اپنے ابتدائی عہد ہی میں سلیم شاہ نے شیر شاہ کی بنائی ہوئی سراؤں کے درمیان ہر جگہ ایک ایک اور سرائے بنانے کا حکم دیا تھا۔ اس سرائے کے ساتھ مسجد خانقاہ اور آبدار خانوں کا بھی انتظام رکھا گیا تھا۔ اس نے عام لنگر بھی جاری کرائے جس میں مسلمانوں کو تو پکا پکایا کھانا ملتا تھا اور ہندوؤں کو اناج۔ سلیم شاہ نے ایک حکم کے ذریعہ تمام لوگوں کے روزینے حسب سابق بحال رکھے جن کو شیر شاہ نے جاری کیا تھا۔ اس نے حکماً امراء کے گھروں سے پاتروں کے اکھاڑے برخاست کرادیے ان کا ہندوستان میں بڑا رواج تھا۔

امراء سے بادشاہ نے تمام ہاتھی بھی لے لیے، صرف کمزور اور لاغر ہتھنیاں جو بارکشی کے کام کی تھیں رہنے دیں۔

سلیم شاہ نے حکم دیا تھا کہ بادشاہ کے سوا سرخ سراپردہ اور کوئی نہ لگائے۔

اس نے تمام ملک کو اپنا خالصہ قرار دے دیا۔

فوجیوں کی تنخواہ اسی قاعدہ پر جاری رکھی جس پر شیر شاہ کے عہد میں تقسیم ہوتی تھی۔

سلیم شاہ نے ہر سرکار میں حکم نامے جاری کیے، ان میں دینی دنیوی، جزئی کلی، مالی اور ملکی تمام معاملات کے متعلق قوانین درج تھے اور ان طریقوں کی وضاحت تھی جن کے مطابق فوج، رعیت اور تاجروں کو معاملات کرنا چاہیے۔ حکام کے لیے بھی تفصیلی لائحہ عمل درج تھا۔ جس میں تمام امور کے بارہ میں قوانین لکھ دیئے گئے تھے۔ یہ لائحہ عمل اتنا مکمل تھا کہ اس کے بعد حکام کو بہت کم ضرورت پڑتی تھی کہ وہ کسی معاملہ میں قاضی یا مفتی سے دریافت کریں

سلیم شاہی لائحہ عمل

سلیم شاہ نے اپنے ہر سردار کو ایک ایک جوتی اور ایک ایک ترکش دے رکھی تھی ہر جمعہ کو بیس ہزاری دس ہزاری اور پانچ ہزاری تمام امیر آٹھ ہاتھ اونچا خیمہ لگوا کر سلیم شاہ کی جوتی اور ترکش کو ایک کرسی پر رکھتے تھے اور ان چیزوں کو سب سے پہلے لشکر کے سردار پھر منصف یعنی امین پھر دوسرے افسر اور عہدہ دار جھک جھک کر سلام کرتے تھے اور بڑے ادب و ترتیب کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے تھے۔ پھر منشی مذکورہ حکم نامہ کو جو اسی صفحات پر مشتمل تھا لے کر داخل ہوتا تھا اور اسے اوّل سے آخر تک پڑھتا تھا۔ اس میں ہر مشکل مسئلہ کے شق وار حل تفصیل

سے درج تھے، اسی کے مطابق سارا نظم و نسق چلایا جاتا تھا۔ اگر کبھی کوئی امیر کسی بھی معاملہ میں اس لائحہ عمل کے خلاف کاروائی کرتا تو منشی اس کی خبر بادشاہ کو پہنچا دیتا تھا اور اس امیر کو مع اہل و عیال کے سزا دی جاتی تھی۔ سلیم شاہ کے آخری عہد تک یہی معمول اور طریقہ تھا۔ میں (مصنف) ۹۵۵ھ میں کم عمر لڑکا تھا۔ اس وقت میں فرید تاران پنج ہزاری کے لشکر کے ساتھ اپنے نانا کے ہمراہ بجوارہ گیا تھا، بجوارہ بیانہ کا ماتحت علاقہ ہے۔ وہاں میں نے یہ کیفیت (لائحہ عمل پڑھنے کی رسم) اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس سے پہلے ۹۵۴ھ میں بھی ایک مرتبہ ایسی محفل کو دیکھ چکا تھا

نیازیوں کی تحقیر خواجہ اویس شروانی کو سلیم شاہ نے اعظم ہمایوں کی سرکوبی کے لیے متعین کیا تھا۔ اس نے دھن کوٹ کی سرحد پر نیازیوں کے مقابلہ میں شکست کھائی اور اعظم ہمایوں نے سہرند تک اس کا تعاقب کیا۔ بادشاہ نے ایک دوسرا بھاری لشکر اس کے مقابلہ پر روانہ کیا اور اس نے نیازیوں کو شکست دے دی۔ ان کی بعض عورتیں بھی شاہی لشکر کے ہاتھ آ گئیں۔ سلیم شاہ نے ان کو بے عزت کرا کے قلعہ گوالیار میں بھیج دیا۔ غنیمت میں نیازیوں کے علم سراپردہ اور دوسرا سارا اسباب ملا تھا، وہ سب بادشاہ نے رنڈیوں کو بخش دیا اور ان رنڈیوں میں سے کسی کو اعظم ہمایوں کسی کو سعید خاں اور کسی کو شہباز خاں کا خطاب دیا۔ ان رنڈیوں کے دروازوں پر نوبت کے وقت نقارے بجتے تھے۔ اس شاہانہ التفات کی وجہ سے ان کے دماغ آسمان پر پہنچ گئے تھے۔ یہ رنڈیاں جمعہ کی شب میں دربار کے دستور کے مطابق سلیم شاہ کے سلام کو جایا کرتی تھیں۔ اس وقت نقیب بلند آواز سے کہتا تھا، "بادشاہ ہم نظر دولت، اعظم ہمایوں خاں نیازی، سعید خاں نیازی، شہباز خاں نیازی دعا کے لیے حاضر ہے۔" سلیم شاہ کی یہ حرکت پٹھانوں کو بڑی ناگوار تھی، کیونکہ وہ سب آخر کار ایک ہی برادری اور قبیلہ کے تھے۔ بعض کہتے ہیں یہ خطاب علم اور نقارے پہلی فتح کے وقت ہی رنڈیوں کو دیے گئے تھے۔

پٹھانوں سے بدگمانی اس شکست فاش کے بعد اعظم ہمایوں کا زور ٹوٹ گیا۔ نیازیوں کی جمعیت پراگندہ ہو گئی اور انھیں پھر مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ رہتاس کے نواح میں ککھڑوں کی پناہ میں تھا پھر کشمیر کے پہاڑوں میں جا کر پناہ گزین ہو گیا تھا۔ سلیم شاہ نے ایک بڑا لشکر لے کر نیازیوں کے مکمل استیصال کے لیے کوچ کیا۔ پنجاب پہنچنے کے بعد اس نے شمالی کوہستان میں موزوں مقامات پر پانچ قلعوں کو تھانہ کے لیے تعمیر کرایا، جیسے مانکوٹ، رشید کوٹ وغیرہ۔ سلیم شاہ پٹھانوں سے بڑا بدگمان ہو گیا تھا، اس لیے اس نے لشکر کے پٹھانوں کو ذلیل کرنے کے لیے قلعوں کی مرمت پر لگا دیا اور وہ دو سال تک چونا پتھر ڈھوتے رہے۔ اس عرصہ میں اس نے ان کو ایک حبہ بھی تنخواہ کا نہیں دیا، جو اس مصیبت سے بچ گئے تھے ان کو ککھڑوں کے مقابلہ پر لگا دیا گیا۔ ککھڑ حسب عادت دن بھر ان پٹھانوں سے لڑتے تھے اور رات میں چوری چھپے چھاپہ مار کر ان کے لشکر میں سے عورت مرد باندی غلام جو بھی ہاتھ لگ جاتا اڑا لے جاتے تھے اور ان اسیروں کو کچھ عرصہ قید میں رکھ کر بیچ دیتے تھے۔

فرملی کا لطیفہ پٹھان ان مصیبتوں اور ذلتوں سے تنگ آ گئے لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ سے کچھ کہتا۔ ایک دن شاہ محمد فرملی نے جو ایک نامی امیر تھا اور نہایت خوش طبع ہزل گو اور گستاخ بھی تھا، سلیم شاہ سے

کہا میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے کہ آسمان سے تین تھیلیاں اُتریں، ایک میں سونا ایک میں کاغذ اور ایک میں خاک بھری ہوئی تھی۔ سونا تو دفتر کے ہندوؤں کے گھر چلا گیا، کاغذ شاہی خزانے میں رہے اور خاک سپاہیوں کے سر پر پڑی۔ سلیم شاہ کو یہ لطیفہ بہت پسند آیا اور اس نے خوش ہو کر حکم دیا کہ "اب جو ہم گوالیار لوٹ کر جائیں تو سارا حساب کر کے سپاہیوں کی دو سال کی تنخواہ ادا کر دی جائے"۔ اس حکم کی تعمیل سے پہلے ہی سلیم شاہ کا انتقال ہو گیا۔

نیازیوں کا حشر

نیازیوں کو کشمیریوں نے جو بڑے مکار اور دغا باز ہوتے ہیں دھوکا دے کر اپنے ہاں بلا لیا اور راستہ سے بہکا کر گھاٹیوں میں پھنسا دیا پھر سلیم شاہ کے اشارہ سے ان کا راستہ بند کر کے ان پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں نیازیوں کی عورتیں بھی اپنے ننگ و ناموس کو بچانے کے لیے لڑ کر مر گئیں۔ خود اعظم ہمایوں کی ماں اور بیوی بھی مقابلہ کرتی ہوئی پتھروں کے نیچے دب کر مر گئیں۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

مشہور ہے کہ شیر شاہ کے زمانہ میں ان نیازیوں نے سنبھل قبیلہ کے پٹھانوں کو عہد و پیمان کر کے بلایا تھا اور پھر عہد شکنی کر کے شیر شاہ کے اشارہ سے اس قبیلہ کے دو ہزار آدمیوں کو عورتوں بچوں سمیت ہلاک کر دیا تھا۔ زمانہ کا پھیر دیکھو کہ ان کا کیا ان کے آگے آیا ——— کشمیریوں نے ان تینوں بھائیوں کے سر کاٹ کر سلیم شاہ کے پاس بھیج دیے۔

کامران مرزا کی توہین

جس زمانہ میں سلیم شاہ نے ککھروں پر فوج کشی کی تھی اور مالی گڑھ کا قلعہ بنانے میں مصروف تھا، کامران مرزا ہمایوں سے شکست کھا کر کابل سے ہندوستان آیا تھا تاکہ سلیم شاہ سے مدد لے کر ہمایوں سے دوبارہ مقابلہ کرے۔ سلیم شاہ نے اس کے استقبال کے لیے اپنے لشکر میں سے ہیموں بقال کو منتخب کیا اور اس کے ہمراہ پٹھانوں کی جمعیت کر دی۔ ہیموں بقال پہلے بازار کا نگران تھا، لوگوں کی چغلیاں کھا کر اور مخبری کر کے وہ سلیم شاہ کے ہاں قابل اعتبار بن گیا تھا۔ سلیم شاہ نے اسے کامران کے استقبال پر محض اس لیے بھیجا تھا کہ اسے پٹھانوں پر اعتماد نہیں تھا اور ہیموں پر اعتماد تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مرزا بھی اسے قابل اعتبار سمجھے گا لیکن مغل شہزادہ میرزا کامران اس کے آنے سے بہت خفیف ہوا اور ہندوستان کا رخ کرنے پر اسے پشیمانی سی ہوئی۔ علاوہ ازیں مرزا کو توقع تھی کہ سلیم شاہ ملاقات کے وقت تعظیم و تکریم سے پیش آئے گا لیکن جب وہ ملنے گیا تو سلیم شاہ دربار میں بڑے تکبر اور غرور کے ساتھ تخت پر بیٹھا رہا۔ سرمست خاں افغان داؤد زئی نے جو بارگی کے عہدہ پر تھا معمولی ملازمین کے درجہ کی تعظیمات ادا کیں اور نہایت بدتمیزی کے ساتھ مرزا کی گردن کو بادشاہ کے سامنے جھکا کر چلا چلا کر کئی مرتبہ کہا "بادشاہ نظر دولت کامران مقدم زادۂ کابل دعا کرتا ہے"۔ سلیم شاہ نے نہایت لاپروائی کے ساتھ مرزا کو دیکھا اور کہا "خوش آمدی"۔ اپنے سراپردہ کے قریب اس کے لیے ایک ڈیرہ اور شامیانہ لگوا دیا اور ایک خلعت، ایک کنیز اور ایک خواجہ سرا اس کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے خدمت پر متعین کر دیے۔ کبھی کبھی مرزا کو اپنے ہاں بلا کر شعر و سخن کی باتیں کر لیا کرتا تھا، لیکن یہ صحبتیں تلخ ہی رہتی تھیں۔ کامران مرزا ان تکلفات اور مراسم سے نہایت تنگ آ چکا تھا۔ اپنی زندگی سے بیزار اور نکل بھاگنے کا موقع دیکھ رہا تھا۔ پٹھان ہندی زبان میں اسے چھیڑا کرتے تھے۔ جب وہ دربار میں آتا تو کہتے تھے "مور" آتا ہے۔

ایک مرتبہ مرزا نے سلیم شاہ کے حضور میں ایک امیر سے پوچھا "مور" کسے کہتے ہیں؟ اُس نے جواب دیا "مردِ عظیم الشان کو"

اس وقت سلیم شاہ نے حکم دے دیا آئندہ کوئی مرزا کے متعلق یہ لفظ نہ کہے اور نہ اس کی ہنسی اڑائے۔

کامران مرزا کا فرار

ایک دن سلیم شاہ نے مرزا سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ مرزا نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

گردش گردوں گرداں گرد نانرا گرد کرد
برسر اہل تمیز اہل ناقصاں را مرد کرد

سلیم شاہ اس وقت تو اس کنایہ کو سمجھ کر ٹال گیا لیکن خفیہ احکام جاری کر دیے کہ "مرزا کی سخت نگرانی کی جائے تاکہ وہ کہیں نکل کر جا نہ سکے۔" مرزا نے زمینداروں کے ذریعہ کسی پہاڑی راجہ کو بہت سے وعدوں کے ساتھ اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ اسے بھاگنے میں مدد دے۔ چنانچہ راجہ نے چناب کے کنارے تک گھوڑوں کی ڈاک بٹھا دی اور کامران رات میں چادر اوڑھ کر ڈیرہ سے نکل گیا۔ محافظوں نے سمجھا مرزا کے سراپردہ سے کوئی عورت نکل کر جا رہی ہے۔ اس کے بعد مرزا گھوڑے پر سوار ہو کر دریا عبور کر گیا اور اس راجہ کے ہاں چلا گیا۔ وہاں سے برقع اوڑھ کر ایک نگہبان کے ساتھ راجہ کے آدمیوں کے ہمراہ آگے روانہ ہو گیا۔ جب وہ موضع گھکڑی میں دریائے بھیت کے کنارے پہنچا تو رات ہو چکی تھی اس لیے وہاں ٹھہر گیا۔ یہ موضع سلطان پور کے نواح میں قلعہ رہتاس سے تین کوس پر ہے۔ کسی نے سلطان پور کے حاکم سلطان آدم کو خبر پہنچا دی کہ ایک مغل عورت جلودار کے ہمراہ تنہا فلاں جگہ ٹھہری ہوئی ہے اور وہ صبح وہاں سے چلی جائے گی۔ سلطان آدم نے آدمی دوڑا کر تحقیق کرائی۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ خود مرزا کی ملاقات کے لیے آیا۔ مرزا نے سلطان آدم کی بڑی خوشامد کر کے اس سے یہ قول لیا کہ وہ اسے اس کے مقام تک پہنچا دے گا۔ اس وقت ہمایوں بھی کہیں قریب پہنچا ہوا تھا۔ سلطان آدم نے سارا حال اس کے پاس لکھ بھیجا اور مرزا کی جاں بخشی کی درخواست کی۔ ہمایوں نے اس کے حسب مرضی فرمان لکھ کر بھیج دیا اور دو سال بعد مرزا کو اپنے ہاں طلب کر کے اس کی آنکھوں میں نشتر پھیر کر اسے مکہ معظمہ کو روانہ کر دیا۔

اس واقعہ کی تاریخ اسی لفظ "نیشتر" سے نکلتی ہے یہ سارا واقعہ تاریخ اکبرنامہ[1] اور تاریخ نظامی میں تفصیل سے درج ہے۔

---

[1] اکبرنامہ سلسلۂ تیموریہ کی تین جلدوں میں مکمل تاریخ ہے۔ بابر اور ہمایوں کے عہد کا حال تفصیل سے ہے۔ پہلی جلد کے پہلے حصے میں اکبر کے آبا و اجداد کا ذکر ہے۔ یہ حصہ ہمایوں کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں اکبر کے ۱۸ سنہ جلوس سے ۴۶ سنہ تک کے تفصیلی حالات ہیں۔ شعبان ۱۰۱۰ھ میں کتاب ختم ہوئی لیکن اس میں ۱۰۱۱ھ تک کے حالات درج ہیں جو غالباً بعد میں اضافہ کیے گئے۔ تیسری جلد آئین اکبری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جلد اکبر کے عہد حکومت کا مرقع ہے۔ سلطنت کے ہر شعبہ ہر صوبہ کے متعلق ہر طرح کے حالات امراء، مشاہیر، علماء، اہل کمال فقرا، عبادت گاہوں، عقائد اہل ہنود، مالگزاری کے قوانین اور نقشے شامل ہیں۔ یہ حصہ ۱۰۰۶ھ میں مرتب ہوا اس کا موضوع دونوں جلدوں سے علیحدہ ہے۔ مصنف کا نام شیخ ابو الفضل ہے جو شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا تھا۔ اکبرآباد میں ۶ محرم ۹۸۵ھ کو پیدا ہوا۔ اکبرنامہ کی دوسری جلد کے خاتمہ پر ابو الفضل کو پنج ہزاری کا منصب اور پچاس ہزار روپیہ نقد انعام ملا۔ ابو الفضل چونکہ اکبر کی خلوت و جلوت کا رفیق اور راز دار تھا اس لیے اس کی تاریخ معتبر سمجھی جاتی ہے لیکن اس نے اکبر کی کمزوریوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے واقعات کو مسخ کر کے بھی پیش کیا ہے جس کا پورا بدایونی کی منتخب التواریخ سے کھل جاتا ہے۔ ابو الفضل کو جہانگیر کے اشارہ سے یکم ربیع الاول ۱۰۱۱ھ بروز جمعہ اورچھا کے راجہ نرسنگھ دیو قندیہ نے گھیر کر قتل کر دیا تھا۔ اس کی قبر گوالیار سے دس میل پر انتری میں ہے۔ ابو الفضل علم و فضل کے لحاظ سے بلا پایہ ابو الفضل تھا۔ اکبرنامہ میں آخری چار سال کے حالات درج ہونے سے رہ گئے تھے اس لیے ابو الفضل کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

شاہ محمد دہلوی کا قصّہ

عہد سلیم شاہ کے واقعات میں شاہ محمد دہلوی کا واقعہ بھی مشہور ہے۔ شاہ محمد شیر شاہ کے زمانہ میں ولایت (ایران) سے ہندوستان آیا تھا اور اپنے آپ کو سیّد کہتا تھا لیکن لوگوں کو اس کے سیّد ہونے میں شکوک و شبہات تھے۔ اس نے اپنی وضع قطع مشائخوں کی بنا رکھی تھی لیکن یہ سب مکر اور ڈھونگ تھا۔ شیر شاہ پر اس نے اپنے ولی ہونے کا سکہ جما دیا تھا۔ سلیم شاہ بھی شاہزادگی کے زمانہ میں اس کا بڑا معتقد تھا اور اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بادشاہت کی فال نکلوایا کرتا تھا۔ اسے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اس کی جوتیاں تک اٹھایا کرتا تھا۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شخص شاہ محمد کے لیے خربوزوں سے بھرا ہوا ٹوکرا لے کر آیا۔ سلیم شاہ بھی اس وقت وہاں پہنچ گیا۔ شاہ محمد نے اس سے کہا: " اس ٹوکرے کو ہم چترِ شاہی سمجھ کر تجھے دیتے ہیں، اُٹھ! سر پر رکھ اور چل!" سلیم شاہ نے عقیدت میں بے تکلف اس بوجھ کو اُٹھالیا اور اسے اپنے لیے اچھا شگون سمجھا لیکن بعد میں ایسی باتیں اس کو ناگوار گزرنے لگیں اور وہ شاہ محمد سے ناراض رہنے لگا۔

سلیم شاہ کے زمانہ میں دو عالی نسب سیّد بھی ہندوستان آئے تھے۔ یہ دونوں بڑے عابد زاہد خوش اخلاق اور وجیہہ تھے ان میں سے جو خادم تھا اس کا نام امیر طالب تھا اور دوسرا اس کا بھتیجا میر شمس الدین اس کا مخدوم تھا۔ یہ دونوں عراق سے سفر کرتے ہوئے پنجاب میں سلیم شاہ کے لشکر میں وارد ہوئے اور وہاں سے دہلی آکر کسی محلہ میں ٹھہرے۔ بہت ہی جلد لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ میر طالب کو فنِ طب میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اکثر مریض اس کے علاج سے شفایاب ہونے لگے۔ اس طرح ان کو لوگوں کی طرف سے خاصی فتوحات نذر نیاز ملنے لگیں لوگوں میں یہ بھی مشہور ہوگیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی انگشتری کا نگینہ ان کے پاس ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے جس کے دل میں بھی کوئی شک ہو اس نگینہ کے سامنے اس کی بینائی دھندلی پڑ جاتی ہے۔

محمد شاہ کی ان لوگوں سے پہلے کی جان پہچان تھی، سابقہ تعارف کی بناء پر اس نے اپنی بیٹی کا میر ابو طالب سے نکاح کردینا چاہا لیکن ابو طالب نے یہ رشتہ پسند نہ کیا، اس وجہ سے بھی لوگ شاہ محمد کے سیّد ہونے کے بارے میں اور بھی زیادہ بدگمان ہوگئے۔ شاہ محمد نے ان دونوں سیّدوں کو اپنی ہی حویلی میں ایک محفوظ جگہ ٹھہرالیا اور ان کی خدمت میں لگا رہا۔

(بقیہ اکبر نامہ صفحہ گزشتہ) شاگرد عنایت اللہ عرف محمد صالح نے شاہی حکم سے ۴۷ سنہ جلوس سے ۵۰ سنہ جلوس تک کے حالات لکھ کر تاریخ مکمل کردی تھی۔ اکبر کی وفات ۱۲ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء یوم بدھ بعمر ۶۵ سال واقع ہوئی تھی، اس وقت اس تاریخ کا کام بند کردیا گیا۔

اسی نام (اکبر نامہ) سے ایک اور تاریخ ہے جسے شیخ اللہ داد پسر ملا علی شیر نے طبقات اکبری اور اکبر نامہ کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ اس میں شیخ فرید بخاری کی فتوحات اور کارناموں پر تفصیلی مواد ہے۔ دونوں تاریخوں سے بس یہ حصہ ہی زائد ہے مصنف بڑے اچھے عالم تھے اور طبقات اکبری کے مصنف نظام الدین کے استاد تھے، اُن کا بیان ہے کہ انھوں نے "ہمایوں نامہ" کی تصنیف میں جوہر آفتابچی کو بھی مدد دی تھی۔ ۶۵ سال کی عمر میں انھوں نے یہ تاریخ لکھی اور ۱۰۱۱ھ میں اسے مکمل کیا۔

قتل کی واردات

چند دن بعد ایک اندھیری رات میں چند مسلح آدمی شاہ محمد کے بالاخانے پر سے اتر کر آئے اور ان دونوں کو جو اس وقت تہجد میں مشغول تھے شہید کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی اور صبح حاکم شہر نے خود آکر شاہ محمد سے تفتیش کی۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں قطعاً اس معاملہ سے واقف نہیں ہوں اور نہیں جانتا کہ ان کے قاتل کون ہیں۔ پھر اس نے اسی مضمون کا ایک محضر نامہ دہلی کے بڑے بڑے لوگوں کی مہریں لگوا کر سلیم شاہ کے پاس بھی بھیج دیا۔

سلیم شاہ نے شیخ الاسلام اور صدر الصدور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو واقعہ کی تحقیقات کے لیے دہلی روانہ کیا اور ہر طرف فرامین بھیج کر اکابر علماء جیسے میاں حاتم[1] سنبھلی اور میاں جمال خاں[2] مفتی وغیرہ کو بلوایا۔ دو ماہ تک برابر اس واردات کی تحقیق و تفتیش ہوتی رہی، آخر بڑی تلاش و سعی کے بعد قرینہ یہی معلوم ہوا کہ شاہ محمد نے ہی قاتلوں کو ان کے قتل کے لیے لگایا تھا۔ غرض ان علماء نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ بادشاہ کے پاس روانہ کر دی۔ شاہ محمد کو اتنے بلند مرتبہ سے اس ذلت تک پہنچنے کا بڑا صدمہ تھا، اس لیے اس نے بادشاہ کا جواب آنے سے پہلے ہی فصد کھلوائی اور اس حال میں دہی پی لیا جس کے اثر سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ بعض لوگ اس واقعہ کے متعلق کچھ اور تفصیل بھی بتاتے ہیں، بہرحال شاہ محمد کا بہروپ سب پر کھل گیا کہ اس کی وضع قطع، عبادت و ریاضت سب مکر تھا اور بس۔ یہ واقعہ ۹۵۶ھ میں پیش آیا تھا۔

شیخ علائی کا واقعہ

دور سلیم شاہی کا دوسرا واقعہ بیانہ کے شیخ علائی مہدوی سے متعلق ہے اور وہ سیدی مولا کے واقعہ سے مشابہ ہے، جس کا ذکر ہم سلطان جلال الدین فیروز شاہ کے حالات میں کر آئے ہیں۔

شیخ علائی کے باپ کا نام حسن[3] تھا اور وہ بنگالہ کے مشائخوں میں سے تھے وہ اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ نصراللہ جو بڑے

۱؎ میاں حاتم سنبھلی شیخ عزیز اللہ طلنبی کے شاگرد اور مرید تھے، علم کلام اصول و فقہ میں بڑی جامعیت حاصل تھی۔ نہایت صالح اور متقی عالم گزرے ہیں۔ کہتے ہیں "شرح مفتاح" اور "مطول" جیسی ضخیم کتابوں کا از ابتداء تا انتہا چالیس مرتبہ درس دیا تھا۔ ملا علاء الدین لاری کی کتاب "حاشیہ عقائد نسفی" پر سخت تنقید کی کہ مصنف کو اس کا جواب بن نہ پڑا۔ ستر سال تک مسندِ درس پر متمکن رہے اور ۹۶۸ھ میں رحلت کی۔

۲؎ میاں جمال خاں مفتی۔ ان کے والد کا نام شیخ نصیر الدین تھا۔ خاندان کنبوہ کے مشہور عالم میاں لادن کے بھائی تھے۔ علوم عقلی و نقلی دونوں میں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ فقہ کلام اور تفسیر میں ان کی فضیلت مسلمہ تھی۔ مفتاح کی دونوں شرحوں میں بڑا فاضلانہ محاکمہ کیا ہے اور کتاب "عضدی" کا چالیس مرتبہ درس دیا۔ صاحب علم اور گوشہ نشین آدمی تھے، بادشاہوں اور امراء کی محفلوں سے دور ہی رہتے تھے۔ نوے سال کی عمر میں ۹۸۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف میں شرح عضدی، شرح مفتاح اور فقہ کی شرح انوار مشہور کتابیں ہیں۔

۳؎ شیخ حسن۔ ان کے والد شیخ طاہر نے ملتان سے بہار آکر شیخ بدھ حقانی سے علم حاصل کیا۔ شیخ حسن بھی بہار میں پیدا ہوئے۔ اس وقت شہر بہار صوبہ بنگال کے ماتحت تھا۔ حصول علم کے بعد راجی حامد شاہ مانک پوری کے مرید ہو گئے۔ سلوک اور توحید کے موضوع پر ان کے متعدد رسالے ہیں، ان میں سے ایک رسالہ کا نام "مفتاح الفیض" تھا۔ بہار سے جون پور جاکر مقیم ہو گئے تھے۔ سلطان سکندر خان کو دہلی بلا لیا تھا۔ دہلی میں ان کا قیام سلطان محمد تغلق کے "برج حصار" میں جس کا نام "کوشک بجی منڈل" تھا، رہا۔ ۲۴ ربیع الاول ۹۰۹ھ میں اسی جگہ وفات پائی۔

صاحب علم شخص تھے زیارت کعبہ کے لئے گئے اور وہاں سے لوٹ کر بیانہ میں آکر مقیم ہو گئے۔ اس سال کی تاریخ ہے:

"و جاء نصر اللہ و الفتح"

بیانہ میں آکر بڑے بھائی پیری مریدی کے مشغلہ میں اور چھوٹے بھائی درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ شیخ حسن کی اولاد میں سے شیخ علائی سب سے زیادہ نیک سیرت تھے۔ تقویٰ اور سلیم الطبعی کے آثار بچپن ہی سے ان کے چہرہ سے جھلکتے تھے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے باپ سے تمام علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کر لی۔ جودت طبع اور سرعت ذہن فطرت نے ودیعت کیا ہی تھا، بہت ہی جلد تدریس و افادہ میں نامور ہو گئے۔ باپ کے انتقال کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے سجادہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے اوقات زہد و عبادت، ارشاد و تلقین میں گزارنے لگے۔ اس علم، کمال اور پارسائی کے باوجود نفس امارہ کی ڈنک ٹوٹی نہیں تھی۔ اس لیے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کسی دوسرے شیخ کا رتبہ ان کے مرتبہ سے بڑھ جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک ریاکار صوفی کو پالکی سے اتار کر لوگوں میں خوب ذلیل کیا۔ اس وقت تک علائی کا دلی منشاء یہ تھا کہ "صرف میں ہی خاص و عام میں مقبول و سربر آوردہ رہوں۔ شیخ علائی کے دوسرے بھائی عمر میں گو ان سے بڑے تھے لیکن ان کی فضیلت کی وجہ سے سب نے ان کی اطاعت اختیار کر لی تھی اور ان کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے۔

عبداللہ نیازی کا مسلک

اسی دوران میں شیخ سلیم چشتیؒ کے ایک خلیفہ میاں عبداللہ نیازی پٹھان اپنے شیخ سے اجازت لے کر سفر حج پر گئے۔ وہاں انھوں نے بڑی ریاضتیں کیں اور ہر قسم کے ذکر و اشغال پورے کیے حرمین ہی میں وہ میر سید محمد جون پوری کے جن کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، معتقد ہو گئے اور مہدوی مذہب اختیار کر کے ہندوستان واپس آئے۔ بیانہ ہی میں آبادی سے دور باغ کے ایک گوشہ میں حوض کے کنارے سکونت اختیار کی۔ ان کا معمول تھا کہ خود پانی کے گھڑے بھر کر اپنے سر پر اٹھا کر لے جاتے تھے اور اس طرف کام کرنے والے لکڑہاروں، کسانوں وغیرہ کو اکٹھا کر کے نماز پڑھایا کرتے تھے جو کوئی پس و پیش کرتا اسے وہ اپنے پاس سے کچھ نہ کچھ دے کر جماعت کی طرف راغب کرتے تھے۔

شیخ علائی نے ان کے طریقہ کو بہت پسند کیا اور اپنے معتقدوں سے کہا "دیکھو دین اور ایمان اس کا نام ہے جو میاں عبداللہ نیازی کا سلوک ہے اور ہم لوگ جس روش پر ہیں وہ محض بت پرستی اور زنار داری ہے۔" رباعی

"تا یک سر موئے از تو ہستی باقی است   اندیشۂ کار بت پرستی باقی است

گفتی بت و زنار شکستم رستم   ایں بت کہ ز پندار پرستی باقی است

غرض کچھ ہی دن میں علائی ان بزرگ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ باپ دادا کے طریقہ کو ترک کر دیا۔ مشیخت اور پارسائی کی دکان بڑھا دی۔ سارا غرور و تکبر بالائے طاق رکھ دیا اور ان تمام لوگوں سے جن کو انھوں نے ناراض کر رکھا تھا منت خوشامد کر کے معافی چاہی اور رضامند کر لیا۔ خانقاہ اور لنگر کی ہما ہمی چھوڑ کر قلندرانہ روش اختیار کر لی اپنا سارا مال و اسباب یہاں تک کہ کتابیں بھی محتاجوں میں تقسیم کر دیں۔ بی بی سے کہا "اگر تجھے فقر و فاقہ منظور ہے تو بسم اللہ میرے ساتھ رہ اگر نہیں تو اس مال میں سے

اپنا حصہ لے لے، پھر تو مختار ہے جہاں چاہے گزر کر لے"۔ وہ نیک بی بی اسی فقر و فاقہ پر بخوشی رضامند ہوگئی ؎

کار دیں بعضی زناں شاید بہ از مرداں کنند
در دلیری شیر مادہ بہتر از شیر نر است

شیخ علائی کی تحریک

اب کہیں جا کر نفس امارہ کا سر کچلا گیا اور شیخ علائی طلب صادق کے ساتھ میاں عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے پاس انفاس کا طریقہ سیکھا اور جس ذکر کا وہ شغل کرتے تھے خود بھی اس کا ورد رکھا۔ اس ریاضت سے کلام پاک کے رموز و معانی، نکات و دقائق بہت جلد ان پر کھل گئے۔ ان کے مُرید اور خادم جن میں بعض مجرد اور بعض گھر بار والے تھے اللہ کے توکل پر اُن کی خدمت میں لگے رہے اور ان سے ذکر و شغل کے طریقے سیکھنے لگے۔ ان کے مریدوں میں تین سو آدمی خانہ دار تھے۔ یہ لوگ کوئی پیشہ یا تجارت نہیں کرتے تھے کہیں سے کچھ مل جاتا تو آپس میں تقسیم کر لیتے۔ اگر ان میں سے کبھی کوئی کچھ کمائی کر بھی لیتا تو اس میں سے دسواں حصہ ضرور راہِ خدا میں دے دیتا۔ روزانہ دو وقت ایک تو فجر کے بعد اور ایک کسی اور نماز کے بعد سب چھوٹے بڑے ایک حلقہ میں بیٹھ جاتے اور قرآن کے معانی و مطالب کا درس لیتے۔ شیخ علائی کا بیان ایسا اثر انگیز تھا کہ جو کوئی ایک مرتبہ بھی اُن کو سُن لیتا پھر وہ سارے گھر بار، بال بچوں کو چھوڑ کر اُن کا ہو جاتا اور کسی مشغلہ کی طرف رُخ نہ کرتا۔ یہ سب ایسے قانع اور متوکل تھے کہ اگر بھوک کے مارے ان کا دم بھی نکلتا ہو تو ان میں سے کوئی دم نہ مارتا تھا۔ جو بھی اجنبی ان کی محفل میں چلا جاتا تو کم سے کم وہ اپنے گناہوں سے ضرور تائب ہو جاتا تھا۔

ان میں سے اکثر کا تو یہ حال تھا کہ رات میں اپنے کھانے اور استعمال کے برتن اوندھا کر رکھ دیتے تھے یہاں تک کہ نمک آٹا بلکہ پانی بھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا۔ بس اس رزق دینے والے کی رزاقی پر توکل کر کے رات گزار دیتے تھے، صبح اللہ تعالیٰ بہر حال کہیں نہ کہیں سے اُن کا رزق اُن کے پاس پہنچا دیتا تھا۔

اسباب دنیاوی سے یہ بے نیازی تھی لیکن ہتھیار اور سامان جنگ دشمنوں کے مقابلہ کے لیے ہر شخص کے پاس لازماً ہوتا تھا۔ اِس لئے جو بھی ان کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ مالدار اور صاحب حیثیت لوگ ہیں، محتاج نہیں۔

ان سب کا وطیرہ تھا کہ شہر اور بازار میں جو بھی بات شریعت کے خلاف نظر آتی اسے وہ جبراً روک دیتے تھے اور اس معاملہ میں سرکاری حکام سے ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہ ہوتے تھے اور ان کے مقابلہ میں اکثر غالب ہی رہتے تھے چنانچہ شہر کے جو حاکم ان کے معتقد تھے وہ تو ان کی ہر طرح مدد کرتے تھے اور جو ان کو نہیں مانتے تھے وہ بھی ان کے ڈر سے دم نہیں مارتے تھے۔ شیخ علائی کی تحریک اس تیزی سے پھیلی کہ باپ بیٹے کو، بھائی بھائی کو، شوہر بی بی کو چھوڑ کر مہدوی دائرہ میں شامل ہو گیا۔

شیخ علائی کا سفر

شیخ علائی کی اس تحریکی جدوجہد اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میاں عبداللہ کے اوقات میں خلل پڑنے لگا اور وہ اس ہنگامہ آرائی کے متحمل نہ ہو سکے۔ آخر کار ایک دن اُنھوں نے شیخ کو بلا کر نہایت نرمی کے ساتھ نصیحت کی کہ یہ رونق ہمیشہ نہیں رہتی اور اس زمانہ کے لوگوں کو حق بات کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

تمھیں لوگوں کی روک ٹوک سے کیا غرض، یا تو خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کرو یا حج کا ارادہ کرلو۔ شیخ علائی نے اپنے مربی کے حسب منشاء اسی وضع اور حالت میں چھ سات سو آدمی ہمراہ لے کر گجرات کا اس ارادہ سے قصد کیا کہ وہاں طریق مہدویہ کے کسی پیشوا کی صحبت سے فیض حاصل کریں۔

جب وہ بیانہ سے نکل کر قصبہ بساور میں پہنچے تو میرے والد مرحوم ان کی خدمت میں مجھے بھی لے کر گئے تھے۔ چونکہ میں اُس وقت بہت کمسن تھا اس لیے مجھے ان کی صورت بس وہم و خیال کی طرح کچھ کچھ یاد ہے۔

اس سفر میں شیخ علائی جب جودھ پور کے قریب خواص پور میں پہنچے تو خواص خاں جو اس جانب مامور تھا ان کے استقبال کے لیے آیا اور ان کا معتقد ہو گیا لیکن خواص خاں نہ صرف یہ کہ صوفیوں کی محفل سماع میں شرکت کرتا تھا بلکہ اپنے سپاہیوں کا حق بھی مار لیتا تھا اور شیخ علائی کسی خلاف شرع بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ان کی اور خواص خاں کی نبھ نہ سکی اور کچھ دوسرے اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ شیخ علائی گجرات سے لوٹ کر پھر بیانہ آ گئے۔

علائی دربارِ شاہی میں

جب سلیم شاہ تخت نشین ہوا اور شیخ علائی کا شہرہ اس کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مخدوم الملک ملا سلطان پوری کے بہکاوے میں آکر میر رفیع الدین محدث اور ابوالفتح تھانیسری[۱] اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو جمع کیا اور شیخ علائی کو بھی بیانہ سے بلوایا۔

شیخ علائی اپنے چند ہر دم ساتھ رہنے والے خاص خاص مریدوں کو لے کر جو ہمیشہ زرہ پہنے ہتھیار باندھے رہتے تھے، دربار میں آئے اور اس شان سے کہ انھوں نے شاہانہ آداب و مراسم کی کوئی پرواہ نہ کی اور مسنون طریقہ پر بادشاہ کو "السلام علیکم" کہا سلیم شاہ نے ان کے سلام کا بڑی حقارت و بیزاری سے جواب دیا۔ شیخ کی یہ حرکت نہ صرف بادشاہ بلکہ دوسرے تمام امراء کو بھی ناگوار گزری۔ مخدوم الملک[۲] نے بادشاہ کو پہلے ہی یہ باور کرا رکھا تھا کہ شیخ علائی مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور امام مہدی چونکہ تمام دنیا کے بادشاہ ہوں گے اس لیے لازماً شیخ کا ارادہ بھی خروج و بغاوت کا ہوگا۔ اس لیے یہ شخص گردن زدنی ہے۔ عیسیٰ حجاب نے جو بڑا مقرب امیر تھا، شیخ علائی کو پھٹے کپڑوں ٹوٹی ہوئی جوتیوں کے ساتھ اس خستہ حالت میں دیکھا تو کہنے لگا:

---

[۱] ابوالفتح۔ شیخ نصیر الدین اودھی دہلوی کے مریدوں میں سے گزرے ہیں تیمور کے حملہ کے بعد دہلی سے کالپی میں آکر مقیم ہو گئے تھے، اسی جگہ وفات پائی۔ ان کا مزار کالپی میں ہے۔ حضور اکرمؐ کی نعت میں ان کا ایک فصیح و بلیغ قصیدہ ہے جس کے چند شعر شیخ المحدثین دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں نقل کیے ہیں۔ ان کا پورا نام تھا شیخ ابوالفتح احمد تھانیسری۔

[۲] مخدوم الملک۔ اصل نام عبداللہ سلطان پوری ہے۔ مضافات لاہور میں سلطان پور کے انصاری خاندان سے تعلق تھا اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا، خاص طور پر علم فقہ میں بڑی مہارت تھی۔ عربی لسانیات فقہ تاریخ اور دوسرے موضوعات پر کئی ایک کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں "عصمۃ الانبیاء" اور "شمائل النبی" مشہور کتابیں ہیں۔ ہمایوں نے ابتدائی دور میں مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کا خطاب عطا کیا تھا اپنے عقائد میں نہایت متعصب تھا۔ اس علم و فضل کے ساتھ دنیاداری اور دولت کی محبت بھی بہت تھی۔ جتنا بڑا عالم تھا اتنا ہی دولت مند بھی تھا۔ اکبر کے زمانہ میں دیوان خانہ شاہی کی وکالت کے عہدہ پر فائز تھا۔ جب مرا تو اس کے گھر سے تین کروڑ کا نقد خزانہ نکلا۔ حج کے لیے مکہ گیا ہوا تھا واپسی میں جس وقت گجرات پہنچا وہاں سنہ ۹۹۰ھ میں انتقال ہو گیا۔

بہ خوب اذ را اس کی ہیئت کذائی تو دیکھو ان پھٹے حالوں ہم سے بادشاہت لینا چاہتا ہے، کیا ہم پٹھان مر گئے ہیں؟"

شیخ علائی کی تقریر

شیخ علائی نے دربار کی ان چبھتی ہوئی نگاہوں کو نظر انداز کر دیا اور گفتگو کے شروع ہونے سے پہلے اپنے معمول کے مطابق قرآن کی چند آیتیں تلاوت کیں اور ان کی تشریح کرتے ہوئے دنیاداری کی مذمت، احوال قیامت اور علمائے زمانہ کی دنیا طلبی اور بے عملی پر ایسی مؤثر اور درد انگیز تقریر کی کہ سلیم شاہ اور اُس کے درباریوں پر سکتہ سا چھا گیا اور باوجود قساوت قلبی کے ان کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔

یہ بیان سن کر سلیم شاہ محفل سے اُٹھ کر محل سرا میں چلا گیا اور شیخ علائی اور ان کے ساتھیوں کے لیے کھانا وغیرہ بھجوایا لیکن شیخ علائی نے اس کا کھانا نہ کھایا اور اپنے رفیقوں سے کہا جس کا جی چاہے وہ ضرور کھالے۔ جب سلیم شاہ لوٹ کر باہر آیا تو شیخ نے اس کی تعظیم بھی نہ کی۔ بادشاہ نے جب اُن سے پوچھا کہ "تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا" تو اُنھوں نے بلا جھجک جواب دیا "تم نے جو اپنے حق سے زیادہ خزانہ کا روپیہ خلاف شریعت جمع کر رکھا ہے وہ تمھاری ملکیت نہیں بلکہ سب مسلمانوں کا حق ہے اور تمھارا کھانا بھی اسی قسم کا ہے"۔ سلیم شاہ کو یہ سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گیا۔

مہدویت پر مباحثہ

اب علماء نے شیخ علائی سے مسئلہ مہدویت پر گفتگو شروع کی لیکن شیخ کا یہ زور بیان تھا کہ سب کے لب سِل گئے۔ میر سید رفیع الدین صفوی نے جن کا انتقال ۹۵۴ھ میں ہوا، ان احادیث کو بیان کیا جن میں امام مہدی کی علامتوں کا ذکر ہے۔ شیخ نے ان کو جواب دیا کہ "تم شافعی مذہب ہو اور ہم حنفی ہیں، ہمارے تمھارے اصولوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس لیے تمھاری توجیہیں اور تاویلیں ہم تسلیم نہیں کر سکتے، پھر ہم تمھارے استدلال کو کیسے مان لیں"۔ ان کے مقابلہ میں ملا عبداللہ کا تو یہ حال تھا زبان سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ شیخ نے اُسے خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے کہا "تو دنیا دار فاسق ہے، دائرہ عدل سے باہر ہے، علانیہ تیرے گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آتی ہیں اور حدیث صحیح میں ہے:

"جو مکھی نجاستوں پر بیٹھتی ہے وہ اس عالم سے ہزار درجے بہتر ہے جو بادشاہوں اور امیروں کی خوشامد میں لگا رہتا ہے"۔

اسی طرح اُنھوں نے دوسرے بے عمل عالموں کی خوب خبر لی اور اپنے سارے بیان کو آیتوں اور حدیثوں سے ثابت کیا، یہاں تک کہ ملا عبداللہ کو دم مارنے کی مجال نہ رہی اور وہ چپکا ہو کر بیٹھ گیا۔

ملا جلال کا لطیفہ

مباحثہ کے دوران ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ ایک دن اسی بحث کے سلسلہ میں آگرہ کے ملا جلال[1] بھیم دانشمند نے وہ حدیث جس میں امام مہدی کے حلیہ کا ذکر ہے پڑھی اور اس میں لفظ

---

[1] ملا جلال۔ غالباً قاضی جلال الدین ملتانی سے مراد ہے۔ یہ پہلے تاجر تھے، بعد میں اکبر آباد آگرہ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اکبر کے زمانہ میں قاضی یعقوب کی معزولی پر عہدۂ قضاءت پر مامور رہے۔ کہتے ہیں بلحاظ عدل و دیانت بہترین قاضی گزرے ہیں۔ اپنے بیٹے کی نازیبا حرکتوں کے خمیازہ میں ان کو دکن کی طرف جلاوطن ہونا پڑا۔ دکن میں ان کی بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ دکن سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔

"اجل الجهتہ" کو "اَجَلّ" (ج پر زبر لام پر تشدید) پڑھا۔ "اَجَلّ" "جلال" سے مشتق اور "جلیل" کی تفضیل ہے۔ شیخ علائی سن کر مسکرائے اور کہا "عوام میں تو اپنے آپ کو بڑا عالم مشہور کرتا ہے اور حال یہ ہے کہ عربی کی عبارت بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتا پھر اس حدیث کے رموز و نکات اشارہ کنایہ کو کیا خاک سمجھے گا۔ یہ لفظ اصل میں "اَجْلیٰ الجهتہ" ہے اور اجلیٰ "جلی" کی تفضیل ہے نہ کہ تیرے نام جلال کی"۔ وہ اس گرفت پر ایسا خفیف ہوا کہ پھر اس نے آخر تک دم نہ مارا۔

مشہور ہے شیخ مبارک بھی اسی مجلس میں موجود تھا غالباً اسی وجہ سے اس کو بھی مہدوی کہا جانے لگا۔

سلیم شاہ سے گفتگو

سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ وہ شیخ کی تقریر پر عش عش کرنے لگا اور کچھ ایسا فریفتہ ہوا کہ ان سے کہا "تم مجھ کو ہمیشہ قرآن کا وعظ سنایا کرو مگر مہدوی مذہب کو ترک کر دو اور میرے کان میں چپکے سے اس مذہب سے انکار کے متعلق کہہ دو۔ اگر تم کو یہ قبول ہو تو میں تمھیں اپنی سلطنت کا محتسب مقرر کر دوں گا اور آج تک تم یہ جو امر معروف اور نہی منکر میری اجازت کے بغیر کرتے رہے ہو، اب یہ سب میری اجازت سے کیا کروگے، علماء نے تمھارے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے لیکن میں تمھارا لحاظ کرتا ہوں اور تمھارا خون بہانا نہیں چاہتا"۔

شیخ علائی کی جلاوطنی

شیخ اس بیکار سے ادعا (دعویٰ مہدویت[1]) پر جو ضروریات دین میں بھی شامل نہیں ایسے متعصب تھے کہ انھوں نے کسی صورت بھی بادشاہ کا کہنا نہ مانا اور اس سے بے باکانہ جواب دیا کہ ——

---

[1] مہدویت۔ سید محمد جون پوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا یا نہیں؟ یہ سوال تاقی موضوع بحث رہا ہے۔ بعض کہتے ہیں انھوں نے صرف مہدی یعنی رہبر یا رہنما ہونے کا دعویٰ کیا تھا نہ کہ "المهدی" کا یعنی وہ خاص شخصیت جس کے متعلق مسلمہ اعتقاد ہے کہ قرب قیامت پر اس کا ظہور ہوگا۔ یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے پیرؤں نے مہدویت کے عقیدہ پر الگ سے ایک نیا مذہب اختراع کر لیا، بعد میں چل کر بعض اصول و عقائد پر مہدویت کو ماننے والوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک "تسویت" کا قائل نہیں تھا دوسرا اس کو لازمی قرار دیتا تھا۔ تسویت سے مراد ختم نبوت میں سید محمد مہدی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مساوی ہونا ہے۔ دوسرا اختلاف سید محمد مہدی کا انکار کرنے والوں کے ایمان و کفر سے متعلق تھا۔ ایک گروہ منکرین کو کافر کہنے سے احتراز کرتا تھا اور دوسرا مہدویت کا دار و مدار ہی منکرین مہدی کو کافر قرار دینے پر رکھتا تھا حیدرآباد دکن کے پٹھان مہدویوں نے جن کی وہاں کثرت تھی ۱۳۲۹ھ ۱۵ رجب کو محلہ چنچل گوڑہ میں ایک اجماع منعقد کر کے تسویت کی تصدیق کی تھی۔ مسلمان ممالک میں سیاسی نزاعات جب بھی پیدا ہوئے ہر فریق نے مہدی موعود کے اعتقاد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں ایسی ایسی موضوع حدیثیں بیان کی جانے لگیں کہ مہدی موعود کی پہچان کچھ آسان بات نہ رہی۔ ہر فریق نے اپنے پیشوا کو مہدی ثابت کرنے میں وہی علامات گھڑ لیں جو ان کے حسب حال تھیں اس لیے ان علامتوں میں بڑا التضاد ہو گیا اور جس نے بھی کچھ تھوڑی بہت قوت حاصل کر لی اس نے اپنے مہدی آخر الزمان ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ ۴۱۵ھ بلاد مغرب میں محمد بن تومرت مغربی نے عبد المومن کومی کی حمایت سے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس شخص نے کچھ لوگوں کو قبروں میں چھپا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کے حکم سے یہ نقلی مردے قبروں سے نکلے اور اس کے مہدی ہونے کی تصدیق کی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد میں محمد بن عبد اللہ میمون نے شام میں یہی دعویٰ کیا تھا اور ایک شہر "مہدیہ" بھی بسایا تھا۔ اس کا حال ابن کثیر ابن جوزی اور خلکان نے تفصیل سے لکھا ہے۔ کردستان میں بھی اذباسا نامی ایک شخص نے شہر زور سے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اسے ایک کرد سردار امیر احمد خاں نے قتل کر دیا۔ سات سو ہجری میں بلاد مغرب ہی سے ایک کیمیاگر سید محمد نامی یہی دعویٰ لے کر اٹھا تھا۔ ۶۱۷ھ میں محمد بن عبد اللہ

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

"تمھاری باتوں میں آکر میں اپنا اعتقاد نہیں بدل سکتا۔"

سلامت چو خواہی ملامت رواست

سلامت چو گم شد ملامت خطاست

اسی دوران میں ہر روز سلیم شاہ کے سننے میں آتا کہ آج فلاں سردار شیخ کا مرید ہوگیا اور فلاں امیر اُن کے معتقدوں میں شامل ہوگیا اور دنیا کے معاملات چھوڑ دیے۔ ادھر ملا عبداللہ برابر بادشاہ کو شیخ کے قتل پر ترغیب دے رہا تھا۔ آخر سلیم شاہ نے شیخ کو حکم دیا کہ "تم اس ملک سے نکل جاؤ اور دکن میں جاکر سکونت اختیار کرو۔"

دکن میں مہدویت

دکن میں مہدوی مذہب کافی پھیل چکا تھا۔ خود شیخ عرصہ سے وہاں جانے کے آرزومند تھے۔ یہ حکم تو ان کے لیے خوش خبری سے کم نہ تھا۔ چنانچہ وہ بے تامل دکن کی طرف روانہ ہوگئے دکن کی سرحد پر جب وہ ہنڈیہ پہنچے تو وہاں کا حاکم بہار خاں جس کا لقب اعظم ہمایوں شروانی تھا، ان کا معتقد ہوکر اس مسلک کا پیرو بن گیا۔ وہ ہر روز ان کا وعظ سنا کرتا تھا۔ اس کا آدھے سے بھی زیادہ لشکر شیخ کا معتقد ہوچکا تھا۔ مخبروں نے یہ خبریں بادشاہ تک پہنچائیں۔ یہ بات اسے بڑی ناگوار گزری۔ مخدوم الملک تو شیخ علائی سے خار کھائے بیٹھا ہی تھا، اس نے جھوٹ سچ ملا کر بادشاہ کو اور بھڑکایا، یہاں تک کہ سلیم شاہ نے شیخ علائی کو واپس لانے کے لیے فرمان صادر کر دیا۔

(بقیہ حاشیہ مہدویت صفحہ گزشتہ) نے مصر میں اسی دعویٰ پر بغاوت کی تھی۔ شیخ اویس رومی جو سلطان بایزید کے عہد کے نامور صوفی ہیں ان کے متعلق بھی مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو مہدی سمجھا تھا، لیکن اس کے ادعا سے پہلے ہی ان کو معلوم ہوگیا کہ یہ محض شیطانی وسوسہ تھا۔ سید محمد جون پوری سے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ صاحب "معارج الولایت" کی تحریر ہے "سید محمد نور بخش جون پوری کو ایک روز حال آیا دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ "انت مہدی" یعنی تو مہدی ہے۔ انھوں نے سمجھا میں مہدی موعود ہوں۔ ایک مدت تک اسی دعویٰ پر رہے۔ آخر جب حج کو چلے۔ اثنائے راہ میں ان کو کشف ہوا کہ میں مہدی بایں معنی ہوں کہ ہدایت یافتہ ہوں۔ پس اس دعویٰ سے باز آکر مریدوں اور ہمراہیوں کو اس اعتقاد سے پھیر دیا اور کہا کہ جب اس سفر سے پلٹوں گا باقی مریدوں کو بھی اس اعتقاد سے باز رکھوں گا۔ آخر اثنائے راہ میں وفات پائی۔ ہمراہیوں نے یہ خبر دوسروں تک پہنچائی۔ ان میں سے بعض نے یہ عقیدہ ترک کر دیا اور بعض پہلے اعتقاد پر ہی قائم رہے۔"

مہدویوں کے عقیدہ کے لحاظ سے فرائض کی تعداد تیس ہے۔ اس میں سے بیس فرائض اعتقادی ہیں جن کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ان میں کسی کو اختلاف نہیں۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ ان اعتقادی فرائض میں بھی مہدیوں کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ دس فرائض عملی بھی جن میں ان کا باہم اختلاف ہے ان دس فرائض میں سے عشر، نوبت، اجماع، تسویت اور صحبت صادقین پر اختلافی رسالے لکھے جاتے رہے ہیں۔

کسی وقت مہدوی فرقہ ایک تبلیغی اور تحریکی فرقہ تھا لیکن عرصہ دراز سے اس کی حیثیت ایک قبیلہ اور قوم کی رہ گئی ہے اور بس۔

تاریخی شواہد ایسے ہیں جن سے قیاس ہوتا ہے کہ سید محمد جون پوری کی جدوجہد ایک صحیح اسلامی تحریک تھی جو ہندوستان میں سیاسی قوت کے ذریعہ اسلامی نظام کے لیے میدان ہموار کر رہی تھی بعد میں تحریکی روح ختم ہوگئی اور ان کے پیرو دُور از کار عقائد کی الجھنوں میں گرفتار ہوکر رہ گئے اور اس طرح ایک نیا مذہب "مہدویت" پیدا ہوگیا۔

عبداللہ نیازی کا واقعہ

اسی دوران میں سلیم شاہ نیازی پٹھانوں کا فتنہ رفع کرنے کے لیے آگرہ سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تھا۔ جب وہ اس سفر میں بیانہ کے قریب ہراور میں پہنچا تو مخدوم الملک نے بادشاہ سے عرض کیا "شیخ علائی کا تو معمولی فتنہ تھا جس سے نجات مل گئی سب سے بڑا فتنہ شیخ عبداللہ نیازی ہے جو علائی کا مرشد اور سارے نیازیوں کا پیر ہے اور ہمیشہ وہ تین چار سو مسلح آدمیوں کو لے کر بیانہ کے پہاڑوں میں دنگا فساد کرتا رہتا ہے۔"

یہ سن کر سلیم شاہ کو جو نیازیوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا بس آگ ہی لگ گئی۔ اسی وقت حاکم بیانہ میاں بھوہ کے پاس فرمان بھیجا کہ "شیخ نیازی کو فوراً حضور میں روانہ کر دو۔ میاں بھوہ شیخ کا بڑا عقیدت مند تھا۔ اس نے خفیہ جا کر شیخ سے درخواست کی کہ" اس وقت مصلحت یہی ہے کہ آپ یہاں سے کسی طرف کو ٹل جائیں پھر بادشاہ کو آپ کا خیال بھی نہ رہے گا۔ اور میں یہاں سے کوئی معقول عذر لکھ کر روانہ کر دوں گا۔" شیخ عبداللہ نے اس کی بات کو قبول نہ کیا اور اس سے کہا۔" بادشاہ کے دل سے میرا خیال نہیں جائے گا، ویسے بھی مخدوم الملک ہمیشہ تاک میں لگا رہتا ہے، میں کہیں دور دراز چلا بھی جاؤں اور پھر بادشاہ مجھے وہاں سے طلب کرے تو مجھے لمبے سفر کی زحمت اٹھانی پڑے گی، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اس وقت جب کہ بادشاہ صرف دس کوس پر ہے یہیں اس سے جا کر مل لوں ؎ خدا کا جو حکم ہے بہرحال وہ پورا ہو کر ہی رہے گا ؎

عناں کار نہ در دست مصلحت بین است
عناں بدست قضا دہ کہ مصلحت این است

شیخ نیازی لشکر شاہی میں

غرض یہ بزرگ راتوں رات چل کر شاہی لشکر میں پہنچ گئے اور صبح جس وقت سلیم شاہ کوچ کے لیے سوار ہو رہا تھا شیخ نے "السلام علیکم" کہا۔ میاں بھوہ نے زبردستی ان کی گردن یہ کہتے ہوئے جھکا دی "اے شیخ بادشاہوں کو اس طرح سلام کرتے ہیں۔" شیخ نے بھوہ کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "جو سلام سنت ہے اور جو رسول اللہؐ اپنے صحابہ کو کیا کرتے تھے اور صحابہ رسول اللہ کو وہی طریقہ ہے جو میں نے کیا اس کے سوا میں کسی اور سلام کو نہیں جانتا۔"

سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر پوچھا "علائی کا پیر یہی ہے ؟" ملا عبداللہ نے جو گھات میں لگا ہوا تھا جھٹ سے کہا، "ہاں، یہی ہے !"

بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے اس مرد حق کو لاتوں گھونسوں پر رکھ لیا، لکڑیوں کوڑوں سے خوب پٹائی کی۔ شیخ کو جب تک ہوش رہا وہ یہ آیت پڑھتے رہے :

" ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین "

سلیم شاہ نے پوچھا "کیا کہتا ہے ؟"

ملا عبداللہ نے کہا "مجھ کو اور آپ کو کافر کہہ رہا ہے !"

سلیم شاہ کا پارا اور چڑھ گیا اور ان کو اور زیادہ اذیت پہنچائی۔ غرض بادشاہ برابر ایک گھنٹہ سے زیادہ وہاں

سوار کھڑا رہا اور اس مظلوم کو بے گناہی کے گناہ میں سزا دیتا رہا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا دم نکل گیا ہے تب چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

شیخ میں جان باقی تھی، اُسی وقت لوگوں نے اُن کو چمڑے میں لپیٹ کر ایک رات ایک دن برابر آگ کی گرمی میں رکھا اور اُن کے حواس کچھ ٹھکانے ہوئے۔ یہ حادثہ ۹۵۵ھ میں پیش آیا تھا۔

شیخ نیازی کی مہدویت سے توبہ

کچھ عرصہ بعد شیخ نے بیانہ چھوڑ کر سیاحت اختیار کی اور افغانستان روہ میں جاکر کافی مدت ٹھہرے۔ پھر عرصہ تک پٹن میں بجواڑہ کی سرحد پر انبیرا اور انبرتسر کے درمیان مقیم رہے۔ شیخ کہا کرتے تھے "اہل قیل وقال کی صحبت کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔"

آخر میں جب شیخ سرہند میں آکر رہے تو اُنھوں نے مہدوی مسلک سے توبہ کر لی اور اس عقیدہ سے تمام مہدویوں کو باز رہنے کی تلقین کی۔

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے اٹک کا سفر کیا تھا تو اس نے شیخ موصوف کو سرہند میں بلا کر ان کے اور ان کے بیٹوں کے نام بطور معاش کچھ اراضی مقرر کردی تھی۔ شیخ عبداللہ نیازی نے نوے برس کی عمر میں ۱۰۰۰ھ میں انتقال کیا۔

مخدوم الملک کی فتنہ پردازی

جب سلیم شاہ نیازیوں کا قلع قمع کر کے آگرہ واپس آیا تو مخدوم الملک ملا عبداللہ نے بادشاہ کو شیخ علائی کے خلاف پھر بھڑکانا شروع کیا اور کہا — "شیخ علائی کو تو اس ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن وہ ہنڈیہ میں بدستور موجود ہے۔ بہار خاں اُس کا مرید اور معتقد بن گیا ہے اور اس کا سارا لشکر شیخ کا مطیع ہو گیا ہے، اندیشہ ہے کہ وہ کوئی فتنہ برپا کردے گا۔"

سلیم شاہ نے دوبارہ شیخ علائی کو بلایا اور اس قضیہ کو یکسر نمٹا دینے کا ارادہ کر لیا۔ سلیم شاہ بخوبی جانتا تھا کہ شیخ عبداللہ صاحب غرض ہے اور آگرہ اور دہلی میں کوئی عالم علائی سے بحث کرنے کے قابل نہیں، اس لیے اس نے حکم دیا کہ شیخ علائی کو بہار میں شیخ بدہ طبیب دانش مند کے پاس لے جاؤ اور وہ جو بھی حکم دیں اس کے مطابق عمل کرو۔ شیخ بدہ بڑے نامی گرامی عالم تھے۔ "ارشاد قاضی[۱]" پر ان کی شرح بڑی معتبر اور مشہور ہے۔ شیر شاہ تو ان کا ایسا معتقد تھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے اُن کے آگے رکھا کرتا تھا۔

علائی شیخ بدہ کی خدمت میں

شیخ علائی جب وہاں پہنچے تو بدہ طبیب کے گھر میں سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اُنھوں نے شیخ بدہ کی مجلس میں اور بھی خلاف شرع باتیں دیکھیں جن کا ذکر مناسب نہیں۔ ان سے بھلا کہاں رہا جا سکتا تھا، بے محابا وہ شیخ بدہ کو ان حرکتوں پر ملامت کرنے لگے۔ شیخ بدہ اس وقت کافی بوڑھے ہو چلے تھے، ان میں بات کرنے کی بھی قوت نہ تھی، ان کے بیٹوں نے جواب میں کہا۔ "ہندوستان میں بعض رسمیں ایسی مروج ہو گئی ہیں اگر ان سے منع کیا جائے اور اتفاق سے اس اثناء میں جان و مال کا کوئی نقصان ہو جائے تو ہندوستان کی بے وقوف عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ نقصان اس رسم کے روکنے کی وجہ سے ہوا اور اس صورت میں اُن کے

۱؎ یہ فقہ کے موضوع پر قاضی شہاب الدین جونپوری کی تصنیف ہے۔

بالکل ہی منکر اور کافر ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے، کافر ہو جانے سے ان کا فاسق رہنا ہی غنیمت ہے۔ شیخ علائی نے کہا " یہ ایک فاسد خیال ہے کیونکہ جب پہلے ہی سے یہ عقیدہ ہو کہ گناہ کے چھوڑنے سے جان یا مال کا نقصان ہوتا ہے اور سنت کے موافق عمل کرنے سے آدمی مرجاتا ہے تو وہ پہلے ہی سے کافر ہے پھر ان کے اسلام کا لحاظ کرنا کوئی ضروری نہیں بلکہ اس صورت میں تو نکاح کی صحت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔"

اس تقریر سے شیخ بدھ کے بیٹے اور ہم نشین قائل ہو گئے اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگے اور ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ شیخ بدھ طبیب نے بھی منصف مزاجی سے کام لیا، ان کے اعتراض کو مان کر ان تمام باتوں سے توبہ و استغفار کی۔

شیخ بدھ کا خط

شیخ بدھ نے ان کے متعلق بادشاہ کے نام پہلے جو خط لکھا تھا اس کا مضمون یہی تھا کہ " مسئلہ مہدویت پر ایمان کا انحصار نہیں اور امام مہدی علیہ السلام کی علامات میں بھی بڑا اختلاف ہے، اس لیے قطعی طور پر شیخ علائی کے کفر یا فسق کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کو اس مسئلہ میں جو اشتباہ ہے وہ دور کر دیا جائے۔ یہاں کتابیں کمیاب ہیں وہاں کے علماء کے کتب خانوں میں بے شمار کتابیں ہوں گی اس لیے اس مسئلہ کی اسی جگہ بہتر طور پر تحقیق ہو سکتی ہے۔"

(شیخ بدھ نے اس خط میں اپنے طور پر شیخ علائی کے بچاؤ کے پہلو رکھے تھے) لیکن ان کے بیٹوں نے انھیں سمجھایا کہ " ملا مخدوم صدر الصدور ہے آپ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اس صورت میں لازماً بادشاہ آپ کو طلب کرے گا۔ اس ضعیفی میں یہ طویل سفر بہت دشوار ہوگا۔"

بیٹوں کی اس فہمائش پر شیخ بدھ نے وہ خط روانہ نہ کیا (اور نہ انھوں نے دوسرا خط لکھا) لیکن ان کے بیٹوں نے باپ سے چھپا کر بالا بالا سلیم شاہ کو خط لکھا جس میں انھوں نے ملا عبداللہ کی بڑی خوشامد کی۔ لکھا۔ " آج اگر کوئی بڑا محقق ہے تو وہ ملا عبداللہ مخدوم الملک ہی ہے وہ جو بھی فتویٰ دے درست ہے۔"

شیخ علائی کی شہادت

یہ خط سلیم شاہ کو پنجاب میں ملا اور اس کے ساتھ ہی شیخ علائی بھی پہنچے۔ ان کی بادشاہ سے یہ ملاقات بن کے مقام پر ہوئی۔ بادشاہ نے خط پڑھنے کے بعد شیخ علائی کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ " تم میرے کان میں دعویٰ مہدویت سے توبہ کہہ دو پھر جہاں چاہو رہو۔" شیخ علائی نے اس مرتبہ بھی بادشاہ کے کہنے کو تسلیم نہ کیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ملا عبداللہ سے کہا " اب تم کو اختیار ہے۔" پھر اس نے اپنے سامنے شیخ کو درے لگانے کا حکم دیا۔ اتفاق سے شیخ علائی کی گردن میں طاعون کی گلٹی نکل آئی تھی اور دوا کے لیے اس پھوڑے میں ایک بتی رکھی جاتی تھی۔ ان دنوں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس پھوڑے کی تکلیف کے علاوہ سفر کی صعوبتوں سے بھی شیخ بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے تیسرے کوڑے ہی میں ان کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

سلیم شاہ کا بغض

بادشاہ کو اس پر بھی چین نہ آیا۔ اس کے حکم سے اس (مظلوم) کی لاش کو ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر پامال کیا گیا اور ان کو دفن کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ خدا کی عجیب شان ہے اسی وقت

بڑی بھیانک آندھی اٹھی۔ یہ ایسی خوفناک آندھی تھی کہ لوگ سمجھے بس اب قیامت آگئی۔ سارے لشکر میں اُن کا ماتم ہونے لگا اور سب کو یقین آ گیا کہ بس اب سلیم شاہ کی حکومت کی خیر نہیں۔ لوگوں نے ان کے جنازہ پر اتنے پھول ڈالے کہ ان کا بدن پھولوں میں چھپ گیا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا پھولوں کی قبر ہے۔

جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے سیدی مولہ کو شہید کرا دیا تھا اور بہت ہی جلد اُس کو اس کی سزا مل گئی تھی۔ یہ قصہ بھی اسی طرح کا ہے۔ سلیم شاہ کو تو اتنی بھی مہلت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اس واقعہ کے بعد دو برس بھی حکومت نہیں کر سکا۔ یہ سارا فتنہ صرف ملا عبداللہ کا برپا کیا ہوا تھا اس کو تو اہل اللہ سے بس دلی عداوت تھی۔

شیخ علائی کی شہادت ۹۵۵ھ میں ہوئی۔ میری (مصنف ہذا کی) عمر اس وقت دس سال تھی۔ اسی عمر میں میں نے ان کی شہادت پر یہ دو تاریخیں نکالی تھیں:

ایک :۔ "ذاکر اللہ"

دوسری :۔ "سقاہم ربہم شراباً"

خواص خاں کا قتل

سلیم شاہ کے عہد کا ایک اور واقعہ خواص خاں کے قتل کا ہے ۔۔۔۔۔۔ جب خواص خاں شکست کھا کر نیازیوں کے ساتھ پہاڑوں کی طرف چلا گیا تو سلیم شاہ نے اس کے پیچھے تاج خاں کرانی کو متعین کیا۔ یہ تاج خاں سلیمان کرانی کا بھائی تھا اور علم و فضل کی وجہ سے پٹھانوں میں نہایت ممتاز تھا بادشاہ نے بن کی لشکر گاہ سے تاج خاں کو لکھ بھیجا "اگر کسی اور طرح ممکن نہ ہو تو عہد و پیمان کر کے خواص خاں کو بلاؤ اور دھوکہ سے قتل کر دو۔"

حسب الحکم تاج خاں نے جب کسی اور طرح اس علاقہ کا بندوبست ممکن نہیں رہا تو بادشاہ کی طرف سے خواص خاں کے پاس قول نامہ بھیج دیا۔ خواص خاں سیدھا سادا مسلمان سپاہی تھا اس قول و قرار پر بھروسہ کر کے تاج خاں کے پاس آ گیا۔ تاج خاں نے اسی وقت اسے قتل کر کے اُس کا سر سلیم شاہ کے پاس قصبہ بن میں بھیج دیا۔ اس کا لاشہ پہلے تو سرستی میں جو سنبھل کے توابعات میں سے ہے دفن کیا گیا تھا، بعد میں اسے دہلی لا کر دفنایا گیا۔

خواص خاں کے قتل کا واقعہ ۹۵۹ھ میں ہوا۔ اس کی تاریخ ہے "مصیبت بعالم شد"۔

خواص خاں نہایت بہادر کشادہ دل آدمی تھا۔ اس کا قصہ مشہور ہے کہ جس وقت وہ شیر شاہ کے ساتھ کالپی پہنچا تھا تو اس نے وہاں کے حلوائیوں کو دو لاکھ روپے پیشگی دے ئے تھے کہ وہ رنتھنبور کو ہمیشہ مصری بھیجتے رہیں۔

اسی طرح بیانہ میں آم کے جتنے باغ تھے ان سب کے دام اُس نے مالکوں کو اپنے پاس سے ادا کر کے انھیں حکم دیا کہ وہ ہمیشہ امیروں اور غریبوں کو آم بطور تحفہ دیتے رہیں۔ اسی اثناء میں شیر شاہ کا انتقال ہو گیا اور سلیم شاہ نے اسی حساب کے چوبیس ہزار روپے بقایا خواص خاں سے وصول کر کے اپنے خزانہ میں جمع کرا لیے تھے۔

اسی سال ۹۵۹ھ میں سلیم شاہ کے خاص مصاحب شیخ عبدالحی کا انتقال ہوا۔ عبدالحی شیخ جمالی کنبو کے بیٹے تھے، خود بھی بڑے عالم اور شاعر تھے۔ ان کی وفات پر آگرہ کے شاہ میر نے یہ تاریخ لکھی تھی:

گفت نامم ہمی شود تاریخ
بندہ دقیقہ درمیاں نبود

سلیم شاہ پر قاتلانہ حملہ

سلیم شاہ کا ایک اور مشہور واقعہ یہ ہے۔ سلیم شاہ قصبہ بن میں ٹھہرا ہوا تھا، ایک دن حسب عادت وہ عصر اور مغرب کے درمیان کسی سواری پر تنہا قلعہ مان گڑھ کی سیر کے لیے جا رہا تھا، یہ قلعہ وہاں سے پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ راستہ میں کوئی شخص فریاد کرتا ہوا سامنے آیا اور بادشاہ کا راستہ روک کر بغل سے تلوار کھینچی اور حملہ کر دیا۔ سلیم شاہ نے نہایت پھرتی سے اس وار کو اپنے کوڑے پر روک لیا کوڑے کا دستہ کٹ گیا اور بادشاہ کو بھی کچھ زخم آگیا۔ وہ شخص دوسرا وار کرنا چاہتا تھا کہ سلیم شاہ پہلو بچا کر اس سے لپٹ گیا اور اس سے تلوار چھیننے لگا۔ اسی وقت سزاول خاں کا بیٹا دولت خاں جسے سلیم شاہ نے اپنا چہیتا معشوق بنا رکھا تھا وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے حملہ آور پر تلوار کا وار کیا اور بھی لوگ جمع ہو گئے اور اس کو پکڑ لیا۔ لوگ اس سے پوچھنے لگے کہ "تُو نے یہ حرکت کس کے اشارہ سے کی؟" سلیم شاہ نے لوگوں کو پوچھنے سے روک دیا اور کہا کہ "نہ معلوم یہ بدمعاش (جھوٹ سچ لگا کر) کتنے گھروں کو برباد کر دے" یہ کہہ کر بادشاہ نے اسے فوراً قتل کر دینے کا حکم دیا۔ اس کی تلوار دیکھنے پر پتہ چلا یہ وہی تلوار ہے جو سلیم شاہ نے اقبال خاں کو دی تھی۔

اقبال خاں ایک کمینہ فطرت آدمی تھا۔ عرصہ تک وہ شیر شاہ کی خدمت میں رہا تھا۔ نہایت بدصورت اور انتہائی احمق اور نالائق تھا اسی لیے لوگ اسے "رحمۃ الٰہی" کہہ کر چھیڑتے تھے۔ یہ کنایہ جولاہوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ سلیم شاہ نے خدمتگاری کے درجہ سے اُٹھا کر اسے اپنا مقرب بنا لیا تھا۔ اس کے اس تقرب پر نامی گرامی امراء تک حسد کرتے تھے۔ اس کی تلوار کو پہچاننے کے بعد سلیم شاہ نے اس کے مرتبہ کو گھٹا دیا۔ لوگوں نے اسے قتل کر دینے کی ترغیب بھی دی لیکن بادشاہ نے کہا "اپنے پروردہ کو مارنے سے مجھے شرم آتی ہے"۔ سلیم شاہ پٹھانوں سے بدگمان تھا ہی، اس واقعہ کے بعد وہ اُن کا اور بھی دشمن ہو گیا اور انھیں ختم کر دینے کا عزم کر لیا۔

ہمایوں کے خلاف لشکر کشی

ان واقعات کے بعد سلیم شاہ اپنے دارالخلافہ گوالیار واپس ہوا، جب دہلی پہنچا تو خبر ملی ہمایوں ہندوستان کے ارادہ سے اٹک[1] تک پہنچا ہے، اس وقت بادشاہ نے اپنے گلے پر جونکیں لگوائی تھیں، اس خبر کے سنتے ہی جونکوں کو نکلوا دیا اور جلدی میں نہایا بھی نہیں گلے پر کپڑا باندھ کر سو گیا۔

---

[1] اٹک۔ حسن ابدال اور پشاور کے درمیان واقع ہے کسی زمانہ میں یہ شہر جنگی اہمیت رکھتا تھا ۹۸۹ھ / ۱۵۸۱ء میں اکبر نے اس جگہ ایک مستحکم قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ قلعہ کے کھنڈر اس کی گزشتہ رونق و آبادی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں کے پراچہ سوداگر مشہور ہیں جن کی تجارت کابل اور قندھار تک تھی۔ اٹک کی قابل دید چیز دریائے سندھ کا پل ہے۔ یہاں دریائے سندھ کو دریائے اٹک کہتے ہیں۔ یہ دریا ہمالیہ سے نکل کر ستره سو میل طے کرنے کے بعد کراچی کے قریب بحیرہ عرب میں گرتا ہے۔ اٹک کے قریب دریائے کابل اس میں آکر مل جاتا ہے دونوں کے سنگم پر کمالیہ اور جمالیہ نام کی دو چٹانیں ہیں جو دریا کے بیچ میں اٹھی ہوئی ہیں۔ ان کی تہہ میں خوفناک بھنور رہتا ہے جس میں کشتی پھنس جائے تو نکل نہیں سکتی۔ انھی دونوں چٹانوں پر پل کے پائے قائم کر کے یہ عظیم الشان پل باندھا گیا ہے۔ اس پر سے ریل کی پٹڑی گزرتی ہے۔

پھر وہ ہمایوں کے مقابلہ کے لیے دہلی سے لوٹ کر شہر سے کوئی تین کوس کے فاصلہ پر جا کر ٹھہرا۔ اس وقت مسلسل سفر سے لشکری نہایت خستہ اور آشفتہ حالی ہو چکے تھے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات کیا کرتے، اسی بُرے حال میں وہ اُس کے پیچھے لگے رہے۔ خیر خواہوں نے بادشاہ سے عرض کیا "طاقت ور دشمن سے مقابلہ ہے یہاں لشکر کے سپاہی نہایت تباہ حال ہیں اگر ان کی پچھلی تنخواہیں دے دی جائیں تو مناسب ہوگا۔" سلیم شاہ نے جواب دیا۔ "اگر میں اس وقت تنخواہیں دے دوں تو میری غرض سمجھی جائے گی اس لیے میں فتح کے بعد دو سال کی تنخواہ ادا کر دوں گا۔" بچارے پریشان حال لشکریوں نے یہ سن کر ایک آہ سرد کھینچی اور اسی بے سروسامانی میں روانہ ہو گئے۔ امیروں نے پھر عرض کیا "توپیں تو لشکریوں کے ساتھ ہیں لیکن ان کو کھینچنے والے بیل گوالیار میں چھوڑ دیے گئے ہیں، اب کیا کیا جائے؟ بادشاہ نے کہا "اتنے ہزار سپاہی آخر کس مرض کی دوا ہیں جو مفت تنخواہیں پاتے ہیں۔" مجبور ہو کر افسروں نے پیادوں سے ہی بیل اور گدھوں کی طرح توپیں کھنچوائیں۔ بعض توپیں تو اتنی بھاری تھیں کہ ایک ایک کو ہزار ہزار بلکہ دو دو ہزار سپاہی کھینچتے تھے۔ اس مصیبت کے باوجود اتنی جلدی کوچ بہ کوچ ہوئے کہ لشکر سات دن میں پنجاب پہنچ گیا۔ خیر یہ ہوئی کہ ہمایوں کسی مصلحت کی وجہ سے خود ہی کشمیر کی سرحد ہاتھا تک آکر کابل لوٹ گیا۔ اس کا ذکر آئندہ تفصیل سے کیا جائے گا۔

گوالیار کو واپسی

ہمایوں کی واپسی کی خبر سن کر سلیم شاہ بھی گوالیار لوٹ آیا۔ اسی اثناء میں وہ شکار کے لیے قصبہ انبیری گیا ہوا تھا۔ وہاں بعض امیروں کے اشارہ پر کچھ مفسدوں اور اوباشوں نے بادشاہ کا راستہ روک لیا۔ جب بادشاہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ اس راستہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے راستہ سے شہر میں داخل ہوا، پھر اس سازش کے سرغنوں بہاؤالدین، محمود اور امداد کو قتل کرا دیا۔ جن جن سے بادشاہ کو بدگمانی تھی ان میں سے بھی بعض قتل کیے گئے اور بعض قید خانہ میں ڈال دیے گئے۔ اس مرحلہ کے بعد اس نے خزانہ کھلوا کر سپاہیوں کو دو سال کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے احکام جاری کر دیے اور اس حکم کو بذریعہ فرمان تمام پنج ہزاری اور دہ ہزاری امیروں تک پہنچا دیا گیا۔ ابھی لشکر کے کچھ آدمیوں ہی کو تنخواہ ملی تھی کہ بادشاہ سخت مرض میں مبتلا ہو گیا اور اکثر لوگ تنخواہ سے محروم رہ گئے۔

سلیم شاہ کی بیماری

کہتے ہیں سلیم شاہ کو مقعد کی جگہ دنبل نکلا تھا، بعض کہتے ہیں سرطان کا عارضہ تھا۔ اس درد سے بادشاہ تڑپ تڑپ جاتا تھا۔ اس کی فصد بھی کھولی گئی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس بے قراری میں اس کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکل جاتا تھا۔ "میں خدا کو اتنا غالب نہیں جانتا تھا۔" (نعوذ باللہ)

اس مرض کی بے قراری میں بھی یہ حال تھا کہ جب تک اس کے حواس ٹھکانے رہے اپنے معشوق دولت خاں کو سامنے بٹھائے رکھتا تھا اور اس کی صورت دیکھتا جاتا تھا۔ جس وقت بھی غش سے چونکتا یہی کہتا "دولت خاں کہاں ہے؟" ضعف کی وجہ سے کروٹ لینا مشکل تھا لیکن اپنے محبوب کی یہ دلداری تھی کہ اگر دولت خاں دوسری طرف آبیٹھتا تھا تو اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ اسے اپنے سامنے آنے کی زحمت دے بلکہ لوگوں سے کہتا تھا میرا منہ اُس کی طرف پھیر دو۔ ایک دن دولت خاں موجود نہ تھا پوچھا وہ کہاں ہے"؟ لوگوں نے کہا "کسی سے ملنے گیا ہے۔" سلیم شاہ سمجھا اس نے مجھے مرتا ہوا دیکھ کر اوروں سے

پہلو جوڑ لیا ہے، اتنے میں دولت خاں حاضر ہو گیا اس کو دیکھ کر جان میں جان آئی اور سلیم شاہ نے یہ شعر پڑھا ؎

قدر من می نشناسی کہ چہ سانم بوفا
باش تا صحبت یاران دگر دریابی

میں نے معتبر آدمیوں کی زبانی سُنا ہے کہ سلیم شاہ نے اپنے خزانچی کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر روز بغیر پوچھے دولت خاں کو ایک لاکھ تنکہ تک ادا کر دیا کرو، اگر وہ اس سے زیادہ طلب کرے تو پوچھ لیا کرو۔

سلیم شاہ کی وفات

سلیم شاہ کا مرض کم نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ معالج اور طبیب عاجز رہ گئے اور وہ اسی طرح تڑپتے ہوئے سدھار گیا۔

سلیم شاہ کی وفات ۹۶۱ھ میں ہوئی۔ اس نے نو سال حکومت کی۔ اس کی میّت بھی سہسرام لے جا کر شیر شاہ کے پہلو میں دفن کی گئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال گجرات کے خدا ترس عادل بادشاہ سلطان محمود گجراتی کو برہان نامی خدمت گار نے شہید کر دیا۔

اور تو اور اسی سال دکن کے بادشاہ نظام الملک نے بھی انتقال کیا۔ یہ سال گویا بادشاہوں کی وفات کا سال تھا۔ میر سید نعمت اللہ اشوئی نے جو سلیم شاہ کا ایک مشہور صاحب علم مصاحب تھا، ان تینوں بادشاہوں کی تاریخ لکھی ہے ؎

سہ خسروا زوال آمد بہ یک بار — کہ ہند از عدل شاں دار الاماں بود
یکے محمود شاہ شاہنشاہ گجرات — کہ ہمچوں دولت خود نوجواں بود
دوم اسلیم شاہ آں کان احسان — کہ فرزند عزیز شیر خاں بود
سوم آمد نظام الملک بحری — کہ در ملک دکن خسرو نشاں بود
زمن تاریخ فوت ایں سہ خسرو
چہ می پرسی زوال خسرواں بود
۹۶۱ھ

سلیم شاہ کی لطیفہ گوئی

سلیم شاہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اسے شعر شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ ہر طرح کے بکثرت اشعار یاد تھے۔ اکثر میر نعمت اللہ اشوئی سے شعر و سخن پر مباحثہ کیا کرتا تھا۔ سمجھ بوجھ کے لحاظ سے نہایت ذہین تھا اکثر لطیفے کہا کرتا تھا اور دوسروں سے لطیفے سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ علماء و صلحاء کا بھی عقیدت مند تھا۔

کہتے ہیں پنجاب جاتے ہوئے جب وہ الور میں ٹھیرا تو ایک دن دُور سے مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کو آتے ہوئے دیکھا۔ مصاحبوں سے کہنے لگا، "تم جانتے ہو یہ کون آرہا ہے؟" سب نے کہا "حضور ہی بتلادیں"! سلیم شاہ نے کہا۔ "بابر بادشاہ کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے چار تو ہندوستان سے نکل گئے مگر پانچواں یہ باقی رہ گیا"۔ سرمست خاں نے کہا "اس فتنہ کی جڑ کو آپ نے کیوں رہنے دیا؟" سلیم شاہ نے کہا "کیا کروں اس سے بہتر آدمی مجھے دوسرا نظر نہیں آتا"۔

جب ملا عبداللہ محفل میں پہنچے تو بادشاہ نے انھیں تخت پر بٹھایا اور ایک مروارید کی تسبیح جو تیس ہزار کی تھی اور

اسی وقت کہیں سے پیش کش میں آئی تھی، ان کے حوالہ کر دی۔

سلیم شاہ کو کسی نشہ کی عادت نہ تھی۔ نماز کا ایسا پابند تھا کہ اس کی کبھی جماعت فوت نہیں ہوتی تھی۔

فیروز شاہ بن سلیم شاہ

سلیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا فیروز خاں دس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا خطاب فیروز شاہ رکھا لیکن اسے زیادہ عرصہ سلطنت کا موقع نہ ملا۔

سلیم شاہ کے سالے مبارز خاں ولد نظام خاں نے تیسرے ہی دن بھانجہ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب اس کی بہن اور بادشاہ کی ماں بی بی بائی کو پتہ چلا تو وہ بھائی کے قدموں پر گر پڑی اور منت کرنے لگی "بھیا خدا کے لیے اس معصوم کی جان کے پیچھے نہ پڑ، بادشاہی تجھے مبارک، میں اسے لے کر کہیں چلی جاؤں گی کہ اس کا پتہ تک نہ چلے گا" لیکن ظالم ماموں نے ایک نہ سنی اور محل سرا میں گھس کر ماں کے سامنے اس کمسن بچہ کا سر کاٹ دیا۔ اس کا کیا اس کے سامنے آیا اس کی نسل بھی آگے چل نہ سکی۔

کہتے ہیں سلیم شاہ نے کئی بار مبارز خاں کے قتل کا ارادہ کیا تھا اور اپنی بی بی سے کہا تھا "اگر تو اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو بھائی کا خیال چھوڑ دے اور اگر بھائی پیارا ہے تو اس بچہ سے ہاتھ دھولے"۔ اس نے ہمیشہ بھائی کی سفارش کر کے یہی جواب دیا کہ میرا بھائی عیش و عشرت میں لگا ہوا ہے، بادشاہی سے اس کا کیا سروکار، اس کا تو عدم وجود برابر ہے۔" سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ جس وقت بھی وہ مبارز خاں کو دیکھتا تھا بی بی سے کہتا تھا "دیکھ تو پچھتائے گی اور اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا"۔

سلیم شاہ کا اندیشہ درست تھا وہی ہوا جو اس نے کہا۔

سلطان محمد عادل عرف عدلی

سلیم شاہ کا سالا مبارز خاں سلطان محمد عادل کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تمام امراء اس کی بادشاہت پر رضامند ہو گئے۔ اس کا خطاب تو عادل تھا لیکن لوگوں میں عدلی مشہور ہو گیا بلکہ اس کو بھی بگاڑ کر لوگ "اندلی" کہنے لگے۔

مبارز خاں سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ کے حالات سے بہت متاثر تھا اسی لیے اس نے ہر بات میں اسی کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری جانا۔ چنانچہ اپنے ابتدائی عہد میں خزانہ کھول کر اشرفی روپے خوب لٹائے اور اس عارضی سخاوت سے عام خاص سب کو اپنا ہمنوا بنا لیا لیکن یہ بہار صرف چند روز کی ہی تھی۔

اس نے وزارت کا منصب اپنے ایک غلام شمشیر خاں کے تفویض کر دیا۔ یہ خواص خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ وکالت کا عہدہ دولت خاں نومسلم کو ملا جس کی لوحانیوں نے پرورش کی تھی۔ ان کے ساتھ ہیمو بقال بھی ان مناصب میں شریک تھا۔

ہیمو میوات کے قصبہ ریواڑی کا رہنے والا تھا اور سلیم شاہ کے عہد میں بازار کی کوتوالی سے اونچے مراتب پر فائز ہوگیا تھا محمد عادل نے اس بقال کو اس قدر مطلق العنان بنا دیا تھا کہ وہ سلطنت کے تمام ملکی اور مالی معاملات میں دخیل تھا۔

بغاوتوں کا آغاز

خود سلطان عادل عیش پسند آدمی تھا اس لیے راگ رنگ میں زیادہ گزرتی تھی۔ سپہ گری، مہم پسندی سے اس کو کوئی مناسبت نہ تھی، اس کی ان عادتوں، شاہزادہ فیروز خاں کے ظالمانہ قتل اور ہیمو کی سرپرستی کی وجہ سے لوگ اس سے سخت ناراض تھے چنانچہ بڑے بڑے پٹھان امیر اور سردار اپنی اپنی جگہ خود مختار ہونے لگے اور ابھی اس کی تخت نشینی کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ہر طرف بغاوتیں شروع ہوگئیں اور ملک کا سارا نظم و نسق جو شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں کافی منظم اور مستحکم تھا، درہم برہم ہوگیا۔

دربار شاہی میں ہنگامہ

ایک دن محمد عادل گوالیار کے قلعہ میں امراء کو جاگیریں تقسیم کر رہا تھا، اس موقع پر اس نے قنوج کی سرکار شاہ محمد فرملی سے لے کر سرمست کے حوالہ کر دی۔ شاہ محمد کا بیٹا سکندر جو ایک خوب رُو اور بہادر نوجوان تھا اس تبدیلی پر ناراض ہو کر سخت لہجہ میں گفتگو کرنے لگا۔ شاہ محمد اس کا باپ اسے نرمی اور ملائمت کی نصیحت کرنے لگا اور اس گفتگو سے منع کرنے لگا۔ سکندر نے باپ پر بھی بگڑ کر کہا: "تم کو بھی شیر شاہ نے لوہے کے پنجرے میں قید کر دیا تھا، سلیم شاہ نے تم پر احسان کیا اور سفارش کر کے تم کو رہائی دلائی تھی، اب یہ سُور پٹھان ہمیں نکالنے پر تل گئے ہیں، تم اس خطرہ کو محسوس نہیں کر رہے ہو"۔ اسی طرح اس نے سرمست خاں کو بھی سخت گالیاں دیں اور کہا: "یہ سگ فروش ہماری جاگیر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے"۔ سرمست خاں قوی اور قد آور آدمی تھا اس نے سکندر کو گرفتار کرنا چاہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اے فرزند اتنی تیزی کیوں دکھا رہا ہے"؟ سکندر اس کی نیت بھانپ گیا اور خنجر سے اس کے شانہ پر ایسا کاری وار کیا کہ سرمست خاں وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کے بعد سکندر نے جوش غضب میں اسی مجلس میں کئی ایک امیروں کو قتل کر دیا۔ عام طور سے مشہور ہے کہ جب سے ہندوستان میں خنجر کا رواج ہوا ہے اس سے کسی نے اس طرح کام نہیں لیا جیسا کہ اس وقت سکندر نے لیا۔ اس ہنگامہ کی وجہ سے بڑا شور و غل ہونے لگا اور عدلی شاہ بھاگ کر محل سرا میں گھس گیا۔ سکندر کچھ امیروں کو قتل اور کچھ کو زخمی کر کے بادشاہ کے پیچھے بھی لپک کر گیا اور اس پر تلوار سے وار کیا لیکن عدلی نے جلدی سے محل سرا کے کواڑ بند کر لیے اور تلوار اس کے سر کی بجائے دروازہ پر پڑی۔ اس کے سب امیر پہلے تو بدحواس ہو کر تلواریں پھینک کر بھاگ گئے، پھر سب نے ہجوم کر کے دونوں باپ بیٹوں کو نرغہ میں لے لیا۔ دو تین گھنٹوں تک دست بدست جنگ ہوتی رہی آخر سکندر، ابراہیم خاں سور اور شاہ محمد، دولت خاں لوحانی کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اسی دن اس ہنگامہ سے پہلے عماد اور سلیمان کا بھائی تاج خاں کرانی عدلی کے دیوان خانہ سے ناراض ہو کر قلعہ سے باہر آ گیا اور حضرت اعلیٰ اپنا خطاب رکھ کر بغاوت کے منصوبے باندھتے ہوئے جا رہا تھا کہ راستہ میں شاہ محمد سے جو دربار کو جا رہا تھا اس کی ملاقات ہوگئی۔ دونوں دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ تاج خاں نے کہا "آثار کچھ اچھے نہیں، میں نے تو بغاوت کا ارادہ کر لیا ہے اگر تم بھی میرے ساتھ شریک ہو جاؤ تو ہماری طاقت دگنی ہو جائے گی"۔ شاہ محمد نے اس کی بات نہ مانی اور

اس کی موت اسے کشاں کشاں عدلی کے دربار میں لے آئی۔

تاج خاں کی سرکشی

تاج خاں دن کے وقت ہی علانیہ گوالیار سے بنگالہ کی طرف کوچ کر گیا۔ بادشاہ نے اس کے تعاقب میں ایک فوج روانہ کی، خود بھی پیچھے روانہ ہوا۔ چھپرامئو میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا سخت لڑائی کے بعد تاج خاں کو شکست ہوئی اور وہ چنار کی طرف بھاگ گیا۔ راستہ میں جہاں کہیں بھی عدلی کے خالصہ کے عامل ملتے اُن کو گرفتار کر لیتا تھا اور جو کچھ مال و دولت ہاتھ لگتی قبضہ میں لے لیتا۔ اسی لوٹ میں اسے سو ہاتھی بھی کہیں سے مل گئے۔ یہ سب غنیمت لے کر تاج خاں اپنے بھائیوں سلیمان، عماد اور الیاس کے پاس جو گنگا کے ساحلی پرگنوں کے حاکم تھے چلا گیا۔ اس کے تعاقب میں عدلی بھی چھپھار میں پہنچ گیا۔ کرانی اپنی جمعیت لے کر گنگا کے کنارے بادشاہی لشکر سے مقابلہ پر آئے۔ بادشاہ کی طرف سے ہیمو نے ایک سو ہاتھیوں کو لے کر ان پر حملہ کیا اور سخت لڑائی کے بعد انھیں پسپا کر دیا۔

ابراہیم خاں کی بغاوت

جب عدلی چھپھار میں پہنچا تو اس کا ارادہ ہوا کہ غازی خاں کے بیٹے ابراہیم خاں کو جو شیر خاں کے بھائی بندوں میں سے تھا گرفتار کر لے۔ عدلی کی بہن ابراہیم خاں کے نکاح میں تھی، اس نے شوہر کو اس بات کی خبر کر دی۔ ابراہیم خاں بھیس بدل کر خفیہ طور پر قلعہ سے نکل گیا اور اپنے باپ کی جاگیروں بیانہ اور ہنڈون کا رُخ کیا۔ عدلی نے عیسیٰ خاں نیازی کو اس کے تعاقب میں مامور کیا۔ کالپی کی سرحد پر فریقین میں مقابلہ ہوا۔ ابراہیم خاں نے نیازی کو شکست دے کر بھگا دیا اور ایک بڑی جمعیت فراہم کر کے اپنی موروثی جاگیروں پر خود مختار ہو کر بیٹھ گیا۔

عدلی جب کرانیوں کے فتنہ سے فارغ ہوا تو اس نے ابراہیم خاں کے معاملہ پر توجہ دی۔ جب شاہی لشکر جمنا کے کنارے پہنچا تو ابراہیم خاں نے مصالحت کی خاطر پیغام بھیجا کہ "اگر رائے حسین جلوانی اور بہار خاں شروانی جسے سلیم شاہ نے اعظم ہمایوں کا خطاب دیا تھا اور دوسرے نامی امیر آکر مجھے مطمئن کر دیں تو ان کے قول پر بھروسہ کر کے میں آپ کی اطاعت میں آجاؤں گا۔" عدلی نے ان امیروں کو اس سے گفتگو کے لیے روانہ کیا۔ ان امیروں نے وہاں جاکر اچانک ایک اور ہی فیصلہ کر لیا۔ اُنھوں نے ابراہیم خاں کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس کو سلطان ابراہیم کا خطاب دے کر بادشاہ قرار دے دیا۔ اس دوران میں آگرہ اور دوسرے کئی ایک شہروں میں بھی سلطان ابراہیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

ابراہیم سے مقابلہ پر عاجز ہو کر عدلی شاہ گوالیار سے بھتہ اور وہاں سے چنار کی طرف پسپا ہو گیا اور اپنے ساتھ کافی خزانہ ہاتھی اور ایک بڑا لشکر لے کر گیا۔

ابراہیم اور سکندر میں مقابلہ

عدلی کی دوسری بہن کا نکاح احمد خاں سے ہوا تھا۔ وہ بھی شیر شاہ کے بھائیوں میں بڑا بہادر آدمی تھا۔ وہ بھی پنجاب میں وہاں کے امراء کو عدلی سے برگشتہ کر کے تاتار خاں کاشی، حبیب خاں اور نصیب خاں طغرچی کی مدد سے خود مختار ہو گیا۔ اور سلطان سکندر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ پڑھوا دیا، پھر ایک بڑا لشکر لے کر دہلی اور آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوسری طرف سے اس کے مقابلہ پر ابراہیم بھی ایک بھاری لشکر کے ساتھ آگرہ سے نکلا اور دس کوس کے فاصلہ پر فراہ کے مقام پر سکندر کے مقابلہ میں صف آرائی کی۔

اکثر بڑے بڑے امیر جیسے حاکم آگرہ خاں سلطانی جس کی شان و شوکت بادشاہوں جیسی تھی اور رائے حسین، جلوانی، مسعود خاں، حسین خاں غلجئی وغیرہ ابراہیم کے طرف دار تھے۔ ابراہیم نے دو سو امیروں کو تو سراپردہ علم طوق اور نقارہ عطا کیا تھا اور جو بھی امیر دس پندرہ سوار ساتھ لے کر اس کے پاس چلا گیا، اُسے بھی سرخ چھپر یا لگا ہوا باش کا جھنڈا مل گیا اور بادشاہ کی طرف سے منصب اور جاگیر کا فرمان بھی۔ اس تدبیر سے ابراہیم نے اسّی ہزار کا لشکر جمع کر لیا۔ اس مرحلہ میں جس دن آگرہ سے حاجی خاں اس کی ملازمت کے لیے حاضر ہوا۔ اس دن اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔

ابراہیم نے حاجی خاں کو ایک نہایت وسیع اور اونچا سراپردہ جو نیا نیا تیار ہوا تھا جس میں باہر کی طرف پرتگالی سقرلاط اور اندر فرنگستانی مخمل لگی ہوئی تھی، عمدہ فرش اور سونے چاندی کے برتنوں کے ساتھ عطا کیا۔ حاجی خاں نے فوراً ہی وہ سراپردہ کھڑا کر کے اس میں قیام کیا۔ اس کی اس شان کو دیکھ کر پٹھان امیر رشک کرنے لگے۔ ابراہیم کے مقابلہ میں سکندر کے پاس صرف دس بارہ ہزار آدمی تھے۔ جب اس نے غنیم کا یہ رنگ دیکھا تو صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ آخر کار دونوں میں اس مضمون کا عہد نامہ تحریر ہوا کہ " دہلی سے شمال کا جتنا علاقہ قبضہ میں ہے یا آئندہ فتح ہو گا وہ ابراہیم خاں کا ہو گا اور ادھر پنجاب ملتان وغیرہ پر جہاں جہاں قبضہ ممکن ہو سکندر قابض رہے گا اور مغلوں کی فوج کشی کی روک تھام بھی اسی کے ذمہ ہو گی۔

دونوں لشکروں میں جو پٹھان تھے وہ آپس میں رشتہ دار بھی تھے۔ اس صلح پر سب کو بڑی خوشی ہوئی، صلح کے معاہدے میں سکندر کے بھائی "کالا پہاڑ" اور "پنج بھیہ امیروں" نے جو پانچ بہادر بھائی تھے، مزید یہ شرط بڑھائی کہ جب ابراہیم، عدلی کو شکست دے کر اس کے خزانہ اور بختہ کے علاقہ پر قبضہ کرے تو ان دونوں میں ہم کو بھی حصہ دار بنائے ورنہ صلح فسخ ہو جائے گی۔ سکندر بھی اس شرط پر اصرار کرنے لگا۔ امیروں نے ابراہیم کو بھی یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ " اس بلا کو ٹالیے، جب عدلی کا ملک اور خزانہ فتح ہو گا تو دیکھا جائے گا، سکندر لے سکے گا تو لے لے گا"۔ امیروں کے اس مشورہ سے مسعود خاں اور حسین خاں غلجئی نے اختلاف کیا اور کہا " سکندر سے بھی آخر ایک دن لڑنا ہی پڑے گا اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ابھی اس قضیہ کو چکا دیں، اس وقت صلح کر لینے میں تو ہماری کمزوری ظاہر ہوتی ہے اور اس سے دشمنوں کے حوصلے بھی بڑھ جائیں گے۔ عدلی بھی مقابلہ کے لیے چڑھ آئے گا"۔ گفتگو نے جب یہ رخ بدلا تو صلح التوا میں پڑ گئی۔

ابراہیم خاں نے حاکم سنبھل میاں یحییٰ تارن کے آنے تک لڑائی ملتوی رکھی۔ یحییٰ تارن بہت بہادر اور دانشمند سردار تھا، سنہ ۹۶۱ھ میں اس نے عدلی کے بیس امیروں کو جو سنبھل پر فوج کشی کے ارادہ سے آئے تھے بدایوں کے میدان میں مقابلہ کر کے بھگا دیا تھا۔ پھر اس نے راجہ متر سین کٹھریہ کو بھی جو پہلے کبھی سنبھل پر قابض تھا اور اب پھر قوت پیدا کر کے حملہ کا ارادہ کر رہا تھا قصبہ کندرکھی کے میدان میں لڑ کر بُری طرح شکست دی تھی۔

فتحہاء آسمانی شد میں (بدایونی مصنف ہذا) اس وقت اپنے والد کے ساتھ سنبھل میں تحصیل علم کے لیے گیا ہوا تھا، میری عمر بارہ سال تھی۔ اس فتح پر میں نے تاریخ نکالی تھی ؎

"چہ لیں خوب کردہ اند"

میرے سنبھل میں آنے سے پہلے میاں حاتم سنبھلی بھی اس لڑائی کا قصّہ سُن چکے تھے۔ جب میں ان کے پاس "کنز" کا درس لینے گیا تو اُنھوں نے فرمایا "ہم نے فی البدیہہ تاریخ کہی ہے:

"فتحہا آسمانی شد"

ذرا حساب کر کے تو بتاؤ اس میں کتنے عدد ہوتے ہیں؟" جب میں نے حساب کیا تو نو سو ساٹھ عدد نکلے۔ میں نے ان سے عرض کیا "اس میں ایک عدد کی کمی ہے۔" اُنھوں نے فرمایا "اضافت کا ہمزہ قدما کے املا کے مطابق بڑھا دو اس طرح: "فتحہاء آسمانی شد" مکمل تاریخ ہو گئی۔"

اس تاریخ گوئی کے بعد اُنھوں نے دعائے خیر کر کے میرا سبق شروع کرایا اور کتاب "ارشاد قاضی" کے چند ورق جو خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے مجھے بطورِ یادگار عنایت فرمائے، پھر انھوں نے مجھے میاں شیخ ابو الفتح الہدیہ خیر آبادی کے سپرد کر دیا۔ یہ بزرگ اس کتاب کی تصنیف کے وقت اپنے باپ کے سجادہ نشین ہیں۔

جس وقت میاں یحییٰ تارن نے کانت اور کولہ کے علاقے فتح کیے اور بدایوں سے گزر کر قصبہ آہار میں گنگا پر پُل بندھوایا تو میں اپنے والد کے ہمراہ ان کے لشکر میں امروہہ تک گیا اور وہاں لشکر سے جدا ہو کر میر سید محمد[1] میر عدل کے ہاں جا کر پڑھنے لگا۔

ابراہیم خاں کی شکست

ابراہیم خاں نے میاں یحییٰ کے لشکر میں آنے کے بعد دوسری صبح کو ہی میدان میں لشکر کو ترتیب دیا۔ میاں یحییٰ مقابل میں تھا، حاجی خاں داہنی جانب، رائے حسین جلوانی غلزیوں کے ساتھ بائیں جانب اور قلب میں خود ابراہیم خاں کا مقام تھا۔ دوسری طرف سکندر نے بھی صف آرائی۔ سکندر کے دائیں پہلو نے جو "پنج بھیہ امراء" کی کمان میں تھا، ابراہیم کے بائیں پہلو پر حملہ کر کے ان کو آگرہ تک پسپا کر دیا اور آگرہ میں داخل ہو کر شہر کو جی بھر کر لوٹا اور آگرہ میں سکندر کے نام کی منادی کرا دی۔

ان کے مقابلہ میں ابراہیم خاں کے دائیں پہلو نے جو حاجی خاں کے زیر کمان تھا سکندر کے بائیں پہلو کو دبا کر قصبہ ہوول اور پلول تک ان کا تعاقب کیا۔ اس لڑائی کے دوران میں حاجی خاں اپنے سراپردہ کی طرف سے گزرا تو دیکھا کہ وہ شاندار سراپردہ غارت گروں کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ وہ اسی وقت میدان جنگ سے نکل کر الور چلا گیا۔ یحییٰ تارن کچھ دیر تک لڑتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں زخم آ گیا اور ایک دو انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ وہ بھی کچھ دیر بعد کھسک کر سنبھل کی طرف چلا گیا۔ ابراہیم خاں بس چار پانچ آدمیوں کے ساتھ نشیب میں سر جھکائے غنیم سے مقابلہ کر رہا تھا اور گولے اس کے سر پر سے گزر رہے تھے جب اسے معلوم ہوا کہ مقابل کی فوج میں بذات خود سکندر موجود ہے تو باگ پھیر کر اُدہ کی طرف کوچ کر گیا۔ اس کا سارا اسباب شاہی چتر وغیرہ برباد ہو گیا

---

[1] میر سید محمد۔ سید رفیع الدین محدث کے شاگرد، سید جلال سے بدایوں میں علوم کی تحصیل کی تھی۔ سوری بادشاہوں کے زمانہ سے اکبر کے ابتدائی عہد تک وہ برابر دربار سے متعلق رہے اور "میر عدل" ان کا عہدہ اور خطاب تھا۔ انصاف کی کرسی پر نہایت عدل و دیانت سے آخر تک کام کرتے رہے۔ جب تک وہ دربار اکبری میں رہے اُس وقت تک ابو الفضل جیسے آدمیوں کو دین میں رخنہ اندازی کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ سنہ ۹۸۴ھ میں بھکر کی حکومت پر ان کا تقرر ہوا اور اسی جگہ وہ سنہ ۹۸۶ھ میں فوت ہوئے۔

سکندر اس کے تعاقب میں اٹاوہ تک گیا۔ وہاں یہ اطلاع ملی کہ ہمایوں نے ہندوستان پر دوبارہ حملہ کر دیا ہے اور پنجاب میں داخل ہو چکا ہے سکندر نے ابراہیم کا پیچھا چھوڑا اور تیزی سے پنجاب کا رُخ کیا۔ سرہند میں ہمایوں سے اس کی لڑائی ہوئی اور وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ابراہیم اٹاوہ سے سنبھل چلا گیا جہاں اس نے سلطان عدلی کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کردیں اپنے لیے ایک مرصع چتر بھی تیار کرایا۔ مہینہ بھر کی تیاریوں کے بعد وہ ایک ہزار سواروں کی جمعیت لے کر براہ کیتی کالپی کی طرف روانہ ہوا۔

ابراہیم کی ناکامی

عدلی نے ابراہیم کے مقابلہ پر ہیموں بقال کو جو اس کا وزیر اور وکیل مطلق بنا ہوا تھا، مامور کیا۔ ہیموں بقال چنہار سے بہت سے عالی مرتبہ امیروں پانچ سو ہاتھی اور بے شمار خزانہ لے کر آگرہ اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جب دونوں میں مقابلہ ہوا تو ابراہیم نے ایسی بہادری دکھائی کہ ہفتخوانِ رستم کی یاد تازہ ہوگئی لیکن تقدیر نے ساتھ نہ دیا اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ویسے ابراہیم بذات خود شاہانہ شخصیت کا مالک تھا۔ خوب صورت، خوش کلام، خلیق، متواضع، سخی اور بہادر ساری خوبیاں اس کی ذات میں جمع تھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑائی میں فتح اور کامیابی صرف عطیۂ خداوندی ہے، انسان کی کوششوں کا اس میں کوئی دخل نہیں، چنانچہ ابراہیم خاں نے دو برس میں سولہ سترہ لڑائیاں لڑیں، ہر بار اول اول وہ غالب رہا مگر آخر میں شکست کھا گیا۔

ہیمو کی یلغار

ابراہیم خاں ہیمو کی فوج سے شکست کھا کر بیانہ کی طرف چلا گیا، ہیمو بھی اس کے تعاقب میں بیانہ پہنچا۔ ابراہیم نے بیانہ کے پٹھانوں اور زمینداروں کو جمع کر کے دوبارہ ہیمو سے مقابلہ کی تیاری کی اور شب خون کے ارادہ سے کوچ کیا لیکن صبح ہوگئی۔ اس وقت اس کا لشکر بیانہ سے دس کوس پر قصبہ خانوہ میں پہنچ چکا تھا یہاں غنیم سے ایک سخت لڑائی ہوئی لیکن کوتاہیٔ قسمت کا کیا علاج! ہیمو نے چالاکی سے گھیر کر اسے شکست دے دی اور وہ مجبوراً بیانہ کے قلعہ میں محصور ہوگیا۔ یہ ایک نہایت بلند اور مستحکم قلعہ تھا۔ ہیمو نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ میں آتش باری کا کافی سامان موجود تھا۔ ابراہیم خاں کا باپ غازی خاں ہندوؤں سے بیانہ کے مغربی کوہستان کے راستہ برابر قلعہ میں رسد پہنچا رہا تھا۔ ہیمو کی فوج ہر روز حملہ کرتی تھی اور گھمسان کے مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ ہیمو تین مہینے تک قلعہ کا محاصرہ کیے رہا اور بیانہ کے سارے علاقہ کو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیا۔ اسی غارت گری میں میرے والد کی جمع کی ہوئی کتابیں جو لیساور میں تھیں بیشتر لٹ گئیں اور ہندوستان کے سارے مشرقی علاقہ میں قحط پھیل گیا۔

ہولناک قحط

خاص طور سے آگرہ، دہلی اور بیانہ میں تو ایسا سخت قحط پڑا کہ ڈھائی تنکہ[1] میں ایک سیر[2] جوار ملنے لگی اس دام پر بھی ملنا محال ہوگیا تھا اکثر لوگ گھروں کو بند کر کے بیٹھ گئے اور ایک ایک گھر میں دس دس

۱؎ تنکہ۔ فرشتہ نے تنکہ کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے "دراں وقت تنکہ یک تولہ طلاء و نقرہ مسکوک رامی گفتند و ہر تنکہ نقرہ را پنجاہ پول مس

(باقی حاشیہ تنکہ و سیر صفحہ آئندہ پر)

میں ہیں بلکہ اس سے بھی زائد آدمی بھوک اور فاقہ سے مر گئے، ان بے چاروں کو نہ کفن ملا نہ قبر۔ ہندوؤں کا بھی یہی حال تھا۔ لوگ کیکر کے بیج اور مویشیوں کے چمڑے جن کو امراء ذبح کر کے فروخت کر دیتے تھے، کھا کھا کر جان بچا رہے تھے ایسی چیزوں

(بقیہ حاشیہ تنکہ صفحہ گزشتہ) کہ جیتل می گفتند می دادند اما وزن آں معلوم نیست کہ چہ مقدار بود بعضے بر آنند کہ یک تولہ مس و بعضے گویند کہ مثل پول ایں زماں دو تولہ ربع کم" فرشتہ نے یہ علاؤ الدین خلجی کے عہد کے تنکہ کا حال لکھا ہے۔ جب اول اول مسلمان ہندوستان آئے تھے تو یہاں ایک سکہ بہت زیادہ رائج تھا جسے "دلی وال" کہتے تھے وہ جیتل کے برابر ہوتا تھا۔ تاج الماثر جو ایبک کی تاریخ اور غالباً مسلمانوں کے عہد کی سب سے پہلی تاریخ ہے۔ اسی لفظ "دلی وال" کو استعمال کرتا ہے۔ طبقات ناصری کا مصنف قاضی صدر جہاں جو اکثر بعد کی تاریخوں کا ماخذ ہے جیتل اور تنکہ دونوں کو استعمال کرتا ہے۔ ۴۱۸ھ میں سلطان محمود غزنوی کے سکوں پر عربی میں درہم کا لفظ ضرب ہے اور اس کے ساتھ سنسکرت میں تنکہ بھی ثبت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تنکہ اصل میں سنسکرت کا لفظ ہوگا۔ بعض مورخوں کے خیال کے مطابق یہ ترکی کا لفظ نہیں معلوم ہوتا۔ ابتدا میں چاندی اور سونے دونوں کا تنکہ ۱۰۰ رتی یعنی ۱۷۵ گرین کے وزن کا ہوا کرتا تھا۔ سلطان محمد تغلق کا ایک نقرئی تنکہ ۸۰ رتی یعنی ۱۴۰ گرین کا بھی ملتا ہے۔ ابن بطوطہ اس تنکہ کو "درہمی دینار" اور عام مروجہ نقرئی تنکہ کو دینار لکھتا ہے۔ مسالک الابصار کے مصنف نے لکھا ہے "طلائی تنکہ تین مثقال کا ہوتا تھا اور نقرئی تنکہ کی آٹھ "ہشتگانیاں" آتی تھیں ایک ہشتگانی مصر اور شام کے درہم کے مساوی تھی، ایک ہشتگانی کی چار "سلطانیاں" ہوتی تھیں۔ ایک سلطانی یا دوگانی کے دو جیتل ہوتے تھے اور ایک جیتل کے چار فلوس ملتے تھے۔" ابن بطوطہ نے لکھا ہے "تنکہ کے پچاس پول آتے تھے۔" اس کی پول سے جیتل مراد ہے اور وہ یہ حساب "عدلی تنکہ" کا بتاتا ہے۔ عدلی تنکہ کے پچاس جیتل ہی ہوں گے لیکن معمولی تنکہ نقروی کے مسالک الابصار کے حساب سے چونسٹھ جیتل بنتے ہیں۔ اکبر کے وقت جو جیتل رائج تھا وہ اس سے مختلف تھا وہ ایک روپیہ کا ہزارواں حصہ ہوتا تھا۔

طبقات اکبری کے مصنف نے تنکہ سفید (نقروی) تنکہ سرخ (طلائی) کے علاوہ تنکہ سیاہ کا لفظ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ وہ سلطان محمد تغلق کے ذکر میں لکھتا ہے۔ "واضح باشد کہ مراد ازیں تنکہ نقرہ است کہ پارہ از مس ہم داشت و بہ ہشت تنکہ سیاہ برابر است" فرشتہ نے اس کی وضاحت کی ہے "نظام الدین احمد بخشی تحقیق کردہ مراد ازیں تنکہ نقرہ است کہ پارہ مس ہم داشت و یکے ازاں تنکہا را ہشتاد و دہ پول مس می دادند" سکہ سیاہ کا جو مطلب فرشتہ بتاتا ہے وہ زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ سلطان محمد تغلق کے سکوں میں بھی ایک سکہ ایسا ملتا ہے جس میں چاندی اور تانبا ملا ہوا ہے، اس کا وزن ۳۲ رتی کا ہے وہ نہ تو عدلی کا پورا حصہ ہے اور نہ معمولی تنکہ کا بلکہ ایک علیحدہ مستقل سکہ معلوم ہوتا ہے، غالباً یہی اصل تنکہ کا وزن ہے یعنی ۳۲ رتی۔ اگر ہم تنکہ کو ٹانک سے مشتق سمجھیں تو ٹانک چار ماشہ کے برابر ہوتا ہے اور یہی وزن سلطان محمد تغلق کے مذکورہ سکہ کا بھی ہے، اس لئے تنکہ سیاہ سے یہی سکہ مراد لیا گیا ہے۔

ابن بطوطہ کے وقت تین قسم کے تنکے تھے۔ (۱) تنکہ سفید: خالص چاندی کا جس کا وزن سو رتی اور اسی رتی کا تھا۔ اسی رتی والے تنکہ کو "عدلی" کہتے تھے۔ (۲) تنکہ سرخ: خالص سونے کا یہ ۱۰۰ رتی کا بھی ہوتا تھا اور ۱۱۲ رتی کا بھی۔ (۳) تنکہ سیاہ: چاندی اور تانبے سے مخلوط ۳۲ رتی کا ہوتا تھا۔ ابن بطوطہ تنکہ سفید کو دینار اور عدلی کو درہمی دینار اور طلائی کو تنکہ لکھتا ہے۔ تنکہ سیاہ کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جہاں اس نے درہم لکھا ہے اس سے اس کی مراد ہشتگانی سے ہے جو ہمارے موجودہ روپیہ کی دوانی کا درجہ رکھتی ہے۔ جسے مسالک الابصار کے مصنف نے مصر اور شام کے درہم کے برابر لکھا ہے۔

مسٹر ایڈورڈ طامس نے نظام الدین احمد بخشی مصنف تاریخ الفی (جس کا حوالہ فرشتہ نے بھی دیا ہے) کی عبارت سے نتیجہ نکالا ہے کہ تنکہ سیاہ ششگانی یعنی چھ جیتل کے مساوی ہوتا تھا۔

(حاشیہ ۲ متعلقہ صفحہ گزشتہ) سیر۔ اس زمانہ میں سیر کا وزن کیا تھا؟ ابن بطوطہ نے سفرنامہ میں "دہلی کا رطل" لکھا ہے۔ رطل سے اس کی مراد من سے ہے وہ اس رطل کو مصر کے ۲۵ رطل کے مساوی لکھتا ہے۔ اس کے فرانسیسی مترجموں نے اس حساب سے من کا وزن ۲۹ $\frac{3}{4}$ پونڈ قائم کیا ہے جو چودہ سیر پختہ کے مساوی ہے۔ مسالک الابصار میں دہلی کے سیر کو ستر مثقال کا لکھا گیا ہے۔ مثقال اگر ۴ $\frac{1}{2}$ ماشہ کا ہو تو سیر کا وزن ۲۹ تولہ ۲ ماشہ اور من کا ۱۳ سیر ۸ چھٹانک ہوا۔ بابر نے تزک میں مثقال کو ۵ ماشہ کا بتایا ہے، اس حساب سے من کا وزن ۱۴ سیر ۹ چھٹانک ۲ تولہ کا ہوا۔ اکبری سیر

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کو کھا جانے کے سبب تھوڑے ہی دن میں ان کے ہاتھ پیر ورم سے سوج جاتے تھے اور وہ مرجاتے تھے۔ اس سال کی تاریخ ہے ”خشم ایزد“ ـــ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آدمی آدمی تک کا گوشت کھا جاتے تھے۔ ان لوگوں کی شکلیں ایسی ڈراؤنی ہوگئی تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ یہ سارا علاقہ اس قحط اور دو سال کی ان لڑائیوں کی وجہ سے بالکل تباہ و تاراج ہوگیا، نہ کسان بچے نہ رعایا، ہندو لٹیروں کی بن آئی اور وہ ادھر ادھر سے ہجوم کر کے مسلمانوں کو لوٹنے لگے۔

قلعہ آگرہ کی آتش زدگی

۹۶۲ھ میں قلعہ آگرہ کی آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ سکندر اور ابراہیم کی لڑائی کے وقت قلعہ عدلی شاہ کے لشکر سے خالی ہوگیا تھا۔ اس وقت غازی خاں سور کے امرائے قلعہ میں غلہ اور سامان جنگ جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس غرض سے وہ قلعہ میں کوٹھریوں کو دیکھتے بھالتے پھر رہے تھے۔ ایک دن صبح سویرے ایک کوٹھری میں جس میں بارود بھری ہوئی تھی چراغ کا گل جھڑنے سے آگ لگ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان کی خبر لانے لگے اور ایسا زبردست دھماکہ ہوا کہ شہر میں زلزلہ سا آگیا لوگ تو سمجھے بس قیامت آگئی۔ قلعہ کے ستون اور پتھر دھماکے سے اڑ اڑ کر جمنا کے پار کئی کوس تک جا کر گرے اور اس بلائے ناگہانی میں ہزاروں آدمی تلف ہوگئے۔ آدمیوں اور جانوروں کے اعضا بھی پانچ چھ کوس تک اڑ کر گرے، لوگ سوتے سے اٹھ کر توبہ و استغفار کرنے لگے۔ آگرہ کے قلعہ کا اصل نام بدل گڑھ تھا۔ اس لیے اس حادثہ کی تاریخ نکالی گئی۔

”آتش بدل گڑھ“

ہیمو کا دسترخوان

جیسا کہ ذکر ہوا ان دنوں قحط[۵۱] اس درجہ پر تھا کہ لوگ ایک ایک روٹی پر جان دے رہے تھے۔ لیکن ہیمو کے لشکر میں پانچ سو ہاتھیوں کو روزانہ چاول شکر اور گھی کا راتب ملا کرتا تھا۔ ہیمو تمام پٹھان امیروں کو روزانہ ایک وقت اپنے دسترخوان پر بلا کر کھانا کھلایا کرتا تھا اور کہتا تھا بڑے بڑے لقمے کھاؤ اگر کسی کو

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ سیر صفحہ گزشتہ) ۵۲ تولہ ۲ ماشہ ۲ رتی کا ہوتا تھا۔ عالمگیری سیر ۷۰ تولہ کا تھا۔ محمد شاہ تغلق کے وقت کا من ۱۴½ سیر کا۔ زمانہ زیر بحث میں بھی سیر ۲۹ تولہ دو ماشہ کا ہی ہوگا۔ بدایونی نے جوار کی قیمت ۲½ تنکہ لکھی ہے۔ غالباً یہاں نقرئی یا طلائی تنکہ سے مراد نہیں ہے بلکہ تنکہ سیاہ سے مراد ہوگی کیونکہ جوار ایک سستا غلہ ہے، نقرئی یا طلائی تنکہ کی صورت میں اس کے دام بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ محمد تغلق کے قحط کے وقت بھی موجودہ روپیہ کی شرح میں ۷ سیر ۴ چھٹانک غلہ کے دام تین روپیہ چودہ آنہ سے بڑھ کر نہیں ہوئے تھے۔

۵۱ قحط۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے قدیم ادوار میں بنگال کو چھوڑ کر عملاً پورا ہندوستان قحط سالی اور اس کے نتائج سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ ان قحطوں کے نتیجہ میں کثرت اموات، بچوں کی فروخت، غلامی اور مردم خوری کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ باربوسا (سولھویں صدی) نے ساحل کارومنڈل کے متعلق لکھا ہے ”اگرچہ ملک میں ضروریات افراط کے ساتھ تھیں تاہم اگر بارش نہ ہو تو قحط کی بدولت سخت ہلاکت واقع ہوتی تھی اور بچے ایک ایک روپیہ سے کم دام پر بھی بکتے تھے“ قحط سالی کے زمانہ میں ملابار کے جہاز بھوکوں کے لیے خوراک لاتے تھے اور مبادلے میں غلاموں کو بھر بھر کے لے جاتے تھے“۔ بدایونی سے دس سال پہلے ایک سیاح کوریا نے بھی ساحلی علاقوں پر قحط سالی کی ہلاکت و تباہی کا نقشہ کھینچا ہے وہ بھی مردم خوری کا ذکر کرتا ہے۔ ۱۵۶۰ء کے قریب سیزر فریڈرک گجرات میں بچوں کی فروخت کا ذکر کرتا ہے۔ لوگوں کی بسر اوقات کا انحصار موسم پر ہی تھا اور جب بارش نہیں ہوتی تھی قحط سالی اور معاشی تباہی اس کا لازمی نتیجہ تھی۔

کم کھاتے ہوئے دیکھتا تو اُسے گالیاں دے کر کہتا تھا "اے تو آج اس سستی سے کھا رہا ہے کل اپنے مغل نامردوں سے کس طرح لڑے گا؟" افغانوں کا ستارہ بس ڈوبنے ہی والا تھا۔ اس لیے ان کی غیرت وحمیت ایسی ماری گئی تھی کہ اس ناپاک کافر کی مغلظات پر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی اپنی طبعی جہالت اور جنگ جوئی کو بالائے طاق رکھ کر اس کی گالیوں کو خوف یا لالچ کے مارے حلوہ کی طرح نگل جاتے تھے ؎

بخدمت منہ دست بر پائے من

مرا نان دہ و کفش بر سر بزن

محمد خاں سور کی بغاوت

ہیمو قلعہ بیانہ پر ابراہیم خاں کا محاصرہ کیے پڑا تھا کہ اسے خبر ملی کہ بنگالہ کے حاکم محمد خاں سور نے سلطان جلال الدین خطاب رکھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا ہے اور جون پور تک کا علاقہ فتح کر کے اب آگرہ اور کالپی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسی اثنا میں عدلی کا فرمان بھی ہیمو کی طلبی کے لیے پہنچا کہ ایک طاقتور دشمن سے مقابلہ آن پڑا ہے تم جلد آؤ۔ ہیمو نے قلعہ بیانہ سے محاصرہ اُٹھا لیا اور فوراً ہی کوچ کر دیا۔ جب وہ آگرہ سے چھ کوس کے فاصلہ پر موضع منڈاگر میں پہنچا۔ ابراہیم نے قلعہ سے نکل کر ہیمو کی فوج پر حملہ کر دیا لیکن حسب معمول شکست کھا کر الور کی طرف چلا گیا۔ وہ وہاں حاجی خاں سے مدد لے کر دوبارہ مقابلہ کی تیاری کرنا چاہتا تھا۔ ہیمو نے اس کے تعاقب پر اپنے بھتیجے تھرپال کو کچھ فوج دے کر متعین کیا تھا۔ اس نے دو منزل تک اس کا تعاقب کیا اور پھر لوٹ کر اپنے لشکر میں آ گیا۔ ابراہیم الور پہنچا تو حاجی خاں نہ تو اس کے آنے سے کچھ خوش ہوا اور نہ اس نے اسے کسی قسم کی مدد دی۔ وہاں سے مایوس ہو کر ابراہیم خاں لوٹ آیا اور اپنے باپ بھائیوں اور رشتہ داروں کو ہنڈون میں چھوڑ کر ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ ٹھٹھہ چلے جانے کا ارادہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد حیدر خاں چغتہ نے ابراہیم خاں کے باپ غازی خاں کو قول وقرار کر کے بیانہ میں بلایا لیکن اس کے آنے پر عہد شکنی کی اور اسے اور اس کے خاندان کو قتل کر ڈالا۔ اس کے خاندان کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا۔

ابراہیم خاں ٹھٹھہ میں

ابراہیم خاں کو لوگوں میں ہر دل عزیزی حاصل تھی۔ اس لیے بہت جلد اس کے پاس اچھا خاصا لشکر جمع ہو گیا۔ اس نے ٹھٹھہ کے حاکم رام چندر پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار بھی ہو گیا۔ راجہ نے اس سے بڑا اچھا سلوک کیا اور زمینداروں کے رواج کے مطابق اس کو کمان نذرانے میں پیش کی، اس کے لیے سرا پردہ اور شاہی ساز وسامان مہیا کر دیا۔ وہ اس کو تخت پر بٹھا کر خود ملازموں کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ اس حال میں ابراہیم خاں کافی عرصہ تک ٹھٹھہ میں مقیم رہا۔

حاکم مالوہ باز بہادر

اسی دوران میں مالوہ کے حاکم باز بہادر[1] کا پٹھانوں سے جھگڑا ہو گیا۔ پٹھانوں نے ابراہیم خاں کو اپنا سردار بنا کر باز بہادر سے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ گڑہ کٹنگہ کی رانی درگاوتی بھی ابراہیم خاں

---

[1] باز بہادر۔ یہ مانڈو کا بادشاہ تھا۔ مانڈو کی تاریخ دلاور خاں کے عہد حکومت سے شروع ہوتی ہے۔ اس نے تیمور کے حملہ کے بعد ۱۴۰۱ء ۸۰۴ھ میں خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ اس کا تعلق غور سے آئے ہوئے سرداروں سے تھا۔ اس نے دوبار کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی مدد کے لیے اپنی فوج لے کر آئی، باز بہادر نے رانی سے مصالحت کی بات چیت کر کے اسے ابراہیم کی مدد سے روک دیا اور وہ اپنے علاقہ کو واپس چلی گئی۔ ابراہیم بھی اس وقت مقابلہ کو خلاف مصلحت جان کر اوڑیسہ کی طرف چلا گیا اور وہاں کے زمینداروں کو اپنا حامی اور موافق بنا لیا۔ اسی زمانہ میں سلیمان کرانی نے وہاں کے راجہ کو شکست دی تھی۔ اس نے بڑے قول و قرار کے بعد ابراہیم خاں کو اپنے پاس بلایا، پھر عہد شکنی کر کے اُسے قتل کر ڈالا۔ ابراہیم کا قتل ۹۷۷ھ میں ہوا۔

گوریوں سے لڑائی

جب ہیمو شب و روز کوچ کرتا ہوا عدلی کے ہاں پہنچا تو اس وقت عدلی اور محمد خاں گور کالپی سے پندرہ کوس پر موضع چھپر گھٹہ میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ دونوں فوجوں کے درمیان دریائے جمنا حائل تھا۔ محمد خاں کافی ساز و سامان اور ایک بڑا لشکر لے کر آیا تھا، اس لیے

(بقیہ حاشیہ باز بہادر صفحہ گزشتہ) اس کے لڑکے الپ خاں ہوشنگ نے مانڈو کو دارالخلافہ بنا کر ایک شاندار شہر بنا دیا اس کے بعد محمد غوری تخت نشین ہوا، پھر محمود خلجی اس کا جانشین بنا، اس کے بعد غیاث الدین تخت پر بیٹھا اس کی وفات پر غیاث الدین دوم نے حکومت کی، اس کے مرنے پر سلطان محمود دوم تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ۱۵۳۲ء میں ہمایوں نے قلعہ مانڈو کو فتح کر لیا، ہمایوں کی شیر شاہ سے شکست پر ملو خاں ایک خلجی سردار نے قادر شاہ کے لقب سے ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں حکومت کی اس کو شیر شاہ نے شکست دے کر اپنے ایک عزیز شجاع خاں کو مالوہ اور مانڈو کی حکومت دے دی۔ ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء تک وہ حکمران رہا۔ باز بہادر اسی شجاع خاں کا لڑکا تھا۔ اس کا اصل نام بایزید تھا، اس نے اپنے بھائی دولت خاں کو قتل کر کے سلطان باز بہادر اپنا خطاب رکھا اور ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء میں خود مختار حکومت قائم کی۔ یہ ایک دلاور بادشاہ تھا۔ پہلے پہل اس نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں لیکن آخر میں رانی درگاوتی کے ہاتھوں اسے ایسی شکست ہوئی کہ اس نے جنگ سے توبہ کر لی۔ اس زمانہ میں مالوہ موسیقی کا مرکز تھا۔ باز بہادر خود بھی اعلیٰ درجہ کا موسیقار تھا۔ اس کے اور روپ متی کے عشق کی داستانیں بڑی مشہور رہی ہیں (مسٹر ایل ایم کروسبے نے ایک فارسی نسخہ سے روپ متی کے حالات زندگی کا ترجمہ "لیڈی آف دی لوٹس" کے نام سے کیا ہے) کہتے ہیں باز بہادر ایک دن نربدا کے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا وہاں برگد کے نیچے ایک ہندو دوشیزہ گا رہی تھی۔ اس کے حسن اور آواز نے بادشاہ کو مسحور کر لیا اور اس نے روپ متی کو اپنا بنا لینا چاہا۔ روپ متی نے اس کی التجا پر جواب دیا "جب نربدا مانڈو میں ہو کر بہے گی اس وقت میں تمہاری ہو جاؤں گی اس سے پہلے نہیں"۔ کہتے ہیں نربدا دریا کے دیوتا نے باز بہادر کی رہنمائی کی کہ مانڈو میں ہماری پاک ترس یعنی ایک چشمہ ہے اسی جگہ روپ کو رکھنا۔ بادشاہ نے وہ چشمہ تلاش کر لیا اور روپ متی سے شادی کر کے اس چشمہ پر تالاب بنوایا اور اس کے کنارے محل تعمیر کرایا۔ اسی تالاب کو "ریوا کنڈ" کہتے ہیں لیکن جنوبی پہاڑ پر روپ متی کے نام کے جو شہ نشین ہیں اُن پر لگے ہوئے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو پہلے بادشاہوں نے تعمیر کرایا تھا۔ باز بہادر نے ان میں اضافہ کیا ہے۔ ۹۶۸ھ/۱۵۵۶ء میں اکبر نے ادہم خاں کو مالوہ پر حملہ کرنے بھیجا۔ باز بہادر اس سے شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ روپ متی گرفتار ہو کر ادہم خاں کے پاس لائی گئی مگر اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ ۱۵۶۱ء میں جب محمد خاں حاکم تھا باز بہادر نے خاندیس کے میراں مبارک خاں کی مدد سے پیر محمد کو شکست دی۔

۹۶۹ھ/۱۵۶۲ء میں عبداللہ خاں نے حملہ کر کے باز بہادر کو گونڈواڑہ کی پہاڑیوں میں بھگا دیا۔ اس نے میواڑ کے راجہ اودے سنگھ کے ہاں پناہ لی، وہاں سے گجرات چلا گیا، بعد میں اکبر نے اسے معاف کر کے دو ہزاری منصب عطا کیا۔

لڑائی میں اس کا پلہ بھاری تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بس فتح ہونے ہی والی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہیمو دُم دار ستارہ کی طرح میدان جنگ میں وارد ہوا لڑائی کا پانسہ بدل گیا۔ ہیمو کے پہنچتے ہی لشکر نے خاصہ کے ہاتھیوں کے ذریعہ بآسانی جمنا کو عبور کر لیا اور گوریوں کے لشکر پر جو خواب غفلت میں تھے شب خوں مارا۔ اس اچانک حملہ سے محمد خاں کے لشکری بدحواس ہو گئے اور غنیم کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔ اس معرکہ میں محمد خاں گور کے اکثر طرف دار امیر قتل ہو گئے اور جو جان بچا کر بھاگ سکے بھاگ گئے۔ محمد خاں بھی وہاں سے بچ کر کسی طرف نکل گیا۔ اس کے بعد اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کا سارا ساز و سامان ہیمو کو غنیمت میں مل گیا۔

عدلی کی ہلاکت

اس فتح کے بعد عدلی نے چنھار میں جاکر قیام کیا اور ہیمو کو بہت سا خزانہ بے شمار ہاتھی اور بڑی فوج دے کر مغلوں کے مقابلہ پر نامزد کیا جو آگرہ اور اٹاوہ تک پیش قدمی کر کے قبضہ کر چکے تھے (اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے) اسی دوران میں محمد خاں گور کے بیٹے خضر خاں نے باپ کا جانشین بن کر اپنا خطاب سلطان محمد بہادر رکھا اور خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا اور باپ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک بھاری لشکر کو عدلی کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ اس مقابلہ میں خلاف توقع عدلی نے بڑی بہادری دکھائی اور داد مردانگی دیتے ہوئے قتل ہو گیا۔ عدلی کے قتل کا حادثہ ۹۶۲ھ میں ہوا۔ اس کا مادۂ تاریخ ہے:

"کور بہ بکشت"

عدلی بہ حیثیت موسیقار

عدلی باعتبار حکمرانی کیسا ہی رہا ہو، فن موسیقی اور رقص میں بڑا ماہر تھا چنانچہ تان سین کلاونت جو سارے ہندوستان میں اس فن کا استاد تھا اس کی شاگردی کا اقرار کیا کرتا تھا۔ سزاول خاں کا لڑکا باز بہادر بھی اس فن میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا لیکن وہ بھی بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ میں نے یہ فن عدلی سے سیکھا ہے۔

ایک مرتبہ دکن کا ایک سازندہ ایک قد آدم پکھاوج لے کر آیا تھا، اس کی دونوں طرف کسی کے ہاتھ نہیں پہنچتے تھے اس لیے کوئی اس کو بجا نہیں سکتا تھا۔ یہ پکھاوج جب عدلی کی محفل میں آئی تو وہ اس کی ترکیب کو سمجھ گیا اور تکیہ لگا کر ایک طرف ہاتھوں سے اور دوسری طرف پاؤں سے بجانے لگا۔ سب لوگ حیران رہ گئے اور اہل ہنر بے ساختہ داد دینے لگے۔

مجاہد خاں بھگت

عدلی نے اپنے زمانۂ امیری میں جبکہ وہ بیس ہزاری جاگیردار تھا ایک بھگت لڑکے کو جو نہایت خوب صورت اور نازک اندام تھا اور اپنے فن میں بھی ماہر و کامل تھا، اپنے ہاں نوکر رکھ لیا تھا۔ یہ لڑکا بدایوں کے کسی گاؤں سے عدلی کی محفل میں تماشہ دکھانے آیا تھا اور عدلی اس کی صورت اور سیرت پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس وقت اس نے اس بھگت کو مجاہد خاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اس نے اس کو دس ہزاری کا منصب عطا کیا۔ یہ لڑکا اس قدر نازک مزاج تھا کہ ایک مرتبہ اجاولن کے میدان میں چوگان کھیل کر لوٹا تو راستہ میں غازی خاں سور کے ڈیرہ میں ٹھہر گیا اور کہا "مجھے بھوک لگی ہے"۔ غازی خاں نے کہا

آجاؤ ماحضر تیار ہے، لیکن جب کھانا سامنے آیا تو قلیہ کی مہک سے ہی اسے غش آنے لگا اور وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔ اس کے طہارت خانہ میں اس قدر کافور ڈالا جاتا تھا کہ بھنگی روزانہ دو تین سیر کافور اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ حاجت سے فارغ ہونے کے بعد اس کا رنگ سرخ زرد اور سبز ہو جاتا تھا اور حالت غیر ہو جاتی تھی۔ اس نزاکت اور آرام طلبی کے باوجود وہ نماز کا بڑا پابند تھا۔ کبھی اس کی نماز اور روزہ قضا نہیں ہوا اور اس نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا۔

نیرنگئ زمانہ کی کارستانیاں دیکھیے کہ جس وقت یہ نازک اندام لڑکا مرا، اسے دو گز کفن تک نصیب نہ ہوا اور اتنا بھی پتہ نہ چلا کہ اس کی لاش کس خاک میں جا کر ملی۔

عدلی کے بعد ہی ہندوستان کی سلطنت پٹھانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغلوں کے خاندان میں منتقل ہو گئی۔

ہمایوں کی ہندوستان کو واپسی

ہمایوں نے کابل کے راستہ دوسری بار ہندوستان پر حملہ کیا اور سکندر سے ایک سخت لڑائی لڑکر کامیابی حاصل کی (ان واقعات کو ہم مجملاً بیان کریں گے) جس وقت ہندوستان کی سلطنت ہمایوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور اس کے بھائیوں میں باہمی اختلاف حد سے تجاوز کر گیا جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں تو ہمایوں نے پنجاب سے رخصت ہو جانا ہی مناسب جانا۔ ہندوستان سے نکل کر اس نے بکھر کی تسخیر کا ارادہ کیا اور اس سے قریب قصبہ لوہری میں اپنی لشکرگاہ قائم کی۔ مرزا ہندال بھی سندھ سے نکل کر بکھر سے پچاس کوس کے فاصلہ پر قصبۂ پاتر میں غلہ کی ارزانی کے خیال سے جا ٹھہرا۔

یہاں پہنچنے کے بعد ہمایوں نے حاکم ٹھٹھہ میرزا شاہ حسین ارغون کے پاس خلعت اور گھوڑا روانہ کر کے یہ پیغام دیا کہ "بعض ضرورتوں کی بنا پر یہاں آنا ہوا اور اب گجرات کی فتح کا مصمم ارادہ ہے لیکن یہ مہم تمہارے مشورہ اور تعاون پر منحصر ہے۔"

میرزا شاہ حسین نے باتوں باتوں میں پانچ مہینے ٹال دیے اور حیلے بہانے کر کے خود بادشاہ کو بکھر سے ٹھٹھہ آنے کی دعوت دی کہ بالمشافہ سارے معاملات پر گفتگو ہو سکے۔

بکھر کا معرکہ حاکم ٹھٹھہ سے یہ مراسلت ۹۴۷ھ[1] میں ہوئی تھی اور اسی سال ہمایوں نے حمیدہ بانو بیگم سے نکاح کیا اور وہاں سے پاتر چلا گیا اور پاتر سے سوہری پہنچا۔ مرزا ہندال قندھار کے حاکم قراچہ بیگ کے بلاوے پر اس کے پاس چلا گیا۔ یادگار ناصر مرزا نے بھی جو لشکر شاہی سے دس کوس پر ٹھہرا ہوا تھا قندھار چلے جانے کی ٹھان لی۔ ہمایوں نے ایک بزرگ عالم مرزا ابوالبقاء کو اس کے پاس بھیجا اور اسے اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب ابوالبقاء کشتی کے ذریعہ دریا عبور کر رہے تھے قلعہ بکھر میں سے ایک گروہ نے باہر نکل کر ان کی کشتی پر تیر چلانے شروع کیے، ایک تیر انھیں بھی لگا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ ان کی شہادت کا واقعہ ۹۴۸ھ میں پیش آیا جس کا مادۂ تاریخ "سرور کائنات" ہے۔ مرزا یادگار ناصر نے نصیحت و مشورہ قبول کر لیا اور بکھر ہی میں ٹھہر گیا اور بادشاہ نے ٹھٹھہ کا ارادہ کیا لیکن شاہی لشکر کے بہت سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر مرزا یادگار کے پاس چلے گئے اور مرزا کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ چونکہ محاصل کی آمدنی بہت زیادہ تھی اس لیے یہ لوگ فارغ البالی سے بسر کر رہے تھے۔

---

[1] ایک دوسرے نسخہ میں "ہفعصد و چہل و ہشت" ہے۔

ہمایوں نے دریا عبور کر کے قلعہ بکر[1] کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین کو مرزا حسین کی طرف سے برابر رسد پہنچ رہی تھی نہ صرف یہ بلکہ وہ خود بھی کشتیوں میں سوار ہو کر ہمایوں کے لشکر کی رسد کو روکنے لگا۔ شاہی فوج برابر سات ماہ تک قلعہ کا محاصرہ کیے پڑی رہی لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ انہی دنوں شدت سے قحط بھی پڑ گیا اور اہل لشکر بھوکوں مرنے لگے۔ غلہ تو میسر نہیں ہوتا تھا، ناچار جانور ذبح کر کر کے کھاتے رہے۔ آخر جانور بھی ختم ہو گئے۔ اس موقع پر ہمایوں نے بکر سے مرزا یادگار ناصر کو بلایا تاکہ اس سے مدد لے کر وہ شاہ حسین کو پسپا کرے اور قلعہ کو فتح کر لے۔ مرزا یادگار خود تو کمک کے لیے نہیں آیا البتہ تھوڑی سی مدد بھیج دی جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

مرزا یادگار کے اس رویّہ کی وجہ یہ تھی کہ مرزا شاہ حسین نے اندر ہی اندر اس کو ورغلایا تھا اور اس کو بادشاہ بنانے اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اپنی بیٹی سے اس کا نکاح کر دینے کا بھی اقرار کیا تھا۔ مرزا اس کے جھانسوں میں آ گیا، علانیہ ہمایوں کا مخالف بن گیا اور شاہی لشکر کی تمام کشتیوں کو قبضہ میں لے لیا۔ ان کارروائیوں سے ہمایوں محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور ہو گیا۔ واپسی کے لیے کافی دن تک کشتیاں نہیں ملیں۔ آخر دو زمینداروں کی مدد سے ان کشتیوں کو جن کو مرزا یادگار نے غرق کرا دیا تھا دریا سے نکلوایا گیا اور وہ ان کے ذریعہ بکر پہنچا۔

یادگار ناصر اپنی حرکتوں کی وجہ سے بادشاہ سے ملتے ہوئے شرما رہا تھا۔ اس نے اپنی شرمندگی کو مٹانے کے لیے شاہ حسین پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا اور بشرمندگی ہمایوں کی خدمت میں شرمسار حاضر ہوا۔ غنیم کے بہت سے مقتولین کے سر اپنی وفاداری دکھانے کے لیے پیش کیے۔ ہمایوں نے اس کے سابقہ قصور سب معاف کر دیے لیکن پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ یادگار ناصر نے شاہ حسین کے ورغلانے سے دوبارہ بادشاہ سے

---

[1] قلعہ بکر۔ یہاں قلعہ بکھر مراد ہے۔ ابن بطوطہ بھی اس جگہ گیا تھا وہ کہتا ہے "یہ شہر بہت خوبصورت ہے۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ اس کے بیچ میں سے گزرتی ہے اس شاخ کے وسط میں ایک خانقاہ ہے۔ وہاں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔ اس خانقاہ کو کشلو خاں (بہ عہد محمد تغلق) نے تیار کرایا تھا" حال حال تک بھکر اس قلعہ کو کہا جاتا رہا ہے جو سکھر اور روڑی کے درمیان واقع ہے۔ روڑی اور قلعہ کے درمیان دریا کی شاخ چار سو گز چوڑی ہے اور سکھر اور قلعہ کے درمیان اس کی چوڑائی دو سو گز ہے۔ ابن بطوطہ نے بھکر کے شہر کا جو ذکر کیا ہے وہ غالباً سکھر ہو گا۔ کیونکہ روڑی کا شہر تو ۱۲۹۷ء میں آباد ہوا البتہ ایک قدیم شہر الور نام کا یہاں سے ۱۵ میل پر سندھ کے پرانے شکم پر واقع تھا جہاں سے دریا ہٹ چکا ہے۔ ابن بطوطہ نے سکھر اور قلعہ دونوں کو ملا کر ایک شہر کہا ہے کیونکہ سندھ کی شاخ انہی دونوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ کشلو خاں کی خانقاہ خواجہ خضر کی خانقاہ کہلاتی ہے جو قلعہ کے شمال میں ایک علٰحدہ جزیرہ پر ہے۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے "بھکر گزیں دژ لیست و آنرا در کہن نامہا منصورہ نویسند ہر شش دریا یکجائی گزیدہ ورنہ او گرد و حصہ از جانب جنوب قلعہ دیک بخش از شمال باراں کم شود میوہ گزیں" ابو الفضل نے بھکر کو ہی منصورہ لکھا ہے۔ محمد بن قاسم کے وقت کا منصورہ جس کا "فتوح البلدان" میں ذکر ہے، حیدرآباد سندھ کے شہر سے قریب تھا جہاں اب قصبہ نصیر پور واقع ہے۔ بدایونی بھی بکھر یا بھکر کے ساتھ دریا کا ذکر کرتا ہے۔ بہر حال قلعہ سے مراد یہی بھکر کا قلعہ ہے اور صرف بکر لئے سکھر کا قدیم شہر سکھر کا نیا شہر پہاڑی کے نیچے آباد ہوا ہے اور ضلع کا صدر مقام ہے۔

مخالفت کا ارادہ کیا۔ اس دوران میں منعم خاں بھی، جسے بعد میں خان خاناں کا خطاب ملا تھا لشکر سے بھاگ نکلنے کی فکر کرنے لگا لیکن یہ دونوں اپنے ان ارادوں سے باز رہے۔

راجہ مالدیو کا بلاوا

اس زمانہ میں مارواڑ کے راجہ مالدیو نے ہمایوں کے پاس متعدد عریضے لکھ کر اسے آنے کی دعوت دی۔ ہمایوں نے بھی ان حالات میں بکر اور بھٹہ کا قیام مناسب نہ جانا اور جیسلمیر کے راستہ مارواڑ چلا گیا۔ واپسی کے وقت راجہ جیسلمیر[۱] نے اس کا راستہ روکنا چاہا لیکن تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہی وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ جس جنگل سے لشکر گزر رہا تھا وہ ایسا بے آب و گیاہ صحرا تھا کہ پینے کے لیے میلوں تک پانی کا قطرہ بھی نہیں ملا اور سارے لشکر والے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی کنواں نظر آ جاتا تو سپاہی اس طرح ہجوم کرتے تھے کہ اچھا خاصا دنگا فساد ہو جاتا تھا اور پیاس کے مارے بہت سے تو کنوئیں میں کود پڑتے تھے اور کنواں ان گرنے والوں سے پٹ جاتا تھا۔ ہمایوں نے اس حالت کو دیکھ کر یہ شعر کہا تھا ؎

چناں زد چاک ہا گردوں لباس دردمنداں را
کہ نے دست آستین می یابد و نے سر گریباں را

بہ وقت تمام ہمایوں جیسلمیر کے صحرا کو عبور کر کے مارواڑ کے قریب پہنچا اور آتکہ خاں کو راجہ مالدیو کے پاس بھیج کر اس کی واپسی کے انتظار میں جودھ پور میں ٹھہر گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب کہ شیر شاہ نے ناگور پر قبضہ کر لیا تھا اور اس نے مالدیو کو ہمایوں کی مدد کرنے پر بہت ڈرایا دھمکایا تھا۔ اس لیے مالدیو ہمایوں کو بلا کر سخت پریشان اور پشیمان تھا۔ اس نے آتکہ خاں کو عذر حیلے کر کے اپنے پاس کچھ عرصہ تک روک رکھا۔ آخر کار ایک فوج استقبال کے بہانے ہمایوں کو گرفتار کر کے لانے کے لیے بھیج دی۔ آتکہ خاں راجہ کے ارادوں کو تاڑ گیا تھا۔ چنانچہ وہ اجازت لیئے بغیر ہی کوچ کر کے لشکر میں پہنچ گیا اور ہمایوں کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔ ہمایوں نے فوراً ہی امرکوٹ کی طرف کوچ کر دیا۔ اسی منزل میں مالدیو کے دو جاسوس بھی لشکر گاہ میں داخل ہو گئے تھے، جب وہ پکڑے گئے تو بادشاہ نے ان دونوں کے قتل کا حکم دیا۔ ان دونوں میں سے ایک کے پاس چھری تھی اور ایک کے پاس خنجر، چونکہ دونوں جان سے مایوس ہو گئے تھے اس لیے نڈر ہو کر انھوں نے حملہ کر دیا۔ مرد عورت، گھوڑا خچر جو ان کے سامنے آیا اُسے قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ان کے ہاتھوں بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس ہنگامہ میں ہمایوں کا گھوڑا بھی ہلاک ہو گیا۔ ہمایوں نے سواری کے لیے تردی بیگ سے دو تین گھوڑے اور اونٹ مانگے۔ اُس نے اس موقع پر بڑی کنجوسی دکھائی اور سواری کے لیے کوئی جانور نہ دیا۔ مجبوراً ہمایوں ایک اونٹ پر سوار ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ندیم کوکہ سے نہ رہا گیا اور اس نے وہ گھوڑا جس پر اس کی ماں سوار تھی بادشاہ کو دے دیا اور اپنی ماں کو ہمایوں کے اونٹ پر سوار کرا دیا۔ وہ خود

---

[۱] اس وقت جیسلمیر کا راجہ راول لون کرن تھا۔ سنہ ۱۵۴۳ء میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ راجہ نے کنوؤں میں ریت بھروا دی تھی تاکہ شاہی لشکر پریشان ہو۔ جب ہمایوں جیسلمیر کے تالاب پر پہنچا تو راجپوتوں نے پانی پینے سے روکا۔ لشکر والوں نے حملہ کر کے انھیں بھگا دیا۔

اس تپتے ہوئے ریگستان میں جو آگ کا تنور بنا ہوا تھا پیدل ہی سفر کرتا رہا۔ اس سفر کی یہ منزل بڑی کٹھن گذری کیونکہ مالدیو کی آمد کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ اس پریشان حال قافلہ نے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر رات بسر کی۔

ہمایوں کی صحرانوردی

پوری رات مالدیو کے سپاہی ان کی تلاش میں جنگل میں بھٹکتے رہے، جب صبح ہوئی اور کوچ کیا گیا تو اتفاق سے ہمایوں اپنے بائیس آدمیوں کے ساتھ جن میں منعم خاں اور روشن بیگ کوکہ بھی شامل تھا لشکر سے کٹ کر جدا ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں مالدیو کی فوج کا ایک دستہ ان کے سر پر آپہنچا۔ ان بائیس آدمیوں نے بڑی ہمت کے ساتھ مقابلہ کا عزم کر لیا پہلے ہی حملہ میں ہندو سردار کو ایسا تیر لگا کہ وہ اسی وقت گر کر ختم ہو گیا۔ اس کی ہلاکت سے بھگدڑ سی مچ گئی اور بہت سے ہندو مارے گئے۔ اس فتح سے ہمایوں کو کسی قدر اطمینان حاصل ہوا، غنیمت میں بہت سے اونٹ بھی ہاتھ آگئے تھے۔ یہاں سے ہمایوں نے بہت سا پانی لشکر میں ذخیرہ کرالیا اور آگے بڑھا۔

تیسرے دن ایک مقام پر پہنچے وہاں ایک کنواں تھا لیکن پانی بہت زیادہ گہرائی میں تھا۔ لشکریوں کو تین منزل تک پانی نہیں ملا تھا، پیاس کے مارے ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اب جو پانی ملا تو حرص کے مارے سب نے اتنا پی لیا کہ بہت سے آدمی گھوڑے اور اونٹ مر گئے بیابان ایسا لق و دق تھا کہ اس کی انتہا حد خیال سے بھی پرے معلوم ہو رہی تھی۔ مجبوراً ہمایوں نے امرکوٹ چلے جانے کا فیصلہ کیا جو ٹھٹھہ سے سو کوس کے فاصلہ پر ہے۔

امرکوٹ میں قیام

امرکوٹ کا راجہ رانا نامی اپنے بیٹوں کے ساتھ استقبال کے لیے آیا اور ہمایوں کی بڑی خاطر تواضع کی۔ یہاں پہنچ کر ہمایوں کو قدرے سکون نصیب ہوا، اس نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور جو کچھ روپیہ اور مال تھا وہ سب لوگوں میں تقسیم کر دیا جن کو نہ مل سکا انہیں ہمایوں نے تردی بیگ وغیرہ سے قرض لے کر دیا۔ کافی زر نقد کمر پٹکے اور خنجر رانا کے بیٹوں کو انعام میں عطا کیے۔ رانا کے باپ کو مرزا شاہ حسین ارغون نے قتل کر دیا تھا اس انتقام کے لیے رانا نے ایک بڑی جمعیت فراہم کی اور ہمایوں کو اس پر فوج کشی کی ترغیب دی۔ ہمایوں نے اپنا سارا ساز و سامان بیگم بادشاہ کے بھائی خواجہ معظم کی تحویل میں دے کر امرکوٹ میں چھوڑ دیا اور خود بکھر کی طرف کوچ کر گیا۔

اکبر کی ولادت

امرکوٹ میں بروز اتوار ۵ رجب ۹۴۹ھ کو شاہزادہ اکبر پیدا ہوا۔ تردی بیگ نے اسی منزل میں ہمایوں کو فرزند کی ولادت کی خوش خبری سنائی۔ ہمایوں نے بچہ کا نام اکبر رکھا اور جب وہ مقام چچل میں پہنچا تو بیٹے کو بلوا کر اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ اس سفر میں ہمایوں کے لشکر میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک کر کے لوگ لشکر سے کھسکتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ منعم خاں بھی ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ انہی دنوں گجرات سے بیرم خاں آکر لشکر ہمایونی میں شامل ہو گیا۔

ان پریشان کن حالات میں ہمایوں نے ہندوستان میں مزید قیام مناسب نہ جانا اور قندھار جانے کا مصمم ارادہ کر لیا

اور مرزا شاہ حسین سے اس سفر کے لیے کچھ کشتیاں اور اونٹ مانگے۔ اس نے بھی ہمایوں کے ٹل جانے کو غنیمت جانا اور فوراً تیس کشتیوں اور تین سو اونٹوں کا انتظام کر دیا اور ہمایوں سندھ عبور کر کے ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔

بھائیوں کی سازش

اس زمانہ میں مرزا کامران نے قندھار مرزا ہندال سے چھین کر مرزا عسکری کے حوالہ کر دیا تھا اور اس کے بجائے مرزا ہندال کو غزنی کی حکومت دے دی تھی۔ چند روز بعد مرزا ہندال کو بھی قندھار سے علیحدہ کر دیا تھا اور مرزا ہندال نے امور سلطنت سے دست بردار ہو کر کابل میں درویشی اختیار کر لی تھی۔ جس وقت ہمایوں قندھار کی طرف چلا، مرزا کامران نے شاہ حسین کے بہکانے سے مرزا عسکری کو لکھا کہ "ہمایوں قندھار کی طرف آ رہا ہے جس طرح ممکن ہو اسے گرفتار کر لو"۔ جب ہمایوں مقام شال مستانگ میں پہنچا تو مرزا عسکری نے اس کا راستہ روکنے کے لیے کوچ کیا اور ہمایوں کے لشکر کی مخبری کے لیے ایک ازبک چولی بہادر نامی کو متعین کیا۔ چولی بہادر نے آدھی رات کے وقت بادشاہ کے لشکر میں آ کر بیرم خاں کو سارے حالات سے مطلع کر دیا۔ بیرم خاں نے اُسی وقت شاہی سراپردہ کے پیچھے پہنچ کر ہمایوں کو تمام کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ بھائیوں کی اس سازش کی وجہ سے ہمایوں نے کابل اور قندھار کا ارادہ ترک کر دیا اور صرف بائیس آدمیوں کو ساتھ لے کر جن میں بیرم خاں اور خواجہ معظم بھی شامل تھے عراق کا ارادہ کیا۔ بیرم خاں اور خواجہ معظم دونوں کو ہمایوں نے بیگم بادشاہ اور شاہزادہ اکبر کو لانے کے لیے رخصت کر دیا۔ اس وقت ہمایوں نے تردی بیگ سے چند گھوڑے طلب کیے، بیگ نے بخل سے کام لے کر نہ صرف یہ کہ گھوڑے نہیں دیے بلکہ ہمایوں کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔

اکبر کی گرفتاری

شاہزادہ اکبر کی عمر اس وقت صرف ایک سال کی تھی۔ ان دنوں سخت گرمی پڑ رہی تھی اور راستہ میں پانی نہ ملنے کا بھی خطرہ تھا، اس لیے ہمایوں نے شاہزادہ کو اتکہ خاں کے سپرد کر کے لشکرگاہ میں ہی چھوڑ دیا اور بادشاہ بیگم کو اپنے ہمراہ لے کر رخصت ہو گیا۔ ہمایوں کے جاتے ہی مرزا عسکری نے حملہ کر کے اس کے لشکر کو لوٹ لیا اور تردی بیگ کو گرفتار کر لیا۔ شاہزادہ اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے جا کر اپنی بیوی سلطان بیگم کے سپرد کر دیا۔ یہ واقعات ۹۵۰ھ میں پیش آئے۔

ہمایوں طہماسپ کی پناہ میں

اس سفر میں بھی ہمایوں کو عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور وہ بہ ہزار دقت سیستان سے نکل کر خراسان پہنچا، جہاں شاہ طہماسپ کے بڑے بیٹے سلطان محمد مرزا سے ملاقات کی اور وہاں بادشاہی ساز و سامان اور اسباب سفر مہیا کر کے مشہد مقدس میں روانہ ہوا۔ شاہ طہماسپ کے حکم سے ہر منزل میں مقامی حکام ہمایوں کے استقبال کے لیے آتے تھے اور اس کی دعوت و خاطر داری کا انتظام کرتے تھے۔

ہمایوں نے پہلے ہی شاہ طہماسپ کی خدمت میں بیرم خاں کو روانہ کر دیا تھا اس کے ذریعہ طہماسپ نے ہمایوں کے نام خوش آمدید کا ایک خط ارسال کیا تھا۔ غرض بمقام ٹیلاق سورتق الی دونوں بادشاہوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ دوران گفتگو طہماسپ نے ہمایوں سے شکست کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ

اصل وجہ بھائیوں کی مخالفت ہے۔ اس وقت طہماسپ کا بھائی بہرام میرزا بھی موجود تھا۔ ہمایوں کی یہ بات اُسے بُری لگی اور وہ اُس وقت سے ہمایوں کا دشمن بن گیا۔ اس نے طہماسپ سے کہا کہ "یہ اس باپ کا بیٹا ہے جس نے اوزبکوں کے مقابلہ میں کئی ہزار قزلباشوں کو اپنے ہمراہ لے جاکر ہلاک کرا دیا تھا۔"

اس کا اشارہ اصل میں اس واقعہ کی طرف تھا جبکہ بابر نے شاہ اسماعیل نجم اول سے سترہ ہزار قزلباش سوار اوزبکوں کے خلاف لڑنے کے لیے حاصل کیے تھے۔ اس مہم میں جب اس نے قلعہ نخشب عرف کش کا محاصرہ کیا تھا تو ایک تیر پر یہ شعر لکھ کر قلعہ میں بھیجا تھا ؎

حرف راہ از بکاں کردیم نجم شاہ را
گر گناہے کردہ بودم پاک کردم راہ را

دوسرے دن جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو اوزبکوں کے مقابلہ پر قزلباشوں کو چھوڑ کر بابر علیحدہ ہوگیا تھا۔ قزلباشوں کا لشکر تباہ و برباد ہوگیا۔

طہماسپ کے بھائی نے ہمایوں کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی لیکن خوش قسمتی سے طہماسپ کی بہن نے جس کو امام مہدی کی نذر میں پیش کرنے کی غرض سے ابھی تک بیاہا نہیں گیا تھا، جو نہایت مدبر اور دانش مند خاتون تھی اور تمام امورِ سلطنت اس کی رائے سے سرانجام پاتے تھے ہمایوں کی بڑی حمایت اور سفارش کی۔ ہمایوں نے طہماسپ کے پاس ایک رباعی لکھ کر بھیجی جس کا آخری شعر تھا ؎

شاہان ہمہ سایہ ہُما می خواہند
بنگر کہ ہما آمدہ در سایۂ تو

سلمان کے ایک قطعہ پر تضمین بھی لکھ کر بھیجی ؎

از خدا امیدوارم شاہ با ما آں کند
آنچہ با سلمان علی در دشت ارژن کردہ است

یہ اشعار طہماسپ کو بہت پسند آئے اس پر بہن کی حمایت اور سفارش کہ اس نے بڑے معقول دلائل سے بادشاہ کو ہمایوں کی حمایت اور اعانت پر آمادہ کر دیا تھا۔ غرض طہماسپ نے خوش ہو کر بڑے جشن منعقد کرائے اور ہمایوں کے لیے شاہانہ ساز و سامان تیار کرا دیا اور اسے شیعہ مذہب قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس مسئلہ پر ہمایوں سے بڑے مباحثے ہوتے رہے۔ آخر ہمایوں نے کہا "اپنے سارے عقائد ایک کاغذ پر لکھ کر لاؤ"۔ جب بادشاہ کے آدمی وہ لکھ لائے تو ہمایوں نے اس کاغذ کے مضمون کو پڑھ کر سنا دیا اور خطبہ میں شیعوں کے مسلک کے مطابق بارہ اماموں کے نام بھی دہرا دیے۔

ہمایوں کی مدد

ان تکلفات کے بعد طہماسپ نے دس ہزار سواروں کو اپنے بیٹے شاہ مراد کی سرکردگی میں ہمایوں کی مدد کے لیے متعین کر دیا۔ شاہ مراد چونکہ شیر خوار لڑکا تھا اس لیے بداغ خاں قزلباش کو

اس کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ قزلباش اور ہمایوں جدا جدا راستوں سے جا کر قندھار پر حملہ کریں اور جب قندھار فتح ہو جائے تو اسے شاہ مراد کے قبضہ میں دے دیا جائے۔

غرض ہمایوں طہماسپ سے رخصت ہو کر اردبیل اور تبریز کی سیر کرتے ہوئے تنہا مشہد پہنچا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت اکیلا وہ روضۂ مبارک میں گھوم رہا تھا کہ اسے دیکھ کر ایک زائر نے دوسرے سے چپکے سے پوچھا "کیا ہمایوں بادشاہ یہی ہے؟" دوسرے نے کہا "ہاں"۔ پہلے زائر نے ہمایوں کے قریب ہو کر اس کے کان میں کہا "اب بھی خدائی کا دعویٰ کرے گا؟" اس کا اشارہ اس طرز عمل کی طرف تھا جو ہمایوں نے بنگال میں اختیار کیا تھا۔ وہاں وہ چہرہ پر نقاب ڈالا کرتا تھا، جب نقاب اٹھاتا تھا تو لوگ کہتے تھے "تجلی ہو گئی"۔ جب کسی معرکہ کے بعد تلوار کو دریا میں دھوتا تھا تو فخریہ کہا کرتا تھا "اب ہماری تلوار کا کون مقابل بن سکتا ہے؟" وہاں سے آگرہ پہنچنے کے بعد اپنی تعظیم کے لیے زمین بوسی کی رسم شروع کرا دی تھی۔ آخر امیر ابوالبقا اور دوسرے امیروں اور وزیروں نے تعظیم و تسلیم (کے عام طریقہ) کو بحال کرا دیا۔

قزلباشوں کی یلغار

حسب قرارداد قزلباش سرداروں نے تمام گرم سیر علاقوں پر فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا۔ جب وہ قندھار کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑے تھے تو ہمایوں بھی پانچ دن بعد وہاں پہنچ گیا۔ مرزا عسکری محصور ہو گیا تھا۔ قزلباشوں سے اس کی برابر تین ماہ تک لڑائی ہوتی رہی، دونوں طرف کے بہت سے آدمی ان مقابلوں میں مارے گئے۔ اسی اثناء میں ہمایوں نے بیرم خاں کو ایلچی بنا کر کابل کی طرف مرزا سلیمان بدخشی اور مرزا یادگار ناصر کے پاس بھیجا۔ یادگار ناصر بکر سے پریشان ہو کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

قندھار کی فتح

قزلباشوں کو پہلے یہ خوش گمانی تھی کہ ہمارے جاتے ہی چغتائی امیر ٹوٹ جائیں گے اور اطاعت قبول کر لیں گے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ محاصرہ برابر طویل ہوتا جا رہا ہے اور اس دوران میں کافی آدمی ہلاک ہو چکے ہیں علاوہ ازیں عسکری کی مدد کے لیے مرزا کامران کے آنے کی خبر بھی اڑ رہی ہے تو وہ بددل ہو گئے اور واپس ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ قزلباش چلے جاتے لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بعض امیر جیسے محمد سلطان مرزا، الغ میرزا اور میرزا حسین خاں وغیرہ کامران سے ناراض ہو کر ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ موئید بیگ بھی جو قلعۂ قندھار میں قید تھا کسی طرح چھوٹ کر بادشاہ کے پاس آ گیا۔ ہمایوں نے اس پر خاص طور سے بڑی عنایت کی۔ مرزا عسکری نے جب لوگوں کو اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر ہمایوں کے پاس جاتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گیا اور خود بھی امان طلب کر کے حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کے قصور معاف کر دیے کہ ؎

در عفو لذتی ست کہ در انتقام نیست

صورت حال کی اس تبدیلی کے بعد ہمایوں نے قزلباشوں سے کہا کہ چغتائی لشکر کے اہل و عیال اور شہر کے باشندوں سے تین دن تک کوئی تعرض نہ کرو تاکہ وہ سب شہر سے نکل جائیں۔ اس وقت ہمایوں کے قبضہ میں کوئی ملک نہیں تھا لیکن مذکورہ معاہدہ کے مطابق وہ بداغ خاں اور مرزا مراد کو قلعۂ قندھار میں لے کر گیا اور وہ سارا علاقہ ان کے

حوالہ کر دیا۔ فتح قندھار کے بعد اکثر قزلباش امیر عراق لوٹ گئے۔ مرزا مراد کے ساتھ بداغ خاں کے علاوہ دو چار اور امیر رہ گئے۔

جب سردیوں کا موسم شروع ہوا تو ہمایوں نے اپنے لشکر کے امراء کے لیے بداغ خاں سے کسی محفوظ مقام کے دینے کا مطالبہ کیا۔ اس نامعقول شخص نے اس کے جواب میں نامناسب باتیں کہیں۔ اس اختلاف کی جب خبر پھیلی تو اکثر چغتائی امیر ڈر کر ہمایوں کے لشکر سے نکل بھاگے ان میں مرزا عسکری بھی شامل تھا لیکن اسے راستہ ہی میں گرفتار کر لیا گیا اور ہمایوں نے اسے قید میں ڈال دیا۔

قزلباشوں کی پسپائی کے سبب

ہمایوں سے قزلباشوں کے اس اختلاف کے بعد متعدد ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ قندھار قزلباشوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اول تو یہ کہ چغتائی امراء نے ہمایوں کو مشورہ دیا کہ سردیاں گزارنے کے لیے فی الحال قزلباشوں سے قندھار چھین لیا جائے اور جب کابل و بدخشاں فتح ہو جائیں تو ان کو اس سے زیادہ علاقہ بطور تلافی عطا کر دیا جائے۔

دوسرا بڑا سبب یہ ہوا کہ قزلباشوں کے شیرخوار شہزادہ میرزا مراد کا اسی اثناء میں انتقال ہو گیا۔

تیسرا سبب قزلباشوں سے لوگوں کی وہ عام ناراضی تھی جو اُنھوں نے شہر والوں پر مظالم ڈھا کر اور چغتائی امراء پر قلعہ میں داخلہ بند کر کے مول لی تھی۔

چوتھا سبب وہ ہنگامہ تھا جو اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔

قزلباشوں پر حملہ

یہ واقعہ اس طرح رونما ہوا کہ ایک مرتبہ ایک رافضی یادگار ناصر مرزا کے سامنے جو ہندال مرزا کو ساتھ لے کر کامران کے پاس سے یہاں بھاگ آیا تھا، اپنی عادت کے مطابق صحابہؓ پر تبرا کرنے لگا۔ یادگار ناصر یہ گستاخی برداشت نہ کر سکا اور اس نے رافضی کو ایسا تیر مارا کہ وہ اس کا سینہ توڑ کر نکل گیا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ اس وقت حاجی محمد خاں کوکی اپنے دو نوکروں کے ہمراہ بار برداری کے اونٹ لے کر رسد لینے کے بہانے قلعہ میں داخل ہوا اور دروازہ کے محافظوں پر حملہ کر کے انھیں قتل کرنے لگا۔ اس کی مدد کے لیے دوسرے بہت سے چغتائی امیر بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان حملہ آوروں میں الغ بیگ اور بیرم خاں بھی شامل تھا اس اچانک حملہ سے قزلباش بدحواس ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور قلعہ میں چغتائی لشکری داخل ہو گئے۔ قزلباشوں کی ساری شیخی کرکری ہو گئی جب ہمایوں بادشاہ قلعہ میں داخل ہوا تو بداغ خاں کو سخت مضطرب اور پریشان دیکھا، اسے جلد ہی عراق کی طرف رخصت کر دیا۔ قندھار کے شہریوں نے بہت سے قزلباشوں کو گلی کوچوں میں گھیر گھیر کر قتل کر دیا۔

کابل کی فتح

قندھار پر قبضہ کے بعد ہمایوں نے وہاں کی حکومت بیرم خاں کے حوالہ کر کے کابل کی طرف کوچ کر دیا۔ ہمایوں کے مقابلہ میں مرزا کامران بھی آگے بڑھ کر مقابل ہوا لیکن یہ حال تھا کہ اس کے لشکر میں سے ہر روز ایک دو نامی گرامی امیر بھاگ کر ہمایوں کے سایہ میں آ جاتے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مرزا کامران کے ہاتھ پیر پھول گئے اور اس نے بہت سے علماء اور مشائخین کو واسطہ بنا کر بھائی سے اپنے قصوروں کی معافی چاہی۔ ہمایوں نے

اس شرط پر کہ وہ لشکرِ شاہی میں حاضر ہو جائے اس کے سارے قصور معاف کر دیے۔ مگر کامران کے دل میں چور تھا اس لیے وہ ہمایوں کے سامنے آتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ چنانچہ بجائے حاضر ہونے کے وہ کابل کے قلعہ میں محصور ہو گیا اور وہاں سے راتوں رات غزنی کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی ساری فوج لشکرِ شاہی میں ضم کر لی گئی۔ بادشاہ نے کامران کے تعاقب میں تو مرزا ہندال کو روانہ کیا اور خود شہر کابل میں داخل ہوا۔ اور ایک مدت بعد اپنے چہیتے شاہزادے اکبر کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کیں۔

کابل کی فتح ۱۰ رمضان ۹۵۲ھ کو ہوئی۔ اس کا مادہ تاریخ ہے:

"بے جنگ گرفت ملک کابل از وے"

ہمایوں کی یلغار کے سامنے کامران کے قدم غزنی میں بھی ٹک نہ سکے، اور وہ جلد ہی بھکر کی طرف بھاگ گیا۔ مرزا شاہ حسین نے جس کی بیٹی کامران کے نکاح میں تھی اس کی مدد کی۔ اس موقع پر مرزا یادگار ناصر بھی فرار ہو جانے کی فکر میں تھا۔ ہمایوں کو جب اس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے اسے قتل کرا دیا۔

ہمایوں نے کابل سے بدخشاں کی تسخیر کے ارادہ سے کوچ کیا۔ وہاں سلیمان مرزا سے مقابلہ ہوا۔ وہ کچھ عرصہ تک لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر پسپا ہو گیا۔ اس دوران میں کابل کو خالی پا کر کامران نے فوج کشی کی اور شہر پر قبضہ کر لیا اور ہمایوں کی بیگمات اور شاہزادۂ اکبر کو قید کر لیا۔

کامران سے آخری جنگ

ہمایوں نے بدخشاں کی حکومت مرزا ہندال کو دی تھی، بعد میں اس سے لے کر دوبارہ مرزا سلیمان کے حوالہ کر دی اور خود نہایت تیزی سے کابل کی طرف لوٹ گیا۔ کابل سے باہر کامران کو بُری طرح شکست ہوئی اور وہ پسپا ہو کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ سخت محاصرہ کی وجہ سے اس کے حالات نہایت ابتر ہو گئے۔ اس دوران میں اس نے انتہائی سنگ دلی سے کام لے کر چند بار شاہزادہ اکبر کو قلعہ کے اُس کنگرہ پر جو بندوقوں اور توپوں کا نشانہ تھا بٹھا دیا لیکن "جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے"۔ اکبر کی جان ہر بار سلامت ہی رہی۔

دونوں بھائیوں کی اس لڑائی میں منافق امیروں اور سرداروں کی سرگرمیاں بس دیکھنے کے لائق تھیں، وہ کبھی اِس طرف ہو جاتے تو کبھی دوسرے کے جھنڈے تلے پہنچ جاتے تھے۔ اس معرکہ میں دونوں طرف سے بہت سارے آدمی ہلاک ہوئے۔ جب کامران ہر طرح مجبور ہو گیا تو بھیس بدل کر قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اس کے تعاقب پر حاجی محمد خاں ایک جمعیت کے ساتھ نامزد کیا گیا تھا۔ جب وہ تعاقب کرتے ہوئے مرزا کے قریب پہنچا تو کامران نے اس سے کہا: "تیرے باپ بابا قشقہ کو کیا میں نے ہی قتل کیا تھا؟" حاجی محمد خاں کہن سال تجربہ کار سپاہی تھا، یہ فقرہ سُن کر اس نے کامران کو نکل جانے دیا اور واپس ہو گیا۔ کامران کے فرار کے بعد شاہزادہ اکبر صحیح سلامت باپ کو مل گیا۔

کامران مرزا نے یہاں سے بھاگ کر حاکم بلخ پیر محمد کے پاس پناہ لی اور اس سے مدد لے کر لغیر لڑے بھڑے سلیمان مرزا اور اس کے بیٹے ابراہیم مرزا سے بدخشاں کے بعض علاقے چھین لیے۔ اسی زمانہ میں قراچہ بیگ نے جوالی

خاص مہمات میں نمایاں کارنامے انجام دے چکا تھا بعض احمق امیروں کے ساتھ مل کر بادشاہ سے نامناسب مطالبے کرنے لگا لیکن جب ان امیروں کی غرض پوری نہ ہوئی تو یہ بدخشاں کو چلے گئے۔

ان چند برسوں میں کابل شورشوں اور انقلابات کا مرکز بنا رہا، چنانچہ ایک ظریف نے اس سلسلہ میں یہ شعر کہہ کر مذاق اُڑایا ہے ؎

قلعۂ کابل کہ در رفعت ز کیواں برتر است ؛
چوں غلیوازی کہ شش ماہ مادہ و شش ماہ نر است

کامران کی عہد شکنی

اس دوران میں ایک سے زیادہ مرتبہ مرزا کامران نے مخالفت اختیار کی اور ہر مرتبہ حاضر ہو کر معافی چاہی۔ ہمایوں نہایت بامروت شخص تھا، اُس نے ہر مرتبہ بھائی کے قصور کو معاف کر دیا اور اپنا دل اس کی طرف سے صاف کر لیا۔ آخر میں کامران نے خود حاضر ہو کر مکہ معظمہ چلے جانے کی اجازت طلب کی لیکن ہمایوں نے اس کی درخواست قبول نہ کی اور اسے بدخشاں کی حکومت پر مامور کر کے خود بلخ کی طرف لشکر لے کر گیا۔ وہاں پیر محمد اور شاہ اوزبک عبداللہ خاں کے لڑکے عبدالعزیز خاں کو شکست دی۔ اس کے اپنے امیروں میں اس وقت بڑی مخاصمت پیدا ہو گئی تھی اور کامران کی طرف سے بھی دل مطمئن نہیں تھا اس لیے ہمایوں وہاں سے جلد ہی کابل لوٹ آیا۔

کامران کی وفات

کامران نے حسب عادت پھر عہد شکنی کی لیکن شکست کھا کر ہندوستان میں سلیم شاہ کے پاس مدد لینے کے لیے بھاگ گیا۔ یہاں سے بھی اسے مایوس ہو کر واپس ہونا پڑا۔ واپسی کے وقت وہ آدم گھکڑ کے ذریعہ گرفتار ہو کر ہمایوں کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ ہمایوں نے اس کی جان بخشی تو کر دی لیکن اسے اندھا کر دیا۔ اس قصہ کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ کچھ عرصہ بعد کامران ہجرت کر کے مکہ کو چلا گیا وہاں اس نے چار حج کیے اور اسی جگہ فوت ہوا۔ مولانا قاسم کاہی[1] نے اس کی تاریخ وفات لکھی ہے ؎

کامران آنکہ پادشاہے را | کس ندیدست ہیچو او ند خورد
شد ز کابل بہ کعبۂ و آنجا | جاں بحق داد و تن بخاک سپرد
گفت تاریخ او چنیں کاہی | بادشہ کامراں بہ کعبہ مرد

اسی کے متعلق ولیسی[2] شاعر کی تاریخ ہے ؎

---

[1] قاسم کاہی۔ عرف کالے میاں تھا، ہمایوں کے عہد میں کابل سے ہند آئے تھے تفسیر، کلام، تصوف، ہیئت، موسیقی اور شاعری میں کمال حاصل تھا ان کی شاعری میں سادگی اور موسیقیت تھی۔ ہمایوں کی وفات پر ایک قطعہ بڑا مشہور ہے یہ ان کا ہی ہے جس کا مشہور شعر ہے ؎

پے تاریخ او کاہی رقم زد | ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

کاہی نے بوستاں کے جواب میں ایک مثنوی گل افشاں بھی لکھی ہے۔

[2] ہمایوں کا درباری امیر اور سخن سنج شاعر تھا۔ اس کے گھر پر شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں جہاں نامور شعراء جمع ہوا کرتے تھے۔

شہ کامران خسرو نامدار | کہ در سلطنت سر بکیواں رساند
مجاور شد اندر حرم چار سال | بکل دل از قید عالم رہاند
زلبعد وقوف حج چار مین | باحرام حج جاں بجاناں فشاند
چو در خواب ویسی درآمد شبے | عنایت نمود و سوے خوش خواند
بگفتا او بپرسیدت از فوت ما | بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند

مرزا کامران نہایت باہمت، بہادر، سخی، خوش مزاج اور خوش اعتقاد تھا۔ ہمیشہ اس کی صحبتوں میں علماء اور فضلا حاضر رہتے تھے۔ خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کے شعر کافی مشہور ہیں۔ ایک زمانہ میں ایسا پرہیزگار ہوگیا تھا کہ اپنے ملک میں انگور کی کاشت تک کی ممانعت کرادی تھی، اگرچہ بعد میں خود بھی بکثرت مے نوشی کرنے لگا تھا۔ آخر میں تمام باتوں سے توبہ کرکے نہایت پارسائی کی حالت میں انتقال کیا اس کی وفات ۹۶۴ھ میں ہوئی۔

کابل کی آخری لڑائی میں قراچہ خاں مارا گیا اور مرزا عسکری گرفتار ہوگیا۔ خواجہ جلال محمود دیوان نے اسے بدخشاں لے جاکر مرزا سلیمان کے حوالہ کردیا۔ وہاں چندروز قید میں رہنے کے بعد اسے رہائی ملی۔ مرزا سلیمان نے بعد میں اسے بلخ بھیج دیا تھا، وہاں سے وہ مکہ کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن شام اور مکہ کے درمیانی جنگل میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی وفات کا مادۂ تاریخ ہے ؂

"عسکری پادشاہ دریادل"

ہندال کا قتل

مرزا ہندال کا انجام یہ ہوا کہ جب کامران نے آخری بار شکست کھائی اور ہندوستان میں جاکر پٹھانوں کے پاس پناہ لی۔ اسی دوران میں کسی موقع پر کامران نے ہندال کے لشکر پر شب خوں مارا تھا اور وہ اسی معرکہ میں قتل ہوگیا۔

یہ واقعہ ۹۵۸ھ میں پیش آیا۔ اس کی تاریخ لفظ "شب خوں" سے ہی نکلتی ہے ؂

خرد تاریخ فوتش جست گفتند
دریغا مرد شمع از شب خوں

مرزا اماں[1] نے اس کی تاریخ کہی تھی ؂

شاہ ہندال سرو گلشن ناز | چوں ازیں بوستاں محنت رفت
گفت تاریخ قمری نالاں | سروے از بوستان دولت رفت

---

[1] "تذکرہ روزروشن" میں ایک اماں اللہ قہستانی کا شعر درج ہے یہ اماں اللہ ہرات میں رہتے تھے، وہ شعر ہے ؂
روز در فکرم کہ شب بے تو چوں خواہد شدن
شب دریں اندیشہ ام تا روز چوں خواہد شدن
ایک اور بزرگ شیخ اماں اللہ پانی پتی بھی ہیں جو صوفی بھی تھے اور شاعر بھی، ان کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ یہاں غالباً انہی بزرگ سے مراد ہے۔

مولٰنا حسن علی فراس نے یہ تاریخ لکھی ہے

ہندال محمد شہ فرخندہ لقب   ناگہ ز قضا شہید شد در دل شب
شبخوں بہ شہادتش چو گردید سبب   تاریخ شہادتش ز شبخوں بہ طلب

ہمایوں نے مرزا ہندال کا سارا مال و اسباب شاہزادہ اکبر کو عطا کیا اور غزنی اور اس کے توابعات بھی اس کو جاگیر میں دے دیے۔

اسی دوران میں سلیم شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں اس کی وفات کے بعد بڑی طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔ جب ہمایوں کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے دوبارہ ہندوستان کی تسخیر کا مصمم ارادہ کر لیا۔

انہی دنوں لوگوں نے چغلیاں کھا کر ہمایوں کو بیرم خاں کی طرف سے ناراض کر دیا۔ چنانچہ ہمایوں نے بجائے ہندوستان کے قندھار کی طرف پہلے یورش کی۔ وہاں بیرم خاں خود بادشاہ کے استقبال کے لیے حاضر ہو گیا۔ اس کی خیر خواہی بخوبی ظاہر ہو گئی اور معلوم ہوا کہ اہل غرض نے اس کے خلاف جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ تھا۔

مولانا زین الدین محمود

اس مرتبہ ہمایوں جو قندھار گیا تو بیرم خاں کی معرفت اس نے مولانا زین الدین محمود کمان گر بہدائیؒ سے ملاقات کی۔ مولانا ممدوح خراسان کے ایک موضع بہدا کے رہنے والے تھے۔ اکثر بزرگوں اور عالموں کی صحبت میں رہ چکے تھے، چنانچہ وہ مولانا جامی اور مولانا عبدالغفور سے بھی ملاقات کر چکے تھے۔ مولانا فن نقاشی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے لیکن وہ اپنے اس کمال کو لوگوں سے چھپائے رکھتے تھے۔

بیرم خاں ان کا شاگرد تھا اور ہمیشہ ان کے درس میں حاضر رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی یوسف زلیخا کے درس میں بیرم خاں مداخلت کرنے لگتا تھا تو مولانا فرماتے تھے "بیرم خاں کیا تو نے دنیا میں اپنے لیے کوئی اور یوسف زلیخا بنا لی ہے؟"

ایک مرتبہ ہمایوں نے حضور اکرمؐ کے نام پر کھانا پکوایا اور مولانا کی دعوت کی۔ ہاتھ دھلانے کے وقت ہمایوں نے خود اپنے ہاتھ میں آفتابہ اٹھا لیا اور طشت بیرم خاں نے سنبھالا۔ اس وقت مولانا نے سید جمال الدین محدث کے پوتے میر حبیب اللہ کی طرف اشارہ کر کے ہمایوں سے کہا "اس کو بھی جانتے ہو یہ کون ہے؟" ہمایوں کو ان کے سامنے بھی آفتابہ لے جانا پڑا۔ میر صاحب گھبرا گئے اور تھوڑا سا پانی جلد جلد اپنے ہاتھوں پر ڈال لیا۔ مولانا نے نہایت اطمینان کے ساتھ اچھی طرح اپنے ہاتھ دھوئے۔ اس موقع پر ہمایوں نے مولانا سے پوچھا "کتنے پانی سے ہاتھ دھونا مسنون ہے؟" مولانا نے فرمایا "جس قدر پانی سے ہاتھ اچھی طرح دھل جائیں۔" اس مجلس کے باقی لوگوں میں سے کچھ کے ہاتھ بیرم خاں نے اور بعض کے قاسم خاں کے داماد حسین خاں نے دھلوائے اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ہمایوں مولانا کی صحبت سے بہت خوش ہوا اور ان سے بہت کچھ استفادہ کرتا رہا، بعد میں اس نے کچھ نقدی بیرم خاں کے ذریعہ روانہ کی۔ مولانا کو کسی سے تحفہ لینے کی عادت نہ تھی اس لیے انھوں نے بہت انکار کیا لیکن بیرم خاں نے بھی بڑے خلوص کے ساتھ اس قدر اصرار کیا کہ انھوں نے وہ رقم کراہت کے ساتھ قبول کر لی۔ لیکن اس کے عوض انھوں نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی بہت سی کمانیں جو اس رقم سے زیادہ قیمت کی تھیں بادشاہ کے پاس بھجوا دیں کہ ہدیہ یک طرفہ نہیں دونوں جانب سے

ہوا کرتا ہے۔

ایک دن بیرم خاں ایک نہایت نفیس کشمیری شال ان کو تحفہ دینے کے لیے لے کر حاضر ہوا۔ انھوں نے یہ شال ہاتھ میں لی اور فرمایا "کتنی اچھی چیز ہے!" بیرم خاں نے کہا "یہ صوفیانہ شال ہے اس لیے آپ کی نذر کے لیے لے کر آیا ہوں۔" آپ نے اپنی دو انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "میرے لیے تو اپنی دو ہر ہی بہت کافی ہے ہاں اسے تم مجھ سے زیادہ کسی اور مستحق کو دے دو۔"

مولانا کی کرامتیں بھی بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں جس وقت ہمایوں کے لشکری تیراندازی کی مشق کیا کرتے تھے تو وہ بھی خلاف عادت وہاں پہنچ جاتے تھے اور تیراندازی کا فن سیکھنے سکھانے کے لیے لوگوں کو ترغیب دیا کرتے تھے کہتے تھے "ایک دن یہ تیراندازی کام آئے گی۔" ماچھی واڑہ کی لڑائی میں جو پہلے ہی حملہ میں پٹھانوں کو شکست ہوئی تو وہ صرف ہمایونی لشکر کی تیراندازی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ غالباً مولانا کا اشارہ اسی معرکہ کی طرف تھا۔

جس وقت بیرم خاں قندھار کی حکومت علی قلی خاں سیستانی کے بھائی بہادر خاں کے سپرد کر کے کابل آیا تھا تو اس نے اپنی طرف سے ایک ظالم ترکمان کو گماشتہ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے ظلم و ستم کی خبریں روزانہ مولانا کے پاس پہنچتی تھیں اتفاقاً وہ ترکمان بیمار ہو گیا تو لوگوں کو کچھ دن کے لیے اس کی زیادتیوں سے نجات ملی۔ ایک دن کسی شخص نے مولانا کی مجلس میں کہا کہ "اب وہ تندرست ہو کر پھر اٹھ رہا ہے"۔ مولانا نے اس شخص کو تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تندی سے فرمایا "شاید قیامت کے دن ہی اٹھے گا"۔ چنانچہ دو چار دن بعد ہی وہ ظالم مر گیا۔

ہمایوں جب لوٹنے لگا تو اس نے قندھار کو بیرم خاں کے بجائے منعم خاں کے سپرد کرنے کا ارادہ کیا لیکن منعم خاں نے کہا "اس وقت جب کہ آپ ہندوستان پر حملہ کا عزم کیے ہوئے ہیں، کسی قسم کا تغیر و تبدل لشکر کی بے دلی کا باعث ہوگا۔ ہندوستان کی فتح کے بعد جس طرح چاہے کیجیے"۔ ہمایوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور قندھار بیرم خاں کے پاس اور داور بہادر خاں کے پاس ہی رہا۔

ہندوستان کی طرف کوچ

ان انتظامات کے بعد بادشاہ نے سامانِ جنگ تیار کیا اور ماہ ذی الحجہ ۹۶۱ھ میں کابل سے ہندوستان کے ارادہ سے سوار ہو گیا۔ اس کی روانگی کا قطعۂ تاریخ ہے ؎

خسرو غازی نصیر الدین ہمایوں شاہ آنکہ — گوئے سبقت بر دز از شاہان پیش پیشگی
بہر فتح ہند از کابل عزیمت کرد و شد — سال تاریخ توجہ نہ صد و شصت و یکے

اس قطعہ میں لفظی اور معنوی دونوں تاریخیں موجود ہیں۔

جب شاہی لشکر نے پرشاور پر منزل کی تو قندھار سے بیرم خاں بھی آکر شامل ہو گیا۔ یہاں سے لشکر نے روزانہ مسلسل کوچ کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر لیا۔ ہمایوں کی ہراول فوج پر بیرم خاں، خضر خواجہ خاں، تردی بیگ خاں اور سلطان سکندر ازبک مامور تھے۔ ہمایوں کی آمد آمد سن کر حاکم رہتاس تاتار خاں کاسی قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس مرتبہ آدم گکھڑ نے بھی لشکر میں حاضری نہ دی اور جب ہمایوں لاہور پہنچا تو وہاں کے پٹھان مقابلہ کی طاقت نہ پا کر بھاگ گئے۔

ہراول کے امیر لاہور، تھانیسر، جالندھر اور سرہند کی طرف بے روک ٹوک بڑھتے چلے گئے۔ دیپال پور کے قریب شہباز خاں اور نصیر افغانی مقابلہ کے لیے آئے لیکن شاہ ابو المعالی اور علی قلی شیبانی سے شکست کھا کر بھاگ گئے۔ اس وقت مغلوں کا ایسا ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ ہزار ہزار پٹھان پڑے پگڑیاں باندھے ہوئے دس سواروں کو بھی دیکھ لیتے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے تھے، چاہے وہ سوار لاہوری ہی کیوں نہ ہوں۔

جب ہمایوں سندھ کے اُس پار ہی تھا سکندر سور نے ابراہیم سور کو شکست دینے کے بعد آمادہ سے عدلی شاہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کی تھیں، اس موقع پر اُسے خبر ملی کہ ہمایوں نے سندھ کو عبور کر لیا ہے۔ سکندر سخت پریشان تھا کیوں کہ پٹھانوں کا یہ حال تھا کہ ہر شخص ہمت ہار کر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان بچانے کی فکر میں لگا ہوا تھا اور سب یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ یہ صرف اسلیم شاہ کا ہی دم تھا کہ وہ مغلوں کے دانت کھٹے کر دیتا تھا اب ان سے مقابلہ کرنے والا کون رہ گیا ہے؟ اس عام پست ہمتی کے باوجود سکندر نے دوسرے تمام کام چھوڑ کر مغلوں سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

سکندر سور سے مقابلہ

ہمایوں کی کچھ فوج جالندھر میں پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ سکندر نے سب سے پہلے اس محاذ پر حبیب خاں، نصیب خاں طغوچی اور تاتار خاں کاسی کو روانہ کیا اور خود بھی ان کے پیچھے کوچ کر دیا۔ سکندر کی پیش قدمی کی وجہ سے چغتائی امیر ستلج کے اُس پار چلے گئے۔ پٹھانوں نے اُن کا تعاقب کیا۔ شام ہوتے ہوتے دونوں فوجوں میں ایک سخت لڑائی ہوئی۔ مغلوں نے قدم جما کر تیر اندازی شروع کر دی۔ پٹھان اپنے ناکارہ سامان جنگ کی وجہ سے اس تیر اندازی کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور اُنھوں نے ایک ویران گاؤں میں جا کر پناہ لے لی۔ اس کے بعد پٹھانوں نے ایک حماقت یہ کی کہ مغلوں کے لشکر کو بخوبی دیکھنے کے لیے بہت سی آگ جلائی، قدرتی طور پر معاملہ اُلٹا ہی ہوا پٹھان تو خود روشنی میں آ گئے اور مغل لشکر اندھیرے میں محفوظ رہا۔ اس روشنی سے فائدہ اُٹھا کر مغلوں نے تاک تاک تیر مارنا شروع کر دیے، جو تیر بھی اُن کی کمان سے نکلتا تھا کسی نہ کسی پٹھان کی جان لے کر ہی جاتا تھا۔ آخر پٹھان شکست کھا کر بھاگے اور مغلوں نے بآسانی یہ معرکہ جیت لیا۔ ان کا بہت کم جانی نقصان ہوا اور غنیمت میں کافی ساز و سامان ہاتھی اور گھوڑے ہاتھ آئے۔ اس فتح کی خبر ہمایوں کو لاہور میں ملی۔

بہت جلد سارا پنجاب سرہند اور حصار فیروزہ تک کا علاقہ مغل فوج کے قبضہ میں آ گیا اور ہمایوں فاتحانہ کوچ کرتا ہوا دہلی کے قریب آ پہنچا۔ اسی دوران میں سکندر نے بھاگے ہوئے پٹھانوں کو چاروں طرف سے جمع کر کے اسی ہزار سوار اور بہت سے ہاتھیوں اور توپ خانہ لے کر سرہند پر حملہ کیا اور شیر شاہ کے طریقہ پر اپنے لشکر کے اطراف خندق اور حصار کھینچ دیا۔ مغل سرہند کے دروازے بند کر کے اندر سے لڑنے لگے اور ہمایوں کو کمک کے لیے لکھا۔ ان کی مدد کے لیے ہمایوں نہایت تیزی سے یلغار کرتے ہوئے سرہند پہنچ گیا۔ یہاں کافی عرصہ تک لڑائی ہوتی رہی، ہر روز خوں ریز مقابلہ ہوتا تھا۔

پٹھانوں کی شکست

جس دن شاہزادۂ اکبر لشکر کی کمان کر رہا تھا اُس دن بڑی سخت خونریز لڑائی ہوئی ایک طرف

سے اکبر دوسری طرف سے بیرم خاں، سکندر خاں، عبداللہ خاں اوزبک، شاہ ابوالمعالی، علی قلی خاں، بہادر خاں آگے بڑھے اور بڑی مردانگی کے ساتھ پٹھانوں پر حملہ کیا۔ پٹھانوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، اپنے حوصلہ سے بڑھ کر انھوں نے بہادری دکھائی۔ نوشتۂ تقدیر میں فتح مغلوں کے لیے لکھی جا چکی تھی پٹھان مغلوں کی یلغار کی تاب نہ لا سکا اور شکست کھا کر میدان سے بھاگ گئے۔ مغلوں نے ان کا تعاقب کیا۔ اس دن سارے راستہ میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ غنیمت میں مغل فوج کو ہر طرح کا بے انتہا مال و اسباب بے شمار ہاتھی اور گھوڑے ملے۔ مقتول پٹھانوں کے سر اس کثرت سے ڈھیر تھے کہ ان کے مینار بن گئے۔ اسی مناسبت سے بیرم خاں نے اس مقام کا نام "سرمنزل" رکھا تھا، یہی نام آج تک چلا آرہا ہے۔ اس فتح کی تاریخ ہے:

"شمشیر ہمایوں"

منشی خرد طالع میموں طلبید — انشائے سخن ز طبع موزوں طلبید
تحریر چو کرد فتح ہندوستان را — تاریخ ز "شمشیر ہمایوں" طلبید

جب سکندر لڑائی ہار گیا تو مایوس ہو کر کوہ سوالک کی طرف بھاگ گیا اور سکندر خاں اوزبک ایک بڑا لشکر لے کر سامانہ کے راستہ دہلی جا پہنچا۔ جو پٹھان دہلی میں رہ گئے تھے وہ سب منتشر ہو گئے۔ ہمایوں نے سکندر کے تعاقب کے لیے شاہ ابوالمعالی کو روانہ کیا اور خود ۹۶۲ھ ماہ رمضان میں دہلی میں داخل ہوا اور ہندوستان کے ایک بڑے علاقہ میں اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہو گیا۔

ہندوستان کے بادشاہوں میں بہت کم کو یہ نصیب ہوا کہ ایک مرتبہ شکست کھانے کے بعد دوبارہ ان کو سلطنت مل جائے۔

اس سال ہمایوں نے بہت سے علاقے اپنے امراء کو جاگیر میں عطا کیے اور مصطفےٰ آباد کا پرگنہ جس کا محصول سالانہ تیس چالیس تنکہ ہوتا تھا حضور اکرمؐ کے نام پر وقف کر دیا۔ حصار فیروزہ اکبر کو جاگیر میں ملا۔ بابر نے بھی اپنی پہلی فتح کے وقت میں یہی مقام ہمایوں کو جاگیر میں دیا تھا۔ پنجاب کا صوبہ شاہ ابوالمعالی کے سپرد کر کے اسے سکندر کے مقابلہ پر مامور کیا گیا۔

سکندر نے بھاگ کر شمالی کوہستان میں پناہ لی تھی۔ ابوالمعالی کی مدد کے لیے جو دوسرے امیر مامور کیے گئے تھے، سکندر نے ان کی جاگیروں پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ اس کی دست برد سے سرکاری خزانہ اور خالصہ کے پرگنے بھی محفوظ نہیں تھے۔ اس کے مسلسل حملوں سے مذکورہ امیر بے دل ہو چلے تھے اور سکندر کی قوت روزانہ بڑھتی جا رہی تھی۔

جب سکندر کی دست درازیاں بہت بڑھ گئیں تو ہمایوں نے شاہزادہ اکبر کو بیرم خاں کی اتالیقی میں سکندر کے مقابلہ پر بھیجا اور شاہ ابوالمعالی کو حصار فیروزہ پر تبدیل کر دیا۔ اکبر کے رخصت ہونے سے پہلے ہی بادشاہ نے آگرہ پر قنبا خاں کنگ کو میرٹھ اور سنبھل پر علی قلی خاں کو، بدایوں پر قنبر دیوانہ کو اور بیانہ پر محمد خاں آختہ بیگی کو مامور کر کے رخصت کر دیا تھا۔

غازی محمد خاں کا قتل

حیدر محمد خاں نے بیانہ پر حملہ کیا تو ابراہیم سور کا باپ غازی محمد خاں قلعہ بیانہ میں محصور ہو گیا۔ اس محاصرہ سے پہلے بھی اور بعد میں بھی لوگوں نے غازی محمد خاں کو بہت سمجھایا کہ وہ رنتھمبور اور پھر وہاں سے گجرات چلا جائے۔ لیکن اس نے کسی کا مشورہ قبول نہ کیا اور قلعہ میں اس طرح گھر کر رہ گیا جیسے مچھلی جال میں۔ بیانہ کے تمام زمیندار امن طلب کرتے ہوئے مغل لشکر میں حاضر ہو گئے۔ حیدر محمد خاں نے عہد و پیمان کے ذریعہ غازی خاں کو معہ اہل و عیال قلعہ سے باہر آجانے پر راضی کر لیا اور اس کی رہائش کے لیے ایک محفوظ مقام کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن جب اس نے بیانہ کے خزانوں اور دفینوں کے متعلق بخوبی تحقیقات کر لی تو اپنے کیے ہوئے عہد سے پھر گیا اور غازی خاں کو اس کے اہل و عیال بلکہ شیر خوار بچوں سمیت قتل کرا دیا۔ ان کے سر بادشاہ کے پاس بھجوا دیے۔ ہمایوں کو اس کی یہ عہد شکنی ناگوار گزری اور اس نے میر شہاب الدین نیشاپوری کو جس کا شہاب الدین احمد خاں خطاب تھا غازی خاں کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے بیانہ کی طرف روانہ کیا۔ حیدر محمد خاں نے نفیس اسباب جواہرات وغیرہ کو تو چھپا لیا اور کم قیمت والا سامان معائنہ میں پیش کر دیا۔

قنبر دیوانہ

قنبر دیوانہ نے سنبھل پہنچنے کے بعد کافی بڑی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ بعد میں جب سنبھل علی قلی خاں کے حوالہ ہوا تو وہ کہا کرتا تھا "یہ تو وہی مثل ہوئی کہ پیر کسی کے اور گاؤں کسی کا۔" علی قلی خاں کے سنبھل آنے سے پہلے ہی قنبر بدایوں چلا گیا۔ وہاں اس نے کانٹ اور کولہ کی طرف یلغار کر کے رکن خاں پٹھان سردار سے مقابلہ کیا، اسے شکست دے کر لکھنؤ تک کا علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد پٹھانوں کے مقابلہ میں شکست کھا کر اور وہاں کے قلعہ میں بڑا کشت و خون کر کے بدایوں لوٹ آیا۔ بدایوں میں بھی اس نے ظلم و ستم پر کمر باندھ لی۔ علی قلی خاں نے اسے اپنے پاس بلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ گیا اور کہلوایا "میں بادشاہ کے پاس تجھ سے زیادہ مقرب ہوں اور میرا سر شاہی تاج سے وابستہ ہے۔" اس کی ان باتوں سے بگڑ کر علی قلی خاں نے اس پر فوج کشی کی اور بدایوں کا محاصرہ کر لیا۔ قنبر دیوانہ اس محاصرہ کے دوران میں بھی شہر والوں پر ظلم ڈھانے سے باز نہیں رہتا تھا۔ آج کسی کی بیوی کو اٹھا لیا تو کل کسی کی بیٹی کا اغوا کیا، کسی کا مال و اسباب زبردستی چھین لیا۔ اس کو اپنے کسی آدمی پر بھروسا نہ تھا اس لیے راتوں میں بذات خود مورچوں کی گشت کیا کرتا تھا۔ اپنی دیوانگی کے باوجود لڑائی کی چالوں میں بڑا ہوشیار تھا۔

ایک دن قلعہ کے ایک خالی مقام پر آدھی رات کے وقت پہنچ گیا، ایک جگہ چلتے چلتے رک گیا پھر دو چار قدم آگے بڑھ کر سوچنے لگا پھر اچانک پلٹ کر اسی پہلی جگہ آ گیا اور اسی وقت بیلداروں کو بلا کر زمین کو کھودنے کا حکم دیا اور کہا کہ "اس جگہ میرے کان میں کچھ آواز سی آ رہی ہے۔" جب وہ جگہ کھودی گئی تو معلوم ہوا علی قلی خاں نے قلعہ کے باہر سے سرنگ لگا رکھی تھی۔ جن لوگوں نے یہ سرنگ دیکھی تھی ان کا بیان ہے کہ جب سرنگ کھودی جانے لگی تو معلوم ہوا قلعہ کی بنیاد پانی کے اندر تک چلی گئی ہے اور اس میں لوہے کے پشتے اور سال لکڑی کے شہتیر مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک جگہ خالی مل گئی تھی اس مقام سے سرنگ کھودی گئی تھی جس کا سراغ اس دیوانہ کی ہوشیاری سے بروقت لگ گیا۔ علی قلی خاں بھی قنبر کی اس دانائی پر حیران رہ گیا۔

محاصرہ جاری تھا کہ بدایوں کے تمام شہریوں نے ایکا کر کے علی قلی خاں کے پاس کہلا بھیجا کہ "فلاں رات کو فلاں برج پر حملہ کرنا ہم قلعہ کے اوپر سے کمندیں اور سیڑھیاں لٹکا دیں گے"۔ اسی منصوبہ کے مطابق علی قلی خاں نے حملہ کیا اور اس کے سپاہیوں کو شیخ حبیب بدایونی نے اس برج کی طرف سے جو شیخ سلیم چشتی کے رشتہ دار شیخ زادوں کا تھا اوپر چڑھا لیا اور ان لشکریوں نے شہر میں داخل ہو کر آگ لگا دی۔ قنبر دیوانہ سے جب کچھ نہ بن پڑا تو وہ ایک کالا کمبل اوڑھ کر شہر سے نکل گیا لیکن لوگ پکڑ کر اسے علی قلی کے پاس لے آئے۔

علی قلی خاں بڑی نرمی اور ملائمت سے پیش آیا اور کہا کہ "اگر تو اطاعت قبول کر لے تو میں تیری جان بخش دوں گا" لیکن دیوانہ نہایت تلخ و ترش باتیں کرتا رہا اور کسی طرح قابو میں نہیں آیا، مجبور ہو کر علی قلی خاں نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کی قبر بدایوں میں اب تک مشہور ہے۔ قنبر کی عادت تھی کہ بہت سا کھانا پکوا کر لوگوں کی دعوت کرتا تھا اور کہتا تھا "کھاؤ مال خدا کا ہے، جان خدا کی اور قنبر دیوانہ بکاول خدا ہے"۔

جب علی قلی خاں کا عریضہ قنبر کے سر کے ساتھ بارگاہ سلطانی میں پہنچا تو علی قلی خاں کی یہ حرکت ہمایوں کو سخت ناپسند ہوئی۔

ہمایوں کی وفات

انہی دنوں بتاریخ ۷۔ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو ہمایوں بادشاہ کتب خانہ[1] کی چھت پر گیا جو دہلی کے قلعۂ دین پناہ میں بنایا گیا تھا جس وقت وہ وہاں سے اُتر رہا تھا اذان کی آواز آنے لگی۔ اذان کے احترام میں وہ اسی جگہ بیٹھ گیا، جب وہاں سے اُٹھنے لگا تو عصا اچٹ گیا اور ہمایوں کا پیر پھسل گیا اور وہ چند سیڑھیوں پر سے پھسلتے ہوئے زمین پر آ گیا۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو شیخ جولی کو پنجاب میں شاہزادہ اکبر کے پاس روانہ کیا اور اس کو اپنے حالات سے مطلع کیا۔

اس صدمہ سے ہمایوں جانبر نہ ہو سکا۔ آخرکار اس حادثہ کے آٹھویں دن ۱۵ ماہ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو اس نے اس عالم فنا سے آنکھیں پھیر لیں۔

ہمایوں کے انتقال کی تاریخ اس شعر سے نکلتی ہے ؎

چو گشت از رحمت حق ساکن اندر روضۂ رضواں
بہشت آمد مقام پاک او تاریخ اذاں باشد

مولانا قاسم کاہی نے تاریخ کہی ؎

---

[1] ہمایوں علم دوست بادشاہ تھا چنانچہ اس نے دہلی کے شیر شاہی قلعہ میں شیر منڈل کی سہ منزلہ عمارت کی آخری منزل میں اپنا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اسے چونکہ نجوم میں بھی بڑی دستگاہ حاصل تھی اس لیے یہ اس کی رصدگاہ بھی تھی۔ اس شاہی کتب خانہ کے مہتمم کا نام تاریخوں میں نظام المعروف بازبہادر ملتا ہے۔ ہمایوں کا شوق کتب بینی اس درجہ پر تھا کہ میدان جنگ میں بھی چھوٹا سفری کتب خانہ رہتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے کھمبایت کا محاصرہ کیا تھا تو اور کتابوں کے ساتھ تاریخ تیمور کا وہ نسخہ بھی تھا جس کو بہزاد نے مصوّر کیا تھا ایک جنگلی قبیلہ نے شاہی کیمپ پر چھاپہ مارا تو یہ نسخہ جاتا رہا لیکن جلد ہی مل گیا۔ (تزک جہانگیری۔ اکبر نامہ)

ہمایوں بادشاہ ملک معنیٰ — ندارد کس چو او شاہنشہی یاد
زبام قصر خود افتاد ناگہ — وزاں عمر عزیزش رفت برباد
پئے تاریخ او کاہی رقم زد
ہمایوں پادشاہ از بام افتاد

ہمایوں کی تاریخ وفات کا ایک اور مادہ ہے ؎

مشو غافل از سال فوتش ببیں
ہمایوں کجا رفت و اقبال او

اس کی ایک اور تاریخ ہے ؎

اے آہ پادشاہ من از بام افتاد

ہمایوں کی ذاتی خوبیاں

ہمایوں کی عمر اکیاون سال کی تھی۔ اس نے ۲۵ سال سے کچھ زائد حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔ امور سلطنت میں بڑی گہری نظر تھی۔ ظاہری اور باطنی بہت سے ہنر و کمال اسے حاصل تھے۔ وہ نجوم و ہیئت کے علاوہ دوسرے مروجہ علوم میں بھی ماہرانہ دستگاہ رکھتا تھا۔ علماء اور فضلاء، بزرگوں اور شاعروں کی دل سے قدر کرتا تھا۔ خود بھی بڑے اچھے شعر کہا کرتا تھا۔

۱؎ نجوم و ہیئت کا ذوق اس حادثہ کا باعث بنا اس شام ستارۂ زہرہ کے طلوع ہونے کا گمان کیا جا رہا تھا بادشاہ شیر منڈل کی برجی میں ریاضی دانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مباحث میں مشغول تھا۔ اذان کی آواز سن کر اٹھا تو پھسل کر گر پڑا اور اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ (اکبر نامہ ص ۳۶۳)

۲؎ ہمایوں کی ہیئت دانی کے متعلق اکبر نامہ (ص ۲۲۰) میں یہ جملہ درج ہے "توجہ اقدس باصطرلاب و کرہ و سائر آلات رصدی درجۂ کمال داشت" طبقات اکبری (جلد دوم ص ۱۸۴) کا حوالہ ہے "در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود" ہمایوں نے علم ہیئت ملا الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا جو اپنے وقت کے ماہر رصد تھے۔ ان علوم میں اس کی مہارت کا یہ درجہ تھا کہ ریاضی نجوم اور ہیئت کے ممتاز عالم نورالدین ترخان نوری سفیدونی نے ہمایوں سے ہی ان علوم کو سیکھا تھا (مآثر الامراء ج ۱ ص ۴۷۸) کرہ اور اصطرلاب کو ہمایوں نے ہی سب سے پہلے یہاں رواج دیا۔ ایک خاص قسم کا اصطرلاب بھی ایجاد کیا تھا جس کا نام "اصطرلاب ہمایوں" ہے (بحوالہ مضمون لاہور کا ایک فلکی آلات ساز از سلیمان ندوی) ہمایوں نامہ میں گلبدن بیگم نے لکھا ہے (ہمایوں نامہ ص۵۲) "جب ہمایوں کی شادی حمیدہ بانو سے قرار پائی تو ہمایوں نے خود اصطرلاب اٹھا کر ستاروں کی گردش کے ذریعہ تاریخ مقرر کی۔" اس سلسلہ میں "خرگاہ ہمایونی" کا تذکرہ بھی دلچسپ ہے، اس نے دو خرگاہ بنائے تھے جن کی ساخت ہیئت کے اصولوں پر تھی ایک خرگاہ آسمان کے بارہ برجوں میں تقسیم تھی ہر برج میں ایک قفس تھا جس سے "کواکب دولت" جھلکتے تھے۔ دوسرا خرگاہ یونانی ہیئت کے نو آسمانوں کی نقل تھی اس میں بھی ہر آسمان کے ستارے جڑے تھے۔ ہمایوں کی ایک اور ایجاد "بساط انبساط" تھی۔ اس بساط میں فلکی دائرے کرے اور عناصر کی اشکال تھیں۔ کرۂ خاک میں ہفت اقالیم کے نقشے تھے۔ (قانون ہمایونی ص۱۲) اس کے علم ریاضی کے متعلق اکبر نامہ میں ہے "در اقسام خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر نداشتند" فرشتہ لکھتا ہے (جلد اول مقالہ دوم ص ۲۲۳) "در علم ریاضی علم مہارت می افراشت"۔

ہمایوں ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ خدا اور رسول اکرم کا نام کبھی بغیر وضو کے نہیں لیتا تھا اگر کسی ایسے نام کو دہرانے کی ضرورت پڑتی جو عبد اور اللہ سے مرکب ہو تو وہ صرف عبد کہا کرتا تھا۔ مثلاً عبدالحی کو فقط عبدل کہتا تھا۔ اپنے رقعات کے سرنامہ پہ بجائے لفظ "ہو" کے اس لفظ کا ہندسہ گیارہ لکھا کرتا تھا۔ غرض اس طرح کے تمام مذہبی آداب کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔

اس کی محفلیں رات رات بھر جمی رہتی تھیں، کبھی اس کی طرف سے تکان اور سستی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ دل کا بڑا سخی تھا۔ اس کی فیاضی کے لیے سارے ہندوستان کا خراج بھی کافی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے محکمہ مالیات کے کارکن اس کے سامنے نقد روپیہ نہیں لاتے تھے۔

اس کی زبان پر کبھی گالی نہ آتی، جب بہت غصہ میں آجاتا زبان سے "ہے نادان" کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ مجلس میں جب آتا تو بھولے سے بھی بایاں پیر پہلے نہ رکھتا تھا۔ اس کی مجلس میں کسی اور شخص کی بھی مجال نہ تھی کہ کبھی بایاں پاؤں پہلے رکھے۔ اگر کبھی کسی سے یہ چوک ہو جاتی تو وہ اسے دوبارہ پیچھے لوٹ کر آنے کے لیے کہتا تھا۔ اس کی حیا کا یہ عالم تھا کہ کبھی قہقہہ مار کر نہیں ہنسا اور کسی کی طرف گھور کر نہیں دیکھا۔

اس کا یہ قصہ کافی مشہور ہے کہ جب اس نے ہندوستان کی تسخیر کا دوسری بار ارادہ کیا تو کابل کے مفسر قرآن شیخ حمید سنبھلی تک اس کے استقبال کے لیے گئے۔ ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا۔ ایک دن شیخ نے ہمایوں سے کہا "تمھارا پورا لشکر رافضی معلوم ہوتا ہے"۔ ہمایوں نے پوچھا "کیسے؟" انھوں نے کہا "اب کی بار تمھارے تمام سپاہیوں کے نام یار علی، کفش علی اور حیدر علی وغیرہ ہیں دوسرے کسی خلیفہ کے نام پر کسی کا نام نہیں"[1]۔ یہ بات سن کر ہمایوں کو بڑا طیش آگیا اور ہاتھ میں جو قلم تھا وہ فرش پر پھینک کر کہا "میرے دادا کا نام عمر شیخ تھا" اتنا کہہ کر محل سرا میں چلا گیا لیکن کچھ دیر بعد ہی باہر آکر نہایت ملائمت کے ساتھ اس نے شیخ کو اپنے صحیح عقائد سے آگاہ کیا۔

ہمایوں کی ذاتی خوبیاں اتنی ہیں کہ ان کو لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ہمایوں علم دوست اور نہایت قدردان بادشاہ تھا اس کے عہد میں صاحب کلام شاعر بہت سے گزرے ہیں۔

---

[1] شیخ نے دراصل یہ اشارہ اس بات کی طرف کیا تھا کہ ہمایوں نے شاہ طہماسپ صفوی سے مدد لیتے وقت شیعہ عقائد کو قبول کرنے سے صاف صاف انکار نہیں کیا تھا اور صفویوں کا لشکر لے کر بدخشاں پر حملہ کیا تھا اس شبہ میں کہ وہ شیعہ ہو گیا ہے شیخ موصوف نے یہ طنز کیا اور ہمایوں نے اپنے دادا "عمر شیخ" کے نام کا حوالہ دے کر شیعیت سے برأت ظاہر کی۔

عہد ہمایوں کے شعراء

جنوبی عہد ہمایونی کے شاعروں میں سے بدخشاں کے ایک شاعر مولانا جنوبی بدخشی معمائی نامی تھا۔ اس نے ہمایوں کی شاہزادگی کے زمانہ میں اس کا قصیدہ اٹھائیس اشعار پر مشتمل کہا تھا۔ اس قصیدہ کا کمال یہ ہے کہ وہ مشکل صنائع جو خواجہ رشید قدر کے قصیدہ میں ذوالفقار شروانی اور خواجہ غیاث کے قصیدے میں سلمان ساوجی جیسے بڑے بڑے شاعروں نے چھوڑ دی تھیں، جنوبی نے اس قصیدہ میں ساری ختم کر دیں جیسے معما، اظہار مضمر اور تاریخ وغیرہ حقیقت میں جنوبی نے یہ قصیدہ لاجواب لکھا ہے ؎

شہنشاہا رخ تو لالہ و نسرین لب تو جاں　　ہمی بینم لب تو غنچۂ رنگیں شدہ خنداں

نمی گویم خط تو سبزۂ و ریحاں خد تو گل　　شود ظاہر قد تو فتنۂ دوراں دم جولاں

اس قصیدہ کی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کے ہر مصرع کے شروع کا ایک ایک حرف لیا جائے تو یہ حروف مل کر یہ مطلع بناتے ہیں ؎

شہنشاہ دیں بادشاہ زماں

ز بخت ہمایوں شدہ کامراں

اگر پہلے دو شعروں کے درمیانی لفظوں کو سرخی سے لکھیں تو یہ مطلع نکلتا ہے جسے تین بحروں میں پڑھ سکتے ہیں ؎

رخ تو لالہ و نسرین خط تو سبزہ و ریحاں

لب تو غنچۂ رنگیں قد تو فتنۂ دوراں

اگر اس کو لوٹ کر پڑھیں تو یہ مطلع تین بحروں میں دوسری ردیف اور قافیہ سے اس طرح بن جاتا ہے ؎

خط تو سبزہ و ریحاں رخ تو لالہ و نسریں

قد تو فتنۂ دوراں لب تو غنچہ رنگیں

درمیان میں سرخی سے خط کشیدہ الفاظ کے علاوہ جو لفظ رہ جاتے ہیں وہ خود اپنی جگہ مل کر ایک اور مطلع بن جاتے ہیں۔ اس مطلع میں اور بھی خوبیاں رکھی ہیں جو اس کے حاشیوں سے واضح ہو سکتی ہیں۔ اس قصیدہ کے دوسرے چار شعر ایسے ہیں کہ اگر ان اشعار کے بعض حصے سرخی سے الگ کر لیے جائیں تو یہ مل کر بدخشاں کی فتح کا قطعۂ تاریخ بن جاتے ہیں۔

توئی شاہ شاہاں دوراں کہ شد　　ہمیشہ ترا کار فتح و ظفر

گرفتی دفتی بدخشاں و تاریخ شد　　محمد ہمایوں شہ بحر و بر

یہ قطعہ "معمہ" بھی بن جاتا ہے اور اس کا "اظہار مضمر" اس رباعی سے ملتا ہے جو اس قصیدہ کے آگے کے

اشعار سے نکلتی ہے۔ رباعی

"تا خاک درش گشت تن زار گدا — دل از غم و غصۂ خود افتاد جدا
جان من زار از غم یار برفت — غم شد ز جدائی دم دہد آں شاہ ندا

اس کا گوشوارہ ہے:

"گوید خبر فتح شہ دین ما"

یہ قصیدہ ان تمام قصائد کے ساتھ میری خاص بیاض میں اُس وقت کا لکھا ہوا ہے جبکہ میں عالم شباب میں تھا۔ اگر مجھے موت نے کچھ اور مہلت دی تو میں اس قصیدہ کے کمالات "سنجات الرشید" کے دوسرے دفتر میں جس کی تکمیل میرے دل سے لگی ہوئی ہے انشاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا۔

وفائی

عہد ہمایوں کے دوسرے شاعر شیخ زین الدین خاں تھے جن کا تخلص وفائی تھا۔ بابر نے اپنے عہد میں ان کو پورے ہندوستان کا مستقل صدر الصدور بنا دیا تھا۔ آگرہ میں جمنا کے پار ایک مسجد اور ایک مدرسہ ان کی یادگار ہے۔ نظم و نثر کے تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی، خاص طور سے فن معما گوئی، تاریخ اور بدیہہ گوئی میں ان کی مثال نہیں تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ بابر کے پاس آئے تو بادشاہ نے پوچھا "تمھاری عمر کیا ہے؟" فی البدیہہ جواب دیا "بس پانچ برس پہلے" چہل سالہ "تھا اور اب" چہل سالہ "ہوں اور دو برس بعد" چہل پورے "ہوں گے۔"

میری بھی کسی نے عمر پوچھی تو میں نے جواب دیا تھا "میں ایک سال پہلے "پنجہ سالہ" تھا اور اب "پنجاہ سالہ" ہوں اور دس برس بعد "پنجہ سال" پورے ہوں گے۔

مشہور ہے کہ شیخ زین ایک مرتبہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار پر گئے اور وہاں شیخ کی یہ حکایت سُنی کہ "الہدایا مشترک و تنہا خوشترک"۔ اس پر اُنھوں نے یہ قطعہ لکھا ؎

شیخنا بادا ترا از حق ہدایا بر دوام — آں کدام من کہ گویم الہدایا مشترک
گوئی تنہا مشترک زانساں کہ گفتی پیش ازیں — شترک سانا زنیگوئی کہ تنہا خوشترک

یہ قطعہ بھی انھیں کا لکھا ہوا ہے ؎

غم گریباں گیر شد سر در گریباں چوں کشم — شوق دامنگیر آمد پا بداماں چوں کشم
اے گریبانم ز شوقت پارہ دامن چاک چاک — بے تو پا در دامن و سر در گریباں چوں کشم

شیخ زین نے ہندوستان کی فتوحات اور اس سلسلہ کے عجیب و غریب حالات پر مشتمل ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس سے ان کی سخنوری کا کمال جھلکتا ہے۔ ان کی وفات چنہار کے علاقہ میں سنہ ۹۴۰ھ میں ہوئی اور اپنے ہی بنائے ہوئے مدرسہ میں دفن ہوئے۔

نادری

ہمایونی دور کے ایک اور شاعر مولانا نادری سمرقندی گزرے ہیں جو اپنے زمانہ کے بڑے فاضل اور جامع کمالات شخص تھے۔ ایک نو عمر جوان نظام نامی پر ان کا دل آگیا تھا اسی کے لیے اُنھوں نے یہ "اظہار معمّہ"

لکھا تھا جو بہت مشہور ہے ؎

من دل شکستہ گویم صفت نظام نامی
کہ نداشت بے وصالش دل ناتواں نظامی

اس معمہ کا اظہار اس رباعی میں ہے ؎

رنجورم و در دل از تو خارم صد غم
بے لعل لبیت حریف دردم ہمہ
زیں عمر لوم من مسکین غریب
خواہم شود آرام گہم کوی عدم

اس کا گوشوارہ ہے :

"صفت سنبل شاہد گویم"

ان کے دوسرے اشعار کا نمونہ :

وہ چہ خرام است قد یار را
بندہ شوم آں قد و رفتار را
یار سوئے ما بہ ترحم ندید
داشت نگہ جانب اغیار را
سوئے خرابات گذر نادری
در سر می کن سرو دستار را

ایضاً

سر کویت کہ عمری بودم آنجا
بعمر خود کجا آسودم آنجا
بقصد سجدہ ہر جا سر نہادم
تو بودی کعبۂ مقصودم آنجا
جہانی محرم و من ماندہ محروم
ہمہ مقبول و من مردودم آنجا
چہ پرسی نادری چونی دراں کوی
گہی ناخوش گہی خوش بودم آنجا

ہمایوں کی شان میں ایک قصیدہ بھی کہا تھا ؎

المنۃ للہ کہ بہ جمعیت خاطر
باعیش نشستہ حریفان معاصر
در حضرت گل بلبل غائب شدہ حاضر
عریاں ز خزاں بود نگہ شاہد بستاں
مبنی است کہ شرح کتب فن ریاضی است
تصنیف متین تو ز ایجاز دوائر

"اسم کبار" کا یہ معمہ بھی ان کا ہی لکھا ہوا ہے ؎

مصحف است آں رو و آں خط آیت جور و جفاست
عارضش آں دلستاں بے بہرہ از خال وفاست

مولانا نادری کا انتقال ۹۶۶ھ میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات میر امانی کابلی نے لکھی ؎

وا حسرتا کہ نادری نکتہ داں برفت
آں نادری کہ داد سخن داد در جہاں
جستم برسم تعمیہ تاریخ فوت او
گفتا خرد کہ رفت یکے از سخن وراں

فارغی اسی زمانہ کے ایک اور شاعر شیخ ابوالواحد فارغی تھے۔ بڑے درویش مزاج اور نہایت شیریں کلام شاعر تھے۔

نمونہ کلام ؎

از بس کہ آں جفاجو آزار می نماید
اندک ترحم او بسیار می نماید

ان کا ایک "واسوخت" بھی مشہور ہے ؎

بحمد اللہ کہ وارستم ز عشق مست بدخوئی — کہ می افتاد چوں چشم خود از مستی بہر کوئی
چو ساغر از برائے جرعۂ لب بر لب ہر کس — عراحی وار بہر ساغرے مائل بہر سوئی

؎ اغیار دوش پیش تو بودند و فارغی
از دور ہا بر آتش حرماں سپند بود

؎ چو تیر خود کشی از سینہ ام بگذار پیکاں را
مرا دل دہ کہ تا مردانہ در راہت دہم جاں را

ان کی وفات ۹۴۰ھ میں ہوئی۔ آگرہ میں شیخ زین کی خانقاہ میں ان کے مقابل دفن ہوئے۔ یہ دونوں بڑے گہرے دوست تھے اور اتفاق دیکھو ایک ہی سال میں آگے پیچھے فوت ہوئے۔ کہتے ہیں جب دونوں ہندوستان کے ارادہ سے سفر کر رہے تھے تو ایسے قلاش تھے کہ ان کے پاس سوائے پرانی پوستین کے کچھ نہیں تھا۔ شیخ زین نے شیخ ابوالواحد سے کہا کہ میں کابل کے بازار میں یہ فروخت کرنے لے جاتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم وہاں آ کر مسخرہ پن نہ کرو۔ انھوں نے قبول کر لیا۔ بازار میں خریدار قیمت کے لیے الجھنے لگا وہ صرف پانچ اشرفی دے رہا تھا، شیخ زین زیادہ مانگ رہے تھے۔ شیخ ابوالواحد سے نہ رہا گیا، وہ اجنبی کی طرح وہاں پہنچے اور دونوں کے درمیان دلالی کرنے لگے۔ بڑی رد و کد کے بعد خریدار سے بولے "اے بے انصاف اس پارہ پارہ پوستین میں پانچ اشرفی کے تو فقط پسو اور جوئیں ہیں۔" ظاہر ہے معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ شیخ زین نے بگڑ کر کہا "ہم تو ایک روٹی ٹکڑے کے محتاج ہیں اور تم اس حالت میں بھی مسخرہ پن سے باز نہیں آتے۔"

جاہی ایک اور شاعر جاہی تیمانی تھے، تیمان بخارا کے متعلقات میں سے ہے اس جگہ کی مناسبت سے تیمانی کہلاتے تھے۔ جس زمانہ میں ہمایوں کابل میں ہندوستان پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا وہ دربار شاہی میں پہنچے اور الطاف شاہانہ سے معزز ہوئے۔ جس وقت ہمایوں نے کابل میں شاہ محمد خاں شاپور کو بطور نگران حاکم بنایا تھا اس نے لوگوں کو بڑی ایذائیں دی تھیں اس کے معتوب افراد میں جاہی بھی تھے۔ ملا جاہی نے شاپور کی ہجو میں ایک ترکیب بند لکھا تھا اس میں شاپور کی بیٹی کو چھوڑ کر جو ہمایوں کے نکاح میں تھی اس کے خاندان کے تمام مردوں اور عورتوں پر بڑی فحش پھبتیاں ہیں۔ بادشاہ بھی چونکہ شاپور سے ناراض ہو گیا تھا اس لیے اس نے بھرے دربار میں شاپور کے سامنے ہی

ملا کی زبان سے یہ ہجو سُنی اور اس پر بہت ہنسا۔ ملا کو شاپور سے معقول صلہ بھی دلوایا۔ فحش اشعار کو چھوڑ کر صرف ایک بند یہاں درج کیا جاتا ہے۔

شاعر شاہ ہمایونم و خاک درگہ میزند کوکبۂ شاعریم طعنہ بمہ
خسرو شعرم و ابیات خوشم خیل و سپہ دیدم از محبۂ زنی ظلم نہ جیرم ونہ گنہ
پارۂ کاغذ از ہذیان گشتہ سیہ سوئی ہجوش اگر اندیشہ شود روئی برہ
غرض آنست کہ ایں خر عنقاں ابلہ عزت و حرمت ایں طائفہ دارند نگہ
وائی آنکس کہ بہ خیل شعر البستیزد ہر کہ باما بہ ستیزد بہ بلا بہ ستیزد

اس مصرع کی ہمایوں نے اصلاح کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کیوں نہیں کہتے:

"ہر کہ با ما بہ ستیزد با خدا بہ ستیزد"

جاہی کے اور شعر ہیں ؎

تا بودہ ایم عاشق و بدنام بودہ ایم
اما ز عاشقاں باندام بودہ ایم

؎ خوبرویاں ہمہ بے مہر و وفائید شما با اسیراں زپئے جور و جفائید شما
وعدہ کردید وفا طور دروغی گفتید راست گوئید کہ ایں طور چرا ئید شما
ما دریں شہر نہ از بہر شما رسوائیم ہمہ جا باعث رسوائی مائید شما
چند پرسید کہ مقصود تو در عالم چیست راست گویم کہ شمائید شمائید شما
جاہی از دست شما جاں نتواند بروں کہ بلائے ز بلاہائے خدائید شما

؎ دوش ماہ عید شد بر شکل معقل آشکار کو نجار روزہ بود آئینہ دل را غبار
خویش را در سلک خدام تو می خواہد فلک زاں کماں حلقہ آوردہ است بہر زہ گذار

واضح رہے، جاہی نے دوسرا شعر "خویش را در سلک الخ" نظام استرآبادی کے اس قصیدہ میں سے لیا ہے ؎

شب نجوم از مجمع مردم نشاں آوردہ اند وز مہ نو تازہ حرفی درمیاں آوردہ اند
بر سر پیہ سلطنت بنشستہ شاہ زنگبار از برائے پیشکش انجم کماں آوردہ اند

ان کی ایک رباعی ہے:

خط گرد رخت باعث حیرانی ماست زلفت سبب بے سر و سامانی ماست
آں کاکل مشکیں پے دیوانی ماست اینہا ہمہ اسباب پریشانی ماست

؎ بیا کہ بہر تبق بازی تو ساخت فلک
ز آفتاب کدوی زر از ہلال کجاب

اسی قافیہ میں ایک دوسری بحر میں بیرم خاں کا مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے

عقد کباب زبود خدنگ تو از کجاب
کرد از ہلال صورت پروین شہاب چک

مذکورہ دونوں مطلعوں کا ماخذ ثناری تونی کے مشہور قصیدہ کا مطلع ہے۔ جامی کو ایک غلام نے ۹۵۶ھ میں پیالہ میں زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا۔

حیدر تونی دور ہمایونی کا ایک شاعر حیدر تونیائی بھی تھا۔ یہ بڑا صاحب علم وفضل اور فن موسیقی میں ماہر تھا۔ اس کی زیادہ تر زندگی ہندوستان ہی میں بسر ہوئی۔ اس کا یہ مطلع جو اس نے امام شہید کی تعزیت میں کہا تھا، عاشورہ کے دنوں میں اکثر مجالس میں پڑھا جاتا ہے۔

ماہ محرم آمد و شد گریہ فرض عین
گریم خون بیاد لب تشنۂ حسین

ہمایوں کے عہد کے ملک المنجمین سے متعلق اس کی ایک ہجو بھی بڑی مشہور اور نوادرات کلام میں سے ہے۔ حیدر کے چند شعر ہیں

دلا چوں غمش مہربانی نداری
بجز دردش آرام جانی نداری

رباعی: آنی کہ ز رشک مہر و ماہت گویند — مہرویاں را خیل و سپاہت گویند
تو لایق آنی کہ بدیں حسن و جمال — شاہان زمانہ پادشاہت گویند
ہر لحظہ نازنین مرا ناز دیگر است — نازش بجان کشم چکنم ناز پرور است
با غنچہ نسبت دہن یار چوں کنم — تنگ است غنچہ لیک سخن جائی دیگر است

حیدر تونی کا ایک لڑکا نہایت بزدل تھا۔ وہ ۹۸۵ھ میں اکبر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ایک دن وہ اپنی کشتی میں بیٹھنے اور خوفزدہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس وقت بھی خوف اور دہشت کے آثار اس کی حرکتوں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا "تم کو حج پہ جانے سے پشیمانی ہوئی ہوگی؟ اس کے ساتھ میں نے وہ شعر پڑھا جو قدسی شاعر کے لیے اس کے حریفوں نے کہا تھا

از رنج رہ بادیہ و خار مغیلاں
از آمدن کعبہ پشیمان شدہ باش

اس نے چھوٹتے ہی جواب دیا "ہاں"۔ یہ سن کر بادشاہ نے فرمایا "کعبہ کو جانے سے نہیں بلکہ کشتی میں بیٹھنے پر پشیمان ہوا ہوگا"۔ اس وقت بادشاہ کے اشارہ سے متین خاں نقال نے ایسی صورت بنائی جیسے اسے باؤلے کتے نے کاٹا ہے اور کتے کی طرح بھونکتا ہوا حیدر تونی کے لڑکے پر لپکا وہ جو ہراساں ہو کر بھاگا تو اس کی دستار ایک طرف اور جوتے

ایک طرف اور خود دہشت سے لڑکھڑا کر لوٹ پوٹ بس ساری مجلس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ جب اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو بڑا شرمندہ ہوا۔ بادشاہ نے اسے بڑی تسلی دی۔ بعد میں وہ ہندوستان میں نہ رہ سکا اور یہاں سے چلا گیا۔

طاہر دکنی

ایک اور شاعر طاہر خواندی دکنی بھی تھا۔ یہ شاہ جعفر کا چھوٹا بھائی تھا۔ عراق کے علمائے سلف نے خواندیوں کے نسب کے متعلق بڑی جرح و تنقید کی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک محضر بھی مرتب کیا گیا تھا۔ اس پر مخالفت و موافقت میں رائیں لکھی گئی تھیں۔ اس کا تذکرہ ابن اثیر جزری کی "کامل التواریخ" اور قاضی یحییٰ قزوینی کی "لب التاریخ" میں موجود ہے۔ طاہر اپنے آپ کو شاہ طہماسپ کا رشتہ دار بتایا کرتا تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے رافضی مشہور تھا۔ اسی بنا پر اسے میر جمال الدین صدر استرآبادی نے بڑی اذیت دی تھی اور وہ تنگ آ کر دکن کو جو بھگوڑوں کا ٹھکانا تھا چلا گیا، وہاں دکن کے حاکم نظام شاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور جلد ہی وہ اچھے مراتب پر ترقی کر گیا۔ آخر میں جملۃ الملکی کے عہدہ پر مامور ہوا۔ دکن میں اس کی وجہ سے شیعہ مذہب کا رواج ہوا۔

اتفاق سے نظام شاہ سخت بیمار ہو گیا۔ طاہر کے بھائی شاہ جعفر نے کوئی عمل پڑھ کر اسے صحت یاب کر دیا اور یہ اس کی بڑی کرامت سمجھی گئی۔ اسی شاہ جعفر کے بہکانے سے نظام شاہ نے سُنّی مذہب اور مہدوی مسلک کو چھوڑ کر شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ ان دونوں رافضی بھائیوں کی وجہ سے دکن کے اکثر بزرگوں کو بڑی ایذائیں برداشت کرنی پڑیں۔ تنگ آ کر سُنّی دکن سے نکلتے چلے گئے اور وہاں شیعوں کی کثرت ہو گئی۔

شاہ طاہر نے انوری کے قصیدہ پر ایک قصیدہ ہمایوں کی طرف میں کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

محمل مہر چو آید بہ شبستان حمل — لالہ فانوس برافروزد و نرگس مشعل

کوہ از درد سر بہمن وو رست کنوں — شوید از ناصیہ اش ابر بہاری صندل

اس نے منقبت میں ایک قصیدہ بھی کہا تھا، اس میں "گریز" اور قصیدہ کا عام اسلوب حضرت امیرؓ کے مناسب حال نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا مطلع ہے ؎

باز وقت است کہ بر طبق تقاضائے فلک
افگند بر سر ایوان چمن گل توشک

اس کا یہ مطلع بہت مشہور ہے ؎

در غم آباد جہاں عیش از دل ناشاد رفت
خو بہ غم کردیم چنداں کہ عیش از یاد رفت

؎ ما بجرم عشق بدنامیم و زاہد از ریا — ہر دو بدنامیم اما ما کجا و او کجا

؎ بیروں میا کہ شہرۂ ایام می شوی — ما کشتہ می شویم و تو بدنام می شوی

اس کا ایک بڑا اچھا قصیدہ ہے ؎

ہر آنکس کہ بر کام گیتی نہد دل
بنزدیک اہلِ خرد نیست عاقل

شاہ طاہر ۹۵۲ھ میں دکن ہی میں فوت ہوا، اس کا مادۂ تاریخ ہے۔

"تابع اہل بیت"

خواجہ ایوب اسی دور ہمایونی کا ایک شاعر خواجہ ایوب ابن خواجہ ابوالبرکات ہے۔ یہ ماوراءالنہری بزرگوں کی اولاد میں سے تھا۔ وہ اور اس کا باپ دونوں علم و فضل کے لحاظ سے بھی بڑے عالی مرتبہ تھے لیکن باپ عراق و خراسان میں اور بیٹا کابل و ہندوستان میں، دونوں بے قیدی اور رندمشربی میں مشہور تھے۔ اس منتخب میں ان کی تفصیلی حالات کی گنجائش نہیں۔

ایک مرتبہ خواجہ ابوالبرکات نے اپنے ہم عصروں کو یہ مطلع سنایا ؎

خشک شد کشتِ امید و تازہ شد قحط و فنا
زآتشِ دل یا و را ابر چشم ما باراں نماند

لوگوں نے اعتراض کیا کہ دوسرے مصرع میں لفظ "یا" بے معنی ہے، یہاں "کا" محل ہے۔ اس نے فی البدیہہ جواب میں یہ قطعہ کہا ؎

ہرچہ آید بہ پیش اہل نظر بگمان خطاش خط نکنند
نقطہا گر فتند زیر و زبر عاقلاں پیر و نقط نکنند
یا بخوانند و نیک فکر کنند یا بخوانند تا غلط نکنند

خواجہ ایوب نے سلمان ساوجی کی زمین میں ایک قطعہ کہا ہے ؎

تب غم دارم ز درد سر ہجراں بر سر آمدہ جانم بلب و نا مدہ جاناں بر سر
تا گرفت آتش دل در تن من چون فانوس دامنم چاک شد و چاک گریباں بر سر

قاضی نیشاپور کی ہجو میں کیے ہوئے قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں ؎

خلاف شرع پیمبر نوشت فقہ دیگر کہ ہیچ زاں نبود در کتاب ہا مسطور
عسل حرام نوشت و شراب کرد حلال کہ ایں عصارۂ تاکست و آں قئے زنبور
زنی کہ شکوۂ شوہر بہ پیش قاضی برد کہ حظ نفس من از وی نمی رسد بظہور
جواب داد کہ گر او قوی ضعیف شد است رواں بود کہ درآرد بجائے خو د مزدور

خواجہ اپنے اشعار میں کبھی ایوب اور کبھی فراقی تخلص کرتا ہے۔ یہ غزل اسی کی ہے ؎

اے شاخ گل کہ ہمچو سہی قد کشیدۂ برگرد لب خطی ز زمرد کشیدۂ
قدت بر آمدۂ چو الف مد ظلہ وز ابروان فراز الف مد کشیدۂ

برحرفِ دیگراں زدہ قرعۂ قبول | برحرفِ عاشقاں قلم رد کشیدہ
تشویش میکشی مکش اے نقشبند چین | ناید چو چشم ور نقش اگر صد کشیدہ
از دولتِ وصال فراقی طمع مبر | جور و جفائے یار چو بے حد کشیدہ

خواجہ ایوب کی چال ڈھال، وضع قطع ناپسندیدہ تھی لیکن ہمایوں اس کے حال پر بڑا مہربان رہتا تھا اور اکثر اس کی ہم نشینی کا طالب رہتا تھا۔ اپنے خاندان کی کسی بیگم کے ساتھ اس کا نکاح بھی کر دیا تھا لیکن خواجہ کی حالت نہ سدھرنا تھی نہ سدھری، بلکہ اس کا نتیجہ کچھ خراب ہی نکلا۔ ایک بار بادشاہ کی محفل میں خواجہ نے ایک ایسی ناشائستہ حرکت کی کہ اسے بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمایوں نے اغماض ہی برتا صرف اتنا کہا "اے خواجہ یہ کیا حرکت تھی"!

خواجہ ایوب نے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا اور سامان سفر درست کر کے سب سے رخصت ہو کر کشتی میں سوار بھی ہو گیا۔ رفیقوں سے پوچھا "مکہ جانے سے بھلا کیا فائدہ ہے"؟ انھوں نے کہا "گناہوں سے آدمی پاک ہو جاتا ہے" یہ سن کر اس نے کہا "اکٹھے ہی گناہ کر کے حج کریں گے تاکہ سارے گناہوں سے پاک ہو جائیں"! یہ کہہ کر کشتی سے اتر گیا، حج کا ارادہ چھوڑ دیا اور کھلم کھلا فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا۔

سلطان بہادر گجراتی نے اس کی خوش طبعی کی وجہ سے ایک اشرفی روزانہ اس کے خرچ کے لیے مقرر کر دی تھی۔ ایک دن سلطان احمد آباد کے بازار سے گزر رہا تھا۔ خواجہ کو ترپولیہ کی مسجد میں دیکھ کر رک گیا اور اسے مخاطب کر کے پوچھا "اب تو آپ کی گزر بسر اچھی طرح ہو رہی ہے"؟ خواجہ نے جواب دیا "کیا پوچھتے ہو تم نے جو کچھ میرا روزینہ مقرر کیا ہے وہ تو میرے ایک (عضو) کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا"۔ اس گستاخانہ اور سخت جواب کے باوجود سلطان بہادر نے اس کا روزینہ دگنا کر دیا۔

اسی زمانہ میں شاہ طاہر دکنی نظام شاہ کا سفیر بن کر بڑے ساز و سامان اور شاندار جلوس کے ساتھ گجرات آیا ہوا تھا۔ اس نے خواجہ کی بڑی تعریف سنی تھی۔ اس لیے خود اس کے گھر ملنے گیا۔ خواجہ کے گھر کا یہ حال کہ ٹوٹا آبخورہ اور پھٹا بوریا تک نہ تھا۔ شاہ طاہر خواجہ کی صحبت سے نہایت خوش ہوا، اسے اپنے شعر بھی سنائے۔ دوسرے دن اس نے اپنے مقام پر خواجہ کی دعوت کی اور اسے دینے کے لیے خلعت گھوڑا اور کچھ زر نقد بھی اٹھا رکھا۔ اس دن باتوں باتوں میں مذہبی مسائل بھی چھڑ گئے۔

خواجہ نے شاہ طاہر سے پوچھا "شیعہ لوگ صحابہ کی شان میں گستاخیاں کیوں کرتے ہیں"؟

شاہ طاہر نے جواب دیا "ہمارے مجتہدوں نے صحابہ پر تبرا کرنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے"!

خواجہ سے کہاں رہا جاتا جھٹ سے کہا "جس ایمان کا جز لعن ہو اس ایمان پر لعنت"!

شاہ طاہر کو خواجہ کی بات ناگوار گزری اور وہ مجلس اسی افراتفری میں ختم ہو گئی اور اس نے خواجہ کو جو کچھ دینا چاہا تھا نہ دیا۔

کچھ عرصہ بعد خواجہ بھی دکن چلا گیا تھا، وہاں نظام شاہ سے ملاقات کی۔ نظام شاہ نے اس کی بڑی خاطر کی

اور اس کے لیے ضروری ساز و سامان بھی مہیا کر کے بھیجا لیکن خواجہ کی بدخلقی ایسی تھی کہ وہ کہیں ٹک نہیں سکتا تھا چنانچہ وہ دکن میں بھی زیادہ عرصہ نہ رہ سکا۔

کچھ عرصہ بعد ہی خواجہ کا انتقال ہو گیا۔

ضمیمہ:۔ بدایونی نے عہد ہمایوں کے ایک فاضل شخص غیاث الدین خواند امیر کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ روضۃ الصفا کے مصنف میر خواند کا نواسہ تھا۔ اس کا باپ بدخشاں کے والی سلطان محمود کا وزیر تھا۔ اس کا نام خواجہ ہمام الدین احمد ہے خواند امیر ہرات میں پیدا ہوا علمی لیاقت و صلاحیت کی وجہ سے جلد ہی میر علی شیر ہرات کے وزیر کی بارگاہ میں باریاب ہوا، طب اور فن انشاء پر اس کی کتابیں مشہور ہیں۔

جلد دوم

عہد اکبری

سببِ تصنیف منتخب التواریخ

فنِ تاریخ کی اہمیت

حمد و نعت کے بعد اس بات کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ایک باوقعت علم اور لطیف فن کا نام ہے جو صاحبانِ علم و خبر کے لیے سرمایۂ عبرت اور وارثانِ خرد و ہوش کے لیے ایک دوررس تجربہ کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ اربابِ قلم نے ابتدائے آفرینش سے زمانۂ حال تک اس فن کے لیے زحمتیں برداشت کی ہیں اور معتبر تصانیف اور مبسوط کتابیں وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ یہ علمی ذخیرہ فنِ تاریخ کی اہمیت اور فضیلت پر معقول دلائل فراہم کرتا ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے سلسلہ میں ہم ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتے جو عقیدہ کے کمزور اور شکوک و اوہام کے شکار ہیں اور جن کے متعلق یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ تاریخ کے مطالعہ سے کتاب و سنت کی سیدھی راہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ جو فطرتاً بے دینی کی طرف میلان رکھتے ہیں، تاریخ ہی کیا خود کلامِ الٰہی کا مطالعہ بھی ان کو ابدی شقاوت میں مبتلا کر دیتا ہے حالانکہ کلامِ پاک شفا اور رحمت ہے۔

"وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ"

ہمارا خطاب تو ان لوگوں سے ہے جو سلامتیٔ طبع جودتِ ذہن اور شیوۂ انصاف سے مالا مال ہیں، جو لوگ منکرِ شرع ہیں، ہماری نگاہ میں وہ نہ تو قابلِ اعتبار ہیں نہ اہلِ بصیرت۔

امام بخاری اور قاضی بیضاوی سے لے کر اب تک کے اکثر علمائے حدیث و تفسیر اس علم کی تحریر و تدوین سے برابر دلچسپی رکھتے آئے ہیں اور ان کے قول و عمل کو مشرق سے مغرب تک امت کے تمام گروہوں میں مستند تسلیم کیا گیا ہے، البتہ ایک مختصر سا گروہ ان بدعت پسند اشخاص کا ضرور رہا ہے جس نے اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے حقائق و واقعات میں تحریف و تخلیط سے کام لیا اور واقعات کی صحیح توجیہہ و تاویل کے بجائے اس کی نظر ہمیشہ صحابہ کرام کی ہم عصرانہ چشمک زنی پر رہی اور وہ صحابہ کے اس اختلاف کو بھی اپنے اختلافات پر محمول کر کے سادہ لوح اشخاص کے بہکانے اور اپنی دنیا بنانے کی فکر میں لگا رہا۔ مثل مشہور ہے:

"اگر کوا کسی قوم کی رہبری کرنے لگے تو اس قوم کا ہلاک ہو جانا یقینی ہے۔"

وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ یقین سے سرفراز کیا ہے اور توفیقِ الٰہی ان کے ہمراہ رہتی ہے، اس عالم کون و فساد میں رونما ہونے والے ہر سانحہ اور حادثہ کو صانعِ قدرت کی حکمت و قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم نظرِ تحقیق سے کام لیں تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ یہ دنیا بذاتِ خود ایک قدیم صحیفہ ہے جس کا آغاز و انجام ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس کا ہر ورق افرادِ انسانی پر گزرنے والے احوال و حوادث کا مرقع اور ان لوگوں کے کارناموں کا مجموعہ ہے جن کے ہاتھوں میں مخلوقِ خدا کی باگ ڈور رہی ہے۔

منتخب التواریخ کس طرح لکھی گئی

علم تاریخ کی اسی اہمیت کے پیش نظر راقم سطور داعیِ اسلام عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نے کشمیر کی تاریخ[1] کے انتخاب سے فارغ ہونے کے بعد شاہانِ دہلی کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ واضح رہے کشمیر کی تاریخ کو اکبر بادشاہ کے حکم پر ہندوستان کے ایک فاضل شخص نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا مجھے ایک زمانہ سے خیال تھا اور میں چاہتا تھا کہ ابتدائے اسلام سے اس زمانہ تک کے حالات اختصار کے ساتھ ضبطِ تحریر میں آجائیں تاکہ ایک ایسا تاریخی مجموعہ بن جائے جس میں ہر بادشاہ کا اجمالاً تذکرہ ہو جو صاحبانِ علم کے لیے ایک "اشاریہ" کا کام دے سکے۔ میری آرزو تو بس یہی ہے کہ اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے عبرت حاصل کریں اور ان کی نگاہیں اس سرائے فانی کے آئینہ میں عالم ملکوت کی جھلک کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔

لیکن بدقسمتی سے میں اپنی مالی الجھنوں اور احباب و اقارب سے جدائی کے باعث ایسا پریشان خاطر رہا کہ یہ کام برابر ٹلتا ہی رہا یہاں تک کہ ایک مخیر دولت مند نے جسے میرے ساتھ تعلق خاطر تھا اور مجھے بھی اس سے وابستگی تھی، تاریخ نظامی کی تصنیف سے جو ایک ضخیم کتاب ہے دلچسپی لی۔ افسوس کہ اس مخلص دوست کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اسی زمانہ میں مجھے کچھ سکون و یکسوئی حاصل ہوئی اور مذکورہ ارادہ از سرِ نو تازہ ہو گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس اہم کام کو شروع کر دیا۔

مصنف کے ماخذ

پیش نظر تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لیے میں نے شاہانِ ہند کے کچھ حالات تو تاریخ مبارک شاہی[2] اور نظام التواریخ نظامی سے لیے ہیں اور کچھ اپنی معلومات کی بنا پر اضافہ کیے ہیں۔ ان حالات کو

---

[1] تاریخ کشمیر: جس تاریخ کا بدایونی ذکر کر رہا ہے وہ سنسکرت کی ایک منظوم تاریخ ہے اس کا نام "راج ترنگی" اور مصنف کا نام پنڈت کلھنا اس کو ابوالفضل نے غالباً پنڈت کلیان برہمن لکھا ہے۔ کلیان کے باپ کا نام چنپک اور سکونت پرہاسپور (کشمیر) تھی۔ سب سے پہلے یہ تاریخ ۸۴۳ھ میں سلطان زین العابدین والی کشمیر کے حکم سے شائع ہوئی۔ اکبر کے حکم سے ملا شاہ محمد شاہ آبادی (کشمیر) نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۹۹۹ھ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے اس ترجمہ کی نظر ثانی اور ترتیب کا کام کیا۔ یہ ترجمہ دستیاب نہیں ہوتا۔ ایک ہندو اہل قلم ٹھاکر اچھیر چند نے بھی "راج ترنگی" کا ترجمہ کیا تھا جسے سیوک اسٹیم پریس لاہور نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا تھا۔ انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے "کلہن ذات کا برہمن تھا، شیوجی کا پجاری ہونے کے باوجود وہ بدھ مت سے بھی عقیدت رکھتا تھا"۔ راج ترنگی ۱۱۴۹ء میں مرتب کی گئی، مصنف کی ولادت غالباً بارھویں صدی کے آغاز ہی میں ہوئی۔ مصنف کا باپ راجہ پرش کے دربار میں ۱۰۸۹ء سے ۱۱۰۱ء تک ایک معزز عہدہ پر مامور رہا اور ۱۱۳۶ء تک زندہ رہا۔ مصنف بارھویں صدی کے آخر تک زندہ رہا۔ راج ترنگی شاعری کا بہترین نمونہ ہے اور تاریخی حیثیت سے کشمیر کے حالات کا مرقع۔ قدیم فرمانرواؤں کے عروج و زوال کا آئینہ ہے۔ کشمیر پر جو قدیم تاریخیں ملتی ہیں ان میں ایک "واقعات کشمیر" ہے اس میں شروع سے ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء تک کے حالات ہیں یہ بھی غالباً راج ترنگی سے ہی ماخوذ ہے جسے سنسکرت سے قاری حسین نے فارسی میں مرتب کیا اس میں کشمیر کے شاعروں اور مشاہیر کا تذکرہ ایک مستقل اضافہ ہے اس کو "واقعات کشمیر" کے نام سے محمد اعظم ولد خیر الزماں خاں نے مرتب کیا تھا۔ مذکورہ اضافہ محمد اعظم کا ہے۔ ایک اور تاریخ نرائن کول عاجز کشمیری کی ہے اس کا نام "تاریخ کشمیر" ہے، اس کا قدیم نسخہ جہانگیری امیر ملک حیدر نے جو ۱۰۲۸ھ سفر کشمیر کے موقع پر جہانگیر کے ساتھ تھا دیوان کشمیر عارف خاں کی فرمایش پر مرتب کیا تھا، سنسکرت اور فارسی کی تاریخوں سے مواد جمع کر لیا تھا، لیکن وہ اس کی تکمیل نہیں کر سکا۔ کول کا دعویٰ ہے کہ یہ ادھورا مواد اس کے ہاتھ آگیا اور اس نے اسی سے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔ کول کے حالات نہیں ملتے۔

[2] تاریخ مبارک شاہی میں سلطان معز الدین محمد بن سام کی فتوحات سے ۸۳۸ھ تک ۲۷ بادشاہوں کا سن وار تذکرہ ہے۔ مبارک شاہی کا مصنف ملا یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی ہے۔ اس تاریخ کا ابتدائی حصہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے جلوس تک مختلف تاریخوں سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد تالیف کتاب کے زمانہ تک پچاسی سال کے واقعات مصنف نے عینی مشاہدات اور معتبر روایات پر مرتب کیے ہیں۔ تاریخ نظامی، منتخب التواریخ فرشتہ اور دوسرے مورخین نے اسی کتاب سے بیشتر واقعات اخذ کیے ہیں۔

مبارک شاہی کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے شمس العلماء مولانا محمد ہدایت حسین کے زیر اہتمام ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا۔

لکھتے ہوئے میں نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے اور عبارتی تکلفات اور استعارہ بازی میں اپنے قلم کو الجھنے نہیں دیا۔ اس مجموعہ کا نام "منتخب التواریخ" رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تالیف جو صرف شاہانِ اسلام کے بقائے نام اور دنیا میں اپنی ایک یادگار چھوڑ جانے کے خیال سے مرتب کی گئی ہے، مولف کی مغفرت کا ذریعہ ثابت ہو گی۔

میری تمام ترنیت تو راست بیانی پر مرکوز ہے پھر بھی اگر مجھ سے کوئی سہو رہ گیا ہو تو میں اللہ تعالیٰ سے عفو کا امیدوار ہوں؎

بہ بدگفتن زبان من مگرداں ۔۔۔ زبان من زیان من مگرداں

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ

تخت نشینی

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بیرم خاں خانخاناں کے مشورہ اور تائید سے دوسری[1] ماہ ربیع الاول ۹۶۳ھ میں باغ کلانور میں تخت نشین ہوا اور سرحد کے امرا کو اس نے تسلی آمیز فرامین بھیجے۔ دہلی میں بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اکبر کی تاریخ جلوس "از بہر شہزادہ اشرف" سے نکلتی ہے۔ ایک اور تاریخ ہے ؎

جلال الدین محمد اکبر آں شہزادۂ دوراں ۔۔۔ بتاریخ پدر می گفت شاہنشاہ دورانم

"کام بخش" بھی اس کے جلوس کا مادۂ تاریخ ہے۔

تخت نشینی سے پہلے ہی بیرم خاں نے پیر محمد خاں شروانی کو جو ایک لشکر لے کر سکندر کا تعاقب کرتا ہوا کوہ سوالک میں موضع دھمیری تک پہنچ گیا تھا، کسی نہ کسی طرح حیلے بہانے کر کے واپس بلا لیا۔ غرض یہ تھی کہ ہمایوں کے مرنے کی خبر مشہور نہ ہونے پائے۔

ابوالمعالی کی سرکشی

تخت نشینی کے موقع پر امرائے دربار نے ابوالمعالی کو بھی شرکت کے لیے بلایا۔ اس نے کہلوا دیا کہ مجھے اس وقت کچھ عذر ہے اس لیے میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ دوبارہ کہلوایا گیا کہ ایک خاص مشورہ درپیش ہے اور اس میں تمھاری رائے نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اس نے عذر معذرت کی اور کچھ ایسے مطالبات کیے جن کا پورا کرنا محال تھا۔ مصلحت وقت کے پیش نظر بیرام خاں نے اس کے تمام مطالبے قبول کر لیے، لیکن جب وہ دربار میں آیا تو بیرم خاں کے اشارہ سے تولک خاں قورچی نے جو ایک طاقت ور پہلوان تھا (اب تو وہ ایسا ضعیف ہو گیا ہے کہ تار عنکبوت نظر آتا ہے) اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتا لیکن اکبر نے یہ کہہ کر کہ "پہلے ہی دن کسی بے گناہ کا خون مناسب نہیں"۔ اس کی جان بچائی البتہ اسے قید کر کے لاہور بھیج[2] دیا۔

---

[1] جلوس اکبر: جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے "میرے باپ نے چودہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر جلوس فرمایا تھا" بیرم خاں نے اس صوبے کے امیروں کو جمع کر کے نیک ساعت میں مضافات لاہور پرگنہ کلانور میں تخت سلطنت پر بٹھایا"۔

تاریخ جلوس: یا تو کاتب کی غلطی ہے یا مصنف سے سہو ہوا ہے کیوں کہ ہمایوں ۷ ربیع الاول کو بالاخانہ سے گرا تھا اور ۱۵ ربیع الاول کو اس کی وفات ہوئی۔ اس صورت میں دوسری ربیع الاول کو اکبر کس طرح تخت پر بیٹھ سکتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ غلطی طبقات اکبری (مطبوعہ نولکشور ص ۲۴۲) میں بھی ہے اس میں دوم ربیع الاول لکھا ہوا ہے لیکن نظام الدین احمد ہروی نے دوسری جگہ تخت نشینی کے جشن کی تاریخ ۲ ربیع الثانی لکھی ہے، اس لیے ایک خیال یہ ہے کہ یہی تاریخ صحیح ہوگی۔ "ماثر رحیمی" کے مصنف نے "دوپہر کا وقت جمعہ کا دن، ربیع الثانی سنہ ۹۶۳ھ لکھا ہے" (دیکھو ص ۶۴۵) دوسرے بیانات سے ماثر رحیمی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لیے اکبر کی تاریخ جلوس ۲ ربیع الاول کے بجائے، ۲ ربیع الثانی یا زیادہ سے زیادہ دوسری ربیع الثانی ہو سکتی ہے۔

[2] ابوالمعالی کی گرفتاری: "اقبال نامہ" میں معتمد خاں نے لکھا ہے کہ مرزا عزیز کوکہ کو خاندان شاہی کے تمام اسرار سے (باقی اگلے صفحہ پر)

بیرم خاں کا قصیدہ ابو المعالی کاشغر کا رہنے والا اور سید زادہ تھا۔ نہایت بہادر اور خوب صورت شخص تھا۔ اس سے ہمایوں کو بڑی محبت تھی چنانچہ اسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا۔ بیرم خاں نے صنعت توشیح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ عظیم اور قدیم تھا۔ اس قصیدہ میں چوبیس شعر تھے غضب یہ تھی کہ ہر شعر کے اول مصرع کا ایک ایک حرف لیا جائے تو اس سے "حضرت محمد ہمایوں بادشاہ" بن جاتا تھا اور اگر ہر شعر کے دوسرے مصرع کا ایک ایک حرف لیں تو "شاہزادہ جلال الدین محمد اکبر" نکلتا تھا ہر شعر کے اول مصرع کا آخری حرف جمع کر لیں تو "میرزا شاہ ابو المعالی" کا نام بن جاتا ہے اگر اس کے قافیہ کے سارے میم "جمع کر لیے جائیں، سنہ ۹۶۱ھ قصیدہ کے نظم کرنے کی تاریخ نکل آتی ہے۔

ابو المعالی کی جان بخشی ابو المعالی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جس زمانہ میں ہمایوں دوسری مرتبہ قندھار آیا ہوا تھا، ابو المعالی نے نشہ کی حالت میں ایک تبرا کرنے والے رافضی کو بحالت غضب میں قتل کر دیا تھا۔ مقتول کے وارثوں نے بادشاہ کے پاس دعویٰ کیا۔ ہمایوں نے ابو المعالی کو طلب کیا۔ ابو المعالی اس کر و فر کے ساتھ کہ سیاہ مخمل کی پوشاک نیب تن تھی جس کا استر سُرخ تھا۔ اور وہی تلوار دامن میں چھپی ہوئی تھی جس سے اس نے یہ خون کیا تھا، مستی سے جھومتا ہوا دربار میں حاضر ہوا اور اس جرم سے صاف انکار کر دیا۔ بیرم خاں نے اسی وقت یہ شعر پڑھا ؎

نشانِ شب رواں دارد سرِ زلفِ پریشانش
دلیل روشن ست اینک چراغ زیرِ دامانش

ہمایوں کو یہ شعر بہت پسند آیا۔ جرم چونکہ بخوبی ثابت نہیں ہو سکا اس لیے ابو المعالی کی جان بچ گئی اور بیچارے مقتول کا خون رائیگاں گیا۔

ابو المعالی کا فرار ابو المعالی لاہور کے قید خانہ سے بھاگ کر کمال خاں کھکر کے پاس چلا گیا۔ وہ علاقہ اس زمانہ میں کمال خاں کے چچا آدم کھکر کے قبضہ میں تھا۔ اس نے ابو المعالی کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک بڑی فوج تیار کر کے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

ابو المعالی یہ فوج لے کر گیا۔ ۹۶۵ھ میں کشمیر کے حاکم غازی خاں چک سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں ابو المعالی بھیس بدل کر دیپال پور چلا گیا اور وہاں بہادر خاں کے ایک افسر تولک نامی کے پاس پناہ لی۔ تولک نے اسے اپنے گھر میں چھپا لیا۔ ایک دن تولک کا اس کی بیوی سے جھگڑا ہو گیا اس کی بیوی نے غصہ میں بہادر خاں کو جا کر بتا دیا کہ "تولک نے ابو المعالی کو گھر میں چھپا رکھا ہے اور دونوں بغاوت کی سازش کر رہے ہیں"۔ بہادر خاں اسی وقت سوار ہو کر آیا، تولک کو قتل کر دیا اور ابو المعالی کو گرفتار کر کے بیرم خاں کے پاس بھیج دیا۔ بیرم خاں نے ابو المعالی کو ولی بیگ ترکمان کی تحویل میں بھکر روانہ کر دیا۔ ولی بیگ راستہ بھر اس کو ایذا دیتا رہا اور

(بقیہ صفحہ سابقہ) آگاہی تھی مرزا نے مجھ سے شاہ کی گرفتاری کا جو حال بیان کیا وہ یہ ہے: شاہ ابو المعالی اپنے ایک حسین خدمت گار پر بڑے فریفتہ تھے۔ جب شاہ دربار میں نہ آئے تو بیرم خاں نے جو بڑی چلتی رقم تھا اس خادم کو غائب کرا دیا۔ دو تین دن بعد شاہ کو کہلوایا کہ تمہارے خادم کو ہم نے ڈھونڈھ نکالا ہے بادشاہ اسے خود تمہارے حوالہ کرنا چاہتے ہیں شاہ جدائی میں بے قرار تھے بے سوچے چلے گئے اکبر نے اس سپاہی زادہ کو بلا کر سپرد کر دیا اور کہا تمہاری تلوار جس طرح اس کے ہاتھ میں رہتی تھی اب بھی اس کو دے دو۔ شاہ نے اپنے محافظ سے تلوار لے کر اسے دے دی۔ اس عرصہ میں دسترخوان بچھا شاہ نے ہاتھ دھونے کے لیے سیلچی پر ہاتھ بڑھائے تھے کہ تولک خاں نے جو توپ خانہ کا افسر تھا پیچھے سے آ کر شاہ کی مشکیں باندھ لیں۔

وہاں سے گجرات روانہ کر دیا اور علی قلی خاں کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔ بیرم خاں نے علی قلی خاں کو فرمان بھیجا کہ ابوالمعالی کو قید کر کے آگرہ روانہ کر دیا جائے۔ جب ابوالمعالی آگرہ پہنچ گیا تو خود بیرم خاں کے بعض قضیے پیدا ہو گئے اور اکبر اس سے بدگمان ہو گیا۔ بیرام خاں نے بادشاہ کی بدگمانی رفع کرنے کے لیے ابوالمعالی کو چند روز بیانہ کے قلعہ میں قید کر دیا اور جب خود حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ مگر کچھ دن بعد ہی ابوالمعالی اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر کے پاس لوٹ آیا لیکن غرور و تکبّر کی وجہ سے اس نے گھوڑے پہ بیٹھے ہی بیٹھے بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ بات اکبر کو بڑی ناگوار گزری اور اس نے ابوالمعالی کو دوبارہ قید کر دیا۔ ابوالمعالی کا باقی حال آیندہ بیان کیا جائے گا۔ جس وقت وہ لاہور کے قید خانہ سے نکل بھاگا تھا اس کے محافظ پہلوان گل گز نے بادشاہ کے خوف سے خودکشی کر لی تھی۔

سکندر سے مقابلہ

تخت نشینی کے بعد جب حکومت کا نظام بخوبی ترتیب پا گیا تو اکبر نے سکندر کے مقابلہ پر پہاڑوں پر ایک فوج روانہ کی۔ سکندر اس فوج سے تین ماہ تک برابر لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر مغلوب ہو گیا۔ انہی دنوں نگرکوٹ سے راجہ رام چندر بادشاہ کی ملازمت میں حاضر ہوا۔

اکبر نے برسات کا موسم بسر کرنے کے لیے جالندھر کی طرف کوچ کیا اور وہاں پانچ ماہ تک مقیم رہا۔ جس وقت دہلی کے حاکم تردی بیگ خاں کو ہمایوں کی وفات اور اکبر کے جلوس کی خبر ملی تو اس نے کامران کے بیٹے میرزا ابوالقاسم کو شاہی اسباب ولوازمات اور بہترین ہاتھی دے کر خواجہ سلطان علی وزیر خاں اور اشرف خاں میر منشی کے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں روانہ کر دیا تھا۔

اسی سال مرزا سلیمان نے ابراہیم مرزا کے ساتھ کابل کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ قلعۂ کابل میں منعم خاں محصور ہو گیا۔ اس نے اس حملہ کی اطلاع کے لیے اکبر کے پاس متعدد عرضیاں بھیجیں۔ اکبر نے محمد قلی خاں برلاس، اتکہ خاں اور خضر خاں ہزارہ کو بادشاہ بیگم اور دوسری بیگمات کو لانے کے لیے کابل روانہ کیا۔ ابھی یہ لوگ وہاں پہنچے نہ تھے کہ مرزا سلیمان نے قاضی نظام بدخشی کو جو ایک بڑے عالم تھے اور بعد میں انھیں قاضی کا خطاب ملا تھا اپنا سفیر بنا کر منعم خاں کے پاس بھیجا اور صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ منعم خاں صرف ایک بار خطبہ میں اس کا نام پڑھے۔ منعم خاں نے مصلحتاً اس شرط کو قبول کر لیا اور مرزا سلیمان بھی اتنی بات پر خوش ہو کر بدخشاں کو واپس چلا گیا۔

پٹھانوں سے مقابلہ

جلوس کے پہلے سال ہی علی قلی خاں کو خانِ زماں کا خطاب مرحمت کیا گیا اور اس نے سنبھل پر فوج کشی کر کے عدلی کے ایک امیر شادی خاں پٹھان سے مقابلہ کیا۔ دونوں میں رہب ندی کے کنارے بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں خان زماں کو شکست ہوئی۔ وہ از سرِ نو جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ دہلی اٹاوہ اور آگرہ سے اس کے نام خطوط آئے کہ عدلی کی طرف سے ہیموں بقال ایک بڑی فوج لے کر یلغار کر رہا ہے اور اکثر علاقے فتح کر کے وہ دہلی کے قریب پہنچ چکا ہے۔

ہیمو کے حملہ کی خبر سنتے ہی آگرہ سے سکندر خاں ازبک اٹاوہ سے قیا خاں گنگ کالپی سے عبداللہ خاں ازبک بیانہ سے حیدر محمد خاں اور بقیہ تمام امیر بھی اپنے اپنے علاقوں سے کوچ کر کے دہلی میں تردی بیگ خاں کے پاس جمع ہو گئے۔ خان زماں کو جمنا کے دوسرے کنارے پر ہی رک جانا پڑا۔ وہ دہلی نہ پہنچ سکا۔

ہیمو بقال کا دہلی پر قبضہ ہیمو سے مغل لشکر کا یہ مقابلہ تغلق آباد کے قریب ہوا۔ مغلوں کے میسرہ کی عبداللہ خاں ازبک اور لعل خاں بدخشی کمان کر رہے تھے انھوں نے تیزی کے ساتھ ہیمو کی فوج پر حملہ کیا۔ اسے پسپا کر کے ہوول اور بلوال کے قصبوں تک اس کا تعاقب کیا اور کافی مال غنیمت غنیم سے چھین لیا۔

اس موقع پر ہیمو بہت سے ہاتھیوں سمیت اپنے لشکر سے کٹ گیا تھا۔ اس نازک وقت میں اُسے دُور کی سوجھی۔ اُس نے مغلوں کو سنانے کے لیے یہ افواہ اڑائی کہ اس کی کمک کے لیے الور سے حاجی خاں بڑی فوج لے کر آپہنچا ہے اور اسی وقت اچانک تردی بیگ خاں پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تردی بیگ خاں کے پاس تھوڑی سی جمعیت تھی اس لیے ایک ہی حملہ میں ہیمو نے تردی بیگ خاں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ لیکن اس ڈر سے ان کا تعاقب نہیں کیا کہ کہیں مغل دھوکہ دے کر دوبارہ پلٹ پڑیں۔ مغلوں کے وہ امیر جو ہیمو کے میمنہ کے تعاقب میں دور تک نکل گئے تھے جب شام کے وقت لوٹ کر آئے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ ان کے چھوڑے ہوئے مورچوں پر ہیمو کی فوج قبضہ کیے ہوئے نظر آرہی تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ دہلی سے نکل کر بھاگ گئے۔ خانِ زماں بھی میرٹھ کے راستہ کوچ کر کے ان لوگوں سے سرہند میں آکر مل گیا۔

جب اکبر کو دہلی کی شکست کا حال معلوم ہوا تو اس نے سکندر کے مقابلہ کے لیے خضر خاں خواجہ کو متعین کر دیا۔ اکبر کی پھوپھی گلبدن[1] بیگم اسی خضر خاں کے نکاح میں تھی اور خود ہیمو کی سرکوبی کے لیے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ جس وقت اس نے سرہند میں منزل کی تو ہیمو سے شکست کھا کر آنے والے امیر شاہی لشکر سے آکر مل گئے۔

---

[1] گلبدن بیگم: یہ شاہزادی بابر کی بیٹی ہے۔ کابل کے مضافات میں ۱۵۲۳ء کو اس کی ولادت ہوئی تھی۔ جس وقت بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت گلبدن بیگم کی عمر ڈھائی سال تھی۔ گلبدن بابر کی پانچویں بیوی دلدار بیگم سے ہوئی تھی اس بیگم سے تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہوئے بڑا لڑکا ہندال ہے جو ۱۵۱۹ء میں پیدا ہوا گلبدن بیگم اس سے چھوٹی ہے اس کی بڑی دو بہنوں کا نام گلرخ اور گل چہرہ تھا۔ اس نے اپنے بچپن کا یہ ذکر لکھا ہے "میں نے لشکر کو جاتے دیکھا اور دل میں یہ خیال کیا تھا کہ پل کے پل میں یہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا چنانچہ فوج کے چلے جانے کے بعد مہینوں اور برسوں میری نظروں میں کابل کی مشرقی سڑک کا یہ منظر پھرتا رہا۔" بادشاہ بابری فوج کے ہندوستان پر روانگی کی طرف ہے۔ گلبدن کی تربیت ہمایوں کی ماں ماہم بیگم نے کی تھی۔ جس روز آگرہ میں گلبدن نے اپنے باپ کو بادشاہ بنے دیکھا تو (وہ لکھتی ہے) "بابر کی شخصیت کا رعب مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ میں اس سے بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی اس لیے میں اس محفل کے واقعات کو یاد نہ رکھ سکی۔" بابر کا انتقال ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو ہوا۔ گلبدن لکھتی ہے "شاہ بابا کی وفات سے دن تیرہ و تار ہو گیا اور ہم سب نے اس قیامت کے دن کو گوشوں میں بیٹھ کر رنج و الم میں گزارا۔" جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر آگرہ میں داخل ہوا تو گلبدن سترہ سال کی تھی اور اس کی شادی اس کے پھوپھی کے لڑکے خضر خواجہ خاں سے ہو چکی تھی خضر کے باپ کا نام ایمن خواجہ تھا اس نے اس وقت جب کہ سب بھائی ہمایوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے ہمایوں کے ساتھ رہنا ہی گوارا کیا اور کامران مرزا کے اصرار پر بھی وہ اس کے ساتھ نہ گئی۔ شیر شاہ کی یلغار اور ہمایوں کے فرار کے متعلق وہ لکھتی ہے "ہمارے لیے یہ دن کسی طرح قیامت سے کم نہ تھا۔ ہم اس قدر پریشان تھے کہ میں اپنی سراسیمگی کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتی"۔ گلبدن کا حقیقی بھائی ہندال ۲۰ نومبر ۱۵۵۱ء میں مارا گیا تھا اس نے اس واقعہ کے متعلق لکھا ہے "یہ تو بتاؤ میرے بیٹے اور شوہر کو اس شب خون میں کیوں نقصان نہیں پہنچا اور یہ بجلی صرف میرے بھائی پر ہی کیوں گری"۔ اکبر کے زمانہ میں ۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو گلبدن بیگم شاہی خواتین کے قافلہ کے ساتھ دہلی آگئی ۱۵۵۷ء سے ۱۵۷۴ء تک اس کے حالات کا پتہ نہیں چلتا ہے بہر حال وہ ایک بادشاہ کی بہن ایک بادشاہ کی پھوپھی کی حیثیت سے یہ زمانہ گزار گئی۔ عہد اکبری میں اس کے ایک سفر کا حال ملتا ہے جس میں اس کا خیمہ اکبر کے خیمہ سے متصل نصب تھا اور اس نے اس سفر میں راجپوت عورتوں کے طرز زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ ۱۵۷۵ء میں گلبدن اکبر کی مرضی کے خلاف حج کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس قافلہ کا سردار سلطان خواجہ تھا اس وقت اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

تردی بیگ کا قتل

خانخاناں بیرم خاں کو تردی بیگ خاں سے سابقہ رنجش تھی لیکن وہ اسے دکھاوے کے لیے "طوقان" (بڑا بھائی) کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اب اسے موقع ملا تو اس نے اکبر کو یہ باور کرا دیا کہ اس شکست کا ذمہ دار تردی بیگ خاں ہے۔ تصدیق کے لیے خان زماں اور دوسرے امیروں سے شہادت بھی دلوا دی اور بادشاہ کو مجبور کر کے اس کے قتل کی اجازت لے لی، پھر سیر کے بہانے تردی بیگ خاں کے کیمپ میں جا کر اس کو اپنے خیمہ میں بلا لایا۔ جب مغرب کا وقت ہوا تو طہارت کا بہانہ کر کے وہاں سے ٹل گیا اور اپنے آدمیوں کو جنھیں اس نے اس غرض سے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا اشارہ کر دیا۔ ان لوگوں نے خیمہ میں داخل ہو کر تردی بیگ خاں کو قتل کر دیا۔ قتل کے دوسرے دن خانخاناں دربار میں حاضر نہ ہوا۔ اس نے اسی الزام میں تردی بیگ کے داماد خنجر بیگ اور خواجہ سلطان علی میر منشی کو بھی گرفتار کر لیا تھا لیکن یہ لوگ کچھ دن بعد رہا ہو گئے تھے۔

پانی پت میں فوجوں کی آمد

اس عرصہ میں ہیمو نے دہلی میں بڑی قوت پیدا کر لی اور اپنا خطاب راجہ بکرماجیت رکھ کر خود مختار بن بیٹھا۔ اسلامی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ جب اسے اکبر کے کوچ کی اطلاع ملی تو ایک ہزار پانسو جنگی ہاتھی کافی مال و دولت اور بکثرت لشکر لے کر پانی پت پہنچ گیا۔ اس کا توپ خانہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میدان میں آ چکا تھا، ادھر اکبر کے بھی چند امیر خان زماں، اسکندر خاں وغیرہ بھی لشکر سے آگے نکل کر پانی پت پہنچ چکے تھے، انھوں نے پہل کر کے ہیمو کے ہراول پر حملہ کر دیا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد اس کا توپ خانہ چھین لیا۔

ہیمو نے اپنے لشکر کے پٹھانوں کو جن کا سردار شادی خاں میواتی تھا مناصب اور جاگیروں میں اضافہ کا لالچ دے کر اور ان کو کافی روپیہ اور انعام و اکرام دے کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا، لیکن یہ پٹھان ہیمو کی حرکتوں سے سخت بیزار ہو چکے تھے اور دل سے اس کی شکست و بربادی کے خواہاں تھے۔ بہر حال ہیمو اپنی اس کثیر فوج کو لے کر ہوائی نامی ایک ہاتھی پر سوار ہوا اور راتوں رات کوچ کرتے ہوئے پانی پت پیچھے چھوڑ کر موضع کھرسندہ میں جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

دس محرم ۹۶۴ھ[1] جمعہ کے دن صبح خان زماں اور سکندر خاں ہراول کے امیروں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اکبر بھی شاہی لشکر کے ساتھ معرکہ گاہ سے تین کوس کے فاصلہ پر پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے امرائے لشکر کو کمک کے لیے روانہ کر رہا تھا۔ ہیمو کے ساتھ جو امیر تھے وہ سب کے سب اس سے برہم اور بیدل تھے۔ ان کے اس

---

[1] جہانگیر نے توزک میں معرکۂ پانی پت کی تاریخ ۲ محرم ۹۶۴ھ لکھی ہے۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) ہو چکی تھی اس نے اپنے اس سفر کا حال نہیں لکھا۔ یہ سفر سورت کی بندرگاہ سے کیا گیا تھا یہاں تقریباً ایک سال کی تاخیر ہو گئی آخر ۱۷۔ اکتوبر ۱۵۷۶ء کو گلبدن کا قافلہ جہازوں پر سوار ہوا۔ ساڑھے تین سال بعد یہ قافلہ مارچ ۱۵۸۲ء میں فتح پور سیکری واپس آ گیا۔ گلبدن نے اسی سال عمر پائی ۱۶۰۳ء میں بخار کے عارضہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اکبر کے عہد میں اس کے حالات کا ذکر تاریخوں میں بہت کم ملتا ہے۔ تاریخوں میں ایک جگہ وہ سلیمہ کے ساتھ شاہزادہ سلیم کا قصور معاف کرانے کے لیے اکبر کے دربار میں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ حمیدہ بانو بیگم کے ساتھ شاہی رقم کا نذرانہ اور جواہرات قبول کرتی ہوئی ملتی ہے اور اس کا کچھ ذکر اس کے نواسے محمد یار کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ محمد یار کو دربار سے نکال دیا گیا تھا اس وقت اس کی عمر ستر (۷۰) سال تھی۔

گلبدن کی یادگار اس کا "ہمایوں نامہ" ہے۔ یہ اس عہد کی ایک مختصر سی دستاویز اور اہم ماخذ ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گلبدن نہ صرف یہ کہ ایک اچھی انشاپرداز تھی بلکہ مورخ بھی اچھی تھی نہایت سادہ لیکن موثر طرز بیان میں اس نے اپنے چشم دید واقعات قلمبند کر دیے ہیں وہ شاعر بھی تھی۔ میر مہدی شیرازی نے اپنی کتاب تذکرۃ الخواتین میں گلبدن کا یہ شعر درج کیا ہے ؎

ہر پری کو او بہ عاشق خود یار نیست   تو یقیں میداں کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

رویہ کی وجہ سے ہیمو صرف ہاتھیوں کی لڑائی پر بھروسا کیے ہوا تھا چنانچہ اس نے پہلی یلغار ہی میں ہاتھیوں کا ایک بڑا غول لے کر اکبری فوج پر حملہ کر دیا یہ حملہ بڑا سخت اور ہولناک تھا شاہی لشکر میں افراتفری سی پھیل گئی، لیکن جلد ہی اکبر کے امیروں نے اپنی اپنی صفوں کو سنبھال کر منظم طریقہ سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور ہیمو کے ہاتھی بوکھلا گئے۔ اس محاذ پر جب ہیمو فوری طور پر کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے اپنا رُخ بدل دیا اور ہاتھیوں کو دوسرے محاذ پر جہاں خان زماں کمان دار تھا پہنچا دیا۔ خان زماں نے بھی اس کی فیل سوار فوج کو تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ اس موقع پر ہیمو باؤلے کتے کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا کبھی کچھ منتر پڑھنے لگتا اور کبھی مارو مارو کا غل مچانے لگ جاتا تھا۔ اسی دوران میں ایک تیر ایسا آکر لگا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور اس کی فوج بدحواس ہو کر منتشر ہو گئی۔ شادی خاں میواتی بھی اسی معرکہ میں مارا گیا۔

مغل فوج کی کامیابی

ہیمو کی فوج کے پسپا ہوتے ہی شاہ قلی خاں محرم یلغار کرتا ہوا ہیمو کے ہاتھی پر حملہ آور ہوا۔ فیل بان نے کہا مجھے مار کر کیا لو گے، تمہارا دشمن ہیمو اسی ہاتھی پر عماری میں پڑا ہوا ہے۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں ہیمو کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس پیش کیا گیا۔ شیخ گدائی کمبو اور دوسرے امراء نے عرض کیا "چونکہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے اس لیے آپ بھی اس کافر پر اپنی تلوار آزمائیں"۔ اکبر نے ان کو جواب[2] دیا "یہ مُردہ پڑا ہوا ہے، اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو میں تیغ آزماتا" آخر خانخاناں نے سب سے پہلے ہیمو پر تلوار چلائی۔ اس کے بعد شیخ گدائی نے پھر دوسروں نے بھی اس فرض کو ادا کیا اور اس بدبخت کی لاش کے چیتھڑے اڑ گئے۔

اس فتح کی تاریخ ان اشعار سے نکلتی ہے ؎

زروئے مکر و تزویر و دغا گر حضرت دہلی
بدست افتاد ناگہ از قضا ہیموں ہندو را
جلال الدین محمد اکبر آں شاہ فلک رفعت
بعون لطف حق بگرفت ہندوئے سیہ رو را
دبیر صنع بر لوحِ بقا با خامۂ قدرت
رقم زد بہر سال فتح آں بگرفت ہیمو را

اکبری فوج کو پانی پت کی اس فتح کے نتیجہ میں ایک ہزار پانسو ہاتھی بے شمار خزانہ اور کافی مال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیمو کی شکست خوردہ فوج کے تعاقب میں پیر محمد خاں اور مہدی قاسم خاں کا داماد حسین خاں روانہ ہوئے۔ ہیمو کی بیوی ایک بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی نکل بھاگی تھی۔ تعاقب کرنے والے دستوں نے اس کو الور کے آگے جا کر گھیر لیا اور وہ خزانہ چھوڑ کر بجوارہ

---

[1] تزک جہانگیری میں ہیمو کے سواروں کی تعداد ۳۰ ہزار اور اکبر کے لشکر کی تعداد چار پانچ ہزار درج ہے۔

[2] تزک جہانگیری میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے "بیرم خاں نے عرض کیا مناسب یہ ہے کہ حضور اپنے دست مبارک سے اس کافر کا سر الگ کر دیں تاکہ جہاد کا مرتبہ حاصل ہو اور فرامین میں آپ کے نام کے ساتھ غازی کا لفظ بڑھایا جائے۔ میرے والد نے کہا میں نے پہلے ہی اسے پارہ پارہ کیا ہے، میں ایک بار کابل میں خواجہ عبدالصمد شیریں قلم سے تصویر سازی کی مشق کر رہا تھا بے خیالی میں میرے قلم سے ایک ایسی تصویر بنی جس کے اعضا الگ الگ تھے۔ میرے ایک مصاحب نے پوچھا یہ کس کی تصویر ہے میری زبان سے نکلا "ہیموں کی"۔ غرض میرے والد نے اس کے خون سے ہاتھ آلودہ نہیں کیا اور ان کے حکم سے ایک خادم نے اس کی گردن اڑا دی۔ ہیمو کے لشکر کے پانچ ہزار آدمی مارے گئے تھے۔

اور کوا کے کوہستان میں جان بچا کر بھاگ گئی۔ اس کا خزانہ کچھ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل لشکریوں کے ہاتھ آیا، پھر بھی وہ اتنا تھا کہ سپاہیوں نے ڈھالوں میں بھر بھر کر اسے بانٹ لیا۔ جس راستہ سے ہیمو کی بیوی گزری تھی اس پر اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں اتنی گری تھیں کہ ایک عرصہ تک وہ راہ گیروں کو ملتی رہیں۔ یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ کے زمانہ سے عدلی کے عہد تک جمع ہوتا رہا تھا زمانہ کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا اور وہاں فتح کی خوشی میں پھولوں کا ایک مینار لگوایا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے بڑے جاہ و حشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بادشاہ ایک مہینہ تک دہلی میں مقیم رہا اور وہاں سے اس نے آگرہ اور سنبھل کی طرف امراء کو روانہ کیا۔

دہلی کے قیام ہی میں یہ خبر ملی کہ لاہور سے بیس کوس پر موضع چیپاری میں اکبری امیر خضر خاں کو سکندر نے حملہ کر کے شکست دے دی اور وہ بھاگ کر لاہور آ گیا ہے۔ اس پر اکبر نے دوبارہ پنجاب کا رخ کیا، جب جالندھر پہنچا تو سکندر پھر کوہ سوالک کی طرف بھاگ گیا۔ اکبر نے دلیسوڑہ اور دھمیڑی تک اس کا تعاقب کیا۔

یہ واقعات ابتدائے جلوس سے متعلق تھے۔ اب میں جزئیات کو چھوڑ کر بڑے بڑے واقعات کو جو اکبری عہد کے چالیس سال میں رونما ہوئے اجمالاً تحریر کروں گا۔

سکندر افغان کی اطاعت

سکندر برابر اکبر کی فوج سے برسرِ پیکار تھا اسی سال وہ قلعۂ مانکوٹ میں محصور ہو گیا۔ مغل لشکر روزانہ اس پر حملے کر رہا تھا۔ ان حملوں سے اس کی جان عذاب میں آ گئی تھی۔ اکبری فوج میں سے مہدی قاسم خاں کے داماد محمد حسین خاں نے ان معرکوں میں بڑی جاں نثاری اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کا بھائی حسن بیگ بھی اسی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اکبر نے حسین خاں کے دلیرانہ کارناموں کی بڑی قدر کی اس کو روز بروز اونچے درجوں پر ترقی ملتی رہی اور اچھی سے اچھی جاگیریں بھی اسے مرحمت کی گئیں آخر میں لاہور کی حکومت پر اسے فائز کیا گیا۔

جب محاصرہ طویل ہو گیا اور قلعہ بند فوج غلہ کی کمی کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگی تو سکندر کے رفیق کھسکنے لگے، چنانچہ سید محمود بارہہ وغیرہ سکندر سے ٹوٹ کر اکبر سے آ کر مل گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سکندر نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور اپنے بیٹے عبدالرحمن کو غازی خاں سور کے ہمراہ اتکہ خاں اور پیر محمد خاں کو وسیلہ بنا کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ سفارت ۲۷۔ رمضان ۹۶۴ھ کو بارگاہ شاہی میں باریاب ہوئی۔ اس نے بہت سے ہاتھی نذر گزرانے اور قلعہ بھی سپرد کر دیا۔

اکبر نے شرائط صلح کے متعلق جو فرمان لکھوایا تھا اس کی رو سے جونپور عارضی طور پر سکندر کی جاگیر میں اس شرط پر دیا گیا تھا کہ جب وہ دوسرے اور علاقوں کو فتح کر لے تو جونپور پر خان زماں اس کا قائم مقام ہو جائے گا۔ اس فرمان کے بموجب سکندر پہاڑوں کے راستہ سے کوچ کرتے ہوئے جون پور پہنچ گیا۔ بعد میں جب خان زماں نے جون پور پر قبضہ کر لیا تو حسب فرمان سکندر نے گور پر لشکر کشی کی لیکن وہاں اسے ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا کہ گور تو اس کے ہاتھ کیا آتا چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ خود وہ "گور" کی آغوش میں چلا گیا۔

اکبر نے جس زمانہ میں قلعہ مانکوٹ کا محاصرہ کر رکھا تھا، محمد قلی خاں برلاس، اتکہ خاں اور دوسرے چند امرا کابل جا کر بادشاہ بیگم

اور خانوادۂ شاہی کے دوسرے افراد و مستورات کو اپنے ساتھ لشکر میں لے آئے تھے۔

اکبر کی لاہور کو روانگی

بادشاہ نے دوسری شوال ۹۶۴ھ کو لاہور کا رُخ کیا۔ اسی سفر کے دوران خانخاناں اور اتکہ خاں میں بدگمانی اور شکر رنجی پیدا ہو گئی۔ قصہ یہ ہوا کہ کسی منزل میں شاہی ہاتھی دوڑتے ہوئے خانخاناں کے سراپردہ پر سے گزر گیا خانخاناں کو شبہ ہوا کہ یہ حرکت اتکہ خاں نے قصداً کی ہے۔ جب لشکر لاہور پہنچا تو اتکہ خاں اپنے تمام بیٹوں کو لے کر خانخاناں کے پاس آیا اور کلام پاک کی قسم کھا کر اس نے اپنی بریت ظاہر کی اور خان خاناں کی بدگمانی رفع ہو گئی۔

اسی سال ملا عبداللہ سلطان پوری کے توسط سے سلطان آدم گھکر لاہور آ کر اکبر کے حضور میں باریاب ہوا۔ لاہور میں خانخاناں کے ساتھ اس کا بڑا یارانہ ہو گیا اور اکبر نے اس قضیہ کا فیصلہ کر دیا جو سلطان آدم اور اس کے بھتیجے کمال خاں کے مابین جاری تھا۔ اس طرح سلطان آدم بڑی عزت و احترام کے ساتھ اپنے وطن کو لوٹ گیا۔

دہلی میں داخلہ

موسم باراں کے ختم ہونے پر اکبر نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ جالندھر میں جب منزل ہوئی تو ہمایوں کی بھانجی اور میرزا نور الدین محمد کی لڑکی سلیمہ سلطان بیگم[1] کا نکاح خان خاناں بیرم خاں کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوا اور ایک بڑا جشن شادی کی تقریب میں منعقد کیا گیا۔ دونوں طرف سے دل کھول کر روپے لٹائے گئے۔

۲۵ جمادی الثانی ۹۶۵ھ کو اکبر دہلی میں داخل ہوا۔ اس زمانہ میں خان خاناں ہر ہفتہ دو مرتبہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر دوسرے اور امراء کے مشورہ و تعاون سے انتظامی معاملات اور مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔

خان زماں اور شاہم بیگ کا معاشقہ

اس زمانہ میں جو واقعات پیش آئے ان میں شاہم بیگ کے ساتھ خان زماں کی عشق بازی کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ہمایوں بادشاہ کے قورچیوں کے عملہ میں دو خوبصورت اور خوش مزاج لڑکے شامل تھے ایک کا نام خوش حال بیگ اور دوسرے کا نام شاہم بیگ تھا۔

شاہم بیگ طہماسپ کے ساربان کا لڑکا تھا۔ یہ دونوں لڑکے نہ صرف خوش خلق و پسندیدہ اطوار تھے بلکہ دلیری اور بہادری میں بھی ہم چشموں میں امتیاز رکھتے تھے۔

اس زمانہ میں جب کہ خان زماں کا سنبھل پر تقرر نہیں ہوا تھا اسے شاہم بیگ سے بڑا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا حال شاعر کے اس مفہوم سے مختلف نہ تھا ؎

---

[1] سلطان سلیمہ بیگم۔ یہ شادی ایک سیاسی مصلحت ہی تھی کیوں کہ شادی کے وقت سلیمہ کی عمر پانچ سال تھی اس کی پیدائش ۹۶۱ھ میں ہوئی شادی ۹۶۵ھ میں ہوئی اکبر اس رشتہ کے ذریعہ بیرم خاں کا اعزاز اور سلطنت سے اس کے تعلق کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ بابر کی لڑکی گلرخ بیگم سلیمہ کی والدہ تھی اس طرح یہ ہمایوں کی حقیقی بھانجی تھی، سلیمہ کے والد مرزا نور الدین محمد نقشبندی خواجہ زادوں میں سے تھے سلیمہ سلطان نہایت نیک سیرت شیریں کلام حاضر جواب صاحب علم و سلیقہ خاتون تھی۔

مطالعہ کا بڑا ذوق تھا، ارباب سخن کی قدر دان تھیں، خود بھی شعر کہتی تھیں۔ جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے:

"بہ جمیع صفات حسنہ آراستگی داشتند در زناں ایں مقدار ہنر و قابلیت کم جمع می شود۔" (توزک جہانگیری ص ۱۱۳)

مخفی تخلص تھا، اس کا مشہور شعر ہے ؎

کاکلت را من ز مستی رشتہ جاں گفتہ ام
مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

(جہانگیر نامہ کشوری ص ۶۶ مآثر الامراء ص ۳۷۶)

۹۸۲ھ میں جب اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم حج کو گئیں تو یہ بھی ہمراہ تھیں چار حج کیے ۹۹۰ھ میں ہندوستان واپس آئیں۔ بیرم خاں کی وفات کے بعد اکبر نے سلیمہ سلطان بیگم سے عقد کر لیا تھا (مآثر الامراء ص ۳۷۶) ۱۰۲۳ھ کے واقعات میں جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے (ص ۱۳۴) جس وقت نور جہاں بیگم کی والدہ نے عطر گلاب ایجاد کیا تو ہمیں اس کی خوشبو بہت پسند آئی ہم نے ان کو ایک عقد مروارید عطا کیا، سلیمہ سلطان بیگم تشریف رکھتی تھیں انھوں نے "عطر جہانگیری" اس کا نام رکھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عطر گلاب نور جہاں کی ایجاد نہیں جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے بلکہ اس کی ماں کی ایجاد ہے۔

نشان بر تختۂ ہستی نبود از عالم و آدم
کہ جان در مکتب شوق از تمنائی تو میزد دم
کہ دارد ایں چنیں عیشی کہ در عشق تو من دارم
شرابم خون کبابم دل ندیمم درد نقلم غم

ہمایوں کے انتقال کے بعد جب خان زماں اکبر بادشاہ کی خدمت سے وابستہ ہوا تو اس نے شاہم بیگ سے اس بات کا قول و قرار لیا کہ وہ شاہی ملازمت ترک کر کے اس کے پاس آ جائے گا۔ چنانچہ اس نے لکھنؤ سے اپنے چند آدمی دہلی بھیجے کہ وہ شاہم بیگ کو بھگا کر لے آئیں۔

ماوراءالنہر کے دوسرے عیاش امیروں کی طرح جو جوانوں کو شاہی مراتب کا لالچ دے کر بہار کا موسم عیش و نشاط میں گزارا کرتے ہیں، خان زماں بھی شاہم بیگ کی خاطرداری اور خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اسے "بادشاہ" کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ اس کے عشق میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا اور اکثر اوقات اس کی رکاب پکڑ کر خدمت گاروں کی طرح اس کی خدمت میں کھڑا رہتا تھا۔

میں نے ابوالغیث نجاری دہلوی کی زبان سے جن کے ساتھ شاہم بیگ کو بڑی عقیدت تھی، یہ بھی سنا ہے کہ جس زمانہ میں شاہم بیگ لشکر شاہی سے جون پور گیا تھا، با جماعت نماز، درود خوانی اور تلاوت کلام پاک کا بڑا پابند تھا، ہمیشہ طہارت و پاکی کا خیال رکھتا تھا اور برائیوں کی طرف اس کا میلان نہ تھا۔ شاہم بیگ کی خاطر خان زماں بھی بڑا متقی اور پرہیزگار بن گیا تھا۔ اپنے لشکر میں بھی اس نے غیر شرعی باتوں کی روک تھام کے لیے محتسبوں کا تقرر کر دیا تھا اور شاہم بیگ کی تعلیم کے لیے میر سید محمد مکی کو جو سات قراتوں کے قاری تھے مقرر کیا تھا۔ راقم نے بھی سلیم شاہ کے عہد میں سنبھل میں مکی صاحب کے سامنے اپنی قرأت کی اصلاح کی تھی۔ غرض خان زماں اس خوبرو لڑکے کی ہر طرح خاطرداری کرتا رہتا تھا۔ لڑکوں کی پاک بازی کم سنی تک ہی رہتی ہے، شاہم بیگ کے چال چلن بھی بہت جلد بگڑ گئے۔

آرام جان

آرام جان نامی ایک حسین اور دلربا طوائف تھی۔ شاہم بیگ کا اس پر دل آگیا اور وہ بھی دل و جان سے اس نوجوان پر فریفتہ ہو گئی۔ یہ طوائف پہلے سے خان زماں کے نکاح میں تھی۔ اس نے شاہم بیگ کو جب اس کی طرف مائل پایا تو اس طوائف کو اس کے حوالہ کر دیا۔ شاہم بیگ نے چند دن اس کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منائیں۔ جب جی بھر گیا تو اسے اپنے ایک جانی دوست عبدالرحمن بن مؤید بیگ کو بخش دیا۔

عشق بازی کے یہ قصے جب بادشاہ سلامت کے سننے میں آئے، سلطانی غیرت جوش میں آگئی اور شاہم بیگ کی حاضری کے فرمان آگرہ اور دہلی سے جون پور پہنچے۔ اس علاقہ کے جاگیرداروں کے نام بھی فرمان صادر ہوا کہ اگر خان زماں تعمیل حکم میں لیس و پیش کرے تو سب مل کر اس کی گوشمالی کریں۔

خان زماں نے اپنے ایک معتمد آدمی برج علی کو اپنے قصوروں کی تلافی کے خیال سے دہلی روانہ کیا۔ برج علی سب سے پہلے خان خاناں کے نائب پیر محمد خاں کے مکان پر گیا۔ برج علی پہنچا تو وہ ایک برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ برج علی نے خان زماں کے پیغام سے اسے مطلع کیا۔ غالباً باتوں میں کوئی ناگواری پیدا ہو گئی اور پیر محمد خاں نے برج علی کی کسی سخت بات پہ اسے اس برج پر سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔

اس صدمہ سے وہ بے چارا مٹی کا ڈھیر بن گیا اور اس ظالم نے سنگ دلی کے ساتھ قہقہہ لگا کر کہا "یہ کمینہ اب اسم بہ مسمّٰی بنا ہے"۔

خان زماں کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو اس نے جدائی کا پتھر اپنے سینہ پر رکھ کر شاہم بیگ کو سرہرپور کے پرگنہ میں بھیج دیا، یہ پرگنہ جون پور سے اٹھارہ کوس پر اس کے دوست عبدالرحمٰن بیگ کی جاگیر میں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شاہم بیگ کچھ عرصہ تک وہاں سیر و شکار میں مصروف رہے، جب بادشاہ سلامت کا غصہ ٹھنڈا پڑے تو لوٹ آئے۔

شاہم بیگ کا انجام

سرہرپور میں شاہم بیگ کی عبدالرحمٰن بیگ کے ساتھ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ آرام وہ خوب صورت مکان تھا جس کے ساتھ ایک سرسبز و شاداب باغ ایک خوش منظر تالاب کے کنارے تھا۔ دونوں دوست عیش و نشاط کے جلسے مناتے رہتے تھے۔ ایک دن جب کہ شراب و کباب کی مجلس جمی ہوئی تھی ؎

سرود و عاشقی و مے پرستی
سبب شد ہر سہ چیز بہر مستی

عالم مستی میں شاہم بیگ نے عبدالرحمٰن بیگ سے آرام جان کو بلانے کا مطالبہ کیا، اس نے نکاح کا عذر کر کے اس کی فرمائش ٹال دی۔ اس بات سے شاہم بیگ کو بڑا رنج ہوا اور دونوں کی دوستی دیکھتے ہی دیکھتے دشمنی میں تبدیل ہو گئی اور شاہم بیگ نے غرور و مستی کی وجہ سے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ عبدالرحمٰن کو گرفتار کر لیں، پھر اس نے اس گھمنڈ میں کہ آرام جان پہلے اسی کی تھی عبدالرحمٰن کے مکان میں سے اپنے پاس بلوا لیا اور اس کے ساتھ خوش وقتی میں مشغول ہو گیا۔

عبدالرحمٰن کے چھوٹے بھائی مؤید بیگ کو اس کی اس حرکت پر بڑی غیرت آئی اور وہ ایک جمعیت لے کر اس بالاخانہ کی طرف گیا جس میں شاہم بیگ آرام جان کو لیے پڑا تھا۔ شاہم بیگ بھی مقابلہ پر اتر آیا۔ دونوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ شاہم بیگ کو اس نشہ کی حالت میں ایک تیر ایسا آ کر لگا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے فوت ہونے کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے۔ ع

"برداشت آہ[1] و گفت کہ شاہم شہید شد"

عبدالرحمٰن بیگ قید سے چھوٹ کر دربار شاہی کے ارادہ سے رخصت ہو گیا۔ خان زماں نے اپنے محبوب کے غم میں ماتمی لباس پہن لیا اور عبدالرحمٰن بیگ کا گنگا تک تعاقب کیا۔ وہاں سے با چشم گریاں مایوس و ناکام لوٹ آیا ؎

در ماتم شمس از شفق خوں چکید
مہ روئی بر کند و زہرہ گیسو بہ برید
شب جامہ سیاہ کرد ازیں ماتم و صبح
بر زد نفسے سرد و گریباں درید

خان زماں کی معرکہ آرائی

ان چند سالوں میں خان زماں نے باوجود مختصر جمعیت کے افغانوں کی ایک بھاری فوج سے دلیرانہ جنگ کر کے فتح حاصل کی۔ اس سلسلہ کی اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں وہ بلا شبہ اس کا ایک تاریخی کارنامہ

---

[1] "آہ" کے عدد خارج کر دیے جائیں تو ۹۶۳ھ تاریخ نکل آتی ہے۔ اس مادۂ تاریخ کے باوجود قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ اسی سال پیش آیا تھا یا ایک سال پہلے۔ سال گزشتہ ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

ہے۔ انھی لڑائیوں میں سے لکھنو کی جنگ بھی ہے جس میں حسن خاں بچگوتی بیس ہزار سپاہیوں کو لے کر حملہ آور ہوا تھا۔ خان زماں کے پاس تین چار ہزار سے زیادہ کی جمعیت نہیں تھی۔

جب غنیم نے گردی ندی کو عبور کر کے بہادر خاں کی فوج پر حملہ کر دیا تو خان زماں کھانے کے لیے دستر پر بیٹھ گیا۔ جب لوگوں نے آ کر کہا کہ غنیم سر پر آ پہنچا ہے تو اس نے شطرنج لانے کا حکم دیا اور بڑے اطمینان سے شطرنج کھیلتا رہا۔ پھر لوگ دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ دشمن نے آدمیوں کو پسپا کر دیا ہے تو اس نے ہتھیار منگائے۔ جس وقت دشمن کے سپاہی سراپردوں کو لوٹتے پھر رہے تھے اور اس کا سارا لشکر منتشر ہو چکا تھا خان زماں نے بہادر خاں کو رخصت کر دیا اور خود تھوڑے سے آدمیوں کو ساتھ لے کر نقارہ بجاتے ہوئے دشمن کے مقابلہ پر آیا اور ایسا دلیرانہ حملہ کیا کہ غنیم کے پیر اکھڑ گئے اور پٹھان بھاگ نکلے۔ خان زماں نے سات آٹھ کوس تک ان کا تعاقب کیا اور بہت سارے پٹھانوں کو تہ تیغ کر دیا۔

لکھنو کی جنگ کی طرح جون پور کی لڑائی بھی اس کی بہادری کا ایک کارنامہ ہے۔ بنگالہ میں کوریہ نے سلطان بہادر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا، پھر وہ بنگال سے تیس چالیس ہزار سوار لے کر جون پور پر حملہ آور ہوا۔ مقابلہ میں خان زماں کا سارا لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔ جس وقت غنیم پہنچا ہے خان زماں دستر سے اٹھ کر بس گیا ہی تھا حملہ آوروں نے دستر کو اسی طرح جما ہوا پایا تو بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور سب کچھ لوٹ لیا۔ پھر خان زماں ایک مختصر سی جمعیت اکٹھی کر کے پٹھانوں پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑا اور انھیں شکست دے کر بھگا دیا۔ بہت سے پٹھان قتل اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ اس قدر مال غنیمت مغل لشکریوں کے ہاتھ لگا کہ انھیں اور کسی چیز کی آرزو نہ رہی۔

سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ کے اقبال سے اس نے اور اس کے بھائی نے اپنی فوج کے ساتھ مشرقی ہندوستان میں جیسی فتوحات حاصل کیں وہ کم ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوں گی۔ اگر ان کا دامن معصیت سے داغدار نہ ہوتا تو کیا عجب کہ شاہی اعزاز سے نوازے جاتے۔ اپنی سرکشی کی وجہ سے انھوں نے اپنے یہ سارے کارنامے خاک میں ملا دیے۔ ان کا باقی حال مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا۔

اسی سال خانخاناں نے خواجہ کلاں بیگ کے لڑکے مصاحب بیگ کو جو نہایت شر پسند اور ظالم آدمی تھا، قتل کرا دیا۔

اکبر کا آگرہ میں داخلہ

۱۷ محرم ۹۶۵ھ کو جلوس کے تیسرے سال اکبر کی شاہانہ سواری آگرہ[1] میں داخل ہوئی۔ یہی وہ سال ہے جس میں پیر محمد خاں کو عروج بھی نصیب ہوا اور سال بھر کے اندر اندر زوال بھی آ گیا۔

---

[1] آگرہ۔ آگرہ کو سلطان سکندر لودھی نے دریائے جمنا کے کنارے آباد کیا تھا۔ موجودہ شہر اکبر کی یادگار ہے اس نے ۹۷۲ھ/۱۵۶۶ء میں اسے اکبرآباد کا نام دیا۔ دہلی سے پہلے یہ ہندوستان کا پایۂ تخت رہا۔ عہد اکبری میں صوبۂ اکبرآباد کے تحت اکبرآباد، بیانہ، سیکری، گوالیار، کالپی، متھرا، مکن پور، بھرت پور، الور کے شہر تھے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں آگرہ کا حال لکھا ہے "آگرہ ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ہے جمنا کے کنارے اس میں ایک پرانا قلعہ تھا میرے باپ نے میری ولادت سے پہلے اسے گرا کر نیا قلعہ سرخ پتھر کا بنوایا یہ قلعہ پندرہ سولہ سال میں تیار ہوا، اس پر ۳۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔" جمنا کے دونوں کناروں پر شہر آگرہ کی آبادی ہے وسعت اتنی ہے کہ عراق، خراسان اور ماوراءالنہر جیسے چند شہر اس میں آباد ہو سکتے ہیں۔ مکانات اکثر سہ منزلہ چار منزلہ ہیں، لوگوں کا ہجوم اس قدر رہتا ہے کہ راستہ چلنا مشکل ہے۔ شاہجہاں آباد دہلی کے آباد ہونے تک آگرہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب سلطنت مغلیہ کو زوال ہوا تو جاٹ اور مرہٹے آگرہ پر قابض ہو گئے ۱۸۰۳ء میں یہ انگریزی قبضہ میں آیا۔ یہاں کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔ تاریخی عمارتوں کی وجہ سے آگرہ ایک یادگار شہر ہے شاہجہان کی بنائی دو منزلہ جامع مسجد، سکندرہ، فتح پور سیکری، تاج محل، قلعہ، موتی مسجد وغیرہ اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ ابوالفضل اور فیضی آگرہ ہی کے متوطن تھے۔

پیر محمد خاں پہلے صرف ملا تھا۔ ملاگیری سے وہ امارت کے اس درجہ پر پہنچا کہ تمام امور مملکت میں وہ خانخاناں کی نیابت کرنے لگا تمام امراء اس کے دروازہ پر حاضر ہوا کرتے تھے اور بہت کم لوگوں کو باریابی کا موقع ملتا تھا۔

پیر محمد خاں کا عروج وزوال

اس کے جاہ وحشم کا یہ حال تھا کہ جس وقت لشکر دہلی سے آگرہ جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں خانخاناں پیر محمد خاں کے ساتھ شکار کے لیے نکل گیا۔ خانخاناں کو جب بھوک لگی تو اس نے اپنے رکاب داروں سے پوچھا کہ "ہمارے ہمراہ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی ہے"؟ پیر محمد خاں نے اسی وقت عرض کیا "اگر آپ یہاں ٹھہر جائیں تو جو کچھ میرے ساتھ ہے خدمت میں پیش کیا جائے گا"۔ خانخاناں اپنی جمعیت کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ پیر محمد خاں کے رکاب خانہ سے اس وقت تین سو شربت کے پیالے اور سات سو کھانے کی رکابیاں دستر پر چنی گئیں۔ اس کے اس ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر خانخاناں حیران رہ گیا بظاہر تو کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل میں بہت پیچ وتاب کھاتا رہا، اسی وقت سے خانخاناں کا دل اس سے پھر گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد پیر محمد خاں کچھ دن تک بیماری میں مبتلا رہا۔ ایک دن خانخاناں اس کی عیادت کے لیے گیا تو اس کے ایک غلام نے اسے داخل ہونے سے روک دیا کیوں کہ پیر محمد خاں نے امراء وغیرہ کے داخلہ پر پابندی لگا رکھی تھی اور خانخاں سے کہا جب تک اجازت آجائے آپ توقف فرمائیں۔ خانخاناں کے لیے یہ بات جلتے پر تیل سے کم نہ تھی۔ جب پیر محمد خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مرض کی نقاہت کے باوجود دوڑا ہوا آیا اور خانخاناں سے معافی چاہی کہ "دربان نے آپ کو پہچانا نہیں"۔ خانخاناں نے اس کے جواب میں صرف ایک معنی خیز جملہ کہا "اور تم نے بھی نہیں"۔ اس واقعہ کے باوجود پیر محمد خاں کے دربانوں نے خان کے ملازموں میں سے کسی اور کو اندر جانے نہیں دیا۔ صرف طاہر محمد سلطان، میر فراغت بڑی کوشش کے بعد اندر مجلس میں پہنچ سکا تھا خان خاناں کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا اور پیر محمد خاں کے ہوش درست کرنے کا تہیہ کر لیا۔

دو تین دن بعد خان خاناں نے خواجہ امینا جو بعد میں خواجہ جہاں بنا ہے اور میر عبداللہ بخشی کو خدمت گاروں کی ایک جماعت کے ساتھ پیر محمد خاں کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ "ان دنوں کو تو بھول گیا ہے جب تو طالب علمی کے لباس میں نہایت خستہ حال قندھار پہنچا تھا۔ ہم نے اس وقت تجھ میں قابلیت اور خلوص کے جذبہ کو دیکھ کر اور چند عمدہ خدمات کے بجالانے کی وجہ سے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا اور تجھے ملاگیری سے امارت کے اعزاز پر پہنچنا نصیب ہوا، پھر ہم نے ترقی دے کر تجھے امیر الامرائی کا عہدہ عطا کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا ظرف دولت ومرتبہ کی سمائی کے لائق نہیں اور تیری طرف سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو چلا ہے اسی لیے ہم چند دن کے لیے وہ ساز وسامان تجھ سے چھینے لیتے ہیں جو تیرے اس غرور کا باعث ہے تاکہ تیرا دماغ ٹھکانے آجائے۔ تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تو فوراً ہی علم ونقارہ اور ساز وسامان سرکاری آدمیوں کے سپرد کر دے"۔

پیر محمد خاں نے خانخاناں کے حکم کی تعمیل کی اور سارا ساز وسامان اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ پھر وہ امیر الامراء کے درجہ سے گر کر وہی ملا پیر محمد بن گیا بلکہ اس کا حال اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہو گیا۔

خان خاناں نے چند دن بعد ہی اسے قلعہ بیانہ میں بھیج کر قید کر دیا۔ اسی قید کے زمانہ میں اس نے "برہان تمانع" کی بحث پر جو "لَوْ کَانَ فِیْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا" کی آیت پر مبنی ہے اور یہ متکلمین کے درمیان ایک مشہور بحث ہے، ایک رسالہ اور

چند دوسرے رسالے لکھ کر خان خاناں کے نام سے موسوم کیے تاکہ اس وسیلہ سے اسے رہائی مل جائے، لیکن ایسی باتوں کا کچھ نتیجہ نہ نکلا ؎

دل شیشہ ایست چوں شکنی کے شود درست
ظرف کلال نیست کہ سازی و بشکنی

چند دن بعد خانخاناں کے حکم سے اسے مکہ معظمہ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ تقدیر اچھی تھی، جب وہ گجرات پہنچایا گیا تو خانخاناں خود سازشوں کا شکار ہوگیا۔ یہ خبر جب پیر محمد خاں کو ملی تو وہ گجرات سے لوٹ آیا اور اکبر کے ہاں باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب عطا کر کے خانخاناں کے تعاقب کے لیے مامور کر دیا۔ یہ تفصیل بھی ہم انشاء اللہ آگے بیان کریں گے۔

ان واقعات کے بعد خان خاناں کی نیابت کا عہدہ پیر محمد خاں کے بجائے خان خاناں کے ہی ایک ملازم حاجی محمد خاں سیستانی کو دیا گیا تھا۔

شیخ گدائی کا اقتدار

ایک اور شخص شیخ گدائی کنبوہ تھا۔ یہ دہلی کے شاعر جمال کنبوی کا لڑکا تھا۔ جب ہندوستان دوبارہ فتح ہوا تو حالت سفر میں شیخ گدائی گجرات کے مقام پر خان خاناں کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اس سے اس کی رسم و رسم اچھی خاصی ہوگئی تھی۔ انہی سابقہ روابط کی بنا پر خانخاناں نے اس کی سرپرستی کی اور اسے صدر الصدور کا عہدہ دے کر تمام ہندوستانی اور خراسانی امیروں میں اس کا مرتبہ بڑھا دیا۔ یہ شخص نہایت مکار اور ریاکار تھا۔ اس نے صوفیانہ وضع اختیار کر رکھی تھی اور اپنے گھر پر سماع کی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا۔ ان محفلوں میں خان خاناں بلکہ خود بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ ہندوستان میں اسلام کا آغاز ہی تھا اس لیے ایسے مکار لوگ جو غلامانہ ذہنیت اور پست فطرت رکھتے تھے اور ان کے نفاق و ریاکارانہ زہد کی وجہ سے درویشی ان پر پھبتی نہیں تھی، مکر و تزویر سے بآسانی اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ شیخ گدائی بھی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ لوگوں کو تو اس کے عالی النسب ہونے میں بھی شبہ تھا۔ غرض اس کے اس بڑھتے ہوئے اعزاز و مرتبہ کی وجہ سے اہل علم اور امراء کی محفلوں میں ماتم سا برپا ہوگیا ؎

در تنگنائے حیرتم از نخوت رقیب
یا رب مباد آنکہ گدا معتبر شود

شیخ گدائی نے قدیم امیرزادوں اور پیرزادوں کی جاگیریں ضبط کرا دیں۔ وہ صرف انہی کو جاگیر عطا کرتا تھا جو اس کے دربار میں جانے کی ذلت گوارا کر لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ایک گز زمین جاگیر میں حاصل کرنے کے لیے اس کی خوشامد نہ کرتے ہوں، ان میں ولایت (ایران) سے آنے والے معزز لوگ بھی شامل تھے۔ ایسے لوگ شاید یہ شعر پڑھ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہوں ؎

گر فرو تر نشست خاقانی
نے اورا عیب و نے ترا ادب است
مے نہ بینی کہ سورۂ اخلاص!
زیر تبت یدا ابی لہب است

میر سید نعمت رسولی نے جس کا ذکر آچکا ہے اس کی ہجو میں ایک قطعہ کہا تھا جو محفلوں اور خانقاہوں میں کافی مشہور ہوگیا تھا۔ شریر لوگوں نے شیخ گدائی کے دیوان خانہ اور مسجد میں بھی یہ شعر لکھ دیا تھا تاکہ وہ اسے پڑھ لے۔ اس نے اسے مٹوا دیا۔ اس قطعہ کا ایک شعر یہ ہے ؎

نام گدائی مسبہ نان گدائی مخور
زانکہ گدائی بدست روی گدائی سیاہ

بعد میں چل کر اس کی بعض ایسی حرکتوں کا انکشاف ہوا جو اس کی بداعمالی، حماقت اور بدنیتی کو ظاہر کرتی تھیں اس کا ذکر بھی مناسب موقع پر آجائے گا۔

میر عبد اللطیف قزوینی انہی دنوں عراق سے میر عبد اللطیف[1] جو قزوین کے معزز خاندان سادات سیفی کے سربرآوردہ آدمی تھے ۹۶۳ھ میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ بادشاہ نے لسان الغیب حافظ شیرازی کا دیوان ان سے سبقاً سبقاً پڑھنا شروع کیا۔

ان کے لڑکے کا نام غیاث الدین ہے جس کو نقیب خاں کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ شخص نہایت ذہین اور جامع العلوم ہے۔ چنانچہ علم سیرت، تاریخ اور اسماء الرجال اور دوسرے تمام مروجہ علوم میں اس کی نظر بڑی گہری ہے وہ بلاشبہ اس دور میں باعث برکت بلکہ صحیح معنوں میں ثانی لوح محفوظ ہے۔ راقم الحروف کو بھی اس کے ساتھ ہم جماعتی، ہم عصری اور دینی اخوت کا شرف حاصل ہے۔ وہ ان دنوں بادشاہ سلامت کی خدمت میں تاریخ، نظم و نثر اور دوسرے علوم کی کتابوں کے پڑھنے پر مامور ہے۔

قلعہ گوالیار پر قبضہ ۹۶۶ھ میں گوالیار کا قلعہ فتح ہوا۔ گوالیار کے قلعہ میں عدلی کا ایک غلام بھبل خاں نامی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اس نے امان حاصل کر کے قلعہ کی کنجی شاہی کارندوں کے حوالہ کردی۔ "فتح باب قلعۂ گوالیار" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔

رنتھبور کا قضیہ اسی سال عدلی کے ایک اور غلام سنگرام خاں نے رنتھبور کا قلعہ رائے سرجن ہارا کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے: اکبر بادشاہ نے آگرہ میں آنے سے پہلے امیروں کی ایک جماعت کو جن میں ہندو بیگ اور دوسرے مغل امیر شامل تھے، قلعۂ رنتھبور کی تسخیر کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان امیروں نے سنگرام خاں پر حملہ کر کے قلعہ کے مضافات کو بری طرح لوٹا، لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی اور قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ جب بیانہ کی جاگیر خانخاناں کے ایک غلام حبیب خاں کو دی گئی اور لیسادر و تودہ ترک علی جو تودہ بھون کے نام سے مشہور ہے چغتائی خاں کے حوالہ ہوا تو حبیب خاں کو میر لشکر بنا کر رنتھبور کی مہم پر مقرر کیا گیا۔ اس نے قلعہ کو ایک سال تک محاصرہ میں رکھا۔ اس طویل محاصرہ سے قلعہ والے تنگ آگئے اور صلح کی بات چیت کرنے پر مجبور ہوگئے سنگرام خاں نے حبیب خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنا ایک قاصد ہمارے پاس روانہ کریں تاکہ ہم اپنی شرائط اسے بتا دیں۔

---

[1] میر عبد اللطیف قزوینی: یہ اعاظم سادات حسینی سیفی میں سے تھے والد کا نام قاضی میر یحییٰ تھا۔ میر علاؤ الدولہ صاحب تذکرہ ان کا بھائی ہے۔ قزوین کے سنی شاہ طہماسپ صفوی کے مخالف تھے اس لیے بادشاہ نے ان پر سختی کی اور وہ بھاگ کر گیلانات کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ جب ہمایوں ایران پہنچا تو ان سے ملاقات ہوتی تھی ۹۶۳ھ میں ہندوستان آکر اکبر سے متعلق رہے۔ ۵ رجب ۹۸۱ھ کو فتح پور سیکری میں انتقال کیا۔ قلعہ اجمیر میں سید حسین جنگ سوار کی درگاہ میں ان کی قبر ہے قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ وفات "فخر آل یٰسین" نکالی ہے۔

مغل سرداروں نے میرے والد کو حاجی بھیکن لیساوری کے ساتھ اس سفارت کے لیے منتخب کر کے روانہ کیا۔ بڑی ردوکد کے بعد سنگرام خاں چند شرطوں پر قلعہ سپرد کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ایک شرط یہ تھی کہ اسے نقد روپیہ اور مال واسباب دیا جائے، دوسری یہ کہ شاہی ملازمت میں اس کے معاش کی بھی کوئی سبیل نکالی جائے۔ امیروں نے اس کے ان مطالبوں کی بجائے ٹال مٹول سے کام لیا۔ ان کے پاس روپیہ بھی نہیں تھا جو اسے دیتے، اسی لیے وہ قلعہ پر زبردستی ہی قبضہ کر لینے کی فکر کرنے لگے تھے۔ امراء کے اس رویہ کو دیکھ کر اس نے رنتھبور کا قلعہ رائے سرجن کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ شاہی لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لینے کی ہر طرح کوشش کی لیکن ان کو کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قلعہ کو حوالہ کر دینے کے بعد سنگرام خاں تو حاجی خاں الوری کے ساتھ گجرات کی طرف نکل گیا اور رائے سرجن نے قلعہ میں کافی رسد اور سامانِ جنگ پہنچا کر اسے اچھی طرح مستحکم کر لیا اور رسد و محصول کی وصولیابی کے بہانے قلعہ سے متعلقہ بعض پرگنوں پر بھی قابض ہوگیا۔ غنیم کے اس تسلط کے بعد حبیب علی خاں اور دوسرے امیر کافی نقصان اٹھا کر اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

قلعہ چنار کا قضیہ

اسی سال عدلی کے غلام جمال خاں نے جو چنار پر قابض تھا ایک قاصد دربار میں بھیجا اور درخواست کی کہ اگر بادشاہ کسی تجربہ کار لائق آدمی کو روانہ کریں تو میں قلعہ اس کے حوالے کر دوں گا۔ اس کے عریضہ پر خان خاناں نے مہر علی بیگ سلاوز کو جس نے بعد میں خانی کا اعزاز پایا تھا اور قلعہ چتوڑ کا حاکم مقرر ہوا تھا، جمال خاں کے قاصد کے ساتھ روانہ کیا اور جمال خاں کے نام ایک تسلی آمیز فرمان بھی بھیج دیا۔

اس زمانہ میں مَیں پڑھنے کے ارادہ سے وطن سے بیساور اور وہاں سے آگرہ پہنچا تھا اور مہر علی بیگ سے تعارف ہو جانے کی وجہ سے اسی کے گھر پر رہا کرتا تھا۔ مہر علی بیگ نے اس سفر میں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے بڑا اصرار کیا اور میرے استاد مرحوم شیخ مبارک ناگوریؒ اور والد مرحوم شیخ ملوک شاہ سے بھی سفارش کرائی، یہاں تک مجبور کیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہ چلے گا تو میں اس سفر کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا۔ دونوں بزرگوں نے مروت و آشنائی کی وجہ سے مجھے اس سفر کی اجازت دے دی۔ میں بھی مجبوراً تعلیم ترک کر کے عین برسات میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

ہم لوگ قنوج، لکھنو، جون پور اور بنارس کی سیر کرتے، جگہ جگہ کے عجائبات دیکھتے اور ہر شہر کے علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ماہ ذی قعدہ ۹۶۶ھ میں گنگا کے کنارے آئے اور دریا عبور کر کے چنار پہنچے۔

جمال خاں نے اپنے آدمیوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ مہر علی کو قلعہ کے اندر لے گئے اور وہاں اسے شیر شاہی اور سلیم شاہی دور کی عمارتیں دکھائیں اور قلعہ کے ساز و سامان کا معاینہ کرایا۔ قلعہ والوں نے ہماری مہمانی اور ضیافت بڑی کشادہ دلی کے ساتھ کی۔ جس وقت جمال خاں کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں قلعہ چنار کے عوض جون پور کے پانچ پرگنے دیے جانے کا وعدہ تھا تو جمال خاں نے جسے اس سے زیادہ کی توقعات تھیں یہ چاہا کہ مہر علی کو اس وقت تک قلعہ میں روک لے جب تک کہ دربار سے اس کے عریضے کا جواب آجائے۔

اس اثنا میں اس نے خان زماں سے علٰحدہ گفت و شنید شروع کر دی اور تیسری طرف فتح خاں افغان بنی سے بھی جو اپنی جمعیت کے ساتھ رہتاس کے قلعہ پر قابض تھا، قلعہ سپرد کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب مہر علی کو اس کے اس مکر و فریب کا علم ہوا تو

اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں فتح خاں اور جمال خاں مل کر اسے کسی آفت میں نہ ڈال دیں۔ اس ڈر کے مارے وہ ہمیں اسی جگہ چھوڑ کر سیر کے بہانے قلعہ سے نکلا اور گنگا عبور کر کے تنہا چلا گیا۔ اس کے تمام ساتھی قلعہ میں رہ گئے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے جمال خاں سے چاپلوسی کی باتیں کیں اور اسے یہ یقین دلایا کہ میں کسی طرح مہر علی کو واپس لاتا ہوں تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی چنانچہ میں شام کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر گنگا کو عبور کرنے لگا۔ اتفاق سے کشتی پہاڑ کے دامن میں ایک خوفناک بھنور میں پھنس گئی۔ یہ بھنور قلعہ کی دیوار کے قریب ہی تھا اسی وقت ہوا کا ایک تیز سناٹا آیا اور کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ اگر اس وقت اللہ کی مہربانی شامل حال نہ ہوتی تو بلاشبہ کشتی اس بھنور میں چکراتی ہوئی پہاڑ سے ٹکراتی اور اس کے پرخچے اڑ جاتے ؎

رسیدم من بہ دریائے کہ موجش آدمی خوار است

نہ کشتی اندراں دریا نہ ملاحے عجب کار است

غرض بڑی مشکلوں سے کشتی ساحل سے جا لگی اور ہم اس جنگل میں جو کوہ چنار کے دامن میں ہے شیخ محمد غوث کے ٹھکانے پر پہنچے، یہ ہندوستان کے ممتاز شیخ اور صاحب دعوت بزرگ تھے اور اس ویرانہ میں بارہ سال سے مقیم تھے۔ ان کی گزر بسر جنگل کے پھول اور درختوں کے پتوں پر تھی۔ دعوت دین کی برکت کی وجہ سے ان کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ عالی مرتبت بادشاہ خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کے آستانہ پر سر جھکاتے تھے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری

جب مہر علی آگرہ پہنچ گیا تو چنار کے قلعہ پر عدلی کے غلام فتو نے قبضہ کر لیا۔ ۹۶۶ھ میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے۔ اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ شیخ گدائی کو حسد اور نفاق کی وجہ سے آگرہ میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا، کیوں کہ شیخ محمد غوث کی وجہ سے اس کی مشیخت کی دکان پھیکی پڑ رہی تھی ؎

بر نزد خرد ایں سخن روشن است

کہ ہم پیشہ ہم پیشہ را دشمن است

خان خاناں کے مزاج میں شیخ گدائی کا بڑا دخل تھا اس لیے خان خاناں بھی شیخ محمد غوث سے کھل کر نہیں ملا بلکہ اس نے کئی ایک مجلسیں منعقد کیں وہ ان مجلسوں میں شیخ کا ایک رسالہ پڑھ کر سناتا تھا جس میں شیخ نے اپنی معراج کا حال لکھا ہے کہ حالت بیداری میں مجھ سے خدا نے گفتگو کی اور حضور اکرم پر مجھے ترجیح دی ان مجلسوں میں ایسی ہی دوسری خرافات کا تذکرہ کر کے شیخ کی ذات پر کیچڑ اچھالا جاتا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے شیخ محمد غوث ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے اور وہاں ہدایت و رشد کی مہم میں مشغول رہے۔ ایک کروڑ کی جاگیر پر جو انھیں بادشاہ کی طرف سے ملی تھی قناعت کر لی۔

اسی سال خان زماں کا بھائی بہادر خاں سزاول خاں کے لڑکے باز بہادر کے مقابلہ پر گجرات کی طرف مامور کیا گیا۔ وہ سیری کے قصبہ تک پہنچا تھا کہ خان خاناں کے قضیے اٹھ کھڑے ہوئے چنانچہ وہ دربار میں واپس آگیا۔

اسی سال اندری سے حسین خاں آگرہ آیا اور چند سربرآوردہ امراء کو اپنے ساتھ لے کر رنتھمبور کی طرف گیا اور سوپر پہنچ کر اس نے

بڑے نمایاں کارنامے انجام دیے اور پھر وہاں سے اس نے قلعہ رنتھمبور پر حملہ کیا اور رائے سرجن کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ قلعہ میں لے کر گیا اور اس سے قلعہ داری کا جائزہ لے لیا، لیکن وہ بھی خانخاناں کے جھگڑے کی وجہ سے اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر گوالیار آگیا اور وہاں سے مالوہ جانے کا ارادہ کیا تھا کہ خان خاناں نے اسے آگرہ میں طلب کر لیا۔

اکبر دہلی میں

۹۶۷ھ میں اکبر نے شکار کے ارادہ سے جمنا کو عبور کیا۔ اس موقع پر مطلب پرستوں نے جن میں ادھم خاں جو ماہم انکہ کی فرزندی کی وجہ سے سب سے زیادہ مقرب تھا اور صادق محمد خاں پیش پیش تھے، خانخاناں کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے کیوں کہ ان تمام امیروں کو خان خاناں سے اس کی مستقل وکالت کی وجہ سے بڑا حسد تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خانخاناں سلطنت کے در و بست پر اس طرح قابض تھا کہ بادشاہ بھی اس کے ہاتھوں تنگ آچکا تھا۔ اس کی بادشاہت تو بس برائے نام تھی، سب کچھ خان خاناں کے ہاتھ میں تھا۔ بعض وقت تو ضروری اخراجات کے لیے بھی بادشاہ کو خود بڑی تنگی ہو جاتی تھی۔ خزانہ بالکل ہی خالی تھا۔ بادشاہ کے عملہ کے جتنے لوگ تھے وہ سخت پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ انھیں جاگیریں بھی بڑی خراب دی گئی تھیں، اس کے برعکس خان خاناں کے جتنے ملازم تھے وہ بڑے خوش حال رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہی امراء خان خاناں کے زوال کے آرزومند رہتے تھے۔

بیرم خاں کے خلاف سازشیں

جب شہنشاہ کی سواری دہلی سے نصف مسافت پر سکندرہ راؤ میں پہنچی تو وہاں ماہم انکہ نے اطلاع دی کہ دہلی میں بیگم بادشاہ سخت بیمار ہیں اور بادشاہ سلامت کو بار بار یاد کرتی ہیں۔ یہ سُن کر اکبر نے دہلی کا ارادہ کیا۔ جب شاہی لشکر دہلی پہنچا تو دہلی کے حاکم شہاب الدین احمد خاں نے استقبال کیا۔ دہلی میں تمام امیروں نے مل کر خان خاناں کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی اور رائی کا پہاڑ بنا کر بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکا دیا ؎

خال و خط و زلف و ابرو یت یک جا شدند

از برائے کشتن مسعود محضر مے شوند

ان لوگوں نے خان خاناں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی اور مظلومی دکھلانے کے لیے ایسا ڈھونگ رچایا کہ کہنے لگے حضور کی دہلی میں تشریف آوری پر خان خاناں یہی سمجھے گا کہ ہم لوگ ہی آپ کو یہاں لے کر آئے ہیں اور وہ یقیناً ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا، ہم چونکہ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے مناسب یہی ہے کہ حضور ہمیں مکہ معظمہ چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

اکبر کو ماہم انکہ کی جدائی گوارا نہیں تھی اس لیے اس نے تمام امیروں کی دلدہی کی اور خانخاناں کو پیغام بھیجا کہ "ہم تمھاری اجازت کے بغیر دہلی چلے آئے اور اب ہمارے تمام ملازم تمھاری طرف سے خوفزدہ ہیں، تمھیں چاہیے کہ تم ان سب کی تسلی کر دو تاکہ یہ سب مطمئن ہو جائیں"۔

خانخاناں نے خواجہ امینا، حاجی محمد خاں سیستانی اور ترسون محمد خاں کو شہنشاہ کے دربار میں بھیج کر اپنی طرف سے بڑی عذر خواہی کی اور اپنی خیر خواہی اور خلوص کو جتلانا چاہا لیکن اکبر نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان لوگوں کو بھی واپسی سے روک دیا اور یہاں تمام امور سلطنت شہاب الدین احمد خاں اور ماہم انکہ کے ذریعہ انجام پانے لگے۔ ان لوگوں نے اس بات کا خوب پروپیگنڈہ کیا کہ "بادشاہ سلامت خانخاناں سے ناراض ہو چکے ہیں"۔ آگرہ میں جتنے امیر تھے سب ایک ایک کر کے دہلی پہنچنے لگے۔ سب سے پہلے قیام خاں گنگ آگرہ چھوڑ کر آیا۔ وہاں سے جو امیر بھی آتا تھا شہاب الدین احمد خاں وغیرہ اس کی جاگیر اور منصب میں اضافہ کر دیتے تھے۔ ان امیروں نے دور اندیشی

سے کام لیا اور قلعہ کی مضبوطی کا بھی بخوبی انتظام کر لیا۔

بیرم خاں کی مکہ کو روانگی

خانخاناں نے جب بساطِ الٹتی ہوئی دیکھی تو اپنے مصاحبوں وغیرہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی وغیرہ نے رائے دی کہ ایک منٹ ضائع کیے بغیر دہلی جا کر بادشاہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا جائے لیکن خان خاناں نے یہ تجویز پسند نہ کی اور کہا کہ اکبر کا مزاج میری طرف سے پھر گیا ہے، اس لیے اب میرا اور اس کا نبھاؤ مشکل ہے۔ اس سے قطع نظر میری ساری عمر خیر خواہی میں گزری ہے اب بڑھاپے میں نمک حرامی کا داغ لگا کر میں بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔

خانخاناں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر حج کا ارادہ کیا اور بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔ آگرہ کے تمام سرداروں اور امراء کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کر کے دہلی رخصت کر دیا۔ مالوہ سے بہادر خاں کو بھی بلا کر ان لوگوں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بیانہ کے قید خانہ سے محمد امین دیوانہ کو بھی رہا کر دیا۔

دہلی میں امراء نے اکبر کو سمجھایا کہ خانخاناں پنجاب کا عزم کیے ہوئے ہے اور اس کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ اکبر نے میر عبداللطیف قزوینی کے ذریعہ خانخاناں کو پیغام بھیجا کہ اب ہم نے سلطنت کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے تم عرصہ سے حج پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے، اس لیے تم کوئی علاقہ اپنی جاگیر کے لیے تجویز کر لو، تمہارا گماشتہ اس کی آمدنی مکہ میں تمہارے پاس بھیجتا رہے گا۔

خانخاناں پہلے ہی سے یہ عزم کیے ہوئے تھا، یہ فرمان قبول کر کے وہ میوات سے ناگور کی طرف چلا گیا۔ سرداروں میں سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا البتہ ولی بیگ ذوالقدر، حسن قلی خاں جو بعد میں خانِ جہاں بنا، اسماعیل قلی خاں اور اس کے بھائی شاہ قلی خاں اور حسین خاں خویش مہدی قاسم خاں اس کے ہمراہ ناگور تک آئے۔ ناگور پہنچ کر خانخاناں نے سارا سامان جلوس نقارہ اور علم وغیرہ حسن قلی خاں کے ہاتھ دربار میں بھیج دیا۔ جب وہ حدود بیکانیر میں پہنچا تو شیخ گدائی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر نکل گیا۔

ابوالمعالی کی گرفتاری

اکبر نے دہلی سے پنجاب جانے کا ارادہ کیا۔ جس دن اس نے قصبۂ جھجھر میں منزل کی حسن قلی خاں مع سازوسامان کے حاضر ہوا۔ اسی منزل میں شاہ ابوالمعالی بھی خدمت شاہی میں حاضر ہوا لیکن اس نے یہ گستاخی کی کہ سواری کی حالت ہی میں بادشاہ کو تسلیمات کی۔ اکبر کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور اسے گرفتار کر کے شہاب الدین احمد خاں[1] کے سپرد کر دیا۔

بیرم خاں کا تعاقب

اسی منزل میں پیر محمد خاں شیروانی بھی جو خانخاناں کا حال سن کر گجرات سے لوٹ آیا تھا، باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب اور سرداری کا سامان دے کر خانخاناں کے تعاقب میں روانہ کیا تاکہ وہ جا کر خانخاناں کو جلد از جلد مکہ روانہ کر دے اور ہندوستان ٹھہرنے کی مہلت نہ دے۔ پیر محمد خاں فوراً ہی شاہی لشکرگاہ سے رخصت ہو گیا اور ناگور کے قریب پہنچ کر قیام کیا اور ایک دو منزل کی مسافت پر یہ شعر ایک رقعہ میں لکھ کر خان خاناں کے پاس بھیج دیا ؎

آمدم در دل اساس عشق محکم ہمچناں
باغمت جان بلا فرسودہ ہمدم ہمچناں

خان خاناں نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

---

[1] بیرم خاں کے زوال میں ماہم انکہ شہاب الدین احمد خاں کے علاوہ حمیدہ بانو بیگم کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

"آمدن مردانہ اما نزدیک رسیدہ توقف کردن نامردانہ"

(تم آئے یہ تمھاری بہادری تھی لیکن قریب آکر ٹھٹک گئے یہ تمھاری نامردی ہے)

خانخاناں کو پیر محمد[1] خاں کے تعاقب سے بہت رنج ہوا اور وہ ناگور سے کوچ کر گیا۔ چونکہ جودھ پور کے راجہ مالدیو نے بڑی جمعیت کے ساتھ گجرات کا راستہ روک رکھا تھا اسی لیے وہ بیکانیر کی طرف چلا گیا۔ یہاں بعض لوگوں نے اسے بہکایا اور اس نے گجرات کے بجائے پنجاب کا رُخ کیا۔ اپنے تمام اہل و عیال کو اپنے تین برس کے لڑکے مرزا عبدالرحیم سمیت جو اس وقت خانخانی اور سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز ہیں شیر محمد خاں دیوانہ کی جاگیر میں تبرہندہ کو روانہ کر دیا۔ خانخاناں نے شیر محمد خاں کو اپنا فرزند بنا لیا تھا اسی بھروسے پر اس نے اس کی پناہ میں اپنے خاندان کو بھیج دیا تھا، لیکن شیر محمد خاں نے اس کی سابقہ مہربانیوں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور اس کے خاندان کی ہر طرح توہین کی۔ خانخاناں دیپال پور پہنچا تھا کہ اسے یہ حال معلوم ہوا، اس نے شیر محمد خاں کی فہمایش کے لیے خواجہ مظفر علی دیوانہ اور درویش محمد اوزبک کو روانہ کیا تاکہ یہ لوگ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھیں۔ شیر محمد خاں نے ان کی کچھ نہ سُنی بلکہ اس نے خواجہ مظفر علی کو قید کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ خانخاناں کو سب سے زیادہ صدمہ شیر محمد خاں کی اس طوطا چشمی سے ہوا۔

بیرم خاں کی شکست

خانخاناں نے اب جالندھر کا رُخ کیا۔ یہاں اکبر کے اشارہ سے پنجاب کے امیروں شمس الدین خاں اتکہ اس کے بیٹے یوسف محمد خاں اور شہاب خاں کے داماد حسین خاں وغیرہ نے اس کا راستہ روک دیا، موضع کنور پھلور پرگنہ دکھدار میں سخت مقابلہ[2] ہوا۔ خانخاناں کی طرف سے مہدی قاسم خاں کے داماد حسین خاں نے بڑی مردانگی دکھائی، لیکن زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اسے ولی بیگ اور اس کے بیٹے اسماعیل قلی خاں کے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا گیا۔ خانخاناں یہاں سے شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اس لڑائی میں اس کا جو کچھ مال و اسباب تھا سب کا سب لٹ گیا۔ لوٹ کے اس مال میں ایک مرصع علم بھی تھا جس پر موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے، اسے خانخاناں نے ایک کروڑ کے صرفہ سے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا کے مزار پر چڑھاوے کے لیے مشہد مقدس روانہ کرنے کے لیے تیار کرایا تھا۔ اس علم کی تاریخ قاسم ارسلان نے کہی تھی:

"علم ہشتم"

اتکہ خاں نے مال غنیمت کے ساتھ یہ علم بھی بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔

اکبر نے پنجاب سے دہلی واپس ہونے کے بعد کابل سے منعم خاں کو وکالت کا عہدہ دینے کے لیے بلوا بھیجا۔

بیرم خاں کی فیاضی

اسی سال خانخاناں نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل اپنے نام سے مشہور کر دی تھی اور اس کے عوض اس نے شاعر کے پاس ساٹھ ہزار تنکہ روانہ کر کے اس سے پوچھا تھا "یہ رقم کم تو نہیں؟" اس نے فی البدیہہ بطور لطیفہ

---

[1] پیر محمد خاں۔ "منتخب اللباب" (جلد سوم صہ ۱۸۳) میں پیر محمد خاں کو دکن کا رہنے والا بتایا گیا ہے کہ وہ وہاں تین چار سال کسی جرم میں قید کاٹ کر بیرم خاں کے پاس چلا گیا تھا۔ خان نے اسے پہلے اپنے کتب خانہ کا داروغہ مقرر کیا تھا۔

[2] بیرم خاں کی شکست: اس جنگ کے نتیجہ کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ اکبری اور جہانگیری دور کے مصنفوں نے بیرم کی شکست ہی لکھی ہے۔ لیکن خافی خاں نے لکھا ہے، "ان مورخوں نے محض بادشاہ کی رعایت سے اصل واقعہ پر پردہ ڈال دیا ہے ورنہ حقیقت میں شکست خان اعظم شمس الدین خاں اتکہ کو ہوئی تھی اور بیرم خاں مظفر و منصور ہوا تھا (منتخب اللباب صہ ۱۴۹ مطبوعہ کلکتہ)

فرشتہ نے بھی شکست کی تائید کی ہے اس نے اس جنگ کا مقام ماچھی واڑہ لکھا ہے، جو اس کی غلطی ہے۔ بیرم خاں کا فتح کے باوجود پیچھے ہٹ جانا محض اس کی بادشاہ سے نمک حلالی تھی نہ کہ کمزوری۔

لکھا "ساٹھ کم ہیں"ل۔ خان نے چالیس ہزار تنکہ مزید روانہ کر کے ایک لاکھ پورے کر دیے۔ وہ غزل یہ ہے:

من کیستم عنانِ دل از دست دادۂ
وز دست دل براہ غم از پا فتادۂ
دیوانہ وار در کمر کوہ گشتۂ
بے اختیار سر بہ بیاباں نہادۂ
گاہے چو شمع ز آتش دل در گرفتۂ
گہ چو فتیلہ با دل آتش فتادۂ
بیرم ز فکر اندک و بسیار غم
ہرگز نگفتہ ایم کمی یا زیادۂ

اسی شاعر ہاشمی کا ایک اور مطلع ہے ؎

لبت خنداں بود از چشم گریانی کہ من دارم
دلت جمعست از حال پریشانی کہ من دارم

خانخاناں نے اسی طرح باوجود خزانہ خالی ہونے کے رام داس لکھنوی کو ایک مجلس میں ایک لاکھ تنکہ نقد و جنس کی صورت میں انعام دیا تھا۔ رام داس اسلیم شاہ کے گویوں میں سے تھا، موسیقی میں اسے تان سین ثانی کہا جا سکتا ہے، یہ گویا خلوت و جلوت میں خانخاناں کا ہمدم تھا اور وہ اس کی خوبصورتی سے اپنی آنکھیں سینکا کرتا تھا۔

اسی طرح حجاز خاں بدایونی کو خانخاناں کے نام پر ایک قصیدہ لکھنے کے صلہ میں ایک لاکھ تنکہ نقد خانخاناں کے خزانہ سے دیے گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے سرہند کی پوری سرکار کا امین بنا دیا گیا تھا۔ حجاز خاں کو علم نقارہ کا امیرانہ اعزاز حاصل تھا اور وہ پہلے افغانی امرا کے زمرہ میں شامل تھا۔ آخر عمر میں اس نے سپاہ گری ترک کر کے معمولی معاش پر قناعت کر لی اور زہد و عبادت کی روش اختیار کر لی تھی جس قصیدہ پر خانخاناں نے اسے یہ گرانبہا صلہ دیا تھا اس کا مطلع ہے ؎

چوں مہرۂ نگین سما شد فرو بر آب
پرکار خاتمش بر زمیں داد لعل ناب

یہاں خواجہ کلاں بیگ کی یہ بات پوری صادق آتی ہے کہ عالم بالا کی شعر شناسی کا حال بھی کھل گیا۔ بہرحال خان کی ہمت بلند

ل جواب نہایت معنی خیز ہے۔ "کم" کے عدد نکالے جائیں تو ساٹھ ہوتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ کہ انعام ساٹھ ملا ہے کافی سمجھ لیجیے، دوسرا یہ کہ معاوضہ کم ہے کچھ اور عنایت ہو۔ یہ واقعہ جس رنگ میں تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے اس سے بیرم کے خلاف اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ سوچنے کی بات ہے خود نغزگو شاعر تھا، وہ خود بھی ایسی غزل لکھ سکتا تھا اسے زبردستی دوسرے کی غزل پر قبضہ کرنے پھر اس کا معاوضہ دینے کی آخر کیا ضرورت تھی جب کہ وہ خود مستعار اشعار لینے کی مذمت کرتا ہے ؎

امروز شاعران دگر از کمال جہد — از شعر مستعار ندارند ننگ و عار
اشعار بندہ چوں دگراں مستعار نیست — دارم ہزار عار ز اشعار مستعار

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہاشم قندھاری کو جو اس کے دامن دولت سے وابستہ تھا معقول صلہ دینے کے لیے یہ بہانہ پیدا کیا ہو۔

کے سامنے ایک لاکھ بس ایک کے برابر تھے۔

اسی سال ماہ ذی قعدہ میں پنجاب پر اتکہ خاں کے تقرر کے بعد دربار شاہی سے خواجہ عبدالمجید ہروی کو آصف خاں کا خطاب ملا اور وہ دہلی کی حکومت پر فائز ہوا۔ حسین قلی خاں کو اس بنا پر کہ اس کا باپ ولی بیگ اور اس کا بھائی اسماعیل قلی خاں خانخاناں کے ہمراہ تھے، آصف خاں کے سپرد کر دیا گیا اور بادشاہ کی سواری پنجاب کی طرف روانہ ہوئی۔

منعم خاں کی وزارت

اسی سفر کے دوران حسب الحکم منعم خاں کابل سے تردی بیگ خاں کے بھانجے مقیم خاں کے ساتھ جس کو بعد میں شجاعت خاں کا خطاب ملا تھا، آکر لودھیانہ کی منزل میں باریاب ہوا۔ اسے خانخاناں کا خطاب اور قلم دان وزارت تفویض کر دیا گیا۔

اتکہ خاں کے فتح پانے اور خانخاناں کے کوہ سوالک کی طرف فرار کی خبر بھی اسی منزل میں پہنچی تھی اور بادشاہ نے اسیران جنگ کا معائنہ کر کے ان کو قید خانہ میں بھجوا دیا، ولی بیگ جو بری طرح زخمی ہو گیا تھا قید خانہ ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا اور اس کا سر کاٹ کر دہلی بھیج دیا گیا حسین خاں کو اس کے سالے ملک محمد خاں ولد ملاں قاسم خاں کے حوالہ کر دیا گیا، آخر میں بادشاہ کی نظر عنایت اس پر ہوئی اور اسے بیتالی کا قصبہ جاگیر میں مرحمت ہوا۔ بتیالی دریائے گنگا کے کنارے ہے اور امیر خسرو کی جائے پیدائش ہے۔

بیرم خاں کی اطاعت

شکست کے بعد خانخاناں بیرم خاں تلوارہ میں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ تلوارہ شمالی کوہستان میں ایک بلند اور مستحکم مقام ہے اور راجہ گوبند چند کی عملداری میں ہے۔ شاہی فوجوں نے بھی تلوارہ پر یلغار کر کے جنگ چھیڑ دی۔ بادشاہی لشکر میں سے سلطان حسین جلائر جو نہایت خوش قامت اور بہادر نوجوان تھا ہلاک ہو گیا۔ لوگ جب مبارک باد دیتے ہوئے اس کا سر خانخاناں کے پاس لے گئے تو اس نے اس کی آنکھوں کو چوم لیا اور اس کی حسن خدمات کو یاد کر کے ہائے ہائے کر کے رونے لگا اور کہا "میری زندگی پر ہزار لعنت کہ میرے نفس کی خاطر ایسے ایسے جوانوں کی زندگی خاک میں مل رہی ہے۔" اس علاقہ کے ہندوؤں نے خانخاناں کو بڑا حوصلہ دلایا، لیکن مسلمانوں کا غم اس کے دل کو ایسا لگا تھا کہ سارے ارادے ترک کر کے اپنی عاقبت کے ڈر سے اپنے قصوروں کا معافی نامہ ایک غلام جمال خاں نامی کے ہاتھ بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا اور خدمت شاہی میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔ ملا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک کو اس کو لانے اور دلاسا دینے کے لیے روانہ کیا گیا۔ دونوں طرف سے قاصد آ جا رہے تھے اور ساتھ ہی معرکۂ کارزار بھی گرم تھا۔ منعم خاں چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دلیرانہ خانخاناں کے مقام پر جا پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔

جب خانخاناں کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بادشاہ کے حکم سے تمام امیر اس کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ حسب سابق کورنش بجا لا کر اس کی تعظیم کی گئی۔ شہنشاہ نے اس کے قصور[1] معاف کر دیے اور خاص خلعت اور گھوڑا مرحمت فرمایا۔ منعم خاں اسے اپنے ٹھکانہ پر لے گیا اور اس کے لیے تمام ساز و سامان کے ساتھ سراپردہ وغیرہ کا انتظام کر دیا۔ دو دن بعد شایان شان سفر خرچ اسے دے کر مکہ معظمہ کو رخصت کر دیا گیا۔ چھوٹے بڑے تمام امیروں اور مصاحبوں نے اس کی مدد کے لیے نقد اور جنس کا چندہ کر کے جسے ترک "چندوغ" کہتے ہیں اس کی خدمت میں پیش کیا۔ حاجی محمد خاں سیستانی کو اس کی رہبری کے لیے نامزد کر کے دہلی کی طرف روانہ کیا گیا اور بادشاہ سلامت

---

[1] اکبر نے بوڑھے بیرم خاں کے سامنے تین صورتیں رکھی تھیں (۱) حکومت کی تمنا ہو تو چندیری اور کالپی عطا کر دیا جاتا ہے (۲) مصاحبت منظور ہو سابقہ اعزاز و احترام کے ساتھ ہمارے ہمراہ رہو (۳) حج کا ارادہ ہو تو سفر کا بندوبست کر دیا جائے۔ بیرم خاں نے تیسری صورت قبول کی۔

وہاں سے سیر و شکار کے ارادہ سے حصار فیروزہ کی طرف روانہ ہوئے - چار ربیع الاول ۹۶۸ھ کو سواریِ شاہانہ دہلی پہنچی، وہاں سے بذریعہ کشتی ۲ ربیع الثانی کو دارالخلافہ آگرہ میں نزول اجلال ہوا -

خارِ مغیلاں کہتے ہیں خانخاناں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ناگور کے راستہ سے گجرات کی طرف جا رہا تھا ایک جنگل میں ببولوں کے جھنڈ میں سے گزرنا پڑا، وہاں اس کی دستار کانٹوں میں الجھ کر سر سے گر پڑی - یہ ایک برا شگون تھا اس لیے خانخاناں کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا - حاجی محمد خاں نے اس وقت فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

در بیاباں چوں ز شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

شعر سن کر خانخاں کا تکدر جاتا رہا -

بیرم خاں کی شہادت جس وقت خانخاناں پٹن سے گجرات پہنچا تو پٹن کے حاکم موسیٰ خاں فولادی اور حاجی خاں الوری نے اس کی تعظیم و تکریم کی اور اس کی ضیافت کا اہتمام کیا - دوران قیام میں ایک دن خان خاناں سہنس لنگ نامی ایک تالاب کی سیر کے لیے گیا - مغرب کی نماز کے لیے جب وہ کشتی سے اترا تو ایک پٹھان مبارک خاں نامی کہ خانخاناں نے ہندوستان کی فتح کے زمانہ میں اس کے باپ کے قتل کا حکم دیا تھا اوباشوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر آیا، بہانہ ملاقات کا تھا اور نیت قتل کی، چنانچہ اس نے اچانک خنجر سے بھرپور وار کیا اور بوڑھا خان اسی جگہ شہید ہو گیا - اس کی تاریخ شہادت یہ ہے ؎

بیرم بطوافِ کعبہ چوں بست احرام
در راہ شہید گشت تا یافتہ کام
تاریخ شہادتش ز دل پرسیدم
گفتا کہ شہید شد محمد بیرام[1]

میں نے بھی بلحاظ تعمیہ یہ تاریخ نکالی ہے:

"گفت گل گلشن خوبی نماند"

خانخاناں بڑا رقیق القلب انسان تھا - بزرگوں اور مشائخوں کا نہایت معتقد تھا - اس کی مجلس میں ہمیشہ اللہ رسول کا ذکر رہتا تھا ایک دن سیکری میں وہ ایک گوشہ نشین درویش کی ملاقات کے لیے گیا اور ان سے آیت "تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" کا مطلب پوچھا - چونکہ اس درویش نے تفسیر نہیں پڑھی تھی اس لیے اس کا جواب نہ دیا - خانخاناں نے خود آیت کی وضاحت کی -

"تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ بِالْقَنَاعَةِ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِالسُّؤَالِ"

(تو عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے قناعت کے ذریعہ اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے سوال کے ذریعہ)

بیرم[2] خاں بڑا پابند اوقات تھا، کبھی جماعت اور جمعہ کی نماز قضا نہ ہوئی، لیکن عقائد میں تفضیل کی طرف میلان رکھتا تھا، حافظ

---

[1] یہ تاریخ قاسم ارسلان کی کہی ہوئی ہے - ماثرالامراء کے مصنف نے لکھا ہے میں نے خواب میں یہی تاریخ نکالی تھی - [2] محمد بیرم خاں ترکمان: بیرم خاں کے آبا و اجداد کا تعلق ایران کے "قراقوینلو" نامی ایک ترکمان قبیلہ سے تھا اس قبیلہ کا ایک سردار علی شکر بیگ ترکمان تیموری خاندان سے وابستہ تھا علی شکر کی اولاد میں شیر علی بیگ ترکمان گزرا ہے - یہ مرزا سلطان حسین حاکم ہرات سے لڑتے ہوئے مارا گیا، اس کا بڑا لڑکا یار علی بیگ قندز کی فتح کے بعد بابر کی ملازمت میں آ گیا - بابر نے (باقی اگلے صفحہ پر)

محمد امین خطیب سے کہا کرتا تھا دوسرے صحابہ کی نسبت حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں تعظیم کے چند کلموں کا اضافہ ہونا چاہیے۔

اسی سال میاں حاتم سنبھلی کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کی تاریخ وفات ہے:

"عِندَ مَلِیکٍ مُّقتَدِر"

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اسے غزنی کا حاکم مقرر کیا اس کے مرنے پر اس کا لڑکا سیف علی بیگ حاکم ہوا۔ یہی سیف علی بیگ بیرم خاں کا باپ تھا۔ بیرم خاں بدخشاں میں پیدا ہوا۔ باپ کے مرنے پر بلخ میں جاکر تعلیم حاصل کرتا رہا، جب ۱۶ سال کا ہوا تو ہمایوں کی ملازمت اختیار کی، تیموری خاندان سے اس کا ننھیالی رشتہ بھی تھا۔ (اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۸)۔ بیرم کا رنگ گورا قد متوسط، چہرہ پر داڑھی تھی بیرم علم کا قدردان فن موسیقی کا رسیا خلیق، ملنسار اور منکسر المزاج تھا، ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور تھا دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں، نہایت صاحب ذوق اور سخن شناس تھا، اکثر اساتذہ کے کلام پر اس نے تنقید و اصلاح کی ہے اس کے ساتھ ہی وہ نہایت شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع بھی تھا۔ میدان جنگ میں ایک ماہر جرنیل بہادر سپاہی تھا تو مسند وزارت پر مدبر سیاست داں اور منتظم حاکم تھا۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کا بھی دور دور تک شہرہ تھا بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بیرم نہ ہوتا تو ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اور نہ اکبر ہی تخت سلطنت پر بیٹھ سکتا تھا۔ بیرم خاں کو ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بیرم خاں کے فارسی اور ترکی کلام کا دیوان بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا تھا یہ دیوان ۹۱ صفحات پر مشتمل ہے، فارسی کلام ۵۰ صفحات پر ہے بعد میں ترکی کلام ہے آخر میں اس دیوان کے کاتب نے تممہ کی تاریخ ۷ شوال سنہ ۱۰۱۲ھ اور مقام کتابت جالنہ پور لکھی ہے۔ کاتب کے نام کا پتہ نہیں چل سکا۔ جالنہ نام کا ایک تعلقہ حیدرآباد دکن کے ضلع اورنگ آباد میں ہے شاید یہی مقام ہو۔ اس میں جو غزلیں ہیں وہ نہایت شگفتہ پر لطف اور موثر ہیں ایک غزل کے اشعار ہیں:

حرفے نہ نوشتی دل ما شاد نہ کردی — مارا بہ زبان قلمے یاد نہ کردی
بر یاد تو صد بار کشم نالہ و فریاد — فریاد کہ یک بار مرا یاد نہ کردی
اے کردہ فراموش زغم خواری بیرم — حرفے نہ نوشتی دل ما شاد نہ کردی

ہمایوں اور بیرم خاں میں بڑی محبت تھی، چنانچہ ہمایوں نے کابل سے قندھار میں بیرم کے پاس یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

اے آنکہ انیس خاطر محزونی — چوں طبع لطیف خویش موزونی
بے یاد تو نیستم زمانے ہرگز — آیا تو بیاد من محزوں چونی

بیرم نے جواب میں لکھ بھیجا:

اے آنکہ بذات سایۂ بے چونی — از ہر چہ ترا وصف کنم افزونی
چوں مے دانی کہ بے تو چوں مے گزرد — چوں مے پرسی کہ در فراقم چونی

(ماثر الامراء صفحہ ۳۸۳)

وہ سلطنت کا وزیر مطلق اور نوعمر بادشاہ کا سرپرست تھا۔ اس کے زمانہ میں ہندوستان کا جو حال تھا اس کا ذکر بدایونی نے ان الفاظ میں کیا ہے" در عہد بیرم خاں کہ بہترین عہدہا بود ہند حکم عروس داشت" (منتخب صفحہ ۲۸۹)۔ اکبر نے سنہ ۹۶۵ھ بمقام جالندھر سلیمہ سلطان بیگم کو بیرم خاں کے عقد میں دیا تھا۔ سلیمہ ہمایوں کی بھانجی تھی۔ اس خاتون کے متعلق جہانگیر نے توزک میں یہ فقرہ لکھا ہے" بجمیع صفات حسنہ آراستگی داشتند در زناں ایں مقدار ہنر و قابلیت کم جمع می شود" (توزک جہانگیری صفحہ ۱۱۴) یہ شاعرہ بھی تھی، تخلص مخفی تھا، اس کا ایک شعر (جہانگیر نامہ کشوری صفحہ ۹۶، ماثر الامراء صفحہ ۳۷۶) ہے:

کاکلت را من زمستی رشتۂ جاں گفتہ ام — مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

بیرم کی وفات پر اکبر نے اس سے شادی کر لی تھی (ماثر الامرا صفحہ ۳۷۶، منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۱۵۱، جہانگیر نامہ صفحہ ۹۶) سلیمہ کی وفات ۱۰ ذی قعدہ سنہ ۱۰۲۱ھ کو ہوئی (توزک جہانگیری صفحہ ۱۱۴) بیرم خاں کی اولاد میں صرف مرزا عبدالرحیم خانخاناں کا نام ملتا ہے جو فتح پانی پت کے بعد سنہ ۹۶۴ھ بمقام لاہور پیدا ہوا تھا۔ عبدالرحیم بیرم خاں کی اس بیوی کے بطن سے ہے جو خاندان میوات کی تھی۔ اکبر بیرم خان کو خان بابا اور عبدالرحیم کو مرزا خان کہا کرتا تھا۔ بیرم خاں نے اساتذہ کے کلام پر جو تنقید اور اصلاح کی ہے اس کے مجموعہ کا نام "دخلیہ" ہے۔ بیرم آخر میں سازشیوں کا شکار ہوگیا۔ اس پر نمک حرامی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ خانخاناں نے کھل کر لکھا ہے "بیرم پر حاسدوں کی سازش سے اگرچہ بغاوت کا الزام لگا دیا گیا لیکن عقلمندوں پر ظاہر ہے کہ ترکوں سے نمک حرامی بہت کم وقوع میں آتی ہے، جو لوگ بیرم کو باغی سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں وہ اس تہمت سے پاک اور بری تھا۔ بادشاہ نے بھی اس پر کوئی زیادتی نہیں کی البتہ مخالفین نے سازش کا وسیع جال پھیلا رکھا تھا لیکن وہ بھی اپنے کیے کی سزا پا کر رہے" (منتخب اللباب صفحہ ۱۵۲) فرشتہ نے بیرم خاں کی شہادت جمادی الاول سنہ ۹۶۸ھ لکھی ہے اور وقت صبح کا بتایا ہے۔ بدایونی نماز مغرب کا (باقی اگلے صفحہ پر)

مالوہ کی فتح

اسی سال ۱۲ رجب کو حاکم مالوہ باز بہادر ولد سزاول خاں بڑا لاؤ و لشکر اور ہاتھی لے کر ادھم خاں اور پیر محمد خاں کے مقابلہ پر سارنگ پور سے سات کوس کے فاصلہ پر آیا، یہاں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باز بہادر کو شکست ہوئی۔ اس کا سارا ساز و سامان غنیمت میں آیا اور اس کے حرم کی عورتیں بھی گرفتار ہو گئیں۔

جس دن یہ فتح ہوئی مذکورہ دونوں سردار اپنے ڈیرہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور قیدیوں کو ان کے سامنے پیش کر کے قتل کر دیا جاتا تھا، اس وقت پیر محمد خاں طنز سے فقرے چست کر رہا تھا "اس مقتول کی گردن کتنی موٹی تھی"[۱] وہ اس لاشہ میں سے تو ڈھیروں خون نکلا "انسان اشرف المخلوقات ہے اور خلقت الٰہی کی اساس ہے، اس سنگ دل کی نظر میں اس دن انسان کھیرے ککڑی نظر آ رہے تھے کہ انسانی جان کا اس طرح مذاق اڑا رہا تھا۔ مالوہ کے سید اور مشائخ قرآن اٹھائے ہوئے امان مانگتے ہوئے آئے۔ ظالم نے ان بے قصوروں کو بھی قتل کرا دیا۔

ادھم خاں نے فتح کی ساری روداد شہنشاہ کے پاس لکھ کر روانہ کی اور غنیمت میں ملنے والے چند ساتھی صادق محمد خاں کے ذریعہ حضور میں روانہ کر دیے۔ جتنے عمدہ ہاتھی تھے اپنے لیے رکھ لیے اور باز بہادر کی حرم[۲] کی عورتوں، گائنوں اور طوائفوں کو بھی اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ بہ نفس نفیس ۲۱ شعبان ۹۶۸ھ کو آگرہ سے سارنگ پور پہنچا اور ادھم خاں سے سارا مال[۳] وصول کر کے ۲۹ رمضان کو آگرہ واپس آ گیا۔

خان زماں سے بدگمانی

اسی سال عدلی کے بیٹے شیر خاں نے جو باپ کے مرنے پر چنہار میں اس کا قائم مقام بنا ہوا تھا، ایک بڑی فوج لے کر جون پور پر حملہ کر دیا۔ خان زماں نے ابراہیم خاں اوزبک، مجنوں خاں قاقشال اور شاہم خاں جلائیر کی مدد سے اسے شکست دی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس واقعہ کے بعد ہی اکبر کو خان زماں کے متعلق بدگمانی ہو گئی اور وہ خود جون پور کے ارادہ سے عازم سفر ہوا۔ جب کالپی پہنچا تو وہاں کے حاکم عبداللہ اوزبک نے بادشاہ کی مہمانی کا شرف حاصل کیا۔ یہاں سے سواری کڑہ کی طرف گئی۔ کڑہ میں خان زماں اور بہادر خاں بھی جون پور سے آ کر حاضر خدمت ہوئے اور نذرانے میں عمدہ ہاتھی اور نفیس تحائف گزرانے۔ بادشاہ نے ان دونوں کو خلعتیں اور گھوڑے دے کر ان کی جاگیروں پر رخصت کر دیا۔ اس طرح خان زماں کا یہ قضیہ بخیر و خوبی طے پا گیا اور اس کی تاریخ ہوئی

"اَلصُّلْحُ خَیْرٌ"

۱۔ کشت و خون: دوسرے بیانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان ظالموں نے انتہائی بربریت کا ثبوت دیا تھا جب ان سے پوچھا گیا کہ تم نے جو کچھ کیا ہے کہاں تک انصاف پر مبنی ہے تو انھوں نے جواب دیا "آخر اتنے قیدیوں کے ساتھ اور کیا کیا جا سکتا تھا۔"

۲۔ حرم: ان عورتوں میں جو باز بہادر کے حرم میں تھیں روپ متی بھی شامل تھی۔ روپ متی پر اس سے پہلے ہم ایک حاشیہ لکھ چکے ہیں۔ اکبر جب خود تحقیقات کے لیے پہنچا ہے تو اسے دو قیدی عورتوں کی فریاد پہنچی کہ ادھم خاں نے ان کی آبرو ریزی کی ہے۔ اس نے ان عورتوں کو کیمپ میں بلایا، لیکن ماہم انکہ نے اپنے بیٹے کے جرم کو چھپانے کے لیے ان مظلوم عورتوں کو قتل کرا دیا۔

۳۔ جب اکبر ادھم خاں کی تحقیقات کے لیے چلا تو ماہم انکہ نے ایک قاصد کو اس کی خبر دینے کے لیے بھیجا تھا، لیکن اکبر اس سے پہلے سارنگ پور پہنچ گیا۔ ماہم انکہ بھی دوسرے دن وہاں پہنچ گئی اور مال غنیمت پر قبضہ کر کے ادھم خاں کے معاملہ کو دبا دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وقت بتاتا ہے ماثر رحیمی (ص ۹۸۰) میں جمعہ کا دن ۱۴ جمادی الاول ۹۶۸ھ درج ہے ماثر الامراء (ص ۳۸۱) میں لکھا ہے اس کی لاش سے کپڑے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے تھے بعد میں بیرم خاں کو شیخ حسام الدین کے مقبرہ میں دفن کیا گیا پھر اسے دہلی لایا گیا۔ ۹۸۵ھ میں بیرم خاں کے بھانجے حسین قلی خاں نے حسب وصیت ہڈیوں کو مشہد مقدس میں دفن کر دیا۔

لیکن اس تاریخ میں ایک عدد زائد ہے ؎

منہی اقبال دریں کہنہ دیر
غلغلہ انداخت کہ الصلح خیر

اسی سال ۱۷ ذی الحجہ کو بادشاہ سلامت آگرہ واپس تشریف لے آئے۔

اجمیر کی زیارت ۹۶۹ھ میں اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے اجمیر کا ارادہ کیا اور وہاں پہنچ کر درگاہ کے مجاوروں کو کثیر انعامات عطا کیے۔ اسی سفر میں جب شاہی قافلہ سانبھر کے قصبہ میں پہنچا تو انبیر کے حاکم راجہ بہاڑامل اور اس کا بیٹا رائے بھگوان داس حاضر خدمت ہوئے۔ راجہ نے اپنی ایک لڑکی بھی بادشاہ کے نکاح میں دے دی۔

اکبر نے مرزا شرف الدین حسن کو جس کی جاگیر اجمیر کے مضافات میں تھی قلعہ میرٹھ پر حملہ کرنے کے لیے مامور کیا یہ قلعہ اجمیر سے بیس کوس پر جیمل راجپوت کے قبضہ میں تھا۔ اس مہم کے انتظام کے بعد اکبر دارالخلافہ کو واپس ہوگیا۔

قلعہ میرٹھ کی تسخیر مرزا شرف الدین نے مذکورہ قلعہ پر چڑھائی کر کے محصورین کو اس شرط پر امان دی کہ وہ سب قلعہ خالی کر کے نکل جائیں اور مال و اسباب قلعہ ہی میں چھوڑ دیں۔ جیمل شرائط صلح کے مطابق قلعہ کو چھوڑ کر چلا گیا لیکن اس کے ایک سپاہی دیوداس نامی نے قلعہ سے نکلتے وقت کچھ لوگوں کی مدد سے سارے مال و اسباب میں آگ لگا دی اور شرف الدین کے لشکر پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا۔ آخر خود بھی لڑتے ہوئے مارا گیا اور اس کے ساتھ جو دو سو آدمی تھے وہ بھی ہلاک ہوگئے قلعہ شاہ بداغ خاں اور اس کے بیٹے عبدالمطلب خاں اور دوسرے امیروں کی کوشش سے فتح ہوگیا۔

باز بہادر کا انجام جب ادھم خاں دربار میں چلا گیا تو مالوہ میں پیر محمد خاں بلا شرکت غیرے حاکم ہوگیا اور وہاں اس نے ایک بڑا لشکر جمع کر کے برہان پور اور بیجا گڑھ کے قلعوں کو فتح کیا۔ نربدا ندی کے دوسرے ساحل تک فوج کشی کر کے اس طرح قتل عام کیا کہ وہ سارا علاقہ بے چراغ ہوگیا۔

باز بہادر شکست کھانے کے بعد اس علاقہ کے کئی اور حاکموں کے ساتھ یہاں سے وہاں قزاولی کرتا پھر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ پیر محمد خاں اپنے لشکر سے جدا ہوگیا۔ باز بہادر نے موقع پا کر اس پر حملہ کر دیا۔ پیر محمد خاں گھبرا کر منڈو کی طرف بھاگا اور غنیم کے خوف سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریائے نربدا میں گھوڑے ڈال دیے۔ اس وقت کچھ اونٹ بھی دریا پار کر رہے تھے، ایک اونٹ بدحواس ہو کر اس کے گھوڑے پر آگرا اور وہ اس کے ساتھ ہی دب کر مر گیا۔ پیر محمد خاں کی وفات کے بعد مالوہ پر متعینہ سردار وہاں ٹھہر نہ سکے اور دربار میں واپس چلے آئے حسب الحکم انھیں قید کر دیا گیا چند روز بعد ان کو رہائی ملی۔

مغل سرداروں کی واپسی کے بعد باز بہادر نے اپنے ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ بعد میں عبداللہ خاں ازبک نے معین الدین احمد خاں فرنخودی کی کمک سے دوبارہ حملہ کر کے اسے پھر مالوہ سے بے دخل کر دیا۔ باز بہادر چند روز تو رانا اودے سنگھ کی پناہ میں چتوڑ اور اودے پور میں رہا۔ چند دن اس نے گجرات میں گزارے، آخر مجبور ہو کر دربار شاہی میں حاضر ہوگیا اور اکبر کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ چند دن اسے قید میں رکھا گیا تھا بعد میں رہا کر دیا گیا۔ لیکن موت سے چھٹکارا کہاں رہائی کے چند دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مالوہ کی مہم کے بعد عبداللہ خاں ازبک ہانڈیہ کو اور اس کے معاون امیر اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے اور معین الدین

احمد خاں دربار میں حاضر ہو گیا۔

اسی سال خواجہ عبداللہ مروارید (جو ایک مشہور وزیر گزرا ہے) کا پوتا خواجہ محمد صالح صدارت کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن اس کو صرف دیوان کے اختیارات حاصل تھے۔ انعامات، اراضی کے عطیات اور امداد و وظائف دینے کا اسے اختیار نہیں دیا گیا تھا۔

سفیرِ ایران کی آمد

اسی سال شاہ طہماسپ کی طرف سے ایک سفیر سید بیگ ولد معصوم بیگ ہمایوں بادشاہ کی تعزیت کے سلسلہ میں شاہی مکتوب لے کر آیا (یہ خط ہم آگے نقل کریں گے) دربار میں اس سفیر کی تعظیم و تکریم کی گئی اور بادشاہ نے اسے سات لاکھ تنکہ انعام دیا اور خلعت اور گھوڑا مرحمت فرمایا۔ امراء نے بھی اس کی ضیافت کی اور تحفے دیے۔ وہ ہندوستان سے بے شمار تحائف لے کر لوٹا۔

ادھم خاں کی سرکشی

بادشاہ نے سے اتگہ خاں کو جس کا لقب اعظم خاں تھا، پنجاب سے بلا کر مملکت کا وزیرِ مطلق بنا دیا تھا۔ ادھم خاں کو بادشاہ کے تقرب پر بٹانا نہ تھا اور وہ اس بات سے سخت ناراض بھی تھا کہ ماہم اتگہ سے وکالت کا عہدہ چھین کر اتگہ خاں کو دے دیا گیا۔ اس پر چند حاسد امیروں خاص طور سے منعم خاں اور شہاب الدین احمد خاں نے اسے اتگہ خاں کے خلاف اس قدر ورغلایا کہ اس نے غضب ناک ہو کر عین دربار میں اتگہ خاں پر حملہ کر کے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اسی طرح شمشیر بدست اکڑتے ہوئے حرم شاہی کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاہنشاہ بھی تلوار کھینچے ہوئے باہر نکلے اور اس سے پوچھا "یہ آخر تو نے کیا کیا؟ اس نے بے باکی سے جواب دیا" ایک غدار کو میں نے کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ شہنشاہ کے حکم[۱] سے ادھم خاں کے ہاتھ پیر باندھ کر محل کی چھت پر سے نیچے گرا دیا گیا۔ اس کے جسم میں چونکہ جان باقی رہ گئی تھی اس لیے شہنشاہ نے حکم دیا "اسے دوبارہ گراؤ"۔ اس واقعہ کی تاریخ "دو خون شد" سے نکالی گئی اور دوسری تاریخ ہے "رفت از ظلم سر اعظم خاں"۔

واضح رہے پہلی تاریخ میں ایک عدد زیادہ ہے۔

اعظم خاں کی شہادت پر ایک اور شخص نے تاریخ لکھی ہے:

خانِ اعظم سپاہ اعظم خاں
کہ چو او کس دریں زمانہ ندید
بشہادت رسیدہ ماہ صیام
شربت موت روزہ دار چشید
کاشں سالِ دگر شہید شدی
کہ شدی سال فوت خانِ شہید

ادھم خاں کے چالیسویں کا کھانا کھلانے کے بعد اس کی ماں ماہم[۲] اتگہ بھی بیٹے کے غم میں فوت ہو گئی۔

۱۔ ادھم خاں کی ہلاکت: دوسری تاریخوں میں ہے کہ ادھم خاں کو خود اکبر نے گھونسہ مار کر نیچے گرا دیا تھا اور خود ہی جا کر ماہم اتگہ کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ ماہم بیم نے تیرے دفکے کو قتل کرا دیا ہے۔ وہ جب وہ مری ہے تو اکبر نے اپنی دایہ کے جنازہ کو کندھا دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے اکبر آباد میں ایک ہی جگہ دفن ہیں۔

۲۔ ماہم اتگہ: دوسری تاریخوں میں ماہم انا نہیں تھا، ہمایوں کے ایک وفادار ملازم ندیم خاں کی بیوی تھی یہی وہ عورت ہے جس نے اکبر کی تربیت اور پرورش کی تھی اور اکبر کے ساتھ بیٹوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ ادھم خاں اسی کا لڑکا تھا۔ بایزید لکھتا ہے "اس کی ذات میں کوئی خوبی نہیں تھی نہ عقلمند اور ہوشیار تھی (باقی اگلے صفحہ پر)

اسی سال میرے والد شیخ ملوک شاہ بھی ۷۰۲ رجب کو آگرہ میں انتقال فرما گئے، میں نے ان کی میت لیا اور وہیں لے جا کر دفن کی۔ ان کی تاریخ وفات نکالی ہے ؎

سرِ دفترِ افاضلِ دوراں ملوک شاہ
آں بحرِ علم و معدنِ احسان و کانِ فضل
چوں بود در زمانہ جہانی ز فضل ازاں
تاریخ سال فوت وے آمد جہانِ فضل

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ والد مرحوم کے پیر شیخ پنجو سنبل جن کے ساتھ مرحوم کو بڑی عقیدت و ارادت تھی اسی سال محبوب حقیقی سے جا ملے۔ ان کا بیان بھی انشاء اللہ آگے آئے گا۔ شیخ مرحوم کی تاریخ نکالی گئی ؎

کمال الحق والدین شیخ پنجو
کہ آمد جنت فردوس جائش
ز روئے تعمیہ تاریخ فوتش
شود حاصل ز نام دل کشائش

ان کی دوسری تاریخ ہے:

"درویش دانشمند رحمۃ اللہ علیہ"

منعم خاں کا فرار اور گرفتاری

منعم خاں خانخاناں اور محمد قاسم خاں میر بحر اس خوف کے مارے کہ کہیں وہ ادھم خاں کو بہکانے کے الزام میں پکڑے نہ جائیں اور دوسری بعض وجوہات کی بنا پر بھی سیر کے بہانہ سے کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر گئے اور وہاں کے بعض زمینداروں کی مدد سے دو تین سوار ساتھ لے کر روپڑ اور بجوارہ کے راستہ پہاڑ کے دامن کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے ان کا ارادہ کابل چلے جانے کا تھا کیوں کہ وہاں منعم خاں کا لڑکا غنی خاں حاکم تھا، لیکن جب وہ دوآبہ میں سمرت کے پرگنہ پر جو میر محمد منشی کی جاگیر میں تھا پہنچے تو قاسم علی خاں سیستانی نے جو پرگنہ کا شقدار تھا جنگل میں ان کو دیکھ لیا اور ان کے انداز کو دیکھ کر بھانپ گیا کہ یہ بھاگے ہوئے ہیں اس نے وہاں کے اوباشوں کی ایک جمعیت لے کر انہیں گھیر لیا اور دونوں کو باندھ کر سید محمود بارہہ کے آدمیوں کو جو اس علاقہ میں ٹھہرے ہوئے تھے مطلع کیا۔ سید محمود نے اپنے عزیزوں اور لڑکوں کو ان دونوں کے ہمراہ کر کے ان کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ آگرہ بھیج دیا۔ جب ان کے واپس آنے کی خبر ملی تو شاہنشاہ نے افسروں کی ایک جماعت کو ان کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور دوبارہ وکالت کا عہدہ پہلے سے کہیں زیادہ اعزاز کے ساتھ منعم خاں کے تفویض کر دیا تاکہ وہ اس ذمہ داری کو شہاب خاں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اکبر کی دایہ ہونے کی وجہ سے اس کو اقتدار مل گیا تھا حمیدہ بانو بیگم سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ ابتدائی عہد میں ماہم انگہ صحیح معنوں میں سلطنت کی وزیر اعظم بنی ہوئی تھی۔ اسی کے اشارہ پر بیرام خاں کے مقابلہ میں منعم خاں کو آگے لایا گیا تھا۔ اکبر نے عرصہ تک ماہم کے اثر و اقتدار میں بسر کیے جب اس کی عمر ۱۹ سال کی ہوئی تو اس نے ماہم اور اس کے بیٹوں کو بے دست و پا کر دیا۔ ماہم پر یہ بھی الزام ہے کہ اس نے اکبر کو بے دخل کرنے اور اپنے بیٹوں کو حکومت دلانے کی بھی سازش کی تھی اسی سلسلہ میں منعم خاں سے اکبر نے وزارت کا عہدہ چھین لیا تھا۔ ایرانی مورخوں نے ماہم انگہ کا ذکر اچھے انداز میں نہیں کیا ہے۔ انہی کے بیان پر پروفیسر بلوک نے بھی اسے حرام اولاد اور حرامکار لکھا ہے۔ ان کے برخلاف ابوالفضل اسے "پاکبازی کا گنبد" کہتا ہے۔

اور خواجہ جہاں کی مدد سے سرانجام دیے۔

کھکڑوں کی شکست

اسی سال خان کلاں میر محمد خان اتکہ نے کمال خان کھکڑ کی کمک کے لیے ایک بڑی فوج لے کر کھکڑوں کے ملک پر چڑھائی کی اور سخت جنگ کر کے کمال خان کے چچا سلطان آدم کو اسیر کر لیا۔ اس کا لڑکا لشکری تمی کشمیر کی طرف بھاگ گیا لیکن بعد میں گرفتار ہو گیا اور دونوں باپ بیٹے اپنی موت آپ مر گئے۔ خان کلاں وہ سارا علاقہ کمال خان کھکڑ کے سپرد کر کے آگرہ واپس آ گیا۔

ایک روز شاہنشاہ نے ایک بڑا جشن منعقد کیا تھا۔ اس محفل میں خان کلاں میر محمد خان اتکہ نے ایک قصیدہ جسے وہ اپنے خیال میں بڑا کارنامہ سمجھ رہا تھا، پڑھنا چاہا۔ محفل میں تمام امراء، سردار، اہل علم اور بڑے بڑے شاعر جمع تھے۔ جب خان کلاں نے اپنے قصیدہ کا مطلع اٹھایا اور یہ مصرع پڑھا ؎

بحمداللہ کہ دیگر آمدم فتح کھکڑ کردہ

اچانک اس کا رشتہ دار عبدالملک خان اٹھ کر آگے آیا۔ اس وقت شاہنشاہ پوری توجہ سے اس کا قصیدہ سن رہے تھے، بلکہ یہ مجلس اسی قصیدہ کے لیے منعقد کی گئی تھی اور خان کلاں کو بادشاہ سے بھاری صلہ کی امید تھی، عبدالملک خان نے سامنے آ کر بلند آواز سے کہا:

"میرے خان" دیگر آمدم" نہیں بلکہ "دیگر آمدیم" کہو، کیوں کہ دوسرے بہت سے بدنصیب بھی تو تمھارے ساتھ تھے" عبدالملک کی اس پھبتی پر ساری مجلس زعفران زار ہو گئی۔ خان کلاں نے اپنی پگڑی زمین پر رکھ دی اور فریاد کی۔

"اس بدتمیز مسخرے سے حضور ہی میرا انصاف کریں گے اس نے تو میری ساری محنت خاک میں ملا دی۔"

عبدالملک بڑا پر مذاق آدمی تھا، چنانچہ اس نے اپنے نام کا سجع بھی بڑا مضحکہ خیز بنایا تھا ؎

عبد را چوں با ملک افزوں کنی
پس الف لامے درو اندروں کنی

ملا شیری ہندی شاعر نے اپنا مشہور قصیدہ "مدح و قدح" اسی کے نام پر لکھا تھا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

اگر گوارہ بسیا یہ مقابل تو گریز
کہ صاحبے و مقابل نے شوی بگوار

مدرسۂ خس

اسی سال مولانا علاؤالدین لاری جنھوں نے شرح عقاید نسفی پر حاشیے لکھے ہیں، خان زماں کے پاس (جون پور) سے آگرہ تشریف لائے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک چھپر ڈال کر مدرسہ قائم کیا اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس مدرسہ کی تاریخ بنا ہے۔

"مدرسۂ خس"

بعد میں وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفر آخرت کے لیے کمر باندھ لی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

کابل کے ہنگامے

اسی سال کابل کے حالات بھی بڑے دگرگوں ہو گئے اور ایک مختصر سی مدت میں کابل پر کئی ایک حاکموں کا

تقرر و تبادلہ ہو گیا۔ منعم خاں جب کابل سے ہندوستان آیا تھا تو اس نے حیدر خاں آختہ بیگی کو وہاں اپنا نائب بنا دیا تھا، لیکن اس کی بدسلوکی کی وجہ سے اس کی جگہ اپنے بیٹے غنی خاں کو قائم مقام بنا دیا، وہ بھی نالائقی میں حیدر خاں سے کچھ کم نہیں تھا چنانچہ اس نے کابل کے ایک صاحب اقتدار امیر تولک خاں قوچین کو بے سبب ہی قید کر دیا۔ بعد میں تولک خاں نے قابو پا کر غنی خاں کو قید میں ڈال دیا۔ غنی خاں نے بڑے عہد و پیمان کے بعد اس قید سے رہائی پائی، پھر اس نے تولک خاں سے بدعہدی کی اور اس پر حملہ کر دیا۔ تولک خاں نے اس سے مقابلہ نہ کیا اور اپنی جاگیر چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا۔ ہمایوں بادشاہ کی بیوی جوجک بیگم نے جو ہمایوں کے دس سالہ لڑکے مرزا حکیم بیگ کی والدہ تھی، شاہ ولی بیگ اتکہ اور منعم خاں کے بھائی فضائل بیگ کور (مرزا کامران نے اسے اندھا کر دیا تھا اس لیے اس کو کور کہتے تھے) اور اس کے لڑکے ابو الفتح بیگ کی مدد سے قلعہ کابل کے دروازے بند کر لیے اور غنی خاں کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔ غنی خاں بھی مجبور ہو کر ہندوستان آ گیا۔ چونکہ باپ (منعم خاں) اس سے ناراض تھا اسی لیے یہاں اس کی سرخروئی کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا اور وہ جون پور میں آوارہ گردی کرتا رہا اسی حال میں وہ اپنے دن پورے کر گیا۔

فضائل بیگ مذکور تو بیگم کی جانب سے اور ابو الفتح بیگ باپ کی جانب سے کابل کے نائب بن کر گئے اور وہاں انھوں نے اپنے لیے اچھی جاگیریں مخصوص کر لیں اور مرزا کی عمل داری میں بری جاگیریں چھوڑ دیں۔ شاہ ولی اتکہ کو ان کی یہ کارروائی بڑی ناگوار گزری۔ اس نے علی محمد اسپ (یہ شخص اب دربار شاہی سے متعلق ہے) کی مدد سے بیگم کے اشارہ پر ایک رات ابو الفتح بیگ کو جب کہ وہ نشہ سے چور تھا قتل کر دیا۔ اس کا باپ اپنا سارا مال متاع لے کر ہزارہ کی طرف کوچ کر گیا لیکن میرزا کے آدمیوں نے تعاقب کر کے اس کو بھی تہ تیغ کر دیا۔

جوجک بیگم کا اقتدار

شاہ ولی بیگ نے بیگم کی تائید و مدد سے کابل کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنا خطاب عادل شاہ رکھ کر خود مختار بن بیٹھا۔ اس کی سرکوبی کے لیے شہنشاہ نے منعم خاں کو کابل کی حکومت اور میرزا حکیم بیگ کی اتالیقی پر مامور کر کے چند امرا کے ساتھ روانہ کیا۔ منعم خاں کے مقابلہ پر جوجک بیگم میرزا کو ہمراہ لے کر کابل کے پورے لشکر کے ساتھ جلال آباد پہنچ گئی۔ بیگم کے مقابلہ میں منعم خاں اور اس کے تمام مددگار امیروں محمد قلی خاں برلاس، شہاب خاں کے بھائی حسن خاں وغیرہ کو پہلے ہی حملہ میں بری طرح شکست کھانی پڑی۔ یہ لوگ سارا لاؤ لشکر تباہ کر کے بڑی بری حالت میں بادشاہ کی خدمت میں واپس آئے۔ اس فتح کے بعد بیگم[1] نے شاہ ولی کو غداری کے الزام میں گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔

شاہ ابو المعالی کی بغاوت

اسی سال شاہ ابو المعالی مکہ سے واپس آیا۔ اسی زمانہ میں میرزا شرف الدین حسین آگرہ سے بھاگ گیا تھا اس کے تعاقب میں بادشاہ نے حسین قلی خاں اور صادق محمد خاں وغیرہ کو مقرر کیا تھا۔ جب شاہ ابو المعالی اثنائے راہ میں وہاں پہنچا تو میرزا شرف الدین کے بہکانے سے اس نے بھی سرکشی اختیار کی اور فتنہ و فساد مچاتے ہوئے ہر جگہ لوٹ مار کرنے لگا۔ حسین قلی خاں کے رشتہ دار اسماعیل قلی خاں، احمد بیگ اور اسکندر بیگ اس کا تعاقب کرنے لگے۔ اسی تاخت و تاراج میں شاہ ابو المعالی نے قلعۂ نارنول کے سرکاری خزانہ کو لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔

---

[1] جوجک بیگم: پورا نام ماہ جوجک بیگم تھا۔ کہتے ہیں یہ کوئی خاندانی عورت نہ تھی۔ جب ۱۵۴۶ء میں حمیدہ بانو بیگم قندھار سے کابل چلی گئی، ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ جب اس کے بطن سے ہمایوں کا دوسرا لڑکا مرزا محمد حکیم پیدا ہوا تو اسے ہمایوں نے بیگم کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے یہ نہایت ہوشیار اور بہادر عورت تھی، اس نے جس طرح کابل پر قبضہ رکھا، اور بڑے بڑے امیروں پر قابو پایا یہ اس کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

محمد صادق خاں اور اسماعیل قلی خاں نے حملہ کر کے نارنول کے نواح میں ابوالمعالی کے بھائی خان زادہ کو جسے شاہ سوندان بھی کہتے تھے گرفتار کر لیا۔ بھائی کی گرفتاری سے ابوالمعالی بے دست و پا ہو گیا اور مجبوراً اس نے ہندوستان کو چھوڑ کر کابل کی راہ لی۔ پنجاب میں اس نے اسکندر بیگ اور احمد بیگ کو جو اپنے ساتھی امیروں سے جدا ہو گئے تھے۔ ان کے ملازموں سے سازش کر کے گھیر لیا اور قتل کر دیا اور ماہ جوجک بیگم والدۂ میرزا محمد حکیم کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا جس میں اس نے مرحوم ہمایوں بادشاہ کے ساتھ اپنے خلوص و عقیدت کا اظہار کیا تھا اور اس کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا تھا ؎

ما بدیں در نہ پے حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ ایں جا بہ پناہ آمدہ ایم

جوجک بیگم نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

ابوالمعالی کا کابل پر قبضہ

جب شاہ ابوالمعالی وہاں پہنچا تو بیگم نے اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح بھی کر دیا اور کابل کا سارا نظم و نسق ابوالمعالی کے ہاتھ میں آ گیا۔ کچھ دن بعد ہی ابوالمعالی نے بعض شر پسندوں جیسے شو کون اولد قراجہ خاں وغیرہ کے بہکانے سے بیچاری بیگم کو قتل کرا دیا، حیدر قاسم کوہ بر کو بھی جو شاہ ولی بیگ کے بعد کچھ عرصہ تک کابل کا وزیر مطلق رہا تھا شہید کر دیا اور اس کے بھائی محمد قاسم کوہ بر کو قید میں ڈال دیا۔

شاہ ابوالمعالی کے اس خون خرابہ پر لوگ بگڑ گئے اور ایک بڑی جماعت بیگم کے انتقام کے لیے مقابلہ پر آ گئی۔ کابل کے قلعہ میں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ ان لوگوں نے محمد قاسم کو قید خانہ سے نکال لیا۔ محمد قاسم یہاں سے نکل کر بدخشاں چلا گیا اور وہاں مرزا سلیمان کو شاہ ابوالمعالی کی سرکوبی کے لیے آمادہ کیا۔ میرزا محمد حکیم نے بھی اپنا قاصد بھیج کر اس کو کابل آنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

مرزا شرف الدین حسین کی بغاوت

میرزا شرف الدین حسین مذکور نے بادشاہ کا بخوبی اعتماد حاصل کر لیا تھا اور ناگور سے دار الخلافہ آگرہ میں آ گیا تھا۔ میرزا کا خاندانی تعلق چار واسطوں سے خواجۂ احرار عبید اللہؒ سے ملتا ہے: شرف الدین حسین ولد خواجہ معین الدین ولد خواجہ خاوند ولد خواجہ یحییٰ ولد خواجۂ احرار۔ آگرہ میں رہتے ہوئے ان دنوں جبکہ اس کے والد مکہ معظمہ کی زیارت سے واپس آ چکے تھے۔ شرف الدین حاسدوں کے بہکاوے میں آ کر بغیر کسی ظاہری وجہ کے بادشاہ کی طرف سے بدگمان ہو گیا اور ناگور واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے اس کے تعاقب میں صادق محمد خاں اور ایک جمعیت کو حسین قلی خاں کے ہمراہ کر کے روانہ کیا اور انھیں ہدایت کی کہ پہلے تو اسے تسلی دلاسہ دے کر سیدھی راہ پر لائیں اگر نہ مانے تو اس کا معقول سدباب کر دیں۔

مرزا شرف الدین ناگور جاتے ہوئے اجمیر کا قلعہ ترخان دیوانہ کے حوالہ کرتا گیا، لیکن دیوانہ بھی قلعہ خالی کر کے اس کے پیچھے چلا گیا۔ جالور کے مقام پر مرزا شرف الدین حسین کی شاہ ابوالمعالی سے ملاقات ہوئی تھی جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں، ان دونوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شاہ ابوالمعالی تو حسین قلی خاں کی فوج پر جو حاجی پور میں ٹھہری ہوئی تھی حملہ کر کے اسی راستہ سے کابل کو چلا جائے گا اور وہاں سے شاہزادہ میرزا محمد حکیم کو لے کر ہندوستان پر حملہ کرے گا، اس کے آنے تک مرزا شرف الدین اسی جگہ شاہی فوج کو پریشان کرتا

رہے گا۔ اس منصوبہ پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا کیوں کہ جب شاہ ابوالمعالی کو خبر ملی کہ صادق محمد خاں اور دوسرے امیر اس کے مقابلہ پر بڑی فوج لے کر آرہے ہیں تو وہ اس قرارداد کو چھوڑ کر پہلے نارنول گیا اور وہاں کے حاکم میر گیسو شقدار کو گرفتار کر کے اس سے کچھ روپیہ وصول کر لیا۔ پھر سیدھا کابل کی طرف نکل گیا۔ شاہی لشکر سے احمد بیگ، اسکندر بیگ، صادق محمد خاں اور اسماعیل قلی خاں علٰحدہ ہو کر اس کا تعاقب کرنے لگے۔

احمد بیگ اور اسکندر بیگ نے مرزا شرف الدین کے چند آدمیوں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا اور ان پر کافی بھروسا کرنے لگے تھے۔ ان ملازموں نے ایک مفسد شخص زمانہ قلی نامی کے ذریعہ شاہ ابوالمعالی کو یہ پیغام بھیجا کہ تم فلاں جگہ ٹھہرے رہو، جس وقت یہ دونوں سردار وہاں پہنچیں گے ہم ان کا کام تمام کر دیں گے۔ اس سازش کے مطابق جب وہ دونوں مقررہ مقام سے گزرے تو شاہ ابوالمعالی نے اچانک گھات سے نکل کر ان پر حملہ کر دیا اور ان مفسد مخبروں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مقتول سرداروں کے ساتھی منتشر ہو کر بھاگ گئے۔

دہلی میں ہلچل

جب اس واقعہ کی تفصیلات اکبر کو معلوم ہوئیں تو وہ اس بغاوت کو رفع کرنے کے خیال سے خود دہلی آیا۔ بادشاہ کی آمد کے بعد دہلی میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد بادشاہ کے دل میں آیا کہ وہ دہلی کے امرا اور شرفاء کی بیٹیوں سے نکاح کر لے، چنانچہ بادشاہی خواجہ سرا اور مشاطہ عورتیں لڑکیوں کے انتخاب کے لیے دہلی کے گھرانوں میں آنے جانے لگیں اور دہلی والوں میں بڑی ہلچل سی مچ گئی۔ اکبر کو اس بات پر شیخ بدہ اور آگرہ کے امرائے بہرہ نے آمادہ کیا تھا۔ بادشاہ کا دل دہلی کی ایک عورت پر بُری طرح آ گیا تھا، وہ عورت عبدالواسع کی زوجہ تھی۔ بادشاہ کی خواہش اور مطالبہ پر عبدالواسع نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اسے شاہی حرم سرا میں داخل کر دیا گیا اور بیچارہ عبدالواسع اس شرم کے مارے دہلی چھوڑ کر دکن میں بیدر جا کر بس گیا۔

قاتلانہ حملہ

دہلی کے اس قیام کے دوران میں ایک دن بادشاہ سیر کرتے ہوئے بیگم کے مدرسہ کی طرف جا نکلا۔ مدرسہ کی چھت پر سے فولاد نامی ایک لڑکے نے جو مرزا شرف الدین حسین کا غلام تھا، بادشاہ کو نشانہ بنا کر تیر چھوڑ دیا، نشانہ اچٹ گیا اور تیر بادشاہ کے جسم کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ خوبیٔ قسمت سے بادشاہ کی جان بچ گئی۔ امرا نے مجرم کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کرنے اور مقدمہ چلانے کی رائے دی تاکہ ان سب لوگوں کا پتہ چل جائے جو اس قاتلانہ حملہ کی سازش میں شریک ہیں، لیکن بادشاہ نے اس بات کو قبول نہ کیا اور اس لڑکے کو اسی وقت قتل کرا دیا۔ وہاں سے سوار ہو کر قلعہ دین پناہ میں آکر ٹھہر گیا۔ طبیبوں کے علاج سے چند دن میں ہی وہ زخم اچھا ہو گیا۔ صحت پانے کے بعد بادشاہ دہلی سے لوٹ کر سنہ ۹۷۰ھ میں آگرہ واپس آ گیا۔

مرزا سلیمان کی کابل پر فوج کشی

اسی سال شاہ ابوالمعالی کا قضیہ بھی ختم ہو گیا۔ محمد قاسم کوہ برکی تحریک پر مرزا سلیمان نے بدخشاں سے کابل پر فوج کشی کی۔ ابوالمعالی میرزا حکیم کو ساتھ لے کر مقابلہ پر آیا۔ دونوں میں یہ لڑائی غوربند کے کنارے پر ہوئی۔ سخت مقابلہ کے بعد شاہ ابوالمعالی کی فوج کا ایک پہلو پسپا ہونے لگا۔ اس محاذ کو سنبھالنے کے لیے ابوالمعالی خود اس طرف روانہ ہوا اور سلیمان مرزا کے مقابلہ پر مرزا محمد حکیم کو چھوڑ گیا۔ اس کے پیٹھ پھیرتے ہی مرزا محمد حکیم نے اپنے خاص آدمیوں کو ساتھ لے کر دریا عبور کیا اور سلیمان مرزا سے جا کر مل گیا۔ اس صورت حال کی تبدیلی کی وجہ سے ابوالمعالی کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ میدانِ جنگ چھوڑ کر فرار ہو گیا، لیکن سلیمان مرزا کے آدمیوں نے اس کا تعاقب کر کے جاریکاروں کے قصبہ میں

اسے گرفتار کر لیا۔ کابل میں سلیمان مرزا کے سامنے اسے پابجولاں لایا گیا۔ سلیمان مرزا نے اسے اسی طرح مرزا محمد حکیم کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ نے اسی وقت اسے پھانسی پر چڑھا کر اپنی ماں کے قتل کا انتقام لے لیا۔ یہ واقعہ ۱۷ ماہ رمضان ۹۷۰ھ میں پیش آیا۔

ان واقعات کے بعد سلیمان مرزا نے اپنی بیٹی کو مرزا محمد حکیم سے بیاہ دیا اور اپنے ایک معتمد ملازم امید علی کو اس کا وکیل مقرر کر کے بدخشاں واپس چلا گیا۔

قلعہ چنہار پر قبضہ

اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خاں نے چنہار کا قلعہ ایک دوسرے غلام فتو نامی کے سپرد کر دیا تھا۔ فتو نے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد بادشاہ کے دربار میں عریضہ روانہ کیا، جس کے جواب میں بادشاہ نے فتو کے پیر شیخ محمد غوث اور آصف خاں خواجہ عبدالمجید ہروی کو فتو کے پاس روانہ کیا۔ ان لوگوں نے شرائط صلح طے کر کے فتو سے قلعہ کا قبضہ لے لیا اور قلعہ داری حسن خاں ترکمان کو تفویض کر دی۔ فتو کو اپنے ہمراہ دربار شاہی میں لے آئے۔ یہاں اس نے بڑی عزت اور مرتبہ پایا۔

اسی دوران میں شیخ محمد غوث کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ملا اسماعیل عطائی معمائی نے نکالی ہے:

"بندۂ خدا شد"

اسی سال میرے نانا مخدوم اشرف نے ۲۰۔ رمضان کو رحلت کی، ان کی تاریخ وفات "فاضل جہاں" ہے۔

خواجہ اور راجہ کی نوک جھونک

۹۷۱ھ میں خواجہ مظفر علی تربتی کو خان کا خطاب اور وزارت کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ اس کے تقرر کا مادۂ تاریخ "ظالم" ہے۔ خواجہ کی راجہ ٹوڈرمل سے نہ بنتی۔ ان دونوں کے درمیان ذرا ذرا سی بات پر ہر روز ہی جھگڑا رہتا تھا۔ کسی ظریف نے ان دونوں کے متعلق اس ضرب المثل کو ؎

سگ کاشی بہ از صفاہانی　　گرچہ صد بار سگ ز کاشی بہ

اس طرح بدل کر کہا ہے ؎

سگ راجہ بہ از مظفر خان　　گرچہ صد بار سگ ز راجہ بہ

امرائے دربار نے راجہ ٹوڈرمل کے خلاف محاذ سا بنا لیا اور انہوں نے بادشاہ سے اس کی شکایتیں کیں۔ اکبر نے جواب دیا "تم سب اپنی اپنی جاگیروں میں ہندوؤں کو ملازم رکھتے ہو، یہ ہماری سرکار کا ہندو ہے، پھر کیوں ناراض ہوتے ہو؟"

ایک شخص نے راجہ کی مہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا ؎

آنکہ شد کار ہند را از و مختل
راجۂ راجہاست ٹوڈرمل

اسی سال بادشاہ نے قاضی لال کو جو بڑا ظریف آدمی تھا کسی جرم میں بیرن سے طلب کر کے قتل کرا دیا تھا۔ اس کی تاریخ نکالی گئی:

"قاضی لال"

رانی درگاوتی

اسی سال عدلی کے ایک بڑے امیر غازی خاں سور نے بغاوت کی۔ یہ شخص کئی بار بادشاہی دربار میں حاضر ہوا اور ہر مرتبہ سرکش ہو کر بھاگ گیا، اس مرتبہ اس نے کڑہ کے نواح میں اچھی خاصی جمعیت فراہم کر لی اور آصف خاں پر حملہ کر دیا۔ آصف خاں نے اسے شکست دی وہ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس فتح سے آصف خاں کا اثر و اقتدار بہت

بڑھ گیا اور اس نے قوت حاصل کر کے کڑہ کنتلہ کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ اس علاقہ میں اس وقت ستر ہزار گاؤں آباد تھے اور اس کا صدر مقام قلعہ چوراگڑھ تھا۔ وہاں کی رانی بڑی خوبصورت اور حسین عورت تھی اس کا نام درگا وتی تھا۔ آصف خاں کے مقابلہ پر رانی بیس ہزار سوار پیادے اور سات سو جنگی ہاتھی لے کر آئی، فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی؛ آخر ایک محاذ پر رانی تیر لگنے سے بری طرح زخمی ہو گئی۔ اپنی ناموس کے خیال سے اس نے فیل بان کو حکم دیا کہ وہ اسے قتل کر دے۔ فیل بان نے ایک خنجر مار کر اس کا کام تمام کر دیا، لیکن حملہ آوروں میں سے ایک اوباش سپاہی نے رانی کے لاشہ ہی سے اپنی ہوس نکال لی (پناہ بخدا)۔ رانی کو شکست دینے کے بعد آصف خاں نے چوراگڑھ پر یلغار کر دی، وہاں رانی کے لڑکے سے کچھ مقابلہ ہوا لیکن وہ بھی مارا گیا۔ آصف خاں کو مال غنیمت میں اتنا خزانہ ملا جو شمار سے باہر تھا۔ اسی مال کا غرور تھا کہ آصف خاں میں بڑی نخوت پیدا ہو گئی، لیکن جلد ہی اس کا وہ غرور خاک میں مل گیا۔

ہاتھیوں کا شکار

اسی سال ۱۲ ذی قعدہ کو عین موسم باراں میں بادشاہ نے ہاتھیوں کے شکار کے ارادہ سے نرور کی طرف کوچ کیا اور اس شکار میں اس نے ہاتھیوں کو گرانے اور پکڑنے کے لیے چند نئے طریقے ایجاد کیے۔ نرور سے شاہی سواری سارنگ پور ہوتی ہوئی مندو کے علاقہ میں پہنچی۔ عبداللہ خاں اوزبک اپنے بعض جرائم کی وجہ سے خوف زدہ تھا اس لیے وہ مندو سے بھاگ کر گجرات چلا گیا۔ مقیم خاں نے جس کو اس مہم میں شجاعت خاں کا خطاب ملا تھا اوزبک کو جا کر بہت کچھ سمجھایا اور اسے تسلی دلاسا دیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔ بادشاہی ہراول سے اس نے کچھ مقابلہ بھی کیا۔ جب اکبر قریب پہنچ گیا تو وہ اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کو چھوڑ کر چند آدمیوں کے ساتھ گجرات میں چنگیز خاں کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ کے آدمی گجرات کی حدود تک عبداللہ خاں کا تعاقب کرتے رہے اور اس کے حرم اور ہاتھیوں وغیرہ کو پکڑ لائے۔ جو بچ گئے انھیں جاٹوں نے دھر لیا۔

چنگیز خاں حاکم گجرات

چنگیز خاں سلطان محمود گجراتی کا غلام تھا۔ سلطان کے مرنے کے بعد گجرات کا حاکم بن گیا تھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اس کے عہد میں گجرات ایسا آباد تھا کہ پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ علم و فضل کا وہاں بڑا دور دورہ تھا۔ جو بے سہارا بھی خان کا سپاہی بن جاتا تھا وہ ہر طرح سے خوش حال ہو جاتا تھا۔ چنگیز خاں بڑا فیاض شخص تھا، وہ ہر روز اپنے پہننے کے پانچ چھ جوڑے لوگوں میں تقسیم کرا دیتا تھا اور اس کا ہر جوڑا پچاس، ستر یا اسّی اشرفی سے کم دام کا نہیں ہوتا تھا۔

اس کی سخاوت کا ایک معمولی واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز اپنے ملازموں کے ساتھ سیر کر رہا تھا، عبداللہ خاں اوزبک بھی اس کے ساتھ تھا، اتفاق سے اسی وقت نقدی اور اسباب سے بھری ہوئی دو تین کشتیاں اس کے نذرانے میں پیش کی گئیں، اس نے اسی وقت وہ کشتیاں عبداللہ خاں کو بخش دیں۔

شاہ عارف جنوں ایک عامل جنوں کی تسخیر کے عمل میں بہت مشہور تھا۔ میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا۔ وہ لوگوں میں خزانہ کے خزانہ لٹایا کرتا تھا۔ یہ ساری دولت اسے گجرات ہی سے ملی تھی کیوں کہ اس کی اشرفیوں پر بھی چنگیز خاں کا ہی سکہ کندہ تھا۔

اسی سفر کے دوران میں برہان پور کے میراں مبارک شاہ نے قاصد بھیج کر اطاعت کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے اپنے خواجہ سرا اعتماد خاں کو ان قاصدوں کے ہمراہ بھیجا اور وہ جا کر میراں شاہ کے بیٹے کو بڑے تحفوں اور نذرانوں سمیت اپنے ساتھ لیتا آیا۔

اسی سال دکن کے ایک نامی امیر مقرب خاں نے بھی آ کر اطاعت قبول کی۔

محرم ۹۷۲ھ میں بادشاہ نے مندو سے قصبۂ نالچہ کا رخ کیا اور اس علاقہ کی حکومت قرابہادر خاں کو عطا کی۔ یہاں سے شکار

کھیلتے ہوئے اجین، سارنگ پور اور گوالیار کے راستہ سے بادشاہ ۳۔ ربیع الاول کو آگرہ واپس آگیا۔

اسی سال محل شاہی میں کسی حرم کے بطن سے حسن اور حسین نامی دو توام لڑکے پیدا ہوئے لیکن ایک مہینہ زندہ رہ کر دونوں مر گئے۔

شہر نگر چین کی تعمیر اکبر بادشاہ نے شہر نگر چین کو اسی سال تعمیر کرایا تھا جس وقت اکبر نامہ کی تصنیف ہو رہی تھی۔ ابوالفضل نے اس شہر کی تعریف میں چند سطریں مجھ سے لکھوائی تھیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

"چوں مہندس کارخانۂ ابداع اندیشۂ بلند شہریار کامگار را کہ معمار معمورۂ گیتی خصوصاً بنائے مقصورۂ ہندست از آغاز فطرت اختراع آئین ایجاد فرمودہ بمقتضائے ؎

جہاں دار داند جہاں داشتن

یکے را بریدن دگر کاشتن

ہر منزل و ہر گل زمینی را کہ ہوائے آں معتدل و فضائے آں جمیع و آبش گوارا و سوادش مسطح باشد تعمیر بخشیدہ محل نزول اجلال موکب اقبال سازد چہ اختیار اماکن منزہ و مساکن طیبہ و منازل مروحہ و میاہ عذب بہر البقائے نعمت و صحت بدنی و احتمال اعتدال مزاج انسانی کہ وسیلہ معرفت و طاعت یزدانی ہماں تواند بود از جملہ ستہ ضروریہ است۔

خصوصاً وقتیکہ بعضے از مصالح ملکی نیز مثل سیر و شکار و غیرہ باں متضمن گردد بنا بر اں دواعی دریں سال خجستہ فال بعد از معاودت از سفر مالوہ کہ اولیائے دولت منصور و اعدائے ملک مقہور شدہ بودند پیش دید ہمت والا نہمت و اقتضائے رائے جہاں آرائے چناں افتاد کہ موضع گھر آولی را کہ بہ یک فرسنگے آگرہ واقع شدہ و باعتبار لطافت آب و نظافت ہوا بر خیلے اکثر رجحانے و مرتبہ تمام داشتہ معسکر چشم ہمایوں و خیم دولت ابد پیوند گردانیدہ و از مضائق مداخل و مخارج شہر خاطر قدس مآثر را فراغتے حاصل گشتہ اوقات فرخندہ سمات را گاہے بچوگان بازی و گاہے بدوانیدن سگان تازی و پرانیدن جانوران گوناگوں مصروف سازند و بنائے آں معمورۂ بلند اساس را بہ شگون استحکام مبانی قصر سلطنت بے زوال و تفاؤل از دیاد جاہ و جلال گرفتہ فرماں نافذ بر اں گونہ عز اصدار یافت کہ باریافتگان قرب منزلت و منظوران نظر عاطفت ہر کدام از برائے خود دراں مکان مرفہ عمارات عالی و مناظر رفیع بنیاد نہند در اندک مدت سواد آں بقعہ لطیف از پرتو توجہ حضرت ظل الٰہی خال رخ نو عروس عالم شدہ و نگر چین کہ عبارت است از امن آباد نام یافت ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست

آمد آخر ز پس پردۂ تقدیر پدید

اب اس شہر اور اس کی عمارتوں کا کوئی نشان تک نہیں رہا۔

صدر الصدور کا عہدہ اسی سال یا گزشتہ سال بادشاہ نے قصبۂ اندری کرنال سے شیخ عبد القدوس[1] گنگوہیؒ کے پوتے

[1] شیخ عبد القدوس گنگوہی: یہ شیخ محمد بن عارف چشتی کے مرید تھے۔ ان کی ایک کتاب "انوار العیون" ہے۔ صاحب معارج الولایت نے ان کو "ولی مادر زاد" لکھا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

شیخ عبدالنبی محدث کو بلاکر صدر الصدور بنایا اور انھیں یہ اجازت دی کہ مظفر خاں کی مدد سے لوگوں کے روزینے اور معاش مقرر کیا کریں۔ چند دن بعد ہی وہ مستقل صدر الصدور ہو گئے۔ اول اول انھوں نے لوگوں کو اس قدر انعامات اور روزینے عطا کیے کہ اگر سابقہ بادشاہوں کے تمام عطیوں کو بھی جمع کیا جائے تو اس کے برابر نہ ہوں، بعد میں ان کا طرز عمل بالکل ہی برعکس ہو گیا۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

اسی سال خواجہ معظم سے جو رشتہ میں بادشاہ کا خالو ہوتا تھا بعض نامناسب حرکتیں ہوئیں۔ اکبر اسے نصیحت کرنے اور ان باتوں سے منع کرنے کے لیے اس کے گھر گیا لیکن اس نے بادشاہ کی آمد کی خبر پا کر بدگمانی اور خبط کی وجہ سے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ اکبر نے اسے گرفتار کر کے سزا دی۔ پانی میں غوطے دلائے اور قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ اسی قید میں وہ قید حیات سے چھوٹ گیا۔

کابل پر تیسرا حملہ

اسی سال تیسری مرتبہ مرزا سلیمان نے کابل کا رخ کیا۔ اس مرتبہ اس کے یہاں آنے کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ شاہ ابوالمعالی کے سدباب اور میرزا محمد حکیم کو حاکم بنانے کے بعد واپس ہو رہا تھا تو اس نے کابل کے اکثر علاقے اپنے لشکریوں میں بطور جاگیر تقسیم کر دیے تھے۔ اس کے آدمیوں اور مرزا کے درمیان ان بن ہو گئی اور مرزا نے بدخشانی امیروں کو کابل سے بے دخل کر دیا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے مرزا سلیمان نے ایک بھاری لشکر لے کر کابل پر چڑھائی کر دی۔ مرزا محمد حکیم میں اس سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی، اس لیے وہ باقی قاقشال اور چند معتمد سرداروں کو کابل میں چھوڑ کر جلال آباد چلا گیا۔

جب مرزا سلیمان نے اس کا تعاقب کیا تو وہ جلال آباد میں بھی نہ ٹھہر سکا اور وہاں سے دریائے نیلاب کے کنارے پہنچ کر اس نے اکبر بادشاہ کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا۔ مرزا سلیمان نے جلال آباد میں اپنے ایک سردار قنبر نامی کو تھوڑی سی فوج دے کر ٹھہرا دیا اور خود پشاور سے کابل واپس چلا گیا۔ اکبر کے حکم کے بموجب پنجاب کے تمام امیر جیسے محمد قلی خاں برلاس، اتکہ خاں اپنی تمام جمعیت سمیت اور ملاں قاسم خاں، کمال خاں گکھر وغیرہ مرزا محمد حکیم کی کمک پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے جلال آباد پر حملہ کر کے قنبر کو تین سو آدمیوں سمیت تہ تیغ کر دیا اور قنبر کا سر فتح کی خوش خبری کے ساتھ کابل میں باقی قاقشال کے پاس بھیج دیا۔ اب مرزا سلیمان کو لینے کے دینے پڑ گئے، وہ باگیں پھیر کر بدخشاں کی طرف بھاگ گیا اور مرزا حکیم فاتحانہ کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بادشاہ نے اس کی اتالیقی کے لیے خان کلاں کو متعین کیا۔ وہ تو وہاں رہ گیا اور دوسرے امرائے لشکر اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

خواجہ حسن نقشبندی

کچھ عرصہ بعد مرزا محمد حکیم نے اپنی بیوہ بہن کو جو شاہ ابوالمعالی کے نکاح میں تھی خان کلاں سے مشورہ کیے بغیر خواجہ نقشبندی کی اولاد میں سے خواجہ حسن نقشبندی کے نکاح میں دے دیا۔ خواجہ حسن کا مرتبہ اس رشتہ کی وجہ سے بڑھ گیا اور وہ کابل کا وکیل مطلق بن گیا۔ تمام امور سلطنت اس کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ اس کے دور حکومت پر ظریفوں نے یہ پھبتی کسی ہے ؎

گر خواجۂ ما خواجہ حسن خواہد بود
ما را نہ جوال و نے رسن خواہد بود

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ان کے پوتے عبدالنبی نے اپنے باپ کے رسالہ "اباحت سماع" سے اختلاف کر کے سماع کے خلاف بڑا مدلل رسالہ لکھا تھا۔ یہ وہی عبدالنبی ہے جن کو اکبر نے صدر الصدور بنایا ہے۔ عبدالنبی کو آخر میں اکبر نے ناراض ہو کر قید کر دیا، جس میں وہ ۹۹۲ھ میں فوت ہو گیا۔ شیخ عبدالقدوس کی وفات ۹۴۴ھ میں ہوئی تھی۔ دہلی کے توابعات میں بمقام گنگوہ آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

خواجہ حسن کے اثر و رسوخ کی وجہ سے خان کلاں کے ہاتھ بندھ گئے اور وہ معطل ہو کر رہ گیا۔ یہ صورت حال جب ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ لاہور چلا آیا اور کابل کے سارے حالات بارگاہ شاہی میں لکھ کر روانہ کر دیے۔

شیخ الاسلام فتح پوری

اسی سال شیخ الاسلام فتح پوری چشتی نے جو ۹۷۱ھ میں حرمین شریفین سے تشریف لائے تھے، ایک نئی خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس کی عمارت ایسی خوش وضع ہے کہ دنیا میں شاید ہی اس جیسی کوئی خانقاہ ہو۔ ان کی آمد پر میں نے عربی میں ایک خط لکھ کر بدایوں سے روانہ کیا تھا اور ان کے خیر مقدم کی دو تاریخیں درج کی تھیں۔ پہلی تاریخ یہ ہے: ؎

شیخ اسلام مقتدائے انام
رفع اللہ قدرہ السامی
از مدینہ چو سوئے ہند آمد
آں ہدایت پناہے نامی
ہند از مقدم ہمایونش
یافت از سر خجستہ فر جامی
گیر حرفے و ترک کن حرفے
بہر سالش ز شیخ اسلامی

دوسری تاریخ یہ ہے ؎

شیخ اسلام ولی کامل — آں مسیحا نفس و خضر قدم
لامع از جبہۂ او سر ازل — طالع از چہرۂ او نور قدم
از مدینہ چو سوئے ہندوستان — آں مسیحا نفس و خضر قدم
بشمر حرفے و مشمر حرفے — بہر تاریخ ز خیر المقدم

جس خانقاہ کا ذکر کیا گیا، وہ آٹھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔

انہی دنوں آگرہ میں بنگالی محل اس کے علاوہ ایک اور محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس تعمیر کے سلسلہ میں قاسم ارسلان نے یہ تاریخ کہی ہے ؎

چوں از پئے عشرت شہ زیبا منظر — فرمود بنا در خانہ فیض اثر
تاریخ یکے از عشرت آمد بیروں — شد خانہ بادشاہ تاریخ دگر

بادشاہ سلامت نے ۹۸۲ھ میں پہلی رجب کو ہاتھیوں[1] کے شکار کے لیے نروَرہ اور کرہرہ کا ارادہ کیا اور وہاں شکاریوں کو ہاتھی پکڑنے کے لیے مقرر کر کے شاہانہ سواری گوالیار پہنچ گئی۔ گوالیار میں گرمی کی وجہ سے بادشاہ کو بخار آ گیا۔ جب صحت ہوئی تو وہ دارالخلافہ لوٹ آیا۔

---

[1] ہاتھی کا شکار: ہاتھی کے شکار کے مختلف طریقے تھے، ایک طریقہ "کھیدہ" کہلاتا تھا اس میں سوار اور پیادہ ہو کر شکار کھیلتے تھے یہ شکار عموماً گرمی کے موسم میں کیا جاتا تھا، ڈھول اور نفیریاں بجا کر ہاتھی کو بدحواس کر دیا جاتا تھا اور اسے اس قدر دوڑایا جاتا تھا کہ وہ تھک جاتا تھا اور کسی درخت کے سایہ میں سستانے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ شکاری موٹے رسّے اس کی گردن اور پاؤں میں ڈال دیتے اور اسی درخت سے جکڑ دیتے، پھر پالتو ہاتھی کے ذریعہ اسے مانوس کیا جاتا۔ ایک اور طریقہ "چور کھیدہ" تھا پالتو ہاتھی کو جنگلی ہاتھیوں کی چراگاہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور مہاوت اس پر اس طرح لیٹ جاتا تھا کہ دکھائی نہ دے جب ہاتھیوں کے غول میں داخل ہوتا (باقی اگلے صفحہ پر)

قلعۂ آگرہ کی تعمیر

اکبر نے اسی سال آگرہ کے قلعہ کی تعمیر کا ارادہ کیا اور وہاں کے خشتی قلعہ کو ڈھا کر سنگین قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ قلعہ کی تعمیر کے اخراجات کے لیے بادشاہ کے حکم سے فی جریب تین سیر غلّہ کا محصول لگایا گیا۔ یہ محصول سارے ملک میں با امراء اللہ جاگیرداروں سے تحصیل کے کارندوں نے وصول کیا۔ یہ قلعہ پانچ سال میں بن کر تیار ہو گیا اس کی دیوار کا عرض دس گز اور بلندی چالیس گز ہے۔ فصیل کے گرد جو گہری خندق ہے اس کے دونوں طرف پتھر اور گچ کا پشتہ بنا ہوا ہے۔ اس خندق کا عرض بیس گز اور پانی کی سطح تک گہرائی دس گز ہے۔ خندق میں دریائے جمنا سے پانی لایا گیا ہے۔ قلعہ ہر لحاظ سے ایسا ہے کہ دنیا میں اس کا ثانی نہ ہوگا۔ اس کے دروازہ کی تاریخ شیخ فیضی نے "بنائے در بہشت" کہی ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر پر تقریباً تین کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ جب قلعہ مکمل ہو گیا تو اس میں ہندوستان کی تمام ملیات کا صدر خزانہ قائم کیا گیا اسی مناسبت سے یہ تاریخ نکالی گئی ؎

"شد بنائے قلعہ بہر زر"

جو روپیہ اس قلعہ[1] میں پڑا ہوا ہے نہ معلوم کب اپنی بربادی کی داستان سنائے زبان حال سے تو وہ "اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا" کا ورد کرتا نظر آتا ہے ؎

زر از بہر خوردن بود اے پسر
ز بہر نہادن چہ سنگ و چہ زر

اوزبک سرداروں کی بغاوت

اسی سال خان زماں، ابراہیم خاں اور اسکندر خاں اوزبک نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا قصہ یہ ہے کہ عبداللہ خاں اوزبک کی سرکشی کی وجہ سے اکبر تمام اوزبکوں کی طرف سے بدگمان ہو گیا تھا۔ سکندر خاں اوزبک اودھ کا جاگیردار تھا۔ اکبر نے زور سے اشرف خاں میر منشی کو بلا کر سکندر خاں کو لانے کے لیے اودھ روانہ کیا۔ ابراہیم خاں اوزبک تمام اوزبکوں کا سردار تھا جاگیردار اور حاکم بھی تھا، اودھ پہنچنے کے بعد تمام اوزبک سرداروں نے اکٹھا ہو کر مشورہ کیا۔ اور سب نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کر کے اشرف خاں کو قید کر لیا اور خود جون پور میں خان زماں کے پاس چلے گئے۔

اوزبکوں نے دو مقامات سے بغاوت شروع کی۔ لکھنؤ میں بغاوت کی ابتدا اسکندر خاں اور ابراہیم خاں کی سرکردگی میں ہوئی اور کڑہ مانک پور میں بغاوت کے سرگروہ خان زماں اور بہادر خاں تھے۔ کڑہ پر باغیوں نے شاہم خاں جلائر اور شاہ بداغ خاں پر حملہ کر کے شکست

---

[1] قلعہ آگرہ: قلعہ کی عمارت سنگ سرخ کی ہے جس کے چاروں طرف خندق ہے، فصیل ۷۰ فٹ بلند ہے، قلعہ کا دور دو میل ہوگا، قلعہ میں شاہی محل سرا، دیوان عام، دیوان خاص، شمن برج، انگوری باغ، حوض، شیش محل مشہور عمارتیں ہیں۔ ان میں شاہجہاں کی بنائی ہوئی مسجد "موتی مسجد" نہایت خوب صورت ہے۔ یہ مسجد ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ ہنٹر نے لکھا ہے "یہ مسجد دنیا کے تمام معبدوں میں سب سے زیادہ نفیس ہے۔" جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے "ایک پرانا قلعہ تھا میرے باپ نے میری پیدائش سے پہلے اس کو گرا کر نیا قلعہ سرخ پتھر کا بنوایا کہ سیاح اس جیسا قلعہ اور نہیں بتاتے۔ پندرہ سولہ سال میں مکمل ہوا۔ اس میں چار دروازے اور دو کھڑکیاں ہیں۔ اس کی تعمیر میں ۳۵ لاکھ روپیہ جو ایران کے مروجہ ایک سو پندرہ طومان اور توران کے ایک کروڑ پانچ لاکھ "خانی" کے مساوی ہے خرچ ہوا۔"

(بقیہ صفحہ سابقہ) تو وہ دوست کسی ہاتھی پر کمند پھینک کر اسے بے بس کر دیتا اور اپنے ہاتھی سمیت اسے نکال لاتا۔ ہاتھی کو پکڑنے کی ایک اور شکل "گاڈ" تھی ایک گہرا گڑھا کھود کر اسے گھاس اور لکڑیوں سے پاٹ دیتے تھے یہ گڑھا ہاتھیوں کی عام گذرگاہ پر کھودا جاتا تھا۔ جب ہاتھی اس گڑھے کے قریب پہنچتا تو اطراف سے گھات میں لگے ہوئے شکاری شور مچاتے ہاتھی بھڑک کر تیزی سے بھاگتا اور جلدی میں اس گڑھے کو دیکھ نہ پاتا اور اس میں گر جاتا تھا جب بھوک پیاس سے بہت بیتاب ہونے لگتا تو اسے چارہ اور پانی دے کر آہستہ آہستہ مانوس کر لیتے۔ ایک اور صورت "باڑ" کہلاتی تھی ایک وسیع خطۂ زمین کے چاروں طرف خندق کھود دی جاتی تھی اس کا صرف ایک راستہ کھلا رکھ کر اس پر دروازہ لگا دیا جاتا تھا چارہ کے لالچ میں ہاتھی بے محابا احاطہ میں داخل ہو جاتا تھا شکاری دروازہ بند کر دیتے تھے اور راستہ کاٹ دیتے تھے ہاتھی غضب ناک ہو کر نکلنے کے لیے بڑا زور لگاتا لیکن جدھر جاتا اس طرف آگ جلتا ہوا دیکھ کر اسے مڑ لیا جاتا۔ خوف زدہ ہو کر رہ جاتا پھر پالتو ہاتھیوں کے ذریعہ اسے مانوس کر لیا جاتا تھا۔ (آئین اکبری ص ۱۲۹)

دیدی اور یہ دونوں نیم کھارہ کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ محمد امین دیوانہ اسی معرکہ میں باغیوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا۔ مجنوں خاں قاقشال بھی باغیوں کے سامنے ٹھہر نہ سکا اور وہ مانک پور میں قلعہ بند ہو گیا۔ اور آصف خاں کڑہ اور کٹنکہ کا علاقہ ایک جمعیت کی حفاظت میں دے کر کافی بڑے خزانہ اور بھاری لشکر کے ساتھ مجنوں خاں کی کمک کے لیے پہنچ گیا اور خزانہ کا منہ کھول کر اس نے لشکریوں کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے لشکر میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے خان زماں کے مقابلہ میں ایک مضبوط محاذ بنا لیا اور بارگاہ شاہی میں عریضے روانہ کیے ثانی خاں نے اپنے عریضہ میں یہ شعر لکھا تھا ؎

اے شہسوار معرکہ آرائے روزِ رزم
از دست رفت معرکہ پا در رکاب کُن

باغیوں پر اکبر کی فوج کشی

جس وقت بادشاہ سلامت مالوہ کے سفر سے لوٹے تو انھیں اس بغاوت کی اطلاع ملی۔ بادشاہ نے اسی وقت منعم خان خانخاناں کو آگے روانہ کر دیا تاکہ وہ دریائے گنگا کو قنوج کے گھاٹ سے عبور کر کے باغیوں کے مقابلہ میں صف آرائی کر لے۔ اس کی روانگی کے بعد اکبر ماہ شوال ۹۷۳ھ میں میدان جنگ کے لیے سوار ہوا۔ جب سواری قنوج پہنچی تو قبا خاں گنگ جو باغیوں کے ساتھ ہو گیا تھا خانخاناں کی سفارش پر باریاب ہوا، بادشاہ نے اس کے جرم معاف کر دیے، وہاں سے شاہی لشکر یلغار کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچا۔ سکندر خاں کو مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ لڑے بغیر پسپا ہو گیا اور خان زماں اور بہادر خاں سے جا کر مل گیا۔ یہ سب لوگ آصف خاں اور مجنوں خاں کے مقابلہ کو ترک کر کے جون پور کی طرف فرار ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ نرہن ندی کو عبور کر کے کیمپ لگا دیا۔

جون پور میں چھاؤنی

ان کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر سے یوسف محمد خاں ولد اتکہ خاں کو نامزد کیا گیا اس کے پیچھے بادشاہ نے بھی کوچ کیا اور جون پور کے سامنے چھاؤنی ڈال دی۔ اسی منزل میں آصف خاں مجنوں خاں کے ہمراہ پانچ ہزار تجربہ کار سپاہیوں کے ساتھ لشکر میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ بروز جمعہ ۱۲ ذی الحجہ ۹۷۳ھ میں اکبر نے قلعہ جون پور میں نزول اجلال فرمایا۔ آصف خاں کو لشکر کی کمان دے کر باغیوں کے مقابلہ پر رخصت کیا۔ اس نے نرہن کے راستہ پر خان زماں کے مقابل اپنا کیمپ لگا دیا۔ بادشاہ نے اس دوران میں حاجی محمد خاں سیستانی کو بنگالہ کے حاکم سلیمان کرانی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ سلیمان کی خان زماں سے بڑی دوستی تھی اور اندیشہ تھا کہ وہ باغی خان کی مدد کرے گا۔ اس سفارت کی غرض یہ تھی کہ اسے خان زماں کی مدد سے روک دیا جائے، لیکن جب حاجی محمد خاں رہتاس کے قلعہ پر پہنچا تو وہاں کے پٹھانوں نے جو خان زماں سے ملے ہوئے تھے اسے گرفتار کر کے خان زماں کے پاس بھیج دیا۔ خان زماں نے قدیم روابط اور آشنائی کی وجہ سے حاجی محمد خاں کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنی والدہ کو اس کے ہمراہ کر کے بادشاہ کے پاس اپنے قصور معاف کرانے کے لیے روانہ کیا۔

جون پور کے قیام کے دوران میں اکبر نے حسن خاں خزانچی اور مہاپاتر بھاٹ کو جو شیر شاہ اور اسلیم شاہ کے دربار کا رکن تھا اور ہندی شاعری و موسیقی میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا، اوڑیسہ کے راجہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نہ تو خان زماں کی مدد کرے اور نہ اسے اپنے ہاں پناہ دے بلکہ اپنے اثر سے کام لے کر سلیمان کو بھی مخالفانہ حرکتوں سے روک دے۔ سلیمان نے طوعاً و کرہاً اس بات کو مان لیا اور بادشاہ کے لیے نفیس تحفے اور عمدہ ہاتھی روانہ کر کے اطاعت اختیار کر لی۔ یہ دونوں سفیر لوٹ کر آگرہ میں باریاب ہوئے۔

آصف خاں کا فرار

انہی دنوں مظفر خاں اور دوسرے چند باا ثر سردار آصف خاں کے مخالف ہو گئے ان کو آصف خاں سے بھاری انعام اور تحائف کی توقع تھی اور وہ مارے حرص کے ان مطالبات کو صراحتاً اور کنایتاً ظاہر کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس سے صاف صاف چوراگڑھ کے مال غنیمت کا مطالبہ کر دیا۔ آصف خاں نرہن کی سڑک پر خان زماں کے مقابلہ میں محاذ جمائے ہوئے تھا۔ اس موقع پر ان لوگوں کے مطالبوں اور مخالفتوں سے وہ سخت پریشان ہو گیا اور آدھی رات کے وقت اپنے چھوٹے بھائی وزیر خاں کو لے کر اپنی خاص جمعیت کے ہمراہ کرہ کننکہ کے راستہ کٹرہ کو چلا گیا۔ جب اس کے محاذ چھوڑ کر چلے جانے کی اطلاع بارگاہ شاہی میں پہنچی تو لشکر کی کمان منعم خاں خانخاناں کو دیدی گئی اور شجاعت خاں کو آصف خاں کے تعاقب پر مامور کیا گیا۔

قلعۂ رہتاس

شجاعت خاں مانک پور سے کشتیوں پر سوار ہو کر آگے بڑھا تھا کہ اس کی آمد کی اطلاع آصف خاں کو ہو گئی اور وہ لوٹ کر دریا کے کنارے مقابلہ پر آ گیا اور ایک سخت جنگ کر کے شجاعت خاں کی کشتیوں کو گنگا عبور کرنے سے روک دیا۔ مجبوراً شجاعت خاں رات کے وقت پیچھے ہٹ کر گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گیا اور آصف خاں نے فوج کشی کر کے اس طرف کے سارے علاقہ کو اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ شجاعت خاں دوسرے راستہ سے کٹرہ چلا گیا۔ وہاں سے غنیم کا تعاقب شروع کیا لیکن آصف خاں کافی دور نکل گیا تھا اس لئے جون پور آ کر باریاب ہو گیا۔

انہی دنوں قلعہ رہتاس کے حاکم فتح خاں افغان تبتی نے اپنے بھائی حسن خاں کو بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ ۹۷۲ھ میں سلیمان[1] کرانی نے اس کے قلعہ پر حملہ کیا تھا لیکن جب اس نے شہنشاہ کی آمد آمد سنی تو محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ غرض حسن خاں نے حاضر ہو کر مناسب نذرانے گزرانے اور درخواست کی کہ کسی سردار کو مقرر کر دیا جائے تاکہ ہم قلعہ اس کے سپرد کر دیں۔ بادشاہ نے جون پور سے خلیج خاں کو اس کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بعد میں فتح خاں اپنے بھائی کو اس سفارت پر بھیجنے سے پشیمان ہوا اور قلعہ میں کافی سامان رسد جمع کر کے اپنے بھائی کو لکھ بھیجا کہ تم جلد از جلد لوٹ آؤ کیوں کہ اب قلعہ میں رسد وغیرہ کا کافی ذخیرہ ہو چکا ہے اور قلعہ سپرد کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ حسن خاں نے اس خط کے ملنے پر خلیج خاں کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی، بظاہر وہ اس کی بڑی اطاعت کرتا رہتا تھا لیکن خلیج خاں جلد ہی اس کی منافقت سے آگاہ ہو گیا اور قلعہ کا خیال چھوڑ کر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

رہتاس کا یہ قلعہ بہار کے توابعات میں چودہ کوس کے طول اور تین کوس کے عرض میں واقع ہے۔ اس کی بلندی پانچ کوس ہے۔ قلعہ کے اندر زراعت ہوتی ہے۔ پانی اتنا وافر ہے کہ جہاں میخ گاڑو وہیں پانی نکل آتا ہے۔ جب سے شیر شاہ نے یہ قلعہ فتح کیا تھا پٹھانوں کے قبضہ ہی میں چلا آ رہا تھا یہاں تک کہ فتح خاں اس کا حاکم بنا اور اس نے سلیمان کے سامنے ہار نہ مانی، آخر کار فتح خاں سے شاہی لشکر نے یہ قلعہ چھین لیا جس کا ذکر حسب موقع آئندہ کیا جائے گا۔

صلح کی گفت و شنید

جون پور میں بادشاہ چھاؤنی ڈالے ہوئے مقیم تھے اور انھوں نے منعم خاں کو مقدمۃ الجیش کا سردار بنا کر

---

[1] بنگال پر شیر شاہ کے وقت سے پٹھانوں کی حکمرانی چلی آ رہی تھی یہ بادشاہ برائے نام دہلی کے ماتحت تھے عدلی شاہ کے زمانہ میں کرانی افغانوں میں سے چند امیر اور سردار دربار سے ناراض ہو کر بنگال چلے گئے اور وہاں خود مختار حکومت بنا لی ان کا سردار تاج خاں تھا سلیمان کرانی اس کا چھوٹا بھائی تھا اس نے کٹک بنارس جگنا تھ کامروپ اور اڑیسہ تک کے علاقے فتح کیے۔ اس کی زندگی تک اکبر نے بنگال کا رخ نہیں کیا۔ یہ نہایت بہادر منتظم اور دیندار حکمران تھا ڈیڑھ سو عالم اور مشائخ اس کی صحبت میں رہتے تھے تفسیر حدیث نماز روزہ کا شائق تھا اس کے اوقات نہایت باقاعدہ تھے اس کے بعد پٹھانوں میں خانہ جنگی اور سازشیں شروع ہو گئیں اور بنگالہ میں مغلوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔

خان زماں کے مقابلہ میں بھیجا تھا اور خود امور سلطنت کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ جب منعم خاں زمن گھاٹ پر اس کے مقابلہ میں پہنچا خان زماں نے بہادر خاں کو سردار بنا کر سرور کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اس علاقہ میں شورش برپا کر کے جہاں تک ممکن ہے قبضہ کر لے۔ باغیوں کی اس کارروائی کو روکنے کے لیے بادشاہ نے معزالملک مشہدی کو جو قطعاً سرداری کی اہلیت نہیں رکھتا تھا مامور کیا۔ اس کے ساتھ لشکر کے بڑے امرا جیسے شاہ بداغ خاں اس کا لڑکا عبدالمطلب خاں، قبا خاں سعید خاں اور محمد معصوم خاں فرنخودی وغیرہ کو بھی نامزد کیا گیا۔

اسی دوران میں منعم خاں نے خان زماں سے سابقہ روابط کی بنا پر سفارت و مراسلت جاری رکھی اور اسی میں اس نے چار پانچ ماہ گزار دیے اور باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ آخر بادشاہ نے صلح یا جنگ کے قطعی فیصلہ کی خاطر خواجہ جہاں اور دربار خاں کو جون پور سے زنبن روانہ کیا۔ ان لوگوں کے آنے پر صلح کی باقاعدہ گفتگو ہوئی باغیوں کی طرف سے خان زماں دو تین آدمیوں کے ساتھ اور لشکر شاہی کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے ملے۔ آخر کار صلح اس شرط پر طے پائی کہ خان زماں اپنی والدہ کو اپنے چچا ابراہیم خاں اوزبک کے ہمراہ دربار میں بھیج دے اور جتنے مشہور اور عمدہ ہاتھی اس کے پاس ہیں وہ شاہی کارندوں کے سپرد کر دے۔ جب اسے معافی مل جائے تو سکندر اور بہادر بھی دربار میں حاضر ہو جائیں۔ جب صلح طے پا گئی تو دربار خاں واپس چلا گیا اور بادشاہ کو اس کی اطلاع دی

دوسرے دن خانخاناں اور خواجہ جہاں خان زماں کی والدہ اور ابراہیم خاں کو ہمراہ لے کر مع ہاتھیوں کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور دونوں نے خان زماں کے قصور معاف کر دینے کی سفارش کی، شاید اسے معافی مل جاتی، لیکن اسی وقت سروار سے میر معزالملک کی شکست اور فرار کی اطلاع پہنچی جسے سنتے ہی شہنشاہ کا پارہ چڑھ گیا اور وہ صلح ادھوری رہ گئی۔

معزالملک کی فوج کشی

معزالملک کی شکست کا قصہ یہ ہوا کہ جب سکندر اور بہادر کے مقابلہ پر بادشاہی فوج پہنچی تو یہ دونوں اس جگہ ٹھہر گئے جہاں تک وہ پیش قدمی کر چکے تھے اور معزالملک کو پیغام دیا کہ تم ہمارا واسطہ بن کر دربار سے ہمارے جرم معاف کرا دو تاکہ جو کچھ ہاتھی اور مال غنیمت ہم نے جمع کر رکھا ہے وہ سب ہم دربار میں روانہ کر دیں۔ جب ہماری خطائیں معاف ہو جائیں گی تو ہم خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ میر معزالملک ایک فرعون صفت آدمی تھا اور یہ غرور تو مشہدی سیدوں کو معلوم ہوتا ہے وراثت ہی میں ملا ہے اسی لیے مشہور ہے ؎

اہل مشہد بجز امام شما
لعنۃ اللہ بر تمام شما

ان کی شان میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

روئے زمیں گرچہ زمردم خوش است!
مشہدی از روئے زمیں گم خوش است

چنانچہ اس نے بڑے تکبر اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور ان کے اظہار اطاعت پر یہ کہلا بھیجا کہ اب صرف تلوار ہی تمہارا فیصلہ چکائے گی ابھی معاملہ اسی نوبت پر تھا کہ بادشاہ کی طرف سے لشکر خاں میر بخش اور میر ٹوڈر مل پہنچے تاکہ صلح یا جنگ، کوئی ایک بات جلد از جلد طے پا جائے، اگر مناسب ہو تو جنگ کریں ورنہ سکندر اور بہادر کو تسلی دلاسا دے کر اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

التوائے جنگ کی پیشکش

بہادر خاں خود شاہی لشکر کی چھاؤنی کے قریب آیا اور اس نے میر معزالملک کو چند امیروں کے ساتھ بلا کر

صلح کی گفتگو چھیڑی اور کہا کہ "خان زماں اپنی والدہ اور ابراہیم خاں کو صلح کے لیے دربار میں بھیج رہا ہے بلکہ اب تک وہ بھیج بھی چکا ہوگا، اس لیے ہم کو اپنے قصوروں کی معافی کی امید اور توقع ہے، ہم اس سفارت کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک یہ معاملہ یکسو نہیں ہو جاتا ہم لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتے تم بھی دربار سے جواب آنے تک کچھ دن تک لڑائی کو ملتوی رکھو تو بہتر ہے۔"

معز الملک کی شکست

التوائے جنگ کے لیے بہادر خاں کا یہ مطالبہ نہایت معقول تھا لیکن میر معز الملک کو اتنی سمجھ کہاں؟ وہ تو بس آگ بنا ہوا تھا اور راجہ ٹوڈر مل تیل سے کم نہیں تھے۔ وہ برابر اس آگ کو بھڑکاتے رہے، چنانچہ انھوں نے بہادر خاں کو منہ توڑ جواب دیا ان کے اس رویہ سے بہادر خاں اور اسکندر خاں مایوس ہو گئے اور مقابلہ کے لیے صف آرائی کر لی۔ میر معز الملک نے ان کے مقابلہ پر محمد امین دیوانہ کو مقدمۂ لشکر پر مقرر کر کے بڑھایا اور خود قلب لشکر میں ٹھہرا رہا۔ اپنے ساتھ تجربہ کار سپاہیوں اور عبد المطلب خاں، سلیم خاں، کاکر علی خاں، بیگ نورین خاں سرداروں کو متعین کر کے دوسرے امیروں کو میمنہ اور میسرہ پر لگا دیا۔ دوسری طرف باغیوں کے ہراول پر تو سکندر خاں اور اس کا داماد محمد یار تھا، قول پر بہادر خاں خود کمان کر رہا تھا۔ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ جلد ہی محمد یار قتل ہو گیا اور اسکندر خاں گھبرا کر کالی ندی میں کود پڑا اور تیر کر نکل گیا۔ اس کے اکثر ہمراہی ندی میں غرق ہو گئے۔ جو بچے وہ دشمن کی تلوار کا نشانہ بن گئے۔ ساری فوج لوٹ مار میں منتشر ہو گئی۔ میدان میں میر معز الملک اپنے چند سرداروں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ بہادر خاں ابھی تک اپنے مورچے پر جما ہوا تھا، اس نے جب میر کو تنہا پایا تو اچانک اس پر حملہ کر دیا اور ایک ہی حملہ میں اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سے جنگجو جوانوں نے خاص طور سے حسین خاں خویش، مہدی قاسم خاں اور باقی محمد خاں وغیرہ نے جو میر معز الملک کی سرداری اور راجہ ٹوڈر مل کے حکم چلانے سے رنجیدہ تھے جس قدر جد و جہد کرنی چاہیے تھی نہیں کی البتہ شاہ بداغ خاں نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ لڑتے لڑتے وہ گھوڑے سے گر پڑا اس کے بیٹے عبد المطلب خاں نے اس کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا آخر اپنی جان بچا کر نکل گیا اور اس کا باپ ازبکوں کے ہاتھ قید ہو گیا۔ راجہ ٹوڈر مل اور خان کا لشکر پسپا ہو گیا، رات میں ان لوگوں نے ہاری ہوئی جنگ جیتنے کے لیے باغیوں پر حملہ کیا لیکن کچھ نہ کر سکے، باغیوں نے ان کو منتشر کر کے بھگا دیا۔ دوسرے دن یہ سب اکٹھا ہو کر شیر گڑھ کی طرف ہٹ گئے۔ اور ساری روئداد دربار میں لکھ بھیجی۔

باغیوں کی اطاعت اور معافی

اب ہم اصل قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب خان خاناں، خان زماں کی والدہ ابراہیم خاں اور خان زماں کے معتمد آدمیوں میر ہادی صدر اور نظام آغا کو دربار میں لے گیا اور جنگی ہاتھی بھی ملاحظہ میں پیش کیے تو ابراہیم خاں سر برہنہ گردن میں تلوار لٹکائے اور بجائے چادر کے کفن لپیٹے ہوئے زبان حال و قال سے کہہ رہا تھا: ع

"خواہی بدار خواہی بکش رائے رائے تست"

خان خاناں بھی ان لوگوں کی سفارش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ کر رہا تھا، بادشاہ نے ان سب کے جرم معاف کر دیے، ان کی جاگیریں بحال کر دیں اور حکم دیا کہ جب تک لشکر یہاں ہے یہ لوگ دریا عبور نہ کریں اور ان کے نمائندے آگرہ میں آکر فرامین حاصل کر کے حسب فرمان اپنی جاگیروں کو سنبھال لیں۔ خان زماں کی والدہ نے یہ خوش خبری اپنے بیٹوں کے پاس بھیج دی اور بہادر و سکندر نے کوہ پارہ اور صف شکن ہاتھیوں کو جن کی وجہ سے یہ سارا فتنہ برپا ہوا تھا۔ نذرانوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ عین اسی مرحلہ پر راجہ ٹوڈر مل، اور لشکر خاں کا عریضہ جس میں لڑائی اور شکست اور امراء کی منافقت کا ذکر تھا پہنچا۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا،

"ہم نے خانخاناں کی خاطر سے خان زماں اور دوسروں کو معافی دے دی ہے اب تمام امیر دربار میں لوٹ آئیں"۔ اسی سلسلہ میں میر معزالملک اور راجہ ٹوڈرمل پر شاہی عتاب بھی نازل ہوا۔ جن لوگوں نے منافقت سے کام لیا تھا وہ عرصہ تک کورنش و تسلیمات سے محروم کر دیے گئے بعد میں پھر ان کو اپنے اپنے اعزاز دوبارہ مل گئے۔

خان زماں کی عہد شکنی

اسی زمانہ میں بادشاہ نے کوچ کیا۔ قلعہ چنار کی سیر کی اور اس قلعہ کے جنگل میں ہاتھیوں کا شکار کرکے بعد لشکر میں لوٹ آیا۔ جس زمانہ میں قلعہ چنار میں چھاؤنی تھی خان زماں نے عجلت کرکے دریائے گنگا کو عبور کیا اور معاہدۂ صلح کے خلاف قصبۂ مئو کے ملحقہ دیہات محمد آباد میں آگیا اور اپنے گماشتوں کو جون پور اور غازی پور پر قبضہ کرنے بھیج دیا شہنشاہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری، انھوں نے اشرف خاں میر منشی کو جون پور بھیجا تاکہ خان زماں کی والدہ کو قلعہ میں نظر بند کرکے تمام باغیوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ پھر بادشاہ نے لشکر کو خواجہ جہاں اور مظفر خاں کی تحویل میں چھوڑا اور خود خان زماں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب بادشاہ سردار ندی کے کنارے پہنچے تو غنیم کی مال و اسباب سے لدی ہوئی کشتیاں بادشاہی آدمیوں کے ہاتھ آگئیں۔ بادشاہ نے ندی کے کناروں پر چوکیاں قائم کرکے گھنے جنگلوں کو طے کیا۔ جب معلوم ہوا کہ خان زماں کوہ سوالک کی طرف بھاگ گیا ہے تو اس کا تعاقب چھوڑ کر لوٹ آئے۔

اسی اثنا میں بہادر خاں چند بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کے ساتھ جون پور پہنچا اور کمندوں کے ذریعہ قلعہ پر چڑھ کر اپنی والدہ کو چھڑا لایا اور اشرف خاں کو قید کر لیا لیکن جب اس کو بادشاہ کے لوٹ کر آنے کی خبر ملی تو وہ سکندر خاں کے ہمراہ نرہن گھاٹ کے ذریعہ گنگا کو عبور کرکے بھاگ گیا۔

بادشاہ کی سالگرہ کا جشن

پانچ رجب ۹۷۳ھ کو جون پور کے ملحقہ پرگنہ نظام آباد میں اکبر کی سالگرہ ہوئی۔ معمول یہ تھا کہ سالگرہ پر بادشاہ کو تولنے کا جشن منعقد ہوتا تھا جس میں شمسی اور قمری تاریخوں کے حساب سے سال میں دو بار سونے چاندی اور ہر قسم کے اجناس سے بادشاہ کو تولا جاتا تھا پھر یہ تول برہمنوں اور دوسرے محتاجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس رسم کے موقع پر شاعروں نے بڑے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔

آگرہ کو اکبر کی واپسی

جشن سالگرہ کے بعد بادشاہ جون پور کے قلعہ میں داخل ہوئے۔ جب خان زماں کو بادشاہ کے قیام کی اطلاع ملی تو اس نے میرزا میرک کو جسے بعد میں رضوی خاں کا خطاب ملا تھا خان خاناں کے پاس سفارش کروانے بھیجا۔ وہ خان زماں کی والدہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا، خان زماں کا پیغام اطاعت پیش کیا۔ خان خاناں نے میر عبداللطیف قزوینی ملا عبداللہ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر کے ساتھ دوبارہ خان زماں کے قصور معاف کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے یہ التماس قبول کر لی۔ خواجہ جہاں میر مرتضیٰ شریفی (جو علامہ میر سید شریف جرجان کے خاندان سے ہے) اور مخدوم الملک کو خان زماں کو بلانے اور معافی کی خوش خبری سنانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ خان زمان نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور قسمیں کھا کر اطاعت کا عہد کیا اور اپنے عزیزوں کو کورنش بجالانے کے لئے دربار میں کیا۔ خان زماں کے قضیہ کی یکسوئی کے بعد بادشاہ نے ۹۷۳ھ کے اواخر میں مراجعت فرمائی اور بروز جمعہ ۷ ماہ رمضان سن مذکور کو دارالخلافہ آگرہ میں پہنچ کر آرام کیا، پھر وہاں سے نئے شہر نگرچین میں جاکر چوگان بازی، کتوں کی دوڑ اور جانوروں کے شکار میں مشغول ہو گئے۔ اسی موقع پر بادشاہ نے ایک آتشیں گولہ ایجاد کیا جسے اندھیری رات میں چھوڑا جاتا تھا۔ انہی دنوں

محمد یوسف خاں ولد اتکہ خاں کثرت شراب نوشی سے فوت ہوگیا۔

اسی سال بادشاہ نے آصف خاں کی سرکوبی کے لیے مہدی قاسم خاں اس کے داماد حسین خاں اور خالدی خاں کو چند اور امراء کے ساتھ تین چار ہزار کی جمعیت دے کر گڑھ کٹنگہ کی طرف روانہ کیا۔ آصف خاں نے چوراگڑھ کے قلعہ کو خالی کر دیا اور دربار میں معافی کے لیے عریضہ روانہ کیا لیکن اس کی درخواست قبول نہ کی گئی۔ مجبور ہو کر اس نے خان زماں کو ایک خط لکھا اور خود بھی اپنے بھائی وزیر خاں کو لے کر جون پور میں خان زماں کے پاس آگیا، لیکن خان زماں نے پہلی ملاقات ہی میں اس سے ایسی لاپروائی برتی کہ وہ یہاں آنے پر سخت پشیمان ہوگیا۔ اس کی مثال ایسی ہوگئی ع

آہ از چاہ بروں آمد و در دام افتاد

اس عرصہ میں مہدی قاسم خاں نے گڑھ کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے کر جاگیرداروں میں تقسیم کر دیا اور آصف خاں کے تعاقب کو چھوڑ کر ہنڈیہ کے راستہ سے مکہ معظمہ کے ارادہ سے چلا گیا۔ حسین خاں اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کو چھوڑنے کے لیے دکن کے قریب قلعہ ستواس تک گیا تھا۔

مرزاؤں کی بغاوت اسی زمانہ میں اچانک سلطان محمد مرزا کے بیٹوں ابراہیم حسین مرزا، شاہ مرزا اور محمد حسین مرزا نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان محمد مرزا کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے تو امیر تیمور صاحبقران اور ماں کی جانب سے سلطان حسین مرزا سے ملتا ہے اور اب وہ کافی بوڑھا اور معمر ہوچکا ہے، بادشاہ نے اعظم پور کا پرگنہ اس کو جاگیر میں دیا تھا۔ اس کے بیٹوں نے سنبل کے علاقہ میں سرکشی اختیار کی۔ اس وقت بادشاہ خان زماں کے قصہ سے فارغ ہونے کے بعد محمد حکیم مرزا کی شورش کو دفع کرنے کے لیے پنجاب گئے ہوئے تھے۔ منعم خاں نے ان بھائیوں کی مدافعت کی۔ وہ منعم خاں کے مقابلہ سے بھاگ کر دوآبہ میں چلے گئے اور دہلی سے گزر کر مالوہ جا پہنچے، وہاں سے تو دو بھائی شاہ میرزا اور محمد حسین مرزا تو ہنڈیہ چلے گئے اور ابراہیم حسین میرزا نے ستواس کا رُخ کیا جو دس (دو) کوس کے فاصلہ پر تھا۔ حسین خاں دکن کے ایک امیر مقرب خاں کی مدد سے قلعہ ستواس میں قلعہ بند ہوگیا۔ قلعہ میں کافی ذخیرہ نہ تھا اس کے لشکری گھوڑے، اونٹ اور بیل تک کاٹ کر کھا گئے، فاقہ اور بھوک سے ان کا بُرا حال تھا اور کسی طرف سے کوئی کمک نہیں پہنچ رہی تھی اس کے باوجود ان لوگوں نے میرزا ابراہیم حسین کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا اور قلعہ بند فوج نے لڑنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا ابراہیم حسین نے ہنڈیہ میں مقرب خاں کے بھائی برق دم خاں کو قتل کر دیا تھا اور اس کے اہل و عیال کو بھی قید کر لیا تھا۔ جب مقرب خاں اور حسین خاں صلح پر راضی نہیں ہوئے۔ تو اس نے برق دم خاں کا سر نیزہ پر بلند کر کے مقرب خاں کو دکھایا اور اس کی ماں کو بھی اس کے سامنے لا کر کہا کہ ہنڈیہ فتح ہوچکا ہے، تمہارے عزیز رشتہ دار اور وہاں کے سارے لوگ گرفتار ہوچکے ہیں اب تم کس کے بھروسہ لڑائی پر کمر باندھے ہوئے ہو۔ یہ دیکھ کر اور یہ سن کر مقرب خاں کے ہوش اُڑ گئے اور وہ اطاعت قبول کر کے مرزاؤں کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ حسین خاں کو بھی قول و قرار دے کر قلعہ سے باہر بلوا لیا گیا اور اسے بھی مرزاؤں نے ملازمت کی پیش کش کی لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ انھوں نے اسے سلامتی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ جب ۹۷۵ھ میں شہنشاہ لاہور سے آگرہ تشریف لائے تھے تو حسین خاں دربار میں حاضر ہوا تھا، اس موقع پر اس کی جاگیر میں پٹیالی کے ساتھ شمس آباد کا پرگنہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔

حسین خاں کی مصاحبت میں اس سے ایک سال پہلے پٹیالی گیا تھا وہاں حسین خاں سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے اسے

نہایت با اخلاق منکسر مزاج درویش صفت، بہادر، سخی، خوش اوقات، یکاسُنی، علم پرور اور علم دوست پایا وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا، چنانچہ اس کی رفاقت چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اور کسی اور کی ملازمت اختیار کرنا میں نے مناسب نہ جانا اور اسی جگہ ٹھہر گیا اور دس سال اس گوشۂ گمنامی میں اس کی دوستی اور رفاقت میں گزار دیے۔ آسمان بھلا اس خوش وقتی کو کہاں دیکھ سکتا تھا، ہماری آپس میں کچھ ایسی رنجش ہوگئی کہ جدائی کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے میری خفگی کو دور کرنے کے لیے بڑی کوشش کی اور معذرت چاہی، یہاں تک کہ بدایوں جاکر والدۂ مرحومہ تک کو بیچ میں ڈالا، لیکن میرا دل ایسا پھر اتھا کہ میں اس کے پاس نہ گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

دل کہ رنجید از کسے خورسند کردن مشکل است
شیشۂ بشکستہ را پیوند کردن مشکل است

آصف خاں کا فرار

خان زماں نے آصف خاں اور بہادر خاں کو پٹھانوں کے علاقوں پر فوج کشی کے لیے مقرر کیا اور وزیر خاں کو کسی بہانے سے اپنے پاس روک کر نظر بند کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے آپس میں خط و کتابت کر کے فرار ہو جانے کی ٹھانی، چنانچہ ایک مقررہ رات کو وزیر خاں تو خان زماں کے پاس سے بھاگ گیا اور اس کا بھائی آصف خاں، بہادر خاں کے پاس سے بھاگ کر آگرہ اور مانک پور کے راستہ پر تین کوس تک چلا گیا۔ بہادر خاں نے آصف خاں کا تعاقب کر کے راستہ روک دیا اور دونوں میں جون پور اور مانک پور کے درمیان ایک سخت جنگ ہوئی جس میں آصف خاں کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہو گیا۔ بہادر خاں اسے ہاتھی پر عماری میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے چلا۔ اسی اثنا میں وزیر خاں جون پور سے بھائی کو چھڑانے کے لیے وہاں پہنچ گیا اس وقت بہادر خاں کی جمعیت مال غنیمت لوٹنے کے لیے منتشر ہو گئی تھی اس لیے وزیر خاں کے اچانک حملہ کی بہادر خاں مدافعت نہ کر سکا اور اسی حال میں اس نے حکم دیا کہ آصف خاں کو عماری میں ہی قتل کر دیں۔ لوگوں نے آصف خاں پر حملہ کر دیا۔ تلوار کا ایک زخم اس کی ناک پر آیا اور اس کی دو تین انگلیاں بھی کٹ گئیں، عین اس موقع پر وزیر خاں نے تیزی سے بڑھ کر آصف خاں کو قاتلوں کے نرغہ سے چھڑا لیا اور دونوں بھائی وہاں سے بھاگ کر کٹرہ کی طرف چلے گئے اور بہادر خاں کو خالی ہاتھ لوٹ جانا پڑا۔

جس زمانہ میں کہ اکبر بادشاہ مرزا محمد حکیم کا تعاقب کرتے ہوئے لاہور کے نواح میں پہنچے تھے اور وہاں شکار میں مصروف تھے، وزیر خاں خدمت سلطانی میں حاضر ہو گیا۔ مظفر خاں کے وسیلہ سے اسے باریابی نصیب ہوئی۔ بادشاہ نے آصف خاں کے نام معافی اور مہربانی کا فرمان لکھ دیا۔

کابل پر مرزا سلیمان کا چوتھا حملہ

اسی سال مرزا محمد حکیم بھی لاہور پہنچا تھا اس کے لاہور آنے کا سبب یہ تھا کہ جب تیسری مرتبہ مرزا سلیمان کابل سے واپس ہو گیا اور کابل پر مرزا حکیم کا پوری طرح قبضہ ہو گیا تو اس نے بادشاہی امیروں کو ہندوستان واپس کر دیا اور خواجہ حسن نقشبندی کو اپنی وکالت کے عہدہ پر مستقل کر دیا۔ اس کی اس کارروائی سے رنجیدہ ہو کر خان کلاں کابل چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ مرزا سلیمان کے لیے اس سے اچھا کیا موقع ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے میدان کو صاف دیکھ کر چوتھی بار اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کی مدد و تائید سے کابل پر چڑھائی کر دی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس موقع پر مرزا حکیم کابل محمد معصوم کوکہ کے حوالہ کر دیا اور خود خواجہ حسن نقشبندی کے ساتھ غوربند کی طرف چلا گیا۔ یہ محمد معصوم وہی شخص ہے جس نے بعد میں ہندوستان پہنچ کر

بڑے فتنے اور بغاوتیں برپا کیں، ویسے یہ نہایت بہادر اور دلیر شخص تھا۔

جب مرزا اسلیمان کابل پر بزورِ شمشیر قبضہ نہ کر سکا تو اس نے اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کے ذریعہ مکر و فریب سے کام لینا چاہا، چنانچہ بیگم وہاں سے قراباغ پہنچی جو کابل سے دس کوس پر غور بند کی سرحد پر واقع ہے۔ وہاں اس نے مرزا سے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور بڑی سخت قسمیں کھائیں اور اسے صلح کی گفتگو کے لیے بلایا۔ میرزا چند آدمیوں کے ساتھ اس گفت و شنید کے لیے روانہ ہوگیا۔ خواجہ حسن بھی مصالحت پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن باقی قاقشال صلح کی تجویز پر راضی نہیں ہوا تھا اور اس نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ یہ عورت نہایت مکار اور چالباز ہے اس کے بھرے میں نہیں آنا چاہیے۔ اس کا خیال صحیح تھا کیوں کہ ابھی مرزا محمد حکیم قراباغ پہنچے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا اسلیمان ایک بھاری جمعیت لے کر یلغار کرتا ہوا کابل سے وہاں پہنچ گیا اور گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتفاق کی بات کہ مرزا محمد حکیم کے چند آدمیوں کی مرزا اسلیمان کے لشکریوں سے مڈبھیڑ ہوگئی، انھوں نے فوراً اس کی اطلاع مرزا حکیم کو پہنچادی اور وہ وہاں سے الٹے پاؤں غوربند بھاگ گیا۔ حملہ آوروں کے ڈر سے وہاں بھی اس کے قدم نہیں رُکے اور وہ کوہ ہندوکش کے راستہ پر چلا گیا۔ خواجہ حسن تو چاہتا تھا کہ اسے حاکم بلخ پیر محمد خاں کے پاس کمک حاصل کرنے کے لیے لے جائے لیکن باقی قاقشال نے اس ارادہ کی سختی سے مخالفت کی اور مرزا کو اکبر بادشاہ کے حضور میں لے جانے کے لیے پنجہر کے راستہ جلال آباد پہنچا، وہاں سے یہ لوگ دریائے نیلاب کے کنارے کنارے آگے بڑھے اور دریائے سندھ کو عبور کر کے بارگاہ شاہی میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ تو ادھر آئے اور خواجہ حسن اپنی جمعیت کو لے کر بلخ چلا گیا۔ کچھ مدت بعد وہاں وہ ایسی پریشانیوں میں گھر کر رہ گیا کہ زندگی اس پر عذاب بن گئی۔

مرزا حکیم فرار ہوا تو مرزا اسلیمان نے کوتل کے سنجد درہ تک اس کا تعاقب اور اس کے لشکر کے عقبی حصّہ کو اسیر کر لیا۔ اس کا سارا مال و اسباب لوٹ کر اسی جگہ اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔

مرزا اسلیمان کی واپسی

جب مرزا اسلیمان مرزا حکیم کی فکر میں کابل سے ہٹا تو محمد معصوم کابلی نے قلعہ سے نکل کر اس کے لشکر پر حملہ کر دیا اور اس کے سردار محمد قلی شغالی کو شکست دے کر چارباغ میں محصور کر دیا۔ جب سلیمان کو یہ اطلاع ملی تو اس نے قاضی خاں بدخشی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ محمد معصوم پہلے تو صلح پر بالکل راضی نہ ہوا۔ قاضی خاں چونکہ اس کا استاد تھا اس لیے بعد میں وہ اس کا کہا ماننے پر راضی ہوگیا اور مرزا اس سے تھوڑی بہت پیش کش لے کر بدخشاں کو واپس چلا گیا۔

خوش خبر خاں کی فتنہ پردازی

اب یہاں کا حال سنیئے اس سے پہلے کہ مرزا محمد حکیم کا ایلچی دربار میں پہنچے اکبر نے کابل کے اس نئے ہنگامہ کا حال سُن کر خوش خبر خاں سلول کے ذریعہ مرزا حکیم کے لیے مرصّع زین اور لگام والا گھوڑا ہندوستان کے نفیس تحائف کافی رقم اور امرائے پنجاب کی امدادی فوجیں ایک فرمان کے ہمراہ روانہ کر دی تھیں۔ مرزا محمد حکیم نے فرمان شاہی کا بڑھ کر استقبال کیا اور دربار شاہی میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اسی اثنا میں وہاں فریدوں خاں (جو مرزا حکیم کا ماموں تھا) پہنچ گیا، جسے بادشاہ نے کابل کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے نگرچین سے روانہ کیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر مرزا کو الٹی پٹی پڑھائی اور سارے معاملہ کو ایک دوسرے ہی رُخ پر ڈال دیا۔ مرزا کو بہکانے میں شہاب خاں کے بھائی حسن خاں کا جو اس زمانہ میں کابل ہی میں تھا اور سلطان علی الّامی خبرنویس کا جو ہندوستان سے بھاگ کر ایسے ہی کسی واقعہ کا انتظار کر رہا تھا بڑا ہاتھ ہے، ان دونوں نے فریدوں خاں کی ہاں میں ہاں ملا کر مرزا حکیم کو باور کرا دیا کہ لاہور پر قبضہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن خوش خبر خاں کے حامیوں نے اس کی مخالفت کی آخر کار سب نے خوش خبر خاں کو گرفتار

کر لینے کا فیصلہ کیا۔ مرزا حکیم طبعاً بڑا با مروت آدمی تھا، اس نے خوش خبر خاں کو علیحدہ بلا کر اسے وہاں سے رخصت کر دیا۔ یہ خوش خبر خاں اس زمانہ میں جب کہ بادشاہ لاہور کے نواح میں شکار میں مصروف تھے، دریائے راوی میں ڈوب کر مر گیا۔ اس واقعہ کے متعلق ایک عزیز نے کیا ہی اچھا کہا ہے ؎

خوش خبر خاں بدخبر کہ نبود
در جہاں بد قیافتی چوں وی
مرد در آب گرچہ مے گویند
وَمِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ

مرزا محمد حکیم کا لاہور پر حملہ

مرزا محمد حکیم نے بہر حال بغاوت پر کمر باندھ لی اور لوٹ مار کرتا ہوا بھیرہ تک پہنچ گیا اور وہاں سے غارت گری کرتے ہوئے لاہور کا رخ کیا اور مسلسل کوچ کر کے لاہور کے سامنے دریائے راوی کے کنارے مہدی قاسم خاں کے باغ میں اپنا کیمپ لگا دیا۔ اس کی مدافعت کے لیے میر محمد خاں اور تمام امرائے اتکہ نے پوری تیاری کر لی اور قلعہ بند ہو گئے۔ مرزا حکیم نے فصیل پر حملہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان امیروں نے اس کو حصار کے قریب تک پھٹکنے نہ دیا۔ جب ان امیروں کے عریضے بارگاہ سلطانی میں پہنچے تو بادشاہ نے آگرہ کو خان خاناں اور مظفر خاں کی حفاظت میں دے کر ۳ جمادی الاول ۹۷۴ھ میں خود کوچ کیا اور دہلی و سرہند کے راستہ سے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ مرزا محمد حکیم کو جیسے ہی بادشاہ کی یلغار کی اطلاع ملی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ جس راستہ سے آیا تھا اسی راستہ سے کابل واپس چلا گیا۔

لاہور سے مرزا کے تعاقب میں قطب الدین محمد خاں اور کمال خاں گکھڑ کو روانہ کیا گیا یہ لوگ کچھ دور تک جا کر بھیرہ سے واپس چلے آئے۔ انہی دنوں سندھ کے حاکم محمد باقی ترخان ولد مرزا محمد عیسیٰ کا عریضہ دربار میں پہنچا جس میں اس نے اپنی اطاعت کا اظہار کیا تھا اور بھکر کے حاکم سلطان محمود کی شکایت کی تھی کہ اس نے سندھ اور لاہور کے علاقہ میں مداخلت کر کے نقصان پہنچایا ہے۔ بادشاہ نے اس کے حسب مدعا سلطان محمود کے نام فرمان لکھ دیا۔

لاہور میں قیام کے دوران خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ الغ مرزا اور شاہ مرزا نے جن کو سنبل اور اعظم پور کے توابعات میں ہنتور کی جاگیر دی گئی تھی اپنے چچاؤں ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے بہکانے سے بغاوت کر دی ہے، خالصہ کے بعض پرگنوں پر قبضہ کر لیا ہے اور جب ان کا تعاقب کیا گیا تو یہ مالوہ کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

لـہ ہم اس سے قبل قلعہ بھکر کا حال ایک حاشیہ میں درج کر چکے ہیں۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے "قدیم زمانہ میں بھکر کا نام منصورہ تھا" ابوالفضل کی تائید مشہور مورخ ابوالفدا بھی کرتا ہے وہ لکھتا ہے "منصورہ وہ شہر ہے جو دریائے سندھ کی ایک شاخ سے جزیرہ کی مانند گھرا ہوا ہے" یہ اشارہ غالباً اسی مقام کی طرف ہے جہاں پنج ند دریائے سندھ سے مل کر بہتی تھی۔ اس زمانہ میں ملتان سے منصورہ کا فاصلہ بارہ پڑاؤ کا سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت ملتان سے روڑہی تک ۲۰۰ میل کی مسافت ہے۔ اگر ایک پڑاؤ کی مسافت تقریباً ۲۰ میل سمجھی جائے تو منصورہ اور بھکر کے ایک ہی ہونے کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں شہر بھکر کو ایک مال دار عرب عمر بن حفص نے بسایا تھا اور خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور عباسی کے نام پر منصورہ نام رکھا تھا۔ مذکورہ قلعہ میں ایک مقام پر مقیاس الماء بنا ہوا ہے، یہ بھی غالباً عرب فاتحین کا نصب کردہ ہے۔ اس سے دریا کے اتار چڑھاؤ کی روزانہ کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ واضح رہے دریائے نیل میں بھی فراعنہ کے وقت سے اس طرح کا "مقیاس الماء" یا "پیمانہ آب" لگا ہوا ہے جس کا ذکر ناصر خسرو (چوتھی صدی ہجری) اور ابن بطوطہ (ساتویں صدی ہجری) نے بھی اپنے سفر ناموں میں کیا ہے۔

سیر و شکار

انہی دنوں بادشاہ نے ہانکے کا شکار کھیلا۔ اس شکار کے لیے تقریباً چالیس کوس سے جانوروں کو ہنکا ہنکا کر گھیرے میں لایا گیا اور بتدریج اس گھیرے کو تنگ کر دیا گیا۔ اس گھیرے میں ہر قسم کے تقریباً پندرہ ہزار جانور آ گئے تھے۔ بادشاہ نے خاص و عام کو درجہ بدرجہ شکار کرنے کا حکم دیا۔ شکار سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنا گھوڑا دریائے راوی میں ڈال دیا۔ سوائے ایک دو آدمیوں کے جن میں خوش خبر خاں بھی تھا باقی سارے ہمراہی سلامتی کے ساتھ دوسرے کنارے پہ پہنچ گئے۔

اسی شکار کے دنوں میں مظفر خاں وزیر خاں کو اپنے ہمراہ لایا تھا اور بادشاہ نے آصف خاں اور مجنوں خاں کے نام فرمان جاری کر دیا تھا کہ دونوں مل کر کڑہ اور مانک پور کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔

خان زماں کی دوبارہ بغاوت

اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ خان زماں، بہادر خاں اور سکندر خاں نے عہد شکنی کر کے بغاوت کر دی ہے اور اپنے کچھ آدمی مرزا محمد حکیم کے پاس اس کو حملہ کرنے کی دعوت دینے بھیجے ہیں۔ جون پور میں میرزا حکیم کے نام کا خطبہ و سکہ بھی جاری کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملا غزالی مشہدی نے مرزا حکیم کے متعلق یہ سجع نکالا تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم　　　　وارث ملک است محمد حکیم

مہابھارت کی یادگار

بادشاہ کو جب اس بغاوت کی خبر ملی تو انھوں نے خان زماں کے نمائندہ میرزا مبارک رضوی کو خان باقی خان کی حراست میں دے دیا اور پنجاب کے تمام معاملات خان کلاں اور امرائے اتکہ کے سپرد کر کے ۱۲۔ ماہ رمضان ۹۷۴ھ کو آگرہ کا قصد کیا۔ راستہ میں قصبۂ تھانیسر کی سیر کی جو دورِ قدیم کا بہت بڑا دار الکفر تھا۔ تھانیسر میں کر کھیت کا تالاب ہے جس میں آج سے چار ہزار سال پہلے کوروں اور پانڈوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے قول کے مطابق اس لڑائی میں ستر اسی کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ اس جگہ ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس زیارت گاہ میں ہندو سونا چاندی جواہرات قیمتی کپڑے اور نفیس چیزیں چڑھاتے اور خیرات کرتے ہیں اور "نکوئی کن و در آب انداز" کے مطابق پوشیدہ طور پر روپے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس تیرتھ میں سنیاسی اور جوگی کورو پانڈو کی لڑائی کی یادگار میں ایک دوسرے سے جنگ بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی جنگ کا تماشا بھی دیکھا اور بادشاہ کے اشارہ پر کچھ سپاہیوں نے اپنے بدن پہ راکھ مل کر سنیاسیوں کا بھیس بنا لیا اور سنیاسیوں کی طرف سے لڑنے لگے، کیوں کہ سنیاسی بیچارے صرف تین سو تھے اور ان کے مقابلے میں جوگی پانسو سے زیادہ تھے، لڑائی بڑی دلچسپ تھی۔ ادھر ادھر سے کچھ لوگ مارے گئے، آخر کار سنیاسیوں کو فتح ہوئی۔

جب اکبر نے دہلی میں نزول فرمایا تو میرزا میرک رضوی خاں، باقی خاں کے قید سے چھوٹ کر اپنے آقاؤں کے پاس چلا گیا۔ خان باقی خاں بھی سزا کے خوف سے باغیوں سے جا کر مل گیا۔

دہلی کے قیام میں حاکم دہلی تتار خاں کی سعی سے پرگنہ بھوجپور کا جاگیر دار شاہ فخر الدین مشہدی شہاب خاں ترکمان گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا اور اسے اس جرم میں کہ محمد امین دیوانہ جب لاہور سے بھاگ کر اس کے پرگنہ میں گیا تھا تو اس نے پناہ دی تھی اور اسے گھوڑا اور سفر خرچ دے کر باغیوں کے پاس پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے سزا دینے کا حکم نافذ کیا۔

باغیوں کے خلاف اکبر کی فوج کشی

جب سواری آگرہ میں پہنچی تو خبر ملی کہ خان زماں نے شیر گڑھ عرف قنوج پہ حملہ کر کے یوسف خاں مشہدی کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اکبر نے آگرہ کو خان خاناں کی نگرانی میں چھوڑا اور ۲۶ شوال ۹۷۴ھ

میں جون پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت اتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی کہ ہڈیوں میں گودا تک حدت کے مارے جلا جا رہا تھا۔

جب سکنتیہ کے قصبہ میں چھاؤنی قائم ہوئی تو معلوم ہوا خان زماں مانک پور کی طرف جہاں اس کا بھائی بہادر خاں تھا، بھاگ گیا ہے۔ بادشاہ نے قصبہ بھوجپور پہنچ کر چھ ہزار تجربہ کار سواروں کی جمعیت کو محمد قلی خاں برلاس، مظفر خاں، راجہ ٹوڈرمل، شاہ بداغ خاں اور اس کے لڑکے عبد المطلب خاں اور حسین خاں کی (جو اسی زمانہ میں ستوا س سے آیا ہوا تھا) سرداری میں اسکندر خاں پر حملہ کرنے کے لیے اودھ کی جانب متعین کر دیا۔

لشکر کے ہراول کی کمان داری پر پہلے حسین خاں کو مقرر کیا گیا تھا لیکن وہ قلعہ بندی کی مصیبتیں اٹھا کر پریشان حال اور قلاش ہو کر آیا تھا، اور اپنے لشکر کے اخراجات کی وصولی کے لیے پرگنہ شمس آباد کی طرف جو اسے ابھی ابھی جاگیر میں ملا تھا گیا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے واپس آ کر لشکر کے ساتھ ہمرکاب ہونے میں کچھ دیر ہو گئی اس لیے بادشاہ نے اس کی جگہ ہراولی پر قیا خاں کو مقرر کر دیا۔

ان دنوں میں حسین خاں مذکور کے ساتھ تھا وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کوچ کر گیا تھا، اس لیے میں اسی قصبہ میں ٹھہر گیا۔ وہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا جس کی شہر کے معتبر لوگوں نے شہادت دی تھی کہ کچھ ہی دن پہلے ایک دھوبی کا خورد سال بچہ گنگا کے کنارے گھاٹ پر سو گیا تھا، اچانک وہ دریا میں گر پڑا اور تیز و تند موجوں نے اسے وہاں سے بہا کر دس کوس کے فاصلہ پر قصبہ بھوجپور کے کنارے ڈال دیا۔ وہاں اس کے رشتہ دار دھوبیوں نے بچہ کو پہچان لیا اور صبح ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔

باغیوں پر اکبر کا حملہ

جب رائے بریلی[1] میں شاہی کیمپ لگا تو خبر آئی کہ خان زماں اور بہادر خاں گنگا عبور کر کے کالپی کی طرف جا رہے ہیں اس لیے بادشاہ نے لشکر کو خان جہاں کی سرکردگی میں کٹرہ کی طرف روانہ کر دیا اور خود نہایت تیزی کے ساتھ مانک پور پہنچ کر ہاتھی پر سوار ہو کر دریا کو عبور کیا۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ پندرہ سولہ آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے، مجنوں خاں اور آصف خاں جو ہراول پر متعین تھے ہر ساعت باغیوں کی خبریں پہنچا رہے تھے، انھوں نے خبر دی کہ خان زماں اور بہادر خاں جن کے سروں پر قضا منڈلا رہی تھی، رات بھر شراب پینے اور رنڈیوں کا ناچ دیکھنے میں مشغول رہے ہیں اور اب ان کی سرکشی کا پیمانہ بس لبریز ہو چلا ہے۔ خان زماں وغیرہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ بادشاہ خود ان کے سر پر آ پہنچا ہے کیوں کہ یہ لوگ میدان جنگ کی ہر آنے والی خبر کے متعلق یہی خیال کیے ہوئے تھے کہ یہ صرف مجنوں خاں کی پیش قدمی سے متعلق ہے، چونکہ یہ مجنوں خاں کو گھاس کے تنکہ کے برابر بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس لیے ان کو اس کی یلغار کی کوئی پروا نہیں تھی۔

خان زماں کی ہلاکت

بادشاہ اس دن سندر نامی ہاتھی پر سوار تھے اور اپنے ساتھ عماری میں انھوں نے مرزا کوکہ اعظم خاں کو بٹھا رکھا تھا، شاہی سواری تو لشکر کے قلب میں تھی۔ آصف خاں اور امرائے اتکہ میمنہ پر تھے۔ مجنوں خاں کچھ اور لوگوں کے ساتھ میسرہ پر متعین تھا۔ ادھر خان زماں خاں صبح کے وقت اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے کر سو گیا تھا کہ

---

[1] بریلی رام پور سے ۳۹ میل پر ہے پہلے چھوٹا شہر تھا مغل سلطنت کمزور ہوئی تو روہیلوں نے یہاں قبضہ کر لیا۔ اٹھارویں صدی میں روہیلکھنڈ کا حاکم حافظ رحمت خاں تھا اس نے بریلی کو اپنا دار الخلافہ بنایا ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی تھی اس لڑائی میں رحمت خاں نے ابدالی کی مدد کی تھی ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء میں اودھ کے نواب نے انگریزوں کے اشارہ پر حملہ کر کے اس شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ اسی معرکہ میں رحمت کی شہادت ہوئی۔ حافظ رحمت خاں کا مقبرہ شاہ نیاز احمد کا مزار قدیم یادگار ہیں۔ شہر سے باہر بدھ دور کے آثار بھی ملتے ہیں یہاں لکڑی کا کام اچھا ہوتا ہے، سرمہ بھی مشہور ہے۔

اچانک موت کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ جب اس نے اچھی طرح دیکھا تو لشکر کی سج دھج دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ خود شہنشاہ لشکر میں موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو فوراً ہی بلا لیا اور صف آرائی کر لی۔ ایک بہادر جمیعت کو شاہی ہراول کے مقابلہ پر آگے بڑھایا۔ جب یہ دستہ آگے آیا تو بابا خاں قاقشال اور قچیوں کے سردار نے اس کو تیروں کی زد پر لے لیا اور پیچھے دھکیل کر خان زماں کی لشکر گاہ تک پہنچا دیا۔ اس موقع پر بھاگنے والوں میں سے کسی کا گھوڑا پوری قوت سے جا کر خان زماں کے گھوڑے سے ٹکرا گیا اس صدمہ سے خان کی پگڑی اس کے سر سے اتر کر کمند کی طرح اس کے گلے میں لپٹ گئی۔ بہادر خاں نے جب یہ حال دیکھا تو بڑی بہادری کے ساتھ اس نے بابا خاں پر حملہ کر دیا اور اسے ڈھکیلتے ہوئے مجنوں خاں کی صفوں تک پہنچا دیا۔ اس بھگدڑ میں مجنوں خاں اور بہادر خاں ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نہایت دلیری اور بہادری کے ساتھ لڑائی کی۔ عین اس وقت ایک تیر بہادر خاں کے گھوڑے کو لگا اور وہ بدک کر زمین پر گر پڑا بہادر خاں کو لوگوں نے گھیر کر گرفتار کر لیا۔ اس وقت بادشاہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حسب الحکم کوہ پیکر ہاتھیوں کے حلقہ کو خان زماں کے لشکر پر دوڑا دیا گیا۔ ہیرانند نامی بادشاہی ہاتھی باغیوں کے ہاتھی اودیا سے جا کر بھڑ گیا اور اسے اس زور کی ٹکر ماری کہ وہ میدان میں ڈھیر ہو گیا۔ اس ہنگامہ میں ایک تیر خان زماں کے گھوڑے کو بھی لگا۔ وہ اسے نکالنے لگا تھا گھوڑے کو ایک اور تیر آکر لگا اور گھوڑے کے بھڑک جانے سے خان زماں نیچے گر پڑا۔ اسی وقت نرسنگھ نامی ہاتھی کے فیل بان نے خان زماں کی طرف رُخ کیا خان زماں نے اس سے بہت کچھ کہا کہ میں ایک بڑا سردار ہوں اگر تو زندہ بادشاہ کے پاس پکڑ لے جائے تو تجھے بڑا انعام ملے گا، لیکن اجڈ فیل بان نے مان کر نہیں دیا اور اس پر ہاتھی کو دوڑا دیا۔ خان زماں ہاتھی کے پیروں کے نیچے اس طرح پامال ہو گیا کہ اس کی ہڈیاں تک سرمہ ہو گئیں۔

بہادر خاں کا قتل

جب میدانِ جنگ ٹھنڈا پڑا تو نظر بہادر، بہادر خاں کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ بادشاہ اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اس سے پوچھا کہ "بہادر! کہو کیا حال ہے؟" اس نے جواب میں کہا "الحمد للہ علیٰ کل حال" جب اس نے پانی مانگا تو بادشاہ نے اپنے خاصہ میں سے پانی کا پیالہ اسے دیا۔ امراء اس کے زندہ رہنے کو خطرناک سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اصرار کر کے اس کو قتل کرا دیا۔ کچھ دیر بعد خان زماں کا سر بھی ملاحظہ میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ کو تردد تھا کہ یہ خان زماں کا سر ہے یا نہیں؟ اسی وقت خان زماں کا وکیل رائے ارزانی جو اسیروں کی صف میں کھڑا تھا، آگے آیا اور مقتول کے سر کو اٹھا کر اپنے سر سے لگایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کے علاوہ خواجہ دولت خواجہ سرا نے جو خان زماں کی ملازمت چھوڑ کر بادشاہ کی ملازمت میں آگیا تھا اور اسے دولت خاں کا خطاب ملا تھا کہا "خان زماں کے سر کی علامت میں بتاتا ہوں۔ وہ چونکہ ہمیشہ پان سیدھے کلے میں رکھا کرتا تھا، اس لیے اس کی سیدھی جانب کے دانت سیاہ ہو گئے تھے" دیکھا گیا تو ایسا ہی تھا۔ یہ لڑائی بروز پیر یکم ذی الحجہ ۹۷۴ھ کو پیراگ عرف الہ آباد کے مضافات میں منکروال کے قصبہ میں جلوس کے بارھویں سال ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی تاریخ نکالی گئی ہے

چوں خان زماں ازیں جہاں رفت بباد
بنیادِ فلک سراسر از پائے افتاد
تاریخ وفاتش ز خرد جستم گفت
فریاد ز دست فلک بے بنیاد

اس تاریخ میں خان زماں کی سابقہ خدمات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک اور تاریخ اس کی بغاوت کے پیش نظر نکالی گئی:

"قتل دو نمک حرام بے دین"

یہ قاسم ارسلان کی کہی ہوئی تاریخ ہے اس میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

ایک اور تاریخ ہے ؎

قتل علی قلی و بہادر ز دورِ چرخ
جانا مپرس از من بیدل کہ چوں شدہ
جستم ز پیر عقل چو سالِ وفات شاں
آہے ز دل کشیدہ و گفتا دو خوں شدہ

اس معرکہ میں جو لوگ قتل ہوئے ان میں ایک مرزا خوش حال بیگ بھی ہے۔ میں نے مرزا کو مالوہ کے لشکر میں ادھم خاں اور پیر محمد خاں کے ساتھ ایک محفل میں دیکھا تھا۔ بلاشبہ وہ حسن صورت و حسن سیرت کا مکمل نمونہ تھا۔ اس کی شخصیت دل سے بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔

اس کی یہ تاریخ نکالی گئی ؎

خوش حال کہ بود دیدۂ اہل خرد
برگشت ز پادشاہ از طالع بد
مقتول چو شد بہ صحبت خان زماں
تاریخ آمد کہ گل رُخ زیبا قد

اسی سال علامۂ عصر میر مرتضیٰ شریفی شیرازی اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو سدھار گئے۔ ان کو پہلے دہلی میں امیر خسرو کے قریب دفن کیا گیا تھا۔ بعد میں جب صدر الصدور قاضی اور شیخ الاسلام نے عرض کیا کہ میر خسرو ہندوستانی اور سنی تھے اور میر مرتضیٰ عراقی اور رافضی ہے اس لیے امیر خسرو کو اس کی قربت سے اذیت ہوگی بے شک ؎

روح را صحبت نا جنس عذابی است الیم

اس عرضداشت پر بادشاہ نے دوسری جگہ دفن کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ بات دونوں مرحومین کے بارے میں بہر حال افسوسناک تھی۔ ایک شخص نے مرزا کی تاریخ وفات نکالی ہے:

"علم از علما رفتہ"

دوسرے نے اسی مادۂ تاریخ کو اس طرح بدل کر کہا:

"علامہ ز عالم رفت"

اسی سال میرے ایک شناسا شیخ ابو الفتح جو شیخ سعد اللہ ولد شیخ بدھ کے بھائی ہوئے تھے اور بیانہ کے معززین میں سے تھے انتقال کر گئے ان کی تاریخ وفات ہے ؎

ابو الفتح آں دیدۂ اہل بینش
کہ در دورِ گردوں نظیرش نیابی
چو رفت از جہاں سال تاریخ فوتش
طلب از حروف فضائل نیابی

آگرہ میں افواہیں

میرزا نظام الدینؒ سے میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے خود مجھ سے بالمشافہ یہ بیان کیا اور اس واقعہ کو اپنی تصنیف تاریخ نظامی میں بھی درج کیا ہے کہ خان زماں کی جنگ کے موقع پر افواہ باز خاص طور سے پوستی افیونی طرح طرح کی وحشت ناک خبریں پھیلاتے رہتے تھے۔ ایک دن دو چار احباب بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے تفریحاً ہم نے بھی سوچا کہ بڑا مزا آئے گا، اگر ہم یہ افواہ پھیلا دیں کہ بادشاہی فوج خان زماں اور بہادر خاں کا سر لے کر آرہی ہے چنانچہ یہ خبر ہم نے چند لوگوں کو سنائی اور یہ سارے شہر میں پھیل گئی۔ اتفاق دیکھو کہ جس دن آگرہ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی، اسی دن خان زماں اور بہادر خاں قتل کیے گئے تھے اور تیسرے دن مراد بیگ کا باپ عبداللہ ان دونوں کے سر لے کر آگرہ میں آیا اور وہاں سے دہلی، لاہور اور کابل لے کر گیا۔

اس فتح کے بعد جس کا باغیوں کو شان گمان بھی نہیں تھا اکبر الہ آباد گیا اور ان لوگوں کو جو بارگاہ سے بھاگ گئے تھے یا باغیوں کا ساتھ دے رہے تھے گرفتار کر کے سرکاری افسروں کے سپرد کر دیا۔ میرزا میرک رضوی کو جو دہلی سے فرار ہو گیا تھا ہاتھی کے نیچے دے دیا گیا مگر ابھی ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ سے رگیدنا شروع ہی کیا تھا کہ بادشاہ نے اس کے سید ہونے کا خیال کر کے معافی عطا کر دی۔ چند دوسرے باغی بھی اپنی سزا کو پہنچے۔ اس واقعہ کی تاریخ ہوئی —— "چہ خوش ہا شد" —— خان زماں کے کچھ آدمیوں کی جنہوں نے اطاعت اختیار کر لی تھی جان بخشی کر دی گئی۔

دو دن بعد بادشاہ وہاں سے بنارس اور وہاں سے جون پور پہنچے اور اس شہر میں تین دن تک قیام کیا اس کے بعد تین چار دن میں یلغار کرتے ہوئے چار پانچ اشخاص کے ہمراہ کڑہ اور مانک پور کی سڑک پر گنگا کے کنارے پہنچے شاہی لشکر اسی جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھ کر کڑہ کے قلعہ میں سواری پہنچی۔

قاضی طواایسی کی حق گوئی

جس وقت خان زماں کے آدمیوں کو قتل کیا جا رہا تھا، قاضی طوائسی لشکر کے قاضی نے جو نہایت دیانت دار حق گو آدمی تھا عرض کیا کہ ان لوگوں کو شکست دینے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے۔ بادشاہ کو اس کی یہ بات بری لگی اس لیے اس کو قضاوت سے معزول کر کے کڑہ کے قاضی یعقوب کو جو علم فقہ میں بڑی شہرت رکھتا تھا اور شیر شاہ کے قاضی فضیلت کا جسے لوگ قاضی فضیحت کہا کرتے تھے داماد تھا منتخب کر کے طواایسی کی جگہ قاضی بنا دیا۔ یہ شخص علم و فضیلت کے باوجود مسخرہ پن اور ہزل گوئی کا عادی تھا۔ دس سال بعد اسے بھی معزول کر دیا گیا اور اس عہدہ پر قاضی جلال الدین ملتانی کا تقرر ہوا، جس کا ذکر آگے تفصیل سے کیا جائے گا۔

اکبر نے خانخاناں کی طلبی کے لیے فرمان روانہ کر دیا تھا، چنانچہ خان خاناں اسی منزل میں آگرہ سے آکر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے بہادر خاں اور خان زماں کی ساری جاگیر جون پور اور بنارس سے غازی پور اور قلعہ چنار تک اور ادھر زمانیہ سے لے کر چوسہ ندی کی گزرگاہ تک اس کو عطا کر دی اور گھوڑا و خلعت مرحمت فرمایا اور اس عملداری پر رخصت کر دیا۔ اس انتظام کے بعد اکبر نے ماہ ذی الحجہ ۹۷۴ھ میں عین بارش کے موسم میں کوچ کیا اور محرم ۹۷۵ھ میں پایۂ تخت پہنچ گیا۔

سکندر اوزبک کے خلاف فوج کشی

محمد قلی خاں برلاس اور مظفر خاں کی جمعیت کو اودھ میں سکندر اوزبک کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا تھا ان لوگوں نے سکندر کو اودھ کے قلعہ میں محصور کر دیا۔ جب اس کو خان زماں

اور بہادر خاں کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ بھی بدحواس ہوگیا اور امیروں سے صلح کے مذاکرات کرتا رہا۔ مصالحت کا تو بہانہ تھا امراء شاہی کو دھوکہ میں رکھ کر وہ کشتی میں سوار ہوگیا اور سرو ندی کے دوسرے کنارے جا پہنچا۔ پھر وہاں سے اس نے مصالحت کی دوبارہ بات چھیڑی چنانچہ شاہی لشکر کے چند امیر اس سے گفتگو کے لیے گئے۔ وہ بھی اپنے تین چار آدمیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر آیا اور دونوں فریقوں نے صلح کا عہد و پیمان کرلیا۔ طے یہ پایا تھا کہ امرائے مذکور اسے بارگاہ شاہی میں لے جائیں گے اور سفارش کریں گے اگر اسے کچھ ایسا ہول تھا کہ اس عہد پر قائم نہیں رہ سکا اور پٹھانوں کے علاقہ میں چلا گیا۔ امیروں نے گورکھ پور تک اس کا تعاقب کیا اور سارا ماجرا دربار میں لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے بذریعہ فرمان امراء کو طلب کرلیا تھا اس لیے اودھ میں محمد قلی خاں برلاس کو متعین کرکے یہ لشکر دارالخلافہ کو چلا گیا۔

چتوڑ کے قلعہ پر حملہ

۹۷۵ھ میں قلعہ چتوڑ کی تسخیر کا ارادہ کیا گیا اور بادشاہ نے بیانہ کو حاجی محمد خاں سیستانی سے لے کر آصف خاں کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کے علاوہ اسے بساور، وزیر پور اور ماندل گڑھ کی جاگیریں بھی عطا کی گئیں، تاکہ وہ پہلے جاکر لشکر کا ساز و سامان تیار کرلے۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ نے کوچ کیا اور باری کے راستہ سے شکار کھیلتے ہوئے سومیدانہ اور پھر وہاں سے سوپر کی طرف گیا۔ لشکر شاہی کی آمد پر رائے سرجن کے آدمیوں نے سوپر کے قلعہ کو خالی کردیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ پر نظر بہادر کو اور کوتہ بلایہ کے قلعہ پر شاہ محمد خاں قندھاری کو متعین فرمایا۔ یہاں سے لشکر قلعہ کاگرون پہنچا اور شہاب الدین احمد خاں اور شاہ بداغ خاں کو مالوہ کا علاقہ جاگیر میں دے کر ان کو بادشاہ نے محمد سلطان کے بیٹوں میرزا الغ اور شاہ میرزا کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا۔ یہ دونوں باغی ہوکر سنبل سے بھاگ گئے تھے، جب سواری اجین پہنچی تو مذکورہ دونوں بھائی فوج کشی کی اطلاع پاتے ہی اس علاقہ کو چھوڑ کر گجرات میں سلطان محمود کے غلام چنگیز خاں حاکم گجرات کے پاس چلے گئے اور مالوہ کا سارا علاقہ بلاکسی جنگ کے ممالک محروسہ میں شامل ہوگیا۔

اکبر کی فوج کشی پر رانا اودے سنگھ[1] نے چتوڑ کے قلعہ پر اپنے ایک بہادر اور دلیر سردار رائے جیمل کو جو قلعہ برٹہ میں میرزا شرف الدین حسین سے جنگ کرکے بھاگ نکلا تھا مقرر کردیا اور خود اودی پور کی طرف کوہلیز کے گھنے جنگلوں اور بلند پہاڑوں میں

---

[1] رانا اودے سنگھ کا تعلق راجگان میواڑ سے ہے۔ یہ راجہ اپنا سلسلہ نوشیرواں سے ملاتے ہیں۔ میواڑ کے راجاؤں کا ہندوستان میں بڑا بھرم تھا۔ جہانگیر نے توزک میں ۸ سنہ جلوس کے حالات میں رانا امر سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: رانا ہندوستان کے معتبر راجاؤں میں سے ہے۔ اس ملک کے تمام راجے راجا اس کے آباد اجداد کی سرداری کو تسلیم کرتے تھے مدت دراز سے سلطنت اس خاندان میں چلی آرہی ہے۔ پہلے یہ عرصہ تک مشرقی علاقہ کے حکمران رہے پھر دکن کی طرف رخ کیا اور وہاں کی اکثر ریاستیں فتح کیں اور راجہ کی جگہ راول کا لقب اختیار کیا پھر کوہستان میوات میں آئے اور چتوڑ کے قلعہ کو فتح کیا۔ اس وقت سے آج تک کے میرے جلوس کا آٹھواں برس ہے ۱۴۷۱ برس ہوتے ہیں ۱۰۱۰ برس کے عرصہ میں اس خاندان کے ۲۶ فرمانروا راول کے لقب سے مشہور ہوئے اور راول سے رانا امر سنگھ تک کہ اب رانا ہے ۴۶۱ برس میں ۲۶ رانا فرمانروا ہوئے۔" اس خاندان کا مشہور راجا سنگرام رانا سانگا تھا۔ مارواڑ، جودھ پور، ادے پور، اجمیر سے لے کر رام پور اور الور تک کے راجہ اس کے باج گزار تھے۔ اس کا راج بیانہ سے دریائے سندھ مالوہ سے میواڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر بابر نے ہندوستان پہ حملہ کرکے سیکری کے قریب اس کو شکست نہ دی ہوتی تو بلاشبہ وہ پورے ہندوستان کا چکرورتی راجا بن جاتا اور دوسرا وکرماجیت کہلاتا۔ بابر نے توزک میں لکھا ہے "جب میں کابل میں تھا تو رانا نے دوستی کے خطوط لکھے اور یہ کہلوایا کہ آپ دلی پر حملہ کریں میں آگرہ پر حملہ کروں گا لیکن جب میں نے ابراہیم کو شکست دی اور آگرہ بھی فتح کرلیا تو اس نے میری بات تک نہ پوچھی بلکہ کچھ ہی دن بعد کندبار کا محاصرہ کرلیا۔" رانا سانگا کے بعد اس کے جانشین کمزور نکلے، یہاں تک کہ اکبر نے اودے سنگھ کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اودے سنگھ نے بھیل قبیلہ میں پناہ لی اور دشوار گھاٹیوں میں ایک شہر اودے پور آباد کیا وہاں گھاٹیوں میں بندھ باندھ کر ایک جھیل بھی بنائی جو اب بھی اودے ساگر کے نام سے مشہور ہے ۱۰۷۲ برس بعد جب وہ مرا تو اس کا بیٹا پرتاب جانشین ہوا۔ یہ نسبتاً باپ سے زیادہ جری اور منتظم راجہ تھا۔

جا کر چھپ گیا۔

آصف خاں نے بہرام پور پر جو اس علاقہ کا آباد و بارونق شہر ہے حملہ کیا اور بزور شمشیر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ راجہ کا سارا علاقہ پامال ہوگیا حسین قلی خاں نے اودے پور کوملمیر پر فوج کشی کی اور بڑی تباہی مچائی۔ رانا مجبور ہو کر وہاں سے دوسرے محفوظ مقام پر منتقل ہوگیا۔

قیامت خیز محاصرہ

بادشاہ قلعہ چتوڑ[۱] کا محاصرہ کیے ہوئے تھے حکم شاہی کے بموجب قلعہ پر چڑھائی کے لیے سرنگیں کھدوائی گئیں سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ دس سوار اس میں اچھی طرح سے آجا سکتے تھے اور بلند اتنی تھی کہ ہاتھی سوار ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے بآسانی گزر سکتا تھا۔ قلعہ والوں کی آتش باری اور سنگ اندازی سے لشکر کے بہت سے آدمی ہلاک ہو رہے تھے ان کی لاشیں سرنگ میں پتھر اور اینٹ کی جگہ لگادی جاتی تھیں کافی عرصہ میں جا کر سرنگ اور نقب قلعہ کی بنیادوں تک پہنچی۔ قلعہ کے دو متصل برجوں کو نیچے سے کھوکھلا کر کے بارود سے بھر دیا گیا اور بہادر مسلح سواروں کی ایک جمعیت ان برجوں کے قریب پہنچ کر سرنگ کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگی کہ جیسے ہی یہ برج گریں وہ اس راستہ سے قلعہ میں داخل ہو جائیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں نقبوں میں جب آگ لگائی گئی تو ایک نقب جس کا فتیلہ نسبتاً چھوٹا تھا، جلد پھٹ گئی دوسری نقب کا فتیلہ کچھ لانبا تھا اس لیے اس کے پھٹنے میں دیر لگی۔ پہلی نقب کے پھٹتے ہی ایک برج بنیاد سے اکھڑ کر فضا میں بکھر گیا اور حصار میں ایک بہت بڑا شگاف پیدا ہوگیا۔ منتظر سواروں نے جن کو دوسرے فتیلہ کا خیال نہیں رہا تھا بے محابا حملہ کر دیا اور قریب پہنچ کر اندر جانے کا راستہ کھوجنے لگے عین اسی وقت دوسرا فتیلہ سلگ اٹھا اور دوسرے برج کو بھی جہاں غیر بھی تھے اور اپنے بھی تھے ہوا میں اڑا دیا۔ چنانچہ لشکر کے اکثر غازی سو سو اور دو دو سو من وزنی پتھروں کے نیچے دب کر رہ گئے اور سنگ دل کافروں کا بھی یہی کچھ حشر ہوا اس آگ کے سیلاب میں لوگ پروانوں کی طرح جل کر راکھ ہوگئے۔ حصار کے پتھر تین تین چار چار کوس تک جا کر گرے اور مسلمان کیا کافر کیا ہر طرف ایک ہنگامہ بپا ہوگیا ؎

ایں بہ جنت داد آب واں بدوزخ برد جوں
گرچہ خون گبر و مومن ہر دو یک جا دوید

انسانی لاشوں پر کوے اور گدھ دنوں تک جشن مناتے رہے۔ ایسے پانچ سو سپاہی جن میں سے اکثر کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اس حادثہ کی نذر ہوگئے۔ ہندوؤں کے مقتولین تو شمار سے باہر تھے۔ محصورین نے راتوں رات زور لگا کر ان برجوں کی درمیانی دیوار کو دوبارہ تعمیر کرلیا اور محاصرہ میں کم و بیش تقریباً چھ مہینے لگ گئے۔

---

[۱] کہتے ہیں ساتویں صدی عیسوی میں چترانگ نامی ایک راجا نے اس قلعہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے نام پر یہ چتراکوٹ کہلایا آخر بگڑ کر چتوڑ ہوگیا۔ راجپوتوں کی مشہور ریاست اودے پور کا یہ سولھویں صدی عیسوی تک پایہ تخت رہا۔ اس کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ یہاں کے راجپوتوں نے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے بڑی بڑی خونریز لڑائیاں اس جگہ لڑی تھیں۔ سلاطین اسلام میں سب سے پہلے علاؤالدین خلجی نے سنہ ۷۰۳ھ/۱۳۰۳ء میں اس کو فتح کیا علاؤالدین کے دوسرے حملہ کی سرگذشت بہت دردناک ہے۔ جب راجا شاہی محاصرہ سے جاں بلب ہوگیا تو اس کی رانی پدمنی دوسری رانیوں کے ساتھ چتا میں جل کر مرگئی۔ خلجی کے بعد سلطان محمد تغلق نے اور ایک مرتبہ بہادر شاہ والی گجرات نے اس قلعہ کو فتح کیا تھا آخر میں اکبر نے اس پر قبضہ کر کے راجپوتوں کی کمر توڑ دی۔ قلعہ کی عمارت ایک پہاڑی پر ہے جو سطح زمین سے پانسو فٹ بلند ہے، طول سوا تین میل عرض نصف میل قلعہ میں جانے کے لیے چکر دار سڑک بنی ہوئی ہے۔ ایک مستحکم فصیل ہے جس میں سات دروازے ہیں۔ قلعہ میں کئی ایک چشمے اور باؤلیاں ہیں۔ جس وقت اکبر نے حملہ کیا تھا قلعہ میں آٹھ ہزار فوج اور چالیس ہزار باشندے تھے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے "اس پہاڑ کا دور چھ کوس ہے قلعہ کی فصیل زمین سے تین کوس بلند ہے، تالابوں اور سنگین حوضوں کے علاوہ قدرتی چشمہ بھی جاری ہے۔" قلعہ میں بہت سے محل اور مندر تھے جن کے کھنڈر موجود ہیں ایک شاہی محل اچھی حالت میں ہے۔ یہاں ایک مینار ہے جے تھمب" ہے اسے رانا کمبھا نے سنہ ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں شاہان مالوہ کو اور سنہ ۸۵۴ھ/۱۴۵۰ء میں گجرات و مالوہ کی متحدہ فوجوں کو شکست دینے کی یادگار میں بنوایا تھا یہ ۱۲۰ فٹ بلند ہے اس کی ۹ منزلیں ہیں۔ اکبر کے حملہ کے وقت رانا اودے سنگھ حکمران تھا۔

قلعہ چیتوڑ کی فتح

۲۵ ماہ شعبان ۹۷۵ھ منگل کی رات کو شاہی لشکر نے ہر طرف سے حملہ کر کے قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈال دیئے اس موقع پر مسلمان حملہ آوروں کی توپوں اور بندوقوں کے شراروں سے جو روشنی پھیلی تو جیمل[1] کی شکل اس روشنی میں دکھائی دی اور ایک بندوقچی نے تاک کر اس کی پیشانی کو نشانہ بنایا اور وہ اسی جگہ سرد ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی یہ عالم تھا جیسے چڑیوں کی ٹکڑی میں پتھر آن گرا ہو۔ قلعہ بند فوج اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ گئی اور لوگ اپنے اہل و عیال سمیت آگ میں کود گئے۔ اس طرح آگ میں جل مرنے کو ہندوستان میں "جوہر" کہا جاتا ہے۔ جو بچ گئے وہ اکبری تلوار کی نذر ہوئے اور تھوڑی سی تعداد اسیر کر لی گئی۔ اس ہولناک رات میں ساری رات جنگجوؤں کی تلوار نیام سے باہر ہی رہی۔ دوسرے دن قیلولہ کے وقت تک مقتول راجپوتوں کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس خونی واقعہ کی تاریخ ہے ع

دل گفت کہ بکشاد بزودی چیتور

دوپہر کے بعد قتال و جدال کا یہ سلسلہ بند ہوا اور سپاہی اپنے ٹھکانے پر لوٹ کر آ گئے۔ بادشاہ تین دن تک چیتوڑ میں ٹھہرے رہے اور ہر طرف فتح نامے روانہ کیے اور آصف خاں کو وہاں کی حکومت سپرد کر کے بروز منگل ۲۵ ماہ شعبان کو سواری شاہانہ نے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔

اجمیر کا پیدل سفر

جیسا کہ بادشاہ نے منت مانی تھی اجمیر کو پیدل جانے کا ارادہ کیا اور بروز اتوار ۷ ماہ رمضان کو اجمیر پہنچ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی اور وہاں صدقہ خیرات اور نذر گزار کر دس دن بعد واپسی کے لیے سوار ہوئے۔ اس سفر کی تاریخ میر علاء الدولہ[2] قزوینی مصنف تذکرہ شعراء نے کہی ہے ؎

شاہ دیں پرور و جمشید سریر | خسرو عہد محمد اکبر
ساخت بے شبہ پئے فتح چیتور | دیگ روئیں تن اژدر پیکر

بہر تاریخ دلی از عالم غیب
دیگ چیتور کشا شد یک سر

اجمیر سے بادشاہ نے آنور کا رخ کیا اور وہاں شیر[3] کا شکار کیا۔ اس شکار میں شاہ محمد خاں قندھاری کے لڑکے عادل محمد خاں نے جو بہادری

---

[1] جیمل اور پتا راجپوتوں میں مشہور بہادر سردار گزرے ہیں انھوں نے ملک کو بچانے کے لیے جو کارنامے دکھائے ان کے گیت اور کبت لوگوں کی زبان پر عرصہ تک رہے۔ مشہور ہے کہ قلعہ آگرہ کے ہتیا پول دروازے پر جو دو ہاتھی تراش کر رکھے گئے تھے ان پر انہی دونوں کی مورتیں تھیں یہ دونوں ہاتھی سونڈ ملا کر کھڑے ہیں لوگ نیچے سے آتے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جیمل خود اکبر کی گولی سے مارا گیا تھا ایک دن اکبر دمدمہ پر کھڑا بندوق چلا رہا تھا اس وقت اس کے ہاتھ میں سنگرام نامی بندوق تھی۔ ایک شخص سبز جلتہ پہنے قلعہ کے برج پر نظر آیا نشانوں سے وہ سردار معلوم ہوتا تھا۔ اکبر نے نشانہ لے کر بندوق چھوڑی۔ دور سے معلوم نہ ہوا راجہ بھگوان داس مان سنگھ کا باپ پاس کھڑا تھا اکبر نے اس سے کہا جب گولی نشانہ پر لگتی ہے تو ہاتھ کو ایک طرح سے لپک دیتی اور دل کو سرور ملتا ہے اس وقت مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا ضرور اس جلتہ پوش کو گولی لگی ہے کچھ دیر بعد خبر ملی کہ مذکورہ برج خالی پڑا ہے اور قلعہ کے محلات سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں راجہ بھگوان داس نے عرض کی فتح مبارک وہ شخص خود جیمل سنگھ تھا۔

[2] میر علاء الدولہ قزوینی میر عبداللطیف قزوینی کا چھوٹا بھائی تھا میر عبداللطیف کا حال ہم اس سے پہلے ایک حاشیہ میں لکھ آئے ہیں۔ میر علاء الدولہ اپنے تذکرہ کی وجہ سے مشہور ہے تذکرہ شعرا فارسی شاعروں کے حالات کا ایک اچھا مجموعہ اور ماخذ ہے۔

[3] شیر کا شکار: عام طریقہ تو یہ تھا کہ لوہے کے بڑے پنجرے میں جس کا دروازہ کھٹکے سے گر جاتا تھا جنگل میں رکھ دیتے تھے اور اس کے ایک محفوظ حصہ میں بکری کو باندھ دیتے تھے۔ شیر بکری کے لیے اندر داخل ہوتا اور پھنس جاتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ درخت کی شاخ سے ایک کمان میں زہر آلود تیر جوڑ کر لٹکا دیتے تھے جیسے ہی شیر اس کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں ایک دوسرا شیر بھاشیر سے تنہا مقابلہ کیا۔ نتیجہ میں دونوں شیر مارے گئے۔

بادشاہ یہاں پر لشکر سے علیحدہ ہو گئے اور نارنول پہنچے۔ نارنول میں شیخ نظام نارنولی بڑے پایہ کے بزرگ تھے اکبر نے ان کی زیارت کی اور اپنے لیے ان سے دعا کرائی پھر مسلسل کوچ کرتے ہوئے دارالخلافہ لوٹ آیا۔

اسی سال بدایوں میں میری دوسری شادی ہوئی اور "الآخرۃ خیرالک من الاولیٰ" کا ثبوت مل گیا۔ اس نکاح کی تاریخ ملی ہے ؎

چوں مرا از عنایت ازلی
اتصالے بہ ماہ چہرے شد
عقل تاریخ کدخدائی را
گفت ماہی قرین مہری شد

اسی سال برگزیدہ اولیا و مشائخ شیخ عبدالعزیز دہلوی[1] نے سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کی تاریخ وفات ہے ؎

عزیز جہاں شیخ عبدالعزیز
کہ عالم ہمہ قطب وہلیش خواند
سوئے عرصۂ آخرت تافت رخ
وزیں تنگنا اسپ ہمت جہاند
طلب کردم از دل چو تاریخ او
بگفتا کہ قطب طریقت نماند

چونکہ شیخ ہمیشہ اپنے دستخط کے ساتھ لکھا کرتے تھے "ذرۂ ناچیز عبدالعزیز" اس لیے ایک اہل علم نے ان کی تاریخ اسی "ذرۂ ناچیز" سے نکالی ہے۔

---

[1] پورا نام عبدالعزیز ابن حسن بن طاہر جون پوری مشہور چشتی بزرگ تھے ان کا ایک مشہور رسالہ "عینیہ" ہے جو انھوں نے شیخ امان پانی پتی کے رسالہ "غیریہ" کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ رسالہ فلسفۂ وحدت الوجود پر بڑی مدلل چیز ہے۔ ملا بدایونی نے ان بزرگ سے تصوف اور دوسری کتابیں پڑھی تھیں۔ پیدائش جون پور میں ۸۹۸ھ میں ہوئی ڈیڑھ سال کی عمر تھی کہ والد دہلی لے کر آ گئے تھے وفات ۹ جمادی الآخر ۹۷۵ھ میں ہوئی۔

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) قریب سے گزرتا ذرا سی حرکت پر وہ تیر کمان سے چھوٹ کر اسے گھائل کر دیتا۔ شیر کے راستہ میں بکری کو باندھ دیتے ہیں اور اس کے اطراف زمین پر کافی مقدار میں گوند بھگا کر پھیلا دیتے ہیں جب شیر حملہ کرتا ہے تو اس کے پنجے گوند میں آلودہ ہو جاتے ہیں جس قدر پنجے جھاڑتا ہے گوند چپکتا چلا جاتا ہے اور شیر سراسیمہ ہو جاتا ہے اس وقت اسے یا تو زندہ پکڑ لیتے ہیں یا ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایک خطرناک طریقہ یہ ہے کہ ماہر شکاری بھینسے پر سوار کھڑا رہتا ہے اور اسے شیر سے لڑاتا ہے وہ سینگوں پر اٹھا کر شیر کو پھینک دیتا ہے جس سے وہ مر جاتا ہے۔ اکبر نے کئی ایک شیروں کو مار گرایا تھا باری کے جنگل میں ناہر خاں کے ہاتھی پر بادشاہ سوار تھے، شیر نے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ ہاتھی کا سر زمین تک جھک گیا۔ بادشاہ نے اس ہر توع پر ایک ہی وار میں شیر کا خاتمہ کر دیا۔ ٹوڈہ کی شکارگاہ میں ایک شخص کو شیر نے دبوچ لیا اکبر نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ شیر گر پڑا اور اس غریب کی جان بچ گئی۔ قمرغہ شکار میں ایک بڑا شیر بادشاہ کے سامنے آ گیا۔ اکبر نے اس کی پیشانی پر تیر چلایا کہ وہ گر پڑا۔ ایک بار ایک پیادہ کو شیر نے پکڑ لیا تھا اکبر نے بندوق سے اس پر فائر کیا اور شیر ختم ہو گیا پیادہ کی جان بچ گئی۔ متھرا کے جنگل میں اکبر اور شجاعت خاں کے سامنے شیر آ گیا تھا شجاعت خاں تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا لیکن اکبر اسی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا اور نہایت غضب سے شیر کو گھورنے لگا۔ شیر ٹھٹک کر لوٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ بادشاہ کے تیر سے زمین پر تڑپتا ہوا نظر آیا۔

۹۷۶ھ میں بادشاہ نے پنجاب سے تمام امرائے اتکہ خیل اور کمال خاں گکھڑ کو دربار میں بلالیا اور ان کی جاگیریں حسین قلی خاں اور اس کے بھائی اسماعیل قلی خاں کے سپرد کر کے انھیں اس صوبہ پر نامزد کردیا۔ حسین قلی خاں اور اس کا بھائی ناگور سے آئے اور رنتھبور کی فتح کے بعد آگرہ سے پنجاب کی صوبہ داری کے لیے رخصت ہوئے۔ سنبل اور بریلی کی سرکار خان کلاں کو تفویض کی گئی۔

باغی مرزاؤں کا تعاقب

محمد سلطان مرزا کے لڑکے گجرات میں چنگیز خاں کی پناہ میں چلے گئے تھے۔ حاکم گجرات سے بھی ان کی نبھ نہ سکی اور وہ یہاں کی جاگیروں میں دست درازی کر کے بھاگ کر مالوہ آگئے۔ ان کے مقابلہ میں محمد مراد خاں اور مرزا عزیز اللہ مشہدی اجین کے قلعہ میں محصور ہوگئے۔ اشرف خاں میر منشی اور صادق محمد خاں ایک بھاری لشکر کے ساتھ رنتھبور کی مہم پر بھیجے گئے ان کو جب مرزاؤں کی یلغار کی خبر ملی تو انھوں نے بادشاہ سے اجازت لے کر قلیج خاں کے ساتھ جسے ان کے بعد اس قلعہ کی تسخیر پر مقرر کیا گیا تھا۔ مرزاؤں کی سرکوبی کے لیے اجین کا رخ کیا۔ سرونج میں شہاب الدین احمد خاں اور سارنگ پور میں شاہ بداغ خاں بھی ان امیروں سے آکر مل گئے، اس طرح ایک بڑی فوج منظم ہوگئی۔ مرزاؤں کو جیسے ہی اس لشکر کشی کی اطلاع ملی وہ اجین سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہی امیروں نے ان کا تعاقب کیا۔ جب مرزاؤں نے نربدا ندی کو عبور کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ جھجھار خاں حبشی نے ترپولیہ کے میدان میں چنگیز خاں کو غافل پاکر قتل کردیا ہے اور گجرات ترکتازیوں کے لیے خالی پڑا ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی ان لوگوں نے گجرات کا رخ کیا اور پہلے ہی حملہ میں چمپانیر کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ وہاں سے بڑھ کر بھروچ کے قلعہ کو گھیر لیا اور کچھ عرصہ بعد محصور قلعہ دار رستم خاں رومی کو سازش اور حیلہ سے گرفتار کر کے قتل کردیا اور اس قلعہ پر بھی قبضہ کرلیا قلیج خاں اور صادق محمد خاں دوسرے شاہی امیروں کے ساتھ نربدا کے کنارے سے لوٹ کر دربار میں آگئے اور مندو کے جاگیردار اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے۔

قلعہ رنتھنبور کی فتح

اسی سال ۹۷۶ھ کی پہلی رجب کو بادشاہ دہلی تشریف لائے اور چند دن پالم کے پرگنے میں ہانکے کا شکار کھیلتے رہے یہاں سے آخر ماہ شعبان کو شاہی لشکر قلعہ رنتھنبور پہنچا۔ تھوڑی ہی مدت میں سرنگ قلعہ کی دیواروں تک کھود لی گئی۔ قلعہ کے مقابل رن کی نہایت دشوار گزار پہاڑی تھی حکم شاہی پر سات آٹھ سو کہاروں نے مل کر پندرہ بڑی بڑی توپیں جو پانچ پانچ سات سات من کا گولہ پھینکتی تھیں اس پہاڑی پر پہنچا دیں۔ ان توپوں کی گولہ باری سے پہلے ہی دن قلعہ کے اندر کی عمارتیں پیوند خاک ہوگئیں۔ حاکم قلعہ رائے سرجن قلعہ چتوڑ کی بربادی اور وہاں والوں کی تباہی و ذلت کو دیکھ چکا تھا، جان کے خوف سے اس نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے اور اپنے لڑکوں دودا اور بھوج کو بعض زمینداروں کے ہمراہ بارگاہ شاہی میں بھیج دیا اور امان کی التجا کی۔ حسین قلی خاں جہاں اس کی تسلی کے لیے روانہ کیا گیا اور وہ رائے سرجن کو دربار میں لے آیا۔ اس نے قلعہ کی کنجی سپرد کردی۔ اس طرح بروز چہارشنبہ ۳ شوال کو یہ قلعہ فتح ہوگیا۔

اس فتح کی تاریخ ہے:

"فتح متین"

اکبر نے دوسرے دن چند آدمیوں کے ہمراہ قلعہ کی سیر کی اور قلعہ مہتر خاں سلطانی کے سپرد کردیا اور لشکر کو خواجہ جہاں خواجہ اینا اور مظفر خاں کی سرکردگی میں آگرہ روانہ کردیا اور خود حضرت خواجہ اجمیریؒ کے مزار کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ اجمیر سے بادشاہ کی سواری بہت جلد ۲ ذی قعدہ ۹۷۶ھ کو آگرہ واپس ہوگئی۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کے بھائی میر فارغی نے قلعہ رنتھنبور کی فتح پر حسب ذیل تاریخ کہی ہے:

چوں گل نصرت شگفت در چمن فتح شاہ!
منہئی تاریخ گفت قلعہ گرفتند زود!

مولانا شیری کی کہی ہوئی تاریخ ہے ؎

قلعۂ کفر چو از دولت شاہ یافت شکست
شہ کفار شکن یافتہ شیری سالش

اسی سال آگرہ کے نئے قلعہ کا دروازہ ہتیا پول بن کر مکمل ہوگیا اس کی تاریخ ہے ؎

کلک شیری پئے تاریخ نوشت
بے مثال آمدہ دروازۂ فیصل

اکبر شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں

بادشاہ کے مسلسل کئی ایک لڑکے ہوئے تھے لیکن وہ کمسنی میں ہی اس دنیا سے گزر گئے۔ اس سال بادشاہ کی ایک بیوی[1] حاملہ ہوئی۔ بادشاہ نے شیخ اسلام چشتی سیکری سے[2] دعا کرائی اور اس بیوی کو شیخ کے گھر پر بھجوا دیا۔ شیخ نے اس سے پہلے ہی شاہزادہ کی ولادت کی خوش خبری دی تھی اور شاہنشاہ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی تھی اس لیے وہ بارہا شیخ کے گھر پر جاتے رہے اور بے چینی سے اس وعدہ کا انتظار کرنے لگے۔

شیخ سے اس تعلق و ربط و ضبط کی وجہ سے بادشاہ نے کوہ سیکری پر شیخ کی قدیم خانقاہ کے قریب ایک بڑی عمارت[3] کا سنگ بنیاد رکھا ایک نئی خانقاہ بنوائی اور ایک وسیع اور بلند سنگین مسجد تعمیر کرائی جو سنگینی میں پہاڑ کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے اور دنیا میں ایسی مسجد کم ہی ہوگی۔ یہ مسجد تقریباً پانچ سال کی مدت میں تعمیر ہوئی۔ اس بستی کا فتح پور[4] نام رکھا گیا اس میں بازار، حمام، چوک وغیرہ بنائے گئے۔

---

[1] یہ حرم راجہ بھاڑا مل کی بیٹی تھی جو راجہ مان سنگھ کی پھوپھی ہوتی ہے یہی جہانگیر کی ماں ہے۔

[2] اس وقت اکبر کی عمر ۲۷-۲۸ سال کی تھی شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک کے کہنے پر اکبر شیخ سلیم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کرائی۔

[3] اس عمارت کا نام رنگ محل تھا، اسے اکبر نے شیخ سلیم کے مکان سے متصل مستورات کی قیام گاہ کے لیے بنوایا تھا اسی محل میں شہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا۔ بدایونی نے اس کی پیدائش شیخ کے اصل مکان میں بتائی ہے لیکن اکبر نامہ اور ماثر الامرا میں وضاحت سے اس محل کا ذکر کیا گیا ہے۔

[4] شہر فتح پور آگرہ سے ۲۳ میل مغرب میں واقع ہے اور موضع سیکری سے ۵-۶ فرلانگ پر ہے۔ سیکری کے پہاڑ کا نام کوہ اربلی ہے اسی کی ایک شاخ کے دامن میں فتح پور آباد ہے۔ سیکری کی آبادی شیخ سلیم اور ان کے مریدوں کے مکانوں سے شروع ہوئی تھی۔ جس غار میں ریاضت کرتے تھے وہ مسجد سنگتراش میں اب بھی موجود ہے۔ پہلے اس کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا۔ اسی جگہ رانا سانگا کو بابر نے شکست دی تھی اسی فتح کی یادگار میں یہ نام تجویز ہوا تھا بعد میں یہ شہر فتح پور کے نام سے مشہور ہوگیا۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے کہ "شہر ۱۴-۱۵ برس کی مدت میں آباد ہوگیا" لیکن وہ اس نام کی وجہ تسمیہ گجرات کی فتح لکھتا ہے۔ ابو الفضل لکھتا ہے "جہاں پناہ نے اسی کا نام فتح آباد رکھا تھا لیکن رعیت نے درخواست کی کہ ہم اپنے شہر کا نام فتح پور رکھنا چاہتے ہیں بادشاہ نے درخواست منظور کر لی"۔ اکبر کا قیام فتح پور میں ۱۲ برس رہا آخر میں وہ اکبرآباد منتقل ہوگیا تھا، لیکن $\frac{۱۰۱۰}{۱۶۰۱}$ھ میں بھی وہاں اکبر کے قیام کا پتہ چلتا ہے۔ جہانگیر نے آگرہ کو دار الخلافہ بنایا $\frac{۱۰۲۸}{۱۶۱۸}$ھ میں آگرہ میں طاعون کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ فتح پور آکر ٹھہرا تھا۔ اسی جگہ ۱۴ ربیع الثانی $\frac{۱۰۲۸}{۱۶۱۸}$ھ کو جہانگیر نے جشن نوروز منایا تھا۔ شاہجہاں اور عالمگیر بھی فتح پور آکر ٹھہرتے رہے۔ محمد شاہ کے عہد تک فتح پور کی رونق قائم رہی۔ جاٹوں کی لوٹ مار کے زمانہ میں چورامن اور سورج مل جاٹ نے آگرہ پر قبضہ کر لیا تھا انھوں نے آگرہ اور فتح پور کے شاہی محلات کو بری طرح لوٹ لیا اور دفینوں کے لالچ میں اکثر عمارتوں کو ڈھا دیا۔ اس کے بعد فتح پور پر نجف خاں، آفراسیاب خاں، ہمدانی خاں، اسماعیل خاں امیروں کا دور دورہ رہا پھر مہاراجہ سیندھیا نے یہاں قبضہ کر لیا ۱۸۰۳ء میں یہ انگریزوں کی عملداری میں آگیا اس عرصہ میں فتح پور بہت کچھ تباہ و تاراج ہوچکا تھا ۱۸۵۷ء کے غدر میں تو بالکل ہی تباہ ہوگیا۔ اس وقت وہاں کی موجودہ آبادی ۸-۱۰ ہزار کے اندر اندر ہے اکبری اور جہانگیری عہد میں ایسی گھنی آبادی تھی کہ راستہ چلنا مشکل ہوتا تھا۔ درگاہ شریف کے علاوہ شاہی محلات امراء کے قصر یہاں کی یادگاریں ہیں اور پورا شہر مغل عظمت کا عبرت کدہ معلوم ہوتا ہے۔

امیروں نے بھی وہاں محل باغات اور عمارتیں تیار کرائیں۔

میں نے ان عمارتوں، مسجد اور خانقاہ کی تاریخ نکالی ہے ؎

هٰذِهِ الْبُقْعَةُ قُبَّةُ الْاِسْلَام
رَفَعَ اللهُ قَدْرَ بَانِيْهَا
قَالَ رُوْحُ الْاَمِيْنِ تَارِيْخَهُ
لَا يُرىٰ فِي الْبِلَادِ ثَانِيْهَا

دوسری تاریخ ہے:

بیت معمور آمدہ از آسماں

اشرف خاں کی نکالی ہوئی تاریخ ہے:

ثانی المسجد الحرام آمد

شیخ چشتی نے اپنے گھر کی عورتوں کو بادشاہ سے بے پردہ کر دیا تھا، ان کے عزیزوں اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے تو ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کر دیا ہے۔ شیخ[1] نے جواب دیا، تم کو میں نے امیر بنا دیا ہے دنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں ہے، دوسری بیبیاں کر لو آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے ؎

یا مکن با فیل باناں دوستی
یا بنا کن خانۂ در خورد فیل

ایک دلگداز داستان عشق اس سال کا دلچسپ و عجیب واقعہ سید کرمی گرم سیری کے لڑکے سید موسیٰ کی موت کا سانحہ ہے۔ سید موسیٰ کالپی کے معزز سادات کے گھرانے کا نوجوان تھا اور بادشاہی فوج میں ملازم تھا۔ وہ آگرہ میں ایک سنار کی لڑکی موہنی نامی پر عاشق ہو گیا۔ اور دونوں میں عشق و محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ جس وقت رنتھنبور پر لشکر کشی ہوئی تھی۔ وہ لشکر کے ساتھ نہیں گیا اور قلعہ آگرہ میں جمنا کے کنارے اپنی محبوبہ کے پڑوس میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ یہ مکان میر سید جلال متوکل کے گھر کے قریب تھا۔ اس کا عشق جنون تک جا پہنچا تھا، چنانچہ اپنے بھروسے کے چند آدمیوں کو لے کر ایک دو بار اپنی معشوقہ کو اس کے گھر سے نکال لایا لیکن ہر مرتبہ یا تو محافظ سپاہیوں نے یا سناروں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس طرح کوئی دو سال چار مہینے بیت گئے۔ اس عرصہ میں یہ عاشق و معشوق کبھی کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے تھے اور بس۔ لیکن درد مہجوری آخر کب تک، ایک رات

---

[1] شیخ سلیم چشتی بابا فرید گنج شکر کی اولاد سے ہیں والد کا نام شیخ بہاؤ الدین تھا آپ کے پردادا شیخ سلیمان پاک پٹن سے لدھیانہ آ کر رہے۔ آپ کے والد لدھیانہ سے دہلی آ گئے تھے، دہلی کے محلہ زندہ پیر میں سلطان بہلول لودھی کے عہد میں $\frac{۸۸۱ھ}{۱۴۷۶ء}$ کو تولد ہوئے۔ آپ نو سال کے تھے والدین سیکری میں آ کر رہنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۸ برس کی عمر میں آپ اپنے بھائی شیخ موسیٰ سے اجازت لے کر سرہند گئے اور وہاں شیخ مجد الدین سے علم حاصل کیا، وہاں سے عالم اسلام کی سیاحت اور حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ بیس سال تک عرب، ایران اور مصر کے اکثر شہروں کی سیاحت کی۔ اس عرصہ میں ۱۴ حج کیے بصرہ میں خواجہ ابراہیم عرب سے خرقہ حاصل کیا اور شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان آنے کے بعد سرہند کے قریب بیدالی میں ڈھائی سال ٹھہرے پھر $\frac{۹۳۰ھ}{۱۵۲۴ء}$ میں سیکری تشریف لائے $\frac{۹۶۲ھ}{۱۵۵۵ء}$ میں بحری راستہ سے دوسرا حج کیا اور آٹھ سال حرمین میں مقیم رہے۔ $\frac{۹۷۱ھ}{۱۵۶۳ء}$ کو ہندوستان واپس آئے۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں بھی آپ کا بڑا اعزاز تھا۔ ۹۷۱ھ میں آپ نے فتح پور میں خانقاہ تعمیر کرائی یہی خانقاہ شہر فتح پور کی آبادی کا باعث ہوئی۔ آپ کا انتقال شب پنجشنبہ ۲۹ رمضان $\frac{۹۷۹ھ}{۱۵۷۱ء}$ کو ہوا۔

موہنی کے اشارہ پر وہ کمند لگا کر اپنے محبوب کے کوٹھے پر جا پہنچا اور وہ رات دونوں نے ایک دوسرے کی ہم آغوشی میں گزاری لیکن دونوں پاکباز اور باعفت ہی رہے۔ اس بات کو سید موہنی کے بھائی سید شاہی نے اپنی مثنوی "مثنوی دلفریب" میں اس طرح بیان کیا ہے:

ہر چند ہوائے دل زدی جوش
مے کرد حیا ندا کہ خاموش
(دل تو بہت جوش مار رہا تھا لیکن حیا برابر اس کو تھامے ہوئے تھی)

در پیش نظر زلال حیواں
یکدم نہ مجال خوردن آں
(نظروں کے سامنے آب حیات رکھا تھا لیکن اس کو پینے کی مجال نہ تھی)

دلہا ز کمال تشنگی گرم
لبہا شدہ مہر بستہ از شرم
(دل مارے پیاس کے بے قرار تھے لیکن لبوں پر شرم نے مہر لگا رکھی تھی)

یک خانۂ خلوت و دو مشتاق
دل ہا شدہ جفت ماندہ تن طاق
(اکیلا گھر اور دو چاہنے والے لیکن دل ان کے تو ملے ہوئے تھے اور جسم جدا تھے)

ماندند دو خستۂ دل افروز
در بازی طاق و جفت تا روز
(وہ دونوں خستہ دل جفت و طاق کی یہ بازی صبح تک کھیلتے رہے)

ایں ست بر نزد ما محبت
کز دل ببرد خیال شہوت
(ہمارے نزدیک تو محبت وہی ہے جو دل سے شہوت کا خیال نکال دے)

چوں دل ز ہوائے نفس میرد
کے عشق دراں قرار گیرد
(جب دل خواہشات نفسانی کے ہاتھوں مر جاتا ہے تو عشق بھلا اس میں کیسے ٹھہر سکتا ہے)

نبود بہ جہاں بے سر و پائے
جز در دل پاک عشق را جائے
(اس جہان بے سرو پا میں عشق بجز پاک دل کے اور کہیں نہیں رہ سکتا)

عشق است انیس جان پاکاں
عشق است رفیق دردناکاں

(عشق پاک روحوں کا ساتھی اور غم زدوں کا دوست ہے)

القصہ بصد لطافت و ناز
بکشادہ ہزار دفتر راز

(مختصر یہ کہ بڑی لطافت کے ساتھ وہ رات ناز و نیاز میں بسر ہوئی)

دیدند قریب چوں سحر را
کردند وداع یک دگر را

(جب سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو انھوں نے ایک دوسرے کو رخصت کیا)

رخصت ہوتے وقت اچانک دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہنی اپنے گھر بار کو وداع کر کے اور ننگ و ناموس کا خیال چھوڑ کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ ہی نکل جائے، جیسا کہ اس مثنوی کے شعر ہیں:

کاے عاشق صادق وفا کیش
من با تو موافقم میندیش

(اے باوفا عاشق صادق فکر نہ کر، میں تیرے ہمراہ ہوں)

عہدے کہ نخست با تو بستم
آں عہد یکے است تا کہ ہستم

(جو عہد میں نے تجھ سے کیا ہے جیتے جی وہ عہد قائم رہے گا)

برخیز کہ فکر خود نمایم
وز بام دگر فرود آیم

(اٹھ کر ہم اپنی راہ لیں اور اب اس کوٹھے سے اُتر جائیں)

تا آنکہ نگشتہ است آگاہ
دزدیدہ رویم تا سحر گاہ

(جب تک کہ کوئی آگاہ ہو ہم صبح ہونے سے پہلے چھپ کر دور نکل جائیں)

غرض وہ دونوں اس محلہ سے نکل کر بھاگم بھاگ موسیٰ کے ایک دوست کے گھر پر پہنچے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔ موہنی کے عزیزوں نے سید موسیٰ کے گھر کا محاصرہ کر کے ایک فتنہ مچا دیا۔ سید موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے جس نے مذکورہ بالا مثنوی میں یہ سارا واقعہ لکھا ہے۔ میرے ساتھ اس کا بڑا یارانہ تھا۔ ساروں کو کسی نہ کسی طرح ٹال کر رخصت کر دیا۔ جب موہنی کو اس ہنگامہ کی اطلاع ملی تو اسے سید موسیٰ کی زندگی کی فکر پڑ گئی کہ کہیں اس کے عزیز حاکم شہر کے ذریعہ اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے چاہنے والے کو بادل ناخواستہ رخصت کر دیا اور اس سے دوبارہ ملاپ کا وعدہ کیا۔ خود بدنامی سے بچنے کے لیے اپنے گھر لوٹ گئی۔ گھر جا کر اس نے ایک بڑا دلچسپ اور کارگر بہانہ کیا کہ "اس رات میں بے خبر سو رہی تھی کہ ایک حسین و جمیل شخص آیا اور میرا ہاتھ

پکڑ لیا۔ میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اس شخص کو موجود پایا اچھی طرح دیکھا تو اس کے سر پر جواہرات کا جڑاؤ تاج رکھا تھا اور اس کے دو نورانی پَر تھے اس نے میرے چہرے پر کوئی افسون پڑھ کر پھونکا اور جب میں مارے حیرت کے دم بخود رہ گئی تو مجھے اس نے اپنے پر دل میں چھپا لیا اور ایک ایسے شہر میں لے گیا جس کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے۔ وہاں لے جا کر اس نے مجھے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار محل میں رکھا۔ مثنوی کے شعر ہیں:

ہرچند کہ آں مقام دل خواہ
بود بخدا بسے طرب گاہ
واں جملہ بتان حور زادہ
بودند بخدمتم ستادہ
لیکن ز فراق دوستانم
آرام نمے گرفت جانم
مے مردم از اشتیاق مادر
مے سوختم از غمِ برادر
ہر لحظہ دریں تن بلا کش !
ہجر پدرم ہمے زد آتش
با گریۂ زار و آہ جاں سوز
چوں رفت دراں مقام سہ روز
دیدند ہمہ کہ بس خرابم
بسیار ز غم در اضطرابم
آگاہ شدند از ملالم
کردند ترحمے بر حالم
زانساں کہ مرا بہ خانہ بردند
بردہ بچناں غمے سپردند
آوردہ بخانہ ام رسانند
زاں محنت و درد وا رہانند

(ترجمہ: وہ مقام بلاشبہ نہایت خوش منظر اور دلکش تھا۔ میری خدمت کے لیے حوریں مقرر تھیں، لیکن میں اپنی ماں، بھائی اور باپ کی جدائی سے تڑپ رہی تھی۔ روتے دھوتے وہاں تین دن گزر گئے۔ ان لوگوں نے جب مجھے غم سے بے قرار پایا تو میرے حال پر رحم کیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر گھر تک پہنچا گئے۔)

جاہل ہندوؤں نے اس افسانہ کو صحیح سمجھ لیا۔ مصلحت یہی تھی کہ وہ اس واقعہ کو چھپاتے لیکن غصہ کے مارے انھوں نے چند دن تک موہنی کو بالاخانہ میں قید کر دیا۔ سید موسیٰ بے چارہ درد فراق میں تڑپتا رہا۔ موہنی کے خیال میں تقریباً دیوانہ ہی ہو گیا۔ ان دونوں کی عشقبازی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا جہاں چار آدمی مل بیٹھتے بس یہ داستان چھڑ جاتی، پھر جس کے منہ جو بات چڑھتی کوٹھوں پہنچ جاتی۔ آخرکار موہنی نے ایک مشاطہ کے ذریعہ موسیٰ کے پاس کہلوا بھیجا اور اسے تسلی دی کہ میں نے بڑی مشکل اور حیلہ گری سے کام لے کر ان لوگوں کے ہاتھ سے نجات حاصل کر لی ہے اور اب ہر طرح مطمئن ہوں۔

از طعنۂ اہل عصر رستم فارغ ز چناں بلا نشستم
در کوئے جنوں قدم نہادی واں رنج مرا بباد دادی
اکنوں ہم اگر علاج یابی امید کہ رو ازاں نتابی
نوعے بکنی کہ ایں فسانہ شہرت نکند دریں زمانہ
یعنی کہ ز شہر من برآئی وز منزل ما کنی جدائی
لیکن ز کسان دوستداری یک محرم راز خود گذاری
تا حال مرا چنانچہ داند
ہر روز بتو خبر رساند

(ترجمہ: میں دنیا والوں کی ملامت و انگشت نمائی سے نجات پا چکی ہوں لیکن تم نے دیوانگی اختیار کر کے میری ساری محنت اکارت کر دی، اب ذرا ہوش مندی سے کام لو اور ایسا رویہ اختیار کرو کہ زمانہ میں ہماری داستان کا چرچا ہونے نہ پائے۔ ایک ہی راہ ہے کہ تم اس شہر سے چلے جاؤ اور یہاں اپنا ایک قابل اعتماد رازدار چھوڑ جاؤ تاکہ وہ میرے حالات سے تم کو ہر روز باخبر رکھے۔)

سید موسیٰ نے اپنی محبوبہ کے کہے پر عمل کیا اور ایک دن صبح اس کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ دونوں نے رو دھو کر ایک دوسرے کو وداع کیا۔ ایک رازدار کو وہاں چھوڑ کر وہ اپنی ملازمت پر رنتھنبور چلا گیا۔

موہنی نے موسیٰ کو اپنے سے دور بھیج تو دیا لیکن اس کے چلے جانے پر دن گزارنا اور رات کاٹنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا جب فراق کے صدمے سہے نہ جا سکے تو چند دن بعد اس نے اس رازدار سے مل کر کہا رات کے وقت تم ہمارے گھر آ کر فقیروں کی طرح صدا لگانا اور میں دان دینے کے بہانے گھر سے نکل آؤں گی، پھر تم مجھے اس شہر سے نکال لے جانا۔ چنانچہ مقررہ وقت پر وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل آئی۔ اس خادمہ کو جو اس کی نگرانی پر مقرر تھی کسی کام کے بہانے بھیج دیا اور اس رازدار کے ساتھ بھاگ گئی۔

ان لوگوں نے سفر کی تیاری پہلے ہی سے کر رکھی تھی۔ تین دن تک تو شہر میں چھپے رہے۔ جب ہر طرح اطمینان کر لیا تو فتح پور اور بیانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔ اتفاق سے موہنی کا ایک رشتہ دار اسی راستہ پر آ نکلا اور اس نے موہنی کو پہچان کر پکڑ لیا۔ اس زمانہ میں آگرہ کا کوتوال سلطان جمال تھا۔ اس کے سپاہی موقع پر آ پہنچے۔ انھوں نے موہنی کو تو اس کے رشتہ داروں کے حوالہ کیا اور بھگا لے جانے والے کو قید میں ڈال دیا۔ وہ بیچارا کافی عرصہ تک قید و بند کی مصیبت میں مبتلا رہا آخر بڑی مشکل سے رہائی

نصیب ہوئی ۔

جب بے چارے سید موسیٰ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ پہلے ہی درد فراق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اس وحشت ناک خبر کے سنتے ہی اس پر ایسی مایوسی چھائی کہ بس مرنے کے قریب ہو گیا ۔ وحشت و جنوں کے عالم میں آگرہ جانا چاہتا تھا ، لیکن بھائیوں اور دوستوں نے سمجھا بجھا کر ، ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اس ارادے سے باز رکھا ۔ جب لشکر دارالخلافہ کو لوٹ کر آیا تو سید موسیٰ کا حال اور بُرا ہو گیا ، چونکہ موہنی کو ایک محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا اس لیے باوجود ہزار کوشش کے وہ غریب اپنی محبوبہ کی جھلک تک نہیں دیکھ سکا ۔

سید موسیٰ کا ایک دوست قاضی جمال نامی ہندی کا شاعر تھا ۔ یہ شخص کالپی کے نواح میں سیوکن پور کا رہنے والا تھا ، اپنے دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ گئی ، جرأت سے کام لے کر ایک دن وہ مغرب کے وقت اس مکان پر جا پہنچا جہاں موہنی نظر بند تھی ، اور اسے وہاں سے نکال کر ایک تیز رفتار گھوڑے پر بٹھا لیا اور دریائے جمنا کے چڑھائی کی طرف کنارے کنارے گھوڑے کو بھگا دیا ۔ موہنی کے رشتہ دار اس کا تعاقب کرنے لگے اور سامنے سے شہر کے لوگ بھی دوڑتے ہوئے پہنچ گئے ۔ گھوڑا تیز تھا لیکن راستہ میں بہت سے نالے اور گڑھے تھے اس لیے وہ بچ کر نکل نہ سکا ۔ جب موہنی نے یہ حال دیکھا تو اس نے خود کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور قاضی سے کہا تم بچ کر نکل جاؤ میرا سلام اس بے چارے کو پہنچا دینا اور کہنا ؎

من جہد ہمی کنم قضا مے گوید
بیروں ز کفایت تو کار دگر است

تقدیر کے آگے مجبور و بے بس ہوں ۔

جب سید موسیٰ کو اس ناکامی کی خبر ملی تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا ، قلعہ آگرہ میں اپنے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہا اور اس صدمے کے مارے جلد ہی اس کی روح دنیا کی قید سے چھوٹ گئی ۔ مرتے وقت اس نے انتہائی یاس و محرومی کے ساتھ یہ شعر تین مرتبہ پڑھا ؎

از یار دلم ہزار جاں یافت
یاری بر از و نے تواں یافت

(میرا دل میرے محبوب کے سہارے جیتا رہا ہے میں اس سے بہتر محبوب کہیں نہیں پا سکتا ۔)

پھر اس نے کہا " اے اللہ اس درد کو مجھ بدنصیب کی روح کے ساتھ وابستہ رکھنا " ؎

بزن بر سینہ ام خنجر جدا افگن سر از تن ہم
دریں خانہ تاریک رابگشائے در روزن ہم

جب وہ مر گیا تو اس کی میت کو دفنانے کے لیے اٹھایا گیا ۔ لوگ اس جوان مرگ کی موت پر ماتم کرنے لگے ، اس کا جنازہ موہنی کے گھر کی طرف سے نکالا گیا ۔ موہنی کو اس کے گھر والوں نے پابہ زنجیر کر کے قید کر رکھا تھا اس نے کوٹھے پر سے اس شہید کا جنازہ دیکھا ، تو حس حال میں تھی اسی حال میں مبہوت و متحیر رہ گئی ۔ اس کا معمول یہ بن گیا کہ صبح سے شام تک کوٹھے پر کھڑی ہوئی سرو ننگا ہوں سے اس طرح تکتی رہتی جیسے وہ برابر جنازہ کو سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہے ۔ آخر کار اس کی یہ بے حسی ختم ہوئی اور اچانک بے قرار ہو کر اسی حالت میں ایک چیخ مار کر اونچے کوٹھے پر سے نیچے کود گئی اور بیروں کی زنجیر توڑ ننگے سر ننگے پیر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے بدنصیب عاشق کے محلہ

میں جا پہنچی۔ اس کی حالت برابر بگڑتی چلی گئی۔ کبھی تو بے حس و حرکت مدہوش رہتی اور کبھی خاموش و حیرت زدہ نظر آتی۔ ماں باپ نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو صبر کرکے بیٹھ رہے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

"کس نہ ستد از دہ ویراں خراج"

جلد ہی اس بے چاری کا بُرا حال ہو گیا، دیوانوں کی طرح اپنے آپ میں الجھتی رہتی۔ سینہ کوبی کرتی اور سید موسیٰ کے نام کا ورد کرتی رہتی۔ اسی حالت میں میر سید جلال متوکل کے جو ایک بزرگ درویش و عالم تھے آستانہ پر پہنچی اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا اور پھر اپنے عاشق کی قبر پر جا کر کھڑے قد سے اس طرح گری کہ پھر نہیں اٹھی۔

سید شاہی نے مثنوی میں اس منظر کو اس طرح نظم کیا ہے:

ایں واقعہ چوں شنید آں ماہ	آمد سوئے ما دویدہ ناگاہ
چوں یافت شرف ز دین اسلام	بربست بطوف خلد احرام
با خوبے او چو عشق شد جمع	پروانہ صفت بسوخت آں شمع
کرد از سر شوق و جذبہ فریاد	موسیٰ بزباں گرفت و جان داد
در یک نفس آں دو سرورِ عشق	گشتند شہیدِ خنجرِ عشق
تا آنکہ میان باغ رضواں	باشند بہم ز خلق پنہاں
آں ہر دو مصاحبانِ جانی	رفتند ازیں جہانِ فانی
از درد و غم و فراق رستند	پنہاں ز ہمہ بہم نشستند
اے سیدی ایں چہ نالہ داری	دل را چہ بغم حوالہ داری

ایں واقعہ را بکن فراموش
در صبر بکوش و باش خاموش

(ترجمہ: جب موہنی نے یہ واقعہ سنا تو وہ ہمارے پاس دوڑتی ہوئی چلی آئی، اور اسلام قبول کر لینے کے بعد اس نے جنت کے ارادہ سے احرام باندھ لیا۔ عشق اس کے حسن کا لاگو تھا اس لیے وہ شمع حسن پروانہ کی طرح جل گئی۔ انتہائے شوق میں اس نے موسیٰ کا نام دہرایا اور اپنی جان دے دی۔ وہ دونوں وفاشعار دیکھتے ہی دیکھتے خنجرِ عشق سے شہید ہو گئے تا کہ دنیا کی آنکھوں سے چھپ کر جنت کے باغ میں ایک ساتھ رہیں۔ وہ دونوں دلی دوست اس دنیا سے رخصت ہو گئے، جدائی کے صدموں سے چھوٹ کر سب کی آنکھوں سے اوجھل ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ اے سیدی اب نالہ و فریاد سے کیا حاصل تو نے اپنے دل کو غم کے حوالہ کیوں کر دیا ہے اب تو اس واقعہ کو بھول جا، صبر کر اور خاموش رہ۔)

قارئین مجھے معاف کریں میں نے اختصار کا وعدہ کیا تھا لیکن کیا کروں عشق کی اس دل گداز داستان نے میرے قلم کو بے قابو کر دیا اور مضمون کچھ طویل ہو گیا۔

بشنو اے گوش بر فسانۂ عشق	از صریر قلم ترانۂ عشق

کار من عشق دیار من عشق است ۔۔ حاصل روزگار من عشق است
چہ کنم در سرشت من ایں ست ۔۔ وز ازل سرنوشت من ایں ست
بہر ایں آفریدہ اند مرا
جانب ایں کشیدہ اند مرا

شیخ زادہ دام محبت میں

عشق و محبت کا ایسا ہی ایک واقعہ پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ گوالیار میں شیخ محمد غوث کے عزیزوں میں ایک نوجوان شیخ زادہ تھا جو پاکبازی اور راست روی میں مشہور تھا۔ آگرہ میں وہ ایک طوائف پر عاشق ہوگیا۔ یہ خبر شاہنشاہ کو ملی تو انھوں نے اس گانے والی کو ایک مصاحب مقبل خاں کے حوالہ کر دیا۔ اس شیخ زادہ نے جان ہتھیلی پر لے کر اس محل پر کمند لگائی جس میں اس کی محبوبہ کو چوکی پہرہ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے اسے نکال لے گیا۔ بادشاہ نے شیخ محمد غوث کے لڑکے شیخ ضیاء الدین کو جو اس وقت اپنے باپ کے گدی نشین ہیں ان دونوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر ان دونوں کو بادشاہ کے روبرو لے جا کر کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کا نکاح کرا دینا چاہا لیکن شیخ ضیاء الدین اور کچھ دوسرے لوگوں نے بادشاہ کو اس ارادہ سے روک دیا۔ نوجوان شیخ زادہ اس مخالفت کی تاب نہ لا سکا اور خنجر کھینچ کر اپنا کام تمام کر لیا۔

اس کی تجہیز و تکفین پر علماء میں بڑا اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ شیخ ضیاء الدین کا کہنا تھا کہ حدیث شریف "مَنْ عَشِقَ وَعَفَّ وَكَتَمَ ثُمَّ مَاتَ مَاتَ شَهِيدًا" (جس نے عشق کیا پاک رہا اور اسے چھپایا پھر مر گیا پس وہ شہید مرا) کے مطابق وہ شہید عشق ہے اس لیے اس کو شہید کی شان سے دفنانا چاہیے ؎

شہید خنجر عشقم بخوں دیدہ آلودہ
بہ خاکم ہم چناں پرخوں سپارید و مشوئید مرا

ان کے علی الرغم شیخ عبدالنبی صدر اور دوسرے عالم اور قاضی کہتے تھے وہ ناپاک مرا ہے آلودۂ فسق ہے نہ کہ آسودۂ عشق۔ واللہ اعلم۔

اپنے عاشق کے پیچھے اس مطربہ کا برا حال ہو گیا چنانچہ اس نے سب کچھ چھوڑ ایک کفنی گلے میں ڈال لی اور عاشق کے مزار پر مجاور بن کر جا بیٹھی۔ چند ہی دن بعد اپنے چاہنے والے سے جا ملی ؎

خوبرویاں چوں پردہ برگیرند
عاشقاں پیش شاں چنیں میرند

اسی سال شیخ گدائی کنبوہ دہلوی جو معزول کوتوال کی طرح بے آبروئی رہا تھا اور جو زمانہ کی ڈھیل کی وجہ سے نہایت متکبر و مغرور رہ چکا تھا، فوت ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی تاریخ وفات نکالی:

"مردۂ خوک کلاں"

قلعہ کالنجر پر قبضہ

۹۷۶ھ میں جب چیتوڑ اور رنتھنبور کے قلعوں کی فتح کی خبریں ملک میں ہر جگہ پہنچیں اور ہندوستان کے سارے قلعے یلغار شاہی کے سامنے زمین بوس ہوتے ہوئے نظر آئے، تو بھٹہ کے حاکم چند نے بڑی

عاقبت اندیشی سے کام لیا۔اس سے پہلے کہ ذلیل و خوار ہونا پڑے اس نے قلعہ کالنجر جسے اس نے خواندہ بہار خاں شروانی کے لڑکے بجلی خاں سے بھاری قیمت دے کر خریدا تھا، بادشاہ کے سپرد کر دینے کا فیصلہ کیا اور قلعہ کی کنجی نفیس تحائف کے ساتھ دربار میں بھجوا دی۔ بادشاہ نے کالنجر کی کنجی مجنوں خاں قاقشال کو جس کی جاگیر قلعہ سے قریب تھی عطا کر دی اور راجہ رام چند کے نام تسلی آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے جھوسی اور پیاگ (الہ آباد) کے قریب پرگنہ اریل بشمول تمام عمارتوں کے جاگیر میں مرحمت فرمایا۔

شاہزادہ سلطان سلیم کی پیدائش

۹۷۷ھ کی ۱۷ ماہ ربیع الاول دن کے سات بجے فتح پور میں شیخ سلیم چشتی کے مکان[1] پر شاہزادہ سلطان سلیم کی ولادت ہوئی ؎

گوئی بزمیں ستارہ آمد
یوسف بجہاں دوبارہ آمد
بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

شہنشاہ آگرہ سے نہایت تیزی کے ساتھ فتح پور پہنچے اور انتہائی خوشی کے عالم میں انھوں نے تمام قیدیوں کو رہا کر دینے کا حکم دیا۔ شہزادہ کی ولادت کی مسرت میں سات دن تک شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر شاعروں نے مبارک بادی کے قصیدے کہے۔ خواجہ حسین مروہ نے جو قصیدہ سنایا تھا اس کے ہر مصرع سے بادشاہ کی تاریخ جلوس اور مصرع ثانی سے شاہزادہ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ اس قصیدہ کے صلہ میں بادشاہ نے اسے دو لاکھ تنکہ کا انعام دیا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

للہ الحمد از پئے جاد جلال شہریار
گوہر مجد از محیط عدل آمد بر کنار

آخری شعر ہے ؎

شاہ ما پاینده باد و باقی آں شہزادہ ہم
روزہائے بے حساب و سالہائے بے شمار

آخر میں تاریخ کے متعلق مروی نے کہا ہے:

بادشاہا سلک لولوئے نفیس آوردہ ام ہدیہ کان آمد باز جوی گوشدار
کس ندارد ہدیہ زیں بہ اگر دارد کسے ہر کہ دارد گو بیا چیزے کہ دارد گو بیار
یک بہ یک اشعار مروی بسکہ بے عیب آمدہ ہر یکے جوئی زوے مقصود دریائے دربار

مصرع اول زوے سال جلوس بادشاہ
از دوم مولود نور دیدہ عالم برآر

[1] شیخ کے مکان میں شمالی دالان کا نام مجلسی دالان تھا یہ ان کی نشستگاہ تھی اسی دالان کی چھت پر ایک چھوٹا کمرہ منڈف نام کا ہے یہ شیخ کی چلہ گاہ تھی کہتے ہیں اسی میں سلیم پیدا ہوا۔ دوسرا بیان ہے کہ مکان سے قریب اکبر نے ایک محل تعمیر کرایا تھا اس میں سلیم اور دانیال دونوں پیدا ہوئے۔ (ماثر الامراء جلد دوم ص۵۷۰۔ اکبر نامہ ص۲۶۴)

شیخ یعقوب صیرفی کشمیری نے بھی اسی اسلوب پر ایک قصیدہ کہا تھا لیکن کیا فائدہ جس کو صلہ ملنا تھا مل چکا۔

ایک شاعر نے یہ تاریخ نکالی:

"در شاہ وار لجۂ اکبر"

ایک اور تاریخ ہے:

"رُوئے نمود از مطلع اقبال شاہ کامیاب"

جمعہ ۱۲۔شعبان کو بادشاہ نے اپنی منت کے مطابق شہزادہ کی ولادت کے شکرانہ میں آگرہ سے پیدل اجمیر کا سفر کیا۔ ہر روز چھ سات کوس طے کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کرنے کے بعد رمضان مبارک میں وہاں سے واپس آئے اور دہلی میں قیام فرمایا۔ چند دن دہلی کے اولیاء اللہ کی زیارت کی پھر جمنا کے دوسرے کنارے پر شکار کھیلا اور وہاں سے دارالخلافہ لوٹ آئے۔

رافضیوں کو قتل کی سزا اسی سال بادشاہ نے میرزا مقیم اصفہانی اور ایک شخص میر یعقوب کشمیری کو رافضی ہونے کے جرم میں فتح پور میں قتل کرا دیا۔

مرزا مقیم لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک حسین خاں کی ملازمت میں رہا تھا۔ حسین خاں سیدوں کا بڑا معتقد تھا اس لیے وہ مرزا کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا اس نے مرزا کو اپنی سرکار کا وکیل بھی بنا دیا تھا۔ حسین خاں کے عزیزوں اور بھائیوں نے خان کو بتلایا کہ یہ مرزا کٹر رافضی ہے اس لیے خان اس سے کبیدہ خاطر ہو گیا، مرزا بھی حسین خان کی ملازمت چھوڑ کر بارگاہ شاہی میں جا پہنچا۔ بادشاہ نے اس پر مہربانی کی اور اسے کشمیر کے حاکم حسین خاں کے پاس شاہی وکیل بنا کر بھیج دیا۔ اس زمانہ میں کشمیر میں چند متعصب رافضیوں نے قاضی حبیب کو جو پکے سنی تھے مذہبی تعصب میں حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ قاضی ابھی زندہ ہی تھا کہ کشمیر کے حاکم حسین خاں نے مفتیوں کے فتوے کے مطابق قاتل کو سزائے موت دے دی۔ مرزا مقیم نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور اپنے اثر سے کام لے کر ان مفتیوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا، ایک نہایت متعصب اور شر پسند رافضی کے حوالہ کر دیا اس نے تین چار مفتیوں کو قتل کر دیا۔ اس قضیہ کے کچھ عرصہ بعد ہی مرزا مقیم اور حسین خاں کا وکیل میر یعقوب حسین خاں کی لڑکی کو بادشاہ کے پاس پیش کش کی رسم کے لیے لے کر آئے۔ اس موقع پر یہ واقعہ بادشاہ کے علم میں لایا گیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو شیخ عبد النبی اور اس کے رشتہ دار دوسرے چند علماء کے فتوے پر فتح پور کے میدان میں قتل کرا دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کشمیر کی تاریخ میں بھی جسے میں نے مرتب کیا ہے درج کیا گیا ہے۔

کوہ سوالک کے بت خانے مہدی قاسم خاں حج سے واپس آ کر قلعہ رنتھنبور میں حاضر خدمت ہوا تھا۔ اکبر بادشاہ نے اس

ؔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا" یہ حسینی حسنی سادات میں سے ہیں باپ کا نام غیاث الدین حسن تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر میں ہروان میں جو نیشاپور کے نواح میں ہے خواجہ عثمان چشتی کی خدمت میں پہنچے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ شیخ عبد القادر جیلانی رح سے بھی فیض اٹھایا جس سال معز الدین سام نے دہلی کو فتح کیا تھا وہ ہند آئے اور گوشہ نشینی کی خاطر اجمیر پہنچے اور دہاں دین کا چراغ جلایا ہفتہ کے دن چھ ماہ رجب ۶۳۳ھ میں وصال ہوا۔ اجمیر کے پہاڑ کے دامن میں ان کا مزار زیارت گاہ عام و خاص ہے۔" جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے" آپ کا مولد شریف سیستان ہے پہلے بخارا گئے اور علوم ظاہری کی تحصیل کی پھر خراسان آئے پھر قصبۂ ہاروں میں شیخ عثمان ہارونی کے مرید ہوئے اور ان کے حکم سے ہمیشہ وہ سفر میں رہتے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم ادہمؒ سے ملتا ہے۔ خواجہ قطب الدین اوشی آپ کے مرید تھے۔ ان کے مرید شیخ فرید شکر گنج ہیں اور ان کے مرید شیخ نظام الدین اولیاء ہیں۔"

سال لکھنؤ کا پرگنہ حسین خاں سے لے کر اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کارروائی سے حسین خاں کو بہت رنج ہوا۔ مہدی قاسم خاں کی لڑکی اس کے نکاح میں تھی، اس سے خان کو محبت بھی تھی لیکن محض انتقام کے مارے اس نے اپنے چچا غضنفر بیگ کی لڑکی سے نکاح کر لیا اور مہدی قاسم خاں سے تعلقات منقطع کر لیے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے مہدی قاسم خاں کی لڑکی کو خیرآباد میں اس کے بھائیوں کے پاس بھیج دیا، اور جہاد کا ارادہ کر کے لکھنؤ سے اودھ کے راستے کوہ سوالک کا رخ کیا۔ کوہ سوالک کے بت خانوں کے متعلق یہ جھوٹی شہرت تھی کہ وہاں بت کدوں کی اینٹیں سونے اور چاندی کی ہیں اور بڑے بڑے خزانے جمع ہیں۔ سوالک کی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں اس نے یہ مہم اختیار کی۔

حسین خاں کا سوالک پر حملہ

پہاڑیوں کا طریقہ ہے کہ جب بھی کوئی ان کے علاقہ پر حملہ کرتا ہے تو وہ تھوڑا بہت مقابلہ کر کے پہاڑوں کے اندر پسپا ہو جاتے اور وہاں اونچی اونچی خطرناک پہاڑیوں پر مضبوط مورچہ بندی کر لیتے ہیں۔ حسین خاں بھی ان کو پسپا کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچا جہاں پیر محمد خاں کا بھانجہ سلطان محمود شہید ہوا تھا۔ اس جگہ شہیدوں کی بہت سی قبریں تھیں۔ حسین خاں نے شہداء کے لیے فاتحہ پڑھی اور ان کی شکستہ قبروں پر چبوترہ تعمیر کرایا اور پھر وہاں سے پہاڑوں کے اندر اور آگے تک پیش قدمی کی اور وہاں کے ایک بہت بڑے زمیندار راجہ رنگا کے علاقہ پر حملہ کر کے قصبہ وجرائیل تک کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کر دیا۔ وہاں سے اجمیر تک جو راجہ رنگا کا پایہ تخت تھا اور تبت کے مال و اسباب مشک، ریشم اور سونے چاندی کی بہت بڑی منڈی تھی، صرف دو دن کا راستہ رہ گیا تھا، لیکن جیسا کہ ان پہاڑوں کی خصوصیت ہے کہ گھوڑوں کے ہنہنانے نقارہ کی آواز اور آدمیوں کے شور کی وجہ سے سخت بارش ہونے لگی اور جلد ہی غلہ اور گھاس کا کال پڑ گیا، لشکری بھوکے مرنے لگے۔ حسین خاں نے اپنے لشکر کو اس شہر کے فتح کرنے کی بہت ترغیب دی اور وہاں کے زر و جواہر اور خزانوں کا بڑا لالچ دلایا لیکن لشکری ایسے بدحواس ہو چکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی اقدام کرنے اور لڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ واپسی کے وقت کافروں نے حسب معمول راستے روک دیے اور لشکریوں پر تیروں کی بوچھار کر دی، ان کے تیروں میں زہر آلود ہڈیوں کے پھل لگے ہوتے ہیں وہ لشکر کو جگہ جگہ گھیر گھیر کر سنگباری کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین خاں کے اکثر تجربہ کار اور جنگ آزما بہادر ان پہاڑوں میں شہید ہو گئے اور جو لوگ زخمی ہو کر واپس آئے وہ بھی پانچ چھ ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے۔ زہر کے اثر سے وہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اس واقعہ کی تاریخ "تلخ بے مزہ" نکالی گئی۔

حسین خاں کی ناکام واپسی

حسین خاں کوہ سوالک سے ناکام و نامراد دربار میں لوٹ کر آیا۔ اس نے پہاڑیوں سے انتقام لینے کے لیے بادشاہ سے کانت و گولہ کی جاگیر کے لیے جو اس پہاڑ کے دامن میں واقع ہے درخواست کی، بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس نے وہاں جا کر کئی بار پہاڑ کے دامن کے علاقوں پر حملہ کیا اور ان کو تہ و بالا کر دیا لیکن پہاڑ کے اندرونی علاقوں میں داخل نہیں ہو سکا۔ اس کے لشکر کے بہت سے آدمی جو پہلی مرتبہ موت کے پنجے سے بچ کر نکل آئے تھے اس مرتبہ وہاں کے زہریلے پانی کے اثر سے بغیر جنگ کے ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ چند سال بعد حسین خاں نے جان ہتھیلی پر لے کر کوہستان پر شد و مد سے حملہ کیا اور دور تک اندر چلا گیا، لیکن اسے ان خونی پہاڑوں میں سے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ تفصیل ہم انشاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے۔

بھائی اور بیٹے کا انتقال اسی سفر کے موقع پر میں حسین خاں سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بدایوں آگیا تھا۔ بدایوں آنے کے بعد میں نے اپنے مرحوم بھائی شیخ محمد کو جسے میں نے دل و جان سے پالا پوسا تھا اور وہ اپنے اخلاق و عادات میں نہایت سعادت مند لڑکا تھا، ایک اچھے گھرانے میں بیاہ دیا۔ یہ شادی، شادی نہیں بلکہ بربادی تھی کیوں کہ تین ماہ بعد ہی شیخ محمد اور میرا لڑکا عبداللطیف، بیمار پڑے اور ایک کے پیچھے ایک اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔" انا للہ وانا الیہ راجعون"

اس کے مرثیہ میں میں نے یہ ترکیب بند کہا تھا ؎

یارب ایں رفرچہ روز یست کہ افتاد مرا ویں چہ جانکاہ بلائیست کہ رو داد مرا

حال دل ہیچ ندانم بکہ گویم چہ کنم

چارۂ درد دل خود زکہ جویم چہ کنم

مقبرۂ ہمایوں کی تعمیر اسی سال دہلی میں جمنا کے کنارے میرک مرزا غیاث کے زیر نگرانی ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ آٹھ نو سال بعد مکمل ہوگیا۔ یہ عمارت واقعی نہایت حیرت انگیز اور پر فضا ہے۔

شاہزادہ مراد کی ولادت جمعرات کے دن تیرہ ماہ محرم ۹۷۸ھ کو شیخ سلیم کے مکان میں شاہزادہ مراد کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ نے سابقہ جشن کی طرح ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔ اس موقع پر قاسم ارسلان نے ایک قطعہ پڑھا جس کے ہر مصرع سے ان دونوں شاہزادوں کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ پہلے مصرع سے شاہزادہ سلیم کی اور دوسرے سے مراد کی قطعہ

اولین شاہزادہ آں تابندہ ماہ

ماہ وار از اوج عزت شد عیاں

آں دوم فرزند اکبر پادشاہ

آیتے نازل شدہ از آسماں

ایک دوسری تاریخ بھی اسی اسلوب پر ہے ؎

ز نور پاک چوں سلطاں شد نازل

لوائے شاہ مراد ابن اکبر عادل

خواجہ حسن مروی نے بھی سات شعر کا ایک قطعہ کہا جس کے پہلے مصرع سے بڑے شاہزادہ کی اور دوسرے مصرع سے چھوٹے شاہزادہ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ قطعہ ؎

داد دو شہزادہ بہ شاہ ایں سپہر چہرۂ آں ہر دو بہ ز آفتاب

اول از ثانی دشاہ جہاں ثانی از و دلبر عالی جناب

واں یکے از میں بہ شاہ سریر مژدہ رساں بود بہ صد فتح باب

آں دگرے باعث امن و اماں عہر زمہ دادہ باد و نہ خواب

مژدہ کہ مولود شہ از اول است گفتہ از و مصرع اولی جواب

از دو میں مصرع ابیات ہم — مولد شہزادۂ ثانی بیاب

بادا مدام آں شہ و شہزادہ را
جاہ سکندر فرا فراسیاب

قلعہ اجمیر کا سنگ بنیاد

فتح پور میں بادشاہ نے بارہ دن قیام کیا۔ اس کے بعد نذر گزارنے کے لیے اجمیر تشریف لے گئے اس مرتبہ وہاں ایک قلعہ کی بنیاد رکھی اور امراء کو عمارتوں کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ جمعہ کے دن چار جمادی الآخر کو وہاں سے کوچ ہوا اور بادشاہ ناگور پہنچے۔ اس شہر کے بڑے تالاب کو کھدوانے کے لیے امیروں کو مامور کیا گیا اور اس کا نام "شکر تلاؤ" رکھا گیا۔

اسی زمانہ میں حاکم مارواڑ مالدیو کا لڑکا چندر سین دربار میں حاضر ہوا۔ بیکانیر کا راجہ رائے کلیان مل بھی اپنے لڑکے رائے سنگھ کے ساتھ آیا، کلیان مل اپنی لڑکی کو پیش کش کے لیے لایا تھا چنانچہ وہ حرم میں داخل کر لی گئی۔ باپ کو تو بیکانیر واپس جانے کی اجازت مل گئی لیکن بیٹے کو خدمت شاہی میں ہمراہ رہنے کا حکم ہوا۔ راستہ میں بادشاہ نے گورخر کا شکار کیا۔ یہ شکار اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بادشاہ شیخ فرید گنج شکر کی زیارت کے لیے اجودھن کی طرف جو پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے گئے۔ وہاں مرزا عزیز کوکہ اعظم خاں جاگیر دار تھا، اس نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑا پر تکلف جشن منعقد کیا اور بادشاہ کے نذرانے میں نفیس اور قیمتی تحفے دیے۔ ایسی ضیافت کم ہی دیکھنے میں آئے گی۔

پٹن سے بادشاہ لاہور تشریف لائے اور حسین قلی خاں کے مہماں رہے، پھر حصار فیروزہ کے راستے دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں سے مسلسل کوچ کر کے فتح پور لوٹ آئے۔

بکھر کی فتح

میر خلیفہ کا لڑکا محب علی خاں پیشۂ سپاہ گری ترک کر کے عرصہ سے گھر بیٹھا ہوا تھا، اس کی بیوی ناہید بیگم کی سفارش پر جس کی ماں مرزا عیسیٰ خاں حاکم ٹھٹھہ کے عقد میں تھی، بادشاہ نے اسے علم و نقارہ عطا کیا اور ملتان میں جاگیر مرحمت فرمائی۔ حاکم ملتان سعید خاں مغل کو اس کی مدد کے لیے فرمان لکھا اور اسے اس کے پوتے مجاہد خاں کے ساتھ جو ایک دلیر اور بہادر نوجوان تھا ٹھٹھہ کو فتح کرنے کے لیے مقرر کر دیا۔ وہ دار الخلافہ سے ملتان آیا اور اپنی جاگیر کے انتظام کے لیے چار سو سوار مقرر کر کے بکھر کے حاکم محمد سلطان (سلطان محمود) کے پاس پیام بھیجا کہ "تم نے خود بارہا یہ بات کہی تھی کہ اگر تم یہاں آ جاؤ تو پھر کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ ٹھٹھہ کو فتح کر کے تمہارے سپرد کر دوں گا۔ یہ بات بادشاہ کے علم میں آئی تو انھوں تمہارے بھروسہ پر مجھے اس مہم کے لیے مقرر کر دیا ہے، اب مدد کا وقت آگیا ہے۔" اس نے جواب میں لکھا کہ "اگر تم جیسلمیر کے راستے سندھ کی فتح کا ارادہ کرو تو میں تمہارے لیے کمک روانہ کروں گا ورنہ میں بکھر سے اس فوج کشی کی اجازت نہیں دوں گا کیوں کہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔" اس کے اس انکار پر محب علی خاں اور مجاہد خاں نے ایک دوسرے راستہ سے بکھر پر حملہ کر دیا۔ سلطان محمود نے اپنے سارے لشکر کو ان کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ محب علی خاں کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی اور بکھر کی فوج شکست کھا کر ماتیلہ کے قلعہ میں محصور ہو گئی۔ آخر وہ قلعہ بھی صلح اور امان کی شرط پر محب علی خاں کو مل گیا۔ سلطان محمود نے بکھر کے قلعہ سے اپنے بقیہ لشکر کو توپچیوں اور تیر اندازوں کے ساتھ مقابلہ پر بھیجا۔ وہ بھی شکست کھا کر بھاگے اور قلعہ بند ہو گئے اس حملہ کے وقت قلعہ میں لوگوں کا

ایک اژدہام سا ہو گیا تھا۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے قلعہ کی ہوا خراب ہو گئی اور قلعہ والوں میں وبا پھوٹ پڑی۔ یہ وبا ایسی سخت تھی کہ روزانہ کم و بیش ہزار آدمی جان سے جا رہے تھے۔ ۹۸۳ھ میں اسی معرکہ کے دوران سلطان محمود جو کافی بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا فوت ہو گیا اور بکھر کا قلعہ بادشاہی فوج کے قبضہ میں آگیا۔ بادشاہ نے قلعہ کے ذخیروں اور مال و اسباب کی تحقیق کے لیے میر گیسو کو فتح پور سے روانہ کیا تھا۔

اسکندر خاں ازبک کی اطاعت اور وفات

اسکندر خاں ازبک پٹھانوں کو چھوڑ کر منعم خاں خانخاناں کے پاس امان طلب کرتے ہوئے آگیا۔ چنانچہ منعم خاں جون پور سے اس کو لے کر اسی سال دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے دونوں کو مرصع تلوار، چار پارچہ خلعت، سنہری زین والا گھوڑا انعام دیا اور اسکندر خاں کو لکھنو کی جاگیر مرحمت فرمائی۔ اسے خانخاناں کی کمک پر متعین کر کے جون پور کو رخصت کر دیا۔ اسکندر خاں نے لکھنو پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی دس جمادی الاول ۹۸۰ھ میں وفات پائی۔

میرا ایک دوست جمال ولد شیخ منگن بداؤنی جو نہایت حسین و جمیل شخص تھا، سنبل میں عید قربان کے دن تیر اندازی کر رہا تھا، اسے ایک اجنبی شخص نے پان کا بیڑا دیا۔ جیسے ہی اس نے یہ پان کھایا اس پر ضعف طاری ہو گیا اور فوراً ہی مر گیا۔ اس کی تاریخ وفات ہے:

صد آہ از جواں وزیب جمال خاں

شیخ رحم، شیخ یعقوب، صوفی کشمیری نے تاریخ کہی:

سپردہ جاں بروز عید قرباں

۹۷۹ھ میں آگرہ میں ایک شاندار محل اور اسی طرح فتح پور کے نئے شہر میں دوسرا محل بن کر تیار ہو گیا۔ قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ کہی ہے:

تمام شد دو عمارت مثل خلد بریں   بدور دولت صاحب قران ہفت اقلیم
یکے بہ بلدۂ دار الخلافت آگرہ   دگر بہ خطۂ سکری مقام شیخ سلیم

سپہر از پئے تاریخ ایں دو عالی قصر
رقم زدہ دو بہشت بریں بر ملک قدیم

شیخ سلیم چشتی کی وفات

اسی سال ماہ رمضان مبارک کے آخر میں شیخ سلیم چشتی فتح پوری نے جو ہندوستان کے برگزیدہ شیخ اور بلند مرتبہ بزرگ تھے، رحلت فرمائی۔ ان کا کچھ تذکرہ اسی منتخب کے آخر میں کیا جائے گا۔ ان کی ایک تاریخ وفات تو ہے "شیخ ہندی" اور دوسری ہے:

تاریخ وفات شیخ اسلام
شیخ حکما و شیخ حکام

خمیازۂ عشق

اس سال مجھے ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہوا کہ جس وقت محمد حسین خاں کو کانت و گولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصہ تک اس کی ملازمت میں اس جگہ رہا۔ مجھے اس صوبہ کی صدارت اور فقرا کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے مضافات میں بمقام مکن پور حضرت شاہ مدار کا مزار ہے میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا ہوا تھا۔

۱؎ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انسان کی سرشت میں غفلت وجہل ابوالبشر آدم سے وراثتاً چلا آرہا ہے۔ میں نے بھی انسان ہی کا کچا دودھ پیا ہے، خطا و نسیان سے بالاتر نہیں ہوں میری آنکھوں پر بھی غفلت وجہالت کا پردہ پڑ گیا اور یہاں ایک خوبرو کے کرشمہ دادا نے مجھے دام ہوس میں پھنسا دیا۔ میں اس حرص وہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ گزری گزری، اس درگاہ میں مجھ سے جو بے ادبانہ حرکت سرزد ہوگئی تو اس کا خمیازہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس دنیا ہی میں مل گیا۔ میرے معشوق کی قوم کے چند افراد نے حملہ کرکے مجھے زخمی کر دیا چنانچہ میرے سر ہاتھ اور کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے۔ دوسرے تمام زخم تو مندمل ہو گئے لیکن سر کا زخم بڑا گہرا تھا تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجہ تک پہنچ گئی تھی اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ گئی اور انگلی لٹکنے لگی تھی۔ بس جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس حادثہ کو جھیل گیا۔ قصبۂ بانگرمئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اسی بیماری او رمصیبت میں میں نے منت مانی کہ اچھا ہو جاؤں تو حج کروں گا، لیکن افسوس ایفائے عہد کی اب تک نوبت نہ آئی۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد میں وہاں سے کانت وگولہ چلا گیا۔ غسل صحت کے بعد ہی میں دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خان نے خدا اسے بہشت جاوداں عطا کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سردی سخت پڑ رہی تھی اس لیے سر کا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب[1] گز کا مرہم اور کھانے کے لیے گز کا حلوا تیار کرا دیا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا آیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس میں موت کے منہ میں جا کر نکل آیا۔ اسی دوران میں ایک دن میں نے کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں، وہاں باقاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے جس میں دیوانی کے کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں اور چوکیداروں کا ایک جتھا شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ہٹانے اور رعب داب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھنے لگا پھر اس نے کہا "یہ وہ شخص نہیں ہے"۔ اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی اور میں بہت شرمندہ ہوا۔ میں نے بچپن میں جو افواہ[2] سن رکھی تھی اس موقع پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔

بدایوں کی آتشزدگی

اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ اس حادثہ میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ سے بچ کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن آگ نے پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں تک پہنچ گئی، چنانچہ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے، بہت سے گر کر مر گئے اور جو بچے وہ معذور و اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے جس قدر پانی ڈالتے تھے اس کے شعلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔ میں نے اس آتش زدگی کو خود اپنی

---

[1] ایک درخت کا نام ہے جو ندی کے کنارے ہوتا ہے، اسے عربی میں طرفا اور ہندی میں جھاؤ کہتے ہیں۔

[2] مصنف نے "افواہ عام" کا لفظ لکھا ہے وضاحت نہیں کی، جاہل لوگ کہا کرتے ہیں "فرشتوں سے بھی غلطی ہو جاتی ہے" غالباً اسی طرف اشارہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ) [1] شاہ مدار: ان کا لقب بدیع الدین تھا، یہ شیخ محمد طیفوری بسطامی کے مرید تھے، ہمیشہ خلوت میں رہتے تھے۔ ہر پیر کو ملاقات کی اجازت تھی۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تو وہ کوئی نہ کوئی داستان سناتے۔ اس داستان میں ہر شخص کو اپنی مراد اور سوال کا جواب مل جاتا۔ انہی سے سلسلہ مداریہ کے لوگ منسوب ہے ہیں۔ مزار مکن پور میں ہے۔ ان بزرگ کا زمانہ شیر شاہ کے بعد کا ہے۔ سلطان ابراہیم شرقی (جون پور) کے زمانہ میں قاضی شہاب الدین نے ان سے مباحثہ و مجادلہ کیا تھا اور نتیجہ میں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ (ابوالفضل آئین اکبری دفتر سوم ص ١٧٣)

آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ اس کی لپیٹیں میرے کمان تک پہنچ چکی تھیں۔ اس حادثہ سے پہلے کا قصہ ہے کہ دوآبہ کا ایک مجذوب بدایوں آیا تھا میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا، تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا "اس شہر سے نکل جاؤ"۔ میں نے پوچھا "کیوں؟" مجذوب نے جواب دیا "یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے"۔ وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا اس لیے مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا ۔

چہ پرسی از بداؤں وز احوال پریشانش ۔۔۔ کہ آیات عذاب النار نازل گشتہ در شانش

گجرات پر فوج کشی

۹۸۰ھ میں گجرات فتح ہوا۔ گجرات میں بڑا انتشار اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے گجرات پر حملہ کی تیاریوں کا حکم دے دیا اور فوج کو حاضر ہو جانے کے لیے فرمان جاری کر دیے۔ گجرات کی مہم کے لیے ۲۰ صفر کو پایۂ تخت سے روانگی عمل میں آئی۔ ۱۵ ربیع الاول کو اجمیر میں لشکر نے چھاؤنی قائم کی۔ اجمیر میں بادشاہ نے پہلے تو حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی پھر دوسرے دن وہ میر سید حسین خنگ سوار کی زیارت کے لیے پہاڑ کے اوپر تشریف لے گئے۔ میر موصوف کی شان میں یہ شعر مشہور ہے ۔

شکر اللہ بدل تافت انوار جلی ۔۔۔ از حسین ابن علی بن حسین ابن علی

ان زیارتوں سے فارغ ہو کر بادشاہی ہراول میر محمد خان کلاں کی سرکردگی میں آگے روانہ کر دیا اور شاہی سواری مسلسل کوچ کر کے نویں جمادی الاول کو ناگور پہنچی۔

شاہزادہ دانیال کی ولادت

اجمیر کے قیام کے دوران میں چہارشنبہ کی رات کو دوسری ماہ جمادی الاول کو ایک مجاور شیخ دانیال کے گھر میں شاہزادہ دانیال کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ کو یہ خوش خبری ناگور کی دوسری منزل میں پہنچائی گئی۔ شیخ دانیال کی نسبت سے شاہزادہ کا نام دانیال تجویز کیا گیا۔ تاریخ ولادت ہے :

"بگفتا ناصر شرع نبی باد"

یہ تاریخ لفظ شریعت سے بھی نکلتی ہے ۔

سروہی کی جنگ

جب لشکر شاہی میرٹھ پہنچا۔ تو خبر ملی کہ سروہی کے مقام پر ایک راجپوت نے ایلچی گری کے بہانہ خان کلاں پر جمدھر (ہندوستان کا ایک مشہور ہتھیار) سے حملہ کر دیا۔ جمدھر خان کے سینہ میں اندر تک کھب گیا اور اس کی نوک شانہ کی پشت پر نکل آئی۔ لوگوں نے حملہ آور کو اسی وقت جہنم رسید کر دیا۔ خان کلاں کو گہرا زخم آیا تھا، لیکن خیریت ہوئی کہ وہ زخم دس پندرہ دن میں بھر گیا۔ جب لشکر سروہی پہنچا تو سوڈیڑھ سو راجپوتوں نے اپنی رسم کے مطابق کچھ نے تو بت خانہ میں اور کچھ نے راجہ سروہی کے محل میں جان دے دینے کا اقرار کیا اور مقابلہ پر نکل آئے۔ سب کے سب مارے گئے۔ حاکم دہلی مرحوم تاتار خاں کا لڑکا دوست محمد جسے "تاتارچہ" کہا جاتا تھا اسی جنگ میں شہید ہو گیا۔

اسی منزل میں بادشاہ نے بیکانیر کے رائے سنگ کو جودھ پور پر متعین کیا تاکہ گجرات کا راستہ محفوظ رہے اور کوکندہ و کوہلمیر کے حاکم رانا کیکا کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہ آئے۔ راجہ بھگوان داس کے لڑکے مان سنگھ کو ایک آراستہ فوج کے ساتھ ایدر کی طرف مقرر کیا گیا تاکہ وہ شیر خاں فولادی کے لڑکوں کا تعاقب کرے، جو اپنے اہل و عیال سمیت اس جانب جا رہے تھے ۔

احمد آباد کی فتح

پہلی رجب کو شہر پٹن کے سامنے شاہی لشکر نے کیمپ لگا دیا۔ پٹن سید محمود کے بھائی سید احمد خاں بارہہ کو جاگیر میں مرحمت ہوا۔ اسی مقام پر پٹھانوں کا تعاقب کرنے کے بعد مان سنگھ کافی مال غنیمت لے کر حاضر ہوا۔ بشیر خاں افغان، سلطان محمود گجراتی کے غلام اور وزیر مطلق اعتماد خاں کے ساتھ تقریباً چھ ماہ سے احمد آباد[1] کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اصل میں اعتماد خاں نے سلطان محمود گجراتی کے لڑکے مظفر کو مقید کر رکھا تھا اور اس کے نام سے خود حکمرانی کر رہا تھا۔ جب اسے اکبر کی فوج کشی کی اطلاع ملی تو محاصرہ اٹھالیا اور پٹھانوں کی جمعیت پراگندہ ہو گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بروز اتوار نو ماہ رجب کو سلطان مظفر بارگاہ شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے شاہ منصور وزیر کے جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے سپرد کر دیا اور اس کے خرچ کے لیے ماہانہ تیس روپیہ کی رقم منظور کی۔ بعد میں وہ شاہی قید سے بھاگ گیا، لیکن راجا سورت کے ہاتھوں قید ہو گیا۔ جس وقت راجہ نے اس کو گرفتار کر کے جوناگڑھ میں اعظم خاں کے پاس روانہ کیا تو اس نے راستہ میں اُسترہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ اس سلسلہ کے بقیہ حالات بعد میں بیان کیے جائیں گے۔

دوسرے دن اعتماد خاں، شاہ ابو تراب، سید حامد بخاری، اختیار الملک حبشی، ملک الشرق، وجیہ الملک، الغ خاں حبشی جہجار خاں حبشی اور گجرات کے دوسرے تمام امراء بارگاہ سلطانی میں باریاب ہوئے اعتماد خاں شہر احمد آباد کی کنجی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ بادشاہ نے اپنی ایک حرم کا لحاظ کر کے حبشیوں کو معتمد امرا کے سپرد کر دیا۔

جمعہ کے دن ۱۴ رجب کو احمد آباد کے ساحل پر خیمہ گاہ لگائی گئی، اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ کو سید محمود خاں بارہہ اور شیخ محمود بخاری نے شاہی بیگمات کو لشکر میں پہنچایا۔ بروز پیر دوسری شعبان کو لشکر نے احمد آباد سے کنھبایت کی طرف کوچ کیا۔ یہ فوج کشی ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے خلاف کی گئی تھی ان لوگوں نے عرصہ سے بھڑوچ، بڑودہ اور سورت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی موقع پر اختیار الملک حبشی جو گجرات کا نامی گرامی سردار تھا احمد آباد سے احمد نگر کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے بے اعتباری کی وجہ سے اعتماد خاں کو شہباز خاں کنبوہ کے حوالے کر دیا۔ شعبان کی چھٹی تاریخ کو کھنبایت کی بندرگاہ پر قیام ہوا اور چودہ تاریخ کو لشکر بڑودہ کے قصبہ میں پہنچا۔ بادشاہ نے گجرات کا سارا نظم و نسق میرزا عزیز کوکہ کے سپرد کر کے اس کو احمد آباد رخصت کر دیا۔

ابراہیم حسین مرزا سے مقابلہ

۱۷۔ ماہ شعبان کو خبر پہنچی کہ ابراہیم حسین میرزا نے قلعہ بھڑوچ میں رستم خاں رومی کو قتل کرا یا ہے اور اب وہ اس راستہ سے بھاگنا چاہتا ہے جو لشکر گاہ سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ بادشاہ

---

[1] احمد آباد: یہ شہر بڑودہ سے ساٹھ میل پر دریائے سابرمتی کے کنارے واقع ہے۔ ۸۱۰ھ/۱۴۰۷ء میں احمد شاہ والی گجرات نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا اس کا مادۂ تاریخ "خیر" ہے۔ احمد شاہ اور محمود شاہ بیگھڑا کے دور میں شہر نے بڑی ترقی کی گجرات کا دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے یہ دہلی کے بعد دوسرے درجہ کا شہر سمجھا جاتا تھا آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی، ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں اور مقبرے تھے۔ اکبر کے عہد تک احمد آباد صنعت اور تجارت میں بڑی رونق پر تھا، محمد شاہ کے عہد میں مرہٹوں نے اسے تباہ و تاراج کر دیا۔ ۱۸۱۷ء سے یہ انگریزی حکومت کے قبضہ میں رہا۔ انگریزی عہد میں اس کی آبادی تقریباً دو لاکھ تک رہی۔ شہر کے وسط میں احمد شاہ کی جامع مسجد بڑی عظیم الشان ہے اس کا طول ۰ گز عرض ۳۲ گز ہے۔ چھت کے ستون ۳۵۲ ہیں، ۱۵ گنبد ہیں، محمود شاہ بیگھڑا کی بیوہ رانی سپری نے ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں مسجد تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد ہندو اور مسلم طرز تعمیر کا مشترک نمونہ ہے اور احمد آباد کی سب سے زیادہ خوب صورت مسجد ہے۔ شہر کے مشرقی جانب "کانکریا" نام کا ایک بڑا تالاب ہے جو بڑی عمدہ سیرگاہ ہے یہ تالاب سلطان قطب الدین بن محمد شاہ گجراتی کی یادگار ہے۔ احمد آباد میں سوتی، ریشمی، طلائی اور نقرئی تار کا نہایت عمدہ کپڑا تیار ہوتا ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے "احمد آباد تین تاروں پہ لٹکتا ہے"۔ بیرون شہر دادہری کا کنواں، "شاہ عالم" "سرخیز" تاریخی یادگاریں ہیں۔ سرخیز شاہی سیرگاہ تھی تالاب کے کنارے سلطان محمود بیگھڑا اور اس کے بیٹے سلطان مظفر کا عالی شان مقبرہ ہے۔

نے شاہزادہ سلیم کی کمان میں لشکر کو اسی جگہ ٹھہرا لیا۔ خواجۂ جہاں، شجاعت خاں اور دوسرے امراء کو بھی لشکر کی نگہداشت کے لیے مامور کر دیا۔ شہباز خاں کو سورت پر متعینہ امیروں سید محمود بارہہ اور شاہ قلی خاں محرم کو بلانے کے لیے روانہ کر دیا اور ملک الشرق گجراتی کو بدرقہ پر مقرر کر کے میرزا ابراہیم حسین کی سرکوبی کے لیے بادشاہ نے یلغار کی۔ جب وہ مہندری ندی کے کنارے پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ چالیس سواروں نے ندی عبور کی اور دوسری طرف کی خبر لے کر آئے کہ میرزا ابراہیم حسین دوسرے کنارے پر قصبہ سرنال میں ٹھہرا ہوا ہے۔ امرائے شاہی نے ہتھیار سجا لیے۔ سورت پر متعینہ امیر بھی اسی رات آ کر لشکر سے مل گئے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کو ہراول پر متعین کیا اور ایک سو سپاہیوں نے ندی عبور کر لی۔

مرزا ابراہیم حسین کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے۔ اسے شاہی لشکر کی یلغار کی خبر مل گئی اور وہ سرنال کے قصبہ سے ایک دوسرے راستہ سے نکل گیا اور ایک جنگل میں پہنچ کر مقابلہ کی تیاری کرنے لگے۔ مہندری ندی کے کٹاؤ اور راستہ کی خرابی کی وجہ سے مان سنگھ ایک طرف نکل گیا اور بادشاہ کسی اور راستہ پر جا پڑے۔ آخر کار غنیم سے مڈبھیڑ ہوئی اور ابراہیم حسین میرزا نے بابا خاں قاقشال پر حملہ کر کے اس کے اوچھی دستہ کو کافی دور تک پسپا کر دیا۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مارے گئے۔ اسی موقع پر راجا بھگونت داس کا لڑکا بھوپت بھی مارا گیا۔ مخالفوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے بادشاہ کی جمعیت پر حملہ کر دیا۔ اس وقت بادشاہ ایک ناہموار تنگ مقام پر جو جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا ٹھہرے ہوئے تھے، حملہ آوروں میں سے تین شخص آگے بڑھے ایک نے راجہ بھگونت داس کا رخ کیا۔ راجہ نے جھاڑی کے پیچھے سے اس پر نیزہ پھینک کر مارا اور وہ زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ بادشاہ سب سے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے شخص نے ان پر حملہ کر دیا، لیکن وہ بادشاہ کے مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور بھاگ گیا۔ مقبول خاں، غلام سرخ بدخشی ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہوا پھر چاروں طرف سے بادشاہی لشکر نے میرزا ابراہیم حسین کی جمعیت کو گھیر لیا اور وہ مغلوب ہو کر میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ اس معرکہ میں اس کے بے شمار آدمی مارے گئے اور چونکہ رات ہو چکی تھی اس لیے بادشاہ نے لوگوں کو تعاقب سے روک دیا اور میرزا ابراہیم حسین چند گنتی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد نگر کے راستہ سروہی کی طرف چلا گیا وہاں سے وہ ناگور پہنچا۔ جب امرائے شاہی نے اسے شکست دے کر وہاں سے بھگایا تو دہلی کے راستے سنبل کے نواح میں چلا گیا۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہم آگے بیان کریں گے۔

قلعہ سورت کی فتح

بادشاہ اس معرکہ سے ۱۸ شعبان کو رخصت ہو کر بڑودہ میں لشکر سے آ کر مل گئے اور وہاں سے قلعہ سورت[1] کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ اس قلعہ کو گجرات کے وزیر خداوند خاں نے فرنگیوں کی روک تھام کے لیے

---

[1] سورت: یہ گجرات کا تجارتی شہر رہا ہے۔ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں شاہان گجرات نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ بحری تجارت کا یہ قدیم دروازہ تھا اس کا مادہ تاریخ ہے "بانہ آباد بندر سورت" یہاں ایران، عرب، شام اور روم کے باشندے آ کر آباد ہوئے شہر کے محلوں کے نام بھی انھی سے منسوب رہے ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں پرتگیزوں، فرانسیسیوں اور یورپ کی دوسری قوموں نے اسے اپنا تجارتی مستقر بنایا۔ انگریزوں کے سفیر نے ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں شہنشاہ دہلی سے یہاں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت لی یہی انگریزوں کی سب سے پہلی کوٹھی تھی اس کی آبادی ۱۰ لاکھ تک پہنچ گئی تھی بعد میں مرہٹوں کی تاخت و تاراج نے سورت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ۱۸۳۷ء میں یہاں خوفناک آتشزدگی ہوئی تھی۔ بعد میں بحری تجارت بمبئی منتقل ہو گئی تو سورت کی رونق ختم ہو گئی۔ انگریزی عہد میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آبادی نہیں رہی۔

سورت کا قلعہ تاریخی چیز ہے اس کو سلطان مظفر نے پرتگیزوں کی روک تھام کے لیے تیار کرایا تھا یہ اس دریا پر ہے جو سمندر سے جا کر مل جاتا ہے، سمندر سے ۱۲ میل پر واقع ہے۔ بدایونی نے سن تعمیر ۹۴۷ھ لکھا ہے صحیح تاریخ ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء ہے اس کا مادہ تاریخ ہے:

"سد بود بر سینہ و جان فرنگی این بنا"

سمندر کے کنارے ۹۴۷ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ چنگیز خاں کے مرنے کے بعد باغی مرزاؤں نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب گجرات فتح ہو گیا تو مرزاؤں نے اپنے اہل و عیال کو اس قلعہ میں ٹھہرایا اور وہاں کا نظم و نسق ہمایوں بادشاہ کے قورچی ہمزبان نامی کے سپرد کر دیا۔ یہ شخص شاہی ملازمت میں تھا اور غداری کر کے مرزاؤں سے جا ملا تھا۔ اس انتظام کے بعد وہ سارے ملک میں فساد مچاتے پھر رہے تھے۔ جب میرزا ابراہیم حسین کی شکست کی خبر قلعہ والوں کو ملی تو کامران مرزا کی لڑکی گلرخ بیگم جو ابراہیم حسین مرزا کی بیوی تھی اپنے لڑکے میرزا مظفر حسین کو ساتھ لے کر دکن کی طرف رخصت ہو گئی۔ میرزا مظفر حسین کو اس وقت بادشاہ کی دامادی کا شرف حاصل ہے۔ شاہ قلی خاں محرم اور صادق محمد خاں نے میرزا کے خاندان کا تعاقب کیا اور تھوڑا بہت مال غنیمت چھین کر لوٹ آئے۔

بادشاہ نے اپنے پہنچنے سے پہلے راجہ ٹوڈر مل کو قلعہ میں آمد و رفت کے راستوں اور دوسرے حالات کی تحقیق کے لیے روانہ کر دیا تھا اس نے تمام حالات کا جائزہ لے کر بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ قلعہ تھوڑے سے وقت میں بآسانی فتح ہو جائے گا۔ اس رپورٹ پر شاہی لشکر ۔ ماہ رمضان کو قلعہ پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ مورچے لگا دیے گئے اور حملہ کر کے قلعہ والوں کو بُری طرح تنگ کر دیا۔ دو ماہ کے عرصہ میں اونچے اونچے پشتے بنا کر توپچی اور بندوقچی اس غضب کی آتش باری کرنے لگے کہ قلعہ والوں میں سے کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بادشاہ نے دوسری جانب ایک تالاب کے کنارے قیام کیا اور مورچے آگے بڑھا کر پانی کا راستہ بند کر دیا۔ اب قلعہ والے ہر طرح مجبور ہو گئے۔ ہمزبان اور دوسرے محصور امیروں نے ایک طالب علم مولانا نظام الدین کو جو اچھا مقرر تھا امان طلب کرنے کے لیے بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ اسے امرا کی سفارش پر باریابی کی اجازت ملی اور بادشاہ نے قلعہ والوں کی درخواست قبول کر لی اور اسے امان کی خوش خبری دے کر رخصت کر دیا۔ قاسم علی خاں بقال اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ وہ قلعہ والوں کو تسلی دلاسا دے کر حضور میں لے آئیں، دیانت دار محرر بھی مقرر کیے گئے تاکہ وہ لوگوں کے نام لکھ لیں اور قلعہ کے مال و اسباب کو ضبط کر لیں۔ ہمزبان اور اس کے ساتھی جب حاضر کیے گئے تو بادشاہ نے ہمزبان اور اس کے چند ساتھیوں کو جنھوں نے محاصرہ کے دوران نہایت گستاخانہ کلمے کہے تھے تنبیہ و تادیب کی اور ان کو سرکاری کارندوں کے حوالہ کر دیا۔ بقیہ دوسرے اسیروں کو معاف کر دیا۔

یہ فتح ۲۳ ماہ شوال ۹۸۰ھ کو حاصل ہوئی۔ اس کی تاریخ میں اشرف خاں میر منشی نے یہ قطعہ کہا ہے ؎

کشور کشائے اکبر غازی کہ بے سخن   جز تیغ او قلاع جہاں را کلید نیست

تسخیر کرد قلعۂ سورت بہ جملہ   ایں فتح جز ببازوئے بخت سعید نیست

تاریخ فتح شد کہ عجب قلعہ گرفت

اینہا بدولت شہ عالم بعید نیست

دوسرے دن بادشاہ قلعہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے اور اس کی مرمت کا حکم دیا۔ اس معائنہ کے دوران چند بڑی بڑی دیگیں اور توپیں ملاحظہ سے گزریں جس وقت سلیمان سلطان خداوندگار روم نے گجرات کی بندرگاہوں کو فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا تھا تو اس نے یہ سامان سمندر کے راستہ روانہ کیا تھا۔ چند وجوہ کی بنا پر اس کی فوج واپس چلی گئی تھی اور اس وقت سے

وہ دیگیں سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ جب خداوند خاں نے سورت کا قلعہ بنوایا تو وہ ان میں سے چند دیگوں کو قلعہ میں اٹھوا لایا تھا جو باہر رہ گئی تھیں۔ انھیں بعد میں جوناگڑھ کے حاکم نے قلعہ میں پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ اس قلعہ میں جب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو آگرہ کے قلعہ میں پہنچا دی جائیں چنانچہ وہ وہاں پہنچا دی گئیں۔

قلعہ سورت کی تعمیر کا سبب

کہتے ہیں خداوند خاں نے یہ قلعہ فرنگیوں کی سرکوبی کے لیے تعمیر کرایا تھا، کیوں کہ یہ فرنگی مسلمانوں کو بہت ستانے لگے تھے اور مسلمانوں کے شہروں پر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ جس وقت قلعہ بننے لگا تھا تو انھوں نے جہازوں پر سے آتش باری کر کے تعمیر کے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ماہر انجینیروں نے سمندر کے اندر تک قلعہ کی دیواریں پہنچا دیں اور قلعہ کے اطراف میں گہری خندق کھود کر خشکی کے دونوں جانب پتھر، چونا اور پکی اینٹوں کی مستحکم دیوار بنا دی۔ اس فصیل کے ہر دو پتھروں کے درمیان لوہے کے قلابے لگائے گئے ہیں اور درازوں میں سیسہ پگھلا کر کنکر پتھر جما دیے ہیں اس دیوار کی بلندی خندق کی چوڑائی کے برابر بیس گز ہے اور طول ۳۵ گز ہے۔ چاروں دیوار کا عرض پندرہ گز ہے۔ قلعہ اس قدر بلند اور خوش منظر ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے۔ سمندر کی جانب قلعہ کے جو برج ہیں، ان میں فرنگیوں خاص طور سے پرتگالیوں کے طرز تعمیر کی طرح جھروکے بنائے گئے ہیں۔ فرنگیوں نے اس قلعہ کی تعمیر کے وقت بڑی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی تھی اور جنگ پر آمادہ ہو گئے تھے۔ آخر کار وہ مصالحت پر مجبور ہو گئے اور یہ شرط پیش کی کہ سمندر کی جانب جو حصہ ہے اسے ڈھا دیا جائے تو ہم ایک کثیر رقم دینے کو تیار ہیں۔ خداوند خاں نے اسلامی حمیت کی بنا پر ان کی پیش کش کو قبول نہ کیا اور ان کی ضد میں اس نے اس حصہ کو بہت جلد مکمل کرا دیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کی حکومت قلیج خاں کے لڑکے کو سپرد کی اور ۱۴ ذی قعدہ کو وہاں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس محاصرہ کے دوران چند قابل ذکر واقعات پیش آئے تھے، پہلا یہ کہ میرزا شرف الدین حسین جو دس سال سے برابر باغی ہو کر مارا مارا پھر رہا تھا ولایت بگلانہ کے راجہ بہارجیو کے ہاتھوں گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا۔ حاضر ہونے میں اس نے بے ادبی اور خود سری کا مظاہرہ کیا اس لیے اسے تنبیہ کر کے شاہی کارندوں کے حوالے کر دیا گیا۔

بروچ کی منزل میں چنگیز خاں کی والدہ نے جہجھار خاں حبشی کے خلاف چنگیز خاں کو ناحق قتل کرنے کے الزام میں استغاثہ کیا

---

۱ پندرھویں صدی عیسوی میں پرتگیزوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ سمندروں پر بزور اقتدار قائم کر کے بحری تجارت پر قابو رکھا جائے اور ساحلوں پر مقبوضات قائم کیے جائیں۔ سمندر پر انھوں نے کسی حریف کے نہ ہونے کی وجہ سے بآسانی اقتدار قائم کر لیا اور بڑے مضبوط بحری بیڑے بنا لیے۔ ان کے ابتدائی مرکز ہندوستان کے مغربی ساحل پر گوا مشرق اقصیٰ میں ملکا خلیج فارس پر ہرمز تھے۔ ترکوں کے تسلط کی وجہ سے عدن ان کے ہاتھ نہ آسکا۔ خلیج کمبے (کھمبایت) میں بھی ان کا جلد ہی عمل دخل ہو گیا کوچین، ملیبار اور کولمبو بھی ان کی دسترس میں تھے، اپنے اس وسیع بحری منصوبہ کے مطابق ضروری تھا کہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو اسی لیے وہ قلعہ سورت کی تعمیر کے خلاف تھے۔ سورت کے قلعہ نے پرتگیزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتدار کو جہازوں سے ساحل پر اترنے کا موقع نہیں دیا، لیکن یہ قلعہ بندیاں یورپ کی اس ہمہ گیر بحری یلغار کا صحیح جواب نہیں تھیں ضرورت تھی کہ شاہان ہند بھی بحری قوت کے فراہم کرنے پر توجہ دیتے، لیکن مدت دراز تک کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا۔ اکبر کے عہد میں سمندر پر اصولاً پرتگال کے حق فرمانروائی کو تسلیم کر لیا گیا تھا گو کہ وہ بھی بحر قلزم کو جانے والے جہازوں کے لیے پرتگیزوں سے اجازت نامہ لیتا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۵۷۰ء میں بیجاپور اور دوسری اسلامی ریاستوں نے گوا کے خلاف مشترکہ کارروائی کی تھی جو دیرپا ثابت نہ ہوئی ہندوستانی سمندر میں پرتگیزوں کا صرف ایک حریف تھا جو ملیبار کے بحری قزاقوں کا بادشاہ کنیل تھا۔ سولھویں صدی کے آخر میں اس نے "امیر بحر ہندوستان" کا لقب اختیار کیا اور مدتوں تک پرتگیزوں کو پریشان رکھا۔

اور قصاص کا مطالبہ کیا۔ اس معاملہ کی تحقیقات کرائی گئی۔ چونکہ قاتل نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا اس لیے اس کو ہاتھی کے پیر کے نیچے ڈال دیا گیا۔

باغیوں کے مشورے

اسی محاصرۂ سورت کے دنوں میں ابراہیم حسین میرزا شکست کھا کر سرنال سے پٹن گیا اور وہاں محمد حسین میرزا اور شاہ میرزا سے جا کر مل گیا اور قلعہ سورت کو بادشاہی فوج سے چھین لینے کے لیے ان مرزاؤں نے مشورہ کیا۔ طے پایا کہ ابراہیم حسین مرزا ہندوستان جا کر وہاں فتنہ برپا کرے اور محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا شیر خاں فولادی کے ساتھ مل کر پٹن کا محاصرہ کر لیں تاکہ بادشاہ ان کے مقابلہ کے لیے سورت چھوڑ کر احمد آباد آ جائیں۔

شیر خاں فولادی کی بہادری

حسب قرارداد جب مرزاؤں نے حملہ کیا تو سید احمد خاں بارہہ پٹن میں محصور ہو گیا اور بڑی دلیری سے لڑتا رہا۔ اس کی مدد کے لیے قطب الدین محمد خاں مالوہ اور چندیری کے جاگیرداروں کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ رستم خاں، عبدالمطلب خاں، شیخ محمود بخاری دہلوی وغیرہ بھی احمد آباد سے اعظم خاں کے ساتھ پٹن پہنچ گئے۔ مدد پر آنے والی فوج سے مقابلہ کے لیے محمد حسین مرزا، شاہ مرزا اور شیر خاں فولادی نے محاصرہ اٹھا لیا اور پٹن سے پانچ کوس کے فاصلہ پر پیش قدمی کر کے بادشاہی فوج پر حملہ کر دیا اور ایسی سخت لڑائی کی کہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ انھوں نے بادشاہی ہراول کو اعظم خاں کے میمنہ پر دھکیل دیا اور میسرہ کو بھی منتشر کر دیا۔ شاہی امرا نے بھی بڑی ثابت قدمی سے ان کی مدافعت کی، آخر کار میدان بادشاہی لشکر کے ہاتھ رہا اور مخالف فوج منتشر ہو گئی۔ اس وقت لشکری غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے اور خان اعظم چند ہمراہیوں کے ساتھ میدان میں ٹھہر گیا۔ شیر خاں فولادی افیون کھاتا تھا، افیونیوں کو ہمیشہ قبض رہتا ہے جس وقت جنگ ہو رہی تھی وہ طہارت خانہ چلا گیا تھا اس لیے افیون کی پینک اور قبض کی وجہ سے وہ اپنے دو تین ہزار آدمیوں کو لے کر اس وقت پہنچا جب کہ اس کے ساتھی بھاگ چکے تھے اور میدان خالی پڑا تھا اس نے آتے ہی شیخ محمد بخاری کے دستہ پر حملہ کر دیا۔ شیخ محمد بخاری نے آخر تک جم کر اس کا مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اعظم خاں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کی فوج نے چاروں طرف سے حملہ آوروں کو گھیر لیا اور شیر خاں فولادی بھی مجبور ہو کر بھاگ گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا کر مل گیا، جب اس سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنے ہی پیرزادہ (شیخ محمد بخاری) کو کیوں شہید کر دیا؟ تو اس نے جواب دیا "ہم نے یہ سنا تھا کہ تمام مغل سرداروں میں شاہ بداغ خاں اور ایک دوسرا سردار نہایت جم کر مقابلہ کر رہے ہیں انھیں کے گمان میں ہم نے شیخ محمد پر حملہ کیا اگر ہم کو اس کا یقین ہوتا کہ وہاں شیخ محمد ہے تو ہرگز اس کے قتل کا ارادہ نہ کرتے"۔

اس شکست کے بعد محمد حسین میرزا دکن کی طرف چلا گیا اور شیر خاں قلعہ جونا گڑھ میں وہاں کے حاکم امین خاں غوری کی پناہ میں چلا گیا یہ فتح ۱۸ ماہ رمضان ۹۸۰ھ میں حاصل ہوئی۔ اعظم خاں نے سید احمد خاں بارہہ کو بدستور سابق قلعہ پٹن پر ہی مامور رکھا اور خود سورت میں جا کر باریاب ہوا۔

اختیار الملک حبشی سرکاری محافظوں کی قید سے احمد آباد میں بھاگ گیا تھا اس کی گرفتاری کے لیے قطب الدین محمد خاں اور دوسرے چند امیر مقرر کیے گئے تھے۔ اختیار الملک بھاگ کر باغیوں سے جا ملا اور ادھر ادھر بعض مقامات پر اس نے قبضہ کر لیا۔ امرائے شاہی نے اس پر حملہ کر کے اسے وہاں کے قلعوں اور جنگلوں سے بھگا دیا اور سارے علاقہ میں تھانے قائم کر کے محافظ دستے مقرر کر دیے۔ یہ انتظام

کے بعد یہ لوگ اس وقت جب کہ لشکر سورت سے لوٹ کر محمود آباد پہنچا تھا دربار میں حاضر ہو گئے۔

گجرات سے واپسی

آخر ماہ ذی قعدہ میں بادشاہ احمد آباد پہنچے دس دن تک وہاں قیام رہا۔ احمد آباد کی حکومت بادشاہ نے اعظم خاں کے سپرد کی۔ اُمرائے اتکہ کو گجرات میں جاگیریں عطا کیں۔ مظفر خاں کو ڈھائی کروڑ کی جاگیر مرحمت ہوئی اور اسے مالوہ کا سارا علاقہ اجینؔ[1] اور سارنگ پور کی حکومت بھی تفویض کی گئی۔ اس انتظام کے بعد بادشاہ عید قربان کے دن احمد آباد سے روانہ ہوئے اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے محرم ۹۸۱ھ کو اجمیر واپس آئے۔ اس اثنا میں سعید خاں کا عریضہ آیا کہ مرزا ابراہیم گرفتار ہوا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی سال کی دوسری صفر کو سواریِ شاہانہ دار الخلافہ پہنچی۔

ابراہیم حسین مرزا کی شورش

ابراہیم حسین مرزا کا قصہ یہ ہوا کہ وہ گجرات سے ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے لیے سب سے پہلے میرٹھ گیا۔ وہاں ایک قافلہ کو جو آگرہ جا رہا تھا لوٹ لیا اور ناگور چلا گیا یہاں خانِ کلاں کا لڑکا فرخ خاں محصور ہو گیا۔ مرزا نے شہر کے باہر بستیوں کو لوٹ لیا اور ایک دن وہاں ٹھہر کر نارنول چلا گیا۔ ابھی وہ نارنول سے بیس کوس کے فاصلے پر تھا کہ اتفاق سے رام رائے اور رائے سنگھ جو گجرات کے راستہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیے گئے تھے، تقریباً ایک ہزار سواروں کے ساتھ جودھ پور سے یلغار کرتے ہوئے ناگور پہنچے اور فرخ خاں نے ان کے ساتھ میرزا کا تعاقب کیا اور موضع کھتولی کے نواح میں جا کر کیمپ لگا دیا۔ ان کی آمد پر مرزا وہاں سے بھاگ گیا اور شاہی فوج کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس طرف کو نکل گیا ہے اور کہاں ہے؟ فوج میں جو مسلمان تھے روزہ دار تھے وہ افطار کے ارادہ سے ایک تالاب کے کنارے ٹھہر گئے۔ میرزا کچھ دور تک جانے کے بعد لوٹ آیا اور دوسری ماہ رمضان ۹۸۰ھ کو ان پر شب خون مارا، دو طرف سے ان پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ ان لوگوں نے بھی ڈھالیں سنبھال لیں اور جم کر مقابلہ کیا۔ مرزا کے ساتھ سات سو سے زیادہ آدمی نہ تھے۔ جب بادشاہی دستہ نے دلیری سے حملہ کیا تو یہ مقابلہ پر ٹھہر نہ سکے اور منتشر ہو گئے۔ مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، اندھیری رات میں اس کی فوج قریوں اور دیہاتوں میں منتشر ہو گئی اور اس کے سپاہی جگہ جگہ گرفتار اور مقتول ہو گئے۔ ان میں سے ایک سو سپاہی فرخ خاں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور تہ تیغ کر دیے گئے۔ بعض زخمی ہو کر بہ مشکل مرزا سے جا کر مل گئے۔ مرزا نے تین سو آدمیوں کو لے کر لوٹ مار کرتے ہوئے گنگا اور جمنا کو عبور کیا اور اپنی سابقہ جاگیر پرگنہ اعظم پور پہنچ گیا۔ اب اس نے سوچا اگر میں سنبھل کے قلعہ میں جس کے عقب میں کماؤں کا پہاڑ ہے اور آگے گنگا جیسی خندق ہے چلا جاؤں اور وہاں ایک فوج فراہم کر لوں تو بہت سے لوگ میرے جھنڈے کے نیچے جمع

---

[1] اجین: سپرا ندی کے کنارے یہ شہر قبل مسیح سے آباد چلا آرہا ہے پہلے یہ مالوہ کے راجاؤں کا پایۂ تخت تھا راجا بکرماجیت کا بھی دار الخلافہ تھا اس کا قدیم نام "اونت کا پوری" ہے۔ اس کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے اور ہندوؤں کے سات مشہور تیرتھوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ شمس الدین التمش نے ۶۳۱ھ میں اسے پہلی بار فتح کیا تھا۔ یہاں کے حکمرانوں نے شہر مانڈو کو پایۂ تخت بنا لیا۔ اکبر کے زمانہ میں یہ دہلی کا صوبہ بن گیا۔ تیرھویں صدی میں یہ مہاراجی سندھیا دولت راؤ سندھیا مرہٹوں کے قبضہ میں رہا اب یہ ایک معمولی قصبہ ہے جس کی آبادی انگریزی عہد میں ۲۵ ہزار سے زیادہ نہیں رہی۔ ایک دروازہ "چوبیس کھنبا" نام کا ہے مشہور ہے کہ اسے راجہ بکرماجیت نے بنایا تھا۔ برہمنوں کی روایت ہے کہ اس عمارت میں جو جوگی رہتے تھے جو ہر روز ایک شخص کو دیوتا بنا کر شام میں اس کا خون پی لیتے تھے بکرماجیت نے ان جوگیوں کو قتل کرا دیا اس کی یادگار میں اس جگہ دسہرہ اور اشٹمی کے دن بھگوتی کا بڑا میلہ لگتا ہے۔ ایک قدیم مندر مہاکالی مہادیو کا مندر ہے یہ بھی بکرماجیت کی یادگار ہے اسے التمش نے گرا دیا تھا موجودہ مندر بعد کی تعمیر ہے اس کے علاوہ سپرا ندی کے گھاٹ رانی کا باغ، بھرتری کا گپھا، کالیادہ کا محل، بے نیر کی مسجد، جامع مسجد مشہور مقامات ہیں۔

ہو جائیں گے لیکن اس کا یہ خیال بس خیال ہی رہا کیوں کہ بادشاہی امیروں نے ہر طرف سے اس کے راستے روک دیے تھے۔

راجہ اودلیسر سے لڑائی

مہدی قاسم خاں، ابراہیم حسین مرزا کے دہلی آنے سے پہلے حسین خاں اپنی جاگیر کانت وگولہ میں بدایوں اور پٹیالی کے سرکشوں کی خبر گیری کے لیے گیا ہوا تھا اسی اثنا میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور راجہ بہار امل نے جو وکیل اور وزیر مطلق تھے فتح پور سے اس کے پاس خط بھیجا کہ ابراہیم حسین مرزا دو جگہ شکست کھا کر دہلی کے نواح میں آیا ہوا ہے اور پایۂ تخت بالکل خالی پڑا ہے اس لیے تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ۔ حسب طلب وہ دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت وہ موضع اودھ سے کوچ کر رہا تھا پرگنہ جلیسیہ سے اس کے پاس خبر آئی کہ راجہ اودلیسر نے جو بادشاہ کے جلوس سے برابر اب تک آگرہ کے نواح میں ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کرتا رہا ہے بادشاہی امراء کے خلاف فوج کشی کر دی ہے اور مردانہ وار حملہ کر کے بعض بہادر، تجربہ کار آدمیوں کو ہلاک کر دیا ہے اور اب وہ پرگنہ جلیسیہ میں موضع نراہی کے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔

خوفناک حملہ

ماہ رمضان کی پندرھویں دوپہر کو جب کہ اکثر لوگ روزہ سے متفرق ہو کر راستہ طے کر رہے تھے کہ اچانک گولی چلنے اور تیر چھوڑنے کی آواز آئی اور معاً لڑائی چھڑ گئی۔ راجہ اودلیسر نے گنواروں کی مدد سے اونچے اونچے درختوں پر تختے رکھوا کر مچانیں بنا لی تھیں، وہاں سے اس نے شاہی رسالہ پر بندوقوں اور تیروں سے آتش باری کر دی۔ اس اچانک حملہ سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے۔ ایک گولی حسین خاں کے زانو کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ زین پر سے جھک کر گھوڑے کی گردن پر ضعف کے مارے بے ہوش ہو گیا، وہ گر پڑتا لیکن بڑے حوصلہ سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور زین پر بیٹھ گیا میں نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے جو لوگ آس پاس تھے ان کو گولی لگنے کا علم تک نہیں ہوا وہ یہ سمجھے کہ روزہ کی وجہ سے غشی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے جانا چاہا تاکہ تیروں کی بوچھاڑ سے پناہ مل جائے۔ اسی حالت میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور خلاف عادت مجھے غصہ سے گھور کر دیکھا۔ جھٹکے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا باگ پکڑنے کا یہ کونسا موقع ہے؟ پھر اس نے فوج کو گھوڑوں سے اتر آنے کا حکم دیا۔ اسے اسی جگہ چھوڑ کر سب لوگ گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہو گئے۔ اس کے بعد ایسی سخت لڑائی ہوئی اور جانبین سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ ان کی گنتی محال تھی آخر کار اسلام کی برکت سے ان مٹھی بھر غازیوں کو شام ہوتے ہوتے دشمن پر فتح حاصل ہو گئی اور کافر گروہ در گروہ مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے، لڑتے لڑتے سپاہیوں کے بازو ایسے شل ہو گئے تھے کہ تلوار مارنے اور تیر چھوڑنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس گھنے جنگل میں کچھ اس طرح اژدحام ہو گیا تھا کہ دونوں فریق بھڑ گئے تھے اور دوست و دشمن میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا کمزوری اور ضعف کے مارے سپاہیوں میں شناخت و تمیز کا یارا نہ رہا تھا۔ بعض خدا کے ایسے بندے بھی تھے کہ اس سخت اور دشوار دن میں بھی اپنے روزہ کی حفاظت کرتے رہے۔ مجھ میں اتنی برداشت نہیں تھی، چنانچہ جب میں بالکل ہی بے طاقت ہو گیا تو میں نے ایک چلو پانی سے اپنے حلق کو تر کر لیا۔ بعض تو پانی نہ ملنے کے سبب پیاس سے مر گئے۔

حسین خاں کی فوج کشی

اس فتح کے بعد حسین خاں نے کانت وگولہ کا رخ کیا اور ان مقامات پر جنگی استحکامات عمل میں لائے اس وقت ابراہیم حسین مرزا سنبل سے پندرہ کوس پر لکھنو کے پرگنہ میں پہنچا ہوا تھا۔ حسین خاں باوجود زخمی ہونے کے پالکی میں سوار ہو کر میرزا کے مقابلہ پر بانس بریلی پہنچ گیا۔ مرزا حسین خاں کی بہادری سے بخوبی واقف تھا

اور جانتا تھا کہ اس سے لڑ کر وہ کسی حال بھی سرخرو نہیں ہو سکتا اس لیے وہ امروہہ کے راستہ لوٹ گیا۔ لکھنؤ کے نواح میں ہمارے اور اس کے لشکر کے درمیان سات کوس کا فاصلہ تھا۔ اگر اس وقت مقابلہ ہو جاتا تو اس صورت میں جب کہ حسین خاں زخمی تھا، معلوم کیا نتیجہ برآمد ہوتا مرزا سے اس موقع پر بڑی فاش غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے اس حال میں کہ حسین خاں کے لشکر کا نظام درہم برہم تھا اس پر حملہ نہ کیا۔

امرائے سنبل سے مشورے

سنبل کے قلعہ میں وہاں کا حاکم معین الدین خاں فرنخودی اور دوسرے جاگیر دار امرا ایک بڑی فوج کے ساتھ قلعہ بند ہو گئے تھے۔ جب آدھی رات کو انھوں نے حسین خاں کے نقارہ کی آواز سنی تو یہ سمجھ کر کہ مرزا ابراہیم حسین نے حملہ کر دیا ہے' بدحواس ہو گئے۔ جب لوگوں نے قلعہ کے نیچے جاکر آواز دی کہ حسین خاں مدد کے لیے آپہنچا ہے تو اس وقت کہیں جاکر دم میں دم آیا اور لوگ استقبال کے لیے دوڑے۔ دوسرے دن سب امیر شیخ الاسلام فتح پوری کے خلیفہ شیخ فتح اللہ ترین کے مکان پر جمع ہوئے اور طے پایا کہ سب لوگ گنگا کے کنارے تولک خاں قورچین بیگ، نورین خاں، رحمان قلی خاں، کاکر علی خاں اور دہلی کے ان تمام امیروں سے جاکر ملیں جو مرزا سے مقابلہ کے لیے گنگا کے کنارے آہار کے پرگنہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے مشورہ کے بعد جو کچھ طے پائے اس پر عمل کیا جائے۔ اس موقع پر حسین خاں نے کہا خدا کی شان، یہاں مرزا چند گنتی کے سواروں کے ساتھ پہنچا ہے اور سنبل کے قلعہ میں تمہاری تعداد اس کے مقابلے میں دگنی تگنی ہے پھر تم میں بیس تیس کے قریب قدیم تجربہ کار امیر اور سردار موجود ہیں اور تم لوگ مرزا سے ڈر کر آہار کے قلعہ میں جو ایک چوہے دان کی طرح ہے جاکر چھپنا چاہتے ہو۔ اس طرح تو مرزا دلیر ہو کر سارے حدود سرکار میں افراتفری پھیلا دے گا۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں، یا تو تم لوگ گنگا کو عبور کر کے ان چند پرانے قلعوں پر جو مرزا کے راستہ میں ہیں قبضہ کر لو اور اسے گنگا عبور کرنے نہ دو اور میں اس کے عقب سے پیشقدمی کرتا ہوں، پھر جو بھی ہو گا سامنے آجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے پہلے گنگا پار کر کے اس کا راستہ روک دیتا ہوں اور تم پیچھے سے حملہ کر دو، بس وفاداری کا یہی تقاضا ہے۔" حسین خاں کے اس دلیرانہ مشورے کو کسی نے قبول نہ کیا، مجبوراً حسین خاں ان سواروں کو لے کر جو اس کے ساتھ تھے آہار کے امیروں کے پاس چلا گیا اور ان کو بھی اس نے اس چھوٹے سے قلعہ میں آکر بند ہو جانے پر سخت لعنت ملامت کی اور ان کے سامنے بھی اپنی وہی تجویز رکھی اور کہا کہ اس وقت غنیم حدود سرکار کے وسط میں اس طرح آگیا ہے، جس طرح کوئی خرگوش لشکر کے درمیان گھر جائے۔ اگر ہم تیزی سے نقل و حرکت کریں تو اس مہم کو سر کر سکتے ہیں اور اس کو زندہ گرفتار کر سکتے ہیں اور اس فتح کا سہرا لازماً ہمارے ہی سر رہے گا۔ لشکریوں نے جواب دیا کہ ہم مخدوم الملک اور راجہ بہارمل کے حکم کے مطابق مرزا کو دہلی کے نواح سے بھگا کر سنبل تک لے آئے ہیں، اب یہاں سے ساری ذمہ داری سنبل کے صوبہ دار معین الدین احمد خاں اور اس علاقہ کے جاگیرداروں کی ہے، ہمیں تو صرف دہلی کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، مرزا سے جنگ کرنے کا نہیں۔

مرزا کا لگاتار تعاقب

اس اثنا میں خبر ملی کہ مرزا نے امروہہ پر حملہ کر کے تاخت و تاراج کر دیا اور اب وہ گنگا عبور کر کے لاہور کی طرف یلغار کر رہا ہے۔ حسین خاں نے جب امیروں کو اس طرح ٹال مٹول کرتے دیکھا تو فوراً ہی ان سے الگ ہو گیا اور یلغار کرتے ہوئے گڈھ مکتیسر پہنچ گیا تاکہ مرزا کو بغیر مقابلہ کیے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ بادشاہی امیروں میں سے ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ ہی ایسے امیر تھے جنھوں نے حسین خاں کا ساتھ دیا تھا لیکن جب وہ اس منزل پر پہنچا تو آہار کے امیروں نے

خط بھیجا کہ تم جلدی نہ کرو ہم بھی تمھارے ساتھ آرہے ہیں چنانچہ وہ سب طوعاً وکرہاً وہاں آکر حسین خاں سے مل گئے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ دیکھنے میں تو اچھی خاصی جمعیت تھی لیکن ان کے دل اندر ہی اندر پھٹے ہوئے تھے۔ ادھر مرزا بساط خالی پاکر بڑی بے خوفی سے اپنا مہرہ آگے بڑھائے جا رہا تھا اور راستہ میں جو بھی شہر پڑتا تھا اسے بری طرح لوٹ لیتا تھا۔ چنانچہ سننے میں آیا کہ اس نے پائل کے قصبہ میں مسلمان گھرانوں کو بری طرح تاخت وتاراج کر دیا اور اس قصبہ میں بارہ کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ دوسرے شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ حسین خاں مرزا کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دوسرے امیر بھی تعاقب میں شامل تھے یہاں تک کہ یہ سب آگے پیچھے سرہند جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر تو دوسرے تمام امیروں نے اپنے خیمے لگا دیے اور ٹھہر گئے لیکن حسین خاں بھلا کہاں ٹکنے والا تھا وہ اپنے آدمیوں کو لے کر جو پورے سو بھی نہیں تھے مذکورہ دو امراء کے ساتھ سرہند سے یلغار کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچ گیا۔ وہاں خبر ملی کہ مرزا لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے اور وہاں کے لوگ قلعہ بند ہو گئے ہیں۔

میرزا آگے بڑھ کر شیر گڑھ وجھنی تک جا پہنچا۔ اس وقت حسین قلی خاں نگرکوٹ اور قلعہ کانگڑہ کی تسخیر پر لگا ہوا تھا۔ جب اسے مرزا کے متعلق اطلاعات ملیں تو اس نے ہندوؤں سے مصالحت کر لی اور نگرکوٹ والوں سے پانچ من سونا اور بادشاہی خطبہ پڑھنے کی شرط پر صلح کر لی اور وہاں سے میرزا یوسف خاں عدلی کے غلام فتو مسند عالی، اسماعیل قلی خاں، راجہ بیربر اور دوسرے امیروں کے ہمراہ مرزا کے تعاقب میں یلغار کرتے ہوئے سنکرہ پہنچ گیا۔

شیخ داؤد قادری جھنی وال

حسین خاں دیوانہ سہی لیکن وہ ان تمام احمقوں سے زیادہ عقل مند تھا اس کو جب حسین قلی خاں کی پیش قدمی کی خبر ملی تو اس نے قسم کھائی کہ جب تک میں حسین قلی خاں سے جا کر مل نہ لوں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا، چنانچہ اس نے وہاں سے کوچ کیا، تلونڈی کے راستہ میں دریائے بیاہ (بیاس) کو عبور کیا اور یلغار کرتے ہوئے شیر گڑھ میں جھنی کے قریب پہنچا۔ وہاں اس نے حضرت غوث قطب الاقطاب شیخ داؤد قادری جھنی وال کی خدمت میں حاضری دی۔ جب محفل میں دستر بچھایا گیا تو حسین خاں نے اپنی قسم کا حوالہ دے کر کھانے سے معذرت چاہی، حضرت نے فرمایا "قسم کا کفارہ آسان ہے اور دوستوں کا دل دکھانا بڑی نادانی ہے۔" خاں نے اسی وقت ایک غلام کو آزاد کر کے کفارہ دیا اور کھانا تناول کیا اور حضرت کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ وہ رات اس نے اسی جگہ بسر کی اس وقت اس کے سارے لشکر کی مہمانی حضرت کے لنگر کی طرف سے کی گئی۔ گھوڑوں کے لیے حضرت کے خاص مزرعہ سے گھانس اور دانہ مہیا کیا گیا۔ حسین خاں نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔

میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار وفیوض دیکھے اور سنے ان کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا میں نے اس سلسلہ میں فی البدیہہ چند شعر کہے تھے جسے حضرت نے پسند فرمایا وہ شعر یہ ہیں:

اے منزہ نسبت ایجاد تو از ماء وطین — ذات پاک چوں پیمبر رحمۃ للعالمین
ہست اسم اعظمت داؤد از تاثیر آں — چوں سلیماں جن وانس آمد ترا زیر نگین

ثم وجہ اللہ یقین من نمی شد سالہا
روئے تو دیدم عیاں شد نکتہ عین الیقین

میرا تو ارادہ ہو گیا تھا کہ میں ترک دنیا کر کے حضرت کی خانقاہ کی جاروب کشی اختیار کر لوں لیکن حضرت راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ "بس اب تم ہندوستان چلے جاؤ"۔ مجبوراً میں ان سے رخصت ہو کر نہایت غمگین اور پریشان حال روانہ ہوا۔ خانقاہ سے نکلتے وقت غم کے مارے بے اختیار میری چیخیں نکل گئیں۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے باوجود اس معمول کے کہ ان کی خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی، چوتھے دن بھی مجھے رہ جانے کی اجازت دے دی اور مزید افادات مرحمت فرمائے اور جو باتیں بتائیں ان کی لذت سے دل اب تک مسرور ہے ؎

می روم سوئے وطن زیں درد دل بے اختیار ۔۔۔ نالہ دارم کہ پنداری بغربت مے روم

مرزا ابراہیم حسین کا فرار

حسین خاں ازبک جب طلنبہ کی منزل پر پہنچا تو اس نے حسین قلی خاں کے نام خط بھیجا کہ چونکہ میں چار سو کوس سے یلغار کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں اگر آپ مجھے بھی اس فتح میں شامل کر لیں اور ایک دن لڑائی میں توقف کریں تو یہ آپ کی محبت سے بعید نہیں ہے۔ حسین قلی خاں نے خوش آمدید کہا اور اس کے جلودار کو رخصت کر دیا، لیکن وہ اسی دن تیزی سے طلنبہ کے قصبہ کے باہر ملتان سے چالیس کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت میرزا اس کے حملہ سے بے خبر تھا اور شکار پر گیا ہوا تھا۔ میرزا کے کچھ آدمی تو کوچ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور بعض ادھر ادھر منتشر تھے۔ اس حال میں حسین قلی خاں نے ان پر حملہ کر دیا اور میرزا کے آدمی صف بندی نہ کر سکے۔ میرزا کے چھوٹے بھائی مسعود حسین مرزا نے آگے بڑھ کر حسین قلی خاں کی فوج پر حملہ کیا لیکن ناہموار زمین پر اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر پڑا۔ اسے اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ جب مرزا ابراہیم حسین شکار سے لوٹ کر آیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور دلیرانہ حملے کیے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً باگ پھیر کر فرار ہو گیا۔ فتح کے دوسرے دن طلنبہ سے حسین خاں اپنے اسّی نوّے سواروں کو لیے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے پہنچا۔ حسین قلی خاں نے جنگ کی ساری تفصیل اسے بتائی اور جس نے جو کچھ کارنامے انجام دیے، ایک ایک کر کے سنائے۔ حسین خاں نے کہا یہ تو سب ٹھیک ہوا لیکن دشمن زندہ بچ کر نکل گیا تم کو اس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا، جب تک وہ گرفتار نہ ہو مہم ادھوری ہی رہے گی۔ حسین قلی خاں نے جواب دیا ہم نگرکوٹ سے مسلسل یلغار کرتے ہوئے آئے ہیں اور کوہستان پر ہمارے لشکریوں نے بڑی دوڑ دھوپ کی ہے اور اب ساری فوج تھکی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ فتح ہر حیثیت سے مکمل فتح تھی اس لیے ہم نے مزید اقدام نہ کیا۔ اب دوسرے حوصلہ آزمائی کریں اُن کی باری ہے۔

مرزا ابراہیم کی گرفتاری

حسین خاں نے اس امید میں کہ اس کی یہ پانسو کوس کی مسلسل دوڑ دھوپ ٹھکانے لگ جائے اور کامیابی کا سہرا سر بندھے۔ حسین قلی خاں سے رخصت ہو کر آگے کوچ کر دیا، جو لوگ بہت زیادہ تھک گئے تھے ان کو اس نے ہاتھی اور نقارہ کے ساتھ لاہور واپس بھیج دیا اور اپنے ساتھ ایک مختصر سی جمعیت لے کر مرزا کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کے اور میرزا کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا کہ ایک رات میرزا نے اپنے چار سو سواروں کے ساتھ بیاس اور ستلج کے سنگم پر قیام کیا۔ اس وقت چھپل قوم کے آدمیوں نے جو ملتان کی پس ماندہ رعیت ہیں اس پر شبخون مارا اور تیر برسانے لگے۔ میرزا نے اپنے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ جن میں سے بعض زخمی اور اپاہج ہو چکے تھے اور بری طرح تھکے ہوئے تھے اس قوم سے مقابلہ کیا لیکن چھپل اس پر غالب آ گئے۔ اسی دوران میں ایک تیر مرزا کی گدی میں لگا اور منہ کو پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ جب معاملہ الٹ گیا تو اس کے آدمی میرزا کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ نکلے

لیکن وہ جہاں بھی گئے موت سایہ کی طرح ان کے پیچھے لگی رہی۔ میرزا کو اس کے دو قدیم غلاموں نے فوراً ہی قلندروں کا لباس پہنا دیا اور ایک طرف کو لے کر چلے گئے۔ مرزا نہایت کمزور ہو گیا تھا، اس لیے وہ اسے لے کر ایک گوشہ نشین درویش شیخ زکریا کے ٹھکانے پر رات گزارنے کے لیے پہنچے شیخ نے بہ ظاہر بڑی مہربانی کا سلوک کیا لیکن خفیہ طور پر ملتان میں سعید خاں کے پاس اس کی اطلاع بھیج دی۔ ع

ہر کجا گوشہ نشینی است دو مکرے ہست

سعید خاں نے اپنے غلام دولت خاں نامی کو اسے گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کر دیا۔ اور بادشاہ کے پاس اس گرفتاری کی اطلاع ایک عریضہ کے ذریعہ بھیجی جو بادشاہ کو گجرات سے اجمیر کو واپسی کے وقت ملی۔

حسین خاں کو جب مرزا کی گرفتاری کی خبر ملی تو وہ ملتان پہنچا اور سعید خاں سے ملاقات کی۔ اس نے مرزا سے ملنے کے لیے کہا تو حسین خاں نے کہا اگر ملاقات کے وقت میں تسلیمات بجالاؤں تو بادشاہ کی وفاداری کے خلاف ہو گا اگر ایسا نہ کروں تو مروت کے خلاف کہ مرزا دل میں کہے گا اس قلیچی کو دیکھو کہ ستو اس کے محاصرہ میں امان پانے پر تو اس نے جھک جھک کے سلام کیے تھے اور اب جب کہ ہم مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بے نیازی دکھا رہا ہے۔" جب مرزا کو اس کی اس بے تکلفانہ گفتگو کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا " وہ آئے اور بغیر تسلیمات کے کلام کرے اس کو سب کچھ معاف ہے" غرض حسین خاں ملنے کے لیے گیا اور باوجود اجازت کے وہ تسلیمات بجالایا۔ مرزا نے اس سے افسوس کرتے ہوئے کہا " ہم بغاوت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن جب جان پر بن گئی تو ہم اپنی جان ہتھیلی پر لے کر ایک غیر ملک میں چلے گئے وہاں بھی ہمیں چین سے رہنے نہ دیا گیا، تقدیر میں بہر حال یہ شکست لکھی تھی، لیکن کاش ہم تیرے ہاتھوں شکست کھاتے کہ تو بہر حال اپنوں میں سے ہے لیکن یہ ذلت حسین قلی خاں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی جو دین و مذہب کے اعتبار سے غیر ہے"۔

حسین خاں اس ملاقات کے بعد اپنی جاگیر کانت و گولہ کو واپس چلا گیا اور میرزا اسی قید میں کچھ عرصہ بعد زندگی کے بندھنوں سے رہا ہو گیا۔

کانت و گولہ سے حسین خاں دربار شاہی میں حاضر ہوا اور پنجاب سے حسین قلی خاں، مسعود حسین مرزا کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسرے اسیران جنگ کے ساتھ فتح پور میں لایا۔ یہ اسیر تین سو کی تعداد میں تھے، ان کے منہ پر گدھے سور اور کتوں کی کھال کی پٹیاں باندھ کر حضور میں لایا گیا تھا۔ ان میں سے چند کو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ قتل کرا دیا گیا اور باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ میرزا کے تقریباً ایک سو سرداروں نے جن کو خان کا خطاب حاصل تھا، شکست کے بعد ملتان کے راستہ میں حسین خاں کے پاس امان کی درخواست کی تھی۔ حسین خاں ان سب کو اپنے پرگنوں پر لے کر چلا گیا تھا، پھر اس نے ان کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ حسین قلی خاں نے ان لوگوں کا بادشاہ کے سامنے ذکر چھیڑ دیا۔ حسین خاں نے فوراً کہا چونکہ اسیروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے اس لیے میں نے اس جماعت کو بادشاہ پر تصدق کر کے چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے اس بات کو درگزر کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ کی۔ انہی دنوں سعید خاں ملتان سے میرزا ابراہیم حسین کے سر کو جسے مرنے کے بعد جسم سے جدا کر دیا گیا تھا لے کر بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کا سر ملاحظہ میں پیش کیا۔ ؎

ہر آں خاکے کہ از دست بادی	فریدونی بود یا کیقبادی
خوش آید ایں کشاورزی نمودن	فریدوں کشتن و خاقاں درودن

راجہ بیربر کی قدر و منزلت

سنہ ۹۸۰ھ میں حسین قلی خاں نے نگر کوٹ کا قلعہ فتح کر لیا۔ اکبر کو بچپن ہی سے برہمنوں مسخروں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بڑی موانست اور ربط و ضبط تھا، چنانچہ تخت نشینی کے آغاز میں ایک بھکاری برہمن برہما داس نامی جو مسخرا اور کبت گو تھا اور ہندوؤں کی مداحی کر کے زندگی بسر کیا کرتا تھا، کالپی سے بادشاہ کی خدمت میں آیا۔ یہ شخص چونکہ کافی چالاک اور ہوشیار تھا بادشاہ کا مزاج بھی اس سے ملتا تھا اس لیے بہت جلد اچھے مناصب پر پہنچ گیا اور بادشاہ کا ندیم خاص بن گیا۔ پہلے اسے کب رائے یعنی ملک الشعراء کا خطاب ملا بعد میں راجہ بیربر[1] یعنی نامور بہادر کا خطاب مرحمت کیا گیا۔

جب اکبر نگر کوٹ کے حاکم راجہ جے چند سے جو شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ناراض ہوا اور اسے قید کر دیا تو اس نے نگر کوٹ کا قلعہ راجہ بیربر کو جاگیر میں دے دیا اور لاہور کے حاکم حسین قلی خاں کو فرمان لکھا کہ نگر کوٹ پر قبضہ کر کے اسے راجہ بیربر کے حوالہ کر دیا جائے۔ حسب فرمان حسین قلی خاں نے پنجاب کے تمام امیروں میرزا یوسف خاں قزاق خاں کے لڑکے جعفر خاں اور فتو مسند عالی وغیرہ کو ساتھ لے کر نگر کوٹ کی طرف کوچ کیا اور پہلے دھمیری، گوالیار اور کوٹلہ کو جو نہایت بلند قلعہ ہے بزور شمشیر فتح کر لیا اور ملحقہ سارے علاقہ پر قبضہ کر کے وہاں محافظ مقرر کر دیے۔

نگر کوٹ پر حملہ

ان قلعوں کی فتح کے بعد حسین قلی خاں نے ایک دشوار گزار راستہ سے نگر کوٹ پر فوج کشی کی۔ اس راستہ کو میں نے بھی سنہ ۹۹۸ھ میں دیکھا ہے جب کہ میں نگر کوٹ کی سیر کے لیے گیا تھا۔ بلاشبہ یہ راستہ اس قدر خراب اور دشوار ہے کہ اگر کہا جائے کہ اس پر چڑھتے ہوئے چیونٹی کے پیر بھی پھسل جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خان نے اس راستہ سے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، ساز و سامان، بڑی بڑی توپیں اور دیگیں اوپر چڑھائیں اور قلعہ کانگڑہ کا محاصرہ کر لیا۔

جے چند کا لڑکا بدھی چند یہ سمجھ کر کہ اس کا باپ قید میں مر چکا ہے، قلعہ بند ہو گیا۔ نگر کوٹ کا مندر شہر کے باہر واقع ہے۔ یہ ہندوؤں کی بہت بڑی زیارت گاہ ہے، چنانچہ دور دراز سے لاکھوں بلکہ کروڑوں ہندو تہوار کے دنوں میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں اور ڈھیروں سونا روپیہ پیسہ کپڑے اور دوسری قیمتی اور نفیس چیزیں وہاں چڑھاوے کے لیے لاتے ہیں۔ حسین قلی خاں نے پہلے ہی حملہ میں اس مندر کو

---

[1] راجہ بیربر: اصل نام مہیش داس یا برہم داس اس کا باپ گنگا داس مادھو رام جو بر فرقے کا برہمن تھا۔ بیربر کا ایک بھائی موہن رائے چھوٹی عمر میں گنگا میں ڈوب کر مر گیا، دوسرا بھائی گنگا رائے سادھو بن کر نیپال کے جنگلوں میں چلا گیا تھا۔ تیرہ برس کی عمر میں باپ کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ بڑی عسرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ حسن اتفاق سے راجہ کالنجر کے ایک درباری جاہلی کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گئی جہیز میں کافی مال و دولت ملا اور بیربر کے دن پھر گئے۔ اسی رشتہ کی بنا پر اس کی مہاراجہ کالنجر کے دربار میں رسائی ہو گئی اور وہ اشلوک سنانے کبت پڑھنے پر مامور ہو گیا۔ اکبر کے دربار میں پہنچنے کے بعد اس کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بیربر کے لطیفے اور پہیلیاں بہت مشہور ہیں۔ ایک پہیلی ہے " من نرم ہیا اکھد کنگ جانک سنسار۔ بیربر میں کھبت انھل سمجھت نہیں گنوار "

یہ پہیلی بیر کے دانے کے متعلق ہے۔ بیربر اکبر کے نو رتنوں میں شامل تھا اور اس کا لقب "مصاحب دانشور" تھا۔ راگ راگنی میں بھی بڑی مہارت تھی۔ جب پشاور کے مغرب میں عدم آباد کے پٹھانوں پر مہم بھیجی گئی تو بیربر بھی اس مہم کے ساتھ گیا اور اپنی بے تدبیری کی وجہ سے ان گھاٹیوں میں مارا گیا۔ اکبر کو اس کی موت کا بڑا رنج ہوا۔ بیربر کی وفات سنہ ۹۹۳ھ میں ہوئی۔ اکبر نامہ اور اقبال نامہ جہانگیری میں اس کے دو لڑکوں کے نام ملتے ہیں۔ ایک ہر ہر رائے تھا جو خدمت شاہی میں رہتا تھا سنہ ۱۰۱۱ھ میں وہ شاہزادہ دانیال کی خدمت میں آ گیا۔ دانیال اسے بیربر ثانی کہا کرتا تھا۔

بڑے بیٹے کا نام لالہ تھا سنہ ۱۰۱۰ھ میں ملازمت چھوڑ کر گنگا کے کنارے وہ سادھو بن گیا۔ لوگوں میں بیربر اور ملا دو پیازہ کے لطیفے بڑے مشہور ہیں، لیکن یہ سب فرضی ہیں ان کی کوئی اصل نہیں۔

فتح کر لیا اور بہت سے پہاڑیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مندر کے گنبد پر سونے کا ایک چتر چڑھا ہوا ہے، اسے لشکریوں نے تیر مار مار کر چھلنی کر دیا۔ اب تک وہ تیر اس چتر میں لگے ہوئے ہیں۔ تقریباً دو سو کالی گائیں اس بت خانے کے نام پر چھوڑی ہوئی تھیں ہندو گائے کی بڑی تعظیم کرتے اور پرستش کرتے ہیں۔ اس بت خانہ کو انھوں نے دار الامان سمجھ کر یہ گائیں وہاں چھوڑ رکھی تھیں مسلمانوں نے ان گایوں کو ذبح کر دیا، اور عین تیروں کی بارش میں ان گایوں کے خون کو اپنے موزوں میں بھر بھر کر دینی حمیت اور تعصب کی وجہ سے مندر کی دیواروں پر چھڑک دیا۔ اس معرکہ میں مندر کے برہمن اور مجاور تو اتنے مارے گئے کہ شمار سے باہر تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے پابیگانے تمام ہندو بیربر کو جو بزعم خود ہندوؤں کا پیر بنا ہوا تھا بڑی لعنت و ملامت کرتے ہیں، کیوں کہ یہ آفت اس کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔

شاہی لشکر نے بیرونی شہر پر قبضہ کر لیا اور اونچے اونچے مورچے بنا کر بڑی توپوں سے راجہ بدھی چند کے محل پر گولے برسانے شروع کر دیے۔ گولہ باری سے تقریباً اسی آدمی ہلاک ہو گئے۔ بدھی چند اس ہلاکت سے بمشکل بچ سکا، پھر اس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی، قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے کہ میرزا ابراہیم حسین کی بغاوت کی خبر ملی کہ وہ لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے۔ علاوہ ازیں حسین قلی خاں کے لشکری بہت تنگدست ہو چکے تھے۔ انہی وجوہ سے خان نے صلح کی پیش کش کو منظور کر لیا اور اکبری وزن کے مطابق پانچ من سونا جو اس مندر کی ایک سال کی آمدنی کے مساوی ہے اور بہت سے قیمتی کپڑے اور ہر جنس کی نفیس چیزیں نذرانہ میں وصول کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔ اسی سال ماہ شوال میں اکبر کے نام کا خطبہ و سکہ اس علاقہ میں جاری ہوا اور راجہ جے چند کے دروازے پر ایک بلند مسجد کے محراب کو تعمیر کرایا گیا۔ اس کے بعد ہی حسین قلی خاں میرزاؤں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

جب وہ چماری کے قصبہ میں پہنچا تو مشہور بزرگ خواجہ عبد الشہید نبیرۂ خواجہ احرار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ نے اسے فتح کی بشارت دی اور اپنا خاص کپڑا بھی عنایت فرمایا یہ اسی دعا کی تاثیر تھی کہ یلغار کرتے ہوئے قصبہ طلنبہ میں پہنچا اور باغی مرزا پر فتح پائی، جس کی تفصیل ہم لکھ آئے ہیں ؎

سخت آزردہ ولانیم اثر خواہد کرد
در حق ہر کہ باخلاص دعائے بکنیم

حاکم بنگالہ کا انتقال

سلیمان کرانی بنگالہ کا حاکم جس نے اپنا خطاب "حضرت اعلیٰ" رکھا تھا، کافروں کے مرکز کٹک اور بنارس کو فتح کیا تھا، جگناتھ کو دار الاسلام بنا دیا تھا اور کامرو سے اڑیسہ تک کا علاقہ اس کی عملداری میں تھا، اسی سال فوت ہو گیا۔ اس کا لڑکا بایزید اس کی جگہ تخت پر بیٹھا لیکن پانچ چھ مہینے کے اندر ہی پٹھانوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کا چھوٹا بھائی داؤد بن سلیمان اس علاقہ پر قابض ہو گیا۔

اسی سال مشہور بزرگ شیخ نظام الدین امبیٹھی نے وصال فرمایا۔ ان کا کچھ تذکرہ مشائخین کے سلسلہ میں ہم آگے کریں گے۔

گجرات پر دوسرا حملہ

۹۸۱ھ میں بادشاہ نے گجرات کی شورشوں کو دبانے کے لیے دوبارہ سفر کیا۔ یہ سفر بادشاہ نے سانڈنی پر سوار ہو کر کیا۔ نو دن میں وہ یلغار کرتے ہوئے فتح پور سے احمد آباد پہنچ گئے اور اس گروہ سے جس نے اعظم خاں کو محصور کر رکھا تھا سخت لڑائی لڑ کر فاتح و مظفر جلد ہی دار الخلافہ واپس تشریف لے آئے۔

گجرات جانے کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے جب گجرات کو پہلی مرتبہ فتح کیا تھا تو احمد آباد خان اعظم کے سپرد کر دیا تھا۔ بادشاہی لشکر

کی واپسی کے بعد وہاں ہر مقام پر سرکشوں نے فتنہ و فساد مچانا شروع کیا یہاں تک کہ اختیار الملک گجراتی نے حبشیوں کی جمعیت فراہم کر کے احمد نگر اور اس کے اطراف کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ محمد حسین مرزا بھی دکن سے لوٹ کر آ گیا تھا اور سورت کو فتح کر لینے کے منصوبے باندھ رہا تھا چونکہ قلیچ خاں سورت میں قلعہ بند ہو گیا تھا اس لیے اس نے کھنبایت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اعظم خاں نے اختیار الملک کے خلاف فوج کشی کی۔ دونوں فریقوں میں احمد نگر اور ایدر کے درمیان کئی ایک لڑائیاں ہوئیں۔ اعظم خاں نے قطب الدین محمد خاں کے لڑکے نورنگ خاں کو سید حامد کے ہمراہ محمد حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے کھنبایت کی طرف روانہ کیا۔ اس فوج سے محمد حسین مرزا کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ اس نے پوری بہادری اور مردانگی سے غنیم پر حملے کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر وہ شکست کھا کر اختیار خاں کے پاس چلا گیا۔ شیر خاں فولادی کے لڑکے جھجھار خاں حبشی کا لڑکا بھی اس سے آکر مل گیا تھا اس لیے اختیار خاں کی فوجی طاقت بڑھ گئی اور اعظم خاں کے مقابلہ میں اس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ یہ سب ایک دوسرے راستہ سے یلغار کر کے احمد آباد پہنچنا چاہتے تھے، لیکن اعظم خاں تیزی سے کوچ کر کے احمد آباد پہنچ گیا اور بھروچ سے قطب الدین احمد خاں کو بھی بلا لیا۔ چونکہ اس کو اپنے بعض آدمیوں پر پورا بھروسا نہیں تھا اس لیے وہ احمد آباد میں قلعہ بند ہو گیا۔ گجرات کے تمام باغی بیس ہزار کا لشکر لے کر جس میں مغل گجراتی پٹھان، حبشی اور راجپوت شامل تھے، احمد آباد پہنچے، اور اس کا محاصرہ کر لیا ہر روز دونوں طرف سے سخت لڑائی ہو رہی تھی، خان کلاں کا لڑکا فاضل محمد خاں اسی معرکہ میں مارا گیا۔ خان اعظم ہر روز جنگی صورت حال لکھ کر دربار میں بھیج رہا تھا اور اس نے متعدد عریضے بادشاہ کی تشریف آوری کے لیے لکھے۔

بادشاہ نے دیوانی کے عمّال کو حکم دیا کہ ان امیروں کے لیے جو گجرات کی پہلی مہم میں شامل نہیں تھے۔ اس مہم کا ساز و سامان فراہم کر دیں اور ان جنگجو سپاہیوں کو جنھوں نے گزشتہ پورا سال سفر کی زحمتوں میں گزارا تھا اور خستہ حال ہو رہے تھے نقد روپیہ ادا کریں، پھر بادشاہ نے حسین قلی خاں کو خان جہاں کا خطاب عطا کیا اور اسے پنجاب کے امیروں کے ساتھ اسی صوبہ پر اور سعید خاں کو ملتان پر متعین کر دیا اور شجاعت خاں کو پیش خیمہ کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دیا۔

اونٹنیوں پر بادشاہی یلغار

بادشاہ بتاریخ ۲۴- ربیع الثانی کو تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر لیسا ور اور تودہ کے راستہ روانہ ہوئے۔ ایک سو کوس کی مسافت صرف دو دن میں طے کی۔ اسی مہینہ کی ۲۶ تاریخ کو سواری اجمیر پہنچ گئی، وہاں مزار کی زیارت کر کے اسی دن شام کو آگے کوچ کر دیا اور قصبہ بالیانہ میں پہنچ کر لشکر کا معائنہ کیا اور مختلف سمتوں پر فوجوں کو نامزد فرمایا۔ خان خاناں بیرم خاں مرحوم کے لڑکے میرزا خاں کو جو اب خانخاناں بن چکا ہے اور دکن کی مہم پر مامور کیا گیا ہے قول لشکر پر متعین کیا، اس کی مدد کے لیے سید محمود خاں بارہہ، صادق محمد خاں اور امرا کی ایک جماعت کو متعین کیا گیا۔ میمنہ کی سرداری میر محمد خاں کلاں کے سپرد ہوئی، میسرہ پر وزیر خاں کو مقرر کیا گیا، ہراول پر محمد قلی خاں اور ترخان دیوانہ متعین ہوئے۔ بادشاہ کے جلو میں تجربہ کار سو سوار تھے جنھیں ہزاروں سواروں میں سے منتخب کیا گیا تھا۔

تیسری جمادی الاول کو بروز منگل بادشاہی لشکر احمد آباد سے بیس کوس کے فاصلہ پر کری کے قصبہ میں جا کر اترا۔ باغیوں کی ایک فوج قلعہ سے نکل کر راستہ روکنے کے لیے مقابلہ پر آئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاہی فوج کی یلغار کی نذر ہو گئی، چونکہ قلعہ پر قبضہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لیے لشکر وہاں سے پانچ کوس اور آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے اس جگہ ستانے کے لیے

نزول فرمایا۔ نویں دن اس منزل سے کوچ ہوا اور احمد آباد سے تین کوس کے فاصلے تک بغیر باگیں کھینچے لشکر یلغار کرتا رہا۔ اس جگہ بادشاہ نے اسلحہ خانۂ خاص سے لوگوں کو ہتھیار تقسیم کیے اور سب لوگ پوری طرح ہتھیاروں سے آراستہ ہوگئے، بادشاہ نے اعظم خاں کو بلانے کے لیے پہلے ہی آصف خاں کو روانہ کر دیا تھا۔ اس وقت مخالف غافل پڑے ہوئے تھے، جب انھوں نے کرنا بجتا ہوا سُنا تو پریشان ہو کر گھوڑوں کی طرف دوڑے اور محمد حسین مرزا دو تین سواروں کے ہمراہ تحقیق کے لیے دریا کے کنارے پہنچا۔ اس طرف سے ترک سبحان قلی بھی دو تین آدمیوں کے ساتھ اس کنارے پر آیا ہوا تھا، مرزا نے پوچھا "بہادر یہ کس کی فوج ہے؟" اس نے کہا "شہنشاہ کی فوج ہے۔" مرزا نے کہا "میرے قاصدوں نے تو بادشاہ کو چودہ دن پہلے فتح پور میں چھوڑا ہے، اگر یہی بادشاہی فوج ہے تو وہ ہاتھی جو ہمیشہ جلو میں رہتے ہیں کہاں ہیں؟" اس کو جواب دیا گیا کہ نو دن کے اندر بھلا ہاتھی چار سو کوس کی یلغار کیسے کر سکتے ہیں۔

باغیوں کا زبردست حملہ

محمد حسین مرزا ایک آراستہ فوج کے ساتھ مقابلہ پر آیا اور اختیار الملک کو پانچ ہزار سوار دے کر اس نے خان اعظم کے مقابلہ پر بھیجا تاکہ وہ اسے قلعہ پر چڑھائی کرنے سے روک دے۔ بادشاہی فوجوں نے دریا کو عبور کر لیا۔ محمد حسین مرزا نے سبقت کر کے ڈیڑھ ہزار جاں نثار مغلوں کے ساتھ جن میں سے ہر ایک کو خان کا خطاب حاصل تھا اور وہ بڑے بڑے مناصب اور جاگیروں کے امیدوار تھے، بادشاہ کے ہراول پر جس کی کمان محمد قلی خاں اور ترخان دیوانہ کے ہاتھ میں تھی حملہ کر دیا اور اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ اسی وقت حبشیوں اور پٹھانوں نے یک لخت وزیر خاں کے میسرہ پر حملہ کر دیا، جولانگری کے مقام پر فریقین میں سخت خون ریز معرکہ ہوا ؎

بن نیزۂ و قبۂ بارگاہ	فرو شد بماہی و برشد بماہ
سپاہی کہ آں را کرانہ نبود	بانگشت لشکر بہاموں نمود

کمان کیانی در آمد بزہ
یکی گفت بستاں یکی گفت دہ

محمد حسین مرزا کی گرفتاری

ان دنوں اکبر ہر وقت سورۂ "یا معین" کا وظیفہ پڑھتا رہتا تھا۔ جب اس نے اپنے ہراول کو درہم برہم دیکھا تو وظیفہ چھوڑ کر خود ہراول کی کمک کے لیے آگے بڑھا اور دشمنوں کی صفوں کو زیر و زبر کر کے منتشر کر دیا۔ اس حملہ میں بہت سے آدمی مارے گئے۔ سیف خاں کوکہ بہادری سے بڑھ کر دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن پھر وہ جان بچا کر ان کے نرغہ سے نکل نہ سکا۔ محمد حسین مرزا نے پوری دلیری اور بہادری صرف کر ڈالی اور کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی لیکن جس کا نمک کھایا تھا وہ آخر پھوٹ کر نکلا، اس کا گھوڑا زخمی ہوگیا اور مجبوراً اسے میدان کارزار سے منہ موڑنا پڑا۔ جب وہ فرار ہو رہا تھا، تھوہر کی ایک جھاڑی اس کے سامنے آگئی۔ اس نے ایڑ لگا کر پھلانگ جانا چاہا لیکن موت نے اس کی باگیں تھام لی تھیں چنانچہ زین سے پھسل کر زمین پر آ رہا۔ ایک ترک سپاہی گدائی علی تاملی اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا، اس نے اپنے گھوڑے پر سے اسی دم جست لگائی اور اس کو دبوچ لیا اور گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے نرمی اور ملامت سے فہمائش کی اور اسے رائے سنگھ کے حوالہ کر دیا۔

وزیر خاں حبشیوں اور گجراتیوں کے مقابلہ میں بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا، لڑائی کا پلہ اس وقت ڈانواڈول ہی تھا کہ مخالفوں کو

محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا کی شکست کی خبر ملی۔ اس خبر کو سنتے ہی ان کے حوصلے گر گئے اور وہ میدان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ اسی طرح خان کلاں کی فوج نے شیر خاں فولادی کے لڑکے کو شکست دے کر بھگا دیا اور میدان دشمنوں کے وجود سے پاک ہو گیا۔

اختیار الملک کا اکبر پر حملہ

فتح کے بعد میدان کے کنارے ایک ٹیکرے پر بادشاہ نے قیام فرمایا اور بہادروں کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے لگے۔ اس موقع پر خلاف توقع اختیار الملک گجراتی پانچ ہزار سواروں کو جو خان اعظم کا راستہ روکنے کے لیے متعین کیے گئے تھے شہر سے لے کر نکلا اور جنگل کا راستہ کاٹ کر اچانک سامنے آگیا۔ بادشاہ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ سخت بدحواس ہو گئے اور ایک ہڑ سا مچ گیا۔ اکبر نے ایک دستہ کو تیر اندازی کا حکم دیا اور "سورن یا معین" کے نعرے لگانے لگا۔ بہادروں نے غنیم کی پہلی صف کو جو سب سے آگے تھی تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ جو لوگ بہادری کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے حسین خاں ان میں سب سے آگے تھا۔ بادشاہ نے اپنی خاص ہلالی تلوار جو ایک مشہور تلوار تھی اسے مرحمت فرمائی۔ اختیار الملک ایک ہی حملہ میں پسپا ہو کر بھاگ نکلا۔ اس کا گھوڑا بھی تھوہر کی جھاڑیوں میں جا کر پھنس گیا۔ سہراب بیگ ترکمان اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے بڑھ کر اختیار الملک کو گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر اختیار الملک نے سہراب بیگ سے کہا" اے جوان تو ترکمان معلوم ہوتا ہے اور ترکمان حضرت علی مرتضیٰ کے غلام اور ان کے فدائی ہوتے ہیں، میں بخاری سید ہوں اس لیے مجھے چھوڑ دے۔ سہراب بیگ نے جواب دیا میں تجھے کس طرح چھوڑ دوں تو اختیار الملک ہے اور میں نے تجھے پہچان کر ہی تیرے تعاقب میں خون پسینہ ایک کیا ہے، پھر وہ گھوڑے سے اُترا یا اور ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے گھوڑے کو کوئی دوسرا لے اڑا تھا، اس لیے وہ اس کے سر کو اپنے دامن میں چھپا کر حاضر ہوا اور بادشاہ کے سامنے یہ سوغات رکھ دی۔ بادشاہ نے اسے کافی انعام و اکرام عطا کیا۔ اس لڑائی میں تقریباً ایک ہزار سوار مارے گئے۔ بادشاہ نے عبرت کے لیے ان سروں کو جمع کرا کے وہاں مینارہ لگوا دیا۔

محمد حسین مرزا کا قتل

جس وقت اختیار الملک کا یہ ہنگامہ برپا تھا رائے سنگھ کے کارندوں نے محمد حسین مرزا کو ہاتھی سے اُتار کر دستی نیزوں سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کا اور اختیار الملک کا سر آگرہ کو بھیج دیا گیا ؎

چہ کنی سر گزشت طراری | سر گزشت از اجل شنو باری
تا بگوید بہ غافل کر و کور | بکہ دادم ز کرستیدم زور
خسرواں را چگونہ بستم دست | قصر ہا را چگونہ کردم پست
تا بگوید کہ گردناں را تن | چوں شکستم سر و تن و گردن

تا چو بر شنیدی از غرور ہی
دل بریں عمر بے وفا نہی

اعظم خاں سے ملاقات

اسی دوران میں اعظم خاں قلعہ سے نکل کر دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس سے بغل گیر ہو گئے اور اس کے دوسرے امیروں کا حال احوال پوچھتے رہے۔ اعتماد خاں کے مکان میں بادشاہ نے پانچ دن قیام فرمایا اور قطب الدین محمد خاں کو اس کے لڑکے نورنگ خاں کے ساتھ بھروچ اور چانپانیر کی طرف شاہ مرزا کی سرکوبی کے لیے متعین

کیا گیا۔ خان کلاں کو پٹن کی حکومت دی گئی اور وزیر خاں کو دولقہ اور دندوقہ کے علاقہ پر نامزد فرمایا۔ شاہ قلی خاں محرم راجہ بھگونت داس اور خان بخشی کے لشکر کو ایدر کے راستہ سے آگرہ اور فتح پور جانے کا حکم ملا کہ یہ لوگ اودے سنگھ کے علاقہ کو پامال کرتے ہوئے جائیں۔ اسی یلغار میں بدنگر کا شہر ان لوگوں کے ہاتھوں پر فتح ہوا۔

گجرات کا نظم و نسق

بادشاہ نے ۱۶ جمادی الاول کو احمد آباد سے کوچ فرمایا اور محمود آباد میں جاکر سلطان محمود گجراتی کے محل میں قیام فرمایا۔ دولقہ سے خان اعظم اور دوسرے تمام گجرات کے امرا کو اپنے اپنے مقام پر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مرزا غیاث الدین علی قزوینی بخشی کو آصف خاں کا خطاب عطا کیا۔ گجرات کی دیوانی اور بخشی گری کا عہدہ اس کے سپرد کیا گیا۔ تیسری جمادی الثانی کو بادشاہ اجمیر پہنچے، سانگانیر کی منزل سے راجہ ٹوڈرمل کو جو آگرہ میں ایک ہزار جہازوں اور کشتیوں کی تیاری کے سلسلہ میں ٹھہرا ہوا تھا گجرات کے مال غنیمت اور حساب کتاب کے لیے مقرر فرمایا۔ سات جمادی الآخر کو سواری شاہانہ پایۂ تخت پہنچی۔ اس ساری مہم میں ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔

اسی ماہ کی ۲۵ تاریخ کو شاہزادوں کی ختنہ کرائی گئی۔ رجب کی دوسری تاریخ کو شاہزادہ سلطان سلیم کو مولانا میر کلاں محدث ہروی کے پاس بسم اللہ کے لیے بٹھایا گیا۔ مولانا میر کلاں مشہور محدث میرک شاہ بن میر جمال الدین کے شاگرد تھے۔

اسی سال بادشاہ نے مظفر خاں کو سارنگ پور کی حکومت سے واپس بلاکر وزیر مطلق کے عہدہ پر مامور فرمایا۔ اس کے القاب میں جملۃ الملک کا خطاب کے بھی اضافہ ہوگیا۔ شیخ محمد بخاری جنگ پٹن میں اور سیف خاں احمد آباد کی آخری لڑائی میں مارا گیا تھا۔ ان دونوں کے قرضے تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے تھے۔ بادشاہ نے یہ قرض شاہی خزانے سے ادا فرما دیے۔

اکبر کی اجمیر کو روانگی

اسی سال بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو جو گجرات کی مالی رپورٹ تیار کر کے لایا تھا تلوار مرحمت فرمائی اور اسے لشکر خان بخشی کے ساتھ جسے ہندوستان میں اکثر لوگ "شر خاں" کہا کرتے تھے، بنگالہ کی مہم کا ساز و سامان کرنے کے لیے منعم خاں خانخاناں کے پاس بھجوا دیا۔ شہر اللہ کنبوی لاہوری کو شہباز خاں کا خطاب عطا فرمایا اور اسے میر بخشی کے عہدہ پر مقرر کر دیا۔ اس کی مہر کے لیے حسب ذیل سجع نکالا گیا تھا ؂

بہ یمن عنایات صاحب قرانی
رسیدم ز خدمت بہ شہبازخانی

انہی دنوں میر محسن رضوی جو دکن کی سفارت پر گیا ہوا تھا وہاں کے فرماں رواؤں کے عمدہ عمدہ تحائف لے کر حاضر دربار ہوا۔ اکبر نے بنگال کی فتح کے لیے دعا مانگنے اجمیر کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب وہ فتح پور سے چار کوس پر موضع دائرہ میں پہنچا تو خواجہ احرار کے پوتے خواجہ عبدالشہید میرزا شرف الدین کو رہائی دلانے کے لیے پہنچے اور اس کی سفارش کی، بادشاہ نے ان کی سفارش کو قبول نہیں کیا، اگرچہ تعظیم و تکریم میں کوئی کوتاہی نہ برتی، خواجہ نے بھی فاتحہ پڑھ کر بادشاہ کو رخصت کیا، لیکن دل میں رنجش تھی، اس لیے آزردہ خاطر واپس ہوئے۔ بادشاہ نے اجمیر سے سات کوس ادھر ہی پیادہ سفر شروع کیا اور ۱۲ ذی قعدہ کو مزار مقدس کی زیارت فرمائی۔

جشن شاہانہ

اسی مہینہ کی ۱۷ تاریخ کو آفتاب برج حمل میں داخل ہوا ؂

جرم خورشید چو از حوت درآید بہ حمل
اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

جیساکہ ہر سال اس خاص دن کی تعظیم میں عید منائی جاتی تھی، بادشاہ نے اس بار بھی ایک بڑا جشن منعقد کیا اور حاضرین محفل میں سے ہر گروہ کو ایک ایک لاکھ روپیہ عطا فرمایا۔ ۲۳ ماہ ذی قعدہ کو بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر پایۂ تخت پہنچے اور بنگالہ کے سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کشتیاں تیار کرنے کا حکم صادر کیا گیا، ان میں سے ایک کشتی شیر کے سر اور ایک دوسری مگرمچھ کے سر کی وضع کی تھی۔ یہ دونوں سمندری جہازوں کی طرح بڑی اور بلند تھیں۔

دربار اکبری میں رسائی

اس سال ماہ ذی الحج کے آخر میں میں حسین خاں کی ملازمت ترک کرکے بدایوں سے آگرہ پہنچا اور جمال خاں قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلہ سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔

ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی، پہلی حاضری میں ہی بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا اور ہم نشینوں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہی محفل کے علما کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا ڈنکا بجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے، کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے اور بحث مباحثہ کرکے اس کو نیچا دکھانے اور خود سربلند ہونے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا، اللہ کی عنایت سے قوت طبع ذکاوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے میں جلد ہی ان میں سے اکثر پر چھا گیا۔

جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا تھا بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے۔ میں نے اس پر بڑے چست الزامات لگائے جو بادشاہ کو پسند آئے۔ شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس میرا وسیلہ اور رسائی نہیں تھی اس لیے وہ مجھ سے کچھ ناخوش ہی تھا، وہ اس مناظرہ کے وقت میرے فریق کی ہی طرفداری کر رہا تھا اور وہی مثل سامنے آگئی،

سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا

بعد میں عبدالنبی کے ساتھ یہ پرخاش ختم ہو گئی اور ہماری آپس میں خوب نبھنے لگی۔ انہی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل کہ اس کے علم و عقل کا ستارہ اوج پر تھا، باریاب ہوا اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔

ہرن مینار

اسی سال اجمیر کے راستہ میں بڑی عمدہ اور بلند عمارتوں کی تعمیر انجام کو پہنچی۔ چونکہ اکبر درگاہ کا نہایت معتقد تھا اور ہر سال لازماً اجمیر کو جاتا تھا، اس لیے اس نے آگرہ سے اجمیر تک ہر منزل پر ایک محل بنانے کا حکم دیا تھا اور ہر کوس پر ایک ایک منارہ اور کنواں بھی بنوایا۔ بادشاہ نے اپنی زندگی میں جتنے ہرنوں کا شکار کیا تھا ان سب کے ہزاروں سینگ رکھے ہوئے تھے۔ یہ سینگ ہر منارہ پر بطور یادگار لگوا دیے۔ ان میناروں کی تاریخ "میل شاخ" ہوتی ہے۔ کاش اس کے بجائے باغ یا سرا بنوائی جاتی!

اسی سال شہباز خاں کنبو کی رائے پر "داغ" اور "محلہ" کی رسم کا آغاز ہوا۔ تمام ممالک محروسہ میں تحصیل کے "کروڑیوں" کا تقرر کیا گیا اور بادشاہ نے تمام ملک کے خالصہ ہونے کا حکم صادر فرما دیا۔ اس کا ذکر کچھ تفصیل سے آگے بیان کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

بنگال پہ فوج کشی

سنہ ۹۸۲ھ میں صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے بنگالہ کی فتح کے ارادہ سے کوچ کیا اور "نہنگ سر" نامی کشتی میں سوار ہوا۔ بنگال میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے وہ اس سفر کا سبب بنے۔ وہاں سلیمان افغان کررانی

جس نے اسلیم شاہ کے عہد سے بنگالہ کے سارے علاقہ پر قبضہ کرکے خود مختار حکومت قائم کر رکھی تھی، فوت ہو چکا تھا۔ اس کا لڑکا بایزید چند دن تک اس کا جانشین رہا، لیکن اپنی بدسلوکی کی وجہ سے اپنے بہنوئی ہنسو اور دوسرے امیروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد سلیمان کا چھوٹا لڑکا داؤد جو اس کا ولی عہد تھا بادشاہ بن گیا۔ اس نے بادشاہ بننے کے بعد اطاعت کی وہ روش ترک کر دی جس پر سلیمان کاربند تھا۔ دربار میں عریضے بھیجنے بھی بند کر دیے۔

بادشاہ کو سلیمان کے انتقال کی خبر سورت کے قلعہ میں ملی تھی۔ بادشاہ نے اسی وقت خان خاناں منعم خاں کو جو اس زمانہ میں جون پور میں تھا فرمان بھجوایا تھا کہ وہ داؤد کی گوشمالی کرے اور بہار کے ملک کو فتح کرلے۔ خان خاناں نے ایک بھاری لشکر لے کر حملہ کر دیا اور دو لاکھ روپیہ نقد اور قسم قسم کے نفیس تحفے پیش کش میں وصول کرکے مصالحت کرلی اور واپس آگیا۔

امیر الامراء لودھی کا قتل

اس وقت داؤد حاجی پور میں تھا۔ اس کا ایک سردار لودھی جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اور اڑیسہ کی حکومت اس کو تفویض کی گئی تھی، باغی ہو گیا تھا اور قلعہ رہتاس پر قبضہ کرکے خود مختاری کا دعویٰ کر رہا تھا۔ جگناتھ کے حاکم قتلو خاں کی مدد سے داؤد نے دو ہاتھی عطا کرنے کا اسے لالچ دیا اور بڑی تدبیر سے اس پر قابو پاکر قید کر دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ داؤد چند ساتھیوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اس وقت لودھی نے سلیمان کے ملازمین میں سے دس ہزار سوار اپنے ساتھ لیے اور داؤد کو ختم کر دینے کا ارادہ کرلیا۔ داؤد اسی وقت شہر میں لوٹ آیا اور فوج کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان میں تفرقہ پیدا کر دیا اور لودھی کو حسن تدبیر سے گرفتار کرکے اس کے سارے مال و اسباب کو ضبط کرلیا۔ لودھی کو اپنے قتل کا کامل یقین ہو گیا تھا لیکن اس آخر وقت میں بھی اس نے داؤد کو خیر خواہی کے طور پر نصیحت کی اور کہا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کو میرے قتل کے بعد بڑی پشیمانی ہوگی اور اس وقت پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میں ایک تدبیر سمجھاتا ہوں اگر تم اس پر عمل کروگے تو فتح تمہارے قدم چومے گی۔ اس سے پہلے دو لاکھ روپیہ دے کر مغلوں سے میں نے صلح کرا دی ہے اس صلح کے بھروسے پر اطمینان سے بیٹھے نہ رہو کیوں کہ مغل اس تھوڑی سی رقم پر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اس لیے خود پہل کرکے مغلوں کے خلاف دلیرانہ فوج کشی کر دو، یاد رکھو جو بھی پہل کر جائے گا وہی کامیاب رہے گا۔"

داؤد نے اس کی باتوں کو غرض آمیز سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور خانخاناں کی اس گرگ آشتی پر جو فقط دکھاوا تھی بھروسا کرکے اس نے اپنے خیر خواہ لودھی کو قتل کرا دیا۔ اس کو قتل کرکے اس نے اپنے پیر پر آپ کلہاڑا چلایا، اس کی حکمرانی پر بس اسی وقت سے زوال آگیا۔ خانخاناں کو جیسے ہی یہ خبر ملی اس نے پٹنہ اور حاجی پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت داؤد کو لودھی کی قدر ہوئی اور وہ اس کے قتل پر بڑا نادم ہوا، لیکن اب اس سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

بادشاہی فوجوں کے مقابلہ پر داؤد نے پٹنہ کے قلعہ کی مرمت کرائی اور لڑائی چھڑنے سے پہلے ہی اس میں قلعہ بند ہو گیا لیکن اس کی بدمستی اور بے تدبیری کی وجہ سے اس کے اکثر امیر اس سے علٰحدہ ہو کر منتشر ہو گئے۔

دلچسپ دریائی سفر

بادشاہ نے مذکورہ تاریخ پر میرزا یوسف خاں کو لشکر کی سرداری پر مامور کرکے خشکی کے راستہ روانگی کا حکم دے دیا اور شہاب الدین احمد خاں کو آگرہ کی حفاظت پر چھوڑ کر خود دریا کے راستہ روانہ ہو گئے۔

اس موقع پر میں نے یہ رباعی کہی تھی:

شاہنشہ دادگستر دین پرور — جمشید جہاں ستاں محمد اکبر
بنشست برُوئے بحر چوں سکندر — ہم بحر بہ فرمان وُے آمد ہم بر

اس مہم میں بڑے شاہزادہ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے، اس وقت دریا پر اتنی کشتیاں اور ڈونگے تھے کہ دریا کی سطح نظر نہیں آرہی تھی۔ ملاح اپنی مخصوص زبان میں بڑی خوش آوازی کے ساتھ الاپ رہے تھے، ان کے گیت ایسے سریلے تھے کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سارا منظر اتنا دل کش تھا کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ روزانہ کشتیوں سے اُتر کر سیر و شکار کیا جاتا تھا اور رات میں جب لنگر ڈال دیے جاتے تو علمی مباحثے اور شعر گوئی کی محفلیں جمتیں اور آپس میں بڑی دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

الہ آباد میں قیام

۲۳۔ ماہ صفر کو پیاگ عرف الہ آباس (الہ آباد[1]) میں جہاں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے، منزل کی گئی۔ یہاں کے مندر میں ہندو حصول ثواب اور مشاہدۂ تناسخ کے لیے طرح طرح کی سخت ریاضتیں کرتے ہیں۔ بعض تو اپنے سر آرہ کے نیچے دے دیتے ہیں، بعض اپنی زبان کٹوا لیتے ہیں اور بعض کسی اونچے درخت سے دریا میں گر کر جان دے دیتے ہیں۔

یہاں پہنچنے پر بادشاہ نے ایک عالی شان عمارت کی تعمیر کا حکم دیا اور شہر کا نام الہ آباد رکھا۔ بنارس پہنچنے کے بعد شیر بیگ قورچی کو ایک تیز رفتار کشتی میں بٹھا کر خانخاناں کے پاس بھجوایا۔

دوسری ماہ ربیع الثانی کو یحیٰی پور کے موضع سے جو جون پور کے مضافات میں ہے اور جہاں گودی ندی گنگا میں آکر ملتی ہے، شاہزادہ، حرم شاہی، صدر الصدور اور قاضیوں کی کشتیاں گودی کے چڑھاؤ پر جون پور کی طرف روانہ ہوگئیں۔ بادشاہ بھی دو تین منزل تک ان کے ساتھ جاکر لوٹ آئے۔ اسی منزل میں سلطان محمود بکری کے فوت ہونے اور اس کے علاقہ پر محب علی خاں کے قابض ہو جانے کی اطلاع ملی، پھر خانخاناں کے حسب التماس بادشاہ نے گنگا میں تیزی سے سفر شروع کیا۔

ماہ مذکور کی چھ تاریخ کو لشکر خشکی کے راستہ سے چل کر غازی پور کے شہر میں شاہی قافلہ سے آملا۔ اسی منزل میں خان خاناں کے پاس سے اعتماد خاں خواجہ سرا حاضر ہوا اور خان خاناں کے لشکر کے تمام حالات تفصیل سے گوش گزار کیے اور عجلت سے روانگی کی استدعا کی۔

سید میر منجم کی پیشین گوئی

اس ماہ کی ساتویں تاریخ کو سید میر کی اصفہانی منجم نے جو خان زماں کی شکست کے بعد سے جون پور

[1] الہ آباد: دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے ہندوؤں کا مشہور تیرتھ ہے، پہلے اسے پراگ کہتے تھے پھر الہ باس نام پڑا، اکبر نے الہ آباد رکھا۔ اس جگہ گنگا اور جمنا کا سنگم ہے۔ ہندو سرسوتی جو پنجاب کے ریگستان میں غائب ہوگیا ہے کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بھی اسی جگہ نمودار ہوکر مل گیا ہے۔ ان تین دریاؤں کے ملاپ کی وجہ سے اس سنگم کو "تربینی" کہا جاتا ہے راجہ رام چندر جی نے پراگ میں پناہ لی تھی اشوک نے بدھ مذہب کے احکام لکھا کر اس جگہ لاٹھ نصب کی تھی جو اب تک قلعہ میں ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں عرصہ تک یہ کڑہ کا ماتحت شہر رہا۔ اکبر نے ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں جمنا کے کنارے شاندار قلعہ بنوایا اور اسے صوبہ کا دار الحکومت قرار دیا۔ مغل سلطنت کے زوال پر بندھیلے، مرہٹے اور نوابان اودھ نوبت بنوبت اس پر قابض رہے۔ ۱۸۰۱ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا، ان کے زمانہ میں تقریباً دو لاکھ تک آبادی رہی، یہاں صوفیائے کرام کے متعدد دائرے ہیں۔ ایک دائرہ میں مشہور شاعر ناسخ کا بھی گھر تھا وہ کہتے ہیں:

پھر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم — آئی کہاں سے گردش پرکار میرے پاؤں میں

قدیم عمارتوں میں خسرو باغ اور قلعہ ہیں، ہر سال دریا کے کنارے کنبھ کا بھاری میلہ لگتا ہے جس میں لاکھوں زائرین جمع ہوتے ہیں۔ بادشاہی زمانہ میں الہ آباد سے متعلق حسب ذیل شہر تھے: غازی پور، بنارس، جون پور، قلعہ چنار، قلعہ کالنجر، کڑہ مانک پور، الہ آباد کے امرود مشہور ہوتے ہیں۔ اردو کے شاعر اکبر اور نہرو خاندان اسی شہر کا رہنے والا ہے۔

ہی میں مقیم تھا، نقیب خاں کی فرمائش پر نجوم کی کتاب اعظم کا مطالعہ کیا اور مرکب و مرتب حروف کا استخراج کر کے اس نے فال نکالا تو یہ شعر برآمد ہوا ؎

بزودی اکبر از بخت ہمایوں　　　برد ملک از کف داؤد بیروں

حسن اتفاق کہ جو کچھ پیش آیا اس فال کے مطابق پیش آیا۔ واپسی میں جب جون پور میں بادشاہی لشکر نے کیمپ لگایا تھا تو سید موصوف دربار میں حاضر ہوا، پھر نجوم سے فال نکالی۔ اس وقت یہ شعر برآمد ہوا ؎

مژدۂ فتح بناگاہ رسد　　　سر داؤد بدرگاہ رسد

میری اس ماہر نجوم سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی، میں نے اس علم کے سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کر لیا اور کہا "یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابجائی لازمی ہے۔ آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسرے فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسے فال برآمد کر سکتا ہے۔ اس کا مجھے مشاہدہ بھی ہوا، بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا اور انہی دنوں سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقہ کو سیکھ لیا۔ نجومیوں کے متعلق عارف جامی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جفرداں زمانہ مست جنب　　　پیش بنہادہ زیں مقولہ کتب
نہ از احوال عاقبت ترساں　　　نہ از اسباب عافیت پرساں
چند حرفے نوشتہ پہلوئے ہم　　　وز عدد زیر شاں نہادہ رقم
بستہ با خود تخیلے باطل　　　یک سر از حلیۂ خرد عاطل
مرد را وقت اہل دل را دق　　　چیست این جفر جعفر صادق

جعفر صادق از تو بیزار است
صادقاں را زکاذباں عار است

شاہی بجرہ جوسر میں

۲۰ ماہ ربیع الثانی کو جوسر میں منزل کی گئی، یہاں خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ پٹھانوں کے سربرآوردہ امیر عیسیٰ خاں نیازی نے جو بہادری اور شجاعت میں کافی مشہور ہے، پٹنہ کے قلعہ سے جنگی ہاتھی اور ایک بھاری جمعیت لے کر شاہی فوج پر حملہ کر دیا تھا، لیکن بادشاہ کے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان دنوں شہاب الدین احمد خاں کا بھائی محمد معصوم بن ہاشم خاں خان خاناں کے لشکر میں تھا اور اس کا لڑکا بادشاہ کی خدمت میں کشتی پر رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس سے روزانہ لشکر کے حالات معلوم کرا کے بادشاہ کو سنایا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے بادشاہ کی خدمت میں بڑا تقرب حاصل کر لیا تھا یہاں تک کہ اس کو نیابت خاں کا خطاب مل گیا، لیکن بعد میں چل کر کون سی ایسی بغاوت تھی جو اس نے نہیں کی اور بغاوت کا کون سا ایسا پھل تھا جو اسے چکھنا نہ پڑا۔ اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ آگے بیان کریں گے۔

قلعہ حاجی پور کی فتح

اس مہینہ کی سولہ تاریخ کو پنج پہاڑی کے مقام پر جو کہ پٹنہ سے دو تین کوس پر واقع ہے، قافلہ پہنچا۔ یہاں پانچ بلند گنبد ہیں جن کو پہلے زمانہ میں کافروں نے پکی اینٹوں سے بنوایا تھا۔ بادشاہ نے اس جگہ

خان خاناں کے مکان میں قیام فرمایا۔ خانخاناں نے اس موقع پر مروارید سے بھرے ہوئے تھال نچھاور کیے اور بے شمار نفیس تحائف قیمتی کپڑے نذر میں گزرانے۔ یہاں سے بادشاہ نے تین ہزار بہادر سوار عین طغیانی کے وقت کشتیوں میں بٹھا کر حاجی پور کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیے۔ اسی قلعہ سے پٹنہ والوں کو مدد پہنچائی جاتی تھی۔ یہ جنگی کشتیاں تمام سامان جنگ سے لیس تھیں اور قلعہ شکنی کے سارے آلات ان میں رکھے گئے تھے۔ دیکھنے میں اتنی پرشکوہ اور شاندار تھیں کہ بس آدمی دیکھتا ہی رہ جائے ۔۔ یہ جمعیت خان عالم کی سرکردگی میں روانہ ہوئی، راجہ گجپتی کو خان عالم کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا۔ راجا گجپتی اس علاقہ کا بڑا با اثر آدمی تھا، اس کی قوت اور جمعیت ایسی تھی کہ اس نے خان زماں جیسے بہادر سردار کو دو سال تک ان جنگلوں میں سرگرداں رکھا تھا ابھی تک وہاں کے جنگل جیسا کہ چاہیے پاک وصاف نہیں ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں میں بکثرت حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں نے حملہ کر کے خشکی اور تری دونوں طرف سے حاجی پور کو گھیر لیا۔ بادشاہ بھی محاذ پر پہنچے اور دریا کے اس طرف ایک بلند مقام پر ٹھہر کر جنگ کا نقشہ دیکھنے لگے دوری اور دھند لکے کی وجہ سے جنگ کی صورت حال واضح طور پر معلوم نہیں ہو رہی تھی، اس لیے تجربہ کار جوانوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر عصر کے وقت حاجی پور کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ وہ صحیح خبر لے کر آئیں۔ قلعہ والوں نے جب ان کو آتے دیکھا تو اٹھارہ کشتیوں میں سپاہی بھر کر ان کے مقابلہ کے لیے روانہ کیے۔ جب مقابلہ ہوا تو اس مختصر سی جماعت نے اس بڑے گروہ پر نمایاں کامیابی حاصل کی اور ان کو راستہ سے ہٹا کر خان عالم کے بیڑے سے جا ملے۔ غنیم کی طرف سے فتح خاں بارہہ بہت سارے پٹھانوں کے ساتھ بڑی سخت لڑائی کے بعد مارا گیا اور قلعہ بزور شمشیر فتح ہو گیا۔ مقتول سرداروں کے سر ایک کشتی میں رکھ کر بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ اس کشتی کو بادشاہ نے حفاظت سے داؤد کے پاس بھجوا دیا تاکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرے۔ میں نے اس وقت یہ تاریخ کہہ کر ملاحظہ میں پیش کی:

چتر شہ دین بہر کشاد پٹنہ — انداخت چو سایہ بر سواد پٹنہ
فی الحال رقم زد از پئے تاریخش — منشی خرد "فتح بلاد پٹنہ"

دوسرے دن بادشاہ پنج پہاڑی کے اوپر تشریف لے گئے اور قلعہ پٹنہ کا سرسری معائنہ کر کے اس کے اطراف واکناف کے علاقہ کو ملاحظہ فرمایا۔ اس وقت پٹھان بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کر رہے تھے کہ آگ گولے تین کوس کے فاصلے سے لشکر میں آکر پھٹتے تھے۔ میں بیانہ اور بجونہ کے حاکم سید عبداللہ خاں جو کان بیگی کے خیمہ میں رہتا تھا ایک گولہ میرے سر پر سے دندناتا ہوا گزر گیا، اللہ نے بچا لیا اور زندگی کی یہ مہلت مل گئی ورنہ نا معلوم میں کہاں پہنچ گیا ہوتا۔

داؤد کا فرار اور پٹنہ کی فتح

حاجی پور کے فتح ہو جانے سے غنیم کی کمر ٹوٹ گئی۔ داؤد کے پاس بیس ہزار سوار اور بے شمار جنگی ہاتھی تھے اور ایک بہت بڑا توپ خانہ بھی تھا لیکن اس سارے خدم وحشم کے باوجود وہ شاہی حملہ سے ڈر کر اس مہینہ کی ۲۱ تاریخ کو ایک کشتی میں بیٹھ کر قلعہ سے بھاگ گیا۔ سرہر ہندی بنگالی جس کا خطاب بکرماجیت تھا اور جس نے لودھی کے قتل پر داؤد کو آمادہ کیا تھا۔ ایک کشتی میں خزانہ رکھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ گوجر خاں کررانی جس کا خطاب رکن الدولہ تھا ہاتھیوں کو لے کر جنگل میں نکل گیا۔ بہت سارے لوگ تو مارے خوف کے دریا میں غرق ہو کر مر گئے۔ بعض سراسیمہ ہو کر قلعہ کے برج اور فصیل پر سے نیچے کود پڑے اور خندق ان کی لاشوں سے پٹ گئی۔ کچھ لوگ گلی کوچوں میں ہاتھیوں کی پلیٹ میں آکر ہلاک ہوئے۔ قلعہ کی بھاگی ہوئی

فوج جب پن پن ندی پر پہنچی تو گوجرخاں ہاتھیوں کو اس پل پر سے جسے ندی پر باندھا گیا تھا گزار کر نکل گیا اس کے پیچھے لوگوں کا پل پر اس قدر ہجوم ہوا کہ پل بوجھ سہار نہ سکا اور ٹوٹ گیا۔ اس موقع پر بہت سے پٹھان سردار مال و اسباب چھوڑ کر ندی میں کود پڑے اور اس میں غرق ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ کو رات کے آخری حصہ میں داؤد کے فرار ہو جانے کی خبر ملی اور وہ شہر پٹنہ میں داخل ہوئے۔ شہر میں ۵۶ ہاتھی لشکر کے ہاتھ آئے اس فتح کی تاریخ ہوئی ع

ملک سلیماں ز داؤد رفت

بادشاہ نے پٹنہ کی حفاظت اور انتظام پر خانخاناں کو مقرر کیا اور خود گوجرخاں کے تعاقب میں جو داؤد کے تمام ہاتھیوں کو لے جا رہا تھا روانہ ہو گیا اور گھوڑے پر سوار ہی پن پن ندی کو عبور کیا اور دریا پور تک جو پٹنہ سے ۳۶ کوس پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے یلغار کر کے تقریباً چار سو مشہور ہاتھیوں کو پکڑ لیا۔ گوجرخاں البتہ اپنی جان سلامت لے کر نکل گیا۔ شہباز خاں، میر بخشی اور مجنوں خاں نے دریا پور سے آگے بڑھ کر سات کوس تک اس کا تعاقب کیا اور وہاں سے لوٹ آئے۔ انھوں نے آکر بادشاہ کو اطلاع دی کہ گوجرخاں بل بھوند ندی پار کر کے نکل گیا ہے، لیکن اس کے بہت سے آدمی پانی میں غرق ہو کر ہلاک ہو چکے ہیں۔

اسی مہینہ کی ۲۱ تاریخ کو خانخاناں بھی دریا کے راستہ سے دریا پور میں آیا، وہ اپنے ساتھ کشتیاں بھی لے کر آیا تھا۔ بادشاہ نے چھ دن وہاں قیام کیا اور خانخاناں کی کمک کے لیے اپنے ساتھ کے امراء کو دس ہزار سواروں کے ساتھ متعین کیا اور اس پورے لشکر کی تنخواہ اور راتب میں دس سے تیس تک اور دس سے چالیس تک کا اضافہ فرما دیا اور خانخاناں کو بنگالہ کا پورا ملک اور کشتیوں کا سارا بیڑا تفویض کر کے وہاں سے غیاث پور کی طرف جو گنگا کے کنارے ہے بادشاہ نے مراجعت کی۔

اسی سال دوسری جمادی الاول کو یوسف خاں کو لشکر کی سرداری پر مقرر کر کے مظفر خاں کو فرحت خاں کے ہمراہ رہتاس کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ فرمایا تاکہ وہ فتح کے بعد رہتاس کی حکومت فرحت خاں کے سپرد کر کے دربار میں چلا آئے۔

اسی مہینہ کی تیسری تاریخ کو بادشاہ کی سواری پٹنہ میں داخل ہوئی۔ وہاں بادشاہ نے سارے معاملات کا مناسب انتظام کیا اور داؤد کی عمارتوں کا سرسری معائنہ کیا۔ پٹنہ میں عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ وہاں بعض چھپر کے مکان تیس تیس، چالیس چالیس ہزار میں تیار ہوتے ہیں حالانکہ وہ تمام کے تمام لکڑی سے ہی بنائے جاتے ہیں۔

بنگال سے واپسی

چھٹی تاریخ کو بادشاہ جون پور پہنچے اور ایک مہینہ تک وہاں قیام فرمایا۔ جون پور اور بنارس کو خالصہ میں شامل کر لیا اور اس کا نظم و نسق میرزا میرک رضوی اور شیخ ابراہیم سیکری والی کے سپرد کر کے نویں جمادی الثانی کو جون پور سے دہلی کے لیے کوچ فرمایا۔ جب موضع خان پور میں کمپ لگایا گیا تو قاضی نظام بدخشی فیروزہ کابلی کے ساتھ خدمت شاہی میں پہنچے قاضی نظام کا کچھ ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں یہ بدخشاں اور ماوراء النہر کے بہت بڑے عالم تھے، تصوف و طریقت میں ان کا بڑا مرتبہ تھا، فیروزہ کابلی مرزا محمد حکیم کے گھرانہ کا لڑکا تھا یہ نہایت ذہین طالب علم تھا۔ خطاطی اور موسیقی کے فن میں بھی اس کو بڑا کمال حاصل تھا ان کی آمد کی تاریخ ہوئی ــــ "دانائے بدخشی"

بادشاہ نے قاضی نظام کو ایک مرصع شمشیر اور پانچ ہزار روپیہ نقد مرحمت فرمایا، انھوں نے بتدریج اپنی استعداد و عالی ظرفی کی وجہ سے قاضی خاں کا خطاب اور بعد میں "غازی خاں" کا خطاب حاصل کر لیا اور سہ ہزاری کے عہدہ تک ترقی کی، البتہ فیروزہ کا حال

پھر اس کے برعکس ہی ہوا، وہ اپنے مقام سے برابر تنزل ہی کرتا رہا۔

اسی منزل میں خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ داؤد پٹنہ سے نکل کر گڑہی چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے قلعہ کو مستحکم کر کے اپنے معتمد سرداروں کے سپرد کر دیا اور وہاں سے ٹانڈہ کی طرف چلا گیا ہے۔ جب شاہی فوجوں نے گڑہی کی طرف پیش قدمی کی تو قلعہ والے مرعوب ہو کر جنگ کیے بغیر ہی قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ

جمادی الآخر میں جب شیر گڈھ عرف قنوج میں منزل ہوئی تو بادشاہ نے مجھے مخاطبت سے نوازا اور از راہ مہربانی حکم دیا کہ میں طوطی نامہ[1] کی طرح سنگھاسن بتیسی[2] کا ترجمہ کر کے اس کی نظم و نثر کو مرتب کروں۔ اس کتاب میں بتیس حکایتیں ہیں جو مالوہ کے حاکم راجا بکرماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔ بادشاہ کا ارشاد تھا کہ میں آج ہی اس کام کو شروع کر دوں اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھا دوں۔ ایک صاحب علم برہمن کو اس کی ترجمانی کے لیے مقرر فرما دیا۔ اسی دن میں نے جب ایک

---

[1] طوطا کہانی: اس کے سنسکرت ماخذ کا نام شک ستپتی یعنی طوطے کی ستر کہانیاں ہے۔ اس کے دو نسخے ہیں ایک "ٹیکسٹس اورنیٹر" مرصع زبان میں ہے اس کا مولف ایک برہمن چنتامنی بھٹ ہے جس نے پورن بھدر کے پنچ تنتر سے عورتوں کی بدچلنی کی کہانیاں لے کر کسی پرانی شک ستپتی کی مدد سے یہ کتاب لکھی۔ دوسرا نسخہ "ٹیکسٹس سوٹ پلی کیٹر" سادہ زبان میں ہے یہ پہلے کے بعد کا ہے۔ اس کا مولف سوتیا مبر جین ہے یہ کسی نظم سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، غالباً پراکرت کی کسی نظم سے اخذ کیا گیا ہے۔ دونوں نسخوں کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک مرہٹی نسخہ بھی ہے جسے مشرقی راجستان میں پرشوتم داس دیو کے لڑکے دیودت نے ترجمہ کیا تھا اس کا نام شک بہتری رکھا۔ بارھویں صدی میں ہیم چند نے اپنی کتاب "یوگ شاستر" میں شک ستپتی کے قصہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے یہ قدیم داستان ہے۔ سنسکرت سے برج بھاشا میں بھیروں پرشاد نے ترجمہ کیا تھا جو لکھنؤ سے چھپا تھا اس کا نام بھی شک تبری تھا۔ فارسی میں ایک قدیم نسخہ ملتا ہے لیکن یہ ترجمہ نہایت بھدا تھا اسی لیے ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء میں ضیاء نخشبی بدایونی نے "طوطی نامہ" کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا لیکن اس میں صرف ۵۲ کہانیاں ہیں۔ نخشبی نے کچھ حکایات فارسی کے بختیار نامے کی بھی شامل کر لی ہیں۔ نخشبی سے ابوالفضل نے اپنی زبان میں اس کا خلاصہ کیا، اسی سے انتخاب کر کے ۳۵ کہانیوں کا دکنی ترجمہ ۱۱۳۳ھ/۱۶۲۹ء میں کیا گیا، دکن کے مشہور شاعر غواصی نے ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں ۳۵ کہانیاں دکنی مثنوی طوطی نامہ نظم کی۔ غالباً ابن نشاطی نے بھی ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں اس داستان کو دکنی میں نظم کیا تھا۔ قادری کے طوطی نامہ سے حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں لفظی ترجمہ ۱۸۰۱ء میں کیا جو ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۲۹۲ھ/۱۸۲۵ء میں انبا پرشاد داستان گو نے قادری کے طوطی نامہ کو "حکایات سخن سنج" کے نام سے اردو نثر میں منتقل کیا۔ اس قصہ کا ہیرو ہجوعہ کالڑکا مدن سین ہے جو ایک جوہری ہے۔ پہلی، دوسری، آخری کہانی میں مرکزی قصہ ہے، یہ سب ۲۸ داستانیں اور ۳۵ کہانیاں ہیں، جن میں سے بیشتر عورتوں کی بدچلنی کے متعلق ہیں۔ ان داستانوں اور کہانیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے، کہ شک ستپتی میں پنچ تنتر ہتوپدیش اور بیتال پچیسی کی کافی کہانیاں شامل ہو گئی ہیں۔

گجراتی میں طوطا کہانی سامل بھٹ کی منظوم اور سمبت کی نثر میں ہے۔ ۱۸۷۱ء کے ترجمے میں ہندی میں بھیروں پرشاد نے اشک بہتری کے نام ۱۸۷۴ء لکھنؤ میں سنسکرت سے کیا۔ فارسی کا ایک نسخہ کتب خانہ شاہی رام پور میں ہے ۹۹۸ھ کا ہے مخطوطہ ۱۰۸۲ھ۔ سری انگ پٹم کی کتابوں میں ۸ کہانیوں کا مجموعہ شامل ہے جو ۱۸۰۲ء کا مکتوبہ ہے۔ ایک طوطی نامہ نثر کا ۱۸۳۵ء میں حاجی خلیفہ کا ہے اور عبداللہ کا ۱۸۸۴ء کا ہے۔ ترکی میں شیخ عبداللہ صابری نے نخشبی سے آزاد ترجمہ طوطی کے نام سے کیا یہ سلیمان اعظم کے عہد ۹۳۴ھ کا ہے۔ اردو کے ترجموں کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ انگریزی میں گیروِل نے ۱۷۹۲ء میں نخشبی سے، گلیڈون نے قادری سے ۱۸۰۰ء (کلکتہ) جان بیڈن نے ۱۸۰۶ء میں جارج سمال نے ۱۸۷۵ء لندن میں اردو سے ترجمہ کیا۔ جرمنی میں اکن نے ۱۸۲۲ء فارسی سے اور ترکی سے جارج رسن نے ۱۸۶۵ء لندن میں کیا۔ فرانچ میں ملر نے ۱۹۳۴ء یونانی میں "شیک گور بزنگ کے نام سے ۱۸۸۱ء بنگالی میں توتا رہتاس کے نام سے چنڈی چرن نے ۱۸۰۶ء میں کیا۔

[2] سنگھاسن بتیسی: یہ سنسکرت کی قدیم داستان ہے اس کا ہیرو راجا بکرماجیت ہے جس کے نام سے ہندوؤں کا بکرمی سن منسوب ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں بکرماجیت کے تخت پر راجہ بھوج نے فرماں روائی کی۔ جب بھوج نے بکرماجیت کا سنگھاسن جو ۳۲ پتلیوں کے سروں پر کھڑا ہوا تھا ایک کھنڈر سے نکالا اور اس پر جلوس کرنا چاہا تو ایک پتلی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس نے ایک داستان سنائی اس طرح پوری ۳۲ پتلیاں ۳۲ داستانیں سناتی ہیں جو سب کی سب راجہ بکرماجیت سے متعلق ہیں انہی داستانوں کا مجموعہ یہ کتاب ہے اس کا سنسکرت میں نام "وکرم چرتر" اور سنہاسن دوترنیستی ہے۔ اس کے مصنف کے متعلق کافی اختلاف ہے، کہتے ہیں اسے ایک بدھ بھکشو نے لکھا تھا اس کے قدیم جینی نسخے کا مصنف سنہدر سین دیواکر ہے۔ جینی میں ایک اور نسخہ شماکر کا ہے جو چودھویں صدی کے آغاز میں گزرا ہے۔ بعض نسخے کالی داس، رام چندر اور شو سے بھی منسوب ہیں۔ یہ کتاب "کتھارنو" کے دوسرے حصے میں بھی شامل ہے، ضروری نہیں کہ یہ بھوج کے عہد گیارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہو، یہ بہرحال

(باقی اگلے صفحہ پر)

کہانی کا پہلا صفحہ لکھ کر پیش کیا تو بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ جب اس کتاب کا ترجمہ ہو گیا تو اس کا نام "نامۂ خرد افزا" تجویز ہوا۔ اس میں اس کا تصنیفی پس منظر اور تاریخ بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا اور تعریف کر کے اسے شاہی کتب خانہ میں داخل کرا دیا۔

خواجہ عبدالشہید کی بددعا

اسی دوران میں جب کرآولی کی منزل پر شاہی قافلہ پہنچا تو خواجہ عبدالشہید سمرقند واپس جانے کا ارادہ کر کے رخصت ہونے کے لیے آئے اور اکبر سے کہا "میں اپنی ہڈیوں کو اسی سرزمین (سمرقند) میں پہنچانا چاہتا ہوں"، پھر انھوں نے بادشاہ کی کمر سے ایک تلوار باندھی اور دوبارہ میرزا شرف الدین حسین کی رہائی کے لیے درخواست کی۔ اس بار بھی جب بادشاہ نے قبول نہ کیا تو انھوں نے نہایت رنجیدہ ہو کر فرمایا "اب میں مزید کیا کہوں، یہ بات امن و امان سکے لیے بہر حال مضر ہے، بس اپنے خدا سے یہی چاہتا ہوں کہ وہ (تمھارے) ایمان کو سلب کرے"۔ جیسا کہ انھوں نے کہا تھا وہ سمرقند پہنچتے ہی اپنے بزرگوں سے جا ملے۔ رحمۃ اللہ علیہ!

۲۰ جمادی الثانی کو اسکندر پور کے قصبہ میں منزل ہوئی تو یہ خبر پہنچی کہ داؤد نے ٹانڈہ کو بھی جو گنگا کے اس طرف گوڑ کے مقابل واقع ہے بغیر جنگ کیے چھوڑ دیا ہے اور صحرانوردی کرتے ہوئے اڑیسہ کو چلا گیا ہے اور ٹانڈہ پر خانخاناں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

اکبر کی دہلی میں آمد

اگرہ تین منزل پر تھا، لیکن بادشاہ نے آگرہ کے بجائے دارالملک دہلی کا رخ کیا اور پہلی ماہ رجب کو دہلی میں ورود شاہانہ ہوا۔ چند دن مقدس مزاروں کی زیارت کی۔ انہی دنوں حسین خاں پٹیالی بھون گاؤں کے قریب حاضری کے لیے آیا، لیکن اسے باریابی کی اجازت نہ ملی بلکہ بادشاہ نے شہباز خاں میر بخشی کو حکم دیا کہ اسے دولت خانہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تیرھویں صدی سے پہلے کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ اس کی داستان "بتیال پچیسی" سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ بتیال پچیسی دکرم سین گوداوری کے راجا سے متعلق ہے جسے شیمندر یا شودا اس نے لکھا تھا۔ بتیال پچیسی کا زمانہ بارھویں صدی عیسوی کا ہے اس لیے سنگھاسن بتیسی اس کے بعد کی ہی تصنیف ہو سکتی ہے۔ سنسکرت میں اس کے جو نسخے کالی داس، رام چند اور شو کے ملتے ہیں وہ تیرھویں صدی کے ہیں۔ سدھ سین دیواکر جینی اور شیمان کہ جینی کے نسخے چودھویں صدی کے ہیں۔ دکنی زبانوں میں بھی یہ داستان ہے، مرہٹی میں بھی اس کا نسخہ ہے۔ سنسکرت سے سندر داس کوی نے ۱۶۳۱ء میں ہندی میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۰۴ء میں کاظم علی جوان اور للولال نے برج بھاشا سے ہندی میں کیا۔ بنگالی میں آقدا روسی نے "شیما نگر سے" و ترس سنگھاسن" کے نام سے ۱۸۱۸ء میں سیرام پور میں کیا، فارسی میں چترنج کی بن مہر چند کا ئستھ ساکن سونی پت نے اکبر کے عہد میں شاہنامہ کے نام سے ترجمہ کیا (ہیں فنژجم) انجمن ترقی اردو میں جو قلمی نسخہ دیکھا ہے اس میں مصنف کا نام بھوج داس ابن مہروب ہے۔ اس نسخے کو ۲۲ رمضان ۱۲۳۶ھ میں پیر خان کاتب نے لکھا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے حکم سے غالباً اسی چتر بھج داس کے ساتھ مل کر ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں ترجمہ کیا، اور اس پر ملا صاحب نے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴-۹۵ء میں نظر ثانی کی۔ ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں جہانگیر کے حکم سے بھارا مل بن راج مل کھتری نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء عہد شاہجہاں میں بسبب رائے ابن ہر کرن داس کائستھ قنوجی نے چتر بھج اور بھارا مل کے نسخوں کو ملا کر مرتب کیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں کشن بلاس ابن کشن داس باسدیو قنبولی صوبہ لاہور نے ترجمہ کیا۔ کوپن ہیگن میں ایک فارسی نسخہ چاند ولد مادھو رام کا لکھا ہوا ہے۔ فارسی نسخے برٹش میوزیم، انڈیا آفس، کیمبرج یونیورسٹی میں بھی ہیں یہ داستان گل افشاں خلاصۃ التواریخ میں بھی شامل ہے ۱۸۴۵ء میں ای سی بیلے کے حکم سے سید حامد علی اور شو سہائے کائستھ گلاوٹھی بلند شہر نے بھی ترجمہ کیا تھا۔ اردو میں فقیر نامی ایک شخص کی قلمی نظم ویر بکرم کے نام سے صاف دکنی زبان میں ہے۔ یہ نسخہ شاہ عالم کے عہد کا ہے اس پر ایک مہر ۱۲۵۶ھ کی بھی لگی ہوئی ہے۔ کاظم علی جوان اور للولال نے ۱۸۰۴ء میں سندر داس سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا منتری ایڈیشن راجہ درگا پرشاد کا ۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ کا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں کانپور کے زنگ لال جی کا بھی ترجمہ ہے۔ منشی لکھمن لال کا منظوم ترجمہ ۱۸۸۶ء سے کچھ پہلے کا ہے۔ منگولی زبان میں سنگھاسن بتیسی کا "ارجی بورجی خاں" کے نام سے ترجمہ ہوا تھا اسی منگولی سے ۱۸۶۸ء میں جلگ نے جرمن زبان میں ترجمہ کیا اس کے ایک حصہ میں بتیال پچیسی ہے اور دوسرے میں سنگھاسن بتیسی ہے۔ انگریزی میں برک نے جلگ کے جرمن نسخہ سے "Sagas from the far east" کے نام سے اور بیسویں صدی میں ایڈگرٹن نے "Vikram Adven ture" کے نام سے ترجمہ کیا۔ فرنچ میں تیرن نے "Los eallier" کے نام سے ترجمہ کیا یہ ترجمہ بھارا مل کے فارسی نسخہ نیویارک سے کیا گیا۔

احاطہ سے باہر نکال دیا جائے۔ حسین خاں کو اس توہین کا بڑا صدمہ ہوا اور اس نے ہاتھی اونٹ، گھوڑے اور سارا سامان سپاہ گری ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ کے طالب علموں، مستحقوں اور مجاوروں، مدرسوں اور خانقاہوں کو مرحمت فرما دیا اور سب کچھ ترک کر کے الف وار قلندری اختیار کر لی ؎

ایں ہمہ طمطراق کن فیکوں
شمۂ نیست پیش اہل جنوں

جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ملی تو اس نے اس پر عنایت مبذول کی اور اپنی شال اتار کر اسے اوڑھائی۔ اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر بطور پروانگی عطا فرمایا اور حکم دیا کہ کانت گولہ اور بریٹیالی اور دوسرے علاقے جو ایک کروڑ بیس لاکھ کی جاگیر تھی حسب سابق ایک فصل تک اس کے سپرد کی جائے اور سرکار کا کروڑی اس جاگیر میں مداخلت نہ کرے۔ جب وہ سواروں کا "داغ و محلہ" کرائے تو اسے مناسب تنخواہ پر جاگیر عطا کر دی جائے گی۔ حسین خاں اپنی فیاضی اور کشادہ دستی کی وجہ سے اس قدر قلاش ہو چکا تھا کہ دس سوار رکھنے کی بھی اس میں طاقت نہیں تھی۔ اس قصۂ کو رفع دفع کرنے کے لیے وہ مجبوراً اپنی جاگیر پر چلا گیا اور شمالی کوہستان کو فتح کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اس مرتبہ وہ دربار سے ایسا گیا کہ پھر اسے لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا ؎

زر بدہ مرد سپاہی را تا سر بدہد
و گرش زر ندہی سر بنہد در عالم

اجمیر کی زیارت کے لیے روانگی

اوائل شعبان میں بادشاہ نے دہلی سے اجمیر کا قصد کیا۔ نارنول کی منزل میں حسین قلی خاں جہاں مبارک باد کے لیے حاضر ہوا اور خان اعظم یلغار کرتے ہوئے احمد آباد سے حاضر خدمت ہوا۔ رمضان المبارک کے آغاز میں حسب سابق اجمیر سے سات کوس کے فاصلہ پر بادشاہ پیدل زیارت کے لیے چلے اور درگاہ پر پہنچ کر داؤد کے لشکر کے نقاروں کی ایک جوڑی جس کو درگاہ پر پیش کرنے کی بادشاہ نے منت مانی تھی نذرانہ میں دی۔ حسب معمول ہر روز درگاہ میں راتوں کے وقت اہل اللہ اور صالحین کی محفل جمتی، اور سماع کی مجلسیں منعقد ہوتیں، جن میں بادشاہ برابر حاضر رہتے۔ موسیقار اور قوال جو اپنے فن میں ایک سے ایک بڑھ کر تھے دل سوز نغمے گا گا کر سناتے تھے اور چاروں طرف سے ان پر روپے پیسے کی بارش ہونے لگتی۔

دار الخلافہ کو واپسی

اجمیر سے بادشاہ نے راجہ مالدیو کے لڑکے چندرسین کی سرکوبی کے لیے ایک تجربہ کار فوج کو متعین کیا اس فوج کی سرداری محمد طاہر خاں میر فراغت حاکم دہلی کے لڑکے طیب خاں کے سپرد کی گئی۔ اس فوج کشی کا سبب یہ تھا کہ چندرسین کے بارے میں بادشاہ کو مسلسل یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ جودھ پور اور سیوانہ کے علاقہ میں سرکشی اختیار کر کے مسلمانوں کو پریشان کر رہا ہے۔ جب یہ فوج اس پر حملہ کرنے کے لیے پہنچی تو وہ گھنے جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گیا اور فوج کی روانگی کے بعد ماہ رمضان کے وسط میں خان اعظم کو گجرات پر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی اور بادشاہ مسلسل کوچ کر کے رمضان کی آخری تاریخ تک فتح پور واپس تشریف لے آئے۔

قلعہ سیوانہ کی تسخیر

بادشاہ نے اسی سال شاہ قلی خاں محرم، سالال خاں تورچی، اور چند دوسرے امیروں کو سیوانہ کے

قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ یہ قلعہ مالدیو کے پوتوں کے قبضہ میں تھا۔ جلال خاں قورچی بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ نہایت ظریف اور خوش طبع آدمی تھا۔ مصاحبوں اور ندیموں میں بادشاہ کے مزاج میں کسی کو اتنی دسترس نہ تھی جتنی جلال خاں کو حاصل تھی۔ اس معرکہ میں اس نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ بہرحال اسے دنیا بھی ملی اور عاقبت بھی ہاتھ سے نہیں گئی۔ اس کے بعد اس مہم پر شہباز خاں کنبوہ کو روانہ کیا گیا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

اسی سال بادشاہ نے میر گیسو بکاول کو سلطان محمود بکری کے مال و دولت کی تحقیقات اور قلعہ بکر کے انتظامات کے لیے مقرر فرمایا۔

اسی سال گجرات میں بڑی سخت وبا پھیلی۔ غلہ اس قدر مہنگا ہوگیا کہ ایک من جوار کے دام ایک سو بیس تنکہ سیاہ تک چڑھ گئے۔ وبا اور قحط کی وجہ سے بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔

خواجہ امینا خواجہ جہاں کی وفات

اسی سال خواجہ امینا[1] خواجہ جہاں کا لکھنو میں اس وقت انتقال ہوگیا جب کہ بادشاہی لشکر پٹنہ سے لوٹ کر وہاں پہنچا تھا۔ صبوحی شاعر نے اس کی شان میں یہ رباعی کہی تھی ؎

برا اہل ہنر سد سکندر در تست   یاجوج کہ گویند صف لشکر تست

در دور تو آثار قیامت پیداست   دجال توئی خواجہ امینا خر تست

واضح رہے صبوحی نے یہ رباعی اس زمانہ میں کہی تھی جب خواجہ امینا کا ستارہ پورے عروج پر تھا۔

خواجہ امینا کی کنجوسی ضرب المثل بنی ہوئی تھی، چنانچہ وہ رات کا بچا ہوا کھانا کھاتا تھا، لیکن یہ کفایت اور جزرسی صرف اس کی اپنی ذات تک محدود تھی، کیوں کہ وہ حاجت مندوں کی امداد و اعانت بھی بہت کیا کرتا تھا، بلکہ اس معاملہ میں شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آسکے۔

اس کا معمول تھا کہ ملازمت دلانے کے لیے ایک مقررہ رقم بطور رشوت لیا کرتا تھا اور بادشاہ کے پاس سفارش کرکے جاگیر، نقارہ، خان یا سلطان کا خطاب دلا دیا کرتا تھا۔ جو لوگ ماوراءالنہر خراسان، عراق سے ہندوستان آتے تھے وہ ان کو شاہی خزانہ سے معقول رقمیں دلایا کرتا تھا اور کوشش کرکے دوسرے امیروں سے بھی خاصا روپیہ فراہم کردیتا تھا اور دوسروں کی طرح خود بھی اپنے شایان شان ان کی مدد کرتا رہتا تھا۔

ملا عصام الدین ابراہیم اسفر کے ایک شاگرد حافظ تاشکندی تھے جو عربی کے مشہور عالم ہیں انھوں نے سورۂ محمد پر ایک تفسیر لکھی ہے، ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس تفسیر سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ وہ جب ہندوستان آئے تو خواجہ امینا نے بادشاہ سے اور دوسرے امیروں سے تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ اکٹھا کرکے ان کو دلایا وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ منعم خان خانخاناں کے پاس گئے اور وہاں سے بھی مالا مال ہوکر مکہ معظمہ کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ ۹۷۷ھ میں اپنے وطن پہنچ کر انتقال فرمایا۔

---

[1] خواجہ امینا: پورا نام خواجہ امین الدین تربتی تھا۔ تربت علاقہ خراسان کے رہنے والے تھے۔ ایران کے سفر میں ہمایوں کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ بیرم خاں کے معتمد خاص تھے، خواجہ جہاں کا خطاب اکبر نے عطا کیا۔ ابوالفضل نے ان کے متعلق لکھا ہے "قلم و حساب کا شہسوار تھا، خط شکستہ نہایت درست اور خوب لکھتا تھا مالیات کے بندوبست اور حساب کتاب میں ماہر تھا۔" کہتے ہیں کسی مست ہاتھی نے ان پر حملہ کردیا وہ جان بچا کر بھاگے، خیمہ کی رسی سے الجھ کر گرے اور خوف و صدمہ سے ۹۸۳ھ میں انتقال ہوگیا۔

ایک دلچسپ لطیفہ انہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ اکبر کی مجلس میں حاجی ابراہیم سرہندی بھی تھا جو ہمیشہ علما سے الجھتا رہتا اور اپنی بڑائی جتانے کے لیے مباحثے کرتا رہتا تھا اور بحث میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کر کے مخالف کو پریشان کر دیتا تھا۔ جس وقت تاشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھ لیا کہ "موسیٰ" کون صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے۔ مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات اس کا جواب جیسا کہ دینا چاہیے نہ دے سکے اور عوام نے باور کر لیا کہ حاجی ابراہیم بلحاظ علم سب پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ بڑی ناانصافی کی بات تھی، کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے جسے بادشاہ نے متھرا کا قاضی بنایا تھا کہا تم بحث میں کیوں حصہ نہیں لیتے ہو۔ اس نے بے ساختہ جواب دیا "اگر حاجی ابراہیم مجھ سے "علیمی" کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو اس وقت بھلا میں کیا جواب دے سکوں گا"۔ بلاشبہ یہ اس نے بڑی عمدہ بات کہی تھی۔

یادِ رفتگان اس تاریخ سے اب تک کہ دس سال کی مدت گزر چکی ہے ان مباحثہ کرنے والوں کی جماعت میں سے جو سو سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل تھی محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب اوڑھا چکی ہے، بے شک "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" ؎

زخیل دردکشاں غیر ما نماند کسے　　　بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے

وہ محفلیں اجڑ گئیں اور ایک میں سوگوار رہ گیا ہوں کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو میری غمزدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے کہ بہرحال اس قحط الرجال میں ان کی ہستیاں بڑی غنیمت تھیں اب کس سے بات کریں، تبادلۂ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔ اب مجھ ناکارہ و افتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں ؎

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند　　　در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر　　　یک لحظہ زما بیشتر ک مست شدند

پیمائش اور کروڑیوں کا تقرر اس سال اکبر نے ملک کی خوش حالی اور زرعی ترقی کی طرف توجہ فرمائی اور ملک کے سارے زرخیز و بنجر پرگنوں کی پیمائش کرائی۔ شہری، پہاڑی علاقوں، دریاؤں، میدانوں، جنگلوں، تالابوں اور کنوؤں کی تفصیلات جمع و مرتب کی گئیں اور جگہ جگہ کروڑیوں کو مقرر کر کے ہر ایک کروڑی کی تحویل میں اتنی اراضی دے دی کہ زراعت کے بعد اس سے ایک کروڑ تنکہ کا محصول وصول ہو سکے۔ وہی ملازم کروڑی بنائے گئے جن پر پورا بھروسا تھا اور جو محنتی تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ تین سال کے عرصہ میں غیر مزروعہ خطوں کو قابل کاشت بنا دیں تاکہ سرکاری خزانہ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے ہر کروڑی سے اس رقم پر ضامن لیے گئے۔

اس پیمائش کی ابتدا فتح پور سے کی گئی۔ اس کے پہلے کروڑ کو آدم پور دوسرے کو شیث پور اسی طرح ایوب پور وغیرہ کے

ؔ اکبر کے زمانہ میں سب سے پہلے کل ممالک محروسہ کی پیمائش کرائی گئی البتہ علاء الدین خلجی کے زمانہ میں بندوبست و مالگزاری کا ایک ضابطہ تحال ضرور مرتب ہوا تھا۔ ناپنے کے لیے جو جریب استعمال ہوتی تھی وہ پہلے رسی کی تھی اس میں خشکی و تری کی وجہ سے ناپ کا فرق ہو جاتا تھا اس لیے بانس میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریب بنائی گئی، پہلے طول ۵۰ گز کا تھا اس کے بجائے ۶۰ گز کا طول مقرر کیا گیا۔ کروڑیوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے مالگزاری کا یہ بندوبست ناکام رہا، لوگ اسقدر تنگ تھے کہ گھر گھر اس پیمائش اور کروڑیوں کا رونا تھا، کسی شاعر کا ایک شعر اسی جریب کے متعلق ہے ؎

درنظر عبرت مرد لبیب　　　ما دو سر بہ کہ طناب جریب

نام دیے گئے اور ہر خطہ پر سرکاری عامل تعینات کیے گئے، لیکن بندوبست کا یہ طریقہ کامیاب نہ ہوا اور ممالک محروسہ کے اکثر علاقے ان کروڑیوں کے مظالم کی وجہ سے بجائے آباد ہونے کے ویران ہو گئے، یہاں تک کہ لوگ اپنے بال بچوں کو بیچ بیچ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور آمدنی کا تناسب بہت زیادہ گر گیا۔ ان کروڑیوں کے احتساب کے لیے راجہ ٹوڈرمل کو مقرر کیا گیا اس نے ان سب کو اس طرح شکنجہ میں کسا کہ اکثر سخت سزاؤں کی وجہ سے مر گئے اور بیشتر کچہری کے قید خانہ میں کسی سزا کے بغیر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دنیا سے بے گور و کفن رخصت ہوئے۔ ان گرفتاران بلا کا حال بعینہٖ ان ہندو فدائیوں کی طرح ہو گیا تھا جو کامروپ کے ملک میں خود کو ایک بت کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور ایک سال تک جو من میں آتا ہے کرتے رہتے ہیں، وہ چاہے کتنا ہی بڑا گناہ اور جرم کریں ان کے لیے سب کچھ معاف ہوتا ہے، لیکن سال کے گزرتے ہی ان میں سے ہر ایک کو پکڑ کر اس بت خانہ میں اکٹھا کر لیا جاتا ہے اور اس بت کے آستانہ پر ان کے سر قلم کر دیے جاتے ہیں۔

داغ و محلہ کا ضابطہ

کروڑیوں کی یہ حالت تھی اور امرائے شاہی کے یہ ٹھاٹ تھے کہ خالصہ کے علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک ان کی جاگیروں میں تقسیم تھا اور یہ لوگ رات دن عیش و عشرت میں مبتلا رہتے تھے ان کے گھرانوں کے خرچ اتنے تھے کہ ان کو روپیہ بٹورنے کے سوا کوئی اور کام نہ تھا۔ عیش پسندی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ سپاہیوں کی نگہداشت اور رعایا پروری کی طرف توجہ کر سکیں۔ جب کسی لڑائی پر جانا پڑتا تو بجائے مقررہ فوج کے چند غلاموں اور اپنے شاگرد پیشہ کے مغل سپاہیوں کے ساتھ میدان میں حاضر ہو جاتے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی کارآمد مضبوط فوج تیار نہ تھی۔

شہباز خاں میر بخشی نے "داغ و محلہ"[۱] کا طریقہ جو سلطان علاؤالدین خلجی اور بعد میں شیر شاہ کے ضابطوں میں شامل تھا از سر نو مرتب کر کے پیش کیا۔ اس قاعدہ کی رو سے طے پایا کہ پہلے امیروں کو بیسی کا عہدہ دیا جائے اور جب وہ اپنے عہدہ کے شایان شان بیس سوار بھرتی کر کے ان کا معائنہ کرا دے اور اس کے حسب استعداد بادشاہ مزید ترقی دینا پسند فرمائیں تو اسے "صدی" کا عہدہ دیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے لازم ہوگا کہ سپاہیوں کے علاوہ گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور دوسرے

---

[۱] آئین داغ: یہ ترکوں کی قدیم رسم ہے، پہلے صرف بادشاہ کی ملکیت کے اظہار کے لیے گھوڑوں پر نشان لگا دیا جاتا تھا بہار کے موسم میں داغ کا جشن منعقد ہوتا تھا بعد میں فوج میں بھرتی کا قانون بن گیا۔ ہندوستان میں علاؤالدین خلجی نے گھوڑوں کی حاضری اور شمار کے لیے داغ کا قانون سب سے پہلے رائج کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے جاگیرداری کا طریقہ اختیار کیا اور داغ موقوف ہو گیا۔ شیر شاہ نے دوبارہ آئین داغ کو نافذ کیا۔ اس کے بعد اکبر نے بھی اس کو تازہ کیا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے: پہلے گھوڑے کی گردن پر سیدھی جانب حرف سین کا سرا (۳) لوہے سے داغتے تھے پھر چلیپہ کا نشان جس کے چاروں سرے ٹوٹے تھے لگایا جانے لگا۔ یہ نشان سیدھی ران پر ہوتا تھا پھر مدت تک چلپہ اتری ہوئی کمان کی شکل رہی پھر لوہے کے ہندسے داغے جانے لگے یہ گھوڑے کے سیدھے پٹھے پر ہوتے تھے۔ پہلی دفعہ $\frac{1}{۳}$ دوسری دفعہ $\frac{۲}{۳}$ وغیرہ۔ بعد میں اس غرض کے لیے خاص طور سے ہندسے تیار کرائے گئے۔ انہی سے داغ لگایا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ قانون نافذ کیا تو امراء میں بڑی ہلچل مچی۔ مظفر خاں، امرزا عزیز کوکلتاش سپہ سالار نے بڑی ضد اور جھگڑا کیا اس کو مکان میں نظربند کر دیا گیا۔ بعض کو بنگال میں تبدیل کر دیا۔ موجودات اور حاضری کے وقت سوار کو اپنا حلیہ، عمر اور گھوڑے کا حلیہ وغیرہ لکھانا پڑتا تھا۔ سپاہیوں کا وزن بھی لکھا جاتا تھا۔

پیادے کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ بارہ روپے آٹھ آنے اور سوار کی زیادہ سے زیادہ تیس روپیہ ہوتی تھی۔ جانور کا نصف خرچ سرکار سے ملتا تھا۔ ۱۰۰۶ھ تک اکبری فوج کی تعداد ۴۴ لاکھ تھی۔ منصب دار ۱۶۶ تھے۔

[۲] علاؤالدین خلجی کا افسر مال "شرف قائنی" تھا یہی شخص ہے جس نے سب سے پہلے مالگذاری کے جدول اور رجسٹر بنائے اور پیمائش و محاصل کے ضابطے مقرر کیے (تاریخ فیروز شاہی برنی ۲۸۷)

لوازمات فراہم کر کے ملاحظہ میں پیش کرے۔ اس تیاری کے بعد وہ ہزاری پھر دو ہزاری اور پانچ ہزاری تک اس طرح ترقی کرتا چلا جائے۔ پنج ہزاری سے اونچا کوئی عہدہ نہیں تھا اور اگر کوئی امیر اس ضابطہ پر پورا نہ اترے تو اس کا تنزل کر دیا جائے۔

امرائے فوج کی چالبازیاں

داغ و محلہ کا یہ ضابطہ اسی لیے نافذ کیا گیا تھا کہ امیر مقررہ تعداد میں فوج رکھنے کے پابند ہو جائیں، لیکن امیروں نے اس ذمہ داری سے بچنے کی تدبیر نکال لی، چنانچہ وہ حاضری اور معائنہ کے وقت اپنے آدمیوں اور بارگیروں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے تھے اور اپنے عہدہ کی مقررہ تعداد کو پوری کر لیتے تھے۔ جب ترقی مل جاتی تو ان کرایہ کے سپاہیوں کو رخصت کر دیتے تھے۔ لڑائی کے موقع پر حسب ضرورت نئی فوج بھرتی کر کے پہنچ جاتے تھے اور جنگ کے ختم ہونے پر خدا کی پناہ مانگتے ہوئے اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کا خزانہ روپیہ پیسہ بہرحال محفوظ ہی رہتا تھا اور ساری خاک بے چارے سپاہیوں کے سر پر پڑتی تھی کہ انہیں دوبارہ کمر باندھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ ان امیروں کے پاس پیشہ ور لوگ جولاہے، دھنیے، بڑھئی، بقال، ہندو اور مسلمان گھوڑا اور ساز کرایہ پر لے کر اونچے بنے داغ کے لیے پہنچ جاتے تھے اور ملازمت حاصل کر کے ان میں سے کوئی "احدی" کوئی "داخلی" بن جاتا تھا، خدمت ملنے کے چند دن بعد ہی ان کے پاس نہ وہ گھوڑا نظر آتا تھا اور نہ سامان سپاہ گری۔ جب آن پڑی تو انھیں پیادہ ہی گھسیٹنا پڑتا تھا۔

معائنہ کے وقت اکثر ایسا ہوا کہ بادشاہ نے سپاہیوں کو دیوان خانہ خاص میں بلا کر اسی طرح وردیوں اور ہتھیاروں سے لیس ہاتھ پاؤں بندھوا کر ترازو میں تلوایا تو ان کا وزن کم و بیش ڈھائی من اور تین من تک نکلا۔ جب پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ سارا ساز و سامان اور ہتھیار عاریۃً لیے ہوئے تھے۔

بادشاہ اس صورت حال سے بخوبی واقف تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو دیدہ دانستہ یہ رعائتیں دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی گذر بسر کرتے رہیں۔

کچھ عرصہ بعد دو اسپہ، یک اسپہ، نیم اسپہ احدیوں کا تقرر کیا گیا۔ نیم اسپہ کا مطلب یہ تھا کہ دو سوار مل کر ایک گھوڑے کی پرورش کریں اور فی گھوڑا جو چھ روپیہ ماہوار ملتا تھا اس میں دونوں تین تین روپے لے لیں ع

اینک در روزگار من بیں و مپرس

یہ رنگ ڈھنگ کچھ اچھے نہیں تھے۔ باوجود اس بد انتظامی کے یہ اکبر کی اقبال مندی ہی تھی کہ اس کے تمام دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ بعد میں اتنے سپاہیوں کی بھی ضرورت نہ رہی اور امیروں کو بھی شاہی کارندوں کی ناز برداریوں سے چھٹکارا مل گیا۔

داؤد کا تعاقب

اسی سال بادشاہ سلامت نے داؤد کے تعاقب کے لیے منعم خاں خانخاناں اور راجہ ٹوڈرمل کو اڑیسہ کی طرف روانہ کیا اور مجنوں خاں قاقشال کو گھوا گھات (گھوڑا گھاٹ) کی جانب متعین کیا۔ داؤد ٹانڈہ سے بھاگ کر گنگ بنارس میں قلعہ بند ہو گیا تھا اور جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گھوڑا گھاٹ میں مجنوں قاقشال کا وہاں کے جاگیردار سلیمان منگلی سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان کے پاس بڑا لاؤ لشکر جمع تھا اور وہ شان و شوکت اور بہادری میں بھی کافی مشہور تھا۔ اس مقابلہ میں سلیمان منگلی ہلاک ہو گیا اور قاقشال کی فوج کے ہاتھ اتنا مال غنیمت آیا کہ وہ اسے اٹھانے سے عاجز تھی۔ اس معرکہ

میں بہت سے پٹھان اسیر ہو کر آئے۔ مجنوں خاں نے سلیمان کی لڑکی کا نکاح اپنے لڑکے جباری سے کر دیا۔ جباری ان دونوں بادشاہی امیروں میں شامل ہے۔ سلیمان کی شکست کے بعد مجنوں خاں قاقشال کی لڑائی جلال الدین سور کے لڑکے سے ہوئی۔ جلال الدین کسی زمانہ میں اس علاقہ کا خود مختار حکمران تھا۔ یہ لڑائی گھوڑا گھاٹ کے حدود میں ہوئی۔ قاقشال نے اس علاقہ کے زمینداروں کی مدد سے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور ٹانڈہ تک اس کا تعاقب کیا، اسی یلغار میں اس نے گور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مجنوں خاں اور معین الدین فرنخودی نے ٹانڈہ کی ناکہ بندی کر دی اور خانخاناں کی کامیابی کی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

جب داؤد کو شکست ہوئی اور خانخاناں کی واپسی کی خبر اڑی تو سارے پٹھان جو جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے اکٹھا ہو کر موقع کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ ٹوڈرمل داؤد کے تعاقب پر لگا ہوا تھا۔ وہ محمد قلی خاں برلاس، محمد قلی خاں توقبائی اور مظفر مغل کو ساتھ لے کر متواتر کوچ کرتے ہوئے بنگال کے علاقہ گوالپاڑہ تک پہنچ گیا۔ داؤد وہاں سے دس کوس کے فاصلہ پر رین کساری نامی مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ایک بھاری فوج جمع کر کے وہ دہرپور میں قلعہ بند ہو گیا۔ داؤد کا ایک چچیرا بھائی جنید بہادری اور دلیری میں مشہور تھا، وہ پہلے شہنشاہ کی ملازمت میں تھا، ملازمت چھوڑ کر وہ آگرہ سے گجرات پھر وہاں سے بنگالہ چلا گیا تھا اسی دوران میں وہ داؤد سے ملنے کے لیے رین کساری کے نواح میں پہنچا۔ راجہ ٹوڈرمل نے میرزا ابوالقاسم گوسالہ کو جس کا لقب تمکین ہے نظر بہادر کے ساتھ اس کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ یہ دونوں جنید سے شکست کھا کر راجہ کے پاس لوٹ آئے۔ اب راجہ خود اس کے مقابلہ پر گیا۔ جنید مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور جنگل میں جا کر پناہ لے لی۔ یہاں سے راجہ کی فوج مدن پور جا کر کچھ دن کے لیے ٹھہر گئی اسی جگہ محمد قلی خاں برلاس بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔ بادشاہی فوج میں اس کی وفات سے بڑا انتشار پھیل گیا اس لیے لشکر میدنی پور سے پیچھے ہٹ کر مدارن میں آ گیا۔ اس جگہ قیا خاں گنگ امرائے لشکر سے ناراض ہو کر کسی جنگل میں چلا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ ساری صورت حال خانخاناں کو لکھ بھیجی۔ خانخاناں نے راجہ کی مدد کے لیے شاہم خاں جلائر اور لشکر خاں بخشی کو جسے عسکر خاں اور استر خاں بھی کہا جاتا تھا کچھ دوسرے افسروں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ بردوان میں راجہ سے جا کر ملے۔ راجہ نے اس جگہ تمام امراء کو چھوڑا اور خود قیا خاں کے پاس تنہا جا کر اسے پرچا منا کر واپس لے آیا، پھر وہاں سے کوچ کر کے مدارن کے راستہ سے جھورہ پہنچا۔ جب لشکر برجین میں پہنچا تو خبر آئی کہ داؤد نے اپنے اہل و عیال کو ٹوگنگ بنارس میں چھوڑ دیا ہے اور لڑائی کی پوری تیاریاں کر لی ہیں۔ جب خانخاناں کو یہ خبر ملی تو اس نے تیز رفتاری سے کوچ کیا اور راجہ کی فوج سے جا کر مل گیا۔

پٹھانوں سے خونریز لڑائی

پٹھانوں نے اپنی لشکرگاہ کے اطراف خندق کھود کر اچھی خاصی قلعہ بندی کر لی تھی۔ ۲۰ ذی قعدہ ۹۸۲ھ کو بھتجورہ کے نواح میں دونوں فوجوں کے درمیان بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف منگولسی کے ہاتھی برابر باندھے کھڑے تھے۔ داؤد کے ہاتھی چارہ گھاس کھا کر تر و تازہ اور مست تھے۔ اس نے ہاتھیوں کو بادشاہی لشکر پر دوڑا دیا۔ خانخاناں نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ بندوقیں اور توپیں جو گاڑیوں پر رکھی ہوئی تھیں وہ ہاتھیوں کی صف پر چھوڑی جائیں۔ توپوں کے سر ہوتے ہی ہاتھی گھبرا کر پلٹ پڑے۔ اس موقع پر بندوقوں کی ضرب سے بہت سے پٹھان ہلاک ہوئے۔ داؤد کے مقدمۃ الجیش پر گوجر خاں کمان دار تھا۔ اس نے بادشاہی ہراول پر حملہ کر دیا۔ ہراول کی کمان خان عالم، خواجہ عبداللہ،

کنجک خواجہ، سید عبداللہ چوگان بیگی اور میرزا علی عالم شاہی کر رہے تھے۔ گوجر خاں کا یہ حملہ اس غضب کا تھا کہ ان امیروں کے قدم اکھڑ گئے اور غنیم نے انھیں دھکیل کر التمش کی فوج تک جس کی سرداری قباخاں گنک کر رہا تھا، پہنچا دیا۔ ہراول کے کمان دار خان عالم نے جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ التمش کی فوج منتشر ہوگئی اور اس نے خان خاناں کی جمعیت میں آکر پناہ لی اس بھگدڑ کی وجہ سے خانخاناں کی جمعیت کا شیرازہ بھی پراگندہ ہوگیا۔ خان خاناں نے نظم قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ایک مرتبہ منتشر ہونے کے بعد اس کی فوج جم نہ سکی۔ عین اسی حالت میں گوجر خاں سر پر آپہنچا۔ خان خاناں کے مقابل آکر اس نے پے در پے تلوار کے کئی ایک وار کیے۔ خان خاناں نے بڑے حوصلے سے کام لیا اور گوجر خاں کے ہر حملہ کو اس نے اپنے تازیانہ پر روک لیا۔ اس نازک موقع پر ہاتھیوں سے گھبرا کر خانخاناں کا گھوڑا بھڑک گیا اور سنبھالے نہ سنبھلا۔ مجبور ہو کر خانخاناں نے معرکہ سے باگ پھیر لی اور بھاگی ہوئی فوج کو جمع کرنے کے بہانے سے تین چار کوس تک پسپا ہوتا چلا گیا۔ پٹھانوں نے کافی دور تک اس کا تعاقب کیا۔ اس موقع پر قباخاں گنگ اور دوسرے چند سرداروں نے پٹھانوں کے لشکر پر دونوں جانب سے تیر چلانے شروع کیے اور تیر ماری سے ان کے لشکر کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ یہ مقابلہ اتنا سخت اور بھاری تھا کہ دونوں فریق لڑتے لڑتے تھک گئے۔ دونوں میں مزید نقل وحرکت کی طاقت نہ رہی۔ حسن اتفاق سے اسی وقت ایک تیر گوجر خاں کو ایسا لگا کہ وہ اسی وقت گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے گرتے ہی پٹھان میدان چھوڑ کر بدحواسی کے ساتھ بھاگ نکلے۔ بہت سے مارے گئے۔ اسی وقت خان اعظم کا علم دار اس کا جھنڈا لے کر جونہی خان خاناں کے پاس پہنچا اسے گوجر خاں کے قتل کی خبر بھی مل گئی۔ اس اطلاع پر خان خاناں نے اپنی باگیں پھیر لیں اور چند ساتھیوں کے ساتھ معرکہ گاہ میں لوٹ کر آگیا۔ ان لوگوں نے آتے ہی پٹھانوں پر تیر چلانے شروع کر دیے۔

راجہ ٹوڈر مل اور لشکر خاں شاہی میمنہ پر متعین تھے۔ انھوں نے بھی پیش قدمی کر کے غنیم کے میسرہ پر جس کا سردار اسماعیل خاں آبدار تھا اور اسے داؤد نے خانخاناں کا خطاب دے رکھا تھا، حملہ کر دیا۔ اسی طرح شاہم خاں جلائر اور پاینده محمد خاں مغل اور دوسرے سرداروں نے جو شاہی میسرہ پر تھے پٹھانوں کے میمنہ پر جس کا سردار حاکم اڑیسہ خان جہاں تھا حملہ کر دیا۔ دونوں پہلوؤں سے غنیم کی فوج کو دباتے ہوئے یہ لوگ داؤد کی خاص جمعیت تک جا پہنچے اور اس کے نامی گرامی ہاتھیوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے انھیں پراگندہ کر دیا۔ اس حملہ سے داؤد کی جمعیت میں افراتفری مچ گئی۔ اسی وقت خان خاناں فتح کے پھریرے لہراتا ہوا دور سے نمودار ہوا۔ گوجر خاں کے مارے جانے کی خبر داؤد کو ملی۔ اس غیر متوقع صورت حال سے داؤد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ میدان چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اس کے وہ سارے ہاتھی برباد ہوگئے۔

صلح کی گفت و شنید

فتح کے بعد خانخاناں نے اسی منزل میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج کے لیے کچھ دن تک توقف کیا۔ اسے بھی کافی زخم آئے تھے،[1] جن کا علاج کیا گیا۔ لشکر خاں بری طرح زخمی ہو چکا تھا اس لیے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس اثنا میں داؤد بھاگ کر کٹک بنارس جا پہنچا تھا۔ خانخاناں نے اسی منزل سے راجہ کو شاہم خاں جلائر، قباخاں، سید عبداللہ خاں، محمد قلی خاں توقبائی اور سعید خاں بدخشی کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور طے پایا کہ وہ خود بھی زخموں کے ٹھیک ہو جانے

---

[1] گوجر خاں سے دست بدست لڑائی میں خانخاناں کے سر گردن اور بازو پر زخم آئے تھے۔ زخم بڑے کاری تھے۔ اچھے ہو جانے کے بعد بھی کہا کرتے تھے، سر کا زخم اچھا ہو گیا ہے مگر بینائی بگڑ گئی، گردن کا گھاؤ بھر گیا ہے مگر مڑ کر نہیں دیکھ سکتا۔ کندھے کے زخم نے ہاتھ نکما کر دیا۔ سر تک اچھی طرح نہیں جاتا۔

کے بعد ان کے ساتھ آکر شامل ہو جائے گا۔

یہ فوج وہاں سے رخصت ہو کر کل گھاٹی پہنچ گئی اور ادھر داؤد اور تمام پٹھانوں نے کٹک[1] بنارس کے قلعہ کو مقابلہ کے لیے مستحکم کر لیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ غنیم کی تیاریوں کا حال سن کر خان خاناں بھی کٹک بنارس آ پہنچا اور دریائے مہندری کے کنارے کیمپ لگا دیا۔ خانخاناں کے پہنچنے کے بعد صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی اور بڑی رد و کد کے بعد امرا کے مشورہ سے طے پایا کہ داؤد خانخاناں سے آکر ملے اور حلف اٹھا کر مصالحت کا عہد کرلے۔ بنگال کا ایک وسیع علاقہ اسے تفویض کر دیا جائے۔

داؤد اور خانخاناں کی ملاقات

مقررہ دن شاہانہ انداز میں مجلس کو سجایا گیا۔ تمام امرا بہ لحاظ مراتب اپنے اپنے مقام پر بیٹھے۔ سراپردہ اور بارگاہ کے سامنے فوج کے دستے داؤد کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے، بنگالہ کا حکمران نہایت شان و شوکت کے ساتھ افغان سرداروں کے جلو میں بنارس کے قلعہ سے باہر نکلا اور خان خاناں انتہائی تواضع کے ساتھ اس کی تعظیم بجالایا اور ادب کے ساتھ پیشوائی کرتے ہوئے اسے سراپردہ میں لے کر آیا۔ ملاقات کے وقت داؤد نے اپنی تلوار میان سے باہر نکال کر خانخاناں کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ جب سے کہ تم جیسا عزیز دوست زخمی ہوا ہے میں ایسی سپاہ گری سے ہی بیزار ہو گیا ہوں۔ خانخاناں نے وہ تلوار لے کر ایک محافظ کے سپرد کر دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب مسند پر بٹھا لیا۔ باپ کی طرح مشفقانہ انداز میں مزاج پرسی کی۔ اس موقع پر طرح طرح کے کھانے، حلوے اور شربت تیار کیے گئے تھے۔ خانخاناں نے اپنے معزز مہمان کو نہایت اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اہم امور پر گفتگو شروع ہوئی اور عہد نامہ کی تکمیل کی گئی۔ اس سے فارغ ہونے پر خانخاناں نے ایک تلوار اپنے خاص اسلحہ خانہ سے منگائی۔ اس تلوار کا دستہ اور بند حسن قیمتی جواہرات سے مرصع تھا۔ یہ تلوار اس نے داؤد کی کمر سے باندھتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ آپ بادشاہ کے دولت خواہ بن چکے ہیں، یہ تلوار شہنشاہ کی طرف سے باندھ لیجیے، بنگال کے علاقہ کے متعلق میں بادشاہ سے درخواست کروں گا، حسب منشاء اس سلسلہ میں فرمان پہنچ جائے گا۔ غرض طرح طرح کے تکلفات کے بعد قیمتی تحائف دے کر خانخاناں نے داؤد کو رخصت کیا اور یہ شگفتہ اور بارونق محفل برخاست ہو گئی[2]۔

خان خاناں اس مہم سے دس ماہ صفر ۹۸۳ھ کو ٹانڈہ کے صدر مقام پر لوٹ آیا اور وہاں سے اس نے سارے حالات کے متعلق عریضہ لکھ کر بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق فرمان، بھاری خلعتیں، جڑاؤ تلوار اور مع ساز کے ایک عربی گھوڑا روانہ کر دیا۔ بنگالہ کے معاملات خان خاناں کو تفویض کر کے اسے وہاں کا مطلق العنان حاکم بنا دیا۔ ۹۸۲ھ میں بتاریخ ۱۶ جمادی الثانی (اول) میاں شیخ داؤد جھنی وال نے وصال فرمایا۔ ان کی تاریخ وفات "یا شیخ داؤد ولی" ہے۔ میں نے "کمالات دستگاہ"

---

[1] ماثر الامرا میں کٹک اڑلیسہ لکھا ہے، یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] داؤد کے ساتھ صلح کے لیے جب مغل امیروں میں مشورے ہو رہے تھے تو راجہ ٹوڈرمل ہی صرف ایسا آدمی تھا جو صلح کا مخالف تھا اس کا کہنا تھا کہ غنیم کی جڑ اکھڑ چکی ہے، خرگوش کی طرح چاروں طرف بھاگا پھرتا ہے، اب اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ لیکن اکثر امیر جلد صلح کر لینا چاہتے تھے، کیونکہ وہ عرصہ سے بنگال کی ناموافق آب و ہوا میں مسلسل دوڑ دھوپ کرتے رہے تھے اور کافی تھک چکے تھے، چاہتے تھے جلد فیصلہ ہو اور صحیح سلامت گھروں کو لوٹ جائیں۔ کثرت رائے سے ٹوڈرمل کی بات پیچھے رہ گئی اور صلح کا جشن منعقد کیا گیا۔ ٹوڈرمل بھی اپنی بات کا پورا تھا، وہ نہ تو اس جشن میں شامل ہوا اور صلح نامہ پر اپنی مہر لگائی۔

تاریخ کہی تھی۔

جب بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر آئے تو ماہ ذی قعدہ ۹۸۲ھ میں فتح پور میں نئی خانقاہ کے پاس ایک عبادت خانہ کی بنیاد رکھی جو چار ایوانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

شیخ ابوالفضل کی باریابی

انہی دنوں شیخ ابوالفضل ولد شیخ مبارک ناگوری جسے علّامی بھی لکھا جاتا ہے اور اسی نے بے دینی کا یہ سارا ہنگامہ برپا کیا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ باریابی کے وقت اس نے "آیۃ الکرسی" کی تفسیر پیش کی، جس میں بہت سے قرآنی رموز و نکات درج تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر در اصل اس کے والد کی لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس تفسیر کو پسند فرمایا، اس کی تاریخ "تفسیر اکبری" نکالی گئی۔ بادشاہ نے مغرور اور متکبر ملاؤں کی سرکوبی کی توقع مجھ سے لگا رکھی تھی۔ اس کام کے لیے اب انھیں موزوں آدمی مل گیا۔ ابوالفضل کو پہلے ہی سے علما کے ساتھ بڑی پرخاش تھی جس کا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں اہل بدعت کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور میر حبش جیسے لوگ قتل کیے گئے تھے۔ شیخ عبدالنبی مخدوم الملک اور دوسرے تمام علما نے متفقہ طور پر عرض کیا تھا کہ شیخ مبارک مہدی بھی بدعتی اور سخت گمراہ ہے۔ ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اجازت لے کر شیخ کو حاضر کرنے کے لیے محتسبوں کو روانہ کر دیا تھا۔ شیخ مبارک اپنے بیٹوں کو لے کر کہیں چھپ گیا اور لوگوں نے اس کی مسجد کے منبر کو توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اسی لیے شیخ مبارک نے ان کے ذریعہ سفارش کرانی چاہی۔ شیخ سلیم نے اپنے ایک مرید کے ہاتھ کچھ رقم سفر خرچ کے لیے اس کے پاس بھیج دی اور کہلوایا تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اس ملک سے بھاگ کر گجرات چلے جاؤ۔ جب شیخ مبارک کو ان کی طرف سے ناامیدی ہوئی تو انھوں نے میرزا عزیز کوکہ کو وسیلہ بنایا۔ اس نے بادشاہ سے شیخ مبارک کی علمیت اور درویشی کی بڑی تعریف کی اور اس کے لڑکوں کے علم و فضیلت کو بھی سراہا اور کہا کہ اس کے پاس سرکاری انعام کی کوئی زمین نہیں ہے اور وہ ایک متوکل شخص ہے۔ ایسے درویش صفت آدمی کو آزار پہنچانا کچھ مناسب نہیں۔ کوکہ کی سفارش پر بادشاہ نے ان باپ بیٹوں کو سزا دینے کا خیال ترک کر دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کے دن ایسے پھرے کہ شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمات زمانہ سازی، بددیانتی، مزاج شناسی اور خوشامد کے ذریعہ بادشاہ کا بہت زیادہ تقرب حاصل کر لیا اور جیسے ہی موقع ملا اس نے بادشاہ کی پشت پناہی سے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے اس کے خاندان کے خلاف چغلیاں کھائی تھیں اور ایذا رسانی کی ناکام کوشش کی تھی طرح طرح سے رسوا کیا اور مدتوں پہلے گزری ہوئی باتوں کا ایک ایک کر کے انتقام لیا۔ اس کے انتقام کی لپیٹ میں صرف اس کے مخالف ہی نہ آئے بلکہ وہ عام و خاص ہر ایک کی ایذا رسانی پر اتر آیا، چنانچہ اس کی وجہ سے کتنے ہی مشائخین صالحین اور صاحب احتیاج اشخاص کی معاش اور وظیفے بند ہو گئے۔ ان لوگوں کو وہ طرح طرح سے ایذائیں دیتا تھا اور زبان حال و قال سے مزے لے لے کر کہا کرتا تھا ؎

یارب بہ جہانیاں دلیلی بفرست — نمرودان راچو پشہ فیلی بفرست
فرعون وشاں دست برآوردستند — موسیٰ وعصا و رود نیلی بفرست

اس کی ان کارگزاریوں سے جب لوگ ہائے ہائے کرنے لگے تو وہ ان پر طنز کرتے ہوئے اکثر یہ رباعی پڑھا کرتا تھا ؎

آتش بہ دو دست خویش در خرمن خویش
چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش
اے وائے من و دست من و دامن خویش

بحث و مباحثہ کے وقت اگر کوئی کسی مجتہد کا قول پیش کرتا تو وہ نہایت جسارت سے کہا کرتا تھا فلاں حلوائی، فلاں موچی اور فلاں چرم فروش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ غرض علمار کا انکار اور ان کی توہین اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

بادشاہی عبادت خانہ ۹۸۳ھ میں عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ ان کی تعمیر کا پس منظر یہ تھا کہ جب گزشتہ چند سالوں میں اکبر کو بڑی بڑی فتوحات نصیب ہوئیں اور روز بہ روز مملکت کی حدود میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملک کا سارا نظم و نسق حسب منشا قائم ہو گیا اور دنیا میں کوئی مخالف اور دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان زیادہ تر عبادت اور ریاضت کی طرف ہو گیا، چنانچہ اجمیر کی درگاہ معینہ کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ صحبتیں رہنے لگیں اور اس کے زیادہ تر اوقات اللہ رسول کے "تذکرے" میں گزرنے لگے۔ ان محفلوں میں وہ اکثر تصوف کی باتوں، فقہی مسئلوں اور علمی مباحثوں میں مصروف نظر آنے لگا۔ راتیں بھی اللہ کی عبادت میں گزرنے لگیں۔ کسی نے "یا ہو" اور "یا ہادی" کا وظیفہ بتا دیا تھا وہ عموماً راتوں میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بڑا اثر تھا چنانچہ ان نعمتوں کے شکرانہ میں جو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا کی تھیں تقریباً ہر روز وہ ایک پرانے حجرہ میں جو آبادی سے دور شاہی محلات کے قریب واقع تھا سنگی فرش پر مراقبہ میں بیٹھا رہتا تھا۔ حاکم بنگالہ سلیمان کرانی کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پچھلی رات کو اٹھ کر ڈیڑھ سو مشائخین اور علما کے ساتھ تہجد کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا اور فجر کی نماز تک ان عالموں کی مجلس میں تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا تھا، فجر پڑھنے کے بعد ملکی معاملات، فوج اور لشکر کے حساب کتاب میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ اکبر نے بھی اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ ان دنوں میرزا سلیمان کے آنے کی بھی خبر تھی۔ مرزا سلیمان صوفی منش، صاحب حال بادشاہ تھا۔ صاحب بیعت بھی تھا، لوگ اس کے ہاتھ پر مریدی کی بیعت کیا کرتا تھا، لہٰذا اکبر نے کچھ تو شوق عبادت میں اور کچھ آنے والے اس معزز مہمان کی خاطر شیخ عبداللہ نیازی کے حجرہ پر ایک بڑی عبادت گاہ تعمیر کرائی۔ عبداللہ نیازی کے حالات ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ پہلے شیخ الاسلام چشتی کے مرید تھے بعد میں مہدوی سلسلہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس عبادت گاہ کے چاروں طرف ایک وسیع ایوان اور نواب تلاؤ نامی حوض تیار کرایا گیا اور اس حجرہ کو "عبادت خانہ" کا نام دیا گیا جو بعد میں "عبادت خانہ" ہو گیا۔ ملا قتیری نے اسی کے بارے میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر ہے۔

دریں ایام دیدم جمع با اموال قارونی
عبادت ہائے فرعونی عمارت ہائے شدادی

عبادت خانہ کی محفلیں اکبر کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد شیخ الاسلام کی جدید خانقاہ سے اس عبادت خانہ میں آکر مجلس

منعقد کرتا تھا۔ اس محفل میں نامی گرامی علما، مشائخین اور چند خاص مصاحب اور ندیم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ دوسروں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس محفل میں عموماً علمی مباحث اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔

اسی محفل میں ایک دن جلال خاں قورچی نے جو میر المحسن اور کرم فرما تھا، اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث سے ملنے آگرہ گیا تھا، ان کا افلاس کے مارے ایسا برا حال ہے کہ ایک دن انھوں نے چند سیر چنے منگائے جس میں سے کچھ تو خود کھائے کچھ مجھے دے دیئے اور ایک حصہ اپنے گھر والوں کے لیے بھیج دیا۔ یہ سن کر اکبر بہت متاثر ہوا اور شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ سے بلوا کر اسی عبادت خانہ میں ان کے قیام کا انتظام کرا دیا۔

مذکورہ عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو بھی محفل منعقد ہوتی تھی جس میں سادات، مشائخ، علما اور امرا سبھی حاضر رہتے تھے بادشاہ کے قریب نشستیں لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور لوگ آپس میں بڑی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے، اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا کہ امراء تو مشرقی جانب بیٹھیں، سادات مغربی جانب، علماء کی نشست جنوبی حصہ میں اور مشائخین شمال میں بیٹھا کریں۔ اکبر باری باری ہر ایک کی نشست گاہ میں جا کر ان کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس موقع پر طرح طرح کی خوشبوؤں سے پوری مجلس مہک اٹھتی تھی اور بادشاہ مستحق لوگوں کی جو مقربان دربار کے وسیلہ سے وہاں پہنچ جاتے تھے حسب مدارج مالی امداد بھی کیا کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خاں گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت ساری نفیس اور قیمتی کتابیں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کتابوں کو اکبر نے خود اپنے ہاتھ سے اس محفل میں آنے والے علما میں تقسیم کیا۔ مجھے بادشاہ نے جو کتابیں دی تھیں ان میں ایک کتاب "انوار المشکوٰۃ" تھی، جس میں "مشکوٰۃ الانوار" کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ بھی شامل تھا۔ جو کتابیں بچ گئیں وہ امراء کو دوسرے تحفوں اور راشیل کے عوض عطا کیں۔ مال غنیمت کو اکبر "ارباس" یعنی زوال دشمن کہا کرتا تھا۔

ایک رات اسی محفل میں علما کی مجلس میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا اور وہ چیخ چیخ کر بحث کرنے لگے۔ ان کے شور و غل سے بادشاہ نے برہم ہو کر مجھ سے کہا "اس کے بعد جو شخص بھی ناشائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دینا، میں اس کو مجلس سے اٹھا دوں گا۔" میں نے اس وقت چپکے سے آصف خاں کو کہا "اس طرح تو تقریباً سبھی کو اٹھوانا پڑے گا۔" اکبر نے مجھے یہ کہتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے پوچھا "کیا کہہ رہے ہو۔" جو کچھ میں نے کہا تھا وہ دہرا دیا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے مصاحبوں کو بھی یہ بات بتائی۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری

اس محفل میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو چھیڑنے اور تنگ کرنے کے لیے اکثر بلایا جاتا تھا۔ اس کہن سال عالم کو شیخ ابو الفضل جواب ایک نئے دین کا مجتہد بنا بیٹھا ہے اور اس جیسے دوسرے نئے نئے بار یافتہ لوگ بحث و مباحثہ میں الجھا کر کھلونا بنا لیتے اور اس کی ہر بات کو غلط ملط کر دیا کرتے تھے۔ ان مباحثوں کے دوران میں اکبر کا اشارہ پا کر بعض مصاحب اور امیر بھی الٹی سیدھی فرضی باتیں بنا بنا کر اس پر فقرے چست کیا کرتے تھے۔ اس کا بڑھاپا ان سب کے ہاتھوں میں اچھا خاصہ کھیل بن گیا تھا۔

ایک مرتبہ اسی شبینہ محفل میں خان جہاں نے کہا مخدوم الملک نے فتویٰ دیا ہے کہ ان دنوں حج پر جانا فرض نہیں، بلکہ ایک

طرح سے گناہ ہے۔ جب لوگوں نے وجہ دریافت کی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ تو گجرات اور عراق کا ہے جو قزلباشوں کی لوٹ مار سے پُرخطر ہے اور اگر سمندر کے راستہ جائیں تو فرنگیوں سے پروانہ راہداری لینے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے ان کے پروانۂ راہداری پر حضرت عیسیٰؑ اور بی بی مریم کی تصویر چسپاں رہتی ہے جو بت پرستی کی ایک شکل ہے، اس لیے یہ دونوں راستے حج کے لیے بند ہو گئے ہیں۔

اس کے متعلق خان زماں نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتا ہے کہ ہر سال کے اختتام پر سارا مال متاع اپنی بیوی کے نام کر دیتا ہے اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام پر واپس لے لیتا ہے۔

غرض خان زماں نے مخدوم الملک کی کنجوسی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیا داری کے بہت سے قصے سنائے اور اس نے علما و مشائخین خاص طور سے پنجاب کے مستحق لوگوں پر جو جو زیادتیاں کی تھیں وہ سب ایک ایک کر کے بتائیں۔ بس پھر کیا تھا بہت سے لوگوں کی زبانیں کھل گئیں اور لوگ اس کی اہانت اور مذمت کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر قصے سنانے لگے آخر میں یہ طے پایا کہ اسے حج کے لیے زبردستی مکہ معظمہ روانہ کر دیا جائے۔ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تم پر حج فرض ہے؟ تو اس نے جواب دیا "نہیں"۔

شیخ عبدالنبی

ان دنوں مخدوم الملک کا ستارہ زوال میں آچکا تھا اور دربار سرکار میں شیخ عبدالنبی کا سورج چمکنے لگا تھا چنانچہ بادشاہ تعظیم و احترام کی وجہ سے کبھی کبھی حدیث سننے کے لیے خود اس کے گھر پر چلا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو اکبر نے اس کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی تعلیم کے لیے اسی کے حجرہ میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ عموماً مولانا عبدالرحمٰن جامی کی "چہل حدیث" کا درس دیا کرتا تھا۔

شیخ عبدالنبی کو محدّثی، حافظی اور امامی کا بڑا دعویٰ تھا، لیکن علمیت کا یہ حال تھا "الحزم سوء ظن" کی حدیث جب بھی سناتا تو ہمیشہ "الحرم" کو "الخزم" ("ح" کے بجائے "خ" اور "ز" کے بجائے "ر") پڑھا کرتا تھا۔ مدتوں تک اس کو اپنی اس غلطی کا احساس نہ ہوا۔ جس وقت بادشاہ اس سے برداشتہ خاطر ہو گئے تھے اور ملاؤں کا گروہ دربار سے نکل گیا تھا، مرزا عزیز کوکہ نے بادشاہ کو بتایا تھا کہ علم حدیث میں اس کی یہ قابلیت ہے جس پر وہ ناز کیا کرتا ہے، آپ نے اس کو سر چڑھا رکھا تھا، اس لیے اس کا مزاج عرش پر جا پہنچا۔

شیخ عبدالنبی کا غرور و تکبر

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ جب تک کہ ممالک محروسہ کے تمام ائمہ اپنے وظائف اوقاف اور معاش کے فرامین پر صدر (شیخ عبدالنبی) کی مہر نہ لگوائیں "کروڑی" ان کی زمین اجرا نہ کریں"۔ اس فرمان کی وجہ سے ہندوستان کے مشرقی کنارے سے لے کر بکھر تک کے اہل غرض شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے جن کی سفارش کسی امیر و مقرب نے کر دی تو اس کا کام حسب منشا تکمیل پا گیا اور جن کو کسی کا وسیلہ نہیں ملا وہ بچارے سید عبدالرسول اور شیخ کے دوسرے کارندوں کے پاس دھکے کھاتے رہے۔ نہ صرف ان کو بلکہ شیخ کے فراشوں، دربانوں، سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھاری بھاری رشوتیں دے کر ان غریبوں نے اپنا کام بنایا اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ دربانوں کے ڈنڈے کھاتے رہے۔ بہت سے بدنصیب اس ہجوم میں گرمی کی تاب نہ لا کر وہیں جاں بحق ہو گئے۔ اس کی بادشاہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔

لیکن وہ اس صدر عالی قدر کی تعظیم کے منافی کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے بادشاہ نے اس کے منہ پر کوئی بات نہ کہی۔

جس وقت وہ اپنی مسند جاہ و جلال پر متمکن رہتا تھا اور عالی مرتبہ امیر اہل علم کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے اس کے پاس جاتے تھے تو اس کے تیور بس دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ تعظیم و تکریم کا کیا سوال وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے پر اتر آتا تھا اور جب بچارا بڑی عاجزی اور خوشامد کرتا تو ان عالموں کے لیے جو ہدایہ اور دوسری منتہی کتابیں پڑھا سکتے تھے سو بیگھہ کے لگ بھگ کی اراضی منظور کر کے باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت دراز سے قابض تھے قلمزد کر دیتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ ہندوؤں تک کو اچھی اچھی زمینیں از خود عطا کر دیتا تھا۔ اس طرح اس کے ہاتھوں علم کی بھی اور عالموں کی بھی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔

اپنے اجلاس پر دوپہر کے بعد جب وہ نہایت غرور و تکبر سے کرسی پر بیٹھا ہوا وضو بنا رہا تھا تو اس کے مستعملہ پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص صاحبوں کے سروں اور کپڑوں پر گر رہے تھے اور اس کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی اہل علم اور فقراء کا کام نکالنے کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے اور خوشامد، چاپلوسی اور اس کی دلجوئی کی خاطر طرح طرح کی ذلتیں اٹھا رہے تھے۔ پورے شاہی عہد میں کسی صدر الصدور کا یہ اثر اور دبدبہ نہیں رہا جتنا کہ شیخ عبدالنبی کو حاصل ہو گیا تھا ؎

روستائی اگر شود قاضی   حکمہائے کند کہ بگشندش

منصب امامت پر تقرر

انہی دنوں بادشاہ نے مجھے امامت کی خدمت سپرد کی اور کچھ خرچ دے کر فرمایا بیستی عہدہ کے مطابق تم بھی بیس گھوڑوں کو داغ کرا لو۔ اسی زمانہ میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں نیا نیا پہنچا تھا اور جیسا کہ شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ "ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں"۔ میرا اور ابوالفضل کا معاملہ یکساں ہی تھا، لیکن وہ نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ اس کو بھی جب بادشاہ نے "بیستی" کے عہدہ کے لیے گھوڑے داغ کرانے کے متعلق فرمایا تو اس نے فوراً ہی "داغ اور محلہ" کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کر لی اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار کے عہدہ اور وزارت کے منصب تک پہنچ گیا۔ اس کے برعکس میں نے ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے ملازمت کی اس پیش کش کو قبول نہ کیا، اس وقت مجھے یہ مضحکہ انگیز شعر یاد آ گیا تھا جو کسی سید نے اپنے بارے میں کہا تھا ؎

مرا داخلی سازی و بیستی
مبیناد مادر بایں نیستی

میں بس اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مجھے مدد معاش کے لیے اگر بادشاہ کوئی اراضی وغیرہ عنایت فرما دیں تو ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ علمی خدمات میں مصروف رہوں گا کیونکہ قناعت اور توکل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور پونجی نہیں ہو سکتی ؎

جاہ دنیا مطلب دولت فانی بگذار
جاہ دیں بس بود و دولت اسلام ترا

لیکن میری بد نصیبی دیکھو، مجھے وہ بھی میسّر نہ ہوا۔ آخر ماہ شوال ۹۸۳ھ میں مَیں نے دربار سے رخصت کی درخواست دے دی۔ بادشاہ نے اسے منظور نہ فرمایا اور مجھے ایک گھوڑا اور ہزار بیگہ اراضی عطا فرمائی جو اس زمانہ میں بیس گھوڑوں کے مقررہ راتب کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں جو فرمان لکھا گیا تھا اس میں یہ عطیہ مدد معاش کے صیغہ میں رکھا گیا تھا میں نے بہت کچھ عرض کیا کہ اس مختصر اراضی پر ہمیشہ خدمت سے وابستہ رہنا میرے لیے مشکل ہوگا، لیکن کوئی توجہ نہ کی گئی بادشاہ نے صرف یہ فرمایا، لشکروں میں قیام کے موقع پر امداد اور انعام تمھیں دیا جاتا رہے گا۔ اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبد النبی نے کہا ہم نے تمھارے گروہ کے آدمیوں میں کسی کو اتنی امداد نہیں دی۔ جس امداد اور انعام کا وعدہ کیا گیا تھا وہ اب تک کہ بائیس سال ہو چکے ہیں بجز ایک دوبار کے پورا نہیں کیا گیا۔ وہ وعدہ تو بس ایک سراب سے زیادہ نہ تھا جس کے عوض میں خواہ مخواہ ان بیہودہ بندشوں اور لا حاصل خدمتوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اب خدا ہی چاہے تو ان سے نجات ملے ؎

یا وفا یا خبرِ وصال تو یا مرگِ رقیب
بازیٔ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

بہر حال جس طرح بھی گزری اور گزر رہی ہے اس پر خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے ؎

بہ ہمہ حال شکر باید کرد
کہ مبادا ازیں بتر گردد

جن فضول مشغلوں میں یہ عمر کٹی ان کے حسب حال فضولی بغدادی کا یہ قطعہ ہے جو اس نے حیرتی سمرقندی پر شاہ طہماسپ کے التفات و توجہ کے بارے میں کہا تھا:

من ز خاکِ عرب و حیرتی از ملکِ عجم — ہر دو گشتیم باظہارِ سخن کام طلب
یافتم از دو کرم پیشہ مراد دلِ خویش — او ز شاہِ عجم و من نظر از شاہِ عرب

مسئلہ تعدد ازدواج

اس زمانہ میں اکبر نے علماء سے سب سے پہلے یہ مسئلہ پوچھا تھا کہ "کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا درست ہے"۔ علماء نے کہا چار سے زائد آزاد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے"۔ اکبر نے کہا "ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، اب اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے"۔ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ اکبر نے پھر کہا "ہم نے شیخ عبد النبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے"۔ علماء نے کہا "ہاں ایک مجتہد ابن ابی لیلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے تو آیت پاک " فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع " کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن یہ ساری روایتیں مرجوح ہیں ان پر عمل درست نہیں ہوگا"۔ بادشاہ نے شیخ عبد النبی سے بھی دریافت کرایا، اس نے جواب دیا " میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان اختلافات کا ظاہر کرنا مقصود تھا، اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا"۔ عبد النبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے کہا " اس طرح تو شیخ نے ہمارے ساتھ منافقت برتی کہ اس وقت تو کچھ کہا تھا اور اب وہ کچھ اور کہہ رہا ہے"۔ بس اسی وقت سے شیخ عبد النبی کی طرف سے اکبر کا دل کھٹک گیا۔

بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علماء نے بڑے ردّ و بدل اور اختلافی روایتوں کو جمع کر کے آخر یہ فتویٰ دے دیا کہ "متعہ کے طریقہ پر جتنی عورتیں چاہیں نکاح میں رکھنا مباح ہے۔" اور یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔ شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو دوسرے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، حالانکہ اہل سنت کا یہ رویہ نہیں ہے۔ غرض اس معاملہ میں بڑی بحثیں اٹھیں، ان کا خلاصہ "نجات الرشید" میں بیان کیا گیا ہے۔ نقیب خاں نے امام مالک کی "موطا" دکھائی کہ اس میں تو ایک حدیث سے صراحتاً متعہ کی ممانعت نکلتی ہے۔

ایک رات "انوپ تلاؤ" کے حجرہ میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب شیخ ابوالفضل حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت شیخ ابوالفضل نے علماء کی مخالفت کرتے ہوئے ان روایتوں کو جو اس کے والد نے جمع کر کے دی تھیں بیان کیا۔ بادشاہ نے مجھے بھی وہاں بلا کر پوچھا "تم کیا کہتے ہو؟" میں نے عرض کیا "ان تمام مختلف روایتوں اور طرح طرح کے مسلکوں کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے — متعہ امام مالک اور شیعہ علماء کے نزدیک باتفاق مباح ہے اور امام شافعی اور امام اعظمؒ کے نزدیک حرام ہے اور جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اسی وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی باتفاق مباح ہو جاتا ہے۔ بس یہی ایک کانٹے کی بات ہے، اس کے علاوہ قیل و قال اور جنگ و جدال کے سوا کچھ نہیں۔" بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ قاضی یعقوب نے اس وقت مجھ سے بہت بحث کی۔ میں نے اسے جواب دیا کہ "جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہو جاتا ہے۔" اپنے اس دعویٰ پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ کو اور دوسری مثالوں کو میں نے بطور دلیل پیش کیا، نیز میں نے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد پہنچے، تو انھوں نے شافعی مذہب کے طریقہ پر سورۂ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل پر علماء نے بڑے طعنے دیے تھے لیکن دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز بلکہ مستحسن ہونے تک کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جب میں نے یہ باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ کہیں تو قاضی یعقوب کو قائل ہونا پڑا اور اس نے عاجز ہو کر کہا "میں کیا کہوں متعہ کا مباح ہونا مبارک ہو۔" بادشاہ نے فرمایا "اس مسئلہ میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔" اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے موافق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ تمام بوڑھے عالموں صدر سے لے کر مخدوم الملک اور قاضی وغیرہ تک کے لیے یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ اور اسی روز سے ان سب کا زوال شروع ہو گیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے اور ان کی معاش روک دی گئی تھی، آگرہ سے بلا کر سارے ممالک محروسہ کا قاضی بنا دیا اور قاضی یعقوب کو گور (بنگال) کی قضاوت پر بھیج دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا، یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آ گئی۔

"جزیہ اور اللہ اکبر"

اسی زمانہ میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ پوری طرح تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ[1] لگائیں۔ اس سلسلہ میں سب جگہ فرامین بھی جاری کر دیے گئے لیکن جلد ہی یہ حکم اٹھا لیا گیا۔ اسی

[1] جزیہ: اکبر سے پہلے بھی غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا قاعدہ تھا جو کبھی کبھی موقوف بھی ہو جاتا تھا۔ جزیہ کی معافی کا سن ۹۸۷ھ میں دیا ہے۔ اکبر کا ہندوؤں سے وہ معاملہ نہیں تھا جو پہلے سلاطین کا رہا تھا وہ انھیں اپنا بنائے رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھا چنانچہ جلوس کے پہلے سال ہی اس نے جزیہ معاف کر دینا چاہا تھا۔ سنہ ۹ جلوس میں دوبارہ جب یہ معاملہ سامنے آیا تو علما کی مخالفت کی وجہ سے اس پر پوری طرح عمل نہ کیا جا سکا۔ لیکن عملاً اکثر مقامات پر جزیہ موقوف ہو گیا۔ ۹۸۳ھ میں اکبر نے دوبارہ جزیہ لگانے کا حکم دیا لیکن جلد ہی منسوخ کر دیا گیا۔ آخر ۲۵ جلوس ۹۸۸ھ میں اکبر نے مستقلاً معافی جزیہ کا حکم جاری کر دیا۔

زمانہ میں بادشاہ نے دریافت کیا کہ اگر ہم اپنے سکہ اور مُہر میں "اللہ اکبر" درج کروائیں تو کوئی ہرج تو نہیں؟ اکثر نے تو جواب دیا کہ یہ بہت بہتر اور اچھا ہے لیکن حاجی ابراہیم نے مخالفت کی کہ "اس سے تو کچھ اور باتوں کا احتمال ہوتا ہے اگر آیت ولذکر اللہ اکبر" کو نقش کرالیا جائے تو یہ احتمال رفع ہو جائے گا۔" اکبر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور کہا " یہ تو قطعی بات ہے کہ بندہ سے اس عاجزی کے باوجود خدائی کا دعویٰ سرزد نہیں ہوسکتا، ہمارا مقصد تو صرف لفظی مناسبت ہے اس بات کو دوسری طرف لے جانے کا آخر کیا مطلب ہے؟"

اسی سال بادشاہ نے مسئلہ متعہ کی تحقیق سے پہلے ہی سید محمد میر عدل کو جس کا بادشاہ بڑا لحاظ کیا کرتے تھے اکبر کی طرف نامزد کردیا تھا۔ ان کو شمشیر خاصہ، گھوڑا اور پوشاک مرحمت کی گئی۔ ان کا وہاں جانے کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد "میر عدلی" کے اہم منصب پر ان جیسا کوئی شخص مامور نہیں ہوسکا۔ کہتے ہیں ایک دن حاجی ابراہیم سرہندی نے سرخ اور زعفرانی لباس کے جواز کا فتوی دے دیا تھا اور ایک حدیث بھی پیش کی۔ میر عدل (مرحوم) نے بھرے دربار میں اس کو بدبخت اور ملعون کہا اور گالیاں دیتے ہوئے اس کو مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھالیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

حکیم ابوالفتح گیلانی اور ملا محمد یزدی

اسی سال حکیم ابوالفتح گیلانی اور حکیم ہمایوں جس کا نام بدل کر پہلے ہمایوں قلی پھر حکیم ہمام رکھا گیا تھا اور نورالدین قراری، تینوں بھائی گیلان سے دربار میں حاضر ہوئے۔ بڑے بھائی نے آتے ہی ہاتھ پیر نکالے اور خوشامد اور جی حضوری کرکے وہ بادشاہ کے مزاج پر حاوی ہوگیا۔ دین و مذہب میں اختراعات کرکے بہت جلد اس نے بڑا تقرب حاصل کرلیا۔

کچھ عرصہ بعد ملا محمد یزدی جسے عام طور پر "یزیدی" کہا جاتا تھا ایران سے آیا اور گیلان کے ان بھائیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کو شیعیت کی طرف مائل کرنے لگا، چنانچہ وہ صحابہ پر زبان طعن دراز کرتا تھا اور بادشاہ سے مہمل اور جھوٹے قصے بیان کرتا رہتا تھا۔ بیربر حرام زادہ شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح تو اس یزیدی سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے بادشاہ کو سرے سے دین ہی سے منحرف کردیا اور وحی نبوت، معجزہ، کرامت اور شریعت کے مطلق انکار پر لے آئے۔ میں ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکا ان بدبختوں کا جو انجام ہوا وہ حسب موقع انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

ان دنوں بادشاہ کے حکم سے علماء قرآن مجید کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان بڑے ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ دیپ چند راجہ منجھولہ مسخرا کہا کرتا تھا اگر حق تعالیٰ کے پاس گائے معزز نہ ہوتی تو پھر قرآن کے پہلے سورہ میں اس کا کیوں ذکر آتا۔ جب کبھی شاہی محفل میں تاریخ کے مباحث چھڑ جاتے تو صحابہ کے متعلق اکبر کا اعتقاد اور بھی گھٹ جاتا۔

بے دینی کے یہ سارے اسباب جب جمع ہوگئے تو اکبر نماز، روزہ اور دوسرے مسائل سے منحرف ہوگیا اور ان کا نام اس نے "تقلیدیات" رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں غیر معقول ہیں۔ پھر "نقل" کے بجائے "عقل" پر دین کو منحصر سمجھ لیا گیا۔ اسی زمانہ میں فرنگیوں[۱] کی آمد و رفت بھی ہونے لگی اور بادشاہ نے ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کرلیا۔

---

[۱] اہل فرنگ سب سے پہلے اکبر کے دربار میں ۹۸۰ھ میں حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کرکے سورت پر قبضہ کرلیا تھا اکبر نے جب اس کا محاصرہ کرلیا تو اس نے اپنی مدد کے لیے اہل فرنگ کو بلایا تھا، یہ اس کی مدد کو آئے تھے اندر ہی اندر قلعہ پر قبضہ کرلینے کے منصوبے تھے لیکن جب شاہی فوجوں کو فتح ہوئی

ہر خیالے کہ عقل شاں بندد
چرخ بر عقل اہل آں خندد

شیخ بدر الدین کی عزیمت

اسی سال شیخ الاسلام چشتی کے صاحبزادہ شیخ بدر الدین نے جو صاحب سجادہ تھے شاہی ملازمت سے توبہ کی اور اپنے باپ کی طرح گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت، ذکر و فکر اور تلاوت و تلقین کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ ایک رات بادشاہ نے ان کو عبادت خانہ میں بلایا، وہ آئے تو پہلے کی طرح آداب بجا نہ لائے۔ بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے نشست و برخاست کے انداز اور گفتگو سے ان کو بڑی اذیت پہنچائی۔ کچھ تو یہ قصہ اور کچھ اور اسباب ایسے ہوئے کہ وہ تین چار سال بعد ہی غیرت کے مارے بلا اطلاع اجمیر اور وہاں سے گجرات چلے گئے، پھر تنہا ایک کشتی میں بیٹھ کر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیت اللہ میں وہ اکثر وصالی روزہ رکھا کرتے تھے اور تپتی دھوپ میں ننگے پیر طواف کرتے رہتے تھے۔ اسی حال میں وہ اپنے رب سے جا ملے۔ ؎

کمال از کعبہ رفتی بر در یار
ہزار اں آفریں مردانہ رفتی

چوتھے وید کا ترجمہ

اسی سال شیخ بھاون جو دکن کا ایک عقلمند برہمن تھا دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ "بید اتھربن" کا جو ہندوؤں کی چوتھی مشہور وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں، ترجمہ کیا جائے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔ اس کتاب کی بعض عبارتیں نہایت پیچیدہ تھیں اور جو پنڈت مقرر تھا وہ اس کی صحیح تعبیر نہیں کر پاتا تھا، اس لیے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے جب یہ مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی تو بادشاہ نے یہ کام پہلے تو شیخ فیضی کے اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی خاطر خواہ اس کا ترجمہ نہ کر سکا[1]۔ اس بید کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک کہ ایسی عبارت جس میں "لام" بہت آتے ہیں جیسے کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ پڑھی نہ جائے نجات نہیں ہوگی۔ ایک اور حکم ہے چند شرائط پر گائے کا گوشت کھانا مباح ہے، دوسرے یہ کہ میت کو دفن کیا جائے، جلایا نہ جائے۔ اسی بید کے احکام کو پیش کر کے شیخ بھاون نے ہندوستان کے اکثر برہمنوں کو بحث میں لاجواب کر دیا اور اسی کی وجہ سے اس نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

---

[1] بلوک مین نے آئین اکبری کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ اس وید کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تو یہ مکار تحفے تحائف لے کر سفیروں کے بھیس میں بادشاہ کے پاس آ رہا ہے۔ پہلے اور خلعت و انعام لے کر رخصت ہو گئے۔ پھر اکبر نے کئی سال بعد خود حاجی حبیب اللہ کاشی کو گوا بھیجا تا کہ وہ یورپ کے تحفے فرنگیوں سے لے کر آئے کاشی ۹۸۳ھ میں یورپ کا ساز و سامان اور اہل ہنر و کمال کی ایک جماعت کو لے کر دربار میں واپس آیا۔ ان تحائف میں سب سے پہلے آرگن (ارغنوں) باجا بھی ہندوستان میں آیا تھا۔ ابو الفضل نے اکبر نامہ میں ۹۸۶ھ کے ذیل میں لکھا ہے کہ کوچ بہار کے راجہ کا جس وقت اطاعت نامہ آیا تھا اس قافلہ کے ساتھ تاجر بادسو ایک فرنگی تاجر بھی حاضر ہوا تھا۔ ایک اور یورپین باسو بادبان کا نام بھی ملتا ہے جو اس زمانہ میں دربار میں حاضر ہوا تھا۔ ابو الفضل نے جلوس کے ۳۵ میں گوا کے ایک پادری فریبتون کا حال بھی لکھا ہے کہ وہ بڑا عالم تھا، شہزادوں کو پڑھانے اور یونانی کتب کے ترجمہ کا کام اس کے سپرد ہوا۔ اقبال نامہ میں ۱۰۰۳ھ چالیسویں جلوس میں بھی پادریوں کے ایک وفد کی حاضری کا حال لکھا ہے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ یہ عیسائی اپنے ساتھ انجیل اور تثلیث کا عقیدہ لے کر آئے، اکبر نصرانیت سے متاثر ہو گیا تھا، ان کی بڑی خاطر کرتا تھا، توریت اور انجیل کے ترجمہ کا حکم بھی دیا تھا۔ ان کی عبادت کے موقع پر بادشاہ ناقوس اور باجے سنا کرتا تھا۔

گلبدن بیگم کی حج پر روانگی

اسی سال ماہ شعبان میں بابر بادشاہ کی صاحبزادی گلبدن بیگم جو بادشاہ کی پھوپھی ہوتی ہیں، نورالدین محمد مرزا کی بیٹی سلیمہ سلطان بیگم کے ساتھ جو پہلے بیرم خاں خانخاناں کے عقد میں تھیں، بعد میں بادشاہ کے نکاح میں آگئی تھیں، حج کے لیے روانہ ہوئیں۔ انھیں ایک سال تک گجرات میں ٹھہرنا پڑا، پھر انھوں نے حجاز پہنچ کر چار حج کیے۔ واپسی کے وقت ان کا جہاز ٹوٹ گیا اس لیے عدن میں ایک سال تک قیام کرنا پڑا۔ یہ دونوں ہندوستان کو ۹۹۰ھ میں لوٹ کر آئیں۔ اس وقت سے پانچ چھ سال تک بادشاہ کا یہ معمول رہا کہ وہ دربار کے کسی امیر کو "امیر الحاج" بنا کر لوگوں کو حج پر جانے کی عام اجازت دیتے تھے اور حاجیوں کو سفر خرچ نقد روپیہ اور بھاری تحائف دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ طریقہ برخواست کر دیا گیا۔

مرزا سلیمان کی ہندوستان میں آمد

مرزا سلیمان بابر کے زمانہ سے بدخشاں کا مستقل حاکم تھا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا، آخر میں جب اس کا مقابلہ پیر محمد خاں اوزبک اور اس کی بیوی ولی نعمت بیگم کی فوجوں سے ہوا تو اس کا لڑکا ابراہیم مرزا مارا گیا اور مرزا سلیمان سخت مشکلات میں پھنس گیا۔ اسی اثنا میں ابراہیم میرزا کا لڑکا شاہرخ مرزا باغی بن بیٹھا اور اس نے خروج کر کے سارے بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔ میرزا سلیمان کے لیے بدخشاں میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا، چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر پہلے تو کابل میں مرزا محمد حکیم کے پاس مدد لینے آیا، لیکن جب دیکھا کہ مرزا حکیم مدد دینے پر راضی نہیں تو اس نے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ ایک رہنما فوج کر دی جائے تاکہ وہ اسے نیلاب (اٹک) کے کنارے تک خطرناک مقامات سے بحفاظت پہنچا دے۔ مرزا نے بڑے ناز نخروں کے بعد اس کے ساتھ ایسے آدمیوں کو کر دیا جو پہلی ہی منزل پر اسے تنہا چھوڑ کر کابل کو بھاگ گئے۔

مرزا سلیمان تن تنہا بے سروساماں اپنی ایک لڑکی کو لیے ہوئے ہندوستان کے راستہ پر سفر کرتا رہا۔ بعض مقامات پر پٹھانوں نے اس کا راستہ بھی روکا، مرزا سلیمان بہادری کے ساتھ لڑتا بھڑتا ان سے بچ کر نکل آیا۔ اسی مقابلہ میں اسے ایک تیر کا زخم بھی لگا غرض وہ نہایت پریشانی کی حالت میں نیلاب (اٹک) کے کنارے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے دو تین قیمتی گھوڑے عرضی کے ساتھ اکبر کے دربار میں روانہ کیے۔ بادشاہ نے آغا خاں خزانچی کے ذریعہ پچاس ہزار روپیہ قیمتی تحفے اور چند عراقی گھوڑے مرزا کے استقبال کے لیے روانہ فرمائے۔ اس سے پہلے ہی راجہ بھگوان داس حاکم لاہور حسب فرمان پیشوائی کے لیے پہنچ چکا تھا اور ہر روز شاہی مہمانوں کی ضیافت و خاطر داری کر رہا تھا، راستہ میں بھی جتنے حکام اور امراء تھے وہ بھی مہمانداری کے فرائض انجام دے رہے تھے، غرض مرزا سلیمان کو پورے اعزاز و احترام کے ساتھ دارالخلافہ لایا گیا۔

اسی دوران میں اکبر نے گجرات سے خان اعظم کو بھی بلا لیا اس جشن میں شرکت کے لیے وہ نہایت تیزی سے یلغار کرتے ہوئے ۴ رجب ۹۸۳ھ کو فتح پور پہنچ کر باریاب ہوا۔ ایک دن خان اعظم نے موقع پا کر داغ کے قانون اور کروڑیوں کے مظالم، فوج کے مالی معاملات، رعایا کی عام بدحالی اور بادشاہ کی بدعتوں کے متعلق کھری کھری باتیں سنائیں اور ان امور کے متعلق بڑی جرأت کے ساتھ بغیر کسی لاگ لپیٹ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکبر کو اس کی باتیں بڑی تلخ معلوم ہوئیں اور وہ اس سے ناراض ہو گیا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اس حق بات کو برداشت نہ کر سکا اور اسے حکماً کورنش سے روک دیا اور اس پر بادشاہی محافظ بھی مقرر کر دیے

کہ دوسرے امیر بھی اس سے ملنے نہ پائیں۔ چند دن بعد اکبر نے خان اعظم کو آگرہ بھیج دیا، وہاں اسے اس کے باغ میں نظر بند کر دیا گیا۔

مرزا سلیمان کا شاہانہ استقبال

مرزا سلیمان جب متواتر کوچ کرتے ہوئے لاہور سے متھرا پہنچا، تو بڑے بڑے امراء اور قاضی نظام بدخشی جس کو مرزا سلیمان نے قاضی خاں کا خطاب دیا تھا اور اکبر کے دربار سے اسے غازی خاں کا خطاب مرحمت ہوا تھا، استقبال کے لیے گئے۔ مرزا سلیمان اس سال ۱۵ رجب کو فتح پور کے قریب پہنچا اس کی پیشوائی کے لیے دربار کے مصاحبین اور معزز لوگ بھیجے گئے پھر خود بادشاہ تمام امرا کے ساتھ پانچ کوس تک اس کو لانے کے لیے تشریف لے گئے۔

مرزا سلیمانؒ کا استقبال بڑی دھوم دھام کے ساتھ کیا گیا چنانچہ اس دن راستہ کے دونوں طرف پانچ ہزار ہاتھی کھڑے تھے جن میں سے بعض پر تو فرنگی مخمل کی اور بعض پر رومی زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ سونے اور چاندی کی زنجیروں سے آراستہ تھے۔ ان کے سروں پر اور ان کی گردنوں میں سیاہ اور سفید جھالریں لٹک رہی تھیں، ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ سنہری زین والے عربی گھوڑے بھی صف بستہ تھے۔ دو دو ہاتھیوں کے درمیان ایک ایک گاڑی تھی جس میں چیتےؒ بند تھے۔ ان کے گلے میں مخمل اور قماش کے سنہری پٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان گاڑیوں کے جو بیل تھے ان میں سے ہر ایک کے سر پر زردوزی کے تاج رکھے ہوئے تھے۔ اس ساز و سامان کی سنہری روپہلی جھلمل سے جنگل میں بس آگ سی لگ گئی اور دشت رشک گلزار لالہ زار بن گئے۔

ؒ مرزا سلیمان: تین واسطوں سے امیر تیمور کا پوتا تھا۔ مرزا سلیمان بن خان مرزا بن سلطان محمود مرزا بن سلطان ابو سعید مرزا بن امیر تیمور گورگان۔ بدخشاں میں قدیم سے ایک خود مختار خاندان حکمران تھا جو خود کو سکندر کی اولاد بتاتا تھا۔ سلطان ابو سعید مرزا نے وہاں کے آخری بادشاہ سلطان محمد سے بدخشاں چھین لیا۔ جب سلطان محمود مرزا کا انتقال ہوا تو ۹۰۵ھ میں اس کے ایک سردار خسرو نے خسرو شاہ کے نام سے بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔ ۹۱۰ھ میں بابر نے خسرو کو یہاں سے بے دخل کر دیا اور ۹۱۲ھ میں خان مرزا کو بدخشاں پر حاکم بنا دیا۔ مرزا سلیمان کو بابر نے اپنے ساتھ رکھا۔ جس وقت سلطان سعید نے بدخشاں پر حملہ کیا تھا بابر نے ہندوستان سے مرزا سلیمان کو بھیجا، سلطان سعید پہلے ہی ہندال کے مقابلہ سے بچ کر بدخشاں سے لوٹ گیا تھا۔ ہندال کو بابر نے وہاں سے بلا لیا تھا اس لیے مرزا سلیمان آسانی سے بدخشاں کا حاکم بن گیا۔ مرزا سلیمان نے چار بار کابل پر حملہ کیا لیکن کبھی اسے مستقل کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مرزا کامران نے ایک مرتبہ اس پر حملہ کر کے اسے قید کر دیا تھا ہمایوں نے بھی اس پر حملہ کر کے بدخشاں پر قبضہ کر لیا تھا بعد میں ہمایوں نے اسے دوبارہ بدخشاں کا حاکم بنا دیا۔ حج سے واپسی کے بعد ۹۹۳ھ میں مرزا حکیم کے ساتھ بدخشاں پر حملہ کر کے اس نے اپنے پوتے مرزا شاہرخ سے بدخشاں چھین لیا، پھر شاہرخ نے اس کو ایسا تنگ کیا کہ وہ بخارا چلا گیا۔ وہاں کے حاکم عبداللہ خاں ازبک نے گرفتار کر لینا چاہا تو بھاگ کر حصار آیا۔ اس اثنا میں عبداللہ خاں نے بدخشاں پر قبضہ کر لیا اور مرزا سلیمان اور ان کا پوتا شاہرخ دونوں بھاگ کر کابل آ گئے اور مرزا حکیم سے مدد لے کر ازبکوں سے عرصہ تک مقابلہ کرتے رہے پھر مایوس ہو کر کابل آ گئے۔ اس وقت مرزا حکیم مر چکا تھا اور مان سنگھ کابل کا صوبہ دار تھا اس نے دربار اکبری میں بھجوا دیا۔ مرزا سلیمان نے ۷۷ برس کی عمر میں ۹۹۷ھ بمقام لاہور انتقال کیا۔

ؒ چیتوں کا شوق: اکبر کو بارہ سال کی عمر سے ہی چیتوں کا شوق تھا۔ جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان آیا تو سرہند کے مقام پر سکندر خاں افغان کو شکست ہوئی اور مال غنیمت میں اس کا ایک پالتو چیتا فتح باز نامی بھی پیش ہوا۔ چیتے بان کا نام دوندو تھا۔ جب دوندو نے اپنے کرتب اور چیتے کے ہنر ایک تماشے میں پیش کیے تو اکبر کو یہ کھیل بہت پسند آیا تھا۔ اس نے سینکڑوں چیتے جمع کر رکھے تھے۔ ان کو باقاعدہ سدھایا جاتا تھا۔ پنجاب میں شکار کے موقع پر ایک ہرن پر شاہی چیتا چھوٹا گیا۔ ہرن نے ایک گڑھے پر سے چھلانگ لگائی چیتے نے بھی اس کے پیچھے جست کی اور ہوا میں اس کو جا دبوچا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کبھی چیتوں کی تعداد ہزار تک نہ پہنچی۔ جب ایک دو کی کسر رہ جاتی تو کچھ نہ کچھ ایسا عارضہ ہوتا تھا کہ چند چیتے مر جاتے تھے۔ بادشاہ کو اور سب کو اس مسلسل اتفاق پر بڑی حیرت رہتی تھی۔

جب مرزا سلیمان کی نظر دور سے بادشاہ کی سواری پر پڑی تو وہ بے تکلف گھوڑے سے اُتر کر دوڑنے لگا اور قریب پہنچ کر تسلیمات بجا لایا۔ شہنشاہ بھی ادباً گھوڑے سے اتر آئے اور اسے ان رسمی تکلفات کو ادا کرنے سے روک دیا، تپاک سے بغل گیر ہو گئے۔ ملاقات کے بعد دونوں سوار ہو کر باتیں کرتے ہوئے چلے۔ مرزا سلیمان کی مہمانی کا انتظام انوپ تلاؤ کے دولت کدہ میں کیا گیا تھا۔ اس وقت انوپ تلاؤ کے در و دیوار اور صحن کو منقش اور زریں سائبانوں سے سجایا گیا تھا۔ زرکار فرش بچھا ہوا تھا اور ہر قسم کا شاہانہ ساز و سامان سلیقہ سے جمایا گیا تھا۔ تخت سلطنت پر اکبر نے مرزا سلیمان کو اپنے پاس بٹھا لیا اور شاہزادہ کو بلا کر مرزا سے ملایا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے بدخشاں کی تسخیر کے لیے روپیہ اور فوج سے مدد دینے کا وعدہ کیا۔ مرزا کے ٹھہرنے کے لیے ہتیا پول کے بُرج میں جہاں نقار خانہ تھا ایک مکان کا انتظام کرا دیا گیا تھا۔

فاتحہ خوانی کی بحث

مرزا سلیمان کبھی کبھی راتوں میں عبادت خانہ میں آتا تھا اور علما و مشائخین کی محفل میں بیٹھا کرتا تھا۔ اکثر اس پر وجد و حال طاری رہتا تھا اور بڑی اونچی اونچی باتیں کیا کرتا تھا۔ کبھی اس کی نماز باجماعت فوت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی، میرزا نے اعتراض کیا کہ تم نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی؟ میں نے کہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز کے بعد فاتحہ پڑھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نے کہا "ولایت (ایران) میں علم نہیں ہے علماء نہیں ہیں وہاں تو فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔" میں نے کہا "ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے، تقلید سے ہم کو کیا سروکار۔" بادشاہ نے فرمایا "بحث چھوڑو آئندہ پڑھ لیا کرو۔" میں نے بادشاہ کے ارشاد کو قبول کر لیا، لیکن میں نے فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کے بارے میں جو روایت تھی وہ ان کے سامنے بیان ضروری کر دی۔

تورۂ چنتائی

انہی دنوں اکبر نے "تورۂ چنتائی" کی قدیم رسم کو جو متروک ہو چکی تھی۔ محض مرزا سلیمان کو دکھانے کے لیے دوبارہ رواج دیا۔ دیوان خانہ میں ایک بڑا دستر خوان بچھایا جاتا تھا اور لشکریوں کو رسماً اس دستر پر کھانے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ جب مرزا چلا گیا تو یہ رسم بھی بند ہو گئی۔ اکبر نے مرزا سلیمان کی مدد کے لیے حاکم پنجاب خان جہاں کو فرمان لکھ دیا کہ وہ [illegible] لے کر میرزا کے ساتھ بدخشاں کو جائے اور میرزا شاہ رخ سے بدخشاں چھین کر میرزا سلیمان کے سپرد کر دے، پھر لاہور [illegible] لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا، چنانچہ معاملات نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کر لی۔

منعم خاں خانخاناں کی وفات

منعم خاں خانخاناں بنگال پر متعین تھا۔ جب داؤد سے صلح ہو گئی تو وہ ٹانڈہ [illegible] معتدل تھی کوچ کر کے لشکر کو گنگا کے اس پار گور کے علاقہ میں لے گیا۔ گور [illegible] جہاں کی آب و ہوا [illegible] تھا، وہاں کی آب و ہوا نہایت خراب اور متعفن تھی۔ منعم خاں نے وہاں پہنچ کر شہر کی تعمیر کا حکم دیا۔ امراء نے اس کو [illegible] ارادہ سے روکنا بھی چاہا لیکن موت ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں تک لے آئی تھی اس لیے وہ باز نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خراب آب و ہوا سے لشکر میں طرح طرح کی بیماریاں جن کا نام بھی کسی نے نہ سنا تھا پھیل گئیں۔ روزانہ بے شمار آدمی بیماریوں کا شکار ہو کر مرنے لگے۔ اس علاقہ میں ہزارہا آدمی متعین تھے ان میں سے بہ مشکل چند سو اپنے اپنے وطن کو لوٹ کر آسکے باقی سب وہیں پیوند خاک ہو گئے ع "چہ دامن گیر یا رب منزلی بود"

لہ مرنے والوں میں حاجی محمد خاں سیستانی بھی تھے جو بیرم خاں کے زمانہ کے قدیم نبرد آزما سردار تھے، اشرف خاں میر منشی بھی اسی وبا میں فوت ہوئے۔

کثرت اموات کا یہ حال تھا کہ مُردوں کو دفن کرنا ممکن نہ رہا تھا، مجبوراً ان کو پانی میں بہا دیا جاتا تھا اور ہر گھڑی کسی نہ کسی امیر کے فوت ہو جانے کی خبر خانخاناں کو مل رہی تھی، لیکن نہ معلوم اس کے کانوں میں کس غفلت کی روئی بھری تھی کہ وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آیا اور اس کی نازک مزاجی سے ڈر کر امرا کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اس سے سختی کے ساتھ واپسی کا مطالبہ کریں۔ آخر موت نے ہی آکر اسے چونکایا، لیکن اب مہلت کہاں رہی تھی، خانخاناں بھی ان وباؤں کا شکار ہو کر بستر مرگ پہ اس طرح گرا کہ پھر اسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کا انتقال دس رجب ۹۸۳ھ میں ہوا۔[1]

خانخاناں[2] نے اپنے پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا تھا اس لیے اس کا برسوں سے جمع کیا ہوا مال و متاع اور سرمایہ بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ ؎

چہ خوش گفت ایں نکتہ را نکتہ سنج
کہ زر زر کشد عاقبت گنج گنج

اس کے مرنے پر بنگال میں متعینہ امرا نے شاہم خاں جلائر کو اپنا سردار بنا لیا۔ جب خانخاناں کی موت کی خبر پہنچی تو دربار سے خان جہاں کو خانخاناں کا قائم مقام بنایا گیا۔ بادشاہ نے اسے زر دوزی کی قبا اور چار سنہری تھال، مرصع شمشیر، سنہری زین والا گھوڑا مرحمت فرما کر بنگالہ کی حکومت پر متعین کر دیا۔

خانخاناں کی وفات سے جو نئی صورت حال پیدا ہو گئی اس کے سبب میرزا سلیمان کی کمک کا ارادہ دگرگوں ہو گیا اور اکبر نے یا تو خود سلیمان کی درخواست پر یا سیاسی مصالح کی بنا پر مرزا کو سمندر کے راستہ حجاز روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے خزانہ سرکار سے پچاس ہزار روپیہ اور گجرات کے خالصہ سے مزید بیس ہزار روپیہ دلوا کر قلیج خاں کے بدرقہ میں حج کے لیے رخصت کر دیا کہ وہ اسے سورت کی بندرگاہ سے جہاز پر چڑھا کر لوٹ آئے۔ مرزا سلیمان نے اسی سال حج کی سعادت حاصل کی، پھر وہ وہاں سے عراق کے راستہ واپس ہوا اور دوبارہ بدخشاں کی حکومت حاصل کر لی ؎

تو راہ رفتہ از آں نمودند ورنہ کہ زد ایں در کہ بروئے کشودند

---

[1] جب تک گور میں رہے صرف خانخاناں ہی ایسا شخص تھا جو بیمار نہ ہوا، لیکن جب وہ ٹانڈہ لوٹ کر آیا تو وہ بھی بیمار ہو گیا اور گیارھویں دن فوت ہو گیا۔

[2] دربار اکبری کے اس نامور سپہ سالار اور پنج ہزاری امیر کا تعلق امرا کے کسی خاندان سے نہیں تھا۔ وہ ایک ترک قبیلہ کا فرد تھا جس کا پیشہ سپاہ گری تھا اصل نام منعم بیگ تھا۔ باپ کا نام بیرم بیگ تھا۔ ہمایوں کے لشکر میں معمولی درجہ سے ترقی کی اور شاہی معرکوں میں ساتھ رہا۔ ہمایوں کے دور ادبار میں منعم خاں نے بڑے نازک وقتوں میں ساتھ دیا۔ ہمایوں کی بارگاہ میں منعم خاں اور بیرم خاں دو ہی بہادر جاں نثار تھے جو بادشاہ کے دائیں بائیں سرفروشی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت منعم خاں کی عمر ۵۰ برس تھی جب بیرم خاں اکبر سے ناراض ہو کر مارا مارا پھر رہا تھا تو منعم خاں کو اکبر نے کابل سے بلا کر خانخاناں بنایا اور وہ ترقی کر کے پنج ہزاری منصب اور سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز ہوا۔ منعم خاں مہم پسند جوشیلا سپاہی نہیں تھا بلکہ مدبر ٹھنڈے مزاج کا سپہ سالار تھا۔ میدان میں مقابلہ کرنے سے پہلے وہ غنیم میں پھوٹ ڈال کر حکمت عملی سے ہی آدھا معرکہ پہلے ہی سر کر لیتا تھا۔ عام ترکوں کی طرح وہ بھی نجوم اور شگون کا بڑا قائل تھا۔ ہمدردی، اعلیٰ ظرفی، رفاقت، تدبر و استقلال اس کے قابل تعریف اوصاف ہیں مشرقی اضلاع میں منعم خاں کی بنائی ہوئی مسجدیں اور عمارتیں اور جون پور کی تعمیریں اس کی یادگار ہیں دریائے گومتی کا پل بھی منعم خاں کا بنایا ہوا ہے جو ۹۷۵ھ میں تعمیر ہوا اس کے محراب پر جو شعر ہیں ان میں سے دو شعر یہ ہیں:

خانخاناں خانِ منعم احتشام ٭ بستہ ایں پل را بہ توفیق کریم ٭ بود بہر تاریخش بری گر اشتغال ٭ لفظ بدرا از صراط مستقیم۔ خان مرحوم کے بیٹے کا نام غنی خاں تھا، جو نالائق اور ناخلف نکلا۔ کابل کے فساد کے بعد دکن چلا گیا تھا اور وہاں ابراہیم عادل شاہ کے پاس ملازم ہو گیا تھا (ماثر الامرا)

مرزا سلیمان نے ہندوستان سے لوٹتے وقت اپنی ایک لڑکی کا نکاح قندھار کے حاکم مظفر حسین مرزا سے جو اسی زمانہ میں لاہور آیا ہوا تھا کر دیا تھا، دوسری لڑکی کو کسی اور شخص سے بیاہ دیا تھا۔

حسین خاں کا کوہستان پر حملہ حسین خاں مرحوم جس سے میرے قدیم مراسم بلکہ دلی لگاؤ تھا۔ داغ محلہ کے قانون سے سخت عاجز ہو گیا تھا اس سلسلہ میں اسے بڑی پریشانیاں لاحق رہیں۔ جب وہ بہت تنگ آگیا تو اس نے اپنے خاص ساتھیوں کی جمعیت لے کر کانت و کولہ سے کوچ کیا اور بداؤں اور سنبل سے گزر کر گنگا کو عبور کیا اور دوآبہ میں پہنچ گیا۔ اس علاقہ کے سرکش زمیندار عرصہ سے مالگزاری ادا نہیں کر رہے تھے، کروڑی بے چارہ کا کیا ذکر وہ سرکاری مطالبوں پر جاگیر دار تک کو جواب نہیں دیتے تھے۔ حسین خاں نے ان کی سرکوبی کے لیے ہی یہ فوج کشی کی تھی۔ چنانچہ وہ ان سرکشوں کے خلاف فوجی کارروائی کرتے ہوئے شمالی کوہستان کے دامن تک جا پہنچا۔

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں حسین خاں پر ایک مدت سے اس کوہستان کو فتح کرنے کی دھن سوار تھی۔ اس کے تصوّر میں ہمیشہ یہاں کے بت خانوں کی سونے چاندی کی اینٹیں ہی جمی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اسی مفروضہ دولت کے لالچ میں کسی بھاری لشکر کو لیے بغیر ہی اس نے بسنت پور جا کر محاصرہ کر لیا۔ بسنت پور کوہستان میں نہایت دشوار گزار بلندی پر واقع ہے۔ اسے اس مہم میں مصروف دیکھ کر کروڑیوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا چنانچہ تھانیسر کے کروڑی ملک الشرق گجراتی اور دوسرے کروڑی اپنے اپنے قلعوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے اور حسین خاں کے متعلق یہ جھوٹی خبر اڑا دی کہ وہ باغی ہو چکا ہے۔ دربار شاہی میں بھی عریضے بھیج کر اس کی اطلاع کرا دی۔

سعید خاں مغل کی حسین خاں کے ساتھ بڑی گہری اور دیرینہ دوستی تھی، وہ انہی دنوں ملتان سے دربار میں آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس سے حسین خاں کے حالات اور اس کی بغاوت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے اس کی تردید کر دی۔ بادشاہ نے اس سے رعایا کے تلف شدہ مویشیوں اور مالی نقصانات کے سلسلہ میں حسین خاں کی طرف سے ضمانتی تحریر بھی مانگی تھی اور اس نے حسین خاں کی طرف سے ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کی وجہ سے ان کی آپس میں جو دوستی اور محبت تھی وہ جاتی رہی ؎

این دغل دوستاں کہ مے بینی — مگسانند گرد شیرینی

پیش تو از نور موافق تر اند — در عقب از سایہ منافق تر اند

حسین خاں کو قابو میں لانے کے لیے بادشاہ نے سید ہاشم ولد محمود بارہہ اور میر سید محمد میر عدل کے لڑکوں کو امراء کی ایک جمعیت کے ساتھ بکر کی جانب رخصت کیا اور روانگی سے پہلے ہی حسین خاں کے لڑکے کو ان کی نگرانی میں دیدیا۔

حسین خاں کا انتقال حسین خاں بسنت پور کے کوہستان میں لڑتے ہوئے زخمی ہو گیا۔ ایک گولی اس کے شانہ کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور اس مہم میں اس کے بہت سے تجربہ کار آدمی بھی ضائع ہوئے۔ جب وہ ہر طرف سے مجبور ہو گیا تو ناکام و نامراد کوہستان سے لوٹ آیا اور کشتی میں سوار ہو کر دریائے گنگا کے راستہ پٹیالی کی طرف جہاں اس کے اہل و عیال مقیم تھے روانہ ہوا، لیکن جب گڑھ مکتیسر پہنچا تو سرکاری آدمیوں نے اس زخمی حالت میں اسے گرفتار کر لیا اور آگرہ لے جا کر حسب الحکم صادق محمد خاں کی حویلی میں نظر بند کر دیا صادق محمد خاں سے ہندوستان کی فتح بلکہ قندھار کے زمانہ سے ہی دینی تعصب کے سبب اس کی

ان بن رہتی تھی اور آج اسی کے گھر رہنے کی ذلت اسے برداشت کرنی پڑی - بادشاہ کے حکم سے شیخ بینا طبیب اس کے علاج کے لیے فتح پور سے آگرہ آیا - اس نے معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دی کہ حسین خاں کا زخم نہایت خطرناک ہے - بادشاہ نے معالجہ کے لیے حکیم عین الملک کو جانے کا حکم دیا - قدیم روابط کی بنا پر میں بھی حضور سے اجازت لے کر عین الملک کے ساتھ گیا - عرصہ بعد اس سے میری ملاقات ہوئی اور دو بچھڑے ہوئے دوست گزرے ہوئے زمانہ کی یادوں کو سنبھالے نہایت رقت و حسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے ؎

ہر جا من و معشوق بہم باز رسیدیم — از بیم بد اندیش لب خویش گزیدیم

بے واسطۂ گوش و لب از راہ دل و چشم — بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

ابھی میں اسے اور وہ مجھے دیکھ ہی رہے تھے کہ بادشاہی جراح آگئے اور انھوں نے ایک بالشت لمبا نشتر زخم میں ڈال کر اسے چیر دیا - مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس بہادر نے اس نشتر زنی پر اُف نہ کی نہ اس کی پیشانی پر کوئی بل آیا بلکہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مسکراتا ہی رہا - وہ منظر قیامت کے نظارہ سے کچھ کم نہ تھا - جب میں اس سے مل کر رخصت ہوا تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری بس آخری ملاقات ہے ، چنانچہ فتح پور پہنچنے کے تین چار دن بعد ہی ہم کو اطلاع ملی کہ حسین خاں سخت اسہال میں مبتلا ہے - اسی عارضہ میں آخر کار وہ گھل گھل کر مر گیا - بلا شبہ وہ شہید تھا کیوں کہ کافروں کے لگائے ہوئے زخم ہی کی وجہ سے فوت ہوا ؎

نپاید کسے در جہاں کو بماند

مگر آں کزو نام نیکو بماند

حسین خاں نہایت فیاض تھا - مستحقوں اور محتاجوں کے لیے مٹھی بھر بھر کر روپیہ صرف کرتا تھا - اس کی یہ سخاوت اور دردمندی آخر اس کے کام آئی اور اس کا کفن دفن خواجہ محمد یحییٰ نقشبندی جیسے پایہ کے بزرگ کے ہاتھوں عمل میں آیا - وہاں سے اس کی میت کو پٹیالی کے گورستان میں جو اس کا خاندانی مقبرہ تھا لے جا کر سپرد خاک کیا گیا - اس کی تاریخ "گنج بخش" نکالی گئی -

جس وقت میں بکر کے سفر میں میر عدل مرحوم کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس تونگر دل درویش دست کی وفات کی خبر میر عدل کو سنائی - وہ اس خبر کو سُن کر زار و زار رونے لگے اور اس کی پاک دلی ، دلیری اور چستی کی بڑی تعریف کرتے رہے اور فرمایا جو شخص دنیا سے بے نیاز رہنا چاہے تو اسے اسی طرح زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہونا چاہیے جیسا کہ حسین خاں نے کیا اور جس طرح وہ دنیا سے رخصت ہوا - اتفاق دیکھو کہ میر عدل سے میری یہ ملاقات بھی بس آخری ہی تھی - انھوں نے بھی اس موقع پر خود فرمایا تھا کہ "ہمارے سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں ، معلوم نہیں اب تم سے بھی دوبارہ ملنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں" ان کی بات سچ نکلی اور وہ بھی جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے -

حسین خاں کے اوصاف میں تقریباً نو سال تک اس یگانۂ روزگار حسین خاں کی خدمت میں رہا - سپاہ گری اور دنیاداری کی ظاہر وضع کے باوجود میں نے جو وصف اس میں پائے اس زمانہ کے بیشتر پیشواؤں اور مرشدوں میں ان کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا - وہ نہایت درست عقیدہ سنی تھا - ہمت اور شجاعت میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں - منکسر مزاج ایسا کہ چھوٹے بڑے ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا تھا - دنیا سے بے نیازی میں اس جیسا کسی کو نہ پایا - لوگوں کی خدمت میں ہر دم کوشاں

رہتا تھا، توکل اور زہد میں اس کے پایہ کا کوئی دوسرا نہیں تھا، اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو دین اور مذہب کی یہ بے قدری دیکھنی نہ پڑتی جسے دیکھنے پر زمانہ نے مجبور کر دیا ہے۔

سادگی اور انکسار

جس زمانہ میں وہ لاہور کی حکومت پر مستقلاً فائز تھا میں نے معتبر آدمیوں کی زبانی سنا کہ اس کی غذا حضور اکرمؐ کی متابعت میں صرف جو کی روٹی تھی۔ اس زمانہ میں اس نے وہاں کی ہزارہا پرانی مسجدوں اور مقبروں کی مرمت اور تعمیر کرائی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی ہندو مسلمانوں کے بھیس میں اس کی مجلس میں آ کر بیٹھ گیا وہ اسے مسلمان سمجھ کر بڑی تواضع اور انکساری کے ساتھ ملاقات کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو بڑی شرمندگی ہوئی اور اس نے عام حکم دے دیا کہ آج سے تمام ہندو اپنی آستینوں کے کناروں پر کسی نہ کسی رنگ کی پٹی سی لیا کریں تاکہ ہندو مسلمان میں تمیز ہو سکے۔ اسی حکم کی وجہ سے لوگوں میں اس کا نام "ٹکریہ" پڑ گیا۔ ٹکری پیوند کو کہتے ہیں جسے عربی میں غیار (بروزن دیار) کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ حکم بھی نافذ کیا تھا کہ حکم شرعی کے مطابق کافر زین کی سواری نہ کریں بلکہ جانوروں پر پالان باندھا کریں (علاؤالدین خلجی نے بھی ہندوؤں کو گھوڑے کی سواری سے منع کر دیا تھا بحوالہ فیروز شاہی برنی مترجم)

اس کی ہمراہی میں ہمیشہ سید اور اہل علم رہا کرتے تھے، ان کا ادب و لحاظ اس کو اس قدر تھا کہ محض اسی خیال سے کوئی بے ادبی نہ ہو جائے، سفر میں وہ کبھی سواری کی حالت میں نہیں سویا۔ تہجد کی نماز اس کی کبھی فوت ہوئی نہ جماعت۔ اور باوجود لاکھوں کروڑوں کی جاگیر کے اس کے طویلہ میں ایک گھوڑے سے زیادہ کبھی نہ رہا۔ وہ بھی بعض اوقات چاہے سفر میں ہو کہ حضر میں کسی نہ کسی مستحق کو بخش دیتا تھا اور خود پیدل ہو جاتا تھا۔ اس کے آدمیوں اور غلاموں کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس دو دو گھوڑے کوتل میں لگے رہتے تھے ع

"خان مفلس غلام با ساماں"

دنیا سے بے نیازی

اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کبھی مال جمع نہیں کرے گا۔ جب بھی اس کے سامنے سونا روپیہ لایا جاتا تو کہتا تھا کہ یہ تیر یا نیزہ ہے جو میرے پہلو میں چبھا جا رہا ہے۔ جب تک وہ مال بخش نہیں دیتا اس کو چین نہیں پڑتا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ پندرہ ہزار سے تیس چالیس ہزار روپیہ تک لوگوں نے پرگنوں کے حساب میں دبا لیا اور اس نے کوئی دھیان دیے بغیر فوج کے مصارف اور دوسرے اخراجات کی اجرائی پر دستخط کر دیے اور اس کے پاس صرف رسد کا حصہ رہ گیا۔ اس نے منت مانی ہوئی تھی کہ جو بھی غلام اس کے ہاتھ آئے گا وہ بس اسی دن سے آزاد ہو جائے گا کبھی تین سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں نہیں رکھا۔ اخروٹ کو وہ مسکرات میں سمجھتا تھا۔ اسی لیے اس کی حرمت پر اس کو اعتقاد تھا

ایک دن شیخ الہدیہ نے جو اس وقت کے بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے حسین خاں کے اس بے ہنگام اخراجات اور اڑے وقتوں کے لیے پونجی نہ رکھنے پر اعتراض کیا اور اس کو اس عادت کو چھوڑنے کی نصیحت کی۔ ان کی یہ بات بڑی ناگوار گذری اور طیش میں آ کر کہا کہ اگر مال کو جمع کرنا جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو سنت رسول ہے تو سرتابی کی مجال نہیں اور اگر ایسا نہیں تو ہم لوگ تو تم جیسے رہبرانِ دین سے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ اگر ہم میں دنیا کی حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی رہ گیا ہے تو اسے تم دور کرنے کی کوشش کرو نہ یہ کہ تم اس جہان خانی کی متاع حقیر و بے مایہ کو ہماری نگاہوں میں بڑھا چڑھا کر پیش کرو اور اس طرح ہم کو اس کا

لائچی بنادو کہ ہم بخل و خست کی سنت میں گرفتار ہو جائیں ؎

قرار برکف آزادگاں نگیرد مال

نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

بہادری اور سخاوت

میں اس کے ساتھ کسی میدانی معرکہ میں شریک نہیں رہا، لیکن اکثر جنگل کی لڑائیوں میں اس کے ہمراہ رہنے کا موقع ملا ہے۔ ان لڑائیوں میں میں نے ایسی ثابت قدمی اور دلیری خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جس کا ذکر بس داستانوں کے معرکہ آراؤں کے متعلق ہی سننے میں آتا ہے۔ وہ نہایت قوی ہیکل اور انتہائی دلیر تھا۔ جنگ کے دن بس ایک ہی کلمہ ورد زبان رہتا تھا "یا شہادت یا فتح" لوگ بہت کہتے تھے کہ حضور دعا میں فتح کو مقدم رکھیے لیکن وہ یہ جواب دیتا کہ مجھے زندہ لوگوں کی نسبت گزرے ہوئے لوگوں کے دیدار کا زیادہ اشتیاق ہے۔ اس کی دریا دلی اور سخاوت ایسی تھی کہ اگر روئے زمین کے خزانے اور سلطنت بھی اس کو مل جاتی تو وہ پہلے ہی دن سب کچھ لٹا کر قرضدار ہو جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چالیس پچاس عراقی اور ترکی گھوڑے کسی سوداگر کو اس کی بتائی ہوئی مجموعی رقم پر یہ کہہ کر اکٹھے خرید لیے کہ تو جانے اور تیرا خدا اور پھر وہ سب ایک ہی نشست میں اپنے رفیقوں کو بخش بھی دیے، جن کو نہیں ملے ان سے عذر خواہی کرتا رہا۔

اس سے پہلی بار میں اس وقت ملا تھا جب کہ کہہ کٹنکر پر لشکر کو متعین کیا گیا تھا۔ اس نے آگرہ میں ایک عراقی گھوڑا پانسو روپیہ میں خریدا اور اسی وقت مجھے عطا کر دیا۔ کہتے ہیں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم اس کے ذمہ قرض تھی۔ قرض خواہوں کے ساتھ اس کی ایسی خوش معاملگی تھی کہ اس کے انتقال پر تمام قرض خواہوں نے قرضہ کے دستاویز پھاڑ دیے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور اس کے ورثا سے قرضوں کا کوئی مطالبہ اور جھگڑا نہ کیا۔

میں اپنی اس کوتاہ زبان سے حسین[1] خاں کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں، اب جب کہ میں پیری کی ذلتوں سے دوچار ہوں اس بات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری زندگی کا بہترین حصہ یعنی عنفوان شباب کا زمانہ اسی کی خدمت میں گزرا اور یہ اسی کی ہی توجہات کے طفیل ہے کہ میری نشوونما نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی کہ آج میں دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کا مالک ہوں۔

اسی سال بادشاہ نے میری خوش آوازی کی وجہ سے چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے ساتھ اماموں میں داخل کر دیا اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں نمازوں کے وقت حاضری کی یاد دہانی کرا دے۔

جلوس کا بائیسواں سال

انہی دنوں خواجہ امین الدین محمود کا جو خواجہ امینا کے نام سے مشہور ہے، انتقال ہو گیا اور اس کا چھوڑا ہوا کافی بڑا سرمایہ خزانہ عامرہ میں داخل کر لیا گیا۔ اسی سال کی ۱۷ ذی قعدہ کو بادشاہ نے اجمیر کا سفر کیا۔ بدستور سابق ایک منزل سے پیادہ جا کر مزار مبارک کی زیارت کی۔ اسی مہینہ کی نویں تاریخ کو سورج برج حمل میں داخل

---

[1] حسین خان: ماثر الامرا میں ہے کہ حسین خاں بیرم خاں کی خدمت میں تھا، ہمایوں کے ساتھ کئی معرکوں میں اس نے بہادری دکھائی اور ترقی پائی مہدی قاسم خاں ایک معزز ہمایونی مہدی قاسم کا ماموں تھا اپنی لڑکی بھی اس کے عقد میں دے دی تھی۔ ابوالفضل نے اسے تین ہزاری کی فہرست میں لکھا ہے۔ اس کا بیٹا یوسف خاں جہانگیر کے دربار میں امیر تھا اس نے میرزا عزیز کوکہ کے ساتھ دکن میں بڑی شجاعت دکھائی۔ ۳ جلوس جہانگیری میں وہ شاہزادہ پرویز کی مدد پر گیا تھا یوسف خاں کا بیٹا عزت خاں شاہجہاں کے دربار میں امیر تھا۔

ہوا اور جلوس شاہی کے بائیسویں سال کا آغاز ہوا۔

خانجہاں کے نام فرمان

اس موقع پر یہ خبر ملی کہ منعم خاں خانخاناں کے انتقال کے بعد بادشاہی امیر داؤد کے مقابلہ پر ٹھہر نہیں سکے، گوڑ اور ٹانڈہ سے پسپا ہو کر حاجی پور اور پٹنہ آ گئے ہیں اور خان جہاں کا لشکر چونکہ ابھی تک لاہور میں رکا ہوا ہے اس لیے وہ تیزی سے کوچ نہیں کر رہا۔ اکبر نے ترک سبحان قلی کے ہاتھ خان جہاں کو تیزی سے روانہ ہونے کے لیے فرمان روانہ کیا۔ چنانچہ خان جہاں نے بائیس دن میں ایک ہزار کوس کا فاصلہ طے کیا۔ ابھی بادشاہ اجمیر ہی میں تھے کہ دوسری اطلاع ملی کہ خان جہاں نے گڑھی پہنچ کر داؤد کی پٹھان فوج سے ایک سخت جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار پٹھانوں کو قتل اور اسیر کر کے اب وہ آگے بڑھ چکا ہے۔

رانا کیکا کی مہم پر مان سنگھ کا تقرر

اوائل محرم ۹۸۴ھ میں اکبر مان سنگھ ولد بھگوان داس کو حضرت معین الدین چشتی کے روضہ میں ساتھ لے کر گیا اور وہاں خلوت میں حضرت سے مدد کی دعا کر کے مان سنگھ کو خلعت گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا فرمائے اور اسے کوکندہ اور کونبھل میر کے دار الحرب پر جو رانا کیکا کی عملداری میں تھا فوج کشی کے لیے مامور کیا۔ اس کی کمک کے لیے خاصہ کے اور دوسرے صیغوں کے پانچ ہزار سواروں کو امراء کی سرکردگی میں متعین فرمایا۔ اس مہم پر مان سنگھ کے ساتھ آصف خاں میر بخشی غازی خاں بدخشی شاہ غازی خاں تبریزی مجاہد خاں سید احمد خاں، سید ہاشم بارہہ، مہتر خاں خاصہ خیل اور دوسرے امراء بھی مقرر کیے گئے تھے۔

جہاد کا شوق

لشکر کے کوچ کے وقت میں بھی قاضی خاں اور آصف خاں کو رخصت کرنے کے لیے ان کے ہمراہ دو تین کوس تک جہاں ان امیروں کی چھاؤنی تھی، گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لینے لگا اور میں وہاں سے اسی وقت لوٹ کر شیخ الاسلام شیخ عبد النبی صدر کی خدمت میں آیا اور ان کو بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ انھوں نے حامی تو بھر لی لیکن میرے معروضہ کو اپنے وکیل سید عبد الرسول کے ذمہ کر دیا۔ یہ صورت بالکل بے کار تھی اور معاملہ میں تاخیر کا اندیشہ تھا۔ نقیب خاں کے ساتھ میرا اچھا خاصا یارانہ تھا، میں نے اس کو وسیلہ بنایا، پہلے تو اس نے مجھے روکنا چاہا اور کہا اگر ہندو اس لشکر کا سردار نہ ہوتا تو سب سے پہلے میں تم کو اجازت دلوا دیتا۔ میں نے خان کو بخوبی سمجھایا کہ ہم تو بادشاہ سلامت کو اپنا سردار مانتے ہیں، مان سنگھ وغیرہ سے ہم کو کیا غرض اور یہ معاملہ تو نیت کی درستی پر منحصر ہے۔ غرض نقیب خاں نے اس وقت جب کہ بادشاہ مزار شریف کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، میرا معروضہ پیش کیا۔ پہلے تو انھوں نے فرمایا اس کے ذمہ تو امامت کے فرائض ہیں، وہ کس طرح جا سکتا ہے؟ نقیب خاں نے عرض کیا اس نے جہاد کی نیت کر لی ہے۔ بادشاہ نے مجھے بلا کر پوچھا، مصمم ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا "ہاں"۔ فرمایا "کیوں؟" میں نے کہا "میں اپنے اعمال کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعہ دور کرنا چاہتا ہوں"۔ اس پر فرمایا "انشاء اللہ تعالیٰ تم فتح کی بشارت لے کر آؤ گے"۔ اتنا کہہ کر بادشاہ مراقبہ میں چلے گئے اور بڑی توجہ سے فاتحہ پڑھتے رہے اور جب میں نے چبوترہ پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنے پیر کھینچ لیے۔ جس وقت میں دیوان خانہ سے رخصت ہوا تو مجھے دوبارہ بلوایا اور دونوں ہاتھوں سے بھر کر ۵۶ اشرفیاں عطا کیں اور مجھے رخصت کیا۔ اس زمانہ میں شیخ عبد النبی سے سابقہ رنجشیں دور ہو گئی تھیں اور وہ مجھ پر مہربان ہو گیا تھا اسی لیے میں اس سے بھی

رخصت ہونے کے لیے گیا اس نے مجھ سے کہا "یاد رکھنا جس وقت دشمن سے مڈبھیڑ ہو تو چونکہ حدیث نبوی کے بموجب یہ وقت دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے تم مجھے دعائے خیر سے یاد کرنا اور بھولنا نہیں۔" میں نے وعدہ کیا اور فاتحہ پڑھنے کی درخواست کی۔ پھر میں گھوڑا تیار کرکے اس لشکر میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ یہ سفر اول سے آخر تک نہایت خوشگوار اور مبارک ثابت ہوا۔ آخرکار ہم فتح نامہ اور اس ہاتھی کو لے کر جو رانا کیکا سے اس جنگ و جدال کا باعث ہوا تھا، فتح پور لوٹ آئے۔

داؤد کی دوبارہ سرکشی

اسی سال ۲۰ محرم کو کوکندہ کے لشکر کا انتظام کرنے کے بعد بادشاہ نے فتح پور کو مراجعت فرمائی اور وہاں پہلی ماہ صفر کو پہنچ گئے۔ انہی دنوں مخبروں نے خبر پہنچائی کہ گرہی سے خانجہاں کے آگے بڑھنے کے بعد داؤد ٹانڈہ سے نکل کر آک محل کے موضع میں جس کے ایک طرف تو دریائے گنگا اور دوسری طرف پہاڑ ہے، آگیا ہے اور وہاں قلعہ اور خندق بنا کر شاہی لشکر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ خواجہ احرار کے پوتے خواجہ عبداللہ اس خندق کی لڑائی میں مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف پٹھانوں کا سردار خانخاناں بھی قتل ہو گیا ہے۔ اس اطلاع پر بادشاہ نے پٹنہ و بہار کے حاکم ظفر خاں کو لکھا کہ وہ ساری فوجیں اکٹھی کرکے خان جہاں کی کمک پر چلا جائے۔

چوگان کی بازی

ربیع الاول کے مہینہ میں بادشاہ میرزا محمد شریف کے ساتھ فتح پور میں چوگان[1] کھیل رہے تھے۔ مرزا شریف نہایت ذہین، خوش مزاج اور خوش آواز نوجوان تھا۔ وہ کھیل کے دوران گھوڑے سے گر پڑا اور اسی وقت مر گیا۔ شہنشاہ اس ناگہانی حادثہ پر ششدر سے رہ گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا کریں۔ قطب الدین محمد اتگہ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا خداوندا آپ کھڑے کیا کر رہے ہیں یہاں سے تشریف لے چلیے، تب وہ چونکے اور محل کو واپس آگئے۔ اس حادثہ کے متعلق شہر بلکہ سارے ملک میں کچھ اور ہی افواہ اڑ گئی، اس لیے بادشاہ نے اپنی صحت و عافیت کے متعلق فرامین ہر جگہ روانہ کیے اور اس خبر سے جو شورش سی اٹھنے لگی تھی دب گئی۔ یہ فرمان کوکندہ میں مان سنگھ اور آصف خاں کے نام بھی گیا اور لشکر میں جو رنج و ملال پھیل گیا تھا مسرت و خوشی میں تبدیل ہو گیا۔

کوکندہ پر لشکر کشی

کوکندہ اوائل ماہ ربیع الاول ۹۸۴ھ میں فتح ہوا، جس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ مان سنگھ اور آصف خاں اجمیر کی فوج کے ساتھ مانڈل گڑھ کے راستہ متواتر کوچ کرتے ہوئے بلدہ تک جا پہنچے۔ یہ مقام رانا کیکا کے صدر مقام کوکندہ سے سات کوس پر واقع ہے۔ رانا بھی مقابلہ کے لیے نکل کر آیا۔ مان سنگھ ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے ساتھ بادشاہی امرا جیسے خواجہ محمد رفیع بدخشی، شہاب الدین گروہ، پاینده قزاق، علی مراد اوزبک، راجہ لون کرن حاکم سانبھر اور دوسرے راجپوت قول (قلب لشکر) پر متعین تھے اور بہادر نوجوانوں کی ایک جمعیت ہراول پر لگائی گئی تھی، انہی میں سے اسی سے زائد لشکریوں کو منتخب

---

[1] چوگان بازی: دس آدمیوں سے زیادہ حصہ نہیں لیتے۔ کھلاڑیوں کی دو دو کی جوڑی ہوتی ہے، اس کے کھیلنے کا طریقہ "ردل" کہلاتا ہے جس میں سوار گیند کو چوگان (بلہ) کے خم میں لے کر سب کے درمیان سے نکال لے جاتا ہے اور میدان کے کنارے پہنچا دیتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تیزی سے گیند کو چوگان سے ضرب لگائی جاتی ہے اور پھر کھلاڑی سب سے تیز آگے بڑھ کر دوبارہ گیند کو آگے بڑھاتا ہے، اسے "بیلہ" کہتے ہیں۔ اکبر عموماً بیلہ کے طریقہ پر چوگان کھیلتا تھا جب گیند کو کھلاڑی "حال" یعنی مقررہ کنارہ پر پہنچا دیتا تو نقارہ بجا کر اس کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اکبر نے اندھیری راتوں میں بھی چوگان کھیلنے کا طریقہ نکالا تھا۔ گیند پلاس کی لکڑی کی بنائی جاتی تھی جس کی آگ دیر تک قائم رہتی ہے۔ اسی گیند سے اندھیرے میں چوگان کھیلا جاتا تھا۔ شاہی گیند پر سونے چاندی کے حلقے لگے ہوتے تھے۔ جب گیند ٹوٹ جاتی تھی تو جس کے ہاتھ آتی وہ ان حلقوں کو پا لیتا تھا۔ (آئین اکبری)

کر کے سید ہاشم بارہہ کی کمان میں ہراول سے آگے روانہ کیا گیا۔ اس قسم کے دستہ کو "جوزۂ ہراول" کہتے ہیں۔ میمنہ پر سید احمد خاں بارہہ اور دوسرے امیر تھے اور میسرہ پر قاضی خاں اور اس کے ساتھ سیکری کے شیخ زادے جو شیخ ابراہیم چشتی کے عزیز رشتہ دار تھے مامور تھے۔ چنداول (عقب) پر مہتر خاں سردار تھا۔

رانا کیکا کا زبردست حملہ

جب رانا کیکا درہ کے پیچھے سے نکل کر آیا تو اس کا لشکر دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس کی ایک فوج جس پر حکیم سور افغان سردار تھا ہراول کے مقابلہ میں پہاڑ کی مغربی سمت سے آگے بڑھی۔ اس وقت پیچدار راستہ کے کٹاؤ ناہمواری اور جھاڑ جھنکار کی وجہ سے "جوزہ ہراول" اور "ہراول" ایک ہی راستہ میں خلط ملط ہو گئے اور غنیم کے مقابلہ میں مدافعانہ جنگ کرتے ہوئے پسپا ہوئے۔ لشکر میں جو راجپوت تھے اور ان کی کمان راجہ لون کرن سانبھری کر رہا تھا۔ وہ بھیڑوں کی طرح بائیں جانب بھاگ نکلے اور ہراول سے گزر کر انھوں نے میمنہ میں جا کر پناہ لی۔ اس وقت میں بھی ہراول کے سربرآوردہ سرداروں کے ساتھ تھا۔ میں نے آصف خاں سے کہا "اس وقت ہم راجپوتوں میں اپنوں اور غیروں کی بھلا کس طرح تمیز کر سکتے ہیں"۔ اس نے حکم دیا برابر تیر اندازی کرتے رہو۔ یہ نہ سوچو کون زد میں آتا ہے۔ چنانچہ ہم برابر تیروں کی بوچھا کرتے رہے اور اس پہاڑ جیسے انبوہ اور ہجوم میں ہمارا کوئی نشانہ خطا نہ ہوا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تیر صحیح نشانہ پر لگ رہے ہیں اور مجھے یقین سا آ گیا کہ مقصود حاصل ہو گیا اور جہاد کا ثواب لازماً مل گیا۔ سادات بارہہ اور بعض غیور نوجوانوں نے اس موقع پر ایسی دادِ شجاعت دی جو رستم کے کارناموں کی یاد دلاتی ہے۔ دونوں طرف سے بہت سے آدمی اس محاذ پر کام آ گئے۔

غنیم کی دوسری فوج جس کی کمان خود رانا کیکا کر رہا تھا، گھاٹی میں سے نکل کر آئی اور قاضی خاں کو جو گھاٹی کے دہانہ پر لڑ رہا تھا آگے سے ہٹا کر اسے پسپا کرتی ہوئی سیدھی قلب لشکر پر حملہ آور ہوئی۔ سیکری کے شیخ زادے ایک ہی حملہ میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ فرار کے وقت شیخ ابراہیم کے داماد شیخ منصور کے سرین پر جو اس دستہ کی کمان کر رہا تھا ایک تیر آ کر لگا۔ اس زخم سے وہ کافی عرصہ تک تکلیف اٹھاتا رہا۔ اس کے مقابلہ میں قاضی خاں باوجود ملاگیری کے دشمن کے سامنے دلیری سے جما رہا۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ایک تلوار لگی جس سے اس کا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ جب مقابلہ کی تاب نہ رہی تو وہ بھاگ کر قول میں آ گیا۔ وہ جمعیت جو غنیم کے پہلے حملہ ہی میں لشکر سے نکل بھاگی تھی دریا پار کر کے پانچ چھ کوس تک برابر بھاگتی چلی گئی اور پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

مہتر خاں کی ہوشیاری

اس نازک صورت حال میں مہتر خاں نے بروقت کام کیا۔ وہ اپنے چنداول کو یکبارگی لے کر نقارہ بجاتے ہوئے آگے بڑھا اور اعلان کر دیا کہ خود بادشاہ سلامت یلغار کرتے ہوئے آ پہنچے ہیں۔ اس کی یہ چال کام کر گئی اور بھاگتی فوج کے قدم میدان میں جم گئے۔ مشہور راجہ مان کا پوتا راجہ رام ساگوالیاری جو رانا کیکا کے آگے بڑھا چلا آ رہا تھا اس نے راجا مان سنگھ کے راجپوت دستہ کے مقابلہ میں ایسی بہادری دکھائی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ مان سنگھ ہی وہ راجپوت تھے جو ہراول کے بائیں بازو سے بھاگ کر آصف خاں کی پسپائی کا باعث بنے تھے اور میمنہ کے سید زادوں کے پاس جا کر پناہ لے لی تھی۔ اگر اس وقت سادات ثابت قدمی سے جمے نہ رہتے تو سب کو رسوائی اٹھانی پڑتی۔

ہاتھیوں کی خوفناک لڑائی

رانا نے بادشاہی ہاتھیوں کے مقابلہ پر اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا اور دو مشہور مست ہاتھی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ ہاتھیوں کا فوجدار حسین خاں جو مان سنگھ کے پیچھے ایک دوسرے

ہاتھی پر سوار تھا، اس ریل پیل میں گر پڑا اور مان سنگھ اپنے ہاتھی پر مہاوت کی جگہ پر آ گیا۔ اس نے حیرت انگیز ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ جو دو ہاتھی لڑ رہے تھے ان میں سے ایک تو بادشاہ کے خاصہ کا ہاتھی تھا اور دوسرا رانا کا ہاتھی "رام پرشاد" نامی تھا جو نہایت قوی ہیکل تھا دونوں میں بڑے غضب کا مقابلہ ہوا اور دونوں پوری قوت سے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ اتفاق سے رانا کے ہاتھی کے مہاوت کو ایک تیر لگا اور وہ ہاتھیوں کی ٹکر کے صدمہ سے زمین پر گر پڑا۔ عین اس وقت بادشاہی ہاتھی کا مہاوت نہایت تیزی کے ساتھ کود کر رانا کے ہاتھی کے سر پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ ایسا حیرت انگیز کارنامہ دکھایا تھا کہ کوئی دوسرا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

رانا کیکا کا فرار جب رانا نے میدان کا اس طرح رنگ بدلتا ہوا دیکھا تو مقابلہ چھوڑ کر نکل گیا اور رانا کے لشکر میں بڑی افراتفری سی مچ گئی۔ شاہی محافظ دستے کے جوانوں نے جو مان سنگھ کی محافظت کر رہے تھے، اس موقع پر آگے بڑھ کر ایسی لڑائی کی جو یادگار رہے گی۔ مان سنگھ نے بھی اس دن جس بہادری اور خوبی سے سرداری کے فرائض انجام دیے۔ اس سے ملاشیری کے اس مصرع کی تصدیق ہو گئی ع

"کہ ہندو مے زند شمشیر اسلام"

اس معرکہ میں جیمل چتوڑی کا لڑکا اور گوالیار کا راجہ رام ساہ اپنے بیٹے سالباہن کے ساتھ جو نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا، جہنم رسید ہو گیا۔ گوالیار کے راجاؤں کے خاندان میں کوئی دوسرا قابل جانشین نہ رہا۔ "خس کم جہاں پاک" رانا کیکا بھی جو مادھو سنگھ کے مقابل تھا، تیر کھا کر زخمی ہو گیا۔ حکیم سور سادات کے مقابلہ سے بھاگ کر رانا کے پاس آ گیا اور دونوں کی فوجیں یکجا ہو گئیں۔ رانا میدان میں ٹھہر نہ سکا اور مقابلہ ترک کر کے اونچے پہاڑوں پر جہاں وہ چتوڑ کی فتح کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا، محصور ہو گیا۔

یہ لڑائی سخت گرمی کے موسم میں ہوئی تھی، گرمی کے مارے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ ہم صبح سے دوپہر تک برابر لڑتے رہے اور تقریباً پانسو آدمی اس معرکہ میں ہلاک ہوئے۔ ان میں سے مسلمان شہید تو ایک سو بیس تھے اور باقی لاشے ہندوؤں کے تھے زخمیوں کی تعداد تین سو سے زائد تھی۔ تیز دھوپ کی وجہ سے میدان جنگ تنور کی طرح دھک رہا تھا اور گرمی کی وجہ سے سپاہیوں میں نقل و حرکت کی قوت نہ رہی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ رانا پہاڑ کے پیچھے گھات میں چھپا ہو گا اسی لیے لشکر نے اس کا تعاقب نہ کیا اور اپنے کیمپ کو لوٹ گیا، جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی، اس فتح کی تاریخ ہے:

"وَيَنْصُرُوا مِنَ اللهِ فَتْحٌ قَرِيبٌ"

شاہی فوج کوکندہ میں دوسرے دن وہاں سے کوچ کر کے ہم میدان کارزار میں گئے لاشوں کی دیکھ بھال اور سب کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے کے بعد درہ میں داخل ہوئے اور کوکندہ پہنچ گئے وہاں رانا کے چند نمک خوار رہ گئے تھے جو اس کے محل کی حفاظت کر رہے تھے۔ چند معدودے ضعیف لوگ بھی تھے اور یہ سب مل کر کل بیس آدمی تھے۔ ہندوؤں کی پرانی رسم کے مطابق کہ وہ شہر خالی کرتے وقت اپنی آبرو اور ناموس کی خاطر خودکشی کر لیتے ہیں، یہ بھی گھروں اور بت خانوں میں جمع ہوئے اور عجیب عجیب حرکتیں کرنے کے بعد انھوں نے تلواروں سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا اور سیدھے دوزخ میں چلے گئے۔

اندیشہ تھا کہ رانا شبخون مارے گا، اس لیے امرائے شاہی نے شہر کی کوچہ بندی کر دی اور خندق کھدوا کر اتنی اونچی دیوار بنوادی

کہ سوار بھی اس پر چڑھ نہ سکے۔ جب لشکر شہر میں ٹھہر گیا تو مقتولین جنگ کی اور ہلاک ہونے والے گھوڑوں کی تفصیلی فہرست تیار کی گئی تاکہ وہ عریضہ کے ساتھ منسلک کر دی جائے۔ اس وقت سید احمد خاں بارہہ نے کہا ہمارا نہ تو کوئی آدمی مارا گیا نہ کوئی گھوڑا ضائع ہوا۔ ان کے نام بادشاہی دفتر میں پہنچانے سے کیا حاصل ہے لکھت پڑھت چھوڑو اور سب سے پہلے غلہ کی فکر کرو۔" وہ کوہستان نہایت بنجر تھا چنانچہ لشکر میں اناج کی قلت ہو گئی۔ کوئی بنجارہ بھی غلہ لے کر نہ آیا اور فوج بڑی تنگی میں مبتلا ہو گئی۔ امراء نے مجلس مشاورت منعقد کی اور امراء میں سے باری باری ایک ایک کو سردار بنا کر غلہ لانے کے لیے مواضعات کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے بلند ٹیکروں اور چوٹیوں پر پہنچ کر جہاں شکست خوردہ فوج کی ٹکڑیاں جمع تھیں سب کو اسیر بنا لیا اور ان کے مویشی پکڑ کر لے آئے۔ انہی مویشیوں کے گوشت پر گزر اوقات ہوتی رہی، البتہ پہاڑیوں میں آم اتنی کثرت سے تھے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں کے غریب لوگ عموماً صبح کے وقت کھانے کے بجائے یہی آم کھایا کرتے تھے اور رطوبت کی وجہ سے اکثر بیمار ہو جاتے تھے، وہاں کے آم کا وزن تقریباً اکبری سیر کے برابر تھا اس کا پوست بھی پتلا ہوتا تھا لیکن میٹھا اور مزیدار نہیں تھا۔

اسی اثنا میں دربار سے محمود خاں خواص حسب الحکم یلغار کرتے ہوئے گوکندہ آیا اور جنگ کی روداد معلوم کر کے دوسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ ہر ایک کی کارگزاری بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے فوج کی کارکردگی کی تعریف کی لیکن یہ بات کہ رانا کا تعاقب نہیں کیا گیا اور اُسے زندہ بچ کر جانے دیا بادشاہ کو پسند نہ آئی۔

رام پرشاد ہاتھی

امراء فتح نامہ کے ساتھ "رام پرشاد" ہاتھی کو جو غنیمت میں ہاتھ آیا تھا بادشاہ کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ اس ہاتھی کو بادشاہ نے متعدد بار رانا سے مانگا تھا اور وہ اپنی بدبختی سے اسے دینے پر کبھی راضی نہ ہوا تھا۔ آصف خاں نے میرا نام لے کر کہا کہ "یہ محض دوستی اور ہمراہی کی خاطر اس لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ بہتر ہے کہ فتح نامہ اور ہاتھی اسی کے ذریعہ بھیج دیا جائے۔" مان سنگھ نے جواب دیا "ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکہ کے وقت صفوں کی امامت کرنا چاہیئے۔" میں نے کہا "یہاں امامت کا اب کیا کام ہے اس وقت تو مجھے جا کر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔" میری بات پر وہ مسکرا دیا اور میرے ساتھ تین سو سواروں کی حفاظت میں مذکورہ ہاتھی کو روانہ کر دیا۔ خود مان سنگھ بھی سیر و شکار اور تھانے قائم کرنے کے ارادہ سے ہمارے ساتھ قصبہ موہن تک جو گوکندہ سے بیس کوس کے فاصلہ پر ہے آیا اور سفارش نامہ لکھ کر مجھے وہاں سے رخصت کیا۔

میں باگھور اور ماندل گڑھ کے راستہ سے مان سنگھ کے وطن قصبۂ انبیر پہنچا۔ ہمارا جہاں بھی گزر ہوتا تھا لوگ مان سنگھ کی جنگ اور کامیابی کا حال سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے اور لوگوں کو اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ انبیر سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ہم پہنچے تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا جس قدر وہ آگے بڑھتا تھا اسی قدر اندر دھنستا جا رہا تھا۔ میرے ذمہ اس قسم کی یہ پہلی ہی خدمت تھی۔ اس لیے میں سخت پریشان ہوا۔ آخر وہاں کے رہنے والے پہنچے انھوں نے بتایا کہ گزشتہ سال بھی اسی جگہ سرکاری ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اب ہاتھی کے نکلنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں گنجال اور پتلا کیچڑ کافی مقدار میں پھیلا دو تاکہ دلدل کچھ نرم ہو جائے اور ہاتھی آسانی سے نکل آئے۔ سقاؤں نے اسی طرح کیا جب انھوں نے بہت سا پانی لا کر ڈالا تو ہاتھی آسانی سے نکل آیا اور ہم انبیر میں داخل ہوئے۔ انبیر والے تو اس فتح کی وجہ سے بڑا فخر کرنے لگے۔

بارگاہ شاہی میں حاضری

ہم انبیر میں تین چار دن رہے اور قصبہ تودہ کے راستہ سے جو میری جائے پیدائش ہے سے بیساور جہاں میرا خاندان مقیم ہے گئے اور وہاں سے اوائل ماہ ربیع الآخر میں فتح پور پہنچ گئے۔ میں مان سنگھ کے باپ راجہ بھگوان داس۔ کے وسیلہ سے فتح پور کے بادشاہی دیوان خانہ میں باریاب ہوا اور کورنش بجالاکر امراء کے عریضہ اور ہاتھی کو پیش کیا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ میں نے عرض کیا "رام پرشاد" فرمایا چونکہ یہ سب پیر کے طفیل میں حاصل ہوا ہے اس لیے اس کا نام اب "پیر پرشاد" ہوگا۔ پھر مخاطب کیا کہ "امراء نے تیری تو بہت تعریف لکھی ہے سچ بتا تاکہ تو کون سی فوج میں تھا اور کیا کارنامہ تو نے انجام دیا؟"۔ میں نے کہا "یہ ناچیز بادشاہوں کے سامنے لرزاں و ترساں سچ ہی بیان کرنے کا عادی ہے بھلا جھوٹ کس طرح کہہ سکتا ہے اور جو کچھ واقعہ تھا میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ بادشاہ نے پوچھا تم نہتے تھے یا مسلح؟ میں نے کہا ایک زرہ اور تلوار میرے پاس تھی۔ فرمایا یہ سامان تم کو کہاں سے مل گیا؟ عرض کیا، سید عبداللہ خاں سے میں نے لیا تھا۔ بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ ان دنوں ہمیشہ بادشاہ کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا، چنانچہ مٹھی بھر اشرفیاں اٹھا کر جو کل ۹۶ تھیں مجھے انعام دیا۔ پھر پوچھا شیخ عبدالنبی سے ملاقات کی ہے؟ میں نے کہا راستہ کی گرد جھاڑتے ہوئے سیدھے خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اس سے کیسے مل سکتا تھا؟ پھر بادشاہ نے ایک اعلیٰ قسم کا نخودی دوشالہ اٹھا کر مجھے دیا کہ یہ لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو اور اس سے کہنا کہ یہ دوشالہ ہم نے تمہارے لیے اپنے خاص کارخانہ میں تیار کرایا ہے، اسے اوڑھ لو!" میں وہ دوشالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گیا اور اسے بادشاہ کا پیغام دیا۔ شیخ بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھا کہ رخصت کرتے وقت میں نے تم سے کہا تھا مقابلے کے وقت مجھے دعا میں یاد رکھنا۔ میں نے کہا اس وقت تو میں نے یہ دعا "اللھم اغفر للمومنین والمومنات وانصر من نصر دین محمدؐ واخذل من خذل دین محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام" پڑھی تھی۔ شیخ نے کہا یہی کافی ہے، سبحان اللہ، کس قدر جائے عبرت ہے کہ یہی وہ شیخ عبدالنبی ہے کہ وہ جب دنیا سے رخصت ہوا تو ایسے برے حال میں کہ خدا کسی کو نہ دکھائے نہ سنوائے اور سب کو اس سے عبرت ہو ؂

ہر کرا پرور دگیتی عاقبت خوش بریخت
حال آں فرزند چوں باشد کہ خصمش مادر است

اسی سال بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کے ذریعہ خان جہاں کے پاس فرمان بھیجا اور اسے بنفس نفیس خود وہاں پہنچنے کی خوش خبری دی۔ اس وقت خان جہاں کہل گاؤں کے قریب داؤد کے مقابلہ میں مورچے جمائے مظفر خاں اور بہادر حاجی پور کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کے لشکر کی مدد کے لیے ڈاک چوکی کے ذریعہ پانچ لاکھ روپیہ بھیجا اور غلہ سے بھری ہوئی بہت ساری کشتیاں آگرہ سے روانہ کرنے کا حکم دیا۔

بادشاہ کا عزم بنگال

اسی دوران میں خبر پہنچی کہ نواح حاجی پور کے زمیندار گجپتی نے جو باغی ہو گیا تھا فوج اکٹھی کر کے تھانہ آرہ پر جہاں فرحت خاں اور اس کا لڑکا میرک رداٸی مامور تھے حملہ کر دیا اور ان دونوں کو شہید کر دیا ہے اور اس کی فوج کشی کی وجہ سے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ اس اطلاع پر بادشاہ سن مذکور میں ۲۵ ربیع الآخر کو فتح پور سے مشرقی ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور پانچ کوس طے کر کے منزل کی اس منزل میں سید عبداللہ خاں داؤد کا سر لے کر

حاضر ہوا اور سید میر کی کے فال جفر کا وہ شعر جو اس نے پٹنہ سے واپسی کے وقت جون پور میں نکالا تھا سچ ثابت ہوا۔ وہ شعر تھا۔

مژدہ فتح بہ ناگاہ رسد

سر داؤد بدرگاہ رسد

داؤد کی شکست اور قتل

اس معرکہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جس دن سید عبداللہ خاں کہل گاؤں کے قریب خان جہاں کے لشکر میں پہنچا تو حملہ کی تیاری کی گئی اور دوسرے دن کہ ربیع الآخر کی پندرہ تاریخ تھی خان جہاں اور مظفر خاں نے صف آرائی کی اور تمام امراء کو ان کی ڈیوٹیاں سپرد کیں۔ اس وقت داؤد بڑے نخوت و غرور کے ساتھ اپنے چچا جنید کررانی اور دوسرے سرداروں کو لے کر قلعہ سے باہر آیا اور جنگ چھیڑ دی۔ پہلے ہی حملہ میں توپ کا ایک گولہ جنید کو آ کر لگا اور اس کے چیتھڑے اڑ گئے۔ جب دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی تو پٹھان شکست کھا کر بھاگ نکلے اور داؤد کا گھوڑا ایک دلدل میں پھنس گیا حسین بیگ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، وہ داؤد کی مشکیں کس کر اسے خان جہاں کے پاس لے آیا۔ داؤد سخت پیاسا ہو رہا تھا، اس نے پانی مانگا، لوگوں نے اسی کے جوتے میں پانی بھر کر اسے پیش کیا۔ جب اس نے نہ پیا اور منہ پھیر لیا تو خانجہاں نے اپنے خاص پیالہ سے اسے پانی پلایا۔ داؤد نہایت خوبصورت اور حسین تھا اس لیے خان جہاں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا، آخر امرا نے کہا کہ اس کو زندہ چھوڑنے میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے۔ خانجہاں نے مجبور ہو کر اس کی گردن مارنے کا حکم دے دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر گھاس سے بھر کر خوشبو میں بسایا گیا اور عبداللہ خاں کے حوالہ کر کے روانہ کر دیا۔ اس فتح میں شاہی لشکر کو بہت سے ہاتھی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔

اکبر کی اجمیر کو روانگی

بادشاہ اس فتح کے شکرانہ میں اسی سال ۲۳ جمادی الثانی کو دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور چھٹی ماہ رجب کو جس دن کہ خواجہ صاحب کا عرس تھا وہاں پہنچے۔ خواجہ خاوند محمود کے لڑکے سلطان خواجہ کو "امیر الحاج" بنا کر چھ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرا سامان حرمین شریفین کے مستحق لوگوں کے لیے اور حرم مبارک میں ایک عمارت بنوانے کے لیے روانہ کیا۔ جس وقت سلطان خواجہ رخصت ہونے لگا، بادشاہ بھی زائروں کی طرح ننگے سر ننگے پیر احرام باندھے حاجیوں کا لباس پہن کر اور تھوڑے تھوڑے بال ترشوا کر کچھ دور تک اس قافلہ کے ہمراہ گئے۔ بادشاہ کو اس حال میں دیکھ کر لوگوں کو بڑی رقت ہوئی اور لوگ چیخیں مار کر نالہ و فریاد کرنے لگے۔ سلطان خواجہ کے بدرقہ کے لیے قطب الدین محمد خاں، قلیچ خاں اور آصف خاں کو مقرر کر کے حکم دیا گیا کہ امراء اس قافلہ کو کوکندہ سے بخیر و خوبی آگے پہنچا کر رانا کے سارے علاقہ کو پامال کر دیں اور اس کا جہاں بھی پتہ چلے گھیر کر زندہ نہ چھوڑیں۔

شاہ طہماسپ کا انتقال

اس موقع پر خبر آئی کہ ایران میں شاہ طہماسپ فوت ہو گیا ہے اور شاہ اسماعیل ثانی اس کا جانشین ہوا ہے۔ اس قافلہ کی روانگی پر تاریخ نکالی گئی۔

"اول دولت و فتح و ظفر است"

اس وقت بادشاہ نے عام منادی کرا دی کہ جو شخص چاہے قافلہ کے ساتھ حج پر جا سکتا ہے، اس کا سفر خرچ سرکار سے ادا کیا جائے گا چنانچہ بے شمار لوگ اس سال حج کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ ایک زمانہ یہ تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ کوئی شخص حج کا نام بھی نہیں لے سکتا اور حج کی اجازت کی درخواست پر ہی لوگ واجب القتل مجرم بن جاتے ہیں۔۔۔۔

تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ؕ

ان دنوں جب گوکنده کے لشکر کی عسرت و تنگی کی شکائتیں پہنچنے لگیں تو بادشاہ نے مان سنگھ آصف خاں اور قاضی خاں کو وہاں سے طلب کر لیا۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔

ان کو بعض قصوروں پر چند دن کے لیے کورنش سے محروم کر دیا گیا اور غازی خاں بدخشی، مہتر خاں، علی مراد ازبک خنجری ترک اور دوسرے ایک دو افسروں کو جن میں بھی شامل تھا ان سے مستثنیٰ کر کے شاہانہ عنایات سے نوازا گیا اور ان کے مناصب میں ترقی ہو گئی، باقی تمام لوگوں کا تنزل ہو گیا، اگرچہ بعد میں ان کو بھی بادشاہ نے معاف کر دیا۔

خواجہ شاہ منصور کی باریابی

رانا کیکا شکست کھانے کے بعد اودھے پور اور خان پور وغیرہ کے کوہستان میں قزاقی کرتا پھر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے اسی مہینے کی ۹ تاریخ کو رانا کے علاقہ کی جانب کوچ فرمایا۔

اس زمانہ میں خواجہ شاہ منصور شیرازی خدمت میں آیا بہت پہلے وہ کچھ عرصہ تک بادشاہی شتر خانہ کا مہتمم رہا تھا لیکن مظفر خاں سے دشمنی ہو جانے کی وجہ سے شاہی خدمت سے بھاگ کر جون پور میں منعم خاں کے پاس چلا گیا تھا۔ منعم خاں نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی اور خواجہ منصور ترقی کر کے دیوانی کے عہدہ پر مامور ہو گیا۔ جب منعم خاں کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے فرمان بھیج کر اسے دربار میں بلا لیا۔ خواجہ منصور چونکہ نہایت تجربہ کار، کاردان اور سنجیدہ آدمی تھا اس لیے بادشاہ نے اسے تمام ممالک محروسہ کا دیوان بنا دیا اور وہ امور ملکی میں راجہ ٹوڈرمل کا با اختیار شریک ہو گیا۔

مشہور ہے، اول حق بعد میں ظلم، آدمی اقتدار پانے کے بعد ظلم و ستم پر اتر آتا ہے اور خواجہ کے ساتھ تو یہ بھی اتفاق پیش آیا کہ اسی سال دمدار ستارہ مغرب کی جانب سے طلوع ہوا۔ چونکہ خواجہ منصور دنبالہ دار پگڑی باندھا کرتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کا نام ستارہ دنبالہ دار یعنی "جھاڑو تارا" رکھ دیا۔ خواجہ فوج کا حساب کتاب نہایت سختی کے ساتھ کرنے لگا اور اس کی جا بے جا پکڑ دھکڑ سے لوگ ایسے تنگ آئے کہ وہ راجہ اور مظفر خاں کی سختیاں بھول گئے اور اس پر لعنتیں بھیجنے لگے۔

شاہ اسماعیل کا قتل

اسی سال خبر پہنچی کہ عراق کے بادشاہ شاہ اسماعیل ولد شاہ طہماسپ کو اس کی بہن پری خانم نے امرا کے ساتھ ساز باز کر کے قتل کرا دیا ہے۔ میر حیدر معمائی نے اس کی تاریخ جلوس "شہنشاہ روئے زمین" اور اس کی تاریخ وفات "شہنشاہ زیر زمین" نکالی۔ جو دمدار ستارہ طلوع ہوا تھا اس کا اثر عراق میں ظاہر ہوا اور وہاں اس واقعہ سے بڑا انتشار پھیل گیا۔ تبریز، شروان اور مازندران پر رومیوں نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان محمد خدا بندہ جو شاہ طہماسپ کی دوسری بیوی سے تھا تخت پر بیٹھا۔ اس نئے بادشاہ کے دور میں وہاں ایک بڑی اچھی تبدیلی ہوئی مدت دراز سے وہاں کی حکومت کے زیر سایہ جو صحابہ کے خلاف تبرا ہوتا تھا اور خلفائے بنو امیہ پر لعنت کی جاتی تھی وہ ختم ہو گئی لیکن وہاں کی بے دینی ہمارے ملک ہندوستان میں سرایت کر گئی ؎

نفاق آمده در ہند از بلاد عراق
عراق قافیہ میداں بر ہگذار نفاق

قلعہ ایدر پر حملہ

جس وقت قصبہ موہنی میں سراپردۂ شاہی نصب ہوا تو قطب الدین محمد خاں اور راجہ بھگوان داس کے نام فرمان جاری کیا گیا کہ دونوں سردار کو کندہ میں ٹھہرے رہیں اور قلیچ خاں دوسرے امرا کے ساتھ حاجیوں کے قافلہ کو لے کر ایدر تک جو احمد آباد سے چالیس کوس پرہے جائے اور وہاں کے زائرین کو بھی قافلہ کے ساتھ احمد آباد روانہ کرنے کا انتظام کرے۔ قافلہ کو رخصت کر کے ایدر کے قلعہ کا محاصرہ کرلے اور راجہ نرائن داس کی پوری طرح سرکوبی کر کے لوٹے۔ قلیچ خاں نے حکم کی تعمیل کی اور حاجیوں کے قافلہ کو تیمور خاں بدخشی کے ہمراہ پانسو سواروں کی حفاظت میں منزل تک پہنچا دیا۔ اس کی فوج کشی سے ایدر کا راجہ بھی رانا کیکا کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر چھپ گیا۔

بادشاہ کی مالوہ کو روانگی

اسی منزل میں شہاب خاں اور شاہ بداغ خاں اپنے لڑکے عبد المطلب خاں کے ساتھ اور شاہ فخر الدین خاں اور مالوہ کے دوسرے جاگیردار دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے غازی خاں بدخشی کو ہزاری کا منصب عطا کر کے شریف محمد خاں اتکہ، مجاہد خاں اور ترک سبحان قلی اور تین ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ قصبۂ موہنی میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ مداریہ کی پہاڑیوں میں عبد الرحمٰن ولد مؤید بیگ کو پانچ سو آدمیوں کی چوکی پر مقرر فرمایا۔ قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کو بھی کو کندہ سے لشکر میں طلب کر لیا گیا اور اودے پور پر شاہ فخر الدین اور جگناتھ کو مامور کیا۔ سید عبد اللہ خاں اور راجہ بھگوان داس کو اودے پور کے درہ پر متعین فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ کوچ کر کے بانس والہ اور ڈونگر پور پہنچے۔

اسی مقام پر بنگالہ سے راجہ ٹوڈرمل وہاں کا مال غنیمت اور پانسو ہاتھی لا کر باریاب ہوا۔ اسی منزل سے قلیچ خاں کو ایدر سے بلا کر اس کی جگہ آصف خاں کو لشکر کا سردار بنا دیا اور قلیچ خاں کو کنھبایت کے کلیان رائے بقال کے ساتھ سورت کی بندرگاہ پر بھیج دیا تاکہ وہ فرنگیوں سے پروانۂ راہداری لے کر سلطان خواجہ کے جہاز کو جو اس پروانہ کے نہ ملنے کی وجہ سے وہاں لنگر ڈالے ہوئے پڑا تھا روانہ کرا دے اور مالوہ میں شاہی لشکر سے آکر مل جائے۔

جلوس کا تئیسواں سال

اسی سال ماہ ذی الحجہ میں نوروز ہوا اور جلوس کا تئیسواں سال شروع ہوا۔ اس مرتبہ نوروز[1] کا جشن مالوہ کے قریب دیبالپور کے قصبہ میں منایا گیا۔ میں ان دنوں بری طرح بیمار ہو گیا تھا اور بساور ہی میں ٹھہر گیا تھا۔ میں نے جشن میں شرکت کے لیے بانس والہ کے راستہ سے لشکر میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ ہندون میں سید عبد اللہ خاں سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے اس راستہ کو خطرناک بتایا اور مجھے لوٹا کر بجونہ میں لے آیا۔ چند دن شاہی امامت کی ذمہ داریوں کا خیال کر کے رضوی خاں کے ساتھ گوالیار، سارنگ پور اور اجین ہوتے ہوئے بارہ ذی الحج کو میں دیپالپور مالوہ پہنچا اور دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک نفیس حمائل شریف اور خطبوں کی ایک بیاض جس میں صنائع بدائع سے مرصع نہایت عمدہ خطبے

---

[1] جشن نوروزی: یہ ترک چنگیزیوں کا قدیم تہوار ہے جو بہار کے آغاز میں منایا جاتا ہے۔ ایران میں بھی قدیم سے اس کا رواج تھا زرتشت نے تو اسے اپنا مذہبی تہوار بنایا تھا۔ ہندوستان میں بھی اس دن کا احترام ہندوؤں کے پاس کیا جاتا ہے۔ اکبر اس کو بڑے اہتمام اور عقیدہ سے منایا کرتا تھا۔ اس دن بڑا جشن منعقد ہوتا تھا دولت خانہ خاص اور سبھا منڈل میں نوروز کی شاہانہ محفل منعقد ہوا کرتی تھی اور ۱۸ دن تک امرائے شاہی کے ایوانوں میں ضیافتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس خاص دن اکبر اشنان کر کے راجپوتی وضع کا رنگین جوڑا پہنا کرتا تھا۔ برہمن پیشانی پر ٹیکہ لگاتے تھے۔ نوروز کے دن سونے کے ترازو میں بادشاہ کو ۱۲ چیزوں یعنی سونا، چاندی، ابریشم، خوشبو، لوہا، تانبا، جست، توتیا، گھی، دودھ، چاول، ست نجا سے تولا جاتا تھا اور یہ چیزیں برہمن دان میں لے لیتے تھے۔

درج تھے پیش کیے۔ یہ دونوں چیزیں حافظ محمد امین قندھاری کی تھیں۔ حافظ جیسا خوش آواز شخص اس زمانہ میں میں نے کسی اور کو نہیں پایا۔ جس وقت پساور کے محل گروہر میں منزل کی گئی تھی حافظ کے پاس سے یہ دونوں چیزیں چور اڑا لے گئے تھے۔ بعد میں عبداللہ خاں نے تفتیش کر کے ان کو حاصل کیا تھا اور انھیں میرے سپرد کر دیا تھا۔ جب میں نے بادشاہ کو یہ نذرانہ میں پیش کیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور حافظ محمد امین کو بلا کر مذاقاً فرمایا ایک حمائل شریف کسی جگہ سے ہمارے پاس تحفہ میں آئی ہے میں وہ تمھیں عطا کرتا ہوں۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا اور ایسے خوش ہوا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو، جھک جھک کر تسلیمات بجا لایا اور شکرانہ کا سجدہ ادا کر کے عرض کیا، حضرت نے اسی دن عبداللہ خاں کو فرمایا تھا کہ اسے انشاء اللہ تو ہی تلاش کر کے لائے گا، آپ کی وہ بات پوری ہو کر رہی۔ بادشاہ نے مجھ سے ان نسخوں کے ملنے کا حال دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ مزدوروں کی ایک جماعت پساور کے قصبوں میں حوض اور کنوؤں کے کھودنے کا کام کرتی ہے اور اسی بہانے چوری ڈکیتی کرتی رہتی ہے۔ انھی مزدوروں نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑا کر سید عبداللہ خاں کے پاس مخبری کر دی۔ خان نے سب کو پکڑ لیا اور انھوں نے اپنی چوریوں کا اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے حافظ کو مخاطب کر کے کہا مطمئن رہو انشاء اللہ تمھارا دوسرا سامان بھی نکل آنے گا۔ اس نے عرض کیا میں تو صرف اس مصحف اور بیاض کے لیے فکرمند تھا، یہ آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں اور ان کے بغیر میں خطبے مرتب کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ بقیہ سامان کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس سفر سے واپسی میں جیسا کہ بادشاہ نے فرمایا تھا اس کا وہ سارا سامان جوں کا توں انھیں بیلداروں کے پاس سے برآمد ہو گیا۔ عبداللہ خاں نے یہ سامان فتح پور میں لا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

اسی منزل میں بادشاہ نے از سر نو مجھے امامت کرنے کا حکم دیا اور حسب سابق خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ ہفتہ میں ایک دن اور ایک رات مجھے چوکی پر حاضر کر دیا کرے۔ معاملہ اسی قسم کا تھا کہ

"ننھا مکتب کو نہیں جاتا بلکہ اسے لے جایا جاتا ہے۔"

اس علاقہ کے انتظامات کے لیے چند دن تک دیپالپور میں قیام کیا گیا اور بعض بڑے امراء کو جیسے شہاب الدین احمد خاں وغیرہ کو مالوہ کے جاگیرداروں کے ساتھ راجہ علی خاں پر حملہ کرنے اور اس کے ملک کو فتح کرنے کے لیے برہان پور کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کے داغ و محلہ کا کام شہباز خاں بخشی کے سپرد کیا گیا۔ اسی منزل سے راجہ ٹوڈرمل کو اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ گجرات کی جمعبندی کی تحقیقات اور وہاں کے انتظامات کے لیے مامور کیا گیا۔

راجا نارائن داس کی شکست

اسی اثنا میں خبر آئی کہ آصف خاں نے ایدر کو فتح کر لیا ہے اور راجہ نرائن داس کو شکست ہوئی ہے۔ جب قلیچ خاں کو علی مراد اوزبک کے ساتھ ایدر سے دربار میں بلا لیا گیا تھا اور آصف خاں کو لشکر کی سرداری پر نامزد کیا گیا تھا تو راجہ ایدر رانا کیکا اور دوسرے زمینداروں کی مدد سے فوج اکٹھی کر کے ایدر سے دس کوس کے فاصلہ پر تھانہ پر حملہ آور ہوا اور شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ جب لشکر کو یہ خبر ملی تو آصف خاں میرزا محمد مقیم تیمور بدخشی میر ابوالغیث بخاری اور میر محمد معصوم بکری وغیرہ نے مشورہ کیا کہ تقریباً پانسو سواروں کو تھانہ کی حفاظت پر چھوڑ کر پیش قدمی کی جائے اور راجہ پر حملہ کر دیا جائے، چنانچہ چار ذی الحج سنہ ۹۸۴ھ کی صبح کو یہ لوگ سات کوس کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ دوسری طرف سے راجہ نارائن داس

پوری تیاریوں کے ساتھ بڑھ کر آیا اور دونوں فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ میرزا محمد مقیم نے جو ہراول پر متعین تھا سب سے آگے بڑھ کر معرکہ آرائی کی اور شہید ہو گیا لیکن اس کے زبردست حملہ نے کافروں کے پیر بھی میدان سے اکھاڑ دیے اور وہ بری طرح شکست کھا کر بھاگے اور پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔ جب آصف خاں کا عریضہ بارگاہ میں پہنچا تو اس لشکر کے سرداروں کے نام عنایت آمیز فرمان روانہ کیا گیا۔

اسی سال میر سید محمد میر عدل نے جو بکر کی حکومت پر نامزد ہوئے تھے میر سید ابو الفضل اور اپنے دوسرے بیٹوں کو سببو پر حملہ کرنے بھیجا۔ ان لوگوں نے تھوڑی سی مدت میں اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ میر سید ابو القاسم ولد میر سید صفائی جو بکر کے سربرآوردہ آدمی ہیں، دربار میں حاضر ہوئے ان کو احدیہ کا منصب سپرد کیا گیا۔ اس فتح کی تاریخ ہوئی ع

"فتح سببو می شد باولاد نبیؐ"

انہی دنوں میر عدل کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی تاریخ وفات ہے "سید فاضل۔ عاملہ اللہ بالفضل"۔

شریف آملی کی آمد

انہی دنوں شریف آملی دیپال پور کی منزل میں آ کر باریاب ہوا۔ یہ مردود اور نابکار پاگل کتے کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا پھرتا تھا اور ہمیشہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا تھا۔ بڑے مباحثے اور مجادلے کرتا رہتا تھا، انجام کار اس نے سارے اعتقادات ترک کر کے الحاد و بے دینی کو اپنا شعار بنا لیا۔ کچھ عرصہ تک صوفیوں کے بھیس میں بلخ میں مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے پوتے مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا۔ اس کو درویشی سے کوئی تعلق خاطر نہ تھا اس لیے وہ وہاں ہمیشہ درویشوں کو اپنی ہرزہ سرائی اور نوک جھونک سے پریشان کرتا رہتا تھا۔ تنگ آ کر ان لوگوں نے اسے خانقاہ سے نکال دیا۔ مولانا نے چند شعر اس کی شان میں کہے تھے ان میں کا ایک شعر ہے:

ہست یک ملحدے شریف بنام ؎
ناتمامی بطور خویش تمام

بلخ سے نکلنے کے بعد وہ سیر و سفر کرتے ہوئے دکن جا پہنچا۔ وہاں کے لوگ بھی جب اس کی خباثتوں سے واقف ہوئے تو انھوں نے اس کا قصہ ہی پاک کر دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن ترس کھا کر اسے بس اتنی سزا دی کر گدھے پر سوار کر کے بڑی رسوائی کے ساتھ اس کی تشہیر کرا دی۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں، ہر شخص جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتا ہے اس لیے وہ بھی دکھن سے نکل کر آزادی کے ساتھ گھومتا پھرتا اسی زمانہ میں مالوہ پہنچ گیا۔ اور لشکر سے پانچ کوس کے فاصلہ پر اپنا ٹھکانا بنایا اور طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ نہایت زہریلے خیالات پھیلانے لگا۔ اس کی مجلس میں جاہل عوام حاضر ہونے لگے، خاص طور سے عراقیوں کا اس کے پاس مجمع لگا رہتا تھا۔ یہ عراقی تو ایمان سے ایسے نکلے ہوئے ہیں جیسے مکھن سے بال نکل آتا ہے، دجال نکلے گا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرنے والے بس یہی عراقی ہوں گے۔ اس بدبخت نے ان عراقیوں کے ذریعہ یہ شہرت دی کہ وہ دسویں صدی کا مجدد ہے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا اس کی خبر جب اکبر کو ہوئی تو اس نے ایک رات اسے اپنی مجلس میں بلا بھیجا اور رتنالوں کی بنی ہوئی اس طویل مسجد میں جس میں پانچ وقت نماز ادا کی جاتی تھی اکبر نے اس سے خلوت میں باتیں کیں۔ جب وہ آیا تو اپنی مضحکہ خیز شکل، ناگوار ہیئت کذائی اور ٹیڑھی گردن کے ساتھ جھک کر کورنش[1] ادا کی اور کافی دیر تک ہاتھ باندھے

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوئے اپنی کنجی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے جو حضور اکرمؐ کی دشمنی کی نشانی ہے، کھڑا رہا اس کے سراپا سے جھوٹ، ریاکاری اور منافقت نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب بادشاہ نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو سجدہ کر کے اونٹ کی طرح دوزانو بیٹھ گیا۔ اکبر اس کے سامنے جا بیٹھا اور تنہائی میں باتیں کرنے لگا۔ سوائے حکیم الملک کے اس جگہ کسی اور کو کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی دُور سے کبھی کبھی اس کی آواز بلند ہوتی تھی۔ میں نے بس "علم" کا لفظ سنا۔ غرض اس نے بڑی خرافات بکیں اور انھیں حقائق اور اصل الاصول بتاتا رہا ؎

قومے نہ ز ظاہر نہ ز باطن آگاہ — انگہ ز جہالت بہ لطافت آگاہ
مستغرق کفر اند و حقیقت گویند — لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ

شریف آملی کا مسلک محمود بسخوانی کے مسلک کی نقل تھا۔ اس محمود نے امیر تیمور صاحبقران کے زمانہ میں گیلان کے ایک گانو بسخوان میں ظہور کیا تھا۔ اس نے تیرہ منحوس رسالے لکھے تھے جو ہر طرح کے زندقہ سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک رسالہ کا نام "میزان" تھا، جسے اس نے "علم لفظ و حال" کا نام دیا ہوا تھا۔ اس بدبخت کی تمام تصانیف کا خلاصہ "بحر و کوزہ" نامی ایک کتاب تھی۔ جو غلاظت اس کتاب میں اس نے جمع کی ہے اس کو سن کر ہی قے ہونے لگتی ہے۔ اگر شیطان اس کو سُن لے تو مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ اس شریف کثیف نے بھی ایک کمالات کا مجموعہ بنا رکھا تھا جسے "ترشح ظہور" کا نام دیے ہوئے تھا۔ اس کتاب کی ترتیب اس نے میر عبداللہ اول کے مجموعہ کی طرح رکھی تھی کہ اس کے ہر نامربوط عام فریب فقرہ کا عنوان اس لفظ کو رکھا گیا ہے جس سے وہ فقرہ شروع ہوتا ہے۔ غرض یہ کتاب نہایت مضحکہ خیز چیز تھی۔

خدا کی شان دیکھو کہ باوجود اس جہالت کے اس مکار نے اس طرح لوگوں پر اپنی فضیلت کا سکہ جمایا کہ اب وہ ہزاری منصب دار بنا بیٹھا ہے اور بنگالہ میں "مذہب حق" کا داعی مقرر ہوا ہے۔ بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے شاہی مراتب کی نیابت کرتا ہے۔ ان مراتب کا ذکر انشاءاللہ آئندہ بیان کیا جائے گا ؎

یار بودم قطبک امسال قطب الدین شدم
گر بمانم سال دیگر قطب دین حیدر شدم

فتح پور کو واپسی | جب اس علاقہ کے سارے انتظامات حسب منشا تکمیل پا گئے تو بادشاہ وہاں سے مسلسل کوچ کر کے

(حاشیہ صفحہ سابقہ) ؎ کورنش: بادشاہوں کے دربار میں سلام کے مختلف طریقے تھے کہیں سینہ پر ہاتھ باندھنے کہیں سر جھکانے کہیں دوزانو ہو کر جھکنے کا رواج تھا۔ اکبر کے دربار میں سلام کا طریقہ یہ تھا کہ حاضر ہونے والا ادب سے آگے سامنے بیٹھے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے پشت دست کو زمین پر ٹیکے اور پھر آہستہ سیدھا اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور سیدھا ہاتھ سر پر رکھ کر اتنا جھکے کہ دوہرا ہو جائے، پھر داہنی طرف کو جھوک دیتا ہوا سیدھا ہو جائے۔ اسی کو کورنش اور تسلیم کہا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ طریقہ خود اپنے ایک واقعہ سے اخذ کیا تھا، بچپن میں ہمایوں نے ایک مرتبہ اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔ اتالیقوں کے اشارے پر اکبر نے سلام کرنا چاہا، چونکہ تاج بڑا تھا اس لیے اسے سنبھالتے ہوئے جھک کر اور سیدھا ہو کر آداب بجا لایا۔ اس وقت سہارے کے لیے مٹھی زمین پر بھی ٹکائی ہمایوں کو اس کی یہ ادا بڑی پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ کورنش و تسلیم اسی طرح ہوا کرے۔ اکبر نے اس طرح کورنش کا باقاعدہ آئین مقرر کر دیا، بعد میں سجدۂ تعظیمی کا حکم دیدیا گیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بھی سجدہ ہوتا رہا۔ جہانگیر نے مجدد الف ثانیؒ کو سجدہ اور کورنش نہ کرنے پر ہی قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ شاہجہاں نے سب سے پہلا حکم اسی سجدہ کی موقوفی کا دیا۔ سال دہم جلوس شاہجہانی میں کورنش بھی بند ہو گئی۔ صرف شرعی سلام دربار کا سلام مقرر کیا گیا۔

سیر و شکار کرتے ہوئے رنتھبور کے راستہ سے ۲۳ صفر ۹۸۵ھ کو فتح پور پہنچے۔ اسی موقع پر شیخ فیضی جس کو اب ملک الشعراء کا خطاب مل چکا ہے، ایک غزل کہی تھی اس کا مطلع ہے ؎

نسیمِ خوش دلے از فتح پور مے آید
کہ پادشاہ من از راہِ دُور مے آید

مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ

دو تین ماہ بعد گجرات میں غدر کی اطلاع ملی۔ اس مرتبہ جب راجہ ٹوڈر مل گجرات پر مامور ہو کر گیا تو مظفر حسین ولد ابراہیم حسین مرزا جو مرزا کامران کا نواسا تھا۔ اور اسکو اسکی ماں گلرخ بیگم سورت کے محاصرہ کے وقت دکن لے کر چلی گئی تھی۔ چند اوباشوں کی جمعیت لے کر گجرات میں فتنہ و فساد مچانے پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ سولہ سال تھی، اسے بہکانے والا اصل میں مہر علی نامی ایک شخص تھا جس نے میرزا ابراہیم کے پاس پرورش پائی تھی۔

مرزا مظفر حسین نے گجرات پہنچ کر بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اس کے مقابلہ پر شریف محمد خاں اتکہ کا لڑکا باز بہادر اور گجرات کا دیوان بابا بیگ پرگنہ پتلاد میں پہنچے مرزا نے ان کو شکست دی اور کھنبایت تک جا پہنچا۔ اب اس کے پاس دو تین ہزار سواروں کی جمعیت ہو گئی تھی۔ وزیر خاں حاکم گجرات کے پاس بھی تین ہزار سوار تھے، لیکن اسے اپنے سپاہیوں پر پورا بھروسا نہ تھا، اس لیے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے وہ قلعہ بند ہو گیا اور راجہ ٹوڈر مل کے پاس جو اس وقت پٹن میں ٹھہرا ہوا تھا ساری کیفیت لکھ بھیجی۔ راجہ نے احمد آباد کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کی آمد پر میرزا احمد آباد سے ہٹ کر دولقہ کی طرف چلا گیا۔ وزیر خاں اور راجہ نے اس کا تعاقب کیا۔ اس مقام پر فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ باغی شکست کھا کر جونا گڑھ کی طرف نکل گئے۔ اسی زمانہ میں راجہ فتح پور واپس چلا آیا۔ اس کی واپسی کی خبر سن کر مرزا مظفر حسین نے دوبارہ جونا گڑھ سے نکل کر احمد آباد پر حملہ کیا اور وزیر خاں پہلے کی طرح قلعہ میں محصور ہو گیا۔ میرزا نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، اس کی فوج قلعہ کی دیوار پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ لوگ قلعہ کو فتح کر لیتے لیکن عین اس وقت ایک گولی مہر علی کے سینہ میں آ کر لگی۔ مہر علی مرزا کا وکیل مطلق اور روح رواں تھا، اس کے ہلاک ہوتے ہی میرزا بدحواس ہو کر میدان سے بھاگ نکلا اور سلطان پور اور ندر آباد کی طرف چلا گیا۔

راجہ علی خاں سے مصالحت

بادشاہی فوج کے ان امیروں نے جو شہاب الدین احمد خاں کی سرداری میں برہان پور پر فوج کشی کے لیے بھیجے گئے تھے حملہ کر کے راجہ علی خاں کو قلعہ میں محصور کر دیا تھا اور اس کی ساری مملکت کو تباہ و تاراج کر دیا تھا۔ قلعہ کے فتح ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہی تھی لیکن محاصرہ کے دوران میں قطب الدین محمد خاں کا امراء سے اختلاف ہو گیا اور وہ ناراض ہو کر اپنی جاگیر بھروچ اور بڑودہ کی طرف چلا گیا جہاں مرزا مظفر نے غارت گری کر کے بڑا انتشار پھیلا دیا تھا۔ اس کے اس طرح محاذ سے چلے جانے کی وجہ سے برہان پور کی مہم میں بڑی دقتیں پیدا ہو گئیں۔ امرائے شاہی نے مصلحت یہی سمجھی کہ راجہ علی خاں سے معقول نذرانہ وصول کر کے دربار میں بھیج دیں اور اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ جائیں۔

حکیم عین الملک کی دکن سے واپسی

انہی دنوں حکیم عین الملک شیرازی جو ۹۸۳ھ میں حاکم دکن عادل خاں کے وکیل کے

ہمراہ سفارت پر گیا تھا، واپس آگیا اور عادل خاں کے دیئے ہوئے عمدہ ہاتھی اور قیمتی تحائف نذر میں پیش کیے۔ جب بانس بریلی کی فوجداری سے دیپ چند راجہ منجھولہ کو ہٹا دیا گیا تو وہاں کا فوجدار حکیم عین الملک کو بنایا گیا۔ اس نے وہاں سے ایک طویل عریضہ لکھا، منجملہ اور باتوں کے اس میں یہ بھی فقرہ تھا کہ "جب سے میں دربار سے علیحدہ ہوا ہوں اس جنگل بیابان میں میرے ساتھ کوئی اہم خیال دوست نہیں ہے، اگر جناب والا فلاں شخص کو (یہاں اس نے میرا نام لکھا تھا) جو اس علاقہ کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور یہاں کے لوگوں کو اس پر بھروسا و اعتماد بھی ہے اور دربار میں بھی اس کے ذمہ کوئی اہم خدمت نہیں ہے، میرے پاس بھیج دیں تو اس کے حق میں بھی بڑی عنایت ہوگی اور اس بندہ درگاہ پر بھی احسان ہوگا۔" بادشاہ کے حکم سے خواجہ شاہ منصور اس خطے کے ایک ایک فقرہ کو پڑھتا جاتا تھا اور حسب تجویز اس کا جواب لکھتا جاتا تھا۔ جب وہ مذکورہ فقرہ پر پہنچا تو بادشاہ نے "ہاں" لکھایا نہ "نہیں"۔

حج کے لیے قافلہ کی روانگی

۹۸۵ھ ماہ رجب میں جو خواجہ صاحب کے عرس کا زمانہ ہے بادشاہ نے اجمیر کا عزم کیا۔ جب سواری تودہ پر پہنچی تو شاہ ابو تراب جو شیراز کے بڑے بزرگ اور سلاطین گجرات کے پیر تھے، ملنے کے لیے آئے اور راجہ ٹوڈرمل بھی جو مرزا مظفر حسین کو شکست دینے کے بعد واپس ہو رہا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ میرٹھ کے قریب بادشاہ نے شاہ ابو تراب کو حاجیوں کا امیر بنا کر اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ کافی رقم دے کر مکہ معظمہ کے لیے رخصت کیا اور عام منادی کرا دی کہ جو بھی چاہے اس قافلہ کے ساتھ حج کے لیے جا سکتا ہے۔ میں نے بھی شیخ عبدالنبی صدر سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی آپ بادشاہ سے اجازت لے لیجیے تو اس نے پوچھا "کیا تمھاری والدہ زندہ ہیں؟" میں نے کہا "ہاں"۔ اس نے کہا تمھارا کوئی بھائی بند ایسا ہے جو ان کی خدمت کرتا رہے، میں نے کہا "نہیں صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ شیخ نے فرمایا اگر تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو تو بہتر ہوگا۔ غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں ؎

نہ کرد لطف تو کارے و وقت کار گزشت
نہ شد وصال تو روزے و روزگار گزشت

منوہر پور کی تعمیر

امبیر کے موضع مولتان میں جو ایک قدیم شہر ہے اور اس وقت بالکل کھنڈر بنا ہوا تھا، بادشاہ کی سواری پہنچی تو اس نے وہاں شہر کی اور ایک بلند قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ قلعہ کے دروازوں اور باغ کی تعمیر کی منزلیں امرا کے سپرد کی گئیں بادشاہ نے اس کی تعمیر میں اس توجہ سے اہتمام کیا کہ آٹھ دن میں اچھا خاصا شہر بن کر تیار ہو گیا اور رعایا کو وہاں آباد کر دیا گیا۔ سانبھر کے حاکم رائے منوہر ولد رائے لونکرن کے نام پر اس کا نام منوہر پور تجویز کیا گیا۔ رائے منوہر کو مرزا منوہر بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے شاہزادوں کے ساتھ تربیت پاتا رہا تھا، ایسا ہنرمند اور باکمال نکلا کہ اب بڑے اچھے شعر کہہ لیتا ہے اس کا تخلص توسنی ہے۔ اس کا ذکر شعراء کے بیان میں کیا جائے گا۔

یہاں سے بادشاہ سلامت نے نارنول کے راستہ دہلی کا ارادہ کیا اور شیخ نظام نارنولی سے جو مشائخین عظام میں سے ہیں ملاقات کی۔ دہلی میں پہلے تو بادشاہ نے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی پھر پالم میں شکار کھیلتے رہے۔

لیساور کو روانگی

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں میرے پاس لیساور سے خبر آئی کہ میری ایک خادمہ کو کافی مدت اور آرزوؤں کے بعد ایک لڑکا تولد ہوا ہے۔ میں نے بادشاہ کے پاس اشرفی کا نذرانہ پیش کر کے نام رکھنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا تیرے باپ اور دادا کا نام کیا ہے؟ عرض کیا ملوک شاہ ولد حامد بادشاہ نے فرمایا اپنے اس بچہ کا نام عبدالہادی رکھو "ہادی" کا کلمہ اس زمانہ میں رات دن بادشاہ کے ورد زبان رہتا تھا۔ سات بادشاہی اماموں میں ایک محمد امین خطیب بھی تھے انھوں نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ یہ فضول خیال چھوڑو اور حافظوں کو اپنے گھر پر جمع کر کے بچہ کی درازی عمر کے لیے قرآن کا ختم کراؤ۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ آخر کار وہ بچہ چھ ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔ میں نے اس منزل سے پانچ مہینہ کی رخصت لی اور لیساور چلا گیا۔ بعض مصروفیتوں بلکہ بے کار مشغلوں میں پھنس کر حسب وعدہ خدمت پر واپس نہ جا سکا اور لیساور میں ایک سال تک رہ گیا۔ ان کوتاہیوں اور لوگوں کی مخالفتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بادشاہ میری طرف سے بے توجہ ہوتے چلے گئے اور اب جب کہ اس واقعہ کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں اسی معمولی خدمت سے چمٹا ہوا ہوں کہ نہ رہتے بنے نہ بھاگتے۔

بختے نہ کہ با دوست در آمیزم من
صبرے نہ کہ از عشق بپرہیزم من
دستے نہ کہ با قضا در آمیزم من
پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من

جس وقت بادشاہ پنجاب کی طرف متوجہ تھے، ہانسی کی منزل میں شیر بیگ تواچی کا عریضہ پہنچا کہ مظفر حسین مرزا گجرات سے بھاگ کر دکن چلا گیا ہے، وہاں اسے راجہ علی خاں نے گرفتار کر کے قید کر دیا ہے۔ بادشاہ نے یکم ذی الحجہ ۹۸۵ھ کو مقصود جوہری کے ہاتھ راجہ علی خاں کے نام ایک فرمان بھیجا کہ وہ میرزا کو دربار میں روانہ کر دے۔

جلوس کا چوبیسواں سال

پہلی محرم ۹۸۶ھ کو نوروز ہوا اور جلوس اکبری کا چوبیسواں سال شروع ہو گیا۔

اکبر پر ایک خاص کیفیت کا ظہور

بادشاہ نے پٹن میں حضرت گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور نندنہ کے نواح میں قمرغہ کے شکار (ہانکے کا شکار) کا ارادہ کیا، چار دن تک برابر جانوروں کو ہانکا گیا۔ جس وقت دونوں طرف سے ہانکے کے جانور شکار گاہ میں آ کر جمع ہو گئے اور بادشاہ شکار کے لیے چلے تو اچانک بادشاہ پر ایک عجیب غیر معمولی حالت طاری ہو گئی اور ان کی ظاہری حالت کچھ اس طرح متغیر ہو گئی کہ اس کی تعبیر کسی طرح ممکن نہیں۔ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی وقت بادشاہ نے شکار بند کر دینے کا حکم دے دیا ؎

ہش دار کہ فیض حق بناگاہ رسد
ناگاہ رسد بر دل آگاہ رسد

بادشاہ نے اس درخت کے نیچے جہاں یہ کیفیت وارد ہوئی تھی فقیروں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات دی اور وہاں ایک عمدہ عمارت اور وسیع باغ کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا، سر کے بال ترشوائے۔ بہت سے مصاحبین اس کیفیت و حالت کی

بڑھ چڑھ کر تصدیق و تائید کرنے لگے۔ جب یہ خبر مشرقی ہندوستان میں پھیلی تو لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں اور رعایا میں بڑی ہلچل سی پیدا ہوگئی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد حالات اعتدال پر آگئے۔

مدد معاش کا نیا قانون

بہرہ کی منزل میں دارالخلافہ سے بیگم بادشاہ لشکر میں تشریف لائیں۔ بادشاہ نے پنجاب کی حکومت سعید خاں مغول کے تفویض کی۔ میر قاضی حسین میبذی کے پوتے قاضی علی بغدادی کو پنجاب کے اماموں کی مدد معاش سے متعلقہ اراضیات کے عمل دخل اور اس سلسلہ کے دوسرے کاموں پر متعین کیا گیا کہ قدیم محالات کو منسوخ کر کے باقاعدہ پیمائش کی جائے اور تمام اماموں کو ایک ہی گاؤں کی اراضیات میں حصہ دار بنا دیا جائے۔ اس نئے انتظام سے تمام ممالک محروسہ کے اماموں میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ یہ سب شیخ عبدالنبی کی ضد میں ہوا اور اس میں اس کے کارندوں کی بددیانتی کا بھی بڑا دخل ہے۔

بادشاہ کی فتح پور کو واپسی

یہاں سے بادشاہ نے فتح پور کو واپسی کے لیے کوچ کیا اور تیسری جمادی الثانی کو خضر آباد سادھورہ کے قریب بادشاہ کشتی پر سوار ہو گئے۔ امرا اور عہدہ دار بھی ان کے ساتھ کشتیوں پر ہی روانہ ہوئے۔ لشکر نے خشکی کے راستہ کوچ کیا۔ اسی مہینہ کی ۲۹ تاریخ کو سواری شاہانہ کا دہلی میں ورود ہوا اور یکم ماہ رجب کو کشتی سے اتر کر بادشاہ اونٹ پر سوار ہوئے۔ اسی مہینہ کی چھ تاریخ کو اجمیر پہنچ کر عرس میں شرکت فرمائی اور دوسرے ہی دن دارالخلافہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اس تیزی سے سفر کیا کہ روزانہ پچاس کوس کا دھاوا مارتے ہوئے نویں رجب کو بروز جمعہ صبح کے وقت تودہ کی منزل پر آکر قیام فرمایا۔ میں بسا ور سے لوٹ کر بادشاہ کے استقبال کے لیے اسی منزل میں جاکر حاضر ہوا اور ایک کتاب[1] "چہل حدیث" جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں اور اس کا نام تاریخی نام ہے، خدمت عالی میں پیش کی۔ بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانہ میں داخل کرادی اور میری وعدہ خلافی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ فتح پور پہنچ گئے۔

عبادت خانہ میں علما کے ہنگامے

فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانہ میں علما کی محفل میں گزرتے تھے۔ خاص طور سے جمعہ کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں اور دینی مسائل کی تحقیق اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں۔ ان مجلسوں میں علما کی زبانیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں تلواروں کی طرح خوب ہی اپنے جوہر دکھاتی تھیں۔ مذہب و مسلک کے اختلافات اتنے شدید ہو گئے کہ ایک دوسرے کی تکفیر دھڑلے سے کی جانے لگی۔ سنی، شیعہ، حنفی، شافعی، فقیہ و حکیم کے موازنہ و مقابلہ سے گزر کر اصول و جہات دین پر بھی زبانوں کی چھریاں بے باکی سے چلنے لگیں۔

ملاؤں کے جھگڑے اور اکبر کی بے دینی

انھی دنوں مخدوم الملک نے شیخ عبدالنبی کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھ مارا کہ اس نے خضر خاں سروانی کو جس پر حضور اکرمؐ کے خلاف بد زبانی کا الزام لگایا گیا تھا اور میر حبش کو جس پر رفض کا الزام تھا، ناحق قتل کرا دیا۔ لہذا اس کے پیچھے نماز نہیں ہو سکتی اس لیے بھی کہ اس کو اس کے باپ نے

---

[1] کتاب الاحادیث ' یہ ملا عبدالقادر بدایونی کی مرتب کردہ ہے۔ انھوں نے یہ کتاب شاہی ملازمت سے پہلے ۹۷۶ھ میں اپنے شوق سے لکھی تھی۔

عاق کر دیا تھا اور وہ خود خونی بواسیر کے عارضہ میں مبتلا ہے۔ شیخ عبد النبی نے بھی اس کی جہالت اور گمراہی ثابت کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ درباری ملاؤں میں سے کچھ اس طرف اور کچھ اس طرف ہو گئے اور ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بنانے لگے۔ علما کے ان اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ انھوں نے حقائق کو مسخ کر کے بادشاہ کو جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا، لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علماء کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا، اصل دین ہی سے پھیر دیا اور دین و شریعت کی بنیادوں پر ایسی ضرب لگائی کہ ان پانچ چھ سالوں میں اسلام کا نام تک نہیں رہا اور وہ ساری بساط چوپٹ ہو کر رہ گئی۔

اکبر کی بے دینی کا آغاز

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے علما کے باہمی اختلافات اور ملحدوں کی دراندازی کی وجہ سے بادشاہ کی نظر میں اسلام اور علمائے اسلام کی وقعت گھٹتی چلی گئی۔ کچھ تو اکبر کی افتاد طبع اور کچھ حالات کا تقاضا، بہر حال نتیجہ یہی نکلا کہ بادشاہ نے بہت جلد سارے مسلمہ اعتقادات سے منکر ہو کر الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کر لی۔ بچپن سے عہد جوانی اور جوانی سے اس پختہ عمری تک اکبر کی کچھ ایسی ہی ڈانواڈول روش تھی وہ کبھی ایک نظریہ اور اعتقاد کا پابند نہیں رہا۔ طبیعت میں تحقیق و تجسس کا جذبہ تھا جسے بدعقیدہ مصاحبوں نے غلط رخ پر پھیر دیا۔ اول اول تو صرف طلب حق کا سچا جذبہ تھا، چنانچہ اسی جذبہ کے تحت اکبر ہر دین اور مذہب کے معتقدات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر علما نے ایسی ناسمجھی کا ثبوت دیا کہ بجائے اس کے کہ وہ بادشاہ کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے اپنے اعزاز و مرتبہ کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنے لگے۔ ایک ہی مسئلہ کو جب علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا تو بادشاہ نہایت حیران اور ان کی بحثوں سے دل برداشتہ ہو گیا۔ دربار میں مختلف مذاہب و مسالک کے جو گمراہ کن عناصر جمع ہو گئے تھے انھوں نے اس سے خوب ہی فائدہ اٹھایا اور دین کے معتقدات کو خلاف عقل ثابت کر کے اس کے ذہن کو انکار و انحراف کی طرف مائل کر دیا۔ یہ سب کس طرح ظہور میں آیا اس کی بڑی تفصیلات ہیں، میں مختصراً چند باتوں کا یہاں ذکر کروں گا جس سے بادشاہ کی بداعتقادی کے اسباب کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

بے دینی کے اسباب و محرکات

اس زمانہ میں دربار شاہی میں تقریباً ہر ملک کے اہل علم اور مفکر موجود تھے اور مختلف مذاہب کے عالم اور رہنما بھی جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ رات دن مختلف علوم و نظریات پر تبادلۂ خیالات اور طرح طرح کی نکتہ سنجیوں میں مصروف رہتے تھے۔ بادشاہ کو بھی فتوحات و مہمات کی طرف سے پوری فرصت تھی، اس لیے وہ بھی انہی مشغلوں میں اپنے اوقات صرف کیا کرتا تھا اور جو اصول و کلیات اسے پسند آ جاتے خواہ وہ مسلمانوں کے معتقدات کے موافق ہوتے یا مخالف، انھیں وہ بدل و جان قبول کر لیتا تھا اور جو باتیں اس کی نگاہ میں نہ جچتی تھیں ان کو وہ ترک کر دیتا تھا۔ اس طرح اس نے ترک و اختیار رد و قبول کے ایک خاص شعور اور جداگانہ معرفت کو اپنا معیار بنا لیا اور عجیب طرح کے ہیولانی اعتقادات نے اس کے ذہن پر غلبہ پا لیا۔

وحدت ادیان کا تصور

مجموعی طور پر ایک خیال اس کے ذہن پر پتھر کی لکیر بن گیا تھا کہ اصحاب علم و دانش تمام مذاہب میں موجود ہیں اور ہر قوم و ملت میں عبادت گزار صاحبان کشف و کرامت کی کمی نہیں رہی ہے اس لیے

حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اس لیے حق کو ایک ایسے دین اور ایک ایسی ملت میں محدود و منحصر کر دینا ضروری نہیں ہے جو نسبتاً نیا اور نو پیدا شدہ ہے اور اس کے نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ اس صورت میں ایک دین کا انکار اور دوسرے کا انکار اور بغیر کسی سبب کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کسی طرح بھی معقول و مناسب نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ کے اس خیال کو وہ ملحد اور برہمن حسب موقع پختہ اور اٹل بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے جو ان دنوں شاہی محفلوں اور خلوتوں میں پیش پیش نظر آتے تھے اور بلحاظ علم و دانش علوم رسمی اور انسانی احوال و نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی، وہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور نظریات پر عقلی اور نقلی استدلال کر کے دوسروں کی تکذیب کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کی خام خیالیوں کو راسخ اعتقادات کی شکل دے دی اور "نظریات" کو اس طرح "بدیہیات" بنا کر پیش کیا کہ ان سے پھر جانا اکبر کے لیے ممکن نہ رہا۔

اس نکتۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ حشر و نشر اور دوسرے دینی اصول و معتقدات جن کا ماخذ حکمت نبوی ہے معتبر اور قابل قبول نہ رہیں - دینی مباحث اور نظریات کے متعلق متکلمین[1] میں جو شدید اختلافات ہیں اور علم کلام کی کتابوں میں ان کے معارضے اور مجادلے درج ہیں۔ حریفوں نے جن جن کو ایک خاص زاویہ سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اپنے اپنے مسلک و مذہب کی طرف اسے کھینچ لے جانے کی کوشش کی ؎

میداو رقیب آں سہی قد را پند — کاندر رخ ہر کس چو گل از باد مخند

از حد چو بشد نصیحت آں شوخ گرہ — بر گوشۂ ابرو زدو سر پیش افگند

عقیدۂ تناسخ کا اقرار

سب سے پہلے اکبر نے پرکھوتم نامی برہمن کو جو "نامۂ خرد افزا" کی ترجمانی پر مقرر تھا، خلوت میں بلا کر موجودات اور اشیاء کے ہندی اسماء معلوم کیے۔ اس کے بعد دیوی برہمن خلوت شاہی میں باریاب ہوا۔ دیوی برہمن سے مذاکرات کے لیے ایک خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ایک چارپائی کو رسیوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکہ کے برابر لگا دیا جاتا تھا اور وہ راتوں میں اس معلق حالت میں بیٹھا ہوا اپنی دیومالا کے قصے سنایا کرتا تھا۔ دیوی برہمن ان ترجمانوں میں ملازم تھا جو "مہابھارت" پر کام کر رہے تھے۔ ان نشستوں میں اس نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی

---

[1] علم کلام دو جداگانہ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اسلامی فرقوں کے باہمی جھگڑوں سے پیدا ہوا اور ایک مدت تک پھیلتا رہا اور بڑے بڑے علمی اور سیاسی جھگڑے اس کی بدولت رونما ہوئے۔۔۔ دوسرا علم کلام وہ ہے جو غیر اسلامی فلسفہ خاص طور سے یونانی فلسفہ کے رد و مقابلہ کے لیے ایجاد ہوئے۔ علم کلام کو کلام کہنے کی وجہ سمعانی نے یہ بیان کی ہے کہ سب سے پہلا اختلاف جو عقائد کے متعلق پیدا ہوا وہ کلام الٰہی کے بارے میں تھا اس لیے اس کا نام علم کلام پڑ گیا۔ علامہ شہرستانی نے "ملل و نحل" میں لکھا ہے یہ علم فلسفہ کے مقابلہ میں ایجاد ہوا تھا اس لیے فلسفہ کی ایک شاخ (منطق) کے نام سے یہ فن بھی موسوم ہوا کیونکہ منطق اور کلام ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ یہی وجہ صحیح ہے۔ اس کا آغاز ۱۵۸ھ خلیفہ مہدی کے زمانہ سے ہوتا ہے، مامون رشید کے زمانہ میں معتزلہ گروہ کے فلسفیوں نے اس کو باضابطہ مدون کیا اور اسی وقت سے یہ ایک علٰحدہ فن اور علم بن گیا۔ امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ اس فن کے مشہور اکابر میں سے ہیں، علم کلام کے بانی اور موجد کا نام "ابو الہذیل" (محمد بن الہذیل بن عبد اللہ بن مکحول) ہے جو ۱۳۱ھ میں پیدا ہوا۔ ۲۳۵ھ میں فوت ہوا، اس نے اس فن میں ساٹھ کتابیں لکھی تھیں۔ مجوسیوں اور ملحدوں سے اس کے مناظرے بہت مشہور ہیں، جن کو ابن خلکان نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اشاعرہ اور معتزلہ ان دو بڑے فرقوں کے علمی مباحث اور مناظروں نے علم کلام کے نوک پلک درست کیے اور وہ ایک باضابطہ فن اور جامع فلسفہ بن گیا۔

کے طریقے آگ اور آفتاب کی پوجا اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے اور مشرک بادشاہوں اور خیالی دیوتاؤں جیسے برہما[1]، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی (جن میں سے بعض کو ہندو خدا اور بعض کو فرشتہ کہتے ہیں) کی عظمت و احترام پر دلیلیں پیش کیں۔ اس کے اندیشہ بادشاہ کے دل پر اثر کر گئے اور وہ عقیدۂ تناسخ[2] پر عقیدہ لے آیا۔ خوشامدی درباری کہاں پیچھے رہتے وہ بھی تناسخ کے اثبات و صحت پر رسائل لکھ لکھ کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں دوڑ لگانے لگے۔ بادشاہ ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیق کی طرف جن کے ہندوستان میں بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک بے شمار کتابوں پر عقیدہ رکھتا ہے اور اس کے باوجود یہ بدبخت اہل کتاب نہیں ہیں، بہت زیادہ قائل ہو گیا۔ ہندو مذہب کی طرف میلان کے جو نتائج تھے وہ روز بروز منظر عام پر آنے لگے۔

وحدۃ الوجود کا اثر

انہی دنوں شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجودھنی دہلوی بھی جس کو اکثر صوفیا "تاج العارفین" کہتے ہیں، خلوت گاہ میں باریاب ہوا، وہ شیخ زماں[3] پانی پتی کا شاگرد تھا جو بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "شرح لوائح" کافی مشہور ہے۔ کتاب "نزہۃ الارواح" پر بھی انھوں نے ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ علم تصوف اور علم توحید میں وہ ثانی شیخ ابن عربی[4] سمجھے جاتے تھے۔ تاج الدین بھی راتوں میں معلق چارپائی پر اوپر جا کر رات رات بھر اہل تصوف کے شطحیات اور

---

[1] برہما: ہندو مخلوقات کی آفرینش کا مبدا برہما کو بتاتے ہیں کہ جب دنیا پر اکہتر کلپ گزر گئے (ایک کلپ چار جگ کا اور ایک جگ ۴۳ لاکھ بیس ہزار سال کا ہوتا ہے) تو ایک "من" پیدا ہوا جو برہما کی خواہش تخلیق کا مظہر تھا اس سے دنیا کی تخلیق ہوئی۔ ہندو دیومالا میں برہما خالق کے مترادف ہے جو پیدا کرنے والا دیوتا ہے۔

مہادیو: فنا کرنے والا دیوتا ہے جسے آدر بھی کہتے ہیں۔

بشن: پرورش کرنے والا اور آفرینش کو قائم رکھنے والا دیوتا ہے۔

کچھ لوگ ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ خدا مانتے ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ خدا ایک ہے لیکن ان تین پیکروں میں جلوہ گر ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ خدا ان سے بالاتر ہے، انسان عبادت و ریاضت کے ذریعہ ان تین اونچے خدائی مرتبوں پر ترقی کر سکتا ہے۔

کشن اور رام: دیوتا نہیں بلکہ خدا کے اوتار سمجھے جاتے ہیں، خدا اوتار کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ چار جگ کی مدت میں خدا دس مرتبہ اوتار کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے اب تک نو اوتار ظہور کر چکے ہیں جن کے نام ہیں مچھ اوتار، کورم اوتار، نرسنگھ اوتار، بامن اوتار، پرسرام اوتار، رام اوتار، کشن اوتار، بودھ اوتار، کلکی اوتار ——— رام اوتار راجہ جسرت سے کوشلیا کے بطن سے اجودھیا اودھ میں پیدا ہوئے، بارہ سال اپنی بیوی سیتا اور بھائی لچھمن کے ساتھ بن باس لیا راون کو ہنومان کی مدد سے ختم کر کے اکثر علاقے فتح کیے اور گیارہ ہزار سال تک حکومت کی ——— کشن اوتار متھرا کے راجہ تھے اپنے ماموں کنس کو جو بڑا ظالم تھا قتل کر کے حکومت حاصل کی، مہابھارت کی جنگ میں پانڈوؤں کا ساتھ دیا اور اپنا مشہور اپدیش جسے بھگوت گیتا کہتے ہیں دیا، ایک سو دس سال تک زندہ رہے، کشن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے توحید کی تعلیم دی تھی۔

مہامائی: دیومالا کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے ایک عورت مہا لچھمین کی شکل میں تجلی کی جس کے تین روپ ہیں: ست، رج اور تم۔ جب دنیا کو پیدا کرنا چاہا تو خدا نے تم کے روپ سے ایک نئی شکل میں ظہور کیا۔ خدا کے اس ظہور کو مہاکالی یا مہامایا (مہامائی) کہتے ہیں۔

[2] تناسخ ارواح: یہ فلسفۂ جبر کا لازمی عقیدہ ہے جو مذاہب جبر کو تسلیم کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی صورت میں تناسخ ارواح کو تسلیم کرتے آئے ہیں۔ ہندو فلاسفی کی تو یہ ایک اہم بنیاد ہے۔ تصوف میں تناسخ کا مطلب "ایک ہی ذات کا مختلف حالتوں اور جلوؤں میں ظہور کرنا ہے۔" ویدانت میں "خواہش تناسخ کا باعث ہے، ذات اپنے کمال پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے لیکن خواہشوں کی تکمیل نہیں ہوتی ان کی تکمیل کے لیے ذات دوسرے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔"

[3] شیخ زماں: بدایونی نے شیخ زماں لکھا ہے اصل نام عبدالملک لقب امان اللہ تھا، شیخ امان پانی پتی کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ محمد حسن اور شیخ مودود لاری کے مرید و شاگرد تھے۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے سلسلہ قلندریہ اور سلسلہ چشت سے تعلق تھا۔ تصوف اور علم توحید میں شیخ محی الدین ابن عربی کے معتقد تھے۔ ان کا ایک رسالہ "اثبات الاحدیت" ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی کی کتاب "لوائح" پر مفصل شرح لکھی ہے۔ شیخ تاج الدین زکریا اجودھنی ان کے خلیفہ تھے۔ شیخ امان کی وفات ۱۲ ربیع الثانی ۹۹۷ھ میں ہوئی۔

[4] شیخ ابن عربی: اصل نام محمد باپ کا نام علی بن محمد مغربی، محی الدین ابن عربی کے نام سے مشہور ہیں ان کی تصانیف کی تعداد پانسو بتائی جاتی ہے۔ فتوحات مکیہ مشہور تصنیف ہے ان کی ولادت بلاد اندلس کے شہر مرسیہ میں شب دوشنبہ ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ میں ہوئی۔ وفات شب جمعہ ۲۲ ربیع الآخر ۶۳۸ھ میں بمقام دمشق ہوئی۔ مزار جبل قاسون میں صالحیہ کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ ابن عربی نے فلسفۂ جبر کو وحدت الوجود کی صورت میں مرتب کیا اس سلسلہ میں ان کی کتاب "فصوص الحکم" بڑی شہرت رکھتی ہے۔

مزعومات سنایا کرتا تھا۔ وہ چونکہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیوں کی طرح وحدت الوجود[1] کا پکا معتقد تھا جس کا نتیجہ بجز الحاد اور اباحت کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ اس نے وحدت الوجود کے اس خطرناک نظریہ اور "فصوص الحکم" کے دوسرے مسائل مثلاً "ترجیح رجا بر خوف"، "ایمان فرعون" وغیرہ بخوبی بادشاہ کے ذہن نشین کرا دیے۔ تصوف کے ان نظریات کا بھی اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بیزاری میں بہت بڑا دخل ہے، چنانچہ اس کا یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے لیکن یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوگا۔ شیخ تاج الدین نے اس مسئلہ کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں خوب تاویلیں کر کے بخوبی باور کرا دیا تھا اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کی ان بھول بھلیوں میں اچھی طرح سرگشتہ کر دیا تو اس نے اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک تھا نکال کر سامنے رکھا۔

انسان کامل کا تصوّر

شیخ نے اکبر کے سامنے "انسان کامل" کا ایک تصور پیش کیا اور پھر اس انسان کامل کو خلیفۂ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دے دیا۔ انسان کامل کے بعد درجہ تو صرف عین واجب (ذات خداوندی) کا ہی ہے اس لیے شیخ کی کمند انسان کامل سے گزر کر عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی تو ناچنے کو نچانے والے تھے انھوں نے بھی باتوں کے طوطا مینا بنائے اور خوب خوب گوشے چھوڑے بس کیا تھا طرح طرح کی خرافات و اختراعات شروع ہوگئیں چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام "زمین بوس" رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا کہ اسے فرض عین اور چہرۂ شاہی کو "کعبۂ مرادات" و "قبلۂ حاجات" قرار دے دیا گیا۔ کسی نے زبان ہلائی بھی تو ہندوستان کے بعض مشائخین کے ساتھ ان کے مریدوں کے عمل کو پیش کر کے اس کا منہ بند کر دیا گیا۔

خیر و شر کی اضافیت

ایک اور بزرگ شیخ یعقوب کشمیری اور ان کے ہمنوا بھی اس تگ و تاز میں کسی سے پیچھے نہیں رہے شیخ یعقوب بھی بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے عہد کے مقتدا و پیشوا سمجھے جاتے تھے، انھوں نے قاضی ہمدانی کی "تمہیدات" سے بعض باتیں لے کر ان سے یہ فلسفہ ترتیب دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے اسم "الہادی" کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم "المضل" کا مظہر ہے۔ اس لیے دنیا کا یہ سارا جلوہ انہی دو اسماء کا جلوہ ہے اور خدا کے یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ (مطلب یہ کہ خیر و شر چونکہ منجانب خداوندی ہیں اس لیے دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق و امتیاز نہیں)۔

شیعیت کی چھاپ

مذکورہ بالا "خلوتِ معلق" کے بلند پروازوں میں ملا محمد یزدی بھی تھا۔ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق خلفائے ثلاثہ کے خلاف طنز و طعن کر کے اور عموم صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف و علمائے خلف

---

[1] وحدت الوجود: جبر و قدر کا مسئلہ ہر مذہب میں نزاعی مسئلہ رہا ہے۔ مسئلہ جبر کی مکمل توضیح وحدت وجود کے فلسفہ میں ملتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا ارادہ اور خیال اس کے افعال و اعمال اس کے اپنے نہیں بلکہ کسی خاص قوت اور خاص نظام کائنات کے ماتحت ہوتے ہیں اسی لیے انسان اور دوسری مخلوقات بذاتِ خود کار و خود اختیار ہستی نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک واجب وجود ہستی یعنی خدا کے مظاہر و صور ہیں۔ مادہ روح اور خدا تینوں ایک ہی وجود کے مختلف حالتوں کے نام۔ وحدت وجود کا یہ تصور زردشت کے فلسفہ میں بھی شامل رہا ہے اور ہندوستان کی ویدانت فلاسفی میں بھی کافی وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ویدانت کا فلسفہ اس مقولہ پر مبنی ہے "ایکم برہم دویتے ناستے" (ہم برہم ہی ہے دوسری چیز نہیں) یونانی فلسفہ میں بھی یہ خیال کام کرتا رہا ہے۔ تصوف میں وحدت وجود کے فلسفہ کی مکمل شکل ابن عربی کی تصنیفات میں ملتی ہے۔

سب کو کافر بنانا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت والجماعت کا درجہ گھٹانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ بجز شیعہ کے سب کو اس نے گمراہ کر کے دکھا دیا اور اکبر کے خیالات پر شیعیت کی بھی اچھی خاصی چھاپ پڑ گئی۔

اس صورت حال سے پہلے اکبر کے دل پر علما کا بڑا اثر تھا، یہاں تک کہ وہ ان کو بلحاظ رتبہ و عظمت امام غزالیؒ[1] اور رازیؒ[2] سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا لیکن جب ان عالموں کی رکیک حرکتیں اس کی نظر میں آئیں اور ان کے تحریم و تکفیر کے مناقشوں سے وہ سخت متنفر ہوا تو اس کے دل سے نہ صرف یہ کہ ان جھگڑالو عالموں اور قاضیوں کی عظمت ہٹ گئی بلکہ ان پر قیاس کر کے وہ بزرگان سلف کا بھی منکر ہو گیا۔

عقیدۂ تثلیث کا اثبات

اسی زمانہ میں دربار میں عیسائیوں کی بھی آمد و رفت ہونے لگی تھی۔ یورپ کے اہل علم کو پادری کہا جاتا ہے اور ان کے مجتہد کامل کو پاپا کہتے ہیں، جسے مصلحت و وقت کے لحاظ سے امور دین میں تغیر و تبدل کا اختیار حاصل رہتا ہے اور بادشاہ وقت بھی اس سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ جب عیسائی پادری بھی بادشاہ کی نظر التفات سے نوازے گئے تو انھوں نے انجیل پیش کی اور عقیدۂ ثالث ثلاثہ (عقیدہ تثلیث) کے حق ہونے پر مباحثے کرتے رہے اکبر نے جو اپنے زعم حق پرستی میں دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، نصرانیوں کو بھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیا ان کی عیسائیت کی تصدیق کی اور عیسوی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ حسب الحکم شاہزادہ مراد نے عیسائی پادری سے انجیل کے چند سبق پڑھے۔ شیخ ابوالفضل کو انجیل کے ترجمہ کے لیے حکم دیا گیا، اس نے ترجمہ شروع کیا تو اس پر بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا:

"اے نامی وی ژژو کرستو"

(یعنی اے وہ ذات کہ تو بڑا مہربان اور بخشندہ ہے) شیخ فیضی نے قافیہ پر ردیف چڑھائی اور دوسرا مصرع کہا:

"سبحانک لاسواک یاہو"

ان ملعون عیسائیوں کی جسارت اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے دجال ملعون کے اوصاف اور حضور اکرمؐ کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے تک سے دریغ نہیں کیا (یا اللہ معاف کر یا اللہ پناہ دے)۔

---

[1] امام غزالی: محمد نام، حجۃ الاسلام لقب غزالی عرف سان کی پیدائش ۴۵۰ھ ضلع طوس کے شہر طاہران میں ہوئی، نیشاپور میں امام الحرمین سے تعلیم حاصل کی۔ امام غزالی کے وقت مشہور سلجوقی فرمانروا ملک شاہ حکمران تھا اس کے مشہور وزیر نظام الملک نے ان کی بڑی قدر کی اور مشہور تاریخی درسگاہ نظامیہ کے مدرس اعلیٰ کے عہدہ پر ان کو مامور کیا۔ آپ نے حجاز و بلاد شام کا سفر بھی کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں بمقام طاہران ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ نے تلامذہ اور تصانیف کی ایک بڑی تعداد اپنے پیچھے چھوڑی ان کی کل عمر ۵۵ سال تھی جس میں دس بارہ سال سفر میں گزارے اس کے باوجود فقہ اصول فقہ منطق فلسفہ کلام تصوف و اخلاق پر ۸۷ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں جو ہر موضوع پر نہایت اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

[2] امام رازی: علم کلام کے مشہور عالم اور فلسفی گزرے ہیں۔ پورا نام محمد بن عمر ہے، ۵۴۴ھ میں بمقام رَے پیدا ہوئے۔ نہایت دولت مند عالم گزرے ہیں چنانچہ شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کے لیے ان سے ایک کثیر رقم قرض لی تھی، محمد بن تکش خوارزم شاہ جو خراسان و عراق کا مشہور حاکم گزرا ہے، ان کا معتقد تھا ان کا زیادہ تر قیام ہرات میں رہا یکم شوال ۶۰۶ھ بروز اتوار ہرات میں انتقال کیا۔ تفسیر، اصول فقہ، فلسفہ اور عقلیات تمام علوم پر وہ یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ہر موضوع پر ان کی بہت سی کتابیں مشہور ہیں اور درسیات میں شامل رہی ہیں۔

آفتاب پرستی کا آغاز بیربر ملعون بھی ایک ابلیس کی گانٹھ تھا، اس نے آفتاب پرستی سے اکبر کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کیا کر ——— آفتاب ہی مظہر کامل اور سرچشمۂ سعادت ہے، اسی کی تاثیر سے غلہ پکتا ہے، کھیتیاں لہلہاتی ہیں، پھلوں میں رس اور سبزہ میں تراوت پیدا ہوتی ہے، دنیا کی روشنی اور دنیا والوں کی زندگی آفتاب ہی سے وابستہ و متعلق ہے۔ اس لیے وہی ایک ایسا وجود ہے جس کی عبادت اور تعظیم ہونی چاہیے۔ پرستش کے لیے اسی کے طلوع کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غروب کی طرف جو زوال کی نشانی ہے۔ آفتاب پرستی کے ذیل میں اس نے آگ، پانی، پتھر، درخت اور تمام مظاہر عالم یہاں تک کہ گائے، اس کے گوبر، قشقہ اور زنار کے تقدس کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر بتایا۔ بادشاہ جب ان باتوں کی طرف مائل نظر آئے تو دربار کے بدبخت حکما اور فضلا بھی چراغ دکھانے لگے کہ آفتاب "نیر اعظم" ہے "عطیہ بخش ہمہ عالم" ہے "مربی بادشاہاں" ہے۔ غرض آفتاب پرستی کا بھی دربار میں خوب فروغ ہوا اور نوروز جلالی کی تعظیم بڑے اہتمام سے کی جانے لگی چنانچہ ہر سال اس دن اکبر ایک بڑا جشن منعقد کرتا تھا اور سات سیاروں میں سے ہر سیارہ کے رنگ کے مطابق روزانہ ایک رنگ کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ برہمنوں نے تسخیر آفتاب کا ایک عمل بتا دیا تھا وہ اس کا وظیفہ نصف شب کو اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔ گائے کا ذبیحہ بند کرا دیا اس کے گوبر کو پاک سمجھنے لگا اور گائے کا گوشت کھانا حرام ہو گیا۔ گاؤکشی کی سزا میں اچھے اچھے آدمیوں کو قتل کرا دیا گیا۔ طبیبوں نے بھی گاؤکشی کے خلاف نسخہ آرائی کے جوہر دکھائے اور گاؤ زبانی کی کہ علم طب کی رو سے گائے کا گوشت طرح طرح کی بیماریوں کا باعث ہے اور ہاضمہ کو خراب کرتا ہے۔

آتش کدہ کا قیام دربار میں گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرستوں کا بھی ایک گروہ دینی خراج لینے کے لیے پہنچ چکا تھا، انھوں نے زردشت کے دین کو حق بتا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ کیانی بادشاہوں کی راہ و روش کے قصے بیان کر کے اکبر کو اپنے معتقدات کی طرف جھکا لیا، چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ سلاطین عجم کی طرح جو اپنے آتش کدہ کو ہمیشہ دہکتا ہوا رکھتے تھے ہمارے محل میں بھی شب و روز آگ جلتی رہی، کیوں کہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔ اس آتش کدہ کا انتظام شیخ ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔

اکبر اپنی جوانی کے زمانہ ہی سے ہندوستانی راجاؤں کی لڑکیوں کی صحبت میں ہوم (ہون) کیا کرتا تھا جو ہندوؤں کی آتش پرستی کی ایک پوجا ہے۔

آفتاب اور آگ کی پرستش پچیسویں جلوس کے نوروز کے دنوں میں اکبر نے آفتاب اور آگ کا سجدہ علانیہ کیا۔ مصاحبین بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا اہتمام کرنے لگے۔ سنبلہ کی آٹھویں عید کے دن اکبر ہندوؤں کی طرح پیشانی پر قشقہ لگا کر دولت خانہ میں برآمد ہوا اور جواہرات پروئی ہوئی ایک ڈوری برہمنوں سے اپنے ہاتھ پر تبرک کی خاطر بندھوائی اور امرا نے حسب مدارج مروارید اور جواہرات اس دن نذر گزرانے اور اس توہم پرستی کی عملاً و قولاً تائید و حمایت کی۔ بادشاہ نے راکھی بندھوانی بھی شروع کر دی۔ غرض اسلام کے خلاف دوسرے مذاہب والے جو حکم اور رسم بھی بیان کرتے تھے اکبر اس کو نص قاطع سمجھتا تھا اور امت مسلمہ کے تمام احکام خلاف عقل تھے جن کو عرب کے سر پھروں اور رہزنوں نے وضع کیا تھا اور ان احکام کو ماننے والے سارے مسلمان بادشاہ کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو گئے تھے۔ کیا کہا جائے مختصر یہ کہ

"يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○

(وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، اللہ نے اپنے نور کی تکمیل کر دی ہے اگرچہ کافروں کو یہ بات بری لگی ہو۔)

بتدریج یہ بے دینی اور بد اعتقادی اس انتہا پر پہنچ گئی کہ احکام شریعت اور اسلام کی تردید و تنسیخ کے لیے کسی دلیل اور تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہی، جب جی چاہتا کسی بھی حکم کو علانیہ ترک کر دیا جاتا۔

ابوالفضل کی بے دینی

مجھے یاد ہے کہ ان مباحث کے آغاز میں ایک بار فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں شیخ ابوالفضل سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ "مجھے تمام مصنفوں سے ایک شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات تو نہایت تفصیل سے سن وار لکھے ہیں اور پچھلے پیغمبروں کا حال اس تفصیل سے نہیں لکھا۔ میں نے جواب دیا، نبیوں کے تذکرے میں متعدد "قصص الانبیاء" لکھی گئی ہیں۔ "اس نے کہا نہیں وہ بہت مختصر ہیں تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ انبیا کے زمانہ کو کافی طویل عرصہ گزر گیا تھا اس لیے مفسرین ارباب تاریخ و سیر نے وہی باتیں لکھیں جو ان کے نزدیک تحقیق شدہ تھیں، جن کا ثبوت ان کو نہیں ملا اسے چھوڑ دیا ہوگا۔" اس نے کہا "یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا۔" پھر اس نے ایک بات چھیڑ دی کہ "تذکرۃ الاولیا" اور "نفحات الانس" اور ان جیسی دوسری کتابوں میں ہر پیشہ اور گروہ کے لوگوں کا ذکر ہے لیکن معلوم نہیں اہل بیت سے کیا قصور ہوا تھا کہ ان کتابوں میں ان کا ہی تذکرہ نہیں ہے۔ کیا یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔" میں نے اس کے جواب میں جو کچھ مناسب تھا کہا لیکن مان کر کون دیتا؟ آخر میں میں نے اس سے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمھارا میلان کس مذہب کی طرف ہے؟ اس نے کہا "میں تو ابھی چند دن الحاد کی وادی میں سیر و سیاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے مذاقاً چھیڑتے ہوئے کہا "نیک ارادہ ہے بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔" جیسا کہ مشہور ہے ؎

بر داشت غل شرع بتائید ایزدی
از گردن زمانہ علیٰ ذکرہ السلام

میری بات پر وہ ہنس پڑا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ابوالفضل کی دریدہ دہنی

ابوالفضل کو در پردہ چشم شاہی کی اشارت تھی۔ "یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ" جسے پیا چاہے وہ سہاگن" والا معاملہ تھا، اس لیے وہ ان بد اعتقادیوں کے بارے میں شیخ صدر، قاضی، حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے دیرینہ بوڑھوں کو بڑی جسارت سے چھیڑ چھیڑ کر بحثیں کیا کرتا تھا اور ان کی بے عزتی کرنے میں ذرہ برابر بھی نہیں جھجکتا تھا۔ بادشاہ اس کی لن ترانیوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔

بوڑھے علما نے عاجز آ کر ایک مرتبہ آصف خاں میر بخشی کے ذریعہ خفیہ طور پر ابوالفضل کو کہلوایا کہ "تم آخر کس وجہ سے ہمارے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑے رہتے ہو؟" اس نے جواب دیا، "بس یہ مثل سمجھو" میں بیگن کا نہیں، بادشاہ کا نوکر ہوں۔" غرض اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان عالموں کو اپنی ذہانت، باپ کی معاونت، اور بادشاہ کی پشت پناہی اور بخت کی یاوری سے ایک ایک کر کے ذلیل و خوار کر دیا اور کوئی مسلمان عالم بجز حکیم ابوالفتح اور ملا محمد یزدی کے جو بعض مسائل میں اس سے متفق نہیں تھے، اس کے سامنے

فروغ نہ پاسکا اور اہل علم کی وہ ساری بساط الٹ کر رہ گئی۔

دربار سے پہلو تہی

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو میں نے گوشۂ عزلت اختیار کرلیا اور درباری داری سے بڑی حد تک دور ہی رہنے لگا۔ بادشاہ کی نظریں بھی مجھ سے پھر گئی تھیں اور غیریت کا پردہ درمیان میں آگیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس حال ہی میں خوش رہا ہوں ؎

دل در رگ و پے نہ شد نیکو شد کہ نہ شد   جز در تو فرو نہ شد نیکو شد کہ نہ شد
گفتی کہ بر نجم از نیکو شد کار ت   دیدی کہ نیکو نہ شد نیکو شد کہ نہ شد

میں اپنے آپ کو کسی رعایت کے قابل سمجھتا تھا نہ ان کی خدمت کے لائق ؎

بیا تا تکلف بہ یک سو نہیم
نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی دور ہی سے آستانہ پر کورنش بجالاتا تھا اور اہل محفل کا تماشا دیکھتا رہتا تھا ؎

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است
صحبت گذاشتم ز تماشائیاں شدم

میں نے اوپر جتنے حالات بیان کیے ہیں ان جزئیات اور تفصیلات سمن واہ ترتیب سے بیان کرنا ممکن نہیں اس لیے اتنے ہی پر یہ قصہ ختم کرتا ہوں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہر حالت میں بندہ کا نگہبان اور محافظ ہے۔ حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں ان حالات کو قلمبند نہ کرتا، لیکن خدائے برتر گواہ ہے کہ دین کے درد اور ملت مرحوم اسلام کی دلسوزی میں میرا قلم رک نہ سکا اور یہ باتیں زبان قلم پر آگئیں۔ اس میں نہ تو مقصود کسی قسم کا طعن و طنز کرنا ہے نہ اس کے پیچھے حسد و تعصب کا کوئی جذبہ کام کر رہا ہے۔

صرف ہوائی کا عمل

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ مبارک سے "صرف ہوائی" کا عمل سیکھنا شروع کیا۔ شیخ مبارک سے ملاقات سے پہلے ایک دن شیخ فیضی نے اکبر سے کہا "ہمارے شیخ کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے" بادشاہ نے فوراً جواب دیا "ہاں انھوں نے اپنے سارے تکلفات تمہارے سپرد کر دیے ہیں"۔

اکبر نے شیخ منجھو، میاں تان سین[1] اور دوسرے تمام موسیقاروں کو شیخ مبارک کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان میں ایک دوسرے پر

---

[1] تان سین: اصلی نام ٹاٹنا سینا یا ٹوناسا ٹمناتھا۔ کہتے ہیں اس کی پیدائش اٹلی کی تھی، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرورش کشمیر میں ہوئی، شاید کشمیر ہی میں پیدا ہوا ہو، ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء کو وہ کشمیر سے لاہور میں آیا۔ وہاں سے ۱۸ سال کی عمر میں دہلی چلا گیا، یہاں ایک بزرگ ملا سلامت کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور ان کے ساتھ وہ یکم رمضان ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء کو پٹنہ بھاگ گیا، لیکن سرکاری آدمی دونوں کو دہلی پکڑ لائے، تان سین کے گانے کی دہلی میں بڑی شہرت تھی اس کو وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ملا سلامت کے مرنے کے بعد وہ دہلی سے آگرہ چلا گیا۔ یہاں چھ ماہ ٹھہر کر وہ بہار اور بنگالہ کی طرف چلا گیا، اور داؤد شاہ کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ داؤد کی شکست کے بعد وہ آگرہ کو لوٹ آیا اور چند ہی دن میں دربار اکبری میں باریاب ہوا۔ اس کے چار بیٹے مختلف بیویوں سے ہوئے، تین بیٹے تو مولوی بن گئے ایک بیٹا حشمت نامی تھا جس نے باپ کے فن کو زندہ رکھا۔ تان سین کا انتقال ۱۵۹۵ء میں ہوا، اس کی قبر آگرہ ہی میں تھی جو غدر ۱۸۵۷ء میں تباہ کر دی گئی۔ فرنچ محقق اسٹوارٹ بیلی نے لکھا ہے کہ "دنیا میں دو بڑے موسیقار ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ ایک ہندوستان میں تان سین دوسرا روم میں انگلیلا"۔ ایک مورخ نے اسے "پیغمبر موسیقاراں" لکھا ہے۔ غرض تان سین اپنے دور کا سب سے بڑا موسیقار تھا۔ اس نے کئی ایک راگ اور باجے بھی ایجاد

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ترجیح دیں۔ شیخ مبارک نے میاں تان سین سے اس موقع پر کہا تھا ـــــ ہم نے سُنا ہے تم بھی کچھ گا لیتے ہو اور جب اس نے گا کر سنایا تو شیخ نے اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دی اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

آبی محل کی تعمیر اسی سال فتح پور میں ایک حکیم آیا ہوا تھا اس نے ایک ایسے گھر کی تجویز پیش کی جس کے چاروں طرف پانی ہو اور غوطہ لگائے بغیر گھر میں داخل ہونا ممکن نہ ہو، خوبی یہ کہ پانی گھر میں کسی طرح بھی سرایت نہ کر سکے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور دولت خانہ کے صحن میں بیس گز چوڑا، بیس گز لمبا اور تین گز گہرا ایک حوض بنایا گیا۔ اس کے اندر ایک سنگین کمرہ تعمیر ہوا جس کی چھت پر ایک بلند مینارہ تھا۔ اس کمرہ کے چاروں طرف پل بنائے گئے لیکن حکیم کا دعویٰ افترا بادبین کی طرح غلط ہی ثابت ہوا اور وہ چھپ کر کہیں بھاگ گیا۔ ایسا ہی ایک حوض سترہ سال بعد حکیم علی گیلانی نے لاہور میں بنایا تھا اس حوض کی تاریخ "حوض حکیم علی گیلانی" نکالی گئی تھی۔

بادشاہ نے اس ناکمل حوض کو زر سیاہ سے جس کی قیمت بیس کروڑ روپیہ ہوتی تھی بھروا دیا۔ اور وہاں موسیقی کی ایک محفل منعقد کی۔ شیخ منجھو ایک خوش آواز قوال تھا صوفیانہ وضع قطع میں رہتا تھا اور شیخ ادھن جون پوری کا مرید تھا اس کی تاریخ وفات اس کے نام ہی سے نکلتی ہے۔ اس محفل میں شیخ منجھو نے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ بادشاہ نے اس کو بہت داد دی اور بڑے خوش ہوئے۔ محفل میں میاں تان سین اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے بن سرے گویے بھی بلائے گئے تھے بادشاہ نے شیخ منجھو کو ان سب پر ترجیح دی اور حکم دیا کہ اس حوض کا سارا سونا شیخ منجھو اٹھا لے جائے۔ وہ بچارا اس کو بھلا کس طرح اٹھا سکتا تھا اس لیے

اس نے تھوڑے سے سونے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کے عوض ایک ہزار روپیہ اسے مرحمت فرما دیا اور وہ بقیہ سونا تین سال کی مدت میں جا و بے جا اخراجات میں صرف ہوتا رہا۔

معصوم خاں کی باریابی اسی سال میرزا محمد حکیم کا کوکہ معصوم خاں جو نہایت بہادر نوجوان تھا اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکا تھا میرزا سے ناراض ہو کر بادشاہ کے پاس آگیا تھا۔ اکبر نے اسے پانصدی کا عہدہ دے کر بہار پر روانہ کر دیا۔ معصوم خاں نے وہاں مشہور پٹھان سردار کالا پہاڑ سے جنگ کر کے فتح پائی۔ بادشاہ نے اس کارنامہ پر فتح پور سے ہزاری کا فرمان گھوڑا اور خاصہ کا گھوڑا اس کے لیے روانہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خواب میں حضرت علیؑ کو دیکھا تھا کہ انھوں نے اس کی پیٹھ پر اپنا پنجہ مبارک رکھا تھا، اسی کی برکت سے اس نے کسی جنگ میں بھی پیٹھ نہیں دکھائی اور اس پنجہ کا نشان اس کی پیٹھ پر نظر آتا ہے۔

چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں

اسی سال ماہ شوال میں ایک نہایت کمینہ اور رذیل آدمی ملا طیب کو کیتھل سے بلا کر دربار میں نوازا گیا، بادشاہ کی اکثر نوازشیں بس کچھ اسی قسم کی رہتی تھیں، ملا طیب کو صوبہ بہار اور حاجی پور کا دیوان مقرر کیا گیا اور رائے پرکوتم کو جو اسی قبیل کا آدمی تھا بخشی کا عہدہ ملا اور ملا مجدی سرہندی کو جو پہلے اسلیم شاہ کے عہد میں پرچہ نویس تھا امین بنایا گیا اور شمشیر خاں خواجہ سرا کو خالصہ کا

گیے۔ پرانے "دیپک راگ" وغیرہ کو زندہ کیا۔ اس کی شہرت کا کوئی موسیقار مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب بھی گویے اور قوال تان سین کے نام کی فاتحہ دیتے ہیں۔ تان سین نے فن موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

مہتمم مقرر کیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان کمینہ لوگوں نے خوب ہاتھ پیر نکالے۔ ان کو نہ خدا کا خوف تھا نہ بادشاہ کا لحاظ، من مانی حکومت کرنے لگے اور اس وقت اور موقع کو غنیمت جان کر ایسی ایسی کارروائیاں کیں کہ سارے لشکری ان کے ہاتھوں تنگ آگئے اور زبردستی معصوم خاں کو باغی بنا دیا جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اسی مہینہ مقصود جوہری مرزا مظفر حسین کو اور راجہ علی خاں کے نذرانوں کو خاندیس سے لا کر حاضر خدمت ہوا۔ اکبر نے کچھ عرصہ بعد میرزا کے قصور معاف کر دیے اور انہی دنوں اس کو اپنا داماد بنا کر اسے عزت و مرتبہ عطا فرمایا۔

اسی سال بادشاہ نے شہباز خاں بخشی کو غازی خاں بدخشی اور شریف خاں اتکہ کے ساتھ رانا کیکا پر فوج کشی کے لیے متعین فرمایا۔ رانا کیکا کونبھل میر کے مستحکم قلعہ میں محصور ہو گیا تھا بادشاہی فوجوں نے حملہ کر کے قلعہ کو فتح کر لیا اور اس کے سارے ملک کو تہہ و بالا کر دیا اور رانا راتوں رات قلعہ سے بھاگ کر دوسرے کوہستان میں چلا گیا۔

اسی سال سلطان خواجہ مکہ معظمہ سے لوٹ کر آیا اور وہاں سے بادشاہ کے لیے عربی نسل کے گھوڑے، حبشی غلام اور دوسرے نفیس تحفے لا کر پیش کیے، اسے صدارت کا عہدہ تفویض کیا گیا۔

قافلۂ حجاج کی روانگی

سنہ ۹۸۶ھ میں امیر حجاج کا اعزاز حضرت خواجہ احرار کے پوتے خواجہ محمد یحییٰ کو ملا۔ اکبر نے ان کو چار لاکھ روپیہ دیا اور اسی سال شوال کے مہینہ میں حاجیوں کے قافلے کو اجمیر سے روانہ کیا گیا۔ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بھی جن کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے اکبر اسلاف سے متنفر اور احکام دین سے منحرف ہو گیا تھا، اسی قافلہ کے ساتھ حج کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے آئندہ سال حج کا فریضہ ادا کیا۔ ان کے سفر کی تاریخ "ھو عزیز قوم ذلو" نکالی گئی تھی۔

خان جہاں کا انتقال

سنہ ۹۸۳ھ کے آغاز میں حاکم بنگالہ خان جہاں کے انتقال کی خبر ملی، اس کے بھائی اسمٰعیل قلی خاں کے نام عنایت آمیز فرمان صادر کیا گیا۔ مظفر خاں جو اس وقت دیوان کے عہدہ پر فائز تھا بنگالہ کا حاکم مقرر ہوا۔ رضوی خاں بخشی بنایا گیا اور فتح پور سے حکیم ابوالفتح کو صدر اور رائے پترداس کو میرادہم کی شرکت میں دیوان بنا کر روانہ کیا گیا۔

۱۹ ماہ صفر کو چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک لڑکا عنایت فرمایا۔ اس کا نام میں نے محی الدین رکھا۔ یہ لڑکا پشاور میں پیدا ہوا تھا۔

تحائف و نذرانے

بادشاہ نے ملا عشقی کو جسے خان کا خطاب حاصل تھا اور شاعری میں اس کا ایک دیوان اور مزاحیہ مثنوی بھی ہے کشمیر میں وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ اسی سال وہ قاضی صدرالدین لاہوری کے ساتھ دربار میں واپس آیا۔ اس کے ہمراہ حاکم کشمیر کا ایلچی محمد قاسم نامی بھی آیا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے بہت سا زعفران[1]، مشک[2]، عود[3]، شال اور کشمیر و تبت

---

[1] زعفران کشمیر کی خاص پیداوار ہے، جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ "کشمیر کا زعفران دریائے بہٹ کے پانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ہر سال پانچ سو من زعفران پیدا ہوتی ہے۔ میں اپنے والد کے ساتھ زعفران کی بہار میں وہاں گیا ہوں پھولوں کے تمام درخت پہلے شاخ اور پتے پیدا کرتے ہیں بعد میں پھول لیکن ان کے برعکس زعفران کی ڈنٹھل جب چار انگشت زمین سے نکل آتی ہے تو اس میں سوسنی رنگ کا چار پنکھڑیوں والا پھول لگتا ہے۔ اس میں نارنجی رنگ کے ریشے ریشمی دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ یہی ریشے زعفران ہیں۔ زعفران کا تختہ نصف کوس، ایک کوس کا ہوتا ہے نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن خوشبو اتنی تیز ہوتی ہے کہ دور ہی سے سر میں درد

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے دوسرے تحائف بطور پیش کش لے کر آئے۔

اس زمانہ میں حکیم الملک گیلانی کے داماد حکیم علی کو جو حکمت اور طب اور دوسرے علوم میں بے مثل مہارت رکھتا تھا عادل خاں دکنی کے قاصدوں کے ہمراہ بیجانگر روانہ کیا گیا۔

اسی زمانہ میں میرزا شاہرخ کا بہنوئی میر نظام بدخشاں سے سفیر بن کر آیا اور بدخشی گھوڑے قیمتی لعل اور بہت سے اونٹ نذر پیش کیے۔

اکبر کی خطبہ خوانی اس زمانہ میں اکبر پر دنیاوی اقتدار کے ساتھ دینی سیادت پر بھی قبضہ جمانے کی دھن سوار ہو گئی تھی اور اسے کسی دوسرے کی پیروی و متابعت گراں گزرنے لگی تھی۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا حضور اکرم خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین اور بعض دوسرے سلاطین جیسے امیر تیمور صاحبقران، میرزا الغ بیگ گورگانی وغیرہ خود خطبہ پڑھا کرتے تھے، اکبر نے بھی بظاہر اسلاف کی پیروی میں لیکن درحقیقت اپنے حق اجتہاد کو مضبوط کرنے کی خاطر یکم جمادی الاول ۹۸۷ھ کو فتح پور کی جامع مسجد میں جو بادشاہی محل کے قریب تھی، جمعہ سے پہلے خطبہ پڑھنا چاہا، لیکن جب وہ منبر پر چڑھا تو گھبرا گیا اور لرزنے لگا بڑی مشکل سے شیخ فیضی کے یہ تین شعر وہ بھی ادھورے پڑھ کر مڑ آیا۔ یہ شعر بھی اس صورت میں ادا ہوئے کہ دوسرے برابر سے بتاتے جاتے تھے۔ اس خطبہ کے بعد حافظ محمد امین کو امامت کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے جو شعر پڑھنا چاہے تھے وہ یہ ہیں:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہونے لگتا ہے، مجھے نشہ کی عادت ہے لیکن اس کے باوجود میرے سر میں درد ہو گیا۔ میں نے کشمیریوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کو درد سر کیا ہوتا ہے، معلوم ہی نہیں حالانکہ وہ اس کے پھول چنتے ہیں۔ یہ کشمیری بس حیوان صفت ہیں۔" ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے "زعفران کا بیج ماہ اردی بہشت میں بویا جاتا ہے بارش کے پانی سے پرورش پاتا ہے اس کا رنگ پیازی ہوتا ہے ماہ آبان کے وسط میں پھول نکلتا ہے اس کی شاخ پاؤ گز اونچی ہوتی ہے اس ڈنٹھل پر پھول لگ جاتا ہے، پھول میں چھ پنکھڑیاں اور چھ ریشے ہوتے ہیں جن میں سے تین زرد اور تین سرخ ہوتے ہیں۔ یہ سرخ ریشے ہی زعفران ہیں۔ ایک مرتبہ بیج بونے پر اس کا درخت چھ سال تک برابر پھول دیتے رہتا ہے لیکن ہر سال زمین کو نرم کر دیتے ہیں۔ چھ سال بعد زعفران کے گڈے کو زمین میں سے نکال کر دوسری جگہ بو دیتے ہیں اور اس زمین پر پانچ سال تک کاشت نہیں کرتے۔ زیادہ تر زعفران موضع نیپور مضافات میر راج میں ہوتی ہے یہاں بارہ کوس مربع زمین میں زعفران زار ہے۔ پرس پور کے پرگنہ میں اندرکول کے قریب لمراج کی جانب ایک کوس میں زعفران زار ہے"۔

۲؎ مشک: سیاہ خوشبودار مادہ ہے جو ہرن کے نافہ سے پیدا ہوتا ہے ہرن کے پیٹ میں ایک رسولی نکل آتی ہے جس میں گندہ خون جم جاتا ہے جب وہ پک جاتی ہے تو ہرن اسے ریت سے رگڑ کر چھڑا دیتا ہے اس رسولی کو نافہ کہتے ہیں، نافہ کو چیرا جائے تو سیاہ رنگ کا جما ہوا مادہ نکلتا ہے یہی چیز مشک ہے جو نہایت خوشبودار ہوتی ہے۔ مشک زیادہ تر ترکستان اور تاتار کے علاقہ سے دستیاب ہوتی ہے سیاہی اور خوشبو کی وجہ سے شاعری میں زلف محبوب کو اس سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ (فرہنگ آصفیہ، قراباذین اعظم)

۳؎ عود: ہندی میں اسے اگر کہتے ہیں یہ ایک پودے کی جڑ کا نام ہے اس کو اکھاڑ کر زمین میں دبا دیتے ہیں زردی حصہ خاک ہو جاتا ہے اور جو بچتا ہے وہ خالص عود ہوتا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس کا سارا پودا زمین میں دبا دیا جاتا ہے اسی سے عود نکل آتا ہے۔ عود کے متعلق قدیم داستانوں میں ہے کہ یہ ہندوستان کے ایک خفیہ پراسرار مقام سے نکالی جاتی ہے، یہ محض افسانہ ہے سب سے عمدہ عود "مندلی عود" ہوتا ہے، اس کی خوشبو سے سر میں جوں پیدا نہیں ہوتی۔ "سمندری عود" بھی ایک اچھی قسم ہے جو گیلی اور شیریں ہوتی ہے، مندلی عود سمندری سے زیادہ سخت اور تیز کبودی رنگ کا جس میں سفیدی نہیں پائی جاتی آگ پر زیادہ دیر تک جلتا ہے سب سے بہتر عود سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ اچھے عود کی پہچان یہ ہے کہ اسے پانی میں ڈالو تو تہہ میں بیٹھ جاتا ہے خراب عود اوپر آ جاتا ہے، اچھے عود میں ریشے نہیں ہوتے، آسانی سے کوٹا جاتا ہے، پہلے گجرات سے لایا جاتا تھا بعد میں چانپانیر میں پیدا ہونے لگا، اجین اور دنبا سری سے بھی برآمد ہوتا ہے۔ کھانے کی چیزوں میں ملایا جائے تو نشاط آور ہوتا ہے اس کی دھونی لی جاتی ہے اور اس کو بدن پر اور کپڑوں پر بھی مل لیتے ہیں۔

خداوندے کہ مارا خسروی داد | دل دانا و بازوئے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنموں کرد | بجز عدل از خیال ما بروں کرد
بود وصفش ز حد فہم برتر | تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

بادشاہی عقائد پر عوام کی بے چینی

بادشاہ کی بد اعتقادی کو دیکھ کر لوگوں کی جرأتیں بڑھ گئیں اور اسلامی عقائد اور فروعی مسائل کا علانیہ مضحکہ اڑنے لگا۔ بدبخت ہندو اور ہندو مزاج مسلمان نبوت کے بارے میں زبان درازیاں کرنے لگے، علمائے سُوء نے اپنی کتابوں میں نعت کے بجائے تبرا شروع کر دیا، توحید کے ذکر کے بعد وہ حسب قاعدہ نعت کے بجائے بادشاہی القاب لکھنے لگے۔ انھیں ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مقتدر دروغ بافوں کے مقابلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی لیں۔ ان باتوں پر عوام میں بڑی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگوں میں بادشاہ اور بادشاہ پرستوں کی بدنامی اور رسوائی عام ہوگئی۔ ملک میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ عوام و خواص میں جو لوگ سفلہ طبیعت اور پست فطرت تھے وہ ان بے ادبیوں کے باوجود خود کو بادشاہ کا مرید کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور لالچ یا خوف سے بادشاہ کے مرید ہو جاتے تھے۔ کسی کا یارا نہ تھا کہ حق بات زبان پر لائے۔

اسی زمانہ میں حاکم بنگالہ مظفر خاں نے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے قیمتی تحائف، ہاتھی اور کپڑے وغیرہ کافی تعداد میں نذرانے کے لیے دربار میں بھیجے۔ محمد معصوم کابلی کے بھیجے ہوئے ۳۹ ہاتھی بھی ملاحظہ شاہی میں پیش کیے گئے۔

خیرات کا مظاہرہ

اسی مہینہ کے دوسرے جمعہ کو چوگان بازی کے میدان میں فقیروں اور مستحقوں کو جمع کیا گیا اور بادشاہ خود وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت احاطہ میں تقریباً ایک لاکھ مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ سلطان خواجہ صدر اور قلیج خاں نے ایک ایک کو روپیہ تقسیم کیا۔ وہ دن بھی محشر سے کچھ کم نہ تھا۔ ہجوم کی ریل پیل میں اسّی عورتیں اور بچے ہلاک ہو گئے۔ بعض عورتوں کے پاس سے جن کے شوہر بنگال میں مر چکے تھے، اشرفیوں، روپیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں بھی برآمد ہوئیں۔ اس انکشاف سے بادشاہ کا دل فقراء کی طرف سے بھی بیزار ہو گیا اور حکم دیا گیا کہ "اس کے بعد تھوڑے سے لوگ حاضر کیے جائیں۔" کچھ عرصہ بعد خیرات کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

شاہزادہ سلیم کی اتالیقی

بڑے شاہزادہ کی اتالیقی پر قطب الدین محمد خاں اتکہ کو مقرر کیا گیا۔ اس تقریب میں ایک بڑی محفل منعقد ہوئی اور قطب الدین نے عمدہ ہاتھی اور اپنے عہدہ کے شایانِ شان نذرانے پیش کر کے رسم و قاعدہ کے مطابق شاہزادہ کو کاندھے پر بٹھا کر زر و جواہر کے تھال نچھاور کیے۔

اسی سال ماوراء النہر سے عبداللہ خاں اوزبک کا ایلچی خیر سگالی کا خط لے کر آیا۔ اکبر نے میرزا فولاد برلاس کو خواجہ خطیب کے ہمراہ جو بخارا کا باشندہ تھا تحفے اور ہدیے دے کر اوزبک کے ایلچی کے ساتھ بھیجا۔ بادشاہ کے خط کے آخر میں یہ شعر درج کیا گیا تھا:

چو ما دوست باشیم با یکدگر
بود بحر و بر ایمن از شور و شر

اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علما کا محضر

بادشاہ کی دینی سیادت کو تسلیم کرانے کے لیے ان دنوں ایک محضر تیار کیا گیا جس میں

مجتہدِ شرع پر امام عادل کی فضیلت ثابت کی گئی تھی اور امام عادل (حکمران وقت) کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے سکتا ہے اور اس کے مطابق تجویز و فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس محضر نامہ پر مخدوم الملک شیخ عبدالنبی صدر الصدور، قاضی جلال الدین ملتانی جو قاضی القضاۃ تھا، صدر جہاں مفتی اعظم اور مشہور عالم شیخ مبارک، اور غازی خاں بدخشی نے جو معقولات کا بہت بڑا عالم تھا اپنے دستخط کیے تھے اور اس پر ان کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

اس محضر کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ جو بھی تجویز و حکم دیں خواہ وہ امور مملکت ہوں یا مسائل شرع اس سے انحراف و اختلاف کی کسی شخص کو مجال نہ رہے اور جو ایسا کرے وہ اس محضر کی رو سے خود ہی ملزم بن جائے۔

اس محضر سے متعلق بڑی بحثیں ہونے لگیں۔ ان مباحث کا موضوع یہ تھا کہ "اجتہاد" اور "مجتہد" کی اصطلاحوں کا آخر کس پر اطلاق ہوتا ہے؟ اور ایسے امام عادل کو جو امور مملکت میں صاحب تدبر ہو اور بلحاظ مراتب مجتہدین سے بلند مرتبہ ہو اس بات کا اختیار حاصل ہے یا نہیں کہ وہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔

یہ بحث و تمحیص تو ہوتی رہی لیکن عملاً یہی ہوا کہ اس محضر نامہ پر بعض نے خوشی سے اور بعض نے جبراً مہریں لگا کر اس کی تصدیق کر دی۔ اس کے مضمون کو ہم یہاں بجنسہٖ نقل کرتے ہیں:

محضر نامہ کا متن

"اس تمہید و تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسا وسیع ملک سلطان جہاں پناہ کے عدل و انصاف تدبر و انتظام سے دار الامن بن چکا ہے اور ہر جگہ کے خواص و عوام خاص طور سے عرب و عجم کے علما و فضلا یہاں آ کر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنا بریں تمام علما نے بڑے غور و فکر کے بعد اس آیہ کریمہ کے پیش نظر کہ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" اور اس حدیث صحیح کی روشنی میں کہ "ان احبّ الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی" وغیر ذٰلک نیز عقلی اور نقلی دلائل و شواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ ———— "سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے پاس مجتہد کے مرتبہ سے بڑھ کر ہے۔"

لہٰذا حضرت سلطان الاسلام امیر المومنین ظل اللہ ابو الفتح جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ اعوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر اگر دین کے ان مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام کا اجرا فرمائیں تو ان کی یہ تجویز و حکم متفق علیہ متصور ہوگا اور اس کی اطاعت و پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی۔

ہرگاہ کہ سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعث سہولت ہو اور نصوص شرع کے مغائر نہ ہو اس پر عمل درآمد ہر شخص پر لازم و قطعی ہوگا اور اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسران دینی و دنیاوی پر مستلزم ہوگی۔

یہ سطور حقوق اسلام کے اجرا کی خاطر حسبۃً للہ علمائے دین اور فقہائے مجتہدین کے محضر سے ماہ رجب ۹۸۷ھ میں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔"

اس محضر کا مسودہ شیخ مبارک نے مرتب کیا تھا دوسرے علما نے کراہتاً اس کی نقلیں کیں۔ شیخ مبارک نے بڑے انشراح قلب کے ساتھ

محضر کے ذیل میں یہ فقرہ لکھا کہ "میں اس بات کا دل و جان سے خواہش مند تھا اور سالہا سال سے اس کا منتظر تھا۔"

اس محضر کی صورت میں بادشاہ کو افتا کے کلی اختیارات مل گئے، بس پھر کیا تھا جلد ہی اجتہاد کا دروازہ کھل گیا اور کسی کو کسی قسم کی مخالفت کی مجال نہیں رہی۔ تحلیل و تحریم کا جھگڑا مٹ گیا اور شریعت کے مقابلہ میں امام کی رائے کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ بادشاہ نے کھلم کھلا اسلام کو تقلید کا نام دے کر پس پشت ڈال دیا۔

شیخ ابوالفضل کا معاملہ سمرقند کے حیرتی شاعر کے مماثل تھا کہ جب اس نے ماوراء النہر کے سرد مزاج لوگوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائیں تو محض ان کی ضد میں عراق کے جعفری مومنوں کے ساتھ اس نے یارانہ کر لیا اور ان کے ساتھ بھٹکتا پھرا۔ ابوالفضل نے بھی اس بے دینی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور منہ دیکھے کی شرم میں آخرت کے انگارے سمیٹ لیے۔

اجمیر کا آخری سفر

اسی سال ۱۶ ماہ رجب بادشاہ اجمیر تشریف لے گئے۔ یہ بس اجمیر کا آخری سفر تھا، اس کے بعد سے آج تک کہ چودہ سال گزر گئے عنان شاہی اس طرف پھیری نہیں گئی۔ حسب دستور اجمیر سے پانچ کوس پر پیادہ ہو کر سفر کیا اور مزار مبارک کی زیارت کی۔

ان دنوں لوگ بادشاہ پر پھبتی کستے تھے کہ "کیا خوب خواجہ اجمیری کے ساتھ تو یہ عقیدت اور اس اصل اصول سے جس کے طفیل دنیا کے ہر گوشہ میں خواجہ صاحب جیسے ہزاروں کامل ولی پیدا ہوئے یہ انحراف و سرتابی۔" بس یہ مضمون تھا:

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ ناز ۔۔۔ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

دریں چمن گل بے خار کس نہ چید آری ۔۔۔ چراغ مصطفوی با شرار بولہبی است

بادشاہی کلمہ

مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی ہزار بے وقعت سہی لیکن ان کے ہوتے ہوئے دینی معاملات میں اکبر کی جسارتیں رکی اور سہمی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد گویا پاؤں کی بیڑیاں کٹ گئیں اور اس نے دھڑلے سے عقائد و مسائل میں نئی نئی اختراعات شروع کر دیں۔ چنانچہ قرآن کو مخلوق قرار دے دیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے بارے میں شکوک پیدا کیے، جن، فرشتے اور دوسرے تمام امور غیبی معجزوں اور کرامتوں کا انکار کر دیا۔ قرآن کے تواتر اور اس کے کلام الٰہی ہونے پر بھی اعتراضات وارد کیے، مرنے کے بعد بقائے ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کر دیا اور اپنے ان خیالات کے لیے مندرجہ ذیل اشعار کو سند بنا لیا۔

از حقیقت بدست کوری چند
مصحفی ماند و کہنہ گوری چند
گور با کس سخن نمے گوید
مرقد آں کسے نمے جوید

عید آمد و کارہا نکو خواہد کرد ۔۔۔ چوں روئے عروس
ساقی مے ناب در سبو خواہد کرد ۔۔۔ چوں خون خروس

افسار نماز و پوز بند روزہ ۔۔۔ یک بار دگر
از گردن ایں خراں فرو خواہد کرد ۔۔۔ افسوس افسوس

بے دینی کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بادشاہ کا خاص کلمہ "لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" علانیہ پڑھا کریں، لیکن اسی خیال سے کہ یہ حکم عام ہو تو ملک میں شاید خلل برپا ہو جائے، اس کلمہ کے پڑھنے کا لزوم صرف اپنی حرم سرا تک ہی محدود کر دیا۔

اکبر کی اس بے دینی کی تاریخ "فتنہائے امت" سے نکلتی ہے۔

غیرت مند حق گو امیر

بادشاہ نے جب قطب الدین محمد خاں اور شہباز خاں اور اس پایہ کے دوسرے امیروں کو بھی اسلام کی تقلید چھوڑ کر اس نئے دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امیروں نے بڑی جرأت سے اس مطالبہ کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا "شاہان ولایت خلیفہ روم وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو آخر کیا کہیں گے، وہ سب بہر حال اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ تقلیدی ہو یا کچھ اور"۔ اکبر نے اس پر چڑ کر کہا "تو روم کے فرمانروا کی خاطر ہمارے ساتھ اس درشتی سے بات کر رہا ہے تو اس طرح ان کے پاس اپنا ٹھکانا بنانا چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنا پڑے تو وہاں جا کر اعزاز و مرتبہ حاصل کر لے"۔

شہباز خاں نے بھی بڑی سختی سے مخالفت کی اور جہنمی کتے بیربر کو جو علانیہ اسلام پر طعنے کرتا رہتا تھا سب کے سامنے گالی دے کر کہا "اے ملعون کافر، اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا، ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے"۔ غرض دربار میں بڑی بدمزگی پیدا ہو گئی اور اکبر نے غصہ میں آ کر شہباز خاں اور دوسرے امراء کو کہا "چپ رہو ورنہ ہم تمہارے منہ پر نجاست بھری جوتیاں مارنے کا حکم دیں گے"۔

علماء اور ائمہ کی بدحالی

انہی دنوں پٹن کا حاکم ترسون محمد خاں گجرات سے آکر باریاب ہوا اور قاضی علی بغدادی کو شیخ عبد النبی کی جگہ مدد معاش اور اراضیات کی تحقیق و ضبطی کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ ہزاری، پانصدی اور صدی مرتبہ رکھنے والے ائمہ کو بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کرتا تھا۔ ان کی اکثر زمینیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ کٹ کٹا کر بہت تھوڑی سی اراضی ان کے پاس رہ گئی۔ اس طرح بڑے بڑے علماء، امراء و مشاہیر کے خاندانی اعزاز و اعتبار کو گھٹا دیا گیا اور شریفوں کی اولاد مفلسی کی وجہ سے آوارہ ہو گئی، مدرسے اور مسجدیں ویران ہونے لگیں اور اکثر لوگ جلاوطن کر دیے گئے۔

مدارس از علما آں چناں بود خالی — کہ ماہ روزہ ز میخوارہ خانۂ خمار

برند تختۂ لوح ادیب از پئے مزد — کنند مصحف قاری گرو بوجہ قمار

ان معاملات میں حکیم الملک اور شیخ ابو الفضل میں بڑی مخالفت رہتی تھی۔ حکیم اس کا نام بگاڑ کر "فضلہ" کہا کرتا تھا۔ اکبر کو ابو الفضل کا بڑا پاس تھا اس لیے حکیم الملک پر اس نے بڑی سختی کی، آخر کار مکہ معظمہ کی طرف اس کے اخراج کا حکم صادر کر دیا۔

خدمت شاہی پر دوبارہ تقرر

اسی سال ماہ رمضان میں اجمیر کے قیام کے وقت قاضی علی نے مجھے بھی کہ میں عرصہ سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر بیٹھ رہا تھا، بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور بادشاہ کو میری مدد معاش کے سلسلہ میں ہزار بیگھ اراضی کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا مجھے بھی خیال ہے کہ اس کے فرمان میں ایسی کوئی شرط تھی۔ قاضی علی نے کہا ہاں بشرط خدمت ان کو زمین دی گئی تھی۔ اکبر نے کہا اس سے پوچھو "کیا کوئی ضعف و عارضہ تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی"۔ غازی خاں بدخشی نے

فی البدیہہ کہا "قسمت کا ضعف تھا"۔ اس موقع پر تمام مقربوں نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر، سابقہ اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کر دی گئی تھی، میرے لیے سفارشیں کیں۔ بادشاہ نے جواب دیا "ہم کسی کو ملازم رہنے پر مجبور نہیں کرتے، اگر یہ ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی"۔ میں نے فوراً ہی اس بات کو قبول کر لیا۔ یہ بات بادشاہ کو بڑی ناگوار گذری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے مکرر عرض کیا کہ آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے، تو بڑے اصرار کے بعد فرمایا "شیخ عبدالنبی (جو اس وقت تک لشکر میں موجود تھا) سے پوچھا جائے کہ وہ ملازمت کی شرط کے بغیر کس قدر اراضی کا حقدار ہو سکتا ہے"۔ شیخ نے مولانا اللہ داد امروہی مرحوم کے ذریعہ کہلوایا کہ "چونکہ (ملا عبدالقادر) عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمہ کافی اخراجات ہیں، میں حسب الحکم اس کے لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھہ اراضی تجویز کرتا ہوں"۔ مصاحبوں کا خیال تھا کہ اب ایسی کوئی عرضداشت مناسب نہ ہوگی اور وہ سب مجھے ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کرنے لگے، مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا جس سے بمشکل چھٹکارا نصیب ہوا تھا   یہ سب کچھ اس لیے بھگتنا پڑا کہ میں نے بادشاہ کے بارہا حکم دینے کے باوجود پہلے ہی داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی اور زبان حال و قال سے یہ شعر پڑھ دیا کرتا تھا:

شادم کہ یک سوار ندارم پیادہ ہم
فارغ ز قید شاہم و از شاہزادہ ہم

جزیہ کی منسوخی

اسی سال بادشاہ نے تمغا اور جزیہ کا قانون جس کے ذریعہ کروڑہا روپیہ کی آمدنی ہوتی تھی منسوخ کر دیا اور اس کے لیے تاکیداً فرامین صادر کیے گئے۔

اسی سال محمد معصوم خاں ولد معین الدین احمد خاں فرنخودی جو جون پور کی حکومت پر فائز تھا دربار میں حاضر ہوا اور جون پور جانے کی رخصت پا کر لوٹ گیا۔ ملا محمد یزدی جون پور کا قاضی القضاۃ بنایا گیا۔ دہلی کی حکومت محب علی خاں ولد میر خلیفہ کو تفویض ہوئی۔

ملا محمد یزدی کا فتویٰ

ملا محمد یزدی نے جون پور جانے کے بعد بادشاہ کے خلاف بغاوت و خروج کے جواز کا فتویٰ دیا۔ اس کے فتویٰ پر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم خاں فرنخودی، میر معز الملک، نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امیر تلواریں کھینچ کر بادشاہ سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے بڑی سخت لڑائیاں لڑیں۔ اس زمانہ میں ائمہ کہا کرتے تھے بادشاہ نے ہماری مدد معاش کی، زمینوں پر ہاتھ ڈالا تو اللہ نے اس کے ملک کو تاڑ لیا۔

علماء کا اخراج اور تبادلے

جب مہتر سعادت جسے پہلے خاں کا خطاب حاصل تھا معصوم خاں جون پوری کے پاس جا کر واپس آیا تو اس نے ملا محمد یزدی کے فتویٰ اور وہاں کی صورت حال سے متعلق تفصیلات بادشاہ کو بتائیں۔ اکبر نے کسی بہانہ سے میر معز الملک اور محمد یزدی کو جون پور سے بلا بھیجا۔ جب یہ لوگ فیروز آباد جو آگرہ سے دس کوس پرے ہے پہنچے تو حکم بھیجا گیا کہ سواروں کو ان سے علیحدہ کر کے دونوں کو کشتی میں بٹھا کر جمنا کے راستہ گوالیار لے جائیں۔ اس کے پیچھے ہی دوسرا حکم آیا کہ دونوں کو ختم کر دیا جائے، محافظ دوسری کشتی میں سوار ہو جائیں اور ان کو کسی پرانی کشتی میں بٹھا کر عین دریا میں پہنچنے پر ملاحوں کو حکم دیں کہ ان کی کشتی کو غرق کر دیا جائے۔ چند دن بعد ہی قاضی یعقوب وہاں بنگال سے آئے گا اس کو بھی ان کی طرح ختم کر دیا جائے"۔

اس طرح اکبر نے ان تمام علماء کو جن کے بارے میں اسے اندیشے تھے "ایک ایک کر کے راستہ سے ہٹا دیا اور لاہور کے علماء کو

جلاوطن کر کے جگہ جگہ منتشر کر دیا۔ ان میں قاضی صدر الدین لاہوری کو جن کا علمی مرتبہ مخدوم الملک سے زیادہ تھا بھڑوچ، گجرات کی قضاوت پر ملا عبد الشکور گرول دار کو جون پور کی اور ملا محمد معصوم کو بہار کی قضاوت پر مامور کر دیا۔ شیخ منور کو مالوہ کی طرف جلاوطن کر کے اس صوبہ کی صدارت اس کے تفویض کر دی۔ لاہور میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین جو مشہور واعظ تھے رہ گئے۔ بادشاہ نے ان کو کبر سنی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ یہ بزرگ ۹۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

صاحب زماں کی پیشین گوئی

حاجی ابراہیم سرہندی کا تقرر گجرات کی صدارت پر کیا گیا تھا۔ اس نے ائمہ سے رشوت لے کر کافی روپیہ اور ذخیرہ جمع کر لیا اگر وہ بچارے رشوت دینے سے انکار کرتے تھے تو وہ ان کی مدد معاش کو روک دیتا تھا۔ اس کی حرکتیں بادشاہ کے بھی علم میں آئیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ دکھن جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہے، چنانچہ اسے بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا اور واپس بلا کر حکیم عین الملک کے سپرد کر دیا۔ شبانہ مجلسوں میں اس کو بھی بلایا جاتا تھا اس نے اسی زمانہ میں بزرگان دین کے متعلق جھوٹی سچی باتیں لکھ کر ایک رسالہ بادشاہ کی خدمت میں خوشامد کے طور پر پیش کیا، لیکن اس کا پول بہت جلد کھل گیا۔ اصل میں اس نے ایک پرانی کرم خوردہ کتاب میں غیر معروف خط میں شیخ ابن عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ "صاحب زماں بہت سی عورتوں سے نکاح کرے گا، داڑھی منڈا ہوگا" اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کر دی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور مہربان ہو کر اسے مقربوں میں شامل کر لیا۔

حاجی ابراہیم کی مذکورہ تحریر کے مطابق میاں امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید کی کتابوں میں سے ایک پرانا رسالہ فراہم کیا گیا جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ "ایک صحابی کا لڑکا داڑھی منڈا کر جب حضور اکرمؐ کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا اہل جنت کی یہی وضع ہوگی۔" یہ حدیث بھی اکبر کو بڑے اہتمام سے دکھائی گئی۔

حاجی ابراہیم شاہ فتح اللہ، شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کے ساتھ بڑی بے باکی کے ساتھ مباحثے کرتا تھا اور ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ اسی لیے اس کو اکبر نے رنتھمبور کے قلعہ میں بھیج دیا۔ وہ اسی جگہ فوت ہوا۔ اس کی لاش قلعہ کی فصیل سے نیچے پھینک دی گئی۔ لاش لمبے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، اس لیے یہی مشہور ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ کو قلعہ سے نیچے گرا دیا۔ یہ حادثہ ۹۹۴ھ میں پیش آیا تھا۔

وظائف و مدد معاش کی قطع و برید

اہل علم کے لیے ان کا علم ہی وبال بن گیا تھا۔ آئے دن ان بچاروں کو طرح طرح کی سرکاری کارروائیوں کا سابقہ رہتا تھا۔ بادشاہ نے ممالک محروسہ کے تمام علما اور مشائخین کو فرمان بھیج کر دربار میں بلایا اور خود بہ نفس نفیس ان کی مدد معاش، انعام و وظائف کی تحقیق کی۔ سب علما کو درباری آئین کے مطابق تنظیم و تسلیمات بجالانا پڑتا تھا۔ بادشاہ ان عالموں سے خلوت و جلوت میں گفتگو کر کے اپنے حسب مرضی ہر ایک کے لیے مختصر سی اراضی مقرر کر دیتا تھا اور جس کسی کے متعلق یہ رپورٹ ہوتی کہ وہ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے ہے یا مجلس سماع منعقد کرتا ہے یا کسی نہ کسی طرح کا اعزاز اسے حاصل ہے۔ اس کے مشغلوں کو دکانداری کا نام دے کر اسے یا تو کسی قلعہ میں قید کر دیا جاتا تھا یا بنگال اور بکر کی طرف جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔

علماء کے خلاف یہ کارروائیاں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ بوڑھے اور معمر پیروں اور شیوخ کا حال اور بھی برا تھا۔ صاحب سماع

اہل ذوق صوفیوں کی معاش کے فرامین کی جانچ پڑتال ہندو کارندوں کے ذمہ تھی اور ان کا اجرا اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک ان پر ہندوؤں کی مہر نہ لگ جاتی۔ اس معاشی بدحالی کی وجہ سے بچارے صوفی اپنے حال وقال کو فراموش کر بیٹھے اور وطن چھوڑ کر کسی نہ کسی جائے پناہ میں جا چھپے۔ ان کا سارا تصوف دہرا کا دہرا رہ گیا ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

؎

چناں آسماں بر زمیں شد بخیل
کہ لب تر نہ کردند زرع و نخیل

کیوں نہ ہو ان ظاہر پرست صوفیوں کی بے روح مجلسیں ان کی بے حسی اور جمود، شرمناک اعمال اور بے حاکلیفات کا یہی خمیازہ ہونا تھا ان بے فیض صوفیوں میں اکثر اسی لائق تھے کہ اس انجام بد سے دوچار ہوتے:

اں ز صوفی گری و آزادیست	بلکہ کیدی گری و قوادیست
دزدی و راہ زنی بہتر ازیں	کفن از مردہ کنی بہتر ازیں

موضوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں تاریخی واقعات کو قلمبند کروں لیکن کیا کروں، قلم بے اختیار دوسری طرف بہک جاتا ہے اور سلسلۂ بیان کو چھوڑ کر زمانہ کی اس نئی چال، اس نئے مذہب اور اس نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے۔ کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا، لیکن آہ مجبوری۔

خطابی با فلک کردم کہ از تیغ جفا کشتی	شہان مجلس آرای و جوان مردان بر یک را
زمام حل و عقد خود نہادی در کف قومی	کہ از روئے کرم باشد بر ایشاناں شرف سگ را

ہماں در گوش جانم گفت فارغ باش خوش منزل
کہ سبلت بر کند ایام ہژدہ روز یک را

بنگال میں مظفر خاں کی سخت گیری

اسی سال مظفر خاں بنگال کی عملداری پر گیا۔ اس نے وہاں کے معاملات میں بڑی سخت گیری سے کام لیا اور بنگال میں متعینہ امرا اور سرداروں کو سخت ایذائیں دیں۔ اکثر امیروں کی جاگیر ضبط کر کے دربار کے طریقہ پر داغ و محلہ اور محاسبہ کے پرانے طریقے نافذ کر دیے۔

بابا خاں قاقشال اور خالدی خاں نے جو مملکت کے با اقتدار امیر اور نفس ناطقہ تھے داغ کے قانون سے معافی اور جاگیروں کی بحالی کے لیے بڑی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مظفر خاں نے خالدی خاں کو اس الزام میں قید کر دیا کہ اس نے داغ و محلہ کے بغیر ہی جاگیر کی رقمیں وصول کر لی تھیں اور اسے واپس نہیں کیا تھا۔

اتفاق سے انہی دنوں مظفر خاں کے پاس شاہی فرمان آیا کہ مرزا محمد حکیم کا ایک آدمی روشن بیگ نامی کابل سے بنگالہ گیا ہوا ہے، اسے گرفتار کر کے سزا دی جائے۔ مظفر خاں نے اسے تلاش کرایا تو وہ قاقشالوں کے پاس سے پکڑا گیا اس نے بر سر دربار بابا خاں سے بڑے

درشت لہجہ میں باز پرس کی اور شاہی فرمان دکھا کر روشن بیگ کی گردن مارنے کا حکم دیا۔

قاقشالوں کی بغاوت

مظفر خاں کی ان سخت گیریوں سے سپاہی بڑے خوفزدہ ہو گئے اور سب نے مل کر اپنے سر منڈوا لیے، مغلوں کا بانا پہن لیا اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ شہر گور میں جسے پہلے لکھنوتی کہا جاتا تھا مظفر خاں کے جمع کردہ مال و اسباب کو لوٹ لیا۔ اس نے باغی قاقشالوں کی سرکوبی کے لیے بہت سی کشتیاں تیار کرائیں اور حکیم ابوالفتح اور پتر داس کو گور کی طرف روانہ کیا۔

حکیم ابوالفتح بزم کا یکہ تاز تھا رزم کا شہسوار نہیں اور پتر داس ایک ہندو دفتری تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ جنگجو قاقشالوں کے مقابلہ میں کون سا تیر سیدھا کر سکتے تھے۔ جب قاقشال ان فوجی کارروائیوں سے دبتے نظر نہ آئے تو مظفر خاں نے ان کے نام حکمت آمیز فرمان بھیج کر پیغام دیا کہ "تمہاری جاگیریں بحال کر دی جائیں گی، تمہارے پاس رضوی خاں اور پتر داس کو اسی گفت و شنید کے لیے بھیجا جا رہا ہے تاکہ وہ معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرا دیں"۔ اس کے بعد ہی مذکورہ دونوں اشخاص کو میر سید رفیع الدین محدث کے لڑکے میر ابو اسحاق کے ساتھ قاقشالوں کے پاس بھیج دیا۔ قاقشالوں نے کسی قسم کی گفتگو سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کو قید کر کے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔

امرائے بہار کی بغاوت

اسی دوران میں ملا طیب اور رائے پرکھوتم بخشی نے معصوم خاں کابلی عرب بہادر اور بہار کے تمام امیروں کی جاگیروں کو بہ یک قلم ضبط کر لیا۔ اس کارروائی نے ان امیروں کو بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ان کی سرکوبی کے لیے یہ دونوں جوسا ندی کو عبور کر کے معصوم خاں کے مقابلہ پر پہنچے۔ عرب بہادر نے ان کو غفلت میں رکھ کر اچانک حملہ کر دیا اور رائے پرکھوتم کو قتل کر کے شاہی لشکر کا بہت سا مال لوٹ لیا۔

بہار کے ان باغیوں نے بابا خاں قاقشال سے مراسلت کی اور قاقشالوں کا ساتھ دینے کے لیے گڑہی کی طرف پیش قدمی کر دی۔ ان کا راستہ روکنے کے لیے مظفر خاں نے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کو جو اب دیوان کل کے عہدہ پر مامور ہے روانہ کیا۔ معصوم خاں نے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور قاقشالوں کو ساتھ لے کر دریائے گنگا عبور کی اور مظفر خاں کے مقابلہ میں صف آرائی کر لی۔

مظفر خاں کا قتل

باغیوں کی مدافعت کے لیے مظفر خاں قلعہ ٹانڈہ میں جو اس وقت ایک پرانی چار دیواری سے بڑھ کر نہیں تھا محصور ہو گیا۔ اس وقت وزیر خاں جمیل بیگ نے جو ایک پرانا امیر تھا جان محمد خاں بہبودی کو ساتھ لے کر مظفر خاں پر حملہ کر دیا اور حکیم ابوالفتح اور خواجہ شمس الدین اور دوسرے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں اور پتر داس کسی نہ کسی طرح باغیوں کی قید سے نکل بھاگے اور مظفر خاں کی مدد کے لیے اپنے زمینداروں کو حاجی پور میں بھیج دیا۔ انہی معرکوں میں حکیم نور الدین قراری بھی مارا گیا اور باغی قاقشالوں اور معصوم خاں نے مظفر خاں کو قول نامہ دے کر ٹانڈہ کے قلعہ سے باہر آنے پر مجبور کر دیا پھر اسے گرفتار کر کے بڑے عذابوں سے مروا ڈالا۔

بنگال کی خود مختاری

اب باغیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے مظفر خاں سے چھینا ہوا کافی مال و اسباب ان کے پاس تھا انھوں نے اچھی خاصی جمعیت فراہم کر لی اور پورے بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا۔ ایک بڑی پیدل اور سوار فوج بنائی۔ میرزا شرف الدین حسین ان دنوں بنگال میں نظر بند تھا۔ اسے بادشاہ نے کابلی کے حاکم قاسم علی خاں بقال کے پاس سے بنگالہ میں

بھجوا دیا تھا۔ باغیوں نے میرزا کو قید خانہ سے نکال کر اپنا سردار بنالیا۔ بنگال میں ایک خود مختار حکومت قائم ہو جانے سے سارے ملک میں بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا۔

راجہ ٹوڈر مل کی فوج کشی

اکبر نے بنگال کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے راجہ ٹوڈر مل، صادق محمد خاں، ترسون محمد خاں اور دوسرے تمام امرا کو فتح پور سے روانہ کیا۔ راجہ کی مدد کے لیے محمد معصوم خاں فرنخودی حاکم جون پور اور اس نواح کے دوسرے جاگیرداروں کو متعین کیا گیا۔

ابھی یہ لوگ راستہ ہی میں تھے کہ شاہم خاں جلائر نے سعید خاں بدخشی سے جنگ کر کے اسے قتل کر دیا۔ محمد معصوم جونپوری نے تین ہزار مسلح اور تیار سواروں کو راجہ کے ملاحظہ میں پیش کیا، لیکن اس کی حرکات و سکنات سے راجہ تاڑ گیا کہ وہ بھی بغاوت و خروج کی فکر میں ہے۔ بظاہر اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا رہا، لیکن ساری صورت حال دربار میں لکھ کر بھیج دی۔

شاہی لشکر سے مقابلہ کے لیے محمد معصوم خاں کابلی، میرزا شرف الدین حسین اور قاقشالوں کی فوج تیس ہزار سوار، پانسو ہاتھی بے شمار کشتیاں اور توپ خانہ لے کر منگیر کے قصبہ میں پہنچ گئی۔ راجہ کو اپنے لشکر پر پورا بھروسا نہ تھا۔ وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ یہ سب موقع کے منتظر ہیں، اس لیے اس نے غنیم سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنا مناسب نہ جانا اور منگیر کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ طرفین کی طرف سے ہر روز سخت لڑائی ہوتی تھی اور شاہی لشکر رسد کے نہ ملنے کی وجہ سے نہایت تنگ دست ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں شہباز خاں کے داماد زین الدین کنبو نے دریا کے راستہ ڈاک چوکی کے ذریعہ ایک لاکھ روپیہ راجہ کے پاس بھجوایا جو کچھ دن تک صرف میں آتا رہا۔ بادشاہ اسی طرح وقفہ وقفہ سے کبھی تو دریا خاں آبدار کے ذریعہ کبھی سرمدی کے ہاتھ اور کبھی سیٹھ بھگوان داس خزانچی کے بیٹے کی معرفت رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔

ڈاک چوکی پر جو لوگ مقرر تھے ان میں قاضی زادہ عبدالحی خواص ولد قاضی صدرالدین سنبلی بھی تھا جو نہایت حسین اور خوبصورت نوجوان تھا، لیکن جتنا خوبصورت تھا اتنا احمق بھی تھا۔ وہ بھی ان خبطیوں میں شامل تھا جو مذہب و ملت کے بارے میں نئی بات رانیاں کرتے رہتے تھے۔ اس مہم کے دوران وہ بھی عین عالم جوانی میں مارا گیا۔

راجہ کی فوج کے ساتھ شاہ قربلی کا لڑکا ہمایوں قربلی بھی تھا جسے ہمایوں قلی خاں کا خطاب دیا تھا۔ وہ نئے بادشاہی دین کے ہنگاموں کو اور راجمیر میں لوگوں کے ابتلا و آزمائش کے ہولناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ چکا تھا اور سخت متنفر تھا۔ منگیر کے محاصرہ کے وقت موقع پا کر وہ اور ترخان دیوانہ شاہی لشکر سے بھاگ کر باغیوں سے جا کر مل گئے۔

باغیوں کی پسپائی

مونگیر کا محاصرہ کافی طویل ہو گیا۔ اسی دوران میں بابا خاں قاقشال سخت بیماری میں تقریباً جاں بلب ہو گیا اس کے ضعف و بیماری کو دیکھ کر مجنوں خاں قاقشال کا لڑکا جباری جو باغیوں کا سرگروہ تھا اور اب وہ دربار شاہی میں خدمت پر مامور ہے محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔ باغیوں کا لشکر منتشر ہو گیا۔ معصوم خاں کابلی بھی مجبور ہو کر بہار کی طرف بھاگ گیا اور عرب بہادر نے پٹنہ پر قبضہ کرنے اور بادشاہی خزانہ لوٹ لینے کے ارادہ سے یلغار کرتے ہوئے پٹنہ پر جا کر حملہ کر دیا۔ بہار خاں خاص خیل جو سید عارف کے نام سے مشہور تھا قلعہ پٹنہ میں محصور ہو گیا۔ راجہ ٹوڈر مل نے معصوم خاں فرنخودی کو بہار خاں کی کمک کے لیے روانہ کیا۔ عرب بہادر ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے وہ مشہور زمیندار گجپتی کے پاس چلا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل، صادق خاں اور دوسرے شاہی امیروں نے معصوم خاں کابلی کی سرکوبی کے لیے بہار کی طرف کوچ کر دیا۔ معصوم خاں نے شاہی لشکر پر اچانک شبخون مارا اور صادق خاں کے کیمپ پر جا پڑا۔ اس اندھیری رات میں کیمپ کی نگرانی اور قراولی کے لیے ماہ بیگ جو ایک نامی سردار تھا اور الغ خاں حبشی متعین تھے۔ ماہ بیگ مارا گیا اور الغ خاں جان بچا کر نکل گیا۔ صادق خاں نے ثابت قدمی کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ معصوم خاں نے بڑی بہادری دکھائی لیکن کچھ پیش نہ گئی اور پسپا ہو کر بھاگ گیا۔ اس وسیع علاقہ میں قزاقی کرتے ہوئے عرصہ تک سرگرداں رہا، آخرکار اڑیسہ کے زمیندار عیسیٰ خاں کے پاس جا کر پناہ لی جس نے اس زمانہ میں ڈھائی سو ہاتھی اور چار لاکھ روپیہ کے نفیس تحفے سونا، قیمتی آلات، اگر، پوشاکیں اور بے شمار کپڑے سعید خاں مغول کے ذریعہ دربار میں روانہ کیے تھے۔ معصوم خاں ابھی تک اڑیسہ ہی میں ہے۔ باغیوں کی شکست کے بعد صوبہ کی ہی تک کا علاقہ دوبارہ شاہی قبضہ میں آ گیا۔

حاکم مالوہ کا قتل

انہی دنوں شجاعت خاں اور اس کے بیٹے قائم خاں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ قائم خاں بڑا اچھا موسیقار حسین و ظریف نوجوان تھا۔ بادشاہ نے دونوں باپ بیٹوں کو سارنگ پور سے دربار میں بلایا تھا۔ یہ دونوں حسب طلب فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے نوکروں نے ان کی بدمعاملگی، بدعہدی، بدسلوکی اور رذالت کی وجہ سے کہ آج کل کے سرداروں کا بس ایسا ہی کچھ وطیرہ ہے۔ دونوں کو راستہ میں قتل کر دیا اور بھاگ گئے۔

کہتے ہیں ایک دن ایک سائل نے شجاعت خاں اور دوسرے امرا سے جو دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کچھ طلب کیا۔ اس نے اس سے کہا "بابا کیا کریں تیری خیرات کی مد ہماری برآورد میں شامل نہیں کی گئی ہے۔"

شجاعت خاں کی جگہ بادشاہ نے مالوہ پر شریف خاں اتکہ کو مقرر کیا۔ اس کے مکان پر خود بادشاہ کی سواری گئی۔ اتکہ نے زبردست ضیافت و مہمانی کی اور بادشاہ نے اسے مالوہ پر رخصت کیا۔

بنگال پر اعظم خاں کا تقرر

اسی سال خان اعظم کو جو ایک عرصہ سے نظر بند تھا بادشاہ نے آگرہ سے بلا بھیجا اور اس کو نوازش شاہانہ سے سرفراز کر کے پانچ ہزاری کا عہدہ مرحمت فرمایا، پھر بنگالہ کی حکومت پر مامور کر دیا۔ شہباز خاں کو رانا کے علاقہ سے بلا کر لشکر اور فوج دے کر خان اعظم کی کمک کے لیے مقرر کیا۔ اس نے حاجی پور کی سرحدوں پر فوج کشی کی اور کچھیتی کا جنگل کٹا کر عرب بہادر کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال بادشاہ نے حکیم الملک گیلانی کو اپنے نئے مذہب کا مخالف سمجھ کر مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔ اسے بادشاہ نے وہاں کے شریف اور محتاج لوگوں کی امداد کے لیے پانچ لاکھ روپیہ بطور انعام بھی عطا کیا تھا حکیم آخر عمر تک مکہ ہی میں مقیم رہا ؎

از سر کوئے تو نمے جنبم

آسماں نیستم زمینم من

اس کو واپس بلانے کے لیے بادشاہ نے متعدد بار فرمان بھیجے تھے، لیکن وہ وہاں سے لوٹ کر نہ آیا اور اپنے رب سے جا ملا۔

مشائخین کی آزمائشیں

اس سال اکبر نے تمام علاقوں کے بڑے بڑے مشائخین کو بلا کر فتح پور میں جمع کیا۔ اور ہر ایک کے ساتھ مجلس منعقد کر کے مختلف باتوں کی تحقیق کرتا رہا۔ ان مشائخین میں سے اکثر محض خوشامدی اور چند بیگھہ زمین

کے لالچی تھے۔ بادشاہ کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان میں سے کسی کی کوئی خرق عادت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ خرق عادت کے کرتب ان کو کیا آتے وہ تو دشمنوں ہی کے حصہ میں لکھے گئے ہیں اور جہاں تک علو اخلاق کا معاملہ تھا کہ اس سے مطلب ترک دنیا، تجرد، توکل، استغنا اور عالی حوصلگی ہے وہ سب ان اوصاف سے کورے تھے۔ بادشاہ نے جب ان میں بجز خوشامد اور چاپلوسی کے کوئی اور جوہر نہیں پایا تو ان سے اور دین حق سے اس کی بدگمانی پہلے سے کہیں زیادہ دوچند ہوگئی۔

پوشیدہ مرقعند ایں خامی چند　　بگرفتہ لبطامات الف لامی چند
نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند　　بدنام کنندہ نکو نامی چند

ان مشائخین میں شیخ عبدالعزیز کے بڑے خلیفہ شیخ جا نیلدہ بھی تھے جن کو اکبر نے عبادت خانہ میں ٹھہرایا تھا وہ دکھاوے کے لیے نماز معکوس پڑھا کرتے تھے اور اپنے زہد و عبادت کا بڑا مظاہرہ کرتے تھے۔ اکبر کی کسی حرم کے متعلق یہ کہا کہ اس کو لڑکا ہوگا اس کو بجائے لڑکے کے لڑکی ہوئی۔ ان کی اور بھی قابل اعتراض حرکتیں دیکھنے میں آئیں، اسی طرح سید ہاشم فیروز آبادی نے بڑے ٹھاٹھ سے اپنی مشیخت کی دکانداری شروع کردی۔ ان لوگوں کی یہ حرکتیں بھی بادشاہ کی بد اعتقادی میں اضافہ کا سبب بن گئیں۔

شیخ جہتی افغان کاسی کو پنجاب سے بلایا گیا تھا وہ حسب الحکم قاصدوں کے ساتھ خانقاہ سے پیدل ہی چلا اور اس کی پالکی اس کے پیچھے خالی ہی لائی گئی۔ وہ فتح پور میں شیخ جمال بختیار کے مکان میں آکر ٹھہرا اور پیغام بھجوایا کہ "میری ملاقات کسی بھی بادشاہ کے لیے مبارک نہیں رہی ہے"۔ اکبر نے اس سے ملاقات نہیں کی اور جلد ہی اسے رخصت کردیا۔

شیخ اللہ دیہ خیر آبادی بھی جو توکل و فقر میں بڑے نامور تھے اور انھوں نے بادشاہ سے کوئی اراضی قبول نہیں کی تھی دربار میں تشریف لائے۔ ان کا سلسلہ طریقت بھی بڑا وسیع تھا۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے شیخ ابوالفتح بھی آئے تھے یہ وہی بزرگ ہیں جن سے میں نے اسلیم شاہ کے آخری عہد میں اپنے استاد علامہ میاں حاتم سنبلی کے حسب الحکم　"ارشاد قاضی" اور حاشیہ پڑھا تھا اور اب وہ اپنے باپ کے قائم مقام ہیں۔ اپنے علم احوال و معاملات میں نہایت کھرے اور بے لاگ ہیں۔

جب شیخ الہدیہ دربار میں آئے تو اکبر ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوگیا۔ جب بادشاہ نے حال احوال پوچھا تو انھوں نے اپنے کان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ بادشاہ نے ان کو مزید زحمت نہیں دی اور جلد ہی رخصت کردیا۔

امامت و نبوت کا ادعا

اسی سال دربار کے کمینے اور ذلیل علما نے جو درحقیقت جاہل محض تھے، من گھڑت دلیلیں دے کر بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ اس عہد کے "صاحب زماں" خود حضور والا ہیں کہ آپ کا ظہور مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہتر فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہوا ہے۔ شریف نے محمود بسنخوانی کے رسالوں سے یہ شہادت بھی نکال دکھائی کہ اس نے صراحتاً کہا ہے کہ "سنہ ۹۹۰ھ میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہوگا"۔ پھر اس نے بتایا کہ "صاحب دین حق" کے کلمہ کے "جمل" کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں اور اس کے مصداق صرف حضور والا ہی ہیں۔

خواجہ مولانا شیرازی ملحد نجومی مکہ معظمہ کے معززین کی طرف سے ایک رسالہ لے کر آیا جس میں درج تھا کہ حدیث صحیح کے بموجب دنیا کی مدت سات ہزار سال پوری ہوچکی ہے اور اب ظہور مہدی موعود کا وقت آگیا ہے۔ اسی خصوص میں خود اس نے بھی اپنا ایک رسالہ مرتب کرکے پیش کیا۔

ایسی ہی خرافات شیعوں نے بھی حضرت امیر المومنین حضرت علیؓ سے منسوب کر کے پیش کیں۔ بعض یہ رباعی پڑھ پڑھ کر سناتے تھے جو حکیم ناصر خسرو وغیرہ سے منسوب ہے۔

در نہصد و ہشتاد و نہ از حکم قضا	آیند کواکب از جوانب یکجا
در سال اسد ماہ اسد روز اسد	از پردہ بروں خرامد آں شیر خدا

یہ سب باتیں نبوت کے دعوے کا سبب بنیں اور اکبر نے صراحتاً و لفظاً نہیں مجملاً و معناً نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

شاہ منصور کی معزولی

اس زمانہ میں راجہ ٹوڈر مل کا عریضہ پہنچا کہ "میں نے اب تک بڑے تدبر و حسن سلوک سے معصوم خاں فرنخودی کو اپنے ساتھ لگائے رکھا ہے، لیکن خواجہ منصور دیوان اس سے اور ترسون محمد خاں سے بقایا کا بڑی سختی سے تقاضا کرتا رہتا ہے اور ان کو بہت ڈراتا دھمکاتا رہتا ہے۔ اس کے رویہ سے ان کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں۔ اس نازک وقت میں ایسی باتیں لشکر میں تفرقہ کا باعث ہو جاتی ہیں۔"

شاہ منصور کی سخت گیریوں کی اس سے پہلے بھی بارہا خبریں مل چکی تھیں اس لیے بادشاہ نے اس کو بے دخل کر کے مصلحتاً چند دن کے لیے اسے شاہ قلی خاں محرم کی نگرانی میں دے دیا اور اس کی جگہ آصف خاں ہروی کے بھائی وزیر خاں کو دیوان کل بنا دیا۔ اس کا مددگار قاضی علی بغدادی جیسے منحوس دل آزار چند قسم کے آدمی کو مقرر فرمایا کہ یہ دونوں مل کر معاملات کو سرانجام دیں۔ اس تدبر کے کیا کہنے!

بغیر کان کا آدمی

اسی زمانہ میں بادشاہ کے پاس ایک ایسے آدمی کو لایا گیا جس کے کان سرے سے تھے ہی نہیں اور نہ سماعت کے لیے کوئی سوراخ تھا، لیکن وہ جو کچھ کہا جائے بخوبی سن لیتا تھا اس کے کانوں کی جگہ بالکل صاف اور سپاٹ تھی۔

گنگ محل کا تجربہ

اسی سال بادشاہ کو ایک اور خبط ہوا کہ چند شیر خوار بچوں کو آبادی سے دور ایک مکان میں رکھا جائے تاکہ وہ کسی آواز کو سن نہ سکیں اور ان کی نگہداشت کے لیے تربیت یافتہ دایہ مقرر کی جائیں اور ان کو کوئی بات نہ سکھائی جائے تاکہ اس حدیث "کل مولود یولد علی الفطرۃ" (ہر پیدا ہونے والا اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے) کی تحقیق ہو جائے اور دیکھیں کہ یہ بچے کس دین اور مذہب کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے پہلے کون سا کلمہ ادا ہوتا ہے۔ اس عجیب و غریب تجربے کے لیے بیس شیر خوار نو مولود بچوں کو روپیہ پیسہ دے کر ان کے والدین سے جدا کیا گیا۔ ایک خالی ویران محل میں ان کو رکھا گیا۔ بادشاہ نے اس محل کا "گنگ محل" نام رکھا۔ تین چار سال بعد معلوم ہوا کہ وہ سب بچے گونگے ہو گئے ہیں۔ محل کی وجہ تسمیہ پوری اتری۔ اکثر معصوم بچے تو اسی گنگ محل سے آغوش لحد میں جا بسے:

مادرم خاک است و من طفل رضیع	میل طفلاں نیست بر مادر بدیع
زود باشد کارمیدہ ز اضطراب	در کنار مادر افتم مست خواب

اسی سال بادشاہ نے شاہزادہ دانیال کو اس کے استاد شیخ فیضی، شیخ جمال بختیار اور امراء کی ایک جمعیت کے ساتھ اجمیر روانہ کیا اور وہاں کے فقراء کے لیے پچیس ہزار روپیہ بھی بھیجا۔

معصوم خاں کا تبادلہ

راجہ ٹوڈرمل اور دوسرے تمام بادشاہی امراء نے اس سال حاجی پور میں برسات کا موسم گزارا اور معصوم خاں فرنخودی جو لشکر سے سخت ناراض ہو گیا تھا امراء سے اجازت لیئے بغیر جون پور چلا گیا۔ وہاں جاکر باغی بن بیٹھا۔ بادشاہ نے پیشرو خاں عرف مہتر سعادت داروغۂ فراش خانہ کے ہاتھ اس کی تسلی دلاسے کے لیے ایک عنایت آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے اودھ کا علاقہ دے کر جون پور پر ترسون محمد خاں کو مقرر کر دیا۔ معصوم خاں نے اس تبادلہ پر الٹی سیدھی باتیں کیں پھر اس خیال سے کہ اودھ ایک سرحدی علاقہ ہے جو اس کے لیے نسبتاً بہتر رہے گا وہاں چلا گیا اور جنگ و بغاوت کے منصوبے باندھتا رہا۔

مہتر سعادت نے دربار میں واپس آکر جون پور وغیرہ کے حالات بہ تفصیل گوش گزار کیے اور اس فتوی کا بھی تذکرہ کیا جو ملا محمد یزدی نے بادشاہ کے خلاف خروج و بغاوت کے متعلق دیا تھا۔ یہی سبب ملا محمد یزدی اور میر معز الملک کو دربار میں بلانے کا ہوا تھا جس کا قصہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

نیابت خاں کی بغاوت

اسی زمانہ میں ہاشم خاں نیشاپوری کے لڑکے نیابت خاں نے بغاوت کر دی جسے بادشاہ نے پٹنہ کے سفر کے وقت جوسی اور پیاک کی جاگیر عطا کی تھی۔ نیابت خاں نے کڑہ پر حملہ کر دیا۔ وہاں اس وقت اسماعیل قلی خاں کی جانب سے الیاس خاں نامی ایک پٹھان حاکم تھا۔ اس جنگ میں الیاس خاں مارا گیا اور نیابت خاں نے کڑہ کے قلعہ کا محاصرہ کر کے بڑی لوٹ مار مچائی۔ بادشاہ نے اس کے مقابلہ پر اسماعیل قلی خاں، وزیر خاں، مطلب خاں، شیخ جمال بختیار اور دوسرے امرا کو نامزد کیا اور مسخرے بیر بر کو معصوم خاں فرنخودی کو اطمینان و دلاسا دینے کے لیے روانہ کیا۔ وزیر خاں کے رخصت ہونے کے بعد خواجہ شاہ منصور کو قید سے رہائی دے کر دوبارہ دیوانی کے عہدہ پر مقرر کر دیا۔

جب نیابت خاں کو امرائے شاہی کی یلغار کا پتہ چلا تو وہ کڑہ کا محاصرہ چھوڑ کر قصبہ کو ہوتے ہوئے پٹنہ کی طرف چلا گیا۔ شاہی لشکر نے بھی دریا عبور کر کے اس کا تعاقب کیا۔ ان کو قریب دیکھ کر نیابت خاں بھی پلٹ پڑا اور اس نے ان تمام امیروں کے ساتھ تنہا ایسی سخت لڑائی لڑی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پے در پے حملوں سے اس نے بادشاہی فوج کو زیر و زبر کر دیا اور معرکۂ کارزار میں شیخ جمال کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا، لیکن اسے جلد ہی رہا بھی کر دیا۔ باوجود اس دلاوری کے اسے امراء نے شکست دے دی اور وہ اودھ میں معصوم خاں کے پاس چلا گیا۔ عرب بہادر بھی اسی موقع پر شہباز خاں کے مقابلہ میں شکست کھا کر اودھ چلا گیا تھا۔ شہباز خاں عرب بہادر کا تعاقب کرتے ہوئے جون پور اس کے بعد اودھ پہنچا۔

معصوم خاں کی بغاوت

اودھ میں معصوم خاں نے کافی ساز و سامان مہیا کر لیا تھا۔ اس کی تیاریاں اتنی تھیں کہ اگر کچھ مبالغہ سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت ایران و توران کے بادشاہوں سے بھی جنگ کر سکتا تھا۔ تیس چالیس جھنڈے نشان نقارے اور دوسرا سارا سامان جنگ پوری طرح تیار تھا۔ اس نے اپنی آراستہ و پیراستہ فوج کے ساتھ شہباز خاں پر حملہ کیا اور ایک ہی حملہ میں اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ شہباز خاں ایک دن میں چالیس کوس راستہ طے کر کے جون پور واپس چلا آیا۔ ترسون محمد خاں شہباز خاں کے میمنہ پر متعین تھا وہ لڑائی کے وقت ایک جنگل میں چھپا ہوا تھا۔ جب شہباز خاں میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور معصوم خاں کی فوج مال غنیمت لوٹنے میں منتشر ہو گئی اور میدان میں معصوم خاں کے ساتھ مختصر سی

جمعیت رہ گئی تو ترسون محمد خاں نے اچانک حملہ کر کے اس کو شکست دے دی۔ جب شہباز خاں کو یہ خبر ملی تو وہ الٹے پاؤں لوٹا اور دوسرے دن ترسون محمد خاں سے آ کر مل گیا پھر دونوں نے مل کر معصوم خاں پر حملہ کر دیا۔

اودھ کے قریب دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی اور معصوم خاں شکست کھا کر بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ گیا۔ اس کی ماں، بہن، بیوی، بچے اور سارا مال و اسباب شاہی لشکر کے ہاتھ آ گیا۔ معصوم خاں نے کوہ سوالک تک پلٹ کر نہیں دیکھا اور بادشاہی علاقہ سے نکل گیا۔ یہ واقعہ ۹۸۸ھ میں ہوا۔

ارغنوں باجے کی نمائش

ارغنوں باجا جو ایک عجیب و غریب چیز ہے، حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لے کر آیا تھا، انھی دنوں اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ باجا ایک قد آدم صندوق میں بنا ہوا ہے۔ ایک فرنگی اس میں بیٹھ کر اس کے تار چھیڑتا ہے، اس کے باہر ہور کے پانچ پر اور دوسرے تال سُر لگے ہوئے تھے جن کو دو اور آدمی انگلیوں سے بجاتے تھے۔ دیکھنے والے نہایت لطف اندوز ہو رہے تھے اور بجانے والے فرنگیوں کا چہرہ ہر لحظہ سرخ و سپید ہوتا جاتا تھا اور وہ خوب مست ہو ہو کر اسے بجاتے جاتے تھے۔ اس عجوبہ کو دیکھ کر اہل محفل حیران رہ گئے۔ اس کی تعریف و توصیف حد بیان سے باہر ہے۔

اکبر نے اس محفل میں لوگوں سے پوچھا "اچھا بتاؤ اس زمانہ میں سب سے عقل مند کون ہے؟ بادشاہوں کا نام نہ لیا جائے، کیوں کہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔" ہر شخص جس جس پر اعتقاد رکھتا تھا اس کا نام لینے لگا۔ حکیم ہمام نے کہا "میں تو اپنے آپ ہی کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہوں۔ شیخ ابو الفضل نے اپنے باپ کا نام لیا۔

اخلاص کے چار درجے

ان دنوں بادشاہ کے ساتھ اخلاص کے چار درجے قرار دیے گئے تھے۔ ترک مال، ترک جان، ترکِ ناموس، ترکِ دین جو شخص بھی ان چاروں مدارج کو طے کر لیتا اس کا چار گنا اعزاز ہوتا اور جو کسی ایک درجہ تک پہنچتا اس کا اعزاز اسی مناسبت سے متعین ہوتا، ویسے سب کے سب بادشاہ کے مرید سمجھے جاتے۔

مرزا محمد حکیم کا ہندوستان پر حملہ

سنہ ۹۸۹ھ میں خبر پہنچی کہ مرزا محمد حکیم نے معصوم خاں فرنخودی کے حسب طلب اپنے ماموں فریدوں خاں کے بہکانے سے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس کا ایک سردار شادمان نامی دریائے نیلاب (اٹک) کو عبور کر آیا لیکن مان سنگھ ولد بھگوان داس نے اس پر فوج کشی کی اور اسے قتل کرا دیا۔ جب میرزا کو یہ خبر ملی تو وہ دریا عبور کر کے سید پور کے نواح میں آ گیا۔

مرزا حکیم سے مقابلہ کے لیے بادشاہ نے فوج کو آٹھ ماہ کی تنخواہیں ادا کیں۔ شاہزادہ دانیال کو سلطان خواجہ صدر اور شیخ ابراہیم چشتی کے ساتھ اپنی نیابت کے لیے دارالخلافہ میں چھوڑا اور خود فتح پور سے پنجاب روانہ ہو گئے۔ فتح پور سے پندرہ کوس پر سرائے باد میں شہباز خاں کی فتح کی خبر پہنچی۔

مان سنگھ نے جب شادمان کے اسباب کی تلاشی لی تو اس کے جزدان سے میرزا محمد حکیم کے تین فرمان برآمد ہوئے جو اس نے حکیم الملک گیلانی، شاہ منصور دیوان اور محمد قاسم خاں میر بحر کے نام لکھے تھے۔ اس کے وہ فرمان بادشاہ کے پاس بھیج دیے۔ بادشاہ نے انھیں پڑھ لیا لیکن ان کا افشا نہ کیا۔

دہلی میں خبر ملی کہ میرزا لاہور پہنچ چکا ہے اور وہاں وہ مہدی قاسم خاں کے باغ میں ٹھہر گیا ہے اور لاہور کے قلعہ میں راجہ بھگوان داس مان سنگھ اور سعید خاں محصور ہو گئے ہیں۔

شاہ منصور کے خلاف سازش

پانی پت میں جب لشکر پہنچا تو میرزا محمد حکیم کا وزیر ملک ثانی کابلی جس کا خطاب وزیر خاں تھا اس سے ناراض ہو کر لشکر شاہی میں آگیا اور شاہ منصور کے پاس اس نے قیام کیا اور اس کے ذریعہ خدمت شاہی میں حاضر ہونا چاہا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی سابقہ ربط وضبط نہ تھا اس لیے اکبر کو خیال ہوا کہ یہ بھی مرزا کی کوئی چال ہے کہ اس کا وزیر اس نازک وقت میں ساتھ چھوڑ کر شاہ منصور کے پاس آکر ٹھہرا ہے۔ اس واقعہ سے شاہ منصور کے متعلق بادشاہ کی بدگمانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اسے قید کر کے فرامین جاری کر دیے گئے۔ اس نے بہت کچھ قسمیں کھائیں، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا کیوں کہ یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ معاملات میں قسم کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔

جب سواری شاہ آباد پہنچی تو قاضی علی کے بھائی ملک علی نے جو اب لاہور کا کوتوال ہے دو خط پیش کیے، ایک شاہ منصور کے نام تھا جسے شاہ منصور کے ملازم شرف بیگ نے لکھا تھا، دوسرا گمنام تھا۔ ان خطوط میں پہلے فریدوں خاں سے بعد میں میرزا سے ملاقات کا ذکر تھا اور یہ کہ میرزا نے پرگنہ کی معافی عطا کر دی ہے، پرگنہ کا نام شاید درج تھا یا نہیں تھا، دونوں خط ایک تھیلی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط سے قیاس کیا گیا کہ شاہ منصور کا ملازم شرف بیگ پرگنہ فیروز پور کا جو لاہور سے تیس کوس پر ہے شقدار تھا اس نے اپنے آقا کو اطلاع دی ہے کہ میں نے فریدوں خاں کے توسط سے میرزا سے ملاقات کی۔ میرزا نے ہر جگہ اپنے عاملوں کو مقرر کر دیا ہے لیکن ہمارے پرگنہ کو معافی دے دی ہے۔

ان خطوط سے بادشاہ کی بدگمانی یقین میں بدل گئی۔ اس موقع پر اکثر بلکہ تمام امیروں نے جو شاہ منصور کے ہاتھوں بڑی اذیتیں اٹھا چکے تھے اور اس کی تباہی کے دل وجان سے خواہاں تھے۔ اس کے قتل پر متفقہ طور سے اصرار کیا، چنانچہ بادشاہ نے دوسرے دن صبح خدمت رائے کو حکم دیا کہ اس کو کچھ کوٹ کی منزل میں گلا کاٹ کر سولی پر چڑھا دیا جائے۔ شاہ منصور نے خلق خدا پر جو ستم ڈھائے تھے وہ خالی نہیں گئے، مظلوموں کی فریاد اس کے گلے کا ہار بن کر رہی۔

خوش باش کہ ظالم نبرد رہ بہ سلامت

مرزا عبدالحکیم کا فرار

بادشاہی لشکر سرہند کے راستہ سے کلانور اور رہتاس پہنچا اور وہاں سے نیلاب پر جا کر ڈیرے ڈال دیے۔ میرزا کو یہ خبر ملی تو وہ لاہور کے دریا کو عبور کر کے فرار ہو گیا اور کابل تک اپنی باگ نہ کھینچی۔

اسی سال ماہ ربیع الثانی میں بادشاہ نے نیلاب کے کنارے جو سندھ ساگر کے نام سے مشہور ہے "کٹک بنارس" کی طرح ایک قلعہ "کٹک بنارس" تعمیر کرایا۔ وہاں سے شاہزادہ سلطان مراد کو قلیج خاں اور دوسرے امرا کے ساتھ کابل پر حملہ کے لیے روانہ کیا۔ ان کے آگے مان سنگھ کو سرداروں کی جمعیت کے ساتھ پشاور کی طرف بھیجا۔

انہی دنوں مرزا عبدالحکیم نے خواجہ ابوالفضل نقشبندی اور محمد علی دیوانہ کو اپنے قصور معاف کرانے کے لیے ایلچی بنا کر بھیجا بادشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ حاجی حبیب اللہ کو بھیج کر پیغام دیا کہ اسے معافی اس شرط پر مل سکتی ہے کہ اپنے کیے پر ندامت ظاہر کر کے آئندہ منحرف نہ ہونے کی قسم کھائے اور اپنی بہن کو جو خواجہ حسن کے نکاح میں ہے بارگاہ میں روانہ کر دے۔ میرزا نے حاجی سے

کہا کہ بہن کو بھیجنے کے لیے خواجہ حسن راضی نہیں ہے اور وہ اسے لے کر بدخشاں چلا گیا ہے البتہ میں اپنے قصوروں پر پشیمان ہوں ۔

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیمان شدہ ام

کافرم باز نگوئی کہ مسلمان شدہ ام

اکبر کا عزم کابل

۱۵ جمادی الثانی کو بادشاہ نے نیلاب کو عبور کیا۔ خواجہ نظام الدین احمد کو یلغار کرتے ہوئے شاہزادہ مراد کے پاس جلال آباد جانے کا حکم دیا اور امراء کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مشورہ سے مطلع کریں۔ انھوں نے جواب بھیجا کہ "حضور کا یلغار کرتے ہوئے یہاں آنا ہی مناسب ہے۔" نظام الدین احمد اور حاجی حبیب اللہ ایک ساتھ پشاور پہنچے اور اپنے اپنے پیغام خدمت میں پیش کیے۔

نظام الدین احمد نے کہا اگرچہ امراء کہنے کو تو کہہ رہے ہیں کہ اس مہم کے لیے ہم لوگ کافی ہیں لیکن درحقیقت وہ سب فتح کو حضور کی تشریف آوری پر ہی منحصر سمجھتے ہیں۔ اب بادشاہ نے بھی پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا اور لشکر میں شاہزادہ سلطان سلیم کو راجہ بھگونداس اور قاضی علی میر بخشی کے ساتھ چھوڑ کر خود اپنی جمعیت خاص کے ساتھ کوچ کیا اور روزانہ بیس بیس کوس کی مسافت طے کرتے ہوئے شاہزادہ مراد کے لشکر سے پندرہ کوس پر موضع سرخاب میں پہنچ گیا۔

مرزا عبدالحکیم کی شکست

مرزا محمد حکیم نے کابل سے سات کوس کے فاصلہ پر خورد کابل نامی موضع میں اپنے بھتیجے کے ساتھ شاہزادہ مراد کے لشکر پر حملہ کیا اور بڑی بہادری سے جنگ کی لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ خاں اوزبک کے پاس بھاگ جائے کہ شاہزادہ مراد کابل میں داخل ہو گیا۔

اس جنگ سے ایک دن پہلے فریدون خاں نے شاہزادہ کے چنداول پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔

جس وقت یہ لوٹ مار ہو رہی تھی، حاجی محمد نام ایک احدی بادشاہ کے پاس سے ڈاک چوکی کے سلسلہ میں وہاں پہنچا تھا اس نے یہ سارا حال دیکھا اور لوٹ کر سرخاب میں اس واقعہ کی بادشاہ کو خبر دی۔ اس خبر سے بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی۔ دوسرے دن جب وہاں سے کوچ ہونے لگا تھا کہ فتح کی خبر پہنچ گئی۔

کابل میں ورودِ شاہانہ

۱۰ رجب کو بادشاہ کی سواری کابل میں داخل ہوئی۔ بادشاہ نے اس شہر کے باغوں کی سیر و تفریح میں ایک ہفتہ بسر کیا۔ بادشاہ نے کابل میں مرزا محمد حکیم کے معتمد آدمیوں سے شاہ منصور کے موسومہ خطوط کے بارے میں بڑی تحقیق و تفتیش کی اور پتہ چلا کہ یہ سب اس کے خلاف ایک سازش تھی جو شہباز خاں کے بھائی کرم اللہ نے بعض امیروں کے ساتھ مل کر کی تھی اور وہ آخری خط بھی جو اس کے قتل کا سبب بنا امیروں کا بنایا ہوا تھا۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو بادشاہ کو شاہ منصور کے قتل پر بڑا رنج و افسوس ہوا۔ لیکن اب اس پشیمانی سے کیا حاصل ہوتا۔

بادشاہ نے میرزا کے پاس لطیف خواجہ میر شکار کو بھیج کر اس کو قصوروں کی معافی کی خوش خبری پہنچائی اور اسے اوزبکوں کی پناہ میں جانے سے منع کر دیا۔ مرزا حکیم نے اطاعت و وفاداری کا عہد و پیمان کیا اور علی محمد اسپ کے ساتھ وہ خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے کابل اس کے حوالے کر دیا اور وہاں لشکر کو متعین کر کے یلغار کرتے ہوئے جلال آباد واپس چلے گئے جہاں لشکر کا بڑا کیمپ تھا۔

اکبر کی واپسی

اسی موقع پر محمد قاسم خاں میر بحر کا بھائی خواجگی محمد حسین جو میرزا کا بڑا معتبر امیر تھا بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے جلال آباد سے کافروں کے علاقہ کوہ فتور پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج کو متعین کیا اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے بارہ شعبان کو سندساگر کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک ہی دن میں دریا کے پل پر سے سارے لشکر کو عبور کرا کے مسلسل کوچ کرتے ہوئے رمضان کی آخری تاریخ کو لاہور آ گئے۔ پنجاب کی حکومت دوبارہ سعید خاں راجہ بھگوانداس اور مان سنگھ کے سپرد کر دی اور دوآبہ پنجاب کے اماموں کے معاملات کی تحقیق و تصفیہ کے لیے ملا الہداد امروہہ، ملا الہداد سلطان پوری اور ملاشاہ محمد شاہ بادی، ملا شیری شاعر کو صدارت کے عہدہ پر مقرر کیا، ان میں سے پہلے اور چوتھے صدر نے نیکی اور عدل میں شہرت پائی، دوسرے اور تیسرے صدر اپنی بدنیتی کی وجہ سے بدنام ہوئے۔ ملاشاہ محمد نے تو شیخ اسحاق کاکول جیسے پاکباز متقی اور پرہیزگار عالم کو پروانہ میں یہ فقرہ لکھ بھیجا تھا۔ ”یَا قَوْمَنَا اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ“ دوآبہ ہند میں شیخ فیضی کو صدر مقرر کیا گیا، گنگاپار کے علاقہ پر حکیم ابوالفتح کو صدارت ملی اور دارالخلافہ کا صدر میر فتح اللہ کو مقرر کیا گیا۔

جب سواری پانی پت میں پہنچی تو اس منزل میں شہباز خاں جس نے بادشاہ کے غائبانہ میں کرہی سے لے کر پنجاب تک سارے ممالک محروسہ کو اپنے طور پر لوگوں کی جاگیروں میں تقسیم کر دیا تھا اور جس کو جی چاہے عہدے عطا کر دیے تھے، بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ جب بادشاہ نے اس خود اختیاری اور جرأت کے متعلق باز پرس کی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میں فوج کی اس قدر دلدہی نہ کرتا تو سب کے سب برگشتہ ہو جاتے، اب ملک تمہارا ہے، لشکر تمہارا ہے، جسے چاہو دے دو اور جس سے چاہو منصب اور جاگیر واپس لے لو

زہر کہ خواہی بستاں بہر کہ خواہی بدہ

۲۵ شوال کو بادشاہ سلامت دہلی تشریف لائے، چھوٹے شاہزادوں اور بیگموں نے بادشاہ کا استقبال کیا یہاں سے بادشاہ نے کوچ کیا اور ۵ ذی قعدہ کو دارالخلافہ پہنچ گئے۔

چند دن کیف و مستی میں

اس سفر میں میں ساتھ نہ جا سکا تھا، مجھے ایک بندۂ خدا سے ایسا تعلق خاطر ہو گیا کہ میں پورے ایک سال تک ایسا ور میں ہی رہا۔ اور مجھے اس دوران میں عجیب و غریب تجربے اور سخت مصائب برداشت کرنے پڑے۔ پورا سال بادشاہ سے جدا رہنے کے بعد میں فتح پور گیا اور اسی مہینہ کی چھ تاریخ کو بارگاہ میں حاضری دی۔ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا کہ یہ اس سفر میں کیوں ساتھ نہیں تھا؟ اس نے کہا ”یہ بھی تمام مفت خورے معاش داروں میں شامل ہے۔“ میری غیر حاضری کا قصہ بس اسی بات پر ختم ہو گیا۔

جب لشکر کابل کے قریب تھا تو بادشاہ نے صدر جہاں کو حکم دیا تھا کہ جو اہل علم ہمارے لشکر کے ساتھ ہیں اور جو ساتھ نہیں آئے ہیں سب کے ناموں کی فہرست پیش کرو۔ جب میرا نام آیا تو خواجہ نظام الدین[1] احمد مرحوم مصنف تاریخ نظامی نے جن سے میری دوستی

---

[1] خواجہ نظام الدین احمد، دور اکبری کے مشہور مورخ ہیں۔ ان کے والد خواجہ مقیم ہروی (ہرات) بابر بادشاہ کے دیوان تھے، ہمایوں کے عہد میں وزیر رہے اور مرزا عسکری کے ساتھ گجرات پر متعین رہے۔ اکبر نے خواجہ نظام الدین احمد کو گجرات اور جون پور میں بخشی گری کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ان کا سن ولادت ۹۵۶ھ ہے۔ آصف خاں کے ساتھ ایک مہم پر گئے ہوئے تھے کہ دریائے راوی کے کنارے تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر ۴۵ سال کی عمر میں ۲۳ صفر ۱۰۰۳ھ کو فوت ہوئے۔ ان کی مشہور تاریخ

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایک سال سے قائم تھی اور بڑا تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا، مجھے مریض لکھوا دیا اور فہرست پیش کرا دی۔ مرحوم خواجہ نظام الدین تمام احباب کے ساتھ عام طور سے دلسوزی اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ مجھ پر تو ان کی خاص مہربانی تھی۔ اس دوران میں انھوں نے مجھے پے در پے کئی خط بھی لکھے تھے اور تاکید کی تھی کہ چونکہ تم لشکر کے ساتھ آ نہیں سکے ہو اس لیے اب استقبال کے لیے کم از کم لاہور، دہلی یا متھرا جہاں تک بھی ہو سکے آنے کی کوشش کرو، کیونکہ یہ دنیاوی معاملات ہیں اور ان میں احتیاط برتنا ضروری ہے۔" اس بے چارے نے خیر خواہی سے یہ سب کچھ لکھا، لیکن میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ و ارفع معلوم ہو رہا تھا، مصلحت اور نفع نقصان کی کسے فکر تھی ؎

تو با خدائے خود انداز کار و خوش دل باش
کہ رحم اگر نہ کند مدعی خدا بکند

اس مستی و کیف کے عالم میں حالت خواب ہی میں کبھی کبھی میں شعر کہتا تھا۔ چنانچہ ایک رات نیند میں میں نے یہ شعر کہا تھا، اور بیدار ہونے کے بعد عرصہ تک اس کو یاد کر کے میں مضطرب و بے قرار رہا ؎

آئینہ ما روئے ترا عکس پذیر است
گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

رب العزت کی قسم کہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے تا دم تحریر سترہ سال بیت گئے ہیں ابھی تک اس ذوق و سرمستی کی لذت سے میرا دل سرشار ہے۔ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں زار زار رونے لگ جاتا ہوں، کاش کہ میں اسی عالم میں اس دنیا کے جھگڑوں سے پاک ہو جاتا ؎

خوش آنکہ دید روئے ترا و سپرد جاں
آگہ نہ شد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھے سررشتۂ معرفت ہاتھ آگیا تھا اور میرا دل ایسے فیض سے سرشار تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا رہوں اور شکر بجالاؤں تو بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

در گوش دلم بخواند یک زمزمۂ عشق — زاں زمزمہ ام ز پائی تا سر ہمہ عشق
حقا کہ بہ عہدہا نیایم بیروں — از عہدۂ حق گزاری یک دمہ عشق

ترہت میں بغاوت

بادشاہ جس زمانہ میں کابل کی طرف متوجہ تھے، ترہت کے علاقہ میں بہادر ولد سعید بدخشی نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ اپنا خطاب بہادر شاہ رکھا تھا اور اپنی مُہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) "طبقات اکبری" ہے جو ۹۷۶ھ سے شروع ہو کر اکبر کے ۳۸ جلوس تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اکبر کی لکھائی ہوئی تاریخ "تاریخ الفی" میں بھی وہ بدایونی، حکیم ہمایوں، شاہ فتح اللہ شیرازی، ملا احمد اور آصف خاں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ بدایونی "طبقات اکبری" کو ہی "تاریخ نظامی" کے نام سے لکھتا ہے۔

بہادر الدین سلطان است بن اسفید شہ سلطان
پدر سلطان و خود سلطان زہے سلطان بن سلطان

آخر کار وہ اعظم خاں کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

معصوم خاں کا قتل معصوم خاں فرنخودی کوہ سوالک میں حیران و پریشان گھومتا رہا۔ آخر اس نے اعظم خاں کو وسیلہ بنا کر اپنے قصوروں کی معافی کے لیے لکھا۔ بادشاہ نے اس کی دل جوئی کے لیے فرمان بھیج دیا اور وہ فتح پور میں آکر کورنش بجا لایا۔ چند دن بعد آدھی رات کے وقت وہ دربار سے اپنے گھر سنگھاسن پر سوار ہو کر جا رہا تھا کہ شہر کے دروازہ کے باہر ایک مسلح گروہ نے اس کو گھیر لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

نیابت خاں کا قتل جس دن معصوم ملازمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اسی دن نیابت خاں بھی بیگم بادشاہ کے توسط سے خدمت میں باریاب ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس کے چچا شہاب الدین احمد خاں حاکم مالوہ کی خاطر اس کی جان بخشی کر دی اور کچھ دن کے لیے قلعہ رنتھنبور میں بھیج دیا۔ وہ اسی قلعہ میں قید تھا۔ اسی قید کی حالت میں اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں جو ناقابل بیان ہیں۔ اس نے وہاں بھی دوسرے قیدیوں کو ہموار کر کے فتنہ و فساد مچانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے بادشاہ نے ۹۹۷ھ میں فرمان بھیج کر اس کا جھگڑا بھی ہمیشہ کے لیے چکا دیا۔

انہی دنوں بادشاہ کی سوتیلی والدہ حاجی بیگم جو بڑی نیک خدا رسیدہ اور فیاض خاتون تھی اور دہلی میں جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے روضہ کی مجاورت اختیار کر رکھی تھی فوت ہوگئیں۔ ان کے انتقال سے روضہ کے مجاوروں اور وہاں کے باشندوں کے معاملات میں بڑی خرابی اور انتشار پیدا ہو گیا۔

عیسائی راہبوں سے مناظرہ بادشاہ نے فرنگی راہبوں سے بحث و مناظرہ کے لیے شیخ قطب جلیسری کو جو نہایت بدمست مجذوب تھا شیخ جمال بختیار کے ذریعہ بلوایا اور اس مجلس میں اس عہد کے تقریباً تمام دانشوروں اور صاحب اجتہاد عالموں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ شیخ نے کہا خوب بھڑکتی ہوئی آگ جلائی جائے، اس آگ میں میں اور میرے مقابل حریف داخل ہوں گے، جو صحیح سلامت نکل آئے گا وہی حق پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ آگ جلائی گئی اور اس نے فرنگی راہب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "چلو، بسم اللہ" فرنگیوں کو اور کسی اور کو اس آگ میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ بادشاہ تو فرنگیوں کو ناکام ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مارے غیرت کے شیخ قطب کو چند دوسرے فقرا کے ساتھ بکر میں بھجوا دیا۔ یہ لوگ اپنے آخری وقت تک اسی جگہ رہے۔ اس طرح بہت سے فقرا کو مختلف مقامات پر جلاوطن کر دیا۔ اکثر کو تو قندھار بھیج کر ان کے عوض وہاں سے گھوڑے منگوا لیے۔

فقراء کی جلاوطنی اس زمانہ میں فقیروں کی ایک جماعت الٰہیوں کے نام سے مشہور تھی۔ یہ لوگ پیری مریدی کا سلسلہ چلائے ہوئے تھے اور طرح طرح کی بیہودہ اور گمراہ کن باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان فقیروں کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا بادشاہ نے ان سے کہا تم ان بے ہودہ عقائد سے توبہ کرو۔ انھوں نے مہمل باتیں کر کے توبہ کرنے سے پہلو تہی کی۔ ان فقیروں نے دین اسلام روزہ وغیرہ کے نئے نئے نام اختراع کر رکھے تھے۔ بادشاہ نے ان فقیروں کو بھی بکر اور قندھار بھیج کر ترکی نسل کے گھوڑے ان کے عوض

خرید کر منگوا لیے۔

شیخ ادھن کے پوتوں کو بھی جو جون پور کے بڑے مشائخ میں سے تھے اہل و عیال کے ساتھ دربار میں بلایا گیا اور ان کو اجمیر بھیج کر وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان میں سے دو تین افراد تو انتقال کر گئے اور اس خاندان کے دوسرے لوگ نہایت تنگدستی کے ساتھ گذر بسر کر رہے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین کے پوتے شیخ حسین جنھوں نے حسب دستور تعظیم و تسلیمات بجا لانے سے انکار کر دیا تھا اور اخراج کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ مکہ معظمہ کو چلے گئے تھے۔ انہی دنوں مکہ سے فتح پور کو واپس تشریف لائے۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے پہلے کی طرح کورنش ادا نہیں کی۔ بادشاہ نے ان کو بھی سرکش جان کر بکر میں بھجوا دیا۔ ۱۰۰۲ھ میں نظام الدین احمد، شیخ حسین اور شیخ کمال بیابانی وغیرہ کو بکر سے دربار میں بلایا گیا۔ ان لوگوں نے زمین بوس کی رسم ادا کر دی اس لیے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن کمال بیابانی کو قلعہ رنتھنبور میں بھیج دیا اور شیخ حسین کے لیے بکر ہی میں مدد معاش کا انتظام کرا کے اس جگہ متعین کر دیا۔

اعظم خاں کی بنگالہ سے آمد

۹ محرم ۹۹۰ھ کو اعظم خاں بنگالہ سے آکر حاضر ہوا۔ ایک رات دوران گفتگو بادشاہ نے اس سے کہا ہم مضبوط دلیلوں کی بنا پر عقیدۂ تناسخ کو حق سمجھتے ہیں، شیخ ابوالفضل تم کو بھی یہ مسئلہ بخوبی سمجھا دے گا، اعظم خاں نے یہ بات قبول کر لی، بادشاہ نے اسے ان امیروں کے ساتھ جو کابل کی مہم پر نہ جا سکے تھے معصوم کابلی کی سرکوبی کے لیے متعین کر دیا۔

جلوس کا اٹھائیسواں سال

اسی سال ۱۵۔ صفر کو نوروز واقع ہوا اور جلوس شاہی کا اٹھائیسواں سال شروع ہوا۔

جشن نوروز کے لیے دیوان خانۂ خاص اور عام کو بڑے ٹھاٹھ سے سجایا گیا، رنگ برنگے پردے لٹکائے گئے، طرح طرح کی قیمتی چیزیں سلیقہ سے رکھی گئیں، فرنگی پردے اور دیدہ زیب تصویریں آویزاں ہوئیں، اونچے اونچے سراپردے قائم کیے گئے۔ فتح پور اور آگرہ کے بازاروں میں بھی بڑی دھوم دھام سے آرائش کی گئی اور برابر اٹھارہ دن تک نوروز کا شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ جشن کی محفلوں میں بے شمار ہندی اور فارسی گویے موسیقار اور اہل طرب مرد اور عورتیں اپنے ہنر اور کمال دکھاتی تھیں اور ایوان میں ہر روز کوئی ایک بڑا امیر حاضر ہوتا اور بادشاہ کے لیے قیمتی نذرانہ اور تحائف پیش کر کے ہم نشینی کا اعزاز حاصل کرتا۔

دین الٰہی کا نفاذ

ہجرت پر ابھی پورے ہزار سال نہیں ہوئے تھے مگر بادشاہ نے اپنے طور پر یہ طے کر دیا کہ ہجرت سے نہ سہی حضور اکرمؐ کی بعثت سے تو پورے ہزار سال ہو چکے ہیں اور اب پیغمبر علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایک نئے دین کے آغاز کا اعلان کر دیں۔ اس وقت ایسے کسی دعویٰ اور اعلان کے لیے کوئی رکاوٹ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ سب سے بڑی رکاوٹ علما اور مشائخ کی تھی جن کے اثر و اقتدار کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ ان علما کو دربار سے خارج کیا جا چکا تھا، اسی لیے نہایت اطمینان و جسارت کے ساتھ اکبر نے اسلامی احکام کی منسوخی اور ایک نئے دین کے اصول و قواعد کے نفاذ کا فیصلہ کر کے اس سلسلہ میں پہلا حکم یہ صادر کیا کہ اب سے سکہ پر الفی تاریخ (ہزارواں سن) ثبت کیا جائے اور یہ ہزار سن بعثت، ہجرت سے نہیں بلکہ بعثت سے موسوم کیا جائے۔

دین الٰہی کی بدعتیں

اسی طرح دوسری اور بہت سی نئی نئی اختراعات مصلحت ملکی کے عنوان سے حکماً عمل میں لائی گئیں اور ایسی ایسی بدعتوں کے احکام دیئے گئے کہ انہیں دیکھ دیکھ کر عقل حیران وسر بہ گریبان ہو جاتی تھی ایک حکم تو یہ تھا کہ زمین بوس کے نام سے بادشاہوں کے لیے سجدہ کرنا جائز ولازم ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر شراب جسمانی صحت کی خاطر علاج کے طور پر پی لی جائے اور اس کے پینے سے خلل وفساد نہ پیدا ہو تو وہ جائز ہو گی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی اتنی پی لے کہ بدمستی کرنے اور شور وغوغا مچانے لگے تو اسے سزا دی جائے گی۔ حسب الحکم دربار کے دروازہ پر شراب فروش کی ایک دکان بھی قائم کی گئی جس کی منتظم دربان کی بیوی تھی۔ یہ عورت کسی شراب فروش کی بیٹی تھی، بادشاہ نے خود شراب کا نرخ مقرر کیا۔ اس دکان سے ہر شخص علاج کے نام سے منشی کے پاس اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام لکھوا کر شراب خرید سکتا تھا۔ لوگ فرضی نام لکھوا لکھوا کر شراب مول لے جاتے تھے ان کی تحقیق کرنے والا کون تھا؟ اس طرح شاہی سرپرستی میں نشہ بازوں اور متوالوں کے لیے باقاعدہ سرکاری دکان کھل گئی۔ لوگوں کا بیان ہے اس شراب میں سور کے گوشت کا عرق بھی شامل کیا جاتا تھا (واللہ اعلم) اس احتیاط وسختی کے باوجود لوگ پی پی کر وہاں شور وغوغا مچانے لگے اور ہر روز جھگڑا فساد ہونے لگا۔ سپاہی روزانہ بدمستوں کو پکڑ پکڑ کر سزائیں دیتے تھے، لیکن ان کی مستی اتارے نہیں اترتی تھی۔ بادشاہ سلامت اس دکان کو بند بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان ہنگاموں سے عاجز بھی تھے۔

شیطان پورہ

اس زمانہ میں پایہ تخت فتح پور میں سارے ملک سے کھنچ کھنچ کر بہت سی طوائفیں اور فاحشہ عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ان کی تعداد حساب وشمار سے باہر تھی۔ حکم شاہی سے ان عورتوں کو شہر سے باہر بسایا گیا اور ان کی بستی کا نام "شیطان پورہ" رکھا گیا اور وہاں بھی محافظ داروغہ اور منشی مقرر کیے گئے کہ جو شخص بھی ان عورتوں کے پاس جائے یا ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو وہ باضابطہ اپنا نام ونسب رجسٹر میں درج کرا دے۔ اس کارروائی کے بعد ہر شخص کو ان رنڈیوں کے ساتھ زنا کرنے کی اجازت رہتی تھی۔ اس دفتری اندراج کے بغیر کوئی شخص کسی عورت کو رات کے وقت اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ ان میں سے کنواری لڑکیوں کے ساتھ پہلی شب باشی کی اجازت صرف نامی گرامی امرا کو ہی حاصل تھی وہ بھی داروغہ باقاعدہ بادشاہ کو مطلع کر کے اور دربار سے اجازت حاصل کر کے اس امیر کو اس کا موقع دیتا تھا۔ بدمعاشوں نے یہاں بھی فرضی ناموں سے اپنا دھندا بے روک ٹوک شروع کر دیا لوگ بدمست ہو کر جھگڑے فساد کرنے لگے اور عورتوں کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ قصاص میں پکڑے بھی جاتے تھے اور سزا بھی پاتے تھے لیکن ان کی جگہ دوسرے بڑے فخر ومباہات کے ساتھ یہ جرائم کرنے کے لیے آ جاتے تھے۔

حسن بے پایان او چندان کہ عاشق می کشد
زمرۂ دیگر بہ عشق از غیب سر بر می کند

ان فاحشہ عورتوں میں سے جو مشہور اور نامی گرامی عورتیں تھیں ان کو بادشاہ نے پوشیدہ طور پر اپنے پاس بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے کس شخص نے ان کے کنوارپن کو توڑا تھا۔ ان عورتوں نے جن امرا کے نام لیے ان کو سخت سزائیں دیں اور کافی عرصہ تک قید میں بھیج دیا۔ انہی میں سے ایک نے راجہ بیربر کا بھی جو "مراتب چہارگانہ" میں سب کا پیشرو اور مخلص مرید تھا نام لیا یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنی بیٹیوں تک کو نہیں چھوڑا ہے، وہ اس زمانہ میں اپنی جاگیر کورہ میں گیا ہوا تھا، جب افشائے راز کی

یہ خبر اس کو ملی تو اس نے جوگی بن جانے کا فیصلہ کر لیا، پھر بادشاہ نے عنایت آمیز فرمان لکھ کر اس کو دربار میں بلا لیا۔

گاؤکشی کی ممانعت

بادشاہ کو بچپن ہی سے رند مشرب ہندوؤں سے تعلق خاطر اور وابستگی تھی۔ انہی کی صحبت میں گائے کی تعظیم اس کے ذہن نشین ہوگئی تھی، اس لیے گائے کے ذبیحہ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کی بہت سی لڑکیاں حرم شاہی میں تھیں، وہ بادشاہ کے مزاج پر بہت حاوی تھیں۔ ان کے پاس خاطر سے اکبر گائے کا گوشت، لہسن اور پیاز کھانے اور داڑھی رکھنے سے احتراز کرتا تھا اور اپنی مجلس میں ہندوؤں کی رسومات کی پابندی کیا کرتا تھا۔ غرض ان ہندو عورتوں اور ان کے خاندان والوں کی دل جوئی کی خاطر اکبر نے ان تمام باتوں کو ترک کر دیا جن سے ہندوؤں کو کراہیت ہوتی تھی۔

داڑھی ترشوانے کا جواز

جو لوگ داڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا اس وجہ سے داڑھی منڈوانے کا عام رواج ہوگیا۔ داڑھی منڈانے کے متعلق بڑی عجیب و غریب دلیلیں پیدا کی گئیں کہ داڑھی کا تعلق اصل میں مرد کے خصیوں سے ہے۔ چنانچہ خواجہ سراؤں کی داڑھی نہیں ہوتی کیوں کہ ان کے خصیے ناکارہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے رکھنے یا نہ رکھنے میں ثواب و عذاب کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ پچھلے زمانہ میں ملامتی فرقہ کے عبادت گزار لوگ داڑھی رکھنے کو ایک طرح کی ریاضت سمجھ کر رکھا کرتے تھے، ان کی دیکھا دیکھی داڑھی رکھنے کا رواج ہوگیا۔ اب اس زمانہ میں ریاضت اور ملامت داڑھی رکھنے میں نہیں بلکہ منڈوانے میں ہے، کیوں کہ اب اگر داڑھی منڈوائی جائے تو نادان فقیہہ اور عالم ناراض ہوں گے اور ملامت کریں گے۔ شاہی مفتی بھی اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دور کی کوڑی لائے اور فقہ کی کتابوں میں سے ایک مجہول سی روایت نکال لائے، جس میں یہ فقرہ تھا "کما یفعلہ بعض القضاۃ" (جیسا کہ بعض قاضیوں نے کیا) اس فقرہ میں ان بے دین مفتیوں نے تحریف سے کام لیا۔ اصل لفظ "عصات" تھا اس کو "قضات" سے بدل دیا۔ اب بجائے گناہ گاروں کے اس کا مطلب نکلا کہ جس طرح عراق کے بعض قاضیوں کا عمل داڑھی منڈانا تھا۔

زمانہ کی نیرنگی دیکھو کہ جب میں نیا نیا دربار شاہی میں گیا تھا تو اس وقت اتفاق سے میری داڑھی حد شرعی سے کسی قدر کم تھی جب حکیم ابوالفتح نے مجھے دیکھا تو میر ابوالغیث بخاری مرحوم کے سامنے لعنت ملامت کرنے لگا کہ تم جیسے آدمیوں کو داڑھی گھٹانا زیب نہیں دیتا۔ میں نے جواب دیا "کہ یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں"۔ اس نے کہا "آیندہ ہرگز ایسا نہ کرنا یہ بات نہایت بدنما اور نازیبا ہے"۔ دن ایسے پھرے کہ اس ابوالفتح نے حیدری جولقی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ اپنے رخساروں کا بالکل ہی صفایا کرا دیا، اور نوعمر چھوکروں کی طرح چھیل چھبیلا بن موتراشی کی تائید میں بڑھ چڑھ کر موشگافیاں کرنے لگا۔

تثلیث پرستی

ہندوؤں کی ان رسومات کے علاوہ دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی اور ان کے تین خداؤں کی تصویروں کی زیارت بھی کی جانے لگی۔ طرح طرح کے لہو و لعب شروع ہوگئے۔ اس زمانہ کی تاریخ نکالی گئی

"کفر شائع شد"

دین الٰہی کے اقرار نامے

دس بارہ سال کے اندر اندر یہ صورت ہوگئی کہ اکثر گمراہ جیسے مرزا جانی حاکم ٹھٹھ اور دوسرے مرتد امراء نے اپنے ہاتھ سے اس مضمون کے اقرار نامے لکھے کہ "میں فلاں ابن فلاں

اپنی خوشی اور مرضی سے مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے جسے میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا چلا آیا ہوں، انکار کرتا ہوں اور اب میں دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہو گیا ہوں اور اخلاص کے مراتب چہارگانہ یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں۔" یہ اقرار نامے اس نئے دین کے مجتہدین کو سپرد کر دیے جاتے تھے اور بادشاہ اقرار کرنے والوں کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا کرتا تھا۔

کتے اور سور کی پاکی

احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دے دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ناپاک جانوروں کو محل شاہی کے نیچے رکھا گیا۔ بادشاہ ہر صبح ان کے دیدار کو عبادت سمجھتا تھا، کیوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ سور ان دس مظاہر میں سے ایک مظہر ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہے۔ کتے کے متعلق بعض عارفوں کا یہ قول سند تھا کہ کتے میں ایسی دس عمدہ صفات ہیں اگر ان میں سے ایک صفت کسی آدمی کو مل جائے تو وہ ولی بن جائے۔ دربار کے بعض مقرب اور ملک الشعراء فیضی تو اپنے دستر پر چند کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھا کرتا تھا اور عراق و ہندوستان کے بعض مردود شاعر اس کی پیروی کرتے تھے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ کتوں کی زبان اپنے منہ میں لے کر پیار کرتے تھے۔

غسل جنابت کی تحریم

نئے دین کی شریعت میں ناپاکی کے غسل کی فرضیت بھی کلی طور پر منسوخ کر دی گئی۔ دلیل یہ لائی گئی کہ انسان کی اصل منی کے نطفہ سے ہے جو نیک اور پاک لوگوں کی آفرینش کا سبب ہے۔ اس صورت میں یہ عجیب بات ہے کہ پیشاب اور پاخانے کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہوتا اور اس پاکیزہ لطیف مادہ کا اخراج غسل کو واجب کر دیتا ہے، بلکہ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غسل کریں بعد میں جماع۔

آش حیات

ایک اور بات پیدا کی گئی کہ موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانا نہایت لغو ہے۔ مردہ جمادات میں شامل ہو جاتا ہے اس کو کس طرح ثواب پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بجائے روز ولادت کو جشن کر کے کھانا پکوانا چاہیے۔ اکبر نے ولادت کے کھانے کا نام "آش حیات" رکھا۔

شیر اور جنگلی سور کا گوشت اس بنا پر حلال کر دیا کہ اس سے آدمی میں بہادری کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

چچا، ماموں، قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کر دیا گیا، کیوں کہ ان لڑکیوں کی طرف مرد کی خواہش کمزور رہتی ہے۔

نکاح کے لیے عمر مقرر کی گئی کہ مرد کے لیے سولہ سال کی عمر سے اور عورتوں کے لیے چودہ سال کی عمر سے پہلے نکاح روا نہیں، کیوں کہ چھوٹی عمر کی اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔

سونے اور ریشم کا جواز

سونا اور ریشم پہننا فرض عین قرار دیا گیا۔ ایک دن میں نے مفتی ممالک محروسہ کو خالص ریشم کا لباس پہنے ہوئے دیکھا، میں نے پوچھا ریشم پہننے کے لیے کوئی روایت نکل آئی کیا؟ اس نے کہا ہاں جس شہر میں ریشمی لباس عام ہو جائے وہاں ریشم پہننا جائز ہے۔" میں نے کہا بظاہر تو یہی روایت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ نے اس کا حکم دے رکھا ہے۔ اس نے کہا، نہیں اس کے علاوہ بھی روایت موجود ہے، واللہ اعلم!

نماز روزہ اور حج وغیرہ اس سے پہلے ہی متروک ہو چکا تھا، بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے ان عبادتوں کی مذمت اور تمسخر میں کئی ایک رسالے بڑے دلائل کے ساتھ لکھے بادشاہ کو یہ رسالے بہت پسند آئے، اور اس پر بڑی نوازش فرمائی۔

سن الٰہی کا اجراء عربی کے سن ہجری کو اکبر نے موقوف کرادیا اور اس کی جگہ تاریخ کو اپنے جلوس کے سن سے شروع کرایا جو ۹۶۳ھ میں ہوا تھا۔ مہینوں کا تعین عجمی بادشاہوں کے طریقہ پر کیا گیا جو نصابی کتابوں میں درج ہے۔

زردشتیوں کے مذہب کی طرح سال میں چودہ عیدیں مقرر کی گئیں۔ مسلمانوں کی عیدوں کی رونق جاتی رہی البتہ جمعہ کا التزام باقی رہا وہ صرف اس خیال سے کہ جمعہ کا خطبہ بادشاہ کے نام سے پڑھا جاتا تھا اور اس میں بھی بس بوڑھے لوگ ہی شریک ہوا کرتے تھے۔

نئی تقویم میں سال اور مہینوں کو سن الٰہی اور ماہ الٰہی کہا جانے لگا۔ تنکہ اور مُہر پر تاریخ الف ثبت کرائی گئی، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک ہزار سال پر دین محمدی کی مدت ختم ہو چکی ہے۔

عربی زبان کی مخالفت عربی پڑھنا عیب ہو گیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے، نجوم، حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانہ کی تحصیل فرض ہو گئی۔ عربی کے خاص حروف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو اہدی کہا اور لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ہوتا تھا۔

شاہنامہ کے دو شعر جیسے فردوسی طوسی نے شاہنامہ میں نقل کیے ہیں بادشاہ سلامت کو بہت پسند تھے اور ان کو وہ سند بنائے ہوئے تھے۔ شعر یہ ہیں:

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسیدہ است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو باد بر چرخ گردوں تفو

بادشاہ کو اساتذہ کا جو شعر بھی اپنے مسلک کے مطابق مل جاتا وہ اسے سند بنا لیتا تھا۔

مسائل دینی کا تمسخر غرض اکبر نے دین کے ہر مسئلہ اور ہر عقیدہ میں جیسے نبوت، کلام، رویت، تکلیف، تکوین، حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے طرح طرح کے شبہات وارد کیے اور ہر ایک کا تمسخر و استہزا کیا اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تھا تو اس کو جواب دینے سے روک دیا جاتا تھا اور کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مناظرہ میں عموماً ثابت کرنے والے کے مقابلہ میں انکار کرنے والے کا پلہ ہی بھاری رہتا ہے خصوصاً جب کہ مقابل کو کسی بات کے جبراً منوانے کے بھی پورے اختیارات حاصل ہوں، بحث میں تو دونوں فریقوں کے مساوی ہونے کی شرط لازمی ہے اور یہاں ذرہ و آفتاب کا معاملہ کون کس سے بحث کرتا اور بحث کا کس کو یارا تھا۔ چنانچہ اس مباحثہ کی قربان گاہ پر کتنے ہی خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ تو مباحثہ نہیں بلکہ "مکابرہ" ہوتا تھا جس میں دین فروش علما خوشامد کے لیے طرح طرح کے متروکات و مشتبہات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بطور تحفہ پیش کرتے تھے، جیسا کہ لطیف خواجہ نے جو ماوراء النہر کے بزرگ زادوں میں سے تھا شمائل ترمذی کی اس حدیث "کانّ جیدہ دمیۃ" (حضور کی گردن تصویر کی گردن کی طرح تھی) کے بارے میں کلام کیا کہ رسول اللہ کی گردن کو بت سے تشبیہ دینا کہاں درست ہے۔ اسی طرح "ناقہ قصوی" کی حدیث کے بارے میں جو سیرت کی کتابوں میں مشہور ہے اور ہجرت کے آغاز میں قریش کے قافلہ کو لوٹ لینے کے متعلق، حضور کے چودہ نکاح کرنے اور آپ کی رحلت کے بعد دوسروں پر آپ کی بیبیوں کے حرام ہونے کے

سلسلہ میں بھی بڑے اعتراض اٹھائے گئے اور اس طرح کی لایعنی بحثیں نکالی گئیں، جن کی تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

مجلس چہل گانہ

بادشاہ نے اپنی شبانہ محفلوں میں چالیس مقربوں کو شرکت کے لیے مخصوص کر دیا۔ ان چالیس عقلمندوں کی محفل میں جس کی سمجھ میں جو بات آتی پیش کرتا اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ اگر کوئی کسی علمی (مراد دینی) مسئلہ کے متعلق سوال اٹھاتا تو اس سے کہا جاتا کہ ایسی باتیں ملاؤں سے پوچھی جائیں اور جو مسائل عقل و حکمت پر مبنی ہوں وہ ہمارے سامنے لائے جائیں۔ ان محفلوں میں جب سیرت کی کتابیں پڑھی جاتیں تو یہ لوگ ایسی ایسی بے ادبانہ باتیں کرتے، خاص طور سے خلفائے ثلاثہ کی خلافت قضیۂ فدک اور جنگ صفین کے سلسلہ میں ان کی زبانیں اس بے باکی سے چلتی تھیں کہ انھیں بیان کرنے سے بھی غیرت آتی ہے۔ خدا ایسی باتیں کسی کو نہ سنوائے۔

شیعوں کو بڑا غلبہ اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور سنی عاجز و مغلوب ہو گئے تھے۔ جتنے خدا کے نیک بندے تھے وہ خوف زدہ رہنے لگے تھے اور شر پسند عناصر کے لیے میدان بالکل صاف ہو گیا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا حکم، ایک نہ ایک نئی ممانعت نکلتی طرح طرح کے اشکال و اوہام سامنے لائے جاتے۔ بادشاہ اور اس کے حواری اپنے معتقدات و نظریات کے حق ہونے کے لیے کوئی دلیل اور ثبوت تو کیا لاتے صرف دوسروں کی نفی اور تردید کرتے اور اپنی بات منوانے کی فکر میں رہتے تھے۔ بے دینوں کی بن آئی تھی۔ اچھے لوگ مردود ہو گئے تھے اور مردود مقبول بن گئے تھے۔ جو نزدیک تھے انھیں دھتکار دیا گیا تھا اور جو دور تھے ان کو قریب کر لیا گیا تھا۔

دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر سارے ملک میں بڑا شور و غوغا مچا اور بادشاہ کی ان حرکتوں پر لوگ اللہ اکبر کہہ کر کان پکڑنے لگے۔ اس صورت حال کو ملا شیری کے اس قطعہ میں کس عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس نے یہ قطعہ اسی پُر آشوب زمانہ میں کہا تھا:

تا بزاید ہر زماں کشور بر اندازآفتی — فتنہ در کوئے حوادث کہ خدا خواہد شدن
باعقاب قرض خواہ تیغ در ارباب شرک — بار سر از ذمۂ گردن ادا خواہد شدن
فیلسوف کذب را خواہد گریباں پارہ شد — خرقہ پوش زہد را تقویٰ ردا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی — کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ مے آید مرا زیں بیت بس کہ ظرفگی — نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن

بادشہ امسال دعوئ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالی خدا خواہد شدن

جشن نوروز کی محفلیں

جشن نوروز کے موقع پر اکثر علماء و صلحا بلکہ قاضی اور مفتی تک جام و مے سے شغل کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے

عشقت خبر ز عالم بے ہوشی آورد
اہل صلاح را بہ قدح نوشی آورد
یاد تو اے نگار چہ معجون حکمت است
کز ہر چہ خواندہ ایم فراموشی آورد

نئے دین الٰہی کے مجتہد، خاص طور سے ملک الشعراء فیضی تو یہ کہہ کر پیتے کہ "ہم یہ پیالہ فقیہوں اور عالموں کے اندھے پن کے نام پر پیتے ہیں۔"

نوروز کے آخری دن کا نام جو برج حمل کے انیسویں درجہ میں ہوتا تھا "شرف الشرف" رکھا گیا تھا۔ اس روز تمام دنوں سے بڑھ چڑھ کر جشن کا اہتمام ہوتا اور کورنش و تعظیم کے مراسم ادا کیے جاتے۔ امراء کے منصب و جاگیر میں اضافے ہوتے حسب مدارج گھوڑے اور خلعتیں عطا ہوتیں، شاندار ضیافتیں ہوتیں، نذرانے اور تحفے گزرانے جاتے۔

اسی نوروز کے موقع پر بنگالہ سے شاہم خاں جلائیر اور لاہور سے راجا بھگوان داس حاضر بارگاہ ہوئے۔ اعظم خاں اور دوسرے تمام امرا حاجی پور سے دارالخلافہ میں پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بہار میں باغیوں نے شورش برپا کر دی تھی۔ معصوم خاں کابلی کے ایک ملازم خبیثہ بہادر نے ترخان دیوانہ، سرخ بدخشی کو ہمراہ لے کر بادشاہی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ محمد صادق خاں نے محب علی خاں کے ہمراہ اس سے مقابلہ کیا اور باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس جنگ میں خبیثہ بھی مارا گیا۔

اسی سال گلبدن بیگم اور سلیمہ سلطان بیگم حج سے لوٹ کر آئیں۔ ان کے استقبال کے لیے شاہزادہ سلطان سلیم اجمیر تک گیا اور خواجہ صاحب کے روضہ کی زیارت کی، لیکن پہلے کی طرح نذر نیاز کچھ نہیں ہوئی۔

انہی دنوں بہار سے محمد صادق خاں بھی حاضر بارگاہ ہوا۔ بادشاہ نے بہت جلد اسے اعظم خاں کے ہمراہ معصوم کابلی کی سرکوبی کے لیے مامور کر کے رخصت کر دیا۔ صادق خاں کی کمک کے لیے شاہ قلی خاں محرم، شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کو جو کابل کی مہم پر نہیں جا سکے تھے، متعین کیا گیا۔

نقش قدم کا استقبال

اسی دوران میں شاہ ابوتراب اور اعتماد خاں جو حجاز کے سفر پر گئے ہوئے تھے واپس آئے اور اپنے ساتھ ایک بہت بڑا بھاری پتھر لے کر آئے۔

اس پتھر پر ایک نقش قدم بنا ہوا تھا۔ شاہ ابوتراب کا کہنا تھا کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش ہے ؎

بر لوح سر تربت خود نقش تو کندیم
تا روز قیامت سر ما و قدم تست

بادشاہ بھی اس کے استقبال کے لیے چار کوس تک تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ امراء باری باری سے پتھر کو اٹھا کر چند قدم تک لے جائیں۔ اس اعزاز کے ساتھ اس متبرک پتھر کو شہر میں پہنچایا گیا۔

مخدوم الملک کا انتقال

۱۹ ماہ شعبان کو بڑے شاہزادہ کی سالگرہ منائی گئی اور شہزادہ کا وزن کیا گیا۔ اسی سال یا آئندہ سال شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک[1] جنھیں ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ مرزا محمد حکیم اور دوسرے امراء کی بغاوتوں کی خبر سن کر مکہ سے گجرات واپس آ گئے تھے اور اپنی سابقہ شان و شوکت کی آرزو میں وقت گزاری کر رہے تھے۔ سنہ ۹۹۰ھ میں مخدوم الملک کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ اس کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے فتح پور سے قاضی علی کو مقرر کیا گیا۔ اس نے لاہور آ کر چھان بین کی تو مخدوم الملک کے اتنے خزانے اور دفینے برآمد ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ مخدوم الملک کے

[1] ملا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک کے حالات اسلیم شاہ کے عہد میں لکھے جا چکے ہیں (دیکھیں متعلقہ حاشیہ)

خاندانی قبرستان سے بھی سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے کئی ایک صندوق نکلے جو اس نے میت بناکر دفن کرا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو مال لوگوں کے پاس رکھا دیا تھا اس کی مقدار تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سونے کی ساری اینٹیں اور اس کی تمام کتابیں خزانہ عامرہ میں داخل کر لی گئیں۔ اس کی اولاد مصیبتوں میں گرفتار ہو کر روٹی روٹی کو محتاج ہو گئی۔

شیخ عبدالنبی کا عبرت ناک انجام

شیخ عبدالنبیؒ[1] بہرحال فتح پور پہنچ گیا اور اکبر کے رُو در رُو اس نے سخت باتیں کیں اور اسے خوب بُرا بھلا کہا۔ اکبر کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے شیخ عبدالنبی کے منہ پر پوری قوت سے ایک گھونسہ مارا۔ اس نے چلا کر کہا ایک ہی بار چھری مار کر میرا کام کیوں نہیں تمام کر دیتے؟ اکبر نے اس کو راجہ ٹوڈرمل کے حوالہ کر دیا کہ اس سے ستر ہزار روپیہ کا حساب لیا جائے جو مکہ معظمہ جاتے وقت دیا گیا تھا۔ کروڑیوں نے اس کو کچہری کی حوالات میں طویل عرصہ تک مقید رکھا۔ آخر ایک رات گلا گھونٹ کر اس کو زندگی کی قید سے رہائی دے دی گئی۔ عبرت کی بات ہے کہ شیخ عبدالنبی جیسا مقتدر آدمی اس کا یہ حشر ہوا کہ قتل کے دوسرے دن مناروں والے میدان میں اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ یہ واقعہ سنہ ۹۹۲ھ میں رونما ہوا۔ اس کی تاریخ "شیخ کنبی" نکالی گئی۔

گرچہ الشیخ کالنبی گفتند
کالنبی نیست شیخ ما کنبی است

اسی سال شیخ جلالؒ[2] تھانیسریؒ کا بھی وصال ہوا۔ ان کی تاریخ "شیخ الاولیا" نکالی گئی۔

اسی سال آصف خاں[3] میر بخشی ثانی جس کا اصل نام میرزا غیاث الدین علی تھا فوت ہو گیا۔ اس کی تاریخ وفات "خدایا ورش باد"

---

[1] شیخ عبدالنبی، پورا نام شیخ عبدالنبی ولد شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس اصل وطن اندری علاقہ گنگوہ۔ شیخ کا تعلق ایک مشہور مشائخ خاندان سے تھا۔ مکہ اور مدینہ جاکر علم حدیث کی تحصیل کی تھی۔ واپس آکر تصوف کے مسلک کو ترک کر دیا اور علوم دین کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ سنہ ۹۷۲ھ میں جبکہ مظفر خاں وزیر کل تھا۔ شیخ دربار میں آئے اور مظفر خاں کی سفارش پر صدرالصدور بنائے گئے۔ شیخ عبدالنبی کو دراصل ملا مخدوم الملک کا اثر گھٹانے کے لیے یہ اعزاز و ترقی عطا کی گئی تھی۔ اکبر ابتدا میں شیخ کا نہایت معتقد تھا ان کے گھر پر حاضری دیتا تھا، ان کی جوتیاں تک اس نے سیدھی کیں۔ شیخ کے اقتدار کا بدایونی نے جستہ جستہ وضاحت سے تذکرہ کیا ہے۔ سنہ ۹۸۵ھ تک فیضی اور ابوالفضل بھی دربار میں آچکے تھے۔ ان دونوں نے اکبر کو اس طرح قابو میں کیا کہ وہ الحاد و بے دینی کی طرف مائل ہو گیا۔ اور علما کی قدر دل سے جاتی رہی۔ شیخ کے زوال اور عبرت ناک انجام کا باعث یہی دو بھائی تھے۔ معتمد خاں نے اقبال نامہ میں صاف صاف لکھا ہے کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے اشارہ سے شیخ کو مروا ڈالا۔ ان کی تاریخ وفات کا جو شعر درج ہے اس کے دوسرے مصرع میں "کنبی" کا لفظ "کنب" سے لیا گیا ہے جس کے معنے بھنگ کے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمارا شیخ بھنگ نوش ہے۔ بچارے کو مرنے کے بعد بھی لوگوں نے نہیں بخشا اور طنز و طعن سے نہیں چوکے۔ شیخ عبدالنبی کی ایک تصنیف "وظائف النبی" کے نام سے تھی جس کا قلمی نسخہ دارالمصنفین (اعظم گڈھ) میں موجود ہے۔ انکار سماع پر بھی ایک رسالہ انھوں نے لکھا تھا۔

[2] شیخ جلال الدین تھانیسری کابلی شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ ماں باپ کی طرف سے فاروقی ہیں۔ ان کا وطن اصلی بلخ ہے۔ والد کا نام شیخ محمود تھا۔ شیخ جلال نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ ۱۷ سال میں علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے اور درس اور فتویٰ دیتے تھے۔ جب شیخ عبدالقدوس کے مرید ہوئے تو باطنی کمالات حاصل کیے۔ ان کے مکتوبات بھی ملتے ہیں جو انھوں نے شیخ عبدالقدوس کے مکاتیب کے جواب میں لکھے ہیں۔ بدایونی نے ان کی وفات سنہ ۹۹۰ھ کے حالات میں بیان کی ہے۔ ایک روایت کے بموجب ۱۴ ذی الحج سنہ ۹۸۹ھ کو بچانوے سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مزار تھانیسر میں ہے۔ دوسری تاریخ اس مصرع سے بھی نکلتی ہے "دگر ہست مہتاب عزت جلال"۔

[3] آصف خاں کا حال جون پور میں خان زماں کی بغاوت کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ پہلے تو اس نے خان زماں سے جنگ کر کے مجنوں خاں قاقشال کو اس کی قید سے چھڑا لیا تھا بعد میں خود بھی باغی ہو گیا اور جونا گڈھ میں شورش برپا کر دی۔ جب حسین خاں نے حسب الحکم شاہی اس پر حملہ کیا تو وہ خان زماں کے پاس (باقی اگلے صفحہ پر)

سے نکلتی ہے۔ اس کا قائم مقام اس کا بھتیجہ میرزا جعفر ہوا جسے بعد میں آصف خاں کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

حاجی ابراہیم سرہندی کا قتل

حاجی ابراہیم سرہندی کو پہلے ہی معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بادشاہ کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ اس نے کافی مال متاع جمع کر لیا ہے اور اس کے حرم میں بھی بہت سی عورتیں جمع ہیں اور وہ سرکش ہو کر دکھن کی طرف فرار ہو جانے کی فکر میں ہے۔ اسے گرفتار کر کے اسی سال بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اکبر نے کچھ عرصہ تک اسے عین الملک کی نگرانی میں دے دیا تھا بعد میں قلعہ رنتھنبور بھیج کر قتل کرا دیا گیا۔

برہان قاطع کا اعلان

اسی سال شیخ مبارک نے خلوت شاہی میں اکبر کے سامنے بیر بر سے یہ کہا کہ "جس طرح تمہاری مذہبی کتابوں میں تحریفیں ہوئی ہیں ہمارے دین میں بھی بہت سی تحریفات ہو چکی ہیں، اور اب وہ قابل اعتبار نہیں رہا ہے۔

آخرت فروش گمراہوں نے اسی سال اکبر کو یہ سمجھایا تھا کہ ہجرت پر ہزار سال ختم ہو چکے ہیں، آپ بھی شاہ اسماعیل اول کی طرح "برہان قاطع" (دین الٰہی کے اجراء) کا اعلان فرما دیجیے۔ دربار میں مشورہ کے بعد طے پایا کہ اس مقصد کو بتدریج پورا کیا جائے اور بغیر کسی سختی کے اپنے دلی ارادوں کو ظاہر کیا جائے۔ بادشاہ ان دنوں حکیم ناصر خسرو کی یہ رباعی بہت پڑھا کرتا تھا۔

در نہ صد و تسعین دو قرآن می بینم	وز مہدی و دجال نشان می بینم !
یا ملک بدل گردد یا گردد دین	سرے کہ نہاں است عیاں می بینم

جس وقت ایک نئے دین کے اجراء کے متعلق دربار میں مشورے ہو رہے تھے اور اکبر پوری شدت سے اس کو جاری کرنے کا خیال ظاہر کر رہا تھا، راجہ بھگونت داس نے کہا "چلیے ہم یہ قبول کیے لیتے ہیں کہ ہندو بھی بُرے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن بھلا یہ تو بتایئے کہ ان دونوں سے بہتر اور اعلیٰ کون سا فرقہ اور گروہ ہے جس میں ہم شامل ہو جائیں"۔ بھگونت داس کی بات پر اکبر نے قائل ہو کر شدت برتنے کا خیال چھوڑ دیا، لیکن اس کے بعد ہی سے ملت اسلامیہ کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تاریخ "احداث بدعت" نکالی گئی۔

قاضی جلال ملتانی پر تہمت

اسی زمانہ میں بادشاہ نے قاضی جلال ملتانی پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے جعلی تمسک لکھ کر پانچ لاکھ تنکہ شاہی خزانہ سے وصول کر لیا ہے۔ یہ الزام رکھ کر ان کو خواجہ فتح اللہ بخشی کے ساتھ دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ دکن کے حکام متعصب رافضی ہیں اس لیے وہ قاضی کو سخت اذیتیں دے کر نہایت رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیں گے، مگر معاملہ کچھ برعکس ہی ہوا۔ جب وہ دکھن پہنچے تو وہاں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کیونکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جس کے قصور اس وقت معاف ہو چکے تھے چلا گیا۔ خان زماں نے اس کی طرف سے بے پروائی برتی اس کے اس رویہ سے آصف خاں اور وزیر خاں معزول بھائیوں نے پھر سرکشی کی راہ اختیار کی۔ خان زماں نے وزیر خاں کو نظر بند کر رکھا تھا وہ بھاگ کر مانک پور چلا گیا۔ آصف خاں نے بھی اس طرف کا رخ کیا۔ خان زماں کے بھائی بہادر خاں نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر لیا۔ اس وقت وزیر خاں اپنے بھائی کو چھڑانے کے لیے آپہنچا اور بہادر خاں پر حملہ کر دیا۔ بہادر خاں نے آصف خاں کو ہاتھی کی عماری ہی میں قتل کر دینے کا حکم دے دیا، لیکن اس سے پہلے کہ اس کا کام تمام وزیر خاں کے سر پر پہنچ گیا اور بھائی کو نکال لے گیا پھر بھی آصف خاں کی انگلیاں کٹ گئیں اور ناک پر زخم آیا۔ بعد میں اس کا قصور معاف ہو گیا تھا اور آخر وقت تک ملازمت شاہی سے منسلک رہا۔

ان سے پہلے ہی یہ خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں کہ قاضی نے اکبر کی بے دینی کا نہایت ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور کلمۂ حق کہنے میں بزدلی نہیں دکھائی۔ دکن والوں نے ان کی آمد کو باعث برکت جانا اور علاوہ مدد معاش کی اراضیات کے ان کو اور بھی ذمہ دارانہ خدمات تفویض کر دیں اور وہ وہاں آخر تک نہایت عزت و احترام سے رہے۔ آخر میں حج پہ جانے کی اجازت طلب کی، لیکن دکن کے حکام ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے عرصہ تک ان کو اجازت نہ ملی۔ آخر وہ اجازت حاصل کر کے زیارت حرمین کی سعادت سے فیض یاب ہوئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔

قاضی عبدالسمیع ماوراء النہری

قاضی جلال کو ہٹانے کے بعد ان کی جگہ قاضی عبدالسمیع ماوراء النہری میاں کالی کو قاضی بنایا گیا۔ اس شخص کے متعلق موجی شاعر نے یہ شعر کہا تھا۔

پیری ز قبیلۂ معزز
ریشی چوگل سفید یک گز

یہ نہایت فاسق و فاجر شخص تھا۔ شطرنج پر جوا کھیلتا تھا۔ علانیہ شراب پیتا تھا۔ اس کے مذہب میں رشوت نہ صرف جائز بلکہ فرض تھی۔ قرض کے قبالوں پر حکماً سود وضع کر کے اس کے اندراجات کراتا تھا۔ دین اور مذہب کی بادشاہ کو کوئی پروا نہ تھی، محض بدنامی سے بچنے کے لیے قاضی کا تقرر کرتا تھا، اور اس سے بہتر کوئی دوسرا قاضی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اذان اور نماز کی موقوفی

محل میں پانچ وقت جماعت کے ساتھ نماز بھی ہوتی تھی اور اذان بھی دی جاتی تھی، لیکن انہی دنوں جماعت، نماز اور اذان سب کچھ موقوف کر دی گئی۔ کافروں اور حرم کی کافرزادیوں کی خاطر اکبر کو اب تو احمدؐ، محمدؐ اور مصطفےٰؐ جیسے نام بھی گراں گزرتے تھے، چنانچہ کچھ دن بعد اپنے بعض مقربوں کے نام جو اس طرز کے تھے تبدیل کرا دیے، جیسے یار محمد اور محمد خاں کو بدل کر رحمت خاں وغیرہ کر دیا۔ اچھا ہی ہوا کیوں کہ ان خبیثوں پر یہ بابرکت نام جچتے بھی نہیں تھے، سور کی گردن میں قیمتی موتی کہاں زیب دے سکتے ہیں۔

بددینی کی یہ ساری آگ آگرہ سے اٹھی اور اس نے چھوٹے بڑے ہر ایک کو جلا کر راکھ کر دیا۔ آخر اس کی لپٹوں سے آگ لگانے والے فسادی بھی نہ بچ سکے۔

میر فتح اللہ شیرازی کی باریابی

ماہ ربیع الثانی سنہ ۹۹۱ھ میں بادشاہ نے میر فتح اللہ شیرازی کو عادل خاں حاکم دکن کے پاس سے فرمان بھیج کر بلایا۔ جب وہ فتح پور پہنچا تو بادشاہ کے حکم سے خان خاناں اور حکیم ابوالفتح اس کے استقبال کے لیے گئے۔ میر فتح اللہ الٰہیات، ریاضیات، طبعیات، طلسمات و نیرنجات اور دوسرے تمام عقلی اور نقلی علوم میں اپنے عہد کا ماہر فن شخص تھا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے اسے صدارت کا منصب عطا کیا جو ان دنوں سیاہ نویسی سے بڑھ کر کچھ نہیں رہا تھا اور صدر کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ فقراء کو کچھ دینے کے بجائے ان کی اراضی ضبط کرتا رہے۔ اس کو لیسا ور کا پرگنہ داغ و محلہ سے مستثنیٰ کر کے بطور جاگیر عطا کیا گیا۔ اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی کہ اس کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا شاگرد رہے اور میر غیاث الدین نماز اور عبادات کا پابند اور قائل نہ تھا اس لیے بادشاہ کو اس کے متعلق بھی یہ خوش گمانی تھی کہ شاید وہ مذہب اور دین کے معاملہ میں ان کی تائید کرے گا، لیکن یہ خوش گمانی باقی نہ رہی، کیوں کہ میر فتح اللہ شیرازی نے باوجود اپنی ساری دنیا داری اور ارسطو پرستی

کے مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھائی، چنانچہ وہ عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک پر نماز پڑھا کرتا تھا۔ بادشاہ کے علم میں اس کی یہ تقلید پرستی تھی لیکن اس کے علم و حکمت، تدبیرو مصلحت کا خیال کر کے بادشاہ نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کی ترقی و خاطر داری میں کوئی کمی نہ کی یہاں تک کہ مظفر خاں کی چھوٹی لڑکی سے اس کا نکاح بھی کرا دیا اور اسے وزارت کے عہدہ پر راجہ ٹوڈرمل کا شریک کار بنا دیا۔ وہ نہایت جرأت کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کر کے فرائض وزارت بجالاتا تھا۔ وزارت کے ساتھ ساتھ وہ امراء کے بچوں کو بھی بڑے شوق سے پڑھاتا رہتا تھا اور ہر روز بادشاہی مصاحبوں کے گھر پر اسی غرض سے ضرور جایا کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے حکیم ابوالفتح کے لڑکے کو پھر شیخ ابوالفضل کے لڑکے کو پڑھایا، دوسرے امیروں کے بھی سات سات آٹھ آٹھ سال تک کے بچوں کو الف ب پڑھنے اور لکھنے کی کوشش کراتا رہتا تھا۔ ہمیشہ کاندھے پر بندوق اور کمر میں بارود کی پیٹی بندھی رہتی تھی اور بادشاہ کے ساتھ جنگل میں قاصدوں کی طرح پیدل جایا کرتا تھا۔ اپنی اس وضع قطع اور اوچھی حرکتوں سے اس نے علم کے رہے سہے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا، لیکن اس کا کمال یہی تھا کہ وہ اس ذلت رذالت اور خسیسی کے باوجود مذہب کے معاملہ میں بڑا سخت تھا اور کسی سے نہیں دبتا تھا۔ اس کی آمد کی تاریخ "شاہ فتح اللہ امام اولیاء" سے نکلتی ہے۔

معراج نبویؐ سے انکار ایک رات اکبر نے شاہ فتح اللہ کی موجودگی میں بیربر سے کہا "اس بات کو عقل باور نہیں کرتی کہ ایک شخص اپنے جسمانی بوجھ کو لیے پلک جھپکتے میں آسمان پر جائے اور اللہ تعالیٰ سے نو ہزار باتیں کر کے اتنی جلد لوٹ آئے کہ اس کا بستر واپسی تک گرم ہی رہے اور لوگ بھی اس دعویٰ کی تصدیق کرنے لگ جائیں۔ اسی طرح شق القمر اور دوسرے معجزے بھی خلاف عقل معلوم ہوتے ہیں۔" پھر اکبر نے اپنا ایک پاؤں اٹھا کر سب کو دکھایا اور کہا "دوسرا پاؤں ٹکائے بغیر آخر ہمارا کھڑا رہنا کس طرح ممکن ہے۔ آخر لوگوں نے یہ کیا داستان بنا رکھی ہے۔" بیربر بدبخت اور دوسرے گمراہوں نے بادشاہ کی خوب ہاں میں ہاں ملائی اور بڑا سراہا۔ اکبر رہ رہ کر شاہ فتح اللہ کو دیکھتا جاتا تھا اور اس ساری گفتگو کی غرض بھی یہ تھی کہ وہ نیا آیا ہوا ہے اس کے خیالات معلوم کریں، لیکن وہ بندۂ خدا سر جھکائے کھڑا رہا، بولا کچھ نہیں۔

ملا احمد ٹھٹھہ کی آمد انہی دنوں ٹھٹہ کا ملا احمد متعصب رافضی جو بڑی بے حیائی سے خود کو حکیم بھی کہا کرتا تھا دکن سے آکر باریاب ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد فاروقی سلسلہ کے حنفی تھے۔ وہ ناپاک ان بدنصیبوں پر بھی لعنت بھیجتا تھا مگر حضور کا قول ہے کہ جو اپنے باپ کو لعنت کرتا ہے اس کی لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔ وہ شاہ طہماسپ کے عہد میں عراق میں تبرا کرنے والے شیعہ مومنوں کی صحبت میں پڑ گیا تھا اسی لیے وہ ان کی طرح ہو گیا، لیکن جب شاہ اسماعیل ثانی نے اپنے باپ کے برعکس سنی مسلک اختیار کر لیا اور رافضیوں کو تنگ کرنے لگا تو وہ میرزا مخدوم کے ساتھ جو پکے سنی تھے اور انھوں نے "النواقض فی ذم الروافض" کے نام سے رافضیوں کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں کتاب کی تاریخ تصنیف بھی درج ہے، مکہ کو چلا گیا وہاں سے بھٹکتا بھٹکتا دکن پہنچا، وہاں سے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں سارا میدان خالی پڑا تھا چنانچہ اسے مہمل باتوں کو پھیلانے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا کھلا موقع مل گیا مگر کچھ ہی عرصہ بعد اسے اپنے کیے کا اچھا بدلہ بھی مل گیا۔

ان دنوں جب کہ وہ شیخ فیضی کی صحبت میں نہیں پہنچا تھا اور اتنا بے باک نہیں ہوا تھا میری اس سے بازار میں ملاقات

ہو گئی۔ عراقیوں نے اس کے سامنے میری بڑی تعریف کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے دیکھ کر کہا "رفض کا نور ان کی پیشانی سے صاف جھلکتا ہے۔" میں نے فی البدیہہ جواب دیا "ہاں جس طرح نور تسنن تمہارے چہرے پر جھلک رہا ہے۔" جو لوگ وہاں کھڑے تھے بے ساختہ ہنس پڑے اور اس جواب سے بڑے خوش ہوئے۔ اس کا مزید حال آگے بیان کیا جائے گا۔

تاریخ الفی کی تصنیف کا حکم

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ "چونکہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے آئے ہیں، اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں، یہ تاریخ دوسری تاریخوں کے غلط واقعات کی تردید و تنسیخ کرے۔ اس کا نام "تاریخ الفی" رکھا جائے اس میں سنوں کے ساتھ بجائے ہجرت کے رحلت کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ کی وفات سے اس زمانہ تک کے حالات لکھنے کے لیے سات اشخاص مامور کیے گئے۔ پہلے سال کے واقعات کے لیے نقیب خاں کو، دوسرے سال کے لیے شاہ فتح اللہ کو اور اسی ترتیب سے دوسروں کو متعین کیا گیا۔ لکھنے والوں میں حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی جو انہی دنوں گجرات سے آیا ہوا تھا، مرزا نظام الدین احمد اور اس ناچیز (ملا عبدالقادر بدایونی) کا نام بھی شامل تھا۔ پھر دوسرے ہفتہ اس طرح ۳۵ سال کے واقعات کی ترتیب و تقسیم کی گئی۔

میں نے ساتویں سال کے تذکرہ میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات مرتب کیے تھے ایک رات یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظہ میں تھا جب پڑھتے پڑھتے شہر کوفہ کی تعمیر قصر الامارت کے انہدام، حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کے نکاح کے قضیہ، شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے مرغ کی قد و قامت کے بچھوؤں کے نکلنے کے ذکر پر پہنچے تو اکبر نے ان بیانات پر بڑی رد و قدح شروع کر دی، مرزا جعفر آصف خاں ثالث نے اس موقع پر اکبر کی غلط تائید کی اور اس کی طرف سے بحث کرنے لگا، البتہ شیخ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کی صحیح توجیہات بیان کیں۔ مجھ سے اکبر نے پوچھا "تم نے یہ سب حالات کس طرح لکھ دیے۔" میں نے عرض کیا "میں نے کچھ اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا کتابوں میں جو کچھ دیکھا مرتب کر دیا۔" اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانہ سے روضۃ الاحباب اور سیرت کی دوسری کتابیں منگائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ "وہ تحقیق کر کے بتائے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔" اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور خدا کے فضل سے مجھے اس بے جا گرفت و گیر سے چھٹکارا ملا۔

سن چھتیس تک کے حالات لکھے جا چکے تو اکبر نے حکم دیا کہ اب صرف ملا احمد ٹھٹھہ تاریخ الفی کے بقیہ حالات لکھے گا۔ یہ تبدیلی حکیم ابوالفتح کی تجویز و سفارش کی وجہ سے عمل میں آئی۔ ملا احمد نہایت متعصب آدمی تھا اس نے اپنے اعتقاد کے مطابق جی میں جو کچھ آیا لکھ دیا جیسا کہ اس تاریخ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے دور تک اس نے اس تاریخ کی دو جلدیں پوری کر دیں۔

ملا احمد اپنے مذہب میں نہایت غلو اور تشدد برتتا تھا۔ میرزا فولاد برلاس کو بھی اس کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا، چنانچہ مرزا نے ایک رات اس بہانہ سے کہ اسے بادشاہ نے طلب کیا ہے گھر سے باہر بلایا اور لاہور کی ایک گلی میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے قصاص میں میرزا فولاد کو بھی سزائے موت دی گئی۔

تاریخ الفی کے بقیہ حالات لکھنے کی ذمہ داری اب آصف خاں کے سپرد کی گئی۔ اس نے یہ واقعات ۹۹۷ھ تک پورے کر دیے۔

سنہ ۱۰۰۰ھ میں بادشاہ نے لاہور میں مجھے حکم دیا کہ میں مسودات کا مقابلہ اور تصحیح کروں اور سنوں میں جو تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے درست کردوں۔ ایک سال تک میں یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ میں نے پہلی دو جلدوں کو مکمل کر دیا۔ تیسری جلد کا کام آصف خاں کے حوالہ کر دیا۔

مہابھارت کا ترجمہ

اس سال کا اہم واقعہ مہابھارت کے ترجمہ کی تکمیل ہے۔ مہابھارت ہندوستان کی قدیم اور بڑی کتاب ہے جس میں متعدد قصے، نصیحتیں، مصالح ملکی، اخلاق و آداب، علوم و اعتقادیات، ہندو مذہب اور اس کی عبادتوں کی تفصیل ہے۔ یہ تمام موضوعات ہندوستان کے قدیم فرمانروا کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں۔ بعض کی رائے میں یہ واقعات کم از کم چار ہزار سال پہلے پیش آئے تھے۔ بعض کا قول ہے، مہابھارت پر اسی ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جو بظاہر آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا دور معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے کفار اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور اسے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مہابھارت کے ترجمہ کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ نے شاہ نامہ اور امیر حمزہ کے قصہ کو سترہ جلدوں میں پندرہ سال کی مدت میں لکھوایا تھا۔ اس کی تصویروں پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ اسی طرح ابومسلم کا قصہ اور جامع الحکایات وغیرہ کو بادشاہ نے متعدد بار پڑھوا کر سنا تھا۔ ان کتابوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ سب حقیقی واقعات نہیں ہیں بلکہ فرضی ہیں اور محض شاعری کی گئی ہے یہ کتابیں چونکہ اچھے وقت لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان کو عام شہرت نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی کتابوں کو جنھیں عبادت گزار دانشوروں نے لکھا ہے اور وہ سب کی سب حقیقی اور نص قاطع ہیں، ہندوؤں کی عبادتوں، اعتقاد اور مذہب کا سرچشمہ بھی ہیں، ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرا کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کرایا جائے۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے ہیں، اس لیے دلچسپ اور نئے رہیں گے۔ اس کے علاوہ جس طرح ان کتابوں کے مقدمہ میں درج ہے ان کی اشاعت دینی اور دنیاوی سعادت کا موجب اور شان و شوکت کے بقا، اولاد و اموال کی کثرت کا باعث بھی ہوگی۔

چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ ہندو اہل علم کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ مہابھارت کی تعبیر و ترجمانی کریں۔ چند راتوں تک اکبر نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطالب کو فارسی میں لکھواتا رہا۔ تیسری رات بادشاہ نے مجھے بھی بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں۔ تین چار مہینہ کی مدت میں اس مجموعۂ خرافات کے اٹھارہ فنون میں سے جن میں اٹھارہ ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے صرف دو فن لکھے جا سکے۔ نہ معلوم مجھ سے کیا گناہ ہوا تھا کہ اس ترجمہ سے پالا پڑا اور طرح طرح کے اعتراضات برداشت کرنے پڑے۔ اس کام میں مجھے بجز طعن و تعریض کے کچھ نہیں ملا۔ بعد میں اس کے ایک حصہ کو ملا شیری اور نقیب خاں نے پورا کیا اور ایک حصہ کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے

---

[1] مہابھارت: ہندوؤں کی یہ مذہبی کتاب ہے، جو آریوں کے دور شجاعت کی تصنیف ہے۔ اس کا صحیح سن تصنیف تو نہیں معلوم کب لکھی گئی۔ مصنف کا نام بید ویاس جی ہے۔ یہ کتاب ہند قدیم کے واقعات آریوں کے عقائد، ان کی حکمرانی، معاشرت اور سماجی حالات کا مکمل مرقع ہے۔ کورو پانڈوؤں کی مشہور جنگ مہابھارت کا بھی ماخذ ہے۔ کرشن جی کا اپدیش جو "بھگوت گیتا" کے نام سے مشہور ہے اس کا ماخذ بھی مہابھارت ہے۔ یہ جنگ دہلی کے قریب کوروکشیتر کے مقام پر لڑی گئی تھی جس میں کرشن جی کی مدد سے ارجن نے کوروؤں کو شکست دی تھی۔ اس کا فارسی میں سب سے پہلے ترجمہ اکبر کے عہد ہی میں ہوا۔

اس کے دو فنون کی نظم و نثر مرتب کی۔ پھر حاجی مذکور نے دو حصے اور لکھے اور پہلے جو فروگزاشتیں ہوئی تھیں ان کی تصحیح کر دی۔ اس طرح اس کتاب کے سو جز و مکمل ہو گئے۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پر کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ بھی چھوٹنے نہ پائے۔

سلطان حاجی تھانیسری کو اس محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا؟ کچھ عرصہ بعد کسی بہانہ سے اس کو بکھر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ اب وہ اپنے شہر میں مقیم ہے۔ مہابھارت کی تعبیر و ترجمانی کرنے والے اکثر لوگ کورو پانڈو سے جا ملے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس بارے میں معافی عطا فرمائے۔

اکبر نے اس ترجمہ کا نام "رزم نامہ" رکھا۔ تصویروں کے ساتھ اس کے دو نسخے تیار کرائے اور جب یہ تیار ہو گئے تو امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابوالفضل جس نے اس سے پہلے آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی تھی اس کفرنامہ پر اس نے دو جز کا خطبہ لکھا۔

اس سال کے واقعات میں نے ایک خاص وجہ سے نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ لکھے ہیں، اس لیے اگر واقعات کی ترتیب اور سنوں کی تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو تو قارئین اسے نظر انداز فرما دیں۔

اٹھائیسویں سن جلوس کا آغاز

۲۵ ماہ صفر سنہ ۹۹۱ھ کو نوروز ہوا اور جلوس اکبر شاہی کے اٹھائیسویں سال کا آغاز ہوا۔ حسب دستور سابق نمائشی دوکانوں کی آرائش امراء میں تقسیم کر دی گئی اور جشن کی تقریبات منائی گئیں۔ شاہ فتح اللہ نے اپنی دکان کی بڑی اچھی آرائش کی تھی۔ اس میں جر ثقیل اور ایسے دوسرے آلات کی نمائش کی گئی تھی

اس سال بھی چند نئے احکام اختراع کیے گئے۔ اتوار کے دن نوروز کے اٹھارہ دن اور اکبر کی ولادت کے مہینہ ماہ آبان کے تمام دنوں میں تمام حدود ممالک محروسہ میں جانوروں کے ذبیحے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ حکم بھی محض ہندوؤں کی خاطر نافذ کیا گیا تھا۔ جو شخص بھی ان دنوں ذبیحہ کرتا اسے جرمانہ کی سزا دی جاتی تھی اور اس کا گھر بار تباہ کر دیا جاتا تھا۔ خود اکبر نے گوشت خوری سے اتنا پرہیز کیا کہ سال بھر میں چھٹے مہینے بلکہ اس سے بھی کم گوشت کھایا کرتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ ہے کہ مطلقاً گوشت کھانا ترک کر دے۔

اکبر نے ہر روز چار مرتبہ صبح، دوپہر، شام اور نصف شب کو آفتاب کی پرستش شروع کر دی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ یہ وظیفہ بڑے خشوع و خضوع سے دوپہر میں پڑھا جاتا تھا۔ اس وظیفہ کے وقت دونوں کان پکڑ کر گھوما کرتا تھا اور کانوں پر دونوں ہاتھ توبہ کی طرح مارتا تھا۔ اس طرح کی اور بہت سی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔

نوبت نقارہ ایک مرتبہ تو نصف رات کو اور ایک بار طلوع کے وقت بجانے کا حکم دیا گیا۔ مسجدیں اور خانقاہیں ہندوؤں کے فراش خانے اور چوکی خانے بن گئیں اور وہاں بجائے جماعت کے جماع ہونے لگا اور "حی علیٰ" کی جگہ "یللا تللا" ہونے لگی۔ جو قبرستان شہر میں تھے ان کو مسمار کر دینے کا حکم دیا گیا۔

اس جشن کے موقع پر اکبر نے اپنی والدہ کو ایک لاکھ روپیہ نقد، چند ہاتھی، پوشاکیں، سونے کے برتن، جڑاؤ زیور وغیرہ دیے۔ اس طرح اپنی چچی گلبدن بیگم اور دوسری تمام بیگمات کو بھی انعامات دیے گئے اور عام حکم دیا گیا کہ ہر خاص و عام نذرانے پیش کرے۔

ٹانڈہ پر قبضہ

اسی سال اعظم خاں اور دوسرے امرا نے ٹانڈہ پر قبضہ کر لیا۔ خالدی خاں جباری، میرزا بیگ، قاقشال معصوم خاں کا ساتھ چھوڑ کر اعظم خاں کے پاس چلے آئے اور معصوم خاں بعض زمینداروں کی پناہ میں چلا گیا۔ بنگالہ کا مدار الخلافہ

سرکاری حدود میں آگیا۔

بادشاہ نے دکن کے حکام کی تالیف قلب کے لیے اس سال گجرات کی حکومت اعتماد خاں کے تفویض کر دی۔ شاہ ابوتراب کو وہاں کا امین، خواجہ نظام الدین احمد کو میر بخشی، بادشاہ کے استاد مولانا عبدالقادر کے بھائی ابوالقاسم تبریزی کو دیوان کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔ گجرات کی جاگیروں پر امراء کی بڑی تعداد کو مقرر کیا گیا جن میں محمد حسین میر ابوالمظفر ولد اشرف خاں، میر ہاشم، میر صالح داعی، سید ابواسحاق وغیرہ شامل تھے۔

شہباز خاں کو بادشاہ نے اس کی چند گستاخیوں کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اس نے جو سرکاری رقم موقع بے موقع صرف کی تھی اس کے حساب کتاب کا کام راجہ ٹوڈرمل کے سپرد کر دیا تھا۔ اس سال ابوالفضل کی سفارش پر اسے معاف کر کے راجہ کے چنگل سے رہائی عطا کی اور ۲۷ ربیع الثانی کو اسے بنگالہ پر متعین کر کے رخصت کر دیا کہ وہاں جا کر تمام سرکار بنگالہ کو بادشاہی جاگیرداروں میں تقسیم کر دے اور عیسیٰ کے صوبہ سے معصوم کابلی کو خارج کر دے۔

شیخ فرید بخاری کی سفارت

اسی اثنا میں خبر ملی کہ خان اعظم نے شیخ فرید بخاری کو مصالحت کے لیے اڑیسہ کے حاکم قتلو افغان لوحانی کے پاس بھیجا تھا، قتلو نے شیخ فرید کی بزرگی کا خیال کر کے ان کا استقبال کیا۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو بہادر کورذہ نے جو بنگالہ کا زمیندار اور قتلو کا بڑا فوجی افسر تھا، شیخ سے نہایت بے ادبی کے ساتھ ملاقات کی اور برابری سے بات کرنے لگا۔ شیخ نے اسے ایک زمیندار سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے اس رویہ پر شاہو ولد شیخ راجو بخاری سرہندی نے بھی بگڑ کر سخت طرز عمل اختیار کیا اور دوسرے بخاریوں نے بھی بڑی بے اعتدالی دکھائی۔ جس وقت شیخ فرید وہاں سے لوٹ رہے تھے اور قتلو شیخ کی خدمت میں چل رہا تھا بہادر نے لڑنے کا ارادہ کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ اس جھڑپ میں شاہو اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا، شیخ فرید سلامتی سے بچ کر نکل آئے۔

برہان الملک کی آمد

حاکم دکھن مرتضیٰ نظام الملک[1] کا بھائی برہان الملک وہاں سے بھاگ کر مالوہ میں قطب الدین خاں کے پاس آگیا تھا۔ اس سال رجب کے مہینہ میں وہ حسب الحکم دارالخلافہ آیا اور باریاب ہوا۔ اس کی آمد سے

---

[1] نظام الملک اور برہان الملک: سلطنت بہمنی کا زوال ہوا تو دکن چار ریاستوں میں بٹ گیا تھا گولکنڈہ کی قطب شاہی بیدر کی برید شاہی احمد نگر کی نظام شاہی بیجاپور کی عادل شاہی۔ مرتضیٰ نظام الملک نظام شاہ کا بیٹا اور احمد نگر کا دوسرا سلطان آخر عمر میں کچھ دماغ کا خلل کچھ بڑھاپے کی کمزوری، ملک میں بڑی ابتری پھیل گئی، اس لیے اس کی ماں نے عملاً سلطنت کا انتظام سنبھال لیا۔ اس کا چھوٹا بھائی برہان الملک تھا نظام الملک نے بغاوت کی شبہ میں ماں اور چھوٹے بھائی کو قید کر دیا۔ برہان الملک بعد میں قید سے بھاگ کر ابراہیم عادل شاہ کے پاس بیجاپور چلا گیا اور وہاں سے مدد لے کر احمد نگر پر چڑھائی کی لیکن نظام الملک نے اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ برہان الملک بھاگ کر بیجانگر کے راجا کے پاس کچھ عرصہ رہا، وہاں سے کوکن پھر بگلانہ میں جی راجہ کے پاس چلا گیا۔ قطب الدین خاں کوکہ حاکم ندربار کے وسیلہ سے ۹۹۱ھ میں دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ ۹۹۳ھ میں اسے خان اعظم کے ساتھ احمد نگر پر حملہ کے لیے بھیجا گیا لیکن یہ فوج ناکام واپس آئی۔ احمد نگر میں نظام الملک نے ۲۶ سال حکمرانی کے بعد ۹۹۶ھ میں انتقال کیا اس کا لڑکا حسین نظام الملک دوبارہ تین ماہ حکمران رہا اس کو امیروں نے قتل کرا دیا اور برہان الملک کے لڑکے اسمٰعیل کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ اکبر نے برہان الملک کو سہ صدی کا منصب عطا کیا تھا اور بنگش میں جاگیر عطا کی ۹۹۸ھ میں اکبر نے خاندیس کے حاکم راجہ علی خاں کے ساتھ برہان الملک کو دوبارہ احمد نگر پر قبضہ کے لیے بھیجا۔ ان دونوں نے برار پر قبضہ کر لیا۔ ۹۹۹ھ میں برہان الملک نے احمد نگر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۰۳ھ میں برہان الملک کا انتقال ہوا۔ اس کے عہد میں نورالدین ظہوری مشہور شاعر نے "ساقی نامہ" اسی کے نام پر تصنیف کیا تھا۔ اس نے آخر عمر میں اپنے لڑکے ابراہیم کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ ابراہیم برہان الملک بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کی فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے بعد احمد نگر میں بڑی انارکی پیدا ہو گئی۔ چاند بی بی برہان الملک کی حقیقی بہن تھی (باقی اگلے صفحہ پر)

قبل ایک آوارہ نامعلوم شخص دربار میں آیا تھا اور اس نے خود کو برہان الملک ظاہر کیا تھا۔ اسے بادشاہ نے اودھ میں جاگیر عطا کر دی تھی، جب بھید کھل گیا تو وہ بھاگ کر جوگیوں کے پاس چھپ گیا تھا لیکن ایک ہفتہ بعد ہی پکڑا گیا۔ اسے قید خانہ بھیج دیا گیا۔ بعد میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔

جوگیوں سے بادشاہ کی عقیدت

انہی دنوں بادشاہ نے شہر سے باہر ہندو اور مسلمان فقیروں کو کھانا کھلانے کے لیے دو سرائیں تعمیر کرائیں۔ ایک کا نام خیر پورہ، دوسرے کا دھرم پورہ رکھا گیا۔ ان کے انتظام پر شیخ ابوالفضل کے چند آدمی متعین تھے جو بادشاہی خرچ پر فقراء کو کھانا کھلاتے تھے۔ جوگیوں کی ٹولیاں بھی بہت آتی رہتی تھیں ان کے لیے ایک الگ سرائے بنوا کر اس کا نام جوگی پورہ رکھا گیا۔ اکبر راتوں میں اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ ان جوگیوں کی صحبت میں جایا کرتا تھا اور ان سے مختلف جاہلانہ معلومات، اعتقادات، مراقبے، مشغلے، آسن، کیمیا، ہیمیا، اور ایمیا جیسے عجیب و غریب علوم سیکھا کرتا تھا۔ اس نے کیمیا کے ذریعہ خود سونا بھی بنایا اور اسے لوگوں کو دکھایا۔ جوگی ہر سال ایک مقررہ رات میں جسے وہ شیو رات کہتے تھے ہر طرف سے آکر جمع ہوتے تھے۔ اس رات اکبر بڑے بڑے جوگیوں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور ان سے تگنی چوگنی عمر کی بشارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ان کی دعاؤں اور بعض دوسرے قرینوں سے اکبر کو اپنی درازی عمر کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ بعض حکیموں نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ عمر کی کمی کا تعلق دور قمری سے تھا اب جب کہ دور زحل شروع ہو چکا ہے جس میں ساری باتیں برعکس ہوں گی اور عمریں بھی طویل ہو جائیں گی، چنانچہ پچھلے لوگ ہزار ہزار سال کی عمر کے ہوتے تھے اور ہندی کتابوں میں آدمیوں کی عمر دس دس ہزار سال کی لکھی گئی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں لاماؤں کی عمر جو چینیوں کے پیشوا اور بڑے زاہد و عابد ہوتے ہیں دو سو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس درازی عمر کی خاطر اکبر نے بھی ان جوگیوں کی طرح مباشرت اور کھانے پینے میں کمی کر دی۔ خاص طور سے گوشت ترک کر دیا اور اپنی تالو کے بال منڈوا ڈالے صرف اطراف کے بال رہنے دیے۔ وہم یہ تھا کہ کاملوں کی روح سر کے درمیان جو جسم کا دسواں منفذ (نکلنے کی جگہ) ہے نکلتی ہے اور اس وقت گرج کی طرح کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز سعادت اور نجات، کی علامت ہے۔ تناسخ کی رو سے یہ اس بات کی نشانی ہے کہ روح کسی صاحب شوکت مقتدر بادشاہ کے بدن میں حلول کر گئی ہے۔

مہابلی اکبر کے درشن

بادشاہ نے اپنے مسلک کا نام "توحید الٰہی" رکھا اور اپنے خاص گروہ کے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں "چیلہ" کا نام دیا۔ عام لوگ جن میں زیادہ تر رذیل اور مکار شامل تھے چونکہ بارگاہ شاہی میں نہیں جا سکتے تھے اس لیے وہ ہر صبح کو سورج پوجا کے وقت جھروکہ کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک بادشاہ کا دیدار نہیں کر لیتے ان پر مسواک اور کھانا پینا حرام رہتا تھا۔ بادشاہ کے تقدس کا رفتہ رفتہ یہ رنگ جما کہ ہر رات ہندو مسلمان، عورتیں اور مرد، تندرست اور بیمار اپنی اپنی حاجتیں پوری کرانے نیازمندانہ حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت ہر ایک کو حاضری کی عام اجازت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس نے برہان نظام شاہ کے کمسن لڑکے کو بہادر شاہ کے نام سے تخت نشین کیا اس کا خطاب نادرۃ الزمانی تھا۔ یہ بڑی باحوصلہ مدبر بہادر خاتون تھی۔ علی عادل شاہ بیجاپوری کی بیوہ تھی۔ جب تک وہ زندہ رہی احمد نگر پر اکبری فوج قبضہ نہ کر سکی۔ چاند بی بی سلطانہ کے نام سے مشہور رہی ہے۔ اس کی وفات کا سبب معلوم نہیں ہو سکا معلوم ہوتا ہے یہ امراء اور مغلوں کی سازش کا شکار ہو گئی۔

ہوتی تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہوجاتا تھا اور جیسے ہی بادشاہ آفتاب کے ایک ہزار نام کا ورد کر کے پردہ کے پیچھے سے نمودار ہوتا، یہ لوگ سجدے میں گر پڑتے۔

اکبر پرمیشور کا اوتار

مکار اور چالاک برہمنوں نے خود اکبر کے ایک ہزار ایک نام ترتیب دے دیے کہ رام اور کرشن کی طرح آپ بھی ایک اوتار ہیں اور پرمیشور نے آپ کی صورت میں حلول کیا ہے۔ اکبر نے یہ بھی باور کر لیا۔ پنڈت ہندوستان کے قدیم علما کے ہندی دوہے نقل کر کے پیش کرتے رہتے تھے۔ ان کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان میں ایک بڑا بادشاہ پیدا ہوگا جو برہمنوں کا محافظ ہوگا، گائے کی حفاظت کرے گا اور ساری دنیا پر عدل وانصاف سے حکومت کرے گا۔ یہ ساری خرافات پرانے کاغذوں پر لکھ لکھ پیش کی جاتی تھی۔ اکبر ان تمام باتوں پر اعتقاد لے آتا تھا۔ مختلف فرقوں میں سے جن کے سچے اعتقاد کا اکبر کو یقین ہو جاتا تھا ان کو وہ "احدی" کہا کرتا تھا اور یہ گمان تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو وقت پڑنے پر آگ اور خون کے سمندر میں بے جھجک داخل ہو جائیں گے۔

اسی سال اکبر نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں حنفیوں کے مسئلہ کے مطابق "دہ در دہ" اور شافعیوں اور شیعوں کے "قلتین" کے مطابق پانی بھروا کر وزن کرایا۔ حوض کا پانی ان دونوں سے زیادہ نکلا۔ بادشاہ نے سنیوں اور شیعوں کے دو علحدہ گروپ بنانے کا حکم دیا، جتنے ہندوستانی تھے وہ سنیوں کے کیمپ میں ہو گئے اور جتنے عراقی تھے وہ شیعوں کی طرف چلے گئے۔

ایسے بہت سے جزوی واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے اصل مضمون کو شروع کرتا ہوں۔

گجرات کی بغاوت

جب اعتماد خاں اپنے حسب مدعا گجرات کی حکومت پر مامور ہو کر سروہی پہنچا تو اس نے اس مقام کو سرتال سے علحدہ کر کے رانا کے بھائی جگمال کے سپرد کر دیا اور متعینہ امرا کو ساتھ لے کر ۱۲ ماہ شعبان کو احمد آباد پہنچ گیا۔

شہاب الدین احمد خاں احمد آباد کا مستقل حاکم تھا اور گجرات کے سارے فتنہ وفساد کی اس نے بڑی خوبی سے روک تھام کر رکھی تھی وہ اپنے گھر سے نکل کر عثمان پورہ کے محلہ میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس کے ملازم سردار جو اس تبدیلی پر سخت ناراض تھے دوسرے ہم پیشہ وں کے ساتھ کاٹھیاوار کی طرف چلے گئے جہاں سلطان محمود گجراتی کا لڑکا مظفر شاہ دربار اکبری سے بھاگ کر اپنے ننہیال کے رشتہ داروں کی پناہ میں اپنے دن کاٹ رہا تھا۔ بغاوت پسندوں نے وہاں جا کر اسے حصول بادشاہت پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ لے لیا اعتماد خاں نے شہاب الدین احمد خاں سے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنی جماعت کو دلاسا تسلی دے کر واپس بلا لے لیکن اس نے قبول نہ کیا اور کہا یہ لوگ عرصۂ دراز سے اس دن کے منتظر تھے اور میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ اب ان کا معاملہ میرے قابو سے باہر ہے، اب تم یہاں کے حاکم ہو، تم جانو اور یہاں کے لوگ۔ یہ کہہ کر وہ احمد آباد سے بیس کوس پر قصبۂ کری میں چلا گیا۔

مظفر شاہ کی یلغار

اعتماد خاں اور نظام الدین احمد کے ایک دو آدمی باغیوں کے پاس گئے اور انھیں بہت تسلی دلاسا دیا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ ۲۷ شعبان کو مظفر کاٹھیاواڑیوں اور برگشتہ مغلوں کا لشکر لے کر احمد آباد سے بارہ کوس پر دولقہ کے مقام پر آ پہنچا۔ اسی وقت اعتماد خاں اور نظام الدین احمد شہر چھوڑ کر شہاب الدین احمد خاں کو واپس لانے کے لیے کری کی طرف کوچ کر گئے اور اس کو اطمینان دلایا کہ بدستور سابق قدیم پرگنے اس کی جاگیر میں رہیں گے علاوہ ازیں اسے دو لاکھ روپیہ

نقد بھی دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے جانے سے پہلے احمد آباد کو شیر خاں ولد اعتماد خاں اور میر محمد معصوم بکری کی تحویل میں دے دیا تھا کہ ہم کری سے واپس آکر فوج کا ساز و سامان درست کریں گے۔

مظفر شاہ نے دوسرے دن پیش قدمی کی۔ احمد آباد سے تین کوس پر سرکھ کے مجاوروں نے گجرات کے بادشاہوں کے مزاروں کا چتر تیار کر کے شگون کے لیے اس کے سر پر سایہ کیا اور اسے سلطنت کی مبارک باد دی۔ اس کے لیے تو یہ مژدۂ غیب تھا۔ غرض وہ اسی دن دھاوا مار کر شہر میں داخل ہو گیا۔

امرائے شاہی کی پسپائی

مذکورہ دونوں امیر کری سے راتوں رات یلغار کرتے ہوئے صبح کے وقت عثمان پورہ پہنچے۔ ان کے استقبال کے لیے مظفر اپنی فوج کو آراستہ کر کے آگے بڑھا اور احمد آباد کے ریگستانی ساحل پر مقابلہ کے لیے صف آرائی کر لی۔ وہ تو میدان میں پہنچ کر دم خم دکھا رہا تھا اور یہاں یہ دو بوڑھے امیر باغیوں میں تفرقہ پیدا کرنے بھاگے ہوئے ملازموں کو تسلی دے کر واپس بلا لانے، قرض لینے، دستاویز و تمسک لکھنے اور نامہ و پیام کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ غرض ان کے روکے بغاوت کا یہ سیلاب رک نہ سکا اور جب پانی سر سے گزر گیا تو وہ دونوں بغیر لڑے ہی وہاں سے فرار ہو کر نہر والہ کے شہر پٹن میں جو احمد آباد سے ۴۵ کوس پر ہے ایک ہی دن میں جا پہنچے، ان کے لشکر کا سارا ساز و سامان باغیوں نے لوٹ لیا اور لشکریوں کے اہل و عیال اسیر ہو گئے۔ نظام الدین احمد کا لڑکا محمد شریف سارا مال و اسباب لٹوا کر محافظ سپاہیوں کے ہمراہ بمشکل باپ سے آکر ملا۔

شیر خاں فولادی کی واپسی

ان بھاگے ہوئے امیروں نے فتح پور سے کمک پر آنے والے امراء کے ساتھ پٹن کے قلعہ کی مرمت کی اور اس میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے مظفر نے اپنے معمولی معمولی سپاہیوں کو بھی بڑے بڑے خطاب عطا کیے اور جاگیروں کا امیدوار بنا کر ان کے عہدے بڑھا دیے، خدا کی قدرت کہ ملازمت شاہی میں اسے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا، اب وہ تیس ہزار سپاہیوں کا مالک بن گیا۔ اس نے شیر خاں فولادی کو جو پہلے پٹن کا حاکم تھا اور اب سورت میں نہایت تنگدستی سے گزر بسر کر رہا تھا بلا بھیجا اور چار ہزار سوار دے کر اسے پٹن پر حملہ کے لیے رخصت کیا۔

پٹن کے سرداروں نے شہباز خاں کے بھائی زین الدین کنبو کو قطب الدین محمد خاں کے پاس بھیجا کہ وہ اس طرف سے اور پٹن والے اس طرف سے احمد آباد پر حملہ کریں اور مظفر کو گھیر لیں۔ مظفر نے اس کارروائی سے پہلے ہی آگے بڑھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ بڑودہ میں قطب الدین محمد خاں پر حملہ کر دیا اور سخت جنگ کر کے اسے شکست دی۔ قطب الدین محمد خاں بھاگ کر بڑودہ کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اس کے لشکر کے سردار اور ملازم سارے کے سارے مظفر سے جا کر مل گئے۔

اس واقعہ سے پہلے ہی شیر خاں پانچ ہزار سوار لے کر پٹن سے پندرہ کوس پر قصبہ میانہ کے نواح میں پہنچ گیا اور شہاب الدین احمد خاں بڑے تذبذب کے بعد جاگور کی طرف بھاگ گئے۔ پٹن میں صرف نظام الدین احمد رہ گئے۔ ان کے ساتھ جو سردار تھے ان سب کی جمعیت دو ہزار سواروں سے زائد نہیں تھی۔ فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، آخر نظام الدین احمد کو فتح نصیب ہوئی اور شیر خاں شکست کھا کر احمد آباد بھاگ گیا۔ نظام الدین احمد نے بڑے اصرار سے کہا کر اس کا تعاقب کرتے ہوئے

اس وقت احمد آباد پر حملہ کر دینا چاہیے۔ لیکن امراء نے قبول نہ کیا، حالانکہ ان کا مشورہ بالکل درست تھا کیوں کہ لشکریوں کو اس وقت تک قطب الدین محمد خاں کی شکست کی خبر نہیں لگی تھی۔ اس جنگ میں امراء کے ہاتھ کافی مال غنیمت آیا۔ یہ لوگ کری جاکر ٹھہر گئے اور بارہ دن تک وہاں لشکر کا انتظار کرتے رہے جو مال غنیمت لے کر پٹن گیا ہوا تھا۔

بڑودہ پر باغیوں کا قبضہ

اسی اثنا میں خبر ملی کہ مظفر نے قلعہ بڑودہ[1] کی پرانی دیوار کو توپ اندازی کر کے گرا دیا ہے، اور قطب الدین محمد خاں نے زین الدین کو پناہ کا قول نامہ لینے کے لیے مظفر کے پاس بھیج دیا ہے۔ مظفر نے زین الدین کو تو اسی وقت قتل کرا دیا اور خواجہ محمد صالح سابقہ صدر کو جو اعتماد خاں کے ساتھ متعین ہو کر آئے تھے ان کی بزرگی کا لحاظ کر کے حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ قطب الدین محمد خاں امان پاکر جب قلعہ سے باہر آیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ تسلیمات بجا لایا مظفر نے ملاقات کے وقت اس کی بڑی تعظیم کی اور استقبال کر کے اسے مسند پر بٹھالیا، وہ اس کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تھا لیکن راج سپیلہ کے زمیندار نواری کے بہکانے سے آخرکار اسے قتل کرا دیا۔

پرواری سے مظفر نے بھڑوچ پر فوج کشی کی اور اس قلعہ کو بھی قطب الدین محمد خاں کی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں سے صلح کر کے چھین لیا۔ وہاں مظفر کو کھمبایت کا چودہ لاکھ روپیہ جو عماد الدین کروڑی لے آیا تھا اور دوسرا بہت سا ساز و سامان مل گیا۔ قطب الدین خاں کا دس کروڑ سے زائد روپیہ بھی اس کے قبضہ میں آگیا اور اس نے ایک بڑی فوج اکٹھی کر لی۔ حیرت کی بات ہے کہ قطب الدین خاں کا لڑکا نورنگ خاں اور دوسرے تمام مالوہ کے امیر قریب ہی ندربار اور سلطان پور میں تھے۔ نورنگ خاں نے آگے بڑھ کر اپنے ماں باپ کی کوئی خبر نہ لی۔ اس فتح سے مظفر کی دھاک بیٹھ گئی اور مغل پٹھان گجراتی بے شمار اس کے لشکر میں جاکر شامل ہو گئے۔

مرزا خاں کی لشکر کشی

جب نظام الدین احمد کو اس کی خبر ملی تو وہ تمام سرداروں کو لے کر پٹن میں مذکورہ دونوں امیروں سے آکر ملے۔ یہ سب لوگ پٹن میں مرزا خاں ولد بیرم خاں خانخاناں کا انتظار کرنے لگے جو دربار سے دوسرے امراء کے ساتھ جالور کے راستہ پٹن آرہا تھا۔ مرزا خاں نے آنے کے بعد پٹن میں ایک دن پڑاؤ کیا اور آگے بڑھ کر سرگنج میں کیمپ لگا دیا۔

مظفر بھی بڑودہ سے لوٹ کر آیا اور بھڑوچ پر اپنے سالے نصیر کو اور چرکس رومی کو جو پہلے شاہی لشکر میں تھا متعین کر دیا اور شاہ بھیکن کے مزار کے نواح میں پہنچ کر اپنی چھاؤنی قائم کر دی —— دوسرے دن دونوں فوجوں میں بڑا سخت مقابلہ ہوا مظفر شکست کھاکر محمود آباد چلا گیا اور یہ لڑائی سید ہاشم بارہہ خضر آقا وکیل اور مرزا خاں نے جیت لی۔ اس جنگ میں بہت سے لوگ زخمی

---

[1] بڑودہ: سورت سے ۸۱ میل پر ہے۔ ہندوؤں کے چند قدیم مشہور مندر اور ایک جامع مسجد تاریخی یادگار ہے۔ یہ مسجد ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء کی تعمیر ہے۔ اس مسجد میں ایک قرآن شریف ہے جس کا طول ۶½ فٹ اور عرض ۳½ فٹ۔ متن میں فارسی ترجمہ اور حاشیہ پر تفسیر لکھی ہوئی ہے اس کا وزن کئی من پختہ ہے۔ اس کی رحل بھی کافی لمبی چوڑی نادر چیز ہے۔ یہ قرآن اب بمقام محمد باڑی رکھا ہوا ہے۔ ریاست کے شاہی محل میں سونے اور چاندی کی یادگار توپیں رکھی ہوئی ہیں جو نوادرات میں سے ہیں یہ شہر سورت سے پہلے کا آباد کیا ہوا ہے۔ جب مغل سلطنت کا زوال ہوا ایک شخص پیلاجی گائیکواڑ نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں یہاں ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ ۱۷۳۱ء میں پیلاجی مرا ۱۸۰۲ء میں انگریزوں کی سرپرستی میں یہ ریاست آگئی۔ آخری فرمانروا مہاراجہ سیاجی راؤ گائیکواڑ تھے اس ریاست کا رقبہ آٹھ ہزار پانسو ستر مربع میل ہے۔ مردم شماری ۲۴-۲۵ لاکھ رہی ہے۔ شہر کی آبادی سوا لاکھ رہی ہے۔

ہوئے۔ غنیم کے جو لوگ ہلاک ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں۔ یہ واقعہ تیرہ محرم ۹۹۱ھ کو پیش آیا۔
میرزا خاں نے فتح پور سے پہلے منت مانی تھی کہ اگر فتح نصیب ہو جائے تو میں اپنا سارا مال و متاع اس کے شکرانہ میں خیرات کر دوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے ملازمین کو ہاتھی گھوڑے پوشاکیں اور سارے مال و اسباب کی قیمت مقرر کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ رقم فقرا و مساکین کو تقسیم کر دی جائے۔ بددیانت ملازمین نے ہر چیز کی اس طرح گھٹا گھٹا کر قیمت لگائی کہ محتاجوں کو چوتھائی بلکہ دسواں حصہ تک نہ مل سکا بلکہ اچھی خاصی رقم ان بدبختوں نے اپنی عیاشیوں میں اڑا دی۔
میرزا خان کے اکثر ملازم قلیچی تھے، جیسے دولت خاں افغان لودی، ملا محمودی اور دوسرے امراء، ان لوگوں نے عرض کیا کہ "ہم آپ کے ملازم بنے ہیں کوئی قصور تو نہیں کیا پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بادشاہی ملازمین کے سامنے اس طرح دبے دبے اور حقیر رہیں اور وہ مجلسوں میں ہم پر ہمیشہ اپنی برتری جتلاتے رہیں، تسلیم و تعظیم اور دوسرے درباری مراسم میں ان کو بھی ہمارے مساوی درجہ دیا جانا چاہیے۔ یہ بے سروپا باتیں مرزا خاں کو بڑی بھلی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے امراء اور سرداروں میں سے ہر ایک کے لیے بھاری پوشاکیں اور گھوڑے تیار کرائے اور تمام امراء کی فہرست تیار کر کے ایک بڑا جشن منعقد کیا اور لباس خانہ میں بیٹھ کر اجلاس کی تیاریاں کرنے لگا۔ نظام الدین احمد کی بہن کسی وقت بیرم خاں خانخاناں کے نکاح میں رہی تھی، اس سابقہ رشتہ کی بنا پر اس نے نظام الدین احمد کو بلا کر اس بارے میں مشورہ کیا۔ انھوں نے نصیحت کی کہ یہ کوتاہ اندیش تم کو بہکا رہے ہیں اگر بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے۔ جہاں تک تسلیمات و کورنش کا معاملہ ہے۔ بھلا سوچو تو کہ شہاب الدین خاں مرتبہ کے لحاظ سے پنج ہزاری منصب رکھتا ہے اور تم سے عمر میں بھی بڑا ہے، اس سے تسلیمات کرانا کہاں تک زیبا ہے۔ اس طرح اعتماد خاں گجراتی جو کسی وقت بیس ہزار سواروں کا منصب دار تھا تمہاری تسلیمات بجالائے تو کیا زیب دے گا، خود پاینده خاں مغول بھی اس بات سے صاف انکار کر دے گا اور ممکن ہے وہ کسی جہالت کا ثبوت دے اور خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو جائے۔" میرزا خاں کو یہ رائے پسند آگئی اور اس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔

مظفر شاہ کی شکست اور فرار

اس فتح کے تین دن بعد قلیچ خاں اور مالوہ کے دوسرے امیر احمد آباد پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظفر معمور آباد (محمود آباد) سے جو دریائے مہندری کے کنارے ہے کھنبایت چلا گیا ہے اور بھاگی ہوئی فوج کے دو ہزار سوار اس کے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ میرزا خاں امراء کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مظفر بڑودہ اور پھر وہاں سے راج پیپلہ اور نادوت کی طرف نکل گیا۔ میرزا خاں نے بڑودہ پہنچ کر کھنبایت پر ایک فوج روانہ کی جس نے مظفر کے سردار دولت نامی کو شکست دے کر کھنبایت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرزا خاں نے نادوت کی طرف پیش قدمی کی اور قلیچ خاں اور دوسرے امیروں کو وسطی کوہستان پر جہاں مظفر پناہ گزیں تھا حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ ساری لڑائیاں نظام الدین احمد کی بدولت جیتی گئیں۔ شاہی فوج ساز و سامان سے لدی پھندی رہتی تھی اس کے لیے تیزی سے نقل و حرکت کرنا دشوار رہتا تھا۔ نظام الدین احمد نے امراء کے حوصلے بڑھائے اور خود بھی اپنے عہدہ سے بڑھ کر کارگزاری دکھائی۔ ان کی کوشش و استقامت تھی کہ مظفر کے ساتھ لشکر نے سرنج کی پہلی سخت لڑائی جیت لی تھی اور اب مظفر ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔
میرزا خاں احمد آباد کو لوٹ آیا اور مالوہ کے لشکر کو اس نے قلعہ بھڑوچ کے محاصرہ پر متعین کر دیا۔ بھڑوچ پر مظفر کی طرف سے

چرکس رومی حاکم تھا سات ماہ بعد وہ مارا گیا اور مظفر کا سالا نصیر فرار ہو گیا۔

اکبر کی الٰہ آباد کو روانگی

اسی سال مرزا خاں اور مالوہ کے لشکر کو گجرات پر متعین کرنے کے بعد بادشاہ نے بذریعہ کشتی الٰہ آباد کی سیر کا ارادہ کیا۔ الٰہ آباد قدیم شہر پیاگ کی جگہ نیا آباد کیا گیا تھا۔ یہ شہر ہندوؤں کی قدیم پرستش گاہ ہے۔ وہاں بادشاہ نے قلعہ کی بنیادیں بھی رکھوائی ہیں۔

جس دن بادشاہ رخصت ہونے والے تھے، مکہ معظمہ سے شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادہ شیخ بدرالدین کے انتقال کی خبر پہنچی کہ انھوں نے سات دن کا روزہ رکھا ہوا تھا اور جلتی دھوپ میں ننگے پیر طواف کر رہے تھے جس سے پیروں میں آبلے پڑ گئے اور تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے اور عین عید قربان کے دن سنہ ۹۹۰ھ میں اللہ کے راستہ میں جان دے دی۔ بادشاہ نے شیخ کی خانقاہ کے خادم حاجی حسین کے ذریعہ ان کی وفات کی اطلاع بھجوائی جس سے ان کے خاندان میں واویلا مچ گیا۔ اس خاندان کے یہ آخری بزرگ تھے۔ ان پر رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

راجہ رام چند کی اطاعت

الٰہ آباد پہنچنے کے بعد بادشاہ نے وہاں چار مہینے تک قیام فرمایا۔ یہاں سے زین خاں کوکہ اور بیربر کو جو پہلے راجہ رام چند بھٹہ کا ملازم تھا ایلچی بنا کر چورا گڈھ روانہ کیا۔ رام چند نے اطاعت قبول کر لی اور زین خاں کو بڑی خاطر داری کے ساتھ روک لیا، پھر اس کے ہمراہ فتح پور میں آ کر اس نے دربار شاہی میں باریابی حاصل کی اور ایک سو بیس قیمتی لعل و جواہر جن کی قیمت پچاس ہزار روپیہ ہوتی تھی نذرانے میں دیے، اپنے بیٹے بابو نامی کو خدمت شاہی میں چھوڑ کر کچھ عرصہ بعد وطن لوٹنے کی اجازت حاصل کی۔ واپسی کے چند دن بعد ہی وہ فوت ہو گیا۔

رام چند نہایت خوش اخلاق اور فیاض راجہ تھا۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے اس کی بخششوں کا یہ عالم تھا کہ ایک کروڑ کا سونا ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس نے ابراہیم سور کو بادشاہی کا کتنا کچھ ساز و سامان تیار کر کے دیا تھا۔ میاں تان سین تو اس کے پاس سے واپس ہونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر جلال خاں قورچی بڑے وعدہ وعید کر کے اسے اپنے ساتھ واپس لایا۔

انہی دنوں میں حاجی پور سے اعظم خاں یلغار کرتے ہوئے الٰہ آباد پہنچا، لیکن اپنے لشکر کو لانے کے لیے بہت جلد واپس چلا گیا۔ امرائے شاہی نے الٰہ آباد میں شاندار عمارتوں کی تعمیر کا بندوبست کیا اور یہ طے پا گیا کہ آئندہ اس شہر کو پایۂ تخت بنایا جائے نیا سکّہ جاری کیا جائے اور اس کے لیے شریف سرمدی چوکی نویس نے سجع کا یہ شعر نکالا تھا ؎

همیشه چوں زر خورشید و ماه رائج باد
بشرق و غرب جهاں سکهٔ الٰه آباد

کسی دل جلے نے شریف سرمدی کے متعلق یہ شعر کہا تھا ؎

دو چوکی نویسنده هر دو کثیف
یکے نا نفیس و دگر نا شریف

انہی دنوں ملا الہداد امروہہ اور ملا شیری جو دوآبہ پنجاب کی صدارت کے عہدہ پر مامور تھے الٰہ آباد آ کر حاضر دربار ہوئے

ملا شیری نے بادشاہ کی خوشامد میں "ہزار شعاع" کے عنوان سے آفتاب کی تعریف و توصیف میں ایک نظم پیش کی جو ہزار قطعات پر مشتمل تھی۔ بادشاہ کو بہت پسند آئی۔

بادشاہ کی فتح پور کو واپسی

اسی سال ماہ ذی الحج میں گجرات کی بغاوت کے تدارک کے لیے الہ آباد سے فتح پور واپسی ہوئی۔ اٹاوہ کے نواح میں میرزا خاں کی فتح کی خبر پہنچ گئی۔

بادشاہ دار الخلافہ کو ماہ صفر ۹۹۲ھ میں لوٹ کر آئے اور گجرات کے امیروں کے نام خوشنودی کے فرمان جاری کیے گئے میرزا خاں کو خانخاناں کا خطاب گھوڑا خلعت مرصع خنجر سرداری کے لوازمات اور سب سے بڑا پانچ ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ نظام الدین احمد نے بھی اس مہم میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اس لیے ان کو بھی گھوڑا، خلعت اور منصب میں ترقی دی گئی۔ دوسرے امرا کے منصبوں میں بھی دس بیس اور دس تیس کا حسب مدارج اضافہ کیا گیا۔

راماین کے ترجمہ کا حکم

اسی زمانہ میں بادشاہ نے مجھے "راماین[1]" کے ترجمہ کا حکم دیا، جو بہ لحاظ تصنیف مہابھارت سے پہلے کی کتاب ہے۔ اس میں ۲۵ ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک ۶۵ حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔

راماین میں اودھ کے راجہ رام چند جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے کی داستان ہے۔ ہندو ان کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں کہ اللہ نے رام کی شکل میں حلول کیا تھا۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ لنکا کے جزیرہ پر راون نامی دس سروں والا ایک دیو حکومت کرتا تھا۔ وہ رام کی بیوی سیتا کو اغوا کر کے لنکا لے گیا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرہ کا رخ کیا۔ بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر چار کوس لمبا پل بندھوایا۔ بعض بندروں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس فاصلہ کو ایک چھلانگ میں طے کر گئے اور بعض ایسے بندر تھے کہ سمندر پر چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ غرض ایسی بہت سی خرافات اس میں درج ہیں۔ بہر حال رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتہ تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل و عیال کے ساتھ قتل کر دیا اور لنکا کو راون کے بھائی کے حوالہ کر کے اپنے شہر واپس آ گیا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام نے سارے ہندوستان پر دس ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے اور اس کی کوئی مدت انسانوں سے خالی نہیں گزری۔ عالم کے وجود میں آنے پر لاکھوں سال گزر چکے ہیں۔ وہ آدم ابو البشر کے قائل نہیں ہیں جن کو گزرے سات ہزار سال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے راماین کے یہ واقعات صحیح نہیں، محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں جیسے شاہنامہ اور امیر حمزہ کی داستانیں جو درندوں اور جنوں کے اقتدار کے زمانہ میں گزرا تھا۔

تبدیلی جنس کا واقعہ

ان دنوں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فتح پور کے دیوان خانہ میں ایک خاکروب کی بیوی پیش کی گئی کہ یہ مرد بن گئی ہے۔ راماین کا ایک ترجمان بھی دفتر کتابت سے اٹھ کر اسے دیکھنے گیا اور واپس آ کر اس نے بیان کیا کہ وہاں ایک عورت تھی جس نے شرم سے چہرہ چھپا رکھا تھا اور بات نہیں کر رہی تھی۔ حکیموں نے اس کی تائید و تصدیق میں دلائل پیش کیے اور بتلایا کہ ایسے واقعات بہت پیش آتے رہے ہیں۔

---

[1] راماین: سنسکرت سے قدیم کتاب ہے، جو بالمیک رشی کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں اس کا بڑا درجہ ہے۔ آریوں کی تاریخ کا قدیم ماخذ ہے۔

اسی سال ملا عالم[1] کابلی جو نہایت شیریں گفتار، عالم خوش بیان اور باغ و بہار آدمی تھے، وفات پا گئے۔ ان کی تصنیف "فواتح الولایۃ" ہے، ان کی تاریخ وفات "اشعث طماع" نکالی گئی۔

انتیسواں سن جلوس

اس سال آٹھویں ماہ ربیع الاول ۹۹۲ھ حمل آفتاب واقع ہوا اور نوروز جلالی کے دن جلوس شاہی اور نوروز سلطانی کا انتیسواں سال شروع ہو گیا۔ جشن نوروز بڑی دھوم دھام سے منایا گیا، دکانوں، مکانوں کی آرائش کی گئی، طرح طرح کی محفلیں منعقد ہوئیں، سامری کے گوسالہ کی طرح کانسے کی گائے کا ایک ناقوس بنا کر بجایا گیا۔ غبارے جو فرنگیوں کی ایجاد ہیں اور جو کپڑے سے گیند کی شکل کے بنائے جاتے ہیں چھوڑے گئے۔ اس مرتبہ دس دس آدمیوں کی ٹکڑی خدمت شاہی میں باریاب ہوتی تھی۔ یہ لوگ اکبر کی مریدی اختیار کر کے نئے دین میں داخل ہوتے تھے۔ شجرہ کے بجائے اکبر ان کو اپنی تصویر اخلاص اور رشد و ہدایت کی علامت کے طور پر عطا کرتا تھا۔ اکبر نے پگڑی پر جواہرات سے مرصع ایک سرپیچ باندھ رکھا تھا۔ فرامین کے سرنامے کے لیے "اللہ اکبر" کا کلمہ تجویز کیا گیا۔ اس سال جوا اور سود حلال کر دیے گئے، اسی طرح اور دوسری ممنوعات بھی جائز قرار دے دی گئیں۔ اکبر نے دربار میں ایک جوا خانہ بھی بنوایا، جواریوں کو شاہی خزانہ سے سود پر روپیہ قرض دیا جاتا تھا اس طرح بادشاہ کی دولت میں اضافہ کی ایک صورت نکل آئی۔ چودہ سال سے کم عمر لڑکی اور سولہ سال سے کم عمر لڑکے کی شادی کی ممانعت کر دی گئی۔ حضور اکرمؐ اور حضرت عائشہؓ کے (جن کا کم عمری میں عقد ہوا تھا) زفاف کے قصہ سے اکبر نے صریحاً انکار کر دیا۔ پیغمبران کرام سے خدا کی جناب میں جو لغزشیں ہوئیں مثلاً داؤد علیہ السلام اور اوریہ کا قصہ وغیرہ وہ سب اس مطلقاً انکار کے لیے اچھا خاصا بہانہ بن گئیں۔ اکبر جسے اپنا معتقد نہیں پاتا تھا اسے لائق قتل مردود و نابکار سمجھتا تھا۔ ایسے شخص کو فقیہ اور دشمن سلطنت کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے ہر شخص کو وہی کاٹنا پڑتا ہے جو کچھ اس نے بویا تھا۔ دوسرے مردود و نابکار کیا ہوتے خود حضرت سلامت سارے زمانہ میں گمراہ اور اکفر مشہور ہو گئے اور ان کے مرشد و مجتہد (ابوالفضل) کو "ابوجہل" کا لقب ملا۔ غرض دنیاوی سلطنت اب دین الٰہی کے زیر تسلط آ گئی اور اکبر اپنے دین کے معاملات کو امورِ سلطنت سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگا۔ عزت و ناموس کی بربادی کے لیے نوروزی کی دکانوں (مینا بازار) کو کبھی کبھی مردوں سے خالی کرا دیا جاتا تھا اور بیگمات اہل حرم اور خاص و عام پردہ نشین عورتوں کو سیر و تفریح کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس میلہ میں بادشاہ لوگوں کو روپیہ پیسہ انعام دیتے تھے باہر سے آنے والی عورتوں کے قضیے بھی طے کیے جاتے تھے اور لڑکوں، لڑکیوں کے نکاح بھی کرائے جاتے تھے۔

---

[1] ملا عالم کابلی: نہایت پُر مذاق خوش کلام خوش ادا آدمی تھا۔ عبادت خانہ کے چار ایوان میں ان کے لطائف و ظرائف پر اہل جلسہ لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ تحریروں میں بھی ظرافت تھی۔ "فواتح الولایۃ" کے نام سے مشائخ اور اولیائے ہند کے حالات میں ایک بڑا ذخیرہ مرتب کیا تھا اس میں مجاور، خادم اور بھیک منگوں تک کا حال لکھ دیا۔ مسخرے پن سے یہاں بھی باز نہ آئے کتاب کے نام پر "د" بڑھا کر لکھا "وفواتح الولایۃ"۔ لوگوں نے پوچھا صاحب یہ "او" سے کیا مطلب، اس کے پہلے کون سا نام ہے۔ جواب دیا بیان کی کیا ضرورت دوسرا نام اس میں چھپا ہوا ہے اور وہ ہے "فواتح الولایۃ"۔ "گل بہار" کابل کا ایک موضع ان کا وطن تھا۔ اسی تعلق سے پہلے بہار تخلص کیا بعد میں ربیعی رکھ لیا۔ مولانا جامی کی کتاب "سلسلۃ الذہب" کے جواب میں مزاحیہ اشعار لکھ کر اس کے مجموعے کا نام "صلصل البحر" رکھ دیا۔ ملا بدایونی نے یہ جو تاریخ "اشعث طماع" نکالی اس میں بھی ایک رمز رکھ دیا۔ عرب میں ایک شخص اشعث نامی بلا دعوتوں میں بن بلائے چلا جاتا تھا۔ اسے طفیل الاعراس کہتے تھے اسی چٹورپن کی وجہ سے "اشعث طماع" کے نام سے مشہور تھا۔ بدایونی نے وزن ملا کر "اشعث طماع" تاریخ نکالی اور ایک لطیف چوٹ کر گئے۔

بادشاہ نے نکاح کی قید کو بھی ختم کرا دینے کی بڑی کوشش کی، لیکن ہندو اس کے لیے راضی نہیں تھے اس لیے کچھ نہ کر سکا۔
اس زمانہ میں ہندوؤں کا بڑا زور تھا، آدھا ملک ان کے قبضہ میں تھا۔ وہ فوج میں بھی پچاس فی صد تھے۔ مغل اور ہندوستانی امراء سے وہ کہیں زیادہ مقتدر اور با اختیار تھے، اس لیے نکاح کے معاملہ میں ان کے سامنے اکبر کی کچھ پیش نہ گئی۔ رہ گئیں دوسری قومیں تو ان کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ ان میں نہ غیرت تھی نہ اتفاق، اس لیے بادشاہ نے جس طرح چاہا ان کو نچا کر رکھ دیا۔

انہی دنوں حسب وعدہ اعظم خاں حاجی پور سے یلغار کرتے ہوئے حاضر بارگاہ ہوا۔ مرزا سلیمان مکہ معظمہ سے لوٹ کر بدخشاں پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس نے اور میرزا شاہرخ (مرزا سلطان کا پوتا) نے اوزبکوں سے جنگ کی اور شکست کھائی اور اب دونوں ہندوستان میں پناہ لینے کے لیے آ رہے تھے۔

ذی قعدہ کے اوائل میں نیلاب سے مان سنگھ کا عریضہ پہنچا کہ میرزا شاہرخ نیلاب کے کنارے آ چکا ہے۔ اس نے میرزا کا استقبال کیا اور چھ ہزار روپیہ نقد، بہت سے کپڑے اور پانچ ہاتھی میرزا کی خدمت میں پیش کیے۔

بادشاہ کو اس کی یہ خدمت گزاری بہت پسند آئی۔

امرائے شاہی کا انتقال

اس سال چند امیروں کا انتقال ہو گیا۔ محمد باقی خاں برادر ادھم خاں نے اپنی جاگیر کڑہ کتنکہ میں وفات پائی۔ غازی خاں[1] بدخشی کو الہ آباد سے اودھ کی طرف بھیجا گیا تھا وہ اسی جگہ فوت ہو گیا۔ غازی خاں آخر عمر میں اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اسے قالین پر بٹھا کر اجلاس پر لایا جاتا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا آپ کا کیا حال ہے؟ تو اس نے جواب دیا" الحمد للہ حرص و طمع کے بل پر زندہ ہوں اور اپنے تمام لاؤ لشکر پر حکمران ہوں"۔ نوکروں پر برہم ہو کر یہ دعا کرتا تھا کہ" خدا کرے تو بھی ہزاری منصب ہو جائے تاکہ تجھے میری قدر معلوم ہو"۔

ایک رات قلیچ خاں کے گھر پر بہت سے لوگ افطار کی دعوت میں جمع تھے غازی خاں سورۂ "انا فتحنا" کی تفسیر بیان کر رہا تھا، میں نے کوئی اعتراض کیا۔ اس نے کچھ توجیہ کر کے درشتی سے جواب دیا، میں نے کہا" سبحان اللہ ولایت (ایران) کے سرداروں کا اخلاق معلوم ہو گیا کہ کیسا ہے"۔ اس نے کہا" تمھیں شاید یہ گمان ہوگا کہ میں نے ہزاری منصب دار ہونے کی وجہ سے اس سختی کا مظاہرہ کیا"۔ میں نے کہا" ظاہر تو یہی ہو رہا ہے"۔ اس پر وہ بہت برافروختہ ہو گیا، آخر آصف خاں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔
جس دن الہ آباد سے کوچ ہوا تھا، راستہ میں کافی دور تک میں اور غازی خاں علمی مذاکرہ اور مشائخین کے اقوال بیان کرتے

---

[1] غازی خاں بدخشی: اصل نام قاضی خاں تھا، یہ پہلے میرزا سلیمان کے امراء میں شامل تھے بدخشاں وطن تھا۔ بدخشاں کے لعل کی کان ان کے گاؤں کے قریب تھی مولانا عصام الدین اور ملا سعید کے شاگرد تھے۔ طریقت میں شیخ حسین خوارزمی سے بیعت کی تھی سنہ ۹۸۲ھ میں یہ دربار اکبری میں حاضر ہوئے۔ قاضی خاں کو پھر بعد میں غازی خاں کا خطاب ملا۔ ایک ہزاری منصب دار مقرر ہوئے۔ منتظم اور بہادر آدمی تھے مان سنگھ کے ساتھ رانا کیکا کی مہم میں بڑی ثابت قدمی سے بہادری کے جوہر دکھائے۔ اکبر کے لیے سجدۂ زمین بوس انہی کے ذہن کی اختراع تھی۔ محضر اجتہاد پر پہلے جن چار عالموں نے دستخط کیے اس میں یہ بھی شامل تھے۔ سنہ ۹۸۹ھ میں ان کی تعیناتی کوہستان تبت پر ہو گئی تھی، وہاں انھوں نے بہادر خاں سعید بدخشی کے لڑکے کو جو باغی ہو گیا تھا شکست دی۔ ان کی تصنیفات میں" اثبات کلام" و" بیان ایمان"، " تحقیق و تصدیق"، " حاشیہ شرح عقائد" اور تصوف کے چند رسالے ہیں۔ ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ابو الفضل نے بڑی تعریف کی ہے اور موت کا سبب یہ بتایا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے پاس ایام حیض میں گئے تھے۔ بس یہ بہانہ ہو گیا۔ ان کا ایک لڑکا حسام الدین تھا۔ اکبر نے اسے ہزاری منصب عطا کر کے خان خاناں کے ہمراہ دکن کی مہم پر بھیجا۔ وہاں اس پر جذب کی حالت طاری ہو گئی۔ کپڑے پھاڑ دربار کو واپس آ گیا اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ دلی میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار دی۔

رہے تھے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو وداع کیا۔ غازی خاں سے بس یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اسی سال سلطان خواجہ بھی فوت ہو گیا۔ وہ اکبر کے مریدان خاص میں شامل تھا۔ اس کو ایک خاص وضع کی قبر میں دفن کرایا گیا تھا جس میں ایک جالی لگائی گئی تھی کہ ہر صبح کو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی، کیوں کہ سورج گناہوں کو پاک کرنے والا ہے۔ کہتے ہیں اس کے منہ کو آگ سے جھلسایا بھی گیا تھا۔

ملا احمد ٹھٹھہ بھی مر گیا۔ اس کی تاریخ "سلطان الخوارج" ہے۔ اس میں ایک عدد کی کمی ہے۔

میرزا شاہرخ کی آمد

۹۹۳ھ کے آغاز میں جبکہ تیسویں جلوس کا اختتام تھا میرزا شاہرخ اور راجہ بھگوانداس فتح پور کے قریب پہنچ گئے۔ اکبر نے شاہزادہ دانیال کو شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کے ساتھ استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ اسے بارگاہ میں لے کر آئے۔ بادشاہ نے میرزا کو ایک لاکھ روپیہ نقد فراش خانہ کا سامان، تین عراقی گھوڑے، پانچ ہاتھی اور چند اونٹ اور خچر اور ملازم مرحمت فرمائے۔

شاہزادہ سلیم کی شادی

انہی دنوں بادشاہ نے اپنے مقررہ طریقہ پر شاہزادہ سلیم کو سولہ سال کی عمر میں راجہ بھگونت داس کی لڑکی سے بیاہ دیا۔ خود بادشاہ سلامت کی سواری اس کے گھر پر گئی اور عقد قاضیوں اور شرفاء کی محفل میں منعقد ہوا۔ دو کروڑ تنکہ مہر باندھا گیا اور ہندوؤں کی تمام رسمیں جیسے آگ جلانا وغیرہ انجام دی گئیں۔ دلہن کے گھر سے دولت خانہ شاہی تک دلہن کی پالکی پر سے بادشاہ نے سونا نچھاور کرایا۔

راجہ بھگونت داس نے چند گھوڑے اور قسم قسم کے جڑاؤ سونے کے زیور، جواہرات، سونے چاندی کے برتن طرح طرح کے بے حد وشمار کپڑے جہیز میں دیے۔ امرائے شاہی کو بھی اس نے ہر ایک کے حسب حال عراقی، ترکی اور عربی گھوڑے سنہری زین کس کر بطور ہدیہ دیے۔

تیسواں سن جلوس

بروز جمعرات ۱۹ ماہ ربیع الاول ۹۹۳ھ کو موسم بہار کا آغاز ہوا۔ نوروز سلطانی کے دن آ گئے۔ میرزا نظام الدین احمد نے جو سن وار ترتیب سے تاریخ لکھی ہے، اس نوروز کے متعلق لکھا ہے کہ "جلوس کا تیسواں سال شروع ہو گیا" حالانکہ جلوس کے دوسرے قرن کا آغاز ۲۵ ربیع الاول ۹۹۴ھ میں بمقام اٹک بنارس ہوا تھا، جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس صورت میں تیسواں جلوس کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہاں میرزا سے بھول ہو گئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایام کبیسہ کی وجہ سے قمری کے ہر تین سال پر ایک مہینہ کا فرق پڑ جاتا ہے اور ہر قرن پر شمسی اور قمری سنوں میں ایک سال کا فرق ہو جاتا ہے۔ میرے پاس چونکہ تقویم نہیں ہے، اس لیے میں نے مجبوراً میرزا ہی کی پیروی کی ہے۔ اس کی ذمہ داری میرزا پر ہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان برسوں میں میرزا گجرات میں تھے، شاہی لشکر میں نہ تھے۔

غرض یہ کہ حسب سابق جشن نوروز کی آرایش وزیبائش کی گئی اور بڑا شاہانہ جشن منعقد ہوا۔ ہر روز بڑی بڑی ضیافتیں ہوئیں۔ (مینا بازار) نوروزی کی دکانوں سے جو امراء لگایا کرتے تھے ہر دکان دار نے بھاری بھاری نذرانے گزرانے۔ سب کے کھانے، عطر اور اہل طرب کے انعامات کا خرچ شاہی خزانہ سے ادا کیا گیا۔ حسب الحکم پنج ہزاری سے لے کر احدی تک ہر چھوٹے بڑے نے پیش کش اور نذرانے خدمت میں گزارے۔ مجھ حقیر نے بھی کہ میری حیثیت ذرۂ ناچیز سے بڑھ کر نہ تھی، لیکن ہزار بیگھہ زمین کی وجہ سے ہزاری سمجھا

جاتا تھا یوسف علیہ السلام کو خریدنے والی بڑھیا کی طرح چالیس روپیہ کی نذر دی جسے بادشاہ نے قبول فرمالیا۔

اس جشن میں بڑے شاہزادہ کو بارہ ہزاری کا منصب ملا۔ ان سب کو فراش خانہ، علم و سراپردہ، نقارہ وغیرہ بھی مرحمت ہوئے۔

دکن پر حملہ کی تیاریاں اس سال کے شروع میں دکن میں متعینہ امیر میر مرتضیٰ اور خداوند خاں نے برار کے علاقہ سے نظام الملک کے پایۂ تخت احمد نگر[۱] پر حملہ کیا تھا۔ انھیں نظام الملک کے وزیر صلابت خاں نے شکست دیدی تھی، وہ وہاں سے بھاگ کر برہان پور[۲] میں راجہ علی خاں کے پاس چلے گئے تھے۔ راجہ علی خاں نے ان کے سارے ہاتھی، گھوڑے چھین لیے تھے، ان میں سے ڈیڑھ سو ہاتھی اس نے اپنے لڑکے ابراہیم خاں کے ساتھ دربار میں بھجوادیے تھے۔ جشن نوروز کے موقع پر خود راجہ علی خاں بقیہ گھوڑے لے کر دربار میں آیا اور اکبر کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس کی فرمایش پر بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو جسے بعد میں میر فتح اللہ کا نام دیا گیا تھا، عضدالدولہ کا خطاب مرحمت فرمایا اور پانچ ہزار روپیہ گھوڑا اور خلعت عطا کی۔ ہندوستان کا صدر کل بناکر دکن کی مہم پر مامور فرمادیا۔ اس کے ساتھ خان اعظم، شہاب الدین احمد خاں اور دوسرے امراء بھی متعین کیے گئے۔ اس کے غیاب میں اس کے ایک ملازم کمالائی شیرازی کو اماموں کے معاملات کو پیش کرنے کے لیے اس کا نائب مقرر کیا گیا اس کے تقرر سے صدارت کا عہدہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گیا۔ آخر یہ معاملہ اس حد پر پہنچا کہ شاہ فتح اللہ کو باوجود اس عزت و اقتدار کے کسی امام کو پانچ بیگھہ زمین بھی دینے کا اختیار نہیں رہا تھا البتہ وہ ساری کی ساری زمینیں واپس لے کر بحث ضرور کرتا رہتا تھا۔ مدد معاش کی جتنی زمینیں بازیافت کرلی گئی تھیں وہ ساری کی ساری تباہ ہوگئیں۔ نہ ثمرہ اس سے مستفید ہوسکے نہ رعایا۔ اماموں اور معاش داروں پر جو مظالم ہوئے وہ ان تمام صدور کے نامۂ اعمال میں باقی رہیں گے جن کے اب نام تک باقی نہیں رہے ہیں۔

ماہ رجب سنہ ۹۹۳ھ میں کابل سے خبر آئی کہ مرزا سلیمان اوزبکوں سے شکست کھاکر بدخشاں سے میرزا محمد حکیم کے پاس کابل آگیا تھا اور راسالو نامی ایک موضع کی جاگیر پر صبر شکر کرکے بیٹھ رہا تھا، پھر اس نے قبائل کو اکٹھا کرکے بدخشاں کی سرحد پر اوزبکوں سے مقابلہ کیا اور انھیں شکست دی، بہت سے اوزبک اس لڑائی میں مارے گئے۔ جو اسیر بن کر آئے ان کو میرزا نے خلعت و انعام دے کر رہا کردیا۔

۱؎ احمد نگر: احمد نظام شاہ بحری نے سنہ ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ ڈیڑھ سو برس تک نظام شاہی خاندان کا مرکز رہا۔ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۴ء میں شاہجہاں نے اس پر قبضہ کرکے شاہی عمارتوں کو منہدم کرادیا۔ اٹھارویں صدی میں حیدر آباد کے نظام الملک آصف جاہ کا قبضہ رہا، بعد میں مرہٹے اس پر قابض ہوگئے۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ اس کی آبادی ۴۰ ہزار تک رہی، باشندوں کی زبان مرہٹی ہے۔ اس کو چاند بی بی کا نگر بھی کہتے ہیں۔ یہاں کی ایک مسجد میں ہندوؤں نے کتب خانہ قائم کررکھا ہے۔ مشرقی جانب حسین نظام شاہ بحری کا بنایا ہوا قلعہ ہے جس میں چاند بی بی نے آخر وقت تک مغلوں کا مقابلہ کیا۔ شہر سے چار میل پر عالم گیر کی درگاہ ہے۔ کہتے ہیں جب عالمگیر سنہ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں فوت ہوا تو اسے اسی جگہ غسل دیا گیا تھا۔ اس کی میت یہاں سے اورنگ آباد بھیجی گئی۔

۲؎ برہان پور: دریائے تاپتی کے کنارے واقع ہے خاندیس کے فرماں روا نصیر خاں فاروقی نے سنہ ۸۰۲ھ/۱۴۰۰ء میں اس کی بنیاد رکھی۔ دو سو برس تک یہ خاندیس کا دارالسلطنت رہا۔ سنہ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں اکبر کے عہد میں یہ سلطنت مغلیہ کا ضمیمہ بن گیا۔ شاہجہاں تک یہاں مغل فوج کی بڑی چھاؤنی رہی۔ سنہ ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء میں مرہٹوں نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ اب یہ تیس چالیس ہزار کی آبادی کا مختصر سا شہر ہے۔ جامع مسجد قدیم یادگار ہے جو عادل شاہ فاروقی نے سنہ ۸۹۷ھ/۱۴۹۱ء میں تعمیر کرائی تھی اس پر اکبری فتوحات کا ایک کتبہ بھی نصب ہے۔ برہان پور میں مغل عہد کا ایک واٹر ورکس ہے جس کے ذریعہ تاپتی کا پانی شہر میں نلوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا تھا۔ اسی طرح ترکی حمام کی عمارتیں بھی قابل دید ہیں۔ یہاں شیخ نظام الدین چشتی م ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ اسیر کا قدیم قلعہ جسے اسیر گڑھ بھی کہتے ہیں۔ برہان پور سے چھ میل دور ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔

اور اپنا ملک دوبارہ حاصل کر لیا۔

گجرات میں دوبارہ بغاوت

ماہ شعبان میں حسب الحکم شاہی خان خاناں گجرات سے فتح پور آیا ہوا تھا۔ اس کے گجرات سے پیٹھ پھیرتے ہی مظفر نے دوبارہ علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ مظفر کو جوناگڑھ کے حاکم جام امین خاں غوری سے بڑی شکایات تھیں اس کے ہاتھوں اس نے منہ کی کھائی تھی، اس لیے اس بار اس نے بڑھ کر قلعہ جوناگڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ قلیچ خاں تو احمد آباد میں حفاظت و ناکہ بندی کے لیے ٹھہرا رہا اور مظفر کی سرکوبی کے لیے نظام الدین احمد گجرات کے امیروں کو ساتھ لے کر مقابلہ پر پہنچے۔ مظفر شاہی لشکر سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر دریائے رَن کو عبور کر کے کچھ میں چلا گیا۔ یہ دریا سمندر سے دس کوس اور تیس کوس کے فاصلہ سے جیسلمیر کے ریگستان میں داخل ہوتا ہے اور اسی ریگزار میں کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں نظام الدین احمد نے گجرات سے میرے نام خط بھیجا تھا کہ "خان خاناں نے یہاں سے جاتے ہوئے وعدہ کیا ہے کہ اس بار وہ بادشاہ سے اجازت لے کر تم کو اور ملا الہداد کو اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تم حسب ا‌لا تب خان خاناں سے مل لو اور دربار سے رخصت لے کر یہاں آ جاؤ۔ گجرات کی سیر نہایت دلچسپ رہے گی"۔

اس خط کے بموجب میں خان خاناں سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہ ملا، صرف ایک بار جب کہ میں دولت خانہ شاہی سے متعلقہ کتب خانہ میں جہاں ترجمہ کے کام پر میں لگا ہوا تھا جا رہا تھا تو خانخاناں سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ بہت جلد گجرات کو لوٹ گیا، پھر کابل کے قضیئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے گجرات جانے کے لیے رخصت لینے کا موقع نہ ملا اور وہ ارادہ جسے میں نے اپنی نجات اور بہتری کا وسیلہ سمجھ رکھا تھا پورا نہ ہو سکا۔

خان خاناں فتح پور سے رخصت ہو کر جب سروہی سے دس کوس پر پہنچا تو اس نے سروہی اور جالور پر قبضہ کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ نظام الدین احمد بھی وہاں پہنچ گئے۔ سید قاسم بارہہ بھی اپنی ساری جمعیت کو لے کر استقبال کے لیے آ گیا۔ خان خاناں کی فوج کشی کی خبر سن کر سروہی کا راجہ بھاری پیش کش لے کر حاضر خدمت ہو گیا۔ غزنین خاں جالوری بھی اس مرتبہ ملاقات کے لیے لشکر میں حاضر ہو گیا تھا لیکن جس وقت خان خاناں دربار کے ارادہ سے کوچ کر رہا تھا تو اس سے کوئی ناپسندیدہ حرکت سرزد ہو گئی تھی اور اب اس کے باغی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے خانخاناں نے اسے قید کر دیا اور اپنے ساتھ احمد آباد لے کر چلا گیا۔ جالور کی جاگیر اس سے لے کر اپنی فوج کو وہاں متعین کر دیا۔

معاشقہ کا انجام

سید محمود بارہہ کے پوتے سید جمال الدین کو چند سال پہلے شاہی طرب خانہ کی ایک حسین طوائف سے جس کا نام یمین تھا اور اب تو وہ چڑیل سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ عشق ہو گیا تھا، اس عشق بازی کا بھانڈا پھوٹا تو وہ ڈر کر دربار سے کوہستان میں بھاگ گیا وہاں اس نے اپنی ایک ٹولی بنالی اور وہ سرکاری علاقہ میں لوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ بعد میں وہ کوہستان سے اپنے چچا سید قاسم کے پاس جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ خانخاناں نے حسب فرمان اس کو سید قاسم کی جاگیر پٹن سے بلوا کر قید کر لیا، پھر اس کو اور غزنین خاں کو لاہور بھیج دیا گیا۔ غزنین خاں کی شادی میاں محمد و فاخر الچی مرحوم کی لڑکی سے ہوئی تھی بادشاہ نے اس کے سالے میاں فتح اللہ شربتی کا لحاظ کر کے اسے معاف کر دیا اور وہ دوبارہ ملازمت شاہی سے وابستہ ہو گیا، لیکن سید جمال الدین عتاب سے بچ نہ سکا، اسے پھانسی پر چڑھا کر تیروں سے چھلنی چھلنی کر دیا گیا۔ عشق بازی کا روگ آخر اس کی جان لے کر ہی ٹلا۔

پیر روشن کی لوٹ مار

اٹک بنارس سے راجہ مان سنگھ اور خواجہ شمس الدین کا عریضہ پہنچا کہ کابل میں مرزا محمد حکیم سخت بیمار اور فراش ہے۔ پشاور سے فریدوں ایک قافلہ لے کر کابل کی طرف گیا تھا، جب وہ کوتل خیبر پر پہنچا تو وہاں اس کا مقابلہ روشن ملحد کے لڑکے سے ہوگیا۔ روشن ملحد اس علاقہ میں تھوڑا بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اب تو وہ روشن نہیں بلکہ پیر تاریک کے نام سے مشہور ہے۔ فریدوں خیبر پر شکست کھا کر پٹ اور واپس چلا آیا۔ اتفاق سے جب وہ پشاور پہنچا تو وہاں کے قلعہ میں آگ لگ گئی اور سوداگروں کا ایک ہزار اونٹوں کا لداؤ مال جل گیا۔

اسی اثنا میں یہ خبر بھی ملی کہ عبداللہ خاں اوزبک نے دوبارہ ایک کثیر فوج بھیج کر بدخشاں پر قبضہ کر لیا ہے اور مرزا سلیمان کو وہاں سے بے دخل کر کے اس کے سارے مال و اسباب پر قابض ہوگیا ہے۔ میرزا سلیمان اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر دوبارہ کابل لوٹ آیا ہے۔

مرزا محمد حکیم کا انتقال

اس کے ساتھ کابل سے ایک اور خبر آئی کہ میرزا محمد حکیم[1] کثرت شراب نوشی سے طرح طرح کے امراض میں گرفتار تھا، چنانچہ رعشہ کے عارضہ میں ۱۲ شعبان ۹۹۳ھ کو اس کا انتقال ہوگیا۔

بادشاہ کا عزم کابل

میرزا محمد حکیم کے انتقال کی خبر تیسری ماہ رمضان المبارک کو ملی تھی، بادشاہ کو کابل اور غزنی کی حفاظت کی بڑی فکر پڑ گئی۔ پہلے خیال تھا کہ یہ علاقہ میرزا محمد حکیم کے لڑکوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن امراء نے عرض کیا کہ مرزا کے لڑکے خورد سال ہیں، وہ وہاں کا نظم و نسق سنبھال نہیں سکیں گے، اس لیے بادشاہ نے خود وہاں جانے کا عزم کیا۔ خانخاناں کے نام گجرات جلد پہنچ جانے کا فرمان صادر کیا گیا۔ خان اعظم اور شہاب الدین احمد خاں دکن کی مہم کے لیے نامزد کیے جا چکے تھے۔ عضد اللہ کو حکم دیا گیا کہ وہ دکن کی مہم کے انتظام کے لیے مالوہ اور رائیسین میں ان امراء کے پاس چلا جائے۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ نے پنجاب کی طرف کوچ کر دیا۔ شوال کا چاند دہلی میں دیکھا گیا۔ پانی پت پہنچے تو وہاں سے میر ابو الغیث بخاری کو لکھنؤ کے نواح میں جاگیر دے کر رخصت کر دیا۔ اس ماہ کی انیس تاریخ کو ستلج کے کنارے کیمپ لگایا گیا۔

انہی دنوں شیخ جمال بختیار اور شیخ الاسلام کا پوتا خواجہ اسماعیل جو نہایت حسین و خوبرو شخص تھا اور کثرت عیاشی کی وجہ سے بیمار تھا، ایک ہفتہ کے فرق سے یہ دونوں انتقال کر گئے۔ ایک کی وفات لودھیانہ میں ہوئی اور دوسرے کی تھانیسر میں۔ خواجہ اسمٰعیل کی تاریخ وفات ہے ع "رفت زیبا گلے ز باغِ جہاں"

سیالکوٹ[2] سے تین کوس کی مسافت پر ملا الہداد امروہہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے سینہ پر ایک داغ پڑ گیا تھا اور اس کی تپش دل تک پہنچ گئی تھی۔ اسے حکیم حسن نے ایک مسہل دیا تھا اسی دن وہ فوت ہوگیا۔ بڑا اچھا دوست تھا جو بچھڑ گیا۔

لاہور کے نواح میں جب منزل ہوئی تو صادق خاں کو بکر کی حکومت پر مامور کیا گیا۔ تیرہ ذی قعدہ کو لشکر چناب کے کنارے پہنچ گیا۔

---

[1] مرزا محمد حکیم اکبر کا سوتیلا بھائی تھا جو ماہ چوچک بیگم کے بطن سے تھا جو شاہی خاندان کی عورت نہیں تھی، کنیزوں کا درجہ تھا۔ ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ مرزا حکیم کا ذکر اس سے پہلے ایک حاشیہ میں آچکا ہے۔ مرزا حکیم نے ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

[2] سیالکوٹ: یہ شہر راجہ سالباہن کا بسایا ہوا ہے جو قبل مسیح کا ایک مشہور راجہ گزرا ہے، یہاں قلعہ اور مندر کے قدیم کھنڈرات موجود ہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں تجارتی مرکز اور مشہور شہر رہا ہے۔ اب کھیلوں کے سامان اور کاغذ سازی کے لیے مشہور ہے۔ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی مشہور مصنف گزرے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۰۶۷ھ ۱۶۵۶ء میں ہوا تھا۔

میرابوالغیث اور شیخ محمد بخاری کا مصاحب شیخ عبدالرحیم لکھنوی خان زماں کے زوال کے بعد دربار میں آگیا تھا اور امارت کے منصب پر فائز تھا۔ اسے بادشاہ نے کوہستان میں پرگنہ پیٹھان کی جاگیر عطا کی تھی۔ ان دنوں جنون کے عارضہ میں مبتلا تھا چناب کی منزل میں اس نے حکیم ابوالفتح کے خیمہ میں اپنے آپ خنجر مار لیا۔ اکبر نے اپنے ہاتھ سے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے سیالکوٹ میں بہ حفاظت رکھنے کا حکم دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ صحت یاب ہوگیا، لیکن اس کی دیوانگی اسی طرح باقی رہی۔

اسی ماہ کی ۲۷ تاریخ کو دریائے بیت کو عبور کیا گیا۔ اسی منزل میں محمد علی خزانچی جو کابل میں متعین تھا حاضر خدمت ہوا اور اطلاع دی کہ میرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد اس کے لڑکے فریدوں خاں، کیقباد اور افراسیاب جو کم عمری کے سبب سلطنت کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، امراء کے ساتھ مان سنگھ کے پاس پہنچا دیے گئے تھے۔ مان سنگھ نے اپنے لڑکے کو خواجہ شمس الدین خوافی کے ہمراہ کابل میں چھوڑ دیا ہے اور میرزا کے تمام آدمیوں کو تسلی و اطمینان دے کر اپنے ساتھ بارگاہ میں لے آیا ہے۔"

پانچویں ماہ ذی الحجہ کو قصبہ پنڈی[۱] میں جو اٹک بنارس اور رہتاس کے درمیان ہے منزل کی گئی۔ یہاں مان سنگھ میرزا کے لڑکوں اور ملازمین کو اپنے ہمراہ لے کر حاضر ہوگیا۔ بادشاہ ان سب کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے اور لائق حال امداد اور خرچ مرحمت کیا۔

اٹک بنارس کے نواح سے شاہ رخ میرزا راجہ بھگونت داس اور شاہ قلی خاں محرم کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ کشمیر فتح کرنے کے لیے رخصت کیا گیا۔ اسی دن اسماعیل قلی خاں اور رائے سنگھ درباری کو بلوچوں کی سرکوبی کے لیے اور زین خان کوکہ کو ایک آراستہ فوج دے کر سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں پر فوج کشی کے لیے روانہ کیا گیا۔

روشنائی قبیلہ پر فوج کشی

یکم محرم ۹۹۴ھ کو اٹک بنارس میں چھاؤنی لگائی گئی۔ ۲۵ سال پہلے ایک ہندوستانی سپاہی پٹھان قبیلوں میں چلا گیا تھا۔ اس نے وہاں بیر روشنائی کے نام سے بہت سے احمق پٹھانوں کو اپنا مرید بنا لیا تھا اور پٹھانوں میں الحاد و بے دینی پھیلاتا رہا تھا۔ ایک کتاب بھی "خیر البیان" کے نام سے لکھی تھی جس میں مفسدانہ عقائد درج کر رکھے تھے، بعد میں انہی پٹھانوں میں اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کا ایک لڑکا جلالہ نامی تھا جو چودہ سال کی عمر (۹۸۹ھ) میں جب کہ بادشاہ سلامت کابل سے لوٹ رہے تھے، خدمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اور بادشاہ نے اس کے ساتھ عنایت آمیز سلوک کیا تھا لیکن اپنی موروثی بدبختی کی وجہ سے وہ شاہی لشکر سے بھاگ کر دوبارہ پٹھانوں کے قبیلہ میں چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک بڑی مخلوق کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس کے چھاپوں سے ہندوستان اور کابل کا راستہ بالکل مسدود ہوگیا تھا۔ اس زمانہ میں پٹھانوں کے اس روشنائی فرقہ نے بڑا زور باندھ رکھا تھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے بادشاہ نے کابل مان سنگھ کی جاگیر میں دے دیا تاکہ وہ ان سرکشوں کا بخوبی قلع قمع کر دے۔

اس سال کے ماہ صفر میں سعید خاں کھوکر، بیربر ملعون، شیخ فیضی اور فتح اللہ شربتی اور دوسرے چند امراء کو زین خاں کی کمک کے لیے روانہ کیا گیا۔ چند دن بعد ہی حکیم ابوالفتح اور امراء کی ایک اور جماعت کو پہلی کمک کے پیچھے ہی رخصت کیا گیا۔ یہ فوجیں زین خاں سے جا کر مل گئیں اور ان سبھوں نے مل کر پٹھانوں پر سخت حملے کیے۔ ان کے علاقے پامال کر کے مردوں، عورتوں، بچوں کی ایک بڑی

---

[۱] موجودہ راولپنڈی اسی جگہ آباد ہے۔

تعداد کو اسیر بنا لیا گیا۔

بیربر کی ہلاکت ایک رات کسی شخص نے بیربر کو آکر اطلاع دی کہ "پٹھان آج رات شب خون مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر تم اس تنگ گھاٹی کو جو تین چار کوس سے زیادہ مسافت کی نہیں ہے جلد طے کر کے نکل جاؤ تو خطرہ سے باہر ہو جاؤ گے" اس وقت شام سر پر آ چکی تھی، بیربر نے اپنی خود سری اور خود پسندی کی وجہ سے زین خاں سے کوئی مشورہ نہ کیا اور بے وقت وہاں سے کوچ کر دیا۔ سارا لشکر اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب شام کو وہ ایک گھاٹی میں داخل ہو رہے تھے، تو پٹھانوں نے آس پاس کی پہاڑیوں سے پتھروں اور تیروں کی بارش کر دی اس اندھیری گھاٹی میں راستہ کی تنگی اور غاروں کی کثرت کی وجہ سے سارا لشکر پراگندہ ہو گیا۔ ایک کی ایک کو خبر نہ رہی اور پٹھانوں نے گھیر گھیر کر ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثہ میں آٹھ ہزار سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ بیربر بھی جو جان کے خوف سے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا، قتل کر دیا گیا اور جہنمی کتوں سے جا ملا۔ اس ہولناک رات کو بہت سے بادشاہی امیر اور سردار جیسے حسن خاں بنی، خواجہ عرب بخشی، خان جہاں اور ملا شیری شاعر مارے گئے۔ پٹھانوں نے جنھیں قید کر لیا ان کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس واقعہ کی تاریخ "از خواجہ عرب حیف" سے نکلتی ہے۔ اس میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

اس شکست کے بعد حکیم ابوالفتح اور زین خاں پہنچے۔ ان لوگوں نے بیربر جیسے مصاحب کو مخالفت کی بنا پر ہلاک کروا دیا تھا اور ان کی یہ منافقت ثابت ہو چکی تھی اس لیے کچھ دن تک یہ لوگ عتاب میں رہے اور کورنش سے محروم کر دیے گئے، بعد میں پھر ان کے منصب بحال ہو گئے بلکہ اس سے بڑے مدارج تک ترقی پائی۔

بیربر کا ماتم اکبر کو کسی امیر کے مرنے کا اتنا رنج نہیں تھا جتنا بیربر کی موت کا۔ نہایت حسرت سے کہتا تھا: افسوس اس کی لاش اس گھاٹی سے نہیں لائی جا سکتی کہ اسے چتا تو نصیب ہو جاتی۔ پھر یہ کہہ کر خود تسلی دیتا کہ وہ تمام پابندیوں سے آزاد مجرد شخص تھا، اسے پاک کرنے کے لیے نیر اعظم کی تمازت کافی، ویسے بھی اسے پاکی کی ضرورت نہ تھی۔

روشنائی قبیلہ کی شکست پٹھانوں کے اٹک کی طرف پیش قدمی کی خبر گرم تھی، اس لیے بادشاہ نے دوسرے دن شاہزادہ سلطان مراد اور راجہ ٹوڈر مل کو دریائے سندھ عبور کرا کے سرکش پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے مامور کیا۔ بعد میں شاہزادہ کو واپس بلا لیا، صرف راجہ کو یہ مہم سپرد کر دی گئی۔ اس نے اس کوہستان میں کئی ایک قلعے بنوائے۔

مان سنگھ روشنائی قبیلہ پر مامور تھا۔ اس نے ان کے بہت سے آدمیوں کو ہلاک و اسیر کر لیا۔ اس دوران میں عبداللہ خان کا ایلچی میر قریشی اس کا خط لے کر وہاں پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی بلخ کا حاکم نظر اوزبک بھی عبداللہ خاں سے بگڑ کر اپنے تین بچوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کو لانے کے لیے شیخ فرید بخشی کو احدیوں کے ایک دستہ کے ساتھ روانہ کیا۔ انھوں نے جا کر آنے والوں کو کوتل خیبر عبور کرایا۔ روشنائی قبیلہ کے آدمیوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

اکتیسواں سن جلوس ۲۵ ربیع الاول ۹۹۴ھ نوروز آ پہنچا اور جلوس کا اکتیسواں سال (تاریخ نظامی کے حساب سے بتیسواں) شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن اٹک کے بادشاہی دیوان خانہ میں منایا گیا۔ میر قریش کو کورنش کی اجازت ملی۔ مان سنگھ بھی اس جشن میں شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ شیخ فیضی نے مبارک بادی کا قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے ؎

فرخندہ باد یا رب بر مملکت ستانی
از مبدۂ خلافت آغاز قران ثانی

واضح رہے کہ یہاں جلوس کے پہلے سال کے تعین میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے، اس کی طرف پہلے بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں میرزا کے صاحبزادے محمد شریف نے اپنے باپ کی وفات کے بعد تاریخ نظامی کے سنوں کی تنقیح کی ہے۔ اختلاف سن کو رفع کرنے کے لیے اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

حاکم کشمیر سے صلح

میرزا شاہ رخ راجا بھگوان داس اور شاہ قلی خاں محرم کشمیر میں کوتل پھولباس تک پہنچ چکے تھے۔ جب انھیں زین خاں کی شکست کی خبر ملی تو انھوں نے حاکم کشمیر یوسف خاں سے اس شرط پر کہ کشمیر کے زعفراں زار کی سالانہ پیداوار اور سکہ خالصہ اکبر شاہی سے منسوب رہے گا صلح کر لی اور وہاں اپنے کارندے مقرر کر کے سارا علاقہ حسب سابق یوسف خاں کو تفویض کر دیا۔ یوسف خاں دربار شاہی میں حاضری کا بہت زیادہ خواہشمند تھا اس لیے یہ سب امیر اسے ہمراہ لے کر بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے اس صلح کو پسند نہ فرمایا اس لیے ان امیروں کو بڑی ہی شرمندگی ہوئی اور وہ منہ چھپائے بیٹھے رہے۔ آخر شرف آفتاب (نوروز) کے دن سب کو بلا کر کورنش کی اجازت مرحمت فرمائی۔

انہی دنوں عبداللہ خاں اوزبک کا ایلچی اور مذکورہ سردار نظر بی اپنے بچوں کے ساتھ باریاب ہوا۔ نظر بی کو چار لاکھ تنکہ جو عراق کے پانچ سو تومان کے مساوی ہے مرحمت کیا گیا۔

اکبر کی لاہور کو واپسی

۲۴ ربیع الثانی ۹۹۴ھ کو بادشاہ نے اٹک سے لاہور واپسی کا ارادہ کیا۔ دریائے بہت کے کنارے پٹھانوں کے مقابلہ پر مان سنگھ کے بجائے اسماعیل قلی خاں کو اور کابل پر مان سنگھ کو مامور کیا گیا۔ اسماعیل قلی خاں کی کمک کے لیے سید حامد بخاری کو راستہ کی حفاظت و انتظام کے لیے پشاور میں متعین کیا گیا۔

۱۷ ماہ جمادی الثانی کو لاہور میں نزول اجلال ہوا۔ اسی وقت عرب بہادر کا سر جو بھڑائچ میں حکیم ابوالفتح سے جنگ میں مارا گیا تھا ملاحظہ شاہی میں پیش کیا گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بہادر طبعی موت مرا تھا۔ حکیم نے مردہ کا سر کٹوا کر بھجوا دیا۔

شہزادہ سلیم کا عقد اور راجہ بھگونت داس کی خودکشی

۱۹ ماہ رجب کو رائے سنگھ بھٹہ کی لڑکی سے شہزادہ سلطان سلیم کا عقد کیا گیا۔

شعبان کے اوائل میں محمد قاسم خاں میر بحر اور فتح خاں فیل بان فوجدار اور امراء کی ایک جماعت کشمیر کو فتح کرنے کے لیے مامور کی گئی۔ اس سے پہلے یوسف خاں کشمیری کو جو راجہ بھگوانداس کے قول و قرار پر چلا آیا تھا۔ اکبر نے قید کر کے قتل کرا دینے کا ارادہ کر لیا۔ بادشاہ کے یہ تیور دیکھ کر راجہ بھگوان داس نے اپنے قول و قرار کی حمیت و غیرت میں اپنے آپ کو جمدھر مار لیا۔

یعقوب کشمیری کی بغاوت

یوسف خاں کا لڑکا یعقوب دربار شاہی کے مصاحبوں میں شامل تھا اور مظفر گجراتی کی طرح اس کا بھی انتیس چالیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ وہ کسی طرح بھاگ کر کشمیر واپس چلا گیا۔ چونکہ متعصب رافضی تھا اس لیے اس نے وہاں کے سنی قاضی کو اپنے ہاتھ سے شہید کر دیا اور اپنے باپ کے امیروں اور افسروں کو بہکا

کرکے کشمیر کی حکمرانی ہاتھ میں لے لی، کیوں کر وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کا باپ قتل کرا دیا گیا ہے۔ جب بادشاہی فوج کوتل کترول میں پہنچی تو یعقوب اس کے مقابلہ پر ایک بھاری لشکر لے کر آیا۔ پہاڑ کی گھاٹیوں کو اچھی طرح مستحکم کر کے لڑائی کے لیے کمربستہ ہوگیا۔ یعقوب ایک اوباش طبیعت آدمی تھا اور اپنے آدمیوں سے بدسلوکی کرتا رہتا تھا اس لیے اس کے ملازموں کی ایک جماعت ساتھ چھوڑ کر محمد قاسم خاں سے آکر مل گئی اور کچھ لوگوں نے کشمیر کے حاکم نشین شہر سری نگر میں اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ یعقوب نے پہلے گھر کے فتنہ کا سدباب ضروری سمجھا اور وہاں سے لوٹ کر شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کے پیچھے شاہی فوجیں بغیر کسی رکاوٹ کے کشمیر میں داخل ہوگئیں اور سارا کشمیر شاہی قبضہ میں آگیا۔ یعقوب مقابلہ کی تاب نہ لاکر فرار ہوگیا اور کوہستان میں جاکر پناہ لی۔

یوسف اور یعقوب کا انجام

یعقوب نے دوبارہ لاؤلشکر جمع کر کے قاسم خاں سے جنگ کی، لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی۔ ایک مرتبہ اس نے شب خون بھی مارا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس جنگ میں میرزادہ طے خاں مارا گیا۔ بادشاہی فوجوں نے یعقوب کو تنگ گھاٹیوں میں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور نہایت عاجزی کے ساتھ قاسم خاں کے پاس حاضر ہوگیا اور اس کے ہمراہ خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ بعد میں بادشاہ نے اسے بہار میں مان سنگھ کے پاس جہاں اس کا باپ یوسف بھی قید تھا بھیج دیا۔ دونوں باپ بیٹے عرصہ تک قید میں رہے پھر مالیخولیا کے عارضہ میں دونوں کا انتقال ہوگیا۔

۱۹ رمضان کو بادشاہ نے میر قریش ایلچی کو حکیم ابوالفتح کے بھائی حکیم ہمام اور میر صدر جہاں مفتی ساکن بہانی کے ہمراہ قنوج سے عبداللہ خاں کے باپ سکندر خاں کی عزاداری کے لیے ماوراءالنہر کی طرف روانہ کیا۔ محمد علی خزانچی کے ہاتھ اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہندوستان کے تحائف وغیرہ بھی بھیجے۔

روشنائی قبیلہ کی فوج کشی

انہی دنوں روشنائی قبیلہ کے پٹھانوں نے بیس ہزار پیادہ فوج اور پانچ ہزار سواروں کی جمعیت لے کر سید حامد بخاری پر جو سلاطین گجرات کے عہد کا ایک بہت بڑا امیر تھا حملہ کر دیا۔ اس نے اپنی تھوڑی بہت جمعیت کے ساتھ پشاور میں ان سے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ اس حادثہ پر روشنائی قبیلہ کی سرکوبی کے لیے دربار سے زین خاں کوکہ، شاہ قلی خاں محرم اور شیخ فرید بخشی کو روانہ کیا گیا۔ مان سنگھ بھی کابل سے ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور درۂ خیبر پر پٹھانوں سے سخت جنگ کر کے اس نے روشنائی قبیلہ کو شکست دی اور وہیں ٹھہرا رہا۔ پٹھانوں نے دوسرے دن واپس آکر پھر حملہ کیا اور چوطرفہ لڑائی لڑنے لگے۔ اس وقت مان سنگھ کا بھائی مادھو سنگھ جو اوہند کے تھانہ پر اسماعیل قلی خاں کے ساتھ متعین تھا مدد کے لیے آپہنچا۔ اس تازہ کمک کے آجانے کی وجہ سے پٹھان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کے تقریباً دو ہزار آدمی مارے گئے۔

انہی دنوں بدخشاں میں میرزا سلیمان اوزبکوں سے برابر لڑتا رہا، کبھی ان کو شکست دی اور کبھی ان سے شکست کھائی، آخر عاجز ہو کر وہ کابل اور وہاں سے خیبر میں آکر مان سنگھ سے ملا اور وہاں سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوگیا۔ مرزا سلیمان ماہ ربیع الاول ۹۹۵ھ کو لاہور میں بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔

محمد زماں میرزا کا کارنامہ

شاہ رخ میرزا کا لڑکا محمد زماں میرزا بارہ سال کا تھا۔ جب اوزبکوں کے مقابلہ میں اس کے باپ کو

شکست ہوئی تو وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ عبداللہ خاں نے اسے پیرومرشد خواجہ کلاں بیگ نقشبندی کے جو خواجہ احرار کے پوتے تھے سپرد کر دیا تھا تاکہ اسے بھی وہ دوسرے اسیروں کے ساتھ قتل کرا دیں۔ خواجہ صاحب نے اس لڑکے کے عوض ایک دوسرے واجب القتل اسیر کو قتل کرا کے اسے رہا کر دیا اور وہاں سے رخصت کر دیا۔ جس زمانہ میں سلیمان میرزا دربار میں پہنچا تھا وہ ماوراءالنہر کے فقیروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بھیس بدلے ہوئے بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے ایک ہزار اشرفی انعام عطا کیا۔ پھر وہ ہندوستان سے حج کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے دوبارہ اس نے بدخشاں کا رخ کیا اور ایک اچھی خاصی فوج فراہم کر کے اوزبکوں سے مردانہ وار کئی ایک لڑائیاں لڑیں اور انھیں شکست دے کر وہاں کے سارے کوہستان پر قبضہ کر لیا۔ دشمنوں کو اپنے موروثی ملک سے نکال دیا۔ اس وقت بادشاہ نے لاہور سے دو ہزار اشرفی اور بہت سی بندوقیں، تیر اور کمان سوغات میں میر طوغان عہدی کے ذریعہ اس کے پاس بھجوائی تھیں۔ چند سال تک وہ اوزبکوں سے برابر مقابلے کرتا رہا، آخر شکست کھا کر کابل چلا آیا۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہم انشاءاللہ آگے بیان کریں گے۔

جلوس شاہانہ کا بتیسواں سال

۱۱ ماہ ربیع الثانی ۹۹۵ھ کو نوروز ہوا اور جلوس شاہی کا بتیسواں اور بقول میرزا نظام الدین تینتیسواں سال شروع ہو گیا۔

نوروز کی تقریبات حسب سابق منائی گئیں اور از سر نو ضابطہ بندی عمل میں آئی۔ ایک قانون یہ نافذ کیا گیا کہ لوگ ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں، بجز اس کے کہ عورت بانجھ نکلے، کیوں کہ خدا بھی ایک ہے اس لیے بیوی بھی ایک ہی ہونی چاہیے۔ جب عورت کی عمر کافی ہو جائے اور اس کو حیض آنا بند ہو جائے تو وہ شادی نہ کرے۔ اگر بیوہ عورتیں شادی کرنا چاہیں تو انھیں کوئی نہ روکے۔ کم عمر ہندو لڑکی کو جس نے نکاح کے باوجود شوہر کا لطف نہ دیکھا ہو ستی نہ کیا جائے، بلکہ کسی ایسے ہندو سے جس کی عورت مر چکی ہو اس کا نکاح کر دیا جائے۔

جب بادشاہی مرید ایک دوسرے سے ملیں تو سلام کے بجائے ایک "اللہ اکبر" کہے اور دوسرا "جل جلالہ" کہہ کر جواب دے۔ ہندی مہینوں کا حساب ۲۸ تاریخ سے لگایا جائے نہ کہ تیرہ تاریخ سے جیسے راجا بکرماجیت نے رواج دیا تھا۔ ہندوؤں کے مشہور تہوار اسی حساب سے منائے جائیں، لیکن یہ تاریخ رائج نہ ہو سکی، اگرچہ اس سلسلہ میں فتح پور سے اور ۹۹۰ھ میں گجرات اور بنگالہ سے فرامین صادر کیے جاتے رہے تھے۔

کم حیثیت لوگوں کو شہروں میں تحصیل علم سے روکنے کا حکم بھی نافذ ہوا، کیوں کہ بادشاہ کے خیال میں یہی لوگ پڑھ لکھ کر فتنہ و فساد مچایا کرتے ہیں۔

ایک نیا ضابطہ بنا کر ہندوؤں کے معاملات کا فیصلہ مسلمانوں کا قاضی نہیں کرے گا بلکہ وہ اس غرض کے لیے کسی دانا برہمن کے پاس رجوع کریں گے۔ اگر حلف اٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو گرم گرم لوہا انکار کرنے والے کے ہاتھ پر رکھا جائے اگر ہاتھ جل جائے تو وہ جھوٹا ہوگا ورنہ سچا، یا یہ کہ وہ جلتے ہوئے تیل میں اپنا ہاتھ ڈال دے یا یہ کہ جتنی دیر میں ایک تیر پھینکا جائے اور اسے اٹھا کر واپس لایا جائے وہ شخص پانی میں غوطہ لگائے اور اس عرصہ میں سر باہر نہ نکالے اگر وہ اس سے پہلے ہی سر نکال لے تو مدعا علیہ کو مدعی کا حق دے دیا جائے۔

ایک اور حکم دیا گیا کہ مردہ کو دفناتے وقت اس کا سر مشرق کی طرف اور پیر مغرب کی طرف رکھے جائیں، سونے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔

اسی سال بادشاہ نے جلال روشنائی کی سرکوبی کے لیے عبدالمطلب خاں کو ایک فوج دے کر بنگش کی طرف بھیجا۔ اس نے جلال کو دوسرے پٹھان سرداروں سمیت شکست دی اور بہت سے آدمیوں کو قتل کرا دیا۔ زین خاں کے لشکر کے جتنے آدمی پٹھانوں کی قید میں تھے ان کے عوض دوگنے چوگنے مرد اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔

سلطان خسرو کی پیدائش

۹۹۵ھ میں شہزادہ سلطان سلیم کے ہاں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے سلطان خسرو کی پیدائش ہوئی۔ بادشاہ نے اس خوشی میں بڑا جشن منعقد کیا۔

بیربر کے زندہ ہونے کی افواہ

اسی سال ہندوؤں نے بیربر کے زندہ ہونے کی خبر اڑا دی۔ ان لوگوں نے جب بادشاہ کو بیربر کی جدائی میں بہت زیادہ رنجیدہ اور مضطرب دیکھا تو یہ شہرت دے دی کہ لوگ اس کو شمالی کوہستان میں جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ دیکھ کر آئے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے بھی باور کر لیا کہ وہ چونکہ دنیا سے مستغنی اور مجرد تھا کوئی تعجب نہیں کہ اس نے سنیاس لے لیا ہو اور یوسف زئی پٹھانوں کے واقعہ کی شرمندگی کی وجہ سے یہاں آنا نہ چاہتا ہو۔ لوگ لاہور میں اس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتے تھے۔ بعد میں بادشاہ نے ایک احدی کو تحقیق حال کے لیے نگرکوٹ بھیجا۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ سب خبریں بے بنیاد ہیں۔

کچھ عرصہ بعد اس کی جاگیر کالنجر کے حکام نے دربار میں عریضہ بھجوایا کہ وہ کالنجر پہنچا ہوا ہے، یہاں کے ایک حجام نے تیل ملتے وقت جسم کی علامتیں دیکھ کر پہچان لیا اور وہ اسی حجام کے پاس چھپا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس کو بھجوانے کے لیے فرمان صادر کیا۔ وہاں کے کروڑی نے دراصل ایک مسافر کو بیربر کا دھوکا دینے کے لیے پکڑ رکھا تھا، راز کھل جانے کے اندیشہ سے اس نے اس غریب کو مروا ڈالا اور یہ لکھ بھیجا کہ خود بیربر آیا ہوا تھا لیکن وہ فوت ہو گیا۔ اس نے اس حجام کو بھی دربار میں نہیں بھجوایا۔ اس خبر پر بادشاہ نے دوبارہ بیربر کا ماتم کیا۔ وہاں کے کروڑی اور دوسروں کو پکڑ بلوایا اور ان کو کچھ عرصہ کے لیے قید میں ڈال دیا کہ آخر تم لوگوں نے پہلے ہی ہم کو اس کی آمد سے کیوں مطلع نہ کیا۔ اس جرمانہ میں کروڑی سے بادشاہ نے کافی روپیہ بھی وصول کر لیا۔

اسی سال صادق خاں نے ٹھٹہ پر فوج کشی کر کے قلعہ سیوان[1] کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں کے حاکم میرزا جانی بیگ نے جو محمد باقی ترخان کا پوتا تھا اپنے بزرگوں کے دستور کے مطابق دربار شاہی میں ایلچیوں کے ساتھ بہت سے نفیس تحائف اور نذرانے بھجوائے۔ بادشاہ نے ۵ ذی قعدہ ۹۹۵ھ کو ان ایلچیوں کے ہمراہ حکیم عین الملک کو میرزا جان کے پاس روانہ کیا اور وہ علاقہ اس کے لیے بحال کر کے صادق کے نام فرمان صادر کیا کہ وہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے۔

اوائل ربیع الثانی میں زین[2] خاں کوکہ کو کابل کی حکومت پر متعین کر کے مان سنگھ کو وہاں سے طلب کر لیا گیا۔ اسی مہینہ کے آخر میں

---

[1] سیہوان: کراچی سے ۹۵ میل پر واقع ہے کوٹڑی سے راستہ ہے محمد بن قاسم کے عہد میں بڑا مرکزی شہر تھا۔ ابن بطوطہ (آٹھویں صدی ہجری) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ تاریخی کتابوں میں سیستان لکھا جاتا ہے۔ پرانے قلعہ کے کھنڈر بھی ہیں کہتے ہیں پر سکندر اعظم کے عہد کے ہیں۔ یہاں ریگستان میں ایک بڑی جھیل ہے جس کا نام منچر ہے۔ لال شہباز کے مزار پر سندھی زائرین کا مجمع رہتا ہے۔

[2] زین خاں کوکہ: کوکہ رضاعی بھائی کو کہتے ہیں اکبر کا رضاعی بھائی اور شہزادہ سلیم کا خسر تھا، چار ہزاری بقول صاحب طبقات اکبری پانچ ہزاری منصب دار تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

خان خاناں مرزا خاں، "عضد اللہ" علامت الزماں شاہ فتح اللہ شیرازیؒ کو ہمراہ لے کر یلغار کرتے ہوئے گجرات سے لاہور آیا اور ۲۷ ماہ رجب کو بکر سے صادق خاں حاضر ہوا۔

گجرات کے حالات کا اعادہ

گجرات میں مظفر اور خان خاناں کے درمیان جو حالات پیش آئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مظفر دوسری شکست کے بعد ناڈوت سے چنپانیر کے راستہ سورت کی طرف بھاگ گیا تھا اور قلعہ جوناگڑھ سے پندرہ کوس پر بمقام کوندل ٹھہرا رہا۔ تین ہزار سواروں کی جمعیت اس نے جمع کر لی اور امین خاں غوری حاکم سورت کو ایک لاکھ محمودی سکہ، مرصع خنجر رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا، اسی قدر رقم اس نے جام کو بھی دی جو عرصہ سے احمد آباد کی فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امین خاں تجربہ کار آدمی تھا اس نے اسے یہ جھانسا دیا کہ تم ستر سال جام کے پاس چلو اور اسے لے کر آگے بڑھو، میں بھی بس تمھارے پیچھے آتا ہوں۔ جام نے بھی اس کے ساتھ چال چلی اور لشکر کی تیاری کا بہانہ کر کے پیچھے رہ گیا۔ مظفر احمد آباد سے ساٹھ کوس پر ایک موضع میں امین خاں غوری اور جام کا انتظار کرنے لگا۔

خانخاناں کو جب خبر ملی تو اس نے نہایت تیز رفتاری سے کوچ کیا اور اپنی فوجیں لے کر اس کے سر پر آپہنچا۔ مظفر جب امین خاں اور جام کی کمک سے مایوس ہوگیا تو ناچار حیران و سراسیمہ کوہستان کی طرف بھاگ گیا اور سورت کے ایک شہر دوار کا میں جا کر پناہ لی۔ جام نے اپنے وکیل کو اور امین خاں نے اپنے لڑکے کو شاہ ابو تراب کے وسیلہ سے خان خاناں کے پاس بھیجا اور جام کے آدمی خانخاناں کو کوہستان میں لے کر گئے۔ وہاں اسے کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔

مظفر ایک ہزار مغل اور کاٹھی سواروں کے ساتھ جو اس کے ننہیال کے رشتہ دار ہوتے ہیں گجرات جا کر اشنیرہ نامی ایک مقام میں پناہ گزیں ہوگیا۔ یہ جگہ دریائے سابرمتی کے کنارے ہے اور کٹے پھٹے کراروں پر واقع ہے۔ سرکش کولیوں کی جائے پناہ ہے۔ خانخاناں نے دور اندیشی سے کام لے کر پہلے ہی اس خطرناک مقام پر اپنے چند امراء کو متعین کر رکھا تھا۔ جب مظفر وہاں آیا تو ان امیروں نے سید قاسم بارہہ کی سرداری میں اس پر حملہ کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد مظفر کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھی اور چتر آفتابی آفتاب پرستوں کے ہاتھ آگیا۔ اس کے رشتہ دار مارے گئے اور وہ بھاگ کر سورت کے علاقہ کاٹھیاواڑ کو بھاگ گیا۔

خانخاناں جب بڑودہ سے واپس ہوا تو اس نے جام پر فوج کشی کر دی جام نے بھی آٹھ ہزار سوار جمع کر لیے۔ کہتے ہیں جام کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہندی راگ سے بڑا شغف تھا۔ شعر گوئی سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کا ایک شعر ہے: ؎

آرام من نے دہد ایں چہرخ کج خرامی

تار شتہ مراد بسوزن در آورم

اکثر معرکوں میں اکبر کے ساتھ رہا ہے۔ درباری معاملات میں اس کے مشورے بھی اہمیت رکھتے تھے۔ اکبر کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ عربی اور سنسکرت پر بڑا عبور تھا۔ ۱۵۹۹ء / ۱۰۰۸ھ میں اکبر کے ساتھ دکن کی مہم پر گیا تھا۔ تان سین اور زین خاں کی بڑی دوستی تھی۔ کہتے ہیں دوتارہ اور ستارہ اسی کی ایجاد ہے۔ اس کے ایجاد کیے ہوئے باجے لندن میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں اس کی بعض تصنیفات کا فرنچ میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ چتوڑ کے قلعہ میں جو سرنگ لگائی گئی تھی وہ زین خاں ہی کے اہتمام میں تیار ہوئی تھی۔ وہی سب سے پہلے حملہ کر کے قلعہ میں داخل ہوا تھا۔ اس نے موسیقی کے اصولوں پر ایک کتاب بھی نظم میں لکھی تھی۔ عرفی کے قصیدہ کا شعر تھا ؎ جہاں بگشتم و دردا بہ ہیچ شہر و دیارہ نیافتم کہ فروشند بخت در بازار۔ جب عرفی نے یہ شعر پڑھا تو زین خاں نے فی البدیہہ جواب میں کہا ؎ چہ مفلسے کہ نباشد بدست یک دینار ٭ چہ شود ار بفروشند بخت در بازار

دو ہزار آدمیوں نے کھانا نہ کھانے کی قسم کھائی تھی اور جان دینے کا حلف اٹھایا تھا۔ جب جام اپنی جمعیت کو لے کر مقابلہ پر آیا اور دونوں فوجوں میں آٹھ کوس کا فاصلہ رہ گیا تو جام نے گھبرا کر اطاعت قبول کر لی اور اپنے لڑکے کو تین ہاتھی اٹھارہ کچھی گھوڑے جو عربی گھوڑے کے مشابہ ہوتے ہیں اور دوسرے تحائف دے کر خان خاناں کی خدمت میں بھیجا۔ اس موقع پر خانخاناں حسب فرمان پہلی مرتبہ گجرات سے فتح پور پہنچا تھا۔

اس کے غیاب میں مظفر نے کاٹھیوں اور دوسرے زمینداروں کی مدد لے کر قلعہ جوناگڑھ[1] کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت قلیچ خاں کے حسب ہدایت نظام الدین احمد اور سید قاسم بارہہ نے احمد آباد سے سورت کی طرف کوچ کیا۔ مظفر ان سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر گجرات بھاگ گیا، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

دکن پر فوج کشی اور پسپائی

جب خانخاناں سروہی اور جالور کے راستہ احمد آباد پہنچ گیا تو بادشاہ نے دکن پر حملہ کے لیے عضد الدولہ کو میر مرتضیٰ اور خداوند خاں حاکم برار، اعظم خاں اور شہاب الدین احمد خاں اور مالوہ کے تمام امراء کے ساتھ مامور کیا اور اس علاقہ کے تمام جاگیرداروں کے نام فرمان صادر ہوا کہ اعظم خاں کی سرداری میں پہلے تو برار کا علاقہ دکنیوں کے ہاتھ سے چھین لیا جائے۔ بعد میں سب مل کر احمد نگر پر حملہ کر دیں، چنانچہ یہ فوجیں حسب الحکم روانہ ہوئیں اور دکن کی سرحد پر بمقام ہندیہ انھوں نے اپنا کیمپ لگا دیا، لیکن یہاں ان امیروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اعظم خاں کو شہاب الدین احمد خاں سے پرانی خصومت تھی کیوں کہ اس کا باپ شہاب الدین احمد خاں کی فتنہ پردازی کی وجہ مارا گیا تھا اس لیے وہ اس کو اور عضد الدولہ کو محفلوں اور نشستوں میں تنگ کرتا رہتا تھا اور حق استادی کے باوجود عضد الدولہ کا مذاق اڑاتا رہتا تھا۔ اس کے اس طرز عمل سے شہاب الدین خاں رنجیدہ ہو کر اپنی جاگیر رائے سین کو لوٹ گیا۔ اعظم خاں نے اس پر حملہ کر دیا۔ خواجہ فتح اللہ بخشی اور دوسرے نو دولتیے سردار اس فتنہ کو خوب ہوا دے رہے تھے لیکن عضد الدولہ نے دوڑ دھوپ کر کے اس قصہ کو رفع دفع کرا دیا۔

شاہی لشکر کے اس باہمی نفاق کی وجہ آسیر اور برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کو اچھا موقع مل گیا اور وہ دکنی لشکر کو اپنے ساتھ لے کر مقابلہ پر آ گیا۔ شاہی لشکر مقابلہ کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے عضد الدولہ راجہ علی خاں کے پاس گیا اور بڑی کوشش کی کہ وہ مقابلہ کا ارادہ ترک کر دے لیکن راجہ علی خاں واپس جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ یہ صورت حال دیکھ کر عضد الدولہ یہاں سے نکل کر گجرات آ گیا اور خان خاناں کو دکن پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے لگا۔

راجہ علی خاں کے مقابلہ میں اعظم خاں تنہا رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر برار کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں بھی اس کے قدم ٹک نہ سکے۔ وہاں سے وہ شہر ایلچ پور چلا گیا اور اس شہر کو بری طرح لوٹا۔ دکنی فوجیں اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ ایلچ پور سے بندر بار چلا گیا اور وہاں سے لشکر کے چند آدمیوں کے ہمراہ اپنے بہنوئی خان خاناں سے مدد لینے کے لیے احمد آباد پہنچا۔

---

[1] جوناگڑھ: کاٹھیاوار گجرات کا قدیم شہر ہے مغلوں کے عہد میں حاکم نشین جگہ رہی ہے۔ یہاں عرصہ تک جام خاندان کے لوگ حکمران رہے۔ اکبر کے عہد میں یہ مغل سلطنت میں شامل ہو گیا۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں صلابت خاں نامی ایک امیر نے یہاں خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ اٹھارویں صدی میں انگریزوں کی سرپرستی میں یہ ریاست قائم رہی۔ تقسیم ہند کے وقت پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تھا لیکن بھارت نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ اس کا رقبہ ۳ ہزار ۳ سو ۸۳ میل۔ آبادی ۷ لاکھ کے قریب رہی ہے۔ جوناگڑھ ببر شیر کے شکار کے لیے مشہور رہا ہے۔ یہاں کا قلعہ مضبوطی میں مشہور ہے۔ نور باغ جہانگیر کے مقبرے اور مسجد قابل دید ہے۔ کوہ گرنار پر جینیوں کے پرانے مندر بھی تاریخی یادگار ہیں۔

خانخاناں نے اس کا استقبال کیا۔ ان کی ملاقات محمود آباد میں نظام الدین احمد کے گھر پر ہوئی۔ اعظم خاں اپنی بہن سے ملنے کے لیے خانخاناں کے ساتھ احمد آباد چلا گیا۔ نظام الدین احمد کو اس علاقہ میں متعینہ امیروں کے ساتھ بڑودہ کی طرف بھیجا گیا اور ان کے پیچھے یہ دونوں سردار بھی احمد آباد سے روانہ ہو گئے۔ اعظم خاں تیز رفتاری سے کوچ کرتا ہوا بندر بار اپنے لشکر میں پہنچ گیا اور خان خاناں بھڑوچ جا پہنچا۔ اس کے بعد اعظم خاں نے اس کو لکھا کہ بارش کا موسم آچکا ہے، اس لیے دکن کی مہم کو اس سال ملتوی کر دینا چاہیے۔ چنانچہ خانخاناں بھڑوچ سے احمد آباد کو لوٹ گیا اور اعظم خاں ندربار مالوہ چلا گیا اور راجہ علی خاں دکنی فوجوں کو لے کر اپنے وطن واپس ہو گیا۔

اس واقعہ کے پانچ ماہ بعد اٹک بنارس میں جسے اٹک کٹک بھی کہتے ہیں خانخاناں کی عرضداشت پہنچی کہ حضور والا بدخشاں پر فوج کشی کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہیں، میری خواہش ہے کہ میں بھی اس سفر میں ہمرکاب رہوں۔ جب اٹک سے لاہور کو لشکر پہنچ گیا تو اس کے نام فرمان گیا کہ قلیج خاں اور نظام الدین احمد تو گجرات میں ٹھہرے رہیں اور خان خاناں بارگاہ میں حاضر ہو جائے۔ خانخاناں کے دوبارہ لاہور حاضر ہونے اور عضد الدولہ کو ساتھ لانے کا یہی سبب تھا۔

خان خاناں کے غیاب میں گجرات میں نظام الدین احمد نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے جس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے تاریخ نظامی میں بھی کیا ہے۔

میر ابوالغیث بخاری کی وفات

اسی سال میر ابوالغیث بخاری جن کی تعریف حد بیان سے باہر ہے، لکھنؤ میں قولنج کے عارضہ میں انتقال فرما گئے۔ ان کی میت دہلی لاکر خاندانی مقبرہ میں دفن کی گئی۔ ان کی تاریخ وفات "میر ستردہ سیر" سے نکلتی ہے۔ میں نے ان کی شان میں حسب ذیل مرثیہ کہا تھا:

مرثیہ:

بگورستان او روزے عبورے کردم از عبرت ۔۔۔ جہانے دیدم از آسودگان یکسر بمیدانش
ازیں سو رفتہ انبوہے وزآں سو نامدہ یک کس ۔۔۔ کہ از وے حال پرسم یا نشاں باشد از ایشانش
دراں شہر خموشاں از زبان داناں من جمعے ۔۔۔ زشارستان گیتی رفتہ و گردیدہ مہمانش
ازاں جملہ امیرے پاک طینت بو تراب آئیں ۔۔۔ ابوالغیث آنکہ گردوں غوث خواند قطب گیہانش
زہے شائستہ سیرت سیدی فرخندہ طلعت ہم ۔۔۔ کہ خلق مصطفےٰ بودی عیاں در روئے خندانش
بخارائی کہ دہلی قبۃ الاسلام بود از وے ۔۔۔ چہ شد آں قبہ و آں اسلام و یارب کو مسلمانش
چو درویش سپاہی بود خاک پالیش ار یابم ۔۔۔ کشم در چشم بخت خویش چوں کحل صفاہانش
بہ بالینش ز قندیل دل خود سوختم شمعے ۔۔۔ اگرچہ مشعل ربانی آمد نور ایمانش
بساط مرقد او ساختم نمناک از اشکی
اگرچہ ابر رحمت مشت از باراں غفرانش

عربی علوم پر پابندی

اسی سال حکم نافذ ہوا کہ لوگ علوم عربیہ کو بڑھنا ترک کر دیں اور نجوم، حساب، طب اور فلسفہ کے علاوہ

کچھ اور پڑھانہ جائے۔ اس حکم کی تاریخ نفاذ "کساد فضل" سے نکلتی ہے۔

اسی سال ماہ شعبان میں مان سنگھ دربار میں حاضر ہوا۔ خبر پہنچی کہ عبداللہ خاں نے ہرات فتح کرلیا ہے اور وہاں کے حاکم علی قلی خاں کو بے شمار ترکمانوں اور باشندگان ہرات کے ساتھ قتل کرادیا ہے۔ اس کی تاریخ "شکست ہری" سے نکالی گئی۔

مان سنگھ کا بے باکانہ جواب

محرم ۹۹۶ھ میں مان سنگھ کو بہار، حاجی پور اور پٹنہ کے علاقہ پر مقرر کیا گیا۔ عاشورہ کی رات مان سنگھ اور خان خاناں کو خلوت میں بادشاہ نے بلاکر دوستانہ انداز میں گفتگو کی اور اپنے دین کی ترغیب دینے کے لیے ان سے بطور آزمائش کچھ باتیں کیں۔ مان سنگھ نے بے جھجک جواب دیا اگر حضور کی مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو ہم تو اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے ہوئے خدمت میں حاضر ہیں، کسی اور طرح ہم کو آزمانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور منشا ہے اور اس کا تعلق دین اور مذہب سے ہے تو میں اعتقاداً ہندو ہوں، اگر حکم ہو تو مسلمان بن جاؤں۔ ان دو کے علاوہ میں کوئی اور تیسرا راستہ نہیں جانتا کہ وہ کون سا ہے؟ اس کے اس جواب پر اکبر نے اس معاملہ کو اسی جگہ ختم کردیا اور مان سنگھ بنگالہ کی جانب رخصت ہوگیا۔

تقرر اور تبادلے

انہی دنوں بادشاہ نے کشمیر کی حکومت پر میرزا یوسف خاں رضوی مشہدی کا تقرر فرمایا اور محمد قاسم خاں کو وہاں سے واپس بلالیا۔

۱۲ صفر ۹۹۶ھ کو محمد صادق خاں کو یوسف زئی قبیلہ کی سرکوبی کے لیے بجور کی طرف رخصت کیا اور سیالکوٹ وغیرہ جو مان سنگھ کی جاگیر میں تھا اسے عطا کردیا۔ اسماعیل قلی خاں[1] کو بجور سے بلاکر گجرات میں قلیچ خاں کی جگہ متعین فرمایا۔ قلیچ خاں کو دربار میں بلالیا۔

ملا احمد کا قتل اور قصاص

اسی مہینہ میرزا فولاد بیگ برلاس نے آدھی رات کے وقت ملا احمد رافضی کو جو علانیہ صحابہ پر تبرا کرتا تھا کسی بہانہ گھر سے باہر بلوایا اور اسے قتل کردیا۔ اس کے قتل کی تاریخ "زہی خنجر فولاد" سے نکلتی ہے۔ ایک دوسری تاریخ "خوک سقری" ہے۔ میں نے خود اس کتے کو نزع کے وقت دیکھا تھا، خدا پناہ میں رکھے اس کی شکل بالکل سور جیسی ہوگئی تھی۔ یہ میں نے ہی نہیں بلکہ دوسروں نے بھی اسی طرح دیکھا تھا۔ اس کے قصاص میں میرزا فولاد کو ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر شہر لاہور میں گھسیٹا گیا اور وہ شہید ہوگیا۔ اکبر نے حکیم ابوالفتح کو بھیج کر اس سے پوچھا تھا کہ "تو نے مذہبی تعصب کی وجہ سے ملا احمد کو قتل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا" اگر تعصب ہوتا تو اس کے بجائے میں اس سے کسی اور بڑے کو قتل کرتا۔" حکیم نے یہی جملہ جاکر بادشاہ کو سنادیا۔ اکبر نے کہا "یہ تو بڑا حرامزادہ ہے اس کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔" اسی لیے

---

[1] اسماعیل قلی خاں: بیرم خاں کا بھانجا اور خان جہاں حسین قلی خاں کا چھوٹا بھائی تھا، بیرم خاں کی بغاوت میں ساتھ تھا۔ جالندھر میں بیرم خاں کو شکست ہوئی تو یہ گرفتار ہوکر آیا اور اپنے بھائی کے ساتھ اکبر شاہی میں ملازم رہا۔ ۳۱ سنہ جلوس میں راجہ بھگوان داس کو جنون کا عارضہ ہوا تو اس کا قائم مقام بنا۔ ۳۳ سنہ جلوس میں گجرات پر حاکم بنا کر بھیجا گیا۔ اسی سال مالوہ میں شاہزادہ مراد کی اتالیقی پر تقرر ہوا۔ ۳۹ سنہ جلوس میں کالپی اپنی جاگیر پر متعین رہا ۴۳ سنہ جلوس میں چار ہزاری منصب ملا۔ یہ نہایت عیاش شخص تھا ۱۲ سو عورتیں حرم میں تھیں مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ حرم کی بعض عورتوں نے زہر دے کر مار ڈالا۔

اس کو موت کی سزا دی گئی، ویسے بادشاہ اس کی بہادری اور اہل حرم کی سفارش کی وجہ سے اس کو معاف ہی کر دینا چاہتے تھے۔ قاتل کو موت کی سزا مل گئی، لیکن مقتول کاری زخم کھا کر ابھی زندہ تھا، اپنے قاتل کی موت کے تین چار دن بعد وہ فوت ہوا۔ شیعوں نے اپنے مذہب کے دستور پر اس کی مقعد میں ایک میخ ٹھونک کر دریا میں اسے غوطہ دیا۔ دفن کرنے کے بعد ابوالفضل اور فیضی نے اس کی قبر پر محافظوں کا پہرہ لگا دیا۔ اس کے باوجود لاہور والوں نے اس وقت جب کہ بادشاہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے اس کی قبر کھود ڈالی اور اس کی ناپاک لاش کو جلا دیا۔

جلوس کا چونتیسواں سال

۲۲ ربیع الثانی ۹۹۶ھ کو نوروز واقع ہوا اور جلوس کے ۳۳ ویں یا ۳۴ ویں سال کا آغاز ہوا۔ دربار عام میں جس کے ایک سو چودہ ایوان ہیں، بڑے نفیس کپڑے اور مصور پردے لٹکائے گئے، بڑی آرائش و زیبائش عمل میں آئی۔ اس سال بھی بہت سے خلاف شرع احکام نافذ کیے گئے۔ اس سال کی تاریخ "شیوع معصیت" سے نکلتی ہے۔

ٹوڈرمل پر قاتلانہ حملہ

انہی دنوں قلیچ خاں گجرات سے آ کر باریاب ہوا اور بہت سے نذرانے گزرانے۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا کہ وہ راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ دفتر شاہی میں ملکی اور مالی معاملات سر انجام دے۔ ان دنوں ٹوڈرمل نہایت خوفزدہ اور بدحواس ہو گیا تھا کیوں کہ ایک رات اس کے کسی دشمن نے جو گھات میں لگا ہوا تھا اس پر تلوار سے حملہ کیا تھا۔ اس حملہ سے راجہ زخمی ہو گیا تھا، لیکن زندگی تھی بچ گیا۔

کمایوں کے راجہ کی آمد

انہی سال کمایون کا راجہ بادشاہ سے ملنے کے لیے کوہ سوالک سے آیا۔ اس سے پہلے وہ یا اس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی کسی بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔ اس نے لاہور میں باریابی حاصل کی اور قسم قسم کے تحائف اور نذرانے پیش کیے۔ ان میں کچھ تو گائیوں کی عجیب عجیب دُمیں تھیں اور ایک مشکی ہرن بھی تھا لیکن وہ گرمی کی وجہ سے راستہ ہی میں مر گیا تھا۔ میں نے بھی اس مردہ ہرن کو دیکھا، بالکل لومڑی جیسا تھا۔ اس کے دو چھوٹے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور سینگوں کی جگہ کچھ ابھار سا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ لپٹا ہوا تھا، اس لیے اس کا پورا جسم دکھائی نہیں دیا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ان کے ملک میں پردار آدمی بھی ہوتے ہیں جو اڑتے ہیں اور آم کا ایک ایسا درخت بھی وہاں ہوتا ہے، جو سال بھر پھل دیتا ہے۔

انہی دنوں حکیم عین الملک بھی میرزا جان کے سفیروں کے ساتھ حاضر ہوا۔ طرح طرح کے نذرانے پیش کیے اور بادشاہ کی مرحمتوں سے فیض یاب ہوا۔

رامائن کا ترجمہ

ماہ جمادی الاول ۹۹۶ھ میں میں نے رامائن[1] کا ترجمہ مکمل کر کے پیش کیا۔ یہ ترجمہ میں نے چار سال میں ختم کیا تھا اور اس کے دو نسخے مرتب کر دیے تھے۔ ترجمہ کے آخر میں میں نے یہ شعر لکھا تھا ؎

---

[1] رامائن: یہ ہندوؤں کی سب سے قدیم مذہبی کتاب ہے۔ ۶۰۰ قبل مسیح سے بھی بہت پہلے کی تصنیف ہے۔ مشہور ہے کہ اسے بالمیک رشی نے مرتب کیا تھا اس میں سنسکرت کے ایک لاکھ دس ہزار اشعار ہیں۔ کتاب کا مرکزی قصہ رام چندر جی کے بن باس سیتا جی کے اغوا راون سے لڑائی کا مشہور قصہ ہے۔ اکبر کے عہد میں تلسی داس نے بھی ہندی زبان میں رامائن کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ آریوں کے زمانہ شجاعت کی کتابیں دو قسموں پر مشتمل ہیں، ایک تو شرتی "الہامی

(باقی اگلے صفحہ پر)

ماقصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند
جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا "یہ کتنے جز میں مکمل ہوا"۔ میں نے عرض کیا پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر جز میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس جز میں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس طرح مصنفوں کا دستور ہے اس کا دیباچہ بھی لکھ دو" دیباچہ کی اتنی ضرورت نہ تھی پھر نعت کے بغیر اس کا خطبہ لکھنا پڑتا! اس لیے میں نے دیباچہ کے معاملہ کو ٹال دیا۔ میں اپنے اس سیاہ نامہ سے جو میرے نامۂ اعمال کی طرح داغدار ہے، خدا کی پناہ چاہتا ہوں، لیکن "نقل کفر کفر نیست"۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کراہتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے میرے لیے لعنت بن جائے گی۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور پناہ میں رکھے۔

مکار قلندر کا فریب

انہی دنوں شیخ کمال بیابانی نامی ایک قلندر کو دریائے راوی کے کنارے سے لوگ لے کر آئے کہ یہ عجب باکمال آدمی ہے کہ ساتھیوں سے باتیں کرتے کرتے پلک جھپکتے میں دریا کے دوسرے کنارے پر چلا جاتا ہے اور وہاں سے پکار کر کہتا ہے کہ "اے فلاں اب تم اپنے گھر چلے جاؤ"۔ بادشاہ اس کو خلوت میں دریا کے کنارے لے کر گئے اور اس سے کہا کہ "ہم ایسی چیزوں کے بڑے مشتاق ہیں، اگر تم یہ کرامت ہم کو دکھلا دو تو ہمارا ملک و مال سب تمہارا ہوگا اور ہم بھی تمہارے مرید بن جائیں گے"۔ وہ جواب میں کچھ بولا نہ کوئی حرکت کی۔ اسے گم سم دیکھ کر بادشاہ نے کہا "ہم تجھے ہاتھ پیر باندھ کر قلعہ پر سے دریا میں پھینک دیں گے اگر تو پانی سے صحیح سلامت نکل آیا تو کیا کہنے ورنہ تو اپنے آپ جہنم رسید ہو جائے گا"۔ اب تو وہ بڑا اسٹپٹایا اور اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ میں یہ سارا ڈھونگ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے کرتا ہوں۔ اس نے یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے لڑکے کو جو اس کا ہم شکل تھا دریا کے دوسرے کنارے پر ٹھہرا دیتا تھا اور مغرب کے وقت کسی نہ کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچتا اور وضو کے بہانے وہاں کسی کھوہ میں چھپ جاتا۔ اس وقت اس کا بیٹا دوسرے کنارے سے اس کے ساتھی کا نام لے کر آواز دیتا تھا کہ "بس اب تم اپنے گھر لوٹ جاؤ"۔ بادشاہ نے اس کو بکر میں بھیج دیا، وہاں بھی اس نے اپنی کرامتوں کا بڑا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔ خانخاناں [1] اس کا نائب دولت خاں بھی اس کے پھیر میں آ گئے۔ اس نے ان کو طرح طرح کے کرتب دکھائے اور ایک مرتبہ جمعہ کی رات کو بازی گروں کی طرح اپنے جسم کے عضو عضو کو الگ الگ کر کے دکھایا اور ان کرامتوں سے دولت خاں افغان کو جو خانخاناں کا نفس ناطقہ اور وکیل کل تھا، اپنا معتقد اور مرید بنا لیا۔ خانخاناں نے بھی اس کی عقیدت میں دھوکا کھایا۔ اس چالباز نے خانخاناں سے ایک سونے کا گیند اپنے شیخ کے نام پر حاصل کر کے کہا کہ خضر علیہ السلام نے تمہارے نام دعا سلام کہلوایا ہے، پھر وہ اس گیند کو دریا میں لے کر گیا اور جعل و مکاری سے خانخاناں کے سامنے اس کے بجائے کانسے کی ایک گیند دریائے سندھ میں ڈال دی اور سونے کی گیند اڑا لے گیا۔

رامائن کے ترجمہ کا صلہ

انہی دنوں بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمہ کا کچھ صلہ مجھے عنایت فرمایا جائے، چنانچہ ایک دن شاہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کتابیں۔ سمرتی کے معنی سنی ہوئی باتوں کے ہیں جیسے وید اپنشد آرنیک وغیرہ۔ دوسرے "سمرتی" لفظی معنی یاد رکھنے کی باتیں سینہ بہ سینہ آنیوالی داستانیں جیسے رامائن، مہابھارت وغیرہ۔ "وید" میں رگ وید، یجروید، سام وید، اتھروید، برہمن گرنتھ اور اٹھارہ پران شامل ہیں۔ رامائن مہابھارت سے پہلے کی تصنیف ہے جسے ویاس جی نے لکھا تھا اس پر ایک حاشیہ ہم لکھ چکے ہیں۔ مہابھارت میں رامائن کے اکثر کرداروں کا ذکر ہے لیکن مہابھارت کی شخصیتوں کا رامائن میں ذکر نہیں

فتح اللہ عضدالدولہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ فی الحال یہ شال عبدالقادر کو دے دو، گھوڑا اور خرچہ بھی اسے عنایت کیا جائے گا۔" بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو بساور کی جاگیر عطا کر دی اور وہاں کے اماموں کی اراضیات کے متعلق فرمایا کہ یہ سب تم کو بخش دی گئیں۔" پھر میرا نام لے کر کہا" یہ نوجوان بدایون کا رہنے والا ہے اس کی مدد معاش کو ہم کسی قصور کے بغیر دیدہ و دانستہ بساور سے منقطع کر کے بدایون میں مقرر کیے دیتے ہیں۔" شاہ فتح اللہ نے ایک ہزار روپیہ کی تھیلی حضور میں پیش کی کہ میرے کارندوں نے یہ رقم اماموں کی معاش سے بچا کر بھیجی ہے حالانکہ یہ رقم اس کے شقدار نے پرگنہ بساور کے ائمہ کی بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و تعدی کر کے وصول کی تھی۔ جب رقم پیش کی گئی تو بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا" یہ تمہاری ہے، ہم تمہیں بخشتے ہیں۔" اس معاملہ پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ شاہ فتح اللہ اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو گیا۔

جب میری مدد معاش کے متعلق نیا فرمان تیار ہو گیا تو میں ایک سال کی رخصت لے کر پہلے بساور اور پھر وہاں سے بدایوں گیا۔ وہاں سے میرا ارادہ میرزا نظام الدین احمد سے ملنے اور سیر و تفریح کے لیے گجرات جانے کا تھا، لیکن کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ جا نہ سکا۔

امرائے کشمیر کی وفات

اسی سن جلوس میں سید عبداللہ خاں چوگان بیگی اور میرزادہ علی خاں جو صاحب اعتبار امیر تھے کشمیر میں فوت ہو گئے۔ سید عبداللہ خاں نے بارہ ماہ ربیع الاول کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوایا اور فقیروں کو کھلایا اور گناہوں سے توبہ و استغفار کی۔ اسی دن وہ میرزا یوسف خاں کے ساتھ شکار پر گیا۔ شکار میں اسے بخار ہو گیا اور اسی میں جان دے دی۔ اس سے لگ بھگ ایک سال پہلے میرزادہ علی خاں اس رات جس رات یعقوب نے محمد قاسم خاں پر شب خون مارا تھا، لڑائی میں ہلاک ہو گیا تھا۔

کشمیر کو اکبر کی روانگی

۲۲ جمادی الثانی ۹۹۷ھ کو بادشاہ سلامت کشمیر کی سیر کے لیے جسے بادشاہ نے" باغ خاصہ" کا نام دیا ہوا تھا کابل سے تشریف لے گئے۔ اہل حرم کو شاہزادہ سلطان مراد کے ساتھ بھنبر میں جہاں سے کشمیر کا پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا چھوڑ دیا اور خود بطور یلغار آگے روانہ ہو گئے۔ اس حسین خطہ کی سیر و تفریح میں کچھ عرصہ لگا پھر شاہزادہ کے نام فرمان آیا کہ وہ محل والوں کو رہتاس لے جا کر وہاں ہماری آمد کا انتظار کرے۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کی وفات

انہی دنوں کشمیر میں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ خود بھی حاذق طبیب تھا اس لیے اس نے بطور علاج ہریسہ کھانا شروع کر دیا حکیم علی نے ہریسہ کھانے سے اسے بہت روکا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار موت اس کا گریبان پکڑ کر عالم بقا کی طرف کھینچ لے گئی۔ شاہ فتح اللہ کو تخت سلیمان میں جو کشمیر کے ایک شہر سے متصل بڑا پہاڑ ہے سید عبداللہ خاں چوگان بیگ کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ ملک الشعراء شیخ فیضی نے اس کے مرثیہ میں ایک ترکیب بند کہا تھا جس کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:

در ہنگام آں آمد کہ عالم از نظام افتد — جہاں عقل را در نیم روز علم شام افتد
ہمہ گنجینۂ اقبال در دست لیام افتد — ہمہ خونابۂ ادبار در کاس کرام افتد
حقیقت گم کند سر رشتۂ تحقیق مقصد را — معانی از بیان ماند و ربط از کلام افتد

زبان جہل جنبد بے محابا در سخن رانی — مطالب نادرست آید دلائل ناتمام افتد
دل مستکملان دہر در نقص ابد ماند — چو نارس میوۂ تر شاخ ناگہ نیم خام افتد
گرامی امہات فضل را فرزند روحانی — ابوالآبائی معنی شاہ فتح اللہ شیرازی
دو صد بونصر رفت و بوعلی تا او پدید آمد — بسی دار قضا در تہ کان زیں گونہ برازی
گہے با محمل مشائیاں گرد زمیں گردی — گہے با موکب اشراقیاں گرد فلک تازی
مباہات از وجود کامل او بود دوراں را — بدوراں جلال الدین محمد اکبر غازی

شہنشاہ جہاں را از وفاتش دیدہ پر نم شد
سکندر را اشک حسرت ریخت کافلاطوں ز عالم شد

حکیم ابوالفتح کا انتقال

۲۷ رمضان المبارک کو بادشاہ کابل کی سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ پکھلی کے راستہ سے قلعہ اٹک کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی موقع پر حکیم ابوالفتح بھی دھنتوڑ کے مقام پر فوت ہو گیا۔ اسے حسن ابدال میں دفن کیا گیا۔ اس کی تاریخ وفات "غدا لیش سزا داد" سے نکلتی ہے۔

جب اٹک کے سامنے خیمہ شاہی لگا ہوا تھا، شاہزادہ اہل محل کو لے کر حاضر خدمت ہوا۔ اسی منزل سے شہباز خاں کو یوسف زئی قبیلہ کے بقیہ پٹھانوں پر حملہ کے لیے مامور کیا گیا۔

۲۲ ذی قعدہ ۹۹۷ھ کو بادشاہ کی سواری کابل پہنچی۔ اس موقع پر حکیم ہمام اور صدر جہاں عبداللہ[1] خاں اوزبک کے پاس سے لوٹ کر آگئے اور عبداللہ خاں کے دوستانہ خط پیش کیے۔

ٹوڈرمل اور بھگوان داس کا انتقال

۹۹۸ھ میں راجہ ٹوڈرمل[2] اور راجہ بھگوان داس[3] امیر الامراء جو لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے فوت ہو گئے۔ ان کی تاریخ ہے "بگفتا ٹوڈرو بھگوان مردند"۔

---

[1] عبداللہ خاں اوزبک: ہمایوں کے فوجی سرداروں میں سے تھا۔ ۹۶۸ھ میں اس نے مالوہ کے باز بہادر کو شکست دی تھی۔ ۹۷۱ھ میں اکبر سے ناراض ہو کر گجرات اور وہاں سے توران چلا گیا وہاں اپنے قبیلہ کی مدد لے کر اس نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ مرزا سلیمان والی بدخشاں سے متعدد مرتبہ جنگ کر کے بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔

[2] ٹوڈرمل: یہ اصل میں پنجاب کا باشندہ تھا پانچ برس میں باپ مر گیا ماں نے ضلع گجرات میں ایک پاٹ شالہ میں بٹھا دیا گیارہ برس کی عمر میں وہ راجہ ہر چند رائے کے پاس ملازم ہو گیا۔ حساب سے اس کو فطری لگاؤ تھا اپنے طور پر اس فن میں دسترس حاصل کی اور ہر چند راؤ کے حساب کتاب کا مختار کل بن گیا۔ ۱۸ برس کی عمر میں بادشاہی منشی خانہ میں ملازم ہو گیا اور ترقی کر کے صدر محاسب بن گیا۔ اس کے جوہر سورت کے محاصرہ میں چمکے۔ اکبر نے جوہر قابل جان کر اس کی تربیت و ترقی کی طرف توجہ کی ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء میں بنگال کی مہم میں اس نے جس بہادری اور کاردانی کا ثبوت دیا۔ وہ اس کی آئندہ ترقی کا ذریعہ بن گیا اور وہ وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ ٹوڈرمل نے اراضی کی پیمائش، حد بندی، محصول چنگی کے ضابطے، مردم شماری اور فوجی بھرتی کے قوانین مرتب کیے۔ ذاتی طور پر ٹوڈرمل نہایت دیندار پکا مذہبی اور اکبر کا وفادار ملازم تھا۔ ٹوڈرمل قوم سے کائستھ تھا۔ ۹۹۸ھ میں لاہور میں فوت ہوا۔ فن حساب میں اس کا ایک قدیم رسالہ ہے جو عرصہ تک بنیوں اور مہاجنوں کو حسابی گر کا کام دیتا رہا۔ ایک کتاب "خازن اسرار" کے نام سے بھی ٹوڈرمل سے منسوب ہے جس کے ایک حصہ میں دھرم کی باتیں اور دوسرے حصہ میں دنیاوی معاملات، علم اخلاق اور تدبیر منزل پر بحث کی ہے۔

[3] راجہ بھگوان داس: ۹۹۳ھ دور اکبری میں انبیر (مارواڑ) پر مشہور راجپوت کچھواہہ خاندان حکمران تھا راجہ کا نام بھارا مل تھا۔ ہیمو کی شکست کے بعد مجنوں خاں کے وسیلہ سے بھارا مل دربار اکبری میں باریاب ہوا۔ ۹۶۹ھ میں راجہ بھارا مل کی بیٹی جس کا نام سر پی تھا بعد میں عارف النساء بیگم رکھا گیا سے اکبر کی شادی ہو گئی۔ یہ بیگم مان سنگھ کی پھوپھی اور بھگوان داس کی بہن ہے۔ بھارا مل کے بعد اس کا لڑکا بھگوان داس اکبر کے مقربین میں شامل رہا۔ بھگوان داس چتوڑ احمد آباد اور دوسرے معرکوں میں ہمیشہ اکبر کے ساتھ رہا اور امیر الامراء کا خطاب پایا۔ ۹۹۸ھ میں لاہور میں فوت ہوا۔

کسی نے ایک اور تاریخ لکھی ہے:

تو در ملا آنکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم — چوں رفت سوئے دوزخ خلقی شدند خرم
تاریخ رفتنش را از پیر عقل جستم — خوش گفت پیر دانا "وے رفت در جہنم"

کابل اور گجرات کے لیے تقرر

۲۰ محرم ۹۹۸ھ کو کابل کی حکومت محمد قاسم خاں میر بحر کو تفویض کر کے بادشاہ نے ہندوستان کی طرف مراجعت فرمائی۔

گجرات پر اعظم خاں کی تقرری کا فرمان جاری کیا گیا اور اسے مالوہ سے وہاں تبدیل کر دیا گیا۔ نظام الدین احمد کو دربار میں طلب کر لیا گیا۔ خانخاناں کو گجرات کے بجائے جون پور دیا گیا۔ مالوہ پر شہاب خاں کی تعیناتی ہوئی۔ اعظم خاں نے شہاب خاں کی مخالفت میں مالوہ کو ویران کر کے وہاں دھول اڑا دی۔

خداوند خاں دکھنی کا انتقال

اسی سال خداوند خاں[1] دکھنی رافضی جس کا نکاح بادشاہ کے حکم سے شیخ ابوالفضل کی ہمشیرہ سے ہوا تھا اور گجرات میں کری کا قصبہ اسے جاگیر میں ملا تھا فوت ہو گیا۔ اس کی تاریخ وفات ہے:

"خداوند دکھنی مردہ"

اکبر شاہی کا پینتیسواں سال

۱۴ جمادی الاول ۹۹۸ھ کو ۳۵ ویں جلوس کا آغاز ہوا۔ بادشاہ نے لاہور کے دیوان خانہ کو آراستہ کرنے کا حکم پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ نوروز کے دوسرے دن لاہور میں ورود شاہانہ ہوا۔ تیسرے دن نظام الدین احمد شتر سواروں کی جمعیت کے ہمراہ ایک سو کوس کا فاصلہ صرف بارہ دن میں طے کر کے حاضر خدمت ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس ہیئت میں یہ شتر سوار آئے ہیں اسی طرح سیدھے ڈیوڑھی میں چلے آئیں۔ اس قافلہ کی آمد بھی اچھا خاصا تماشا بن گئی۔ نظام الدین احمد پر بڑی شاہانہ نوازشیں ہوئیں۔

بادشاہ نے بھگوان داس کی وفات پر مان سنگھ کو راجا کا خطاب عطا کیا اور تعزیت کے لیے اس کے نام فرمان صادر ہوا جس میں بڑی عنایتوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ فرمان کے ساتھ خلعت خاصہ اور گھوڑا بھی بھیجا گیا۔

شرف آفتاب کے دن میں بھی بداؤن سے آکر بارگاہ میں حاضر ہوا اور سات سال بعد میرزا نظام الدین احمد سے ملاقات ہوئی۔

اعظم خاں کی فتوحات

اسی سال اعظم خاں نے گجرات سے سورت اور جوناگڑھ پر حملہ کیا۔ وہاں کا حاکم جام ستر سال اور دولت خاں ولد امین خاں غوری جو اپنے باپ کا جانشین بنا تھا اور اپنے لاؤ لشکر پر اسے بڑا گھمنڈ ہو گیا تھا۔ اعظم خاں کی فوج کشی پر یہ دونوں بیس ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ پر آئے اور فریقین میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ اعظم خاں نے اپنی

---

[1] خداوند خاں دکھنی: بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر جب احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت قائم ہوئی تو اس کا دوسرا فرماں روا مرتضیٰ نظام شاہ ہوا اس کا وکیل مطلق خواجہ میرک اصفہانی تھا۔ خداوند خاں اسی خواجہ کے ماتحت ملازم تھا۔ اس کا باپ مشہدی اور ماں حبشن تھی، خداوند خاں نہایت قوی ہیکل بہادر آدمی تھا خواجہ میرک کے زمانہ میں برار کے بعض اضلاع پر حاکم رہا روہن کھیڑہ میں اس کی بنائی ہوئی مسجد اب تک یادگار کے طور پر قائم ہے۔ ۹۹۳ھ میں مرتضیٰ سبزواری کے ساتھ اکبر کے پاس چلا آیا اور ہزاری منصب پر تقرر ہو گیا۔ پٹن گجرات جاگیر میں ملا۔ اکبر نے ابوالفضل کی بہن سے شادی کرا دی، لیکن ابوالفضل سے ناچاقی ہی رہتی تھی۔ ملا صاحب نے ۹۹۸ھ تاریخ وفات لکھی ہے طبقات اکبری میں ہے ایک ہزار پانصدی منصب تھا ۹۹۵ھ میں مرا ماٰثر الامرا میں ۹۹۷ھ کا سن دیا گیا۔

فوج کو سات دستوں میں تقسیم کر کے بڑی بہادری سے جنگ کی۔ بادشاہی میمنہ کا سردار خواجہ رفیع بدخشی جو بڑا بہادر نوجوان تھا، اور محمد حسین شیخ جو امرائے قدیم میں سے تھا اس معرکہ میں شہید ہو گئے۔ ہراول کی فوج میں ابو تراب کا بھتیجا شرف الدین بھی مارا گیا۔ مخالفوں کے چار ہزار آدمی مارے گئے۔ جام کا لڑکا بھی قتل ہو گیا۔ اعظم خاں کو بڑی شان دار فتح حاصل ہوئی۔ یہ فتح بروز اتوار ۶ ماہ شوال ۹۹۸ھ کو ہوئی۔ شیخ فیضی نے "فتوحات عزیزی" سے اس کی تاریخ نکالی۔

دو بزرگوں کا انتقال

اسی سال صاحب تصانیف بزرگ شیخ وجیہ الدین کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ ان کے نام "شیخ وجیہ الدین" سے نکلتی ہے۔

اسی سال شیخ عبدالعزیز دہلوی کے خلیفہ شیخ جانلیدہ بھی قصبہ سیہنہ میں فوت ہو گئے۔ ان کے ایک مرید نے "حقیقت فقر" سے ان کی تاریخ نکالی۔

سندھ اور بلوچستان پر حملہ

بادشاہ نے خانخاناں کا جون پور سے بھی تبادلہ کر دیا اس کو ملتان اور بکر کی حکومت تفویض کر کے سندھ اور بلوچستان کی تسخیر اور میرزا جان کی سرکوبی پر متعین کر دیا۔ خانخاناں کو اس مہم پر چند بڑے بڑے امرا جیسے شاہ بیگ خاں، سید بہاؤ الدین بخاری اور میر محمد معصوم بکری وغیرہ کے ساتھ ۹۹۹ھ میں رخصت کیا گیا۔ ان کے ساتھ ایک سو ہاتھی بھی بھیجے گئے۔ شیخ فیضی نے "قصد تتہ" اس روانگی کی تاریخ نکالی۔

شہاب الدین احمد خاں کی وفات

اسی سال مالوہ سے شہاب الدین[1] احمد خاں کی وفات کی خبر پہنچی "شہاب خانم" اور "ذمیم الاوصاف" اس کی تاریخ وفات ہے۔

تاریخ کشمیر کی ترتیب و تدوین

اسی سال مجھے حکم دیا گیا کہ تاریخ کشمیر کو جسے ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو بڑا عالم و فاضل شخص ہے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا تھا سادہ اور آسان عبارت میں لکھوں۔ میں نے اس کا انتخاب دو مہینہ میں مرتب کر دیا، اس کے آخر میں یہ شعر لکھا ؎

در عرض یک دو ماہ بہ تقریب حکم شاہ
ایں نامہ شد چو خط پری پیکراں سیاہ

یہ نسخہ کتب خانہ شاہی میں داخل کر دیا گیا بادشاہ کے سامنے جز جز اس کو پڑھا جاتا ہے۔

شیخ ابراہیم چشتی کا انتقال

اسی سال شیخ ابراہیم چشتی نے فتح پور میں انتقال کیا۔ وہ اپنے پیچھے کافی دولت چھوڑ گیا۔ اس کے متروکہ مال میں سے ۲۵ کروڑ نقد روپیہ ہاتھی گھوڑے اور دوسرا بہت سا سامان خزانہ شاہی میں داخل ہو گیا۔ وہ نہایت کنجوس اور بخیل مشہور تھا اس لیے اس کی تاریخ "ذمیم الاوصاف" اور "شیخ لئیم" نکالی گئی۔

عرفی شیرازی کا انتقال

لاہور کے چند امرا بھی اسی سال فوت ہوئے جن میں سے خنجری ترک تو بواسیر کے عارضہ میں اور شیخ احمد ہاتھی کے حادثہ میں مرے۔ اسی سال مشہور شاعر ملا عرفی شیرازی نے بھی انتقال کیا۔ مرتے وقت

---

[1] شہاب الدین احمد خاں: اسلیم شاہ کے عہد سے دہلی کے حاکم تھے منعم خاں کے ساتھ اچھے تعلقات رہے، اس وسیلہ سے شہاب خاں سے شہاب الدین احمد خاں بن گئے۔ منعم خاں کے بعد ان کی وہ آؤ بھگت نہیں رہی۔ آخر میں گجرات کے علاقہ میں قلعہ داری کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ مالوہ کی حکومت ملی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ۹۹۸ھ میں وفات پائی۔

اس نے یہ رباعی کہی تھی۔

عرفی دم نزع است و ہماں مستی تو
آخر بچہ مایہ بار بربستی تو
فردا است کہ دوست نقد فردوس بکف
جویائی متاع است و تہی دستی تو

عرفی متقدمین اور متاخرین تمام اساتذہ کلام کے بارے میں بڑی بے ادبانہ باتیں کیا کرتا تھا اس لیے اس نے یہ تاریخ پائی۔
"گفت عرفی جوانہ مرگ شدی"

اس کی ایک دوسری تاریخ ہے "دشمن خدا"۔

معجم البلدان کا فارسی میں ترجمہ اسی زمانہ میں حکیم ہمام نے ایک کتاب "معجم البلدان" کی جس کی ضخامت دو سو جز تھی، بڑی تعریف کی اور اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی کہ اس کتاب میں بڑی عجیب و غریب حکائتیں اور مفید مضامین ہیں۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی آدمیوں کو جمع کر کے اس کتاب کے اجزاء تقسیم کر دیے۔ میرے حصہ میں بھی دس جز آئے۔ ان کا ترجمہ میں نے ایک مہینہ میں کر دیا اور سب سے پہلے اسے پیش کیا اور اس خدمت کو وسیلہ بنا کر بداؤن جانے کے لیے رخصت کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

چھتیسواں سن جلوس ۲۴ جمادی الاول ۹۹۹ھ جشن نوروز حسب دستور منعقد کیا گیا اور جلوس کا ۳۶ واں سال شروع ہوا۔ اس سال گائے، بھینس، گھوڑے اور اونٹ کا گوشت حرام کر دیا گیا۔ ایک اور حکم ستی کے متعلق تھا کہ جو عورت برضا و رغبت اپنے شوہر کے ساتھ چتا پر جلنا چاہے اس کو نہ روکیں لیکن کسی عورت کو زبردستی شوہر کے ساتھ نہ جلایا جائے۔ بارہ سال سے پہلے بچوں کی ختنہ نہ کی جائے۔ بارہ سال بعد اگر لڑکا چاہے تو ختنہ کرائے، نہیں تو نہ کی جائے۔ ایسے شخص کے ساتھ جس کا پیشہ جانوروں کو ذبح کرنے کا ہو اگر کوئی کھانا کھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر اس کے گھر والے اس کے ساتھ کھانا کھائیں تو ان کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں۔

تبت کی سفارت اس سال حاجی میرزا بیگ چھوٹا تبت سے واپس آیا اور اپنے ساتھ وہاں کے حاکم علی رائے کی لڑکی کو لیتا آیا، بادشاہ نے اس لڑکی کا نکاح بڑے شاہزادہ کے ساتھ کر دیا۔ تبت کو دوسری مرتبہ ملا طالب اصفہانی ایلچی بن کر گیا تھا۔ اس کے اور حاجی میرزا بیگ کے بیانات سے وہاں کے جو حالات اور رسوم و عقائد سے متعلق معلومات ملی ہیں وہ ایک رسالہ کی صورت میں مرتب ہو چکی ہیں۔ اکبر نامہ میں بھی یہ حالات درج ہیں، کیوں کہ اس میں ہندوستان، کابل، تبت اور کشمیر کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

مرزا نظام الدین احمد کو پرگنہ شمس آباد کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ اس سال شعبان کے آخر میں ان کو جاگیر پر روانہ کر دیا گیا۔ ان کا خالہ زاد بھائی شمس آباد کے معرکوں میں شہید ہو گیا، اس کا نام محمد جعفر تھا یہ نہایت سعادت مند اور بہادر نوجوان تھا اس کی تاریخ شہادت ہے

چو منشور شہادت یافت جعفر از درد اور
بود تاریخ سال او شہید پاک شد جعفر

سجدہ سے انکار اس مرتبہ مجھے پانچ مہینے کی رخصت ملی۔ مرزا نظام الدین نے سفارشاً عرض کیا کہ عبدالقادر کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، بھائیوں اور عزیزوں کو تسلی دلاسا دینے کے لیے وہ جانا چاہتا ہے اور رخصت کا طلب گار ہے تو بادشاہ نے بڑی خفگی کے ساتھ یہ رخصت عطا کی صدر جہاں نے اس موقع پر دہرا دہرا کر کہا کہ "بادشاہ کو سجدہ کرو" لیکن میں نے سجدہ نہیں کیا بادشاہ نے صرف اتنا کہا "چھوڑو"۔ سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہو کر مجھے سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا۔ بہر حال میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پھر وہاں سے بدایوں آ گیا۔ مرزا لاہور کو چلے گئے۔

شاہی عتاب شاہی کتب خانہ[1] سے "نامۂ خرد افزا"[2] کا نسخہ گم ہو گیا تھا۔ سلیمہ سلطان بیگم نے اس سلسلہ میں مجھے چند مرتبہ یاد فرمایا۔ میرے پاس بدایوں میں کئی ایک قاصد طلبی کے لیے پہنچے، لیکن میں کچھ ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ جا نہ سکا۔ آخر بادشاہ نے حکم دے دیا کہ اس کی مدد معاش موقوف کر دی جائے اور اسے زبردستی بدایون سے لایا جائے۔ اس موقع پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا بڑا حق ادا کیا۔ شیخ ابوالفضل نے بھی بادشاہ سے ہر بار یہی کہا کہ کوئی نہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہو گی، اس لیے وہ نہیں آ سکا اور وہاں رہ گیا"۔

---

[1] دور اکبری کی تصانیف:

۱ ۔ مہابھارت سنہ ۹۹۰ھ تا ۹۹۵ھ میں اس کا ترجمہ رزم نامہ کے نام سے مکمل ہوا، اس کام کو نقیب خاں، ملا عبدالقادر بدایونی، ملا شیری، حاجی سلطان تھانیسری نے انجام دیا۔

۲ ۔ راماین سنہ ۹۹۵ھ تا سنہ ۹۹۹ھ ملا عبدالقادر بدایونی نے ترجمہ کیا۔

(۵۲) ۳ ۔ سنگھاسن بتیسی (سنہاسن دو ترنیتی) خرد افزا کے نام سے بدایونی نے ترجمہ کیا سنہ ۹۸۲ھ۔

۴ ۔ حیوٰۃ الحیوان، دمیری کی مشہور کتاب کا فارسی میں ترجمہ شیخ مبارک نے سنہ ۹۸۳ھ میں کیا۔

۵ ۔ اتھربن: ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب ہے۔ اس کی ترجمانی نو مسلم برہمن بھاون نے کی اور عبدالقادر بدایونی فیضی، شیخ ابراہیم سرہندی نے سنہ ۹۸۳ھ میں ترجمہ کیا۔

۶ ۔ تزک بابری: بابر کی سرگزشت کا ترکی سے فارسی میں عبدالرحیم خان خاناں نے سنہ ۹۹۸ھ میں ترجمہ کیا۔

۷ ۔ انجیل: ابوالفضل نے سنہ ۹۸۳ھ میں اس کا ترجمہ کیا۔

۸ ۔ لیلاوتی: ہندوؤں کے فن ریاضی کی مشہور کتاب ہے، فیضی نے ترجمہ کیا تھا۔

۹ ۔ تاجک: علم نجوم کی ایک کتاب ۔ مکمل خاں گجراتی نے ترجمہ کیا۔

۱۰ ۔ ہربنس: کرشن جی کے حالات۔ مولانا شیری نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۱ ۔ معجم البلدان: شہاب الدین عبداللہ یاقوت متوفی سنہ ۶۲۶ھ کی کتاب ہے۔ ملا احمد ٹھٹہ، قاسم بیگ، شیخ منور اور بدایونی نے ترجمہ کیا سنہ ۹۹۹ھ۔

۱۲ ۔ تاریخ کشمیر: مشہور سنسکرت کی کتاب "راج ترنگنی" مصنفہ کلہانا سلطان زین العابدین کے عہد کی کتاب ہے۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے ترجمہ کیا، پھر بدایونی نے سنہ ۹۹۹ھ میں سلیس فارسی میں لکھا۔

۱۳ ۔ کلیلہ دمنہ: سنسکرت کا قدیم قصہ ہے۔ ابوالفضل نے سنہ ۹۹۶ھ میں "عیار دانش" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

۱۴ ۔ نل دمن: سنہ ۱۰۰۳ھ میں فیضی نے خسرو کی لیلیٰ مجنوں کی بحر میں چار ہزار دو سو اشعار کی یہ مثنوی تصنیف کی۔

۱۵ ۔ جامع رشیدی: سنہ ۹۹۳ھ میں عبدالقادر بدایونی نے عربی سے ترجمہ کیا۔

۱۶ ۔ بحر الاسمار: ہندی افسانوں کی کتاب۔ عبدالقادر بدایونی نے سنہ ۱۰۰۰ھ میں ترجمہ کیا۔

۱۷ ۔ تاریخ الحکما: مصنفہ شہرزوری کا ترجمہ مقصود علی تبریزی نے نزہۃ الارواح کے نام سے کیا۔

۱۸ ۔ ذخیرۃ مرتاضی: فارسی سے سنسکرت میں اس کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگادھر، مہیش مہانند نے کیا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

دکن کو سفیروں کی روانگی

اس سال کے ماہ شوال میں دربار کے چار خاص مقربوں کو دکن کے چار حاکموں کے پاس سفارت پر بھیجا گیا۔ شیخ فیضی کو آسیر و برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کے پاس۔ امین الدین کا پہلے نام محمد امین تھا اس نے خود اپنا نام بدلنے کی درخواست کی (کیوں کہ اس میں محمد کا لفظ آتا تھا جو بادشاہ کو پسند نہ تھا) اس کو امین الدین کا نام دیا گیا۔ امین الدین کو احمد نگر بھیجا گیا۔ احمد نگر میں اس وقت برہان الملک حاکم تھا جو دربار سے مدد لے کر وہاں کی سلطنت پر قابض ہوا تھا اور اب خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ بیجا پور[1] کے حاکم عادل خاں کے پاس صادق خاں کے سابق ملازم میر محمد امین کو رخصت کیا گیا۔ گولکنڈہ[2] کے حاکم قطب الملک کے پاس سفارت کے لیے میر مشیر کو نامزد کیا گیا۔

---

[1] بیجاپور: یوسف عادل شاہ نے ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں عادل شاہی سلطنت کا پایۂ تخت بنایا تھا۔ دو سو برس تک عادل شاہی سلاطین دکن کے بڑے حصہ پر قابض رہے۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں شاہجہان نے اس کو دہلی کا باجگذار بنایا۔ ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے سلطنت مغلیہ میں اس کو ضم کر لیا، اٹھارھویں صدی میں نظام الملک آصف جاہ نے قبضہ کر لیا، ان کے بعد مرہٹوں نے اسے تباہ کر دیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ بیجاپور میں محمد عادل شاہ کا مقبرہ "بول گنبد" کے نام سے مشہور ہے اس کا گنبد بہت بڑا ہے اندرونی قطر ۱۲۴ فٹ ہے بلندی ۱۹۸ فٹ۔ محمد عادل شاہ ساتواں فرماں روا تھا اس کی قبر اونچے چبوترے پر ہے تین طغرے فارسی میں کندہ ہیں جن سے بادشاہ کا سن وفات نکلتا ہے ایک طغرا "عاقبت محمد محمود شد" ہے جس سے ۱۰۶۷ھ نکلتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی تک دنیا کا سب سے بڑا گنبد روضۃ الکبریٰ کے پانتھین گرجا کا تھا جس کا رقبہ ۱۵۸۳۳ مربع فٹ ہے۔ بول گنبد کی تعمیر کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہو گیا کیوں کہ بول گنبد کا رقبہ ۱۸۲۲۵ مربع فٹ ہے۔ بیجاپور کی جامع مسجد بھی مشہور عمارت ہے پانچویں سلطان علی عادل شاہ کی تعمیر ہے۔ یہی بادشاہ اکبر کا ہم عصر ہے۔ یہ مسجد ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں تعمیر ہوئی تھی، اس کی تعمیر سلطان محمد عادل شاہ کے عہد تک ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ سلطان محمد عادل شاہ کا بنایا ہوا آثار محل قلعہ سلاطین عادل شاہی کے مقبرے مشہور عمارتیں ہیں۔ بیجاپور کی توپ بھی عجوبۂ روزگار ہے اتنی لانبی چوڑی توپ شاید ہی کسی جگہ پائی گئی ہو، اس کو احمد نگر کے فرمانروا حسین نظام شاہ کے حکم سے حسین خاں رومی نے ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء میں بنوایا تھا اس کا وزن ۱۱۲۰ من طول ۱۵ فٹ دہانہ کا قطر ۲ فٹ چار انچ ہے ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں سلطان محمد شاہ کے عہد میں بیجاپور لائی گئی تھی۔

[2] گولکنڈہ: شہر حیدرآباد سے پانچ میل مغرب کی جانب واقع ہے قطب شاہی سلاطین کا قدیم دار الحکومت تھا قلعہ میں ۲۵۰ فٹ بلند پہاڑی پر بالا حصار قطب شاہی خاندان کے مقبرے ہیں ان بادشاہوں نے پونے دو سو برس ریاست گولکنڈہ پر حکومت کی گولکنڈہ کی ہیرے کی کان بھی مشہور تھی۔ مشہور ہیرا کوہ نور ایک روایت کے مطابق اسی جگہ سے نکلا تھا۔ اس قلعہ کو قلی قطب شاہ نے بنوایا تھا۔ جو دکھنی زبان کا صاحب دیوان شاعر گذرا ہے۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) ۱۹ - کتاب الاحادیث: ۹۸۶ھ میں ملا عبد القادر بدایونی نے نذر گذرانی جو انھوں نے ۹۷۶ھ میں تیر اندازی پر لکھی تھی۔

۲۰ - تاریخ الفی: نقیب خاں، شاہ فتح اللہ، حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، نظام الدین احمد، عبد القادر بدایونی، ٹھٹوی، جعفر بیگ اور آصف خاں نے کام کیا تھا۔ بدایونی نے تین جلدوں کا ذکر کیا ہے مگر انڈیا آفس لائبریری میں اس کی چار جلدیں ہیں۔ پروفیسر ڈاؤسن کا کہنا ہے کہ اس کی دو اور جلدیں بھی تھیں ۹۹۰ھ میں اس کی تصنیف شروع ہوئی، ۱۰۰۰ھ میں بدایونی نے نظر ثانی کر کے مکمل کر دی۔

۲۱ - اکبر نامہ: ابو الفضل کی تصنیف ہے، اس کی تیسری جلد آئین اکبری کے نام سے مشہور ہے۔ ۲۲ - نجات الرشید: ملا عبد القادر بدایونی کی تصنیف

۲۳ - طبقات اکبر شاہی: ۱۰۰۱ھ کے حالات مرزا نظام الدین احمد کی تصنیف ۲۴ - سواطع الالہام: فیضی نے ۱۰۰۲ھ میں بے نقط تفسیر جس کے ۵۷ جز ہیں

۲۵ - موارد الکلم: فیضی کی بے نقط تصنیف ۲۶ - مرکز ادوار: فیضی کے اشعار کا مجموعہ مرتبہ ابو الفضل

۲۷ - کشکول: ابو الفضل کی منتخب کردہ تحریریں۔ ۲۸ - جوتش: خانخاناں نے جوتش پر مثنوی لکھی تھی۔ ہر شعر کا ایک مصرع فارسی میں دوسرا سنسکرت کا تھا۔

۲۹ - ثمرۃ الفلاسفہ: عبد الستار ابن قاسم کی تصنیف ہے ۴۸ جلوس م ۱۰۱۱ھ میں یونانی سے ترجمہ کی گئی۔ عبد الستار کا کہنا ہے کہ میں نے یونانی پادری جروم زیویر سے حاصل کی تھی، اس میں روما کی تاریخ اور مشاہیر و اہل کمال کا ذکر ہے۔

۳۰ - خیر البیان: یہ پٹھانوں کے باغی قبیلے کے پیر تاریکی (روشنائی قبیلہ) نے لکھی تھی۔

حکم یہ ہوا تھا کہ شیخ فیضی راجہ علی خاں کی سفارت سے فارغ ہوکر برہان الملک کے پاس چلا جائے۔ وہ جب احمد نگر پہنچا تو اس کے اور امین الدین کے درمیان بڑی دوستانہ محفلیں رہیں، لیکن آخر میں یہ دوستی مخالفت میں بدل گئی۔

اکبر کی علالت

اس سال اکبر کی طبیعت کچھ علیل ہوگئی۔ پیٹ کا درد ہوتا تھا جس سے نہایت سخت بے چینی کی حالت رہتی تھی۔ اکبر کو بڑے شاہزادہؔ کی طرف سے بدگمانی ہوگئی کہ شاید اس نے زہر دے دیا ہو۔ بار بار اس سے یہ کہتا تھا "بابا شیخو جیتے رہو یہ سلطنت تو ساری تمہارے ہی لیے تھی پھر تم نے ایسی حرکت کیوں کی"۔ بادشاہ کو حکیم ہمام پر بھی جو ان دنوں شاہی معتمد تھا، کچھ نہ کچھ کھلا دینے کا شبہ ہوا۔ بڑے شاہزادہ نے اپنے چند معتمد آدمیوں کو شاہزادہ مراد کی نگرانی پر مقرر کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی دن بعد بادشاہ صحت یاب ہوگئے۔ اس وقت حرم کی عورتوں اور شاہزادہ مراد نے اس نگرانی کا قضیہ پیش کیا۔ اس معاملہ کو یکسو کرنے کے لیے بادشاہ نے ۲۰ ذی الحج کو شاہزادہ سلطان مراد کو جسے وہ "پہاڑی" کہہ کر پکارتے تھے، مالوہ اور اس سے متعلقہ علاقے سپرد کر دیے۔ شاہزادہ کو علم، نوبت نقارہ، پرچم نشان اور بادشاہی کا دوسرا ساز و سامان شاہزادوں کے لیے مخصوص، چار پارچہ شاہانہ خلعت مرحمت ہوئی۔ اسماعیل قلی خاں کو اس کا نائب بنایا گیا اور دوسرے چند بڑے بڑے امراء کو بھی اس کی ملازمت میں متعین کر کے رخصت فرمایا تاکہ دونوں شاہزادوں میں ایک بڑی مسافت حائل رہے اور آئے دن کے ان جھگڑوں سے نجات مل جائے۔

شاہزادہ مراد کی فوج کشی

شاہزادہ مراد کشور کشائی کے شوق میں مالوہ کی طرف چلا گیا اور بہت سے لوگ شاہزادہ مراد کی قدر و منزلت کو دیکھ کر اس کے پاس جمع ہوگئے۔ اس نے آگرہ قنوج اور گوالیار سے بے شمار فوج جمع کر لی اور یہ لشکر لے کر روندچھ کے زمیندار مدھکر نامی پر حملہ کر دیا۔ یہ زمیندار اپنے کثیر لاؤ لشکر کی وجہ سے ہندوستان کے راجاؤں میں بڑا درجہ رکھتا تھا اور اس علاقہ میں اس نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ شاہزادہ کے لشکر سے اس کا مقابلہ نروَر کے نواح میں ہوا اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہاں کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر چھاپے مارنے لگا۔ اس کے آدمیوں نے شاہزادہ کے بہت سے لشکریوں کو قتل کر دیا، اس کے چھاپوں سے لشکر میں بڑا انتشار پھیل گیا اور وہ اس علاقہ میں نہایت پریشان اور خستہ حال ادھر ادھر کوچ کرتا رہا۔ حسنِ اتفاق سے انہی دنوں مدھکر طبعی موت مر گیا اور اس کا لڑکا نہایت عمدہ نذرانے لے کر شاہزادہ سے ملنے کے لیے حاضر ہوگیا۔ شاہزادہ مراد نے اسے یار محمد ولد صادق خاں کے ہمراہ خدمت شاہی میں لاہور کو روانہ کر دیا اور اجین کے شہر کو اپنا مستقر بنا کر ٹھہر گیا۔ شہزادہ مراد کا اپنے آدمیوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں تھا، لین دین نشست برخاست، تسلیم و تعظیم میں باپ کی دیکھا دیکھی بڑے غرور و تکبّر سے پیش آتا تھا اس کے اس رویہ سے لوگ ناراض ہوگئے اور اجازت لے کر یا بغیر اجازت کے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر واپس آگئے۔

---

[1] شہزادہ: یہ سب سے بڑا شہزادہ سلطان سلیم جہانگیر تھا۔ یہ ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو راجہ بہارا مل کچھواہہ کی لڑکی کے بطن سے فتح پور میں پیدا ہوا تھا راجہ بھگوان داس کا بھانجا اور مان سنگھ کی پھوپھی کا لڑکا ہوتا ہے۔ دوسرا شہزادہ سلطان مراد ۹۷۸ھ میں ۱۰ محرم کو فتح پور میں پیدا ہوا۔ اکبر اس کو فتح پور کی پہاڑی کی نسبت سے پہاڑی راجہ کہتا تھا، جہانگیر نے تزک میں اس کا حلیہ لکھا ہے "سبزہ رنگ، باریک اندام، خوش قد، بلند بالا" دکن کی مہم پر بھیجا گیا۔ کثرتِ مے نوشی سے آخر ۱۰۰۷ھ، ۳۰ سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔ تیسرا شہزادہ دانیال تھا جو مراد کے بعد دکن کی مہم پر بھیجا گیا۔ اجمیر میں اس کی ولادت ہوئی تھی۔ ۳۳ برس کی عمر میں ۱۰۱۳ھ میں شراب نوشی کی علت میں انتقال ہوا۔ سلیم کو بارہ ہزاری، مراد کو دس ہزاری اور دانیال کو ہفت ہزاری منصب دیا گیا تھا۔

جوناگڑھ کی فتح

انہی دنوں حاکم جوناگڑھ دولت خاں ولد امین خاں غوری جو جام کی لڑائی میں زخمی ہوگیا تھا فوت ہو گیا اور اعظم خاں نے اس قلعہ کی تسخیر کے لیے فوج کشی کر دی۔ امین خاں کے وزیروں نے دولت خاں کی لڑائی میں کچھ دن تک تو اعظم خاں کی مدافعت کی۔ آخر امان طلب کر کے قلعہ کی کنجی پانچ ذی قعدہ سال مذکور کو اس کے حوالہ کر دی۔

ٹھٹہ کی فتح

۲۶ محرم ۱۰۰۰ھ جلوس کے چھتیسویں سال خان خاناں نے جانی بیگ سے ایک رات اور ایک دن مسلسل جنگ کی۔ دونوں طرف سے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا، آخر جانی بیگ کے دو سو آدمی مارے گئے اور اسے شکست ہوگئی۔ اس شکست کے بعد جانی بیگ اپنے لشکر کو لے کر جزیرہ میں چلا گیا اور وہاں قلعہ بندی کر لی۔ خان خاناں دو مہینے تک اس کا محاصرہ کیے پڑا رہا۔ اس دوران میں بادشاہ نے خان خاناں کی کمک کے لیے ایک مرتبہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور دوسری دفعہ ایک لاکھ روپیہ ایک لاکھ من غلّہ، سو بڑی توپیں، توپچیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دریا کے راستہ بھجوائیں رائے سنگھ کو جو چار ہزاری امیر ہے کمک کے لیے جیسلمیر کے راستہ سے روانہ کیا گیا۔

جانی بیگ نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور کئی ایک سخت لڑائیوں کے بعد آخر کار عاجز آگیا مصالحت کر لی اور اپنی لڑکی خان خاناں کے لڑکے سے بیاہ دی۔ وہ کشمیر کی فتح کے بعد خانخاناں کے ساتھ ملازمت میں داخل ہوا۔

سینتیسواں سال

پانچ جمادی الثانی ۱۰۰۰ھ کو نوروز ہوا اور جلوس سلطان کا سینتیسواں سال شروع ہوا۔

اس سال درباریوں نے بڑے اہتمام سے اپنی داڑھیاں منڈوائیں، اس لیے ان کی تاریخ ہوئی:

بگفتہ ریشہا بر باد دادہ مفسدے چندے

کرنسی کا نیا قانون

اس سال بھی کئی ایک نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ ایک حکم یہ دیا گیا کہ پچھلے بادشاہوں کے جتنے بھی سکے ہیں روپیہ اشرفیاں وغیرہ وہ سب گلا کر سونے چاندی کے بھاؤ فروخت کر دیے جائیں۔ پہلے سکوں کا نام و نشان تک نہ رہے اور بادشاہی سکے، روپیہ، اشرفی وغیرہ خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے ان کا چلن ایک شرح پر رہے اور سنوں کا فرق ان کے چلن پر اثر انداز نہ ہو۔ اس قانون کے نفاذ کے لیے قلیچ خاں کو مقرر کیا گیا۔ وہ ہر روز صرافوں کو بلا بلا کر ان سے مچلکے لیتا تھا اور جرمانے لگائے جاتے تھے اس نے بڑی سختی سے کام لیا اور چند ایک کو قتل تک کرا دیا۔ اس کے باوجود صراف جعل اور دھوکا سے باز نہ آتے تھے۔ بادشاہ نے کرنسی کے سلسلہ میں بڑے تاکیدی فرمان ہر جگہ بھجوائے لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر خواجہ شمس الدین خوافی دیوان کل کی کوششوں سے اس حکم کا نفاذ ہو سکا۔

جلالہ تاریکی پر فوج کشی

یوم شرف آفتاب کو جب کہ سورج انیسویں درجۂ حمل میں ہوتا ہے۔ جعفر بیگ آصف خاں[۱] بخشی کو جلالہ تاریکی کے تعاقب پر مامور کیا گیا۔ جلالہ اس وقت عبداللہ خاں کے پاس سے لوٹ کر کابل

---

[۱] آصف خاں: اصل نام خواجہ عبدالمجید تھا یزد یا ہرات اصل وطن تھا سیر المتاخرین میں حضرت زین الدین خوافی کی اولاد بتایا ہے، مآثر الامرا میں شیخ ابوبکر کی اولاد میں لکھا ہے۔ قوم تاجیک تھی۔ پہلے ہمایوں کے دفتر کے اہل قلم میں شامل تھے۔ جب اکبر دلی سے بیرم خاں کی مہم پر گیا تو ان کو آصف خاں کا خطاب دے کر دہلی کا حاکم بنایا پھر سہ ہزاری منصبدار ہوئے۔ ۹ سنہ جلوس اکبر شاہی میں رانا درگاوتی کو شکست دے کر ہوشنگ آباد پر قبضہ کیا۔ خانزماں کی بغاوت میں فوج کے سپہ سالار بن کر اس کا مقابلہ کیا، اس جنگ کے دوران وزیر خاں کو ساتھ لے کر خود بھی بغاوت کر دی اور بھاگ کر جوناگڑھ میں جا کر پناہ لی۔ جون پور اور مانک پور کے درمیان بہادر خاں نے حملہ کر کے گرفتار کر لیا۔ ۹۷۵ھ میں اکبر نے قصور معاف کر کے پرگنہ پیاگ جاگیر میں دیا۔ چتوڑ کی مہم میں آصف خاں نے بڑے کارہائے دکھائے تھے۔ اس کے بعد ان کو فوج کا بخشی بنا دیا گیا۔

کی طرف آرہا تھا۔ اس کی کمک پر حاکم کابل محمد قاسم خاں کو مقرر کیا گیا۔ نظام الدین احمد کو "بخشی کل" کا عہدہ مرحمت ہوا۔ آخر شعبان میں زین خاں کوکہ کو بھی آصف خاں کی مدد اور تاریکیوں (روشنائی قبیلہ) کے مکمل استیصال کے لیے اور سواد اور بجوڑ کے علاقہ کو آباد کرنے کے لیے نامزد کیا گیا۔

اس سال وسط شوال میں حافظ سلطان رخنہ ہروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نہایت مخیر شخص تھا، خاص طور سے سرہند میں اس کی بنائی ہوئی عمارتیں اور باغ ایسے خوش منظر اور عالی شان ہیں کہ ہندوستان میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی تاریخ وفات اصول تعمیہ سے نکالی گئی:

رخنہ در باغ شد و آب نماند

فیضی سرہندی نے دو تاریخیں کہی ہیں، ایک ——— "باغ بے آب شد"

دوسری ؎

چو اُو در گوشۂ باغ است مدفون

بجو تاریخ او از گوشۂ باغ

ایک اور تاریخ ہے: ——— "یا حافظ"

یادگار گل کا کشمیر پر قبضہ

یوسف خاں رضوی کشمیر میں اپنے بھتیجے یادگار گل کو نائب بنا کر ۲۴ شوال کو حاضر خدمت ہو گیا اس کے آنے کے بعد بادشاہ سلامت نے لاہور کے نظم و نسق پر قلیچ خاں کا تقرر کیا اور عین موسم باراں میں دریائے راوی کو عبور کیا۔ لشکر کو بڑے شاہزادہ کے ہمراہ کر کے خود شکار کھیلتے ہوئے دریائے چناب پر پہنچے۔

چناب کی منزل میں یہ خبریں ملیں کہ یادگار گل نے کشمیر کے باشاہی تحصیلدار حسین بیگ شیخ عمری بدخشی سے جنگ کر کے اسے شکست دے دی ہے۔ کشمیر کا سرکاری قاضی علی بغدادی اماموں کا بڑا دشمن تھا اور کشمیر کی دیوانی کے عہدہ پر فائز تھا اور حساب کتاب میں الجھنیں پیدا کر کے رعیت کو تنگ کر رکھا تھا۔ یادگار گل نے اس کے ناک، کان کاٹ کر اسے وہاں سے نکال دیا اس واقعہ کی تاریخ ہے:

چوں کہ قاضی علی بغدادی حسرت یادگار با خود برد

خامۂ منشی قضا بنوشت سال تاریخ او کہ موذی مرد

یادگار گل کی تخت نشینی

اس کامیابی کے بعد یادگار گل نے وہاں کے قدیم امراء کی مدد سے تاج شاہی سر پر رکھا۔ کشمیر میں یہ رسم ہے کہ تخت نشینی کے وقت امراء نئے بادشاہ کے اطراف ننگی تلوار میں لیے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں جب یادگار خطبہ پڑھنے کھڑا ہوا تو خوف سے لرزنے لگا اور کافی دیر تک بدحواس رہا۔ ایک اور اتفاق یہ پیش آیا کہ جس دن اس کے مہر کے لیے سجع تجویز کیا گیا تو اس نے اپنے سامنے نگینہ کھدوایا۔ اس وقت نگینہ کا ایک ریزہ اڑ کر اس کی آنکھ میں پڑ گیا اور وہ دیر تک اس تکلیف سے بے چین و مضطرب رہا۔ ان بدشگونیوں کی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ اس کی سلطنت زیادہ عرصہ قائم نہیں رہے گی۔

حسین بیگ شیخ عمری نے یادگار گل سے شکست کھائی وہ کشمیر کے دروں سے اپنی جان بچا کر لے آیا اور راجوری میں جو کشمیر کے راستہ پر ہے، حکم شاہی کا انتظار کرنے لگا۔

یادگار نے کشمیر میں اپنی بادشاہت قائم کی لوگوں کو جاگیریں دیں، خطابات عطا کیے اور میرزا یوسف خاں کے خزانہ، طویلے اور اسلحہ خانہ پر قبضہ کر لیا۔ یوسف خاں کے اہل و عیال سے سارا روپیہ زیور اور اناج وغیرہ چھین کر خچروں پر سوار کرا دیا اور ان کو یوسف خاں کے بیٹے کے ہمراہ کشمیر سے باہر نکال دیا۔

یادگار گل کی شکست اور قتل

اس واقعہ پر بادشاہ نے سارا الزام یوسف خاں کے سر رکھا اور اسے کچھ دن تک شیخ ابوالفضل کے پاس قید میں ڈلوا دیا اور شیخ فرید بخش کو شیخ عبدالرحیم لکھنوی اور دوسرے چند امراء کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دے کر خود چناب پر شاہزادہ کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔

ابھی بادشاہ نے وہاں سے کوچ نہیں کیا تھا کہ خبر ملی امرائے شاہی کے مقابلہ کے لیے یادگار نے کشمیر سے نکل کر ہیرا پور نامی درہ پر مورچے جمائے تھے اور رات کے وقت وہ اپنے سرا پردہ میں عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ میرزا یوسف خاں کے بعض نوکروں نے پٹھانوں کے ایک دستہ کو ساتھ لے کر آدھی رات کو شب خون مارا اور یادگار کو قتل کر دیا۔ تین دن بعد اس کا سر بھی بارگاہ شاہی میں پہنچ گیا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ اس کی تخت نشینی کے چالیسویں دن ہی اس کا سر کٹ کر دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے سر کو عبرت کے لیے قلعہ لاہور کے کنگرہ پر لٹکا دیا گیا۔

جامع رشیدی کے ترجمہ کا حکم

اسی سال ماہ ذی الحج کو حسب الحکم میں بدایوں سے لشکر میں حاضر ہو گیا۔ بھنبر کی منزل میں حکیم ہمام نے عرض کیا کہ عبدالقادر کورنش بجا لانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ وعدہ کے خلاف کتنے عرصہ تک غیر حاضر رہا، حکیم نے جواب دیا "پانچ مہینے"۔ بادشاہ نے پوچھا "غیر حاضری کا کیا سبب تھا"؟ لوگوں نے کہا "وہ بیمار ہو گیا تھا"۔ تصدیق کے لیے بدایوں کے اکابرین کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ جب بادشاہ نے یہ سارے کاغذات پڑھ لیے تو فرمایا "بیماری پانچ مہینے تک نہیں رہتی" اور مجھے کورنش کی اجازت نہیں دی۔ اور میں نہایت شرمندہ رنجیدہ اور غمزدہ شاہزادہ دانیال کے لشکر میں جسے رہتاس میں متعین کیا گیا تھا ٹھہرا رہا، اور حضور اکرم پر درود بھیج کر اور قصیدہ بردہ کا ورد کر کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں جو آخر کار بفضل ایزدی قبول ہوئیں اور میرے پہنچنے کے پانچ ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور کو پہنچا تو بادشاہ نے مجھ پر توجہ اور عنایت فرمائی اور ایک کتاب "جامع رشیدی" کے ترجمہ کے لیے جو کافی ضخیم ہے خلوت شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میرے غائبانہ تجویز فرمایا اور مجھے حاضری کا حکم دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کی واپسی کے بعد ماہ الٰہی کی عید بہمن کے دن اس سال کی ۱۷ ربیع الآخر کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر دی، بادشاہ نے بڑی مہربانی کا اظہار کیا اور وہ خفگی یکساتی رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے علامی ابوالفضل کے مشورہ سے مجھے "جامع رشیدی" کے انتخاب کا حکم دیا۔ میں نے اس انتخاب میں عباسی، مصری، اموی خلفاء کے شجرہ کو جس کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر ان سے درجہ بدرجہ تمام نبیوں اور آدم علیہ السلام تک جا کر ختم ہوتا ہے، عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے خدمت شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب کو خزانہ عامرہ میں داخل

کرا دیا۔

کشمیر کی سیر

۶ محرم سنہ ۱۰۰۱ھ کو شاہنشاہ کشمیر پہنچ گئے اور اٹھائیس دن تک اس "باغ خاصہ" کی سیر میں مصروف رہے۔ وہاں کی حکومت دوبارہ میرزا یوسف خاں کے حوالہ کر دی، چھ صفر سنہ ۱۰۰۱ھ کو وہاں سے مراجعت فرمائی اور کشتی کے ذریعہ کشمیر کی سرحد پر پکھلی کے راستہ بارہ مولہ جا پہنچے۔ راستہ میں "زین مٹکا" نامی تالاب کی بھی سیر کی۔ یہ تالاب دو مشرقی اور مغربی پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ اس کا دور تیس کوس کا ہے اور بہت گہرا ہے۔ "دریائے بیت" (بہت) اسی جھیل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔

سلطان زین العابدین نے، جس کا ذکر تاریخ کشمیر کے تصحیح شدہ نسخہ میں کیا گیا ہے، اس تالاب میں تقریباً ایک جریب پتھر ڈلوا کر ایک بڑا پشتہ بنوایا اور اس پر ایسی عالی شان خوش منظر سنگین عمارتیں تعمیر کرائیں کہ ان کی مثال ہندوستان کے کسی شہر میں بھی نہیں ملتی۔

لرزنے والا درخت

لشکر والے کشمیر میں ایک نہایت انوکھی چیز دیکھ کر آئے تھے، یہ موضع خان پور میں ایک لرزنے والا درخت ہے جس کا تنہ تو دو ہاتھ موٹا اور اس کی بلندی ایک گز سے کچھ زیادہ ہوگی۔ اس کی شاخیں بید مجنوں کی ڈالیوں کی طرح جھکی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی بچہ اس کی ایک شاخ کو پکڑ کر ہلا دے تو پورا درخت حرکت میں آجاتا ہے اور لرزنے لگتا ہے۔

کشمیر کے بعض عجائبات کا تذکرہ شاہ فتح اللہ شیرازی مرحوم نے اپنے ایک رسالہ میں بھی کیا تھا جو علامی شیخ ابوالفضل کی تصنیف اکبر نامہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

پشاور میں ورود شاہانہ

یکم ربیع الاول کو رہتاس میں منزل شاہانہ ہوئی اور اسی ماہ کی ۱۵ تاریخ کو پشاور کی طرف مراجعت فرمائی گئی، ۶ ربیع الثانی کو بادشاہ شہر پشاور میں داخل ہوئے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ بہادر کو درہ نے جس کا کچھ حال ہم پہلے بیان کر آئے ہیں حاکم اڑیسہ قتلو خان کے انتقال کے بعد سکت سنگھ ولد مان سنگھ[1] نے اس پر فوج کشی کر دی۔ وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپا اور سمندر کے کنارے تک بنگال کا سارا علاقہ بادشاہی قبضہ میں آگیا۔

---

[1] راجہ مان سنگھ: کچھوابہ خاندان کے راجہ بہاڑا مل اور بھگوان داس کا ذکر اس سے پہلے حاشیہ میں آچکا ہے۔ مان سنگھ بھگونت (بھگوان) داس کا بیٹا اور بہاڑا مل کا پوتا تھا، اکبر نے اجمیر سے رانا کیکا کی سرکوبی کے لیے جو لشکر بھیجا تھا اس کی سرداری مان سنگھ کو مرحمت کی تھی۔ اس معرکہ میں مان سنگھ نے ایسی بہادری دکھائی کہ بادشاہ کی نظروں میں چڑھ گیا۔ رانا کیکا میواڑ کا راجہ تھا، چتوڑ کی فتح کے بعد تو وہ ہندوارہ کے کوہستان میں قلعہ کو کندہ بنا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے قبضہ میں اودے پور کنبھل میر جوار دلی کے پہاڑوں میں اودے پور سے ۴۰ کوس پر رہے تھا، رانا کیکا نے آخر وقت تک اکبر کی اطاعت نہیں کی۔ گو گنڈہ کے نواح میں مان سنگھ کے مقابلہ میں وہ شکست کھا کر بھاگا۔ مان سنگھ کی اور اس کی دست بدست لڑائی ہوئی تھی، سنہ ۹۸۹ھ میں جب محمد حکیم مرزا نے پنجاب پر حملہ کیا تو مان سنگھ اس کے مقابلہ پر گیا اور پشاور سے آگے تک بھگا دیا۔ سنہ ۹۹۳ھ میں اکبر نے شہزادہ سلیم کی شادی مان سنگھ کی بہن سے کرا دی۔ جب سنہ ۹۹۴ھ میں کابل پر بادشاہی قبضہ ہوا تو مان سنگھ کابل کا حاکم بنایا گیا۔ سنہ ۹۹۷ھ میں مان سنگھ کو اڑیسہ، بنگال پر قتلو خاں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ سنہ ۱۰۰۵ھ میں کوہستان پنجاب پر تقرری ہوئی آخری دور اکبری میں مان سنگھ نے شہزادہ سلیم جہانگیر کو بغاوت پر اکسایا تھا اور جب بنگال میں بغاوت ہوئی تو حسب الحکم شاہی خود ہی جا کر یہ بغاوت رفع کی اور ڈھاکہ میں بنگال کی حکمرانی کرتا رہا۔ اکبر کے بعد جہانگیر کے عہد میں بھی اس کی وہی عزت و آبرو رہی، دکن کی مہم میں سنہ ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی اس کا ایک لڑکا بھاؤ سنگھ تھا جسے جہانگیر نے مرزا راجا کا خطاب دیا تھا۔ کہتے ہیں اس کی ۱۵ سو رانیاں تھیں۔ آجکل جس جگہ تاج محل (روضہ تاج گنج) ہے وہ مان سنگھ کی جاگیر کی اراضی تھی۔

جلوس سلطانی کا اڑتیسواں سال

بروز اتوار ۱۷ جمادی الثانی سنہ ۱۰۰۱ھ سورج برج حوت سے برج حمل میں منتقل ہوا جشن نوروز منعقد کیا گیا اور جلوس شاہانہ کا ۳۸ واں سال شروع ہو گیا اور چند نئے قوانین اجرا کیے گئے۔

۲۴ جمادی الثانی کو خانخاناں اور میرزا جان بارگاہ شاہی میں باریاب ہوئے اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے۔ ان امیروں کو بھی جو اس مہم میں خان خاناں کے ہمراہ گئے تھے حسب مراتب منصبوں اور جاگیروں میں ترقی ملی۔ ملتان پہلے میرزا جانی کی جاگیر میں دیا گیا بعد میں اسے ٹھٹہ اور میرزا رستم کو ملتان کا علاقہ سپرد ہوا، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

مظفر گجراتی کی خودکشی

اس وقت خبر پہنچی کہ جب خان اعظم نے سورت پر قبضہ کر لیا تو وہاں سے مظفر گجراتی[1] بھاگ کر کچھ کے ایک زمیندار کنکار نامی کے پاس چلا گیا۔ خان اعظم اس کے تعاقب میں کنکار کے سر پر جا پہنچا۔ زمیندار اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور مظفر کو غفلت کی حالت میں قید کر کے خان اعظم کے پاس بھجوا دیا۔ مظفر نے راستہ میں قضائے حاجت کا بہانہ کیا اور ایک استرہ سے جو اس کے بازو بند میں چھپا ہوا تھا اپنا گلا کاٹ لیا۔ اس کا سر خان اعظم کے پاس پہنچایا گیا۔ خان اعظم نے اسے ملاحظہ شاہی کے لیے لاہور بھیج دیا۔

انہی دنوں ایک سو بیس ہاتھی جو اڑیسہ کی فتح میں راجہ مان سنگھ کے ہاتھ آئے تھے بنگال سے آئے۔ اکبر نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ امرائے سرحد ہمیشہ وقفہ وقفہ سے دربار میں حاضر ہوتے رہیں۔ اس سال خان اعظم کی طلبی کا فرمان صادر کیا گیا جو چھ سال سے دربار میں نہیں آیا تھا، اس نے جوناگڑھ کو فتح کیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے جوناگڑھ لے کر راجہ رائے سنگھ کے حوالہ کر دیا۔

خان اعظم کی حجاز کو روانگی

آخری مرتبہ جب خان اعظم بنگالہ سے فتح پور میں آ کر باریاب ہوا تھا تو اس نے مذہبی معاملات میں اکبر سے بہت بحث کی تھی اور بادشاہ کے سامنے ابوالفضل اور بیربر سے سخت گفتگو کی تھی اس لیے وہ حاضری میں متامل تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس نے جام کی لڑائی میں اپنی منت کے مطابق داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں طنزاً یہ بھی لکھا تھا کہ "تیری داڑھی اتنی بوجھل ہے کہ تجھے آنے نہیں دیتی ہے۔" اس کے جواب میں خان اعظم نے ایک طویل اور نہایت سخت عریضہ روانہ کیا۔ یہ جواب بادشاہ کے دل میں کھٹک گیا۔ منافقوں نے بھی اس کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی۔ دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خان اعظم اسی سال یکم رجب کو اپنے اہل و عیال کے ہمراہ تمام مال و خزانہ لے کر ایک جہاز میں جوناگڑھ سے بندر دیو کو چلا گیا اور حجاز چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس کی روانگی کی تاریخ ایک عدہ کی کمی سے یہ کہی گئی ہے۔

بجائے راستاں شد خان اعظم　　　ولی در زعم شاہنشاہ کج رفت

---

[1] سلطان مظفر گجراتی: یہ شخص شاہان گجرات کی وراثت کا دعویدار تھا لیکن گجرات کا آخری فرمانروا سلطان محمود گجراتی لاولد مرا تھا اس کے سردار اعتماد خاں نے اس سلسلہ کو قائم رکھنے کے لیے مظفر کو تخت پر بٹھا دیا اور یہ مشہور کیا کہ سلطان محمود نے اپنی ایک حرم کو قتل کرنے کے لیے میرے سپرد کر دیا تھا، وہ حاملہ تھی اس لیے میں نے اسے چھپا دیا اس سے یہ لڑکا تولد ہوا۔ اصل نام تنو تھا اسی لیے ابوالفضل نے اسے مظفر نہیں لکھا۔ تنو ہی لکھا ہے۔ ۹۷۹ھ میں جب بادشاہی فوجوں نے گجرات فتح کیا تو مظفر کو شاہی ملازمت میں شامل کر دیا گیا، جب اکبر کو اعتماد خاں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ شاہی خاندان سے نہیں بلکہ گاڑی بان کا لڑکا ہے تو تیس روپیہ وظیفہ مقرر کر کے خدمت گاروں میں شامل کر دیا۔ چند روز کرم علی داروغہ خوشبو خانہ کے ماتحت رہا پھر منعم خاں خانخاناں کے پاس قید رہا اس کی وفات کے بعد خواجہ شاہ منصور کی نگرانی میں رہا۔ ۲۳ جلوس میں فرار ہو گیا اور گجرات جا کر دوبارہ سرکشی کی، آخر ۱۰۰۱ھ میں خودکشی کر کے مر گیا۔

چو پرسیدم ز دل تاریخ ایں سال گفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

اس کا یہ جرأت مندانہ اقدام بلاشبہ ابن ادھم کے ترک سلطنت کے مشابہ تھا۔

گجرات کے امراء کے تبادلے

بادشاہ کو جب خان اعظم کے چلے جانے کی خبر ملی تو مالوہ کو شاہزادہ مراد کے پاس فرمان گیا کہ اسے گجرات کی حکومت سپرد کی جاتی ہے۔ اس کی وکالت کے لیے اسماعیل قلی خاں کے بجائے محمد صادق خاں کو مقرر کیا گیا۔ سورت اور بھڑوچ کا علاقہ بھی قلیج خاں سے لے کر صادق خاں کی جاگیر میں دے دیا گیا۔

زین خاں کوکہ اور آصف خاں نے جو سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں اور جلالہ تاریکی (روشنائی) کی سرکوبی کے لیے مامور کیے گئے تھے، حملہ کر کے بہت سے پٹھانوں کو قتل کر دیا اور اس کے بھائی وحدت علی کو اس کے اہل قبیلہ کے ساتھ جو تقریباً ۱۴ ہزار آدمی تھے اسیر کر لیا اور اسی سال دربار میں بھجوا دیا۔

۲۹ ذی قعدہ کو مالوہ کی حکومت شاہ رخ میرزا[1] کو سپرد کی گئی۔ شہباز خاں کنبو تین سال سے قید میں تھا۔ اس سے سات لاکھ روپیہ نقد لے کر کانگڑہ کے قلعہ سے بلا کر رہا کر دیا۔ اسے شاہ رخ میرزا کی وکالت اور مالوہ کے نظم و نسق پر متعین کیا گیا۔

شیخ مبارک کی وفات

۱۷ ذی قعدہ ۱۰۰۱ھ شیخ مبارک دانشمند کا انتقال ہو گیا۔ اس کے لڑکوں نے تعزیت میں اپنے سر کے بال، داڑھی مونچھیں اور ابرو منڈوا دیئے۔ ان کی تاریخ وفات ملک الشعراء شیخ فیضی نے "فخر الکمل" اور میں نے "شیخ کامل" نکالی۔

میرزا رستم کی آمد

۸ محرم ۱۰۰۲ھ کو میرزا رستم بن سلطان حسین میرزا بن بہرام میرزا بن شاہ اسماعیل صفوی جو ملک داور اور اس کے نواحی علاقہ کا حاکم تھا اور قندھار و گرم سیر پر اس کے بڑے بھائی میرزا مظفر حسین کی حکمرانی تھی۔ اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے تمام اہل و عیال، بھائی بندوں کے ساتھ ہندوستان آ گیا اور بادشاہ کے پاس باریاب ہوا۔ اس کے استقبال کے لیے بادشاہ نے حکیم عین الملک کو بھیجا تھا اور اس کے لیے سراپردہ بارگاہ قالین اور فراش خانہ کا دوسرا ساز و سامان مرصع کمر پٹہ اور خنجر بھی روانہ کیا۔ جب وہ لاہور سے چار کوس پر پہنچا تو حسب الحکم خان خاناں زین خاں کوکہ اور دوسرے تمام اکابر امراء پیشوائی کے لیے روانہ ہوئے۔ باریابی کے وقت اس کو ایک کروڑ تنکہ نقد انعام دیا گیا اور پانچ ہزاری امراء میں اس کو داخل کیا گیا اور ملتان اس کی جاگیر میں دیا گیا۔

دکن کی مہم پر دانیال اور خانخاناں کا تقرر

ملک الشعراء شیخ فیضی کچھ دن پہلے دکن سے آ چکا تھا اس کی آمد کے چار ماہ بعد حکام دکن کے ایلچی دربار میں آئے۔ چونکہ برہان الملک نے خاطر خواہ پیش کش نہیں بھیجی تھی۔ اکبر نے ۱۲ محرم کو شاہزادہ دانیال کو دکن کی مہم پر مقرر کیا۔ خانخاناں[2] اور رائے سنگھ اس کے وکیل مقرر ہوئے اور دوسرے

---

[1] شاہرخ میرزا: مرزا سلیمان کا پوتا اور میرزا ابراہیم کا بیٹا تھا، ماں کا نام محترمہ خانم تھا، باپ تو پیدا ہونے سے پہلے مرگیا تھا۔ ماں اسے لے کر کاشغر چلی گئی جب جوان ہوا تو بدخشاں کے لیے دادا اور پوتے میں کئی ایک لڑائیاں ہوئیں اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اوزبکوں نے بدخشاں پر قبضہ کر لیا مرزا سلیمان کابل اور شاہ رخ مرزا ۹۹۳ھ میں ہندوستان آ گیا ۱۰۰۱ھ میں اکبر نے اپنی بیٹی شکر النساء بیگم کی اس سے شادی کر دی، پانچ ہزاری منصب دے کر مالوہ پر بھیج دیا آخری عہد اکبری میں ہفت ہزاری منصب ملا۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے "سیدھا سادھا ترک ہے اس نے مجھے کبھی نہیں ستایا ۲۰ برس ہوئے ہندوستان میں آیا ہے ہندی زبان بالکل نہیں جانتا" ۱۰۱۶ھ میں اجین میں انتقال کیا شہر کے باہر دفن کیا گیا۔ [2] عبدالرحیم خانخاناں: بیرم خاں کا لڑکا ۹۶۴ھ میں لاہور

(باقی اگلے صفحہ پر)

بہت سے امرا ہمراہی کے لیے نامزد کیے گئے۔ اس مہم پر روانگی سے پہلے بادشاہ نے شہزادہ دانیال کا خانخاناں کی بیٹی سے نکاح کرایا، اس خوشی میں ایک شاندار جشن منعقد ہوا۔ شاہزادہ کو اس قدر نقد روپیہ اور مال و اسباب جہیز میں ملا کہ ایک لشکر کا پورا سامان اس سے ہو سکتا تھا۔ شادی کے بعد اکبر نے دانیال کو تمام شاہی لوازمات، اور شان و شوکت کا سامان مرحمت کر کے اس مہم پر رخصت کر دیا۔ خود بھی اس کے پیچھے شکار کے ارادہ سے سلطان پور کی ندی تک جو لاہور سے پچیس کوس پر ہے گیا، وہاں پہنچنے کے بعد بادشاہ کی رائے بدل گئی اور شاہزادہ کو مراجعت کا حکم دے کر خان خاناں کو بھی جو سرہند تک پہنچ چکا تھا، مشورہ کے لیے بلوا لیا اور اس کو اس لشکر کا مستقل سردار بنا کر اور مہم کے ضروری انتظامات کر کے دوبارہ لشکر کو رخصت کر دیا اور وہاں سے لاہور لوٹ آیا۔

بروز جمعہ ۱۸ جمادی الثانی سنہ ۱۰۰۸ھ میاں شیخ عبداللہ خلف میاں شیخ داؤد نے انتقال فرمایا۔ ان کی تاریخ ——————

"جان پاک شیخ داؤد" —————— نکالی گئی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) میں پیدائش ہوئی، ان کی ماں سلیمہ سلطان بیگم جمال خاں میواتی کی بیٹی حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی، بڑی بہن اکبر کے حرم میں تھی (اکبر نامہ) اکبر نے لڑکے کا نام عبدالرحیم رکھا۔ بیرم خاں کی شہادت کے بعد ماں بچہ کو لے کر گجرات پٹن سے احمد آباد پہنچی چار ماہ بعد اکبر نے ان کو فتح پور بلا لیا۔ سلیمہ بیگم سے بادشاہ نے نکاح کر لیا، عبدالرحیم کی اکبر کے سایۂ عاطفت میں پرورش ہوئی۔ عربی، ترکی، فارسی، سنسکرت زبانوں کی تحصیل کی۔ اکبر اسے مرزا خاں کہا کرتا تھا نہایت خوبرو حسین جوان تھا، اکبر نے مرزا عزیز کوکلتاش خان اعظم کی بہن ماہ بانو بیگم سے نکاح کرا دیا۔ سنہ ۹۸۰ھ میں جب اکبر احمد آباد گجرات گیا تو عبدالرحیم ۱۳ سال کا تھا اس کے باوجود اس نے بڑی بہادری سے اس معرکہ میں حصہ لیا۔ سنہ ۹۸۸ھ میں عرض بیگی کا منصب ملا۔ سنہ ۹۹۰ھ میں اس کی عمر ۲۸ — ۳۰ سال ہوگی۔ شاہزادہ سلیم جہانگیر کی بارہ تیرہ برس، اکبر نے شہزادہ کا اتالیق مقرر کر دیا۔ سنہ ۹۹۱ھ میں مظفر گجراتی کے مقابلہ میں سالار لشکر بن کر احمد آباد گجرات پر فوج کشی کی اور فتح پائی۔ خان خاناں کا آبائی خطاب حاصل کیا۔ سنہ ۹۹۷ھ تک وہ گجرات کی حکومت پر رہے۔ سنہ ۹۹۸ھ میں وکیل مطلق کا عہدہ ملا اور باپ کی پرانی گدی ہاتھ آئی۔ سنہ ۹۹۹ھ م ۱۵۹۱ء میں ملتان اور بھکر کی جاگیر ملی اور مرزا جانی کو شکست دے کر سیستان پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۱۰۰۳ھ میں شاہزادہ مراد کے ساتھ دکن کی مہم میں شامل رہے لیکن چاند بی بی کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ سنہ ۱۰۰۵ھ م ۱۵۹۷ء میں عادل بادشاہ کے سپہ سالار سہیل خاں کو شکست دی۔ خان خاناں اور شہزادہ مراد میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اسی جھگڑے میں اکبر سے رنجش ہو گئی سنہ ۱۰۰۷ھ میں شہزادہ دانیال کا خان خاناں کی لڑکی جانا بیگم سے نکاح ہوا اور خان خاناں دانیال کے ساتھ دکن کی مہم پر گئے۔ سنہ ۴۵ جلوس میں جب چاند بی بی کو اس کے امیروں نے شہید کر دیا تو خان خاناں کا احمد نگر پر قبضہ ہو سکا۔ سنہ ۱۰۰۹ھ میں تلنگانہ کے علاقے فتح کیے۔ اکبر کے بعد جہانگیر بادشاہ ہوا تو خان خاناں دکن ہی میں تھے۔ سنہ ۱۰۱۸ھ میں جہانگیری دربار میں آئے۔ جب مہابت خاں کا زور ٹوٹا تو خان خاناں اس کے تعاقب میں لشکر لے کر دربار سے روانہ ہوئے اس وقت ۷۲ سال کی عمر تھی دہلی پہنچے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ سنہ ۱۰۳۶ھ کے وسط میں انتقال ہو گیا، ان کی تاریخ وفات "خان سپہ سالار کو" سے نکلتی ہے۔ خان خاناں نہایت علم دوست، شیریں کلام، شاعر، منتظم، فارسی میں ان کی متفرق غزلیں اور رباعیاں ملتی ہیں جو نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کا ایک لڑکا میرزا ایرج تھا جسے سنہ ۱۰۲۰ھ میں جہانگیر نے شاہنواز خاں کا خطاب دیا سنہ ۱۰۲۴ھ سے سنہ ۱۰۲۷ھ تک اس نے دکن میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ خان خاناں کی بہادری، سخاوت، علم دوستی اور مزاح کے بڑے قصے مشہور ہیں ان کی غزل کے چند شعر ہیں:

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است — جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست — وگرنہ خاطر عاشق بہ ہیچ خورسند است

نہ زلف دانم و نے دام ایں قدر دانم — کہ پا تا بسرم ہر چہ ہست در بند است

بدوستی کہ بجز دوستی نے دانم — خداوند آں کو مرا خداوند است

ازیں خوشم بہ سخن ہائے عالیہائے رحیم

کہ اند کے باد اہائے دوست مانند است

میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں تک جتنے واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا ماخذ "طبقات اکبر شاہی" ہے، جس کا نام میں نے تاریخ کی رو سے "نظامی" رکھا ہے۔ یہ نام اس کے مصنف نے بھی پسند کیا تھا اور اسے اپنی کتاب کے ساتھ درج کیا تھا۔ اس کے بعد دو سال کے واقعات میں مجملاً بیان کروں گا۔

اُنتالیسواں (۳۹) سنِ جلوس

بروز پیر ۲۸ جمادی الثانی سنہ ۱۰۰۲ھ نوروز ہوا اور جلوس سلطانی کا ۳۹ واں سال شروع ہو گیا۔ حسبِ سابق ۱۸ دن تک بڑے عیش و طرب کے ہنگامے گرم رہے اور نئے نئے قوانین کا اجرا ہوا۔

کوتوالی کے انتظامات

کوتوالوں کو حکم دیا گیا کہ ہر شہر کا کوتوال اپنے شہر کے تمام محلوں اور گھروں کے حالات سے باخبر رہے اور ہر میرِ محلہ سے اس بات کا مچلکہ لکھوا لے کہ جو شخص تاجر یا سپاہی یا کوئی اور پیشہ ور ان کے محلہ میں آ کر ٹھہرے وہ ان کے حالات سے باخبر رہے گا۔ کسی مفسد یا چور کو اپنے محلہ میں رہنے نہیں دے گا۔ جس آدمی کا خرچ اس کی آمدنی سے زیادہ دکھائی دے اس کی تحقیقات کر کے کوتوال کو باخبر کر دے گا، کیوں کہ اس کی فضول خرچیاں ناجائز آمدنی ہی کے سبب ہو سکتی ہیں۔ محلہ میں خوشی اور غمی کی جو تقریبیں ہوں خصوصاً نکاح، ولادت، قتل وغیرہ کے واقعات سے محلہ والے کوتوال کو لازماً مطلع کر دیا کریں۔ کوتوال ایک معتبر آدمی ہمیشہ ہر محلہ، گلی بازار اور پانی کی گزرگاہ پر متعین رکھے اور لوگوں کی اچھائی برائی کو اپنی نظر میں رکھے۔ راستوں کی ایسی ناکہ بندی کی جائے کہ بھاگا ہوا کوئی شخص یا بھولا بھٹکا آدمی بچ کر نہ جا سکے۔ کوئی سوداگر بغیر اجازت گھوڑے نہ لے جائے اور سوداگر ہندوستان سے غلاموں کو لے کر نہ جا سکیں۔

لین دین کے قاعدے

سونے چاندی اور کپڑوں کا نرخ بھی متعین کیا گیا کہ ان کا لین دین سرکاری شرح پر ہو اور منافع پر مقررہ ٹیکس سرکاری خزانہ میں داخل کیا جائے۔ میتوں کے مال پر ایک داروغہ مقرر کیا جائے تاکہ تحقیقات کے بعد اگر اس کے ذمہ کچھ سرکاری بقایا ہو یا مرنے والا کروڑی، عملدار یا وظیفہ دار ہو تو اس کا مال ضبط کر لیا جائے ورنہ اس کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ جب تک بیت المال کے داروغہ کی اجازت نہ مل جائے، میتوں کو دفن نہ کیا جائے۔

آفتاب کی تعظیم کے لیے قبرستان کا دروازہ شہر کی مشرقی جانب رکھا جائے۔ اگر کوئی "درشنی مریدیہ" مر جائے تو خواہ مرد ہو یا عورت کچا اناج اور چند پکی اینٹیں اس کی گردن میں باندھ کر دریا میں بہا دیں، جہاں پانی نہ ہو وہاں اس کی میت جلا دی جائے یا چینیوں کی طرح کسی درخت پر اسے باندھ دیں۔

قانونِ ازدواج

نکاح سے پہلے دولھا اور دلہن کو کوتوالی میں لا کر جب تک کوتوال کے گماشتوں سے ان کی عمروں کی تحقیق نہ کرا لی جائے اس وقت تک ان کا نکاح نہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا قوانین سے عوام کو جو فائدہ یا نقصان ہوا وہ ہوا، لیکن ان کے نفاذ سے کوتوالی کے ملازمین اور تمام بدمعاشوں کی خوب بن آئی اور انھوں نے رشوت میں اپنے ہاتھ خوب رنگے۔

ایک حکم یہ دیا گیا کہ جو عورت اپنے شوہر سے بارہ سال بڑی ہو شوہر اس سے صحبت نہ کرے۔ جو نوجوان عورت شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بے پردہ گھومتی نظر آئے یا ایسی مکار عورت جو شوہر سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہو فاحشہ عورتوں کے محلہ میں بھجوا دی جائے۔ بھوک اور حالتِ اضطرار میں ماں باپ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کر دیں اور جب ان کی تنگی رفع ہو جائے

تو وہ روپیہ دے کر اپنے بچوں کو چھڑا لیں۔

تبدیل مذہب کی آزادی

وہ ہندو جو بچپن میں یا بہ جبر مسلمان بنا لیے گئے ہوں انھیں اختیار ہوگا کہ اگر چاہیں تو دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کر لیں۔ تبدیل مذہب پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔ جو شخص جس مذہب کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان پر فریفتہ ہو کر مسلمان ہو جائے تو اسے زبردستی اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا جائے۔

بت خانہ، گرجا، آتش کدہ کسی بھی عبادت گاہ کی تعمیر میں کافروں پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔

ملکی قوانین کی تفصیلات

یہ چند احکام تھے جن کا تعلق مذہبی معاملات سے تھا ان کو مختصراً لکھ دیا گیا۔ ان کی تفصیل میری قوت تحریر سے باہر ہے۔ اسی طرح وہ سارے قوانین جو ملکی اور مالی امور سے متعلق ہیں جیسے بیوتات، دارالضرب، فوج، رعیت، سوداگری، چوکی، واقعہ نویسی، کروڑی، داغ و محلی، ہاتھیوں کی لڑائی، ہرن، چیتا، مرغ، بکری، کتے اور سور کی لڑائی۔ اسی طرح اصطبل کے ضوابط، کھانے پینے، سونے اٹھنے کے اوقات کا تعین۔ غرض چھوٹے بڑے سارے معاملات سے متعلق جو قاعدے، ضابطے بنائے گئے انھیں بیان کرنے کے لیے بھی ایک عمر اور ایک دفتر چاہیے۔ یہ تفصیلات اکبر نامہ کے دوسرے دفتر (آئین اکبری) میں جسے علامی شیخ ابوالفضل نے ایک ضخیم جلد میں تصنیف کیا ہے دیکھی جا سکتی ہیں۔

تاریخ الفی کی تصحیح و ترتیب

تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو دفتر تو ملا احمد ٹھٹھہ رافضی نے اور تیسرا دفتر آصف خاں نے لکھا تھا۔ ان تینوں دفتروں کی تصحیح اور مقابلہ کا کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ میں نے یہ کام ملا مصطفیٰ کاتب لاہوری کی مدد سے جو بڑا اچھا مددگار تھا اور احدیوں میں ملازم ہے انجام دیا اور اس کے پہلے دفتر کو مکمل کر کے اس جشن نوروز میں شرف آفتاب کے دن ملاحظہ شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ اس نے (ملا احمد) انتہائی تعصب کے ساتھ لکھا ہے اس لیے اس کے دوسرے دفتر کی بھی تصحیح کر دو۔ میں نے ایک سال میں اس کا مقابلہ اور تصحیح بھی کر دی لیکن اس خوف سے کہ مبادا مجھ پر بھی تعصب کا الزام آجائے میں نے اس کے اصل مضمون میں زیادہ تبدیلی نہیں کی، بس سنوں وغیرہ کی ترتیب درست کر دی اور اس کو اسی حال میں رہنے دیا تاکہ میرے ساتھ کوئی نئی پرخاش پیدا نہ ہو جائے۔

فیضی کی غیر منقوط تفسیر

انہی دنوں ملک الشعراء شیخ فیضی نے قرآن کی ایک تفسیر "سواطع الالہام" کے نام سے لکھی جس کی ضخامت ۷۵ جز کی تھی اور اول سے آخر تک غیر منقوط تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے ۹۹ غیر منقوط فقروں سے اس کی تاریخ بھی نکالی اور اس کے چند جز اشاعت کے لیے عراق بھجوائے۔ اس سال فیضی اس کے تصحیح و مقابلہ میں مصروف ہے۔ اس نظر ثانی کی تاریخ "اسرار ثانی" سے نکلتی ہے۔ اکثر عالموں نے اس تفسیر پر تقریظیں لکھی ہیں۔ شیخ یعقوب کشمیری نے عربی میں تقریظ لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے اس کی تاریخ نکالی ـــــــــ "وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِين" میر محمد حیدر معمائی نے تسمیہ کو چھوڑ کر پورے سورۂ اخلاص سے اس کی تاریخ نکالی۔ میں نے ـــــــــ "من احسن التفاسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم علم القرآن" سے تاریخ نکالی۔ ایک تقریظ بھی میں نے اس پر لکھی جس کا ذکر مناسب مقام

پر آئے گا۔ میں نے لاہور کی شکار گاہ میں جو تیس تاریخی فقرے نکالے تھے ان میں سے چند یہ ہیں "الحمد للہ لحصل المرام اکرم سواطع الالہام" "اللہم المحرر وحدہ لاطراس الکلام" "حدود واسرار کلام اللہ المرسل درر المسرۃ" "سمو المسر الدرر علو" وغیرہ۔

ماہ صفر ۱۰۰۲ھ میں خواجہ ابراہیم حسین احدی جو میرے خاص آدمیوں میں سے تھا فوت ہوگیا۔ اس نے "خواجہ ابراہیم حسین" تاریخ پائی۔

اس سال میں نے توفیق خداوندی سے کلام پاک کی خط نسخ میں نہایت روشن اور صاف کتابت کی اور اسے پورا کر کے یہاں شیخ داؤد حسین والی کے روضہ کے لیے وقف کرا دیا۔

محمد قاسم خاں میر بحر کا قتل

اسی سال ۱۷ ذی قعدہ کو محمد قاسم خاں میر بحر اور میرزا محمد زماں جو شاہ رخ میرزا کا لڑکا تھا کابل میں مارے گئے۔ محمد زماں میرزا حج سے واپسی کے بعد بدخشاں میں آیا۔ بدخشاں والے اوزبکوں کے ظلم وستم سے تنگ آ چکے تھے، انھوں نے اسی کو اپنا سردار بنا لیا اور ہندوستان کی مدد کے بل پر بڑی بہادری سے اوزبکوں پر حملہ کر دیا۔ بعد میں اوزبک ایک کثیر فوج لے کر محمد زماں میرزا کے مقابلہ پر آئے۔ وہ اپنی قوت بھر چند سال تک برابر اوزبکوں سے لڑتا رہا۔ آخر کار شکست کھا کر بھاگا اور چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ ہندوستان کے ارادہ سے کابل کے نواح میں پہنچا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اسے لوگوں نے بہکایا تو کابل کے لیے اس کی نیت ڈانوا ڈول ہوگئی۔ اس کے ارادوں کو بھانپ کر حاکم کابل محمد قاسم خاں نے اسے گرفتار کر لیا، لیکن اس کے ساتھ نہایت تعظیم وتکریم سے پیش آیا اور اسے گھوڑا، خرچ اور خلعت دے کر ڈیڑھ سو سواروں کو اس کی ہمراہی کے لیے متعین کر دیا، اس کا ارادہ تھا کہ میرزا کو لاہور بھجوا دے۔ اسی اثنا میں محمد قاسم خاں کے بعض بدخشی اور کابلی ملازموں نے میرزا سے ساز باز کی اور دوپہر کو سرکاری حویلی کا دروازہ توڑ کر زبردستی اندر داخل ہو گئے اور خواب گاہ میں جا کر محمد قاسم خاں کو تہ تیغ کر دیا۔

محمد ہاشم ولد محمد قاسم خاں اس وقت قلعہ سے باہر تھا، اس نے توپچیوں اور محافظ دستے کی ایک جمعیت لے کر میرزا محمد زماں کا محاصرہ کر لیا اور ایک دن ایک رات مسلسل جنگ کر کے میرزا کو قتل کر دیا اور اس کا سر دربار میں بھجوا دیا۔

اس واقعہ کے بعد بادشاہ نے محمد قلیج خاں کو جو کچھ عرصہ تک جملۃ الملک (مختار کل) رہ چکا تھا، کابل کی حکومت پر مقرر کر کے روانہ کر دیا۔ دیوان مطلق کے عہدہ پر تمام ملکی اور مالی معاملات سرانجام دینے کے لیے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کا تقرر عمل میں آیا۔

انھی دنوں آصف خاں بخشی کو کشمیر کے انتظامی معاملات اور فوجی مہمات کی تحقیق وانتظام کے لیے روانہ کیا گیا۔

میں بعض ناشائستہ عادتوں میں مبتلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سال مجھے توبہ کی توفیق عطا کی اور میں نے اپنی بداعمالیوں سے سچے دل کے ساتھ توبہ واستغفار کی۔ اس توبہ کی تاریخ لفظ "استقامت" سے حاصل ہوئی۔ میری توبہ پر ملک الشعراء فیضی نے یہ شعر کہا ؎

لَقَدْ تَابَ شَیْخِیْ عَنِ الْحُوْبَۃ
تَارِیْخُہٗ سَابِقُ التَّوْبَۃ

غرض یہ کہ ؎

رفت از سرم اندیشۂ مے و معشوق
بشد ز خاطرم آواز بربط و طنبور

آغاز محرم ۱۰۰۲ھ میں شیخ فرید بخاری کو جو ان دنوں آصف خاں کے ساتھ مددگار بخشی کے عہدہ پر مامور تھا حکم دیا گیا کہ وہ شمالی کوہستان پر فوج کشی کر کے وہاں کے سرکش راجاؤں کو اطاعت پر مجبور کرے اور وہاں کی اراضیات کی جمعبندی کر کے عمدہ پیش کش لے کر آئے۔

آغاز سفر میں بادشاہ نے دریائے راوی کو عبور کیا اور اس علاقہ میں ۲۵ دن تک سیر و شکار میں مصروف رہا۔

داستان نل و دمن کی تصنیف

انہی دنوں بادشاہ نے ملک الشعراء فیضی کو "پنج گنج" تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ اس نے تقریباً پانچ ماہ کی مدت میں ہندوستان کی مشہور عشقیہ داستان "نل و دمن" کو چار ہزار کچھ کم دو سو اشعار میں مرتب کر کے خدمت شاہی میں چند اشرفیوں کے نذرانے کے ساتھ پیش کیا۔ یہ کتاب بادشاہ کو نہایت پسند آئی۔ اس کی کتابت اور تصویریں بنوانے کا حکم دیا گیا اور نقیب خاں کو پڑھ کر سنانے پر مقرر کیا گیا۔ اس کتاب کا مطلع ہے ؎

اے در رگ و پئے تو آغاز
عنقائے نظر بلند پرواز

واقعتاً یہ ایک ایسی مثنوی ہے کہ ان تین سو سال میں امیر خسرو کے بعد شاید ہی کسی نے ہندوستان میں ایسی عمدہ مثنوی لکھی ہو۔

مرزا نظام الدین احمد کا انتقال

میرزا نظام الدین کی قلیج خاں کے ساتھ ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ میرزا کا بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل ہو گیا۔ اس نے مفوضہ فرائض بھی نہایت دیانت داری محنت اور خلوص سے سرانجام دیے۔ اس کی حسن کارگزاری کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ نے قلیج خاں اور دوسرے مقربین کو تو مختلف مقامات پر تقرر کر کے دربار سے علیحدہ کر دیا، لیکن نظام الدین احمد پر بادشاہ کی عنایات پہلے سے کہیں زیادہ مبذول رہیں۔ بادشاہ نے اس گوہر قابل کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن تقدیر کے فیصلے انسانی ارادوں کے پابند نہیں ہوتے۔ نظام الدین احمد اپنی ترقی اور اقتدار کے اس دور عروج میں تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۵ سال تھی۔ اس مرض میں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم تمام دوستوں کو آبدیدہ چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے حسن اخلاق نے سب کو ہی گرویدہ بنا رکھا تھا، لیکن خاص طور سے میرا ان کا تعلق نہایت بے غرضانہ اور مخلصانہ تھا۔ ان کی موت کا مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ بجز اشک حسرت بہلنے اور صبر کرنے کے اور کیا چارہ تھا۔ میں نے اس صدمہ کے بعد فیصلہ کر لیا کہ کسی کی محبت کا دم بھرنا اس دنیا میں بے فائدہ ہے۔ ان دوستیوں سے تو گوشۂ عزلت ہی زیادہ بہتر۔

نظام الدین احمد کی وفات ۲۳ صفر ۱۰۰۳ھ میں ہوئی۔ ان کی میت لشکر سے لاہور میں لائی گئی اور ان کے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے جنازہ پر خاص کیا عام کیا سبھی زار زار رو رہے تھے۔ لوگ ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک کے قصے یاد کر کے بڑی حسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی تاریخ وفات کے لیے یہ قطعہ موزوں ہو گیا :

رفت میرزا نظام الدین احمد — سوئے عقبیٰ وجہت زیبا رفت
جوہر او کہ زبس کہ عالی بود — در جوار ملک تعالیٰ رفت
قادری یافت سال تاریخش
گوہر بے بہا ز دنیا رفت

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ فرید کو جس کو بخشی گری کی تقریباً تمام ذمہ داریاں سپرد ہو چکی تھیں اور وہ کوہستان سوالکسنہ پر فوج کشی کے لیے گیا ہوا تھا، واپس بلا لیا اور اس کی جگہ قاضی حسین قزوینی کا تقرر کر دیا گیا۔

اعظم خاں کی واپسی اور بے راہ روی

انہی دنوں اعظم خاں جو مکہ کو گیا ہوا تھا وہاں کے امراء کے ہاتھوں تنگ آکر حج سے ہندوستان واپس آ گیا۔ اب جو وہ لوٹ کر آیا تو اس کی شان بے نیازی جاتی رہی تھی، چنانچہ اس نے اپنی ساری پسندیدہ خصوصیات کو خیرباد کہہ دیا اور بادشاہی مریدوں میں داخل ہو کر تعظیم و تسلیم کے تمام مقررہ لوازمات کی پابجائی کی۔ بادشاہی سجدہ بھی کر گزارا۔ اس تبدیلی کے بعد دربار سرکار میں اس کا چراغ جلنے لگا اور محفلوں، گفتگوؤں ہر جگہ اور ہر موقع پر وہ پیش پیش نظر آنے لگا۔ بادشاہ نے اسے غازی پور اور حاجی پور کا صوبہ جاگیر میں مرحمت فرمایا اور وہ ابوالفضل کے پاس بیٹھ کر نئے مذہب کے احکام سیکھنے لگا۔

جلوس سلطانی کا چالیسواں سال

اس سال (۱۰۰۳ھ) کو ماہ رجب کو نوروز واقع ہوا اور جلوس سلطانی کے چالیسویں سال کا آغاز ہو گیا۔ جشن نوروز کی ساری تیاریاں حسب سابق سر انجام پائیں۔

مہابھارت کی ایک حکایت کا قضیہ

نوروز سے دو دن پہلے بادشاہ نے مجھے دیوان خانہ خاص و عام کے جھروکہ میں بلایا اور براہ راست مجھے کچھ کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا ـــــ "ہم فلاں کو (اشارہ میری طرف تھا) صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہ ظاہر کیا ہے کہ کوئی تلوار اس کے تعصب کی رگ کو کاٹ نہیں سکتی۔" شیخ ابوالفضل نے پوچھا ـــــ "صاحب اس نے کس کتاب میں ایسا کچھ لکھ دیا کہ آپ اس کے متعلق یہ ارشاد فرماتے ہیں۔" اکبر نے فرمایا "اسی رزم نامہ یعنی مہابھارت میں کل رات ہم نے اس کی تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا ہے۔" شیخ نے کہا "اس سے غلطی ہو گئی۔" اس وقت مجبوراً آگے بڑھ کر کہنا پڑا "کمترین تو بس ایک مترجم ہے اس سے زیادہ نہیں، جو کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے میں نے کچھ بڑھایا ہو تو یقیناً میں قصوروار ہوں۔" شیخ نے بھی اس بات کی تائید کی اور بادشاہ سلامت خاموش رہ گئے۔

اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ رزم نامہ میں میں نے ایک حکایت نقل کی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ "ایک پنڈت نے عالم نزع میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ غفلت و جہالت ترک کر کے سب سے پہلے اس صانع حقیقی کو پہچانے اور علم و حکمت کا راستہ اختیار کرے اور علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا بھروسا نہ رکھے۔ حسن عمل کو اختیار کر کے تا حد امکان جھگڑوں سے بچتا رہے اور اس کا یقین کامل رکھے کہ ہر فعل کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ اس موقع پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا ع

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

ہندو مت میں جزائے اعمال کا تصور

بس یہ عبارت اور یہ مصرع تھا جو کھٹک گیا اور اکبر نے اس کو منکر نکیر کے سوال جواب، حشر و نشر، آخرت کے حساب و میزان پر محمول کیا یہ بات چونکہ اس کے عقیدہ تناسخ کے خلاف تھی جس کے سوا وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اس نے مجھ پر ملاپن اور تعصب پرستی کا الزام لگا دیا۔ یہ بات خوب چھڑی اور اچھا موقع نکل آیا۔ چنانچہ میں نے مقربان شاہی کو بخوبی سمجھایا کہ ہندوستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی کے اچھے اور برے انجام کے قائل ہیں اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو ایک محرر جو بندوں کے نامۂ اعمال کو زندگی بھر لکھتا رہتا ہے روحوں کو قبض کرنے والے فرشتے کے سامنے جس کا نام بادشاہ عدل ہے لے جاتا ہے اور وہ نیکی اور بدی کے اندراجات دیکھ کر اور ان کی کمی زیادتی کا مقابلہ کر کے حکم لگاتا ہے کہ یہ شخص مخیر (نیک) ہے پھر اس نیک روح سے کہا جاتا ہے کہ ہم پہلے تو تجھے جنت میں لے جائیں گے تاکہ تو وہاں اپنی نیکیوں کے برابر لذتوں سے لطف اندوز ہو جائے بعد میں تجھے دوزخ میں ڈالا جائے گا تاکہ تیرے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ اگر تو چاہے تو پہلے تجھے دوزخ میں پھر بعد میں جنت میں لے جایا جائے۔ جب وہ دوزخ و جنت کی اس مدت کو پورا کر لیتا ہے تو پھر اسے دنیا میں جانے کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے مطابق کسی جسم میں حلول کر کے زندگی کی چند گردشوں میں گھومتا رہے، یہاں تک کہ اسے نجات مطلق مل جائے اور وہ دنیا میں آنے اور جانے کی اس زحمت سے چھٹکارا پالے۔ میری اس توضیح و تقریر پر وہ معاملہ رفت گزشت ہو گیا۔

اجمیر کی تولیت کی تجویز

شرف آفتاب کے دن اکبر نے کسی کے کہے بغیر اپنے آپ صدر جہاں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر فلاں (عبدالقادر مصنف کتاب) کو ہم حضرت خواجہ اجمیری کے روضہ کی تولیت دے دیں تو کیسا رہے گا، کیوں کہ اس روضۂ منورہ کا کوئی متولی نہیں ہے۔ صدر جہاں نے کہا یہ بہت اچھی تجویز ہے۔ میں بھی دل سے چاہتا تھا کہ درباری الجھنوں سے کسی طرح نجات مل جائے، اس غرض کے لیے میں نے دو تین مہینے تک دربار میں بڑی کوششیں بھی کیں اور دو تین عرضیاں بھی لکھ کر پیش کیں، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

اس سال آخر ماہ رمضان کو صدر جہاں نے بارگاہ شاہی میں عرض کیا کہ "فلاں (عبدالقادر) کی رخصت کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔" بادشاہ نے فرمایا "یہاں بہت سے کام نکلتے رہتے ہیں اور ہم اسے کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کرتے رہتے ہیں۔ اس کی جگہ کسی اور کام کے آدمی کو مہیا کر لو تو دیکھا جائے گا۔" بہرحال خدا کی مصلحت نہیں تھی رخصت نہ ملی اور میں صبر کر کے بیٹھ رہا۔

انہی دنوں ایک دن میرے سامنے اکبر نے شیخ ابوالفضل سے فرمایا "فلاں (عبدالقادر) اجمیر کی خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے گا، لیکن ہم اس سے جب کسی کتاب کا ترجمہ کراتے ہیں تو وہ نہایت اچھی طرح ہماری خاطر خواہ ترجمہ کر دیتا ہے، اس لیے ہم اسے جدا نہیں کرنا چاہتے۔" شیخ ابوالفضل اور دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

بحر الاسمار کی تصنیف

اسی دن بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر نے جس ہندی افسانہ کا بحر الاسمار کے نام سے ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا ہے اس کا ترجمہ کر کے تکمیل کر دو۔

میں نے اس کام کو شروع کر دیا اور اس کتاب کی آخری جلد کو جس کی ضخامت ساٹھ جزو کی ہے پانچ مہینے میں پورا کر دیا۔ اسی اثنا میں بادشاہ سلامت نے خوابگاہ خاص میں مجھے اپنے تخت کے قریب بلوایا اور صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتے رہے۔ پھر حکم دیا کہ

بحرالاسمار کی پہلی جلد جسے سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرایا تھا پرانی اور غیر معروف فارسی میں ہے اس کو بھی تم مروجہ زبان میں تحریر کر دو اور اس اپنے ترجمہ کیے ہوئے مسودہ کو حفاظت سے رکھے رہو" میں نے زمین بوس ہو کر بسر و چشم اس خدمت کو قبول کر لیا اور اس کام کو شروع کر دیا۔ بادشاہ نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ دس ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا میں نے کہا انشاء اللہ یہ کتاب انہی دو تین ماہ کے اندر بہ حسن و خوبی مرتب ہو جائے گی تب کہیں جا کر مجھے وطن جانے کی رخصت مل سکے گی۔

دکن کی مہم پر شاہزادہ مراد اور خان خاناں کا تقرر

اسی سال ہندیہ سے حکیم عین الملک اور شہباز خان کے عریضے پہنچے کہ برہان الملک کو اس کی بدسلوکی سے ناراض ہو کر امراء نے قتل کرا دیا اور ایک بارہ سالہ لڑکے کو اس کا ولی عہد بنا کر تخت نشین کر دیا ہے۔ بادشاہ نے ایک فرمان شہزادہ مراد کے اور دوسرا خان خاناں کے نام لکھ کر بھیجا کہ دونوں جلد از جلد کوچ کر کے تسخیر دکن کے لیے سرحدوں پر پہنچ جائیں۔

شاہ بیگ خاں کی فوج کشی اور فتح

اس سال اوائل ماہ ذی الحج میں شاہ بیگ خاں کابلی قندھار کو چلا گیا اور میرزا مظفر حسین حاکم قندھار قرابیگ میر شکار کے ہمراہ دربار میں حاضر ہوا بھاری نذرانوں کے ساتھ ایک قیمتی جواہر بھی پیش کیا۔ بادشاہ نے اس پر عنایت فرمائی۔ شاہ بیگ خاں نے وادریں جا کر اوزبکوں کی ایک بڑی فوج کو شکست دی ان کے اکثر سرداروں کو قتل کر دیا اور بقیہ اسیروں کو خلعتیں دے کر رہا کر دیا۔ اوزبکوں کی ایک جمعیت بھاگ کر قلعہ بند ہو گئی تھی۔ شاہ بیگ خاں نے توپ خانہ کے ساتھ قلعہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر کے آگے کوچ کر دیا۔ گرم سیر کے سارے علاقہ پر اس نے بخوبی قابو پا لیا۔

بادشاہ نے میرزا رستم کو صوبہ چیتوڑ عطا کیا اور سنبل کا علاقہ ابو الفضل سے لے کر میرزا قندھاری کو جاگیر میں دے دیا۔ ملتان کو جو میرزا رستم کے مظالم سے تباہ ہو گیا تھا خالصہ میں شامل کر لیا۔

انہی دنوں سعید خاں مغل بنگالہ سے حاضر ہوا اور اپنے ساتھ عیسیٰ خاں زمیندار کے دبے ہوئے نفیس تحفے روپیہ اور ہاتھی بہ طور پیش کش لے کر آیا۔

شیخ یعقوب کشمیری کی وفات

اسی سال شیخ یعقوب کشمیری صوفی جو دربار سے رخصت لے کر اپنے وطن گیا ہوا تھا، فوت ہو گیا۔

یاراں ہمہ رفتند و رہ کعبہ گرفتند — ما مست قدم بر در خمار بماندیم
از نکتۂ مقصود نہ شد فہم حدیثے — لا دین دلا دنیا بے کار بماندیم

حکیم عین الملک کا انتقال

حکیم عین الملک راجہ علی خاں کے پاس سفیر بن کر گیا تھا وہاں سے اپنی جاگیر ہندیہ میں لوٹ کر آیا اور پانچ مہینے کی بیماری کے بعد، ۲۷ ذی الحج ۱۰۰۳ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

اللہ کی شان ہے کہ تمام دوست اور رفیق ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں اور ہم اسی سیاہ دلی اور پریشان حالی کے ساتھ آخرت سے غافل بیہودہ مشاغل میں عمر عزیز گنوانے میں لگے ہوئے ہیں۔

حکیم حسن گیلانی کا انتقال

۳ ماہ محرم ۱۰۰۴ھ کو حکیم حسن گیلانی کا بھی انتقال ہوگیا۔ حکیم حسن نہایت درویش مزاج مہربان اور صاحب اخلاق تھا۔

انہی دنوں مخدوم شیخ حامد کا لڑکا شیخ موسیٰ گیلانی جو اچھ کے سجادہ نشین شیخ عبدالقادر کا چھوٹا بھائی ہے ملازمت شاہی میں داخل ہوا، بادشاہ نے اسے پانصدی کا منصب عطا کیا۔

مفتی صدر جہاں دین الٰہی کا پیرو

اسی مہینے مفتیِ ممالک محروسہ صدر جہاں کو ہزاری منصب مرحمت ہوا اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مریدانِ خاص میں شامل ہوگیا۔ ہزاری کا منصب اسی مریدی کا معاوضہ تھا۔ مرید ہونے کے بعد اس نے پوچھا "میری داڑھی کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے"۔ بادشاہ نے کہا "رہنے دو"۔

اس عرصہ میں اور جو لوگ بادشاہی مرید بنے ان میں سے ایک تو ملا تقی شستری ہے جو اپنے آپ کو اعلم العلما سمجھے ہوئے ہے آج کل وہ حسب الحکم شاہنامہ کو نثر میں لکھ رہا ہے۔ اپنی تحریر میں جہاں بھی آفتاب کا نام آتا ہے وہ اس کے ساتھ جلت عظمتہ، و عز شانہ "(بڑی عظمت اور بڑی شان والا) یا اس جیسا کوئی اور کلمہ ضرور لکھ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ زادہ گوسالہ خام نامی بنارسی، ملا شاہ محمد شاہ آبادی اور صوفی احمد مطرب مسند صادہ دہلوی جو خود کو حضرت غوث الثقلین کی اولاد میں سے بتاتا ہے مرید بنائے گئے۔ ان سب لوگوں نے "مراتب اخلاص چہارگانہ" کو قبول کر لیا اور ایک صدی سے پانصدی تک کا منصب حاصل کر لیا۔ بڑی عقیدت سے داڑھی منڈوا ڈالی ان کی تاریخ "موتراش چند" سے نکلتی ہے۔

ان نو مریدوں کا حال بس ایسا ہی تھا کہ "ایک ہندو مسلمان ہوگیا اس خوشی میں لوگوں نے اسے ایک سرخ شال اوڑھادی۔ سرخ دوشالہ اوڑھ کر اس نے اپنے لوگوں کی طرف بڑے فخر و شان سے دیکھا۔ ان لوگوں نے کہا، احمق یہ کپڑا تو کل پرانا ہو کر پھٹ جائے گا اور یہ مسلمانی ہمیشہ کے لیے تیری گردن کا ہار بن جائے گی"۔

صوفی احمد مطرب

یہ صوفی احمد وہی شخص ہے جو اپنے آپ کو شیخ احمد بکری مصری کا مرید بلکہ خلیفہ کامل بتا کر کہا کرتا تھا کہ میں اس مرشد زماں کے اشارہ سے دیار ہند میں آیا ہوں میرے مرشد نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندوستان کے بادشاہ سے لغزش ہوگئی ہے تو وہاں جا کر اس کی مدد کرے گا اور اسے ہلاکت سے بچائے گا"۔ اور اب یہ معاملہ ہی برعکس ہو گیا۔ کہ شکاری خود شکار کے پھندے میں پھنس گیا۔

لاف زن جولاہہ می گفت من بس ماہرم — شاید ار سازند فرد اہر حورم حلہ باف
آں شنید مستی کہ بادے جولہ دیگر چہ گفت — کاے برادر چند لاف اول بیا انگہ بلاف

گوسالہ بنارسی کا معاشقہ

گوسالہ بنارسی نے شیخ ابوالفضل[1] کے پاس بڑی رسائی پیدا کر لی اور مکاری و چاپلوسی سے کام لے کر بنارس کا کروڑی بن گیا۔ وہاں اس نے خوب گلچھرے اڑائے اور بنارس کی ایک طوائف سے عشق بازی

---

[1] ابوالفضل فیضی کا چھوٹا بھائی شیخ مبارک کا لڑکا تھا جس وقت دربار اکبری میں حاضر ہوا اس کی عمر صرف ۲۰ سال تھی یہ بادشاہ کے جلوس کا ۱۹واں سال تھا بہت جلد اسے چار ہزاری منصب ملا آخر کار وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر پہنچا وہ ایک کامیاب سیاست داں مدبر ہوشیار سپہ سالار بے مثل ادیب مؤرخ اور شاعر تھا۔ علامی کے لقب سے مشہور ہے۔ عبداللہ شاہ بخاری کا کہنا تھا کہ "وہ اکبر کے تیر دل سے آتنا نہیں ڈرتا جتنا ابوالفضل کے قلم سے"۔ اکبرنامہ اس کی مشہور تاریخ ہے جو تین دفتروں پر مشتمل ہے دفتر سوم آئین اکبری کے نام سے مشہور ہے ابوالفضل کی انشا کا کمال مکاتبات علامی میں دکھائی دیتا ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

شروع کر دی۔ ملا احمد صوفی مذکور بھی اسی طوائف پر عاشق تھا، بنارسی نے احمد کو کافی روپیہ دے کر درمیان سے ہٹا دیا اور اپنا ایک نگران اس طوائف کے دروازہ پر مقرر کر دیا۔ طوائفوں کے داروغہ نے یہ سارا حال بادشاہ کے پاس لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے ایک محفل نوروزی میں احمد سفلی اور ملا شاہ محمد کی دو صدی جاگیر جو دامن کوہ میں تھی اور اس پر دونوں کا مشترکہ قبضہ تھا چھین لی اور بنارسی کو بنارس سے بلا لیا۔

ملک الشعراء فیضی کا انتقال ملک الشعراء شیخ فیضی کئی ایک بیماریوں جیسے ضیق النفس، استسقا، ورم، خونی قے وغیرہ میں مبتلا ہو گیا تھا، چھ مہینے تک وہ مرض کی سختیاں برداشت کرتا رہا، آخر دس ماہ صفر ۱۰۰۴ھ کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑی انسیت تھی اور وہ رات دن ان کتوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکرات کے وقت اس کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منکر اور بے دینی کا متعصب حامی تھا، چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بیہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس کی تاریخ وفات ہے۔

”وے فلسفی و شیعی و طبیعی و دہری“

ایک دوسری تاریخ ہے ”قاعدۂ الحاد شکست“۔ ایک نکتہ شناس نے یہ تاریخ کہی:

دیدی کہ فلک چہ مایۂ نیرنگی کرد
مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درو مے گنجید
تا نیم دمے برآورد تنگی کرد

اس کی نزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں سے تھام کر آوازیں دیں کہ ”شیخ جیو ہم حکیم علی کو ساتھ لے کر آئے ہیں، تم آخر بات کیوں نہیں کرتے ہو۔“ وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا، کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرا دی۔ آخر بادشاہ شیخ ابو الفضل کو تسلی دلاسا دے کر لوٹ گئے۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جان نثار رخصت ہو گیا۔

حکیم ہمام کی وفات فیضی کے انتقال سے چند دن بعد ہی چھ ربیع الاول ۱۰۰۴ھ کو حکیم ہمام بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) جس میں اس کے لکھے خطوط اور مراسلات ہیں یہ بھی تین دفتروں پر مشتمل ہے ”عیار دانش“ یہ سنسکرت کی ”کلیلہ و دمنہ“ کا قصہ ہے جو نوشیرواں کے عہد میں پہلوی میں ترجمہ ہوئی۔ عباسی دور میں عربی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ عربی سے ملا حسین واعظ کاشفی نے انوار سہیلی کے نام سے ترجمہ کیا۔ اکبر کے حکم سے ابو الفضل نے ۹۹۶ھ میں سادہ فارسی میں مرتب کیا۔ اکبر نامہ کا دفتر سوم آئین اکبری ۱۰۰۶ھ میں مکمل ہوئی۔ ان کے علاوہ ”رقعات ابو الفضل“ ”کشکول ابو الفضل“ ”جامع اللغات“ مہابھارت کا ترجمہ ”رزم نامہ“ نظم میں کوئی کتاب نہیں۔ ابو الفضل شہزادہ سلیم کے اشارہ سے بندھیل کھنڈ کے ایک زمیندار بیر سنگھ کے ہاتھوں ۱۰۱۰ھ میں قتل ہوا۔ اس کے قتل کی اطلاع پر اکبر نے یہ پڑھا تھا ؎

شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ ز اشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ

اس کے لڑکے کا نام عبد الرحمٰن تھا۔ اکبر کے دینی اعتقادات کی تبدیلی میں ابو الفضل کا بڑا حصہ ہے اسی نے علما کی مخالفت میں ”دین الٰہی“ کا یہ ڈھونگ رچایا اور بادشاہ کو خدا کے درجہ تک پہنچا دیا۔

ساتویں ربیع الاول کو کمالائی صدر کا انتقال ہوا۔ ان دونوں کا مال و اسباب اسی وقت ضبط کر لیا گیا اور وہ دونوں کفن کے کپڑے تک کو محتاج ہو گئے۔

خاتمہ یہ دورِ اکبر شاہی کے وہ واقعات ہیں جن کا ذکر میں نے ماہ صفر سنہ ۱۰۰۱ھ موافق سنہ ۳۷ جلوس شاہی تک اجمالاً کیا ہے۔ میں نے اپنی دانست میں تو یہ سارے حالات ٹھیک ٹھیک طور پر ادا کر دیے ہیں۔ بعض سنوں کے اندراج میں جو تقدیم و تاخیر، تحریف، اور تغیر ہو گیا ہے، اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں بلکہ اس کی ساری ذمہ داری اس ماخذ (تاریخ نظامی) پر ہے جس سے میں نے یہ منتخب مرتب کی ہے۔ اگر حیات رہا اور توفیق و اطمینان حاصل ہوا تو انشاءاللہ آنے والے حالات کا بھی میں انتخاب کر جاؤں گا ورنہ جس شخص کو بھی میسر ہو وہ ان حالات کی ترتیب و تسوید کا فرض انجام دے کہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری رہی ہے۔ ؎

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

حصّہ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

جلد سوم

نظام الدین احمد مصنف تاریخ نظامی نے اپنی تاریخ کے آخر میں امرائے بادشاہی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ میری نگاہ میں ان امیروں میں سے اکثر متوفی غیر مرحوم (گمراہ اور بدعمل) ہیں کیونکہ ؎

من وفائی ندیدم ز کساں
گر تو دیدی دعائی من برساں

ان امراء کی گمراہیوں کی وجہ سے میں نے اپنے قلم کو ان کے فضول تذکروں میں اُلجھنے نہیں دیا بلکہ یہ صفحات اس عہد کے بعض مشائخین کرام کے تذکرے سے شروع ہوتے ہیں۔ دورِ اکبری کے بزرگوں میں سے اکثر رحلت فرما چکے ہیں۔ ان میں سے جو مشہور شخصیتیں ہیں اُن کے حالات تحریر کیے جاتے ہیں ٥

(مُلا عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ)

میاں حاتم سنبلیؒ

میاں حاتم سنبھلی بہت بڑے عالم تھے۔ مدتوں علوم کا فیض ان کی ذات سے جاری رہا۔ صوری اور معنوی کمالات ان کی شخصیت میں جمع تھے۔ ابھی وہ تحصیل علم میں معروف تھے کہ ان پر "حال" غالب آگیا اور قیل وقال کو ترک کر کے اپنے اُستاد شیخ عزیز اللہ دانشمند طلبنیؒ کے جو اپنے عہد کے عالم ربانی اور ولی کامل تھے مرید ہو گئے۔ شیخ علاؤالدین چشتیؒ دہلوی کی خدمت میں بھی سلوک کے طریقے سیکھے۔ ان دونوں بزرگوں سے تربیت وتعلیم اور مرید کرنے کی اجازت حاصل کی۔ جذب کی ابتدائی کیفیت میں میاں صاحب سنبھل اور امروہہ کے جنگلوں میں دس سال تک ننگے سر ننگے پیر گھومتے رہے۔ اس ساری مدت میں بستر سے پیٹھ لگی نہ سر کو تکیہ میسر ہوا۔ ذوقِ سماع ان کی طبیعت پر غالب تھا۔ جب بھی بات کرتے یا مسکراتے "اللہ" کا کلمہ برابر وردِ زبان رہتا۔ آخر جذب وکیفیت کا یہ عالم ہوا کہ راگ سُننے کی تاب نہ رہی، راگ چھڑتے ہی بے خودی کے عالم میں کہاں سے کہاں جا پہنچے۔

سنہ ۹۶۰ھ میں جب کہ میری عمر صرف بارہ سال کی تھی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل میں ان کی خدمت میں گیا۔ ان کی خانقاہ میں قصیدہ بردہ کا درس ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ اُنھوں نے تبرکاً حنفی فقہ کی کتاب "کنز" کے چند سبق پڑھائے اور مجھے اپنے خاص مریدوں میں داخل کر لیا۔ میرے والد سے فرمایا کہ ہم نے تمھارے لڑکے کو اپنے اُستاد شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ دیا ہے تاکہ اسے علوم ظاہری کا فائدہ بھی پہنچے۔

شیخ ممدوح نے ۹۶۹ھ میں رحلت فرمائی۔ ان کی تاریخ رحلت ——— "درویش دانش مند" سے نکلتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرے والد کا بھی اسی تاریخ کو انتقال ہوا۔ یہ ان کی حسن عقیدت کا ثمر تھا +

شیخ جلال الدین تھانیسری

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ علوم ظاہر و باطن دونوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ عرصہ تک دینی علوم کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔ آخر میں علوم رسمی کو ترک کر دیا۔ جلوت چھوڑ خلوت کو جا بسایا۔ ان کے اکثر اوقات قرآن پاک کے ختم، نوافل، دعا اور درود ہی میں صرف ہوتے تھے۔ ترانوے سال کی عمر کو پہنچے تو نہایت کمزور اور ضعیف ہو گئے، بس ہڈی چمڑا ہو کر رہ گئے تھے ؎

پیر را از نامرادی رگ چو پیدا شد ز پوست
بہر تعلیم مریداں راستی را مسطر است

اس عمر میں حال یہ ہو گیا تھا کہ بیٹھنے اور حرکت کرنے کی قوت نہیں رہی تھی۔ ہر وقت غذا کی کمی اور کمزوری کی وجہ سے ٹیک لگائے بس غنودگی میں پڑے رہتے تھے، لیکن دل کی قوت کا یہ حال تھا کہ جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑتی کسی کی مدد کے بغیر جھٹ سے اُٹھ کھڑے ہوتے، جوتیاں پہنتے، لاٹھی تھام کر اپنے آپ طہارت اور وضو کر کے نماز ادا کرتے، یہ قوت جیسے نماز ہی کے لیے پیدا ہو جاتی تھی۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہوتے ہی اُسی طرح پھر بستر پر لیٹ جاتے۔

مجھے دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا پہلی بار تو میں ۹۶۹ھ میں آگرہ میں ملا تھا جبکہ وہ تھانیسر کے ماموں کی سفارش اور کارداری کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ دوسری بار ۹۸۱ھ میں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حسین خاں الغ میرزا کا تعاقب کرتے ہوئے تھانیسر پہنچا تھا۔ یہ ملاقات میں نے حسین خاں کے ساتھ کی تھی۔ اس وقت مجھے ان کی شخصیت مجسّم نور دکھائی دی۔

شیخ جلالؒ نے ۹۸۹ھ میں رحلت فرمائی +

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ

شیخ محمد غوث، شیخ ظہور اور حاجی حضور عرف حاجی حمید کے مرید ہیں شطاری سلسلہ میں ان کا نسب سلطان العارفین شیخ بایزید بسطامیؒ سے ملتا ہے۔

ابتدائی حال میں وہ بارہ سال تک کوہستان چنار کے دامن میں مقیم رہے۔ غار ان کا ٹھکانہ تھے اور غذا درختوں کے پتے۔ اس عرصہ میں اُنھوں نے بڑی سخت ریاضتیں کیں۔ علم "اسماء الٰہی" میں مقتدا اور صاحب تصوّف تھے اس علم کی اجازت ان کو اپنے بڑے بھائی شیخ بہلولؒ سے جو بڑے صاحب کرامت بزرگ گزرے ہیں حاصل تھی۔ ان دونوں بزرگوں سے ہمایوں بادشاہ مغفرت پناہ کو بڑی مخلصانہ عقیدت تھی۔ ہمایوں کو شاید ہی کسی اور سے ایسی عقیدت رہی ہو۔ انہی سے ہمایوں نے بھی "دعوت اسماء" کا طریقہ سیکھا تھا۔

جب شیر شاہ نے اقتدار سنبھالا تو ہمایوں کے تعلق کی وجہ سے وہ شیخ محمد غوثؒ کے خلاف ہو گیا، اس لیے شیخ گجرات چلے گئے۔ وہاں کے حکام و سلاطین نے سر آنکھوں پر لیا اور وہ سب شیخ کے عقیدت مند رہے۔

شیخ کی کرامتوں اور کمالات باطنی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ میاں شیخ وجیہہ الدین جیسا متبحر عالم ربانی بھی ان کی بارگاہِ تقدس کا حاشیہ نشین بن گیا تھا۔ ان کے دامن فیض سے وہ بلی گجرات اور بنگالہ میں کتنے ہی صاحب مرتبہ بزرگ پیدا ہوئے۔ ان کے کمالات روحانی کے آثار اب تک ہندوستان میں باقی ہیں۔

میں نے انھیں سب سے پہلے ۹۶۶ھ میں آگرہ کے بازار میں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سوار ہو کر جا رہے تھے اور ان کے آگے پیچھے دائیں بائیں لوگوں نے اتنا ہجوم کر رکھا تھا کہ اس بھیڑ میں کسی کا داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس قدر و منزلت پر ان کے انکسار و تواضع کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو دائیں بائیں گھوم کر اور اس قدر جھک کر سلام کا جواب دے رہے تھے کہ ان کے سر کو لحظہ بھر کے لیے قرار نہ تھا۔ ان کی پشت زین کے تکیہ سے ٹکرائی جاتی تھی۔

اس سال شیخ ممدوح گجرات سے آگرہ آئے تھے۔ اکبر کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ وہ ان کی تحریص و ترغیب پر ان کے مریدوں میں شامل ہوگیا لیکن کچھ ہی دن بعد ان کا منکر ہوگیا۔ خان خاناں بیرم خاں اور شیخ گدائی سے ان کی نبھ نہ سکی اس لیے وہ ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے۔ وہاں ایک خانقاہ قائم کر کے مریدوں کی تربیت و تکمیل میں مشغول رہے۔ سماع و سرود اور وجد کا بھی ذوق تھا بلکہ اُنھوں نے سماع کے متعلق رسالہ بھی تصنیف کیا ہے۔

لباسِ فقر میں یہ بڑے جاہ و جلال والے تھے۔ ان کی مدد معاش ایک ہزار تنکہ تھی۔ جو کوئی اُن سے ملنے آتا تھا وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کافروں سے بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ اسی سبب سے بعض اہل فقر ان کے مخالف بھی ہوگئے تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی نیت کیا تھی ؎

چوں رد و قبول ہمہ در پردۂ غیب است
زنہار کسے را مکنی عیب کہ عیب است

اسّی سال عمر پا کر ۹۷۰ھ میں آگرہ میں انتقال فرمایا اور گوالیار میں دفن کیے گئے

شیخ نہایت سخی اور دریا دل آدمی تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ چنانچہ کبھی اپنے آپ کو "میں" نہیں کہا ہمیشہ خود کو "فقیر" ہی کہا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کو اتنا کچھ غلو تھا کہ جب کسی کو غلہ دیتے تو اس کے وزن کو ظاہر کرنے کے لیے "من" کا لفظ ادا نہیں کرتے تھے بلکہ کہتے تھے اتنے میم اور نون (من) فلاں آدمی کو دے دو۔

شیخ برہان شیخ برہان بڑے زاہد متوکل گوشہ نشین اور مستغنی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں وہ میاں الہداد باری کی جن کا سلسلہ ایک واسطہ سے سید محمد جون پوری سے ملتا ہے صحبت میں صرف تین دن رہے اور فقر و غنا کا یہ فیض حاصل کیا۔ کہ درجۂ کمال تک جا پہنچے۔ نہایت عبادت گزار اور صاحب حضور تھے۔ تقریباً پچاس سال تک گوشت بلکہ بہت سی چیزوں کا کھانا پینا ترک کر دیا، صرف تھوڑے سے دودھ اور مٹھاس پر گزر کرتے رہے۔ آخری عمر میں تو پانی تک ترک کر دیا تھا۔ دیکھنے میں بس ایک روحانی اور نورانی مجسمہ دکھائی دیتے

تھے۔ کالپی میں ان کا حجرہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ اس حجرہ میں وہ ہمیشہ ذکر و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ مہدوی طریقہ پر "پاس انفاس" میں مصروف رہتے تھے۔ عربی علوم نہیں پڑھے تھے پھر بھی قرآن کی تفسیر اس بلاغت کے ساتھ فرماتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی صحبت میں دلوں کو کھول دینے والا اثر تھا۔

میں جب چنار کے سفر سے لوٹا، یہ ۹۶۰ھ کا کوئی مہینہ تھا اور عبداللہ خاں ازبک کا دور دورہ تھا۔ ایک رات شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی پہنچی ہوئی باتیں کیں اور اپنے ہندی کے شعر جن میں وعظ نصیحت تصوف توحید اور تجرید کے مضامین تھے سنائے۔

دوسرے دن مہر علی سلدوز جو درویش دوستی کی صفت کے باوجود پورا ترکی تھا اور مردم آزاری، ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا، میرے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے آیا۔ اتفاق یہ تھا کہ جب وہ چلنے لگا تھا تو اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی اور ان کو مغلظ گالیاں دی تھیں، جب ہم پہنچے تو شیخ نے سب سے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ حدیث تھی:

"قال النبی صلعم المسلم من سلم المسلمون من یدہ و لسانہ"

(فرمایا نبی صلعم نے مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

یہ حدیث پڑھ کر انھوں نے اس کے نکات کی بڑی عالمانہ و دلکش تشریح کی۔ مہر علی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کیے پر نادم و شرمندہ ہو کر توبہ کرنے لگا۔ شیخ سے دعا و فاتحہ کی درخواست کی، کچھ نذرانہ بھی پیش کیا جو شیخ نے قبول نہ کیا۔

شیخ ممدوح کی عمر سو سال ہوئی ہے۔ ۹۷۰ھ میں رحلت فرمائی۔ میں نے ان کی تاریخ اس مصرع سے نکالی ہے ؎

"ولی گفت کہ شیخ اولیاء بود"

ان کو وصیت کے مطابق اسی حجرہ میں دفن کیا گیا جس میں کہ وہ گوشہ نشین رہے تھے۔

شیخ محمد کنبو سنبھلی قادری سلسلہ کے بزرگ تھے۔ راہ سلوک میں انھوں نے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں۔ وجد و سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے، خود بھی نہایت خوش آواز تھے۔ جب ان پر حال و کیفیت طاری ہو جاتی تو بے اختیار خود بھی گانے لگ جاتے اور اس درد بھری لے میں کہ حاضرین پر رقت طاری ہو جاتی۔ ان کی محفلوں میں سماع کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اس کا خیال اب بھی مجھ کو سرشار کر دیتا ہے۔

ابتدا میں علوم ظاہری کی تحصیل کی تھی۔ عشق و تعشق کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ کسی نہ کسی دلربا صورت سے ان کے عشقیہ تعلقات ضرور قائم رہتے تھے۔ اس معاملہ میں ایسے آزاد مشرب تھے کہ لوگوں کی انگشت نمائی کی انھیں کوئی پروانہ ہوتی تھی۔ کھلے بندوں دل کے معاملات میں الجھے رہتے تھے۔ اسی

مناسبت سے وہ شیخ محمد عاشق مشہور ہو گئے۔

۹۸۵ھ میں وصال ہوا۔ ان کی تاریخ وفات "ششم از شوال" سے نکلتی ہے +

شیخ فخرالدین

ایک گوشہ نشین متوکل عبادت گزار بزرگ تھے۔ ہمیشہ لوگوں سے دُور خلوت میں رہا کرتے تھے۔

ہر جمعہ کو ان کی خانقاہ میں صوفیوں کی مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں سماع لازماً ہوا کرتا تھا۔ ان کی محفلِ سماع میں سماع کا کوئی کیسا ہی منکر اور مخالف آجاتا، وجد حال سے بچ نہیں سکتا تھا۔ شیخ کی مستانہ کیفیت دوسروں کو متاثر کر دیتی تھی۔

اس مجلس کے بعد دستر خوان بچھایا جاتا تھا۔ ان کی مجلس میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ اور فقیر برابر کے ہم نشین ہوتے تھے۔ خان خاناں بیرم خاں جمعہ کی نماز اکثر انہی کی مسجد میں ادا کرتا تھا۔ شیخ کی صحبت میں اس پر اکثر اوقات بڑی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ خانقاہ کے معمول کے مطابق خان خاناں وہاں نشست و برخاست تناول طعام وغیرہ میں دوسروں سے کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا۔

شیخ عزیز اللہ

معرفت الٰہی اور عشق خداوندی کے سراپا مظہر تھے۔ صفائی قلب اور سوز و گداز ان کے بشرہ سے عیاں تھا۔ صاحبِ ذوق ایسے کہ دن رات گریہ وزاری کرتے رہتے تھے۔ گانے کی بھنک بھی ان کے کان میں پڑ جاتی تو اس طرح بے قرار ہو جاتے، جیسے کسی نے ان کے باطن میں آگ لگا دی ہو۔ ان کے ہاں صبح و شام سماع کی محفل جمی رہتی تھی۔ اس وقت ان کا یہ عالم رہتا تھا کہ اگر پتھر پر بھی اس عالم میں نگاہ پڑ جائے تو پانی بن جائے۔

اپنے والد بزرگوار شیخ حسن سے بیعت تھے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد حسن سے جو شیخ امان پانی پتی کے پیر تھے اُنھوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ طبیعت میں عجز و انکسار بہت تھا۔ خدمت خلق کا بڑا خیال و اہتمام کرتے تھے۔ اگر وہ چلہ میں بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی محتاج شخص خواہ وہ کسی کافر کے پاس سفارش کے لیے لے جانا چاہتا تو حجرۂ اعتکاف سے نکل آتے اور اس کے گھر دور دراز کی مسافت طے کر کے پیدل ہی چلے جاتے۔ حاجت براری کے بعد لوٹ کر پھر اعتکاف میں بیٹھ جاتے گویا اس سے ان کا چلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی عبادتوں پر لوگوں کی حاجت روائی کو مقدم سمجھتے تھے۔ اگر کوئی کافر یا ظالم حاکم ایک بار کہنے پر ان کی سفارش کو قبول نہ کرتا یا جان بوجھ کر گھر سے ملاقات کے لیے نہ نکلتا تو وہ سارا دن اس کے انتظار میں وہیں بیٹھے رہتے۔ پھر بھی ملاقات نہ ہوتی تو دوسرے دن جانے کے لیے انکار نہ کرتے اور بے تکلف اس طرح چلے جاتے جیسے ان کو کسی طرح کی کدورت نہیں ہوئی۔ ان کے اس انکسار کو دیکھ کر وہ شخص شرمندہ ہو جاتا اور ان کے پاؤں پر گر پڑتا اور اس حاجت مند کی حاجت پوری ہو جاتی۔

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار پر حسب معمول مجلس سماع میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک

دیوانہ شخص نے چیخ ماری اور شیخ کو جھولی بھر کر اٹھا لیا اور سر کے بل ان کو زمین پر پٹک دیا۔ ان کی دستار کھل کر گر گئی، لیکن ایسا ضبط و تحمل تھا کہ چہرے پر ناگواری کا ذرہ برابر بھی اثر نہ تھا۔ اس کے وجد و حال کا خیال کر کے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس پاگل نے دوبارہ یہی حرکت کی تو حاکم شہر نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا لیکن شیخ نے اسے اپنی حمایت میں لے لیا اور بڑی عذر خواہی کر کے اسے سزا سے بچا لیا۔

علوم ظاہری میں بھی ان کی بڑی دسترس تھی۔ اپنے شاگردوں کو عموماً تفسیر عرائس، عوارف اور فصوص الحکم اور ان کی شرحیں پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ امان پانی پتی نے ایک رسالہ "غیریہ" لکھا تھا۔ اس کے جواب میں شیخ عزیز اللہ نے ایک رسالہ "عینیہ" کے نام سے لکھا۔ اس رسالہ میں نظریۂ وحدت الوجود کے بڑے اہم نکات بیان کیے ہیں۔

جس زمانہ میں خان خاناں کی سرکشی کے قصے ہو رہے تھے، کچھ عرصہ تک، اور اس کے بعد بھی چند سال تک میں نے ان کی خدمت میں تصوف کی بعض کتابوں کی سماعت کی تھی۔

۹۷۵ھ میں وہ عالم فنا سے عالم بقا کو تشریف لے گئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے:

"قطب طریقت نماند"

اپنے رسائل و تصنیفات اور خطوط میں وہ ہمیشہ خود کو "ذرۂ ناچیز عبد العزیز" لکھا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تاریخ کسی نے "ذرۂ ناچیز" سے بھی نکالی ہے۔

شیخ سلیم چشتیؒ حضرت شیخ فرید گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا اصل تعلق دہلی سے تھا۔ سلسلہ بیعت میں خواجہ ابراہیم سے متعلق تھے۔ خواجہ ابراہیم چھ واسطوں سے خواجہ فضل عیاضؒ کے سجادہ نشین ہوئے ہیں۔

شیخ سلیم خشکی اور تری کے راستوں سے دو مرتبہ حرمین کی زیارت و طواف کے لیے ہندوستان سے تشریف لے گئے تھے۔ روم، بغداد، شام، نجف اور مغرب کے دوسرے شہروں کی سیاحت بھی کی تھی۔ وہ سال بھر سیر و سیاحت میں رہتے تھے لیکن حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ ضرور پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے بائیس حج ادا کیے۔ چودہ حج اپنی سیاحت کے پہلے دورہ میں اور آٹھ حج دوسرے دورہ میں۔ آخری بار جب حرمین پہنچے تو چار سال مکہ معظمہ میں اور چار سال مدینہ طیبہ میں مقیم رہے۔ جس زمانہ میں وہ مکہ میں مقیم تھے، میلاد کا زمانہ تو مدینہ میں گزارتے اور حج کا موسم مکہ میں گزارتے تھے۔ اس آخری دورہ میں شیخ یعقوب کشمیری بھی ان کے ساتھ تھا۔ قیام کی تاریخ اس نے یہ کہی تھی ؎

شکر خدا را کہ بہ محض کرم ‏ ‏ ‏ منزل ما شد حرم محترم
ہر کہ بہ پرسید ز تاریخ سال ‏ ‏ ‏ نحن اجبناہ و خلنا الحرم

بلادِ عرب میں شیخ سلیم "شیخ الہند" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی عمر ۹۵ سال کی ہوئی۔ ساری عمر انھوں نے

شریعت نبویؐ کی اتباع میں بڑی بڑی ریاضتوں اور سخت مجاہدوں میں گزاری۔ ایسی ریاضت مشائخین عہد میں سے کسی اور نے کم ہی کی ہوگی۔ غسل روزانہ کرتے تھے۔ طہارت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ کبھی نماز پنجگانہ میں جماعت فوت نہ ہوئی۔

جب شیخ امان پانی پتی ان سے ملنے آئے تو پوچھا سلوک و طریقت کا مقصود آپ کو استدلال کے ذریعہ ملا یا کشف کے ذریعہ؟ انھوں نے جواب دیا "ہمارے مسلک کا تعلق بس دل ہی سے وابستہ رہا"۔

بہت سے اہل کمال شیوخ نے ان کے دامن تربیت سے استفادہ کیا، ان کے قائم مقام بنے۔ ان تربیت یافتگان میں ایک شیخ کمال الوری تھے۔ یہ نہایت بوڑھے آدمی تھے لیکن دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک اور بزرگ شیخ پیارے بنگالی ہیں جو بنگالہ کے شہروں میں بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح شیخ فتح اللہ قرین سنبھلی، شیخ رکن الدین اجودھنی، حاجی حسین خادم ہیں جو فتح پور کی خانقاہ کے منتظم اور ان کے بہترین خلیفہ ہیں۔

جس زمانہ میں کہ شیخ دوسری مرتبہ ہندوستان تشریف لائے تھے، مجھے پتہ چلا کہ وہ عربی انشاء میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی آمد کی تاریخ نکالی اور عربی میں مبارک بادی کا خط لکھ کر بدایوں سے بھجوایا تھا۔

۹۷۶ھ میں شیخ اعظم بدایونی کے واسطہ سے جو ان کے چچا کا لڑکا اور داماد بھی تھا خدمت میں حاضر ہوا تھا اُنھوں نے دورانِ گفتگو مجھ سے پوچھا کہ "احادیث میں حضور اکرمؐ اور شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) کی قبروں کا حال کس طرح بیان کیا گیا ہے"؟ میں نے کہا "احادیث میں تو اس طرح ذکر ہے اور بعض نے اس طرح بیان کیا ہے"۔ شیخ نے کہا سہروردی نے "واقعہ عاعقہ" (کتاب کا نام) میں تینوں قبروں کی صورت بیان کی ہے اور پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

میں حسب ارشاد دو روز شیخ اعظم مذکور کے ہمراہ پرانی خانقاہ کے حجرہ میں مقیم رہا۔ اس دوران میں تفصیل سے گفتگو نہ کی۔ پھر اجازت لے کر پشاور چلا گیا۔ اس کے بعد ۹۷۸ھ میں بھی میں نے کئی بار حاضری دی۔

میں نے شیخ کی جو کرامت دیکھی وہ یہ تھی کہ فتح پور کے اس کوہستان میں جہاں سردی کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے بجز ایک باریک کرتے اور ململ کی چادر کے وہ دوسرا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے۔ ہر روز دو مرتبہ غسل کرتے تھے۔ چلہ میں وصال کے روزے رکھتے تھے اور صرف آدھے تربوز بلکہ اس سے بھی کم پر گزر کر لیتے تھے۔

شیخ سلیم ۹۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات ہے — "شیخ ہندی"

شیخ نظام الدین انبیٹھی وال

انبیٹھی لکھنؤ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ نظام الدین اس قصبہ کے رہنے والے اور شیخ معروف چشتی کے شاگرد اور مرید ہیں۔ ان کا سلسلہ شیخ نور قطب عالم سے ملتا ہے۔ پہلے اکتسابی علوم کے طالب رہے، لیکن ان کی فطرت بلند پرواز تھی اس لیے علوم ظاہری سے فیوض باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہمیشہ آنکھیں بند کیے اللہ سے لو لگائے رہتے تھے۔ ذکر اور باطنی توجہ سے کبھی غافل نہ رہتے

یک چشم زدن غافل از آں ماہ نباشم
ترسم کہ نگاہی کند آگاہ نباشم

تھوڑی ہی مدت میں اپنے پیر سے ارشاد و تکمیل کی اجازت لے کر قصبہ انبیٹھی میں آکر رہ گئے۔ یہاں وہ بڑے توکل و قناعت سے گزارتے تھے، خاص و عام سے دور ہی رہتے تھے، بجز جامع مسجد کے کہیں اور نہیں جاتے تھے، البتہ کبھی کبھی خیرآباد شیخ سعد کے مزار کی زیارت اور شیخ صوفی کے خلیفہ الہدیہ سے ملنے چلے جاتے یا گوپامئو میں اپنے خاص مرید قاضی مبارک گوپاموی سے ملنے چلے جاتے۔ قاضی صاحب بھی بڑے متقی صاحب کمال اور دولت مند آدمی تھے۔ قاضی مبارک جب طالب علم تھے تو انھوں نے شیخ کو اپنے والد کی خانقاہ میں دیکھا تھا اور ان میں بڑے اثر و جذب کو محسوس کیا تھا۔ شیخ عبدالغنی سے ملنے کے لیے وہ فتح پور بھی گئے تھے۔ شیخ عبدالغنی بھی بڑے صاحب مرتبہ بزرگ تھے۔ جس وقت بھی شیخ نظام الدین شیخ الہدیہ کی خانقاہ میں جاتے تو ان کی خدمت میں ایک روپیہ یا ایک تنکہ یا کوئی اور چیز بطور ہدیہ ضرور پیش کرتے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ انھوں نے شیخ الہدیہ کے لڑکے شیخ ابوالفتح کے ہاتھ میں جو اپنے والد کے سجادہ نشین تھے ابن عربی کی "فصوص الحکم" دیکھی۔ شیخ نے یہ کتاب چھین کر رکھ لی اور انھیں کوئی دوسری کتاب دے کر کہا، اس کا مطالعہ کیا کرو۔

عبادات و معاملات میں وہ ہمیشہ "احیاء العلوم" "عوارف" "رسالۂ مکیہ" "آداب المریدین" اور اس جیسی دوسری کتابوں سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز سے پہلے ظہر کی نماز باجماعت پڑھ لیتے تھے، اس کے بعد جمعہ کی جماعت کرتے تھے۔ ان کے خطبۂ جمعہ میں بادشاہوں کا قطعاً ذکر نہیں آتا تھا۔

میں نے ایک بار دیکھا کہ انھوں جمعہ کی نماز جوتے پہنے ہوئے ادا کی اور فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جوتے پہن کر نماز ادا کی تھی۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ان سے کافیہ کی کتاب تبرکاً پڑھنی چاہی لیکن شیخ نے اغماض برتا۔ جب اس نے بڑی عاجزی اور اصرار کیا تو جواب دیا کہ کوئی دینی کتاب پڑھو۔ اس نے کہا "یہ بھی تو دینی کتاب ہے اور علم دین کا اس پر انحصار ہے" یہ سن کر شیخ کو جذبہ آگیا اور فرمایا علم دین کا اس کتاب پر کس طرح انحصار ہو سکتا ہے کہ جس میں پہلی بحث ہی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے کسر نفسی کے طور پر خدائے عزوجل کی حمد ہی درج نہیں کی۔

شیخ بہت کم مرید کیا کرتے تھے۔ کوئی شغل نہیں بتاتے تھے۔ تلقین بھی بہت کم کرتے تھے۔ ان کے معزز مریدوں میں سب سے بڑے شیخ حاتم گوپاموی تھے۔ یہ بھی قاضی مبارک کی خانقاہ میں طالب علم تھے۔ انھیں اسی خانقاہ سے شیخ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ شیخ حاتم کو کبھی کبھی درس دیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی کتاب عطا کر دیتے اور دوسرے مشاغل کی تلقین بھی کرتے، اس طرح انھوں نے حاتم کو بالکل اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ اسے دستار، جوتا اور کپڑے بھی عطا کرتے رہتے تھے۔ قاضی مبارک اور دوسرے طالب علموں نے جب یہ عنایات دیکھیں تو وہ حاتم سے جلنے لگے شیخ نے ان کی دلی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا میں کیا کروں اللہ کی یہی مرضی ہے کہ اسے پھٹے کپڑوں، پرانے جوتوں

اور مفلسی کے باوجود اللہ کی نعمت خاص مرحمت ہو۔ چنانچہ اُنھوں نے شیخ حاتم کے لیے اپنے پورے اثر و جذب سے کام لیا کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ درجۂ کمال تک پہنچ گیا۔ شیخ حقائق و معارف کی گفتگو بس انہی شیخ حاتم سے کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ حاتم کی حالت میں تنزل ہونے لگا اور اس سے بعض لغزشیں سرزد ہو گئیں۔ بعد میں پھر اس نے اپنی حالت سنبھال لی اور شیخ کے پاس وہی مرتبہ حاصل کر لیا۔ جب وہ حضرت کی خلافت اور وراثت کا پوری طرح اہل بن گیا تو خدا نے اسے دنیا سے اُٹھا لیا۔ شیخ نے اس کو یاد کر کے بارہا فرمایا کہ "خدا کا ایک بندہ تھا کہ میں جب بھی اس سے خدا کی باتیں کہتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا، وہ بھی اُٹھ گیا۔ اب میں کس سے یہ بات کروں"۔

جس زمانہ میں مَیں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اُس وقت شیخ اپنے سالے عبدالرزاق کو جو بعد میں ان کا خسر بھی ہو گیا تھا گفتگو میں مخاطب بناتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے بیٹے شیخ محمد کو بھی واسطہ بنا کر خطاب کیا کرتے تھے۔ شیخ محمد اب ان کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہیں۔

محمد حسین خاں مرحوم کو جس کے حالات مَیں نے تاریخ میں بیان کیے ہیں حضرت سے بڑی عقیدت و ارادت تھی۔ حسین خاں کے اور میرے گہرے روابط تھے۔ جس وقت اسے لکھنؤ جاگیر میں ملا تھا تو میں ۹۷۶ھ میں سید اصغر بدایونی اور قاضی مبارک گوپاموی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ پہلی ہی ملاقات میں شیخ ہر شخص سے ایسی بات کہتے تھے جو اُس کے حالات سے عین مطابقت رکھتی تھی۔ ان کی زبان پر ہمیشہ الحمدللہ، درود، سبحان اللہ، لاالٰہ الا اللہ، بسم اللہ، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، قرآن کی کوئی آیت یا کوئی حدیث یا کسی بزرگ کا قول ہی رہتا تھا۔ سید اصغر سے معانقہ کیا تو درود پڑھا، قاضی احمد سے ملے تو سبحان اللہ کہا، میری باری آئی تو بسم اللہ، اسی طرح ہر ایک کے مطابق حال کوئی نہ کوئی کلمہ ارشاد فرمایا۔ اسی اثناء میں کہ ابھی وہ گفتگو نہ کر پائے تھے کہ ایک غریب طالب علم نہایت بُرے حال میں آ کر ملا۔ اس سے مل کر شیخ نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھا۔ پھر شیخ عبدالرزاق کو مخاطب کر کے "کلُّ شیئٍ ہالکٌ الا وجہہ" کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ وہ ہاں ہاں کرتے جاتے تھے۔ کبھی بطور تلمیح کسی چیز کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ کسی اور کو خوف اور رعب کے مارے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں بھی مبہوت بنا سُن رہا تھا اور اپنی کوتاہیوں کا خیال کر کے ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو میرے پوشیدہ حالات حضرت پر منکشف ہو گئے ہوں اور وہ اسے ظاہر فرما دیں۔ اسی ڈر سے میں مجلس سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھا کہ وہ طالب علم بول اٹھا، اس آیت میں "وجہہ" کی ضمیر کسی اور چیز کے لیے آئی ہو جیسا کہ بعض اہلِ معرفت نے بیان کیا ہے۔ اس کی بات سُن کر حضرت جلال میں آ گئے۔ اُن کا چہرہ تمتمانے لگا اور فرمایا میں نے اس شیطان سے ملتے ہی تعوذ پڑھا تھا چنانچہ دیکھ لو اس کی شیطنت ظاہر ہو گئی۔ چونکہ وہ جان چکے تھے کہ اس کے اعتراض کے پیچھے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ اسی لیے بار بار لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا۔ پھر قصیدہ بردہ کا یہ شعر پڑھا ۔

یا لائمی فی ھوی العذری معذرۃً
منی الیک ولو انصفت لم تلم

شیخ پر اس وقت بڑا جلال طاری تھا۔ آخر آپ نے حکم دیا کہ اسے مجلس سے اٹھا دو۔ پھر اسے اپنے پاس بلا کر ملائمت کا اظہار کیا۔ حاضرین کو یہ واقعہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ وہ رات ان کی خانقاہ میں میں نے بڑی مشکلوں سے کاٹی اور بھاگ جانے کے لیے بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے رات کٹی۔ ابھی پو پھٹی تھی لیکن اتنا اندھیرا تھا کہ بغیر چراغ کے ایک دوسرے کے چہرے کو پہچاننا مشکل تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ ابھی رات باقی ہے۔ حضرت نے صبح کی نماز پڑھائی۔ جب سورج نکلا، حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے اور مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ہم تین مہمانوں کے لیے شیخ محمد کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ میرے اضطراب کا یہ حال تھا کہ میں ہر لمحہ شیخ محمد کو واسطہ بنا کر رخصت ہونے کی اجازت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حضرت شیخ ایک ہاتھ میں قرآن پاک اور دوسرے ہاتھ میں نمک لیے ہوئے کسی بات کے ضمن میں آیت کریمہ "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل" کی وضاحت کر رہے تھے، میری روانگی کی اجازت کو ٹال گئے۔ ایک اور بات کے ذیل میں حسین خاں کو جو اس وقت پرگنہ اسولی میں تھا بڑی توجہ سے یاد فرمایا اور کہا "وہ میرا طوطا ہے"۔

حضرت طبعاً بڑے فیاض تھے۔ امیر ہو یا فقیر ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد یا نمک یا کوئی اور چیز ضرور دیتے تھے۔ مجھے انھوں نے ایک تنکہ عنایت فرمایا۔ اس سفر میں میں نے ان کی ایک کرامت بھی دیکھی۔ جس وقت ہم تینوں آدمی امیٹھی کو حضرت سے ملنے جا رہے تھے تو راستہ میں سپاہیوں نے ایک شخص کو چوری کے الزام میں پکڑ لیا تھا اور اس کے کپڑے اتار لیے تھے۔ وہ صورت سے فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد وہی شخص کسی طرح باریابی پا کر حضرت کے دروازہ پر آیا اور سوال کرنے لگا۔ بڑی عاجزی اور لجاجت کی لیکن حضرت نے اسے کچھ نہ دیا۔ حاضرین کو جو ان کی سخاوت اور دریا دلی سے واقف تھے نہایت تعجب ہوا۔ انھیں متعجب دیکھ کر حضرت نے اچانک فرمایا "اس چور کو دیکھو کہ راہزنی بھی کرتا ہے اور فقیری بھی" پھر آپ نے اسے مجلس سے نکال دیا۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس وقت ہم نے جو غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چوری میں پکڑا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ دوسرے دن بھی پیش آیا، جس کا ذکر طویل ہو جائے گا۔

رمضان کی آخری تاریخ کو حسین خاں کے ہمراہ ہم لوگ پرگنہ سے یلغار کرتے ہوئے امیٹھی پہنچے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ فجر کی نماز شیخ ممدوح کے پیچھے ادا کریں اس لیے تیزی سے کوچ کرتے رہے۔ صبح ہو چکی تھی، ابھی تین کوس باقی رہ گئے تھے۔ ہمیں جماعت کے فوت ہو جانے کا افسوس ہوا اور ہم نے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑایا یہاں تک کہ طلوع آفتاب سے بس کچھ ہی پہلے شیخ موصوف کی مسجد میں پہنچے۔ اس وقت حضرت گھر سے برآمد ہوئے، جماعت قائم کی اور نماز پڑھائی۔ ایسا گمان ہو رہا تھا کہ وقت باقی نہیں رہا، تاہم ہمیں جماعت کا شرف حاصل ہو گیا۔ اتنی دیر سے جماعت کرنا حضرت کے معمول کے خلاف تھا کیونکہ وہ ہمیشہ صبح کی نماز ایسے وقت ادا کرتے تھے

کہ ابھی صبح صادق کے طلوع کا بس گمان ہی ہوتا تھا۔

اسی دن شام کو اُنھوں نے مسجد میں تصوف پر تقریر کی اور خواجہ حافظ کے چند شعر پڑھے۔ بیان کے دوران میں حسین خاں مرحوم کے ایک ساتھی نے پوچھا "خواجہ حافظ کس کے مرید تھے؟" فرمایا "خواجہ نقشبندی کے"۔ کسی بات پر ایک شخص نے پوچھا "گھوڑے کا گوشت امام اعظم کے مذہب میں حلال ہے؟" آپ نے فرمایا "امام اعظمؒ نے خود گھوڑے کا گوشت کھایا تھا"۔ جب آپ اس شعر پر پہنچے ؎

صوفیاں در دمی دو عید کنند

عنکبوتاں مگس قدید کنند

مجھے اپنے خلوص پر پورا بھروسا تھا اس لیے میں نے بالکل ہی خالی ذہن ویسے ہی پوچھ لیا "دو عید سے کیا مراد ہے؟" یہ سوال انھیں پسند نہ آیا اور فرمایا "یہ بات بایزید اور جنید کے پوچھنے کی ہے، شبلی اور منصور کے پوچھنے کی ہے، تو کہاں اور یہ سوال کہاں!" پھر اس سلسلہ میں اُنھوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور بڑا نادم ہوا۔ حسین خاں حیرت سے دانتوں میں اُنگلی دابے میری طرف دیکھ رہا تھا اور تمام ساتھی نہایت حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ میری خوش نصیبی سے اُس وقت عید کے چاند کے دکھائی دینے کا شور بلند ہوا اور لوگ مبارک باد دینے اور معانقہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مجھے موقع مل گیا اور میں وہاں سے کھسک کر مغرب کے وقت اس خیمہ میں جو مسجد سے متصل باغ میں لگا ہوا تھا نہایت رنجیدہ اور اداس چلا گیا اور زندگی سے بس بیزار ہو گیا۔ حضرت شیخ جب اندر تشریف لے گئے اور مہمانوں کے لیے انھوں نے دسترخوان لگوایا تو اس وقت پوچھا "فلاں کہاں ہے؟" اُن کے لڑکے شیخ محمد نے جواب دیا "وہ اپنی اس گستاخی کی وجہ سے مسجد میں ٹھہر نہیں سکا اور چلا گیا ہے۔ جماعت میں بھی وہ شریک نہیں تھا۔" یہ سن کر حضرت نے اپنے سامنے سے کھانا اور حلوہ اُٹھا کر تبرکاً میرے لیے بھجوایا۔ اس وقت مجھے بڑی تسکین اور اطمینان حاصل ہوا اور معافی کی اُمید بندھ گئی۔

صبح سویرے ہی حسین خاں عید کے لیے لکھنؤ چلا گیا اور میں امیٹھی میں اکیلا رہ گیا۔ حضرت شیخ نے مسجد ہی میں عید کی نماز ادا کی اور نماز کے بعد کتاب "عوارف" کا درس دینے لگے۔ اسی موقع پر شیخ محمد نے میرا قصور معاف کرنے کے لیے سفارش کی۔ حضرت نے سبق بند کر دیا اور مجھے بلا کر بڑی توجہ سے التفات فرمایا۔ میں نے اس وقت روتے ہوئے اُن کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ حضرت نے مجھے اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور کہا "میرے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی اور کینہ نہیں رہتا۔ میں کسی کو کچھ کہتا ہوں تو صرف نصیحت اور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی کہتا ہوں اور رسول اللہ کی طرح جس کسی کو سخت بات کہہ دیتا ہوں تو اس کا نتیجہ بھلائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر کسی پر لعنت بھی بھیجوں تو وہ رحمت بن جاتی ہے۔" پھر آپ نے اپنے سر سے ٹوپی اُتار کر مجھے عنایت کی اور پاس کے حجرے میں مجھے اپنے ساتھ تنہا لے کر گئے اور فرمایا "میرے سامنے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو"۔ یہ دوگانہ میں نے ایک عجیب ہی حالت میں ادا کیا۔ حضرت نے فرمایا "لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں طالبوں کو تلقین نہیں کرتا۔ میں انھیں کیا تلقین کروں، میری تلقین تو بس یہی ہے

کہ زبان پر خدا کا ذکر رہے اور دل شکر گزار"۔ اس کے بعد بس حضرت کا دریا جوش میں آگیا اور بہت سی باتیں بیان کیں۔ اس موقع پر حضرت کی روش کے برخلاف باہر کسی نے ہندی راگ چھیڑ دیا تھا اور اسے سن کر دو سندھی درویش نہایت درد بھری آواز میں آہ و فریاد کرنے لگے۔ اس وقت میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجھ پر حال طاری ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا کہ "صحابہ جب نومسلم بدوؤں کو دیکھتے تھے کہ وہ قرآن مجید سن کر بُری طرح رونے لگتے ہیں تو خود پر افسوس کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سے فرمایا کرتے تھے "کنا نحن امثالکم ثم قست قلوبنا ای تمکنت واستقرت قلوبنا" (ہم بھی تمہارے ہی جیسے تھے لیکن اب ہمارے دل ٹھہر گئے ہیں) اس کے بعد حضرت نے کچھ اور اس طرح کی باتیں بیان کیں جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ پھر آپ نے مجھے یہ دعا پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی جسے میں ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں ــــــ "اللّٰھم انی اعوذ بک من الصمم والبکم والجنون والجذام والبرص"۔

جب میں حضرت سے رخصت ہو کر لکھنؤ میں آکر مقیم ہو گیا تھا کبھی نمک کبھی خاص چاول اور کبھی مٹی کا پیالہ وغیرہ میرے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ حضرت کی عادت تھی کہ عموماً مجلسوں میں بیٹھے ہوئے نمک چاٹا کرتے تھے اور یہ حدیث پڑھتے تھے ــ "الملح دواء لسبعین داء الا السام" (نمک بجز موت کے ستر بیماریوں کی دوا ہے)

حضرت نے میرے چھوٹے بھائی شیخ محمد مرحوم کو بھی اپنی بیعت سے نوازا تھا، چنانچہ وہ حضرت کی تھوڑی سی توجہ سے بڑا عبادت گزار اور فرشتہ خصلت بن گیا تھا اور اکثر اوقات "طیّ کا روزہ" رکھے رہتا تھا۔ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت، نوافل اور ذکر اذکار میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح کہ اس کا ایک لمحہ بھی فضول باتوں میں ضایع نہیں ہوتا تھا اور میری طرح وہ بیکار مشغلوں میں اُلجھا ہوا نہیں رہا ؎

در حق گلاب و گل حکم ازلی ایں بود
کیں شاہد بازاری وآں پردہ نشیں باشد

انہی دنوں اسی قابلِ رشک حالت میں وہ فوت ہو گیا۔ یقین ہے کہ وہ اپنے ایمان کے سایہ تلے جنت میں خوش و مسرور ہو گا۔

حضرت ممدوح کی عمر اسّی سال سے زیادہ ہوئی ہے اس کہنہ عمری میں بھی ان کے ہاں اولاد ہوتی رہی۔ آپ کی وفات ۹۷۹ھ میں ہوئی +

شیخ بھیکن کاکری والے

لکھنؤ کے توابع میں کاکری نامی ایک قصبہ ہے۔ شیخ بھیکن اسی قصبہ کے رہنے والے تھے۔ یہ بڑے عالم، متقی اور متشرع تھے۔ تقویٰ اس درجہ کا تھا کہ اس معاملہ میں وہ امام اعظم ثانی تھے۔ برسوں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ سات قراتوں کے حافظ اور قاری تھے۔ شاطبی کا درس دیا کرتے تھے۔ طریقت میں میر سید ابراہیم ایرجی کے خلیفہ تھے۔ ایرجی موصوف اپنے زمانہ کے بڑے عالم بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ بھیکن تصوف کی باتیں کبھی عام محفلوں میں نہیں کرتے تھے، یہ باتیں صرف خلوت میں وہ بھی محرمانِ راز سے ہوا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر توحید کے رموز علانیہ بیان کیے جائیں تو وہ یا تو کہنے والے پر پڑتی ہیں یا سننے والوں پر

بظاہر تو وہ ایسی باتوں کی ممانعت ہی کیا کرتے تھے۔

ان کے لڑکے بڑے صاحب کمالی ہیں۔ وہ سب کے سب علم و حکمت، فضل و تقویٰ سے آراستہ ہیں۔ میں ان بزرگوار کی خدمت میں محمد حسین خاں مرحوم کے ہمراہ لکھنؤ میں حاضر ہوا تھا۔ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ اس وقت کوئی شخص علم منطق کی کوئی کتاب درس لینے کے لیے ان کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا "علوم دینی کی کوئی کتاب پڑھو"۔ ان کی وفات سنہ ۸۹۱ھ میں ہوئی +

شیخ سعدی یہ بڑے مشائخین میں سے تھے۔ اپنے والد بزرگوار شیخ محمدؒ سے خلافت پائی۔ شیخ محمد وہی بزرگ ہیں جنھوں نے شاطبی پر فارسی میں ایک شرح ستر جزو میں لکھی ہے۔

شیخ سعدی اکثر وجد و حال میں رہتے تھے، کیا ظاہر کیا باطن سراپا خلوص تھے، ہمیشہ خوش بشاش اور مسکراتے رہتے تھے۔ اپنی عمر نہایت خوش اوقاتی اور آزادگی سے گزاری۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو رخصت کرتے ہوئے ایک پرچہ دیا جس میں یہ شعر درج تھا :

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

ان کا انتقال سنہ ۱۰۰۲ھ میں ہوا +

سید تاج الدین شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے۔ یہ بزرگ "دعوت اسماء" کے مجاز تھے۔ ریاضت فقر اور توکل میں ان کی اپنی ایک شان تھی۔ نہایت ایثار پیشہ اور سخی آدمی تھے۔

جب لکھنؤ آئے تو بہت سے آدمیوں نے ان کی صحبت سے استفادہ کیا اور ارشاد و اصلاح کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ اُن کا لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا تھا۔ (مصنف نے ان بزرگ کا سن وفات نہیں لکھا) +

شیخ محمد قلندر لکھنوی پہلے یہ بزرگ سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں سپاہگری کا پیشہ رکھتے تھے۔ جس وقت بابر بادشاہ نے ہندوستان کو فتح کیا، سپاہ گری ترک کر کے فقر و عزلت گزینی کی راہ اختیار کر لی اور شیخ بہلول کے مریدین کر عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ اپنے پیر سے اسماء الٰہی میں سے چند اسماء کی دعوت و تلقین حاصل فرمائی اور ایک باغ میں جس کے اکثر درخت انھوں نے خود لگائے تھے، گوشہ نشین ہو گئے اور لوگوں سے میل جول اور تعلقات کا دروازہ بند کر دیا۔

کہتے ہیں کہ تیس سال سے زیادہ ہوئے کہ وہ صرف دودھ پر گزارہ کرتے ہیں اور اناج وغیرہ کچھ نہیں کھاتے۔ ایک دن محمد حسین خاں ان کی ملاقات کے لیے گیا، میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ایک بلی شیخ کے پاس آ کر درد بھری آواز میں چلانے لگی۔ آپ نے فرمایا یہ بلی فریاد کر رہی ہے کہ "تم لوگوں نے آ کر اپنے بھی اوقات ضایع کیے اور صاحب خانہ کے بھی اور حضور قلب میں خلل پیدا کر دیا"۔

شیخ نظام نارنولی

نارنول ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔ وہ سلسلۂ چشتیہ میں شیخ خانول کے جو قلعۂ گوالیار میں رہتے تھے، مرید ہیں۔ لیکن انھوں نے زیادہ تر استفادہ اپنے بڑے بھائی شیخ اسماعیل نامی سے ہی کیا اور تربیت و خلافت حاصل کی۔ ان کے بھائی ایسے صاحبِ ذوق صوفی تھے کہ ہمیشہ ان پر جذب و شوق کی حالت طاری رہتی تھی۔ عزلت نشین اصحاب خانقاہ کے احوال و کیفیات سے بخوبی واقف تھے۔ خود بھی بڑے صاحب تصوف اہل دل تھے۔

میں نے معتبر آدمیوں اور شیخ کے مریدوں سے سنا ہے کہ وہ چاند گرہن کی راتوں میں اپنے مریدوں کو مالکنگنی کا تیل کھلاتے تھے۔ یہ ہندوستان میں بڑی مشہور اور عام دوا ہے۔ اس کی تعریف میں اطباء نے رسالے لکھے ہیں۔ میں نے خود بھی اس کے بعض خواص کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس تیل کے کھانے سے ان پر آخرت کے حالات کا کشف ہو جاتا تھا اور بڑے عجیب عجیب امور کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ واللہ اعلم

شیخ نظام چالیس سال تک رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن رہے، جوان کے زمانہ سے آخر عمر تک ان کا معمول تھا کہ ہر سال بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حضرت قطب عالم خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کی زیارت کے لیے پیدل دہلی کو جایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بڑھاپے اور بعض دوسرے موانعات کی وجہ سے خواجہ موصوف کا عرس انھوں نے نارنول میں منایا۔

شیخ نظام اپنے پیر کی طرح کسی کی تعظیم نہیں بجالایا کرتے تھے۔ امیر ہوں یا غریب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طرح نہایت بے تکلفی اور سادگی سے ملتے تھے۔ یہی روش مرید بنانے میں بھی ملحوظ رہتی تھی۔

میں نے انھیں ایک بڑے ہجوم میں دیکھا تھا۔ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔

ان کی وفات ۹۹۷ھ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ "آہ نظام" ہے۔

شیخ الہدیہ خیرآبادی

بڑے متبحر عالم تھے۔ ابتدائے حال میں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ شیخ صفی خلیفۂ شیخ سعید سے ارادت و ارشاد کا تعلق تھا۔ ابتدائی دور میں علوم ظاہری کی تدریس میں اس قدر مشغول رہے کہ بہت سے صاحبِ کمال اہل علم اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ بعد میں انھوں نے کلیتاً صوفیاء کا مسلک اختیار کر لیا۔ فقر و توکل تجرید و ایثار تصوف کے تمام لوازمات پر عمل پیرا رہے۔ ان پر ہمیشہ سماع و وجد کا ذوق غالب رہتا تھا۔ درود ہر وقت وردِ زبان رہتا تھا۔ لوگوں سے خاص طور سے اہل دنیا امراء و حکام سے دور ہی رہتے تھے اور محض اس لیے کسی کی ضیافت قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کے تمام بچے اور متعلقین فقر و فاقہ میں اپنے والد کی طرح صبر و شکر کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کے صاحبزادے شیخ ابو الفتح جو صاحب سجادہ اور اپنے وقت کے بڑے عالم اور ظاہر و باطن میں اپنے والد کے مکمل نمونہ ہیں۔ مختلف علوم پر بڑے پایہ کی تصانیف کے مالک ہیں۔

شیخ الہدیہ کے دروازہ سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ ایک دن محمد حسین خاں نے شیخ سے پوچھا، سالار مسعود

جن کے معتقد ہندوستان کے عوام ہیں کیسے آدمی تھے ؟ آپ نے جواب دیا " ایک افغانی تھا جو شہید ہو گیا "

وہ آخر عمر میں بادشاہ کی طلبی پر فتح پور تشریف لائے تھے اور اُس " خلیفۂ زماں " (اکبر) سے ملاقات کی تھی۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کو بلانے جب آدمی گیا تو وہ خانقاہ سے باہر سیر کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ طلبی کی اطلاع دی گئی تو وہیں سے کچھ تیاری کیئے بغیر ہی ساتھ ہو لیئے۔ ان کے خادم سفر کا سامان اور پالکی پیچھے لے کر آئے۔ اکبر کو یہ بات سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ جب اکبر نے ان سے کچھ دریافت کیا تو انھوں نے اشارہ سے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ اکبر نے کچھ رقم انھیں دی، ان کی مدد معاش کا حکم صادر کر دیا اور اُسی وقت رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

شیخ کی وفات ۹۹۳ھ میں ہوئی +

شیخ داؤد جھنی وال

جھنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے آئے تھے اور ملتان کے نواح میں بمقام سیت پور مقیم رہے۔ شیخ اس سیت پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی والدہ بھی فوت ہو گئیں اور وہ یتیم رہ گئے۔ ان کی سرپرستی اور تربیت ان کے بڑے بھائی میاں رحمت اللہ نے کی۔ جس وقت وہ قرآن کا سبق لیا کرتے تھے تو آنسو رخساروں پر بہنے لگتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ پڑھنے پڑھانے کی مصیبت میں نہ ڈالو، بس اللہ کے سپرد کر دو۔ لوگوں نے آخر سمجھ لیا کہ انھیں کسی معلّم کی ضرورت نہیں ہے ؎

بہ تعلیم آداب اورا چہ حاجت
کہ او خود ز آغاز آمد مؤدب

مشہور ہے کہ انھوں نے حضرت امام حسنؓ یا امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا تھا کہ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی چند آیتیں ان کو سکھائیں۔ جب کبھی تفریح کی خاطر کھیلنے جاتے تو حیران رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے ان لڑکوں کے چہرے نوچے ہوئے، ان کے جسم خون آلود اور کھال اُدھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض مجھے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے ان کے سر نہیں ہیں۔

عرصۂ دراز کی مصیبتوں کے بعد حضرت اپنے وطن سے ستگرہ پھر وہاں سے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ نے مولانا عارف جامی کے شاگرد مولانا اسمٰعیل اُچھ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور کم عمری ہی میں اس خوبی کے ساتھ شرح اصفہانی پڑھ لی کہ ان کے ساتھ جو ولایتی (عرب و ایران کے) طالب علم پڑھتے تھے وہ ان کی ذہانت و ذکاوت پر حیران رہ گئے۔ ان کے اُستاد کہا کرتے تھے کہ جس طرح ہم اپنے اُستاد مولانا جامی کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے اسی طرح یہ نوجوان بھی ایسا صاحبِ مرتبہ ہو گا کہ لوگ اس کے دیدار کو ہی بڑی برکت جانیں گے اور اس کی صلاحیتوں سے استفادہ کریں گے۔ آخر اسی طرح ظہور میں آکر رہا ؎

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کچھ عرصہ بعد آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ اس دوران میں خود بخود آپ پر ایک خاص جذبہ طاری ہوا اور حضرت غوث الثقلین سے ایک باطنی مناسبت پیدا ہو گئی۔ عالم مراقبہ میں وہ جو کچھ سوال کرتے تھے اس کا جواب انھیں مل جاتا تھا۔ پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اسی عالم جذب میں سر و پا برہنہ دیپال پور کے نواحی صحرا میں جسے اب شیر گڑھ کہا جاتا ہے اور جو جنگلی جانوروں کا مرکز ہے گھومتے رہتے تھے۔

ما عاشق سرگشتۂ صحرائی دمشقیم

کبھی کبھی جب وہ حضرت مخدوم عالم گنج شکرؒ کے مزار پر چلے جاتے تو وہاں ان کو باطنی اشارے ملتے بشارتیں سنائی دیتیں اور صاحب مزار سے گفتگو ہوتی جس کی تفصیلات اس مختصر کتاب میں نہیں دی جا سکتیں شیخ ابوالمعالی ولد شیخ رحمت اللہ کی تصنیف "نغمات داؤدی" میں دیکھی جا سکتی ہے (شیخ ابوالمعالی کی ولادت کی ایک تاریخ تو "گدائی شیخ داؤد" سے اور دوسری "ابوالمعالی حق پرست" نکلتی ہے۔ اب وہ حضرت شیخ داؤد کے جانشین ہیں) اس صحرانوردی میں حضرت ممدوح نے بیس سال گزار دیے۔ اس کے بعد آپ کی توجہ سلوک و ارشاد کی طرف مائل ہوئی لیکن مشکل یہ تھی کہ بظاہر آپ کا کوئی پیر و مرشد نہ تھا۔ حضرت غوث اعظم نے اپنی روحانیت سے آپ کی راہنمائی کی کہ سلسلۂ طریقت کے تحفظ کے لیے وہ شیخ حامد قادری ولد شیخ عبدالقادر ثانی کے ہاتھ پر بیعت کریں (شیخ حامد کے صاحبزادے شیخ عبدالقادر آج کل اپنے والد کے قائم مقام ہیں) شیخ حامد چونکہ بارہا خود ان سے مقامات سلوک میں مدد لیتے رہے تھے اور ہر مشکل مرحلہ میں ان سے دعا کراتے رہتے تھے اس لیے ان کو اپنا مرید بنانے، شجرہ لکھ کر دینے میں تامل تھا۔ یہاں تک کہ شیخ داؤد خود ایک دن ستگرہ جہاں مخدوم شیخ حامد مقیم تھے تشریف لے گئے اور نہایت عالم جذب میں ان سے فرمایا کہ "یہ دیکھو خود غوث اعظم تشریف لائے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ "سجادہ عصا شجرۂ خلافت گھوڑا پالکی اور دوسرے لوازمات پیشوائی میرے حوالہ کر دو۔" جب شیخ مخدوم کو بھی اس معاملہ میں عین الیقین حاصل ہو گیا تو انھوں نے شیخ داؤد کی تمام فرمائشوں کی تکمیل کر دی اور وہ وہاں سے شیر گڑھ کے نئے شہر میں آ کر جھنگی کے قریب مقیم ہو گئے۔ یہ مقام ملتان اور پٹن کے درمیان تھا۔ آپ نے یہاں قیام فرما کر سلسلۂ سہروردیہ و چشتیہ اور قادریہ کو رواج دیا۔ ان کی تلقین و ارشاد کی ایسی شہرت ہوئی کہ تا قیامت یہ شہرہ ختم نہیں ہو سکتا۔

جس زمانہ میں مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اہل اللہ کے درپے آزار ہو گیا تھا اور بعض طالبان حق کو شہید بھی کرا دیا تھا، اسلیم شاہ افغان سور نے گوالیار سے حضرت کی طلبی کے لیے بھی فرمان بھجوایا تھا۔ آپ تنہا ایک دو خادموں کے ساتھ گوالیار گئے۔ اسلیم شاہ نے گوالیار سے باہر نکل کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ آپ سے ملاقات کی۔ اسی جگہ آپ نے قیام کیا۔ اسلیم شاہ نے نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ حضرت سے بات چیت کی۔ اس رنگ کو دیکھ کر یہی فتنہ پردازوں کے ہوش اڑ گئے اور وہ ادھر ادھر کھسک گئے اور ایسے روپوش ہوئے کہ تلاش کے باوجود ان کا پتہ نہ چل سکا۔ مخدوم الملک نے کہا "یہ جھوٹ بولنے والے آدمی نہیں ہیں۔" کچھ گفتگو کے بعد آپ نے

دریافت کیا، ہم فقراء کو طلب کرنے کا آخر سبب کیا تھا؟ مخدوم الملک نے کہا، ہم نے سُنا تھا کہ آپ کے مرید ذکر کے وقت "یا داؤد" "یا داؤد" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا یہ سننے والے کی غلط فہمی ہے میرے مرید تو "یا ودود" "یا ودود" کا ذکر کرتے ہیں۔

مخدوم الملک کے ساتھ آپ کی ایک دن یا ایک رات نشست رہی۔ آپ نے اسے حقائق و معارف کی باتیں بتائیں اور چند نصیحتیں بھی کیں۔ وہ نہایت متاثر ہوا اور آپ کو اسی مقام سے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک مرتبہ ان کی مجلس میں میاں حسام الدین ملتانی کے زہد و تقویٰ کا ذکر چھڑ گیا (میاں حسام الدین کے اوصاف و حالات کا ذکر "نجات الرشید" میں کیا گیا ہے) آپ نے کہا "افسوس میاں ظاہری رسوم و اخلاق میں پھنس کر حق تعالیٰ کی محبت ذاتی سے دور رہ گیا۔"

حضرت نہایت ایثار پیشہ اور فیاض دست تھے۔ ہر سال ایک بار یا دو بار اپنا سارا نقد و مال جو ہدیوں اور نذرانوں میں جمع ہو جاتا تھا، راہِ خدا میں لٹا دیتے تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ اپنے سکونتی حجرہ میں اس حال میں رہتے تھے کہ بجز مٹی کے پیالے اور پرانے بوریے کے کچھ اور باقی نہ رہتا تھا۔ جب بھی ان کے پاس روپیہ جمع ہو جاتا اسی طرح خیرات کر دیتے۔ اس دریا دلی اور کشادہ دستی کے باوجود حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پر ان کی خانقاہ کے لنگر سے تقریباً ایک لاکھ زائرین کیا خاص کیا عام سبھی کو کھانے پینے کی اشیاء دی جاتی تھیں۔ ابھی تک ان کے لنگر کی رونق اسی طرح قائم ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔

آپ کی زبان مبارک سے بعض بڑے موثر کلمے ادا ہوئے ہیں مثلاً "بسم اللہ الدلیل الہادی فی ظلمات البحار والبوادی"۔ اس پاک کلمہ کا اثر خطرات اور حادثات کے موقع پر ظاہر ہوا ہے اور بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے ایسی ہی بہت سی تسبیحیں ذکر اذکار آپ سے منسوب ہیں۔

آپ نے اپنی مہر کا سجع خود ہی تجویز کیا تھا۔

محی داؤد محی اسم و رسم
فان الفقر محو کل وسم

میں بیرم خاں کے عہد میں جو بلاشبہ ایک بہترین زمانہ تھا اور اس وقت ہندوستان حجلۂ عروسی کی طرح دلکش و بارونق تھا، آگرہ میں تعلیم پا رہا تھا۔ اُس وقت میں نے بعض درویشوں سے آپ کی شان بزرگی کے قصے سنے تھے اور آپ کی عقیدت و محبت کا بیج میرے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ اسی طالب علمی کے زمانہ میں چند بار میں نے حضرت کی خدمت میں جانے کے ارادہ سے شیر گڑھ کا ارادہ کیا لیکن والد مرحوم مانع ہوئے اور راستہ ہی سے مجھے واپس لوٹا لیا۔ بعض اوقات کچھ اور موانعات پیدا ہوئے کہ میں اس برکت سے محروم ہی رہا اور انتظار میں بارہ سال نکل گئے۔

ایک مرتبہ حضرت کا ایک مرید شیخ کالو نامی جس کی زبانی میں حضرت کا حال سن کر غائبانہ معتقد ہو گیا تھا، بدایوں آیا۔

وہ حبیب بھی ملتا مجھ سے کہتا تھا "بڑا افسوس کہ حضرت میاں صاحب زندہ ہیں اور تم ان سے ملنے ایک بار بھی نہیں گئے"۔ اس کی یہ بات میرے خرمنِ اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ایک اچھا سبب پیدا کر دیا کہ محمد حسین خاں نے جس کی ملازمت سے میرا تعلق تھا ابراہیم حسین میرزا کے تعاقب میں کانت وکولہ سے پنجاب کی طرف کوچ کیا اور مجھے اس سعادت سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں پنجاب سے حضرت کی ملاقات کے لیے شیر گڑھ پہنچا۔ میں نے حضرت کے جمالِ مبارک میں ایسا حسن پایا کہ کسی صاحبِ حسن کو اس سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ گفتگو کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے آپ کے دانتوں سے نور برستا ہوا معلوم ہوتا تھا، جس سے دل کی تاریکی چھٹ جاتی تھی۔

میں وہاں چند دن مقیم رہا۔ اس دوران میں کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جس میں کہ سو سو پچاس پچاس ہندو اپنے گھرانوں سمیت آ کر اسلام قبول نہ کرتے ہوں۔ آپ کی شخصیت کی وجہ سے مجھے تو اس شہر کے در و دیوار شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

حضرت نے مجھے ایک کلاہ عنایت کر کے کہا کہ میری طرف سے اپنے اہل و عیال میں تم نائب رہو میرا یہی طریقہ ہے۔ پھر آپ نے میرے متعلقین کے لیے اپنے گھر سے ایک دوپٹہ اور رومال منگا کر عنایت کیا۔ میں نے عرض کیا اگر ایک پیراہن بھی عطا ہو جائے تو میرے لیے نورٌ علیٰ نور ہے۔ بڑے تامل کے بعد فرمایا "وہ بھی وقت پر مل جائے گا"۔ میں نے حضرت سے بعض دلی مقاصد اور اسرار بیان کیے اور ان کے جواب سنے، اس کے بعد میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ اس اثناء میں حضرت بھی کمزوری کی وجہ سے پالکی میں بیٹھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ میں نے ان کی پالکی کا پایہ اپنے کاندھے پر لے لیا اور کئی قدم چلا۔ اس وقت مجھ پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ضبط نہ کر سکا۔ حضرت نے پالکی رکوا لی اور مجھے بہت سی معرفت و محبت کی باتیں بتائیں۔

جس دن میں رخصت ہو رہا تھا میں نے میاں عبدالوہاب کے وسیلہ سے حضرت سے عرض کیا کہ ہندوستان کے مشائخ کہتے ہیں کہ ایک سید کے ظہور کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ ان میں سے اکثر نے ایک سید پر اتفاق بھی کر لیا ہے جس کے آباؤ اجداد اس سے پہلے کچھ عرصہ تک دہلی اور بدایوں پر حکمران بھی رہے ہیں اور اب وہ لوگ جہاد کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ حضرت غوث اعظم کی طرف سے اس اہم خدمت پر مامور کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے سرحد کے بعض امیروں کو بھی اپنا حامی بنا لیا ہے، بعض لوگوں نے مختلف مقامات پر بشارت پا کر اس گروہ میں شرکت کر لی ہے اور اب یہ سب اپنے ارادوں کو عملی صورت دینے کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے پوچھا اس سید کی وضع اور حالت کیسی ہے؟ میں نے کہا وہ ایک گوشہ نشین متشرع اور متوکل فقیر ہے، بڑی عبادت و ریاضت کرتا ہے، دن کو مقبروں میں بیٹھا رہتا ہے، رات کو اپنے حجرہ میں عبادت کرتا رہتا ہے، فنونِ سپاہ گری میں بھی بے مثل اور لاثانی ہے، اس کے اخلاق و عادات نہایت شائستہ ہیں، شادی شدہ کنبہ والا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس جماعت کے لوگ درویش نہیں معلوم ہوتے کہ حضرت غوث اعظم پر یہ افترا باندھتے ہیں اور اس بیچارے سید کا بھی خانہ خراب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی وہ ساری

بشارتیں محض شیطانی وساوس ہیں۔ بھلا حضرت (غوث اعظم) اس بات پر کس طرح راضی ہو سکتے ہیں؟ ان کا حکم تو یہ ہے کہ دنیا کی محبت بالکل دل سے نکل جائے اور خلوص وسچائی کے ساتھ عشقِ خداوندی حاصل کیا جائے، حرص و ہوس کا نام تک باقی نہ رہے۔ عبادت اور ریاضت کا طریقہ چھوڑ کر دنیا کے جال میں پھنسنا کہاں کی ہوشمندی ہے میری جانب سے تم اس سید سے کہنا کہ تم نے جو ارادہ کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم کو استقامت عطا کرے، اگر تمھارے دل میں اس دنیائے فانی کی لذتوں کا ذرا سا شائبہ بھی رہ گیا ہے تو پہلے تم اس کو دور کرنے کی فکر کرو اور اس نادان جماعت کے بہکانے سے مغرور ہو کر بے راہ نہ ہو جاؤ۔ طالب دنیا کا منتہا و مقصود صرف سلطنت ہے جو چند روزہ اور فانی ہے، طالبِ عقبیٰ کو آخرت کی جاوداں نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اگر خدا کا طالب اپنے مطلب سے محروم رہ کر حسرت ہی میں رہ جائے تو اس کی ناکامی اول الذکر کی کامیابی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں اُنھوں نے بڑی نصیحت آمیز باتیں کیں جنھیں سُن کر حاضرین پر ایسا اثر ہوا کہ سب بے اختیار رونے لگے، مَیں بھی وہاں سے روتا اور آنسو بہاتا رخصت ہوا۔

اس زمانہ میں الغ بیگی مرزاؤں کی شورش کی وجہ سے شیر گڑھ سے لاہور تک کا راستہ خطرناک ہو گیا تھا اور میں تنہا تھا، اس لیے آپ نے اپنے ایک خادم کو میرے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شیخ ابو اسحاق مہرنگ کی خدمت میں جو حضرت کے بڑے عمدہ خلیفہ تھے پہنچا دے۔ پھر وہ مجھے حسین خان کے لشکر میں جو طلینہ سے لاہور آیا ہوا تھا اور وہاں سے کانت وکولہ جانے والا تھا، پہنچا دیں۔

غرض میں لاہور پہنچ کر حسین خاں کے لشکریوں کے ساتھ ہندوستان روانہ ہو گیا۔ ایک دن سہارن پور کی منزل میں ایک باغ میں بیٹھا ہوا حضرت کی یاد میں ملول تھا کہ ایک مسافر قادری پیراہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ "یہ لے لو ایک بزرگ پیر کے ہاں سے یہ مجھے حاصل ہوا تھا اور مجھے اس کے عوض کچھ راستہ کا خرچ دے دو"۔ میں نے اس سے جب اس کُرتے کے ملنے کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں میرزا ابراہیم حسین کے لشکر میں تھا جب اُسے شکست ہوئی تو سپاہیوں کا ایک گروہ جس میں میں بھی تھا لٹ گیا اس حال میں کہ پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں رہے تھے شیر گڑھ میں حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں پہنچا، اُنھوں نے ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عنایت کیا۔ جب میری باری آئی تو یہ کُرتا اپنے بدن سے اُتار کر مجھے دے دیا۔ میں نے اس کو پہننا بے ادبی جانا اور ہدیہ و تحفہ کے طور پر اسے محفوظ رکھے رہا۔ اب وہ میں تمھیں دے رہا ہوں۔ میں نے یہ ہدیۂ غیبی اس سے لے لیا ؎

نکہت پیراہنت آمد بہ من لذت جاں یافتم زاں را نچہ
خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا شد قبول الحمد اللہ فاتحہ

مجھے حضرت کی وہ بات یاد آگئی کہ فرمایا تھا کُرتا بھی اپنے وقت پر تم کو مل جائے گا"۔ بلاشبہ یہ آپ کی کرامت تھی۔ میں اس پیراہن یوسف کو جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں ؎

شوق تو در ضمیرم و مہر تو در دلم با شیر اندروں شد و با جاں بدوں شود

شیخ داؤد جہنی وال اپنے وقت کے قطب، صاحب کشف و کرامات تھے۔ آپ نے بڑی بڑی ریاضتیں اور سخت مجاہدے کیے تھے۔ ابتدا میں علوم ظاہری حاصل کیا اور ان کی تعلیم بھی دی۔ پھر ایسے متوکل اور خانہ نشین ہوئے کہ کبھی اہل دنیا سے ملنے نہیں گئے۔ صرف ایک بار شیر گڑھ سے گوالیار وہ بھی اسلیم شاہ کے طلب کرنے پر گئے تھے۔ اکبر بادشاہ جب پٹن کو گیا تو اس نے شہباز خاں کو شیخ کے بلانے کے لیے بھیجا تاکہ وہ ملاقات کا موقع دیں، لیکن آپ نے عذر فرمایا کہ ہماری غائبانہ دعا ہی کافی ہے۔ غرض آپ دنیاداروں کی صحبت سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور الفقر فخری پر عمل کرکے ہمیشہ بخشش و ایثار سے کام لیتے تھے جو طالبانِ حق آتے اُن کو تلقین و ارشاد فرماتے۔ جو شخص بھی حضرت کی صحبت میں پہنچ گیا وہ آپ کے فیض روحانی سے مستفید ہو کر لوٹا

آپ نے ۹۸۲ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات —"یا شیخ داؤد ولی"— ہے

شیخ ابن امروہہ

سالک طریقت اور مجذوب تھے۔ اس حالت جذب کے باوجود شریعت کے لوازم ترک نہیں ہوتے تھے، ذرا ذرا سی پابندی کا بھی اہتمام رہتا تھا۔ ان کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ آزادانہ زندگی گزاری۔ لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے۔

جس زمانہ میں میں میاں شیخ داؤد سے مل کر پنجاب سے واپس ہوا تھا اور امروہہ کے راستے بدایوں جا رہا تھا تو حضرت کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اس وقت وہ کسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوئے بغیر کلام پاک کی ایک آیت بیان کر رہے تھے۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتے تھے۔ اُنھوں نے اس وقت جزا اور صبر کرنے والوں کے اجر کی فضیلت بیان کی اور اس سلسلہ میں آیت "والباقیات الصالحات میری طرف دیکھ کر تلاوت کی۔ اس تلقین کا مطلب جلد ہی ظاہر ہوا۔ ان کا اشارہ کسی مصیبت کی طرف تھا، چنانچہ میری ایک بچی تھی جس کو میں بہت چاہتا تھا میں ابھی اسی سفر میں تھا کہ وہ بدایوں میں فوت ہوگئی۔ ان کے وہ تسلی آمیز ارشادات غالباً میرے ہی لیے تھے۔ واللہ اعلم

ان کی وفات ۹۸۰ھ میں ہوئی۔

خواجہ عبدالشہید

یہ خواجگا خواجہ کے صاحبزادے اور خواجگا خواجہ حضرت خواجہ احرار کے لڑکے ہیں جس وقت خواجہ عبدالشہید پیدا ہوئے تو لوگ انھیں خواجۂ احرار کی خدمت میں لے کر گئے۔ حضرت نے ان کو گود میں لے کر فرمایا: "مردِ حق آگاہ بنے گا۔

خواجہ عبدالشہید ظاہری اور باطنی کمالات کا مجموعہ تھے۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ ان کی شخصیت انسانی کمالات کا آئینہ تھی۔ خلق خدا نے ان کی تلقین و ہدایت سے بڑا فیض اُٹھایا۔ وہ طریقۂ سلوک میں حضرت خواجہ احرار کے قدم بقدم چلتے تھے۔

سمرقند سے ہندوستان آکر یہاں اٹھارہ سال تک بسر کیے۔ ۹۸۲ھ میں فرمایا کرتے تھے "ہماری رحلت کا وقت قریب آچکا ہے اور یہ ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم اپنی ہڈیوں کو سمرقند میں اپنے آبائی قبرستان میں پہنچا دیں"۔ چنانچہ وہ سمرقند کے لیے روانہ ہوگئے، جس وقت وہ کابل پہنچے تھے تو میرزا شاہرخ نے کابل والوں کو اسیر کر لیا تھا اور بدخشاں جا رہا تھا۔

خواجہ صاحب کی سفارش سے تقریباً دس ہزار آدمی ظالموں کی قید سے رہائی پا گئے۔

خواجہ صاحب سمرقند پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ مدفون ہوئے۔ خواجہ صاحب کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ ان کی کرامتوں کا ذکر کر کے ان کے مراتب کو ظاہر کیا جائے۔

میں نے حضرت کا دیدار اس وقت کیا تھا جب کہ لشکر شاہی پٹنہ سے واپسی میں بھون گاؤں اور پٹیالی کی حدود میں پہنچا تھا۔ آپ اکبر بادشاہ سے وداع ہونے کے لیے تشریف لائے تھے۔ میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھا۔ ملاقات اور گفتگو کی سعادت نصیب نہیں ہوئی +

شیخ ادہن جون پوری

چشتی سلسلہ میں اپنے والد شیخ بہاؤالدین کے مرید تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مقتدر اور پیشوا تھے، طویل عمر پائی۔ ان کی زندگی عمر طبیعی سے بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ ان کے لڑکے تک ان کے سامنے ستر ستر اسّی اسّی برس کے ہو گئے۔ اسی طرح پوتوں کی بھی ان کی زندگی میں بڑی عمر ہوئی۔

شیخ ادہن نے اپنی ساری زندگی عبادات اور حصول معرفت میں گزار دی۔ علوم ظاہری بھی انھوں نے بہت حاصل کیے تھے لیکن کبھی درس نہیں دیا۔ سماع کا بڑا ذوق تھا۔ آخر عمر میں جسمانی کمزوری کی وجہ سے وضو بنانے اور نماز پڑھنے اور ضروری حاجتوں کے لیے خادموں کی مدد کے بغیر اُٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس حال میں بھی اگر راگ کی آواز کان میں پڑ جاتی تو سماع کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے، پھر ان پر ایسا حال آتا کہ چند آدمی بھی مل کر ان کو بہ مشکل سنبھال سکتے۔ فرض نماز کے ادا کرنے میں بھی یہی حال تھا۔ سنت اور نفل تو بیٹھ کر پڑھ لیتے لیکن فرض کھڑے ہو کر ادا کرتے تھے اور کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔

مشہور ہے کہ ان سے کرامتیں اس بے تکلفی سے صادر ہوتی رہتی تھیں جیسے روزمرہ کی بشری ضروریات۔ انھیں اللہ نے بکثرت اولاد دی۔ محفل میں جب وہ اپنے ہوش مند سفید سفید داڑھی والے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو آنے والا بڑے شبہ میں پڑ جاتا کہ ان بڈھوں میں سے حضرت کون ہیں اور ان کے لڑکے کون۔

اپنی محفلوں میں طریقت و حقیقت کے باب میں ایسی گہری باتیں بیان کرتے تھے کہ عوام تو عوام خواص بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بوالہوس ان اسرار و رموز کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ ان کی یہی رمز بیانی ان کے متعلق شبہ کا باعث ہو گئی تھی۔

اکبر پہلی بار جب باغیوں کی سرکوبی کے لیے جون پور گیا تھا اور جون پور تین دن کے راستہ پر رہ گیا تھا کہ شیخ کا جون پور میں انتقال ہو گیا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے محروم ہی رہا۔

وفات ۹۷۰ھ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات "شیخ ادہن" سے نکلتی ہے +

شیخ عبدالغفور اعظم پوری

اعظم پور سنبھل کا ایک ماتحت قصبہ ہے۔ شیخ موصوف شیخ عبدالقدوس چشتی کے مرید ہیں۔ ظاہری اور باطنی کمالات کا مظہر تھے۔ بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے حضور اکرمؐ کی طرح توفیق خداوندی ان کے ہمراہ رہتی تھی۔ ان کا تصرف واثر ملنے والوں پر بڑی جلدی

ہوتا تھا۔ اگر طالب کی اہلیت و مناسبت کمتر بھی ہوتی تو شیخ کی کشش بہت جلد اس کو آگے بڑھا دیتی اور وہ بے اختیار خدمت گزاری پر مائل ہو جاتا۔

اکثر اوقات دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ ان کا روح افزا کلام پریشان دلوں کی راحت بن جاتا تھا اور ان کی معجز بیان زبان بے قرار جانوں کے لیے مرہم کا کام کرتی تھی۔

حسن صورت اور حسن سیرت دونوں میں وہ اپنے عہد میں سب سے ممتاز تھے۔ مرید کیا کرتے تھے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تصوف کے موضوع پر کئی ایک رسالے بھی لکھے تھے۔ بلاشبہ شیخ کے ظاہری اور روحانی کمالات میں کوئی کسر نہیں تھی۔

آپ نے ۹۷۵ھ میں رحلت فرمائی اور اعظم پور میں دفن ہوئے۔

میاں وجیہہ الدین احمد آبادی

یہ علوی نسب سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے نسب کو انھوں نے مسافر ہونے کی وجہ سے شہرت نہ دی۔ اپنے زمانہ کے بڑے عابد و متقی عالم تھے۔ شریعت کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ گوشہ نشینی ان کا شعار تھا۔ ہمیشہ دینی علوم کے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام عقلی اور نقلی علوم پر قدرت و عبور حاصل تھا، چنانچہ "صرف ہوائی" سے لے کر "قانون" "شفا" "شرح مفتاح" اور "عضدی" جیسی کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ ایک مخلوق ان کے علمی افادہ سے فیض اٹھاتی رہی۔

اللہ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور رستگاری بھی تھی، چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے۔ ان کی دعا کا بھی بڑی جلدی اثر ہوتا تھا۔ وہ کبھی اپنے طور پر دنیا دار اصحاب کے گھر نہیں گئے، بجز ایک دو بار کے، وہ بھی طلب کرنے پر نہایت استکراہ کے ساتھ۔ اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے لیے بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ ان کا گھر ادنیٰ و اعلیٰ سب کا مرکز و مرجع تھا۔

وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر ہی قانع رہتے تھے۔ جو کچھ نذر نیاز آتی وہ خیرات کر دیتے تھے۔

ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت و ارشاد حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے، اُنھی کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی۔ صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔

سلطان محمود گجراتی کے عہد میں جب شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات گئے تو شیخ علی متقی نے جو نہ صرف اس عہد کے بہت بڑے عالم تھے بلکہ دربار سرکار میں بھی ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا، ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ سلطان نے اس فتویٰ کو میاں وجیہہ الدین کے دستخط و تصدیق پر منحصر کر دیا۔ چونکہ میاں وجیہہ الدین شیخ محمد غوث کے گھر جا چکے تھے اور پہلی ہی بار ان کے شیدا و فریفتہ ہو گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس فتویٰ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ جب شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے ہوئے میاں کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے، کہا آپ آخر کس لیے بدعت اور دین میں رخنہ اندازی کے حامی

بن گئے ہیں؟" اُنھوں نے جواب دیا "ہم اہل قال میں سے ہیں اور شیخ محمد غوث ارباب حال میں سے، ہم ان کے اعلیٰ کمالات کو نہیں سمجھ سکتے اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔"

شیخ محمد غوث گوالیاری سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رہی ہے اس کا سبب یہی واقعہ تھا۔ میاں صاحب کے اس رویہ کی وجہ سے شیخ موصوف پھانسی پانے سے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے۔ ظاہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق پر ایسی جیسے ہمارے پیر (یعنی شیخ محمد غوث) کی نظر ہے۔

میاں وجیہہ الدین کا انتقال ۹۹۸ھ میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات "وجیہہ الدین" سے نکلتی ہے۔ واضح رہے ان چار بزرگوں سے جن کا ذکر کر آیا ہوں مجھے ملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

میاں عبداللہ نیازی سرہندی

نیازی پٹھانوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ میاں عبداللہ پہلے شیخ اسلیم چشتی فتح پوری کے مرید تھے۔ آپ اس حجرہ میں جو نئی خانقاہ کے متصل ہے اور اب وہاں عبادت خانہ شاہی کی عمارت بنی ہوئی ہے، ہمیشہ معتکف رہا کرتے تھے۔

جس وقت شیخ اسلیم پہلی بار براہ خشکی حج کے سفر پر گئے تھے، وہاں سے لوٹ کر آئے تو میاں عبداللہ نے شیخ سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے ان کو رخصت کرتے ہوئے ان تمام شیوخ و اہل اللہ کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک تذکرہ دیا جن سے شیخ نے عرب عجم اور ہندوستان میں ملاقات کی تھی۔ میاں عبداللہ نے بہت سے شہروں کی سیاحت کی اور ان مشائخین سے ملاقاتیں کیں۔

سید محمد جون پوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ میاں عبداللہ کا گجرات اور دکن میں اس سلسلہ سے تعلق ہوا اور اُنھوں نے اسی مسلک کو اختیار کرلیا۔ بیانہ میں آکر کچھ عرصہ تک گوشہ گمنامی میں دنیا سے بے تعلق ہوکر زندگی بسر کرتے رہے۔

جب بیانہ کے شیخ علائی کی تحریک کا غلغلہ بلند ہوا تو اسلیم شاہ نے مخدوم الملک کے بہکانے سے میاں عبداللہ کو بھی سخت ایذائیں دیں اور اُنھیں بری طرح پٹوایا گیا۔ وہ مرتے مرتے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ دنیا کی سیاحت کے لیے نکل گئے۔

آخر عمر میں میاں عبداللہ نے مہدوی عقائد کو ترک کر دیا تھا اور سرہند میں عزلت گزیں ہو گئے تھے۔ تمام مشائخین کی طرح سلوک و طریقت پر کاربند تھے۔

جس زمانہ میں اکبر نے فتح پور میں ان کے حجرہ کو جو محل شاہی سے متصل تھا تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا تھا تو اسی سلسلہ میں میاں عبداللہ کا حال اکبر کو معلوم ہوا تھا۔ اکبر نے ان کو سرہند سے بلا کر تنہائی میں گفتگو کی اور ان کے حالات دریافت کیے۔ اس وقت اُنھوں نے مہدویت سے انکار کرکے کہا، چونکہ پہلے یہ جماعت مجھے اچھی معلوم ہوئی تھی اس لیے میں نے اس مسلک کو اختیار کرلیا تھا، جب مجھے حقیقت کا پتہ چلا تو میں نے اس سے دست برداری کرلی۔

اکبر جب ۹۹۳ھ میں اٹک جاتے ہوئے سرہند پہنچا تو انھیں دوبارہ طلب کرکے ملاقات کی اور ان کی مدد معاش کے لیے

اراضی کی پیش کش کی۔ اُنھوں نے توکل و قناعت کی وجہ سے اس کو قبول نہ کیا لیکن اکبر نے فرمان لکھوا کر ان کے حوالہ کر ہی دیا۔ اُنھوں نے مجبوراً وہ فرمان لے لیا لیکن توکل و قناعت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اس اراضی سے مرتے دم تک کوئی استفادہ نہ کیا۔ ان کے سارے عمل کا انحصار "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" پر تھا۔

الغ میرزا کی بغاوت کے زمانہ میں میں محمد حسین خاں کے ہمراہ تھا اس وقت ان سے میں نے سرہند جا کر ملاقات کی تھی۔ ان کے سامنے "احیاء العلوم" کھلی ہوئی تھی۔ اس کے چند مضامین انھوں نے بیان کیے۔ اس وقت محمود خاں ان کے ایک شناسا آئے جو اسلیم شاہ کے عہد سے ان کی مصاحبت میں تھا اور شیخ علائی کی تحریک کے وقت میاں نے اسے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ میاں صاحب سے پوچھا "دل کیا ہے؟" اُنھوں نے جواب دیا "دل سے ہمارا فاصلہ ہزاروں منزلوں کا ہے اس کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ اخلاق و عمل کی باتیں دریافت کرو"۔ اس کے بعد ایک بوڑھے مغل نے کسی ذکر میں میر سید محمد جون پوری کی مہدویت کا مسئلہ چھیڑ دیا اور ان سے تصدیق و شہادت طلب کی۔ اُنھوں نے کہا "جس وقت میر سید محمد جون پوری نے رحلت فرمائی تھی میں فراہ میں حاضر تھا، انھوں نے مہدویت کے دعویٰ سے انکار کیا تھا اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا" میں مہدی موعود نہیں ہوں"۔ واللہ اعلم۔ ان کی بات سن کر محمود خاں نے آہستہ سے کہا میاں عبداللہ نے بھی اچھا کام کیا کہ مہدویت کی حمایت کرکے بیچارے شیخ علائی کی گردن کٹوا دی اور خود دامن بچا کر اس دائرہ سے نکل آئے۔

میاں عبداللہ نے بعمر نوے سال ۱۰۰۰ھ میں اس سرائے فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔

شیخ ابوالفتح گجراتی

یہ حضرت میر سید محمد جون پوری کے داماد تھے لیکن اُنھوں نے سید صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ رشتہ ان کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ یہ بڑے جاہ و جلال والے بزرگ تھے سلسلہ مہدویہ میں نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ تھے۔ مکہ معظمہ اور گجرات میں شیخ گدائی کے ساتھ ان کی خوب دوستی رہی تھی۔ بیرم خاں خانِ خاناں کے عہد میں کسی اہم کام کے سلسلہ میں آگرہ آ گئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد جب بیرم خاں کی بساط اُلٹ گئی تو وہ گجرات چلے گئے۔

میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاجی مہدی لاہوری کے داماد مولانا عبداللہ قندھاری کے ساتھ آدھی رات کے وقت شیخ کی خدمت میں پہنچا تھا وہ اس وقت آگرہ میں جمنا کے پار شیخ بہاؤ الدین مفتی کے محلہ میں مقیم تھے۔ اور ایک خالی حجرہ میں تنہا بیٹھے ہوئے کسی شغل میں مصروف تھے۔ ہم پہنچے تو اُنھوں نے حضور اکرمؐ کی یہ حدیث:
"لا یقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتھم الملائکۃ و غشیتھم الرحمۃ و نزلت علیھم السکینۃ و ذکرھم اللہ فیمن عندہ" پڑھی اور اس کی تشریح کی، پھر انھوں نے مجھے اس حدیث کے ذکر کی تلقین کی۔ میں نے کچھ عرصہ تک اس حدیث کا ذکر کیا اور واقعی میں نے اس کا بڑا اثر اور فیض محسوس کیا اور قرآن کا مطلب مجھ پر واضح ہو گیا۔ چند بار تو ایسا ہوا کہ جو بھی آواز میرے کان میں پڑتی تھی میں اسے ذکر ہی سمجھتا تھا۔

میں نے ان کے بعض مریدوں کو دیکھا کہ اُنھوں نے اپنے لبوں کو سریش لگا کر بند کر دیا تھا تاکہ بے فائدہ گفتگو سے بچے رہیں۔ بعض اس مطلب کے لیے مُنہ میں کنکریاں بھر لیا کرتے تھے۔

ان کی وفات کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کہاں ہوئی۔

شیخ ابواسحاق لاہوری

حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری میں مشہور تھے۔ اپنے آپ کو پیر کی محبت میں فنا کر رکھا تھا اور ایسی مناسبت پیدا کر لی تھی کہ دونوں ایک ہی مطلب کی دو عبارتیں معلوم ہوتے تھے۔ دنیا کے اُلٹ پھیر سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور دل میں خداطلبی کا جذبہ جاگ جاتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

ان کے بس دو تین رفیق تھے جو ان کے پیر کے ہمراز اور ہمزبان تھے اور لاہور میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ کسی کو اپنے ہاں نہیں بلاتے تھے۔ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا، ہمیشہ ایک اندھیرے حجرہ میں جو ایک باغ میں تھا گوشہ نشین رہتے۔ جب کبھی حضرت میاں سے ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو لاہور سے پیدل نکل جاتے اور ایک رات میں چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے اور پیر کی آستاں بوسی کر کے بغیر ملے اُسی وقت لوٹ جاتے۔ کیوں کہ ان کو میاں صاحب کے دیدار کی تاب نہیں تھی۔

ایک سال مَیں بھی ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کے ہاں ایک رات ایک دن مہمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک محافظ کے ساتھ روانہ ہو گیا حالانکہ وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا، راستہ میں راہزن اور لٹیرے میرا راستہ روک لیتے تھے اور حیران ہو کر پوچھتے تھے اس خطرناک جنگل میں تم تنہا کہاں جا رہے ہو۔ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میں میاں شیخ ابواسحاق کی خدمت سے حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں جا رہا ہوں تو وہ محض ان کا نام سن کر ہی احترام و عقیدت سے پیش آتے اور کھانے پینے کے لیے دودھ دہی وغیرہ لے آتے اور راستہ بتا کر احتیاط و حفاظت کے لیے حضرت میاں کے نام کے ذکر اور ورد کرتے رہنے کی تاکید کرتے۔ اس علاقہ میں حضرت کا نام ہر خاص و عام کے زبان زد تھا۔ غرض میں بحفاظت منزل پر پہنچ گیا۔

جس سال حضرت میاں نے وصال فرمایا تھا، ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پنجاب میں عام وبا پھوٹ پڑی تھی اسی وبا میں تین چار ماہ کے اندر اندر حضرت کے تمام اہل خاندان اور مشہور خلفاء جو تقریباً پچاس ساٹھ آدمی تھے جن میں ترجمان اسرار میاں عبدالوہاب جن کو "میاں بالو" بھی کہا جاتا تھا شامل تھے ایک کے پیچھے ایک اس دنیا سے رخصت ہو کر حضرت سے جا ملے۔ حضرت کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد میاں شیخ ابواسحاق بھی انتقال فرما گئے۔

میاں شیخ داؤد کے بعد سلسلہ علیہ قادریہ کے نام لیوا ان کے صاحبزادے میاں شیخ عبداللہ رہ گئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس سلسلہ کے گدی نشین میاں شیخ ابوالمعالی ہیں ؎

سلام اللہ ما کر اللیالی
علی الشیخ الصفی ابی المعالی

شیخ رکن الدین شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادے ہیں۔ قلم ان کے علم و کمال کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے جو "مکتوبات قدسی" جمع کیے ہیں وہ ان کی فضیلت کا واضح ثبوت ہیں گنگوہ تھانیسر کے نواح میں ایک قصبہ ہے، یہی قصبہ ان کا وطن ہے۔

یہ بڑے صاحب مرتبہ بزرگ ہیں۔ ان کے بشرہ سے ہی ان کے کمالات جھلکتے ہیں۔ تصوّف میں ایک خاص شان کے مالک ہیں۔ ان کے سلوک کا معاملہ ان کے شیوخ کے طریقہ پر ہے۔ ذوق وحال سے بڑی مناسبت ہے۔ امراء وحکام کے گھر شدید ضرورت کے علاوہ نہیں جاتے۔ ہمیشہ گوشہ نشین رہتے ہیں۔ میں نے انھیں بیرم خاں کے ہنگاموں کے وقت دہلی میں شیخ عبدالعزیز کی محفل میں دیکھا تھا۔

میاں مصطفیٰ گجراتی وہ اس بوہرہ فرقہ کے فرد تھے جو گجرات میں تجارت کرتا ہے۔ میر سید محمد جون پوری کے ایک مرید کے مرید ہوئے اور فقر و فنا کا راستہ اختیار کر لیا اور مرتے دم تک اسی راہ پر گام زن رہے۔

جب اکبر بادشاہ بنگالہ کی تسخیر کے بعد پٹنہ سے لوٹ کر اجمیر گیا تھا تو حسب الحکم آصف خاں ثانی میر بخشی ان کو گجرات سے اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا۔ اکبر نے ایک رات دیوان خانہ کے صحن میں علماء کی مجلس منعقد کی اور شیخ مصطفیٰ سے مہدویت کے مسئلہ کی تحقیق چاہی۔ انھوں نے جواب دیا اور علماء سے ان کا بڑا طویل مناظرہ ہوا۔ اس بحث میں ابراہیم سرہندی نے اپنی منحوس عادت کے مطابق سخت کلامی سے کام لیا اور شیخ کو بڑی اذیت پہنچائی۔

میر سید محمد کے ایک مرید شیخ محمد لاہجی نے ایک کتاب "شرح گلشن" تصنیف کی تھی اور خود بھی مہدویت کا دعویٰ کر کے بڑے فتنے برپا کیے تھے۔ اس بحث کے دوران میں میں نے اس کتاب کے مضمون کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا۔ یہ بات چونکہ شیخ کے مدعا کے خلاف پڑتی تھی اس لیے ان کو مجھ سے غالباً رنجش ہو گئی ہوگی۔ جب بادشاہ فتح پور پہنچ گئے تو ان کے لیے حکم صادر ہوا کہ وہ چند دن تک خواجہ عبدالصمد مصور شیریں قلم کے گھر مقیم رہیں۔ اس وقت میں ان کے ہاں معذرت خواہی کے لیے گیا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔

اس وقت وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اسی محفل میں ان کے لیے طشت لایا گیا ان کے منہ سے بہت سا خون گرا۔ جب ان کو گجرات جانے کی اجازت مل گئی تو وہ وطن پہنچنے کے بعد یا راستہ ہی میں انتقال فرما گئے۔

یہ واقعہ ۹۸۳ھ میں ہوا۔ ان کے مکتوبات ان کی یادگار ہیں، جو فقر وفنا، سوز وساز سے بھرے ہوئے ہیں۔

شیخ اسحاق کاکو لاہوری ان کے والد کا نام شیخ کاکو تھا۔ لاہور والے شیخ اسحاق کی ولایت کے معتقد ہیں۔ یہ بڑے صاحب علم، متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے دروازہ پر نہیں گئے نہ کسی سے حاجت چاہی۔ ہمیشہ درس وتدریس میں مصروف رہتے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی

اس وقت تک از خود بات نہیں کرتے تھے۔

ایک دن ایک نامعقول شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا ایک مٹی کا دیگچہ ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا اس کو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلا تامل و انکار اسے سر پر اُٹھا لیا اور بازار سے اس کے مکان تک لے جا کر پہنچا دیا۔ اُسی دن سے اس شخص کے دل کا کھوٹ نکل گیا اور دنیاداری چھوڑ کر وہ آخر کار عالم دین بن گیا۔

میں نے ۹۹۵ھ میں شیخ موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔ ایک دن میں نے شیخ فیضی سے جسے انہی دنوں ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا مذکورہ بالا حکایت بیان کی۔ فیضی نے جیسا کہ اس کی عادت تھی کہ وہ ماضی و حال کے تمام علماء و مشائخ کا مذاق اڑاتا رہتا تھا، حضرت کی بھی مذمت کرنے لگا۔ اس کی باتوں پر میں صبر کر کے خاموش ہو رہا۔ ٹھیک یاد نہیں وہی رات تھی یا دوسری، میں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ ابوالفضل ایک جنگل میں ٹھہرا ہوا ہے اور ایک پرانے کھنڈر میں جس کی بس دو تین دیواریں کھڑی ہوئی تھیں شیخ اسحاق ان توپچیوں کی جماعت میں ہیں جو ہر چاند رات کو بادشاہی اعزاز میں بندوقیں سر کرتے ہیں۔ انھوں نے بندوق اٹھا کر میری طرف چلا دی اور میرے چاروں طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ یہ دیکھ کر میں خوف سے جاگ اٹھا۔ دوسرے ہی دن میں شیخ کی خدمت میں نذر لے کر گیا جسے آپ نے قبول فرما لیا۔ میں نے اپنا یہ قصہ بیان کیا تو کچھ نہ کہا، دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

وہ لاہور کے بہت سے مشہور علماء کے اُستاد ہیں جیسے شیخ سعداللہ جو اپنے زمانہ کے بے مثل عالم ہیں اور شیخ منور وغیرہ۔

جوانی میں حضرت شکار کے بڑے شوقین تھے چنانچہ جب بھی سبق پڑھانے سے فارغ ہوتے، باز عقاب وغیرہ لے کر شکار کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور شکارگاہ میں پیدل ہی گھومتے رہتے۔

ان کی عمر سو سال سے زیادہ ہوئی۔ ۹۹۶ھ میں انتقال فرمایا۔

شیخ سعداللہ بنی اسرائیل

شیخ اسحاق کاکو کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی زندگی مختلف کیفیتوں سے گزری۔ ابتدا میں شریعت کے بڑے پابند تھے۔ پھر اچانک سب چھوڑ ایک گانے والی کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور باوجود سفید داڑھی کے آوارہ گردی کرتے رہے۔ ے

زیں پیش اگرچہ خلق گرفتی زما سبق
عشق آمد و نماند نشانی زما سبق

ان کا تو عشق نے یہ حال کیا اور لوگ خوش عقیدگی کی وجہ سے اسے بھی ایک حال جان کر ان کو ولی سمجھنے لگے۔

اس واہی تباہی حالت میں عین نخاس میں کھڑے درس دینے لگ جاتے تھے، جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے اپنے اس محبوب کے پیچھے لٹا دیا۔ ایک رات وہ اس کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ محتسبوں کی ایک جماعت نے ان کے طلباء کے ساتھ چھاپہ مارا اور دیوار پر چڑھ کر گھر میں داخل ہوئے۔ لہو و لعب کا سارا سامان توڑ دیا۔ اصلاح کی خاطر انھیں سزا دینا چاہتے تھے کہ انھوں نے ان لوگوں سے وہی بات کہی جو کسی نے خلیفہ ثانی امیرالمومنین حضرت عمرؓ سے کہی تھی کہ "میں نے

ایک کام خلافِ شرع کیا اور تم لوگ تین غیر مشروع کاموں کے مرتکب ہوئے ہو، اس لیے تم مجھ سے کہیں زیادہ سزا کے مستحق ہو۔ ایک تو یہ کہ تم نے میری برائیوں کی ٹوہ لگائی، دوسرے اجازت نہیں لی، تیسرے دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوئے۔" یہ سُن کر وہ لوگ نہایت خجل و شرمندہ وہاں سے لوٹ آئے۔

کچھ عرصہ بعد انھوں نے ان بداعمالیوں سے توبہ کر لی اور "احیاء العلوم" کو اپنا دستور العمل بنا کر ہمیشہ عبادتوں اور ریاضتوں میں بسر کرنے لگے۔

انھوں نے نہایت مفید اور بلند مرتبہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیف "جواہر القرآن" پر ایک شرح بھی لکھی تھی۔

اکبر نے ان کو خلوت میں بلا کر گفتگو کی تھی اور ان سے پوچھا کہ تم کس قوم کے ہو؟ انھوں نے برجستہ کہا لکھنے والوں کی قوم سے جن کو ہندی زبان میں کائستھ کہتے ہیں۔ ان کی یہ بے تکلفی بادشاہ کو بڑی پسند آئی اور کافی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔

میں نے پہلی بار ان سے لاہور میں ملاقات کی تھی۔ کسی موضوع پر ملتان کی بربادی لاہور کے آباد ہونے سلاطین لنگاہ خاص طور سے سلطان حسین کا قصہ انھوں نے اس دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ میں ان کی فصاحت اور واقعات کے تجزیہ و تنقید سے حیران رہ گیا۔ گفتگو کی یہ حلاوت اور شیرینی میں نے مشکل ہی سے کسی میں پائی۔

وہ نہایت فیاض طبع انسان تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں جاتا تھا۔ ان کی نہ تو تجارت تھی نہ زراعت بادشاہ کی طرف سے کوئی مدد معاش بھی نہیں ملی تھی، کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ آمدنی کے بغیر وہ اس قدر ایثار و فیاضی کس طرح کرتے ہیں۔ لوگ اس معاملہ میں ہمیشہ حیران ہی رہے۔

تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کے جنازہ میں چھوٹے بڑے ہزاروں آدمی شریک تھے اور بڑی عقیدت سے کاندھا دے رہے تھے۔

میاں شیخ عبداللہ بدایونی

میاں صاحب اپنے زمانہ کی ایک زندہ نیکی اور اللہ کی برکت ہیں۔ بچپن میں جب وہ بوستاں پڑھ رہے تھے تو اس شعر پر پہنچے ؎

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ

اُنھوں نے استاد سے کہا اس شعر کا مطلب ہندی زبان میں بتا دیجیے۔ اُستاد نے کہا تجھے اس حکایت سے کیا غرض؟ آپ نے فرمایا، جب تک آپ اس کا مطلب ذہن نشین نہیں کرائیں گے میں آگے سبق نہیں پڑھوں گا۔ جب معلم نے اس کے معنی بتا دیے تو انھوں نے حضور اکرمؐ کے متعلق پوچھا کہ وہ کون تھے؟ اُستاد نے حضور اکرمؐ کے کچھ حالات اور معجزے بیان کیے۔ بس اتنا سنتے ہی ایک جذب سا ان پر طاری ہوا، اپنا کرتہ پھاڑ دیا اور کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس واقعہ کی جب ان کے والدین کو خبر ہوئی تو دوڑے آئے لیکن جب دیکھا کہ ڈرانے دھمکانے سے وہ اپنے خیال سے نہیں ہٹیں گے تو انھیں

ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ اپنے آبائی وطن سامانہ سے قرآن سیکھنے، احکام دین معلوم کرنے کی خاطر دہلی چلے آئے اور بڑے بڑے علماء و مشائخین کی صحبت سے فیض اٹھا کر اپنے زمانہ کے سربرآوردہ عالم بن گئے۔

شیخ عبدالباقی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، انہی سے ذکر کی تلقین حاصل کی، پھر شیخ صفی خیرآبادی اور دوسرے بزرگوں سے وابستہ رہے اور بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور طریقت و سلوک کا تکملہ کیا۔ اپنے زمانہ کے اکثر رہنماؤں سے فیض تربیت حاصل کیا، خاص طور سے میاں شیخ لادن دہلوی اور میر سید جلال بدایونی سے ان کو بڑی عقیدت رہی۔ میر سید جلال کی وفات کے بعد ان کے قائم مقام ہوئے اور برسوں بدایوں میں درس دیتے رہے بڑے بڑے مشہور عالم ان کی ہی مجلس درس سے نکلے ہوئے ہیں۔

دور دور سے لوگ استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آخر حال میں ان پر حالت جذب کا غلبہ رہتا تھا۔ مجلس سماع میں حاضر ہوتے تھے اور انتہائی جذب و شوق میں نعرہ لگا کر اٹھ کھڑے ہوتے اور چند قدم تک جھومتے جاتے لیکن رقص اور وجد کیے بغیر ہی اچانک لاحول پڑھ کر اپنی جگہ لوٹ کر کھڑے ہو جاتے۔

ایسی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ بزرگوں کی طرح اپنے گھر کی چھوٹی بڑی ضروریات خود ہی پیدل جا کر بازار سے خرید کر اپنے آپ ڈھو کر لے آتے۔ راستہ میں طالب علموں کو سبق بھی پڑھاتے جاتے۔ ان کے شاگرد بہت کہتے کہ حضرت تکلیف نہ کیا کریں ہم یہ خدمت بجا لاتے ہیں، وہ قبول نہیں کرتے تھے۔

ان کے چہرۂ مبارک پر فقر و فنا کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان کو اپنے بزرگوں سے تلقین و ارشاد اور سند خلافت ملی ہوئی ہے لیکن پیری مریدی کے جھگڑے میں نہ پڑے بلکہ اس سے دور ہی بھاگتے ہیں۔

میں ان کے پاس کلام، تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ نہایت ذہین اور مخلص شاگرد شریک درس رہا کرتے تھے اور سبق پڑھتے ہوئے بڑی الجھی ہوئی اور دقیق بحثیں اٹھاتے تھے۔ میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا کہ ان اونچی بحثوں اور گہرے نکات کے حل و افادہ میں انھیں کسی کتاب کے دیکھنے کی حاجت ہوئی ہو۔ تمام علمی نظریے ان پر بخوبی روشن تھے اور حل و تحقیق کا بڑا ملکہ حاصل تھا، خدا کی تائید و توفیق بھی ان کے ساتھ تھی۔

اس وقت ان کی عمر نوے سال ہے +

شیخ جلال الدین قنوجی

ایک مجذوب اور سالک تھے۔ ان کے بزرگ ملتان سے آکر ہندوستان کے قدیم شہر قنوج میں مقیم ہو گئے تھے۔ سلوک کا مرحلہ طے ہوا تو حالت جذب طاری ہو گئی مگر اس حال میں بھی اتباع شریعت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

جب کبھی ان پر حال آجاتا تو وہ منہ کالا کر کے چارپائی کی رسی گردن میں ڈال کر بازاروں میں گھومنے لگتے اور بڑی درد انگیز آواز میں فریادیں کرتے رہتے، اس قسم کی حرکتیں ان سے اکثر سرزد ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دن مسجد حرم میں نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد میں ان کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اٹھ کر صحن مسجد میں اپنے بزرگوں کی قبروں کی طرف چلے گئے۔ ایک خادم ان کے ساتھ تھا۔ ہر قبر پر علیحدہ علیحدہ فاتحہ پڑھی اور خادم سے ہر

ایک کا حال بیان کرتے رہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے فرائض میں سے ایک مسئلہ اس خادم سے پوچھا، اس نے جواب دیا کہ کوئی شخص مر جائے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث چھوڑ جائے تو لڑکے کو میّت کے ترکہ میں سے دو حصے اور لڑکی کو ایک حصہ ملے گا۔" مسئلہ بڑی توجہ سے سُنا اور پھر کچھ کہے بغیر چلے گئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ اس حدیث کے مطابق کہ "قبروں پر علم فرائض کا کوئی مسئلہ کہا جائے اور ورثہ کی تقسیم کا ذکر کیا جائے تو اس کی برکت سے تمام اہل قبور کی مغفرت ہو جاتی ہے۔"

حضرت کا یہ معمول رہتا تھا اور کسی جمعہ کو ترک نہیں کرتے تھے۔

شیخ کپور مجذوب گوالیاری حسینی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے سپاہ گری پیشہ تھا۔ اچانک نوکری چھوڑ کر سقہ گیری کا کام شروع کر دیا۔ راتوں کو پردہ نشین بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچایا کرتے تھے۔ لوگوں کو بغیر اُجرت کے پانی دے دیتے تھے۔ اسی حال میں ان پر جذب طاری ہو گیا۔ کسی سے نہیں بولتے تھے۔ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہتے تھے ؎

می شدم دست بدیوار زضعف از کوئیت

آمدی جلوہ کناں صورت دیوار شدم

گوالیار کے بازار کے سرے پر ایک جگہ کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس جگہ ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں نظر آتے تھے۔ اگر حاضرین میں سے کسی کے دل میں کوئی بات کے پوچھنے کا خیال آجاتا تو بے کہے ہی وہ ہذیان کی صورت میں بڑبڑاتے ہوئے اس کا جواب دے دیتے اور اس کی مشکل حل ہو جاتی۔ غیب کی باتوں کی خبریں بیان کرتے رہتے۔ راتوں کو ہمیشہ قیام کی حالت میں رہتے۔ کبھی روتے اور کبھی ہنستے۔

میں نے معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ ایران سے ایک سیّد نے آکر ان سے سیادت کا ثبوت مانگا تھا۔ جواب میں آپ نے لکڑیاں جمع کر کے آگ بھڑکانے کا حکم دیا۔ پھر اس سیّد کا ہاتھ پکڑ کر کہا آؤ ہم دونوں اس آگ میں داخل ہو جائیں تاکہ جھوٹ سچ ظاہر ہو جائے۔ سیّد تو سہم کر گھبرا گیا اور وہ آگ میں جا کر صحیح سلامت نکل آئے۔ ان کی ایسی بہت سی خوارق مشہور ہیں۔

۹۷۹ھ کو ایک رات سانپ سانپ چلاتے ہوئے دوڑے اور دروازہ پر سے نیچے گر پڑے اور اُسی وقت جان بحق ہو گئے۔ شیخ فیضی نے تاریخ وفات "کپور مجذوب" سے نکالی ہے۔

شیخ اللہ بخش گرمکتیسری دریائے گنگا کے کنارے سنبھل کے تحت گرمکتیسر ایک قصبہ ہے۔ شیخ اللہ بخش اسی قصبہ میں چالیس سال تک فقر و قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بڑے متوکل بزرگ تھے، ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔

ستر سال کی عمر میں آپ سنبھل تشریف لے گئے تھے۔ شیخ پنجو مرحوم سنبھلی کی ایک بوڑھی خادمہ جو بڑی عبادت گزار صائم الدہر اپنے وقت کی بی بی رابعہ تھی، ۳۵ سال سے شوہر کے بغیر زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہمیشہ افطار دودھ سے کیا کرتی

تھی۔ غائبانہ طور پر شیخ ممدوح کی معتقد ہو گئی اور ان سے درخواست کی کہ "مجھے خدا کا راستہ دکھا دیجیے"۔ آپ نے جواب بھجوایا کہ "جب تک تم حضور اکرمؐ کی پیروی نہیں کرو گی اور کسی سے نکاح نہ کرلو گی اللہ کے راستہ کی تلاش تمہارے لیے ایک وبال ہے۔" وہ اسی وقت پالکی میں بیٹھ کر حضرت کے پاس پہنچ گئی اور انہی سے اس کا نکاح ہو گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دونوں آخرت کی منزل کے لیے کوچ کر گئے۔ میں دہلی کے ایک معزز سید زادے سید قاسم کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے انھیں نہایت خوش کلام اور خوش باش پایا۔ جب ہاتھ دھونے کے لیے آفتابہ اور طشت آیا تو انھوں نے فرمایا "ان سید صاحب سے ابتدا کی جائے کیونکہ ہاشمی کو اولیت حاصل ہے"۔

شیخ عارف حسینی

یہ صاحب دعوت بزرگ شاہ اسمٰعیل صفوی کے پوتوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ جلی ہوئی جَو کی روٹی اور کڑوی کسیلی ترکاری سے افطار کر لیتے ہیں۔ ایسی غذا کوئی دوسرا نہیں کھا سکتا۔

شریعت کی پابندی کا بڑا اہتمام رہتا ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتے۔ چنانچہ دربار شاہی میں ابوالفضل کے بیٹھک کے بالکل ہی سامنے وہ بے جھجک پانچ وقت کی اذان کہتے ہیں۔ ان کی بہت سی کرامتیں لوگوں میں مشہور ہیں وہ کاغذ کی گول کترنیں جلتی انگیٹھی میں ڈال دیتے ہیں اور اس میں سے سکہ لگی ہوئی اشرفیاں نکال کر جتنے بھی حاضرین مجلس ہوں انھیں دے دیتے ہیں۔ اگر انھیں کسی حجرے میں مقفل کر دیا جائے تو وہاں سے غیر محسوس طور پر نکل کر کسی اور جگہ ظاہر ہوتے ہیں۔

جب گجرات سے لاہور آئے ہوئے تھے تو انھوں نے لوگوں کو جاڑے کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے جاڑوں میں دیے۔ اس کرامت پر پنجاب کے علماء خاص طور سے مخدوم الملک نے اعتراض کیا کہ یہ پھل ظاہر ہے لوگوں کے باغوں سے ہی ان کی اجازت کے بغیر حاصل کیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کا کھانا غیر شرعی اور حرام ہے۔ ان علماء کی وجہ سے جب لاہور میں ان کی نبھ نہ سکی تو وہ کشمیر چلے گئے۔

کشمیر کے حاکم علی خاں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی۔ اس نے اپنی لڑکی کا ان سے نکاح کر دیا۔ جب دیکھا کہ وہ ٹک کر رہنے والے آدمی نہیں ہیں تو ان سے لڑکی کا مہر دے کر طلاق دلوا دی اور شاہ عارف حسینی وہاں سے نکل کر تبت چلے گئے۔

تبت میں بھی ان کی کرامتیں بڑی مشہور ہیں۔ ایک عجوبہ یہ تھا کہ وہ درخت کو پکڑ کر ہلاتے تھے تو اس سے درہم دینار جھڑنے لگتے تھے۔ غرض گجرات، ہندوستان، کشمیر اور تبت میں ان کے بڑے تصرفات اور اثرات رہے ہیں۔ مگر جہاں جاتے تھے لوگ ان کے پیچھے پڑ جاتے تھے، اسی لیے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں نکل جاتے تھے۔

جس وقت اکبر بادشاہ کشمیر سے کابل کی طرف سفر کر رہا تھا شاہ صاحب نے اسی سفر میں اکبر سے ملاقات

کی تھی۔ اکبر نے ان پر محافظ اور نگران کار مقرر کردیے۔ جب بھی وہ اکبر کی ملاقات کو آتے تھے تو ایک زریں پیالے میں مشک کا نور اور دوسری تمام خوشبویات ڈال کر بطور تحفہ لے آتے تھے۔ اکبر نے ان سے بہت کچھ کہا کہ "آپ ہم سے کچھ سونا یا کوئی جاگیر قبول فرمالیں"۔ وہ ہر بار یہی جواب دیتے کہ "روپیہ تم اپنے احدیوں کو دو کہ وہ بدحال ہیں، میں لے کر کیا کروں گا"۔

میں ایک مرتبہ قلیچ خاں کے ساتھ ابوالفضل کی کچہری میں ملاقات کے لیے گیا۔ حضرت ابوالفضل کی ہی نگرانی اور حراست میں تھے۔ اس وقت وہ ابوالفضل کے بالاخانہ میں تھے۔ مُنہ پر نقاب ڈالے بیٹھے کتابت کررہے تھے۔ کہنے لگے "یہ قلیچ خاں ہے نا جو کہہ رہا تھا میں قلیچ ہوں تمھارا خادم اور غلام"۔

چہرہ چھپائے رکھنے کی عادت بہت پُرانی تھی۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جائیں تو کوئی انھیں پہچان نہ سکے۔ میں نے ایک قابل اعتماد مقرب سے سُنا ہے کہ کشمیر میں اکبر نے ایک دن شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کو شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ان لوگوں نے حسب الحکم ان سے پوچھا کہ "اگر آپ نقاب اُٹھا لیں تو کیا حرج ہے میں آپ کا دیدار کرلوں گا"۔ اُنھوں نے قبول نہ کیا اور کہا "ہم فقیر منش آدمی ہیں ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو، تکلیف نہ دو"۔ حکیم ابوالفتح بڑا شوخ اور بے باک آدمی تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر نقاب اتار لینا چاہا، شاہ صاحب نے اسے روک دیا اور نہایت غصہ میں آکر کہا "میں جذامی یا بدشکل نہیں ہوں لو میرا چہرہ دیکھ لو"۔ یہ کہہ کر گریبان پھاڑ ڈالا اور چہرہ سے نقاب آتار کر زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد کہا "حکیم تُو نے میرا چہرہ تو دیکھ لیا لیکن اس کا نتیجہ انشاءاللہ دو ہفتہ میں تیرے سامنے آجائے گا"۔ چنانچہ پندرہ دن پورے نہیں ہوئے تھے کہ حکیم ابوالفتح اسی سفر میں اسہال کے عارضہ میں فوت ہوگیا۔ ایسی کرامتیں بے شمار ہوتی رہی ہیں۔

ایک دن اکبر نے کہا "شاہ یا تو آپ ہمارے جیسے ہوجائیں یا ہم کو اپنے جیسا بنالیں"۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ "ہم بدنصیب اپنے آپ کو تمھارے جیسا کس طرح بنا سکتے ہیں، ہاں اگر تم چاہتے ہو تو ہمارے برابر آکر بیٹھ جاؤ تاکہ ہمارے جیسے بن جاؤ"۔

میر سید علاؤالدین اودھی بڑے عالی مقامات پر پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اللہ کی جیتی جاگتی نشانی تھے۔ ان کی کرامتیں اور کمالات نہایت روشن اور واضح تھے۔ لوگ ان کے عجیب و غریب خوارق بیان کرتے ہیں۔

صاحب کلام باذوق آدمی تھے۔ حقائق و معارف کو کبھی کبھی نظم میں بھی ادا کرتے تھے۔ ان کا یہ مطلع تو بہت مشہور رہا ہے ؎

ندانم آں گل خود رو چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنی گفتگوئے او دارد

ان کے ایک ترجیع بند کا بند حسب ذیل ہے ؎

کہ بچشماں دل مبیں جز دوست
ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست

شیخ عرفی نے اسی زمین میں کہا ہے ؎

کہ جہاں صورت است و معنی دوست
ور بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

کسی اور کا شعر ہے ؎

کہ جہاں پرتویست از رخ دوست
جملہ کائنات سایۂ اوست

اسی مضمون پر میرا بھی ایک شعر ہے ؎

اوست مغز جہاں جہاں ہمہ پوست
خود چہ مغز و چہ پوست چوں ہمہ اوست

ان کے دامن تربیت سے بڑے بڑے مشائخ اُٹھے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ میر سید ماہرو اپنے والد کے قدم بقدم نظر آتے ہیں۔ ایک اور مرید میر سید علی سلہری تھے جو بڑے صاحب حال تھے۔ ہمیشہ روپوش رہتے تھے۔ ان کا فقر بھی ایک خاص شان رکھتا تھا۔ تصوف کے مضامین بڑی عجیب زبان میں ادا کرتے تھے۔ میں کانت وکولہ (توابع سنبل) میں حسین خاں کے ساتھ ان کی خدمت میں گیا تھا اور ان کی گفتگو سے استفادہ کیا تھا۔ میر سید علی ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ "یا اللہ مجھے شہید اُٹھانا"۔

ایک مرتبہ ان کے گھر میں چور داخل ہوئے۔ جب شور و غل مچا تو میر صاحب نوّے سال کے ضعیف ہونے کے باوجود ایک آہنی گرز اُٹھائے اللہ اللہ کہتے ہوئے ان کا تعاقب کرنے لگے اور ایک دو کو مار گرایا اور زخمی کر دیا۔ آخر ایک ضرب ان کو لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ ۹۹۵ھ میں پیش آیا۔ ان کی تاریخ وفات — "چہ شد آں مرشد کامل" سے نکالی گئی ہے +

شیخ حمزہ لکھنوی | یہ ملک آدم کاکڑ کے پوتے ہیں جو سلطان سکندر اور ابراہیم لودی کے امرا میں سے تھا۔ ہمیشہ اپنے دادا کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے رہتے تھے ملک آدم کی قبر دو عام قبروں کے برابر بلکہ اس سے بھی کچھ لانبی تھی۔

شیخ حمزہ بلند بالا صاحب جذب اور بڑے باشکوہ بزرگ تھے۔ جب کبھی شہر میں آتے تو شیر کی طرح خراماں خراماں راستہ طے کرتے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے، انھیں وہ ہر طرف پھینکتے جاتے لیکن کمال یہ تھا کہ وہ پتھر کسی کو لگتے نہ تھے۔ ان کی گفتگو دلکش طرز عمل پاکیزہ تھا۔ ہمیشہ کلام پاک کی تلاوت کرتے رہتے تھے جس کسی کو اہل جانتے تھے اس سے بات کرتے تھے، اپنے پاس بلا کر بٹھاتے۔ میں بھی ان کے پسندیدہ آدمیوں میں سے تھا۔ ان سے

ملاقات کو میں اچھا شگون جانتا تھا۔ ورنہ اکثر لوگ تو ان کی حرکتوں کو دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے، پاس نہیں پھٹکتے تھے کہ کہیں کوئی ضرر نہ پہنچ جائے۔

شیخ پیرک شیخ پیرکؒ بھی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ دریائے گودی کے کنارے جنگل کے اندر ایک غار میں جہاں تک کسی شخص کا پہنچنا محال ہے چھپے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کی نماز کے بعد افطار کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک بوڑھی رہتی تھی جو خشک روٹی اور اس بیری کے بیر جسے اس نے خود بویا تھا ان کے کھانے کے لیے لے آتی تھی۔

اگر کوئی بڑی مشقتیں برداشت کر کے ان کی ملاقات کے لیے جاتا تو وہ مقررہ وقت پر اپنے حجرہ کے دروازہ پر آکر بیٹھ جاتے لیکن کوئی بات نہیں کرتے تھے۔

جس زمانہ میں حسین خاں لکھنؤ پر حاکم تھا میں بھی اپنے ایک دوست عبدالرحمٰن نامی کے ساتھ جو حسین خاں کا خلیفہ تھا شیخ پیرک سے ملنے کے لیے گیا۔ اتنے ضعیف تھے کہ بس ہڈی چمڑہ نظر آرہے تھے۔ اس غار کے اندر اور باہر بہت سے بڑے بڑے سانپ پھن نکالے ہوئے نظر آرہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے ڈر کر سانپ کو لکڑی سے مارنا چاہا، انھوں نے اشارہ سے روک دیا اور کہا "ان سانپوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟" معلوم ہوا کہ تیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا وہ اس غار میں رہتے ہیں اور یہ سانپ ان سے مانوس ہو چکے ہیں۔ کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتے۔

جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو انھوں نے چند باسی روٹی کے ٹکڑیوں اور خشک میوہ کی طرف جو ان کے سامنے رکھا ہوا تھا اشارہ کیا کہ "یہ اٹھالو" میرے ساتھی نے سونے کا ایک ٹکڑا بطور تحفہ دینا چاہا، انھوں نے قبول نہ کیا۔

لکھنؤ کے یہ دونوں بزرگ شیخ حمزہ لکھنوی اور شیخ پیرک انہی دنوں انتقال فرما گئے تھے۔

شیخ محمد حسین سکندری سکندر دوآبہ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ محمد حسین بڑے صاحب ذوق بزرگ تھے، لوگوں سے دور عزلت نشین رہتے تھے۔ ملازمت ترک کر کے پورے پچاس سال عبادت و ریاضت میں گزارے تھے۔ اس دوران میں کسی کے دروازہ پر نہیں گئے۔ جب میں ۹۷۰ھ میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے خواجہ حافظ کے اس شعر کے معنی پوچھے ؎

عفو خدا بیشتر از جرم ماست

نکتۂ سربستہ چہ گوئی خموش

میں نے پوچھا اس میں آپ کو کس جگہ اشکال پیدا ہو رہا ہے؟ انھوں نے کہا، حافظ نے جب خود نکتۂ سربستہ کہہ دیا تو پھر خاموش رہنے کا حکم کیوں لگا دیا ہے؟ میں نے کہا، "اس کی وضاحت آپ خود فرمائیں تو بہتر ہے"۔ انھوں نے کہا۔ "میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ "نکتۂ سربستہ" غالباً یہ ہو کہ "ہمارے سارے گناہ خدا ہی کے خلق

کیے ہوئے ہیں" یہ بات کہنا ہی حدِ ادب سے تجاوز کرنا ہے، اس لیے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں بھی جواب میں خاموش ہی رہا۔

اسی طرح کی تاویل اُنھوں نے اس آیت میں بھی کی — "واعبد ربك حتیٰ یاتیك الیقین"۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں "حتیٰ" کا لفظ "انتہائے غایت" کے لیے آیا ہے اور انتہائے غایت کی یہاں گنجائش نہیں شاید یہ انتہائے کاف خطاب کے لحاظ سے ہو" ان کی اس بات کا مطلب میں سمجھ نہ سکا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس سے ان کی کیا مراد تھی۔ ان سے وہ بس آخری ملاقات تھی۔

شیخ عبدالواحد بلگرامی

بلگرام قنوج کے تحت ایک قصبہ ہے۔ یہ بزرگ بڑے صاحب فضل و کمال تھے۔ ریاضت و عبادت بہت کیا کرتے تھے۔ ان کی ذات تمام اخلاق حمیدہ کی جامع تھی۔

ابتدا میں وہ ہندی راگ گایا کرتے تھے اور خود بخود حال میں آجاتے۔ کچھ عرصہ سے راگ راگنی کا یہ مشغلہ چھوڑ دیا۔ "نزہتہ الارواح" کی اُنھوں نے بڑی محققانہ شرح لکھی تھی۔ اسی طرح علم تصوف پر اور بھی کئی ایک رسالے لکھے، ان میں ایک "سنابل" نام کی کتاب بھی ہے اور بھی دوسری عمدہ تصانیف ہیں۔

یہ اگرچہ کسی اور بزرگ کے مرید ہیں لیکن شیخ حسین سکندرہ سے فیض و تربیت پائی ہے۔ ہر سال بلگرام سے حضرت شیخ کے عرس پر تشریف لاتے ہیں۔ اب بینائی کمزور ہو چکی ہے اس لیے جا نہیں سکتے۔ قنوج میں متوطن ہو گئے ہیں۔

۹۷۷ھ میں میں لکھنؤ سے بلگرام گیا تھا، رات کو وہ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ یہ پہلی ملاقات تھی جو میرے لیے مرہم و شفاعت ثابت ہوئی۔ کہنے لگے "یہ سب عشق کے پھول بوٹے ہیں"۔ اتفاق کی بات کہ اسی جگہ بدایوں سے مخدومی شیخ عبداللہ بدایونی بھی پہنچ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میرے لیے کوئی رات شب قدر ہے تو یہی رات ہے۔

شیخ عبدالواحد کو نظم سے بھی مناسبت تھی۔ چنانچہ اپنے ایک ملیح و خوش ادا محبوب راجا نامی کے لیے یہ شعر کہا تھا ؎

ای کردہ خیال تو بہ تخت دل ما جا
ہرگز نبود در دل ما غیر ترا جا

انہی کا شعر ہے ؎

مرد یکرنگ چو اول بصلح آمدہ
دمی بلطف نشین تا ز خویش برخیزم

دورِ اکبری کے علماء

"صرف انہی علماء کا ذکر کیا گیا ہے جن سے میری ملاقات ہوئی یا جن کا میں شاگرد رہا۔۔۔۔۔ ورنہ اس دور میں ایسے علماء جن کا بڑا شہرہ رہا ہے بے حد و شمار ہیں"

میاں حاتم سنبھلی

یہ میاں عزیز اللہ طلنبی کے شاگرد ہیں۔ معقول و منقول میں ان کی طرح جامع عالم کوئی اور نہ تھا، خاص طور سے علم کلام، اصول فقہ اور عربیت میں بے نظیر تھے مشہور ہے کہ شرح مفتاح اور مطول اُنھوں نے اول سے آخر تک چالیس مرتبہ پڑھائی تھی، دوسری منتہی کتابیں اسی طرح پڑھاتے رہے تھے۔

مخدوم الملک کے متعلق ان کی رائے تھی کہ وہ علم محاضرات[1] میں اپنا ثانی نہیں رکھتا (مطلب یہ کہ علوم دین کے مقابلہ میں وہ معلوماتی علوم پر زیادہ قادر ہے)۔

ملا علاؤ الدین لاری شرح عقائد نسفی پر ایک حاشیہ بڑے دعویٰ سے لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ میاں صاحب نے مطالعہ کے بعد اس پر ایسے اعتراضات وارد کیے کہ ملا علاؤ الدین کو کوئی جواب بن نہ پڑا۔

میاں صاحب فقہ میں امام اعظم ثانی کے مثل تھے۔ ریاضت اور مجاہدہ بھی بہت کرتے تھے تقویٰ صلاح سے آراستہ تھے۔ ان علمی کمالات کے ساتھ عرصہ تک مقتدر حاکم بھی رہے۔

خان خاناں بیرم خاں کے زمانہ میں ایک مرتبہ میں پانچ سال بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانہ میں شیخ مبارک کے ہاں میں ہی پڑھتا رہا تھا، اس ملاقات پر میں نے ان کو شیخ مبارک کا ایک استفتاء دیا۔ پہلے میاں صاحب اس جدائی کے عرصہ کے حالات پوچھتے رہے، پھر انھوں نے دریافت کیا: "شیخ مبارک کیسے مولوی ہیں"؟ میں نے جواب دیا "علمیت، تقویٰ، فقر و مجاہدہ، امر معروف و نہی منکر میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔ اس زمانہ میں شیخ موصوف ان تمام باتوں کے بڑے پابند تھے"۔ میاں حاتم نے کہا "ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے لیکن مشہور ہے کہ وہ مہدوی ہیں۔ آخر اس کی حقیقت کیا ہے"؟ میں نے کہا "وہ میر سید محمد جون پوری کی بزرگی اور ولایت کے قائل ہیں ان کی مہدویت کے قائل نہیں"۔ اس پر میاں صاحب نے کہا "میر سید محمد کے کمالات میں کیا شک ہو سکتا ہے"۔ اس مجلس میں میاں صاحب

---

[1] محاضرات: یادداشت، سخن موافق حال، تذکرۂ سلف و حکایات، تاریخ، معلومات وغیرہ (م)

کے شاگرد میر سید محمد میر عدلی بھی موجود تھے، اُنھوں نے دریافت کیا۔ "پھر ان کو (ملا مبارک) مہدوی کیوں کہتے ہیں؟" میں نے کہا "وہ چونکہ سب کو امر معروف اور نہی منکر کرتے رہتے ہیں اس لیے لوگ ان کو مہدوی سمجھتے ہیں"۔ اُنھوں نے کہا "ایک بار عبدالحی خراسانی (جس کو چند دن کے لیے منصب صدارت برائے نام مل گیا تھا) خان خاناں کے سامنے شیخ کی بڑی مذمت کر رہا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟" میں نے کہا "شیخ مبارک نے اس کو ایک خط لکھ کر نصیحتیں کی تھیں، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔ بس یہ بات اسے ناگوار معلوم ہوئی اور اس نے یہ گمان کیا کہ شیخ مہدوی ہیں اور مجھ کو رافضی سمجھتے ہیں"۔ یہ سن کر میر سید محمد عدلی نے کہا: "عبدالحی خراسانی کا اپنے رفض پر یہ استدلال تو صرف اسی صورت میں درست ہوگا جبکہ وہ اس منطقی کلیہ پر پورا اُترے کہ "جو نماز باجماعت ادا نہیں کرتا اور جو کوئی باجماعت نماز نہ پڑھے رافضی ہے اس لیے تو رافضی ہوا"، حالانکہ اس کلیہ کا "کبریٰ" ممنوع ہے۔ اس طرح یہ بات بھی منطقی کلیہ پر پوری نہیں اُترتی کہ شیخ امر معروف کرتے ہیں جو کوئی امر معروف کرے وہ مہدوی ہے۔

اس کے بعد میاں صاحب نے کہا میں اس استفتاء پر مہر کر دوں گا لیکن بعد میں میرے پاس ایک اور استفتاء آیا ہوا ہے جس پر تمام علماء کے دستخط ہیں۔ مجھے اس پر کچھ شبہات ہیں۔ تم اسے شیخ بہاؤالدین جو بڑے محقق مفتی ہیں کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہنا کہ سفر کی وجہ سے میرے ساتھ کتابیں نہیں ہیں۔ اگر آپ اس روایت کو بعینہٖ بھیج دیتے تو بہتر ہوتا جس کی بنیاد پر آپ نے اس استفتاء پر دستخط کیے ہیں۔ آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ لوگ مصیبت کے عالم میں اپنے بچوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت صرف "ابراہیم شاہی" میں ملتی ہے۔ فقہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ خود یہ ابراہیم شاہی علماء کے نزدیک معتبر کتاب نہیں سمجھی جاتی کہ فتویٰ دینے کے لیے سزاوار ہو۔ اگر آپ یہ کہیں کہ مفتی مرجوحہ روایتوں میں سے کسی روایت کو ترجیح دے سکتا ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ ابراہیم شاہی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حالت اضطرار میں ابوین کو اولاد کی بیع جائز ہے ظاہر ہے "ابوین" کا لفظ باپ دادا دونوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ کتاب نکاح میں جس کے ابوین مسلمان ہوں وہ اس کا کفو ہے جس کے آبا شرفِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ اس لیے یہاں بالاتفاق ابوین سے باپ اور دادا مراد ہے نہ کہ ماں اور باپ۔ ہم اس روایت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی بیع کا دونوں کو مل کر (بطریقِ اجتماع) اختیار حاصل ہے نہ کہ فرداً فرداً علیحدہ انفرادی حیثیت کے لیے آخر کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

میاں صاحب نے شیخ مبارک کا تو استفتاء رکھ لیا اور مذکورہ استفتاء مجھے دے دیا۔ یہ استفتاء میں نے شیخ مبارک کو دکھایا تو اس نے میاں حاتم کی فقاہت کو بہت سراہا اور کہا ان کو دعا کے بعد میری جانب سے کہنا ہم نے بھی اس دقت کی وجہ سے اس پر مہر نہیں کی تھی"۔ جب میں نے وہ شیخ بہاؤالدین کو دکھایا تو اُنھوں نے کہا "چونکہ دوسرے مفتیوں نے اس کی تصدیق کر کے دستخط کر دیے تھے اس لیے میں نے اس کے قول پر بھروسہ کیا اور اور زیادہ غور نہ کیا۔ بے شک مجھ سے سہو ہو گیا"۔ یہ بھی شیخ بہاؤالدین کی حق بینی و حق پرستی، نیک نفسی اور

انصاف پسندی تھی کہ باوجود اس عظمت و کمال کے اُنھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی ؎

بر سر آں نامہ کہ آصف نوشت
قدم رحمہ اللہ علی النصف نوشت

میاں حاتم سنبھلی ستر سال تک برابر لوگوں کو اپنے علم و اخلاق سے افادہ پہنچاتے رہے۔ ٩٦٨ھ میں اس دنیا کو وداع کیا۔ اُنھوں نے تاریخ وفات ــــ "عند ملیک مقتدر" ــــ پائی ہے۔

میاں صاحب نے اپنے پیچھے شیخ عبدالحلیم کو جانشین چھوڑا لیکن یہ جانشینی صرف پیشوائی اور مشیخیت کی حد تک ہی رہی، علمیت میں نہیں۔ ٩٨٩ھ میں وہ بھی اپنے باپ سے جا ملے۔ ان کے چند نالائق لڑکے وارث رہ گئے ہیں ؎

چند بناز پرورم مہر بتان سنگ دل
یادِ پدر نمی کنند ایں پسران ناخلف

مولانا عبداللہ سلطان پوری

قوم کے انصاری ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد نے سلطان پور میں آکر سکونت اختیار کرلی تھی۔ عبداللہ سلطان پوری اپنے زمانہ کا منفرد یگانۂ روزگار عالم تھا خاص طور سے عربی زبان اصول فقہ تاریخ اور دوسرے تمام علوم نقلی میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ بڑی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے "عصمت انبیاء" اور "شرح شمائل النبی" بہت مشہور ہیں۔ ہمایوں بادشاہ جنت مکانی نے مخدوم الملک کا خطاب اور شیخ الاسلامی کا عہدہ دیا تھا۔ شریعت کو پھیلانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہا۔ نہایت متعصب سنی تھا۔ اس نے بہت سے ملحدوں رافضیوں کو قتل کرا دیا تھا۔

وہ نہایت اصرار سے کہتا تھا کہ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر امیر جمال الدین محدث کا نہیں ہے۔ جس سال کہ گجرات فتح ہوا تھا اور وہ بادشاہی دیوان خانہ کا وکیل مختار تھا اور یہ زمانہ اس کے عین جاہ و جلال کا زمانہ تھا۔ میں پنجاب کے سفر سے لوٹ کر آیا اور شیخ ابوالفضل (جو ابھی ملازم نہیں ہوا تھا) اور حاجی سلطان تھانیسری کے ساتھ مخدوم الملک سے ملنے کے لیے گیا۔ ہم نے دیکھا وہ تیسرے دفتر کو سامنے کھولے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے "دیکھو ایرانی عالموں نے دین میں کیا خرابی پیدا کر دی" پھر اس نے وہ شعر دکھایا جو حضرت علی کی تعریف میں کہا گیا تھا ؎

ہمیں بس بود حق نمائی او
کہ کردند شک در خدائی او

اور کہنے لگا "اس نے تو رفض سے آگے بڑھ کر حلول خداوندی تک معاملہ پہنچا دیا۔ میں نے تو طے کیا ہے کہ اس جلد کو شیعوں کے سامنے جلا دوں۔"

میں اس وقت نہایت گمنام اور غیر معروف تھا اور یہ اس سے پہلی ملاقات تھی، پھر بھی جرأت کر کے میں نے کہا یہ شعر تو اس شعر کا ترجمہ ہے جو امام شافعیؒ سے منسوب ہے ؎

لو ان المرتضیٰ ابدی محلہ   لصار الناس طرا سجدا لہ

کفی فی فضل مولانا علی   وقوع الشاک فیہ انہ اللہ

عبداللہ سلطان پوری نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا "یہ کس جگہ کی روایت ہے"؟ میں نے کہا "شرح دیوان امیر کی"۔ اس نے کہا اس دیوان کا شارح قاضی میر حسین میبذی ہے اور وہ بھی رفض سے متہم ہے"۔ میں نے کہا "یہ دوسری بات ہے"۔ ــــ شیخ ابوالفضل اور حاجی سلطان اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر برابر مجھے خاموش ہو جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ پھر میں نے کہا کہ "بعض معتبر آدمیوں سے میں نے سنا ہے کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لڑکے میرک شاہ یا کسی دوسرے کا ہے، اس لیے اس کی عبارت پہلے دو دفتروں کی عبارت سے نہیں ملتی، کیونکہ اس کی عبارت شاعرانہ ہے اور دو دفتروں کی عبارت محدثانہ"۔ مخدوم الملک نے جواب دیا "ارے بابا میں نے تو دوسرے دفتر میں بھی ایسی باتیں دیکھی ہیں جو بدعت اور فاسد عقیدہ پر صریحاً دلالت کرتی ہیں۔ میں نے ان مقامات پر حواشی لکھ رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے کہ طلحہؓ نے جب سب سے پہلے حضرت امیر المومنین (علیؓ) سے بیعت کی تو آپ نے فرمایا "ید شلاء و بیعۃ شلاء" (یعنی ہاتھ بھی شل اور بیعت بھی شل) حالانکہ جو ہاتھ احد کے دن حضور اکرمؐ کی پناہ بنا ہوا تھا اور جس پر گیارہ زخم آئے تھے اس کو حضرت علیؓ برا شگن کہیں جو شرعاً ممنوع ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، میں اسے جھوٹ سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا۔ "تفاؤل اور شگون میں تو بڑا فرق ہے" ــــ اس وقت ابوالفضل نے چپکے سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر رگڑ ڈالا اور روک دیا۔ مخدوم الملک نے کہا "ان کی تعریف کیا ہے؟" ساتھیوں نے اس سے میرا کچھ حال بیان کیا اور وہ ملاقات بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو دوستوں نے کہا "بڑی خیر ہو گئی کہ انھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا، اگر پھنس جاتے تو کون چھٹکارا دلاتا"۔

ابتدا ابتدا میں جب مخدوم الملک نے شیخ ابوالفضل کو دیکھا تھا تو اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا "اس شخص سے دین میں جتنا بھی خلل پیدا ہو کم ہی ہے"۔

چو طفلیش میدیدم بنمودم اہل دیں را
کہ شود بلائے جانہا بہ شما سپردم ایں را

مخدوم الملک نے سنہ ۹۹۰ھ میں مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد گجرات میں انتقال کیا۔ اس کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ کہا گیا ہے

رفت مخدوم ملک دیا خود برو   رحمۃ اللہ نشانی پیشانی
جستم از دل چو سال تاریخش   گفت بہ شمار مصرعہ ثانی

اس کی اولاد میں چند ناخلف لڑکے رہ گئے جو چنداں لائق ذکر نہیں۔ اس بارے میں تمام اسلاف اخلاف سے شاکی ہی رہیں گے کیونکہ زمانہ کا ماحول ان کو اچھا رکھ سکتا ہے، نہ اچھا ہی پیدا کرتا ہے ؎

خوبی اندر جہاں نمی بینم   گویا روزگار عنیں شد

یہ تو وہی حکایت ہوئی کہ ایک متعصب سنی بادشاہ نے سبزوار پر جو رافضیوں کا مسکن و مرکز ہے حملہ کیا وہاں کے رئیس اور سردار حاضر ہوئے اور کہا "ہم تو مسلمان ہیں کس گناہ میں آپ نے ہم پر لشکر کشی کی ہے؟" اس نے کہا "اس جرم میں کہ تم لوگ رفض میں بہت غلو کرتے ہو" اُنھوں نے کہا "یہ تو ہم پر صریح بہتان ہے" بادشاہ نے کہا "اگر تم سچے ہو تو اپنے شہر میں سے کسی ابوبکر نامی کو تو لا کر دکھاؤ تاکہ میں تمھارے قتل اور لوٹ سے باز آجاؤں" ان لوگوں نے بڑی تلاش کے بعد ایک مفلوک الحال غیر معروف سے شخص کو پیش کیا کہ "یہ اس نام سے منسوب ہے جو تم نے لیا تھا" بادشاہ نے جب اس کو پھٹے پرانے کپڑوں اور بری حالت میں دیکھا تو کہا "تم اس سے بہتر کسی آدمی کو لا کر نہیں دکھا سکتے تھے" ان لوگوں نے کہا "بادشاہ سلامت تکلف برطرف، سبزوار کی آب و ہوا اس سے بہتر ابوبکر پیدا نہیں کر سکتی"۔

مولوی معنوی نے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

سبزوار است ایں جہاں بیدار
ما چو بوبکریم دروی خوار و زار

شیخ مبارک ناگوری

اپنے زمانہ کے بڑے نامی گرامی علماء میں سے تھے۔ تقویٰ توکل اور صلاح میں سب سے ممتاز تھے۔ پہلے پہل اُنھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ امر معروف اور نہی عن المنکر کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اگر ان کی محفل وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی، ریشم، سرخ موزے یا سرخ و زرد کپڑے پہن کر آجاتا تو اُسی وقت ان چیزوں کے اتار دینے کا حکم دیتے جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا، اسے پھاڑ دینے کی تاکید کرتے۔ اگر راستہ میں کسی جگہ راگ نغمے کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہاں سے قدم بڑھا کر تیزی سے نکل جاتے۔ مگر آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی راگ گانا یا ساز سنے بغیر ان کو چین نہیں پڑتا تھا۔ ان کے مسلک اور طریقے ہمیشہ بدلتے رہے، طبیعت میں بڑا تلون تھا۔

پٹھانوں کے دور میں کچھ عرصہ تک وہ شیخ علائی کے ساتھ رہے۔ جب اکبر کے عہد میں نقشبندی صوفیوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو خود کو اس سلسلہ سے وابستہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک ہمدانی مشائخین سے منسوب رہے۔ آخر میں جب عراقیوں نے دربار میں اپنا رنگ جما لیا تو انھی کے رنگ میں باتیں کرنے لگے۔ "تکلموا الناس علی قدر عقولھم" (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کیا کرو) پر ان کا عمل تھا۔

ہمیشہ علوم دینی کے درس دینے میں مشغول رہتے تھے۔ ہندوستان کے علماء کے برخلاف اُنھوں نے شاعری، معمہ گوئی اور مختلف فنون میں بڑی دسترس حاصل کی تھی۔ تمام علوم پر ان کی نگاہ تھی۔ خاص طور سے تصوف پر بڑا عبور حاصل تھا۔ "شاطبی" تو پوری کی پوری ان کو حفظ تھی۔ اس کے درس دینے کا انھی کو حق پہنچتا تھا۔ قرآن کی سات قراتوں کے حافظ اور قاری تھے۔

کبھی بادشاہوں کے گھر نہیں گئے۔ نہایت خوش گفتار اور صاحب مجلس بزرگ تھے۔ ان کی بذلہ گوئی اور نقلیں بڑی

مشہور ہیں۔ آخر عمر میں جب بینائی کمزور ہو گئی تو گوشہ نشین ہو گئے اور اس فرصت میں ایک تفسیر لکھی جو تفسیر کبیر کی طرح چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور بڑی اچھی معلومات و مضامین درج ہیں۔ انھوں نے اس کا نام "العیون" رکھا۔ اس کے دیباچہ میں اُنھوں نے ایسا مضمون لکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انھیں اس صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ تھا اُنھوں نے جو کچھ تجدید کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔ اس تفسیر کو ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ قصیدہ فارضیہ تائیہ جو سات سو اشعار کا قصیدہ ہے قصیدہ بردہ شریف، قصیدہ کعب بن زہیر اور دوسرے قصیدے جو ان کو یاد تھے پڑھتے رہتے تھے۔

شیخ مبارک کا لاہور میں ۱۰۰۱ھ میں انتقال ہوا۔ بلاشبہ ایسا جامع کمال عالم پھر نظر نہیں آیا۔ لیکن افسوس دُنیا کی محبت اور جاہ و مرتبہ کی خواہش نے کہیں کا نہ رکھا۔ لباس تو درویشی کا بنا رکھا تھا لیکن درحقیقت اسلام سے کوئی علاقہ نہ رہا تھا۔

میں نے ابتدائے عمر میں آگرہ میں ان سے چند سبق پڑھے تھے۔ ان کی اُستادی کا مجھ پر بڑا حق ہے لیکن اُنھوں نے جس طرح کی دنیاداری اور بے دینی اختیار کر رکھی تھی۔ روپیہ کے لالچ میں جو مکر و فریب اور زمانہ سازی کرتے رہتے تھے، دین و مذہب میں تحریف و تنسیخ کا جو جال بچھا رکھا تھا، اس سے میرا دل ان کی طرف سے پھر گیا اور ان کی استادی و تعلیم کے سارے حق زائل ہو گئے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں بیٹے کی وجہ سے باپ پر بھی لعنت پڑتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں یزید اور اس کے باپ پر لعنت۔ اسی طرح ان کا اور ان کے لڑکوں کا معاملہ ہے۔

میر سید محمد میر عدل امروہی

امروہہ سنبھل کا ماتحت قصبہ ہے۔ میر عدل نہایت متقی اور صالح بزرگ تھے۔ وہ اور میرے والد سنبھل اور بدایوں میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بدایوں میں اُنھوں نے میر سید جلال دانش مند سے جو حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے پڑھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ رکھا۔ آخر عمر میں بادشاہی مقربوں میں شامل ہو گئے میر عدل کا عہدہ انھیں تفویض کیا گیا۔ اپنے فرائض منصبی وہ نہایت انصاف سچائی اور دیانت داری سے انجام دیتے رہے۔ چنانچہ قاضی قضات بھی ان کے خوف سے اپنی خیانتوں اور خیانتوں سے باز آ گیا تھا۔

جب تک وہ دربار میں رہے کسی بدعتی اور ملحد کو دین میں رخنہ اندازی کی ہمت نہ ہو سکی۔ ان کے بعد میر عدل کا عہدہ کسی کی ذات پر نہیں جچا۔ یہ خطاب بس برائے نام ہی رہ گیا۔

موروثی تعلقات اور قدیم روابط کی وجہ سے وہ مجھ پر بڑے مہربان رہتے تھے۔ میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو اور صدروں کی خوشامد درآمد کی ذلت نہ اُٹھاؤ باقاعدہ ملازمت میں داخل ہو کر "بادشاہی داغ" کرا لو کیونکہ یہ حکام بڑے فرعون اور متکبر ہیں۔ میں نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی تھی اسی لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا کسی کو نہ دکھائے۔

۹۸۴ھ میں میر سید محمد میر عدل کو بکھر کی عملداری مرحمت کی گئی اور وہ ۹۸۶ھ میں اپنے رب سے جا ملے۔

شیخ گدائی دہلوی کنبوہی یہ مشہور شاعر شیخ جمالی کے صاحبزادے ہیں۔ علوم ظاہری میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبتیں دیکھی تھیں۔

بیرم خاں کے ساتھ محبت و دوستی کا تعلق تھا۔ چنانچہ خان خاناں نے ہندوستان کی صدارت کا عہدہ ان کے تفویض کر دیا۔ چند سال تک ان کا مکان ہندوستان، خراسان، ماوراء النہر اور عراق کے اکابر و افاضل کا مرکز و مرجع بنا رہا۔ شاعری کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ ہندی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بیکانیر کے نواح میں بیرم خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی واپس آ گئے۔ بیرم خاں کے قصیوں کے باوجود ان کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دہلی کے بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے دنوں میں وہ ضرور تشریف لاتے تھے اور اپنی محفلیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کرتے تھے۔ ۹۷۶ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی اولاد بھی نالائق ہی نکلی۔

شیخ گدائی کا نمونہ کلام:

غزل

گہی جاں منزل غم شد گہی دل	غمت را می برم منزل بہ منزل
مشو غافل ز حال دردمندی	کہ از حالِ تو یکدم نیست غافل
دل دیوانہ در زلف تو بستم	گرفتارم بآں مشکیں سلاسل
بجاں دادن اگر آساں شدی کار	نبودی عاشقاں را کار مشکل
گدائی جاں بنا کامی بر آمد	نشد کامم ز لعل یار حاصل

لہ یاد

میں نے یہ اشعار تذکرۂ میر علاء الدولہ سے نقل کئے ہیں۔ یہ تذکرہ کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ اشعار شیخ گدائی کے نہیں۔

میاں جمال خاں مفتی دہلی اپنے والد شیخ نصیر الدین اور بھائی میاں لادن کے شاگرد ہیں۔ کنبو برادری سے تعلق تھا۔ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ علوم عقلی اور نقلی خاص طور سے فقہ و کلام عربیت اور تفسیر میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ "مفتاح" کی دونوں شرحوں پر بڑا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ "عضدی" جو درس کی منتہی کتابوں میں سے ہے کہتے ہیں انھوں نے اس کا چالیس بار اول سے آخر تک درس دیا تھا۔

ہمیشہ وہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ دینی علوم کا افادہ عام تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کے گھر نہیں جاتے تھے۔ ہمیشہ حاکموں کی نگاہ میں، وہ معزز و محترم رہے۔ ان کے اکثر شاگرد اچھے عالم و مفکر ہوئے ہیں۔

نوے سال کی عمر پائی اور ۹۸۴ھ میں انتقال فرمایا۔

قاضی جلال الدین ملتانی ان کا تعلق قلعۂ بکر کے مضافات سے رہا ہے۔ نہایت متبحر حق گو اور حق پرست عالم تھے۔ پہلے تجارت کیا کرتے تھے پھر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا چند سال

تک آگرہ میں پڑھاتے رہے۔

جب بعض وجوہ سے قاضی یعقوب کو معزول کر دیا گیا تو انھیں قضاۃ کا عہدہ دیا گیا۔ اپنی ذات میں وہ بلاشبہ نہایت متدین اور امین قاضی تھے، لیکن ان کا لڑکا نہایت بد دیانت ناخلف تھا۔ محکمہ کے تمام وکیل بھی انتہائی بدنفس تھے، ان کی ناشائستہ حرکتوں کی لپیٹ میں وہ بھی آ گئے۔ چونکہ اہل زمانہ کے ساتھ زمانہ سازی کی صلاحیت نہیں تھی اس لیے بادشاہ نے ان کو دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ دکن والے ان کی حق گوئی اور دین حق پر ثابت قدمی کا ذکر سن چکے تھے اس لیے انھوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر وہ وہاں سے کعبۃ اللہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جگہ حق کو لبیک کہا۔

قاضی طوائیس

طوائیس خراسان کے توابع میں سے ہیں۔ یہ بہت دیانت دار قاضی تھے، لیکن بے علمی کی وجہ سے بعض احکام میں انھوں نے بڑی غلطیاں کیں۔ امراء کے ہاتھوں ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ اس لیے وہ ان امیروں سے ہمیشہ بدگمان رہتے تھے۔ مقدمات میں امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی جانبداری کرتے تھے خواہ ان ہی کی طرف سے زیادتی کیوں نہ ہو۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس زمانہ میں ظالم ہی فریادی بن کر عدالت میں پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل کہا کرتا تھا اگر امام اعظم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو وہ ایک دوسری ہی فقہ لکھتے۔

جب خان زماں کا قصہ پیش آیا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا تھا "باغی کا مال لینا جائز نہیں ہے"۔ اس بات پر انھیں معزول کر کے قاضی یعقوب کو قاضی بنایا گیا۔ اور وہ انہی دنوں فوت ہو گئے۔

قاضی یعقوب مانک پوری

یہ قاضی تفضیلت کے داماد ہیں۔ علم فقہ اور اصول میں بڑے کامل تھے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاحاً عربی کے شعر ہندی بحروں میں کہا کرتے تھے۔ چند سال تک وہ ہندوستان کے قاضی قضاۃ رہے۔ کہتے ہیں اس زمانہ میں وہ قوت باہ کے معجون بہت کھایا کرتے تھے۔

ایک دن بادشاہی مجلس میں سرد انگیز چیزیں پینے کھانے کے لیے لائی گئیں۔ بادشاہ نے قاضی کو بھی شرکت کے لیے کہا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا "تم کس قسم کا نشہ کرتے ہو؟" ایک ہندوستانی مصاحب نے برجستہ کہا "قاضی پارہ کھاتے ہیں"۔ ان کو قاضی قضاۃ کے عہدہ سے معزول کر کے بنگالہ کی قضاوت پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بھی اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے قوت باہ کے نسخے اور دوائیاں ظلم و تعدی کر کے حاصل کیے تھے۔ جب معصوم کابلی نے بغاوت کی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس جرم میں انھیں بلا کر قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ گوالیار کے راستہ ہی میں انتقال کیا اور میر معز الملک اور ملا احمد یزدی سے جا ملے۔

شیخ عبدالنبی صدر الصدور

یہ شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے ہیں۔ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حدیث کا علم حاصل کیا۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو اپنے بزرگوں کی روش پر

سماع کے منکر تھے۔ محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ تقویٰ، پاکبازی اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔

جب انھیں صدارت کا عہدہ ملا تو انھوں نے لوگوں کو اتنی اراضی مدد معاش میں دی اور اتنے وظیفے اور وقف قائم کیے کہ کسی بادشاہ کے زمانہ میں ایسا معتقد صدر کوئی نہیں ہوا۔ جس قدر وظیفے اور اعانتیں اس نے جاری کیں۔ اس کا دسواں حصہ بھی کسی صدر نے نہ کیا ہوگا۔ اکبر کچھ عرصہ تک تو ان کا ایسا معتقد رہا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کرکے رکھا کرتا تھا۔ آخر مخدوم الملک اور دوسرے بدنفس علماء کے جھگڑوں کی وجہ سے بادشاہ کی عقیدت ان کے ساتھ ختم ہو گئی۔

چا ہلانند ہمہ جاہ طلب
خویش را علماء کردہ لقب

ان کے زوال کا بڑا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں بادشاہ بانسوالہ کے سفر سے لوٹ کر فتح پور آیا تھا تو قاضی عبدالرحیم قاضی متھرا نے شیخ کے پاس ایک استغاثہ بھیجا کہ ہم ایک مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیے ہوئے تھے لیکن یہاں کے ایک سرکش مالدار برہمن نے ہمارا عمارتی ساز و سامان اٹھوا لیا اور اس سے بت خانہ کی تعمیر شروع کرادی۔ میں نے جب اس کی گوشمالی کا ارادہ کیا تو گواہ موجود ہیں اس نے حضور اکرمؐ کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور مسلمانوں کی سخت توہین کی۔ شیخ نے اس برہمن کو بلا بھیجا لیکن وہ نہ آیا۔ آخر بادشاہ نے بیربر اور شیخ ابوالفضل کو بھجوایا اور وہ اسے لے آئے۔ شیخ ابوالفضل نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا بیان کیا اور کہا کہ اس بات کی تحقیق ہو گئی ہے کہ اس نے گالی بکی تھی۔ اس کی سزا کے معاملہ میں علماء کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک تو اسے قتل کرانا چاہتا تھا دوسرا اس کی تشہیر اور جرمانہ پر زور دے رہا تھا۔ اس معاملہ میں سخت طول پکڑ گئی۔ شیخ نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بڑا اصرار کیا۔ بادشاہ نے صراحتاً اجازت نہ دی اور گول مول کہہ دیا کہ شرعی سزائیں تم سے تعلق رکھتی ہیں، ہم سے کیا پوچھتے ہو؟ وہ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ بادشاہی محل کی عورتیں اس کی رہائی کے لیے سفارشیں کرنے لگیں، لیکن بادشاہ کو شیخ کا بڑا لحاظ تھا اس لیے رہائی کا حکم نہ دیا۔ شیخ نے اس کے قتل کے لیے جب اور زیادہ اصرار کیا تو بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم تو تم سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ تم جو مناسب جانو کرو۔ شیخ نے مکان پر پہنچتے ہی اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب یہ بات بادشاہ کی عرض میں پہنچی تو اسے سخت غصہ آگیا۔ ہندو رانیوں نے حرم میں اور ہندو مصاحبوں نے محفل میں کہا کہ ان مُلّاؤں کو آپ نے اپنی مہربانیوں سے سر پہ چڑھا لیا ہے۔ اب تو ان کی یہ جرأت ہو گئی ہے کہ آپ کی مرضی اور پسند کا بھی ان کو خیال نہیں رہا اور آپ کے حکم کے بغیر ہی وہ اپنا اختیار اور دبدبہ جتانے کے لیے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ غرض اس طرح بدگویوں نے بادشاہ کے کان بھرے کہ مزید تحمل ممکن نہ رہا اور جو مادہ عرصہ سے اندر ہی اندر پک رہا تھا پھوٹ کر باہر نکلا۔

ایک رات انوپ تلاؤ کی محفل میں بادشاہ نے یہ معاملہ پیش کرکے اپنے دین کے نئے نئے مفتیوں سے اس مسئلہ پر رائے مانگی۔ کوئی کہتا تھا اس مقدمہ میں گواہوں پر اچھی طرح جرح اور تعدیل نہیں کی گئی۔ کوئی بول اٹھا شیخ عبدالنبی تو

خود کو امام اعظم کی اولاد کہتا ہے حالانکہ امام اعظم کے مذہب میں اسلامی حکومت کے ماتحت کافر نبی علیہ السلام کے بارے میں بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور ابرائی ذمہ کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحتاً موجود ہے۔ حیرت ہے کہ شیخ نے اپنے دادا سے کس طرح اختلاف کیا۔ اچانک دور سے بادشاہ کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میری طرف متوجہ ہو کر نام لے کر آگے بلایا اور کہا "آگے آؤ"۔ میں جب پہنچا تو پوچھا کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ "اگر ایک شخص کے قتل پر ننانوے روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو اس ایک روایت کو ترجیح دینا چاہیے؟" میں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے جیسا کہ حضور فرماتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ "ان الحدود والعقوبات تندرئی بالشبہات"۔ میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا (شبہات سزاؤں میں کمی کر دیتے ہیں) نہایت افسوس کے ساتھ پوچھا "کیا شیخ عبدالنبی اس مسئلہ سے واقف نہیں تھا، اس نے بیچارہ برہمن کو قتل کرا دیا، آخر ایسا کیوں ہوا؟" میں نے کہا شیخ خود بڑے عالم ہیں وہ ضرور جانتے ہوں گے، اس روایت کے ہوتے ہوئے انھوں نے اگر حکم دیا ہے تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ بادشاہ نے پوچھا "کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا فتنہ و فساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سدّباب۔ اس سلسلہ میں قاضی عیاض کی "شفا" کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی بیان کی، لیکن بعض جبیثوں نے کہا قاضی عیاض مالکی ہیں، ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں بن سکتی۔ بادشاہ نے مجھ سے پوچھا "تمہارے پاس کیا جواب ہے؟" میں نے کہا وہ یقیناً مالکی ہے لیکن اگر کوئی محقق، مفتی، سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کے فتویٰ پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔ اس موضوع پر بڑی لمبی چوڑی بحث ہوگئی۔ شہنشاہ کے مونچھ کے بال لوگوں نے بخوبی دیکھا کہ شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور لوگ مجھے پیچھے سے ٹھوکے دے دے کر بحث سے روک رہے تھے۔ اچانک بادشاہ نے جھلّا کر کہا "تم جو کچھ کہہ رہے ہو، نامعقول ہے"۔ میں اسی وقت تسلیمات بجالایا اور واپس آکر جرگہ میں کھڑا ہو گیا۔ اس دن سے میں نے پیش قدمی اور سبقت چھوڑ دی اور بحث و مباحثہ سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی، کبھی کبھی کورنش بجالاتا تھا اور بس۔

اس واقعہ کے بعد سے شیخ عبدالنبی کو برابر زوال ہوتا گیا اس کے اور بادشاہ کے درمیان ایک حجاب سا پڑ گیا، دونوں ایک دوسرے سے کترانے لگے، یہاں تک کہ شیخ نے دربار میں جانا بالکل ہی بند کر دیا۔

اسی زمانہ میں شیخ مبارک آگرہ سے فتح پور کو کسی معاملہ میں مبارک باد دینے کے لیے آیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے بھی یہ ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا "تم خود اپنے زمانہ کے مجتہد اور امام زماں ہو، شرعی اور ملکی احکام کے اجراء میں ان ملاؤں کے محتاج کیوں بنتے ہو، جو بجز جھوٹی شہرت کے ذرہ برابر بھی علم سے واقف نہیں ہیں"۔ بادشاہ نے کہا "تم ہمارے اُستاد ہو ہم تم سے سبق پڑھتے رہیں گے، کسی طرح مجھے ان ملاؤں کے دباؤ سے نکال لو"۔ شیخ مبارک کو پرانی دشمنیوں کا سودا چکانے کا خوب ہی موقع ملا۔ اس نے نہایت بد باطنی کے ساتھ کہا "آپ اجتہاد کا دعویٰ کر دیں اور اس دعویٰ پر ان عالموں سے محضر لکھوالیں"۔

یہی وہ واقعہ تھا جس کی بنیاد پر شیخ مبارک نے بادشاہ کے اجتہاد اور تمام مجتہدوں پر اس کی افضلیت کے متعلق محضر تیار کیا اور باجیوں کی اس مجلس میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو زبردستی پکڑ کر لایا گیا کسی نے ان کی تعظیم نہ کی، بچارے جوتیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے پھر ان کے ساتھ ایسی زبردستی کی گئی کہ انھوں نے بجبر و اکراہ اس محضر پر اپنی گواہی لکھ دی جیسا کہ ہم تاریخ میں بیان کر آئے ہیں۔ دونوں کو بادشاہ نے حجاز کے سفر پر روانہ کر دیا۔

شیخ عبدالنبی کی وفات ۹۹۱ھ میں ہوئی ۔

شیخ احمدی فیاض انبیٹھی وال

یہ بڑے عالم متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بہت زیادہ معمر ہو گئے تھے چنانچہ چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ اس بڑھاپے کے عالم میں سخت بیمار ہو گئے۔ بڑھاپے کی ان مصیبتوں کے باوجود انھوں نے ایک سال کے اندر پورا کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ اکثر درسی کتابیں پڑھاتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد پڑھتے ہوئے غلطی کر جاتا تو محض یادداشت سے اسے ٹوک دیتے۔

تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ پر بڑی اچھی نظر تھی۔ شیخ میاں نظام الدین انبیٹھی وال کے ہم شہر اور ہمعصر تھے۔ میاں صاحب سے کہا کرتے تھے کہ وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہیں؟

میں جس وقت ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہ شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے۔ ایک ہزلیہ قطعہ کوئی شاگرد ان سے پڑھ رہا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے۔

ابو بکر الولد المنتجب	اراد الخروج لامرٍ عجب
فقد قال انی عزمت الخروج	لکفتارۃٍ ھی لی ام اب
فقلت الم تسمعن یا ابی	بنھی انی عن تلقی الجلب

شک یہ پڑ گیا تھا کہ یہاں لفظ "کفتارہ" ہے یا "کفارہ" جو کافر کی تانیث میں مبالغہ کا صیغہ ہے انھوں نے فرمایا معنی کے لحاظ سے "کفارہ" ہوگا اور "کفتار" کا لفظ تو فارسی ہے۔ میں نے کہا بہرحال "کفتارہ" "کفارہ" سے کہیں زیادہ واضح ہے۔

قاضی صدر الدین جلندری

بڑے عالم متبحر، اہل تصوف و سلوک کے بڑے معتقد، نہایت خوش مزاج اور مجلسی آدمی تھے۔ اگرچہ یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کسی وقت شیخ عبداللہ مخدوم الملک سے پڑھا تھا لیکن میں نے ان کی علمی تحقیقات کو مخدوم الملک سے کئی درجہ بڑھا ہوا پایا۔

اپنے مشرب میں ایک بے قید آدمی تھے۔ مزاج میں آزادہ روی بہت تھی۔ یہاں تک کہ لوگ ان کے متعلق بے دینی کا شبہ کرنے لگتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ وہ بڑا حسن ظن رکھتے تھے۔ جو شخص بھی تارک دنیا ہو جاتا خواہ وہ بدعتی ہی کیوں نہ ہو بڑے اعتقاد سے اس کی خدمت میں جا پہنچتے اور ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے اس کی باتوں کو حجت مان لیتے۔

مشہور ہے کہ ایک بدعتی مجذوب بنا پھرتا تھا، وہ ان کے سامنے سے گزرا۔ قاضی اپنی عادت کے مطابق

ہاتھ باندھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ مکار کہنے لگا کہ "خضر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں"۔ قاضی اس کے پیروں پر گر گئے اور کہا "ہم کو بھی خضر سے ملا دو"۔ اس مکار نے کہا "فی الحال میں اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں سخت متفکر ہوں اور یہ شادی سات سو تنکہ کے لیے رکی ہوئی ہے، اس کام سے جب میں فارغ ہو جاؤں گا تو تجھے ضرور خضر سے ملا دوں گا"۔ قاضی نے اسی وقت سات سو تنکہ اسے دے دیا اور وہ شخص دو دن بعد قاضی کے پاس آیا اور کہا آؤ میں تمھیں خضر سے ملاؤں۔ انھیں لے کر وہ دریا پر گیا۔ وہ شخص نہایت بلند قامت اور قاضی پست قد تھے۔ وہ پانی میں گردن تک جا کر کھڑا ہو گیا اور کہا آؤ خضر یہاں ہے۔ قاضی نے کہا میں تیرنا نہیں جانتا کس طرح آؤں۔ اس نے کہا میں نے تو تم کو خضر کا ٹھکانہ بتا دیا اب تم نہیں آتے تو میرا کیا قصور۔

لوگ ان کے متعلق ایسی ہی اور بھی مضحکہ خیز حکایتیں بیان کرتے ہیں جن کا لکھنا سنجیدگی کے شایان شان نہیں۔ اس واقعہ سے قاضی کی سادہ لوحی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانہ میں بادشاہ نے لاہور کے امراء و اکابر کو مختلف علاقوں پر نامزد کر کے بھیجا تھا تو ہر ایک کو ایک شہر میں کسی ایک عہدہ اور منصب پر مامور کر دیا تھا۔ قاضی صدر الدین کو اس وقت گجرات میں بندر بھروچ کا قاضی بنایا گیا۔ وہ وہیں جا کر رہ گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔

ان کا ایک لڑکا شیخ محمد نامی ہے جو عالم و قابل آدمی ہے اور اسی مقام پر اپنے باپ کا جانشین بنایا گیا۔

میاں الہداد لکھنوی

نہایت صاحب تصرف متصوف دانشور و عالم تھے۔ طبعاً نہایت ذہین تھے۔ خاص طور سے فقہ، اصول فقہ اور عربیت میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نحو میں انھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالہ کا نام ایک متقدر حاکم کے نام پر "قطبی" رکھا تھا جس کی عبارت نہایت پر تکلف تھی۔

میں حسین خاں کی حکومت کے زمانہ میں جب لکھنو گیا تھا تو میاں صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ان کی تصانیف میں دو چیزیں بڑی عجیب و نادر تھیں۔ پہلا تو ایک رسالہ تھا جس کا طول چودہ سطر کا تھا اور عرض بھی اتنی سطروں کا تھا اس کے حاشیوں پر بھی مضمون لکھا تھا۔ اس رسالہ میں چودہ علوم کے احکام و مسائل درج تھے۔ دوسرا ایک اور رسالہ تھا جو مقامات حریری کے طرز پر لکھا گیا تھا، اس کے پانچ حصے تھے اس کا نام انھوں نے قیطون رکھا تھا ان کا کہنا تھا کہ میری اور بھی تصانیف ہیں۔

ان کے چچا زاد بھائیوں کا بیان ہے یہ چودہ علمی رسالہ اور رسالۂ قیطون اصل میں حکیم زبرتی کی تصانیف ہیں جو جون پور میں آیا تھا اور قاضی شہاب الدین سے اس کا مشہور مناظرہ و مباحثہ ہوا تھا، پھر زمانہ کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ شیخ اعظم لکھنوی کے کتب خانہ میں جنھیں ثانی امام اعظم کا خطاب ملا ہوا تھا پہنچا، ان کے بعد وہ میاں الہداد کے پاس مرتے دم تک رہا۔ میاں الہداد شیخ اعظم کے صاحبزادے تھے۔

میر سید جلال الدین قادری آگرہ

آگرہ کے مشہور سید ہیں۔ توکل و زہد میں ایک امتیازی شان کے مالک تھے۔ شروع سے آخر تک گوشۂ تنہائی میں بسر کر گئے۔ امراء کی صحبت

سے دور ہی دور رہے۔ بڑی آزاد مشربی کے ساتھ زندگی گزاری۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف سے لوگوں کو مرید بناتے تھے۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے میر سید داؤد اپنے باپ کے قائم مقام ہوئے۔ وہ نہایت تنگدستی اور فقر کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب شیخ مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو ان بیچاروں کا خاندان بھی ادبار و زوال کا نشانہ بن گیا ؎

صد ہزاراں طفل سر ببریدہ شد
تا کلیم اللہ صاحب دیدہ شد

شیخ حسین اجمیری

ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ حضرت قطب المشائخ سلطان الواصلین خواجہ معین الدین سنجری چشتی کے پوتوں میں سے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں جب اکبر کو حضرت خواجہ اجمیری سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ شیخ حسین سے اس کا مزاج مکدر ہی رہا۔ بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر دشمنوں کی بن آئی اور انھوں نے فتح پور کے بعض مشائخین کے اشارہ پر اس بات کی گواہیاں دیں کہ شیخ حسین کا حضرت خواجہ صاحب سے کوئی رشتہ نہیں ہے کیونکہ خواجہ صاحب نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اسی معاملہ میں صدر اور قاضیوں نے بھی زمانہ سازی کے بموجب محضر لکھ دیے۔ اس طرح اجمیر کی سالہا سال کی موروثی تولیت دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔ دراصل شیخ کا وہاں بڑا عمل دخل تھا۔ اور وہ اس صوبہ میں ایک طرح سے شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا یہ اثر و رسوخ بادشاہ کو کھٹک گیا۔ پھر کچھ اور چھوٹے بڑے معاملات ایسے بھی پیش آئے کہ شاہانہ تکبر و غیرت بھڑک اٹھی۔ آخر اکبر نے شیخ حسین کو جلاوطن کر کے مکہ کو بھجوا دیا۔ جب بادشاہی لشکر بانسوالہ کے سفر میں تھا شیخ حسین اجازت لے کر مکہ گئے اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ جس وقت اکبر فتح پور سے آ کر محمد حکیم مرزا کی سرکوبی کے لیے کابل جا رہا تھا شیخ حجاز کے سفر سے واپس آئے اور دربار میں پہنچے۔ دربار میں نئے مذہب کے نومسلم مریدوں اور نو دولتیے مصاحبوں نے تعظیم و تسلیمات کے نئے نئے آداب وضع کر رکھے تھے۔ شیخ نے یہ (مشرکانہ) آداب و تسلیمات ادا نہیں کیں۔ بادشاہ نے جب ان کو مطیع و مخلص نہ پایا تو گرفتار کر کے قلعۂ بکر میں بھجوا دیا۔ چند سال تک شیخ حسین بکر میں رہے۔

۱۰۰۲ھ میں بعض مقربوں کی سعی و سفارش سے شیخ کو بکر سے طلب کیا گیا۔ شیخ جب بکر سے آئے تو ان کے ساتھ اور بھی قیدی تھے۔ جن میں شیخ کمال بیابانی قلاب جیسے لوگ اور فتح پور کے قاضی بھی تھے جو شیخ ابراہیم چشتی کی کوششوں سے چودہ سال سے وہاں قید تھے۔ ان اسیروں کے نام میرزا نظام الدین احمد کے ذریعہ طلبی کا فرمان جاری کیا گیا تھا۔ یہ سب لوگ دربار میں آئے سب قاعدہ کورنش بجا لائے۔ بادشاہ کو سجدہ کیا۔ اکبر نے خوش ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن شیخ حسین جو اس وقت ستر سال کے بوڑھے ہو رہے تھے کبھی شاہانہ تسلیمات کے نئے آداب پر عمل نہیں کیا تھا، اس بار بھی انھوں نے قدیم وضع پر تعظیم کی اور بس اچٹتی ہوئی تسلیمات بجا لائے۔

ان کے اس رویہ کو دیکھ کر اکبر دوبارہ ان سے خفا ہو گیا اور مرزا نظام الدین سے کہا کہ ان کی مدد معاش کے لیے تین سو بیگھہ کی زمین بکھر ہی میں دی جائے اور دوبارہ اسی جگہ بھیج دیا جائے۔

اکبر کی والدہ بیگم بادشاہ نے محل میں ان کی سفارش کرتے ہوئے کہا "یوتم (اکبر کا پیار کا نام) شیخ کی والدہ بہت غنیمت ہے اور اجمیر میں رہتی ہے۔ بیٹے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل کباب ہو رہا ہے اگر ان کو وطن جانے کی اجازت دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟ وہ تو تم سے کسی مدد معاش کے خواستگار بھی نہیں ہیں"۔ اکبر نے ماں کا کہنا قبول نہ کیا اور کہا "آچہ جیو (ماں کو پکارنے کا نام) وہ وہاں جائے گا تو پھر اپنی دُکان کھول کر بیٹھ جائے گا۔ لوگ اس کے لیے نذر نیاز اور ہدیے بہت لے کر آئیں گے اور وہ وہاں لوگوں کو گمراہ کرنے لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی والدہ کو اجمیر سے یہاں بلا لے"۔ والدہ کو بلانے کی بات شیخ کے لیے بکر جانے سے زیادہ ناقابل قبول اور دشوار گزار تھی۔

اجمیر کی تولیت کے معاملہ میں بادشاہ نے خود میرا نام تجویز کیا تھا۔ ایک رات صدر جہاں نے اس سلسلہ میں مجھے خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کا خیال بدل گیا اور اس تجویز کو جسے خود ہی پیش کیا تھا بدل دیا اور مجھے دربار ہی میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر صدر جہاں سے دریافت کیا "وہ سادہ لوح بوڑھا (شیخ حسین) کہاں ہے؟" میں نے یاد دلایا "لاہور میں ہے"۔ میں نے صدر جہاں کو بڑے اصرار سے کہا کہ "اگر اس سعادت کے لائق نہیں ہوں تو کم از کم اسے (شیخ حسین کو) کوشش کر کے متولی بنوا دو تا کہ حق حقدار کو پہنچ جائے۔ لیکن کیا کیا جائے ان ہندوستانی امیروں کو اپنے آدمیوں کی ترقی و تربیت کا ڈھنگ نہیں آتا اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے صفائی اور خلوص سے نہیں رہتے۔ اسی لیے صدر جہاں کی کوششوں کا مجھ بے کس کے حق میں کوئی نتیجہ نکلا اور نہ بیچارے شیخ حسین کے لیے کچھ ہو سکا۔ شیخ حسین شکستہ دل اور مضطرب گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، نہ تو کسی کے گھر جانے کی قوت ہے نہ کچھ وسائل روزی پیدا کرنے کی طاقت۔ بادشاہ کے پاس اب عرض و گزارش اور سفارش کی بھی کوئی راہ نہیں رہی ہے۔

بہر حال شیخ حسین کی ذات نہایت غنیمت اور اس زمانہ میں باعث برکت ہے۔ میری ان سے کوئی جان پہچان اور ربط و تعلق نہیں۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ حج کر کے پھر قید و بند کی زحمتیں برداشت کر کے آئے ہیں، مجھے تو وہ ایک نورانی وجود اور فرشتہ صورت دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ میں مشغول رہتے ہیں۔ صائم الدہر اور قائم اللیل ہیں۔ ملنے جلنے میں کسی وقت بھی کسی سے وہ دنیا کی بات نہیں کرتے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی اور کشائش عطا کرے گا۔ کیوں نہ ہو "ان مع العسر یسراً"۔

امید ہے ان صاحب خدا بزرگ کے طفیل میں مجھ اسیر تباہی کو بھی رہائی مل جائے تا کہ میں اس دربار کی بے معنی پریشان گفتاری، ہرزہ گوئی، بیہودگی اور دروغ نویسی سے نجات پا جاؤں اور وطن جا کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہوں اور بقیہ عمر کسی مفید مشغلہ میں گزار دوں ؎

بسر آنم کہ گر ز دست بر آید
دست بکاری زنم کہ غصہ سر آید

اس وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں صبح صادق طلوع ہو رہی ہے اور نسیم سحر چلنے لگی ہے۔ اگر میری اس دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر جا لگے تو کرم خداوندی سے کیا بعید کہ وہ میری مشکل حل کر دے ؎

غالباً خواہد کشود از دولتم کاری کہ دوش
من ہمی کردم دعا و صبح صادق می دمید

اگرچہ کسی شکوہ شکایت کا محل نہیں لیکن کیا کروں ایسا مضطرب اور بے قرار ہو گیا ہوں کہ یہ ایک دو درد ناک آہیں بے اختیار نوک قلم پر آگئیں۔ خدا معاف کرے ؎

ہرگز چنیں نبودم کز درد دل بنالم
ایں بار بر دل من غم میکند گرانی

شیخ عبدالقادر

اوچھ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم شیخ حامد قادری کے صاحبزادے ہیں۔ جس وقت بیرم خاں کے عہد میں حضرت مخدوم آگرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ میں طالب علم تھا لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

بیرم خاں بعض اہل بغض حاسدوں خاص طور سے شیخ گدائی کے بہکانے سے حضرت مخدوم کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آیا اور ان کو اوچھ سے طلب کر لیا۔ مخدوم کو اس سلوک سے بڑا رنج ہوا۔ انھوں بیرم خاں کو بددعا دی، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ بیرم خاں کو جو بھگتنا تھا وہ بھگت کر چلا گیا۔ شیخ محمد غوث بیرم خاں کے اس وبال کو اپنا اثر سمجھتے تھے۔ غرض جب حضرت مخدوم ملتان پہنچے تو ان کا وہاں انتقال ہو گیا اور ان کی لاش ملتان کے قریب موضع حامد پور میں امانتاً دفن کی گئی۔

ان کی وفات کے بعد شیخ عبدالقادر اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ کے درمیان سالہا سال تک سجادہ نشینی کا جھگڑا ہوتا رہا۔ شیخ موسیٰ اکثر لشکر میں رہا کرتے تھے اور شیخ عبدالقادر فتح پور میں۔ ایک رات اکبر نے شیخ عبدالقادر کو کوکنار (پوست) پینے کے لیے کہا۔ شیخ نے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے بادشاہ کا مزاج مکدر ہو گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں جماعت سے فارغ ہو کر نفل پڑھنے لگے تو بادشاہ نے فرمایا: "شیخ نفل نماز گھر جا کر ادا کرو۔" شیخ نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا "بادشاہ سلامت یہ کوئی تمھاری ملکیت ہے کہ تمھارا حکم چلے۔" اکبر نے رنجیدہ ہو کر کہا "یہ شیخ کس قدر جاہل ہے۔" پھر انھوں نے حکم دیا "جب تم ہماری ملکیت تسلیم نہیں کرتے تو ہمارے ملک میں بھی نہ رہو۔" شیخ اسی وقت وہاں سے اٹھ آئے، مدد معاش کو چھوڑا، چھوٹے بھائی سے جانشینی کا جو جھگڑا چل رہا تھا اس سے دستبردار ہوئے اور اوچھ میں اپنے آبائی مقبرہ میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ شیخ موسیٰ کے غائبانہ مخدوم شیخ حامد کی ہڈیاں بھی اوچھ لے جا کر اسی قبرستان میں دفن کر دیں۔

اور اپنے اسلاف کی اتباع میں فقر و توکل کا مسلک اختیار کر لیا۔ ان کی عزیمت کی یہ برکت ہے کہ لوگ انھیں اتنا کچھ نذر و ہدیہ دیتے ہیں کہ کسی مدد معاش کے محتاج نہیں رہے۔

چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ برسوں کے زہد و عبادت مجاہدہ و مشیخت چھوڑ دربار میں پہنچے اور بادشاہ کے ساتھ ارادت و عقیدت کا اظہار کیا۔ سپاہ گری کا پیشہ قبول کر کے فوج میں ملازم ہو گئے۔ اکبر نے ان کو پانصدی امیروں کی صف میں جگہ دے دی۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ایک شخص مسلمان ہوا تو دوسرے نے کہا بڑا اچھا کام کیا مسلمانوں میں بس تیری ہی ایک کمی تھی۔ اس تبدیلی کے باوجود شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ عین دیوان خانہ خاص و عام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو کچھ کہے۔

جب ان کے منصب پانے کی خبر عبدالقادر کو ملی تو انھوں نے کہا "وہ تو ہزاری منصب کا اہل تھا، اس سے بڑا منصب کیوں حاصل نہیں کیا اور بے وجہ اب تک محروم پڑا رہا۔ آخر شیخ موسیٰ کو ملتان میں جاگیر مل گئی۔

شیخ عبدالقادر نے دنیا کو ٹھوکر ماری اور فقر و توکل کی بدولت وہ بڑی عزت و توقیر کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن رہے۔ خلق خدا کو ہدایت و ارشاد سے مستفید کرتے رہے۔ ان کے اکثر اوقات عبادتوں سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں گزرتے ہیں۔ ان کی دینی سیادت کا سکہ سب کے دل پر نافذ ہے ؎

ما تو بروئی فقر و قناعت نمی بریم
با پادشہ بگوئی کہ روزی مقدر است

شیخ کبیر

یہ مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے سجادہ نشین ہیں۔ ملتان کے لوگ ان کو اپنے وقت کا ولی کہتے ہیں۔ ملتان والے ان کے اس قدر معتقد ہیں کہ اگر وہ کہہ دیں تو ایک دن میں ہزار سوار بلکہ اس سے زیادہ جمع ہو جائیں۔

ذکر و شغل اس قدر کرتے تھے کہ دیکھنے والا سمجھتا کہ انھوں نے نشہ پی رکھا ہے۔ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے آنکھیں اکثر سرخ رہتی تھیں اس لیے لوگ ان کو مست سمجھا کرتے تھے ؎

از بسکہ خون خورم ہمہ شب بے خود او فتم
مردم نہند تہمت مے خوارگی مرا

شیخ موسیٰ قادری جن کا ذکر آچکا ہے۔ شیخ کبیر کے متعلق نشہ اور مستی کا ہی گمان رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ پچھلے اولیاء جن کا کتابوں میں ذکر ہے کہیں ایسے ہی نہ رہے ہوں جیسے ہمارے شیخ کبیر ہیں کہ ولی بنے بیٹھے ہیں اور پہلے کے شاعر کہیں شیخ فیضی اور اس جیسے دوسرے شاعروں کی طرح نہ گزرے ہوں کہ ملک الشعراء بنا ہوا ہے۔

میں نے ایک مرتبہ فتح پور میں شیخ کبیر سے حسین خاں کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ شکوہ بزرگی تو ان کے ظاہر سے

عیاں تھا، باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ قطعہ

ہر کرا جامہ پارسا بینی | پارسادان و نیک مرد انگار
ور تو احوال او ندانی چیست | محتسب را درون خانہ چکار

ان کی وفات ۹۹۵ھ میں ہوئی۔ اپنے بزرگوں کے مقبروں میں دفن کیے گئے۔

میر سید علی لودھیانہ

یہ بزرگ جھنجھانہ کے شیخ عبدالرزاق کے خلیفہ ہیں۔ بڑے عالم صاحب کمال تھے وجد و حال کی کیفیت بڑی غالب تھی۔ اسی برس سے زیادہ عمر پائی۔

جب سے انھوں نے اپنے مرشد سے تلقین و ارشاد کی اجازت حاصل کی، اُس وقت سے ساری عمر گھر پر ہی گزاری قدم باہر نہیں نکالا۔ ان کی محفل میں کیا امیر کیا فقیر ساری مخلوق حاضر رہا کرتی تھی۔ ان کی بڑی کرامتیں مشہور ہیں۔ سب سے بڑی کرامت تو یہی تھی کہ جو بھی خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کی صحبت میں حاضر ہوتا وہ گنہگاری اور دنیاداری چھوڑ کر اللہ کا مطیع و فرمانبردار بن جاتا اور حقیقی منزل کو پا لیتا۔

ان کے معتقدین میں میرزا نظام الدین احمد کا داماد محمد جعفر بھی تھا کہ یہ نہایت سلیم الطبع نوجوان تھا، لیکن فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا، پرگنہ شمس آباد اسے جاگیر میں ملا ہوا تھا۔ وہ لاہور سے اس پرگنہ کی فوجداری کے لیے رخصت ہوا تو اثنائے راہ میں لودھیانہ ٹھہرا ہوا یہاں میر موصوف کی خدمت میں پہنچنے کی اسے توفیق ہوئی۔ بس ایسا اثر ہوا کہ بداعمالیوں سے توبہ کر لی۔ شہادت کا ایسا شوق اس کے دل میں پیدا ہو گیا کہ بے جھجک اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیتا تھا اور جان کی پروا نہ کرتا تھا۔ بارہا اس نے میر صاحب سے شہادت پانے کے لیے دعا کی التجا کی۔ اُنھوں نے اس پر پھونک مار دی۔ تین چار مہینے کے اندر وہ اس قدر صالح عبادت گزار اور نیک بن گیا کہ بہت سے متقی اور پرہیزگار اس پر رشک کرنے لگے۔ اس کی خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ اس حکومت، شان و شوکت کے باوجود تہجد کی نماز کے لیے اُٹھتا، کسی خادم کو زحمت دیے بغیر وضو کا پانی خود لے آتا۔ میر صاحب نے شہادت کے لیے جو پھونک ماری تھی اس کا اثر بہت جلد ظاہر ہو گیا اور میرزا جعفر شمس آباد کے ایک موضع میں حربی کافروں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔

اسی سال اس موقع پر جب کہ میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رخصت لے کر وطن جا رہا تھا تو میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اس وقت جعفر کی شہادت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ نے فرمایا "شہیدوں کو اُس عالم میں بڑی فرحت و لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں بھی کہا گیا ہے

"بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین"

(وہ اللہ کے پاس زندہ ہیں اور خوشی و مسرت ان کے لیے مہیا کی گئی ہے)

اس سلسلۂ گفتگو میں اُنھوں نے ایک قصہ بھی بیان کیا کہ "ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس نواح میں شہید ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے اصلی روپ میں جمعہ کی راتوں کو اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر گزارا کرتا تھا۔"

یہ قصہ مجھے معلوم تھا اس لیے میں نے عرض کیا کہ میں نے تو لوگوں سے یہ تک سُنا ہے کہ ان میاں بیوی کے بچے بھی ہوئے ہیں۔

اسی طرح پشاور میں جو میرا وطن ہے ایک اور قصہ مشہور ہے۔ وہاں اسحاق نامی پٹھان شہید ہوگیا تھا اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بھی ہر جمعہ کی رات اپنی نئی نویلی دُلہن کے پاس آیا کرتا تھا اور اس کو اس راز کے افشاء سے اس نے منع کر دیا تھا۔ انہی دنوں اس کی بیوی حاملہ ہوگئی اور لوگوں نے اس پر ناجائز کام کا الزام لگا دیا تو اس نے بڑا اصرار کرنے کے بعد اپنی ساس یعنی اسحاق شہید کی ماں سے سارا قصہ بیان کر دیا۔ مقررہ رات کو اس کی ساس نے بھی اپنے بیٹے کو دیکھ لیا اور وہ اس کا نام لے کر آغوش میں لینے کے لیے دوڑی مگر وہ شکل اچانک غائب ہوگئی۔ اُس دن سے بس اسحاق کی وہاں آمد و رفت بند ہوگئی اور ماں نے اپنے بیٹے کے نام ایک کنواں کھدوایا، جو اب تک موجود ہے۔

پشاور کا قصہ بھی میں نے اس محفل میں بیان کر کے میر صاحب سے پوچھا کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا "ممکن ہے عقلاً بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا" میرزا نظام الدین نے کہا "ہو سکتا ہے کوئی جن اس شہید کی صورت میں آتا ہو" آپ نے فرمایا "جنوں کو انبیاء، اولیاء، علماء اور شہداء کی تمثیل اُتارنے پر قدرت حاصل نہیں ہے"

میر سید علی کی وفات ۱۰۰۰ھ میں ہوئی۔ ایک اہل علم نے "شیخ انام" ان کی تاریخ کہی ہے۔

اب اُن کے جانشین میر سید محمود ہیں +

شیخ معین

یہ مشہور واعظ "معراج النبوۃ" کے مصنفُ ملا معین کے پوتے ہیں۔ نہایت نیک نفس اور فرشتہ خصلت آدمی تھے۔ مدت تک لاہور میں قاضی رہے۔

ان کے متعلق مشہور ہے کہ اپنی قضاءت کے دوران میں ایک مقدمہ بھی فیصل نہیں کیا۔ اگر مدعی مقدمہ کے فیصلہ پر اصرار کرتا تو وہ اسے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہتے تھے خدارا تم دونوں آپس میں صلح کر لو تاکہ میں تمھارے جھگڑے میں اللہ کے پاس پکڑا نہ جاؤں اور مجھے آخرت میں شرمسار نہ ہونا پڑے۔ وہ فریقین سے کہا کرتے تھے کہ تم دونوں دانا ہو اور مجھ اکیلے نادان کو دو داناؤں سے سابقہ آ پڑا ہے، خدارا تم دونوں مجھے اللہ کی بارگاہ میں شرمسار نہ کرو۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے غائب رہنے کی بناء پر تفریق کا مطالبہ کرتی تو وہ تا حد امکان اپنے پاس سے اس کا خرچ دے دیتے اور کہتے یہ رقم لے کر جا اور شوہر کا انتظار کر اور اس سے علیحدگی اختیار نہ کر۔

اپنی مدد معاش کو جو کافی اچھی تھی، ساری کی ساری کاتبوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ ان کاتبوں سے وہ قیمتی اور عمدہ کتابیں لکھواتے۔ ان کا مقابلہ و تصحیح کراتے، پھر جلد بندھوا کر طالب علموں کو مفت دے دیتے۔ ساری عمر ان کا یہی مشغلہ رہا اور انھوں نے لوگوں کو ہزاروں جلدیں بخش دیں۔

۹۳۵ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔ ان کے دو لڑکے رہ گئے ہیں ایک تو پہلوانی میں اور دوسرا کبوتر بازی میں مشہور ہے۔ بادشاہ سلامت کے ہاں بھی ان کے ان فنتوں کا ذکر آیا تو بادشاہ نے دونوں کو بلا کر ان کے کھیل تماشے دیکھے۔

"یخرج الحی من المیّت و یخرج المیّت من الحی"

میر عبداللطیف قزوینی

یہ سیفی حسینی سادات میں سے ہیں۔ علوم عقلی اور نقلی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے باپ دادوں سے علم تاریخ گویا ان کے ہاں موروثی ہے، چنانچہ حیرتی شاعر نے قاضی یحییٰ کے والد کی تعریف میں کہا ہے:

قصۂ تاریخ از و باید شنید
کس دریں تاریخ مثل اُو ندید

انھوں نے یا ان کے کسی عزیز نے شاہ اسماعیل کے خروج کی تاریخ "مذہب ناحق" سے نکالی تھی۔ جب اس گستاخی پر پکڑے گئے اور مواخذہ ہوا تو کہہ دیا کہ ہم نے تو "مذہبنا حق" (ہمارا مذہب حق ہے) تاریخ کہی تھی۔ بس یہ معنی خیز جواب دے کر چھوٹ گئے۔

سیفی سید سب کے سب بڑے پکے سُنّی رہے ہیں چنانچہ اس جرم میں شاہ طہماسپ نے ان کی زمینیں اور جاگیریں چھین لی تھیں۔ ہندوستان میں میر عبداللطیف کے آنے کا بھی یہی سبب تھا۔

میں نے میرزا غیاث الدین آصف خاں کی زبانی سُنا ہے کہ جب بادشاہ میر عبداللطیف اور ان کے خاندان کا دشمن ہو گیا تھا، میر علاؤالدولہ نے جو تذکرہ کا مصنف ہے اور عبداللطیف کا چھوٹا بھائی ہوتا ہے اور انھی سے تربیت پائی ہے۔ اپنے بڑے بھائی کو "حضرت آقا" کہا کرتا تھا۔ کسی مصلحت کی وجہ سے اس نے اپنی مذمت میں آپ ایک قصیدہ کہا تھا۔ جس کا ایک مصرع ہے ع

لعنت کنم بہ یحییٰ و بر حضرت آقا

لوگوں نے اس سے کہا تو نے تو میر صاحب کی آغوش میں تعلیم و تربیت پائی ہے، پھر ان کی توہین کیوں کی؟ اُس نے جواب دیا، دیکھتے نہیں ہو، اسی حق کی وجہ سے تو اس کو میں نے "حضرت آقا" کہا ہے اور اپنے باپ کا نام (یحییٰ) تو بغیر تعظیم ہی کے لیا ہے۔

جب فتنہ پردازوں نے شاہ طہماسپ کو میر یحییٰ کی طرف سے بدگمان کر دیا تو شاہ نے اپنے ایک عفریت شکل گماشتہ کو آذربائیجان فرمان دے کر بھیجا کہ میر یحییٰ اور ان کا لڑکا میر عبداللطیف نہایت متعصب سنی ہیں اور انھی کی وجہ سے قزوین میں سُنیّوں کا زور بندھا ہوا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو گرفتار کر لیا جائے اور اہل سنت کی جو کتابیں ان کے پاس ہیں ضبط کر کے ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ ان کے اہل و عیال اور قبیلہ والوں کو اصفہان میں منتقل کر دیا جائے۔ میر علاؤالدولہ کو بھی جو ان دنوں آذربائیجان میں تھا، ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ اس طرح کا خط لکھ کر

بھیجا گیا۔

غرض حسب الحکم میر یحییٰ کو سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور وہ ڈیڑھ سال تک اصفہان میں قید رہے اور اسی قید میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میر عبد اللطیف وہاں سے فرار ہو کر کچھ عرصہ تک گیلانات کے پہاڑوں میں رہے، پھر بادشاہ غفران پناہ (ہمایوں) کے وعدہ پر ہندوستان چلے آئے۔

یہاں آنے کے بعد ان کا بڑا اعزاز و اکرام ملحوظ رکھا گیا اور بے اندازہ شاہانہ سرفرازیوں سے نوازے گئے۔ اکبر نے ان کے پاس دیوان حافظ کے چند سبق اور کچھ دوسری چیزیں بھی پڑھیں۔ میر عبد اللطیف نے پانچ ماہ رجب ۹۸۱ھ کو فتح پور میں انتقال فرمایا۔ قلعہ اجمیر پر میر سید حسین خنگ سوار کے پہلو میں دفن ہوئے قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ "فخر آل یٰسین" نکالی ہے۔

میرزا غیاث الدین علی میر عبد اللطیف قزوینی کا لڑکا ہے۔ اسے دربار سے نقیب خاں کا خطاب حاصل ہے۔ یہ نہایت فرشتہ خصلت اور صاحب علم و کمال شخص ہے۔ علم سیر تاریخ اور اسماء الرجال میں تو عرب و عجم میں بھی اس جیسا ماہر فن وال اور کوئی نہ ہو گا۔

میرزا کے ساتھ میرا بڑا دوستانہ رہا۔ وہ اور میں ہم سبق بھی تھے۔ اب وہ رات دن بادشاہ سلامت ہی کی خدمت میں رہتا ہے اور تقریباً ایک قرن سے وہ خلوت و جلوت میں تاریخ قصے حکایات فارسی اور ہندی افسانے جن کا اسی زمانہ میں ترجمہ ہوا ہے، بادشاہ کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔

اکبر کے ساتھ اس کا ایسا گھلا ملا ہے کہ وہ ذات شاہانہ کا ایک عنصر بن کر رہ گیا ہے۔ اکبر ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی جدائی کو گوارا نہیں کرتا۔

ان دنوں اسے ہلکا سا بخار ہو گیا ہے امید ہے کہ جلدی اسے شفا ہو جائے گی۔ بہر حال نیک لوگ ہر جگہ معزز رہتے ہیں، خدا ان کو سلامت رکھے۔ بڑوں کی زندگی کی دعا کیوں کی جائے کہ وہ رہیں گے تو وہی اپنی برائی کرتے رہیں گے۔

خواجہ محمد یحییٰ حضرت خواجہ احرار سے تین واسطوں میں خاندانی رشتہ رکھتے ہیں۔ فن تحریر میں بڑا عبور حاصل تھا سات خط بڑی عمدگی کے ساتھ لکھتے۔ اس فن میں وہ ماہر اور استاد تھے۔

نہایت اچھے اخلاق و عادات کے مالک تھے۔ یہ خوبی تو ان کو موروثی ملی تھی۔ کم سخن تھے لیکن ہمیشہ ان کی محفل گرم رہتی تھی۔ سخی ایسے تھے کہ جو بھی جاگیر کی آمدنی ہوتی وہ ان کے دستر پر لگ جاتی تھی۔ لوگوں کے آڑے وقتوں میں ہمیشہ کام آتے تھے۔

جب دربار میں مفسدوں کا عمل دخل بڑھ گیا اور پرانی محفل درہم برہم ہو گئی تو انھوں نے بھی دربار سرکار سے کنارہ کشی کر لی اور حجاز جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ بادشاہ نے ان کو حجاج کے قافلہ کا میر حاج مقرر کیا اور کافی خرچ دے کر انھیں رخصت کیا۔ وہ حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹ آئے۔

آگرہ میں ان کے اکثر اوقات عبادت و ریاضت میں گزرتے تھے۔ اسی جگہ ان کا انتقال ہوا ؎

ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر
ندانمت کہ دریں دام گرچہ افتادہ است

شیخ حسین بدخشی مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ تھے۔ ان پر سکر کی کیفیت غالب رہتی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد ہر روز کبرویہ سلسلہ کے طریقہ پر کتاب مصباح کو جو شیخ رشید کی تصنیف ہے ان کی محفل میں پڑھا جاتا تھا۔ کتاب سنتے سنتے ان پر حال طاری ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ان کے ہاں مثنوی مولوی معنوی بھی لازماً پڑھی جاتی تھی۔

شریعت پر ثابت قدم تھے۔ ان کی صحبت و گفتگو بڑی اثر انگیز ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف کرتا تو کہتے "اپنے اوپر تم ہمارا بھی قیاس کرتے ہو"

بدایوں میں چند ترک ان کے مرید تھے۔ ان سے ملنے وہ چند بار بدایوں تشریف لائے تھے اور بدایوں والے ان کی صحبت مبارک سے فیض یاب ہوئے۔ وہاں سے لوٹ کر جب وہ آگرہ میں مقیم تھے تو ان کا وصال ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر اوچھ کے شیخ عبدالقادر ثانی کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ اللہ بخش دونوں نے بڑے تقویٰ و پرہیزگاری کے ساتھ تربیت پائی۔ دونوں بڑے صاحب کمال رہے۔

کچھ عرصہ تک یہ دونوں فتح پور میں رہے جس زمانہ میں نئے مذہب کی باتیں شروع تھیں اکبر نے شیخ اللہ بخش پر مہربان ہو کر گجرات میں صدر کے عہدہ پر فائز کیا تھا اور شہباز خاں کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ تقرری درحقیقت ان کی جلاوطنی تھی۔ جب گجرات میں بغاوت ہوئی تو انھوں نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں اور وہاں سے باغیوں کی نقل و حرکت کی اطلاع تیز رفتار قاصدوں کے ذریعہ بھجواتے رہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر تین صدی کے منصب کے لیے فرمان صادر کر دیا۔ اسی زمانہ میں ان کا وہاں انتقال ہو گیا۔

اکبر نے ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالقادر کے لیے مکہ معظمہ کی طرف خارج کر دینے کا حکم جاری کیا تھا جس زمانہ میں خان خاناں و بیرم خاں اور میرزا نظام الدین احمد گجرات کے نظم و نسق پر مامور تھے وہ وہاں تشریف لے گئے تھے ان کے لیے سامان سفر درست کیا گیا اور وہ حج و زیارت کی برکت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے۔ اب اپنے وطن لاہور میں عبادت الٰہی میں مشغول ہیں۔

شیخ ابوالمعالی میاں شیخ داؤد کے بھتیجے، داماد اور جانشین ہیں احوال و مقامات میں نہایت تیز رس اور بلند پایہ ہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز بلکہ بزرگوں سے بھی آگے ہیں۔ اپنے پیر کی محبت میں انھوں نے خود کو بالکل ہی مٹا دیا اور ہمیشہ پیر کی اتباع میں مصروف رہے۔ خود ان کے اشعار ہیں ؎

ہستم از جام محبت ہمہ دم والہ و مست
ایں و آں ما چہ شناسم من داؤد پرست

دل افسردہ کسے یابد بگفت ہر کسے گرمی
دم داؤد می باید کہ آہن را دہد نرمی

بہ تخت فقر بہ نشینم چو حاصل گشت مقصودم
سلیمانی کنم کز جاں غلام شاہ داؤدم

رباعی

یارب نظری زعین مقصودم بخش — آزادگی زبود و نابودم بخش
ہر چند نیم در خور ایں دولتِ خاص — یک ذرہ زعشق شیخ داؤدم بخش

ان کی زبان پر اکثر یہ جملے رہتے تھے

"یا ابا المعالی، کن عبدالرب المتعالی ولاتکن عبدالدراہم و لآلی"

کہتے ہیں جب یہ پیدا ہوئے تھے تو ان کو قطب الاقطاب حضرت میاں شیخ داؤد کے پاس لے کر گئے اور ان سے نام رکھنے کے لیے کہا گیا۔ حضرت میاں نے فرمایا "ان کا نام شاہ ابوالمعالی رکھو"۔ اس زمانہ میں ایسے نام ہندوستان میں نہیں ہوا کرتے تھے، کیونکہ یہ مغلوں کے نام کے مشابہ تھا۔ لوگوں نے اسے مغلوں کی آمد کے لیے فال سمجھا۔ چنانچہ ایک برس بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمایوں ہندوستان میں آگیا اور اس نے اپنے محبوب ابوالمعالی کو پنجاب کی حکومت عنایت کی۔

ابوالمعالی کی پیدائش کی تاریخ "ابوالمعالی حق پرست" سے نکلتی ہے۔ ان کے چند یہ شعر ان کی مستانہ وار محبت کے گواہ ہیں ؎

غربتی از حال میگوید سخن — بے سخن ایں قیل و قال دیگر است
حالتِ عشقش بود گفتن محال — ور نمی گویم محال دیگر است

غربتی نقد جاں نداکیش کن
دولتِ وصل را ڈگاں ندہند

سخن عشق بدل ورنہ ولب را بکشا
سرایں شیشہ فرو بند کہ با دل نخورد

غربتی بانگ انا الحق زن وازدار مترس — تا نکہ معراج دریں راہ رسن دار بود

آنچہ ما زاں جانِ جاں ہا دیدہ و دانستہ ایم
بہر گفتن نیست بہر دیدن و دانستن است

انھوں نے مجھے لاہور میں یہ رقعہ بھجوایا تھا:

"عزیزی! اس ہنگامہ پرور زمانہ میں ہر آنے جانے والے سے ہم تمھاری خیر خیریت کے طالب رہے کہ اچانک تمھارا محبت نامہ وصول ہوا۔ اس وقت حضرت قادری کے اشعار میری روح کو بے چین کیے ہوئے ہیں، اس لیے مزید کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ سب کو ہماری طرف سے دُعا۔"

ایک دوسرے رقعہ میں اُنھوں نے لکھا ؎

"آں عزیزی کہ ہمہ شب بدلِ من گردد
خرم آں روز کہ در دیدۂ روشن گردد

سلام شوق۔ مولانا عبدالغفار اور شیخ عمر کا ایک ضروری کام ہے جو آپ کی ذرا سی توجہ سے پورا ہو جائے گا اگر فرصت ہو تو ان کا کام کر دیجیے۔"

مولانا جمال تلہ

لاہور میں ان کے نام سے ایک محلہ بھی مشہور ہے۔ حاجی مہدی کے داماد ہیں۔ حاجی مہدی بہت مشہور عالم گزرے ہیں۔ مولانا جمال اُچھ کے ملا اسماعیل کے شاگرد ہیں، لاہور میں مدرس ہیں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم ہیں۔ تقریباً تمام علوم عقلی و نقلی کو انھوں نے حاصل کیا ہے۔ ذاتی طور پر نہایت ذہین جدت طراز جوہر قابل ہیں۔

آٹھ سال سے برابر درس و تدریس کا مشغلہ ہے، ان کی خوش بیانی اور تنقیح و توضیح کا بڑا شہرہ ہے۔ چنانچہ وہ معقول و منقول کسی بھی علم کے مشکل مسائل بآسانی شاگردوں کو سمجھا دیتے ہیں۔ نہایت مہربان و شفیق اُستاد سمجھے جاتے ہیں۔ صلاح و تقویٰ سے آراستہ نہایت با اخلاق انسان ہیں۔ قرآن کے حافظ بھی ہیں۔

شیخ فیضی کی تفسیر میں اکثر مقامات پر اُنھوں نے اصلاح دی ہے اور اس کی تحریر کو مربوط کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔

چیست بحث علم اگر تا فرق فرقد میرود
ذکر مولانا جمال الدین محمد میرود

مولانا عبدالشکور لاہور

سربرآوردہ دانش عالم ہیں۔ متانت فہم اور جدت طبع میں کافی مشہور ہیں۔ مشائخوں سے گہری عقیدت اور حسن ظن رکھتے ہیں اور اپنے اکثر اوقات صوفیاء کے اقوال کے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ ہمیشہ عبادتوں نوافل وظائف دعاؤں اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ سخی ایسے کہ جو کچھ پونجی ہوتی ہے وہ فقراء اور اہل حاجت پر خرچ کر دیتے ہیں۔

جب علماء ابتلاء و آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے بادشاہ نے ان کو جلا وطن کر کے جون پور کا قاضی بنا دیا تھا

جب بادشاہ نے الہ آباد کا سفر کیا اور وہ دربار میں حاضر ہوئے تو وہاں کی قضاءت کا عہدہ قاضی زادہ رومی کو جو نہایت خوش مزاج باکمال عالم ہیں تفویض کر دیا گیا۔ اس وقت سے مولنا عبدالشکور معزول ہیں، تھوڑی سی آمدنی پر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ علمی افادہ میں اطمینان سے مشغول ہیں +

شیخ کبیر ولد شیخ منور اپنے والد کے قائم مقام ہیں۔ یہ ایک صالح نوجوان ہیں جو چھوٹی عمر ہی میں بلند مدارج تک پہنچ گئے اور ایسا کمال حاصل کیا کہ بوڑھے اساتذہ سے بھی آگے ہو گئے۔ اس آخری زمانہ میں لڑکا باپ سے بہتر نکلے تو اسے بس عجوبہ ہی سمجھنا چاہیئے۔

انھوں نے اکثر متداولہ علوم اپنے والد اور خسر میاں سعد اللہ بنی اسرائیل سے حاصل کیے اور ان بزرگوں سے آداب محفل اور دوستی کا سلیقہ خوب سیکھا ہے۔ بادشاہ کے مزاج شناس ہیں۔ افیون کی بُری لت لگی ہے۔ علاوہ ازیں تکبر جھوٹ اور شیخی کے بھی بیمار ہیں۔ خدا ان بُری باتوں سے انھیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

جس زمانہ میں وہ بادشاہ کے حسب الحکم اپنے والد کے ہمراہ پرگنہ بجواڑہ اور کوہ شمالی کے دامن کی طرف گئے ہوئے تھے تو انھوں نے وہاں سے مجھے یہ رقعہ لکھا تھا۔

رقعہ

"کان لی قلب اعیش بہ فضاع منی تقلبہ"

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ جناب من ہمارا دل عبادت کدۂ خلوص میں معتکف ہے اور یہ خاکی جسم کہ اس پر خاک ہی پڑے تو بہتر، اس بیابان کثرت میں رندوں اور وحشیوں کے ساتھ آوارہ نہیں بلکہ ایسے گروہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ وحشی جانور بھی ان کو دیکھ کر وحشت کھا جائیں۔ سبحان اللہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو کر رہے گا۔ ذلیل نفس نے اب گوشۂ عافیت کی قدر جانی ہے۔

جب سے میں سن تمیز پر پہنچا اس وقت سے اب تک کہ میری عمر چالیس سال ہو گئی ہے، میری ہمیشہ توجہ اسی جانب رہی کہ روحانی درد مندوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفسانی عیوب اور باطنی بیماریوں کا علاج کروں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی سخت بیماری میں مبتلا کر دیا کہ اب اس کا علاج خود اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ہونے کا۔

بہرحال اب نہ وہ صحبت روحانی حاصل ہے نہ اطمینانِ قلب، وہ گوشۂ عافیت بھی اجڑ کر رہ گیا۔

آپ براہ کرم نواب فیاضی علامی فہامی (غالباً ابوالفضل) کو سلام و شکریہ پہنچا دیں۔ دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھیے۔ اُمید ہے میاں احمد صحت و سلامتی سے ہوں گے۔ مجھے اپنا مشتاق سمجھیے +

شیخ سعد اللہ نحوی مشرقی ہند کے رہنے والے ہیں۔ بیانہ میں مقیم رہے اور بچپن ہی سے شیخ محمد غوث کی خدمت سے مشرف رہے اور ان کے فیض سے دعوت اسمائے کے عمل و وظیفہ کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے ریاضتیں کیں۔

بیانہ میں انھوں نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی جو برسوں طالب علموں اور سالک کا ملجا و مامن بنی رہی۔ وہ

لوگوں کی تلقین و ہدایت میں برابر لگے رہتے تھے۔ خاص طور سے علم نحو میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے زمانہ کے بے مثل نحوی تھے۔

ستر سال تک بجز دودھ اور جنگلی پھل پھلاری کے سوا کسی اور چیز سے افطار نہیں کیا۔ سخاوت اور ایثار میں بھی بڑے دراز دست واقع ہوئے تھے۔

میں اسلیم شاہ کے عہد میں اپنے نانا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ان سے میں نے کافیہ کے چند سبق پڑھے ہیں۔

آخری دنوں میں وہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ہمیشہ ایک عالم حیرت میں ڈوبے رہتے اور ایک علیحدہ کمرے میں گوشہ نشین رہتے تھے۔ بچوں تک کو اپنے پاس نہیں بلاتے تھے۔ اسی عالم میں ۹۸۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔

کہتے ہیں جس دن ان کا انتقال ہوا تھا ایک چڑیا ان کی میت پر اچانک آ کر گر پڑی۔ دیکھنے والے اس واقعہ پر نہایت حیران رہ گئے۔

شیخ نصیر الدین ہندون کے رہنے والے ہیں کیمیا گری میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہمایوں بادشاہ کے سفر و حضر کے رفیق و مصاحب تھے۔

جوئے کی شکست کے بعد جب ہمایوں آگرہ پہنچا تو اس نے شیخ سے کہا کہ نئے لشکر کی تیاری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔ شیخ نے تانبے کی تمام دیگیں تھال اور برتن جمع کرائے اور بادشاہ کے سامنے انھیں خالص سونا بنا کر دے دیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا اور دور دور تک ان کی شہرت پہنچ گئی۔

میری رشتہ داری بھی انہی کے خاندان میں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے تحقیق کیا پتہ چلا کہ شیخ خود کیمیا کے نسخہ سے واقف نہ تھے انھیں کسی درویش نے کیمیا کے اجزاء سے بھری ہوئی ایک زنبیل دے دی تھی اس سے اُنھوں نے بہت سے تانبہ کو سونا بنا لیا۔ جب وہ ختم ہو گئی تو سونا بنانا ان کے بس میں نہ رہا کیونکہ وہ اس علم سے واقف نہ تھے۔

میں نے ان کو بیرم خاں کے عہد میں میر سید رفیع الدین محدث کے بھتیجے سید شاہ میر کے مکان پر دیکھا تھا۔ بڑے با اخلاق نورانی چہرہ بزرگ تھے۔ اسی زمانہ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہندون ہی میں دفن کیے گئے۔

شیخ مبارک الوری اسلیم شاہ ان کو شاہ مبارک کہا کرتا تھا اور ان کی اس قدر تعظیم کرتا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ وہ غالباً سید ہونے کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ پٹھانوں میں ان کی بڑی عزت و توقیر تھی۔

جس زمانہ میں پٹھانوں کو زوال ہوا اور وہ مغلوں سے شکست کھا کر بھاگے، بعض پٹھانوں نے شیخ اسلام فتح پوری کو اس شبہ میں کہ ان کے پاس بہت روپیہ ہے گرفتار کر کے رنتھمبور کے قلعہ میں بھیج دیا۔ اس خبر کو سُن کر

شیخ مبارک الور سے پیساور کے راستہ وہاں پہنچے اور شیخ اسلیم کو چھڑا لیا۔

اُنھوں نے جب دوسری بار کعبۃ اللہ کی زیارت کی تھی تو میں سولہ سال کا تھا اور اس وقت اپنے والد کے ساتھ پیساور جا کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بعد میں ۹۸۷ھ میں جبکہ اکبر نے اجمیر کی آخری زیارت کی تھی اور الور کے راستہ فتح پور لوٹ رہا تھا میں نے دوبارہ حضرت سے ملاقات کی۔

بلاشبہ وہ نہایت صاحب کمال تھے۔ نہایت فیاض اور ایثار پسند آدمی تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ حال ہی میں نوّے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

شیخ چائین لدہ سُنہی

قصبہ لدہ سوہنہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ قصبہ میوات میں دہلی سے اٹھارہ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں ایک گرم چشمہ ہے جو گندھک کی کان سے نکلتا ہے اس کا پانی سبز رنگ کا ہے اور اس سے گندھک کی بُو آتی ہے۔ جاڑوں میں بھی اتنا گرم رہتا ہے کہ جسم پر ڈالا نہیں جا سکتا۔ خارش کے مریض کے لیے اس چشمہ میں نہانا مفید ہے۔ اس کی بُو اور پانی کا رنگ خود بڑا ثبوت ہے کہ یہ گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔

وہاں کا ایک اور عجوبہ ہے کہ گرمیوں کی راتوں میں اس قصبہ کے پہاڑوں میں کسی کے جلائے بغیر جگہ جگہ تھوڑی تھوڑی آگ جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شیخ چائین حضرت عبدالعزیز دہلوی کے مشہور خلفاء میں سے ہیں۔ فقر و قناعت ان کا مسلک ہے خاص خاص شاگردوں کو تصوف کی کتابیں جیسے فصوص اور "نقد فصوص" وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ آخری عمر میں شہنشاہ اکبر ان کا نہایت معتقد ہو گیا تھا اور بعض مہموں میں ان سے دعا کرائی تھی۔ اپنے محل خاص کے قریب عبادت خانہ میں ان کی رہائش کا انتظام کرا دیا تھا۔ راتوں میں ان کے ساتھ خلوت میں باتیں ہوا کرتی تھیں، لیکن جب اکبر نے ان کو "نماز معکوس" پڑھتے دیکھا تو اس کی عقیدت و ارادت جاتی رہی۔

۹۸۹ھ میں جب بستر مرگ سے جا لگے تو شیخ عبدالعزیز کے لڑکے شیخ قطب عالم کو جو فوج میں ملازم تھا دہلی سے بلوایا اور خرقہ عصا اور مشائخ کا سارا سامان اس کے سامنے رکھ کر کہا یہ تمھارے والد کی امانت تھی اس کے لیے تم سے زیادہ کوئی دوسرا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات "حقیقت فقر" سے نکلتی ہے۔

شیخ قطب عالم کے دل پر بھی ایسا اثر ہوا کہ ملازمت ترک کر کے اپنے مرحوم والد کی جانشینی اختیار کر لی۔ اب وہ دہلی میں مقیم ہے اور حضور اکرمؐ کے قدم مبارک کی تولیت کو سنبھالے ہوئے ہے۔

شیخ عبدالغنی بدایونی

یہ بھی شیخ عبدالعزیز کے خلیفہ ہیں۔ ترک تعلق میں اپنے وقت کے ادہمؒ اور عالم تجرید میں اپنے زمانہ کے شبلیؒ ہیں۔

بدایوں میں وہ طالب علم ہی تھے کہ ان پر کیفیت و حال طاری ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میں سبق پڑھتے

کے دوران جب کہیں سے نغمہ کی آواز آجاتی تو پہروں بے ہوش ہو جاتے۔ جب ان کے ساتھی پوچھتے کہ تم نے کیا دیکھا جو یہ حالت ہو گئی؟ تو کہا کرتے تھے مجھے کچھ پتہ نہیں۔

شادی شدہ ہونے کی وجہ سے روزی کی تلاش میں دہلی آئے اور وہاں کے حاکم تاتار خاں کی خدمت میں پہنچے۔ تاتار خاں تھا تو حاکم لیکن درحقیقت نہایت خدا رسیدہ آدمی تھا۔ اس ملازمت کے دوران شیخ موصوف شیخ عبدالعزیز کے مرید ہو گئے اور تمام مروجہ مشہور کتابیں ان سے پڑھیں اور تحصیل علم کے بعد برسوں سبق پڑھایا۔

درس و تدریس کے مشغلے کے دوران ہی میں جذبہ باطنی اچانک جوش میں آیا اور تمام مشاغل ترک کر کے شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں کچھ عرصہ تک عبادت گزار درویشوں میں شامل رہے۔ بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ جب کمال باطنی حاصل کر لیا تو آبادی سے باہر قدمگاہ حضور اکرمؐ کے قریب ایک مسجد میں جا کر جو خان جہاں کی مسجد مشہور ہے مقیم ہو گئے۔ اگرچہ اہل و عیال اور خاندان کی بڑی ذمہ داریاں تھیں لیکن انھوں نے توکل کا مسلک اختیار کر لیا اور تقریباً ایک قرن ہو چکا ہے، اس گوشۂ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

۱۰۰۳ھ میں جب خان خاناں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے نصیحت کرنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا "حضور اکرمؐ کی پیروی اختیار کرو"۔ اس تحریر کے قریبی زمانہ ہی میں احمد صوفی، حامی بنارسی جو اس آخری دور فتن کے سربرآوردہ اشخاص ہیں اور نئے دین الٰہی کے نومسلم ہیں ؎

چند از صوفیاں شہر و دیار ‏ ‏ ‏ ‏ ہمہ نامرد مند و مردم خوار

ہر چہ دادی بدست شاں خوردند ‏ ‏ ‏ ‏ ہر چہ آمد ز دست شاں کردند

کار شاں غیر خواب و خوردن نہ ‏ ‏ ‏ ‏ ہیچ شاں فکر روز مردن نہ

ان لوگوں نے اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے اور اپنے فسق کو چھپانے کے لیے یہ چاہا کہ شیخ عبدالغنی اور ایک دو اور بقیۃ السیف بزرگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا جائے، چنانچہ ان لوگوں کو دہلی سے لاہور حاضر ہونے کے لیے فرمان جاری کر دیے گئے۔ شیخ نے میرے پاس ایک خط بھیجا جس میں انھوں نے آنے سے بڑی معذوری ظاہر کی تھی۔ میں نے احمد صوفی کو کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی مجبوریاں سمجھائیں یہاں تک کہ اس نے ان بزرگوں کی حاضری کا خیال چھوڑ دیا اور معافی کا ایک خط لکھ کر بھیج دیا۔ اس طرح یہ معاملہ بخیر و خوبی گزر گیا۔

شیخ بہلول دہلوی علم حدیث کے بڑے اچھے عالم تھے۔ صاحبان فقر و فنا کی صحبت میں رہے۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ سے فقر و توکل کے راستہ پر نہایت ثابت قدمی سے قائم ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہمیشہ طالب علموں کو درس دینے اور علمی فیض پہنچانے میں مشغول رہتے ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی آپ کا تخلص حقی تھا۔ علوم عقلی و نقلی دونوں سے بہرہ یاب اور ہنر و کمال کا مجموعہ تھے۔ تصوف میں بھی آپ کا بلند درجہ تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک تو "تاریخ مدینہ سکینہ" کا ترجمہ اور ہندوستان کے متاخر مشائخین کرام کے حالات کا ایک مجموعہ ہے جس کی تاریخ تصنیف "ذکر الاولیاء" سے

سے نکلتی ہے۔

عنفوانِ شباب سے ہی انھیں علوم و فنون سے بڑی دلچسپی تھی۔ شیخ فیضی اور مرزا نظام الدین احمد سے قدیم روابط تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ ان لوگوں کے ساتھ فتح پور میں رہے۔ اس زمانہ میں میں نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔

جب دینِ بادشاہی کا قضیہ پیدا ہوا اور حالات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے تو دوستیوں اور تعلقات میں بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ شیخ موصوف کے بھی بعض لوگوں سے تعلقات بگڑ گئے اور انھوں نے کعبۃ اللہ جانے کا عزم کر لیا۔ جلد ہی وہ دہلی سے اس طرح روانہ ہو گئے کہ کوئی سامانِ سفر ساتھ نہ تھا، غرض کسی نہ کسی طرح گجرات پہنچ گئے۔ وہاں میرزا نظام الدین احمد نے ان کے لیے زادِ سفر مہیا کر دیا اور ہر طرح سے مدد کر کے جہاز پر چڑھا دیا اور وہ حجاز پہنچ گئے۔ بعض قدرتی موانعات کی وجہ سے وہ مدینہ کی زیارت نہیں کر سکے۔ چند روز مکہ معظمہ میں رہے اور شیخ عبدالوہاب ہندی کا خادم شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی اجازت حاصل کر لی اور وطن واپس ہو گئے۔ یہ شیخ عبدالوہاب حاجی بیگم کے ساتھ حج سے جب آگرہ واپس آئے تھے تو میں نے ان کے ہاتھ سے آبِ زمزم پیا تھا اور برکت کے لیے حدیث کا درس پڑھا تھا۔

شیخ عبدالحق اب اپنے حال و کیفیت کو چھپائے ہوئے علوم رسمی پڑھانے میں مشغول ہیں۔ نہایت عالی ہمت آدمی ہیں، اس لیے وہ اپنے راستہ پر استقامت و کامیابی سے بڑھتے رہیں گے۔

جن دنوں وہ مکہ شریف سے دہلی تشریف لائے تھے میں حسبِ طلب بڑی تشویش و عجلت میں بدایوں سے بادشاہی لشکر کی طرف جا رہا تھا۔ ان سے بس ایک مختصر سی ملاقات ہوئی۔ جب میں لاہور پہنچ گیا تو انھوں نے ایک خط بھیجا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"بندگی و نیاز کے بعد۔ جس زمانہ میں آپ دہلی تشریف لائے تھے تو مجھے کچھ دیر کے لیے اپنی ملاقات سے نوازا تھا لیکن یہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ شوق و اشتیاق کی پیاس بجھی نہیں بلکہ اور بڑھ گئی، بہت سی باتیں کہنے سننے سے رہ گئیں۔ آج اس دنیا میں دوستوں سے ملاقات و گفتگو کی مہلت ہی نہیں ملتی، اگر دوستی سچی ہے تو انشاء اللہ عالم فردا میں باطمینان صحبتیں جمیں گی۔ آج تو بس تعلقات کو درست رکھنے اور نیتوں کو پاک رکھنے کی سعی ہی کی جا سکتی ہے، ہم نشینی بس روزِ فردا ہی میں نصیب ہوگی جبکہ جدائی اور وصال کے سارے حجاب اُٹھ جائیں گے۔ بہرحال آپ مجھے فراموش نہ کریں، میں تو ہمیشہ آپ ہی کے خیال میں رہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کے دل میں محبت و حقیقت پسندی جاگزیں ہے۔ اہلِ حرمین میں سے ایک بزرگ یہ دعا ہمیشہ پڑھا کرتے تھے "اللھم کما انعمت فزد کما ذوت خادم کما ادمت فبارك" اللہ تعالیٰ محبت و دوستی کی نعمت کو بڑھائے برقرار رکھے اور مبارک بنائے۔ اگر کبھی آپ اپنے عنایت نامہ سے نوازیں تو حضرت شیخ کلیم اللہ کے حالات سے ضرور مطلع فرمائیں۔ چند باتیں آپ سے عرض کی تھیں، اس سلسلہ میں بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن قلم نہیں چلا۔ اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب ان کا ذکر میرزا سے آیا تو اس نے اسی مطلب کے شعر کہے بلکہ صراحتاً لکھ دیا کہ یہ تکلف سے بعید ہے کہ اس خط کے

پہنچانے کی ذمہ داری آپ بجالائیں گے۔ والدعا۔"

شیخ فیضی دکن سے واپس آنے کے بعد حسب معمول احباب نوازی اور مجلس آرائی میں مصروف رہتا تھا اور گرمیٔ محفل کی خاطر دوستوں پر جان چھڑکتا رہتا تھا لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ سخت پریشان اور رنجیدہ رہتا تھا۔ اس نے لاہور سے شیخ عبدالحق کو بلاوے کے چند خط لکھے لیکن ان کے دل میں فیضی کی طرف سے بڑا رنج تھا اس لیے وہ نہ آئے اور معذرت کے جواب لکھ دیے۔ شیخ فیضی نے اس سلسلہ میں انھیں جو رقعہ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

"آپ سے ملاقات کا شوق محض رسمی اور ظاہری نہیں ہے نہ احاطۂ بیان میں آسکتا ہے۔ پہلے میں آپ کی مرضی و منشاء سے واقف نہ ہو سکا یہی گمان رہا کہ آپ بھی ملنے کے خواہش مند ہوں گے۔ لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ آپ نے دوستی کی یہ راہ ہی سرے سے بند کر رکھی ہے تو میں نے بھی آپ کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دے دی۔ خدا کرے یہ صورت حال گوارا ہو جائے۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے اپنے "خلوت کدہ تنگ" پر کسی ہنگامہ کو پسند نہیں فرمایا۔ آج سے دو تین دن پہلے نقارۃ الاولیاء میاں شیخ موسیٰ میرے ویرانہ پر تشریف لائے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بعید نہیں کہ جناب انھی دنوں آجائیں، ان سے میں نے اس کا سبب بہت کچھ دریافت کیا، لیکن گول مول جواب دے کر ٹال گئے۔ خدا کی قسم اس میں میری جانب سے کوئی اشارہ نہیں اور نہ کبھی ہوگا۔ ع

وقت گویا چہ حاجت طومار

اگر وہاں رہیں تو بھی منظور ہے اگر آجائیں تو نورٌ علیٰ نور۔ خدا کی قسم کہ میں نے اب یہ خواہش بالکل ہی دل سے نکال دی ہے، نہ اپنی یاد کا ذکر کیا ہے نہ اس کی طرف کوئی اشارہ اور نہ میں ایسا کروں گا اس لیے اس بارے میں آپ زحمت نہ اٹھائیں، لیکن مجھے بال و پر ہوتے تو پرواز کر کے اس حجرہ کی چھت پر آبیٹھتا اور نکات محبت کی ریزہ چینی کرتا اور والہانہ گیت گاتا۔ اب اور کیا لکھوں، آپ کی طرف سے ہی ساری تاخیر اور رکاوٹ ہے۔ خدا مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ تو بند نہ کیجیے۔ واضح رہے اگر یہ راستہ اس طرف سے بند ہوگا بھی تو ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا کھلا ہی رہے گا۔ اسکندر فقر میاں بھول کو نیازمندی پہنچا دیجیے۔ انھی دو دنوں میں کسی بہانہ یہ رباعی ہوگئی تھی۔

رباعی

فیض دم پیری ست قدم دیدہ بنہ
ہر گام کہ می نہی پسندیدہ بنہ

از عینک شیشہ ہیچ نکشاید ہیچ
لختی بتراش از دل و بر دیدہ بنہ

خدا کی عجیب شان کہ آج وہ شیخ فیضی نہیں رہا۔ اب تو ان گزر جانے والوں کی صرف باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں، وہ بھی کب تک، کیونکہ ہمارا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں کہ کب کوچ کر جائیں ؎

عنقریب است کہ از ما اثری باقی نیست
شیشہ بشکستۂ و می ریختۂ وساقی نیست

مولانا الہداد سلطان پوری سندھ میں وہ قریۂ بنودہ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم الملک کے شاگرد ہیں۔ شرافت اور حسب ونسب میں نہایت ممتاز و سربرآوردہ ہیں۔ ابتدا میں علم کے غرور اور جوانی کی ترنگ میں نہایت متکبّر تھے لیکن اب جب کہ دنیا کا اچھا خاصا تجربہ ہو چکا ہے ان کا وہ تکبر فقر و انکسار میں تبدیل ہو گیا ہے۔

کچھ عرصہ تک پنجاب کی صدارت کے عہدہ پر فائز رہے، اب کافی عرصہ سے الہ آباد کے نئے شہر کی قضاءت کے عہدہ پر مامور ہیں لیکن بادشاہ کی خدمت ہی میں رہتے ہیں۔ ان کو الہ آباد میں جو معمولی سی معاش ملی ہے اسی پر قناعت کر لی ہے۔ دنیا والوں کے گھروں پر دوڑ دھوپ نہیں کرتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

مولانا عثمان سامانہ عقلیات میں حکیم الملک کے شاگرد ہیں، نقلیات دوسرے اساتذہ سے حاصل کیے۔ مولانا بڑے مستعد آدمی ہیں۔ کیف و حال سے خالی نہیں، بڑے سمجھ دار اور نیک عالم ہیں، اکثر اوقات عبادت ہی میں صرف کرتے ہیں۔ دربار شاہی کے خدام میں شامل ہیں۔

چند سال تک وہ قلیچ خاں کے وسیلے سے دوآبہ میں پرگنوں کے انتظام و بندوبست پر بھی مامور کیے گئے تھے اب دربار میں بلا لیے گئے ہیں اور منصب داروں میں داخل کر لیے گئے ہیں۔

حاجی سلطان تھانیسری مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ علوم نقلی میں بڑی مہارت پیدا کی ہے۔ عرصہ دراز تک شاہی خدمات پر مامور رہے۔ چار سال تک مہابھارت کے ترجمہ میں جو "رزمنامہ" سے موسوم ہے تنہا بڑی مستقل مزاجی سے مصروف رہے۔ اس کا آغاز نقیب خاں سے ہوا تھا۔ تکمیل انھوں نے کیا۔

ان کے پرگنہ کے ہندوؤں نے چغلی کھائی کہ حاجی سلطان گاؤکشی کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں پس بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر کے بکر کی طرف خارج کر دیا۔ اس زمانہ میں صوبہ بکر کا نظم ونسق خان خاناں کے ہاتھ میں تھا اس نے بڑی مہربانی والتفات سے کام لیا اور جلے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہاں کی فتوحات سے فارغ ہوا تو ان کو اپنے ساتھ لیتے آیا اور معافی و رہائی دلانے کا وعدہ بھی کیا۔ وہ پوشیدہ طور پر وطن چلے گئے۔ اسیر اور برہان پور کی فتح کے بعد خان خاناں نے ان کی رہائی کے لیے بادشاہ سے کہا جو قبول کر لی گئی اور حاجی کا معاملہ اللہ نے سدھار دیا۔ شیخ ابوالفضل کو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو تھانیسر و کرنال کا کروڑی بنا دیا جائے، اب بھی وہ اسی خدمت پر مامور ہیں۔

جس زمانہ میں وہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے، کسی نے پوچھا یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟ انھوں نے کہا "دس ہزار سال پرانی خرافات کو مروجہ زبان کے پیکر میں اتار رہا ہوں۔"

سید شاہ میر سامانہ صحیح النسب سید ہیں۔ فضائل علمی سے آراستہ اور تقویٰ و زہد سے پیراستہ نہایت متوکل و قانع عالم تھے۔ دریائے آگرہ کے اس پار طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ شیخ بہاء الدین مفتی مرحوم کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں بہت سے عالم اور صوفی جمع رہتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک خادم مولانا فرید نامی کانا (یک چشم) تھا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی علم حاصل نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی بھی مشکل مسئلہ یا دقیق و گہری بحث کسی بھی بڑی سے بڑی کتاب میں سے دریافت کی جائے تو وہ گھڑی بھر میں دوات و قلم لے کر اس مسئلہ کو تحریری صورت میں حل کر کے رکھ دیتا تھا اور عجیب بات یہ ہے وہ جو کچھ لکھتا تھا خود اسے پڑھ نہیں سکتا تھا یا زبانی طور پر اس کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ ضیاء اللہ باوجود اپنے سلسلہ غوثیہ کے اس کے معتقد تھے تو پھر سید مشارٌ الیہ کا کیا ذکر۔ اس کے متعلق یہ بھی سننے میں آیا کہ اس نے ایک رات مشرق یا مغرب میں ہونے والے کسی واقعہ کی اطلاع سید شاہ کو دی تھی کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی جن اس نے مسخر کر رکھا ہے بعض کچھ اور کہتے تھے۔

جس سال بادشاہ نے شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ بلا کر عبادت خانہ میں ٹھہرایا تھا اور علماء و مشائخین کا کافی بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا میں نے ایک رات خلوت میں شیخ سے فرید کاتب کے متعلق دریافت کیا اور اس کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں بیان کیں اور ان سے پوچھا کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ شیخ نے پہلے تو اپنے مفردات مولفات اور فضائل و کمالات اور ذاتی حالات بیان کیے، پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ جو ساری نعمتیں عطا کر رکھی ہیں ان سب کے باوجود میں شیخ فرید کی خوشہ چینی کے بھی لائق نہیں ہوں اور جو کچھ تم نے اس کے بارے میں سنا ہے وہ عشر عشیر بھی نہیں ہے اس کا درجہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ سب اس کو حضرت میر مشارٌ الیہ کے آستانہ کی جاروب کشی کی بدولت نصیب ہوا ہے۔

اس واقعہ سے پہلے میں نے سید شاہ میر کو بدایوں میں جہاں وہ مدد معاش کے سلسلہ میں آئے تھے دیکھا تھا۔ کتاب "مشارق الانوار" سامنے رکھی ہوئی تھی اور علمی مذاکرہ گرم تھا۔ بلاشبہ وہ جدت پسند طبیعت اور ناقدانہ ذہن کے مالک تھے۔ لیکن جس قدر کہ شیخ ضیاء اللہ اور دوسرے آدمی ان کی تعریف کرتے ہیں میں نے ان کو اس درجہ کا نہیں پایا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، غالباً انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس چیز سے کسی کو محروم رکھا گیا ہو وہ کسی اور کو بھی نہ ملے۔

سید یاسین سید شاہ میر کے چچیرے بھائی ہیں۔ اکثر درسی کتابیں گجرات میں میاں وجیہ الدین سے پڑھی تھیں علوم رسمی کی تحصیل کے بعد میاں صاحب کے مرید ہو گئے اور حج کے لیے چلے گئے۔ وہاں حدیث کا علم حاصل کیا اور اجازت حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے۔ کچھ عرصہ تک لاہور میں امراء اور حکام کی صحبت میں رہے۔ پھر انھوں نے یہ تعلقات ترک کر دیے اور درویشی کا لباس پہن کر سرہند میں بقیہ عمر گزار دی۔

اپنے چند نیلی پوش خادموں کی بڑی اچھی تربیت کی، وہ پیشوائی میں مصاحب ادعا تھے۔

ہمیشہ گجرات، اور پھر وہاں سے حرمین شریفین جانے کی آرزو کرتے رہتے تھے۔ سرہند میں بھی زیادہ عرصہ ٹھہر نہ سکے اور بنگالہ چلے گئے۔ اب ذہن سیر و سیاحت میں لگے ہوئے ہیں۔ نہ معلوم ان کا کیا انجام ہوتا ہے اور وہ کس زمین کا پیوند بننے والے ہیں۔

شیخ ضیاء اللہ

شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں جو انداز بیان ان کا ہے صوفیاء میں کم ہی کسی کا رہا ہوگا۔ ان کی محفل میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کی ہی باتیں ہوتی تھیں۔ ان باتوں کا موضوع ہمیشہ توحید اور وحدت ہی کا مسئلہ ہوتا تھا۔ ان کے باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ آخر کون سا داعیہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے تھے۔

پہلے پہل جب ان کے فضائل کا شہرہ بلند ہوا تو میرے سننے میں آیا کہ شیخ اپنے باپ کی مسند فقر و ارشاد پر جانشین ہو گئے ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ قرآن شریف کے بھی حافظ تھے اور اس کی تشریح و توضیح کرتے تو کسی تفسیر سے مدد لینے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

سنہ ۹۷۰ھ میں ان سے ملاقات کے لیے میں آگرہ گیا اور کسی واقف کار کو وسیلہ اور ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی اور سادگی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا سلام علیک کہہ کر مصافحہ کیا کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیاوی تکلفات برتے جائیں تو یہ حصول مقصد میں آڑے بن جاتے ہیں۔ شیخ کی محفل میں بھی تعظیم و تکریم کے مراسم کا لحاظ رکھا جاتا تھا اس لیے ان کو میری یہ بے تکلفی کچھ پسند نہ آئی۔ اہل محفل نے مجھ سے پوچھا "آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" میں نے کہا "سہسوان سے"۔ پھر پوچھا گیا "تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟" میں نے جواب دیا "عرصہ سے ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی ہے"۔

سہسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس وقت وہاں ان کے باپ کا مرید قلیچ جوگان بیگ جاگیردار تھا، اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز و استہزاء کرنے لگے۔ ایک مسخرہ کو اشارہ کیا کہ مجھے تنگ کر کے محفل سے اٹھا دے۔ میں مشائخوں کی ایسی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بارہا ایسے مواقع پیش آئے تھے، میں ان باتوں سے انجان بنا رہا۔

وہ مسخرہ ہزل کرنے لگا کہ "کہیں عطر کی مہک آرہی ہے جس سے میرا دماغ جوش کھانے لگا ہے۔ اہل محفل ہوشیار رہیں تاکہ کسی کو میرے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچنے پائے"۔ یہ کہتے ہوئے اپنے منہ سے کف نکالنے لگا۔ ان کے ایک صوفی نما مصاحب نے مجھ سے پوچھا "یہ عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟" میں نے کہا "ہاں، لیکن بات کیا ہے؟" اس نے کہا "یہ جو باؤلا شخص ہے اس کو کسی وقت کتے نے کاٹ کھایا تھا جس وقت بھی وہ خوشبو سونگھ لیتا ہے کف منہ سے نکالنے لگتا ہے اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ آپ بھی ذرا ہوشیار رہیے"۔ یہ سن کر حاضرین پریشان سے ہو گئے۔ شیخ بھی مجھے ڈرانے کے لیے دیدہ و دانستہ اس طرف کو ہٹ

گئے جدھر نئی عمارت بن رہی تھی۔ اس طرح اُنھوں نے ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

اس موقع پر میں نے کہا "بڑی حیرت ہے کہ اس بارگاہ عالی پر لوگ بڑی دور دور سے اپنی حاجتیں پوری کرانے آتے ہیں اور یہاں ایک سگ گزیدہ دیوانہ کا علاج نہیں ہو سکتا؟" اُنھوں نے کہا "کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟" میں نے کہا "ہاں"۔ پوچھا "وہ کیا علاج ہے؟" میں نے کہا "اس کے سر پر ڈھیلے اور جوتے مارے جائیں تو اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے:

"سگ دیوانہ را دارو کلوخ است"

(دیوانہ کتے کا علاج ڈھیلا ہے)

میری بات سُن کر سب فق سے ہو کر رہ گئے۔ پھر میں نے کہا "کلوخ (ڈھیلا) ایک بوٹی کا نام بھی ہے جو کُتّے کاٹے کی موثر دوا ہے۔" شیخ نے جب دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر نہیں ہوا تو کہا "آؤ اللہ رسول کے ذکر میں مشغول ہو جائیں۔" پھر اُنھوں نے کلام پاک کو کھولا اور سورۂ البقر کی ایک آیت کی تفسیر شروع کر دی اور طرح طرح کی پیچھے دار باتیں بیان کرنے لگے۔ شیخ جو بھی اُلٹی سیدھی بکواس کرتے جاہل ٹولہ جو اس پر آمنا و صدقنا کہہ اٹھتے۔ میرا دل تو ان کی طرف سے بھرا ہوا تھا اس لیے میں نے قصداً ٹوک دیا اور ان سے پوچھا "یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں کسی اور تفسیر میں بھی ہے؟" کہنے لگے "میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے۔" میں نے کہا "اچھا تو پھر یہ بتائیے یہ مطلب حقیقی ہے یا مجازی؟" اُنھوں نے جواب دیا "مجازی"۔ میں نے کہا "ان دو (حقیقی اور مجازی) مطلبوں میں کونسا علاقہ ہے؟" اس طرح میں نے ان کو علم بیان کی بحث میں اُلجھا لیا۔ اُنھوں نے کچھ اُلٹی سیدھی باتیں کیں اور ہر طرف دوڑ لگانے لگے اور جب میں نے ان کو کس کر گھیرا تو بس اُکھڑ گئے۔ قرآن کو ٹپک کر کہنے لگے "میں نے علم عبدل نہیں پڑھا ہے۔" میں نے کہا "آپ قرآن کا ایک ایسا مطلب بیان کرتے ہیں جو کسی اور جگہ منقول نہیں ہے، لامحالہ آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی رابطہ و علاقہ دریافت کیا جائے گا۔" شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے تو بات کو اِدھر اُدھر پھیر کر میرا حال احوال پوچھنے لگے۔ میں نے انہی دنوں قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی، اس کا ایک باب میں نے شیخ کے سامنے رکھ دیا اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلہ میں جو نکتے میرے ذہن میں آئے تھے، بیان کیے بڑی تعریف کی اور خود بھی اس بارے میں چند نکات بتائے۔ ان سے پہلی ملاقات کا تو یہ رنگ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ میں اکبر بادشاہ کی ملازمت میں تھا اور شیخ حسب طلب حیران پریشان تنہا عبادت خانہ شاہی میں آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔

جمعہ کا دن تھا کہ بادشاہ پہلے ایک دو آدمیوں کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ میرزا غیاث الدین، علی اخوند، میرزا اخوند اور میرزا علی آصف خاں کو کہہ رکھا تھا کہ شیخ کو بحث میں الجھا کر تصوف کا مطلب دریافت کرو، دیکھیں وہ کتنے پانی میں ہے۔ چنانچہ آصف خاں نے گفتگو شروع کی اور "لوائح" کی یہ رباعی پیش کی:

گر در دل تو گل گذرد و گل باشی — ور بلبل بیقرار بلبل باشی

تو جزئی و حق کل است اگر روزی چند — اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ کو کل کس طرح کہا جا سکتا ہے جبکہ وہ جز اور کل ہونے سے برتر و اعلیٰ ہے۔ شیخ تباہ حالی کے بعد دربار میں آئے تھے، ان کا سارا غرور و پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے، نہایت عاجز و شرمندہ تھے اِس لیے اُنھوں نے ایسے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے جسارت کر کے کہا مولوی جامیؒ نے اگرچہ اس رباعی میں اللہ تعالیٰ پر "کل" ہونے ہی کا اطلاق کیا ہے، لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے۔

این عشق کہ ہست جزء لاینفک ما — حاشا کہ شود بعقل ما مدرک ما

خوش آنکہ دمد پرتوی از نور یقین — ما را برہاند از ظلام شک ما

لیکن اس کل ہونے اور جز ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جز ہو یا کل (ہمہ اوست) سب کچھ وہی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود حقیقت میں نہیں ہے۔ اصل میں اس کی اصل حقیقت کو عبارت میں نہیں لایا جا سکتا اس لیے اس کی تعبیر کبھی کُل سے اور کبھی جز سے کی جاتی ہے۔ پھر میں نے وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور چند مسائل جن پر میں نے ان دنوں عبور حاصل کیا تھا شیخ کی طرف سے تائیداً بیان کیے۔ میری اس تقریر پر بادشاہ بہت خوش ہوئے اور شیخ بھی۔

انہی دنوں شیخ کے سوتیلے بھائی شیخ اسماعیل نے جو فتح پور کے محلہ خواجہ جہاں میں میری قیام گاہ سے قریب ہی رہتا تھا اور ہماری آپس میں جان پہچان اور ملاقات بھی اس نے عبادت خانہ میں تخلیہ کرا کے میری اس ملاقات کو یاد دلایا جو گیارہ سال پہلے شیخ سے ہوئی تھی اور جس کا ذکر اس نے میری زبانی سن لیا تھا۔ یہ سن کر شیخ حیران رہ گئے اور کہا "مجھے یاد نہیں کہ ایسا کبھی ہوا ہوگا"۔

شیخ اب آگرہ میں اپنے باپ کی طرح مشائخانہ وضع میں عیش و آرام سے بسر کر رہے ہیں، ان کی محفلوں میں مذہبی دُکانداری کا رنگ ہے، اپنی پُرانی حالت پر قائم ہیں۔ ان کی عام فریب سادہ لوحی کے بڑے قصے مشہور ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔

میر ابوالغیث بخاریؒ کہا کرتے تھے وہ جیسا کچھ بھی ہو ہوا کرے لیکن وہ درویشانہ لباس، فقیرانہ مجلس اور تصوف کی باتیں کرنے کا (اس زمانہ میں) اہتمام کیے ہے اور اپنی روش پر استقامت سے قائم ہے بس اس کی ان اداؤں پر ہم دل و جان سے معتقد ہیں۔

جس سال کہ خان زماں کی مہم فتح ہوئی تھی وہ لشکر کے ہمراہ انبیٹھی گئے تھے وہاں حضرت میاں شیخ نظام الدین سے ملاقات کی، وہ آیت کریمہ "ویسقون فیہا کاساً کان مزاجہا زنجبیلا عینا فیہا تسمی سلسبیلا" کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ شیخ نے اپنی حیثیت ظاہر کی اور مداخلت کر کے کہا "اس آیت میں اور ایک دوسری آیت

میں تناقض ہے۔" حضرت نے فرمایا: "سبحان اللہ باپ تو وہاں (عالم بالا) میں غوطے کھا رہا ہے، شفاعت کامل کا محتاج ہے اور بیٹا یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام میں تناقض ثابت کر رہا ہے۔" ع

"مدعی نبود ہر آنچہ در سینہ بود"

میر ابوالغیث بخاریؒ

یہ بڑے پاک مشرب، عالی ہمت بزرگ تھے۔ ان کے اخلاق فرشتوں کے اخلاق تھے۔ غنا کے پردہ میں فقر کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ اُنھوں نے بہت سے علماء و مشائخین سے استفادہ کیا تھا۔ سخاوت و بخشش، آزادہ روی، حسن معاشرت، صدق معاملت اور میل ملاپ میں اللہ کی کھلی نشانی تھے۔ احکام شریعت کی پابندی اور صوفیائے سلف و خلف کی پیروی پوری طرح کیا کرتے تھے۔ سنت اور نماز باجماعت سے ایسا شغف تھا کہ مرض موت میں بھی باوجود سخت بیماری کے تکبیر تحریمہ بھی ان سے فوت ہونے نہ پائی۔ ان کی مجلس کبھی اللہ رسول کے ذکر اور بزرگوں کی باتوں سے خالی نہیں رہی۔

ان کی تاریخ وفات "میر ستودہ سیر" ہے

میاں کمال الدین حسین شیرازی

احباب کے تذکرے نے میرے دل کو کھول دیا ہے۔ ان کے ذکر میں اگر طوالت ہو تو عزیز قارئین تنگ دل نہ ہوں۔

میاں کمال الدین حسین مولانا حسن شیرازی کے لڑکے ہیں۔ جس وقت شاہ اسماعیل نے خروج کیا تھا وہ (مولانا حسن) شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے پھر وہاں سے گجرات پہنچے اور سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں سید رفیع الدین محدث اور میاں ابوالفتح خراسانی (جو میاں بدہ کے والد ہوئے ہیں) کے قافلہ کے ساتھ آگرہ آئے اور اس جگہ بس گئے۔

شیخ زین الدین خوافی مشہور شاعر نے مولانا حسن کی شان میں کہا ہے ؎

ہست شعر من ز عقل و نقل خواہم بشنود

جامع المعقول والمنقول مولانا حسن

مولانا حسن کے صاحبزادے میاں کمال الدین حسین نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کا ذکر تحریر و تقریر سے بالا ہے۔ اکبر ان کی بزرگی اور بڑائی کے پیش نظر اس بات کا خواہاں تھا کہ وہ بادشاہی ملازمت میں رہیں۔ لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور دنیاوی اعزازات سے منہ پھیر کر مختصر سی مدد معاش کی اراضی پر قناعت کر لی۔ فقر و ایمان کو اپنا سرمایہ بنا لیا۔ وہ ہمیشہ عبادت و اطاعت میں مصروف رہتے تھے اور بڑے اطمینان و بے فکری کے ساتھ کبھی دہلی میں اور کبھی آگرہ میں رہا کرتے تھے۔

لڑکپن سے بڑھاپے تک عبادت، ذکر الٰہی، تلاوت کلام پاک برابر ان کا معمول رہا، کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ ان فضائل و کمالات کے علاوہ علمی استعداد بھی بہت اونچی تھی۔ شاعری، خوش خطی، حسن املاء اور انشاء پردازی تو ان کی موروثی فضیلت تھی ہی۔

میں ابتدائی عمر میں بیرم خاں کے عہد میں آگرہ آیا تھا۔ میرا سب سے پہلا قیام مسجد فیض بخش میں انہی کے مکان پر رہا تھا۔ اس دوران میں میں نے ان کے آستانہ سے بڑی سعادتیں حاصل کیں۔ اُس وقت سے اب تک کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں پورے چالیس سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں انھوں نے تعارف و آشنائی کی ہمیشہ رعایت برتی اور میرے ساتھ برابر مہربانی اور دلسوزی سے پیش آتے رہے۔ ان کی اتنی مہربانیاں ہیں کہ اب مزید اضافہ کی گنجائش ہی نہیں رہی ؎

بس عشق کہ آں کم شد و بس حسن کہ آں کاست
عشق من و حسن تو ہماں بلکہ فزوں ہم

اُنھوں نے مجھے لکھا تھا:

"ان دنوں جب کہ بندوں کی خدائی کا دور دورہ ہے، محبت و دوستی اُٹھ چکی ہے، میں تنہائی اور جدائی کے غم میں مضطرب و بے چین رہا۔ بے قراری میں کبھی دہلی چلا جاتا اور وہاں کے متبرک مزاروں کی زیارت میں لگا رہتا۔ کبھی اپنے بے سہارا بچوں کو دیکھنے کے لیے آگرہ چلا آتا۔ اسی افراتفری میں تھا کہ تمہارے متعدد خط یکے بعد دیگرے پہنچے۔ خدا گواہ ہے کہ تمھارے خطوط سے بڑی تسلی اور تسکین حاصل ہوئی۔ چند دن تک ان خطوط کو بار بار پڑھتا رہا اور صبح و شام تمھارے لیے دعائیں کیں۔ ع

الٰہی تا قیامت زندہ باشی

مکرم و محترم میرزا نظام الدین احمد کی رحلت کی خبر سن کر نہایت ملال اور رنج ہوا۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم خوبیوں کا مجموعہ اور نادرہ روزگار تھے۔ بس کیا کہا جا سکتا ہے یہ جو صدمے مسلسل اور متواتر پہنچ رہے ہیں ان کا ذکر ہم آخر کس سے کریں۔ اب ہم اپنی موت کے منتظر بیٹھے ہیں کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں۔ ہمیشہ یہ دعا وردِ زبان ہے:

"اللهم ارحمنا اذا عرق الجبين وكثر الانين ويئس منا الطبيب وبكى علينا الحبيب اللهم ارحمنا اذا اداؤنا التراب وودعنا الاحباب وفارق النعيم وانقطع عنا النسيم" امید ہے کہ آخرت اچھی ہو جائے گی اور دنیا سے ایمان سلامت لے جائیں گے۔ خط کی روانگی میں عجلت تھی اس لیے میں نے دات بڑی جلدی ہی میں یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ تمھارے ساتھ جو دلی اشتیاق ہے وہ بہرحال حدِ بیان سے باہر ہے۔ بس اس کو تم اپنے دل ہی سے محسوس کر سکتے ہو الفاظ سے اسے محسوس نہیں کرایا جا سکتا۔"

شیخ ابوالفتح تھانیسری

اپنے زمانہ کے بڑے متبحر اور بلند مرتبت عالم تھے۔ حدیث کا علم مولانا سید رفیع الدین محدث سے حاصل کیا تھا۔ میر صاحب ہی کے محلہ میں آگرہ میں تقریباً پچاس سال تک عقلی و نقلی علوم کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس سے بڑے ذہین صاحب علم اُٹھے ہیں۔ میں اور میاں کمال الدین حسین نے بھی ان بزرگوار کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔

ان کا لڑکا شیخ عیسیٰ اب آگرہ میں مفتی کے عہدہ پر متعین ہے +

مولانا عثمان بنگالی پرانے بزرگوں میں سے تھے سنبھل میں آکر مقیم ہوگئے تھے۔ میاں حاتم سنبھلی نے بھی ان سے پڑھا ہے۔ کبھی کبھی وہ مولانا عثمان کی خدمت میں جاکر ان سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔

میں بھی لڑکپن میں میاں مرحوم کے ساتھ مولانا مذکور کی خدمت میں حاضر ہوکر سعادت اندوز ہوا تھا۔ بڑے خداترس بزرگ تھے +

شیخ حسین پزہری بڑے درجہ کے عالم تھے۔ دہلی کے مدرسہ میں طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ ہندوستان میں جو علوم نقلی مروج و مشہور ہیں ان میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا، وہ سب سے ممتاز و سربرآوردہ تھے ساتھ ہی نہایت بااخلاق آدمی تھے، علم و اخلاق کے سارے محاسن ان کی شخصیت میں جمع تھے +

مولانا اسماعیل عرب شیخ حسین کے ہم عصر اور ان کے برابر کے عالم تھے۔ خاص طور سے علم ہیئت، حکمت اور طب میں تو ان کی کوئی نظیر نہیں تھا۔ شیخ حسین کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے فیوض سے طالب علم پوری طرح استفادہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا کافی مالدار آدمی تھے۔ شہر کے بعض شریر لوگوں کے اشارہ پر چوروں نے ان کے گھر میں ڈاکہ ڈالا اور انھیں شہید کردیا +

قاضی مبارک گوپاموی علم کے اونچے مدارج پر ان کا مقام تھا۔ قضاءت کے عہدہ میں بڑی دیانتداری اور نکتہ رسی سے کام لیتے تھے۔ علوم کی تحصیل اور اخلاقی تربیت میاں شیخ نظام الدین انبیٹھی والے کی خدمت میں حاصل کی تھی۔ میاں صاحب نے انھیں اپنی خاص نگرانی میں رکھ کر تربیت دی تھی۔

جب کبھی قاضی مبارک میاں صاحب سے کہتے کہ اگر مسلک ولایت میں سے بھی کچھ برکتیں مجھے عنایت ہوجائیں تو کیا حرج ہے۔ میاں صاحب ان کو جواب دیتے "قاضی مبارک! تجھے تو دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی۔"

قاضی مبارک آخر عمر تک بڑی عزت و تکریم کے ساتھ بسر کرتے رہے اور دنیا سے محترم و معزز ہی اٹھے۔

قاضی مبارک سے استفادہ کے لیے دور دراز سے لوگ گوپامؤ آتے تھے، بہت سوں نے تو اسی جگہ اپنا وطن بنالیا تھا اور ان کے فیض سے درجۂ کمال تک پہنچے تھے۔ ان کے دامن تربیت سے فیض یاب ہونے والوں میں مخدوم بدھ بھی ہیں جو اکثر درسی کتابوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دوسرے معلم سید محی بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کا یہ قافلہ اپنے ٹھکانے پہنچ چکا ہے۔ اب ان کا کوئی قائم مقام نہیں رہا۔

علم کا میدان تو اب روز بروز شیروں سے خالی ہوتا جارہا ہے اور ان کی جگہ روباہ صفت لوگوں نے لے لی ہے۔

"مشارق الانوار" کے مصنف نے بھی یہ فریاد اپنے زمانہ میں کی تھی کہ "لولا تحلی الغاب عن دسامة ذی الشبلین لماصیح بھا نغالة ابو الحصین" ۔

ہمیں نافۂ مانند مسکیں حسن را
از اں روز ترسم کہ ایں ہم نماند

مولانا ویس گوالیاری

بڑے دانشور اور مناظرہ و مجادلہ کرنے والے عالم تھے۔ اصول و فروع کے مباحث میں ان کی ٹکر کا کوئی نہ تھا۔ حافظہ کا یہ عالم کہ بحث مباحثہ کے وقت جب کسی عبارت کو نقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو کتاب کے مضموں کے صفحے زبانی پڑھتے چلے جاتے اور کہتے یہ عبارت فلاں کتاب میں ہے کھول کر دیکھ لو۔ اس کے بعد بس وہ اپنے حریف کے سر ہو جاتے اور اسے الزامات کی زد پر رکھ لیتے، لیکن اکثر ایسا ہوا کہ جب کتابوں میں حوالے کی جستجو کی گئی تو وہ عبارت کہیں نہیں ملی۔ اسی طرح اُنھوں نے ایک دن بادشاہ کے سامنے مولانا الیاس منجم کو بھی جو ہمایوں بادشاہ کے استاد اور رمل و نجوم کے ماہر تھے۔ الزام دے دے کر زچ کر دیا۔ مولانا الیاس کو اس کا ایسا رنج ہوا کہ سرکار لکھنو میں پرگنہ موہاں ان کی جاگیر میں تھا اس جاگیر کو چھوڑ دیا، سپاہگری پر دو حرف بھیجے اور کوچ پر کوچ کر کے گجرات چلے گئے اور وہاں سے مکۂ معظمہ پہنچے۔

جب وہ عراق، آذربائیجان، اردبیل کی ولایت میں پہنچے جہاں ان کا وطن بھی تھا تو شاہ اسماعیل ثانی کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو بہت مشہور ہے۔ مولانا الیاس جب اردبیل پہنچے تو اُس وقت شاہ طہماسپ نے شاہ اسماعیل کو قلعہ قہقہہ میں قید کر رکھا تھا۔ مولانا نے اس کے نام ایک رقعہ لکھا کہ سیاروں کے حساب سے مجھے اس کا علم ہوا ہے کہ تمھیں فلاں مہینے رہائی مل جائے گی اور اس چاہِ ندامت سے نکل کر مسندِ عزت پر قدم رکھو گے اور تختِ سلطنت پر جلوس کرو گے۔ جیسا کہ اُنھوں نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد شاہ طہماسپ کو زہر دے دیا گیا اور عراق میں بڑا انقلاب رونما ہو گیا۔ امیروں اور وزیروں نے شاہ اسماعیل کو قید خانہ سے نکال کر اردبیل کے راستہ تخت نشینی کے لیے لے کر گئے۔ مولوی الیاس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جب تم قہقہہ سے اردبیل پہنچو مجھ سے لازماً ملنا تاکہ بالمشافہ بعض ضروری امور طے کر لیے جائیں اور اسمائے عظیمہ کا عمل رو برو انجام دیا جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شاہ اسماعیل کو وہاں سے عجلت میں گزرنا پڑا اور وہ مولوی موصوف کے گھر پر نہ جا سکا۔ اردبیل سے روانہ ہونے کے بعد وہ لوٹ کر آیا اور مولوی الیاس سے ملنا چاہا لیکن اُنھوں نے مکان کا دروازہ بند کر لیا اور ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بادشاہ نے مجبوراً دروازہ توڑ دیا اور زبردستی ان کے حجرہ میں گھس کر ملاقات کی۔ بادشاہ کے آنے پر اُنھوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور دیوار کی طرف رُخ کر کے کہا وہ مقررہ گھڑی گزر گئی اور تو نہیں آیا، اب میں تیرا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ شاہ اسماعیل مایوس لوٹ آیا۔ اگرچہ سلطنت اس کی جم گئی لیکن ایک ہی سال بعد امیروں نے متفق ہو کر اس کی بہن پری جان خانم کو اس کے قتل پر مامور کیا، اُسے بھی اس کا پتہ چل گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی سدِ باب کرتا پری جان خانم نے اس کو بیہوش کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

شیخ محمد شامی

نسلاً عرب ہیں اور شیعوں کے بڑے مجتہد شیخ زین الدین جبل عاملی کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ شیخ زین الدین کو خلیفۂ روم نے بڑے حیلہ و تدبیر سے مکۂ معظمہ میں گرفتار کرا کے استنبول بلوایا اور قتل کرا دیا تھا۔

شیخ محمد منصب داروں میں شامل ہیں۔ بہادر اور شجیع آدمی ہیں، عربوں کی روایتی سخاوت بھی ان میں موجود ہے، نہایت متواضع اور بااخلاق بزرگ ہیں۔ عربی اور ادبی علوم میں ان کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ شاید ہی کسی کو ہو۔

(مصنف نے شیخ محمد کے عربی میں پانچ خط نقل کیے ہیں جن کی عبارت اکثر جگہ غلط ہے پیش نظر نسخہ کے مرتبین نے بھی یہی لکھا ہے کہ منتخب التواریخ کے متعدد نسخوں کو دیکھنے کے باوجود ان خطوط کی عبارت درست نہیں ہو سکی۔ یہ خط مصنف ہذا ملا عبدالقادر بدایونی کے موسومہ ہیں۔ پہلا خط ملا صاحب کے جواب میں ہے، دوسرا چند دن کی جدائی کے بعد شیخ صاحب نے لکھا تھا۔ تیسرا رقعہ اس وقت لکھا جب کہ لشکر ۱۰۰۲ھ میں دکن گیا تھا، پھر وہاں سے چھاؤنی اٹھ گئی تھی۔ چوتھا رقعہ شکایت و عتاب پر مشتمل ہے۔ پانچواں لشکر کے کوچ کے موقع پر۔ ان رقعوں میں رسمی دوستانہ باتیں ہیں اور بس۔ م)

شیخ حسن علی موصلی

یہ شاہ فتح اللہ کے شاگرد رشید ہیں، لیکن نہایت مخلص سنی۔ جس سال کابل فتح ہوا یہ شاہی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ انھیں بڑے شاہزادہ کی تعلیم پر مقرر کیا گیا۔ وہ شاہزادہ کو فارسی کے رسالے اور علم حکمت کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک شیخ ابوالفضل نے بھی خفیہ طور پر ان سے ریاضی اور طبیعیات اور حکمت کے فنون کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم کے نکات و رموز سیکھے۔ اس حق اُستادی کے باوجود وہ کبھی ان کی تعظیم نہیں کرتا تھا۔ خود تو اوپر بیٹھتا تھا اور اُستاد زمین پر۔ اس جیسے لوگوں کے طور طریق ان کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے چنانچہ وہ ایسے بیزار ہوئے کہ ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ تک مرزا نظام الدین احمد کی صحبت میں رہے۔ مرزا نے اور ان کے لڑکے محمد شریف نے عقلی علوم میں ان سے استفادہ کیا اور بڑی دسترس و کمال حاصل کر لیا۔

شاہ فتح اللہ کے انتقال پر ابوالفضل اور دوسرے مصاحبوں نے دربار میں شیخ حسن علی کے علم و فضل کا ذکر کر کے بادشاہ کو بخوبی سمجھا دیا کہ آج شاہ فتح اللہ کے جانشین صرف وہی ہیں چنانچہ ان کے بلانے کے لیے شاہی فرمان جاری کیا گیا اور وہ حسب الطلب لاہور آئے۔ کورنش کے موقع پر نظام الدین احمد نے ان کو زبردستی سجدہ کرایا۔ اس بات کا انھیں سخت صدمہ ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی ماں سے ملنے کا بہانہ کر کے وطن جانے کی رخصت حاصل کر لی۔ اور ۹۹۸ھ میں خان خاناں کے دور حکومت میں سہتہ پہنچے اور خدا کے بھروسہ پر اپنے ملک کی سمت چل پڑے جب ہرموز پہنچے تو وہاں سے اکبر کے درباریوں کو پیام بھیجا:

"الحمد للہ میں نے منافق دوستوں سے چھٹکارا پا لیا! انشاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا۔"

قاضی نور اللہ شستری

مذہباً یہ شیعہ تھے اور نہایت منصف مزاج، عادل، نیک نفس، حیادار متقی تھے شرفاء کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں علم دفن، جدت طبع، تیزی فہم، ذہانت و ذکاوت تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔

ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں۔ شیخ فیضی کی مہمل بے نقط تفسیر پر انھوں نے سرنامہ (توقیع) لکھا جو حد تعریف

سے ماورا رہے۔ شعر گوئی کا طبعی ملکہ ہے، نہایت دلکش اشعار کہتے ہیں۔ حکیم ابوالفتح کے توسط سے بادشاہ کی بارگاہ میں رسائی ہوئی تھی۔

جس زمانہ میں شاہی لشکر لاہور پہنچا تھا تو شیخ معین قاضی لاہور حاضری کے لیے آئے۔ بڑھاپے کے ضعف اور اعصابی کمزوری کی وجہ سے دربار میں بیہوش ہو گئے۔ بادشاہ کو ان کے بڑھاپے پر بڑا ترس آیا اور فرمایا "شیخ اب کام کے قابل نہیں رہے ہے اس لیے ان کی جگہ قاضی نوراللہ کو مقرر کر دیا جائے۔"

انھوں نے لاہور کے شر پسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے، سیدھا کر کے رکھ دیا اور رشوت کے دروازے بخوبی بند کر دیے اور ان پر کڑی نگرانی رکھی کہ اس سے بڑھ کر ان کا انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ؎

توئی آں کس کہ نکردی ہمہ عمر قبول
در قضا ہیچ ز کس جز کہ شہادت ز گواہ

ایک مرتبہ شیخ فیضی کے مکان پر محفل جمی ہوئی تھی اور قاضی موصوف تفسیر نیشاپوری سامنے رکھے آیت کریمہ — "اذ یقول لصاحبہٗ لا تحزن ان اللّٰہ معنا" (جس کے متعلق تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے) کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ "اگر یہاں صحبت لغوی مراد ہے تو یہ کوئی مدح کی بات نہیں اور اگر اصطلاحی ہے جیسا کہ اہل حدیث کا مسلک ہے تو ہم کو یہ تسلیم نہیں۔" میں نے کہا "اگر ایک بچہ سے بھی جو عربی زبان جانتا ہو پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ یہ آیت مدح پر صریحاً دلالت کرتی ہے، ذم کا کوئی پہلو نہیں۔ اسی طرح کوئی کافر حبشی یہودی ہندی جو عربی زبان جانتا ہو یہی کہے گا۔"

غرض قاضی سے اس موضوع پر بڑی گرما گرم بحث رہی اور شیخ فیضی نے اپنی عادت کے مطابق قاضی کا ساتھ دیا، حالانکہ وہ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے دونوں جانب سے بے تعلق سا تھا۔ اتفاق کی بات کہ نیشاپوری کی تفسیر سے بھی میری تائید ہو گئی بلکہ یہ اضافہ بھی تھا کہ "اگر اس وقت حضور اکرمؐ داعیٔ حق سے جا ملتے تو ان کے رعایا کے لیے صدیق اکبرؓ ہی نمائندہ ہوتے کوئی اور نہیں۔"

حاجی ابراہیم محدث

آگرہ میں زہد و تقویٰ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ علوم دینی خاص طور پر درس حدیث ان کا مشغلہ تھا۔ شریعت کی پابندی پر سختی کی وجہ سے لوگ ان سے ملتے ہوئے جھجکتے تھے، کیونکہ وہ امر معروف اور نہی عن المنکر سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔

جب حسب طلب عبادت خانہ شاہی میں آئے تو شاہی مراسم اور تکلفات کی پابندی نہیں کی اور بے خوف وعظ و نصیحت کرنے لگے۔ خواجہ عبدالصمد شیرازی جو قدیم آرائشی سامان کرایہ پر چلانے کی وجہ سے خواجہ عبداللہ کے نام سے مشہور تھے اور نماز روزہ اور عبادتوں میں بہت مشغول رہتے تھے حاجی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے:

"خواجہ جب تک دل میں خلفائے راشدین کی محبت نہ ہو یہ نماز روزہ کچھ فائدہ نہیں دیتا۔"

شیخ جلال واصل کالپی والے یہ شیخ محمد غوث کے خلفاء میں سے ہیں۔ پہلے جو علوم حاصل کیے تھے بعد میں وہ سب کچھ بھلا بیٹھے۔ سماع و جد و حال ہی کا ذوق اور مشغلہ تھا بادشاہ سلامت کو ان کے بارے میں بڑا حسن ظن تھا۔

شیخ غوث کے خلفاء میں شیخ سلیم کے خلفا کی نسبت تصنع اور بناوٹ بہت کم تھی۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے بڑے مخالف تھے، بعد میں چل کر تو وہی معاملہ پیش آیا کہ جب حضرت علی رضؓ کے سامنے آیت کریمہ ــــ "وقالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ شیئٍ وقالت النصاریٰ لیست الیھود علیٰ شیئٍ" ــ پڑھی گئی تو آپ نے فرمایا صدقنا والحمد اللہ کہ اب ان دونوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

ملک محمود پیارو عربی علوم تفسیر حدیث اور فارسی نظم و نثر کے اچھے عالم تھے۔ نہایت صالح مزاج اور ذوق و حال سے مناسبت رکھتے تھے۔ نسلاً وہ سلاطین گجرات کے خاندان سے ہیں۔ والد کا نام ملک پیارو تھا۔

ملک محمود نہایت فصیح زبان دانشور اور مدبر تھے۔ چنانچہ بادشاہی محفلوں میں اکبر کی میزبانی کا انھیں شرف حاصل تھا۔ اولیاء اللہ سے بڑا اعتقاد تھا اس لیے اکبر نے انھیں چند روز کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضہ مبارک کا متولی بنا دیا تھا۔

ملک محمود کو مخدوم جہانیاں بخاری کے جانشین مخدوم شاہ عالم بخاری سے ایسی عقیدت ہو گئی کہ انھوں نے بادشاہ سے اس درگاہ کی مجاورت کی درخواست کی جو بڑے پس و پیش اور ردو بدل کے بعد قبول کر لی گئی اور وہ احمد آباد جا کر اس آستانہ کے مجاور بن بیٹھے۔ توکل و قناعت کا گوشہ اختیار کر لیا اور اسی مجاورت میں انتقال ہوا۔

میں نے اجمیر اور فتح پور دونوں جگہ ان سے ملاقات کی تھی۔

شعر سے بھی ان کو بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ یہ مطلع انہی کا ہے ؎

دارم دلی گرداں کہ من قبلہ نما می خوانمش
رو سوئے ابرو لیش کند ہر چند می گردانمش

صدر جہاں پہانی پہانی قنوج کا ایک ماتحت گاؤں ہے۔ صدر جہاں سید اور خوش مزاج عالم ہیں۔ ان کی ساری عمر لشکر ہی میں گذری۔ علوم و کمالات شیخ عبدالنبی سے حاصل کیے اور شیخ موصوف ہی کی سعی و کوشش سے اتنے سال ممالک محروسہ کے مفتی رہے۔

جب ہندوستان کے ائمہ پر زوال آیا تو انھوں نے اپنی خدمات، زمانہ سازی اور دنیاداری کی بدولت بہت جلد اپنی عزت و احترام کو بحال کر لیا۔

جب وہ حکیم ہمام کے ساتھ حاکم توران کے پاس سفارت پر گئے، پھر وہاں سے واپس آئے تو ان کو صدارت کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔

جن دنوں لاہور میں بچے کھچے علماء کو مکہ معظمہ بھجوا دینے کی افواہیں گرم تھیں، اور ایک طویل فہرست مرتب کی گئی تھی، ایک دن صدر جہاں کہنے لگے "مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس فہرست میں میرا بھی نام درج نہ کر دیا گیا ہو"۔ میرزا نظام الدین احمد نے جنھوں نے وہ فہرس مرتب کی تھی کہا "تم کو بادشاہ کیوں بھیجنے لگے؟" صدر جہاں نے کہا "آخر کیوں نہیں"۔ میرزا نے جواب دیا "تمھاری زبان سے کبھی کلمہ حق نکلا نہیں جو اخراج کا سبب بنتا"۔

طبیعت شاعرانہ ہے اور شعر و سخن سے بڑی اچھی مناسبت ہے، لیکن وہ شعر گوئی سے تائب ہی ہیں۔ یہ مطلع ان ہی کا ہے۔

ہر تار زلف یار خدایا بلا شود
وانگہ بہر بلا دل ما مبتلا شود

جس طرح شعر گوئی سے توبہ کر لی ہے تو توقع ہے بے مزہ بحثوں، ریاکاری، خود نمائی، خود پسندی اور بیہودہ گوئی لاف و گزاف سے بھی توبہ کی توفیق ان کو نصیب ہو جائے گی۔

شیخ یعقوب کشمیری

صرفی تخلص کرتے تھے۔ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے۔ شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔ شیخ ابن حجر سے درس حدیث کی سند لی تھی۔ درویشی کے لباس میں بڑے سفر کیے اور بڑی دنیا دیکھی اور عرب و عجم کے اکثر شیوخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ ہندوستان اور کشمیر میں ان کے مرید بکثرت ہیں۔

شیخ یعقوب بڑی اچھی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنا "خمسہ" پورا کر لیا ہے۔ متعدد رسالے فن معما پر لکھے ہیں۔ صوفیانہ رنگ میں رباعیات کہی ہیں اور ان کی شرح بھی لکھی ہے۔ انھیں صوفیاء کی حالت و ذوق سے مناسبت ضرور ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ تمام عربی علوم تفسیر حدیث اور تصوف میں قابل اعتماد مستند عالم ہیں۔ کچھ ہی عرصہ قبل وہ تفسیر لکھ رہے تھے جو ان کے کمال علم و فضل کا واضح ثبوت ہے۔

ہمایوں بادشاہ اور خود شہنشاہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ گفتگو اور مصاحبت کا اعزاز حاصل تھا۔ بادشاہ کے منظور نظر اور بڑے مکرم و محترم تھے۔ طبعاً نہایت فیاض اور ایثار پیشہ تھے۔

ان کے مرتبہ کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن اس وادی میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔ یہ چند شعر ان کے ہیں:

در ہر چہ بینم آں رخ نیکوست جلوہ گر — در صد ہزار آئینہ یکروست جلوہ گر
خلقے بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست — ویں طرفہ ترکہ دوست بہر سوست جلوہ گر

خالت از مکر براں گوشۂ ابرو بہ نشست
ہر کجا گوشہ نشینی است درد مکری ہست

مشکلی ای غم دل ماراد مبیں کاں دل کیست
دل ماہست ولی ہیں کہ درد منزل کیست

گہ بکویش گذری پائی زسر باید کرد
قصہ کوتہ زسر خویش گذر باید کرد

اسم شیدا پر یہ معما انہی کا ہے ؎

ماہ من از رخ نقاب انداختہ
وہ کہ عمداً روز را شب ساختہ

جس زمانہ میں لاہور سے اپنے وطن جانے کی ان کو اجازت ملی تھی، انھوں نے راوی کے اس پار سے یہ خط میرے نام لکھا تھا :

" قادری ! مخلصانہ دعا و نیاز
سفر کے وقت مشایعت سنت ہے۔ آپ جیسے مخلص حقیقی سے یہ سنت محض مجبوریوں کی وجہ سے ہی ترک ہوئی ہوگی۔ امید ہے جناب فراموش نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو مسودات کے لیے کشمیری کاغذ کی ضرورت ہو تو مطلع فرمائیے تاکہ میں کشمیر سے اپنی تفسیر کے مسودات بھیج دوں۔ اگر آپ کاغذ کو دھو دیں تو اس کی تحریر اس طرح اُڑ جاتی ہے کہ سیاہی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا، جیسا کہ آپ نے بھی تجربہ کیا ہوگا۔ والسلام"

جب وہ کشمیر گئے تو ایک اور رقعہ وہاں سے بھیجا جو لبس آخری خط تھا
مولانا شیخ عبدالقادر کے نام

قطعہ

از دوانی بداؤنی بیشک | در فنونی فضیلت است فزوں
پس دلیل زیادت معنیش | کہ نمایش بصورت ست فزوں

"آپ کے خطوط وصول ہوئے، کوتاہیٔ لیاقت کی وجہ سے ان کے جواب میں قلم قاصر تھا لیکن خلوص و بندگی کے جذبات بے اختیار زبانِ قلم پر آگئے۔ اُمید ہے کہ جس وقت آپ نواب فیاض کے خسخانہ میں دوپہر کے وقت کشمیر کی ہواؤں سے زیادہ سرد چٹائی پر بیٹھے برفاب کے گھونٹ مزے مزے سے لیتے ہوئے دلچسپ گفتگو میں مشغول ہوں گے، ہم اسیران غم محروموں کو بھی ضرور یاد کریں گے

اے بہ بزم وصل حاضر غائباں را دستگیر
زانکہ دست حاضراں از غائبان کوتاہ نیست

شیخ محی الدین محمد آپ کی خدمت میں نیازمندی عرض کرتا ہے قبول فرمائیے۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ میراں سید قطب الدین نے میرے نیاز نامہ کا جواب نہیں دینا چاہا اور غالباً آپ حق ہمسائیگی کی وجہ سے اس بات کا یقین کرلیں گے لیکن حق بات کہیئے کہ یہ حق اس حق پر ترجیح رکھتا ہے یا نہیں؟ آپ جناب میراں کے اظہار محبت و دوستی پر قطعاً بھروسا نہ کریں کیونکہ وہ پائیدار نہیں ہے۔

"اظہار مضمر" پر جدید آصف خانی طرز پر میں نے وہاں جو اشعار کہے تھے ان کا مسودہ میرے پاس سے گم ہوگیا ہے۔ غالباً آپ نے اس مسودہ کی ایک نقل کرلی تھی، براہ کرم اپنے نسخہ میں سے اس کی نقل بھیج دیجیئے۔"

جواب:

"آپ کی تعریف کیا کروں کیونکہ عبدالقادر کے الفاظ کوزہ ہیں اور آپ کی تعریف سمندر۔ آپ کے لیے دعا کیا کروں

بسوئے سدرہ زمن مرغ طاعتی نہ پرد
کہ نامۂ نبرد از دعات در منقار

اپنے شوق و اشتیاق کا کیسے اظہار کروں

یا من بایادل یدہ طوقنی	من صحۃ الزمان قد عوقنی
الا اقدر ان لکتب شوقی لکم	ما اشوقنی الیک ما اشوقنی

اس وقت سے جب سے کہ آپ اس طرف گئے ہیں نوروز سے پہلے اور اس کے چند دن بعد آپ کے دو خط پہنچے ؎

مردی دراز نیکو در شہر خویش امروز
باخواستہ نشستہ از بخت خویش فیروز

جن میں سے ایک خط میں لکھا ہوا تھا ع

از دوانی بداؤنی بشتاب

اُس کے جواب میں عرض ہے۔ (مثنوی)

اے زبانت کلید نامۂ غیب	دل پاکت نتیجۂ لاریب
زادہ اعجاز کلک تو بیروں	گنجہائے نہاں کن فیکوں
گفتئی از منطق گہر پرور	کہ دوانی بداؤنی خوشتر
گر دوانی دگر بداؤنیند	ہمہ از گنج فضل تو غنیند
دلم آئینہ جمال تو شد	مظہر فیض لایزال تو شد

چه عجب گر ز روئے حق بینی　　خویشتن را درو همی بینی

اگر خود نمائی کا تقاضا ہے تو بس اتنا ہی کافی ہے ورنہ پھیکا پھیکا جواب لکھنے سے فائدہ لیکن مخلصانہ خطوط کے لکھنے میں کوتاہی خواص کا طریقہ نہیں اس لیے معذرت خواہی کے لیے لکھ رہا ہوں کہ اس رقعہ کو سابقہ جرموں کا کفارہ تصوّر فرمائیے۔ اور وہ جو آپ نے ہوائی خستخانہ اور برفاب کے متعلق لکھا ع

از عمر برف ست و آفتاب تموز

کافی دن ہوئے کہ میں اس ٹھنڈی آب و ہوا سے محروم ہی ہو گیا ہوں ع

گرگ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ

والا مضمون ہے۔

بادشاہ سلامت نے اجمیر کی تولیت کے سلسلہ میں میرا نام لیا تھا لیکن ابھی تک اس کی منظوری نہیں ہوئی۔ میری انتہائی آرزو ہے کہ یہ معاملہ جلد طے پا جائے، تاکہ مجھے ملک ملک کی آب و ہوا سے نجات ملے اور دل کو یقین کی ٹھنڈک نصیب ہو۔ اس دنیا کا خس خانہ تو بس برف کی طرح گھل جانے والا ہے ؎

اے عجب دلستاں نگرفت و نشد جانستاں ملول

زیں ہواہائے عفن زیں آب ہائے ناگوار

آپ بھی اس معاملہ میں ممکنہ سعی فرمائیے انشاء اللہ اجمیر جانے کے بعد اجمیر اور کشمیر کو ہم قافیہ سمجھتے ہوئے "جھالرہ" کا پانی پیوں گا جس طرح آپ وہاں "برفتن" کا پانی نوش جاں فرماتے ہیں۔

یہ رمضان کا مہینہ ۱۰۰۳ھ ہے۔ بندہ زادہ بداؤں چلا گیا ہے اور دعا میں مشغول ہے"۔

یہ غزل بھی شیخ یعقوب کشمیری کی ہے جو انھوں نے کسی سفر میں لکھ کر میرے پاس بھیجی تھی:

زد و می کیں نامہ میکردم رقم　　کان یجری الدمع لزوجا بدم
ہر رقم کز خامہ ام ظاہر شدی　　کاد یمحوا معنی ذرک الرقم
محو حرف اشتیاق از لوح دل　　لیس فی وسعی وقد جف القلم
در بلائے ہجر حکمت ہا بود　　لیتنی کوشفت عن تلک الحکم
عرفی از دریائے اشکم نہ محیط　　لیس الامثل اشعث من دیم

مختصر یہ کہ شیخ یعقوب کشمیری کی تعریف و توصیف میری عاجز زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ ان کے اوصاف و کمالات کی نشانیاں ان کے حالات سے بخوبی نمایاں ہیں۔

شیخ نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ کو انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات "شیخ امم بود" کہی گئی ہے ؎

سلام علی الدنیا و طیب نعیمها　　کان لم یکن یعقوب فیها بجالس
دریں خرابہ فجورہ بسوئے شیخ مراد　　کہ جائے محنت و رنج ست ایں خراب آباد

مولانا میرزا سمرقندی

مولانا انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کر آئے تھے بیرم خاں خان خاناں کے عہد میں آگرہ میں مقیم تھے۔ ایک مخلوق ان سے فیضیاب ہوتی تھی۔ منطق میں "شرح شمسیہ" امیر سید محمد کی تصنیف ہے۔ جن کے والد امیر سید علی ہمدانی تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی کوششوں سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی تھی۔ میں نے "شرح شمسیہ" کا کچھ حصہ اور پوری کی پوری "مختصرات" مولانا میرزا کے پاس پڑھی تھی۔ اور حضور اکرمؐ کی یہ مستند حدیث۔ "قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تری غیرہ ثم قتلہ دمہ ھدر"۔ ان کی زبان سے سنی اور اس کی روایت کی اجازت حاصل کی جو چھ واسطوں سے حضور اکرمؐ تک پہنچتی ہے اور اس حدیث کی سند کا قصہ "نجات الرشید" میں تفصیل سے درج ہے۔

مولانا خان زماں کی بغاوت کے زمانہ میں آگرہ سے دہلی آگئے تھے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے۔

قاضی ابوالمعالی

عزیز بخاری کے داماد شاگرد اور خلیفہ ہیں۔ عزیز بخاری کو فقہ پر ایسا عبور تھا کہ اگر تمام فقہ حنفی کی کتابیں دنیا سے اٹھالی جائیں تو وہ از سرنو ان سب کو لکھوا دیتے۔

انھوں نے عبداللہ خاں بادشاہ توران کو فن منطق اور علم جدل کو ملیا میٹ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ماوراء النہر سے ملا عصام الدین الفرائینی اور اس کے خبیث طالب علم انہی کی وجہ سے شہر بدر کیے گئے تھے۔ اس ہنگامہ کا سبب یہ ہوا کہ جب یہ علم بخارا و سمرقند میں پھیلا تو خبیث اور شریر لونڈے جہاں بھی کسی سلیم الطبع صالح آدمی کو دیکھتے کہنے لگتے "یہ گدھا ہے" کیونکہ "لا حیوان" اس سے مسلوب ہے۔ چونکہ "انتفائی عام" "متلزم انتفائی خاص" ہے اس لیے انسانیت کا سلب ہونا لازم آتا ہے۔ اس قسم کے منطقی مغالطے جب بکثرت پھیل گئے تو قاضی نے عبداللہ خاں کو اس کے سدباب پر آمادہ کیا اور اس گروہ کا اخراج کرادیا اور منطق و فلسفہ کی تعلیم پر پابندی عائد کردی۔

ایک روایت یہ بھی نکالی کہ اگر اس کاغذ سے جس پر منطق لکھی ہوئی ہو، استنجا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

قاضی ہمیشہ ہر نماز کے بعد حلقہ میں ذکر کیا کرتے تھے اور مرید بناتے تھے۔ ۹۷۹ھ میں آگرہ میں آئے۔ میں نے شرح وقایہ کے پہلے کے چند سبق ان سے پڑھے۔ بلاشبہ وہ اس فن میں بحر بے پایاں تھے۔

مولانا میر کلال

ملا خواجہ کے پوتے ہیں۔ خراسان کے بڑے مشائخین میں سے تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات سے آراستہ، نہایت متبحر دانشور اور عالم تھے، خاص طور سے علم حدیث میں تو اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔ حدیث کی اجازت انھوں نے سید میرک شاہ سے لی تھی۔ اور مولانا زین الدین محمود کمان گر ہراتی کے منظور نظر تھے اور نیکی ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھا تھا، ہمیشہ دینی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے۔

عقیدت و مریدی کا تعلق شیخ جلال ہروی سے تھا جو سربرآوردہ مشائخین اور مشاہیر میں سے ہیں۔ مولانا میر کلال بلاشبہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اسمائے حسنیٰ کی مظہر تھی۔ اسی (۸۰) سال کی عمر پائی۔ ان کی والدہ سیدہ

تھیں اور زندہ تھیں۔ اس اندیشہ سے کہ کہیں ان کی بیوی ان کی والدہ کی نافرمان نہ نکلے۔ انھوں نے شادی ہی نہیں کی اور والدہ کی زندگی ہی میں انتقال فرما گئے۔

جس وقت مولٰنا کا انتقال ہوا ان کی والدہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ جب انھیں ایسے عزیز و سعادت مند بیٹے کی وفات کی اطلاع دی گئی اور لوگ ان سے تجہیز و تکفین کی اجازت مانگنے لگے تو اس نیک بی بی نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا، اجازت دی اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئیں اور اس سیدہ نے کسی طرح کی بے قراری اور صدمہ کا اظہار نہیں کیا۔

مولٰنا میر کلاں کی وفات ۹۸۱ھ میں آگرہ میں ہوئی اور آگرہ ہی میں دفن کیے گئے۔ ان کے ایک سال بعد ہی ان کی والدہ بھی سدھار گئیں۔

میں ان بزرگ سے ملنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں، لیکن ان سے کوئی استفادہ نہیں کر سکا۔

مولٰنا سعید ترکستانی

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ملا احمد جنید سے انھوں نے پڑھا ہے۔ ملا محمد سرخ سے بھی کچھ استفادہ کیا اور کچھ عرصہ تک ملا عصام الدین ابراہیم کے بھی شاگرد رہے۔

ہندوستان آنے کے بعد اکبر سے ملاقات ہوئی تو اکبر کو ان کی مصاحبت نہایت پسند آئی۔ ان پر درویشی اور انکساری کا بڑا غلبہ تھا لیکن وہ نہایت خوش مزاج اور ذہین تھے۔ چنانچہ اس قریبی زمانہ میں ان جیسے فہم اور علمیت والا عالم شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ گفتگو اور بیان نہایت فصیح اور دلکش ہوتا تھا۔ شاگردوں پر نہایت مہربان رہتے تھے۔

ہندوستان سے کابل لوٹ کر گئے اور ۹۷۰ھ میں وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

حافظ کومکی

حافظ تاشقندی کے نام سے مشہور تھے۔ نہایت متبحر عالم تھے، خاص طور سے عربی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ مولٰنا عصام الدین کے شاگرد ہیں۔ تمام علوم بخوبی جانتے تھے اور لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ بھی بہت پہنچایا۔ ماوراءالنہر میں تمام علماء ان کو اپنا بڑا مانتے تھے۔ بظاہر وہ قومی وضع قطع میں رہتے تھے، ہمیشہ ترکوں کی طرح ترکش کمر سے باندھے ہوئے سوار رہا کرتے تھے۔

۹۷۷ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ اکبر سے ملاقات کی اور بھاری انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ پھر براہ گجرات حرمین شریفین کے لیے روانہ ہو گئے، وہاں سے روم گئے۔ شاہ روم سے ملاقات کی۔ ہندوستان سے دس گنا زیادہ وہاں ان کی تعظیم و تکریم کی گئی یہاں تک کہ وزارت کی پیش کش کی گئی لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا اور ماوراءالنہر لوٹ آئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ میں ان سے اور مولٰنا سعید ترکستانی سے نہیں مل سکا۔

قاضی نظام بدخشی

قاضی خاں لقب تھا، بدخشاں کے رہنے والے ہیں، وہاں ان کا مقام اس پہاڑ سے قریب تھا جس میں لعل کی کان ہے۔ نصابی علوم میں مولٰنا عصام الدین ابراہیم کے شاگرد ہیں۔

ملا سعید سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تصوف سے بڑی وابستگی تھی۔ چنانچہ علم تصوف پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ طریقت میں شیخ حسین خوارزمی کے مرید تھے۔ خداوالوں کی صحبت کے طفیل دنیاوی اعزاز بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ وہ بدخشاں میں امراء شاہی میں داخل تھے۔ ہندوستان آئے تو اکبر بادشاہ نے اندازہ سے بڑھ کر پذیرائی کی۔ پہلے تو قاضی خاں کا پھر غازی خاں کا خطاب ملا۔

قاضی نظام نہایت فصیح زبان اور خوش بیان عالم تھے۔ معتبر تصانیف کے مصنف ہیں۔ ایک رسالہ کلام و بیان ایمان تحقیق و تصدیق کے موضوعات پر لکھا۔ شرح عقائد پر حاشیہ لکھا ہے۔ تصوف میں بھی بہت سے رسالے تصنیف کیے ہیں۔ اودھ میں بعمر ستر سال ۹۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔ فتح پور میں پہلا وہ شخص جس نے فتح پور میں بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کی رسم ایجاد کی وہ یہی قاضی نظام بدخشی تھے۔ ملا عالم کابلی (غالباً طنزاً) بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے افسوس اس کی (سجدہ) ابتداء و اختراع میرے ہاتھوں نہیں ہوئی +

مولانا الہداد لنگر خانی لنگر خاں لاہور کا ایک محلہ ہے۔ مولانا اکثر علوم متداولہ میں ماہر اور متبحر عالم ہیں۔ شریعت کے بڑے پابند، نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ ہیں۔ اب بھی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں۔ بے مروت دنیاداروں کے گھر کبھی نہیں جاتے۔ بادشاہوں اور امیروں سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا، یہاں تک کہ سرکاری مدد معاش بھی قبول نہیں کی۔ اب ان کی عمر اسی سال ہے +

مولانا محمد مفتی لاہور کے معتبر اساتذہ میں سے ہیں۔ بڑے صاحب کمال عالم ہیں، مفتی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ صحیح بخاری اور مشکواۃ کا جب بھی ختم ہوتا ہے تو وہ ایک بڑی محفل منعقد کرتے ہیں جس میں بغرا[1] اور حلووں سے ضیافت کی جاتی ہے۔

ان کا گھر علماء و فضلاء کا مرکز ہے۔ اس زمانہ میں ان کی عمر نوے سال کی ہو چکی ہے اور وہ نہایت کمزور و ضعیف ہو گئے ہیں اس لیے درس دینا چھوڑ دیا ہے۔ چار پانچ لڑکے ہیں جو سب کے سب علم و کمال میں اپنے باپ کا نمونہ اور جانشین ہیں۔

میر فتح اللہ شیرازی شیراز کے سید زادہ اپنے زمانہ کے بے مثل عالم تھے، مدتوں فارس کے حکام و اکابر کے مشیر و راہنما رہے۔ تمام علوم عقلی جیسے حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل، حساب طلسمات و نیرنجات، جر اثقال وغیرہ کے عالم و ماہر تھے۔ اس فن میں ایسی مہارت و دسترس تھی کہ اگر بادشاہ تیار ہو جاتا تو وہ رصد گاہ تیار کر دیتے۔ علوم عقلی کی طرح عربی علوم حدیث تفسیر اور کلام میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔

---

[1] بغرا۔ فرہنگ ترکستانی بحوالہ ناصری غیاث۔ بغرا ایک آش کا نام ہے جسے بغرا خاں نے ایجاد کیا تھا (بغرا خاں ترکستان کا مشہور بادشاہ گزرا ہے) بحوالہ آئین اکبری۔ یہ ایک قسم کا پلاؤ ہے جو چنے کے میدے، سرکہ، چاول گوشت وغیرہ سے تیار ہوتا ہے۔

ان کی بڑی اچھی تصانیف ہیں۔ لیکن بلحاظ علم و تصنیف وہ میرزا جان شیرازی کی برابری نہیں کر سکے۔ جو ماوراءالنہر کے یگانۂ روزگار عالم گزرے ہیں۔

میر فتح اللہ مجلسوں میں نہایت با اخلاق منکسر مزاج اور نیک نفس تھے، لیکن خدا کی پناہ جس وقت وہ پڑھانے بیٹھتے تو اپنے شاگردوں کو گالیوں اور فحش الفاظ سے نوازتے رہتے۔ اسی وجہ سے ان کے درس میں کچھ زیادہ لوگ نہیں جاتے تھے اور کوئی اچھا شاگرد ان کے حلقہ سے نہیں نکلا۔

چند سال وہ دکن میں رہے۔ وہاں کے حاکم عادل خاں کو میر کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ جب اکبر کی خدمت میں آئے تو عضد الملک کا خطاب پایا۔ کشمیر میں ۹۹۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس مقام پر جو تخت سلیمان کے نام سے مشہور ہے، مدفون ہیں۔

ان کی تاریخ وفات "فرشتہ بود" سے نکلتی ہے +

شیخ منصور لاہوری

شیخ اسحاق کاکو کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن زیادہ تر افادہ انھوں نے مولانا سعد اللہ سے کیا۔ ان کے داماد بھی تھے۔ ہندوستان میں جتنے عقلی علوم رائج ہیں، ان سب میں وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ نہایت خوش طبع، سمجھدار اور چھا جانے والے آدمی ہیں۔ امراء و سلاطین سے تعلقات رکھنے کا خوب ملکہ آتا ہے۔

کچھ عرصہ تک تو مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے جس زمانہ میں لاہور میں اکبر کا قیام تھا مالوہ سے آکر باریاب ہوئے اسی تاریخ سے پرگنہ بجوارہ اور کوہستانی بہر حلدوں کے نظم و نسق پر مامور ہیں۔ ان کے لڑکے ملا علاؤالدین مشہور دانشمند مدرس ہیں۔ عرصہ تک خان خاناں کی صحبت میں عزت و اکرام سے رہے۔ جب بادشاہ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو وہاں بھی بڑی عزت پائی۔ بادشاہ نے فوجی ملازمت کی بہت کچھ پیش کش کی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور درس و افادہ میں مصروف رہے۔ جو کچھ انھیں جاگیر سے ملا کرتا تھا وہ طلباء پر صرف کر دیتے تھے۔ ہندوستان کے عالموں میں پیر محمد خاں کے بعد ان جیسا اور ملا نور محمد خاں جیسا کوئی اور شخص سخی، فیاض اور ایثار پیشہ نہیں گزرا۔

انھوں نے شرح عقائد پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ بہت مشہور ہے۔

حج و زیارت کے لیے حرمین تشریف لے گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا +

ملا پیر محمد شیروانی

نہایت خوش فہم شگفتہ طبیعت عالم تھا، لیکن طبیعت میں تنگ دلی اور بے رحمی بہت تھی۔ شریعت کے اوامر و نواہی کی پابندی بھی نہیں کرتا تھا۔ شیروان سے قندھار پہنچا اور بیرم خاں خان خاناں کے ہاں ملازمت کر لی۔ بہت جلد ترقی کے مدارج طے کیے۔ ہندوستان فتح ہو گیا تو اسے خان کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد ناصر الملک کا خطاب ملا اور تین چار سال اس نے نہایت شان و شوکت سے بسر کیے۔ لیکن ظالم کو کبھی فروغ نہیں ہوتا چنانچہ وہ بھی کچھ ہی عرصہ بعد مالوہ کی ندی نربدا میں ڈوب کر مر گیا اور فرعون و نیل کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے بس اسے دور ہی سے دیکھا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس کی مجلس میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا +

میرزا مفلس اوزبک

ملا احمد جند کے شاگرد ہیں۔ مناظرہ و مجادلہ کے فن میں نہایت تیز تھے، لیکن ان کی تقریر فصیح نہیں ہوتی تھی۔ درس دیتے ہوئے بڑی مضحکہ خیز حرکتیں کرتے تھے۔ شکل و صورت بھی اچھی نہ تھی، لیکن نہایت نیاب اور متقی آدمی تھے۔

ماوراء النہر سے ہندوستان آئے تو چار سال تک آگرہ میں جامع خواجہ معین الدین فرنخوری میں سبق دیتے رہے۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت کی اور مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کی تھی۔

مولانا نور الدین محمد ترخان

تمام علوم حکمت و کلام پر مستند عالم تھے۔ علوم عالیہ کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی لگاؤ تھا، چنانچہ نہایت خوش طبع شاعر سمجھے جاتے تھے۔

آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی تھی اور حضرت غفران پناہ ہمایوں بادشاہ کے روضہ کے متولی بنا دیے گئے تھے۔

دہلی میں انتقال کیا۔

مولانا الہداد امروہہ

نہایت خوش طبع، آزاد مزاج، محقق عالم، شیریں کلام، خوش باش اور ندیم پیشہ شخص تھے۔ مزاح و ظرافت کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔ غرض اہل مجلس کے لیے "مایۂ حضور اور مایۂ سرور" سمجھے جاتے تھے۔

شاہی فوجی ملازمت میں انھوں نے کچھ روپیہ پس انداز کر لیا تھا اسی پہ گزر بسر تھی۔ ساری عمر میرے ساتھ بڑی محبت و خلوص سے پیش آتے رہے۔

۹۹۰ھ میں جب کہ لشکر سیالکوٹ کے نواح میں اٹک گنگ کی طرف جا رہا تھا ان کا انتقال ہو گیا۔ لاش امروہہ میں ایک مقام پہ جہاں انھوں نے آخری ٹھکانے کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ لے جا کر دفن کی گئی۔

اس عہد کے جو مشائخ اور علماء تھے ان کا ذکر ہم نے کر دیا ہے۔ میں نے ان میں سے اکثر کی صحبت پائی ہے۔ اور ان کے دیدار سے فیضیاب ہوا ہوں۔

ان تمام بزرگوں میں سے جن کا ذکر کیا گیا اس قحط الرجال کے دور میں بس کوئی کوئی رہ گیا ہے۔ بعض لوگوں کی نظروں سے اوجھل گوشہ نشین ہو گئے، ذہنوں سے ان کی یاد بھی جاتی رہی ہے۔ باقی ماندہ لوگ اپنی آخری سانسیں گنتے ہوئے بے چینی سے اس کوچ کا انتظار کر رہے ہیں جس کے بعد لوٹنا نہیں۔ ان کے کانوں میں برابر الرحیل الرحیل کی صدا گونج رہی ہے۔ جانے کب اس آواز پر اٹھ کے چلے جائیں۔

تاریخ جہاں کہ قصۂ خرد و کلاں — درج ست درو چہ شیر مرداں چہ یلاں
در ہر ورقش بخواں کہ نی عام کرا — قدمات فلاں ابن فلاں ابن فلاں

تمام ممالک محروسہ ہندوستان کے طول و عرض میں دوسرے اور صلحاء و مشائخ اتنے ہیں کہ ان کا شمار خدا ہی بہتر

جاتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جو شرارت، باطنی خباثت، دین فروشی، کنجوسی اور رذالت، بے راہ روی اور بے اعتدالی میں مشہور و معروف ہیں، کچھ کم نہیں۔ ہم نے ایسے پست ہمت لوگوں کے تذکرہ میں اپنے قلم کو الجھانا مناسب نہیں جانا، کیونکہ ایک بڑا کام پیشِ نظر ہے اور زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔

میرا اپنا حال اس نیشاپور کے برف فروش سے کچھ مختلف نہیں جو گرم ہوا میں برف بیچ رہا تھا۔ جب سورج نکلا تو کہنے لگا اے مسلمانوں خدارا نگاہ رحم سے مجھ نقصان کے مارے کو دیکھو کہ اس کی پونجی پگھل پگھل کر اس کے ہاتھوں سے بہی جا رہی ہے ؂

عمر برف است و آفتاب تموز
اندکی ماند و خواجہ غرہ ہنوز

اور میں یہ جو مرنے والوں کی تاریخ وفات لکھتا رہتا ہوں، اس کی مثال اس درزی کی ہے جو قبرستان کے دروازہ پر اپنی دُکان لگائے ہوئے تھا اور ایک کوزہ کھونٹی پر لٹکا رکھا تھا۔ جب بھی کوئی جنازہ شہر سے نکلتا وہ اس کوزہ میں ایک کنکر ڈال دیتا اور ہر مہینہ ان کنکریوں کو گن کر حساب لگا لیتا کہ کتنے جنازے اُٹھائے گئے۔ پھر وہ کوزہ خالی کر کے دوبارہ ٹانگ دیتا اور اسی طرح کنکریاں ڈالتا رہتا۔ یہاں تک کہ دوسرا مہینہ آجاتا۔ کافی عرصہ تک وہ اسی طرح کرتا رہا۔ اتفاق سے وہ درزی مر گیا۔ ایک شخص جسے اس کی وفات کی خبر نہ تھی اس سے ملنے آیا۔ دُکان بند پاکر اس نے ہمسایہ سے دریافت کیا کہ "درزی کہاں ہے؟"

ہمسایہ نے کہا: "وہ اسی کوزہ میں گر پڑا ہے"؂

بنگر کہ بدیگرے کشاید
کوزے چو گذشت بر تو آید

سبحان اللہ ہماری زندگی بھی کیا زندگی، بس اژدہے کے حلق میں جاکر پھنس گئے ہیں کہ ہلنے اور تڑپنے کی بھی مجال نہیں چھٹکارے کی اُمید کہاں۔ قطعہ

چو غنچہ خون خور و دل تنگ باش و لب مکشا	کہ نیست غنچۂ ایں باغ را امید کشاد
نشان زمرد قدری می دہد کہ خاک شدہ است	بہر زمیں کہ فتادہ است سایۂ شمشاد
چو ہر نفس ز چمن میرود بباد گلی	مدام جامہ کبود است سوسن آزاد

غرض میں نے ان دو محترم گروہوں (صوفیاء و علماء) کا تذکرہ تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر درج کر دیا ہے سخن شناس قارئین اعتراض نہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ انتخاب نہایت پریشان حالی میں بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔ نیز میرے پاس یادداشت بھی نہیں تھی کیونکہ بیاض رکھنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔

میں تو وہ بخیہ گر ہوں جس کی سوئی ہر وقت کھو جاتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا "مجھے کیا سمجھتے ہو، اگر میرا وقت سُوئی کے ڈھونڈنے میں ضائع نہ ہوتا تو ہر روز میں ڈھیروں کام کر کے رکھ دیتا۔"

میں نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض تو اس قبیل کے ہیں کہ میری خواہش کے مطابق تو ان کا نہ ہونا ہی بہتر ہوتا، کیونکہ بہت سے ایسے صدیق ہیں جو بعد میں زندیق ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ان تمام میں سے کوئی ایک شخصیت بھی ایسی ہو جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو تو بس میری نجات اور شفاعت کے لیے وہی ایک شخص کافی ہوگا۔ ویسے یہ سارا گروہ ولایت کے اعزاز سے موصوف ہے اور ان میں سے اکثر میں ولایت خاصہ جلوہ گر رہی ہے۔

مَیں نے بے دینوں اور دنیا داروں کا ذکر ان کے ساتھ شامل نہیں کیا ہے۔ اس معاملہ میں مَیں نے عارف بسطامیؒ کے قول پر عمل کیا ہے۔ وہ اپنے ایک معتقد کو نصیحت کر رہے تھے کہ اگر تم اس زمانہ میں کسی ایسے شخص کو دیکھو جو مشائخین کی باتوں پر ایمان رکھتا ہو تو میرے لیے اور خود کے لیے اس سے دعا کرانا، کیونکہ وہ شخص یقیناً مقبول خدا ہے ؎

الٰہی نمی پرم و چارہ نمی دانم

بجز محبت مرداں مستقیم الاحوال

یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ ان صاحب دل اہل اللہ حضرات کی تعداد ایک سو گیارہ ہے۔ یہی لفظ "قطب" کے بھی اعداد نکلتے ہیں اور لفظ "الف" کے بھی کہ اس مسودہ کو لکھتے وقت ہزارواں ہی سن چل رہا ہے۔

ان بدبختوں کی طرف سے جنھوں نے دین اسلام پر صریحاً طعنہ زنی کی ہے جو نہایت بے حیا اور بے دین ہیں، جن کی وجہ سے ملک و ملت میں فتنہ و فساد برپا ہوگیا ہے اور ان کو بجا طور پر "فتنۂ آخر زماں" کہا جاتا ہے، میرا دل سخت نالاں ہے، پھر بھی حکماء کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے چند کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔

دَورِ اکبری کے حکماء

"ان حکیموں میں سے بعض حکمت علمی و عملی میں ایسے طاق تھے جیسے ان کے ہاتھوں میں ید بیضائے موسوی آگیا ہو۔ اپنی مہارت فنی کے لحاظ سے اعجاز مسیحی کی یاد دلاتے تھے۔ بعض کی اہمیت بس اس حد تک ہے کہ انھوں نے طب کو ایک شریف فن سمجھ کر حاصل کر لیا اور اپنی مشق سے اس کو پیشہ بنا لیا ہے۔ یہ ہوں یا وہ ایک بات سب میں مشترک ہے اور وہ ہے "دنیا پرستی اور اقتدار پرستی"۔

حکیم الملک گیلانی

اس کا اصل نام شمس الدین ہے۔ حکمت و طب میں جالینوس زماں اور مسیح دوراں تھا۔ طب کے علاوہ دوسرے مروجہ نقلی علوم میں بھی سب سے نمایاں و ممتاز تھا۔

مجھے اس سے کبھی کوئی ربط نہیں رہا۔ جب میں نیا نیا شاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا تو "نامہ خرد افزا" کو پیش کرتے وقت اس نے بلا کسی سبب کے میرے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھا۔ جب بادشاہ نے مذکورہ کتاب کے متعلق اس سے پوچھا کہ فلاں کی تحریر و انشاء کیسی ہے؟ تو اس نے کہا اس کی عبارت فصیح تو ہے لیکن پڑھنے میں کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

میرے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ تھا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ بندگان خدا کا نہایت خیر خواہ اور لوگوں کے کام بنانے والا با مروت اور آشنا پرور شخص تھا۔ دین و عقیدہ میں بھی نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ رہا ہمیشہ طالب علموں کو سبق پڑھانے میں مصروف رہتا۔ ان طالب علموں کے اخراجات کی کفالت اور ان کی سرپرستی بھی وہی کرتا تھا۔ کسی وقت بھی ان کو لیے بغیر دسترخوان پر نہیں بیٹھتا تھا اور محض انہی شاگردوں کے خیال سے لوگوں کے گھروں پر دعوتوں میں بہت کم شرکت کرتا تھا۔

ایک دن شیخ اسلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے ہوئے فقہ، نصاب اور فقیہوں کا حال اور حکماء کے طریقہ کی تعریف و توصیف اور شیخ بوعلی سینا کی خوبیاں گنا رہا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علماء اور حکماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی بڑائی جتانے کے لیے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، میں نیا نیا گیا تھا کسی کو پہچانتا نہ تھا، اصل بحث کیا تھی، اس کا بھی علم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اس وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ شعر پڑھ دیے:

وکم قلت للقوم انتم علیٰ   شفا حفرۃ من کتاب الشفاء

فلما استہانو بتو بیحتنا — فرغنا الی اللہ حسبی کفا
فما توعلی دین اسطاطلیس — دغتنا علی ملۃ المصطفا

مزید تائید کے لیے میں نے مولٰنا جامی کا یہ شعر جو "تحفۃ الاحرار" میں ہے سنایا:

نور دل از سینہ سینا مجوی
روشنی از چشم نہ بینا مجوی

میرے شعر سنانے پر حکیم بُری طرح بگڑ گیا۔ شیخ سلیم نے کہا "ان لوگوں میں پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، تو نے آکر اسے اور بھی بھڑکا دیا"۔

مشائخین اور علماء کا جب تختہ اُلٹ گیا تو حکیم دین کے مخالفوں اور مرتدوں کی بہ حدِ امکان خوب خبر لیتا رہتا تھا۔ آخر جب حالات بہت بگڑ گئے تو اس نے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی اور ۹۸۸ھ یا ۹۸۹ھ میں حج پر چلا گیا، اُسی جگہ وفات پائی۔

حکیم سیف الملوک دماوندی

ایک طرف تو بڑا عالم و حکیم تھا، دوسری طرف شعر گوئی اور ہجو نویسی بھی کرتا رہتا تھا۔ اپنا تخلص شجاعی رکھے ہوئے تھا۔ اتفاق کے بھی عجیب کرشمے ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حکیم جیسے ہی کسی بیمار کے سرہانے پہنچا، بیمار ملک الموت کا ہاتھ تھام کر رخصت ہو گیا۔ مسخروں نے اُس کا نام ہی "سیف الحکماء" مشہور کر دیا تھا۔

حضرت شیخ جامی محمد جنوشانی کے ایک پوتے تھے جو مخدوم نادہ کے لقب سے مشہور تھے۔ حکیم نے ان کا علاج کیا اور بچاروں کا بیڑہ اُس پار پہنچا دیا۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخ کے لیے دلچسپ فقرہ تراش لیا۔

"سیف الحکماء کشت"

(سیف الحکماء نے مار ڈالا)

ایک جلال طبیب تھے۔ ان کے بارے میں کسی نے یہ قطعہ کہا تھا جو حکیم سیف الملوک پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے:

ملک الموت از جلال طبیب — شکوہ برد دوش پیشِ خدا
بندۂ عاجز شدم ز دست طبیب — میکشتم من یکی و او صدہا
یا ورا عزل کن ازیں منصب — یا مرا خدمت دگر فرما

ہندوستان میں چند سال تک وہ بیرم خاں کی سرکار میں نہایت معزز و مکرم رہا، لیکن جیسی اس کی خواہش تھی ویسی ترقی نہ ملی تو ناراض ہو کر ولایت (ایران) چلا گیا اور وہاں سے ایک ہجو ملیح لکھ کر بھیج دی کہ اس عہد میں شیرینی اور مزاح کے ساتھ شاید ہی کسی نے ایسی عمدہ واقعہ نگاری کی ہوگی۔ اس ہجو کے چند شعر جو مجھے یاد رہ گئے ہیں، تفریح طبع کے لیے درج کیے جاتے ہیں:

قطعہ

صالح بزغالۂ بے وقت برائے بربری گاہے او را گریہ گاہے موش پیراں گفتہ ام
بہمتی بے قشقہ و زنار یعنی شیخ ہند نا مسلمانم اگر او را مسلماں گفتہ ام
اے شفیع الدین محمد بسکہ می چاوی سخن آں سخن چاویت را نشخوار انساں گفتہ ام
اے فریدوں در تعرض روے بے شرم ترا نے بہمواری کہ در سختی چو سنداں گفتہ ام

میر فریدوں نے اس کے جواب میں کہا ؎

اشک حکمت باف لاف ایشک آقائی اجل
آنکہ او را در معیت خانہ درباں گفتہ ام

جس زمانہ میں میر معز الملک سپاہ گری کو چھوڑ کر دہلی میں روپوش ہو گیا تھا، اس نے کہا تھا ؎

شاہ درویشاں معز الملک از من در ہم است
بندہ او را کمی ز درویشی پشیمان گفتہ ام

حکیم زنیل شیرازی

علم و دانش میں ممتاز حکیم تھا اور بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل تھا۔

حکیم عین الملک شیرازی

اپنا تخلص دوائی کرتا تھا۔ علم و کمال میں نہایت بلند مرتبہ تھا اچھے اخلاق و عادات کا مالک تھا۔ شہر بندیہ میں اس کا انتقال ہوا، جیساکہ ہم بیان کر آئے ہیں۔

یہ اشعار اسی کے ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد مرحوم کے باغ میں رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بطور یادگار مجھے دیے تھے۔ وداع ہونے کے بعد وہ لاہور سے راجہ علی خاں والئ برہان پور کے پاس سفیر بن کر چلا گیا۔ بس یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ شعر مندرجہ ذیل ہیں:

چناں از عشق پر گشتم کہ در دنیا نمی گنجم ہمہ جا پر ز عشقم گشت دمن در جا نمی گنجم
اگر با غیر عشق الفت نمی گیرم عجیب نبود مثال عصمتم میداں کہ در صہبا نمی گنجم
نشاں از من چہ می پرسی کہ من خود ہم نمیدانم ہمانا سر توحیدم کہ در انجا نمی گنجم

ہیچ ویرانی نہ شد پیدا کہ تعمیرے نداشت درد بے درماں عشق است اینکہ تدبیرے نداشت
صید آہوئے شدم کہ ہر طرف کردم نگاہ غیر جانے پاک در فتراک نخچیرے نداشت

حکیم مسیح الملک شیرازی

حکیم نجم الدین عبداللہ بن شرف الدین حسن کا تربیت یافتہ تھا۔ نہایت درویش صفت پاک اعتقاد آدمی تھا۔ فن طبابت میں اسے ید بیضا حاصل تھا۔

دکن سے ہندوستان آیا، پھر شہزادہ سلطان مراد کے ہمراہ گجرات اور دکن کی مہم پر متعین کیا گیا۔ لیکن مالوہ ہی میں فرشتۂ اجل نے آ گھیرا +

حکیم مصری طب میں نظری اور عملی طور پر نہایت دور رس اور ماہر شخص تھا۔ علوم نقلی پر بھی اچھا عبور حاصل تھا۔ عجیب عجیب علوم سیکھ رکھے تھے۔ جیسے دعوت اسما علم حروف، علم تکسیر وغیرہ۔

ہمیشہ مسکراتا نظر آتا، خندہ پیشانی سے ملتا اور گفتگو کرتا، لوگ اسے مبارک قدم کہا کرتے تھے۔ شیخ فیضی کے علاج میں اس نے بڑی سعی و کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ کبھی کہا کرتا موت کے معاملہ میں تو سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر علم طب سے عمر میں اضافہ ہو جاتا تو پھر حکیم لوگ اس دنیا سے جاتے ہی نہیں۔

وہ کبھی کبھی مزاحیہ فارسی شعر بھی کہتا تھا۔ یہ اسی کا شعر ہے کہ خواجہ شمس الدین دیوان خوانی کے متعلق کہا تھا ؎

خواجہ شمس الدین بہ خطمی می کند
در طبابت باش دخلی می کند

ایک دن اس نے کنیر کے پھول جس کو عربی میں دفلی کہتے ہیں دیکھے تو فی الفور کہا ع
چو آتش جست کاکل از سر دفلی

بادشاہ نے لاہور میں بادشاہی محل کے صحن میں ایک چبوترہ بنوایا اور حکم دیا کہ ہر شخص اس جگہ ہمارے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس موقع پر حکیم مصری نے شعر کہا ؎

شاہ ما کرد مسجدے بنیاد — ایہا المومنین مبارک باد
اندریں نیز مصلحت دارد — تا نمازاں گذار بشمارد

حکیم مصری نہایت سادہ لوح، بے غرض آدمی تھا۔ کسی سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ برہان پور خاندیس میں اس کا انتقال ہوا اور وہیں دفن کیا گیا +

حکیم علی حکیم الملک کا بھانجا اور حکمت میں اپنے ماموں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ شیخ عبدالنبی سے علوم نقلی کی تحصیل کی ہے۔ علوم شرعی پر اس کی اچھی نگاہ ہے لیکن اس کے باوجود "زیدیہ" مذہب کا کٹر معتقد اور اس زمانہ کے بیشتر حکماء کی طرح متعصب شیعہ ہے۔

اکتسابی فنون خاص طور سے علم طب میں اچھی مہارت ہے مریضوں کا علاج معالجہ بھی کرتا رہتا ہے، لیکن نوجوان اور خود پسند ہے۔ ابھی عملی تجربہ بھی کچھ زیادہ نہیں، اس لیے اکثر بیمار اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے اپنے دکھوں سے رہائی پا جاتے ہیں۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے، لیکن جب شاہ صاحب بیمار ہوئے تو حکیم علی نے تپ محرقہ میں "ہریسہ" کھانے کے لیے تجویز کیا، جس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ع "مرگ ہوش است شربت بہ او"

حکیم ابوالفتح گیلانی

بادشاہ کا چہیتا مصاحب تھا۔ اس نے مزاج شاہانہ پر ایسا قابو پالیا تھا کہ دوسرے تمام درباری اس سے حسد کرتے تھے۔ نہایت ہوشیار ذہین اور تمام ہنروں میں یکتا تھا۔ نظم اور نثر میں بھی باکمال ادیب تھا۔ اسی طرح بے دینی اور تمام بد اخلاقیوں میں بھی اس کی شخصیت ضرب المثل تھی۔

میں نے ان دنوں جبکہ حکیم نیا نیا آیا تھا خود اس سے سُنا کہتا تھا" خسرو کیا ہے بس یارہ شعر کا شاعر، انوری کو خوشامدی انوری کہا کرتا تھا اور اس کو میر بادنجان سے تشبیہہ دیتا تھا جو ایک مسخرا تھا۔ خاقانی کے متعلق کہتا تھا اگر اس زمانہ میں ہوتا تو بڑی ترقی کرتا۔ اس طرح کہ جب وہ (خاقانی) میرے گھر آتا تو میں تھپڑ مار کر اس کی سُستی اور کاہلی کو دور کر دیتا اور یہاں سے ابوالفضل کے گھر جاتا تو وہ اسے طمانچہ لگاتا۔ اس طرح ہم اس کے اشعار میں اصلاح کرتے رہتے"۔

حکیم حسن گیلانی

طبیب حاذق تھا۔ معالجہ میں اچھی شہرت تھی ۔ عالم تو اتنا بڑا نہیں تھا، لیکن نہایت با اخلاق اور خوش کردار آدمی تھا +

حکیم ہمام

حکیم ابوالفتح کا چھوٹا بھائی، اخلاق میں اپنے بھائی سے بہتر تھا۔ اگرچہ بذاتہ نیک نہیں تھا لیکن عملاً شر پسند بھی نہیں تھا۔

حکیم حسن، شیخ فیضی، کمالائی صدر اور حکیم ہمام حسب ترتیب ایک مہینہ کے اندر اندر فوت ہو گئے۔ ان کا مدتوں سے جمع کیا ہوا مال و اندوختہ ایک ہی گھڑی میں کہاں سے کہاں نکل گیا اور یہ حسرت و محرومی لیے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو گئے ؎

جان بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود بدہ انصاف جان من کہ ایں یا آں نکوست

حکیم ہمام کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس کی لاش بعد میں حسن ابدال لا کر اس کے بھائی کے پہلو میں دفن کی گئی +

حکیم احمد تھتوی

عالم تو بہت اچھا تھا، طب نہیں جانتا تھا، بس حکیم بنا ہوا تھا۔ ویسے تمام علوم کا جامع تھا۔ عرب اور عجم کی سیاحت کی تھی۔ نہایت خوش مزاج آدمی تھا لیکن بہت سے فضول خبط لگے ہوئے تھے۔ طبیعت کا لالچی بھی تھا۔ اہل بیت ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ میں نے اس سے اکثر کہا کہ تجھ میں یہ استعداد نہیں کہ تو اہل بیت میں سے ہونے کا دعویٰ کرے کیونکہ ہندوستان میں ایسے دعوے چل نہیں سکتے۔ اگر تو واقعی دیندار ہے تو دین اسلام کی دعوت دے کہ اس زمانہ میں اسلام کا بس نام ہی رہ گیا ہے، لیکن میرے کہنے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر اس نے اپنے اعمال کو بھگت لیا اور مرزا فولاد نے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔

مرنے پر میں نے اسے دیکھا دوسروں نے بھی دیکھا تھا۔ خدا کی قسم اس کی خدائی بے شک ولاریب ہے وہ عین میں سور کی شکل کا نظر آرہا تھا چنانچہ لوگوں نے اس کی تاریخ نکالی —" خوک سقری"۔

شیخ فیضی نے اس کی تاریخ "بیست و پنج ماہ صفر" نکالی ہے۔
میں نے حدیقہ کے اس شعر میں تھوڑا سا تغیر کر کے قاتل اور مقتول دونوں کی مناسبت سے دو تاریخیں نکالی ہیں:

فرغبنا لبقرائن صادق
وخستنا ابوصف ذی لائق

دوسری تاریخ ہے "زہے خنجر فولاد"۔

حکیم لطف اللہ گیلانی بڑا حاذق طبیب تھا۔ اس کا علم بھی بہت اچھا تھا۔

حکیم مظفر اردستانی کم عمری ہی میں شاہ طہماسپ کے طبیبوں میں شامل تھا۔ ہندوستان آیا تو بڑی ترقی کی۔ بڑا با صلاحیت نوجوان ہے۔ اخلاق نہایت عمدہ اور کردار پاکیزہ ہے۔ بیماروں کو اس کی آمد ہی بڑی بابرکت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بلحاظ علم اتنا اونچا نہیں لیکن اس کا تجربہ بلاشبہ بہت اچھا ہے۔

حکیم فتح اللہ گیلانی طب کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ علم ہیئت سے بھی بخوبی واقف ہے۔ "قانون" پر فارسی میں ایک شرح لکھی ہے۔ ان دنوں کابل میں قلیچ خاں کے علاج کے لیے گیا ہوا ہے۔

شیخ مینا یہ سرہند کے شیخ حسن طبیب کا لڑکا ہے۔ جراحی میں بڑا ماہر ہے۔ ہاتھیوں کے علاج میں تو وہ معالج خصوصی تھا۔ آج کل بے قید اور بے حیا ہو گیا ہے۔

اب تک ہم نے جتنے حکیموں کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے مسلمان اور ہندو حکیم بھی ہیں، لیکن ان جاہلوں اور ملعونوں کے تذکرہ پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔

دورِ اکبری کے شاعر

"پیشِ نظر انتخاب میں جن شاعروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں، ان کا ماخذ میر علاء الدولہ کا مشہور تذکرہ " نفائس الماثر" ہے۔ ان میں سے بعض صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کے ساتھ ملاقات کی ہے، بعض کو دور یا نزدیک سے دیکھا ہے یا ان کی شہرت کی وجہ سے ان کا ذکر کیا ہے۔"

غزالی مشہدی

ملحدانہ خیالات اور بے راہ روی کی وجہ سے جب عراق میں اسے لوگوں نے قتل کر دینا چاہا تو وہ وہاں سے بھاگ کر دکن چلا گیا۔ پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ خان زماں نے اس کو خرچ کے لیے ایک ہزار روپیہ بھجوایا تھا۔ اس نے جون پور سے یہ قطعہ بطور لطیفہ کے لکھ کر بھیجا تھا۔ اس میں صنعت معما بھی موجود ہے۔ قطعہ

اے غزالی بحقِ شاہِ نجف   کہ سوئے بندگانِ بے چوں آں
چونکہ بے قدر بودہ آں جا   سرِ خود را بگیر و بیروں آں

چند سال خان زماں کے پاس رہا، بعد میں بادشاہی ملازمت میں پہنچا۔ دربار میں ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ اس کے اشعار کے چند دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ کہتے ہیں اس نے چالیس پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ اگرچہ اس کا کلام کچھ زیادہ بلند نہیں، لیکن کمیت و کیفیت کے لحاظ سے اس کے اشعار اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ تصوّف کی زبان پر بھی بڑا عبور حاصل ہے۔

اس کی وفات جمعہ کی شب ۲۷ ماہ رجب ۹۸۰ھ میں احمد آباد میں اچانک اور دفعتاً ہوئی اور اکبر کے حکم سے اس کو "سرگنج" میں جہاں بڑے بڑے مشائخین اور سلاطین دفن ہیں، دفنایا گیا۔

قاسم ارسلان نے قاسم کاہی کی زبان سے یہ تاریخ کہی۔ قطعہ

دوش غزالی آں سگِ ملعون   مست جنب شد بسوئے جہنم
کاہی سالِ وفاتش بنوشت   ملحد دونی رفت ز عالم

دیگر:۔
بود گنجے غزالی از معنی   مدفنش خاکِ پاک سرگنج است
بعد یک سال تاریخش   احمد آباد و خاکِ سرگنج است

یہ مطلع اسی کے نام سے مشہور ہے لیکن میں نے غزالی کے دیوان میں اسے نہیں پایا ؎

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

غزالی کا نمونۂ کلام :-

در کعبہ اگر دل سوئے غیر است ترا — طاعت ہمہ فسق و کعبہ دیر است ترا
ور دل بحق است و ساکن میکدہٴ — می نوش کہ عاقبت بخیر است ترا

ما از گرگ خود نمی ترسیم اما ایں بلا است
کہ تماشائی بتاں محروم می باید شدن

خفتگان خاک یکسر کشتۂ تیغ تو اند
ہیچ دخلی نیست شمشیر اجل را در میان

چوں فانوس خیال و عالمے حیران درو
مرداں چوں صورت فانوس سرگرداں درو

شدہ زہ بر کمان قامت زاہد روائی او
دلی زنداں نمی ترسد از تیر دعائی او

رباعی

بحریست ضمیر من کہ گوہر دارد — تیغی است زبان من کہ جوہر دارد
صور قلم نغمۂ محشر دارد — مرغ ملکوتم سخنم پر دارد

اس نے ایک قصیدہ میں صنعت "سیاق العدد" ایک تا سو کے اعداد میں بیان کی ہے جس کا مطلع ہے:

بہ یک سخن ز دو لعلت بہ فیض یافت مسیحا
حیات باقی و نطق فصیح و نشاۃ احیا

غزالی کا ایک شعر ہے ؎

ما بادہ ایم و گرد گریبان ما خم ست
داریم نشاۃ کہ دو عالم درو گم است

قاسم کاہی اصل نام میاں کالی کابلی ہے۔ اس کے اشعار میں پختگی نہیں۔ ان کا سارا مضمون دوسروں سے لیا ہوا ہے۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی کوئی شخص اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ علم تفسیر، ہیئت کلام اور تصوف پر اس کو بڑا عبور حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی اس کی ایک کتاب ہے۔ تصوف، معماگوئی، تاریخ اور حسن ادا میں وہ اپنے زمانہ کا بے مثل شخص تھا۔

اگرچہ اس نے پہلے کے اور اس دور کے اکثر مشائخین کی صحبت سے فیض اُٹھایا ہے اور مولوی جامی اور دوسرے بزرگوں کا زمانہ دیکھا ہے لیکن ساری عمر وہ الحاد و زندقہ میں مبتلا رہا۔ آزادی، سخاوت، ایثارپسندی اس میں بہت زیادہ تھی۔ ہمیشہ اس کے پاس قلندروں آوارہ لڑکوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کتوں سے اسے بڑا پیار تھا۔ غالباً کتے ملک الشعرائی کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ (فیضی ملک الشعرا بھی سگ پرست تھا اسی پر طنز ہے۔ مترجم)

ایک قطعہ میں اس نے لڑکوں کے ساتھ شیفتگی کو اس طرح بیان کیا ہے۔ قطعہ

ایں نصیحت بشنواز میغی تا ہمہ عمر ترا بس باشد
شعر خوب و پسر زیبا را معتقد باش زہر کس باشد

ہم کو اس کے مذہب و مسلک سے کیا کام اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

چوں سایہ ہمراہم ہر سو رواں شوی باشد کہ رفتہ رفتہ بما مہرباں شوی
اے پیر عشق صحبت یوسف رخی طلب نبود عجب کہ ہمچو زلیخا جواں شوی
کاہی تو بلبل چمن آرائی کابلی زاغ و زغن نہ کہ بہندوستاں شوی

چوں تار عنکبوت ز ہجر تو شد تنم
در گوشۂ خرابہ ازاں ہست مسکنم

اس کی دو غزلیں صوفیانہ لحاظ سے بہت عمدہ ہیں، کافی مشہور ہوئی ہیں۔ انھیں مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور بادشاہوں صوفیوں کی محفلوں میں بڑی پسند کی جاتی ہیں۔

مطلع:۔

مرغ تا بہ فرق مجنوں پر ز دلی انگیز کرد
آتش سودائی لیلی بر سر او تیز کرد

چوں ز عکس عارضش آئینہ پر گل شود
گرد راں آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

اسم اللہ پر اس کا معما ہے:۔

نیست از ہستیش کسی آگہ
ابدا کان لانہا فنایتہ لہٗ

اسم نبیؐ کا معما ے

تارہ شرح را شتافتہ ام
از محمد نبیؐ شگفتہ ام

اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ بوستان کے جواب میں قافیہ بہ قافیہ "گل افشاں" نامی مثنوی لکھی ہے۔ جس کا مطلع ہے:

جہاں آفریدہ بجاں آفریں
بجاں آفریں صد جہاں آفریں

اس کے چند شعر ے

بناز کشت جہانی بت ستمگر من
ہنوز بر سر ناز است ناز پرور من

ریخت باراں بلا بر تن ہم پرور ما
یہ بلا ہا کہ نیا ورد فلک بر ما

نہ نرگس ست عیاں بر سر مزار مرا
سفید شد بر ہبت چشم انتظار مرا

ایک جوگی کے لڑکے کے متعلق کہا ے

آتشیں روئیت ز خاکستر چو نیلوفر شدہ
یا نقاب از آتش روئے تو خاکستر شدہ

کاہی کے اس مطلع کا مضمون ملا وصفی کابلی کے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ وصفی کا مطلع ہے ے

از تپ ہجراں نہ خاکستر مرا بستر شدہ
بستر از سوز من بیمار خاکستر شدہ

لوگوں نے جب ملا قاسم سے کہا کہ تمہارے اکثر اشعار میں دوسرے شاعروں کا مضمون ملتا ہے۔ اُس نے جواب دیا "اس معاملہ میں میں نے کوئی خاص التزام نہیں کیا، اگر تمھیں پسند نہیں ہیں تو قلم تراش لو اور ایسے اشعار میرے دیوان سے کاٹ دو۔"

اس نے "اصطرلاب" کے متعلق ایک بڑا اچھا قصیدہ کہا ہے۔ جس میں ہمایوں بادشاہ کی مدح ہے۔ بلا شبہ اس قصیدہ میں کمال کر دکھایا ہے۔

جب خواجہ معظم خاں پاؤں میں تکلیف ہونے کے باوجود خیر آباد سے ملا قاسم کاہی کی عیادت کے لیے آیا تو اس نے فی البدیہہ یہ غزل کہی اور اس کا ترنم بھی بنا دیا:

ماندی قدم زناز بروں نیاز من   دروں مباد پائے ترا سرو ناز من

ہر چند وصف وعمل تو کردم ضبب فراق   کوتہ نگشت قصۂ دردِ دراز من

ایک دن ملا بادشاہی باغ میں نہر کے کنارے سیر کر رہا تھا، عیبوحی شاعر وہاں آنکلا اور کہا "استاد آپ نے سنا ایک بڑا نا موسی عراق میں مرگیا"۔ ملا کاہی نے کہا: "خدا تم کو بحفاظت زندہ رکھے"۔

گجرات کے پہلے سفر میں ملا غزالی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ملا قاسم کاہی کے فوت ہو جانے کی خبر اڑ گئی تھی۔ غزالی نے اس وقت یہ تاریخ کہی تھی۔ قاسم کاہی تو مرے نہیں لیکن یہ قطع تاریخ خوب ہوگیا۔ قطعہ

رفت بے چارہ کاہی از دنیا   سالِ تاریخ او اگر خواہی

چوں بناچار رفت شد ناچار   از جہاں رفت قاسم کاہی

اس سے پہلے کہ اس افواہ کا جھوٹ سچ ظاہر ہو جاتا، ملا قاسم کاہی نے اتفاقاً غزالی کی وفات کی ایک تاریخ اور پھر اس کی تلافی میں دوسری تاریخ کہی تھی۔

بہر حال جھوٹے کے آگے آکر ہی رہتا ہے۔ اس شعر کے مطابق کہ ؎

شاعراں دیدم ز روئے تجربت

بے تعاقب بے عقب بے عاقبت

اس زمانہ کے سارے ہی چھوٹے بڑے شاعر بجز تین چار معتبر قدما کے حیدری مشرب (بے قید اور آزاد) ہیں، لیکن یہ دونوں غزالی اور کاہی تو ان آوارہ مشرب شاعروں کے پیشوا اور مقتدا تھے کہ انھوں نے اپنی خباثتوں کو اپنے شاگردوں اور ماننے والوں میں خوب جی کھول کر تقسیم کیا۔ میں جب ان شاعروں کو دیکھتا ہوں تو اس فکر میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں شعرائے متقدمین بھی ایسے ہی نہ گزرے ہوں۔

خواجہ حسین مروی

یہ حضرت شیخ ربانی رکن الدین علاء الدولہ سمنانی کا فرزند ہے۔ معقولات کا علم مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے حاصل کیا اور شرعی علوم میں خاتم العلماء و محدثین شیخ ابن حجر ثانی کی شاگردی کی۔

شعر گوئی، انشاء پردازی، صنائع بدائع، حسن بیان، فصاحت و بلاغت، مزاح و لطافت میں بے نظیر شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان مکمل ہوگیا ہے۔ اس کے شعر اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ نمونۂ کلام:-

اے از مژہ بے تو آب رفتہ   وز دیدہ خیال و خواب رفتہ

خود را ہما چناں کہ نبودی نمودۂ
افسوس آں چناں کہ نمودی نبودۂ

اس شعر کا ماخذ غالباً یہ رباعی ہے:۔

گوئیم مگو ز اہل وفائیم نہ ایم	واندر صفت صدق و صفائیم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چناں	افسوس کہ آنچہ می نمائیم نہ ایم

یہ اسی کے اشعار ہیں:

با ما گرہ چو غنچہ در ابرو فگندۂ
با غیر لب چو پستہ خنداں کشودۂ

محبتے کہ مرا با تو ہست می خواہم
ہمیں تو دانی و من دانم و خدا داند

اکبر بادشاہ نے کتاب سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کرنے کا اسے حکم دیا تھا جسے وہ پورا نہیں کر سکا۔ اس ترجمہ پر اس نے جو نعت لکھی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں:

خوش الحان عندلیب باغ ابلاغ	کحل نرگسش از کحل ما زاغ
کشیدہ در زبور نسخ بے قیل	قلم بر نسخۂ توریت و انجیل
نبوت را بدرگاہش حوالہ	امام الانبیاء ختم الرسالہ

رباعی:	آنم کہ ممالک سخن ملک من است	عراف خرد عبیرئی سلک من است
	دیباچۂ کن از دفتر من ورقیست	اسرار دو کون بر سر کلک من است

۹۷۹ھ میں اس نے ہندوستان سے وطن جانے کی رخصت حاصل کی۔ شیخ فیضی نے جو اس کا تربیت یافتہ تھا اس کی تاریخ "دام ظلہ" نکالی۔ وہ کابل چلا گیا۔ میرزا محمد حکیم نے اس کی عزت و تکریم کی۔ میرزا کو اس نے ہندوستان کے نفیس کپڑے اور قیمتی سامان کی پیشکش کی۔ دربار میں ایک محرر ان تحفوں کی فہرس لکھ رہا تھا۔ خواجہ حسین نے جلد بازی کر کے وہ کاغذ محرر کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہر کپڑے کی قسم نام تفصیل و وضاحت سے لکھنے لگا اور خود ہی اس کی قیمت بھی مقرر کر دی۔ میرزا کو یہ جلد بازی اور اوچھا پن اچھا نہ لگا اور وہ مکدر ہو کر محفل سے اٹھ گیا، اٹھتے ہوئے کہہ گیا کہ یہ سارے تحفے لوگ لوٹ لیں ہم کو نہیں چاہئیں۔ خواجہ حسن کا جلد ہی کابل میں انتقال ہو گیا۔

قاسم ارسلان | اس کا باپ اپنے آپ کو ارسلان جاذب کی نسل سے بتاتا تھا۔ یہ ارسلان سلطان محمود غزنوی کا ایک مشہور امیر گذرا ہے۔ قاسم نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص ارسلان رکھا تھا۔ اس کا وطن اصلی

طوس ہے۔ ماوراء النہر میں نشوونما ہوئی۔

قاسم ارسلان صاحب دیوان شیریں کلام شاعر اچھا خطاط تھا۔ خوش طبع اور خاص و عام میں ہر دلعزیز تھا۔ پڑا ہنس مکھ اور بے تکلف آدمی تھا۔ تاریخ گوئی میں تو اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

خواہم کہ سر برآرم در حشر از زمینی
کانجا بناز گیرہ پا ئندہ ناز نینی

اے نسیم جاں آمدہ برلب ترا چہ قدر
جائے کہ یک نگاہ لبعد جاں برابر است

مجھے یاد آتا ہے کہ یہ آخری مصرع ایک اور غزل میں اس طرح ہے۔ جس کے کہنے والے کا نام معلوم نہیں ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

با آنکہ ہست خلوت وصل تو بے رقیب
شرم تو با ہزار نگہباں برابر است

اسی کا شعر ہے ؎

لفظ و معنی مجال من گرینید
بے تو چوں روی در کتاب کنم

گریاں چو لبسر منزل احباب گزشتیم
عدمرتبہ در ہر قدم از آب گزشتیم

اس نے کوہ اجمیر کی تعریف میں جو حضرت خواجہ اجمیر کا مدفن ہے، مثنوی کہی ہے:

زہے کوہ اجمیر عنبر سرشت — مقام سر مقتدایان چشت
چہ کوہے کہ چوں سود بر اوج سر — محیط سپہرش بود تا کمر
نمایند جرم مہر و آفتاب — براہ کوہ مانند چشم عقاب
چو خورشید روی عیاں چشمہا — کواکب بود رنگ آں چشمہا
بسے نسر طائر بگردوں شتافت — کہ بر قلعہ اش راہ یابد نیافت
شود گر از آں قلعہ سنگی رہا — بزیر فلک را از ہم قلعہ ہا
نہ برقست ہر سو درخشاں زمیغ — کہ آں کوہ را سود بر چرخ تیغ
ز بالائی آں قلعہ گاہ نگاہ — فلک اچشمہ و چشم ماہی است ماہ

بر و سبیل آں قلعۂ پر شکوہ — ہزاراں چو الوند و البرز کوہ
چو بر خیزد از دامن آں عقاب — فتد سایہ اش بر مہ و آفتاب
ببیں ارسلاں رفعت پایہ اش — کہ جا کردہ خورشید در سایہ اش

ملانے اس سال جب کہ بادشاہ نے اٹک سے آکر لاہور میں قیام کیا تھا، ۹۹۵ھ میں وفات پائی +

یہاں تک میں نے بلا ترتیب ان چار شاعروں کا اس لیے تذکرہ کر دیا کہ یہ شاعری میں بڑے مشہور اور نامور ہیں۔ اس کے بعد میں جن شاعروں کا تذکرہ کر رہا ہوں ان کو حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کروں گا +

آتشی قندھاری

بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ لشکر میں واقعہ نویس تھا۔ ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں بھی وہ اچھے عہدوں پر فائز رہا۔ ۹۷۳ھ میں لاہور میں فوت ہوا۔

نمونہ کلام :-

ہر شکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن
بیا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن

اسی کا شعر ہے ؎

خنجر بمیاں تیغ بکف چیں بہ جبیں باش
خونریز و جفا پیشہ کن و بر سر کیں باش

از لعل وفائے خبری را چکند کس — مائل بہ جفا سیمبری را چکند کس

در شفق گشت شب عید نمایاں مہ نو
تا کنیم از پئے جام مے گلگوں تگ و دو

ہمایوں بادشاہ کی محفل میں قلعۂ ظفر میں اس نے یہ رباعی کہی تھی۔ رباعی :

عہد شکر کہ شاہ از غم بیماری است — برخاست و بر مسند اقبال نشست
از صحت ذات آتش خبری می گفتند — المنۃ للہ کہ بہ صحت پیوست

اشرف خاں میر منشی

مشہد مقدس کے حسینی سیدوں میں سے ہے۔ خوش نویسی میں بڑا ماہر اور ہفت قلم کا اُستاد تھا۔ بادشاہ کے امیروں میں شامل تھا۔ شعر کہتا تھا لیکن شاعری تو اس کے لیے بس ایک تہمت ہی تھی، بس طبیعت موزوں تھی۔ چند شعر یہ ہیں۔

نا رسیدہ زلف ساقی، دوراں جامی
میر سر سنگ ملامت بسبویم چکنم

مائیم بعالم کہ دل شاد نداریم — ناشاد دلے چوں دل خود یاد نداریم

رباعی: یارب تو مرا آتشِ قہر مسوز — در خانۂ دل چراغ ایماں افروز
ایں خلعت زندگی کہ شد پارہ بجرم — از راہِ کرم برشتۂ عفو بدوز

رباعی

بیغش ننمود چوں زرِ خالص عیارِ عشق — آں بہ کہ نقدِ عمر کنم صرف کارِ عشق
تا غنچۂ جمال تو گل گل شگفتہ است — بلبل صفت مراست بدل خار خارِ عشق

امیر قاضی اسیری

صاحبِ فضل و کمال شاعر، حکیم الملک کا ممتاز و پسندیدہ شاگرد تھا۔ اپنے زمانہ کا خوش کلام شاعر گزرا ہے۔ چونکہ ہندوستان کی آب و ہوا اس کے موافق نہ تھی اور بادشاہ کی محفل میں باوجود اچھی شناسائی کے کوئی امتیاز حاصل نہ ہو سکا تھا اس لیے ولایت چلا گیا اور اپنے آبائی وطن رے میں انتقال کر گیا۔ یہ اشعار اس کی بلاغتِ فکر کا نمونہ ہیں:

قاصد رقیب بودہ و من غافل از فریب — بے درد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

دلے کہ بر حالِ من دل شدہ خندیدن درشت

اضطرابِ من و خندیدنِ او دیدن درشت

امروز اضطراب دلِ من زیادہ است — گویا شدہ بکشتن من گرم خوئے تو

دل خستہ ام ز ناوک طفلے کہ روزگار

در دستِ او نداده بباز ی کماں ہنوز

امید وصل تو نگذاشت تا دہم جاں را — وگرنہ روز فراق تو مردن آساں بود

از غیر کنم شکوہ چوں آں سیم تن آید

شاید بہوا داریٔ او در سخن آید

ہرگز نرود از دلِ من ذوقِ وصلے — کو ناز بمن در سخن و چشم براہ داشت

میر امامی لنجویہ

یہ کابل کے سیّد ہیں۔ ۹۸۱ھ میں گھوڑے سے گر کر جون پور میں انتقال کیا۔ صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے ایک نازک اندام محبوب چغتائی سلطان کے مرنے پر ایک تاریخ کہی ہے جو بہت مشہور ہوئی ؎

سلطان چغتا بود گل گلشن خوبی — لیکن سوئے رضواں اجلش راہنموں شد
در موسم گل عزم سفر کرد ازیں باغ — دلہا ز غمش تہ بتہ آغشتہ بخوں شد
تاریخ ولے از بلبل ماتم زدہ جستم — در نالہ شد و گفت گل از باغ بروں شد"

یہ شعر بھی میر امامی کے ہیں ؎

وصف قدت بالف چوں کنم اے نخل حیات — کہ الف ساکن و قد تو بود در حرکات

دلی بہ فکر آں دہاں در تنگنائے حیرت است
حیرتش رو دادہ از جائے کہ جائے حیرت است

غافل از یاد تو اے شیریں شمائل نیستم گر تو از من غافلی من از تو غافل نیستم

رباعی

اثبات وجود را چہ حاجت بہ بیاں چوں خود ہمہ اوست آشکارا و نہاں
گویند بہ نفیٔ غیر بکشائے زباں نفی چہ کنم کجاست از غیر نشاں

رباعی

سجادہ نشین مشعبد چرخ کبود سیمائی صلاح صبح از رخ بنمود
شد بہر قیام ما ست در غمیۂ روز پیشیں بہ رکوع رفت و دیگر بسجود

میر شریف امان اصفہانی

نہایت باسلیقہ شاعر تھا۔ بیس سال تک ہندوستان میں درویشانہ حال میں رہا۔ نمونۂ کلام:

رو بہ سیل سرشکم بسوئے خانۂ او
کہ گرد غیر بشوید ز آستانۂ او

لعلت کہ آب زندگی از وی نشاں دہد کو خضر تا بہ بیند و از ذوق جاں دہد

تا بہ تیغت جوانی سر خود در بازم
جاں بہ پیر ساختہ در ضعف بپا آمدہ ام

بزم وصل تو زاں غیر اضطراب ندارم کہ سوئے غیر نظر می کنی و تاب ندارم

قاضی احمد غفاری قزوینی

قاضی احمد امام نجم الدین عبدالغفار کی اولاد میں سے ہیں۔ امام موصوف شافعی مذہب کی کتاب "حاوی" کے مصنف تھے۔ قاضی احمد بڑے صاحبِ علم انشاء پرداز مورخ اور خوش طبع بزرگ تھے۔ ان کی ایک کتاب "نگارستان" مشہور ہے، جس میں نہایت عجیب و غریب حالات لکھے ہیں۔ بلاشبہ ایسا دلکش و نادر مجموعہ اس دور میں کسی اور نے پیش نہیں کیا۔ تاریخ پر ان کی تصنیف "نسخ جہاں آرا" ہے۔ جس میں حضرت آدمؑ سے حضور اکرمؐ تک کے حالات اجمالاً بیان کیے ہیں۔

آخر عمر میں سلاطین عراق کی وزارت سے استعفا دے کر بیت الحرام کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور حج کی سعادت حاصل کر کے بندرگاہ دایل سے ہندوستان آنا چاہتے تھے کہ اجل گریباں گیر ہوئی۔ ۹۷۵ھ میں فوت ہوئے۔

یہ شعر ان کا ہے ؎

پس از عمرے نشیند گر دمی در چشم آں بدخو
تپد دل در برم ترسم کہ ناگہ زود بر خیزد

میر اشکی قمی اس کے اشعار میں خیال آفرینی نہایت بلند ہے۔ آصفی کی پیروی کرتا ہے۔ آگرہ میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام:

از بس کہ سنگ بر سر زد بے تو سینہ چاکی
آں سنگ در کف او گر دید مشت خاکی

بسے سنگ از غمت بر سر من دل تنگ خواہم زد اگر دستم رود از کار بر سنگ خواہم زد

شمعت نصیر دار شہا بندہ می شود
عد یار اگر سرش ببری زندہ می شود

مستانہ کشتگاں تو ہر سو فتادہ اند تیغ ترا مگر کہ بہ مے آب دادہ اند

بسکہ تن بگداخت بے روز آتش سودا مرا
گر ہنی زنجیر بر گردن فتد در پا مرا

کہتے ہیں جب مندرجہ بالا مطلع کو میر اشکی نے قندھار میں مولٰنا صادق کے سامنے پڑھا تو اُنھوں نے کہا: تم نے یہ مضمون امیر خسرو سے اُڑایا ہے۔ خسرو نے کہا ہے ؎

بسکہ بگداخت ز ہجرت تن پر در سودائم
گر ہنی طوق بگردن فتد اندر پائم

اشکی کا ایک اور شعر ہے:

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بلا رفتم
ز ہر مو بر سر من آید سنگ و نگذارد زپا رفتم

اس نے "سنگ" پر اتنے مضمون باندھے ہیں کہ کسی اور کے لیے گنجائش نہیں رہی۔

لاغرتم میان سگاں بیں بکوئے خود
ایں یک بسوے خود کشد آں یک بسوے خود

موئے ژولیدہ کہ آید ز سر می تا پا زاں میاں موئے سفید لیست تن من پیدا

یول قلی انیسی شاملو ترکمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ خان خاناں کے ہاں ملازم ہے۔ نہایت نرم و ملائم اشعار کہتا ہے۔ ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

نمونۂ کلام:

آتش کدہ است دل ز خیالی تو د برو
داغ تو ہندوئے کہ نگہبان آتش است

چو بینی شعلۂ را طرب آتش پرستی داں کہ روحش رفتہ و جسمش در آتش خانہ می رقصد

عشق و مقناطیس یک جنس اند کہ دل ناوکش
تا بروں می شد محبت جذب پیکاں کردہ بود

ملا غنی امنی نو رسیدہ نوجوان ہے۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پہلے خوفی تخلص رکھا تھا۔ خواجہ مرحوم نے بدل کر "امنی" رکھوایا۔ اب بڑے شاہزادہ کی خدمت میں رہتا ہے۔

نہایت خوش طبع شاعر ہے۔ یہ رباعی اس کی ہے،

منم کہ غیر غم اندوختن نمی دانم
تمام اشکم و وا سوختن نمی دانم
ہنوز خاطر اگر روشناس خورشیدم
چراغ بخت خود افروختن نمی دانم

ابتری بدخشی اسم بہ مسمیٰ ہے۔ "فتوحات" اور "فصوص الحکم" کی چند گمراہ کن باتیں یاد کر لی ہیں۔ چونکہ فرعون کے ایمان کے بارے میں ہر ایک سے بحث کیا کرتا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کو "وکیل فرعون" کا خطاب دے دیا۔ یہ مطلع اسی کا ہے ؎

گفتی وفا کنیم با حباب یا جفا
اے شوخ بندۂ سخن اولیم ما

الفتی قلیچ خاں "جان قربانی" نامی گروہ سے متعلق ہے۔ علمی اور حکمی فضیلتوں سے آراستہ ہے۔ اس وقت پنج ہزاری امیر ہے۔ دین کے بارے میں اس کا اعتقاد درست ہے۔ کچھ عرصہ تک جملۃ الملک کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ ان دنوں کابل کی حکومت پر مامور کیا گیا ہے۔ طبیعت میں شعر و نظم کا اچھا سلیقہ اور ملکہ ہے۔

نمونۂ کلام:

تا ز عارض آفتاب حسن نقاب انداختہ — ذرہ ساں خورشید را در اضطراب انداختہ
کشتۂ آں نرگس مستم کہ در عین خمار — عالمے را کشتہ و خود را بخواب انداختہ

دو ترک مست تو آشوب عقل و دین ستند
کماں کشیدہ ز ہر گوشہ در کمیں ستند

نیست در دل غنچۂ پیکاں آں قاتل مرا — بے لبش خونی کہ خوردم شد گرہ در دل مرا

الفتی یزدی علوم ریاضی میں بڑا ماہر تھا۔ خان زماں کے ساتھیوں میں شامل تھا، انہی ہنگاموں میں گرفتار ہوا اگرچہ قتل ہونے سے بچ گیا لیکن موت سے جان نہ بچا سکا۔

اسی کا ایک مطلع ہے ؎

تا گرد عفت دامن یاری نگرفتیم
از پا نہ نشستیم و قراری نہ گرفتیم

اس مطلع پر خان زماں نے ایک ہزار روپیہ صلہ دیا تھا۔

مشت خاشاکیم و داریم آتشی ہمراہ خویش
دور نبود گر بسوزیم از شرارہ آہ خویش

الفتی عراقی کچھ عرصہ تو وہ کشمیر میں میرزا یوسف خاں کے پاس رہا۔ وہاں اس نے ایک "شہر آشوب" کہا تھا جس کا شعر ہے ؎

ہر موئے موشک پراں درخت شعر است
قد جونا و بروت سرطان راعشق است

اسی شہر آشوب میں میرزا یوسف خاں کے ایک محبوب کے متعلق کہا تھا ؎

مرزا یوسف خاقان زماں راعشق مست
عشق پاک تو و خط دگراں راعشق مست

بیرم خاں خان خاناں بیرم خاں مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں سے ہے۔ دانائی، سخاوت، خلوص، حسن اخلاق نیاز مندی و انکساری میں کوئی اس کی مثال نہ تھا۔

ابتدا میں بابر بادشاہ کے ساتھ رہا۔ پھر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں ترقی کی اور خان خاناں کا خطاب پایا۔ اکبر بادشاہ نے اس کے القاب میں "بابا ام" (میرے بابا) کا اضافہ کر دیا۔

بیرم خاں فقراء اور درویشوں کا معتقد، خود صاحب حال اور خوش خیال آدمی تھا۔ یہ اس کی کوشش، بہادری اور حسن تدبیر تھی کہ ہندوستان دوسری بار مغلوں کے ہاتھ پر فتح ہوا اور ایک مضبوط سلطنت قائم ہوئی۔

اس کی فیاضی کا ایسا شہرہ تھا کہ دور دراز سے اہل علم و فضل آتے تھے اور اس کی بارگاہ سے مالا مال ہو کر جاتے تھے۔ ایک دنیا اس کی شخصیت پر ناز کرتی تھی۔ آخر زمانہ میں دشمنوں نے اکبر کو اس سے بدظن کر دیا، پھر اس کا جو حشر ہوا وہ ہم بیان کر آئے ہیں۔

اس کا ایک دیوان فارسی میں اور ایک ترکی میں ہے جو نہایت مشہور ہوا ہے۔

نمونۂ کلام:

رباعی

ارباب فنا بلند و پست ایشانند — در جام بقا مدام مست ایشانند
در معرض نیستی است ہر چیز کہ ہست — میداں بیقیں کہ ہر چہ ہست ایشانند

اے کوئے تو کعبۂ سعادت ما را   وے روئے تو قبلہ ارادت ما را

خوش آنکہ بجذبۂ عنایت سازی   وارستہ ز قید رسم و عادت ما را

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے:

شہی کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او   اگر غلام علی نیست خاک بر سر او

محبت شہ مرداں مجو ز بے پدری   کہ دست غیر گرفت است پائے مادر او

ایک اور قصیدہ اصطرلاب کے بارے میں کہا ہے:

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار   آں بدر کو میانہ شہابش کند گزار

یا آنکہ می کند بہ مہ و خور برابری   آمد بجاں ز حلقہ بگوشان شہریار

نارد بہ چشم کوکبۂ آفتاب را   چوں مہچۂ لوائے شہنشاہ نامدار

پیوستہ آسمان و زمیں زیر حکم اوست   ہمچوں نگین خاتم شاہ جم اقتدار

برکف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی   تا بر قدوم اشرف شاہاں کند نثار

شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف   بر درگہش سپہر نہد روے افتقار

کہتے ہیں ایک رات ہمایوں بیرم خاں سے گفتگو کر رہا تھا۔ بات کرتے کرتے بیرم خاں پر غنودگی طاری ہوگئی۔ بادشاہ نے ہوشیار کرنے کے لیے کہا "او بیرم میں تجھ سے کہہ رہا ہوں"۔ بیرم چونک کر اٹھ بیٹھا اور کہا "ہاں بادشاہ سلامت میں حاضر ہوں لیکن میں نے سنا ہوا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے آنکھوں کی، درویشوں کے سامنے دل کی اور عالموں کے سامنے زبان کی حفاظت و احتیاط رکھنی چاہیئے۔ میں اس فکر میں گم تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی اور عالم بھی۔ میں آخر کن کن چیزوں کی حفاظت کروں۔ ہمایوں کو اس کا یہ جواب بہت پسند آیا اور بڑی تعریف کی۔

بیرم خاں ۹۶۸ھ میں پٹن گجرات میں شہید ہوگیا۔ اس کی ہڈیاں وصیت کے مطابق مشہد میں لے جاکر دفن کی گئیں۔

بیکسی غزنوی نہایت فاضل و کامل شخص تھا۔ حرمین کی زیارت سے فارغ ہوکر ہندوستان آیا۔ عرب میں حدیث کی بعض کتابیں مشکوٰۃ وغیرہ پڑھیں اور میر مرتضیٰ شریفی سے سیرت و شمائل نبوی کا درس لیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اپنے وطن لوٹ آیا لیکن بمقام پشاور ۹۰۳ھ کو اس کا انتقال ہوگیا۔

نمونۂ کلام:

در دیر و کعبہ جز بتو مائل نبودہ ام   ہر جا کہ بودہ ام ز تو غافل نبودہ ام

فلک را رسم بے مہری نہ در دوران تو شد   کہ دوران فلک تا بودہ بے مہر و وفا بودہ

قطعہ:

بیکسی گر شنود طعنۂ دشمن صد بار   لائق آنست کہ آشفتہ و درہم نشود

زانکہ ایں بیت کمال است بعالم مشہور   ایں چنیں بیت چرا شہرۂ عالم نشود

سنگ بد گوہر اگر کاسۂ زریں شکند   قیمت سنگ نہ فزاید و زر کم نشود

رباعی

اے دل تو عناں بغصہ و غم ندہی　　یک لحظہ خوشی بملکت جم ندہی
یاری اگرت بدست افتد زنہار　　خاک قدمش بہر دو عالم ندہی

مولانا بیکسی نے لکھا ہے کہ "ایک دن غفران پناہ ہمایوں بادشاہ نے دارالخلافہ دہلی میں ایک محل کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع اپنے خط خاص سے لکھا تھا ؎

شنیدہ ام کہ بریں طارم زراندود است
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است

اتفاق کہ ہمایوں کا کچھ ہی دن بعد انتقال ہو گیا اور اسے اسی محل میں دفن کیا گیا۔ یہ ہمایوں کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔"

مولانا بےکسی نے یہ واقعہ لکھ کر حسب ذیل قطعہ میں درج کر دیا جو لکھتے ہوئے موزوں ہو گیا تھا۔ قطعہ:۔

دریں کہ شاہ ہمایوں بوقت رحلت خویش　　نوشتہ بود سر منزلے کہ ساکن بود
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است　　بحسن کہ عاقبت خود اشارتے فرمود
چو شد بحکم قضا مدفنش ہماں منزل　　کہ بود قبلۂ حاجات و کعبۂ مقصود
بناء بریں پئے تاریخ رحلتش گفتم
بنائے منزل سلطان عاقبت محمود

باقی کولابی شاعرانہ طبیعت رکھتا تھا۔ یہ اشعار اسی کے ہیں:

ز فرقت تو گرفتار صد الم شدہ ام
تو شاد باش کہ من مبتلائے غم شدہ ام

خوباں اگر ندانند امروز قدر مارا　　دانند قدر مارا فردا کہ ما نباشیم

بچشمم گاہ خون دل گہی خون جگر بستہ
من غم دیدہ را بے روی او راہ نظر بستہ
بگردد ہمچو سرو آزاد در باغ جہاں ہرگز
چو نرگس ہر کہ او چشم طمع در سیم و زر بستہ

باقی کافی عرصہ تک ہندوستان میں رہا۔ معصوم کابلی کی بغاوت میں مارا گیا۔

بیاضی یہ آگرہ میں ایک آزاد مشرب وارفتہ شخص تھا۔ اس کا مطلع ہے ؎

ہر کہ بر از وصل آں سرو سہی بر خورد
از خوشئ طالعست طالع خوش بر خورد

اس نے ایک رباعی میں کاہی اور غزالی کا محاکمہ کیا ہے:

کاہی و غزالی آں دولا یعقل مست — در غیبت جامی و نوائی زدہ دست

در دہر کسی بے مثل اینہاں نگذشت — کاہی چہ خس است وہم غزالی چہ مگست

پیروی خواجہ آصفی کا پیرو ہے۔ مصوری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ صورت سے حقیقت کی طرف کھینچ لے جانا اس کا فن ہے۔ اس نے ایک رسالہ "صورت و معنی" بھی لکھا ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

خداوندا ز معنی تنگ دستم — بہ بخشائی کہ بس صورت پرستم

ز لطف خویشتن اے ایزد پاک — چناں سازی بصورت خانۂ خاک

کہ ہر صورت مرا کہ دیدہ آید — بسوئے معنیم روئے نماید

پیروی کے اور شعر یہ ہیں ؎

بے دردرا شراب محبت کجا دہند

کیفیتی است عشق بتاں تا کرا دہند

خواب دیدم یار قیبش در دل افتاد اضطراب — مردہ بودم دیدہ اگر بیدار می گشتم ز خواب

نظر چوں افگنم وقت تماشا بر مہ رویش — عتاب آلودہ بیند سوئے من تا نگرم سویش

وزدیدہ چوں نگاہ باں نازنیں کنم — چوں بنگرد ز شرم نظر بر زمیں کنم

طفل اشکم برہ یار سر خویش نہاد — خوش یتیمانہ دریں رہ قدمی پیش نہاد

نازپروردہ چو تاب ستم عشق نداشت — یار را تا ہم جفا پیشہ و بدکیش نہاد

رفتم در اضطراب چو از من جدا شود — کاں مہ مباد با دگری آشنا شود

اس کی طولیات کا ایک دیوان ہے۔ ہندوستان میں فوت ہوا۔

بقائی ولایت ایران سے نیا نیا آیا ہوا ہے۔ دکن میں ملک قمی شاعر کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں سے گجرات پہنچا اور میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہنے لگا۔ پہلے اس کا تخلص مشغولی تھا، مرزا نے بدل کر بقائی رکھ دیا۔

اس کے اشعار میں ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کے حالات باوضع و متوازن ہیں ؎

تا عشق ز مژگاں بتاں نیشتر آورد — خون از رگ و از ریشۂ من جوش برآورد

فریاد کہ تا چشم زدن تیر خیالش — در دیدہ فرو رفت و سر از دل برآورد

؎ بجائے اشک از چشم دل افگار می بارد

ہمہ خوں جگر زیں ابر آتش بار می بارد

؎ مرغ دل تا صید چشم او شکار انداز بود — ہر سر مو بر سرم چوں مرغ در پرواز بود

اس نے اب خان خاناں کی ملازمت ترک کر دی ہے۔ کہتے ہیں آگرہ آیا ہوا ہے اور لاہور کا ارادہ رکھتا ہے۔

ملا نورالدین محمد ترخان

پہلے نوری تخلص تھا۔ چند سال تک سرہند کے مضافات میں سفیدون نامی پرگنہ کا جاگیردار رہا اس لیے سفیدونی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

علوم ہندسہ، ریاضی، نجوم اور حکمت میں بڑا ماہر و ممتاز تھا۔ ہمایوں کا ہم راز و ہم سخن مصاحب تھا۔ اسی دربار سے اسے ترخان کا خطاب ملا۔ سخاوت و فیاضی اور مجلس آرائی میں بے مثل آدمی تھا۔ شعر کہنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔

ایک دن فتح پور میں چوگان بازی کے میدان میں ایک ہاتھی نے اسے زخمی کر دیا۔ کہا کرتا تھا "گواہ رہو کہ میں نے اس لغویت و پریشانی میں بعض باتوں سے توبہ کر لی ہے۔" لوگوں نے بہت کچھ معلوم کرنا چاہا کہ آخر کن باتوں سے توبہ کی؟ لیکن کسی خاص بات کا ذکر نہ کیا۔ اس وقت میں نے کہا " پہلی وہ چیز جس سے توبہ کرنی چاہیے۔ وہ شعر ہی ہے مگر اس کو پتہ نہیں میرا فقرہ پسند آیا یا نہیں لیکن دوسرے بہت خوش ہوئے۔

اس نے اپنے عہد حکومت میں جمنا سے ایک نہر کھدوائی تھی جو پچاس کوس تک کرنال بلکہ اس سے بھی آگے تک جاتی تھی۔ اس نہر سے اس علاقہ میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوش حال ہو گئی۔ یہ نہر اس نے شہزادہ سلیم کے نام پر بنائی تھی۔ اس کی تاریخ اس نے "شیخو نئی" نکالی ہے (شیخو تو سلیم کا عرف تھا) اور نئی ہندی زبان میں نہر کو کہتے ہیں۔

بعد میں اس کے حالات بہت ابتر ہو گئے اور اس نے بڑی مصیبتیں اور غم برداشت کیے جس وقت اکبر بادشاہ ۹۹۴ھ میں اٹک تشریف لے گئے تھے تو اسے دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کا متولی بنا دیا تھا۔ اسی جگہ اس نے انتقال کیا — نمونۂ کلام:

دل تنگ دور از آں لب خنداں نشستہ ام
مانند غنچہ سر بگریباں نشستہ ام

ز روئے مکرمت وز راہ احساں	بہ ترخان داد خانی شاہ عادل
ازیں خانی ہمیں نامیت بروے	ازیں نام شگرف اوراچہ حاصل
ز ترخانی ہم اوراشکوہ ہست	بہ نزد خسرو دانائے کامل
کہ غیر از خان خنگی می نماند	ز ترخانی تری گردد چو زائل

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے حکیم مرزا پر لشکر کشی کی تھی خان مذکور حکم عدولی کر کے ۹۸۹ھ میں پنجاب سے لوٹ کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ بس یہ بات بادشاہ کی بدگمانی کا سبب بن گئی۔ جب اکبر اس سفر سے واپس آیا تو فتح پور میں شاہی عتاب میں رہا اور حساب کتاب کے سلسلہ میں چند سال تک سزائیں بھگتتا رہا۔

واقف کار لوگ اس کے زوال کا سبب یہ بتلاتے ہیں کہ تاتار خاں حاکم دہلی سے اس کی مخالفت تھی۔ اس نے تاتار خاں پر ایک ہجو کہی۔ اس ہجو میں دہلی کے بزرگوں کی شان میں بھی بے ادبی کر گیا۔ بس اسی بے ادبی کا وبال اس پر پڑا تھا۔

اس نے یہ ہجو قاسم کاہی کے نام سے منسوب کر کے مشہور کرادی تھی جس کے شعر یہ ہیں:

مفتیٔ دہلی ست میاں خانِ جہاں　　مفت نداده است فتاوات
حاکمِ شہر ست ز تاتار خاں　　خادمِ او چهره حمارات
شیخ حسن چک زنهٔ بزهری　　چک چک بسیار و جکاجات
وقت صلواة ست طہارت　　مقری بر آمد به منارات
شہرکش و شہرکش و شہرکش　　لک لک بسیار و لکالات

اسی ہجو کا مطلع ہے ؎

آه ز دہلی و مزارات　　واه ز خرابیٔ عمارات

اس ہجو میں دو سو پچاس شعر ہیں۔ دہلی کے ایک فاضل بزرگ تھے جن کا نام شیخ محمد کنبو تھا، ان تمام شعروں کا جواب بس ایک ہی شعر میں دے دیا۔ قطعہ:

نورالدین لاده پدر او ازیں
زاده چنیں لاده ز لادات
چک زده آں ابله بیہوده گوئی
لیس جوابٌ بخرافات

اسی زمین میں مولوی نورالدین عبدالرحمٰن جامی کا قطعہ ہے:

آه من العشق و حالات
احرق قلبی بحرارات
مانظر العین الیٰ غیرکم
اقسم باللہ و آیات

کہاں مولٰنا نورالدین جامی اور یہ نورالدین جو اپنے آپ کو جامی سمجھنے لگا تھا ؎

گرنهٔ ہمکار با نیکاں ز ہم نامی چه سود
یک مسیح ابرای اکمه کرد و دیگر اعوراست

بہر حال آدمی لائق تھا، ممکن ہے اپنے کیے پر پشیمان ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ اس کی ان مصیبتوں اور دکھوں کو اس کی غلطیوں کا کفارہ بنا دے۔

جب نورالدین اپنے عہدہ سے معزول ہو کر آگرہ آیا ہوا تھا، ایک دن میں بازار جا رہا تھا کہ وہ اچانک سامنے سے نمودار ہوا۔ میرے ساتھیوں میں سے میاں کمال الدین حسین شیرازی نے جو نہایت خوش مزاج ظریف آدمی تھا اور آگرہ کے ایک بڑے گھرانہ سے تعلق رکھتا تھا، نورالدین سے کہا کہ نواب خاں دہلی کے بزرگوں کا نام تو آپ نے لے لیا،

اب اگر آگرہ کے بزرگوں پر بھی جناب مہربانی فرمائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگرہ کے بزرگوں میں کوئی قابلیت نہیں پاتے کہ ان کا تذکرہ کریں"۔ میری بات پر وہ ہنس دیا اور کہا: "وہ ایک بہتان ہے جو مجھ پر باندھا گیا ہے"۔

تروی اودھ ماوراءالنہر کا رہنے والا ہے۔ لطیف طبع آدمی ہے۔ پہلے الغ میرزا کے مصاحبوں میں تھا۔ جس زمانہ میں ان میرزاؤں نے قلعۂ بھڑوچ پر قبضہ کر لیا تھا، اس نے یہ رباعی کہی تھی:

اولاد تمر کہ در شجاعت فردند
شد فتح بہر کجا کہ رو آوردند
کردند چو فتح بھروچ از روئے ستیز
تاریخ شد اینکہ فتح بھروچ کردند

توسنی اس کا نام منوہر ہے۔ سانبر کے راجہ لون کرن کا بیٹا ہے۔ سانبر کا نمک زار مشہور ہے۔ توسنی کے کلام میں بھی بڑی نمکینی پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کا سارا نمک بس اسی کے کلام میں بس گیا ہے۔

توسنی نہایت خوب صورت اور ذہین شاعر ہے۔ پہلے اس کا نام محمد منوہر تھا بعد میں بادشاہ نے اسے میرزا منوہر کا خطاب دیا لیکن اس کا باپ باوجود کافر ہونے کے اسی پرانے نام محمد منوہر پر فخر کرتا تھا۔ اگرچہ محمد جیسے ناموں سے نسبت اکبر کو پسند نہ تھی۔

توسنی نہایت موزوں طبع تھا جس کا اندازہ اس کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے ؎

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر
مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

رباعی

بے عشق تو در جگر لبالب نار است / بے درد تو در سرم سراسر خار است
بت خانہ و کعبہ ہر دو نزد دم کفر است / ما را بہ یگانگی ایزد کار است

جس وقت بادشاہ نے اس کا تخلص رکھا تھا اس نے چند شعر کہے تھے:

شربت آشاما میا در بزم ما دردی نشاں / کز جگر در کف کباب و خون دل در ساغر است
ننگ مرداں ست حرف از جان و دل گفتن بعشق / دل چو خوں سخت بستہ جاں چو باد صرصر است
توسنی سردہ سمند شوق در میدان عشق / می رسی ایمن بمقصد رہبرت چوں اکبر است

ایک ہندو سے یہ جودت طبع اور کمال شعر کا ظاہر ہونا ایک حیرت انگیز بات ہے۔

تندروئی ابہری مولانا نرگسی کا بھانجا ہے۔ لطافت طبع اور ذہانت میں ممتاز تھا۔ بیرم خاں کے عہدِ اقتدار میں روم سے ہندوستان آیا اور اسی کے زیرِ تربیت و ترقی پائی۔ ایک کوہستانی لڑائی میں اتکہ خاں نے اسے قید کر لیا اور اکبر خاں کے ساز و سامان امام ہشتم علی رضا کے علم کے ساتھ اسے بھی مال غنیمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کو اس کا کلام نہایت پسند آیا۔

اس نے "حسن و یوسف" کے نام سے ایک رسالہ اتکہ خاں کے لڑکے یوسف محمد خاں کے نام پر لکھا تھا جس کا مطلع ہے ؎

بنام آنکہ روئے دشمن و دوست
بہر جانب کہ باشد جانب اوست

محبوب کے سراپا کی تعریف اسی مثنوی میں اس طرح کی ہے:

رخش آئینہ گردن دستۂ عاج
پری رویاں بآں آئینہ محتاج

کفش چوں آفتاب آئینہ نور
شعاع آفتاب انگشت آں حور

بچشم عقل فرق آں شکر لب
شہابی بود رخشاں در دل شب

ندانستم غلط کردم شہابی
میاں سنبلستان جوئی آبی

زنافش آرزو ببریدہ امید
بچاہ ناامیدی ماندہ جاوید

ہوس گم دیدہ گردش گاہ بیگاہ
چو مہ تشنہ بر پیر امنی چاہ

فراز بینیٔ آں نخل مقصود
مقوس ابرواں وسمہ آلود

دمیدہ بر خلاف رسم و آئیں
دو برگ سوسن از یک شاخ نسریں

بچشم بینیٔ آں نور دیدہ
بود چوں شب نمی بر گل دمیدہ

بہ برج عصمت آں دُر ناسفتہ
دو ماہ نو شدہ با یکدگر جفت

بلطف از غنچۂ سوسن زیادہ
زباں در کام و لب بر لب نہادہ

اس نے عمادؔ کے "دہ نامہ" کا بھی جواب کہا تھا، جس کے چند شعر ہیں:

از حسرت لعل آبدارت
وز فرقت زلف تابدارت

موئے شدہ جسم ناتوانش
در جسم نماندہ جائے جانش

خون ست دلش ز غصہ و غم
خوں می خورد و نمی زند دم

صبح کی تعریف میں لکھتا ہے ؎

خاکستر صبح رفت برباد
در پنبۂ صبح آتش افتاد

چند اور شعر:

سرِ بزالو چو نہم در ہجر آں پیماں گسل
تودۂ خاکستری گردد تنم از سوزِ دل

شود از بہر قلم چوں علم تیغ جفائے او — تظلم را بہانہ سازم و رقم بپائے او
جفائے عالمے بر خود پسندیدم ندانستم — کہ چنداں اعتمادے نیست بر مہر و وفائے او

در حقیقت بخیہ ہائے خرقۂ پشمینی فقر
حرص را بر دست از زنجیر استغنا نہد

گدائے عشق بر سنجاب سلطانی زند خندہ — چو با جسم غبار آلودہ از گلخن بروں آید

گرد ہستی رفت بر باد و ہنوز از آب چشم
خاکساراں رہ عشق ترا پا در گل است

تیغ مژگان تو اندر بیخودی آمد نیاز — چوں بخود باز آمدم عہد زخنہ در جاں داشتم

بادشاہ کے حکم سے اس نے ہاتھی کی تعریف کی تھی ؎

زخاک رہ شاہ گردوں سریر — پے عطر بر خود فشاند عبیر
عقاب فلک بر سرش بے گزاف — بود بیضۂ قلۂ کوہ قاف
میاں را چو بندند بزنجیر زر — بود کہکشاں و فلک در نظر
چو آید بہ تنگ از تف آفتاب — فشاند چو فوارہ بر خویش آب
نشینند دائم بعہد دلبری — بلی کوہ قاف است جائے پری

۹۷۵ھ میں چوروں نے اسے تلوار مار کر شہید کر دیا۔ آگرہ میں دفن کیا گیا۔

تشبیہی کاشی دو تین بار ہندوستان آکر چلا گیا۔ اس زمانہ میں پھر آیا ہوا ہے اور الحاد و بے دینی پھیلانے میں معروف ہے۔ بسخوانی مسلک کا داعی ہے۔ اپنے آپ کو شیخ ابو الفضل سے بڑا مجتہد سمجھتا ہے توسل و سفارش سے دربار میں باریابی حاصل کر لی ہے اور اکبر کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا ہے جس میں بادشاہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یکسو ہو کر تقلید پرستوں کو بالکل ختم کر دو تاکہ حق اپنے مرکز پہ پوری طرح استوار ہو جائے اور خالص توحید رواج پائے۔ اس نے ایک رسالہ شیخ ابو الفضل کے نام سے منسوب کیا ہے جو حروف و نقطوں کی کرتب بازی کا نمونہ ہے اور اس میں عددی مناسبتیں پیدا کی ہیں۔

حکیم عین الملک نے اس کے تخلص "تشبیہی" کے اعداد لفظ "زندیقی" کے مطابق نکالے ہیں جو اس کے مکر و زرق سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس کی بکواس کا نمونہ یہ ہے:

یکے بر خود ببال اں خاک گورستاں زشادابی — کہ چوں من کشتۂ زلل دست و خنجر در لحد داری

تو ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
کہ من آں جلوہ قد می شناسم

دروست ایں جہاں و آں جہاں پوچ — کچھ در دست نیست ایں پوچ و آں پوچ

اس نے شیخ ابوالفضل کی محفل میں محمود بسا خوانی کا رسالہ مجھے دیا تھا، جس کا دیباچہ تھا :

"یا اللہ المحمود فی کل مقالہ استعین بنفسك الذی لا الہ الا ھو الحمد للہ الذی وحید نعمہ بوجود کلیاتہ و اظہر وجود الکلیات من نفسہ سہویہم کلیا و ھو یعلم نفسہ ولا نعلم نفوسنا ولا ھو و ھو کون لا یکن الا بہ و مکان لا بغیرہ و ھو ارحم الراحمین "

سوال :- یہ جو " خلق " کہا جاتا ہے وہ کون ہے ؟

جواب :- یہ جو " خلق " کہا جاتا ہے وہ اللہ ہے !

اس کے منہ میں خاک دیکھو کیسی بکواس کی ہے۔ اس کے مذہبی جعل کا چار نقطوں پر انحصار ہے جنھیں اس نے اس رسالہ کے آخر میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے ۔" کتب بکر الکرار بجانب عجمی مجتہدی طیار رح ای کرب لت ش ب ی ہ ی انوی اخروی صاحب مقام "۔۔ لبقیہ رسالہ کا اسی پر قیاس کر لو +

تقی الدین شستری دربار شاہی میں نو وارد ہے۔ علوم عقلی و نقلی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ شعر بھی اچھے کہہ لیتا ہے۔ طبیعت موزوں اور شاعرانہ ہے۔

نمونۂ کلام :

گر دست ندہدم کہ بر ویم نظر کنم
باری دہان بیاد لبت پر شکر کنم
با آنکہ ہمچو سبزہ بخاکم نشاندۂ
دست و دلی کجاست کہ خاکی بسر کنم

ان دنوں وہ بادشاہ کے حکم سے شاہنامہ کو نثر میں لکھ رہا ہے گویا مخمل کو ٹاٹ سے بدلنے میں مصروف ہے +

ثانی خاں ہروی بڑے قدیم امیروں میں سے ہے۔ دانائی، تدبر اور حسن ذوق میں مشہور ہے۔ اس کے پاس جب کسی شخص کے علم و فضل کی تعریف کر کے پیش کیا جاتا تو وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہتا تھا کہ" ہمارے ساتھ دوستی اور محبت کی شرط یہ ہے کہ ہمارے متعلق کمینوں اور اوباشوں کی کہی ہوئی باتوں پر کان نہ دھرو، کیونکہ یہ لوگ خلوص کے دشمن اور نفاق کے بانی ہوتے ہیں۔ اس کے اشعار بے نمک ہوتے ہیں۔ تاہم اس نے اپنا دیوان مکمل کر لیا ہے۔ نمونۂ کلام :

اے رسم تو آزار من و قاعدہ بیداد — بیداد ازیں رسم و ازیں قاعدہ فریاد

بگذر ز ناخوش کہ دریں دیر دیر گیر
نیکی ندید ہر کہ بدی کرد با فقیر

از بہر سلام تو رقیب آمدہ در راہ — یارب کہ ازیں رہ نبرد سر بسلامت

رباعی: دیدم ز فراق آنکہ یعقوب ندید
در عشق کشیدم آنچہ مجنوں نکشید
ایں واقعہ کہ ہجر تو آمدہ بسرم
فرہاد گماں نبرد و وامق نشنید

ثانی خاں کا اصل نام علی اکبر ہے، شاید یہی نام کی مناسبت ہے کہ اس نے بھی الحاد و بے دینی کی تائید میں رسالے لکھے ہیں اور فن نقطہ کی مناسبتیں پیدا کر کے بادشاہ کو اور شاید خود کو وہ شخصیت سمجھتا ہے جو لفظ "شخص" کے اعداد کے مطابق ۹۹۰ھ میں ظہور کرنے والی ہے۔ محمود بسنحوانی کے عقائد بھی ان رسالوں میں بیان کیے ہیں (ان سب پر خدا کی لعنت) تصوف پر بھی ایک منظوم رسالہ لکھا ہے۔ یہ مزاحیہ بیت اسی کی ہے۔ ع

احمر نجم بحر نجم احمر نجا ما مصدر

غالباً آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی +

ثنائی مشہدی اس کا نام خواجہ حسین ہے۔ ابھی وہ ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن اس کی شہرت پہنچ چکی تھی، چنانچہ یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو طرح بنا کر محفل سخن منعقد کیا کرتے تھے اور ہر مشاعرہ میں اس کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ بلا اختلاف سب اس کی اُستادی کے قائل تھے، لیکن جب وہ یہاں آگیا تو حسد کی آگ نے عقیدت کو جھلسا کر رکھ دیا اور وہ بیچارا گوشۂ گمنامی میں لوگوں کے اعتراضات کا ہدف بنا رہا۔

اس کا دیوان مشہور ہے۔ ایک بہت اچھی مثنوی بھی لکھی ہے۔ کوئی بڑا عالم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی نثر اس کے قصیدوں کی طرح شان دار نہیں۔ شاعرانہ ذوق نہایت بلند ہے، بجز توحید و منقبت کے تمام اصناف سخن میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اسی کا شعر ہے:

چناں ناز بارد ز پا تا سرش
کہ رفتن تواں ناز از بسترش

مگر اس کے استاد کے اس شعر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے ؎

عشوہ و انداز ز میں ناز فشاندا ز ہوا
طرز خرام کردن و پا بزمیں نہادنش

نمونہ کلام: گر بمثل جا کند در پیش آئینہ شخص — بیند تمثال خویش تافتہ رو بر قفا

بسکہ از خانہ غم بروں ریزم — تنگی خانہ از بروں در است

ایلچی کی تعریف اس طرح کی ہے:

چو مہر فلک دہر گرد دیدۂ   چو خواب آشنا روئے ہر دیدۂ
نگر رشحۂ دست تست آفتاب   کہ شوید جہانے بیک قطرہ آب
سپاہی دراں قوم طالع زحل   گرفتہ بجدی کہ گرنی المثل
شود بر بدن شمع ہر موئے شاں   مشخص تسازد نظر روئے شاں

اس کے مزید اشعار:

آواز کفش شاں ببرد زہرہ از حیات   اصوات زشت شاں تبرد راہ در ضمیر
رفتار شاں چو آتش و گفتار شاں چو جنگ   دیدار شاں عقوبت و آواز شاں نفیر
گر در خیال دایہ کند شخص شاں گذر   کودک زبیم شاں تبرد لب بسوئے شیر

ای از فروغ شمع رخت انور آئینہ   ولی گشتہ از خیال تو جاں پرور آئینہ
آئینہ بہر دیدن خود پیش رو منہ   در حال من نظر کن و منگر در آئینہ
آئینہ دار در دلم آتش علم کشید   تا جا نمود مہر رخت در ہر آئینہ
تف سموم قہر تو گر شعلہ ور شود   معکوس عکس خویش بہ بیند در آئینہ

ساقی نامہ

بیا دل بہ مے خانۂ اہل راز   بکش جام معنی صورت گداز
خیال خویش را کن از صورت بری   کہ از دیدہ گردی نہاں چوں پری
نگر شوق آں رہنمایت شود   بکوئے خرابات جایت شود
بیا ساقی آں شمع خلوت نشیں   کہ چوں دست بوس است در آستیں
بدستم دہ و روشنم ساز دست   کہ در وی کشایم باعجاز دست
بیا ساقی از بہر رنداں مست   شیشہ بکشائے دست
نگہ کن بدرد و میرس از وبال   کہ در قحط خوں خوردن آمد حلال
بدہ ساقی آں کہربائی وجود   کہ از جذب طبعش نمایم صعود
زنم خیمہ بیرون ازیں جائے پست   چو ہمت کنم زیر پا ہر چہ ہست
بیا ساقی آں بادۂ گرم خوں   کہ در دل نماید محبت فزوں
بدہ تا کنم آشنائی بدوست   زہرش شوم بہ چو از مغز پوست

اس ساقی نامہ میں عامیانہ رنگ ہے۔ ہر جگہ اس نے "بیا" (آؤ) کا لفظ "بیار" (لاؤ) کے معنوں میں

استعمال کیا ہے۔ غالباً اساتذہ کی نگارشات کو بھی اس نے اسی طرح قیاس کیا ہے حالانکہ ان کی عبارت قطعہ ہوتی ہے اور پہلا شعر دوسرے سے مل کر معنی دیتا ہے۔

اس نے آفتاب پہ بھی قصیدہ کہا ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

عکسش کند طبیعت روغن عیاں در آب
سازد ز خاک قدرش اگر افسر آفتاب

اس کے قصائد میں مضمون کی تو بلندی ملتی ہے لیکن عبارت بڑی پست ہوتی ہے، وہی مثال ہوئی ؎

خانہا شان بلند و ہمت پست
یارب این ہر دو را برابر کن

جدائی

نام میر سید علی ہے۔ یہ مصوّر بھی ہے اور کئی حیثیتوں کا مالک ہے۔ اس کی ہر تصویر شاہکار ہے۔ ہندوستان میں وہ اپنے دور کا مانی ہے۔ داستان امیر حمزہ جو مصوّر سولہ جلدوں میں ہے اس کے اہتمام میں مکمل ہوئی۔ اس کی ہر جلد ایک گنجینہ اور ہر ورق ایک مرقع اور صفحہ صفحہ منقش ہے۔

شاعری میں اس کا ایک دیوان بھی مکمل ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام:

صبح دم خار دم از ہمدمیٔ گل میزد ۔۔۔ ناخنے در دل صد پارۂ بلبل میزد
حسن بتاں کعبہ ایست عشق بیابان او ۔۔۔ سرزنش ناکساں خار مغیلان او
پر ورم از داغ سودائی تو سرتا پائی ماست ۔۔۔ تاجر عشقیم وا ینہا مایۂ سودائی ماست
نیم بسمل صیدم وافتادہ دور از کوئے دوست ۔۔۔ میروم افتاں وخیزاں تا بہ بینم روئے دوست
خواستم گویم از احوال خود آں بدخو را ۔۔۔ ہمہ دم ہمدم غیر است چگویم او را

جذبی

نام بادشاہ قلی ہے۔ شاہ قلی خان نارنجی کا بیٹا ہے۔ موزوں طبع شاعر ہے۔

نمونۂ کلام:

این چاشنی کہ حسن ازل با بتاں دہد
جائے رسید عشق کہ بے درد جاں دہد

غایت رشکم نگر کز بیخودی ایم بہ ہوش ۔۔۔ گر کسے آگاہ شود کیں گفتگو از یاد کیست

تو آں شکاریٔ بے قیدی و من آں صیدم
کہ از نہایت خصمی نمی کشد صیاد

آنی کہ لذت شب ہجراں ندیدۂ ۔۔۔ خود را روز وصل گریزاں ندیدۂ
خار ملامتی نگرفتہ است دامنت ۔۔۔ خود را چو غنچہ سر بگریباں ندیدۂ

هرگز نبوده عشق ترا استقامتی ذوقی کم التفاتی جاناں ندیدۂ
با ہیچ کس جواب وسوالے نہ کردۂ داری دلے کہ ہیچ پشیماں ندیدۂ

بود دل از نگاہ غیر درستش چو آں مرغے
کہ طفل مکتب از بیم معلم سر دہد زدوش

پس از عمرے کہ چشمم بر جمال دلستاں افتد نقاب شرم تا رویش نہ بینم درمیاں افتد

من آں نیم کہ بقاصد دہم فسانہ خویش
کہ سازمش ز پئے مدعا بہانۂ خویش

زیک نگاہ تو در بزم ما وہم نقصاں
چہ جنگہا کہ نکردیم در میانۂ خویش

اس کے باپ شاہ قلی خاں کی رباعی ہے:

گاہ توبہ و گاہ کوزۂ مے شکنم
یکبار دو بار نے پیاپے شکنم
یارب زہد آموزی نفسم بر ہاں
تا چند کنم توبہ وتا کے شکنم

پٹنہ کے سفر سے واپسی پر ایک دن راستہ میں جذبی، قاضی شمس الدین قزوینی اور بعض نئے نئے شاعر حسین ثنائی کے اس شعر پر ؎

گر مثل جا کنی در پس آئینہ شخص
بیند تمثال خویش تافتہ رو بر قضا

بحث کر رہے تھے، میں وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے اس شعر کا جس پر اختلاف تھا مجھ سے مطلب دریافت کیا میں نے کہا "اب تو یہ معاملہ ہو گیا ہے کہ یار لوگ شعر اور "تیتال" میں فرق نہیں کر پاتے"۔

یہ تیتال سلطان حسین مرزا کے زمانہ میں ایک مسخرا تھا جو بڑا باتونی اور زبان دراز تھا۔ عالموں کا لباس جبہ عمامہ پہن کر علماء کی محفلوں اور مدرسوں میں طالب علموں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر جاتا اور پہلے نہایت معقول عالمانہ انداز میں مناظرہ اور مباحثہ شروع کر دیتا۔ جب لوگ اس کی تقریر سے متاثر ہوتے، پھر وہ بحث میں مہمل اور بیہودہ باتیں خلط ملط کر دیتا جس سے عالم اور ملا شبہ میں پڑ جاتے۔

جمیلی کالپی وال

اس کے والد شیخ جلال واصل تھے جو شیخ محمد غوث کے خلیفہ ہیں اور سرود و سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ جمیلی کو اپنے باپ کی یہ کیفیت و حال تو نصیب نہ ہوا لیکن وہ حصول علم اور ذوق شعر

سے محروم نہ رہا۔ اگرچہ اس کے اکثر اشعار مضحکہ خیز ہیں۔
یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

گہ شادیٔ وصل تو مرا دست نداد
باری بہ غمت خاطر خود شاد کنم

سر زلفش مرا سوئے جنوں تا رہنموں گشتہ
دل دیوانہ ام پابستۂ قید جنوں گشتہ

اس نے حاکم کالپی قاسم علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

بود نسبت تو بہ خیل خوانین
بسے نا ملائم بسے نامناسب

یہ شعر اسی سے منسوب ہے ؎

موش دل را کہ بعد خون جگر پروردم
ناگہاں گربۂ عشق آمد و دنداں زد و برد

اس کا بڑا بھائی شیخ فضیل ہے جسے عربی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اس نے عربی میں بڑے فصیح شعر بھی کہے ہیں۔
اس نے معین الدین طنطرانی کے جواب میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے ؎

یا جمیل الوجہ وجہی عن قدیم الحال حال
راح روحی بالہوی والدمع کالسلسال سال

ایک دن اس نے یہ مطلع پڑھ کر سنایا۔ چونکہ یہ دونوں بھائی سبز فام ہیں، میں نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے اس مطلع میں اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا ہے"۔ اس جملہ پر وہ بہت ہنسا۔
طنطرانی کے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

یا خلی البال قد بلبلت بالبلبال بال
بالنوی زلزلت قلبی فہو بالزلزال زال

شیخ فضیل نے شیخ فیضی کی تفسیر پر عربی نثر و نظم میں جو "توقیع" لکھی ہے وہ اس کے علم و کمال کا واضح ثبوت ہے۔
ان دونوں دونوں بھائی لاہور سے اپنے وطن کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔

چشتی شیخ حسین صوفی نام ہے، وطن دہلی ہے۔ چونکہ وہ شیخ اسلیم چشتی کا مرید تھا اس لیے یہ تخلص رکھا تھا۔ فتح پور عرف سیکری کی خانقاہ کے صوفیوں میں شامل تھا۔ اس کا ایک دیوان ہے اور چند دوسری تصانیف بھی ہیں۔ جن میں ایک کتاب "دل و جان" کے نام سے نظم میں لکھی ہے مگر اس میں ہندوستانی رنگ ہے اور مضمون بھی اس کا اپنا نہیں بلکہ تفاحی استاد میر علی شیر کی کتاب "حسن و دل" سے لیا ہوا ہے جس میں تفاحی نے خوب ہی داد سخن دی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے چشتی کی

"حسن و دل" کا مزید ذکر بے فائدہ ہے۔ اس کے کئی ہزار اشعار ہیں، اگر کوئی شعر قابل ذکر ہے تو بس یہ مطلع ہے:

چنیں کہ پا بر طاؤس قیس را میلی است
مگر کہ از اثر پائے ناقۂ لیلی است

جعفر ہرات کے سیدوں میں سے ہے۔ شعر اور فن معما گوئی میں خاصا سلیقہ رکھتا ہے۔ آنکہ خاں کا میر بخشی تھا اس نے میرزا عزیز کے نام پر ایک غزل معمایں لکھی ہے۔

نمونۂ کلام:

شانہ برہم زدہ آں سلسلۂ مشکیں را
آہ اگر باد بگوش تو رساند ایں را

غبار مشک نخواہم بداں عذار نشیند
ازیں مباد کہ با خاطرت غبار نشیند

سبزۂ ما در باغ باشد جائے زیر پائے گل
باغ جنت ما فتادہ سبزہ بر بالائے گل

جعفر بیگ آصف خاں قزوینی کے لقب سے مشہور ہے۔ سابق میر بخشی آصف خاں میرزا غیاث الدین علی کا بھتیجا ہوتا ہے۔ اب وہ دربار کے اعلیٰ مرتبہ کے بخشیوں میں شامل ہے۔ اس کو اپنے چچا سے بڑی شکایت تھی کیونکہ اس نے اپنے عہد میں اسے ترقی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اب بھی وہ اپنے مرحوم چچا کے خلاف بغض و عناد ظاہر کرتا رہتا ہے۔

اپنے ہم عصروں میں اس کی شعری صلاحیتیں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن عیش و آرام اور گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے شعر گوئی کی مشق کچھ زیادہ نہیں۔ علم سے بھی بے بہرہ نہیں۔ اگر وہ صرف شاعری کی طرف متوجہ رہتا تو زمانے کو اپنا مداح بنالیتا۔

نمونۂ کلام

کارم امروز بہ بیداد گری افتادہ است
کہ بہر جا کہ نہد پائے سری افتادہ است

گر گرد شمع سرکشت سرگشتہ چوں پروانہ ام
آخر بکشتن میدہد پرواز گستاخانہ ام

گل ہر کس بتاراج خزاں رفت
مرا ہم گلبن و ہم گلستاں رفت

بآتش کارت افتادہ است جعفر
دو صد بلبل بایں جا یک سمندر

بہ پرسش گنہم روز حشر آخر شد
تمسکات گناہاں خلق پارہ کنید

ایں چہ صحرا بود و ایں صیاد صید افگن کہ بود ہیچ نخچیرے نہ شد پیدا کہ نو تیرے نداشت

نامہ دردے سوئے دلدار می باید نوشت
درد دل بسیار شد یا رمی باید نوشت

گر نہ جعفر بہ ہمیں دین و دلے خرسند لی من وکیلش کہ دل و دین تو اندانی داشت

ہمت نگر کہ صد ورق دفتر امید
صد پارہ کردہ ایم و بخوناب شستہ ایم

گلستاں را گلے از تو شگفتہ است کہ امشب تا سحر بلبل نخفتہ است

شہر گنجائش غمہائے دل من چو نداشت
آفریدند برائے دل من صحرا را

گلہائے تو تمام از گلہ سر کردن من گلۂ من ہمگی از گلہ نشنیدن تست

میا در خاطرش اے رحم و انجم را مکن ضائع
کہ خونہا می خورم تا بر سر بیداد می آید

جعفر رہ کوئے یار دانست مشکل کہ دگر ز پا نشیند

رسید و مضطریم کرد و آنقدر نہ نشست
کہ آشنائی دل خود کنم تسلی را

حیدری تبریزی

یہ حاجی تھا، لسانی کا شاگرد ہے۔ شریف تبریزی بھی اس کا اُستاد تھا جس نے لسانی کی تعریف کرتے ہوئے اسے "لسان الغیب" کہا ہے۔ حیدری ہندوستان میں عرصہ تک رہا۔ ایک بار جا کر پھر آگیا۔ دوسری مرتبہ جو گیا تو لوٹ کر نہ آیا۔ اس کا دیوان چودہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، مگر اس میں اچھے شعر بہت تھوڑے ہیں۔

شاہی ہاتھیوں کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

نمود پشت ہائے ریگ رواں فیلہائیش کہ در ہیجاست
کز پئے غرق کردن اعدا ہر طرف موجہائے بحر بلاست

اس قصیدہ کے صلہ میں اکبر نے خزانۂ عامرہ سے گھوڑا اور خلعت مرحمت فرمایا لیکن جب بادشاہی خازن نے صلہ دینے میں ٹال مٹول کی تو اس نے یہ قطعہ کہا:

مشکلے دارم شہا خواہم کنم پیش تو عرض زانکہ زیں مشکل مرا صد داغ حسرت بر دلست
سیم و زر انعام کردی لیکن از خازن مرا ہم گرفتن مشکل و ہم ناگرفتن مشکل ست

اسی کے اشعار ہیں ؎

مہر و مہ رویاں عالم را نباشد اعتبار
پرتو خورشید در یک جا نمی گیرد قرار

سوزم ہمہ دم سوز دروں کہ چنیں است — خوارم ہمہ جا بخت زبوں کہ چنیں است

قطعہ:
چو پاکاں حیدری تا می توانی
کمالے کسب کن در عالم خاک
کہ ناقص رفتن از عالم چناں است
کہ بیروں رفتن از حمام ناپاک

حزنی یہ عراق کے عالموں میں سے تھا۔ جب ہرات میں شورشیں برپا ہوئیں تو وہ وہاں کے خطرات سے بچ کر ہندوستان چلا آیا لیکن یہاں بھی وہ محروم و مہجور ہی رہا اور انتقال کر گیا۔

نمونہ کلام:

مرا بر سادہ لوحیہائے حزنی خندہ می آید — کہ عاشق گشتہ و چشم وفا از یار ہم دارد
ز نادانی ہیر او کرد ہمدم کار من ضائع — عجیب تر اینکہ بر من منت بسیار ہم دارد

خرقہ بر آتش نہم تا بوئے ایمان بشنوی
از کہن دلقی کہ و یکتا رہے زنار نیست

حیاتی گیلانی بڑا درد مند اور مخلص دوست ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ حکیم ابو الفتح کے وسیلہ سے بادشاہی ملازمت میں داخل ہوا اور ترقی کی۔

اس کا ایک دیوان مکمل ہے۔

اس کے کلام میں اکابر شعراء کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن ذکاوت و ذہانت فطری ہے۔

نمونہ کلام:

بہ ہر سخن کہ کنی خویش را نگہباں باش — ز گفتنی کہ دلے نہ شگفد پشیماں باش
چہ بال مرغ کہ گر شغل روزگار این ست — ز مور ہم قدمے وام کن گریزاں باش

خدا بہ شکوہ زبان من آشنا نکند
من و شکایت وانگہ ز تو خدا نکند

رباعی:
دایم تو ستم نمودۂ معذوری — نامی ز وفا شنودہ معذوری
گفتی کہ یمن حرف جفا بہتان ست — خود را تو نیازمودۂ معذوری

رباعی:۔

تا پختگی آرزو بود پیشۂ تو
جز پائے تو میخی نزند تیشۂ تو
دشمنی نکند آنچہ تو با خویش کنی
اے خون تو بر گردن اندیشۂ تو

در میان کافراں ہم بودہ ایم　　یک کمر شائستۂ زنار نیست

تا در فرو بندم بخود غم خانہ باید مرا　　آباد کردہ ہمتم ویرانہ باید مرا
از قصۂ فردا ودی عالم پریشاں میشود　　از گفتگوئے درد خود افسانہ باید مرا
از کشت پائی ایں جہاں کاں خرمن گاؤ وخراست
نے خرمن نے خوشۂ نے دانۂ باید مرا
گر تیغ غازی می کشد در تیر کافر راضیم
من تشنۂ خون خودم پیمانۂ باید مرا
منتیں حیاتی پیش من شور مرا برہم مزن　　من عاشقم تو عاقلی دیوانۂ باید مرا

حیاتی

یہ گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ تھا۔

نمونۂ کلام:

پیغام دوست داغ جگر تازہ می کند
درد وداع و رنج سفر تازہ می کند

رباعی:۔

عاشق رخ خویش بمدت سود و برفت
فال مہر کہ با تو داشت بنمود و برفت
یک شب بہ ہزار حیلہ در بزم وصال
پروانہ بہ شمع دیدہ بکشود و برفت

حالتی

اس کا اصل نام یادگار ہے۔ خود سلطان سنجر ماضی کی اولاد بتاتا ہے لیکن میرزا احمد نے تاریخ نظامی میں اسے چغتائی نسل بتایا ہے۔ بڑا نیک اور خوش عقیدہ آدمی ہے۔ صاحب دیوان شاعر ہے۔

نمونۂ کلام:

نماند آنقدر از گریہ آب در جگرم
کہ مرغ تیر تو منقار تر تواند کرد

بجائے رشتۂ پیراہنت اے کاش می باشم　　باں تقریب شاید با تو در یک پیرہن باشم

بر صفحۂ عذار تو آں خط مشک شود
مضمون تازہ الیست کہ از غیب رو نمود

از قضا گیرم بیازی ہر زماں چشم رقیب تا شود از دولت دیدار جاناں بے نصیب
کردہ جا بر گوشۂ چشم تو خال عنبریں
باز بہر عید حیا دے نشستہ درکمیں

در نالہ زر عنائی آں گل شدہ ام باز گل دیدہ ام امروز کہ بلبل شدہ ام باز
لعل دلجوئی تو از تبخالہ بس آزار دید
وہ کہ گلبرگ ترا از ژالہ آفتہار سید

حالتی کے باپ کا تخلص والہی تھا۔ یہ مطلع اسی کا ہے:

ماہ عید ابرو نمود و خاطرم ارشاد کرد
شکر للہ کہ غم سی روزہ ام آزاد کرد

حالتی کے لڑکے کا تخلص بقائی تھا۔ اس نے اپنے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا۔ بادشاہ کے حکم سے اسے کشمیر سے لاہور لایا گیا اور یہاں کوتوال نے قصاص میں قتل کرا دیا۔ وہ بھی موزوں طبع تھا۔ اس کا شعر ہے:

تا غمزۂ خوں ریز تو غارت گر جاں ست
چشم اجل از دور بحسرت نگراں ست

خان اعظم اصل خطاب اتکہ خاں ہے۔ جس وقت جوسا پر ہمایوں کو شکست ہوئی تو وہ گنگا عبور کر کے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن دریا میں غوطے کھانے لگا، اس وقت خان اعظم نے سہارا دیا اور مدد دے کر کنارے پر لے آیا۔ یہ خدمت اس کی آئندہ ترقیوں کا ذریعہ ہو گئی۔ اس کا مرتبہ شعر و شاعری کے مقام سے بالاتر ہے لیکن وہ نہایت موزوں طبیعت کا مالک تھا۔

نمونۂ کلام:

منہ اے طفل اشک از خانۂ چشم قدم بیروں
کہ می آیند مردم زادہا از خانہ کم بیروں
گر بخورشید رخت لاف زند بدر منیر
آخر از گنبد فیروزہ نگوں خواہد شد

یہ رباعی اس کے لڑکے یوسف محمد خاں کی ہے:

در کوئے مراد خود پسنداں دگر اند در وادیٔ عشق مستمنداں دگر اند
آنانکہ بجز رضائے جاناں طلبند آناں دگرند و دردمنداں دگر اند

خنجر بیگ چغتائی امیروں میں سے ہے۔ تردی بیگ خاں کا داماد ہے۔ اس نے اپنے حالات اور بادشاہ کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے جس میں تین سو شعر ہیں۔ گوناگوں صلاحیتوں کا مالک ہے۔ سپاہگری، خوش خطی، شعر و معما، اصطرلاب و نجوم، تطابق اعداد غرض تمام علوم و فنون کا جامع ہے۔ صاحب تصنیف ہے۔ اپنی مثنوی میں اس نے اپنے ان تمام اوصاف کو گنایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فارسی اور ہندی راگ راگنیوں میں بھی بڑا ماہر تھا۔ اس کو ایسے راگوں کا علم تھا جو بجز بلند مرتبہ سلاطین و امراء کے کسی کی محفل میں نہیں گائے اور اس زمانہ میں تو ان کا نام و نشان بھی نہیں رہا ہے۔ موسیقی میں اس کا مقابل کوئی نہیں تھا۔ اس نے بادشاہ کی نصیحت کے لیے جو مثنوی کہی تھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

شہریارا جہاں عجب جائی است — ہر زماں اندر و تماشائی است
چرخ نیرنگ ساز شعبدہ باز — ہر زماں بازئ کند آغاز
پیش ازیں بودہ اند در عالم — تاجداراں با سپاہ و حشم
زاں دلیراں پر ہوا و ہوس — ماند تاریخ ہائے کہنہ و بس
گر بدنیا ثبات دیدندی — انبیا زو چرا رمیدندی
خسروا کار ایں جہان حسود — ایں چنیں ہست و بود و خواہد بود
زیں ہمہ کاروبار پر خم و پیچ — نام نیک است اصل و آں ہمہ ہیچ
غرضم ایں بود زیں سخنی — بتو نوبت رسید تا چہ کنی
ایں زماں کہ تو یافت عالم زیب — حق نگہدار بادت از آسیب
گر ہمائے پرید زیں گلشن — بر سر ما تو باش سایہ فگن
سخنِ من کہ بے ریا باشد — گر نصیحت کنم روا باشد
چوں بہ خیریت تو می کوشم — سخن حق ز تو چرا پوشم
سخنِ زید یا کہ عمرو بود — بشنو گر ز نفس امر بود
شاہ باید کہ در گہ و بیگاہ — از خود و خلق و حق بود آگاہ
سہو مسکیں زیان نان باشد — سہو شہ آفتِ جہاں باشد
بگدا فکر حلق و دلق بود — در دل شاہ فکر خلق بود
بہ شود کار سلطنت بہ توزک — ہمچو فرمان شہ بہ مہر اوزک
چوں ترا نوبت جہانداری است — لازمت احتیاط و ہوشیاری است
تو چو شمعی و ملک تو خانہ — خلق گرد تو ہم چو پروانہ
ذرہ نبود چو نور خود نبود — نیست پروانہ شمع اگر نبود

یعنی از تست زندگی همه — تو شبانی و اهل ملک رمه
به چراگاه هست آمده است گله — گله را چوں تواں گذاشت یله
بتو فرمود حق نگهبانی — منصب انبیا رست چو بانی
بس کمی رسم انبیا را گم — از خود آگاه باش و از مردم
عمر خوش گوهریست قیمت داں — دولت و ملک را غنیمت داں
پادشاه ولی شعاری تو — در جہاں از برائے کاری تو
عدل و انصاف و جود و علم و سخا — لطف و احسان و خلق مهر و وفا
همه داری ز لطف یزدانی — حیکتم قدر خود نمیدانی
تو بخنده به فیل مست سوار — خلق در گریه بر سر دیوار
تو بدنداں فیل دست زناں — مردم انگشت فکره در دنداں
تو بخرطوم فیل پنجه کشا — آستیں ها فشانده از دنیا
تو مقابل بشیر درنده — مردم از وهم هر طرف کنده
تو بجنگ پلنگ بازی کن — رو کناں ها به پنجه و ناخن
تو ستاده به پیش حملهٔ گرگ — به تعجب ز دور خرد و بزرگ
تو گلوگیر مار اژدر سهم — خلق عالم به پیچ و تاب ز وهم
تو شناور به بحر بے پایاں — بر لبش است شسته ها از جاں
تو به جنگل پئے شکار ددوں — خلق از ترس و وهم از بیروں
تو شب تیرهٔ رفته یک ماه را — مردم از پے بنور مشعل آه
تو به سرما برهنه گر دیده — خلق در زیر جامه لرزیده
تو بگرما دواں بجامه درشت — خلق عرق عرق بزیر درخت
تو پیاده بهر طرف رانده — ما سواره ز کوفت در مانده
تو بمیداں خصم جنگ آور — لشکر از هر طرف تماشا گر
ایں چه لطف است ایں چه غم خواری — که بما و بخویشتن داری
ایں دلیری ست دور از اندازه — ایں شجاعت بتو بود تازه
گرچه اینها هنر بود بے ریب — لیک از پادشاه باشد عیب
شاه اگر دور از زیاں باشد — مردم ملک در اماں باشد
شاه از خویش اگر بود بے غم — همه زیر و زبر شود عالم

بتو مارا جہاں و جاں باید — بے تو جان و جہاں چکار آید
خنجرا غور در فضولی مکن — خاطر شاہ را ملول مکن
این حدیث تو دور از معنی است — شاہ ازیں گفتگوئے مستغنی است
او چو پیش خدائے مقبول است — دولت او بکار مشغول است
خواب اوست عین بیداری — مستیٔ او کمال ہوشیاری
حق بآں کس کہ کارساز بود — از ہمہ کار بے نیاز بود

خنجر بیگ نے جب یہ مثنوی بادشاہ کے سامنے پڑھی تو انعام واکرام سے نوازا گیا۔
اس کا ایک دیوان بھی مکمل ہے جس کے شعر بہت مشہور ہیں۔ اس کے چند اور شعر یہ ہیں:

آہم از دل چند در کوشش نہاں آید بروں
بعد ازاں چنداں کنم افغاں کہ جاں آید بروں

آہم گذشت از سروپا باد رفت جاں
تن خاک گشت و آتش دل شعلہ زن ہنوز

جس زمانہ میں خان زماں اور بہادر خاں نے سرکشی و بغاوت کی تھی، خنجر بیگ بھی ان کے ساتھ ہوگیا تھا اور بنگالہ چلا گیا تھا۔ غالباً اسی فتنہ میں وہ ہلاک ہوگیا۔

خسروی یہ میرزا قاسم جنابدی کا بھانجا ہے۔ حجاز کے سفر کے بعد ہندوستان آیا اور بڑے شاہزادہ کے ہاں ملازم ہوگیا۔ یہ بھی بہرحال قابل ذکر شخص ہے ؎

ز نور عشق باشد خسروی را دل چناں روشن
کہ شمع مرقد او میتواں کرد استخوانش را

نیالایند شیراں خرم سرپنجہ از خونم — سگان دیر را اے ہمنشیں زیں طعمہ مہماں کن

میر دوری اس کا نام سلطان بایزید اور خطاب کاتب الملک ہے۔ ہندوستان میں خط نستعلیق کو اس سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ شعر گوئی میں بھی خاصا ملکہ حاصل تھا۔ آخری عمر میں حج سے بھی بہرہ مند ہوا۔

نمونۂ کلام:

گہ در درون جانے گہ در دل حزینی
از شوخی کہ داری یک جا نمی نشینی

گر بوصل تو بد آموز نمی گردیدم — از فراق تو بدیں روز نمی گردیدم
سوخت پروانہ صفت مرغ دل من اے کاش — گرد آں شمع شب افروز نمی گردیدم
گر بہ تیر مژہ اش سرخ نمی کردم چشم — ہدف ناوک دل دوز نمی گردیدم

رباعی:

تا از نظر آں یار پسندیدہ برفت
خون دلم از دیدۂ غمدیدہ برفت
رفت از نظر وز دل نرفت ایں غلط است
کز دل برود ہر آنچہ از دیدہ برفت

خوش خطی میں میر موصوف کا ایک شاگرد خواجہ ابراہیم حسین احدی میرا ہم سبق تھا یہ شہر بلوط کے بزرگوں کی اولاد میں سے اور شیخ عبدالرحمٰن لاہوری بلوطی کے قریبی عزیزوں میں سے ہے۔ بزرگی اور ولایت میں اپنے زمانہ کا شہرہ آفاق شخص تھا۔ عین جوانی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ایک ہی سال میں تھوڑے سے فرق سے مجھے اس کی اور میرزا نظام الدین احمد کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ دل کے داغ ہرے ہو گئے اور قدیم دوستوں کا غم روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے ؎

دریغا درد را مرہم ندیدم
امید وصل بود آں ہم ندیدم

آہ "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" اب تو افسوس کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ افسوس بھی کیا کریں، ہم سب ایک ہی گنبد کے نیچے سرگرداں ہیں۔ یہاں نکل کر ہی ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملے گا۔

میں نے خواجہ ابراہیم کی تاریخ وفات کہی ہے:

بر موجب حکم پادشاہ کونین
در ماہ صفر خواجہ ابراہیم حسین
چوں کرد سفر ز عالم پر شر و شین
تاریخ شدش خواجہ ابراہیم حسین

وہ اسی قریبی زمانہ میں عراق سے آکر احدیوں میں شامل ہوا تھا۔ ابھی وہ اس عہدہ پر فائز نہیں ہوا تھا کہ اس نے شریف سرمدی چوکی نویس کے لیے جو احدیوں کا داروغہ تھا اور اس کی پلی ہوئی مونچھیں تھیں یہ رباعی کہی تھی:

ایں سادہ دل آخر احدی خواہد شد　　محتاج کلاہ نمدی خواہد شد
از غایت اضطرار روزی صد بار　　قربان بروت سرمدی خواہد شد

دانہی

دانہ بیشاپور کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں وہ کھیتی باڑی میں توکل و قناعت سے بسر کیا کرتا تھا۔ دل میں سیاحت کی سمائی اور ہندوستان کا رخ کیا۔

اس کے اکثر اشعار اسی دہقانی زبان میں ہیں لیکن فصیح زبان میں اس نے بہت سی غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس کا دہقانی کلام پڑھنے لکھنے میں دشوار تھا اس لیے وہ زبان زد نہ ہو سکا۔

ایک دن الفتی شاعر کے ہاتھ سے چوگان چھوٹ کر ناک پر پڑا، دانھی نے فی البدیہ کہا:

الفتی بسکہ شعر بد می گفت
نیک زو باطن تو ندانش
چرخ چوگانی از قضا بشکست
پشت مینی بجائے دندانش

دوائی یہ حکیم عین الملک کا تخلص ہے۔ ماں کی طرف سے علامہ جلال الدین دوانی کی اولاد میں سے ہے۔ بڑی خوبیوں کا مالک اور ممتاز شخصیت رکھتا تھا۔ آنکھ کے علاج میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔

نمونۂ کلام:

ترا بر غم نہ تنہا لہ بر من دل تنگ می بارد   ز تاثیر حوادث بر سر من سنگ می بارد
چناں تندرست یا اہل دل آں شوخ جفا پیشہ   کہ گاہ آشتی از غمزۂ او جنگ می بارد
نداۓ از در احسان او کفر است نومیدی   کہ ابر فیض او فرسنگ در فرسنگ می بارد

اسد ہر شب جگر دل نالہ ام با آہ و زاری ہا
سیہ روزے چو من یارب چہ سازد با چنیں شب ہا
ہیچ دیوانی نشد پیدا کہ تعمیرے نداشت
درد بے درمان عشق است اینکہ تدبیرے نداشت
در شب زلف سیاہش خواب مرگم در ربود
بو العجب خوابے پریشانی کہ تعبیرے نداشت
وہ چہ عاشق کش نگاہی بود دوال منزل کجاست
کاندرو پیدا نشد یک سینہ کو تیرے نداشت
ہر کس کہ قطرۂ ز می دوستی کشید
بیزار شد ز بادہ و جام و سبو شکست

خیز اے دل کہ یار در جنگ است   زندگی نزد عاشقاں تنگ است
عاشقاں را براہ سر بازی   ہر قدم صد ہزار فرسنگ است
وسعت آباد کارخانۂ عشق   بر سپاہ محبتم تنگ است
بس دراز است دست ہمت من   چکنم پائے بخت من لنگ است
اے دوائی حذر کہ در کوشش   فتنہ بیدار و عشق در رنگ است

روشن آں دیدہ کہ دیدن دانست — خرم آں دل کہ تپیدن دانست
کے کشد محنت در تنگ قفس — مرغ روحم کہ پریدن دانست
در کنارم نہ نشیند ہرگز — طفل اشکم کہ دویدن دانست
نتواں یافت دگر در خانہ — صید وحشی کہ رمیدن دانست
نکند میل دوائی بہ بہشت — چوں گل از باغ تو چیدن دانست

روز ہجراں کہ دم سوختن است — کار جاں شعلہ برافروختن است
در شب ہجر کہ جاں باید باخت — کار دل درد و غم اندوختن است
اے جدائی چہ بلائے کہ مدام — دوزخ از بیم تو در سوختن است
زاں دو جادو طلب عشوہ و ناز — مست را غمزہ آموختن است
اے دوائی طلب وصل بتاں — شعلہ و پنبہ بہم دوختن است

رفیعی اصل نام میر حیدر معمائی وطن کاشان۔ نہایت سمجھ دار، ذہین اور ہنرمند آدمی ہے۔ خاص طور سے فن معما اور تاریخ کہنے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ ان دو فنوں کے سوا وہ کسی اور فن کو اہمیت نہیں دیتا۔ ایک دن شیخ فیضی نے اس سے کہا کہ ہندوستان میں معما متروک ہوگیا ہے اور اب اسے عیب سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا "میں نے ولایت میں برسوں اس معماگوئی میں اپنی جان کھپائی ہے۔ اب جب کہ اس فن میں بوڑھا ہوگیا ہوں اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟"

خواجہ حبیب اللہ کے ساتھ گجرات سے لاہور آیا۔ شاہی سرکار اور دوسرے عہدہ داروں سے تھوڑی بہت رقم لے کر وطن کے لیے رخصت ہوا لیکن ہرمز پہنچنے پر کچھ دکمران کے قریب اس کا جہاز ٹوٹ گیا اور اس کی ساری پونجی دریا بُرد ہوگئی۔ اس کے سامان میں شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر کے چند جزو بھی تھے جو علماء کی توقیعات سے آراستہ تھے۔ یہ جزو اور فیضی کا دیوان جو اس نے ولایت میں شہرت کی خاطر روانہ کیا تھا، سب طوفان کی نذر ہوگیا۔

رفیعی کے اشعار کا نمونہ:

نازک دلم اے شوخ علاجم چہ تواں کرد
من عاشق معشوق مزاجم چہ تواں کرد
من بتابوت رفیعی اشکہا بردم کہ تو
ہمرہش گریاں ترا از اہل عزا می آمدی

رباعی:—
زاہد نکند گنہ کہ قہاری تو — ما غرق گناہیم کہ غفاری تو
او قہارت خواند و ما غفارت — یارب بکدام نام خوش داری تو

ایک رباعی اور ہے جس سے ۲۶ تاریخیں نکلتی ہیں۔

رہائی یہ شیخ زین الدین خوانی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہے۔
نمونۂ کلام:

کردی امیدوارم از لطف خویش یارا
بہ تافتی ز ہر سو روئے امید مارا

سفر کردم کہ شاید خاطرم از غم بیاساید چہ دانستم کہ صد کوہ غم در راہ پیش آید

رازہا زاں گل مرا چوں غنچہ از خون دل ست
راز دل گفتن بہر کس بے نہایت مشکل ست

زچشم من چو اشک اے نازنین می رواں مگذر زمانی مردمی کن ایں چنیں از مرداں مگذر

ز تاب قہر نشانے مرا میانۂ آتش
بناز گرم کنی است از کرانۂ آتش

بہ شکر آں دہن تنگ وابروے چو ہلال چناں شدم کہ نیاید مرا کسے بہ خیال

جفا ہمیں نہ ازاں شوخ بے وفا دیدم
ز ہر کہ چشم وفا داشتم جفا دیدم

تو اے رفیق ز درد دلم نہ آگاہ کہ می ازاں مہ نا مہرباں چہا دیدم

روغنی یہ ایک مسخرہ تھا۔ بے حیائی پیشہ تھا۔ اس کی بے شمار ہزلیات ہیں۔ برسوں بادشاہی ملازمت میں رہا۔
اس کے دیوان میں تقریباً تین ہزار شعر ہیں۔

نمونۂ کلام:

حیات جاوداں دارد شہید تیغ بیدادش
مگر در آبگیری آب حیواں دادہ استادش

اس شعر میں میر اشکی کے شعر کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اشکی کا شعر ہے:

مستانہ کشتگاں تو ہر سو فتادہ اند
تیغ ترا مگر کہ بجائے آب دادہ اند

روغنی کے اور اشعار یہ ہیں:

از جفائے او نمی نالم کہ می ترسم کہ رقیب
یابد از تاثیر فریادم کہ از بیداد کیست

بود چوں اخگری در دست وپائے اودل گرمم کہ بر عادت بیازی طفل واز دست افگند زودش

چناں وقار تو بر کوہ پائے حلم فشرد
کہ شد ز ہر رگ او چشمہائے آب رواں

زبانی گوئی قاصد شرح حالم را کہ در نامہ ز دست بیخودی حرف از قلم بسیار افتادہ

قاصد از آمدنش می کند آگاہ مرا
تا کشد جذبۂ شوقش بسر راہ مرا

اس نے ۹۸۰ھ میں جبکہ شاہی لشکر گجرات جارہا تھا، قلعہ آبو گڑھ کے قریب انتقال کیا اور اسی جگہ دفن ہوا۔ قاسم ارسلان نے اس کی تاریخ وفات کہی ہے:

"دادہ چو سگے بکافرستاں جاں"

زین خاں کوکہ ہندی ساز اور دف کے بجانے میں اور موسیقی کی تمام قسموں میں بے مثل ماہر اور یکتائے روزگار ہے۔ خوش خلقی کے سوا دوسری اور خوبیاں نہیں رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔ اس کا شعر ہے ؎

آرام من نمی دہد ایں چرخ کج خرام
تا رشتۂ مراد بسوزن در آورم

سلطان سپلکی سپلک قندھار کا ایک گاؤں ہے۔ ہندوستان کے لوگ اسے سپلکی کہتے تھے۔ سپلک ایک گھناؤنا جانور ہے۔ وہ بڑا تنگ ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ عجیب مصیبت ہے لوگ مجھے ایسے گندے جانور کے نام سے پکارتے ہیں۔

نہایت آزاد منش قلندر آدمی تھا۔ ایک دن ملا قاسم کاہی سے اس نے پوچھا آپ کی عمر کیا ہوگی؟ انھوں نے کہا "خدا سے دو سال چھوٹا ہوں" سلطان نے کہا "محترم ہم تو سمجھتے تھے آپ دو سال بڑے ہیں آپ اپنی عمر گھٹا کر بتا رہے ہیں"۔ مولانا قاسم ہنس پڑے اور کہا تم ہماری صحبت کے قابل ہو۔ واضح رہے ملا قاسم کاہی دوسروں کی باتیں نقل کرنے کے عادی تھے۔ یہ بات بھی شیخ بایزید بسطامی کی تھی جو اس موقع پر جڑ دی۔ شیخ نے کہا تھا "انا اقل من ربی سنتین" اور یہ بس ایک صوفیانہ ترنگ تھی۔ ان کے اس قول کی عارفوں نے یہ تاویل کی ہے کہ خدا سے دو سال کم ہونے کا مطلب دو صفتوں میں کم ہونا ہے کیونکہ بندہ اللہ کی تمام صفات کا مظہر بن سکتا ہے بجز وجوب اور قدرت کے۔ ظاہر ہے بندہ حدوث و عجز سے بچ نہیں سکتا۔ بہر حال خدا اس قسم کی صوفیانہ حشویات اور شطحیات سے بچائے رکھے۔

سلطان نہایت موزوں طبع آدمی تھا۔ خان زماں کا تخلص بھی سلطان تھا۔ جب سلطان نے اس کی شان میں ایک قصیدہ کہا اور پیش کیا تو خان زماں نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت بطور صلہ اس کے پاس بھجوایا اور اس سے درخواست کی کہ اپنا تخلص ہماری خاطر بدل لو۔ اس نے صلہ واپس کر دیا اور کہا میرا نام سلطان محمد باپ کا رکھا ہوا ہے،

اسے میں کیسے ترک کر سکتا ہوں۔ نیز میں تم سے کئی سال پہلے اس تخلص پر شعر کہتا رہا ہوں اور اسی تخلص سے مشہور بھی ہوں۔ خان زماں کو بڑا غصہ آیا اور اس نے کہا اگر تم یہ تخلص نہیں چھوڑو گے تو میں ہاتھی کے پیر سے بندھوا دونگا نہ صرف یہ بلکہ وہ اس غرض کے لیے ہاتھی کو لے آیا۔ سلطان نے کہا "میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ میں شہادت کا درجہ پاؤں"۔ خان زماں نے بہت ڈرایا دھمکایا۔ آخر مولٰنا علاؤالدین لاری خان زماں کے استاد نے کہا کہ جامی کی کوئی غزل محفل میں پڑھی جائے۔ اگر سلطان فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہہ دے تو پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے ورنہ تم جو چاہتے ہو اس سے سلوک کرو۔ چنانچہ جامی کی یہ غزل پیش کی گئی

دل خطت را رقم صنع الٰہی دانست
بر سر سادہ رخاں محبت شاہی دانست

سلطان محمد نے فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہی، جس کا مطلع ہے:

ہر کہ دل را صدف سر الٰہی دانست
قیمت گوہر خود را بکماہی دانست

اگرچہ یہ غزل اتنی زیادہ اچھی نہ تھی لیکن خان زماں سن کر پھڑک اٹھا۔ بڑی تعریف و توصیف کی اور دگنا صلہ دے کر رخصت کیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکا اور خان زماں سے اجازت لیے بغیر بدایوں چلا گیا۔ اس کے بعد جگہ جگہ کی سیر کرتا رہا۔ آخر دکن چلا گیا۔

جس سال دکن کے چاروں حکمرانوں نے متحد ہو کر بیجانگر پر چڑھائی کی تھی اور ایک سخت لڑائی کے بعد اسے فتح کر لیا تھا اور اس قدیم اور مشہور بت کدہ کو ڈھا دیا تھا۔ اسی سال سلطان دکن میں تھا اور اس لشکر کے ہمراہ جنگ میں شریک تھا چنانچہ اسے بڑا مال غنیمت بھی ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد پھر اس کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا، کیا ہوا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے بڑی بے مروتی کا ثبوت دیا تھا کہ خان زماں جیسے قدردان آدمی کی درخواست ٹھکرا دی اور بزرگوں کے منہ آنے کی کوشش کی۔

غزالی کا مطلع ہے ؎

زاہدا عرفاں بدلق و سبحہ و مسواک نیست
عشق پیدا کن کہ اینہا داخل ادراک نیست

اس مطلع کے جواب میں سلطان کا مطلع ہے:

گر بدل دارد رقیب از ما غباری باک نیست
روشن است ایں پیش ما کائینہ او پاک نیست

گاہ در چشمم نشیند گاہ در دل آں پری ہیچ جا تسکیں ندارد زانکہ جادو دیدہ است

چوں کنم تشبیہہ ابرویت بماہ نو کہ من
ہر سر موئے ابرویت ہلالی دیدہ ام

سلطان یہ خان زماں کا تخلص ہے۔ اس کے حالات ہم نے اس منتخب میں تفصیل سے بیان کیے ہیں بلکہ ہندوستان کی ساری تاریخوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے مزید تفصیل کی حاجت نہیں۔

اس کا شعر ہے ؎

باریک چو موئیت میانے کہ تو داری
گویا سر آں موست دہانے کہ تو داری

جب اس کی یہ غزل سامنے آئی تو اس کے صوبہ کے بہت سے شاعروں نے اس کے جواب میں غزلیں کہیں، جیسے:

گفتم کہ گمانیست دہانے کہ تو داری
گفتا کہ یقین است گمانے کہ تو داری

میں نے بھی غزل کہی تھی ؎

سرچشمۂ خضر است دہانے کہ تو داری
ماہی است دماں چشمہ زبانے کہ تو داری

اب تو ایسی شاعری سے جو اس دور جاہلیت میں رائج تھی اور اب وہ فضولیات میں سے معلوم ہوتی ہے، توبہ ہی بھلی۔

خان زماں کا نمونۂ کلام:

فغان و نالہ لسان جرس مکن اے دل
ز جور یار شکایت بکس مکن اے دل

صبا بحضرت جاناں زباں کہ تو دانی   نیازمندیٔ من عرض دہ چنانکہ تو دانی

دلبری دارم کہ رویش چو گل و مو سنبل است
سنبل پر چین او افتادہ بر برگ گل است

جانا نبود مثل تو جانانۂ دیگر   مانند من دل شدہ دیوانۂ دیگر
اے مغ بچہ از دست تو پیمانہ نوشیم   ما مست الستیم ز پیمانۂ دیگر

اس کا بھائی بہادر خاں بھی شعر کہتا تھا۔ ملا آصفی کی زمین میں اس نے اچھے شعر نکالے ہیں۔ ملا آصفی کا مطلع ہے:

بر ما شب غم کار بسی تنگ گرفتہ   کو صبح کہ آئینۂ ما زنگ گرفتہ

بہادر خاں نے کہا ہے:

آں شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ   گویا بمن خستہ رہ جنگ گرفتہ

بہ نشستہ مۂ من بسر مسند خوبی شاہی است کہ جا بر سر اورنگ گرفتہ
از نالۂ من بس نکند بے تو بہادر زمیساں کہ نئے غم زتو در چنگ گرفتہ

سیری قاضی اور فقیہہ ہونے کے باوجود خوش طبع شاعر تھا۔ علم عروض، قافیہ اور معما میں بے مثل مہارت رکھتا تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد حج کے لیے چلا گیا۔

رباعی:

سیری بحریم جان و دل منزل کن
قطع نظر از صورت آب و گل کن
جز معرفت خدائی ہیچ است ہمہ
بگذر ز ہمہ معرفتی حاصل کن

نہ بہر چشم درد آں نرگس بیمار می بندد در رحمت بروئے عاشقان زار می بندد

ناصح مگو بیائے بُتے ناسزا مرا
دیگر مکن عذاب برائے خدا مرا

سپہری خواجۂ مینا (جو خواجہ جہاں کے خطاب سے مشہور ہے) کے بھتیجے میرزا بیگ کا تخلص ہے۔ یہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ اشعار اس کی روشنئ طبع کا نمونہ ہیں:

از تبسم دفع زہر چشم خشم آلود کن
کہ نمک سازند شیریں چوں بود بادام تلخ

دل غریب بکوئے بلا گذاری کرد غریب کوئے تو شد دل غریب کاری کرد

چوں لالہ جام گیر سپہری بدور شاہ
اکنوں کہ گل شگفت و گلستاں معطر است

شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف خاک درش بمرتبۂ افلاک برتر است

سیافی یہ بیرم خاں کے ہاں ملازم تھا۔ بیرم خاں نے اس کے ذریعہ حضرت امام رضا کے آستانہ کے لیے سات ہزار روپیہ کی نقد بھجوائی تھی۔ اس نے یہ ساری رقم خرچ کر دی۔ جس کے مواخذہ میں شاہ طہماسپ نے اسے قید کر دیا۔ ۹۷۰ھ میں وہ اس مصیبت سے چھوٹ سکا۔

نمونۂ کلام:

ز خسارۂ زردم چو در آئینہ عیاں شد
آئینہ ز عکس رخ من برگ خزاں شد

سینۂ تنگم کہ جا دارد غم جاناں درد جائے آں دارد کہ از شادی نگنجد جاں درد

فہمی اس کا باپ تیر ساز تھا۔ اس پیشہ کی مناسبت سے اس نے یہ تخلص رکھا تھا۔ مرزا عزیز کوکہ کی خدمت میں تربیت پائی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی مشق بہت اچھی تھی اور جلد ہی مشہور ہو گیا تھا۔

امیدی رازی کے اس قصیدہ کے جواب میں

اے تو سلطان ملک زیبائی
ما گدا پیشگاں تماشائی

اس نے اپنا قصیدہ دربار میں پیش کیا۔ جب وہ اس مصرع پر پہنچا:

سُنّئ پاکم و بخارائی

تو لشکر خاں میر بخش نے جو خراسانی اور کٹر رافضی تھا لیکن اپنا رفض چھپائے رہتا تھا، اس سے پوچھا "ملا کیا سُنّی ناپاک بھی ہوتا ہے؟" میرزا عزیز کوکا نے ترکی بہ ترکی کہا "ہاں، جیسے تم!"

قاسم ارسلان نے فہمی کے بارے میں کہا ہے ؎

فہمی و طریقی و فریدوں دزدند
چوں گربہ و چوں شغال و میموں دزدند
زنہار بر ایشاں سخن خویش بخواں
کاینہا دو سہ تا شاعر مضموں دزدند

فہمی نے امیدی کے قصیدہ کے جواب میں کہا ہے:

ز دل خیال خالت پیوستہ داشت منزل	پیشت نہ کرد اظہار ایں داغ ماند بر دل
در مزرع محبت تخم امید کشتیم	جز کشت ناامیدی چیزے نگشت حاصل
ز آئینہ چو دیدی رخسار خوں فشاں را	آئینہ آب گردید از شرم در مقابل
ہلال نیست کہ بر اوج چرخ جا کردہ	ز بہر کشتن من تیغ در ہوا کردہ
ہلال عید نسبت داشتی با طاق ابرویش	اگر بودی ہلالی دیگری پیوستہ پہلویش
دہاں او سر موئے بود از نازکی بنگر	کہ چوں تیغ زبانش می شگافد در سخن مورا
پیش من از بہر آزار دل ریش آمدی	من چہ بد کردم کہ با من ایں چنیں پیش آمدی

سقا شیخ جامی کے مریدوں میں یہ ایک فانی مشرب درویش تھے۔ جذب و حال طاری رہتا تھا۔ آگرہ کے گلی کوچوں میں چند شاگردوں کو ساتھ لیے لوگوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ ان کے اشعار بھی پانی کی طرح رواں دواں تھے۔

ان کے ایک پیرزادہ ہندوستان آئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے پیرزادہ کی نذر کر دیا اور خود سراندیپ کی طرف چلے گئے۔ سیلون کے راستہ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں، اس کفرستان میں ایک شخص نے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے خواب میں اشارہ کیا تھا غیب سے ظاہر ہوا اور سقا کی تجہیز و تکفین کی۔

انھوں نے اپنے کلام کے چند دیوان مرتب کر لیے تھے، لیکن جب بھی ان پر جذب طاری ہوتا تھا اپنے دیوان کو دھو ڈالتے تھے۔ جو کلام بچ رہا وہ بھی اچھا خاصا دیوان ہے۔

نمونۂ کلام:

بخیال عارضش در ہر نظر حیرانئ دارم
بدور نقطہ چوں پرکار سرگردانئ دارم
من دیوانہ از خوباں ازاں قطع نظر کردم
کہ در کاشانۂ دل چوں تو یار جانئ دارم

اساس پارسائی را شکستم تا چہ پیش آید — سر بازار رسوائی نشستم تا چہ پیش آید

دل دیوانہ را سرگشتۂ روئے تو می بینم
ہر سو بستۂ زنجیر گیسوئے تو می بینم

از گریہ شدم غرق بخونے جگر امروز — اے دل مدہ از نالہ مرا درد سر امروز

عشق آں گل پیرہن یازم بگریباں می کشد
وہ کہ چاک جیبم آخر تا بداماں می کشد

سپاہی

خواجہ کلاں بیگ کا پوتا ہے۔ یہ رباعی اسی کی ہے:

افسوس کہ وقت گل بزودی بگذشت
فریاد کہ تا چشم کشودی بگذشت
بے چشم و خطت بنفشہ و نرگس را
ایام بکوری و کبودی بگذشت

۹۷۸ھ میں شہر آگرہ میں انتقال ہوا۔

سرمدی اصفہانی

کچھ عرصہ تک شاہی چوکی نویس رہا، اب شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں متعین ہے۔ پہلے فیضی تخلص رکھا تھا جب بادشاہ کی مجلس میں شیخ فیضی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا اس نے اپنا تخلص سرمدی رکھ لیا۔ موزوں طبع آدمی ہے۔

نمونۂ کلام:

تا تیغ ناز آں بت مغرور شد بلند — عد گردن نظارگی از دور شد بلند

مئ در سرو گل در بغل آئی چو در کاشانہ ام
ہر تماشا بشگفد خاشاک محنت خانہ ام

تا بر سر کونین نہادیم قدم را
دستی نبود بر دل ما شادی و غم را

ساقی جزائری یہ عرب ہے۔ اس کا باپ شیخ ابراہیم بڑا فاضل فقیہہ تھا۔ شیعہ اس کو اپنے مسلک کا مجتہد سمجھتے تھے مشہد کا رہنے والا تھا۔ ساقی بھی مشہد میں پیدا ہوا۔ کچھ علم حاصل کرنے کے بعد دکن پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ اب بنگالہ میں رہتا ہے۔ نہایت خوش طبع شیریں کلام شاعر ہے۔

نمونۂ کلام:

ز جانم گاہ گریہ گاہ دردِ آلود می خیزد
بلی چوں آب بر آتش فشانی دود می خیزد

آزردہ دلم از ستم یار نگردد — تا باعث خوش حالیٔ اغیار نگردد

چو تیر بگذرد از من ز دیدہ آب بر آید
ز دیدہ آب ز تیزیٔ آفتاب بر آید
تپد دلم کہ مبادا بخوابش آمدہ باشی
بہ پیش من چو کسی مضطرب ز خواب در آید

بر نفس دل ز ہوائے مژہ خونبار کند — تا مرا باز بدست تو گرفتار کند
زاں نگہ یافت کہ جاں گشت شکارش آری — شست ما تیر ہدف خوردہ خبردار کند
دل ہماں گرم محبت تو ہماں مستغنی — ساقی ایں درد بگو پیش کہ اظہار کند

سیدی اس کا اصل نام سید شاہی ہے، جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ یہ گرمسیر کے سیدوں میں سے ہے جو کابل میں متوطن ہو گئے تھے۔

سیدی خوش کلام شاعر ہے، تصوف سے بھی بہرہ مند ہے اور شیخ اسلام چشتی کا مرید ہے۔ کچھ عرصہ تک بادشاہی ملازمت میں رہا، مختلف امراء کے ساتھ بسر کرتا رہا۔ اب کابل میں قلیج محمد خاں کے پاس ہے۔

نمونۂ کلام:

اول سرگرمیٔ عشقست و دل در اضطراب
ہمچو طفلی کہ تپد ہنگام بیداری ز خواب

گل حمائل کرد تا سرو سہی بالائی من — من ز گل در رشک و گل در غیرت از پیراہنش

نیافت از دل گم گشتہ ام نشاں کہ چہ شد
نسیم اگرچہ دو زلف تو تار تار کشاد

در خانہ از ادب نتوانم قدم نہاد — کز پرتو رخ تو ہمہ خانہ پر شدہ است

از لطف و عتاب تو زما راز نخیزد
از کشتۂ تسلیم تو آواز نخیزد

گرچہ کس را بہ عہد شاہ جہاں | جز دم آب و کہنہ دلق نماند
لیک صد شکر کز نہایت فقر | حسدی درمیانِ خلق نماند

قصیدۂ بتوائی صاحب عطا گفتم | کہ ہست نسخۂ فضل و کمال را فہرست
بایں عطا کہ نمودی تو در برابر آں | ز دولت تو مرا رشتۂ امید گسست
نہ در برابر شعر من ایں عطائی تو بود | عطائی خویش نگہدار و شعر من بفرست

استغفر اللہ از دل بے چاشنیٔ درد
پیکاں بر سینہ بہ نہ دل مردہ در بغل

شاہ ابوالمعالی اس کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ یہ بھی نہایت خوش طبع شاعر تھا شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتا تھا۔ نمونۂ کلام:

جان من ہم صحبت اغیار بودن نیک نیست | جز من بیکس بہر یک یار بودن نیک نیست
خوش بود آزردن عاشق گہی کہ لطف نیز | دائما برسند آزار بودن نیک نیست
بر امید وصل خوش می باش در کنج فراق | نا امید از دولت بیدار بودن نیک نیست

جدا از وصل تو اے دلبر یگانہ شدم
اسیر بند فراقت بہر بہانہ شدم
ز بس فسانۂ عشق تو خواندہ ام ہر جا
میاں مردم عالم بدیں فسانہ شدم

ہزار گونہ غم حاصل است در دل از دو | اگر مرا نکشد غم و گرچہ حاصل از دو

شیری پنجاب کے ایک گاؤں کوکو والا کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ ایک بہت بڑے اور مشہور قبیلہ ماچیان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی ماں کے متعلق کہتا تھا کہ سیدزادی ہے۔
شیری ناخواندہ ہے لیکن فطرت عالی اور طبع رسا پائی ہے۔ وضع کا پابند ہے۔ اس کے باپ مولانا یحیٰی کی تربیت سے بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں۔ اس کے والد کا مطلع ہے:

ہست از باران لطفت اے کریم کارساز
در دل دانا ہر یک قطرہ صد دریائے راز

شیری کو شعر کہنے پر پوری قدرت حاصل تھی، چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایک رات میں تیس غزلیں کہی ہیں۔

ایک دن وہ محفل میں اپنے دیوان کا ایک قطعہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں یہ مصرع بھی تھا۔ ع
"چار دفتر شعر در آب چناب انداختم"
مولٰنا الہداد امروہی مرحوم نے برجستہ کہا۔ "اگر تم اس بیڑے کو بھی ڈال دیتے تو کیا ہرج ہوتا۔"
شیریں نہایت خوددار، دردمند اور فقیر منش آدمی تھا۔ اس بات کی طرف اس نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

صاحب خوان فقیرم و ہرگز
ہمت من نخواہد از جاناں
قرض ہندو بشرط دہ پنجاہ
بہ کہ انعام ایں مسلماناں

خاص طور سے "شکوہ شکایات" کا مضمون اس سے بہتر کسی ہم عصر نے نہیں باندھا۔

گذشتگاں ہمہ عشرت کنید کاسودید
ازاں کہ عیش بر افتاد از میانۂ ما
ایا کساں کہ پس از ما رسید فاتحۂ
بشکر آنکہ بنو دید در زمانۂ ما

بلاشبہ قصیدہ اور قطعہ گوئی میں وہ اپنے تمام ساتھیوں پر سبقت لے گیا ہے، دوسروں کی فصاحت اس کے سامنے ماند پڑ گئی اور اس کے کلام نے سب کے لبوں پر مہر لگا دی۔ جیسا کہ خود اس نے اس قطعہ میں کہا ہے:

اگر از شعر شیریم پرسی — گویم از درمیانہ انصاف است
نہ ہمہ شعر شاعری سرہ است — نہ ہمہ بادہ کساں صاف است
شیری اردال را مکن مدحی — کہ مناسب بحال اشراف است
غزل و مثنویش جملہ سقط — ویں سخن نے ستیزہ نے لاف است

نمونۂ کلام:

چناں فریفتہ شد دل جمال سلمیٰ را — کہ باد لست بلد گشتگی تسلّیٰ را
دراں دلی کہ توئی یاد دیگری کردن — دروں کعبۂ پرستیدن ست عزیٰ را
ہجوم ناز چناں گرد و پیش یار گرفت — کہ راہ نیست دراں تنگہا تمنیٰ را

کارواں گو تیز تر میراں کہ از درد فراق
مصر فریاد زلیخا بر نتابد بیش ازیں

بستم بنامہ تار سفید واشارتی است — کز دوری تو در رگ جاں خوں نماندہ است
بے رخت دریائے درد و غم وجود ما بود — استخواں پہلوئے ما موج آں دریا بود

یکفت تیغ ستم از بہر قتلم تیز می آید زبیداد آنچہ میگویند ازاں خونریز می آید
زلبس امیدواری قاصدے پیدا ز دا ز شیریں سوئے فرہاد مسکیں گر ہمہ پرویز می آید

چرا اے اشک در چشم از وداع یار میگردی کجا بودی کہ اکنوں مانع دیدار میگردی
سراپا جان اے باد صبا در قالب شوقم بسرت گردم مگر در کوئے او بسیار میگردی

اس کے قصیدے کے "جواب و سوال" کے چند شعر ہیں:۔

گفتم اے دل زچہ اوضاع جہاں گشت بدل گفت خاموش کہ در مغز خلل رفتہ خلل
گفتم از چاہ اُمید آب تمنا نرسد گفت کوتہ بود از وے رسن طول امل
گفتم آسائش او ہست بگوئید کجاست گفت در خواب نمایند پس از خواب اجل
گفتم زیا نفسے شاد تواں برد بسر گفت تولیست کہ ہرگز نہ درآید بہ عمل
گفتمش اہل یار چرا ابروئے پرچیں دارد گفت با صاحب بدخو نتواں کرد جدل
گفتم آئینہ دانش ہمہ جا زنگ گرفت گفت کو مصقلہ جود کہ گیرد صیقل
گفتم اہل سخن آرائش مجلس باشند گفت انہا نتواں گفت بارباب دول
گفتم افسوس ازیں مردم دور از معنی گفت فریاد ازیں قوم جفا جوئے دغل
گفتم از بخت بہ تفصیل شکایت دارم گفت باید بہ شہنشاہ بگوئے مجمل
گفتمش اکبر جم قدر سلیماں دانش گفت خاقان بلند اختر خورشید محل
گفتم آں ذات نبی را بہ تعظم ثانی گفت آں خلق خدا را بہ تفضل اول
گفتم اصل و نسبش لازم تاج است وسریر گفت لطف و کرمش حامی ملکست و ملل

یہ دو شعر بھی اسی قصیدہ کے ہیں جس میں ہاتھی کا ذکر ہے

اے خوش آں شب ہا کہ ہر دم در دعائے فیل او سورۂ واللیل خوانم بر لب آب سیاہ
فیل رفتاراں آہو چشم کوکو وال را می کنم ہر لحظہ یاد و می کشم از سینہ آہ

یہ مطلع اس کے ایک قصیدہ کا ہے جس میں چھ باتوں کا لزوم رکھا ہے:

اے جہاں در قبضۂ حکمت بضرب تیغ و تیر تاجدار تخت و بخت از فیل واسپ آفاق گیر
تاج و تخت و تیغ و تیرت مہر و مہ برق و شہاب در شمار فیل و اسپت گشتہ عاجز صد دبیر

اس کا دیوان بہت مشہور ہے۔ جس زمانہ میں وہ مہابھارت کے ترجمہ کے لیے مامور کیا گیا تھا تو کہا کرتا تھا کہ یہ فرسودہ داستانیں کسی بخار میں مبتلا مریض کے خواب ہیں۔

ملا شیری نے ۹۹۴ھ میں کوہستان یوسف زئی میں وفات پائی +

شکیبی اصفہانی وہ حال ہی میں ہندوستان آیا ہے۔ بیرم خاں کے لڑکے خان خاناں کے ساتھ رہتا ہے۔ سلیقۂ شعر سے بہرہ مند ہے۔

ہنوز نالۂ شب ہائے من اثر دارد　　کمان شکستۂ من تیر کارگر دارد
دلم بہ ہجر در آویخت رحمتی اے بخت　　کہ دست عربدہ باکوہ در کمر دارد
تو گل بدامن یاراں فشاں کہ خستۂ ہجر　　بنوک ہر مژہ صد پارۂ جگر دارد

اے خدا جنس مرا از عیب بازاری بدہ
می فروشم دل بدیداری خریداری بدہ

در دست متاعم نہ طرب نرخ چہ پرسی　　نائم کہ تو نستانی و من ہم نفروشم

لذت درد محبت کے فراموشم شود
آں نمک را من بمغز استخواں افتادہ ام

شجاعی یہ سیف الملک حکیم کا تخلص ہے۔ وہ میر سید محمد جامہ باف (جن کا تخلص فکری تھا لیکن "میر رباعی" کے نام سے مشہور تھے) کا علاج کر رہا تھا۔ میر نے اس کے بارے میں کہا تھا:

سیف قاطع بندگاں مولوی سیف الملوک　　آنکہ طرح تو بحکمت در عمل آوردہ بود
دی اجل میگفت بر بر آں جان مریض　　ہر کجا رفتیم پیش از ما علاجے کردہ بود

شجاعی نے میر سید محمد کی نفس پرستی اور بد پرہیزی پر اس طرح چوٹ کی ہے:

رباعی مستزاد

اے میر دو من عصیدہ چوں می گنجد ——— در معدۂ سست
در می گنجد زبدہ چوں می گنجد ——— زاو خال نخست
لوحی کہ درو رباعیٔ جا نکند ——— با خط غبار
خود گو کہ درو قصیدہ چوں می گنجد ——— با ثلث درست

یہ اشعار مولانا شجاعی کے کلام کا نمونہ ہیں

ز سودائی بتاں داری سرے با موئے ژولیدہ
سرت گردم کہ با عاشق سرے داری و سودائی

تا زلف افتادہ بر رخسار جانان من است
یا گمر بر روئے آتش رشتۂ جان من است

جائے ما زیر زمیں بہ کہ برائی نفس شوم
منت روئے زمیں از اہل عالم می کوشم

شعوری تربتی

یہ ایک طالب علم ہے۔ اس کی مشق سخن کا نمونہ یہ شعر ہیں:

اے کہ ز بیم ہجر او در سکرات مردنی — مژدہ کہ آں مسیح دم میرسد و رسیدہ است
مرا ز خانہ برون ہر دم آرزوے تو آرد — گرفتہ شوق گریبان من بسوئے تو آرد
ہزار گونہ جفا می کند رقیب معظم — ولے شعوریؔ مسکیں جہاں بروئے تو آرد
عشق در آمد رگ جانش گرفت — حیرت دیدار زبانش گرفت
زلف کجش بر رخ مہوش فتاد — لعل بپائے تو در آتش نہاد
عہد بود تخم وفا کاشتن — چیست وفا عہد نگہداشتن
غبغب آں دلبر ابرو ہلال — عکس ہلالی ست در آب زلال
نے کہ چو خورشید گرفت ارتفاع — ماہ عیاں گشت ز تحت الشعاع

ملا صادق حلوائی سمرقندی

نہایت بلند مرتبہ عالم تھا۔ نہایت خوش کلام اور صاحب فضل۔ اس کا مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ اس کا ذکر شاعروں کی ذیل میں کیا جائے۔ لیکن افسوس ہم پر اور اس پر بھی کہ ایسا کرنا پڑا۔

سنتے ہیں وہ بڑی کوششوں سے ہندوستان آیا، پھر یہاں سے زیارت بیت اللہ کے لیے گیا۔ وہاں سے ۹۷۸ھ میں لوٹ کر آیا اور اپنے وطن چلا گیا۔ مرزا محمد حکیم نے اس سے کابل ٹھہرنے کی فرمائش کی تھی اور اس سے درس لینے لگا تھا۔

ان دنوں وہ ماوراء النہر میں درس و تدریس میں مصروف ہے۔ شعر کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، اس کا ذوق نہایت بلند ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔

نمونۂ کلام:

دل گم شدہ نمی دہدم کس نشان ازو
در خندہ است لعل تو دارم گمان ازو

جز درت جائے دل آوارہ را منزل نہ شد — از درت گفتم شوم آوارہ اما دل نہ شد

ہم چو خورشید از سفر اے ماہ سیما آمدی
خوب رفتی جان من بسیار زیبا آمدی

چہرہ گلی گل شمع ہر محفل نمی خواہم ترا — ہر طرف چوں شاخ گل مائل نمی خواہم ترا

ضمیر دوست چو آئینہ در مقابل ماست
درو معائنہ پیداست آنچہ در دل ماست

در عشقی کہ تو نہاں در دل و جاں داشتم
شد عیاں از چہرہ ام ہر چند پنہاں داشتم

سہی سروی کہ پروردم در دل چشم خونبارش   بچشم خویش می بینم کنوں با ہر خس و خارش

بیا اے اشک ازیں رفتن ز چشم تر می خواہی
مرا رسوائی عالم ساختی دیگر چہ می خواہی

صبوحی چغتائی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ نہایت بے قید لاابالی شخص تھا۔ شعر خوب کہہ لیتا تھا۔

دلم کہ مہر تو دارد ہمیں تو میدانی
بگفتہ ام بکس ایں راز را خدا داناست

بے حجابانہ درا از در کاشانۂ ما   کہ کسے نیست بجز درد تو در خانۂ ما

عاشق نشدی محنت ہجراں نکشیدی   کس پیش تو غمنامۂ ہجراں چہ کشاید

ہیچ جائے نہ نشستی کہ رقیبت نہ نشست   جز دل من کہ تو جا کردی و او بیروں ماند

من امشب از جفائے ہجر جان بردم   خیالت درمیاں جاں در آمد ورنہ می مردم

فغاں کز چشم آں نامہرباں زاں گونہ فتادم
کہ ہرگز چشم او بر من نیفتادہ است پنداری

خیالت در نظر آوردہ میگویم وصال است ایں   وصالت را تمنا می کنم لیکن خیال است ایں

ضعف غالب شد و از نالہ فرو ماندہ دلم
دگر از حال من او را کہ خبر خواہد کرد

حالت خویش چہ حاجت کہ بر و شرح دہم
گر مرا سوز دلی ہست اثر خواہد کرد

در از افتادن مژگاں بلا انگیز می باشد   بیاض دیدہ چوں گلگوں شود خونریز می باشد

اس نے آگرہ میں ۹۷۳ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات "صبوحی میخوار" سے نکلتی ہے +

صالحی ہرات کا رہنے والا ہے۔ شعر و انشا میں بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ علم سے بھی بے بہرہ نہیں۔ اچھا خوش نویس ہے، عرصہ تک منشیوں میں کام کرتا رہا، پھر اپنے وطن چلا گیا۔

نمونۂ کلام: شب فراق تو در خانہائے دیدہ مرا
نہ بستہ خون جگر آں چناں کہ خواب در آید

امیر خسروؒ کا شعر ہے ؎

بگرد دیدۂ خود خار بستی از مژہ کردم   کہ نے خیال تو بیروں رود نہ خواب درآید

اس کے اور شعر یہ ہیں:

بدو چشم خوں فشانم ز غمت شب جدائی — چہ کنم کہ ہست اینہا گل اوز آشنائی

سر و برگ گل ندارم چہ روم بگشت گلشن — کہ شنیدہ ام ز گلہا ہمہ بوئے آشنائی

چو سگاں بہ آستاں تو ازاں گرفتہ ام جا — کہ رقیب در نیاید بہ بہانۂ گدائی

تا سرم گشت ازاں خنجر بیداد جدا
سر جدا غرقہ بخوں شد دل ناشاد جدا
عاشقی مایۂ درد ست چہ ہجراں چہ وصال
خسرو از عشق جدا نالہ و فریاد جدا

صادقی قندھار میں پیدا ہوا، اصل تعلق ہرات سے ہے۔ کچھ عرصہ تک ہندوستان میں رہا، پھر چلا گیا۔

مرا از بسکہ از تیغ تو در تن چاک می افتد
بہر پہلو کہ می رقتم دلم بر خاک می افتد

دل مجروح را پروائی تن نیست — شہید عشق محتاج کفن نیست

مرا چوں تنگ روزی آفریدند — چرا ہیچم نصیبی زاں دہن نیست

خیالی از تنم باقی است واں ہم — چہ نیکو بنگری جز پیرہن نیست

روزیکہ قسمت ہمہ کس از قضا رسید
شادی نصیب غیر شد و غم بما رسید
اے دل مگو کہ میرسد آں مہ بنالہ ام
چندیں ہزار نالہ کہ کردم کجا رسید

رباعی:

اے قصر جفا یافتہ بنیاد از تو — وے رفتہ بنائے عمر برباد از تو

تو گنج ملاحتی و لیکن ہرگز — ویرانۂ ما نگشت آباد از تو

صرفی یہ شیخ یعقوب کشمیری کا تخلص ہے۔ اس کا ہم کچھ ذکر کر آئے ہیں۔ شیخ بہت سی خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ تھا۔ اس نے تصوف اور دوسرے علوم و فنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی طبیعت بڑی شاعرانہ تھی۔

بر رخ فگند چاشت گہ آں مہ نقاب را
پیش از زوال شام رسید آفتاب را

از تو تیا مپرس وزاں خاک در بپرس — خاصیتش ز مردم صاحب نظر بپرس

آخری عمر میں اس نے تفسیر کبیر کی طرح ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تھا، کچھ لکھ بھی لیا تھا لیکن اپنے وطن میں انتقال کر گیا۔

صرفی ساوجی کچھ عرصہ گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پھر لاہور چلا آیا۔ درویشانہ وضع میں رہتا تھا۔ جس زمانہ میں شیخ فیضی دکن میں مامور ہو کر گیا تھا یہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دکن ہی میں فوت ہو گیا۔ اپنی یادگار ایک دیوان چھوڑ گیا۔ قصیدہ و غزل میں خاص رنگ اور طرز کا مالک تھا۔

ز راہ کعبہ ممنوعم و گرنہ میغر ستادم
کف پائے بزحمت چینیٔ خارِ مغیلانش

گل فروشی من کہ خواہد گل ببازار آورد   باید اول تاب غوغائے خریدار آورد

گرم خواہی بسوزی آتش رخسار روشن کن
کہ از خاکستر من تا قیامت نور برخیزد

صبوری ہمدانی خان زماں کے قتل کے دن یہ قید ہوا تھا۔ قتل ہونے سے تو بچ گیا مگر موت سے جان نہ بچا سکا۔ اس کے اشعار اوسط درجہ کے ہیں۔

سپردم جان من بے صبر و دل از داغ ہجرانش   چہ در دست ایں کہ غیر از جاں سپردن نیست درمانش
چو سوز آشکارا پیش او ظاہر نمی گردد   جہاں آگاہ سازم از جراحتہائے پنہانش
چو در شبگوں لباس آں مہر بسیر شب بروں آید   فروغ صبح ظاہر گردد از چاک گریبانش

کاش از خنجر من سینۂ او چاک شود
تا بہ بیند دل پاکم دل او پاک شود

صالح دیوانہ تھا تو دیوانہ لیکن دربار سے عاقل کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ جب تک خضر علیہ السلام کے نام پر کھانے کے پانچ چھ تھال کسی دریا یا چشمہ پر نہیں بھجوا دیتا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ یہ کام قاسم ہندی کے سپرد تھا جو ایک مہاوت کا لڑکا ہے۔ یہ بھی شاعر ہے لیکن نہایت کمینہ آدمی ہے۔ قاسم ہندی یہ تھال اٹھوا کر باہر لاتا اور شہدوں قلندروں سے کہتا کھاؤ اور مزے اڑاؤ۔ صالح دیوانہ اس سے پوچھتا تھا "تم نے خواجہ خضر کو بھی کھانے پر دیکھا؟" وہ بے حیا جواب دیتا "ہاں ہاں حضرت خواجہ نے تو بڑے شوق سے کھانا تناول کیا"۔ اسی طرح اور بھی جھوٹی سچی باتیں لگا دیتا۔ دیوانہ کو ان باتوں کا یقین آجاتا۔

بہر حال دیوانہ موزوں طبع آدمی تھا۔ بس وہی مثل تھی کہ ؎

شعر رنگا رنگ از طبع کج حیدر کلج
ہمچناں سر میزند کز تودۂ انبار گل

دیوانہ کا شعر ہے ؎

چو سودائی سر زلفش بپا افگندہ زنجیرم
دریں سودا بغیر از جاں سپردن نیست تدبیرم

کچھ عرصہ تک تو وہ بارگاہ شاہی میں مقرب و معزز رہا پھر معتوب ہو کر کابل چلا گیا۔ دوبارہ ہندوستان آیا۔ حضرت سلطان المشائخ کا متولی بنایا گیا، لیکن اس نے اس منصب کو قبول نہ کیا اور اجازت لے کر کابل لوٹ گیا۔

طارمی نام ملا علی محدث ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ملا صادق کا بھائی ہے۔ اس نے عرب میں حدیث کا علم حاصل کیا تھا۔ نہایت متقی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ ہندوستان دو مرتبہ آیا تھا۔ ۹۸۱ھ میں وفات پائی۔ ملا عالم کابلی نے تاریخ وفات کہی:

دریغا کہ ناگاہ ملا علی را ربود از میان دستبرد حوادث
پے سال تاریخ او سال دیگر بگو "مردہ ملا علی محدث"[1]

شعر کہنے کا سلیقہ تھا کبھی کبھی اس کی شوخ طبعی اشعار کا جامہ پہن لیتی تھی۔

تن خاکی چناں افسردہ شد از داغ ہجرانم
رود بیروں چو گرد از جامہ گر دامن برافشانم

درون روضۂ جاں قامتت نہال من است نہال قد تو نازک تر از خیال من است

مردم چشم اذاں جا درمیان آب کرد
تا کہ نتواند دمی با خود خیال خواب کرد

درمیان مردماں چوں نیست ما را اعتبار ہمچو اشک خویش میخواہیم از مردم کنار

تا دل اندر قید زلف مہوشاں انداختم
از برائے خویشتن دام بلائے ساختم

طریقی ساوجی بڈھا کھوسٹ اور مسخرہ تھا۔ اپنی بے حیائی کی وجہ سے دربار میں سب شاعروں کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ آخر حج کی توفیق ہوئی، گیا اور وہیں پیوند خاک ہوا۔

عشق بازی را بغیر از جاں سپردن پیشہ چیست
من کہ از مردن نیندیشم دگر اندیشہ چیست

کسے را جاں ز دست محنت ہجراں نمی ماند اگر ایں است ہجراں ہیچ کس را جاں نمی ماند

دریں دیار بخون خوارۂ کہ دل بستم
بدام زلف پری چہرۂ کہ افتادم

من سگ آنم کہ پا در دامن ہمت کشد نے کہ کس منت نہد نے از کسے منت کشد

دیدیم برفتن قد آں سرو رواں را ہر چند ندیدہ است کسے رفتن جاں را

---

[1] تاریخ وفات کے ان لفظوں سے ۹۸۱ھ کے عدد نکلتے ہیں۔

گفتی کہ زار میکشمت گرد من مگرد
گرد تو گردم از سخن خویشتن مگرد

دو عارضت بخیالم چو وقت خواب درآید بخواب من ہمہ شب ماہ و آفتاب درآید
بیاد آمدنت با وجود آنکہ نیائی ز جاں قرار رود در دل اضطراب درآید

درد عشق افزود و ہمدردی دریں عالم نماند
درد مند بود مجنوں در جہاں او ہم نماند

کردہ ام از شاہد دنیا بکلی انقطاع تا نباشد با کسم از بہر دنیائے نزاع

نمی تواں نفسی بے تو در جہاں بودن
چرا کہ جانی و بے جاں نمی تواں بودن

کسے نگفت و نپرسید کیں چہ مرحلہ بود کہ خضر آتشش والپسین قافلہ بود

شہر دلم سپاہ غمت راسخر است
ایں داغہائے تازہ سیاہی لشکر است

طالب اصفہانی آٹھ سال سے کشمیر میں مقیم ہے۔ پہلے ایک قلندر آدمی تھا، آخر ملازمت کر لی اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اکبر نے اسے کشمیر سے چھوٹا تبت کے حاکم علی رائے کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا، وہاں سے لوٹ کر آیا تو وہاں کے حیرت انگیز حالات اور نوادرات کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور شیخ ابوالفضل کو دیا۔ اس نے اس رسالہ کو اکبر نامہ میں شامل کر لیا۔ نہایت درد مند غم گسار آدمی ہے۔ شعر و انشا میں بڑا اچھا ملکہ رکھتا ہے۔ رباعی:

زہر دم بفراق خود چشانی کہ چہ شد
خوں ریزی و آستیں فشانی کہ چہ شد
اے غافل از انکہ تیغ ہجر تو چہ کرد
خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد

غمنامۂ من نخوانی و کہنہ شود مہجوریٔ من ندانی و کہنہ شود
دیر آمدنت مباد کیں زخم فراق ترسم کہ تو دیر آئی و کہنہ شود

یک روز من خستہ رہ منزل دل
از آبلہ پائے طلب ساختہ گل
جاں صرف رہی کنم کہ از دہر نیاز
جاں بر سر جاں باشد و دل بر سر دل

بعیش کوش کہ این یکہ عمر حجلہ نشین
چو گل برفتن از غنچہ مادر افگندہ
چو برگ گل کہ آباد بہار می افتد
رویم از غم دل خاک بر سر افگندہ

شادم از اہل جہاں کہ صحبت شاں بجہانی نہ ہم گوشہ تنہائی را

طالعی یزدی

خوش خط نستعلیق نویس ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ آگرہ میں جلد سازی کا کام کرتا تھا۔

ساقیاں چند تواں خورد غم عالم را
بادۂ پیش آر کہ بیرون کنم از دل غم را

ہردم کند آزار دل کہ خویش بیزارش کند دل کے شود بیزار از وہر چند آزارش کند

بغیر خود ترا اے نازمیں ہمدم نمی خواہم
ترا می خواہم و غیر تو در عالم نمی خواہم

گر بعد درد دل از من سخنے گوش کند بشنود قول غرض گوی و فراموش کند

شود بے خود اگر گویم ز حال خود سخن با او
چہ حالست اینکہ نتواں گفت حال خویشتن با او

رباعی

پیش آر قناعتی گر از اہل ہشی
باشد کہ سگ نفس دنی را بکشی
زنہار کہ آب و آتش کم کاسہ مخور
کو وا گوید بصد نجابت و ترشی

زاہد بصلاح و زہد خود می نازد عاشق بر دوست نقد جاں می بازد

دارند امید نظر ایں ہر دو ز دوست تا دوست بسوئے کہ نظر اندازد

طفلی

ملا درویش فتحپوری کا لڑکا ہے۔ اس کا چچا ملا صالح اب خانقاہ فتح پور میں مدرس ہے۔ طفلی تیرہ سال کی عمر میں ہی "شرح شمسیہ" پڑھنے لگا تھا۔ نہایت فیاض طبع آدمی ہے۔ شعر کا ذوق بھی بڑی حد تک مناسب و عمدہ ہے۔ بڑے شاہزادہ کی ملازمت میں رہتا ہے۔ یہ تخلص اسی دربار سے اسے ملا ہے۔ بڑے شاہزادہ کی تعریف میں اس نے جو قصیدہ کہا ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں:

ایا شہی کہ جہاں را ز رہزناں خلل بدور معدلتت فتنہ پاسباں آمد

امید لطف تو ہست آنچنانکہ عاصی را گناہ از آتش دوزخ نگاہباں آمد

تو ئی کہ مرکب عزم ترا بروز وغا ظفر علم کش و اقبال ہم عناں آمد
رساند نامۂ اقبال دوش مرغ شرف کہ عینت شہپرش از اوج لامکاں آمد
نوشتہ کاتب قدرت عبارتی کاں را امید ترجمۂ شوق ترجماں آمد

گر حسن صنم جلوہ گر صومعہ گردد سجادہ کناں سبحہ بزنار فروشند
نقد دو جہاں کس نشناسد ز خریدار آں جا کہ متاع دل افگار فروشند
منم کہ یافتہ ام ذوق نشتر غم را
ز ریش سینۂ من خجلت است مرہم را
آنچہ ما کردیم با اسلام در روز جزا جائے آں دارد کہ گردد کفر دامن گیر ما
نوائے بزم عشق آتش زن مضراب بود امشب
اشارت نغمہ سنج ابرو بر لبستم تاب بود امشب
بکے اے دل خندہ را در لب گرہ زن کہ امشب رونق خونناب عشق است
ہراس سر ز نشتم نیست زانکہ طعن رقیب
بود بمذہب عشاق آفریں خوانی
زہے نگاہ تو غارت گر مسلمانی امید وعدۂ تو مایۂ پشیمانی
ز سجدۂ صنم اے برہمن مشو نومید کہ ہست آئینۂ بخت داغ پیشانی
کجا ز پنبہ و مرہم فرو نشیند درد
مرا کہ مرغ دل خستہ شعلہ بار آرد

ترجیع بند:
اے گریہ بشارتی کہ امشب خونناب جگر بدیدہ زد جوش
وے وصل شفاعتی کہ شوقش تاراج نمود کشور ہوشش
از ذوق سخن مگو کہ مارا نشتر بجراحتست ہم دوشش
ایں قصہ بکس نمی تواں گفت الماس بزخم ریز و مخروشش

اس عمر میں فارسی کہنا اور سمجھنا ہی بڑی بات ہے کجا کہ شعر گوئی اور اتنی عمدہ۔ آثار تو یہ ہیں کہ اپنے زمانہ کے بڑے بوڑھوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔

ظہوری

دکن میں رہتا تھا۔ نہایت آزاد منش اور بے قید لیکن درد مند آدمی تھا۔ امیروں کے گھروں پر کم ہی آیا جایا کرتا تھا۔ شیخ فیضی اس کی اور ملک قمی کی جو ملک الکلام کے لقب سے مشہور تھا بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ یہ دونوں فیضی کے ساتھ پایۂ تخت لاہور آنا چاہتے تھے لیکن برہان الملک راضی نہ ہوا۔ ان دنوں سُننے

میں آیا کہ دکن میں غدر ہوا تو وہاں کے لوگوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مولانا ظہوری صاحب طرز اور صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ یہ شعر اس کی یادگار ہے:

ظہوری شکوہ ات از یار بے جاست
تو بے طالع فتادی جرم او چیست

عالم کابلی عارف تخلص تھا۔ نہایت دلچسپ، خوش مزاج، خوش اطوار ملّا تھا۔ بحث کے دوران اور دوسرے مواقع پر ایسی باتیں کہہ جاتا تھا کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جائیں۔ اپنی بیاض میں "شرح مقاصد" کی بحث پر ایک مضمون لکھ رکھا تھا۔ جگہ جگہ اشعار بھی دیے تھے۔ لکھا تھا کہ یہ عبارت میری کتاب "قصد" سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اس نے "شرح تجدید" کے جواب میں "تخدید" کے نام سے اور "مطول" پر بھی ایک دو حاشیے لکھ رکھے تھے کہ یہ عبارت کتاب "طول" سے لیے گئے ہیں جو "مطول" اور "اطول" کے مقابل کی کتاب ہے۔ اس نے ہندوستان کے مشائخین کے حالات میں بھی ایک تذکرہ لکھا تھا۔ اس میں جس مجاور اور فقیر سے بھی کوئی بات سُنی درج کر لی اور کچھ تو لبس اندازہ پر اضافہ کر دیا۔ اس کا نام رکھا "و فتح الولایہ"۔ لوگوں نے کہا بھائی اس واوٗ عطف کا معطوف کہاں ہے؟" اس نے جواب دیا "معطوف معطوف علیہ میں چھپا ہوا ہے جس کا نکالنا ممکن نہیں۔ اگر تم "ولایہ" کے واؤ کو زبر سے پڑھو تو پتہ چلے گا"۔ ملا ہمیشہ قاضی خاں بدخشی پر اس وجہ سے رشک کیا کرتا تھا کہ سجدۂ تعظیمی ایجاد کرنے کا سہرا اس کے سر بندھ گیا تھا۔

ایک دن فتح پور میں مجھے اور مرزا نظام الدین احمد کو صبح صبح بڑا اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ اشتہا بڑھانے والے معجون اور اپنی کتابوں کا بستہ لے کر بیٹھ گیا۔ ہم صبح سے دوپہر تک بھوکے بیٹھے رہے، کہنے سُننے کا کوئی موقع نہ تھا، آخر مرزا سے رہا نہیں گیا اور وہ بول اُٹھے "کچھ کھانے کے لیے بھی ہے؟" اس نے جواب دیا "میں تو اس خیال میں تھا کہ تم لوگ کھانا کھا کر آئے ہو، میرے پاس ایک بکری کا بچہ ہے اگر فرمائیں تو ابھی ذبح کر دوں"۔ ناچار ہم اُٹھ کر اپنے گھر چلے آئے۔ اس کی ان حرکتوں پر آخر اسے کیا سمجھا جائے؟

اس نے جب دیکھا کہ شیخ ابو الفضل اور قاضی خاں اور دوسرے اس کے برابر کے لوگ ملاّگیری سے امارت کے منصب پر پہنچ گئے ہیں تو وہ بھی ہر دم بادشاہ سے یہ عرض کرنے کی فکر میں رہتا تھا کہ اسے بھی فوج میں داخل کر لیا جائے۔ جب اس کی درخواست قبول نہ ہوئی تو ایک دن شام کو چوکی کی سلامی کے موقع پر مانگی ہوئی ایک تلوار کمر سے باندھے فوجی وضع بنائے نہایت مضحکہ خیز حالت میں صف سے باہر نکل کر بادشاہ سلامت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور خلافِ قاعدہ کسی واسطہ کے بغیر براہِ راست اکبر سے پوچھنے لگا "ہمیں کس منصب دار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور ہم کس جگہ سے تسلیمات بجا لائیں؟" بادشاہ اس کا مطلب بھانپ گئے اور کہا "تم جس جگہ ہو وہیں سے تسلیمات بجا لاؤ"۔ جب یہ تدبیر بھی بے نتیجہ رہی تو ایک دن اپنی شان دکھلانے کے لیے تاکہ فوجوں میں داخلہ مل جائے مئی دوپہر کے وقت گرمی میں روئی کا لبادہ جو میل سے چیکٹ رہا تھا کسی کا بخشا ہوا یا مانگے تانگے کا تھا، پہن کر دربار میں

آیا۔ مرزا کوکہ نے اس لبادہ پر بڑی پُر مذاق باتیں کیں وہ بھی ان کا اسی طرح جواب دیتا رہا۔

اس کی جائے پیدائش کابل کے نواح میں گلبہار نامی ایک گاؤں تھا۔ اسی مناسبت سے عرصہ تک اپنا تخلص بہاری رکھے ہوئے تھا۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ تخلص کنیزوں کے نام جیسا ہے تو بدل کر ربیعی رکھ لیا۔ اپنی مُہر کے لیے اسی کا سجع بھی بنوالیا۔ بہرحال عالم کابلی موزوں طبع شاعر تھا۔ یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

می پرد چشمی کہ می گشتم ازو ہر لحظہ شاد

غالباً کاہی ز دیوارش بمو خواہم نہاد

شکست شیشۂ عشرت بہر کہ بنشستم — گسست رشتۂ صحبت بہر کہ پیوستم

برائے کشتن من تیغ کین برخاست — بہر کہ یک نفس از روئے مہر بنشستم

چند شعر اس نے "سلسلۃ الذہب" کی زمین میں بھی کہے تھے اور اپنے اس مہمل مجموعہ کا نام "صلصلۃ الجرس" رکھا تھا۔ اس میں اپنی بہت سی ان تصانیف کے نام دیے ہیں جو ابھی اس کے ذہن ہی میں مستور ہیں اور خارج میں نمودار نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے نام بھی بڑے عجیب عجیب گنائے ہیں۔ مثلاً:

دیدہ باشی بہ نسخۂ تجدید — کہ مجدد رسید فیض جدید

کاندرو عدد مواقف است نہاں — وازبیانش مقاصد است عیاں

متن تجرید پیش او لنگ است — گلشن از قحط آب بیرنگ است

لمعہ اش بے تکلف و اغراق — حکمت عین و حکمت اشراق

وانکہ وصفش نہ مرتبۂ فضل است — اسم ورسمش دلالۃ العقل است

واں نذی کاں زبحر جود آمد — لجتہ الجود فی الوجود آمد

جامع آں عوالم الآثار — من تعالیم عالم الاخبار

کاندرو نوع علم تا صد و بیست — کردہ ام ایں صفت بگو ودکیست

اس مسخرہ پن سے قطع نظر ملا عالم بڑا اچھا دوست تھا، لائق فاضل، ہمدرد، بے غرض انسان تھا، ہزل گو مگر دلچسپ اور ہر دلعزیز آدمی تھا۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل وکرم سے بہشت جاودانی عطا فرمائے گا۔

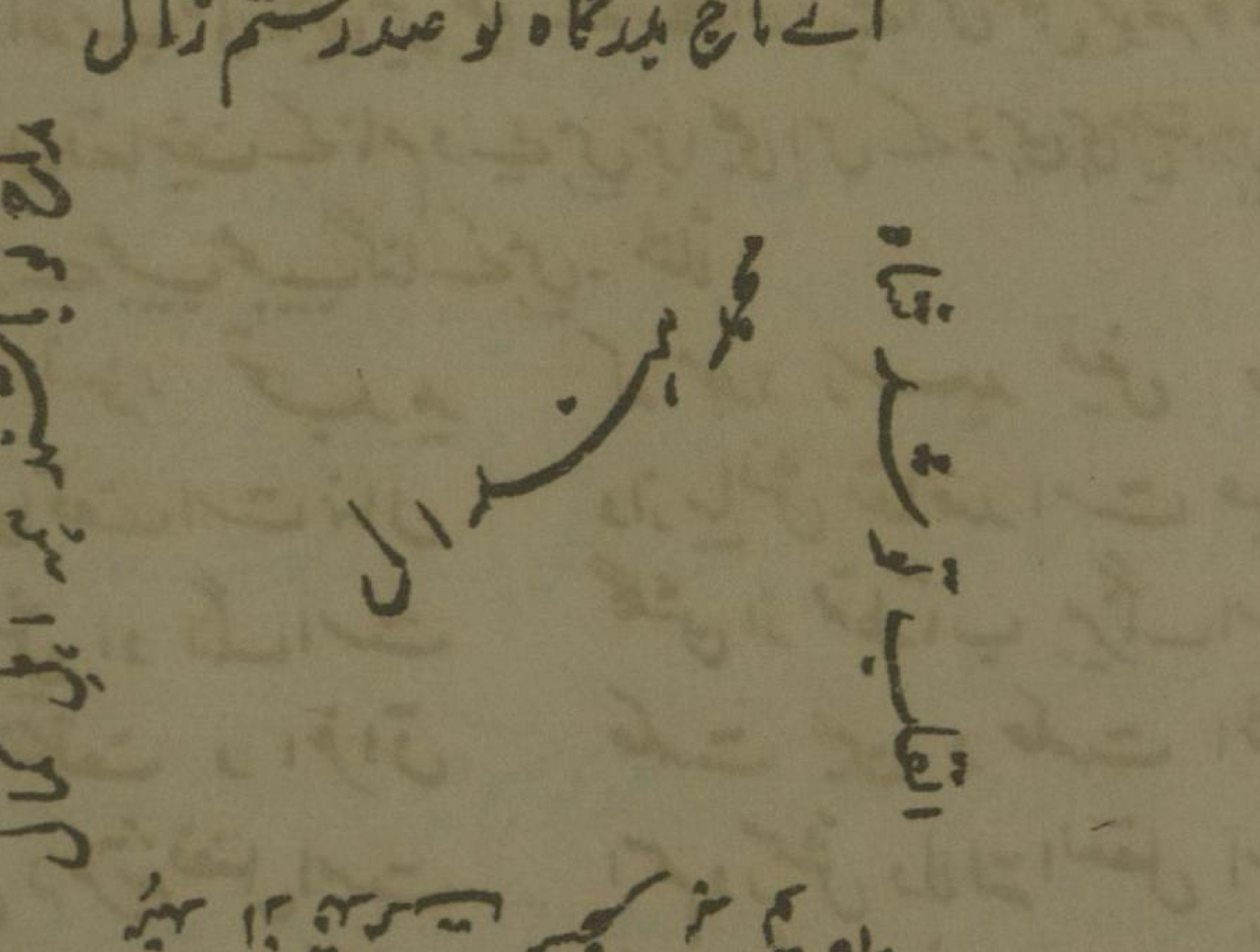
میر عبدالحی مشہدی یہ کچھ عرصہ تک ہمایوں کے زمانہ میں عدل کے عہدہ پر رہے۔ ان کا بھائی میر عبداللہ قانونی خاص مصاحبوں میں تھا۔ یہ دونوں بھائی نہایت متقی پرہیزگار تھے۔ میر عبدالحی خط بابری سے بھی خوب واقف تھے۔ یہ خط بابر بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ اس خط میں قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر مکہ معظمہ بھی بھجوایا تھا، اب اس خط کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

میر علاء الدولہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر مذکور بہت سی حیثیتوں کے مالک تھے۔ خط بابری جو نہایت مشکل خط ہے ان کے سوا کسی اور نے اس قدر جلدی اور خوبی کے ساتھ نہیں سیکھا تھا۔ اس کے حاشیہ پر میرزا عزیز کوکہ

نے لکھا ہے "میر کسی علم سے واقف نہیں تھا بس ایک ہنر جانتا تھا کہ بابری خط اچھا لکھ لیتا تھا، عجب سادہ لوح ہے کہ ایسی بے سروپا حکایتیں جنھیں کوئی بچہ بھی باور نہیں کرے گا، بے سوچے سمجھے، بے موقع و محل مجلسوں میں بیان کرنے لگتا ہے۔" چونکہ میرزا اس سے بہت پہلے سے واقف تھا اس لیے اس کی رائے زیادہ صحیح اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ میر علاء الدولہ کے تذکرہ میں بڑی نشتر گرگی پائی جاتی ہے۔

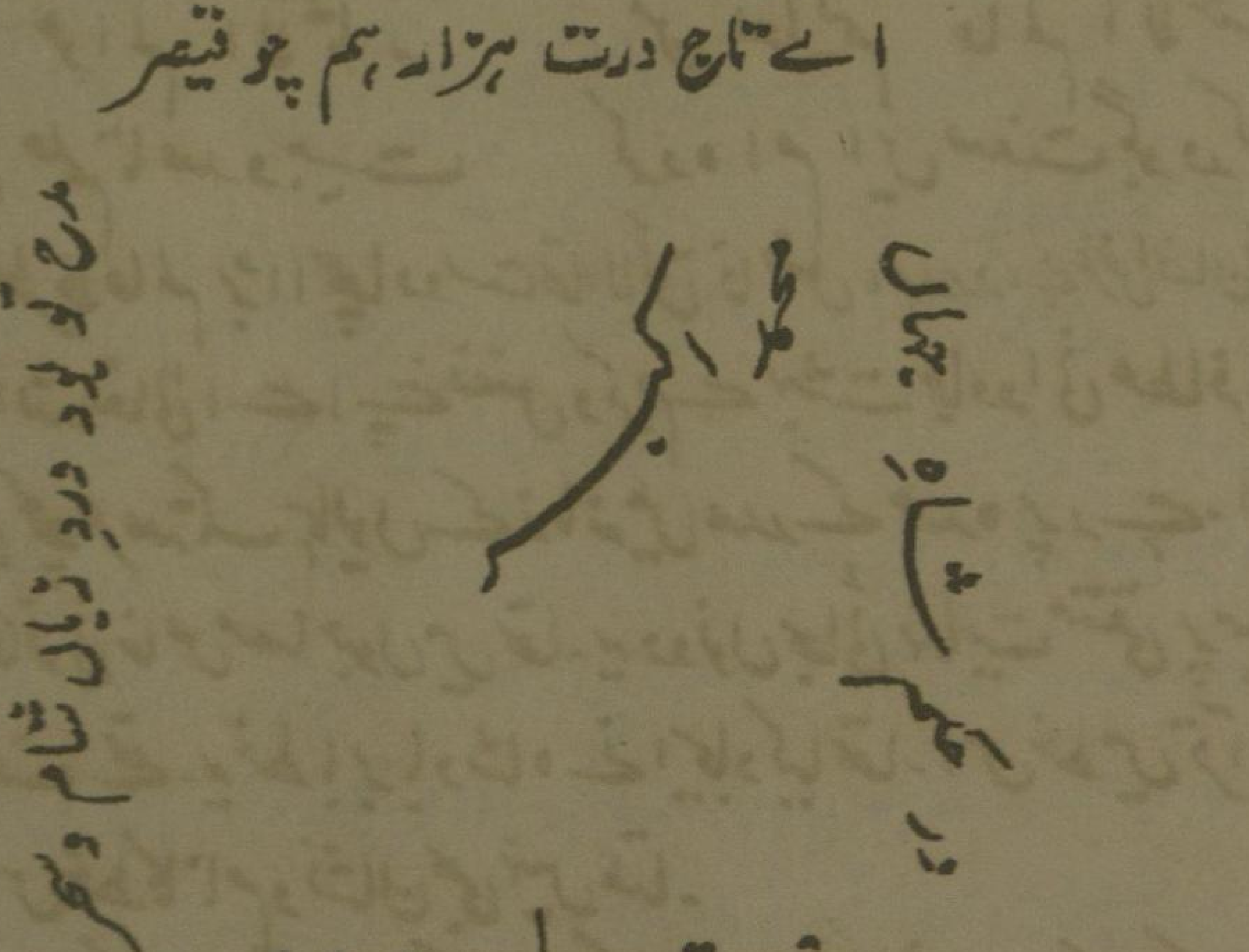
میر عبدالحی شعر سے پوری مناسبت رکھتا تھا۔ اس نے اس مصنوع رباعی کا جواب بھی کہا تھا جسے کسی فاضل شاعر نے میرزا ہندال کے نام مربع کی طرز میں کہا تھا۔ یہ رباعی بہت مشہور ہے۔ بچے بھی پہلی جو چیز یاد کرتے ہیں وہ یہی رباعی ہے۔

رباعی



[1]

میر عبدالحی کے مزاج میں بھی بچکانہ پن تھا۔ اس نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھی:



[1] یہ بچکانہ کھیل کے سوا کچھ نہیں۔ اہل علم اس کو "مربعات" میں شمار نہیں کرتے۔ "مجمع الصنائع" اور "ہفت قلزم" میں جو مربعات ہیں وہ بس ایسے ہی نہیں ہیں کہ چار مصرعوں کو چوکور لکھ دیا ان میں اور بھی قرینے ہوتے ہیں (م)

عتابی سید محمد نجفی نام تھا۔ دکن میں نہایت معتبر و معزز تھا۔ ہندوستان آیا تو الہ آباد میں بادشاہ کے حضور رسائی ہوئی۔ وہ اکبر کو نہایت ہی لاابالی بے باک اور اکھڑا اکھڑا سا آدمی نظر آیا۔ یہ بھی بات عرض میں پہنچی کہ اس نے دکن میں شاہ فتح اللہ کی ہجو کہی تھی۔ جب بادشاہ نے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا "وہاں دکن میں میں شاہ جیسے آدمیوں کو کہاں لائق توجہ سمجھتا تھا"۔ یہ بات اکبر کی بدگمانی کو اور بڑھا گئی اور اس نے اُسے قید کروا دیا۔ فتح پور پہنچنے پر حکم دیا گیا کہ اس کے مسودات کی تلاشی لیں اور دیکھیں کہ اس نے اس عرصہ میں کس کس کی ہجو کہی ہے۔ بعض چیزیں برآمد ہوئیں اور وہ دس سال تک قلعہ گوالیار میں قید رہا۔ آخر بڑے شاہزادہ اور دوسرے مقربوں کی سفارش پر اس کو معافی دی گئی اور لاہور بلا لیا گیا رسی جل گئی تھی مگر بل نہیں گیا تھا۔ وہی بدمزاجی اب بھی موجود تھی۔

ایک دن قاضی حسن قزوینی جس کو خان کا خطاب حاصل تھا سے ملنے گیا، دربان نے روک دیا۔ دربان سے لڑ بھڑ کر قاضی کی محفل میں جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا پہنچ گیا اور قاضی حسن سے کہنے لگا کہ "اچھا تو یہ کھانا ہے جس کی وجہ سے اہل علم کو دروازہ پر روکا جاتا ہے"۔ صاحب خانہ اور دوسرے حاضرین نے بہت معذرت کی کہ دربان نے آپ کو پہچانا نہیں لیکن عتابی نے مان کر نہ دیا اور کھانے میں شرکت نہ کی۔

عربی فارسی شعر کہنے میں بڑی اچھی مہارت رکھتا ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل ہے۔

نمونۂ کلام:

در گلخن ہوا دل فرزانہ سوختیم
قندیل کعبہ بہر در بت خانہ سوختیم

مارخصت ایں خول بحل را بتو دادیم
گفتیم و نوشتیم و بحل را بتو دادیم

بہ عزت تو کہ ما بلبلاں ایں چمنیم
کہ گل شگفت و ندانستہ ایم باغ کجاست

در کشور تو نام وفا گریہ آورد
قاصد جدا و نامہ جدا گریہ آورد

کوس سخا بلند و رہ آفتاب نیست
ایں طرز خاص و مجلس عام تو می کشند

از سر کوئی تو آلودۂ بہتان رفتم
عصمت آوردم و تر دامن عصیاں رفتم

شب زلف تو ز جمعیت دلہا خوش کرد
کہ ز کویت من آزردہ پریشاں رفتم

چشمۂ خضر بخاک قدمم می نازد
گرچہ لب تشنہ تر از چاہ زنخداں رفتم

قند می ریخت بہر در کہ زدم پنداری
کہ بدریوزہ سوئے آب لب خنداں رفتم

در بتکدہ و دولت زدم و از در یاس
ناامید از در گبر و مسلماں رفتم

زبے تابی عتابی دوری او جستم و اکنوں
چو در دل بگذرد بے اختیارم گریہ می آید

رباعی

در عشق رخت علم و خرد باختہ ام

چہ علم و خرد کہ جاں خود باختہ ام

در راہ تو ہرچہ داشتم آخر عمر

در باختم و ہنوز بد باختہ ام

عجبی نیست کہ از آب دہوائے رخ تو زآہن دل بدمد جوہر گیا آئینہ را

رہائی کے بعد بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپیہ نقد دے کر قلیج خاں کے حوالہ کردیا کہ اسے سورت سے حجاز روانہ کردیا جائے، لیکن وہ راستہ ہی سے بھاگ کر دکن چلا گیا اور وہاں کے حکام کے پاس پہلے کی طرح اعزاز و اکرام سے رہنے لگا۔

عبیدی نورسیدہ جوان ہے، اس کا شعر ہے ؎

متاع دل کہ بہ پرسیدنم نمی ارزد

کرشمہ کہ بہ پرسیدنش نمی ارزم

اس کے اس شعر نے لاہور میں بڑی ہلچل مچادی اور اسی لیے حکیم ابوالفتح نے بڑی تعریف کرکے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے جب اس سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو اس نے اس شعر کے بجائے ایک اور شعر جس میں زمانہ کی شکایت بیان کی گئی تھی پڑھا جو بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شعر کے اثر کی طرح ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا۔

عشقی خاں یہ ترک پیرزادوں میں سے ہے۔ علم "سیاق" سے واقف ہے۔ کچھ عرصہ تک سرکار اعلیٰ میں میر بخشی بھی رہا۔ قصیدوں اور غزلوں کا ایک دیوان جمع کیا ہے۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ میں حضور میں کلیات پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت ایک نیا قصیدہ اور غزل سنانے لگ گیا۔ اس کے مضحکہ انگیز شعر جیسے بھی ہوتے تھے سب کو معلوم تھا اسی لیے بادشاہ نے اسے روک دیا اور کہا ابھی رہنے دو جس وقت تم اپنی کلیات پیش کرنا ان اشعار کو بھی اس میں شامل کرلینا ہم سب کچھ ایک ہی بار سن لیں گے۔ خنجر بیگ کی مثنوی کی طرح ایک طویل مثنوی بھی کہی ہے ؎

خوار و بے اعتبار و زشتم من

چہ بلا مردک پاشتم من

اس کے لڑکے رحمٰن قلی سلطان کو تاریخ کہنے میں بڑی مہارت تھی۔ اس نے اس مصرع کو اپنی مہر کا سجع بنایا تھا "بندۂ رحمٰن قلی سلطان ولد عشقی خاں" ع

از آں پر ہنر بے ہنر چوں بود

اس منتخب میں ہم نے شاعروں کے اشعار بلا کسی انتخاب کے جیسے تھے ویسے ہی پیش کردیے ہیں اور اصل ماخذ میں

جو بھی رطب و یابس تھا، نقل کر دیا ہے، خان مذکور کے شعر بھی اسی طرح کسی ترجیح کے بغیر نقل کیے جاتے ہیں۔ ان کے اچھے بُرے ہونے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ میر علاء الدولہ پر آتی ہے۔

عکس چشم پر خمارت در شراب افتادہ است — ہمچو مستی کز سر مستی در آب افتادہ است

غنچہ از شوق لبت در صبحدم خنداں نبود — بلکہ بہر دیدن روئے تو چشم دل کشود

بوقت خط نوشتن میکنم از گریہ تر کاغذ — ز رشک آنکہ بنویسد قلم نام تو بر کاغذ

بہر حال بڑا نرم مزاج اور با وقار آدمی ہے۔ تدمار کی چال ڈھال رکھتا ہے اب تو وہ فانی مشرب پیر بن گیا ہے۔

علمی

اس کا لقب میر مرتضیٰ ہے۔ دو علیاد کے سیدوں میں ہے۔ خان زماں کا معتبر امیر رہا ہے۔ ایک وقت بدایوں اس کے زیر حکم تھا۔ صاحب علم و فضل اور نہایت خوش طبع آدمی تھا۔ بدایوں کے اکابرین میں سے جھجار خان نامی ایک شخص نے جس کا تخلص زاہد تھا، اپنی مثنوی کا ایک شعر جو بسم اللہ کی تعریف میں تھا اس کے سامنے پڑھا ؎

کنگرۂ سین چو خنداں شدہ

خندۂ او ازین دنداں شدہ

میر نے کہا "کنگرۂ سین کیا ہوتا ہے تمہارے شعر پر تو در و دیوار بھی خنداں ہیں۔ کبھی کبھی شوخئ طبع شعر کے قالب میں ڈھل جاتی تھی۔ چنانچہ اس کا شعر ہے ؎

اے دل ہمہ شب آں سگ کو خواب ندارد

از نالہ و فریاد و فغاں کہ تو داری

میر عزیز اللہ

قزوین کے سیفی سیدوں میں سے ہے۔ فن سیاق اور منشی گری میں بہت ماہر تھا۔ دوسرے علوم سے بھی بخوبی واقف تھا۔ کچھ عرصہ تک شاہی دیوان بھی رہا۔ جب ہندوستان میں کروڑیوں کا تقرر کیا گیا تو وہ پانچ کروڑ کی تحصیل پر سنبل میں متعین کیا گیا اور اس صوبہ کا نظم و نسق اور مالیات کا انتظام کرتا رہا، آخر دنوں میں بادشاہی دفتر کے محاسبہ کی زد میں آ گیا جو کچھ پونجی جمع کی تھی وہ سب سرکاری خزانہ میں جمع کرنی پڑی اور اسی مصیبت میں فوت ہو گیا۔ اس کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ایک نظم شہر آشوب اور ایک منظوم رسالہ "گل و مل" ہے۔ اس کے اشعار سلطان حسین مرزا کے عہد کے شاعروں کے رنگ میں ہیں، اس سے پہلے جن شاعروں کا ذکر ہوا ان میں سے اکثر یہی رنگ رکھتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

سبزۂ خط رستہ ز لعلش لبسی با آب و تاب

زانکہ دایم می خورد از چشمۂ خورشید آب

چنیں کافتادہ در راہ غم و محنت چو خاشاکم

نسیم لطف و احسانت مگر بردارد از خاکم

یارب از جمعیت عصیاں پریشانم بسے رحمتی فرما کہ زیر بار عصیانم بسے
غم فراواں، غصہ بیحد، صبر کم، غمخوار نے چوں کنم یاراں بکار خویش حیرانم بسے

معلوم ہوتا ہے یہ اشعار اس نے زمانۂ قید میں کہے تھے۔

میرزا عزیز کوکہ اعظم خاں کے لقب سے مشہور ہے۔ نہایت با اخلاق نیک صاحب علم و فضل آدمی ہے۔ امرائے شاہی میں اس جیسا سمجھدار اور مدبّر کوئی اور نہیں۔ وہ پہلے کبھی شعر و شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ ان صفحات کو ہم اس کے کلام سے خالی نہیں رکھنا چاہتے۔

چوں نشد حاصل مرا کام دل از ناموس و ننگ
بعد ازیں خواہم زدن بر شیشۂ ناموس سنگ

اس کی ایک غزل کا مطلع ہے:

اے زلف چلیپائی تو زنجیر دل من
دمی عشق تو آمیختہ با آب و گل من

نیست کاروبار عالم را مدار دل ز کاروبار او افسردہ بہ

گشتت بیمار دل از درد و غم تنہائی
اے طبیب دل بیمار چہ می فرمائی

جان غم فرسود من شد خاک در راہ وفا بیوفا یارا طریق خاکساری را ببیں

آگرہ میں باغ جہاں آرا بنایا اور اس میں ایک مکان کو نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ کتبہ پر یہ رباعی لکھوائی:

یارب بصفائی دل ارباب تمیز کاں نزد تو ہست خوب تر از ہمہ چیز
چوں گشت بتوفیق تو ایں خانہ تمام از راہ کرم فرست مہمانِ عزیز

اس کے جو کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے ان میں سب سے بڑا تو اس کا وہ دلیرانہ حج پر جانا ہے لیکن آہ اس کا وہ لوٹ کر آنا۔

عہدی شیرازی قصیدہ اور غزل ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ تھا جب یہ ہی آیا تو قاضی محمد کی معزولی کے بعد جو ایک کٹر شیعہ اور بدمعاش آدمی تھا حکیم عین الملک مرحوم نے لاہور میں اس عہدہ پر عہدی کو مقرر کرانے کی بڑی کوشش کی اور صدور سے سفارش کی درخواست کی۔ قبل از قبل فال کے طور پر تاریخ بھی نکالی۔ "قاضی عہدی"۔ لیکن اس کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا بس شیخ چلی کا خواب دیکھ کر رہ گیا اور حکیم کے ساتھ دکھن چلا گیا۔ حکیم کے مرنے کے بعد اس کے حالات کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا کیا ہوا۔

از خون لب شکوہ ام اگمہ تر می شد از روزن دیدہ دود دل بر می شد
اشکم ہمہ شعلہ ریز آتش می ریخت آہم ہمہ تاب دادہ اخگر می شد

حکیم عین الملک جس وقت لاہور سے بلکہ کہنا چاہیئے کہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا حکیم سنائی کی یہ رباعی محفل میں پڑھی گئی:

می زنی نفس کہ ہم نفس نزدیکست ۔ ویں مرغ مرا ز قفس نزدیکست
تا کئی گوئی کہ دورم از دلبر خویش در خود بنگر کہ یار بس نزدیکست

محوی نے اسی وقت فی البدیہہ کہا:

محوی کہ دلش باہمہ کس نزدیکست باغنچۂ باغ و خار و خس نزدیکست
زاں دور نگردند ز محمل او را کش نالہ بنالۂ جرس نزدیکست

حکیم عین الملک نے ان دونوں رباعیوں کے جواب میں بے ساختہ کہا:

چوں یار تو با تو ہر نفس نزدیکست ہشدار کہ آتشت بخس نزدیکست
اے ماندہ ز ہمرہاں و گم کردہ طریق بشتاب کہ آواز جرس نزدیکست

مُلا عہدی نے بھی اسی وقت یہ رباعی کہی جسے میں نے اپنی بیاض میں لکھ لیا تھا:

آزادی ایں مرغ قفس نزدیکست ویں شعلہ بکار خار و خس نزدیکست
از من بہزار بال دیر بگریزد گر ہم داند کہ باچہ کس نزدیکست

میری بھی سنگدلی کا کیا کہنا کہ میں کیسے کیسے لوگوں کی جُدائی کا پتھر سینہ پر اُٹھائے زندہ بیٹھا ہوں۔

عنایت اللہ کاتب شیراز کا رہنے والا ہے۔ ان دنوں شاہی کتب خانہ میں منتظم ہے۔ نہایت خوش طبع اور ذہین ہے۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔

رباعی:

افتادہ چو مرغ بے نوا در قفسم
بے ساز صدا چو دل شکستہ جرسم
با آنکہ حقیر تر ز مو و مگسم
بگرفت ز تنگیٔ دو عالم نفسم

تا کاکل و زلف نیکواں خم بخم است تا شیوہ و رفتار بتاں چم بچم است
تا ناوک غمزہ در کمان ستم است مرگ من و زندگی من دم بدم است

با راہ علاج خویش آموختہ ایم
با خرمن عصیان خود اندوختہ ایم
با آتش دوزخ از خود افروختہ ایم
خود را بہ گناہ خویشتن سوختہ ایم

در گلشن ایں جہاں گل نیست کالودہ بخوں بلبلی نیست

گھوڑے کی تعریف میں کہا ہے:

که پویه اعضائش از بس شتاب
بهم در رود همچو اجزائے آب

عرفی شیرازی بلند فطرت صاحب فہم نوجوان تھا۔ ہر طرح کے شعر بہت اچھے کہے ہیں لیکن کچھ اتنا متکبر اور مغرور تھا کہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ بڑھاپے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔

جب ولایت سے فتح پور آیا تو سب سے پہلے شیخ فیضی سے اس کی دوستی ہوئی۔ شیخ نے بھی اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس آخری سفر میں اٹک کے قریب فیضی کے مکان پر ہی رہتا تھا اور اس کی ضروریات شیخ کے ہاں سے پوری ہوتی تھیں لیکن جیسا کہ فیضی کی عادت تھی وہ ہر شخص کے ساتھ بس ہفتہ دو ہفتہ کی دوستی کرتا تھا پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا تھا۔ دونوں میں شکر رنجی ہو گئی اور عرفی نے حکیم ابوالفتح سے دوستی کر لی اور اس کی سفارش سے خانخاناں کی خدمت میں چلا گیا وہاں اس کے جوہر کھلے۔ روز بروز اس کی شعر گوئی اور مراتب میں ترقی ہونے لگی۔

ایک دن شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا، فیضی ایک کتے کے پلے سے کھیل رہا تھا۔ عرفی نے پوچھا "اس صاحبزادہ کا کیا نام ہے؟" فیضی نے کہا "عرفی"۔ اس نے برجستہ جواب دیا "مبارک ہو" (مبارک فیضی کے باپ کا نام تھا) اس چوٹ سے فیضی تلملا اٹھا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، چپ ہو رہا۔

عرفی اور حسین ثنائی نے شاعری میں بڑا نصیبہ پایا ہے۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں جس میں کتب فروش ان دونوں کے دیوان کو لیے ہوئے کھڑے نظر نہ آئیں۔ ان کے دیوان، عراقی ہندوستانی سب تبرک کا خریدتے ہیں۔ اس کے برعکس شیخ فیضی وہ اپنی کتابوں کے لکھوانے، ان کو زرکار کرنے میں بے دریغ روپیہ اٹھاتا ہے لیکن کوئی اس کی کتابوں کو جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھتا، بجز ان مسودوں کے جو خود وہ ادھر ادھر بھیجتا رہتا ہے۔ ع

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

عرفی کے اشعار کا ایک دیوان ہے "مخزن اسرار" کی بحر میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو بہت مشہور ہوئی۔

نمونۂ کلام:

رباعی

فردا که معاملان هر فن طلبند
حسن عمل از شیخ و برهمن طلبند
آنها که درودهٔ جوی نستانند
و آنها که نکشتهٔ بخرمن طلبند

کسے که تشنه لب ناز تست میداند
که موج آب حیات است چین پیشانی

قابل درد محبت کس نیاید در وجود
زنگ روئے خویش را هر کس بدستانی شکست

عشق می گویم و می گریم زار
طفل نادانم و اول سبق است

مرو بدل قدم از جہل یا فلاطوں باش   کہ در میانہ گزینی سراب و تشنہ لبی ست

اس کی اس غزل کا مطلع خوب ہے:

مدار مجلس ما بر حدیث زیر لبی است   کہ اہل ہوش عوام اند و گفتگو عربی است
بشوق دوست چہ سازم کہ در شریعت عشق   نگاہ بے ادبی و خیال رسوائی است
زمانہ مرگ مرا بر کدام درد نوشت   کہ من بدیدۂ جانش نکردم استقبال
یک سخن نیست کہ خاموشی ازاں بہتر نیست   نیست علمی کہ فراموشی زاں بہتر نیست
گرد سرت گشتی و کردی طواف   کعبہ اگر بال و پری داشتی

غزنوی یہ میر محمد خاں کلال کا تخلص ہے جو بڑا عالی مرتبہ مشہور امیر تھا۔ اس کی محفل کبھی اہل علم اور شعراء سے خالی نہ رہتی تھی۔ باوجود سرکاری مصروفیات کے وہ شعر کہنے کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ ایک بڑا دیوان مرتب کر لیا تھا اور بادشاہ سے کہتا تھا کہ تمھارے عہد کی بڑائی یہی ہے کہ مجھ جیسا آدمی اس عہد میں موجود ہے۔

در جوانی حاصل عمرم بنادانی گذشت
آنچہ باقی بود آں ہم در پشیمانی گذشت
اے جواں حیف تخم نومیدی نکشتی در جہاں
موسم پیری رسید و وقت دہقانی گذشت

برو اے غزنوی دم از سگاں یار ہمدم زن   قناعت کن بنانِ خشک و استغنا بہ عالم زن
بنہ تاج تکبر از سر و از ما و من بگذر   اساس سلطنت برہم چو ابراہیم ادھم زن
ز خویش و آشنا قطع نظر کن تا بیاسائی   اگر نور و حشمت واخوذ و در راہ بس خم زن

جس زمانہ میں وہ سنبھل کا حاکم تھا اس نے شیخ سعدی کی اس غزل کو طبع آزمائی کے لیے پیش کیا۔

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

اور خود اس پر یہ شعر کہا:

دمی کہ چہرۂ ساقی ز بادہ گلرنگ است
بنوش بادہ بر آواز نے کہ دل تنگ است

میر امانی اور دوسرے شاعروں نے اپنے حوصلہ کے مطابق اور اس زمانہ کی زبان کے مطابق جواب دیئے۔
جمال خاں مرحوم بدایونی خان موصوف کے مقرب و مصاحب تھے اور بڑے لطیف طبع آدمی تھے۔ اُنھوں نے جو

غزل کہی تھی اس کا مطلع ہے ؎

ترا رخ از مئی عشرت مدام گل رنگ است
مرا بہ فکر دہانت چو غنچۂ دل تنگ است

اس زمانہ میں میں کانت و کولہ میں حسین خاں کی خدمت میں تھا کہ رات کے وقت یہ غزل میاں جمال خاں کے خط کے ہمراہ وصول ہوئی۔ دوسری صبح کو ہی خبر ملی کہ وہ سنبھل کی عیدگاہ میں عید قربان کے دن بیہوش ہو گیا اور عین جوانی میں محبوب حقیقی سے جا ملا۔ اس کی لاش بدایوں بھیجی گئی۔ اس کی تاریخ وفات "آہ جمال خاں بمرد" نکالی گئی ؎

گردوں در آفتاب سلامت کرا نشاند
کو را چو صبح روشنی اندک بقا نکرد

غباری یہ قاسم علی ولد حیدر نقال کا تخلص ہے جو بڑا بدمزاج مغرور اور متکبر مشہور تھا۔ اپنے آپ کو قریشی جتلاتا تھا لیکن یہ بات طے شدہ تھی کہ جس کا نسب اونچا نہیں ہوتا وہ اپنے آپ کو قریش سے منسوب کر دیتا ہے۔ اس کی محفل میں اگر اُس کا باپ چلا آتا تو اسے بڑی شرم معلوم ہوتی تھی اور بگڑنے لگتا تھا۔ اس کا باپ اس سے کہا کرتا تھا تو چاہے کتنی ہی شیخی کرے، میں تو اپنے آگرہ والی دکان پر بیٹھتا ہوں پھل اور معجون وغیرہ بیچتا ہوں اور ہر آنے والے سے چاہے وہ پوچھے یا نہ پوچھے میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ قاسم علی خاں میرا حقیقی بیٹا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمھارے کتنے لڑکے ہیں؟ کہنے لگا آٹھ اور ان کی تفصیل یہ ہے ؎

دو از من ست و دو از بی بی و دو از ہر دو
دوئی دگر کہ نہ از بی بی است و نے از من

قاسم پہلے بڑا حسین جوان تھا اور مجلس شاہی میں شعر پڑھا کرتا تھا۔ پھر ترقی کر کے بادشاہ کا نائب بن گیا اور خان کا خطاب و منصب پایا۔ وہی مثل ہے کہ ایک نے دوسرے سے کہا تو نے سُنا فلاں کو خان بنا دیا گیا ہے۔ اس نے جواب میں کہا اچھا ہوا وہ کمینہ اسی قابل تھا۔

اس کی تحریر اور علم بس بادشاہ سلامت کی طرح ہی تھا ؎

او را چو طفلکاں خطکی و سواد کی
یا آں خط و سواد کہ خود اعتقاد کی

میں اسے اکیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ہمیشہ "متوسط" کا سبق پڑھتا رہتا ہے اور اپنے استادوں سے زبردستی تسلیمات کراتا ہے۔ اگر کوئی تسلیم نہ کرے تو پھر اس کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی مار ہے کہ اس کا سبق کبھی تک "وضع لمعنی مفرد" کے قاعدہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ اس کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

ماسوائی آب مائل و حمام جائے ماست
حمام خانہ ایست کہ خاص از برائے ماست

کسی کا مطلع ہے ؎

تارے ز زلف خم بہ خم یارم آرزوست
یعنی کہ درد مندم و اظہارم آرزوست

اس نے اس مطلع کے جواب میں کہا ؎

اظہار در پیش سگ یارم آرزوست
یعنی کہ درد مندم و اظہارم آرزوست

زچشم او نرسد جز بلا بما ہرگز　　ندیدہ ہیچکس ایں چنیں بلا ہرگز

رباعی:
ہر کس کہ بہ عشق مبتلا می گردد
با محنت و درد آشنا می گردد
در دائرہ عشق ہر آں کو رہ یافت
پرکار صفت گرد بلا می گردد

۸۷۷ھ میں با ہزار حسرت اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی تاریخ "قاسم خاں ابلہ" سے نکلتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی تاریخ وفات ۸۷۹ھ ہے۔ اس کے مطابق بجائے "ابلہ" کے "جاہل" کا لفظ پورا اترتا ہے ؎

چوں تو جاہل باش از ابلہ نخوانندت مرنج
زانکہ ایں ہر دو عبارت دہ نہ یک دگر است

غربتی حصاری صاحب دیوان شاعر ہے۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہے۔ کہا کرتا تھا کہ "میں ایک دن ماوراء النہر میں سلطان الاولیاء شیخ حسین خوارزمی کی محفل سماع میں حاضر تھا اور قوال یہ رباعی گا رہے تھے:

عمریست کہ من ز پوست پوشان توام　　در دائرہ حلقہ بگوشان توام
گر بنوازی من از خروشان توام　　ور ننوازی من از خموشان توام

حضرت شیخ آخری بیت پر سر دھن رہے تھے۔ اس وقت اچانک ان کی صحبت کی برکت سے مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ میں اپنے ہوش میں نہ رہا اور میری زبان سے یہ شعر نکل گیا:

گر بنوازی مرا و گر ننوازی　　در دائرہ حلقہ بگوشان توام

یہ سن کر حضرت شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی وجد میں گھمانے لگے۔ اس وقت جو لذت نصیب ہوئی وہ میرے دل سے جاتی نہیں۔

۹۶۶ھ میں آگرہ میں شیخ فرید کے مدرسہ کے قریب انتقال کر گیا۔ اس کا یہ مطلع مشہور ہے:

دہان یار با من دوش رمزے گفت پنہانی
کہ من سرچشمۂ آبِ حیاتم ہیچ می دانی

قضاجدا از تو خونم چرا نمی ریزد   مگر ز دست قضا ایں قدر نمی آید

مختصر بود حدیثی ز لبش فہم نہ شد
خط بگرد لب او حاشیۂ مختصر است

براہ عشق تو در ہیچ منزلے نرسیدم   کہ درد عشق ترا پیشتر رسیدہ ندیدم

غیرتی شیرازی عرصہ تک ہندوستان میں رہا، پھر شیراز چلا گیا۔

بقتل غیر راضی نیم زیرا کہ می دانم
اجل زہر ہلاک از خنجر جلاد من بردہ

زنار سبحہ اے زاہد گرہ بے صدق نکشاید   بروئے چند ایں مار رشتۂ زنار گبراں کن
خوش دیار لیست سر کوئے محبت کہ شود   ہمہ با مہر بدل کینۂ افلاک آنجا
ہلاک خنجر آں قاتلم کہ خون مرا   چناں بریخت کہ یک قطرہ بر زمیں نہ چکید

فارغی شیرازی یہ شاہ فتح اللہ کا بھائی ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ ایک مرتبہ ہندوستان آیا تھا۔ بیرم خاں خانخاناں نے اس سے درخواست کی کہ "فارغی شیخ ابوالوجد خوانی کا تخلص ہے اور مجھے ان کے ساتھ بڑی عقیدت ہے، اس لیے تم اپنا تخلص فائقی رکھ لو۔" کچھ عرصہ تک تو اس نے فائقی ہی تخلص رکھا لیکن جب عراق گیا تو اپنا پہلا تخلص اختیار کر لیا۔ دوسری بار ہندوستان آیا اور یہیں پیوند خاک ہو گیا۔

اس کا لڑکا میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کا قائم مقام تھا۔ میں نے اصطرلاب کے بیس باب اسے پیش کیے تھے۔ نہایت بلند فطرت، اور باہمت آدمی تھا۔ اس کا بھائی میر شریف بھی بڑا عالم و فاضل تھا۔ میر تقی کہا کرتا تھا میرے خاندان میں ہم دو بھائی اور شاہ فتح اللہ سنی مذہب ہیں باقی سب کٹر شیعہ ہیں۔

یہ شعر میر فارغی کے ہیں:

خوش آں کہ وعدہ ات خوش حال در محنت سرائے خود
نشینم منتظر ساعت بہ ساعت سوئے در بینم

بجائی میرساند عشق آخر آشنائی ہا   کہ عاشق خویش را بیگانہ یابد از جدائی ہا
برتن خاکی مجنوں نبود داغ عیاں   کز پی قافلہ لیلی است بر ماندہ نشاں

رسید ایام عید و فکر من پیوستہ آں باشد
کہ بہر تہنیت یا رب کہ با او ہمزباں باشد

بملک دل چناں شد عام جور لشکر عشقت   کہ آں جا کاروان صبر ہرگز بار نکشاید

چنوں آں عقدہا در عشق بکشاید آسانی — کہ با صد گونہ محنت عقل دعویدار نکشاید
بشرطی فارغی در خدمت آں بت کمر بستہ — کہ تا روز قیامت از میان زنار نکشاید

درہجر ساختیم بحیات خود ائے اجل
نتواں در انتظار تو ہم بیش ازیں نشست

امام ثامن امام رضاؑ کی ثنا میں اس کے قصیدہ کا مطلع ہے:

صراف چرخ صبح کہ دکان خود کشاد
ہر خردہ کہ داشت بہ یک اشرفی نداد

فہمی طہرانی بڑا جہاں نورد سیاح تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد ولایت چلا گیا۔ موزوں طبع آدمی تھا۔

زعشق آں شعلہ خواہم در تن غم پرور افتد
کہ تا گریم ز سوزش آب در خاکسترم افتد

دل را باحتمال پیامش وہم قرار — ہر چند ایں محال میسّر نمی شود

رو مزن دم ز سوز تا دم صور
کہ جہاں جز سرائے ماتم نیست

فہمی سمرقندی یہ خوش طبع معمہ گو شاعر نادری سمرقندی کا بیٹا ہے۔ ہندوستان آیا تھا لیکن واپس چلا گیا۔

تا خاصیت مے بہ پیر مغاں گفت
از توبہ پشیماں نہ چنانم کہ تواں گفت

زموئے عنبریں چوں بر تنش پیراہن دیدم — لباس کعبہ اش بر خویش پیچیدم

فکری اصل نام سید محمد جامہ باف ہے اور میر رباعی کے نام سے مشہور ہے۔ رباعیات میں وہ اپنے زمانہ کا خیام تھا۔ جون پور کے سفر میں ۹۷۳ھ میں فوت ہوا۔ اس کی تاریخ "میر رباعی سفر نمود" سے نکالی گئی۔

رباعی: دارد فکری سری کہ سامانش نیست — دردیست بدل نہاں کہ درمانش نیست
عمریست کہ پا کردۂ زسر در رہ عشق — سر کردہ رہے کہ ہیچ پایانش نیست

اس کے اشعار بہت مشہور ہیں اس لیے چند رباعیوں اور بیت پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

اے دل اگرت یار سپاہی است مترس — کارش ہمہ جور و کینہ خواہی است مترس
در لشکر حسن او دو چشمش جنگی است — باقی خط و خال او سپاہی است مترس

چو مہر کسے کہ تیغ بر سر نگرفت — سر تا قدمش سپہر در زر نگرفت
گلبن بہ جفائے خار تا دل ننہاد — گل پیرہن چو غنچہ در بر نگرفت

فردا کہ نماند از جہاں جز خبری — ظاہر شود از بہار محشر اثری
چوں سبزہ سر از خاک بر آرند بتاں — مانیز بہ عاشقی بر آریم سری

میڑی یا زلف شبگوں وچوں شبنم ہر طرف   از تو میبارد نمک ای وای برو لہائی ریش

فنائی چغتائی کنیززادہ ہے۔ سفر بہت کیے ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہوا۔ لڑائی میں بہادری کی وجہ سے خان کا خطاب حاصل کیا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس منصب سے معزول کر دیا گیا۔ کہتا تھا تین شین یعنی شمشیر، شعر، شطرنج کوئی مجھ سے جیت کر نہ لے جا سکا۔ اس کی اس بات پر اکبر نے برجستہ کہا شیطینت کا شین بھی؟ کچھ عرصہ تک قید میں رہا تھا۔ رہائی پائی تو دیوانہ ہو گیا اور جنگلوں کی طرف نکل گیا پھر اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس کا ایک دیوان اس کی یادگار ہے۔ اس کے شعر بھی بگڑے ہوئے چغتائی میرزادوں کے رنگ میں ہیں

رسد ہر کس بمقصودی زیارب یا رب شبہا   چرا مقصود من حاصل نشد یارب زیارب ہا

اس کا ایک مطلع مجھے پچاس سال سے برابر یاد ہے۔ تاریخ نظامی میں بھی لکھا ہوا دیکھا:

نگویم بہر تشریف قدومت خانۂ دارم
غریبم خاکسارم گوشۂ ویرانۂ دارم

تا گل روئی تو از بادۂ گلگام شگفت   بادہ از عکس گل روئی تو در جام شگفت

فسونی یزدی سید اور قصہ گو ہے۔ شعر سے مناسبت رکھتا ہے۔ ٹھٹھ سے آکر شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا۔

بے جہت از پیش ما جستی گذر کردن چہ بود   گر گذر افتاد سوئی او نظر کردن چہ بود
در سخن بودی بغیر از دور چوں دیدی مرا   گر حجاب از من نہ کردی مختصر کردن چہ بود
چوں شدم حاضر کہ با اغیار میگوئی سخن   کردی او را غافل و دیدی نہانی سوئی من
کرد تعظیم فسونی بغریب و گراں   ورنہ آں بے سرو پا لائق تعظیم نبود
بعد از ہزار وعدہ کہ یک بار رخ نمود   آں ہم زبیم غیر زمانی نمود و رفت
کشتۂ غمزۂ جاناں نتہد چشم بہم   دم آخر شدہ حیران برخ قاتل خویش

فیروزہ کابلی میرزا محمد حکیم کا خانہ زاد ہے۔ اس کا تعلق سنگا قبیلہ سے ہے، غالباً ہندوستان کے جنگلوں میں فوج کے ہاتھ آگیا اور ہمایوں بادشاہ کی ملازمت میں رہا اور میرزا محمد حکیم کے ساتھ پرورش پائی۔ نہ تو پڑھا لکھا ہے نہ اس کا خط ہی اچھا ہے، البتہ موسیقی میں دخل رکھتا ہے اور طنبورہ کو ایک خاص انداز میں بجاتا ہے۔ پٹنہ کے سفر سے واپسی کے وقت قاضی خاں بدخشی کے ہمراہ جون پور سے آکر شاہی ملازمت اختیار کی۔ علم تو اسے نصیب نہ ہوا لیکن اس کے اشعار اثر و شوخی سے خالی نہیں ہیں۔

غیر منظور نظر ساختۂ یعنے چہ   بندہ را از نظر انداختۂ یعنے چہ
کس ندیدیم بدور تو بایں حسن و جمال   قیمت حسن بر انداختۂ یعنے چہ
علاج ایں تن بیمار چیست جز مردن   بروئے طبیب کمن رنج خویشتن ضائع

سنا ہے کہ اب وہ اکثر متقدمین و متاخرین کے دیوان کے جواب کہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

فہمی الہ آبادی | بڑا مستعد آدمی تھا، دہلی میں فوت ہوا۔

رباعی

اے روئے تو در عرق گل آب زدہ — زلف تو در و بنفشہ تاب زدہ
چشماں تو چوں دوست در یک بالیں — سر بر سر ہم نہادۂ و خواب زدہ
ندیں زمانہ فراغت فسانۂ شدہ است — کجا روم چکنم بد زمانۂ شدہ است
جاں طلب اہل وفا راز جفا کردن تست — تیغ بردار کہ خون ہمہ در گردن تست

ملک الشعراء شیخ فیضی | مختلف فنون شعر معما گوئی عروض و قافیہ تاریخ لغت طب اور انشاء میں بے مثل شخص گزرا ہے۔ پہلے پہل اس نے اپنا تخلص مشہور رکھا تھا۔ لیکن اس کے چھوٹے بھائی کو (ابوالفضل) علامی کا خطاب ملا تو اس نے بھی اپنی شان بڑھانے کے لیے اسی وزن پر فیاضی تخلص رکھ لیا، لیکن یہ تخلص ساز گار نہ ہوا۔ ایک دو ماہ بعد ہی دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ فیضی بڑا جدت پسند ہزل گو متکبر مغرور تھا۔ نفاق، خباثت، ریاکاری، حب جاہ اور رعونت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مسلمانوں سے تو اسے دلی عناد تھا۔ اصول دین کی اہانت کرتا رہتا تھا۔ صحابہ کرام متقدمین اور متاخرین اہل علم اور مشائخین زندہ یا مرحوم ہر ایک کی مذمت اور بے ادبی کرنے میں اسے پاک نہیں ہوتا تھا۔ تمام علماء صلحاء اور فضلاء کی رات دن توہین کرتا رہتا تھا۔ اس سے تو یہودی نصرانی ہندو اور مجوسی لاکھ درجہ بہتر تھے۔ ایسا بدعقیدہ تھا کہ تمام حرام باتوں کو شریعت کی ضد میں حلال اور فرائض کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے جو بے نقط تفسیر لکھی تھی وہ بھی بس اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے تھی۔ کم بخت نے تفسیر بھی مستی اور ناپاکی کی حالت ہی میں لکھی۔ اس کے پالے ہوئے کتے بھی اس کے مسودوں کو ناپاک کرتے رہے۔ اس کا عیب و غرور، ہٹ دھرمی اور بے دینی دھری کی دھری رہ گئی اور اسے اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہونا پڑا کہ خدا نہ کسی کو دکھائے نہ سنوائے۔

جس وقت بادشاہ اس کے آخری دم پر پہنچے تو اُن کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگا۔ یہ بات خود بادشاہ نے اس کے دیوان پر لکھی ہے۔ مرتے وقت اس کا چہرہ سوج گیا تھا اور لب سیاہ پڑ گئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا اس کے لبوں پر اس قدر سیاہی کیوں ہے؟ کیا شیخ نے اپنے ہونٹوں پر مسی لگائی ہوئی ہے؟ ابوالفضل نے کہا "نہیں یہ خون جم گیا ہے جو تھے میں نکلا تھا۔ اس ناپاک بدبخت اور حضور اکرمؐ پر طعنے کرنے والے کا ایسا ہی حشر ہونا چاہیے تھا اور یہ بھی کم تھا" اس کی مذمت میں لوگوں نے بہت سی تاریخیں کہی ہیں۔

فیضیٔ بیدین چو مرد سال وفاتش — گفت سگے از جہاں رفتہ بحال قبیح

ایک اور تاریخ ہے:

سال تاریخ فیضیٔ مردار — شد مقرر بچار مذہب نار

کسی اور نے کہا:

فیضیؔ نجس دشمن نبوی
رفت و با خویش داغ لعنت برد
سگکی بود و دوزخی زاں شد
سال فوتش چو سگ پرستی مرد

اسی طرح: —"قاعدہ الحاد شکست" "بود فیضی ملحدی" اور

چوں بنا چار رفت شد ناچار
سال تاریخ "خالد فی النار"

پورے چالیس سال تک شعر کہتا رہا لیکن اس کے سب شعر بس عجیب ہی ہیں۔ ہڈیاں خوب جمع کیں مگر مغز کسی میں نہیں ملتا۔ سارے شعر بے مزہ ہیں، البتہ مہمل باتوں کے بیان کرنے، فخر و شان دکھانے اور کفر بکنے میں سب سے آگے تھا۔ اس کے کلام میں نہ تو ذوق عشق کا پتہ چلتا ہے نہ معرفت ملتی ہے اور نہ درد کی لذت، حالانکہ اس کے دیوان اور مثنویوں میں بیس ہزار سے زاید ہی شعر ہوں گے۔ اس کے کسی شعر نے کبھی کسی کی افسردہ دلی دور نہیں کی اور اس کی بدبختی کہ اس کا کوئی شعر کسی نے خواہش سے پڑھا نہ یاد کیا۔ اس سے تو معمولی اور ادنیٰ شاعر زیادہ خوش نصیب رہے ؎

شعرے کہ بود ز نکتہ سادہ
ماند ہمہ عمر بیک سوادہ

لطف یہ کہ اپنی جاگیر کا سارا روپیہ اپنے جھوٹے خیالات کی تشہیر میں صرف کرتا رہتا تھا۔ اشعار اور تحریریں لکھوا لکھوا کر دور و نزدیک کے شناساؤں کو بھیجتا رہتا تھا، لیکن کوئی شخص دوبارہ ان کو چھونے کا بھی روادار نہیں ہوتا تھا ؎

شعر تو مگر از حرمت ستر آموخت
کز گوشۂ خانہ میل بیروں کند

اس کے خود منتخب کردہ شعر جو بطور یادگار اس نے لکھ کر میرزا نظام الدین وغیرہ کو دیے تھے۔ ان میں سے چند شعر یہ ہیں:

مژگاں مبند چوں قدم از دیدہ میکشی
مرداں رہ برہنہ نہادند پائے را

چہ دست می بری ای تیغ عشق اگر داد است
ببر زباں ملامت گر زلیخا را

نظر فیض چو بر خاک نشیناں نگنیم
مور را مغز سلیماں رسد از قسمت ما

مشکل کہ سیل دیدہ بگردش در آورد
طوفان نوح می طلبد آسیائی تو

کعبہ را ویراں مکن اے عشق کانجا یک نفس
گہ گہی بس ماندگان عشق منزل می کنند

اے عشق رخصت است کہ از دوش آسماں
بردوش خود نہم علم کبریائی تو

تا چند دل بہ عشوۂ خوباں گرو کنم
ایں دل بسوزم و دل دیگر ز نو کنم

فیضی کنم تہی و رہ عاشقی بہ پیش
دیوان خود مگر بدو عالم گرو کنم

ایک قصیدۂ فخریہ کہا تھا اس پر بڑا ناز کرتا تھا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

شکر خدا کہ عشق بتاں است رہبرم — در ملت برہمن و در دین آذرم

دریں دیار گروہی شکر دہاں ہستند — کہ مادہ یاتمک آمیختند و بدستند

ع: خود گو مزہ در کجائی ایں ست

"مخزن خیال" کی زمین میں ایک مثنوی "مرکز ادوار" لکھی تھی اس کے چند شعر ہیں:

تا بچہ دو ویژہ بریں در شدم — تا بدل و دست تو انگہ شدم

کم طلبیدم گہرم بیش رفت — پس بہ نشستم قدمم پیش رفت

مثنوی میں خیالی سلیمان و بلقیس کا یوں ذکر ہے:

دگر رفتم بگذارم مقابل — شگاف خامہ را با روزن دل

ازاں روزن بایں روزن در آید — خود آں نوری کہ جاں را رہبر آید

اگرچہ رفت ازیں دیوان بیداد — سلیمان سخن را تخت بر باد

بمن آمد یکے تدبیر کردن — بافسون دیو را زنجیر کردن

بہ تخت معنی از سرمایہ بستن — ز گنج خود بپرداید بستن

اسم قادری پر معما کہا ہے:

زداغ عشق بگذارم نشانہ
چو در دل یادگار است و یگانہ

جس زمانہ میں وہ سفارت پر دکن گیا ہوا تھا تو اسے کشمیر سے میرے دو خط وصول ہوئے جن سے اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے مجھے کورنش سے محروم کر دیا ہے۔ وہاں سے اس نے جب بادشاہ کو عریضہ لکھا تو میرے لیے سفارش بھی تحریر کی۔ بادشاہ نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اس خط کو اکبرنامہ میں شامل کر لو۔ اس کی نقل یہ ہے:

"عالم پناہ! انہی دنوں ملا عبدالقادر کے دو عزیز بداؤں سے نہایت پریشان حال آئے اور بتلایا کہ ملا عبدالقادر کچھ عرصہ تک سخت بیمار رہا اور اپنے وعدہ پر دربار میں نہیں پہنچ سکا، اسے بادشاہی آدمی زبردستی پکڑ لے گئے ہیں، معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے مرض کی طوالت کی حضور کو خبر نہیں پہنچ سکی۔"

شکستہ نواز:۔ ملا عبدالقادر قابل شخص ہے اور وہ تمام علوم جو ہندوستان کے عالم پڑھتے رہے ہیں حاصل کر چکا ہے اور میرے والد کا شاگرد ہے۔ تقریباً ۳۷ سال سے میں اسے جانتا ہوں۔ علمی فضیلت کے علاوہ شعر گوئی، عربی فارسی انشاء اور کچھ ہندی نجوم اور حساب کتاب سے بھی بخوبی واقف ہے۔ ولایتی اور ہندی موسیقی

اور چھوٹی بڑی شطرنج بھی جانتا ہے۔ ان فضائل سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نہایت بے طمع قانع راست پسند باادب آدمی ہے۔ بڑا ہی شکستہ دل اور پریشان حال ہے۔ اکثر مقلدانہ رسوم کو ترک کر چکا ہے۔ آزاد منش اور درگاہ والا کا عقیدت مند اور مخلص ہے۔ جس وقت کہ کوہ کمبیر پر لشکر کشی کی گئی تھی اس نے خود درخواست کر کے جاں نثاری کی خاطر محاذ پر جانا قبول کیا تھا وہاں زخمی بھی ہو گیا تھا اور حضور سے انعام بھی پایا تھا۔ پہلی بار جلال خاں تورچی نے دربار میں اس کی تعریف کی تھی اور عرض کیا تھا کہ میں حضور کے لیے ایک امام لے کر آیا ہوں جس کی امامت حضور کو پسند آئے گی۔ میر فتح اللہ نے بھی اس کا کچھ حال حضور سے بیان کیا تھا۔ میرا بھائی بھی اس کے حالات سے واقف ہے لیکن مشہور ہے ع

جوئی طالع از خروار ہنر بہ

میں نے اس وقت خود کو حضور کی بارگاہ میں موجود سمجھتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جرأت کی اس وقت جب کہ مجھ پر ضعف کا غلبہ ہے۔ اگر میں اس کے بارے میں عرض نہ کرتا تو یہ بڑی نامناسب بات ہوتی۔ اللہ تعالیٰ بندگان دربار کو حضور بادشاہ سلامت کے زیر سایہ راستی حق گزاری اور حقیقت شناسی پر ثابت قدم رکھے اور حضور والا کو دنیا اور اہل دنیا پر سایہ گستر، غریب پرور، عطا پاش، خطا پوش تا دیر سلامت رکھے۔ آمین۔"

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس نے تو ایسی محبت اور خلوص کا ثبوت دیا اس کے خلاف یہ مذمت اور غیرت مروت اور وفا کے خلاف ہے۔ خاص طور سے اس کے مرنے کے بعد اس بُرے انداز میں اس کا ذکر کرنا بڑی زیادتی اور بے مروّتی ہے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن دین کی حفاظت اور حق سارے حقوق سے بالاتر ہے۔ ہماری ساری دوستی اور دشمنی تو صرف اللہ کے لیے ہے چنانچہ اس کے ساتھ چالیس سال تک دوستی رہی لیکن جب اس کے طور طریق اور مزاج بدل گیا تو دوستی دشمنی میں بدل گئی اور ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ہم تو سارا معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں، وہی صحیح فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کے متروکہ میں چار ہزار چھ سو مجلد نفیس تصحیح کردہ کتابیں تھیں جن میں اکثر کتابیں تو خود مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ ساری کتابیں شاہی سرکار میں داخل کر دی گئیں۔ جس وقت یہ کتابیں ملاحظہ میں پیش کی جا رہی تھیں تو ذخیرہ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ نظم، طب، نجوم اور موسیقی کو اعلیٰ درجہ دیا گیا اور حکمت، تصوف، ہیئات، ہندسہ کو اوسط درجہ۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور شرعی علوم کو ادنیٰ درجہ میں رکھا گیا۔ ایک سو ایک نسخے تو نل دمن کتاب کے تھے۔ دوسروں کا شمار کہاں تک ہوتا۔

؎۱ مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ فیضی فیاضی نے ایک سو ایک کتابیں لکھی تھیں۔

موت سے پہلے اس نے حضور اکرمؐ کی معراج اور نعت میں چند شعر کہے اور نل دمن میں درج کر دیئے تھے وہ بھی لوگوں کے بڑے اصرار اور کہنے سننے کے بعد اس کتاب کے خاتمہ کے چند شعر یہ ہیں:

شہنشاہا خرد پژوہا　　دریا گہرا فلک شکوہا
بزمی ست جہاں بعیش پیوست　　دور تو شراب و آسماں مست
می مطرب پردہائے خونی　　کلکم بنوائے ارغنونی
ایں بزم کہ عشرت تو ساقی است　　گر می بدوم ترانہ باقی است
سازند سبو کشاں فسانہ　　مطرب نہ و بزم پُر ترانہ
امروز بایں نوائے چو شہد　　من بار بدم تو خسرو عہد
ایں خامہ کہ کردہ ام فلک سائی　　پیش تو ستادہ ام بیک پائی
ترکیب طلسم خوانیم بیں　　دیں خدمت جاودانیم بیں
ایں نالہ کہ عشق بہ زباں برد　　طغرائی ترا بآسماں برد
من بادۂ مست کار ہوشم　　عیبم نبود اگر بجوشم
از قافلہ ات منم درائے　　معذورم اگر کنم صدائے
ایں دیدہ بہائی دست کارم　　کز دادۂ ایزدی شمارم
عہد بلبل مست نغمہ گر خاست　　کز ہند گل عراق برخاست
پیراستہ ام معانی بکر　　در گنجۂ طبع و دہلی فکر
زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود　　فیضی رقم نگین من بود
اکنوں کہ شدم بہ عشق مرتاض　　فیاضیم از محیط فیاض
در دور تو خسرو یگانہ　　چیدم گل بخت از زمانہ
بزعم ز نسیم طبع گل خیز　　جامم ز مئے نشاط لب ریز
می خندہ فلکن چو جام بادہ　　ساقی چو صراحی ایستادہ
از ہم من و بخت جرعہ کش تر　　روزم خوش و روزگار خوش تر
چوں دور تو گشت باغبانم　　بالید نہال ضمیر اتم
ایں چار ہزار گوہر نایاب　　کاں گنجینہ ام بآتشیں آب
بپذیر کہ آب گوہر تست　　از بہر نثار افسر تست
گر بیشتر ست نثار کردم　　بے کسر دو نیمہ کردم
زیں بحر کہ سر باوج جوشد　　گوہر ہمہ موج موج جوشد

زیں سان بفنون نکتہ درزی
بہ نشست سخن بہنگ طرزی

ہر نکتہ کہ خامہ بار بستش
آورد و قلم ز دور دستش

خارم ز قلم بر غیب راہی
کوہی بہ نہفتہ زیر کاہی

نسخی است بخون دل طرازش
لبریز حقیقت از مجازش

بہر کوہش اگر کنند ایں ساز
در رنگ رواں بر قصد آواز

پیچیدم ازیں دم سبک سیر
زنار برہمناں نہ دیر

فکرم کہ بود معانی انگیز
بحریست ز آب خود گہر خیز

ایں خط کہ دہد بنور مایہ
از کلک من ست نیم سایہ

پر معنی ازو چو آب در جوئے
ہر نکتہ درو چو تاب در موئے

ایں در کہ تو اندش بہا داد
کاقبال دو کون رونما داد

دید ایں بت کارگاہ آذر
پیراستگی بماہ آذر

سی و نہم از جلوس شاہی
تاریخ بعددِ الٰہی

چوں سال حرب شمار کردم
الف و سہ الف نگار کردم

فارسی شریف نام ہے۔ خواجہ عبد الصمد مصوّر کا بیٹا ہے۔ خوبرو نوجوان ہے۔ خوش خطی اور مصوّری میں بے مثل مہارت رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کے باپ نے خشخش کے ایک دانہ کے ایک طرف تو پوری سورۂ اخلاص جو پڑھی جا سکتی تھی لکھی اور دوسری طرف کوئی مقولہ لکھا۔ اس کے بیٹے شریف کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے خشخش کے ایک دانہ میں آٹھ باریک سوراخ کر کے تار پرو دیے اور چاول کے ایک دانہ پر ایک مسلح سوار کی تصویر بنائی جس کے سامنے محافظ اور دوسرے سارے لوازمات تلوار سپر چوگان وغیرہ نقش تھے۔ شریف بڑے اچھے ذوق کا مالک ہے۔ صاحبِ دیوان ہے۔ یہ اشعار اس نے خود انتخاب کر کے مجھے دیے تھے:

مرا بنالہ درآمد شب رواں غمت
کہ از اشعۂ آں نور طے راہ کنند

کرم تراست و لیکن تمام جرمم می
مرا چو عفو نمائی ہمہ گناہ کنند

شرر نالہ لبِ غربال ادب می بیزم
کہ بگوش تو مبادا رسد آواز درشت

زمین عشق بکونین صلح کل کردیم
تو خصم گرد ز ما دوستی تماشا کن

فضائی سینہ ام از دوستی چناں پر شد
کہ با کمال طلب ذرۂ نیفزاید

توفیق در طریقت ما پائے مرد نیست
ما دوست را بحالت دیگر شناختیم

غمے دارم کہ شادی ہا فدائش
ز چشم بد نگہ دارد خدائش

چو دل بر آتشم پروانگی کرد
تو گل ہم باد بیگانگی کرد

دل اگر پرد خدایا بشناش برساں — ہجراں کہ بخون دل آمیختہ بود
ز طبع خود چہ سرائیم زعقل دم چہ زنم — بعلتی کہ کرامم دلیل بطلانم
ای خرد دست تہی تا چند در بازار عشق — قیمت ہر جنس پرسی خجلت از کالا بری

رباعی

عشقی دارم کہ دین و ایمان من است — دردی دارم کہ میر سامان من است
گر عشق جدا شود ز من می میرد — گوید کہ شریف فارسی جان من است

بصد رحسن ز دل داشتن چناں عجب است
کہ چوں ہلال نمایندش اندکی دیدار

جنس کساد شکر را نرخ ازاں بلند شد — کہ طرف دیار غم قافلہ نیرسد

ایں دل کہ ربودہ میندا ز
گنجی ببر از گراں نماید

صبا بہ عشق بگو ہمتی کہ بار فتیم — دگر بگوی تو از آب دیدہ گل نشود

ز رشک عشق خموشم نہ از تکبر عشق
کہ جز حدیث تو ام بر زباں نمی آید

قراری گیلانی

یہ مولانا عبدالرزاق کا بیٹا اور حکیم ابوالفتح اور حکیم ہمام کا حقیقی بھائی ہے۔ صاحب علم، خوشنویس اور شعر گوئی سے واقف تھا۔ نہایت درویش صفت اور منکسر مزاج آدمی تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔ جب دربار میں اپنے بھائیوں کے ساتھ تسلیمات کے لیے حاضر ہوا تو چونکہ اس کو تلوار باندھنی نہ آتی تھی اس لیے نہایت بے ڈھنگے پن سے سب کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ اسے دربار کے بعض ظریف حیرت سے دیکھنے لگے تو اس نے کہا ہم لوگ فن سپاہ گری سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس نے امیر تیمور کا قصہ بھی بیان کیا کہ امیر نے ایک جنگ میں لشکر کے ٹھیرنے کے لیے کسی مقام کا تعین کیا کہ بار بردار اونٹ پیدل سپاہی تمام سواریاں مال اسباب کے ساتھ فوجوں کی صفوں کی پناہ میں اور خواتین لشکر کے پیچھے ٹھہریں۔ اس دوران میں عمامہ پوش (علماء وغیرہ) گروہ نے پوچھا کہ ہم کہاں ٹھہریں تو تیمور نے کہا بیگمات کے عقب میں۔ اس کی یہ بات لوگوں نے بادشاہ تک پہنچادی۔ اس لیے بادشاہ نے اسے بنگالہ جانے کا حکم دے دیا اور وہ وہاں مظفر خاں کے ہنگاموں میں مارا گیا۔ یہ اشعار اس کے نتیجۂ فکر کا ثبوت ہیں:

چہ باک گر ہمہ عالم شوند لیلیٰ دوست
کہ میل خاطر لیلیٰ بسوئے مجنوں است

از پی رنج من فلک طبع خلیل میدہد — لقمۂ آتش ار کنم بخت سیہ گلیم را

چہ تہمت بر اجل بندم زچشمت خوردہ ام تیرے — کہ آنم می کشد گر بعد عمد سال دگر میرم
روشن شدم ز آتش عشقت بسان شمع — ہم بر مزار خویش غریبانہ سوختم
موجزن شد بحر آتش از دل سوزان ما — نوح گو بگریز کآتش بار شد طوفان ما

دردم ایں است کہ ہر چند مرا جور کنی
لذت جور تو نایافتہ از دل برود

ز آزارش دل افگار را افگارئی خواہم — بلطف او مقید نیستم آزار می خواہم
ز دردِ ہجر بے خود بودہ ام اے دوست تا حالا — دمے ہم بیخودی از لذت دیدار می خواہم

مبادا دل شود از دیدن دیدار مستغنی
کہ مابسیار بے جرمیم و او بسیار مستغنی

از امتداد ہجراں شادم کہ میتواں کرد — بیگانہ وار یادی آغاز آشنائی

رباعی:-
در دیگِ غضب اگر بجوشانندم
در شعلۂ دوزخ از گذرانندم
بہتر کہ ز روئے لطف بخشد گناہ
وز آتش انفعال سوزانندم

رباعی:- گر عشق دل مرا خریدار افتد — کارِ بکنم کہ پردہ از کار افتد
سجادۂ پرہیز چناں افشانم — کز ہر تارش ہزار زنار افتد
گر حسرت وصال تو از دل بدر کنم
بہ کز وصال حسرت دل بیشتر کنم

قومی یہ خان کلاں کی خدمت میں رہتا تھا۔ خلال کنگھا اور اس جیسی چیزیں بنانے میں بڑا ماہر تھا۔ ایک خلال کے اوپر اس نے اپنا یہ شعر بڑی خوش خطی کے ساتھ لکھا تھا:

کار قومی در ہم از زنجیر زلف یار اوست
ہم چو زلف یار دائم عقدہ گرہ در کار اوست

قیدی شیرازی مکہ معظمہ سے آکر شاہی ملازمت میں داخل ہوا اور بہت جلد مقربین شاہی میں شمار کیا جانے لگا۔ ایک دن محفل میں یہ کہہ دیا کہ حضور نے یہ جو داغ و محلی کا قانون نافذ کیا ہے اس سے لوگ بہت تنگ آگئے ہیں۔ پس اُس دن سے راندۂ درگاہ ہوگیا اور پھر اسے وہ تقرب حاصل نہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک بیانہ کے جنگل میں قلندرانہ وضع میں پھرتا رہا اور فتح پور آیا تو بواسیر و دق میں مبتلا ہوگیا۔ ایک اناڑی طبیب نے اس کی مقعد کی رگ کاٹ دی۔ پس اس کا رشتۂ حیات منقطع ہوگیا۔ نہایت خوش طبع شاعر تھا۔

متاع شکوہ بسیار است عاشق را بہمان بہتر — کہ جز در روز بازار قیامت باز نکشاید
اے قدم ننہادہ ہرگز از دل تنگم بروں — حیرتے دارم کہ چوں در ہر دلے جا کردۂ
گو بمیرم من و غیرے بود اعش نرسد — ساربان گرم حدی باشی کہ محمل بردد
کدام مرہم لطف از تو بر دل است مرا
کہ جاں گداز تر از داغہائے حسرت نیست

قدری موزوں طبع شاعر تھا۔

چنداں اماں نمید ہدم بے خودی کہ جاں
داند کہ چوں بر آید و قربان او شود

قندی بیرم خاں کے عہد میں ماوراء النہر سے آگرہ آیا اور حصول علم میں مشغول تھا۔ اس کی صرف یہی ایک غزل نظر سے گزری ہے:

صومعۂ طاعتم گوشۂ میخانہ شد — سبحۂ درویشیم نعرۂ مستانہ شد
خرقۂ زہد و صلاح در گرد بادہ رفت — غلغل تسبیح و ذکر قلقل پیمانہ شد
قندیٔ بے خانماں سوئے حرم می شتافت — زد مغنے راہ او جانب بتخانہ شد

کامی یہ میر علاء الدولہ مصنف تذکرہ شعراء کا تخلص ہے جو اس انتخاب کا ماخذ ہے۔ اس کے حالات اور اشعار کا ذکر تفصیل حاصل ہے۔ مجھے شعر شناسی اور شعروں کے انتخاب کا اتنا سلیقہ نہیں ہے، اپنے عیوب سے خوب واقف ہوں اس لیے کسی اور کی بُرائی کیا کروں!

کلاہی علوم و فنون سے بہرہ ور تھا۔ اس کا لقب افضل خاں تھا۔ دکن سے ہندوستان آیا۔ شرعی حاکموں میں شامل کر لیا گیا۔ جب ملا عبداللہ لاہوری کے فتوے پر میرزا مقیم اور میر جبش کو رفض کے الزام میں سزا دی گئی تھی تو وہ ڈر کر دکن چلا گیا اور وہیں انتقال کیا۔

ز عشق جز بدل خویشتن نگویم راز — کہ دل سخن شنود از من و نگوید باز
سر بپائے تو نہادم سر گراں از من گذشت — چوں گرفتم دامنش دامن کشاں از من گذشت
تا کئی رقیب ازاں دو ماہ سفر نبندد — بندد کمر بہ کینم یارب کمر نہ بندد
ہر گہ آید بجدل تو عدو خود بفرق — بر سر خود چو شمشیر زنی وقت جدل
می شگافد چوں قلم جدول عدو از سرخی خوں — میکشد غنچۂ میدان جدل را جدول

کلامی چغتائی نسل سے تھا۔ ملا نیازی سے ہمیشہ مباحثہ اور مجادلہ ہوتا رہتا تھا۔ بکھر سے آیا تو کچھ عرصہ آگرہ میں مقیم رہا۔ اس کے اشعار ماوراء النہر کے رنگ میں ہیں۔

بستم بخیال سر زلفت رہ گریہ — لیکن نتواں آب بزنجیر نگہداشت

رخ تو چشمۂ مہر است و قطرہ ہائے عرق حباب وار بروہر طرف نمایاں است
بہ غنچۂ دل پر خون من نظارہ کنید کہ چاک چاک شد از تیغ یار و خنداں است
نشین بچشم کلامی ز روے لطف دمے
کہ گوشہ ایست مصفا و آب در نظر است

کامی قمی

نو رسیدہ جوان ہے۔ حال ہی میں ہندوستان آیا ہے۔ اس کا کلام شوخی و لطافت سے خالی نہیں

ہمہ تن خوں شوم ز دیدہ چسکم
گر بدانم کہ گریہ را اثر است

لقائی استرآبادی

عالم و فاضل ہے۔ کچھ عرصہ تک خان زماں کے ساتھ رہا تھا۔ اس کا شعر ہے:

بر زبانم حرف تیغ دلستاں من گذشت
خیر باشد طور حرفی بر زبان من گذشت

لوائی

سبزوار کا پیر زادہ تھا، عرصہ تک دربار میں رہا۔ باذوق اور پر لطف شاعر تھا:

از پے نظارہ چوں اغیار آید سوئے تو درمیاں حائل شوم شاید نہ بینند روئے تو
در مشیں غیر از آں نکنم گفتگوئے تو تا جائے در دلش نکند آرزوئے تو
اہل ہوس ز شوق چو نام بتاں برند ترسم کہ نام او بہ غلط درمیاں برند

۹۹۵ھ میں لاہور میں آندھی سے ایک دیوار اس پر گر پڑی اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ اچھا موسیقار اور مغنی تھا اس لیے اس کی تاریخ وفات نکالی گئی۔

فغاں کہ قسمت چرخ جفا کیش خوش الحان بلبلے از بوستان رفت
چناں سنگی بر کمر زد کز آں مجروح گشت و از میان رفت
ز پیر عقل جستم سال فوتش
بگفتا پیر زادہ از جہاں رفت

لعلی

میرزا لعل بیگ ولد شاہ قلی سلطان بدخشی کا تخلص ہے۔ یہ بڑا شریف نوجوان ہے۔ حسن صورت اور حسن سیرت، ادب، تواضع، اخلاق، حیا اور نرمی میں بہت مشہور ہے۔ شاہی مقربوں میں شامل ہے۔ حال ہی میں بادشاہ کا فرمان دکن گیا ہے کہ وہ سلطان مراد کے ہاں سے لاہور آ جائے۔ علم تاریخ اور سیرت پر اس کی بڑی اچھی نظر ہے۔ میری اس کے ساتھ بڑی دوستی اور تعلقات ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔ اس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

بر رہگذار تو چوں خاک رہ شدم ترسم
کہ بگذرے بمن و بگذرے براہ دگر

لطفی منجم بادشاہ کا مصاحب تھا مگر بڑا نیک آدمی تھا۔ اسے اساتذہ کے شعر بہت یاد تھے۔ کسی بھی موضوع پر وہ رات بھر میں ایک ہزار شعر سنا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہا اور ان کی مدد سے زادِ راہ حاصل کر کے سفر پر چلا گیا۔

گلگل از تاب شراب آں روئے چوں گلنار شد
گلفروشاں مژدہ تاں بادا کہ گل بسیار شد

دلم گر شعلۂ آتش شود افسردگی دارد — گل بختم گر از جنت دود پژمردگی دارد

ہر آہ کہ در حسرت بالائے تو کردم
نخل چمن آرائی پشیمانی من شد

میر مرتضیٰ شریفی شیرازی یہ میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں۔ ریاضی، حکمت، منطق، کلام اور دوسرے علوم میں تمام علمائے زمانہ سے لائق و فائق تھے۔ شیراز سے مکہ معظمہ جا کر ابن حجر سے علم حدیث کا درس لیا تھا اور تدریس کی اجازت حاصل کی تھی۔ وہاں سے دکن اور دکن سے آگرہ آئے اور قدیم و جدید بیشتر علماء سے آگے بڑھ گئے۔ پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے تھے۔ سنہ ۹۷۴ھ میں انتقال کیا۔ انھیں امیر خسروؒ کے قریب دفن کیا گیا۔ میر محسن رضوی نے یہ تاریخ پائی۔

رفت تا میر مرتضیٰ از دہر — علم گویا ز نسل آدم رفت
بہر تاریخ رفتنش محسن — گفت علامۂ ز عالم رفت

یہ شعر ان کی یادگار ہے:

خاطر جمع ز اسباب میسر نہ شد
تخم جمعیت دل تفرقۂ اسباب است

یہ شعر غالباً "وائح" کی اس عبارت سے ماخوذ ہے: "ایک گروہ نے خیال کیا کہ اطمینان اسباب کے جمع کرنے میں ہے اور یہ لوگ ابدی تفرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ ایک گروہ کا یہ یقین تھا کہ اسباب کو جمع کرنا تفرقہ کا باعث ہے اور انھوں نے ساری چیزوں سے ہاتھ اٹھا لیا۔

محوی یہ میر محمود منشی کا تخلص ہے جو تقریباً ۲۵ سال ممالک محروسہ ہندوستان کا منشی رہا۔ نقیب خاں اس کا داماد ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا۔ منشیانہ اشعار کہتا تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے جو بیرم خاں کے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہوئی ہے۔

از کون و مکان نخست آثار نبود — کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود
آمد چو ہمیں دو حرف مفتاح وجود — شد مطلع دیباچۂ دیوان شہود

اسم قاسم کا معما کہا ہے:

شوخی کہ بود خاک درش منزل من　　جز جور و جفا نیست از و حاصل من
از گوشۂ ایام چوں رخش را بینم　　چشمش فگند تیر جفا بر دل من
از مشک ناب غالیہ بر یاسمیں مکش
بر گرد آفتاب خطِ عنبریں مکش

غزنی نے یہ رباعی ہمایوں بادشاہ کے عطا کردہ گھوڑے کی تعریف میں کہی تھی :

اے خسرو جم سپاہ عالی مقدار　　دارم اسپی کہ ہست بس لاغر و زار
بروے چو شوم سوار در ہر دو سہ گام　　افتد کہ تو ہم یک دو سہ گامے بردار

اس رباعی کا ماخذ ایک مشہور شعر ہے ؎

میرود یک دو گام و میگوید　　کہ تو ہم ساعتے مرا بردار

اس کے اُستاد کا شعر ہے ؎

اے بت سنگیں دل سیمیں بدن
ولے لب تو راحت و غمزہ بلا

اسی زمین میں اس کی غزل ہے :

اے رخ زیبائی تو رشک سمن　　قامت رعنائی تو سرو چمن
پستۂ خنداں تو تنگ شکر　　رستہ دنداں تو دُر عدن
کاکل مشکیں تو دارم بلا　　نرگس فتان تو عین فتن
آہوئے چشمان تو مردم شکار　　غمزۂ خوں ریز تو ناوک فگن
کار دو زلفت ہمہ جادو گری　　شیوۂ چشمت ہمہ خوں ریختن
میکشد از مشک خط جاں فزائی　　سبزۂ نو خیز تو بر یاسمن
جانب محوی نگہ از روئے لطف
اے بت سنگیں دل سیمیں بدن

شیخ فیضی نے بھی اپنے لڑکپن اور ایام جاہلیت میں اسی صنعت پر ایک غزل چار بحروں میں کہی تھی۔

اے قد نیکوئی تو سروِ رواں　　ولے خم ابروئے تو شکل کماں
حلقۂ گیسوئے تو دام جنوں　　طرۂ ہندوے تو کام جناں
ہم لب جادوے تو آب حیات　　ہم خط دلجوئی تو خضر زماں
آہ ز آہوئے تو عین بلا　　کشتۂ آہوئے تو شیر ژیاں
بستۂ گیسوئے تو فیضیٔ زار　　خستۂ ہندوے تو خلق جہاں

اس انتخاب کی تصنیف کے دنوں میں فیضی نے ایک دن میرے ہاتھ میں میر علاء الدولہ کا تذکرہ دیکھ کر لے لیا اور اس ورق کو جس میں اس کا ذکر تھا پھاڑ ڈالا۔

میں نے بھی کہ ان دنوں ان خام خیالیوں سے تائب نہیں تھا چار بحروں میں ایک مطلع کہا تھا۔ اب یہ حشویات قابل ذکر نہیں، خدا معاف فرمائے۔

میر محسن رضوی مشہدی کبھی کبھی شعر کہتا ہے۔ میر محمود منشی کے انداز کا آدمی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی۔

نخواہم مہرباں با خویشتن در پیش اغیارش
کہ می ترسم کہ غیرے بیند و گردد گرفتارش

دل برد ز من سروقدی غنچہ دہانی   رسوائی جہاں ساخت مرا تازہ جوانی

اے نہال قامتت خرم ز آب زندگی
سرو را در پیش بالایت بسے شرمندگی

اس شعر میں بجائے خرم کے شاداب زیادہ اچھا ہوتا۔

یہ اسم روح پر معما کہا ہے:

اے زلف کجت رہزن جانہا ز عتاب
دلے درد تو مرہم نہ دلہائے خراب
عکسے ز لب تو گشتہ در آب عیاں
یا برگ گل فتادہ در جام شراب

حسین شاہ کے نام کا بھی معما کہا ہے:

آں مہ کہ بدیدہ جائے گاہش نیکوست
منظور نظر رخے چو ماہش نیکوست
محسن سر خود نہادہ بر پائش
چوں مہر صفت عارض ماہش نیکوست

موجی یہ قاسم خاں بدخشی کا تخلص ہے جو ہمایوں کے نامی گرامی امیروں میں سے تھا۔ اصناف شعر کو بخوبی جانتا تھا اور اچھے شعر کہتا تھا۔ یوسف زلیخا کے طرز میں ایک مثنوی بھی کہی جس میں چھ ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی میں محبوب کی تعریف یوں کرتا ہے:

مرصع موئے بندی بے بہائش   ز بے قدری فتادہ در قفائش
نکرد از لعل ناب آویزۂ گوش   کہ بود آویختہ دلہائے مدہوش
نکرد از کمال لطف دوراں   ز لولوئے ترش زیب گریباں

که بهر زینت جیب نکوئیش ‌‌ ‌ چکیده قطرهٔ خونی ز روئیش
چو زر خود ما بپائیش دیده پامال ‌ روان افتاد در پائیش چو خلخال
بیاض گردنش چون شمع کافور ‌ ز جیبش سر زده سررشتهٔ نور
ز بازو سیم را ساعد شکسته ‌ ز ساعد بر سمن گلدسته بسته
ازان گلدسته ہائے نازنینش ‌ سمن بر بود هر دو آستینش
کفش برگ گلی آورده در مشت ‌ برو چون غنچهٔ زنبق بر انگشت
برو دوشش که برده عقل را هوش ‌ گرفته خرمن گل را در آغوش
چو آمد در بیاض حسن تقریر ‌ عقائی سینه اش عانی تراز شیر
دو پستانش که در خوبی ست یکتا ‌ حبابی گشته از شیر آشکارا
میانش برتر از حد بیان ست ‌ که این جا نازکیها در میان است

ایک مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی لکھی ہے۔ کہتے ہیں یہ شعر اسی مثنوی کا ہے:

پیری ز قبیلهٔ معزز
ریشش چو گل سفید یک گز

اس رباعی کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ خواب میں اس نے کہی ہے۔

اے باد خبر ز کوئے جاناں برساں ‌ باایں تن مرده مژدهٔ جاں برساں
دشوار بود مرا رسیدن آنجا ‌ لطفی کن و خویش را تو آساں برساں

خمار بادهٔ غم چند دارد سر گراں مارا
بیا ساقی وا ز غمہائے عالم وارہاں مارا

ساقیا تاکی ز دوراں شرح بد حالی کنیم ‌ شیشهٔ بر کن که یک ساعت دلی خالی کنیم

آخر عمر میں سپاہ گری کا پیشہ ترک کر کے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شاعری سے بھی استعفا دے دیتا۔ اس کی وفات آگرہ میں ۹۷۹ھ میں ہوئی۔

میرزادہ علی خاں محترم بیگ کا لڑکا ہے جو ہمایوں کا مشہور امیر تھا۔ میرزادہ نہایت با اخلاق اور موزوں طبع آدمی تھا۔ کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔

شام چو از چهره بگندی نقاب
تاب نیاورد دلت آفتاب

۹۹۶ھ میں کشمیر میں جب کہ یعقوب ولد یوسف خاں کشمیری نے محمد قاسم خاں میر بحر پر شب خوں مارا تھا تو یہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

معزی ہروی

طبا طبائی سیّدوں میں سے ہے۔ بچپن میں کامران مرزا کا ہم سبق تھا۔ ہندوستان میں پچاس سال تک رہا۔ ۹۸۲ھ میں اسی جگہ فوت ہوا۔ یہ دو شعر اسی کے ہیں۔

چند داری اے فلک چوں ذرہ سرگرداں مرا　　تا بکے داری بغربت بے سروساماں مرا

گفتم باہ درد دل خود بروں کنم
دردم باہ کم نشود آہ چوں کنم

مرادی استرآبادی

استرآباد کے سیدوں میں سے تھا۔ ۹۷۹ھ میں فوت ہوا۔ اس کے اشعار مشہور رہے ہیں۔
نمونہ کلام:

بنمود رخ ز پردہ کہ صبح صفاست ایں　　یعنی کمال قدرت صنع خداست ایں
طالع نہ شد شبے ز رخت کوکب مراد　　بے طالعی و تیرگیٔ بخت ماست ایں
زنہار خوش دلی و فراغت طمع مدار　　در خاکدان دہر کہ محنت سراست ایں
بگذشت دلی بخاک مرادی و گفت یار　　در راہ عشق کشتۂ سنگ جفاست ایں
اے سیل غم ز دیدہ غبار رہش مشوی　　مارا چو یادگار ازاں خاک پاست ایں

کفر زلفش کہ بود مایۂ ایمانم ازو
نامسلمانم اگر روئے بگردانم ازو
گر سگ کوئے تو در مرتبہ از من پیش است
لیک در راہ وفا ہیچ نمی مانم ازو

خوباں کہ زلف زینت رخسار ساختند　　خلقے بدام خویش گرفتار ساختند

کیم من دور ازاں گل چہرہ ہمچوں غنچہ دل تنگی
گرفتار جنوں دیوانۂ با سایہ ہم جنگی

بروے یار قضا تا خط غبار نوشت　　نیاز مندیٔ ما را براں کنار نوشت

مشفقی بخاری

مرو کا رہنے والا ہے۔ بعض تو اسے قصیدہ میں اپنے زمانہ کا سلمان سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ وہ مادر زاد النہری رنگ میں شعر کہہ لیتا تھا۔ اس کا کلام سرد اور بے سوز تھا۔ دو مرتبہ ہندوستان آکر واپس چلا گیا۔

چوں نقد ہستی مجنوں غم نگاری بود
خدایہ نقد بیا مرزدش کہ یاری بود

در عاشقی ملامت بسیار بودہ است　　آساں خیال کردم و دشوار بودہ است
تا چمن ہر شب چراغ از گل بیاغ افروختہ است　　کشتہ برگ لالہ آتش برگ داغش سوختہ است

اس کی ہجو نہایت رکیک زبان میں ہے۔ اس کی ہجو ملیح اس قطعہ سے نمایاں ہے جو اس نے آخری بار ہندوستان آنے پر کہی تھی :

کشور ہند شکرستانی است
طوطیانش شکر فروش ہمہ
ہندوان سیاہ چو مگساں
چیرہ بندو نکو چہ پوش ہمہ

میلی ہروی

نام میرزا قلی تھا۔ صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ اس کی شعر گوئی کا ملکہ اس درجہ پر تھا کہ اگر وہ اس زمانہ تک زندہ ہوتا تو اس زمانہ کے اکثر خام کار شعر گوئی سے دستبردار ہو جاتے۔ متاخرین میں سے کوئی اس کے ہم پلہ نہ تھا۔ برسوں نورنگ خاں کی خدمت میں رہا اور اس کی مدح میں بڑے عمدہ قصیدے کہے۔ کہتے ہیں نورنگ خاں نے بدگمانی کی وجہ سے اسے زہر دے کر مروا ڈالا۔ اس کی وفات مالوہ میں ہوئی۔

دانستۂ کہ مہر تو با جہاں نمیرود
کز خاک کشتگاں گذری سرگراں ہنوز
نہ آشنا و نہ بیگانۂ نمی دانم — کہ اختلاط چنیں را کسے چہ نام کند
بے قرار است دل اندر بدن کشتۂ عشق
دیگر از یار ندانم چہ تمنا دارد
امتحاں تام نہد دل ستمی کز تو کشد
خویش را چند بایں حیلہ شکیبا دارد
جاں بہ عزم رحلت و من شاد زیں معنی کہ دل — درد چندیں سالہ را امید درماں یافتہ
در فراقت زاں نمی میرم کہ ناید در دولت
کیں ستم نا دیدہ روزی چند با ہجرم نہ ساخت
با آنکہ بہ پرسیدن ما آمد مردیم — کا یاز کہ پرسیدہ رہ خانہ ما را
میرم و بر زندگانم رحم می آید کہ تو
خوباں ببیاد ہا داری کہ با ما کردۂ

بعض لوگ اس شعر میں رحم کے بجائے رشک پڑھتے ہیں۔ ناقدان سخن ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

منم از زخم دل آں نیم جاں صیدی کہ بر جانش
ترحم می کند صیاد و بسمل می کند زودش
یار خواہد کہ بر گم شود آسودہ و من — شرمساری برم از محنت جاں کندن خویش

افگنده ام ترا بزبا تها و خوش دلم
کز شرم آں نگاه بهر دم نمی کنی

بخت بدبیں که به میلی نکند غیر جفا
خرد سالی که جفا راز وفا نه شناسد

منم و دل خرابی بتو می سپارم اورا
بچه کار خواهد آمد که نگاه دارم اورا

دم آخر است دشمن به منش گذار یک دم
که بعد هزار حسرت بتو می گذارم اورا

نه خواهم با چنیں خواری ز بزمش زود برخیزم
که پندارم اگر ما نم دمی خوشنود برخیزم

پس از عمری چو بنشینم بعد تقریب در بزمش
سخن از مدعائے من کند تا زود برخیزم

میا بپرسش من چوں امید صحت نیست
بحال مرگ مرا دیدن از محبت نیست

بغایتی هوس گفتگو ست با تو مرا
که تاب خامشیم باوجود حیرت نیست

می نمایم خویش را وارسته از سودائی او
تا فریب عشق من کم سازد استغنائی او

صد بار رنجه گشته ام و صلح کرده ام
کاں مه خبر نداشته از صلح و جنگ من

چه شد که میگذری وحشیانه از میلی
مگر به تازه کسے را شکار خود کردی

ببالیں تو آں عیسی نفس می آید اے میلی
که از شوق قدومش مردهٔ صد ساله برخیزد

وفائے عهد گماں از تو بے وفا داریم
کمال ساده دلیهاست اینکه ما داریم

کسے اگر سبب وصل یار من شده است
ز سرگرانئ او شرمسار من شده است

به طنز مژدهٔ وصلی که داده غیر مرا
ز سادگی سبب انتظار من شده است

تا بماند به میاں حرف نهان من و تو
غیر در بزم نشیند به میان من و تو

تو نیائی ز حیا در سخن و من ز حجاب
تا چه سازند رقیباں ز زبان من و تو

غافل به من رسید و وفا را بهانه ساخت
افگند سر به پیش و حیا را بهانه ساخت

اسی رنگ میں مَیں نے بھی شعر کہا ہے :

آزار خلق خواست کند چرخ لاجرم
بدخوئ ستم گر ما را بہانہ ساخت

ملک قمی اسے ملک الکلام بھی کہتے ہیں۔ درویشانہ وضع قطع تھی۔ دکن میں رہتا تھا۔ نہایت دردمند آدمی تھا۔ ہمیشہ اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔ دکنیوں نے ایک فساد میں اسے ملک عدم پہنچا دیا۔

آب شمشیر شہادت شست گرد اختلاف
گبر و ترسا و مسلمان کشتۂ یک خنجر اند

سازند لخت لخت درون فسردگاں   وانگاہ بر جراحت دلہا نمک زنند

تو مرہم دل ریشی بخندۂ نمکیں
ولے بہ بال مژۂ تلخ نشتر جگری

بقدر حوصلۂ عشق نیست بادہ عشق
تو شیر بیشۂ ما نیستی کہ باخبری

سحاب چشم کہ دادہ است نرگست در آب   کہ از نگاہ تو بوئے ستم نمی آید

خوں چکاں ست ملک تیغ ستم می ترسم
کہ پے اجر بدر خانہ قاتل برود

خزانہائے خیال من از ذخیرۂ وصل   چناں پرست کہ چشم مبہم نمی آید
سپاہ عافیت چوں بوملک گستاخ می آید   سمند فتنہ زیں کن خویش را بر قلب لشکر زن

چند پاس وعدۂ ہر بے وفا دارد کسے
چشم بر در گوش بر آواز پا تا کے دارد کسے

در دہر را ایں عافیت خصماں بمنت میدہند
وائے گر زایشاں تمنائی وفا دارد کسے

کدامیں باد ایں نشا طگی کرد   کہ سنبل بر گل رویت پراگند
ازل را با مہ روئے تو پیماں   ابد را با سر زلف تو پیوند
شکر را گرم روئے با تبسم   نمک را آشنائی با شکر خند

بود ناقوس لحن سبحہ سنجاں
دراں کشور کہ بیت باشد خدا وند

شیخ فیضی دکن سے اس کی کلیات لے آیا تھا۔ اس کے سارے اشعار شعرائی عہد کے رنگ میں تھے۔ اس

قدیم طرز سے اس نے نکلنے کی کوشش کی نہ کوئی نیا مضمون پیدا کیا۔ اس کی زبان دانی جیسی کچھ بھی تھی وہ اس کے دیوان کے مطلع سے ظاہر ہے۔

اے حمد تو مسلم مقالات ولے ذکر تو منبر مقامات

بُرا بھلا جو کچھ بھی کہہ لیتا تھا کہہ لیتا تھا۔ مجھے اس کا سب سے اچھا شعر یہ معلوم ہوا:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

مدامی بدخشی شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ میرزا عزیز کوکہ کے ہاں ملازم تھا۔ اس کا شعر ہے:

دلا صد فتنہ برپا زاں قد و بالاست می گوئی
ازاں بالا بلا بسیار دیدم راست می گوئی

اس زمین میں بہتوں نے طبع آزمائی کی اور ایک دوسرے کے مضمون کو پامال کرتے رہے جس کی وجہ سے یہ زمین بالکل ہی بے جان ہو گئی۔ انھیں میں سے یہ شعر بھی ہیں:

بلا و فتنہ در عالم ز قدم خاست می گوئی
بلی می آید از بالا بلاہا راست می گوئی
بہ شہر از قامتم ہر سو قیامت خاست می گوئی
قیامت قامتی داری مہ من راست می گوئی

اس طرح یہ اشعار آخری زمانہ کے فتنوں میں سے ایک فتنہ ہیں۔

شعلۂ شمع ست گاہی رنگ در فانوس آل
یا مگر برگ خزاں در لالہ جا کرد از شمال
چوں گشت تمام شرح صدش از قطرۂ اشک مہر کردش

ملا مقصود قزوینی اپنے زمانہ کا نہایت خوش طبع شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔

در عالم وفا سگِ کوئے تو رام ماست
اقبال رام گشتہ و عالم بکام ماست
عشاق را تمام نظر بر جمال تست
اے شاہ حسن روئے تو ماہ تمام ماست

نہالِ آرزوئے او فشاندم در زمین دل و زاں شاخ نگم جز بار غم چیزے نہ شد حاصل
بود امید کا درم حلقۂ زلف او بکف دہ کہ صدیں خیال کج عمر عزیز شد تلف

اس نے یہ قصیدہ نقیب خاں کے داماد قاضی یحییٰ قزوینی کے نام پر کہا ہے اور خواجہ سلمان ساوجی کے رنگ میں :

دگر ز سروئی دی رفت آسماں در تاب　　　ز تاب صاعقہ خورشید ماند زیر نقاب
فلک بروئے زمیں ساخت جوشنی از آب
نہنگ بحر ز بیم سہام صرصری　　　نہاد بر سر خود خود آہنیں ز حباب
دگر ز کثرت برف و ز شدت سرما　　　زمیں بلرزہ در آمد چو قلزم سیماب
سفید گشت سواد زمیں ز لشکر برف　　　سیاہی از دل آفاق شد چناں نایاب
کہ جا بروئے زمیں تنگ شد بداں گونہ　　　کہ بر زمیں نتواند نہاد پائے غراب
بہ صحن باغ بجائے شگوفہ و سبزہ　　　دگر ز برف و یخ افتاد قاقم و سنجاب
فتاد لرزہ در اشجار در چمن دیگر　　　چو من شدند ز بے برگی ایں چنیں بیتاب
ندیں ہوا بدن من چو بید لرزاں است　　　تنم ز ضعف گہی در تب است و گہ در تاب
سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش　　　کہ تا بکے کشی از جور روزگار عذاب
از جور حادثہ خود را بداں جناب رساں　　　کہ ہست ہمچو سپہر بریں بلند جناب
ایں شرح کہ یک شمہ وصف اخلاقش　　　نہ شد تمام بہ صد دفتر و ہزار کتاب
ملی خصال و محمد شعار و یحییٰ نام　　　چو روشن است کمالش چہ حاجت القاب

ملا مقصود نے ۹۷۰ھ آگرہ میں وفات پائی۔ اس کا باپ ملا فضل اللہ بھی بڑا نیک اور معزز شخص تھا۔ یہ قطعہ اس کا ہے :

فضلی چو غنچہ خلعت ہستی بخود مپیچ　　　بر چہرہ چیں مئی فگن و دامن بخوں مکش
چوں گل شگفتہ باش و چو سرو از غم جہاں　　　آزاد باش و منت ایں چرخ دوں مکش

محنتی حصاری

کچھ پڑھا لکھا تھا۔ دہلی کے مدرسہ میں رہتا تھا، بعد میں حسب الحکم اسے سرہند کی قضات پر مامور کیا گیا۔ دربار سے محنتی کا تخلص مرحمت ہوا تھا۔ سرہند میں وفات پائی۔

یافتم در گذرے جائے کف پائیش را　　　چوں نمالم رخ خود یافتہ ام جائیش را

بفکر موئے میانت دل کساں گم شد
دل شکستۂ ما ہم دراں میاں گم شد

موسوی المشہدی

اس کی نسبت اس کے تخلص سے ظاہر ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا۔

ترا پنہاں نظر سوئے من زار است میدانم
تغافل کردنت از بیم اغیار است میدانم

چشم او میکشدم زار بغمزۂ مودۂ او
می بناید ز نگاہ غضب آلودۂ او

خواجہ معظم یہ اکبر کا ماموں اور حضرت شیخ جام کی اولاد میں سے تھا۔ خبطی اور پاگل سا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کو بے وجہ قتل کر دیا اور قصاص میں ۹۷۱ھ میں قتل کیا گیا، جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ لوگوں نے تاریخ کہی ہے:

خواجہ اعظم معظم نام — کہ ازو بود دہر را تزیور
زن خود را بکشت وکشت اورا — از غضب شہ جلال الدین اکبر
بے رخ آں بت جہاں افروز
گشت آخر شہادتم اکبر

صاف ظاہر ہے کہ یہ تاریخ میر علاء الدولہ مصنف تذکرۂ شعراء کی ہے۔
خواجہ معظم کا مطلع یہ ہے:

درد دل را نتواں پیش تو اے جاں گفتن
محنتی دارم ازیں درد کہ نتواں گفتن

میر علاء الدولہ نے اسی رنگ میں مطلع کہا ہے جو اس کے سامنے حشو مطلق ہے۔

تا شنیدم کہ تواں لعل ترا جاں گفتن
آتشے در دلم افتاد کہ نتواں گفتن

موزوں شیخ پیر آگرہ کا لڑکا ہے۔ سات طریقوں پر خوش نویسی کرتا تھا۔ میں نے اسے اسلیم شاہ کے عہد میں پشاور میں دیکھا تھا۔ اس کا لڑکا بھی نوجوان قابل تھا۔ معما اور خوش خطی میں ماہر تھا۔ چھوٹی بڑی شطرنج خوب کھیلتا تھا۔ یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں۔

مرا چہ سود ز نگہائے رنگ رنگ بہار — چو نیست بے تو دلم را بہ ہیچ رنگ قرار
گواہ درد من درد مند محزونند — سرشک سرخ و رخ زرد و دیدۂ بیدار
اے یافتہ ز عارض تو ماہتاب تاب — وے سوختہ ز رشک جمال تو آفتاب
ہر ناوک تو اے مہ ابرو کمان ما
چوں مغز جا گرفتہ بہ استخوان ما
تیرے کہ بر دل آں مہ ابرو کمان زدہ
مرہم نہادہ بر سر داغ نہان ما

ایک ہندوستانی سے اس سے زیادہ موزونی طبعی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

محمد یوسف بڑا حسین جوان تھا۔ کابل میں پیدا ہوا اور ہندوستان میں نشوو نما پائی۔ خوش خطی میں اشرف خاں کا شاگرد تھا۔ عین عالم شباب میں ۹۸۰ھ میں قلعہ سورت کے محاصرہ میں گجرات میں فوت ہوا۔ اشرف خاں نے اس کے لیے مصرع تاریخ کہا اور اس پر میر علاء الدولہ نے قطعہ مکمل کیا۔

محمد یوسف آں مصر ملاحت — برفت از دہر اشک از دیدہ ریزاں
پئے تاریخ او گفتا عزیزے — "کجا شد یوسف مصرائے عزیزاں"

یہ غزل محمد یوسف کی ہے:

خوش وقت آنکہ جائے بہ میخانہ ساختہ — در پائے خم بہ ساغر و پیمانہ ساختہ
آں کس کہ دادہ شیوۂ مستی بچشم یار — ستم ازاں دو نرگس مستانہ ساختہ
معموریٔ بعالم فانی نیافت چغد — منزل ازاں بگوشۂ ویرانہ ساختہ
گفتم کہ جا بدیدۂ من کن بناز گفت — در رہگذار سیل کسے خانہ ساختہ
زلف تو کرد شانہ پریشاں شکستہ باد — دستے کہ بہر زلف توآں شانہ ساختہ

در ہجر تو آرام بناکام گرفتیم
ناکام بہ ہجراں تو آرام گرفتیم

منظری سمرقندی خوش کلام شاعر تھا۔ آگرہ میں بیرم خاں کی سرکار میں ملازم تھا۔ ایک شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا، چند داستانیں بھی لکھ لی تھیں، جن میں ایک قصہ سکندر سور کی داستان سے متعلق تھا اور اس میں محمد حسین خاں کی بہادری کا ذکر کیا تھا۔ پنیالی میں اس نے یہ نظم پیش کی۔ حسین خاں نے اس سے اس واقعہ کو شروع سے آخر تک بیان کیا۔ اس نے رات بھر بیٹھ کر تین سو چار شعروں کی خاطر خواہ تصحیح اور اصلاح کی اور صبح صبح مجلس میں آکر نظم سنائی۔ خاں نے بڑا اچھا صلہ دیا۔ اس نظم کا ایک شعر ہے:

ز فر نفیرش فلک گشت کر
ملک شد سراسیمہ زاں کر و فر

اس کا یہ مطلع بہت مشہور ہے:

ہمیشہ ما ز فراق تو بے سرو پائیم — تراکس کہ بخاطر نمی رسد مائیم
خط گرد ماہ عارض آں سیم بر نگر — ہر دو نشان فتنۂ دور قمر نگر
بر روئے ماہ سلسلہ عنبریں ببیں — جعد بنفشہ بر رخ گلبرگ تر نگر
بیں چشم رہزن و مژۂ ناوک افگنش — در رہگذار عشق خطر در خطر نگر

یہ آخری شعر ہی اس کے اپنے خاص رنگ میں ہے، بقیہ کا مضمون پامال اور کافی سنا ہوا ہے۔

مدامی ہمدانی ہندوستان میں حیدری کے نام سے مشہور تھا۔ میر محمد خاں کلال کی تعریف میں بڑے اچھے قصیدے لکھے ہیں۔ بد مزاج ایسا تھا کہ ہر ایک سے جھگڑا کر لیتا تھا۔ ہمیشہ اپنی اس عادت سے مصیبتوں میں مبتلا رہا۔

نمی دانست مجنوں عاشقے رسوائی عالم شد
منم رسوائی عشق و عاشقی بر من مسلم شد

در نظر آید ہلال عید مانند کلید — تا کشاید قفل از مے خانہ ساقی شام عید

شد عیاں از پردہ دیگر شاہد خضرا نقاب
خندہ زد چوں صبح غنچہ گشت ظاہر آفتاب

مراہست بر سینہ از تیغ دلبر — الفہا چو بر صفحہ خطہائے مسطر

مقیمی سبزواری خان اعظم کے سلسلہ کا شاعر تھا۔ خوش طبع آدمی تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد اپنے ملک کو چلا گیا۔

خوش آنکہ چوں شمار سگاں خویشتن کند
ہر چند در شمار نیم یاد من کند

عاشقانیم و سر کوئے بلا ماوائے ماست — عالمے پر فتنہ و آشوب از غوغائے ماست
ہر کجا اندوہ و محنت بیش آنجا ساکنیم — ہر کجا آشوب و غم بسیار آنجا جائے ماست
با چنیں بد حالی کامروز داریم از غمش — مرگ ما میخواہد آنکو در غم فردائے ماست
در بیابان غمش سرگشتہ ایم و سایہ است — آں سیہ بختی کہ در روز چنیں ہمپائے ماست
با مقیم از ناز گفتی نیست پروائے کسم — آری آری گی بایں خوبی ترا پروائے ماست

اس کا لڑکا قاضی ابو المعالی ایک شکستہ دل، خاتی مشرب نوجوان ہے۔ اپنے باپ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ بواسیر کے عارضہ میں لاہور میں فوت ہو گیا۔ شیخ سعدی کا مطلع ہے:

کافراں از بت بے جاں چہ تمتع دارید
بارے آں بت بپرستید کہ جانی دارد

اس نے اسی زمین میں کہا ہے:

مردہ حسرت برد آں دم کہ بری دست بہ تیغ
کیں عطا روزی آنست کہ جانی دارد

محوی حال ہی میں ہندوستان آیا۔ خان خاناں بیرم خاں کی ملازمت میں تھا۔ اب مکہ معظمہ کی زیارت کے لیے چلا گیا ہے۔ رباعی کہنے میں بے مثل تھا۔

تا زلف بروں ہم چو مہ خواہد بود
تا خط شہ حسن را سپہ خواہد بود
گر خانہ ز خشت آفتابم سازند
روز من بے چارہ سیہ خواہد بود

من جان و دل حزیں نمی دانستم	من گریہ آتشیں نمی دانستم
نے نام بہ من گذاشتی و نہ نشاں	اے عشق ترا چنیں نمی دانستم

محوی کہ ز کوئے عقل بیروں می گشت
آوارہ تر از ہزار مجنوں می گشت
دور از تو ز دور دیدم آں گم شدہ را
در بادیۂ کہ باد در خوں می گشت

مظہری کشمیری صاحب دیوان شاعر ہے۔ اپنے وطن میں سرکاری خدمت پر مامور ہے۔ ان چند اشعار سے اس کے ذوق شعری کا پتہ چل سکتا ہے۔

اقبال حسن کار ترا پیش می برد
ورنہ صلاح کار ندانستہ کہ چیست

یہ اس کے استاد کا مطلع ہے:

تو عہد استوار ندانستہ کہ چیست
بودن بہ یک قرار ندانستہ کہ چیست

فدائی آئینہ گردم کہ داستان مرا	دروں خانہ بہ گلگشت بوستاں دارد

مظہر بجہاں چو بی نصیباں می باش
وز گل بنوائے عندلیباں می باش
با دیدنی از خوئے عالم می ساز
مہماں نظارہ چوں غریباں می باش

شیخ محمد دہلوی کیا حسب نسب کیا علم و فضل ہر لحاظ سے یگانۂ روزگار تھا۔ مدتوں کی شناسائی کے بعد اس سال جبکہ شاہی لشکر قلعہ چتوڑ کی فتح کے لیے جا رہا تھا، اتفاقاً قصبہ باری کے قریب میری اس سے ملاقات ہوگئی، لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ وہ محفل گھڑی بھر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ ایک طرف اور میں دوسری طرف رخصت ہوگیا۔ اس پہلی ملاقات ہی میں اس کے قابل قدر احوال کا اندازہ ہوگیا۔ اس کا ذکر شاعروں کی ذیل میں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ کبھی کبھی شعر کہتا تھا اس لیے ہم اس کی یاد میں یہ مطلع نقل کرتے ہیں۔

اگر بروز عمت عبر اختیار کنم
چو اختیار نماند بگو چہ کار کنم

نویدی تربتی صاحب دیوان شاعر ہے۔ بیرم خاں کے بخشی کچاک بیگ کی ہجو میں اس نے ایک ترجیع بند کہا ہے جو رہتی دنیا تک لوح زمانہ سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ چند شعر اسی کے ہیں۔

اے بدوراں شریف تو مباہی ایام — خان بن خان سرو سرخیل سلاطین بیرام
عاجز از وادیٔ فہم تو سمند ادراک — قاصر از قصر جلال تو کمند اوہام
سخنے ہست مرا شرح کنم بر نواب — مشکلے ہست مرا عرض کنم بر خدام
دادۂ منصب بخشی گریٔ عالی را — بکچاک بیگ سبب چیست ایا فخر انام
نیستی واقف از افعال ذمیمش گویا — گرچہ تحقیق خدم فرض بود بر حکام
امردی بود خود آرا ولوندی میکش — پسری بود بزر مائل و ترم خود کام
کار او نوکریٔ خواجہ امیر بیگ وزیر — عامل سلسلۂ حضرت مرزا بہرام
چیزہائے دگر از وی بر ہمی معلوم است — دارم از حضرت خان شرم کہ سازم اعلام
قصہ کوتہ بسر قصہ روم القصہ — قصہ خوانی کنم از حالت آں بے اندام
ہر کجا بود چناں بود در اطوار سلوک — کہ بدو آمدہ نفریں ز خواص و ز عوام
ایکہ بہر تن پشیت ز خدا می خواہند — ہمہ سکان سماوات چہ در صبح و چہ شام
تپ و قولنج و بواسیر و دق و استسقا — خصیۂ کرم و کدو دانہ و صرع و برسام
زار و بیمار چو از پای در آئی بہ علاج — بنویسند غذائے حکیماں بہ تمام
قیٔ میمون و گہ سگ بچۂ دہ روزہ — آلت خرس و دم گربہ و سرگین حمام
اے خوش آں دم کہ شوی قبض ز قولنج بول — نسخۂ حقنہ نویسند اطبائے عظام
دست خر پائے شتر شاخ بز و گردن قاز — کلۂ خرس و سر استر و دندان گراز

اس کی ہجو میں اس کا ایک جملہ بھی مشہور ہے۔ خود اس کا بیان ہے کہ "ایک دن کچاک بیگ کچہری میں ایک پرانی مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا مجھ سے کہنے لگا "اے کُتے میرے سامنے تو گو کھاتا ہے"۔ میں نے اُسے جواب دیا" کون کتا ہے جو تمہارے سامنے گو کھا سکے؟"

نویدی کاتا تھا۔ اصل تذکرہ کے مصنف میر علاء الدولہ نے چشم پوشی سے کام نہیں لیا اور یہ قصہ لکھ دیا ہے۔ فحش نویسی میرا بھی وطیرہ نہیں ہے لیکن گرمیٔ سخن کے لیے بعینہ میں نے اسے نقل کر دیا۔ صاحب بینا حضرات از راہ کرم چشم پوشی سے کام لیں تو بہتر۔

یہ شعر نویدی کے دیوان کے ہیں، معلوم نہیں یہ اسی نویدی کا دیوان ہے یا کسی اور کا۔

خدنگت را کہ عمرے جانی در دل داشتم دارم — نہالِ آرزوئے کز تو حاصل داشتم دارم
ہماں قیدی کہ در را دل من مسکیں سرگرداں — ازاں لیلی وش مشکیں شمائل داشتم دارم
اگر از گریہ شد تاریک چشم من خیالت را — بداں صورت کہ در آئینۂ دل داشتم دارم
بگیر اے آشنا دستم کز آب دیدہ عمرے شد — بوادی جنوں پائے کہ در گل داشتم دارم
نویدی مرغ دل را کز خدنگ غمزہ اش عمرے — بخاک و خوں چو مرغ نیم بسمل داشتم دارم

ساخت سودائی سر زلف تو بیتاب مرا — جانم آمد بلب از ہجر تو دریاب مرا
آدرم تاب جفایت ہمہ عمر و لے — اینکہ با غیر نشینی نبود تاب مرا
دارم از گریہ نگہ بر سر کویت خود را — کز سر کوئے تو ترسم کہ برد آب مرا
بے قراری سر زلف تو بیک چشم زدن — نگذارد شب ہجراں تو در خواب مرا
گشت تا جمع نویدی دل من با غم تو — رفت از یاد پریشانیٔ اسباب مرا

گر زار بمیرم ز غم دمبدم خویش — با غیر شکایت بکنم از الم خویش
از بیخودیٔ عشق اگر پیش تو ظاہر — کردم غم دل مُرا مدرگذراں از کرم خویش
میخواست نویدی غم دل پیش تو گوید — چوں در رخت کرد فراموش غم خویش

تا خدنگت از دل افگار می آید بروں — جاں غمِ فرسودمی صد بار می آید بروں
ناوکِ دلدوز او در سینۂ افگار من — جا گرفت آساں و لے دشوار می آید بروں
بر سر کویش من بیچارہ از بے طاقتی — میروم صد بار تا یک بار می آید بروں
اے نویدی از درون خرقۂ پشمینہ ات — گر مسلمانی چرا زنار می آید بروں

نہ فکر آخرت داری نہ دنیا
نمی دانم نویدی در چکاری

نشانی مولانا علی احمد کا تخلص ہے۔ مولانا حسین نقشی مہرکن کے لڑکے ہیں۔ بڑے عالم فاضل ولی مشرب آدمی تھے۔ بڑے شاہزادہ کے اُستاد تھے۔ باپ بیٹے دونوں نے مُہر کنی کے فن کو بڑا فروغ دیا۔ خاص طور سے مولانا مذکور کہ نگینہ پر نقش سازی میں ان کے کارنامے بے مثل ہیں۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر تک ان کے نقش و سکہ کو تبرکا لے جاتے ہیں۔

علم و کمال میں بھی ان کا بڑا اونچا مقام ہے لیکن نقش سازی کے فن نے ان کے سارے کمالات پر پردہ

ڈال دیا ہے، اسی لیے سپاہ گری اور ملازمت میں جیسا کہ چاہیے تھا ترقی نہیں پا سکے، پھر بھی قابل عزت عہدہ پر فائز ہوئے۔ امرائے نامدار سے ان کا مرتبہ کسی طرح کم نہیں رہا۔

علم ہیئت اور طبیعیات کے ماہر ہیں۔ علم کے مدارج اعلیٰ تک رسائی ہے۔ ہر طرز کی خوش نویسی جانتے ہیں۔ املا اور انشا میں بے مثل آدمی ہیں۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتے تو بلا شبہ ان کے شعر صفحہ یادداشت پر یادگار رہتے۔ شعر بس کبھی کبھی کہتے ہیں تخلص اپنے پیشہ کے مطابق رکھا ہے۔

میں عنفوان شباب سے اس منتخب کے لکھنے کے وقت تک کہ میرے بڑھاپے کا زمانہ ہے، ان کے دوستوں میں رہا ہوں۔ ان کے ساتھ میرے نہایت گہرے مراسم رہے ہیں۔

ان کا نمونۂ کلام مندرجہ ذیل ہے:

ترا تا سبزۂ خط بر لب جاں بخش پیدا شد
مسیحا بود تنہا خضر ہمراہ مسیحا شد

محتسب وہ لے خم شکست و آب آتشناک ریخت — خاک من بر باد داد و خون من بر خاک ریخت

باد از یار خبر بر دل ناشاد آورد
اعتمادی نتواں بر سخن باد آورد

مرا ہر شب چو دزداں خواب گیرد چشم تر گردد — دلم را با محنت بیدار بیند باز بر گردد

میں نے اسی رنگ میں کہا ہے:

بہ صد امید قاصد میفرستم سوئے آں بدخو
معاذ اللہ ازاں ساعت کہ او نومید گردد

ان کا ایک شعر ہے:

تا سینہ از خدنگ جفائے تو خستہ ایم
مرہم نماندہ ایم و جراحت نبستہ ایم

جس زمانہ میں گجرات فتح ہوا، انھوں نے بادشاہ کے نام کا سکہ کندہ کر کے پیش کیا اور تاریخ میں یہ شعر پیش کیے:

خسروا سکۂ گجرات بنام تو زدند — ملک را سایۂ عدل تو تبارک بادا
اے خوش آں دم کہ چو تاریخ ولے از من پرسی — گویمت۔ سکۂ گجرات مبارک بادا

ان کے اور شعر ہیں:

کار بجانم رسید و یار نیامد
جاں گراں مایۂ ہیچ کار نیامد

ما را دل مجروح و بتاں را نمکیں لب
تا روز اجل بر شدن ایں ریش نباشد

صورت و معنی نگردد جمع در ہر پادشاہ   پادشاہ صورت و معنی است اکبر پادشاہ
آں شہنشاہی کہ می افتد بروز بار او   از نہیب چوب درباں پادشہ بر پادشاہ

ز سنگ حادثہ دل نہ شکند بہ سینۂ ما
کہ ساختند ز الماس آبگینۂ ما

جس زمانہ میں لشکر شاہی پہلی مرتبہ کشمیر کی طرف گیا تھا، میں رخصت لے کر بساور کو جو میری جائے ولادت ہے چلا گیا تھا۔ انھوں نے کشمیر سے یہ اشعار لکھ کر میرے پاس بھجوائے تھے۔ خدا کو بہتر معلوم ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھی اسی شوق و محبت میں اشعار لکھے ہوں گے لیکن میں ان اشعار سے اپنی نسبت کو خاص سمجھتا ہوں تاکہ دوسرا دعویٰ نہ کرے۔

مرا دور از تو اے ماہ دل افروز   نہ شب خوابست و نے آرام و روز
چکیدہ اشک گلگونم بر خسار   شگفتہ لالہ اندر زعفران زار
ز خون دیدہ شد آلودہ مژگاں   کشیدہ سر ز دریا شاخ مرجاں
ز ہجرت دمبدم خون در دل من   نشستہ چوں صراحی تا بگردن
بسوزد ہر نفس از آتش غم   علم بیروں زند از سینہ ہر دم
کنوں چشمم بخوں دل ستیزد   بجائے قطرہ آتش پارہ ریزد
نہ مژگانست گرد دیدۂ من   سیہ شد آتش دل گرد روزن
ملک خوابا مرا زیں سیر ناشاد   کہ و جان عزیزاں رفتہ برباد
چناں ضعف تن و دل گشتہ حاصل   کہ نے از تن خبر دارم نہ از دل
تنے از محنت تپ بے حضورے   دلے در دل چو آتش در تنورے

شیخ فیضی نے جو فخریہ لکھا ہے اس کا مطلع ہے ؎

شکر خدا کہ عشق بتاں ست رہبرم
در ملت برہمن و در دین آذرم

نشانی نے اس کے جواب میں قصیدہ لکھا تھا جس کے چند شعر ہیں:

شکر خدا کہ پیرو دین پیمبرم   حب رسول و آل رسول ست رہبرم
بیزارم از برہمن و ناقوس و اہرمن   منکر ز دین راہب و قسیس و آذرم
قائل بروز حشر و قیام قیامتم   امیدوار جنت و حوری و کوثرم

حاسد بسوئے من بحقارت نظر مکن   چوں نیستی خلیل منہ پا بر آذرم
زیر نگین من شدہ روئے زمیں تمام   من چوں نگیں بدور گریباں سر اندرم
از شرق تا بہ غرب فضیلت معدلم   ز قطب تا بہ قطب بہر خطہ محورم
سطح محدب فلک فضل خصم را   ہرگز مماس نیست بہ سطح مقعرم
گر در زمیں چو نقطہ موہوم ساکنم   لیکن مدار گردش چرخ مدورم
دست قضا کشیدہ بپرکار روزگار   افلاک ہفت دائرہ برگرد دفترم
ہر چند کم ز نقطۂ دو وضع مرکزم   از خط مستدیر معدل فزوں ترم
گر خصم صد ہزار کند سحر سامری   چوں اژدر کلیم بیک دم فرو برم

نعت میں ان کا شعر ہے ؎

خاتم ختم تو بہ شکستۂ نگینہائے قدیم
طرح نقش تازہ و نو در نشان انداختہ

اپنے ساتھیوں میں سے ایک معرز ستم ظریف کے بارے میں یہ اشعار کہے ہیں:

چند زنی لاف کہ در ساحری   سامریم سامریم سامری
ہر نفس معجزۂ عیسوی است   شعلۂ نور شجر موسویست
در سخنم نادرۂ روزگار   اہل سخن را منم آموزگار
ہر نفسم بردہ ز جادو شکیب   ہر سخنم سحر ملائک فریب
خسرو ملک ہمہ دانی منم   عالم اقلیم معانی منم
جوہریٔ سلک سخن دانیم   صیرفیٔ نقد سخن رانیم
ایں منم امروز بدیں داوری   شعلۂ آتش بزبان آوری
دعویٔ ایجاد معانی مکن   شمع نۂ چرب زبانی مکن
شعلہ سرشتا ز گہرہائے پاک   لاف مزن نیست چو در کیسۂ خاک
طبع تو ہر چند در ہوش زد   یک سخن تازہ نہ شد گوش زد
آنچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند   در کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند
خانہ کہ از نظم بیاراستی   آب و گلش از دگراں خواستی
سقف منقش کہ دریں خانہ است   رنگ وے از خامۂ بیگانہ است
طبع تو دارد روش باغباں   ساختہ باغی ز نہالی کساں
سبزۂ آں باغ ز زاغ دگر   ہر گل رعناش ز باغ دگر

غنچهٔ آں گرچہ رواں پرور است   لیک زخونِ جگرِ دیگر است
بید کہ بے میوہ سر بر کشید   برگش ازاں دانہ مشجر کشید
تازگیٔ آں نہ ز باراں تست   از خوئے پیشانیٔ یاراں تست
چند پئے نقد کساں سوختن   چشم بہ مالِ دگراں دوختن
جمع کمن نقد سخن پروراں   کیسہ کمن پُر ز زرِ دیگراں
شربتِ بیگانہ فراموش کن   آب ز سرچشمۂ خود نوش کن
گر خضری آبِ حیاتِ تو کو   ور شکری شاخِ نباتِ تو کو
نخلِ عفت سر بہ فلک می بری   میوہ بجز خستہ نمی آوری
سرو کہ بر چرخ بساید سرش   چاشنیٔ میوہ نباشد برش
بر سخنِ خویش تفاخر چراست   بر منِ دلخستہ تمسخر چراست
من اگر از شرم نگویم سخن   حمل بہ بیدانشِ من مکن
نے چو رطب سینہ پر از خستہ ام   ہم چو صدف پر دُر و لب بستہ ام
من اگر از بند کشایم زباں   لب نکشانید ز باں آوراں
طعنہ چو ابلیس بآدم مزن   حالتِ من درنگر و دم مزن
ساحریم من کہ بہ دردِ فسوں   لعبتی از سحر بر آرم بروں
غلغلہ در زہرہ و ماہ افگنم   نسخۂ ہاروت بچاہ افگنم
ایں منم آں ساحرِ جادو مزاج   کز سخنم یافتہ جادو رواج
منکہ بہ جادو سخنے شہرہ ام   ہم فلک و ہم مہ و ہم زہرہ ام
ساحریاں در گرہ موئے من   بابلہا در چہِ جادوئے من
دولتِ ایں کار بکامِ من است   سکۂ ایں ملک بنامِ من است
از سخنم طرزِ سخن یاد گیر   عار مکن دامنِ استاد گیر
ہر کہ باستاد ارادت برد   در دو جہاں گنجِ سعادت برد
یک سخن از نظمِ تو نبود درست   مضحکۂ اہلِ سخن نظمِ تست
گرچہ بروئے تو نگوید کسے   عیبِ تو پیشِ تو بگوید کسے
لیک بہ غیبِ تو ملامت گراں   انجمن آرائے سخن پروراں
شعرِ ترا گر بمیان آورند   عیبِ تو یک یک بزباں آورند
شعرِ ترا پیشِ تو تحسین کنند   وز پسِ تو لعنت و نفریں کنند

نے تو بکس یار نہ کس ! تو یار　　عیب تو بر تو نشود آشکار
وہ کہ یکے یار نداری دریغ　　مونس غم خوار نداری دریغ
تا بتو عیب تو نماید کہ چیست　　و آنچہ مجیب تو کشاید کہ چیست

جس زمانہ میں مَیں یہ تذکرہ لکھ رہا تھا، ان کے چند شعر میں نے منگوائے تھے۔ جواب میں انھوں نے یہ رقعہ لکھا تھا:

"وقت یہ آن پڑا ہے کہ اپنی متفرق خرافات کو جمع کروں۔ بہر حال آپ کے احسان پر آفریں ہے۔ دو جزو لکھے ہیں، ایک نثر ہے اور دوسری مثنوی، جو ادھوری رہ گئی ہے۔ انشاءاللہ کل یا پرسوں تک اکٹھا دے دوں گا، فی الحال مثنوی کے چند شعر: "سامریم سامریم سامری" روانہ کر رہا ہوں اصلاح فرمادیں اور جو کچھ لکھنے کے قابل ہوں علٰحدہ کر لیں۔"

ایک اور رقعہ میں اولگوں بادشاہ اور اکبر کے بزرگوں کے سکے صاحب قراں تک لکھ کر میرے پاس بھیجے تھے۔

ناصحی یہ جمال خاں ولد میاں منگن بدایونی کا تخلص ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ نہایت قابل با اخلاق نوجوان تھا۔ اسی کی محبت تھی کہ میں نے بدایوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ شعر گوئی کے عمدہ نمونے چھوڑ گیا۔ اگر زندگی رہتی تو علم وفضل میں بڑی ترقی کر لیتا۔

نمونۂ کلام:

بشنو ایں نکتہ سنجیدہ ز پروردۂ عشق
کہ بہ از زندۂ بے عشق بود مردۂ عشق

ترک من زخم بہ ہنگام سواری زدہ　　لذتے دارم ازیں عشق کہ کاری زدہ

خان کلال کا مطلع ہے ع

در جوانی حاصل عمر بہ نادانی گذشت

اس نے اس پر یہ شعر کہا ؎

ہر سلیمانے کہ خود را کمتر از مورے ندید
عاقبت برباد رفت و آں سلیمانی گذشت

ملا نویدی نیا نیا خان خاناں کی خدمت میں شامل ہوا تھا ؎

قضا کہ نامۂ جرم شراب خوارہ نوشت
نوید عفو خداوند بر کنارہ نوشت

نہانی یہ آگرہ میں ایک بوڑھی شاعرہ تھی۔ غالباً ہرات کی رہنے والی تھی۔ یہ اس کا مطلع ہے:

روز غم شب درد بے آرام پیدا کردہ ام
درد مندیہا دریں ایام پیدا کردہ ام

بہت سے شاعروں نے اس کے جواب میں شعر کہے لیکن کوئی اس کے برابر کا نہیں۔ ع

چہ مردے بودی کز زنے کم بود

اس کا لڑکا جعفر اب کشمیر میں احدی ہے۔ یہ ایک قابل نوجوان ہے اور میر بحر معین کی سرکار میں ملازم ہے۔

نجاتی گیلانی ہندوستان آنے کے بعد فوت ہوگیا۔ شعر و معما خوب کہتا تھا ؎

اے دلم دور از تو در آتش دو دیدہ خوں فشاں
بے توام در آب و آتش آشکارا و نہاں

"ابل" کے اسم کا معما کہاں ہے۔

حل نہ شد از دل تو مشکل ما
از دلت وہ کہ آب شد دل ما

نوعی اپنے آپ کو شیخ حاجی محمد خبوشانی کا پوتا بتاتا تھا۔ لیکن اس کے اعمال ایسے تھے جو اس کے دعویٰ کو جھٹلاتے تھے۔ نہایت شوخ طبع آدمی تھا۔ اب چھوٹے شاہزادہ کی ملازمت میں ہے۔

نوعی سبوکش میم و لعبد مردتم
خورشید دار آبلہ ام جوش می زند

غم نوعی نہ ز لبیاریٔ درد و الم است غم از انست کہ در حوصلہ گنجائی نیست

باز شو تم رہے گرفتہ بہ پیش
کہ دراں راہ خضر بے حذر است
گل صحراش خار مژگاں است
سنگ آں راہ کاسہائے سر است

نیازی بخارا کا رہنے والا ہے۔ نہایت بدمست بے حیا آدمی تھا لیکن صحیح معنوں میں شاعر تھا۔ شعر، عروض، معما، تاریخ اور دوسری تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان موضوعات پر اس کی تصنیفیں بھی ہیں۔

جب ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجلس میں اس نے بایاں پیر آگے بڑھا دیا۔ ہمایوں ادب آداب کا نہایت پابند تھا، اس لیے کہا ملا یہ بایاں پیر ہے۔ پھر حکم دیا کہ اس کو باہر لے جاکر دوبارہ مجلس میں لاؤ۔ جب اسے بیٹھنے کا حکم ملا تو اس نے بیہودہ باتیں شروع کر دیں اور ملا بیکسی سے بحث کرنے لگا اور میر عبدالحی صدر سے جو

بیکسی کی تائید کر رہا تھا کہا بیکسی کے چہرہ پر پھٹکار کیا کریں کہ ہم بھی بے کس بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت خواجہ حسین مروی نے جو منفعل مزاج آدمی تھا، میر عبدالحی کی تائید میں کچھ کہا تو اس نے ان سے کہا "خواجہ تم کیوں پشتی لے کر آگئے"۔

ہمایوں کو اس کی یہ حرکتیں سخت ناگوار گزریں اور وہ محفل سے اٹھ گیا، اسے سزا ملتی لیکن ہمایوں کی بردباری اور حلم ایسا تھا کہ کچھ نہ کہا۔

اور النہر کو چھوڑنے کا سبب اس کی غزل کا یہ مقطع تھا:

برفلک نیست شفق بادۂ گلفام من ست
رند دردی کشم و طاس فلک جام من ست
تا نیازی شدہ در ملک سخن خسرو عہد
نام جامی شدہ منسوخ کنوں نام من ست

کہتے ہیں ٹھٹھہ میں ایک دن وہ اپنی یہ غزل سنا رہا تھا۔ مولانا جامی کا دیوان بھی موجود تھا۔ جب اسے کھولا گیا تو اس کے حسب حال یہ شعر نکل آیا ؂

چرخ را جام نگوں داں کہ مئے عشرت تہی ست
بادہ از جام نگوں جستن نشان ابلہی است

ایک دن نیازی نے فسونی شاعر کو خواب میں دیکھا کہ اس نے اس کی داڑھی پر پیشاب کر دیا کسی شاعر نے یہ سن کر قطعہ کہا ؂

فسونی را نیازی دید در خواب
بریش او ز شیشہ آب پاشید
اگر شاشید بر ریشش مبارید
سگے بر بوتۂ شاشید شاشید

نیازی کے شعر ہیں:

بروئے آتشیں زلف تو اے سیمیں بدن پیچد
بے چوں موئے بر آتش فتد بر خویشتن پیچد

چو تو آنم کہ بر گرد سرآں تند خو گردم خیالش در نظر آوردہ ہر دم گرد او گردم

در تحرک نیست از باد صبا پیراہنش
بلکہ جانی یافتہ پیراہن از لطف تنش

اس کی وفات ٹھٹھہ میں ہوئی۔

نامی | یہ میر محمد معصوم عنفوی ولد میر سید عنفائی کا تخلص ہے جو بکر کے اکابر سادات میں سے ہے میر محمد امرائے شاہی میں شامل ہے اور کسی خدمت پر سندھ اور قندھار کے علاقہ میں متعین ہے۔ نہایت درویش مزاج، با اخلاق، دیانت دار، بہادر اور سخی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری، نماز اور تلاوت کا بڑا پابند ہے۔

کسی نے اس سے کہا اس راستہ میں راہنمائی کے بغیر کام نہیں چلتا، کسی مرشد سے تلقین حاصل کرو۔ اس نے جواب دیا کہ فی المحال دو تین مرشد ہیں اب کسی اور کی کیا حاجت۔ میں جس وقت وطن سے دار الخلافہ میں پہنچا تو ہوا و ہوس کا یہ زور تھا کہ ہزاری دو ہزاری منصب نظروں میں نہیں جچتا تھا لیکن جب دربار میں پہنچ کر چوبداروں اور دربانوں کے ڈنڈے کھائے اور خوب ذلتیں اٹھائیں تو اپنی حیثیت معلوم ہو گئی۔ پھر بڑے انتظار بعد بیستی کا عہدہ نصیب ہوا اور جوانی کے وہ سارے دعوے ہوا بن کر اڑ گئے، ناچار راضی برضا تسلیم کی خو پیدا کر لی اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ وہی مثل ہے کہ "میں نے کچھ بن جانا چاہا کچھ بھی نہ رہا اپنے آپ کو چھوڑ دیا تو سب کچھ بن گیا"۔

نیم ملول کہ کارم نکو نہ شد بد شد
شود شود نشود گو مشو چہ خواہد شد

اگر کوئی مرشد بھی ہوتا تو وہ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم دیتا۔

ہمارا دوسرا مرشد میر ابو المغیث بخاری ہے۔ جو عہدہ اور مرتبہ میں ہم سے کئی درجہ بڑا تھا جب تک اس سے شناسائی نہیں ہوئی تھی ہمارا یہ حال تھا کہ اگر کسی دن ہمارے گھوڑوں کو دانہ چارہ نہیں ملتا تھا تو غم و غصہ کے مارے کسی سے بولتے نہیں تھے، لیکن جب میر کی صحبت نصیب ہوئی تو ہم نے ان کا یہ رویہ دیکھا کہ کبھی کبھی دو چار روز اچھے گزر جاتے تھے ورنہ ان کے طویلہ میں گھانس کا ایک تنکہ رہتا تھا نہ مطبخ سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ باوجود اس کے وہ اس قدر خوش و خرم ہنستے بولتے رہتے تھے کہ کسی پر ان کی تنگ دستی کا حال نہیں کھلتا تھا، نہ وہ اس سلسلہ میں کسی سے کچھ بولتے سنتے تھے۔ ان کے نزدیک خوش حالی اور بدحالی دونوں بس ایک جیسے ہی تھے ؎

از حادثات درصف آں صوفیاں گریز
کہ بود غم کنند وزنا بود شاد مال

اس وقت ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ جب ایسے بڑے آدمی پر بھی یہ وقت گزرتے رہتے ہیں اور وہ حالات کی ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتا تو ہمارے لیے تو بے فکر رہنا کہیں زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہم اس کے دولت و مرتبہ کا دسواں حصہ بھی نہیں رکھتے۔

ہماری تیسری مرشد ایک کنیز ہے۔ جو بادشاہ سلامت نے مرحمت فرمائی تھی۔ جس وقت بھی شیطان بہکاتا ہے

اور ہوا و ہوس زور کرتے ہیں اور طبیعت نظربازی شہوت پرستی کی طرف جھکنے لگتی ہے تو ہم فوراً جاکر اس کی صحبت میں آسودگی حاصل کر لیتے ہیں اور پاک و صاف ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مرشد کا کام اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ وہ ناشائستہ کاموں سے بچالے۔

میر طالب علم میں بھی بڑے کوشاں رہے۔ شعرگوئی اور معما کہنے میں بڑا اچھا ذوق ملا ہے۔ نہایت بلند فطرت آدمی ہے۔ یوسف زلیخا کی بحر میں ایک مثنوی کہی ہے۔ ایک دیوان بھی ہے۔

نمونۂ کلام:

چہ خوش است آنکہ از خود روم و تو حال پرسی　　بتو شرح حال گویم بزبان بے زبانی

چوں گریۂ من دید نہاں کرد تبسم

پیداست کہ ایں گریۂ من بے اثری نیست

در عشق نشہ ایست کہ عشاق خستہ را

ذوقی ست در فراق کہ اندر وصال نیست

داد پیغام بہ قاصد مہ من خندہ کناں　　ظاہر است از سخن او اثر خندہ ہنوز

اس نے احمد آباد سے ٹھٹھ میں میرے پاس اپنا قصیدۂ منقبت روانہ کیا تھا، جس کے چند شعر ہیں:

داغی کہ بود بر دلم از عشق در ازل　　از دولت فراق تو یا در شد بدل

طوفان آتشی کہ دل از درد بر کشید　　افگندہ در مزاج زمین و زماں خلل

ہستم ز آفتاب شفیعی امیدوار　　روزیکہ ہیچ جا نبود سایۂ امل

باران ابر رحمت و ساقی روز حشر　　آں دیں پناہ اعظم و آں صاحب اجل

رباعیات

تنہا با خود در انجمن باید بود　　با خویش ہمیشہ در سخن باید بود

ہم بلبل و ہم گل چمن باید بود　　دیوانہ کار خویشتن باید بود

فریاد رحیل از ہمہ کس می شنوی　　آواز دراز پیش و پس می شنوی

کردہ ہمہ شب گیر بسر منزل دور　　تو خفتہ بر آہنگ جرس می شنوی

اے آنکہ براں رخت نظر می باید　　چشم تو ورائی چشم سر می باید

خواہی کہ از حشو ہاش غافل نشوی　　در چشم دلت چشم دگر می باید

عشقت نہ متاع ہر خریدار بود　　او را دو جہاں بہائے یکبار بود

گل نیست کہ در کوچہ و بازار بود　　یا مشک کہ در دکان عطار بود

ز آلائشِ روزگار اندر گلہ
عیب دگیراں مکن تو ہم زاں گلہ
پرہیز از آلودگیٔ دامن خویش
نامی دو سہ روزے کہ دریں مرحلۂ

در عشق بتاں مشق جنوں باید کرد — جاں را بہ فراق رہنموں باید کرد
چوں شیشہ تمام پر ز خوں باید شد — وانگاہ دل از دیدہ بروں باید کرد
در مذہب ما بہ حیلہ یکساں می باش — در دائرہ کفر با ایمان می باش
ایں است طریق عشق جانانۂ ما — زنار بگردن و مسلمان می باش
گلزار جمال عارض دلدارم — چوں جلوہ دہد بخاطر افگارم
دریا دریا جہاں جہاں خوں ریزم — بستاں بستاں چمن چمن گل بارم

نظیری نیشاپوری لطافت طبع اور نفاست ذوق میں دوسرا شکیبی اصفہانی ہے۔ خان خاناں کی سرکار میں سلسلۂ شعراء میں شامل ہے۔

شیخ نظامی گنجوی کا قصیدہ ہے ؎

ملک الملوک فضل بہ فضیلت معانی
زمین و زماں گرفتہ بہ مثال آسمانی

اسی زمین میں نظیری کا قصیدہ ہے:

زہتر بہ خود نگنجم چو بہ خم میٔ مغانی — بدرد لباس بر تن چو بجو شدم معانی
بہ فسانہ ام مزن رہ کہ ز آتش عزیمت — بدماغ و دیدہ خواہم ہمہ شب کند دخانی
شدہ ام باعتمادی بہ سوال وصل پویاں — کہ نمی کنم توجہ بر جواب لن ترانی
سگ آستانم اما ہمہ شب قلادہ خایم — کہ ہوائے صید دارم نہ خیال پاسبانی

کمر در خدمت عمر یست میبندم چہ شد قدرم
برہمن می شدم گر ایں قدر زنار می بستم

خونخوارہ راہی میروم تا خود بہ پایاں کی رسد — پائے کہ ایں رہ سر کند آخر بداماں کی رسد

اثر نگہ کہ بلب نا رسیدہ آہ ہنوز
ہزار آبلہ دل بر سر زباں دارد

نوائی میر محمد شریف نام تھا۔ میر قدسی کربلائی اس کا بھائی ہے جس کا یہ شعر مشہور ہے ؎

گر ذوق خرمی نہ شناسم عجب مداں — قدسی بہ عمر خویش چو خرم نبودہ ام

نوائی ہندوستان میں بادشاہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کا انتقال ہوا ہے۔

نمونۂ کلام:

منم نشستہ بکنجے ز بلے وفائی تو — قرار دادہ بجود محنت جدائی تو
بگرم خوئیت از جانبی روم چکنم — کہ اعتماد ندارم بر آشنائی تو
تو در طریقۂ مہر و وفا نہ آں شمعی — کہ نور دیدہ فروزد ز روشنائی تو

بہ ہیچ جا نرسیدم بہ ہیچ رہ نگذشتم
کہ در دلم نگذشتی بہ خاطرم نرسیدی

بہ نشیں بہ غمزۂ و ستم آلودہ بہ مخیز — دیر آمدی بہ پرسش ما زود بر مخیز

نویدی نیشاپوری خاصا پڑھا لکھا تھا۔ شعر گوئی میں صاحب مرتبہ شاعر ہے۔ اس کا انتقال ۹۷۳ھ میں حج کو جاتے ہوئے ملک مالوہ اجین میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

اگرم ز اشک گلگوں شدہ لالہ گوں زنیہا
نتواں شدن پریشاں گل عاشقیست اینہا

ہلال خواست شدن حلقۂ در شب عید — ز دور لیست خیالی و لے بہم نرسید
چہ شوقیست ہر لحظہ روئے تو دیدن — چہ ذوقیست ہر دم بکویت رسیدن
چنانم فتادہ است پیوند با تو — کہ نتواں بہ صد تیغ از تو بریدن
نویدی ز لعل لب او چہ حاصل — جز انگشت حسرت بدنداں گزیدن

نظمی تبریزی جوہر شناس شاعر تھا۔ طبیعت شعر میں خوب لڑتی تھی۔ ایک دیوان مرتب کر چکا تھا جو بہت مشہور ہوا۔

نمونۂ کلام:

شوخی کہ بو لب بہ فنون آلودہ
اہل نظرند ازو جنون آلودہ
بر بستہ بسر چہرۂ سرخ است او ما
یا رشتۂ جان ماست خون آلودہ

داغ جفائے یار کہ بر سینۂ من است — داغ عشق مخواں کہ مونس دیرینۂ من است
چناں خواہم نوشتن صورت احوال در نامہ — کہ میگردد ز آب چشم من فی الحال تر نامہ
کبوتر نامہ ات آورد و ماندم زندہ می مردم — نمی آورد آں مرغ ہمایوں فال گر نامہ
سراسر می نویسم حال نظمی را با و اما — کجا خواہد گذشت آں سرو فارغ بال بر نامہ
بحمام پری خانم پری رخسارۂ دیدم — نشستہ در میاں آب آتش پارۂ دیدم

ز دل ربودن و بیگانگیت ظاہر شد
کہ ہر بردن دل بود آشنائی تو

خطی کہ بر گل رخسار یار پیدا شد — بنفشہ ایست کہ از لالہ زار پیدا شد

وقومی نیشاپوری شہاب الملک احمد خاں کا داماد ہے۔ اس کا نام محمد شریف ہے لیکن اعمال ایسے کثیف ہیں کہ اس نام کی مٹی پلید ہو گئی۔ سبے دینی اور الحاد میں وہ ہر ملحد بدنام سے آگے تھا۔ اعتقاد میں نہ تو بسخوانی تھا نہ عباحی بلکہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ ادوار و تناسخ کا قائل، بلکہ اس عقیدہ کا پکا پیرو تھا۔

ایک دن بھمبر میں جو کشمیر کا سرحدی شہر ہے، وہ میرے پاس کشمیر جانے کے لیے کچھ ہمراہیوں کی تلاش میں آیا۔ وہاں پتھر کی بھاری بھاری سلیں پڑی ہوئی تھیں، انھیں دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ کہنے لگا "آہ یہ بیچارے انسانی قالب میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں"۔

اس بداعتقادی کے باوجود اس نے ائمہ علیہ السلام کی شان میں منقبت بھی کہی ہے، شاید یہ اس کے ابتدائی زمانہ کی چیز ہو۔ خوش نویسی، انشاپردازی وغیرہ میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ علم تو حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن عربی تاریخیں پڑھنے کی مہارت از خود پیدا کر لی تھی۔

نمونۂ کلام:

نالہ تا از تو جدا فاش نسازد رازم
بر نیاید شب غم کاش ز ضعف آوازم

جہاں بہشت ز خصمت سر بر آرم چوں مرا بینی — کہ ماند از دست غشم بر زباں گفتگوئے تو
مرا تاب جفائے غیر در دل آتش افگندہ — کہ عد بارش گر آزاری نمی آرد بروئے تو

در زیر زخم تیغ تو عمداً نمی تپم
شاید ز ناتوانیٔ خویشتن خبر کنم

مرا از بے قراری ہائے ہجراں میکند آگاہ — در ایام جوانی حال من پرسید پنداری

ہر کرا بینم ز خوباں بسکہ دارم ذوق عشق
شعلہ از جانم بر آرد آتش سودائے او

ہر ساعتم بجرم دگر متہم کنی — آزار جوئی من ز تو اینہا عجب نیست

نمی خواہم کہ در روز جزا پرسش کنند از من
کہ ترسم بادیم گفتن کہ در عشقت چہا دیدم

ہیچ کس ماندہی غیر من آزار دوستم — کہ بسر دکار ہمیں با من تنہا داری

شب فراق تو صد گونہ ماتم است مرا   دریں بہانہ بآہ و فغاں کہ سر دارد

میتواں دید از بدن سوز دلم را در بدن
ہمچو نور شمع فانوس از درون پیرہن
از غم افتادم بحال مرگ ہنگام وداع
تا شوی آگہ کہ در ہجراں نخواہم زیستن

امام حسینؑ کی منقبت میں کہتا ہے :

ہر گہ از طغیانی سوز عشق در گیرم چو شمع   شعلہ خود را ہر زماں بر من زند پروانہ سال
گر ز فیض خاطرت گردد طبیعت بہرہ ور   میتواں پرداختن در یک سخن صد داستاں
شاہداں بکر معنی چوں شود نکرم بلند   عرض حسین خود کنند از غرفہائے آسماں

گہ جور آید از تو دلم تن در اں دہد   شاید ترا خدائی دل مہرباں دہد
دارد ہلاک غیرت آنیم کہ عشق تو   دردی بجاں ہر کہ دہد جاوداں دہد
شبہا کہ بر فروزم از اندیشۂ تو دل   سوز دلم چراغ بہ ہفت آسماں دہد

یہ اس قصیدہ کے شعر ہیں جو حضرت خاتون جنت بی بی زہراؑ کی منقبت میں کہے ہیں۔ لیکن یہ طرز مجھے بے ادبانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے مدح کے شعر درج نہیں کیے۔

شریف وقوعی نے ۱۰۰۲ھ میں انتقال کیا۔ اس کے ترکہ میں نفیس کتابیں تھیں جو شاہی کتب خانہ کے پیٹ میں سما گئیں۔

وداعی ہروی

تھوڑا بہت لکھا پڑھا آدمی تھا۔ ہندوستان میں آنے کے بعد انتقال ہوا۔

سواد ہند کہ پر ظلمت ست چوں شب ہجراں
کسے کہ آمدہ ایں جا بہ حسرت ست و ندامت
ز ملک ہند وداعی مجو غنیمت و بگذر
غنیمت است اگر جاں بری ز ہند سلامت

اس مطلع کے رنگ میں :

خوش آں زماں کہ بدیدت نظر کناں روم از خود
زماں زماں بخود آیم زماں زماں روم از خود

اس نے کہا ہے :

نہ از شراب بہ بزم تو ہر زماں روم از خود   پیالہ لعل تو بوسد ز رشک آں روم از خود

واقعی ہروی ابن علی نام تھا۔ بادشاہی ملازمت میں تھا۔

نہ بر جبین تو از روئے ناز چیں پیداست   کہ بحر حسن تو زد موج وایں چنیں پیداست
ہنوزت از مئے ناز است نشۂ در سر   ز سر گرانیت اے ترک نازنیں پیداست
چو شمع سوز دل خود چہ آورم بر زباں   کہ سوز را اثر از آہ آتشیں پیداست
چہ احتیاج بہ ماہ نواست در شب عید   ترا کہ ماہ نو از چاک آستیں پیداست

در لعل او ہم ماند آب زندگانی را
بلی جان در میاں باشد ہم یاران جانی را

دلم چو آئینہ ز امروز کس غبار ندارد   کہ چشم مردمی از اہل روزگار ندارد

اے خوش آں مستی کہ آرد بے خبر سوئے توام
وآں چناں باشد کہ نتواں بردن از کوئے توام

شود ہر ذرہ بے تابی ہوائی کوئے آں مہ ہم   خیال بے وفائی ہائے او گیرد سر راہم

سر زلفش بر آں رخ از نسیم آہ ما لرزد
چو دود شمع کز آمد شد باد صبا لرزد

وصفی میر عبد اللہ نام ہے۔ بڑا اچھا خوش نویس ہے۔ سات قلم میں خوش نویسی کرتا ہے۔ شاہ غیاث اور مولانا راقمی کا شاگرد ہے۔ احدیوں کے زمرہ میں داخل ہے۔ اپنی والدہ کی طرف سے میرزا نظام الدین احمد کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتا ہے۔

کنوں کہ لذت اندوہ عشق دانستم
ہزار رنگ بہر خندہ گریہا دارم

رباعی:
تو عشق کہ باطنم شب دیجور است   اسرار حق از دانش من مستور است
باشد کہ محبتم رساند ورنی   زیں سعی شکستہ مقصد دور است
اگر ارادۂ مدح بزرگئ تو کند   زجان نہ جنبد اندیشہ از گراں باری
چناں نزاع بہ عہد تو از میاں برخاست   کہ پنبہ را کند از صدق شعلہ غمخواری

وصلی بڑا زبان آور، خوش طبع شاعر ہے۔ عراق سے حجاز گیا، پھر وہاں سے بحری سفر کرتا ہوا ہندوستان آیا۔ جہاز والے طوفان میں بہہ گئے۔ وہ بھی بہتا بہاتا قطب شاہ دکن کے ساحل کے قریب پہنچ گیا اور اس کے دربار میں آگیا۔

ایک موقع پر اس نے ایک پہلوان کو کشتی میں پچھاڑ دیا تھا۔ پہلوانوں نے حسد کے مارے اسے زہر دلا دیا

اور وہ ۹۷۷ھ میں فوت ہو گیا۔ یہ اشعار اس کی یادگار ہیں:

دل فریبانہ برہ می رود و می ترسم
کہ مبادا بودش دل نگرانی از پے

نگار من تو چناں تند خو بر آمدۂ   کہ کس بر تندیٔ خوئی تو بر نمی آید

وقوفی ہروی میر واعظ کے نام سے مشہور ہے۔ بدخشاں اس کا وطن ہے۔ اس کی وعظ کی مجلس میں بڑی رونق رہتی تھی۔

گر سرم خاک رہت گردد و برباد رود   نیست ممکن کہ خیال رخت از یاد رود

چوں سر زلف تو گردید پریشان دل من
یک سر مو نکشادی گرہ از مشکل من

بے تکلف گرد باد وادیٔ غم گشتہ ام   ہر نفس شوم سرگرداں عالم گشتہ ام

بگذشت ز حد قصۂ درد و الم ما
عشق آمد و بگرفت ز سر تا قدم ما

وفائی اصفہانی کچھ عرصہ تک کشمیر میں رہا پھر لاہور آ کر زین خاں کوکہ کے ہاں رہنے لگا۔

در دل نیم شباں کوب کہ چوں روز شود
ہمہ درہا بکشایند و درش بر بندند

قحط وفاست اینکہ بگویان روزگار
خوانی نہند و خون دل میہماں خورند

ہمدمی یہ میرزا برخوردار خان عالم ولد ہمدم بیگ کا تخلص ہے جو ہمایوں بادشاہ کا مشہور امیر تھا۔ بہادری اور نیکی میں اس کی بہت شہرت رہی ہے۔ یہ اس کے اشعار ہیں:

دل من ہی ز ہر سو تازہ داغی از جنوں دردی
محیط محنت است و ہر طرف گرداب خون دردی

آصفی کی غزل کا مطلع ہے:

قاتل من چشم می بندد دم بسمل مرا
تا بماند حسرت دیدار او در دل مرا

اس کے رنگ میں بادشاہ کے حکم سے اس نے کہا:

آمد و بگذشت از دل تیر آں قاتل مرا
ماند تا روز قیامت داغ او در دل مرا

جس زمانہ میں یہ غزل آگرہ میں محفلوں کی چیز بنی ہوئی تھی، شیخ فیضی نے اسی رنگ میں کہا تھا:

پا برو بگذار اے قاتل دمِ بسمل مرا
تا بایں تقریب پابوسی شود حاصل مرا

فیضی نے ان دنوں اپنے دیوان میں سے اس طرز کی غزلیں نکال نکال کر مقبول عام بنانے کی کوشش کی تھی۔

ہجری یہ شیخ جامی کی اولاد میں سے ہیں۔ نہایت متقی اور فرشتہ خصلت آدمی ہیں۔ ان کا ایک دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

رباعی:

اے گل کہ نمیرسد بداماں تو دست
برنام تو عاشقیم و بر بوئے تو مست
ایں طرفہ کہ حاضری و غائب زمیاں
پنہانی و ظاہر از تو ہر چیز کہ ہست

سحر نوائی طرب نے کہ شوق انگیز است — انیس مجلس گل بلبل سحر خیز است
ہمائے سدرہ نشیں شو زاوج دولت عشق — کہ باغ و منظر ایں دہ کدورت امیز است
دہاں ز درد معاصی بآب توبہ بشوی — کہ رفت عمر بعصیان و وقت پرہیز است
بہ پوش جوشن طاعت کہ در کمینگہ عمر — بدست رہزن ایام تیغ خوں ریز است
مساز قصر امارت دریں رباط دو در — کہ فتنہ رخنہ گر و صرصر اجل تیز است
بحسن نظم حسن ہجری از طریق کمال — مرید عارف شیراز و پیر تبریز است

خوش است موسم و لے خاصہ در بہار شباب — گل نشاط اگر بشگفد ز جام شراب

خوش آں شبی کہ سر کوئے دیر منزل بود
فروغ طلعت ساقی چراغ محفل بود
نسیم وصل دلارام زندگی بخشید
وگرنہ زیستن از دست ہجر مشکل بود

سحر کہ وقت گل و جلوۂ شقائق بود — ہماں فاختہ بر نکتۂ حقائق بود
مرا در کوئے رسوائی سرائے است
درے افتادہ دیوارے شکستہ

دی ہوائے حرم و عزم گلستاں کردم — رفتم و طوف سرا پردۂ جاناں کردم

گل مگر از بغل یار بہ گلزار آمد
کہ زگل بوئے خوش پیرہن یار آمد

باز دل آشفتہ چشماں سحر انگیز کیست
یا ز زنجیر جنونم زلف عنبر بیز کیست

ازاں نامہرباں ترسم خلل در کار جاں افتد
مبادا ہیچ کس را دلبرے نامہرباں افتد

من کیم افتادہ بر خاک درش بے چارۂ
نامرادی بیکسی از خان ماں آوارۂ

اے دل آوارہ بر خاک درش جا کردۂ
نیک جائی از برائی خویش پیدا کردۂ

گر ترا ہست بہ یاراں وفادار سری
بوفایت کہ زمن نیست وفادار تری

طلب کار وصالت گشتہ عمرے جستجو کردم
میسر چوں نہ شد وصلت بہجراں تو خو کردم

ہاشم

محمد ہاشم کا ذکر بیرم خاں خان خاناں کے تذکرہ میں آ چکا ہے۔ یہ مولانا شاہ محمد انسی کا بھتیجا ہے کبھی سمائی اور کبھی وائی تخلص کرتا تھا۔ آخر اسی تخلص پر وفات پائی۔ شعر گوئی کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔

قمری بباغ بہر چہ فریاد می کنی
گویا ز سرو قامت او یاد می کنی
گنجشک وار بستۂ دام تو گشتہ ام
نے میکشی مرا و نہ آزاد می کنی

روم در باغ بے روئی تو اشک لالہ گوں ریزم
بپائے ہر گل بہ نشینم و از دیدہ خوں ریزم

درونم چوں صراحی خوں شد از اندوہ و می خواہم
کہ در بزم تو ایں خونابہ را از دل بروں ریزم

بجز خاک درت جائے نہ ریزم اشک از دیدہ
بہر در آبروئے خویشتن بر خاک چوں ریزم

بیاد روئے گندم گوں او در مزرع سودا
ز اشک دانہ دانہ و میدم تخم جنوں ریزم

صراحی وار ہاشم دمبدم از لعل میگونش
سرشک ارغوانی از نوائے ارغنوں ریزم

عکس نہ در می فگند خال تو اے سیم بر
مردم چشم من ست غرقہ بخون جگر

رباعی:

اے زلف تو زنجیر دل شیدا ایم
شیدائی آں دو زلف عنبر سایم
گفتی کہ ہلاک شو بسودائی غم
عمریست کہ من ہلاک ایں سودایم

ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس کی ایک غزل خان خاناں بیرم خاں نے ایک لاکھ تنکہ میں خریدی تھی۔ اس غزل کا مطلع ہے:

می کیستم عناں دل از دست دادۂ
وز دستِ دل بہ راہ غم از پا فتادۂ

اس کا انتقال لاہور میں ۹۷۲ھ میں ہوا۔

خاتمہ

یہ ان چند شاعروں کا تذکرہ تھا جن میں سے اکثر مؤلف کے ہم عصر ہیں اور ان کے اشعار و دیوان مشہور اور زبان زد عام ہیں۔

جن شاعروں کا ذکر اس انتخاب میں نہیں آیا ان کے تذکرہ کی ذمہ داری بعد میں آنے والوں پر ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ بہت دراز ہے اور کسی ایک زمانہ میں اس کا احاطہ کر لینا محال۔

در بستم جگر کرد روزی کباب | کہ می گفت گوینده ٔ ارباب
بسا تیر و دی ماه و اردی بہشت | بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت
کسانیکہ از ما غیب اندر اند | بیایند و بر خاک ما بگذرند

میرے اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانہ کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنوں کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا۔ نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہتے اور کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ بہرحال مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا۔

مرا تو عہد شکن خواندهٔ و می ترسم
کہ با تو روز قیامت ہمیں عتاب رود

لیکن مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی طرفداری میں ہے۔ میرا حال اس شخص کے بالکل مشابہ ہے کہ ایک گنوار آدمی ایک محفل میں پہنچا، وہاں دسترخوان بچھا ہوا دیکھا تو بے محابا ٹوٹ پڑا اور کھانے لگا۔ سارے تھال اپنے سامنے سمیٹ کر رکھ لیے۔ کسی نے پوچھا "بابا تم کون ہو اور اس زیادتی کا کیا مطلب؟ کہنے لگا "میں ترک ہوں اور داروغہ کا نوکر اور بھوکا ہوں"۔ اگر دوسروں کو بھی دینی خدمت کا درد اسی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ، میں تو ان لوگوں پر فدا ہو جاؤں جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کر دیں ورنہ وہ شرم سے گریبان میں اپنا منہ چھپا لیں۔

اصل میں دیکھا جائے تو میرا یہ بلند پرواز تیز منقار قلم تو قیامت کے "دابۃ الارض" کی طرح ہے جو اس آخری زمانہ کے لوگوں کی پیشانی پر یہ مسلم وہ کافر کا نشان لگاتا گیا اور کسی کو رحمت سے کسی کو لعنت سے سرفراز کرتا رہا۔ حضور اکرمؐ نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے۔ صاحب "مرصاد العباد" نے چار سو سال

پہلے ہی بڑے درد سے کہا تھا۔

شاہاں جہاں یکجملگی بہ شتابید
تا بوکہ لبقیۂ ز دین دریابید
اسلام ز دست رفت پس بے خبرید
بگرفت جہاں کفر و شما در خوابید

ارباب تصنیف وتالیف کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں اور کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف کو منسوب کر کے اپنی اغراض ومنافع کی راہ نکال لیتے ہیں میں اس روش کے خلاف کسی طمع اور توقع کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانہ کے حالات وحقائق کے طالب ہوں اس سے استفادہ کر سکیں ۔

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں احکام دین میں جس طرح تغیر وتبدیل کیا جا رہا ہے اس کی ان ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ ہر وہ املا وانشاء کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی استطاعت رکھتا ہے صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بناء پر یا دوسرے فاسد اغراض کی خاطر حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات وحشویات کو خیرات وحسنات جتلانے میں باک نہیں رکھتا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ

یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں مبتلا ہو جائیں گے ۔ اس لیے میں نے کہ میں ان معاملات سے بخوبی واقف بلکہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، ضروری سمجھا کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں ظن وتخمین کا نتیجہ نہیں، قلمبند کر دوں۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

تاکہ میری سابقہ بیہودہ نگاری کا کفارہ ہو جائے اور اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے۔

مگر صاحب دلے روزی برحمت
کند در کار ایں مسکیں دعائے

مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چند معلومات درج کر دی گئی ہیں۔ اس لیے اس پر تصنیف یا تالیف کے وزنی نام کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ لاف وگزاف

شرفاء کی سیرت کے معارض ہے، مجھے تو اپنی اس نگارش پر شرم سی آ رہی ہے۔ فخر و مباہات کا کیا موقع اور اگر میں طبع پردازی سے بھی کام لیتا تو کیا ہوتا۔ یہ کھوٹی اور بے قیمت متاع میرے دعوے کے جھٹلانے کے لیے بہت کافی ہے

روبہی گفت با شتر کہ عمو　　از کجا میرسی تو راست بگو
میرسم گفت اینکہ از حمام　　شستہ ام ز آب گرم و سرد اندام
گفت آری کہ تناید اینت　　بس بود دست و پائے چرکینت

اب بس دعا اور مناجات کا موقع ہے اور بس

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

میرے پیش نظر تھا کہ اس شیرازہ میں کشمیر کی تاریخ اور سلاطین گجرات، بنگالہ و سندھ کے حالات اور ہندوستان کے عجائب و غرائب کا ذکر بھی شامل کر دیتا لیکن کہاں وہ تذکرے اور کہاں یہ مجموعہ، دونوں میں کوئی نسبت نہیں "قالین میں ٹاٹ کا پیوند" ریشم میں ریشم ہی کا بخیہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بروز جمعہ ۲۳ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۰۵۲ھ کو اپنے رہوار قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جتنا کچھ لکھا گیا، اس پر اکتفا کر لیا۔

بطور تعمیہ یہ قطعۂ تاریخ کہا گیا ہے:

شکر للہ کہ با تمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم گفت
انتخابی کہ ندارد ثانی[1]

---

[1] لفظ انتخاب سے سنہ ۱۰۵۲ھ نکلتا ہے۔ اگر اس لفظ "انتخابی" میں سے دوسرا حرف "ن" نکال دیا جائے تو سنہ ۱۰۰۲ھ نکلتا ہے۔

مصنّف کے حالات

منتخب التواریخ کے مصنّف کا نام عبدالقادر ابن ملوک شاہ بدایونی ہے۔ سخنوری اور حقیقت بیانی میں خاص طور سے تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ تخلص قادری تھا۔

مؤلف کی ولادت ۹۴۷ھ میں ہوئی۔ یہ تاریخ مصنف کے اس بیان سے نکلتی ہے جو اسی کتاب میں درج ہے کہ "مجھے اللہ تعالیٰ نے چالیس سال کی عمر میں بیٹا عطا کیا جس کا نام محی الدین رکھا گیا، اس کی ولادت بساور میں ہوئی ہے"۔

دوسری ایک عبارت جلد اول میں ہے کہ — "اس منتخب کا جامع ان دنوں (۹۶۱ھ) میں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ بارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے سنبھل گیا تھا۔

مؤلف نے اسلیم شاہ کے عہد میں میر سید محمد مکی کے پاس قرآن پڑھا تھا، جس کا ذکر اس نے جلد دوم میں کیا ہے — "میر سید محمد مکی سات قراتوں کے قاری تھے۔ میں نے سنبھل میں ان کے ہاں قرآن کی تلاوت درست کی تھی"۔

عربی علوم کی تحصیل اس نے اپنے نانا مخدوم اشرف کے پاس کی۔ اس کے والد ۹۶۸ھ میں ۲۷ رجب کو آگرہ میں اسہال کے عارضہ میں فوت ہوئے۔ ان کی لاش بساور لے جا کر دفن کی گئی۔

۹۶۰ھ میں بارہ سال کی عمر میں اس نے شیخ میاں حاتم سنبھلی کے ہاں قصیدۂ بردہ شریف اور فقہ کی کتاب کنز کے چند سبق پڑھے اور خود بقول مصنف اس نے بہت سے علوم کی تحصیل شیخ مبارک ناگوری سے کی۔ مصنف کے ہم سبق اور دوستوں میں میر غیاث الدین بھی تھا جس کا لقب نقیب خاں تھا۔

۹۷۵ھ میں عبدالقادر کی شادی بدایوں میں ہوئی۔

اکبر کے ہاں سلسلہ ملازمت ۹۸۱ھ سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ جلد دوم میں ذکر ہے کہ مصنف حسین خاں کی سرکار سے قطع تعلق کر کے بدایوں سے آگرہ آیا اور جلال خاں قورچی اور حکیم عین الملک کے وسیلہ سے بادشاہ کے ہاں باریاب ہوا۔ اکبر نے اس موقع پر کہا تھا "یہ بدایونی عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی خوب سرکوبی کرے گا"۔ اسی زمانہ میں شیخ مبارک کا بیٹا شیخ ابوالفضل بھی بارگاہ خسروی میں باریاب ہوا تھا۔

ماہ رمضان ۹۸۶ھ میں قاضی علی کی کوششوں سے مصنف کے نام ہزار بیگھہ اراضی کی مدد معاش منظور کی گئی۔

ملا عبدالقادر بدایونی دربار کی کتابوں کے ترجمہ اور تصنیف و تالیف کے کاموں اور کتابوں کے انتخاب پر مامور رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کتاب اتھربن وید ہے جس کے ترجمے کا مصنف کو حکم دیا گیا تھا لیکن وہ اس کا خاطر خواہ ترجمہ نہ کر سکے

اور یہ کام فیضی کے سپرد کر دیا گیا۔

ان کی دوسری کتاب "الاحادیث" ہے جس میں تیر اندازی اور جہاد کے سلسلہ کی چالیس حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔

تیسری تاریخ الفی ہے جس کی تصنیف پر سات آدمیوں کو اکبر نے مقرر کیا تھا۔ جس میں سے ایک ملا عبدالقادر بھی تھے۔

چوتھی کتاب مہا بھارت کا ترجمہ ہے جس کا نام رزم نامہ رکھا گیا ہے، جسے عبدالقادر نے نقیب خاں کے ساتھ مل کر مرتب کیا۔

پانچویں کتاب رامائن ہے۔ جس کا ترجمہ ملا صاحب نے ۹۹۷ھ میں چار سال میں کیا۔

چھٹی کتاب جامع رشیدی ہے، جسے حسب الحکم علامی شیخ ابوالفضل کے مشورہ سے ترجمہ کیا۔

ساتویں کتاب بحر الاسمار ہے جو کشمیر کی تاریخ ہے۔ اس کا ترجمہ سلطان زین العابدین نے کرایا تھا، لیکن بہت کچھ ادھورا رہ گیا تھا جس کی تکمیل حسب الحکم ملا صاحب نے کی۔

آٹھویں کتاب نجات الرشید ہے۔

نویں کتاب انتخاب تاریخ کشمیر ہے جو حسب الحکم بادشاہی تالیف کی گئی۔

دسویں کتاب معجم البلدان کے دس جزو کا ترجمہ جو عربی سے فارسی میں کیا گیا۔

گیارھویں تصنیف یہ کتاب منتخب التواریخ ہے، جو تین جلدوں میں ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی معقولات و منقولات دونوں طرح کے علوم کے فاضل تھے۔ عربی اور فارسی کے اچھے انشا پرداز تھے۔ نجوم، حساب اور ولایتی اور ہندی راگ راگنیوں سے بھی واقف تھے۔

اپنی اس تاریخ میں اُنھوں نے عہد اکبری کے چالیس سالہ واقعات کو جمع کیا ہے اور اس تصنیف کو اپنی زندگی تک چھپائے رکھا۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں جب اس کا چرچا ہوا تو جہانگیر نے ان کے بچوں کو بلا کر عتاب نازل کیا اور باز پرس کی۔ اُنھوں نے کہا ہم تو چھوٹے تھے ہمیں اس کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ پھر مچلکہ لکھ کر دیا کہ اگر یہ ہمارے پاس پائی گئی تو ہم سزا کے سزاوار ہوں گے۔

اس کتاب کا ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ نظامی ہے۔ آخر دو سال کے حالات خود مصنف نے جمع کیے ہیں۔

ملا قادری کو تاریخ گوئی میں بڑی مہارت تھی۔

ملا صاحب کو چونکہ میر سید محمد جون پوری کے داماد شیخ ابوالفتح گجراتی سے محبت و عقیدت تھی اس لیے لوگ ان پر بھی مہدوی ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔

سوانح وتاریخ

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
امام مالکؒ مصنفہ :- محمد ابوزہرہ ترجمہ وحواشی :- عبداللہ قدسی	امام مالک دارالہجرت حضرت امام مالک کے سوانح حیات پر جامع اور مفصل کتاب سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۵۰۰ صفحات بہترین ڈسٹ کور	۱۰/-
کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی تالیف :- رائے بہادر وی، پی مینن ترجمہ وتہذیب :- رئیس احمد جعفری	تقدیر کس طرح بدلتی ہے؟ واقعات کس طرح پلٹا کھاتے ہیں؟ اور انقلاب کا چکر کس طرح چلتا ہے۔ کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ سائز ۶½" × ۱۰" صفحات ۳۰۰ نقشے ۲	۶/-
حیدرآباد۔ جو کبھی تھا رئیس احمد جعفری	سقوط حیدرآباد کی سبق آموز اور افسوسناک کہانی کے اہم منشی اور وی پی مینن کی خود نوشت داستان منشی مینن کے افکار وخیالات پر سیر حاصل تبصرہ سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۵۰۰ صفحات علاوہ رنگین وسادہ تصاویر کے ساتھ۔	۱۰/-
نشان حیدری تاریخ ٹیپو سلطان تصنیف :- سید میر حسین علی کرمانی ترجمہ :- محمود احمد فاروقی	سلطان شہید کی شہادت کے صرف آٹھ سال بعد لکھی گئی۔ اس تذکرے کے تمام حالات و واقعات چشم دید مستند اور مفصل ہیں۔ جو بلا کسی رنگ آمیزی کے قلم بند کیے گئے ہیں۔ سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۴۴۸ صفحات	۱۰/-
حیات امیر خسرو مرتب :- نقی محمد خاں خورجوی	برصغیر پاک وہند کے جامع الصفات بزرگ امیر خسرو کے سوانح، ان کے ادبی، علمی، فنی ظاہری اور باطنی کمالات کا دل کش مرقع۔ سائز ۵" × ۷½" ضخامت ۲۵۰ صفحات	۳/۵۰
سیرۃ ائمہ اربعہ رئیس احمد جعفری	حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبل کے مفصل، مکمل اور مستند سوانح حیات۔ سائز ۵½ × ۹" ضخامت ۶۲۰ صفحات	۷/۵۰
سکھ عہد اسلامی میں عباداللہ گیانی	عہد اسلامی میں سکھ قوم کی حیثیت تاریخ کی روشنی میں۔ سائز ۵" × ۷½" ضخامت ۱۰۴ صفحات	۲/-

★

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
فاطمہؓ بنت محمدؐ سید رئیس احمد جعفری	سیدۃ النساء العالمین کے حالات زندگی سائز ۵½" × ۹" ضخامت ۲۲۰ صفحات	۳/۲۵
ڈھاکہ پچاس برس پہلے حبیب الرحمٰن شروانی	ڈھاکہ کی ناقابل فراموش مصور تاریخ سائز ۵½" × ۷½" ضخامت ۱۰۴ صفحات	۲/۲۵
تاریخ اسلام عبدالحکیم نشتر جالندھری	ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک اسلامی دنیا کی مکمل و مفصل تاریخ - پانچواں نوترمیم ایڈیشن - سائز ۶½" × ۱۰" - صفحات ۱۰۸۰	۱۲/-
سیرۃ النبیؐ (کامل) مرتبہ ابن ہشام نظرثانی و تہذیب مولانا غلام رسول مہر	سیرت رسالت مآب پر اس سب سے اہم اور قدیم ترین عربی کتاب کو پہلی مرتبہ سلیس اور دلکش اور ترجمے کا لباس پہنایا ہے، حواشی میں ضروری تشریحات، ہر مقام کے نقشے شامل ہیں۔ اس کی اشاعت اردو ادب میں نہایت اہم اضافہ ہے۔ سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۱۲۰۰ صفحات	۳۲/-
تاتاریوں کی یلغار تصنیف:- لڈیم ترجمہ:- عزیز احمد	تاتاریوں کی مکمل سرگذشت۔ لڈیم کی شہرہ آفاق کتاب THE MARCH OF THE BARBARIAN کا مکمل اور مستند اردو ترجمہ۔ سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۴۰۰ صفحات	۱۲/-
سید احمد شہیدؒ مولانا غلام رسول مہر	سرزمین پاک و ہند میں تحریک احیاء دین کی مکمل سرگذشت سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۹۰۰ صفحات، کتابت وطباعت اعلیٰ	۱۵/-
جماعت مجاہدین مولانا غلام رسول مہر	سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے تنظیمی حالات اور ان کے اکابر رفقا کے سوانح سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۳۲۵، کتابت وطباعت دلفریب	۷/-
سرگذشت مجاہدین مولانا غلام رسول مہر	سید احمد شہیدؒ کے سلسلے کی چوتھی اور آخری جلد سائز ۶½" × ۱۰"، ضخامت ۶۸۰ صفحات، کتابت وطباعت دلفریب	۱۲/-
بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد سید رئیس احمد جعفری	۱۸۵۷ء کی عالم آشوب تحریک انقلاب کی مکمل مستند اور مفصل انسائیکلوپیڈیا (دوسرا ایڈیشن) سائز ۶½" × ۱۰"، ضخامت ۱۳۲۶۴ صفحات، ۱۳ رنگین و سادہ تصاویر کے ساتھ	۲۰/-
۱۸۵۷ء مولانا غلام رسول مہر	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر اردو زبان میں پہلی اور یگانہ کتاب۔ سائز ۶½" × ۹"۔ ضخامت ۴۷۹ صفحات بعض مفید اور ضروری حواشی کے ساتھ	۷/۵۰

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
۱۸۵۷ء کے مجاہد مولانا غلام رسول مہر	پاک و ہند کی پہلی جنگِ آزادی میں نمایاں حصّہ لینے والوں کی مکمّل سرگذشت کسی بھی زبان میں اس موضوع پر آج تک کوئی بھی کتاب نہیں لکھی گئی۔ سائز ½۵" × ۹" ضخامت ۳۲۸ صفحات نادر نقشہ جات اور تصاویر سے مزین مفید اور ضروری اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن۔	۴/۵۰
واجد علی شاہ اور اُن کا عہد سیّد رئیس احمد جعفری	عہد واجد علی شاہ کی مکمّل مستند انسائیکلوپیڈیا۔ سائز ½۶" × ۱۰" ضخامت ۷۲۲ صفحات متعدد تصاویر	۱۲/۵۰
سیرت محمد علی سیّد رئیس احمد جعفری	بعض سربستہ رموز کے انکشافات کے ساتھ۔ سائز ۵" × ½۷، ضخامت ۶۰۰ صفحات۔	۶/-
کمال اتاترک اُستاد محمد محمد توفیق مصری ترجمہ کرم الٰہی خاموش،	دُنیا میں کمال اتاترک کی سوانح اس سے اچھے پیرایے میں کسی زبان میں نہیں لکھی گئی سائز ۵" × ½۷"، ضخامت ۳۶۸ صفحات (ساتواں ایڈیشن)	۴/۷۵
رحمۃ اللعالمین مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری	مقبول عام سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم تین جلدوں میں۔ سائز ½۶" × ۱۰ ضخامت جلد اوّل ۳۸۰ صفحات جلد دوم ۴۷۸، جلد سوم ۴۸۸ صفحات، کتابت و طباعت نفیس	جلد اوّل ۴/- " دوم ۶/۵۰ " سوم ۶/۵۰
سرورِ عالم مولانا غلام رسول مہر	سیرۃ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نہایت اعلیٰ پاکیزہ اور مکمّل کتاب، سائز ۵" × ½۷" ضخامت ۳۳۸ صفحات۔	۲/۵۰
انوارِ انبیاء ادارہ تصنیف و تالیف	انبیاء کرام کے حالات زندگی جس کا ذکر قرآن کریم احادیث صحیحہ، بائبل و دیگر تاریخی کتب میں آیا ہے۔ سائز ½۷" × ۱۰" ضخامت ۴۵۶ صفحات طباعت آفسٹ۔	۱۰/-
انوارِ اصفیاء ادارہ تصنیف و تالیف	دُنیائے اسلام کے نوے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے مکمّل حالات، ہر شخص کے بیان میں ولادت اور رحلت کی تاریخیں۔ جائے پیدائش اور وفات سلسلہ طریقت و شخصیت ذاتی زندگی۔ سائز ½۷" × ۱۰" ضخامت ۱۰۵۰ صفحات۔	۱۰/-
زندگی کے نمونے ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے عملی نمونے سائز ۵" × ½۷"، ضخامت ۱۴۴ صفحات	۱/۵۰

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
تذکرہ غوثیہ مولوی شاہ گل حسن	مولانا سید غوث علی پانی پتی کے حالات ملفوظات، طیبات۔ سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ آفسٹ طباعت۔	۶/-
جوزیفین	اس میں نپولین کی زندگی کے حالات اس کا معاشقہ، ملکی خدمات اور ضروریات کے مقابلے میں حسین ترین صنف نازک کے عشق کی قربانی کی روئیداد پیش کی گئی ہے۔	۲/-
تاریخ انقلاب روس شیر جنگ	روس کے اقتصادی انقلاب کا تاریخی پس منظر سائز ۵" × ۷½"، ضخامت ۴۸۴ صفحات	۴/۵۰
کارل مارکس اور اس کی تعلیمات شیر جنگ	کارل مارکس کے بنیادی اصول اور ان کا عملی تجربہ۔ سائز ۵" × ۷½، ضخامت ۶۶۸ صفحات	زیر طبع
وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج ترجمہ اولاد علی گیلانی	ہندوستان میں انگریزی حکومت کا خون آشام دور۔ سائز ۵" × ۷½" ضخامت ۳۸۶ صفحات	۳/۷۵
تاریخ انقلابات عالم ادارہ تصنیف و تالیف	دُنیا کی تاریخ، سیاست اور معیشت پر ایک مستقل انسائیکلوپیڈیا۔ سائز ۵½" × ۹" ضخامت صفحات، مکمل از سر نو ترتیب دی گئی ہے۔	زیر طبع
الفاروق مولانا شبلی نعمانی	سیرت فاروق رضؓ پر مستند و معتمد کتاب۔ سائز ۵" × ۷½"، ضخامت ۵۴۴ صفحات۔	۴/۵۰
انوار اولیاء رئیس احمد جعفری (ندوی)	بزرگان دین کی سیرت و کردار کا انسائیکلوپیڈیا (تیسرا ایڈیشن) سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۶۰۰ صفحات	۱۰/-
خواجہ غریب نواز ادارہ تصنیف و تالیف	حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مکمل و مستند سوانح۔ سائز ۵½" × ۹" ضخامت ۲۰۰ صفحات۔	۳/-
حکمائے عالم تصنیف :- قفطی ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۱۴ - اسلامی و یونانی فلاسفہ اور حکما کے حالات کا مرقّع۔ سائز ۵½" × ۹" ضخامت ۶۰۸ صفحات مع اشاریہ	۱۰/-

★

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز کشمیری بازار لاہور ، برانچیں :- لاہور - کراچی - پشاور - حیدرآباد

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
حسینؑ ابن علیؑ پروفیسر نگہت شاہجہان پوری	سیرت امام حسین نفسیاتی زاویہ نگاہ سے سائز ۳/۴ ۵ × ۱/۲ ۸" ضخامت ۱۰۸ صفحات	۲/۰
ہمارا قائد زیڈ اے سلیری	قائد اعظم کی ناقابل فراموش جذبات پر تبصرہ سائز ۵" × ۱/۲ ۷" ضخامت ۲۴۰ صفحات	۲/۵۰
دید و شنید رئیس احمد جعفری	زندہ جاوید ہستیوں کا بے نظیر مرقع سائز ۵" × ۱/۲ ۸" ضخامت ۵۷۶ صفحات	۶/۵۰
تذکرۃ الاولیاء	شیخ فرید الدین عطار کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ جس میں تمام اولیاء اللہ کے حالات زندگی نہایت عام فہم زبان و انداز میں لکھے گئے ہیں۔ سائز ۱/۲ ۷" × ۱۰"	۳/۰
تاریخ اشاعت اسلام تالیف۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	عہد نبوی سے لے کر آج تک اشاعت اسلام کی مفصّل اور مستند تاریخ اپنے موضوع پر سب سے پہلی اور جامع کتاب۔ سائز ۱/۲ ۶" × ۱۰"	زیر طبع
تاریخ فرشتہ تالیف ملا محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ ترجمہ عبدالحی خواجہ بی اے (آنرز) ایم اے	مسلم عہد حکومت کی عظیم تاریخ جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کی فرمائش پر [illegible] میں شروع ہو کر سنہ ۱۶۱۲ء میں مکمل ہوئی۔ اہم ترین تاریخی دستاویز۔ غیر معروف اہم مقامات کی تشریح حاشیوں میں نہایت تحقیق کے بعد درج کر دی گئی ہے۔ سائز ۱/۲ ۶" × ۱۰"	زیر طبع
منتخب التواریخ تالیف ملا عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی ترجمہ غلام سرور نگار	تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ کا انتخاب و اضافہ ہے۔ جس میں ہر اسلامی بادشاہ کے احوال کا اجمالی تذکرہ محفوظ ہے۔ غیر معروف اہم مقامات کی تشریح حاشیوں میں نہایت تحقیق کے بعد درج کر دی گئی ہے۔ سائز ۱/۲ ۶" × ۱۰"	زیر طبع
مختصر تاریخ اسلام مولانا غلام رسول مہر	ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک کے مسلمانوں کی مکمل و مستند تاریخ۔ سائز ۵" × ۱/۲ ۸"۔ ضخامت ۳۳۲ صفحات	۳/۵۰

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
امامت وسیاست تالیف رئیس احمد جعفری (ندوی)	یہ کتاب تاریخی حقائق اور مستند ترین واقعات کا ذخیرہ ہے۔ نہایت عمدہ طباعت خوبصورت ڈسٹ کور۔ سائز ۶½ × ۱۰ ضخامت ۵۰۰، صفحات	۱۵/۰
بوادر النوادر از حضرت مولانا اشرف علی صاحب (تھانوی)	حضرت اقدس کی آخری تصنیف اور تمام تصانیف و مواعظ کا انتخاب۔ سائز ۶½ × ۱۰ ضخامت ۸۸۰ صفحات	
نہج الفصاحت یعنی قرآن ناطق محمد عربیؐ تالیف وتہذیب علامہ نصیر الاجتہادی	تمام خطبوں، فیصلوں، مناظروں، مکاتیب مکالمات اقوال اور دعاؤں کا مجموعہ۔ ایک طرف اصل عبارت دوسری طرف ترجمہ، اس کے ساتھ ہی مصر کے مشہور عالم محمد رضا کی کتاب "محمد" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ طباعت فوٹو آفسٹ، مجلد خوبصورت سنہری ڈائی دار۔ سائز ۷½ × ۱۰ ضخامت ۱۰۰۴ صفحات	۲۵/-
نہج البلاغۃ اردو ترجمہ مع متن مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی و سید رئیس احمد جعفری (ندوی) سید مرتضیٰ حسین فاضل	امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے خطبات و کلمات، توقیعات ورقعات کا سلیس اردو میں ترجمہ مع متن۔ عام ایڈیشن	۲۵/-
	(عکسی ایڈیشن) آرٹ پیپر رنگین ایڈیشن سائز ۷½ × ۱۰ ضخامت ۱۰۱۴ صفحات دوسرا ایڈیشن	۵۰/-
حرف آخر مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	تعزیہ وسزائے موت پر عظیم ہستیوں کا بیان سائز ۵" × ۷½"۔ ضخامت ۴۴ صفحات	۲/۰
غوث اعظم مرتب امان اللہ خاں ارمان سرحدی	غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مفصل حالات کسب کمالات اور منازل عرفان کے عہد بہ عہد واقعات، معراج سلوک اور تکملہ، غوثیت کے تمام تر احوال و کوائف، تعلیمات تصانیف، اقوال وارشادات، دعائیں، وظیفے، غرض حضرت شیخ پر جامع، مفصل اور نادر کتاب سائز ۵½ × ۹ صفحات ۲۵۰	۵/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز کشمیری بازار لاہور برانچیں: لاہور۔ کراچی۔ پشاور، حیدرآباد

۱۲ اعلیٰ معیاری کتابیں

انوارِ اولیاء
از: سیّد رئیس احمد جعفری

بزرگانِ دین کی سیرت و کردار کا انسائیکلوپیڈیا

سائز ½۷" × ۱۰"، ضخامت ۶۰۰ صفحات۔ بہترین ڈسٹ کور۔ قیمت -/۱۰ روپے

انوارِ انبیاء
از: ادارہ تصنیف و تالیف،

انبیائے کرامؑ کے حالاتِ زندگی، جن کا ذکر قرآنِ کریم، احادیث صحیحہ، بائیبل و دیگر تاریخی کتب میں آیا ہے۔

سائز ½۷" × ۱۰"، ضخامت ۴۵۶ صفحات، خوبصورت و دیدہ زیب ڈسٹ کور،

قیمت -/۱۰ روپے

انوارِ اصفیاء
از: ادارۂ تصنیف و تالیف

دُنیائے اسلام کے ۱۰۹ صُوفیائے کرام اَور اولیائے عظّام کے مکمل حالات، ہر بزرگ کے بیان میں ولادت اَور رحلت کی تاریخیں، جائے پیدائش اور وفات، سلسلۂ طریقت و شخصیت، ذاتی زندگی۔ سائز ½۷" × ۱۰"، ضخامت ۶۵۰ صفحات، بہترین سہ رنگہ ڈسٹ کور،

قیمت -/۱۲ روپے

کیمیائے سعادت
از: امام غزالیؒ

ترجمہ: ثاقب نقوی

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہورِ عالم کتاب کا نہایت سلیس اَور بامحاورہ ترجمہ۔ سائز ½۷" × ۱۰"۔ ضخامت ۷۶۲ صفحات۔ عمدہ طباعت دیدہ زیب ڈسٹ کور۔

قیمت -/۱۲ روپے

تاریخ ادبِ عربی
از: اُستاذ احمد حسن زیات

ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی

مؤسس انجمن ترقی عربی (پاکستان)

اُردُو میں تاریخِ ادبِ عربی پر جامع و مُستند کتاب، جس میں عربی زبان کے تمام قدیم و جدید بُلند پایہ ادباء و شعراء و مفکّرین کے حالات اَور اُن کے کلام کا منتخب نمونہ درج ہے۔ سائز ½۶" × ۱۰"، ضخامت ۷۰۰ صفحات۔ طباعت بذریعہ اُردو ٹائپ۔

قیمت -/۲۱ روپے

الوحی المحمدی
تصنیف: سیّد محمد رشید رضا

ترجمہ: سیّد رشید احمد ارشد ایم۔ اے

ناقابلِ تردید دلائل سے قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت، دورِ جدید کے علمی اخلاقی اور تمدنی رجحانات کے مطابق قرآنِ کریم کے پیش کردہ دستورِ حیات کی تفصیلات۔

سائز ½۵" × ۹"، ضخامت ۴۸۸ صفحات۔ خوبصورت ڈسٹ کور۔

قیمت ۷/۵۰ روپے

سیّد احمد شہیدؒ
از: مولانا غلام رسول مہر

مجاہدِ کبیر حضرت سیّد احمد شہید بریلویؒ کے مفصل سوانحِ حیات اَور اُن کی تحریکِ احیاءِ دین کی مکمل سرگزشت۔ سائز ½۶" × ۱۰"، ضخامت ۴۸۸ صفحات۔

قیمت -/۱۵ روپے

امام مالکؒ
مصنفہ: محمد ابوزہرہ (مصر)،

ترجمہ و حواشی: عُبیداللہ قدسی،

امام دار الہجرت حضرت امام مالکؒ کے سوانحِ حیات پر جامع اور مفصل کتاب۔ سائز ½۶" × ۱۰"، ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ بہترین ڈسٹ کور۔ قیمت -/۱۰ روپے

آثارِ امام شافعیؒ
تصنیف: محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ: سیّد رئیس احمد جعفری (ندوی)

عہدِ امام شافعیؒ کے فقہی رُجحانات، عہد بہ عہد کے فقہی انقلابات و تصوّرات، فقہِ اسلامی کے تدریجی ارتقا اَور امام شافعیؒ کے فضائل و کمالات اور مجتہدات پر ایک تحقیقی اَور تنقیدی نظریہ۔ سائز ½۶" × ۱۰"، ضخامت ۵۵۰ صفحات۔ رنگین ڈسٹ کور۔

قیمت -/۱۲ روپے

آثارِ امام محمدؒ و امام ابو یوسفؒ
از: سیّد رئیس احمد جعفری

امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے دستِ راست اَور شاگردِ رشید، فقہ حنفی کے امامِ کبیر اور مجتہدِ اعظم امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے آثار و اخبار، حالات و سوانح، مجتہدات فتاوی کا ایک دلآویز مُرقع۔

سائز ½۶" × ۱۰"، ضخامت ۶۰۴ صفحات۔

قیمت ۱۲/۵۰ روپے

حیاتِ امام احمد بن حنبلؒ
تالیف: محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ: سیّد رئیس احمد جعفری،

حضرت امام احمد بن محمد بن حنبلؒ کے حالات و سوانح۔ امام صاحبؒ کے زمانہ، ان کے افکار اور فقہِ اسلامی میں حنبلی فقہ کی امتیازی حیثیت کا تفصیلی تذکرہ۔

سائز ½۶" × ۱۰"، ضخامت ۵۰۸ صفحات۔

قیمت -/۱۰ روپے

حیاتِ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ
تالیف: محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ: سیّد رئیس احمد جعفری،

مقدمہ: مولانا غلام رسول مہر

امام احمد بن تیمیہؒ کے مکمل حالاتِ زندگی پر جامع اَور مفصل کتاب۔

سائز ½۶" × ۱۰"، ضخامت ۸۸۲ صفحات۔ بہترین ڈسٹ کور۔

قیمت -/۲۱ روپے

(مُکمّل فہرست طلب کرنے پر ارسال کی جاتی ہے)

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، کشمیری بازار لاہور

برانچ: بندر روڈ، کراچی — ہسپتال روڈ، حیدرآباد — [illegible]، پشاور

مالکان: عالمی پرنٹنگ پریس، لاہور